نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۵ نمبر ۱

چیتر ۱۸۸۲
اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

چندہ سالانہ : تین روپے
فی پرچہ : ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری یو۔ پی

مطبوعہ
گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمہ اطلاعات۔ اتر پردیش

عنوانات

سرورق: شکنتلا، شہرۂ آفاق سنسکرت ڈرامہ نگار کالی داس کے ڈرامے "شکنتلا" کی ہیروئن اپنے محبوب دشینت کے تصور میں۔ نقش جے۔ ایس گپتا

اپنی بات

اپریل ۱۹۶۰ء سے ہمارے پنج سالہ منصوبے کا دوسرا سال شروع ہوتا ہے۔ یہ امر ہمارے لیے اطمینان بخش ہو کہ گزشتہ چار برسوں میں متعدد ترقیاتی کام ہوئے اور منصوبے کے تحت جو اسکیمیں شروع کی گئی تھیں وہ کامیابی سے چلتی رہیں۔ اس کامیابی میں حکومت کے خلوص کے علاوہ عوام کے اشتراک و تعاون کو بھی بہت بڑا دخل ہو۔ کام کی رفتار کو دیکھتے ہوئے اس امر کی پوری توقع ہو کہ پانچویں سال کے اختتام پر منصوبے کی وہ تمام اسکیمیں بروئے کار آجائیں گی جو اب سے چار برس پہلے بنائی گئی تھیں۔ دوسرے منصوبے کی مدت ختم ہونے کے بعد تیسرا منصوبہ شروع کیا جائے گا۔ اس منصوبے کا خاکہ تیار ہو رہا ہے اور اس میں زراعت کی ترقی اور غذائی پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ صنعتی ترقی پر بھی کافی زور دیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری ریاست زرعی ریاست ہو اور اسے غذائی حیثیت سے خود کفیل بنانا ہمارا اولین فریضہ ہو لیکن ریاست کو حقیقی معنوں میں خوش حال بنانے کے لیے اُسے صنعتی اعتبار سے مستحکم بنانا بھی بہت ضروری ہو۔ چنانچہ حکومت اُتر پردیش پیداوار بڑھانے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ ریاست کی صنعتی ترقی کے لیے بھی کوشاں ہو اور اس سلسلے میں متعدد دوررس اقدامات کر چکی ہو۔ موجودہ سرکاری کارخانوں کے علاوہ نئے کارخانے قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو اور تیسرے منصوبے میں اس جانب مزید توجہ کی جائے گی۔ لیکن ظاہر ہو کہ ریاست کی زرعی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی صنعتی ترقی کے لیے کافی سرمایہ کی بھی ضرورت پڑے گی۔ یہ سرمایہ ہمیں آپ فراہم کر سکتے ہیں۔ مرکزی حکومت نے قومی بچت کی ایک اسکیم تیار کر کے ہمیں یہ سرمایہ فراہم کرنے کا ایک موقع دیا ہو۔ قومی بچت کی اس اسکیم کے تحت دس سالہ اور پندرہ سالہ سرٹیفکیٹوں کی خریداری کے علاوہ کچھ اور طریقے بھی نکالے گئے ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ چند روپے کے بھی خریدے جا سکتے ہیں اور ہزاروں روپے کے بھی۔ اس طرح ان کی خریداری میں غریب بھی حصہ لے سکتے ہیں اور امیر بھی۔ ان سرٹیفکیٹوں کی خریداری پر آپ جو روپیہ صرف کریں گے وہ ایک مقررہ مدت کے بعد نہایت معقول سود کے ساتھ آپ کو واپس کر دیا جائے گا۔ اگر آپ مقررہ مدت سے پہلے ہی اپنی رقم واپس لینا چاہیں تو بعض شرائط کے ماتحت وہ وقت مقررہ سے بھی پہلے واپس مل سکتی ہو۔ ان سرٹیفکیٹوں وغیرہ کی خریداری سے جو روپیہ جمع ہوگا وہ منصوبے کی ترقیاتی اسکیموں کو بروئے کار لانے پر صرف کیا جائے گا۔ اس طرح اس اسکیم میں روپیہ لگا کر آپ ملک اور ریاست کو خوش حال بنانے کی قومی مہم کو بھی تقویت پہنچائیں گے اور کچھ روپیہ بھی پس انداز کر لیں گے جو منافع کے ساتھ آپ کو واپس بھی مل جائے گا۔ قومی بچت اسکیم کی تفصیلات نیا دور کی اسی اشاعت میں کہیں دی جا رہی ہیں۔ ان تفصیلات کو پڑھیے تو آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ قومی بچت اسکیم نہ صرف ملک و قوم کے لیے بلکہ آپ کے اور آپ کے بچوں کے لیے کتنی مفید اور کار آمد ہے۔

ساہتیہ اکادمی، ہند، کی طرف سے ۱۹۵۹ء کے انعامات تقسیم ہو چکے ہیں۔ اس سال اُردو میں انعام جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب کو ان کی کتاب اُردو ڈراما اور اسٹیج پر دیا گیا اور سال گزشتہ حضرت جگر مرادآبادی کو اُن کے دیوان آتش گل پر۔ ساہتیہ اکادمی ۱۹۵۴ء میں قائم کی گئی تھی اور وہ ہر سال دستور ہند میں مندرجہ ۱۴ ہندوستانی زبانوں کے علاوہ سندھی اور انگریزی زبان کی بہترین کتاب پر (جس کا مصنف ہندوستانی ہو) پانچ پانچ ہزار روپے کے انعامات تقسیم کرتی ہو۔ کتاب منتخب کرنے کا طریقہ یہ ہو کہ ساہتیہ اکادمی مشاورتی بورڈ کے اراکین کے علاوہ چند دوسرے ممتاز ادیبوں اور ناقدوں سے درخواست کی جاتی ہو کہ گزشتہ تین برس کے اندر ان کی زبان میں ان کے نزدیک جو بہترین کتاب شائع ہوئی ہو اُس کے متعلق اپنی رائے لکھ کر اکادمی کو بھیج دیں۔ کتاب کا کوئی بھی موضوع ہو سکتا ہو مثلاً ادب، تاریخ، شعر و شاعری، سوانح عمری، فلسفہ وغیرہ۔ رائیں موصول ہونے کے بعد منتخب شدہ کتاب کا اعلان کیا جاتا ہو۔ ۱۹۵۹ء کے انعامات پنڈت جواہر لال نہرو نے تقسیم کیے تھے۔ مقابل صفحے پر تقسیم انعامات کے موقع کی ایک تصویر شائع کی جا رہی ہو۔

نیا دور میں اس امر کا اعلان ہو چکا ہو کہ یہ ضروری نہیں کہ جو غزل اس میں شائع ہو اُس کا معاوضہ بھی دیا جائے۔ اس وقت اس چیز کو ایک مرتبہ پھر واضح کیا جاتا ہے کہ جو حضرات نیا دور میں اشاعت کے لیے اپنی غزل بھیجیں اس بات کا خیال رکھیں۔ ہم یہ بھی عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ نیا دور کے لیے ایسے مضامین بھی درکار ہیں جو سائنس، فنون لطیفہ، آثار قدیمہ، تاریخ اور دوسرے موضوعات پر ہوں۔ ہمارا خیال ہو کہ اردو میں ان موضوعات پر زیادہ نہیں لکھا جا رہا ہو اس لیے ضرورت ہو کہ اس طرف زیادہ توجہ کی جائے ——— (ایڈیٹر)
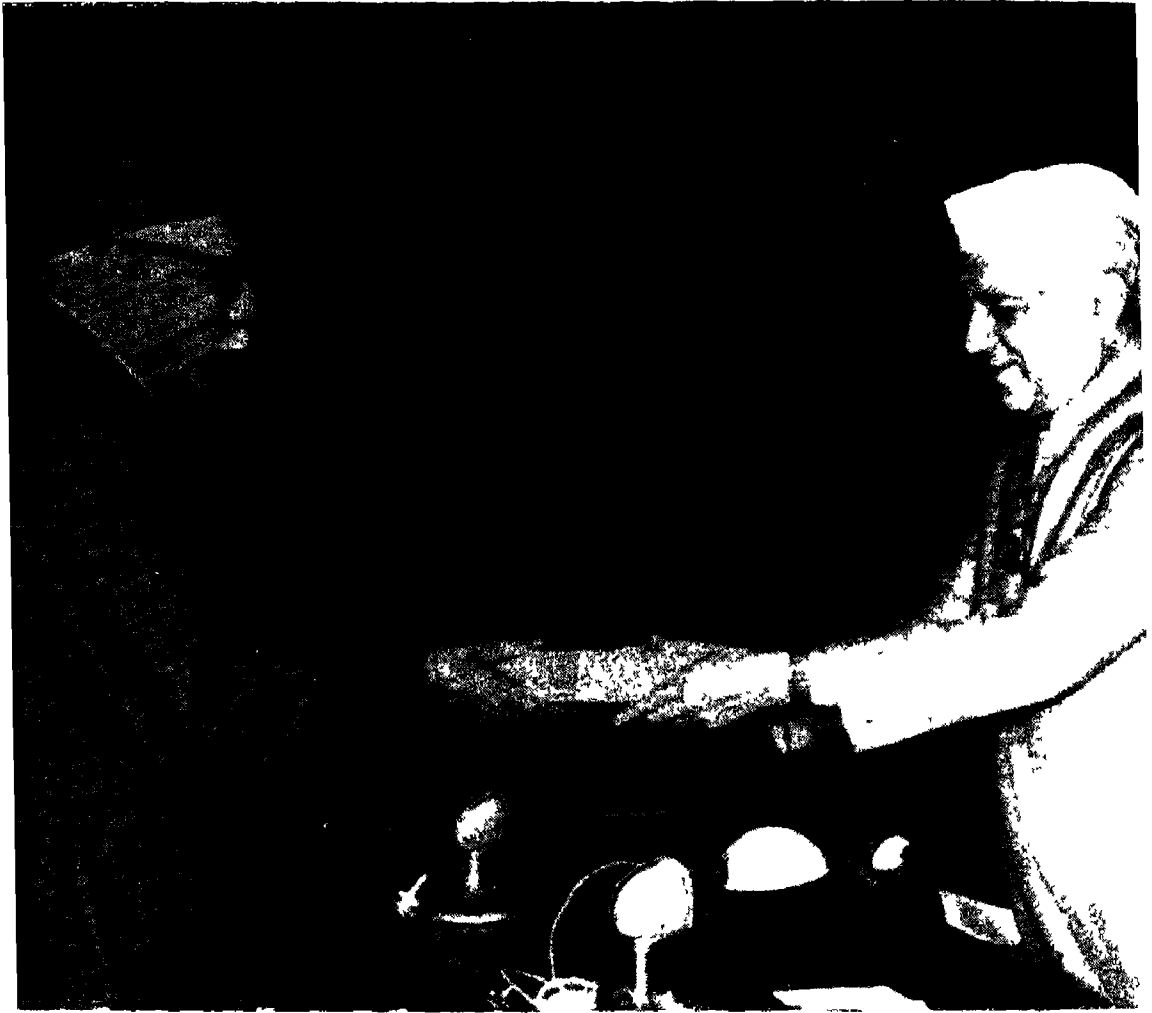
ساہتیہ اکادمی کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کو ان کی کتاب "اردو ڈراما اور اسٹیج"
کے لیے وگیان بھون، نئی دہلی میں ۱۳ فروری ۱۹۶۰ء کو اکادمی کا انعام اور پانچ ہزار روپے کی چیک
پیش فرما رہے ہیں

غزل

فراقؔ گورکھپوری

یہ کس کافر کے ہاتھوں زندگی کی آزمائش ہے
الم کی آزمائش ہے، خوشی کی آزمائش ہے

ہر اک کا جائزہ لیتی ہیں اُس کی نیم باز آنکھیں
سرِ بزم آج ہوش و بیخودی کی آزمائش ہے

منازل غم کے ہیں یا خود شناسی کے منازل ہیں
محبت کیا ہے؟ بس خود آگہی کی آزمائش ہے

سُنا ہے غنچۂ دل گیر اکثر کھل بھی اُٹھتے ہیں
نگاہِ یار تیری دل دہی کی آزمائش ہے

جو اُن ہاتھوں نے پردے چھوڑ رکھے ہیں گناہوں کے
اُن ہی میں عشق کی پاکیزگی کی آزمائش ہے

یہ دُنیا کیا ہے، اے دل امتحاں گاہِ محبت ہے
یہاں ہر ہر قدم پر آدمی کی آزمائش ہے

مرے دم سے جہنم کے بھی شعلے ٹھنڈے پڑ جائیں
قیامت کیا مری تر دامنی کی آزمائش ہے

دوراہے پر اُمید و بیم کے دُنیا کھڑی ہے آج
کہ یہ دَور اہلِ جنگِ زرگری کی آزمائش ہے

اُفق پر زندگی کے کچھ لہو کی ہے جھلک اے دل
صلیب و دار و رسن شاید کسی کی آزمائش ہے

دلوں سے بے خبر ہو کر نہ بیٹھیں انجمن والے
یہ بزم اس کی ادائے دلبری کی آزمائش ہے

سراسر جلوہ گر ہو کر بھی بچنا ہے نگاہوں سے
جمالِ یار تیری نازکی کی آزمائش ہے

مجھے ہے فتح پانا سربسر جبرِ مشیّت پر
سنبھل بیٹھوں، مری بیچارگی کی آزمائش ہے

محبت کا یہ دردِ بیکراں! صبحِ ازل میں نے
کیا تھا عشق کا دعویٰ اسی کی آزمائش ہے

مخالف طاقتوں کو روندتے آگے نکل جانا
جنونِ عشق تیری خودسری کی آزمائش ہے

مظاہر کو سراسر آج کرنا ہے پری خانہ
تری آنکھوں کے سحرِ ساحری کی آزمائش ہے

غضب کی انکھڑیوں کو اک ذرا چشمِ کرم کر دے
مرا غم کیا ہے؟ تیری دوستی کی آزمائش ہے

حجابِ غم، حجابِ نا اُمیدی، شامِ تنہائی
انھیں پردوں میں دردِ عاشقی کی آزمائش ہے

مرا جذبِ نہاں تجھ سے مخاطب ہے نہ پھیر آنکھیں
اِدھر دیکھ آج تیری بے رخی کی آزمائش ہے

بدلتا جا رہا ہے رنگِ عالم دیکھیے کیا ہو
یہ شاید میرے غم تیری خوشی کی آزمائش ہے

جہاں مخلوط ہیں پرچھائیاں یزدان و شیطاں کی
اِسی دنیا میں ہر نیکی بدی کی آزمائش ہے

وہاں اُس کی نگاہیں پوچھتی ہیں کچھ مرے دل سے
جہاں ہر گفتنی ناگفتنی کی آزمائش ہے

تکلّم ہے کہ رنگا رنگ گلشن لہلہاتے ہیں
تبسّم ہے کہ ہر نورس کلی کی آزمائش ہے

بہت کچھ سوچ کر رند آج پیمانے اُٹھاتے ہیں
مرے ساقی تری دریا دلی کی آزمائش ہے

مجھے اس طرح کھونا ہے کہ وہ آنکھیں نہ پا جائیں
سرِ محفل مری گم گشتگی کی آزمائش ہے

غمِ دُنیا کے لاکھوں امتحاں ماضی کی باتیں ہیں
رہی فرقت سو وہ تو جیتے جی کی آزمائش ہے

کھلا ہم پر کہ ملی ہے فتح جب ہر آزمائش پر
کہ خود یہ زندگی ہی زندگی کی آزمائش ہے

فراقؔ اپنی غزل کو ہو دکھانا معجزہ کر کے
کہ آج اعجازِ فن جادوگری کی آزمائش ہے

انشاء کی دو نادر کتابیں

امتیاز علی عرشی

میر انشاء اللہ خاں دہلوی (متوفی ۱۲۳۳ھ = ۱۸۱۸ء) اردو زبان کے مایۂ ناز ادیب ہیں۔ ان کے دماغ میں جتنی ہمہ گیری تھی ہندوستانی شعرا اور ادیبوں میں اس کی مثال بمشکل ہی ملے گی کوئی مشرقی زبان عربی، فارسی، اردو، ہندی، کشمیری، منجملہ پشتو، ترکی، پوربی، ایسی نہیں جس میں کچھ کہا نہ ہو۔ سب میں کہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ خوب کہا ہے۔ پھر ہر زبان کی نثر پر بھی قدرت رکھتے تھے اور نظم پر بھی بے نقط کے بھی استاد تھے اور بول چال میں بھی اہل زبان جیسی مہارت حاصل تھی۔ خدا جانے اس شخص کو کام کرنے کا موقع مل جاتا تو کیا کر گزرتا۔ جس نے ہنسی ہنسی میں یہ کچھ لکھا ہے سنجیدگی کا دامن تھام لیتا تو آسمانِ علم کے کون سے ستارے تھے جنھیں نہ توڑ لاتا۔

صاحبِ قلم ہوتے ہوئے صاحبِ سیف بھی تھے۔ محمد بیگ خاں ہمدانی، شاہ عالم ثانی کے عہد میں نجف خانی امرا کا سرگروہ تھا۔ انشا اس کے ساتھ متعدد جنگی معرکوں میں شریک رہے اور توپ تفنگ اور تیر و تبر کا کھیل ایسی جرات و ہمت سے کھیلے کہ زندگی ہی تھی جو بچ نکلے۔ ایک بار جے نگر میں ہمدانی کے بھتیجے، میرزا اسماعیل بیگ خاں سے کسی بات پر بگڑ بیٹھے، بیچارے مرزا کو جان چھڑانا مشکل ہو گئی۔ لوگوں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ سلجھا دیا ورنہ یہ تو کٹار لے کر جھپٹ ہی پڑے تھے۔ اس پر بھی سیکڑوں بری بھلی سنا کر دم لیا۔

اس شجاعت و جرائت کے ساتھ ظرافت کے پتلے بھی تھے۔ عجیب غریب لطیفے اور نقلیں یاد تھیں جہاں بیٹھ جاتے باتوں کے باغ لگا دیتے اور چٹکلوں کے گل کھلاتے۔ بات میں بات ایسی پیدا کر دیتے کہ سننے والے عش عش کر اٹھتے۔ جو بھی چڑھ جاتا چھوٹا ہو یا بڑا امیر یا غریب اسے چھیڑتے۔ بدقسمتی سے چڑھ جاتا تو چھیڑ چھیڑ کر پاگل بنا دیتے۔ ہنسی دل لگی کے ساتھ رکھ رکھاؤ بھی غضب کا تھا۔ بڑے بڑوں کو بھی خلافِ مزاج بات نہ کہنے دیتے۔ ایک دن نواب سالار جنگ کے بیٹے مرزا آغا قاسم علی خاں کسی شعر میں اُن سے الجھ پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نواب سعادت علی خاں کے روبرو انھیں قائل ہونا پڑا۔

ذکاوت اور طباعی میں طاق تھے۔ غزلوں اور قصائد کی نت نئی زمینیں نکالتے اور اشعار میں اچھوتے مضمون باندھنے کی کوشش کرتے تھے۔

۱۶ برس کی عمر میں نواب شجاع الدولہ کی صحبت میں داخل ہوئے اور اس دن سے مرتے دم تک کبھی نواب نجف خاں کے لشکر میں رہے کبھی بندیل کھنڈ میں جا براجے۔ کبھی مرزا سلیمان شکوہ کے ندیم تھے۔ وہاں سے اٹھ کر الماس علی خاں خواجہ سرا کے ہم جلسہ بن بیٹھے۔ آخر میں نواب سعادت علی خاں کے زیرِ سایہ مزے اڑائے۔ دن رات اُن کے دل کا بہلاوا اور اُن کی صحبتوں کا کھلونا بنے رہے۔ مگر اس جہاں گردی اور ہرجائی پن کے باوجود تصنیف و تالیف کا شغل برابر جاری رکھا اور سچی بات یہ ہے کہ اپنی طبیعت کے جوہر یہاں بھی خوب دکھائے۔

ان کی تصنیفات میں سے کلیاتِ نظم، دریائے لطافت اور

رانی کیتکی کی کہانی مشہور ہیں اور چھپ کر شائع بھی ہو چکی ہیں۔ مخزن الغرائب (ورق ۶۰ ب) میں قرآن مجید کی چند سورتوں کی بے نقط تفسیر اور چار چار ورق کی بے نقط عربی عبارتوں کا بھی حوالہ ملتا ہے مگر یہ چیزیں ہمیں نظر سے نہیں گزریں۔ کتابخانۂ عالیہ رامپور میں اُن کی دو اور کتابیں محفوظ ہیں جن کے نسخے کسی دوسری جگہ نہیں پائے جاتے۔

پہلی کتاب کا نام سلک گوہر ہے۔ یہ ایک مختصر سی کہانی ہے جسے اپنی طبیعت کی اپج دکھانے کے لئے انشا نے بے نقط اردو میں لکھنے کی کوشش کی ہے اور اُسے نواب سعادت علی خاں کے نام معنون کیا ہے۔

جہاں تک لطف زبان کا تعلق ہے انشا کا قلم یہاں وہ گلکاریاں دکھانے میں ناکام رہا ہے جو اُن کی دوسری کتابوں میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انشا نے یہ کوئی انوکھا تجربہ کیا تھا۔ اُن سے پہلے چھوٹی چھوٹی عبارتوں یا خطوط کے علاوہ ملک الشعراء فیضی کی دو کتابیں موارد الکلم اور سواطع الالہام نثر عربی میں اور دیوان مادح نظم فارسی میں موجود اور مشہور و مقبول ہو چکی تھیں۔ خود انشا ہی نے ایک بے نقط قصیدہ، ایک بے نقط دیوان اور ایک بے نقط فارسی مثنوی طور الاسرار کے نام سے ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں تالیف کی تھی۔ چنانچہ اس کا ایک شعر سلک گوہر کے دیباچے میں نواب سعادت علی خاں بہادر کی مدح کرتے ہوئے نقل بھی کیا ہے۔

دراصل اس بے لطفی کی وجہ یہ ہے کہ عام بول چال کا سرمایۂ الفاظ انشا کے عہد میں یونہی کم تھا اُس پر طرہ یہ ہوا کہ ہندی کے وہ سب لفظ جن میں ٹ، ڈ یا ڑ پائی جاتی ہے اس بنا پر چھوڑ دینے پڑے کہ اُس زمانے میں ان پر چھوٹی سی "ط" لکھنے کی جگہ چار چار نقطے لگائے جاتے تھے۔ اگر موجودہ چلن انشا کے زمانے میں بھی پایا جاتا تو عبارت کی سانس اتنی نہ گھٹ جاتی۔

اب صرف دو راستے باقی رہتے تھے پہلا یہ کہ سنسکرت اور ہندی کے بے نقط الفاظ زیادہ کھپائے جائیں اور دوسرا یہ کہ عربی و فارسی سے مدد لی جائے۔ چونکہ انشا کے بہت بعد تک ہندو اور مسلمان دونوں اپنی تحریر و تقریر میں سنسکرت اور ہندی کے نامانوس الفاظ سے پرہیز کیا کرتے تھے۔ اور ان کی جگہ عربی و فارسی کے وہ الفاظ بھی لکھ اور بول لیتے تھے جو عام طور پر مستعمل نہ تھے۔ اس لئے انشا نے بھی رواج زمانہ کے مطابق عربی و فارسی کے ذخیرۂ الفاظ ہی کو در یوزہ گری کی اور وسعت داماں بڑھانے کے لیے عربی کے ان لفظوں کو بھی الف کے ساتھ لکھ کر غیر منقوط بنا لیا جو الف مقصورہ پر ختم ہوتے اور "ی" کے ساتھ لکھنے میں آتے تھے مگر اُس سے پیاس نہیں بجھا کرتی جن لفظوں اور ترکیبوں سے کان آشنا نہ ہوں اُن کا مطلب سمجھ بھی لیا جائے تب بھی لطف حاصل نہیں ہوا کرتا۔ اور یہ نامانوس سنسکرت اور ہندی عربی اور فارسی ہر جگہ بے کیفی ہی کا موجب بنتا ہے۔

اس عیب کو دور کرنے کے لیے انشا نے مطالب و معانی میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی چنانچہ باراتیوں میں مختلف طبقات کی نمائندگی کی غرض و غایت یہی نظر آتی ہے اور اُن کی ہیئت کذائی عادات و خصائل اور بول چال کی مصورانہ نقالی اسی کی شاہد عادل ہیں مگر اشکال و اغلاق کے بھاری بھرکم پردے اٹھا کر شاہد معنی کا دیدار کیا جائے تو بجائے تسکین کے وحشت اور جھنجھلاہٹ ہی بڑھے گی۔

بہر حال انشا کی یہ کوشش اردو زبان کی تاریخ میں ایک عجیب اضافہ کرتی ہے اور اپنے سیٹھے پن کے باوجود مستحق ستایش ہے اسی لیے اسے کتابخانۂ عالیہ رامپور کی طرف سے شائع کر دیا گیا ہے۔ چونکہ اس کتاب کا صرف ایک ہی مخطوطہ دستیاب ہوا اور محققین واقف ہیں کہ ایک قلمی نسخے پر کسی متن کی بنیاد رکھی جائے تو مشتبہ مقامات کا رہ جانا ناگزیر ہوا کرتا ہے اس لیے اس چھوٹی سی کتاب میں بھی ایسا ہوا ہے۔ اس اظہار کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی اہل ذوق کو اس کا دوسرا مخطوطہ دستیاب ہو تو مجھے مطلع کر کے ممنون فرمایا جائے۔

دوسری کتاب کو انشا کا روزنامچہ کہنا چاہیے۔ یہ ترکی زبان میں ہے اور اس میں پنجشنبہ ۸ جمادی الاولیٰ ۱۲۲۳ھ (۲ جولائی ۱۸۰۸ء) سے جمعہ ۲۵ جمادی الاخرہ سال مذکور (۱۸ اگست سال مذکور) تک کے روزمرہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ کتاب کے اول و آخر سے ناقص

ہونے کی بنا پر یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ انشا نے اسے کس تاریخ سے شروع کیا۔ اور کب تک اس کی ترتیب جاری رہی۔ میرا حال بھی وہی ہے جو کسی شاعر نے "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" میں اپنا ظاہر کیا ہے۔ تاہم ترکی کے اندر بھی بہت سے لفظ عربی و فارسی کی جگہ پاگئے تھے وہی مجھ ہندی کی کچھ کچھ راہ نمائی کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ جگہ جگہ انشا نے اردو کے مکالمے اور اپنے یا مخاطب کی زبان کے لفظ جوں کے توں نقل کر دیے ہیں ان سے بھی کسی قدر مدد ملتی ہے میرا دل کسی طرح نہ مانا کہ جو کچھ میں سمجھا ہوں اُس سے ملک کے دوسرے اہل ذوق کو محروم رکھا جائے۔ اس لیے ہر اُس تاریخ کا واقعہ جو بزعم خود میرے فہم و دانش کی گرفت میں آچکا ہے، پیش کرتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ اس روزنامچے کا مکمل نسخہ دستیاب ہو گیا اور کسی ترکی داں نے اس کا ترجمہ کر کے چھپوا دیا تو اس سے نواب سعادت علی خاں کے دربار، درباریوں اور خود انشا کے متعلق بہت سی مفید مطلب اور کار آمد باتیں معلوم ہو جائیں گی۔

روزنامچے کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

<u>پنجشنبہ ۱۸ جمادی الاول ۱۲۲۳ھ</u>

نواب سعادت علی خاں کی سالگرہ کا جشن باغ فرح بخش میں منایا گیا جناب عالی نے حاضرین کی چائے پانی سے مدارات کی شاعروں نے تہنیت کے قصیدے اور قطعے پڑھ کر سنائے خود انشا نے وہ قطعہ[1] پیش کیا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

حبّب تلک عقد ثریا رہے انشاءاللہ
یونہی پڑتی رہے یہ تا صدوسی سال گرہ

<u>شنبہ ۲۰ جمادی الاوّل</u>

غالباً خود نواب نے انشا کے مذکورہ بالا شعر پر یہ اعتراض کیا کہ اس کے پہلے مصرعہ میں مدت غیر محدود ہے یعنی "حبّب تلک عقد ثریا رہے" اور دوسرے میں محدود یعنی تا صدوسی سال جو صریح تضاد ہے اور اس لیے قابل اصلاح ہے۔

اسی سلسلے میں انشا نے کسی استاد کی یہ رباعی سند میں پیش کی:

من عمر تو جاودانہ خواہم کہ شود
فرمانبر تو زمانہ خواہم کہ شود
ایں رشتہ کہ دارد گرہ سالگرہ
تسبیح ہزار دانہ خواہم کہ شود

انشا کا مدعا یہ ہے کہ اس اشعار کے پہلے مصرع میں عمر جاودانہ کی خواہش اور آخری میں ہزار کا تعین موجود ہے لہٰذا اسے تضاد و تناقض نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ابتدا کی غیر محدود مدت سے انجام کی محدود مدت ہی مراد ہے اور چونکہ وہ بھی عمر طبیعی یا اس سے زیادہ ہوتی ہے اس لیے عملاً زیادہ سے زیادہ مدت عمر ہی رہی۔ جیسے از روئے مبالغہ جاودانہ یا غیر محدود کہنا درست ہے۔ خود انشا نے ترکی میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایک صفحے سے زیادہ پر مشتمل ہے آخری جملوں کے اندر فصیح اللہ معمار اور لکھنؤ کی کسی نہر کی تعمیر کا ذکر ہے۔

<u>چہار شنبہ ۴ ۲ جمادی الاوّل</u>

اس تاریخ کے مندرجات میں سے صرف ایک جملہ ہندی کا قابل نقل ہے اس کے محل و موقع کا تعین عبارت ترکی سے نہ کیا جاسکا

"بھائی ان تلوار بازسے کہہ دو کہ اگر ایسے ڈول کا چلنا ہے
تو آئینہ گھر میں کاہے کو رہے گا۔"

<u>پنجشنبہ ۲۵ جمادی الاوّل</u>

کسی معاملے پر گفتگو کے دوران میں نواب نے جو بات کہی تھی انشا نے اسے اس شعر میں فی البدیہہ ادا کر دیا۔

چرخ کجباز نے بازار میں بے قدری کی
بیچا اکسیر محبت کے تئیں خاک کے مول

اس زمین میں انشا کی ایک غزل کلیات میں صفحہ ۲۴۳ پر چھپ چکی ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

سلطنت بیچتے ہیں در دکشاں خاک کے مول
ہے یہاں سایہ ہما کا خس و خاشاک کے مول

لہ پورا قطعہ کلیات انشا ۳۱۶ مطبع دہلی اردو اخبار ۱۸۵۵ء میں ملاحظہ ہو۔

کلیات انشا کا ایک قلمی نسخہ جو ۱۹ ذی الحج ۱۲۱۲ھ (۱۷ جنوری ۱۸۰۸ء) کا لکھا ہوا ہے کتاب خانہ عالیہ رام پور میں محفوظ ہے۔ اس میں یہ غزل مندرج نہیں جس سے یہ قیاس کرنا بجا ہے کہ ۲۵ جمادی الاول ۱۲۲۳ھ کو جب انشا نے یہ شعر کہہ لیا تب نواب کی فرمائش پر یا از خود اس زمین میں غزل کہی اور داخل دیوان کی۔ لیکن یہ شعر دیوان مطبوعہ میں بھی نہیں پایا جاتا اور اس بنا پر کلیات انشا کے مطالعہ کرنے والے کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگا۔

یک شنبہ ۵ رجمادی الاخرہ

نواب سعادت علی خاں کے حضور میں ایک مصور کتاب پیش ہوئی۔ اس کی کسی تصویر میں مصور نے صاحب تصویر کے سر پر بے ڈھنگی سی پگڑی بنائی تھی، اسے دیکھ کر آفریں علی خاں بے اختیار بول اٹھے۔

"یہ تو پگڑی نہیں فرانسیس کی ٹوپی ہے"

انشا اردو میں لکھتے ہیں

میں نے آہستہ آہستہ یہ پڑھا۔ مصرع

پگڑی تو نہیں، ہے یہ فرانسیس کی ٹوپی

حضور نے سُن لیا اور فرمایا۔ "صاحب چلا کے کیوں نہیں پڑھتے؟ دیکھو میاں آفریں علی خاں تم پر یہ مصرع ہوا ہے۔"

انھوں نے کہا: "پیر و مرشد، کیسا مصرع؟"

فرمایا: "ہم کیا جانیں" انھوں نے کہا: ؎

"پگڑی تو نہیں، ہے یہ فرانسیس کی ٹوپی"

میں نے کہا: "یہ عجب زمین نکلی حضور کی زبان سے ارشاد ہوا ہے غلام کو ان سے کیوں پھنساتے ہیں؟ اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ کہنے والے کا قصد نہیں اور بات موزوں ہو جاتی ہے۔"

اس کے بعد ترکی عبارت ہے جس کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے اس زمین میں غزل کہنے کی فرمائش کی جس پر میں نے یہ شعر موزوں کیے۔ اس کے بعد وہی غزل درج ہے جو کلیات انشا صفحہ ۹۵ پر چھپ چکی ہے مگر روزنامچے میں ایک تو یہ شعر زیادہ ہے:

مت بھول کلاہ قجری اپنے یہ، میں تو
چٹ کر گیا ایسی کوئی چھتیس کی ٹوپی

دوسرے مطبوعہ غزل میں ایک شعر اس طرح ہے

سو چکٹی ہوئی ہے یہ منغض کہ جہاں میں
ایسی تو نہ ہوگی کسی سائیس کی ٹوپی

روزنامچے میں پہلا مصرع یوں لکھا ہے۔

سو چکٹی ہوئی یہ متعفن کہ جہاں میں

میری رائے میں میلی کچیلی اور تیل میں چکٹی ہوئی ٹوپی کو منغض کہنے کے کوئی معنی نہیں۔ صحیح لفظ متعفن ہی ہے۔ چنانچہ کلیات انشا کے اس قلمی نسخے میں بھی جو ۱۲۴۱ء کا مکتوبہ ہے روزنامچے ہی کے مطابق مصرع نقل ہوا ہے۔[۱]

روزنامچے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل کس زمانے میں اور کیوں لکھی گئی تھی۔ مولانا آزاد دہلوی نے اس غزل کے متعلق لکھا ہے

"اکثر غزلیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عالم میں سعادت علی خاں کی زبان سے ایک مصرع نکل گیا اس کی غزل کا پورا کرنا ان کا کام تھا ایک دفعہ سعادت علی خاں نے کہا کہ

پگڑی تو نہیں ہے یہ فرانسیس کی ٹوپی

تمام غزل دیکھو ان کی غزلوں میں"[۲]

روزنامچے سے اس کے برخلاف یہ پتہ چلتا ہے کہ خود انشا نے یہ مصرع برجستہ کہا تھا اور وہ بھی آفریں علی خاں کے ایک اردو جملے کو معمولی سے تغیر کے ساتھ موزوں کرکے۔ چونکہ کلیات میں خود انشا نے عنوان غزل میں لکھ دیا ہے کہ:

"مصرع اول گفتۂ حضور است"[۳]

اسی پر اعتماد کرکے آزاد نے آب حیات میں مذکورہ بالا بیان دیا۔

دو شنبہ ۶ جمادی الاخرہ

دیگر واقعات کے ساتھ نواب سعادت علی خاں کی علالت کا بھی ذکر ہے اس سلسلے میں . نثار السہار کا تذکرہ آگیا ہے۔

---

[۱] کلیات انشا ورق ۱۱۳۔ الف [۲] آب حیات ۲۸۶ طبع لاہور سنہ ندارد بار دوازدہم [۳] کلیات انشا ۹۵

شار الحمار عربی میں جنگلی ککڑی کو کہتے ہیں۔ انشا کی شوخ طبیعت نے اس ضمن میں ضرور کوئی لطیفہ پیدا کیا ہوگا۔ آخر میں نواب کا یہ اُردو جملہ نقل کیا ہے :

"اچھا صاحب، بہت اچھا۔ تم بنالاؤ میں لگاؤں گا۔"

سہ شنبہ، جمادی الاخرہ

اس میں عربی کے مشہور ادیب اصمعی کا یہ لطیفہ لکھا ہے کہ خلیفۂ بغداد نے اس سے دریافت کیا کہ : ۔

"الائمۃ اثنا عشر، ام اربعہ ؟ (امام بارہ ہیں یا چار)

اصمعی نے جواب میں کہا :

"اربعہ، اربعہ، اربعہ" (یعنی چار، چار، چار)

بقول انشا اس سے خلیفہ اور دیگر اہل السنت نے سمجھا کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور ابن حنبل یہ چار امام ہیں۔ حالانکہ مقصد یہ تھا کہ بارہ امام ہیں چونکہ وہ شیعی تھا، سنی دربار میں اپنی جان بچانے کے لیے اس نے ایسا پہلو اختیار کیا کہ سننے والا اسے اپنے اعتقاد کے مطابق سمجھے اور اس کا قول، خود اپنے عقیدے کے خلاف بھی نہ رہا۔

اسی طرح اس سے یہ پوچھا گیا کہ رسول اللہ کے بعد مسلمانوں میں کون افضل ہے۔ اصمعی نے کہا۔

"من بنتہ فی بیتہ"

غائب کی ضمیروں کے مرجع بدل جانے سے اس جملے کا مطلب بھی بدل جاتا ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ شخص افضل ہے جس کی بیٹی اس کے (یعنی رسول اللہ کے) گھر میں ہے۔ چونکہ حضرت ابوبکر کی صاحبزادی حضرت عائشہ رسول اللہ کی حرم محترم تھیں اس لیے سنی اس جملے کا مطلب یہی سمجھے۔

دوسرا منشا اس جملے کا یہ ہے کہ وہ شخص افضل ہے جس کے گھر میں اس کی (یعنی رسول کی) بیٹی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی زوجۂ محترمہ حضرت فاطمہ زہرا تھیں اور وہ رسول اللہ کی چھوٹی صاحبزادی ہیں۔

چہار شنبہ ۸ جمادی الاخرہ

کسی نصرانی نے نواب کے حضور میں کہا :

"جس وقت سور کو حلال کرتے ہیں گرم پانی سے اُس کو خوب دھوتے ہیں اور اُس کے بالوں کو شانہ کرتے ہیں اور بہت احتیاط سے بیچتے ہیں۔ اُس کا گوشت شفاف اور براق جیسے دھویا کپڑا ہوتا ہے۔"

جناب عالی نے اس سلسلے میں فرمایا :

"یوں کہئیے کہ جب سور کا گلا کاٹتے ہیں۔"

انشا کہتے ہیں میں نے عرض کی :

"کیا مناسب ارشاد ہوا ہے! اگر ارشاد ہوتا کہ ان کے حلال کرنے کو جھٹکا کہتے ہیں سو ایک مشابہت ہنود سے ہوتی حضور نے یہ ایسا لفظ ارشاد کیا کہ نصرانیت کی خصوصیت نکلی اور یہ کہہ کے میں اتنا ہنسا کہ پاس ادب کا کچھ باقی نہ رہا یہ حد ہے کہ میری آنکھوں سے آنسو لگے بہنے۔"

حضور نے اس پر "احسنت احسنت" کہا۔ یہ انشا کی مذکورہ سخن سنجی کی داد ہے۔

اسی بحث کے آخر میں حسین علی خاں صاحبزادہ جناب عالی کا، اور ایسی اُردو لکھنے کا ذکر ہے جس میں عربی فارسی اور پوربی الفاظ نہ ہوں اور پھر یہ جملہ نقل کیا ہے ۔

"پرانے ڈاگ، بوڑھے گھاگ، سر ہلا کر منہ تھتھا کر ناک بھوں چڑھا کر یہ کھٹراگ لائے۔"

یہ جملہ قلمی کہانی رانی کیتکی میں اس طرح مندرج ہے[1] :۔

"ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پُرانے دھرانے ڈاگ، بوڑھے گھاگ یہ کھٹراگ لائے۔ سر ہلا کر منہ تھتھا کر، ناک بھوں چڑھا کر آنکھیں پھرا کر لگے کہنے۔"

مطبوعہ نسخے میں بھی اسی طرح ہے صرف ڈاگ کا لفظ ساقط

[1] کلیات انشا ورق ۱۸۳ الف

ہے۔ اور "تھتھاکر" کی جگہ "بناکر" متن میں اور "تھتھیاکر" حاشیے میں دوسرے نسخے سے نقل کیا ہے۔[۵]

روزنامچے کی عبارت کا مطلب اگر میں صحیح سمجھا ہوں تو اس سے کہانی رانی کیتکی کی تاریخ تالیف پر بڑی اہم روشنی پڑتی ہے نیز یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے صاحبزادے حسین علی خاں کی فرمائش پر یہ کہانی لکھی گئی تھی۔

پنجشنبہ ۱۶ جمادی الاخرہ

نواب نے پنکھا طلب کرکے خواص کو حکم دیا کہ کوئلوں کو جھلے۔ اس نے پوری تعمیل حکم نہ کی۔ اس پر بقول انشا نواب نے کہا:

"کوئلوں کے واسطے منگایا ہے تو مجھے دھونکنے دے۔"

اس کے بعد یہ جملہ نقل کیا ہے:

"آپ اس کو روشن رکھیے۔"

پھر یہ جملہ ملتا ہے:

"تھالی بتیں کی جو پلنگ کے نیچے دھری ہے جلدی اٹھالاؤ۔"

پھر حضور کا یہ جملہ درج ہے:

"تمہارا دل کیوں اتنا دھڑکتا ہے۔"

پھر حضور نے ہندی میں فرمایا:

"گندھک کی بو اس میں سے آتی ہے۔"

پھر یہ قول نقل کیا ہے:

"کیا خوب، ادھر دیکھیے سبحان اللہ، چہ خوش! آپ پچاس برس کے ہیں۔"

اس کے بعد حضور کا یہ جملہ ہے۔

"صاحب مجھے تمہارا راز فاش کرنا کیا ضرور ہے۔"

پھر یہ کہ:

"ہم اس کے واسطے چھوٹی چھوٹی ڈبیاں بنا دیں گے۔"

چند سطروں کے بعد حضور کا قول ہے:

"اچھا آدمی کو سونپ دو۔"

غالباً انشا نے عرض کی:

"پیر و مرشد اس کا گھٹا نہ کھلے۔"

حضور نے جواب میں فرمایا:

"اچھی آدمی کو جیسے تم نے شیشہ سونپا ہے سمجھا دو کہ گھٹ کھلنے نہ پائے۔"

اس مکالمے سے پورے واقعے کی دلچسپی کا اندازہ ہوسکتا ہے اگر یہ اور اسی قسم کی دوسری عبارتیں ترجمہ ہوکر سامنے آئیں تو بہت سی دلچسپ ادبی معاشرتی اور سیاسی باتیں معلوم ہوسکیں گی۔

یکشنبہ ۱۹ جمادی الاخرہ

نواب کی مجلس میں قہوے کا ذکر ہے۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی اور نادر شاہ کی محفل میں قہوہ کی مدح اور ہجو پر نظام الملک آصف جاہ اول اور عمدۃ الملک کی جو شعر بازی ہوئی تھی وہ نقل کی جاتی ہے۔

آصف جاہ قہوے کی تعریف میں یہ چار مصرعے پڑھتے ہیں:

راح است قہوہ روح فزا و کسل گسل
آرام جان و قوت اعضا و قوت دل
تقریب اجتماع جوانان پارسا
تفریح بخش خاطر پیران مضمحل

اس پر حسب ارشاد محمد شاہ امیر خاں عمدۃ الملک انجام تخلص قہوے کی مذمت میں یہ رباعی پیش کرتے ہیں:

گویند، بدوزخ دم عیش افزودن
عشاق و صمیم است قدح پیمودن
آں آب غلیظ و تلخ و جوشان و سیاہ
معلوم شد کہ قہوہ خواہد بودن

سہ شنبہ ۲۱ جمادی الاخرہ

مرزا تقی خاں نے حضور کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس کے قوافی اصفیا واغنیا تھے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۶ پر)

---

[۵] داستان رانی کیتکی: انجمن ترقی اردو ۱۹۳۳ء

روشؔ صدیقی

کہاں یہ قافلۂ عمر تیز گام آیا ۔۔۔ زبانِ خضر پہ نامِ ابوالکلام آیا
وہ مردِ عشق، وہ ناموس و آبروئے وفا ۔۔۔ ازل سے لیکے حیات ابد مقام آیا
شعارِ شب ہوئی بیدار سینۂ شب میں ۔۔۔ پیامِ صبحِ درخشاں، وطن کے نام آیا
فروغِ مہر جہاں تاب فرشِ راہ بنا ۔۔۔ جو "الہلال" کو لیکر مہ تمام آیا
کمالِ حسنِ تدبّر سے طے کیا اس نے ۔۔۔ جہاں کہیں کوئی دشوار تر مقام آیا
ہزار سنگِ ملامت تھے اک دلِ نازک ۔۔۔ مگر نہ لب پہ کبھی حرفِ انتقام آیا
بچشمِ لطف اسے شاخِ گل میں ڈھال دیا ۔۔۔ اگر تصوّرِ شمشیرِ بے نیام آیا
کچھ اس وقار سے زنداں نشیں رہا برسوں ۔۔۔ کہ رشکِ دیر و حرم کو باحترام آیا
کیا طلسمِ غلامی کو درہم و برہم ۔۔۔ وطن میں دورِ جہاں بانیِ عوام آیا
دلِ بشر کو دیا دردِ زندگی اس نے ۔۔۔ مسیحِ وقت تھا انسانیت کے کام آیا
بڑھا سرِ رسن و دار اس تجمل سے ۔۔۔ ہوا یہ شور، صفِ عشق کا امام آیا

حیات پرتوِ حسنِ قدیم تھی اس کی
نگاہ، جانبِ خُلقِ عظیم تھی اس کی

جمالِ صدق و محبّت عیاں کیا اس نے ۔۔۔ بلند پرچمِ ہندوستاں کیا اس نے
رموزِ وحدتِ قومی کو بے نقاب کیا ۔۔۔ ہر ایک فرد کو اک کارواں کیا اس نے
اٹھا سوال جو خودداری و حمیت کا ۔۔۔ وطن کی خاک کو آتش فشاں کیا اس نے

کبھی حیاتِ ابد، موجِ یک نفس ٹھہری — نفس نفس کو کبھی جاوداں کیا اس نے
نقابِ چہرۂ تشکیک اس نے سرکایا — یقیں کو حسن فروزِ گماں کیا اس نے
تغیراتِ زمانہ کی نبض پہچانی — تصوّرات کو منزل نشاں کیا اس نے
ہزار طرح جو آتش کدے بھڑکتے تھے — ہزار بار انھیں گلستاں کیا اس نے

دلِ حرم کو دیا دردِ نالۂ ناقوس — بتوں کو محرمِ سوزِ اذاں کیا تو نے
حریمِ علم و معارف کا محرمِ ازلی — زمیں کو مدرسۂ آسماں کیا اس نے
وہ ایک حرف، کہ تھا جانِ سرمد و منصور — اس ایک حرف کو آرامِ جاں کیا اس نے
چراغِ دانشِ حاضر کو روشنی دے کر — شریکِ محفلِ روحانیاں کیا اس نے
وہ عہدِ گل جو بہشت و ارم کو شرمائے — نصیبِ گلشنِ ہندوستاں کیا اس نے

ہزار معنیٔ پنہاں بیک سخن کہیئے
اسے پیمبرِ آزادیٔ وطن کہیئے

مظفر علی اسیر - بحیثیت قصیدہ نگار

محمود الٰہی

اُردو شعر و ادب ایک بڑی حد تک درباروں سے وابستہ رہا ہے لیکن دکن کے ابتدائی دور سے لے کر عہدِ غالبؔ تک کوئی دور ایسا نہیں ہو جسے قصیدہ نگاری کا دور کہا جاسکے۔ قطب شاہ، غواصی اور نصرتی وغیرہ کے یہاں قصیدہ نگاری کے نادر نمونے ملتے ہیں مگر دکن میں اردو شاعری کے اس دور پر صنفِ مثنوی کی حکمرانی تھی۔ سوداؔ اردو کے سب سے بڑے قصیدہ نگار مانے جاتے ہیں اور ان کے عہد میں قصیدے کی ادبی اور فنی حیثیت کا اعتراف بھی کیا جاتا تھا لیکن یہاں بھی یہ صنف دوسری اصناف پر غالب و حاوی نہ ہوسکی۔ دہلی میں کم سے کم اتنا ضرور تھا کہ غزل کے ساتھ قصیدے کا بھی نام آجاتا تھا مگر لکھنؤ کے دبستانِ شاعری اور خاص طور پر اس کے عہدِ شباب میں صنفِ قصیدہ کا شمار صنفِ اول کی اصناف میں ٹھاہی نہیں۔ یہاں غزل کے بعد اگر کسی صنف کو بلند مقام ملا تو وہ یہ ہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ دبستانِ لکھنؤ میں قصیدہ نگاری کو فروغ نہیں ہوا، یہاں چند ایسے قصیدہ نگار ملتے ہیں جو اردو قصیدے کی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اردو شعر و ادب کا مورخ اور نقاد ان کی خدمات فراموش نہیں کرسکتا۔ ان قصیدہ نگاروں میں مظفر علی اسیرؔ کا نام سرِفہرست آتا ہے۔

اسیرؔ مصحفیؔ کے شاگرد تھے اور مصحفیؔ کے دوسرے شاگرد آتشؔ کی طرح یہ بھی بڑے کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ اپنے معاصرین میں اسیرؔ عربی و فارسی دانی میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے فارسی میں ایک دیوان قصائد چھوڑا ہے جس میں بعض قصیدے آمد و برجستگی کا اچھا نمو ہیں۔ اُردو میں انھوں نے تیس سے زیادہ قصیدے لکھے۔ ان کے قصائد کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ لکھنؤ کے عام رنگِ شاعری سے یکسر الگ ہیں۔ نہ تو ان کی تشبیبوں میں رکاکت و ابتذال ہے اور نہ ضلع جگت اور رعایتِ لفظی کی بھرمار۔ لہجے میں بڑی سنجیدگی اور وقار ہے۔ ہر بات کے اظہار میں ضبط و نظم ہے اور شاعرانہ بلکہ ایک حد تک عالمانہ رکھ رکھاؤ کی پابندی ہے۔ ان کے قصیدوں میں تراکیب کا وہ شکوہ اور بندشوں کی وہ چستی نہیں، جو اساتذہ کے یہاں ملتی ہے لیکن ان کی سادگی نیچرل شاعری سے بہت قریب ہوگئی ہے۔ ان کے یہاں حشو و زوائد کا گذر نہیں۔

جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے، اسیرؔ فارسی میں اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ غالباً اسی لئے انھوں نے سوداؔ کے قصیدوں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے فارسی قصیدہ نگاروں کا مطالعہ کیا اور سوداؔ سے فارسی کے جو مضامین چھوٹ گئے تھے، ان کو صرف اپنایا ہی نہیں بلکہ ان پر بیش بہا اضافے بھی کئے۔ اسیرؔ کی تشبیبوں میں بڑا تنوع ہے۔ ان کے یہاں بہار و خزاں، شکوہ و شکایت اور واقعاتِ خواب کو بہت کم راہ مل سکی ہے۔ یہ ہر قصیدے کی تشبیب میں ایک

نیا انداز اختیار کرتے ہیں اور گریز تک آتے آتے اپنے پڑھنے اور سننے والوں کو ہمہ تن توجہ بنا لیتے ہیں۔ ان کے قصیدوں کی ابتدا اس طرح نہیں ہوتی کہ ہم آپ پہلا شعر سن کر قصیدے کی ساری منزلیں خود بخود طے کر لیں۔ ہمیں آخری شعر تک اسیرؔ کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے اور ہر منزل پر ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ اب اس کے آگے کیا ہوگا۔

فارسی قصیدوں کی تشبیب میں عنصریؔ نے سوال و جواب اور مناظرے کا اسلوب رائج کیا۔ سوال و جواب کا نمونہ ہمارے قصیدوں میں سوداؔ سے ہی ملنے لگتا ہے لیکن مناظرے کا کہیں پتہ نہیں۔ مناظرے میں دو محسوساتی یا مادی چیزوں میں افضلیت کے لئے بحث ہوتی ہے۔ دونوں اپنی صفات، لوازم، خصوصیات اور متعلقات کے حوالے سے ایک دوسرے پر فوقیت اور اولیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آخرکار کسی کو حَکَم منتخب کرتے ہیں اور اس کے فیصلے پر آمنّا و صدقنا کہتے ہیں۔ حَکَم کا بالعموم فیصلہ دونوں کے لئے قابلِ قبول ہوتا ہے۔ وہ دونوں کا میدان متعین کرتا ہے اور انہیں اپنے اپنے حدود کا مختارِ کل تسلیم کرتا ہے۔ ساتھ ہی ان دونوں کی باہمی حیثیت علّت و معلول کی ہوتی ہے۔ عنصریؔ کے بعد اسدی طوسی نے مناظرے کے فن کو اہمیت دی اور متعدد قصیدوں کی تشبیب میں اسے برتا۔ اس نے گبر و مسلمان، شب و روز، آسمان و زمین اور تیر و کمان کا مناظرہ پیش کیا۔ اسیرؔ کے موضوعاتِ تشبیب میں مناظرہ بھی شامل ہے۔ یہ مناظرے میں پورا مناظرانہ ماحول پیش کرتے ہیں۔ فریقین اپنی بات اس طور پر پیش کرتے ہیں کہ نزاع کی تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اپنی بات تسلیم کرانے کے لئے ضد میں آ کر کچھ لوگ جس جھنجھلاہٹ، جھلّاہٹ، ذہنی تشنج اور گرمیٔ سخن کے شکار ہو جاتے ہیں وہی بات اسیرؔ کے کرداروں میں بھی ملتی ہے۔ دو حریف کبھی تنگ آ کر جو مصالحانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں اور بات کو کسی طرح ختم کرنا چاہتے ہیں، اس کی بھی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ اسیرؔ کی اس انداز کی تشبیبوں میں صرف مناظرے کا فن سامنے نہیں آتا، بلکہ ان میں دلکش رزمیہ اور کامیاب افسانہ کے نشانات بھی ملتے ہیں۔

ایک تشبیب میں وہ شوخی اور حیا کا مناظرہ پیش کرتے ہیں۔ دونوں کو کسی جشن میں شرکت کرنا ہے۔ حیا نے چیلنج کیا کہ دیکھیں آج کس کی کامیابی اور کس کی شکست ہوتی ہے

شوخی حُسن سے کہتی ہے اُلجھ کر یہ حیا
سامنا آج سرِ بزم ہے میرا تیرا
دیکھوں میں آج کی تب ہوتی ہوں مغلوب کہ تو
کون پسپا ہو، ظفریاب کرے کس کو خدا
دیکھوں تو بزم نشینوں کے اڑا دیتی ہے ہوش
یا میں ہو جاتی ہوں بڑھ کر سپرِ تیغِ جفا

شوخی ان طعنوں کو کیسے برداشت کرتی۔ اس نے برجستہ جواب دیا

سُن کے شوخی نے کہا واہ رے گرمی تیری
میرے منہ چڑھنے کو آئی ہے، یہ غمزہ ہے نیا
شعلۂ حُسن چھپائے سے کوئی چھپتا ہے
برق ہو ابر کے پردے ہوں تو ہو جلوہ نما

آخرش دونوں انصاف کے گھر پہنچیں۔ فہم بھی وہاں حاضر تھا۔ اس نے ان دونوں کے مقدمے کو انصاف کے سامنے پیش کیا۔

اسی مناظرے کے دوران میں اسیرؔ نے حسنِ شان سے گریز کا حق ادا کیا ہے، وہ قابلِ داد ہے:

بحث دونوں میں ہے، سُن قصہ کہا اے انصاف
قاضیٔ وقت ہے تو زیب دہ مسندِ قضا
بات اتنی ہے کہ شوخی کو ہے شوخی منظور
ہے حیا محفلِ شادی میں طلبگار حیا
جشنِ نوکلب علی خان بہادر کے ہے گھر
ہے شبِ عقد، ولی عہد بنیں گے دولھا
قول شوخی ہے کہ اک برقِ تجلّی ہے جمال
برق کب چاہتی ہے پردہ، چمکنے کے سوا
ہوئی انگشت بدنداں یہ حیا کہتی ہے
نہیں بے باکی و گستاخیٔ بے جا کی یہ جا
اس میں جو بات کہ بہتر ہو بتا اے انصاف
کہ پئے فصل ہے دونوں نے حَکَم تجھ کو کیا

انصاف کا فیصلہ دیکھئے:

ایسے بیمار کی ہے مجھ کو عیادت واجب
رسم دنیا کی بھی ہے، رسم شریعت یک سو
کہہ کے یہ مجھ کو لیا ساتھ گیا اس کے گھر
حالت نزع میں بہتے ہوئے دیکھے آنسو

بیمار کی حالت اور تیمارداروں کی پریشانی کا کتنا فطری نقشہ اسیر نے کھینچا ہے :

طرفہ ہنگامہ تھا، موجود تھے فصاد و طبیب
کوئی سر اور کوئی بیٹھ رہا تھا زانو
کوئی یاشویہ کوئی فصد کی تدبیر میں تھا
پیس کر سر پہ لگاتا تھا کوئی مغز کدو
ایک نے تھام کے شانے کو پڑھا سورۂ حمد
لکھ کے کی یادِ علی ایک نے تعویذِ گلو
آخر کار طبیبوں کی یہ تجویز ہوئی
اور تو کچھ نہیں چلتا ہے ہمارا قابو
ہاں جو اصلی کہیں مل جائے جواہر مہرہ
نفع بے شبہ کرے فرق نہیں ہے سرِ مو

طبیبوں کی اس تجویز نے اسیر کو گریز کا کتنا لطیف پیرایہ دیدیا ہے :

مجھ سے اس آئینہ رخسار نے گھبرا کے کہا
لاؤ "سرکار" سے تم جا کے پھر دیکھوں ہر سو

اس کے بعد مدحیہ مضامین شروع ہو جاتے ہیں۔

ایک دوسری افسانوی تشبیب میں اسیر سفر کی داستان بیان کرتے ہیں۔ ان کے دل میں "اقبال" کی صورت دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ ملہم غیبی نے مشورہ دیا کہ یہ آرزو سفر سے پوری ہو سکتی ہے۔ مشورے پر عمل کرتے ہوئے یہ ایک شہر میں پہنچے رات بسر کی، صبح کو سیر و تفریح کے دوران میں ایک کمرے پر نگاہ پڑ گئی جس میں سلطانِ حسن بیٹھا ہوا تھا۔ ایک راہرو نے بتایا کہ یہی اقبال ہے۔ اسیر اُس کے پاس پہنچے اور اس طرح بات چیت ہوئی۔ بات چیت میں گریز کا بڑا قابلِ قدر پہلو اسیر کے ہاتھ آگیا ہے ۔

کمالِ خلق سے جھلا کے مجھ سے یوں پوچھا
کوئی ہنر ہے، کوئی کسب تجھ میں، کوئی کمال؟
کہا یہ میں نے کوئی اور تو کمال نہیں
کیے ہیں میں نے فنِ شعر میں بسر مہ و سال
کیا اشارہ پڑھو کچھ کہ آج ہم بھی سنیں
عروسِ معنیٔ روشن دکھائے نور جمال
کہا یہ میں نے رباعی پڑھوں کہ کوئی غزل
کہا نہیں، دلِ نازک پہ ہے گراں یہ مقال
کہا قصیدہ، کہا ہاں بشرطِ آنکہ وہ ہو
ثنا میں اس کی جو ہے حامیٔ ایزدِ متعال

اُردو قصیدے کا فخریہ حصہ شاعرانہ تعلّی تک محدود ہے۔ اسیر نے اس کے موضوع میں وسعت پیدا کی اور ایسے فخریہ مضامین قلمبند کیے جو اخلاق کردار کو جلا دینے اور قوم و ملک میں صالح اقدار پھیلانے کے کام آسکے۔ اسیر نے مدح کے موضوعات میں بھی بیش بہا اضافے کیے۔ مذہبی قصیدوں میں وہ اپنے ممدوح کی دینی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہیں اور اس طرح ان سے اثرات مرتب کرکے اپنے سامعین تک پہنچاتے ہیں۔ حضرت امام حسینؓ کے منقبتی قصیدے میں اسیر نے ان کی پوری زندگی سامنے لاکر رکھ دی ہے۔ درباری قصیدوں میں وہ ممدوح کے حوالے سے شہر اور بازار کی رونق، میلوں ٹھیلوں کا حال اور ریاست کی علمی و تہذیبی ترقی کی رفتار بیان کرتے ہیں۔ وہ مدح کو حقیقت سے قریب تر لے آتے ہیں۔ ان کے یہاں مبالغہ ہے مگر حقیقت کا تابع۔ حقیقتوں کو وہ مبالغے میں مجہول نہیں ہونے دیتے۔ ایک قصیدے میں رام پور کے میلے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ۔

ہزاروں خیمے ہیں استادہ سیکڑوں پالیں
پئے سکونت و بہرِ قیامِ خورد و کلاں
ہر ایک شہر سے آئے ہیں لوگ غول کے غول
امیر، اہلِ تمول، رئیس پیر و جواں
عجب ہجوم ہے سوداگروں کا میلے میں
کہ سائے باغ میں ملتی نہیں ہے جائے اماں

میاں و ر

کسی طرف کو ہیں چینی فروش و میوہ فروش
کہیں کیے ہوئے صراف ڈھیر اشرفیاں
مٹھائیاں ہیں وہ حلوائیوں کی پاک و لطیف
ہیں ایسے جن کے بنانے میں صرف تیرہ ماں
کبابیوں کی دکانوں کی کس سے ہو تعریف
وہ دو دانے کہ یہ کھولیں گے جس کو کام و دہاں

کہیں اکھاڑے میں کرتے ہیں پیچ کشتی گیر
کہ ٹھوک ٹھوک کے خم لڑتے ہیں جواں سے جواں

کہیں پٹے کی کسی جا ہے بانک کی کثرت
وہ جست و خیز وہ چوٹیں کہ عقل ہے حیراں

آسیرؔ نے سنگلاخ زمینوں میں متعدد قصیدے لکھے ہیں۔ ''بسر آئینہ۔ پتھر آئینہ''، ''کہن کے پاس۔ برہمن کے پاس''، ''پیدا خورشید۔ تماشا خورشید''، ''جواب قلم۔ گلاب قلم''، ''کمال دھوپ۔ مال دھوپ''، ''چلیپا شانہ۔ سراپا شانہ'' کی زمین میں بعض بعض شعر بہت برجستہ اور رواں ملتے ہیں۔ مجموعی طور پر آسیرؔ ایک بڑے قصیدہ نگار ہیں۔ جدت، تشبیب، واقعہ نگاری، افسانویت، تمثیل و رمزیہ، فن مناظرہ، لطافت گریز کے لحاظ سے ان کے قصیدوں کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔

انشا کی ۲ دو نادر کتابیں

بسلسلۂ صفحہ ۱۰

انشا کہتے ہیں کہ میں نے اس پر یہ شعر کہا۔

سن قصیدہ یہ تمہارا سید انشا نے کہا
واہ وا سو واہ وا سو واہ وا سو واہ وا

یکشنبہ ۲۳ جمادی الاخرہ

انشا نے کسی تقریب سے یہ شعر نقل کیا ہے

مرحلۂ وداع کا دارو اگر ہو کر سلام
سلسلۂ درا کو اور عالم گرد راہ کو

قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں معرکۂ وداع ہے۔[1]

مجھے یقین ہے کہ مذکورہ بالا اقتباسوں سے اس روزنامچے کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اب میں اس ادیب کا انتظار کروں گا جو زحمت اٹھا کر اس اہم علمی کام کے لیے رام پور آئے اور کتاب خانے میں بیٹھ کر اس کا ترجمہ کر دے۔

مجھے یہ بھی توقع ہے کہ اہل علم اس کتاب کے مکمل نسخے کی تلاش جاری رکھیں گے اور مجھے اپنی سعی کے نتائج سے مطلع کریں گے۔

---

[1] کلیات انشا قلمی ۱۴۳ ب مطبوعہ ۲۳۴

ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

ڈی نومارسی

کہیں پڑے نہ محبت کی مار ہولی میں
پریم دل سے کرو دل سے پیار ہولی میں
اُتارو ایک برس کا خمار ہولی میں
گلے میں ڈال دو بانہوں کا ہار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

لگا کے آگ بڑھی آگے رات کی جوگن
نئے لباس میں آئی ہے صبح کی مالن
نظر نظر ہے کنواری ادا ادا کم سن
ہیں رنگ رنگ سے سب نگہت بار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

ہوا ہر ایک کو چل پھر کے گدگداتی ہے
نہیں جو ہنستے انھیں چھیڑ کر ہنساتی ہے
حیا گلوں کو تو کلیوں کو شرم آتی ہے
بڑھاؤ بڑھ کے چمن کا وقار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

تمھیں سے پھول چمن کے تمھیں سے پھلواری
سجائے جاؤ دلوں کے گلاب کی کیاری
چلائے جاؤ رسیلی نظر سے پچکاری
لٹائے جاؤ برابر بہار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

یہ کس نے رنگ بھرا ہر کلی کی پیالی میں
گلال رکھ دیا کس نے گلوں کی تھالی میں
کہاں کی مستی ہے مالن میں اور مالی میں
یہی ہے سارے چمن کی پکار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

ملے ہو بارہ مہینے کی دیکھ بھال کے بعد
یہ دن ستارے دکھاتے ہیں کتنی چال کے بعد
یہ دن گیا تو پھر آئے گا ایک سال کے بعد
نگاہیں کرتے چلو چار یار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

برائی آج نہ ایسے رہے نہ ویسے رہے
صفائی دل میں رہے آج چاہے جیسے رہے
غبار دل میں کسی کے رہے تو کیسے رہے
عبیر اُڑتی ہے بن کر غبار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

حیا میں ڈوبنے والے بھی آج ابھرتے ہیں
حسین شوخیاں کرتے ہوئے گزرتے ہیں
جو چوٹ سے کبھی بچتے تھے چوٹ کرتے ہیں
ہرن بھی کھیل رہے ہیں شکار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

ہر اک قدم پر خوشی کا کنول کھلا کے چلو
قدم کے ساتھ نذیر آج دل ملا کے چلو
بجھے بجھے سے ہو کیوں؟ دل کو جگمگا کے چلو
نظر سے دور کرو اندھکار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

کیمیا گری و علم کیمیا - تاریخ کی روشنی میں

علی ارشاد نقوی

فن کیمیا گری (Alchemy) اتنا قدیم فن ہے کہ تاریخ بھی اس کی ابتدا سے شناسا نہیں معلوم ہوتی ہاں اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس کی شروعات تقریباً تین سو سال قبل مسیح ہو چکی تھی۔ جسے بھی پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا وہ اپنے خالی وقت میں سونا بنانے کی فکریں کیا کرتا۔ اکثر کیمیا گروں کو راتوں کو نیند نہیں آتی تھی اور اگر سوئے تو سونے کے خواب دیکھتے تھے۔ اس دور کے کیمیا گروں کو سونے کا تیار کرنا زیادہ دقت طلب نہیں نظر آتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دو ہی طریقے ہیں جن کے ذریعے وہ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ یا تو وہ عام فہم طریقوں سے ایک ایسا پتھر بنالیں، جو ادنیٰ دھاتوں کو سونے میں بدل سکے اور یا پھر اپنے میں ایسی روحانیت پیدا کریں جس سے خداؤں کو خوش کر کے سونا حاصل کر سکیں۔ کیمیا سے ایسی اکسیر اعظم بھی مراد تھی جو ایک طرف تو ادنیٰ دھاتوں کو سونے میں بدل دے اور دوسری طرف آب حیات کا کام کرے۔

قدیم مصری عقائد کے مطابق ادنیٰ دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کا راز ان کے ایک خدا ہرمیز (Hermes) کو معلوم تھا اور ان کے نزدیک کیمیا گری ہرمیز ہی کی ایجاد ہے۔ اسی باعث کچھ عرصہ تک یہ فن ہرمیٹک آرٹ (Hermatic Art) کہلایا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ معتوب فرشتے جو زمین پر اتار دیئے گئے تھے فن کیمیا گری کے بانی تھے۔ ان فرشتوں نے یہ فن ان عورتوں کو سکھایا جن سے انھوں نے شادی کی۔ توہم پرستوں کے اس نظریے سے قطع نظر کیمیا گروں میں سب سے پہلا نام یونان کے ایک عالم بولوس ڈیما کریٹوس (Bolos Demokritos) کا آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص مسیح سے تقریباً دو سو سال قبل گزرا ہے اور اس نے اپنی فزیکا (Physika) نامی ایک کتاب میں کیمیا بنانے کے کئی نسخے درج کئے ہیں مگر بیشتر اہل تاریخ اس کو ایک فرضی شخصیت ٹھہراتے ہیں لیکن اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ یونان میں کیمیا گری کا چرچا ایک صدی قبل مسیح سے بھی پہلے سے تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس وقت کی کوئی ایسی تحریر نہیں ملتی جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ کب اور کس کیمیا گر نے کن اصولوں پر کام کیا۔ اس سلسلے میں تھیبز (Thebes) میں واقع کچھ قبروں سے برآمد ہونے والی چند تحریریں ہماری کچھ رہنمائی کرتی ہیں۔ اس کے بعد مزید حالات کا ذکر یونان کے ایک مشہور مصنف زوسی مس (Zosimus) کی کتابوں میں ملتا ہے۔ زوسی مس کو خود بھی کیمیا گری اور علم کیمیا (Chemistry) دونوں میں کافی دخل تھا۔ کچی دھاتوں (Ores) سے دھاتوں کو الگ کرنے کے کافی کامیاب طریقے انھیں معلوم تھے۔ انھوں نے مختلف کتابوں میں اپنے تجربات اور مشاہدات کا ذکر کیا ہے اور بہت سی کتابیں دوسرے کیمیا گروں اور ان کے کام کے متعلق بھی لکھی ہیں۔ زوسی مس کے بعد ایک اور یونانی کیمیا گر اسٹفانو (Stephano) کا نام آتا ہے۔ مگر اسٹفانو نے خیالی گھوڑے بہت دوڑائے ہیں اور

راہِ عمل سے گریز کیا ہے۔

اگر کیمیا گری کے معنی اکسیرِ اعظم یا آبِ حیات کی ایجاد مانی جائے تو چین اس فن کا پہلا گہوارہ نظر آتا ہے۔ زدین (Dogenyen) جو تقریباً چار سو سال قبل مسیح گزرا ہے اپنے زمانے کا ماہرِ فن خیال کیا جاتا ہے۔ اس دور کے اکثر لوگ اپنی ساری پونجی اور وقت اکسیرِ اعظم تیار کرنے کی کوششوں میں صرف کر دیتے تھے اور جب ان کے پاس سرمایہ نہیں رہتا تھا تو چوری اور ڈاکے کے ذریعہ کسبِ معاش کرتے تھے۔ اس طرح جرائم کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر چین کے اس دور کے ایک شہنشاہ چنگ (Chang) نے کیمیا گری کو غیر قانونی قرار دیا۔ مگر آبِ حیات کا تعاقب کرنے والوں نے چوری چھپے اس کی تلاش جاری رکھی۔ بعد میں چین کے متعدد فرمانرواؤں نے حیاتِ جاوداں حاصل کرنے کے لئے کیمیا گری کے ذریعے اکسیرِ اعظم تیار کرنے کو جائز قرار دیدیا۔ شہنشاہ سوان (Suan) جس نے تقریباً ساٹھ سال قبل مسیح حکومت کی ہے کیمیا گری میں بہت اعتقاد رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دور کے ایک ماہرِ فن لن سیانگ (Lin Hsiang) کو پوری آزادی دے رکھی تھی کہ وہ حکومت کے خرچ پر سونا یا اکسیرِ اعظم بنانے کے تجربے کر سکتا ہے۔ مگر باوجود تمام کوششوں کے لن سیانگ ناکامیاب رہا اور پھر اسی ناکامی کی پاداش میں اس کو موت کے گھاٹ اتارے جانے کا حکم صادر ہوا۔ قدیم چین کی تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے عجیب عقائد کا اظہار ہوتا ہے۔ درحقیقت وہاں اس دور میں سونا نہیں بلکہ نقلی سونا بنانے کی کوششیں کی گئیں جو زیادہ تر بے سود رہیں۔ مگر اس سعیِ لاحاصل میں ایک مفید پہلو بھی نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ کیمیا گری کے پردے میں علمِ کیمیا (Chemistry) کی تخلیق اور ترقی ہوتی رہی۔ بہت سی دھاتوں کے خواص، ان کو حاصل کرنے کے آسان طریقے اور پھر ان سے تیار ہونے والے مرکبات کے کیمیاوی اثرات کی تحقیق نے علمِ کیمیا میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نئی راہیں کھول دیں۔ ضروریات کے مطابق بہت سے نئے آلات و اسباب بھی دریافت ہوئے۔ بہرحال، یونان اور مصر کی ترقی کا دور رخصت ہو گیا اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ آج ہم کو یہ صحیح نہیں معلوم کہ مختلف فنون میں یونان، چین اور مصر نے کہاں تک کمال حاصل کیا تھا۔

اسلام رائج ہونے کے بعد جب عرب میں علم کا چرچا پھیلا تو یونان اور مصر کی مختلف تصنیفوں کے ترجمے عربی میں ہونے لگے۔ فنِ کیمیا گری پر جو تصانیف دستیاب ہوئیں ان کا ترجمہ بھی عربی میں کر لیا گیا۔ اس قسم کی کتابوں کا ترجمہ کرنے والوں میں حنین ابن اسحٰق کا نام خصوصیت کے ساتھ آتا ہے۔ مگر عرب میں کیمیا گری کا بڑا دارومدار کوفے کے جابر ابن حیان پر ہے۔ کچھ مؤرخوں کی رائے کے مطابق جابر کی پیدائش تقریباً سات سو سال بعد مسیح بمقام طوس ہوئی۔ اس کے والد ایک دوافروش تھے جن کو بعض اختلافات کی بنا پر قتل کر دیا گیا تھا۔ جابر کی تربیت کچھ ایسے ماحول میں ہوئی تھی کہ اس کو بھی کیمیا گری اور اکسیرِ اعظم کی تلاش میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اسی توسل سے اس کی ملاقات بادشاہِ وقت خلیفہ ہارون رشید سے ہوئی۔ جابر نے خلیفہ ہارون رشید کی فرمائش پر ایک کتاب لکھی جس میں اس نے اپنے ایک اکسیرِ اعظم کا ذکر کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس اکسیرِ اعظم کے ذریعے اس نے اپنے دور کے ایک باوقار شخص یحییٰ برمکی کی ایک انتہائی خوبصورت بیوی کو جو سخت بیمار تھی چند لمحوں میں اچھا کر دیا۔ جابر ہی کا قول ہے کہ اس اکسیرِ اعظم کی حیرت انگیز تاثیر نے یحییٰ کو کیمیا گری میں دلچسپی دلائی اور یحییٰ کے بعد اس کے بیٹے جعفر برمکی نے علمِ کیمیا گری میں غیر معمولی مہارت حاصل کی۔

جابر کی جانب بے شمار کتابوں کی تصنیف منسوب ہے۔ یہ تعداد اتنی کثیر ہے کہ اکثر مورخین یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ایک شخص اتنی کتابیں لکھ ہی نہیں سکتا۔ جابر کے یہاں ایک تعجب خیز بات یہ بھی ہے کہ وہ صرف لکھنے پر ہی قناعت نہ کرتا تھا۔ بلکہ اپنے ہر نظریے کو عمل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ کیمیا گری سے متعلق تجربات کے دوران میں جابر نے جن کیمیاوی مشاہدات کو غیر معمولی جانا ان کی بابت مزید تحقیقات کر کے دیگر مفید نتائج اخذ کئے۔ اس نے بہت سی کچی دھاتوں کو صاف کرنے کے کامیاب طریقے دریافت کئے۔ جابر نے فولاد بنانے کے بھی بہت سے نسخے پیش کئے۔ شورے کا تیزاب جابر ہی کی ایجاد کہی جاتی ہے۔

وہ کپڑے اور چمڑے کو پختہ رنگوں میں رنگنے میں بھی کامیاب ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ جابر کیمیا گر کم اور ماہر علم کیمیا زیادہ تھا۔

جابر کے بعد اس کے ہم پلہ لوگوں میں فخرالدین رازی کا تذکرہ آتا ہے۔ یہ نویں صدی عیسوی میں ایران میں بمقام رے پیدا ہوئے۔ انھوں نے بغداد کے پرانے اسپتال کی تجدید کی اور رے کے اسپتال میں بھی وہاں کے اعلیٰ حکیم اور انچارج کی حیثیت سے کام کیا۔ رازی علم طب کے ماہر ہونے کے علاوہ ایک مشہور کیمیاگر اور ایک کامیاب ماہر علم کیمیا گذرے ہیں۔ کیمیاگری کے تجربات کے باعث ان کو تقطیر (Distillation) اور قلم پذیری (Crystallization) وغیرہ کے نئے اور زیادہ مفید طریقوں سے اچھی واقفیت ہوگئی اور اسی وسیلے سے ان کو بہت سی کیمیائی دھاتوں سے بھی آگاہی ہوئی۔ رازی نے جن آلات واسباب کا استعمال اپنے تجربوں میں کیا ہے ان سے پچھلے کیمیا گر قطعاً ناواقف تھے۔ بلکہ حیرت یہ ہے کہ آج کل جو آلات علم کیمیا کی تعلیم گاہوں میں کام آتے ہیں ان میں بہت سے ایسے ہیں جو جابر اور رازی کے ایجاد کردہ آلات کے نمونوں پر بنے ہیں۔ ماہر علم طب ہونے کی حیثیت سے رازی نے لاتعداد پودوں کے عرقیات سے بھی کام لیا ہے۔ آج یہ عرقیات علم طب اور علم کیمیا دونوں پر چھائے ہوئے ہیں۔

اس سلسلے میں ایران کے ایک قابل حکیم ابومنصور کا ذکر بھی انتہائی ضروری ہے۔ اس کی بہت سی ایجادات قابل قدر ہیں۔ پلاسٹر آف پیرس (Plaster of Paris) جس کو سانچے میں ڈھال کر چھوٹی چھوٹی مورتیں اور دوسری حسب ضرورت اشیاء بناتے ہیں ابومنصور ہی کی دماغی کاوشوں کا پھل ہے۔ سنکھیا کے مہلک اثرات سب سے پہلے ابومنصور ہی نے دریافت کئے۔ علاوہ بریں تانبے نیز دوسری دھاتوں کی کیمیاوی اصول پر تحقیق اور اس کے مفید نتائج کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔

اس دور میں کیمیا گروں کے ساتھ ساتھ عوام اور حکمراں بھی اکثر فن کیمیاگری کی مدد سے سونا بنانے میں کوشاں رہتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ موقع سے فائدہ اٹھانے والے دھوکے باز بھی اپنا کام کر جاتے تھے۔ دمشق میں اسی قسم کے ایک چالباز نے سونے کے برادے کو آٹے اور گوند وغیرہ کے ساتھ گوندھ کر اس کی گولیاں بنائیں اور درویش کا بھیس بدل کر ان گولیوں کو ایک فرضی نام سے ایک عطار کے ہاتھ بیچ دیا۔ کچھ عرصہ روپوش رہنے کے بعد اس نے امیرانہ لباس پہن کر ایک مسجد میں جانا شروع کیا اور معتقد لوگوں پر یہ ظاہر کیا کہ وہ کیمیا بنانا جانتا ہے۔ یہ خبر رفتہ رفتہ حاکم وقت تک پہنچی اور اس کی طلبی دربار میں ہوئی جہاں اس کو فن کیمیاگری کے مظاہرے کا حکم ہوا۔ یہ تو اسی کا منتظر تھا فوراً ایک نسخہ لکھ کر پیش کیا جس کا ایک جزو خاص سونا ملی ہوئی وہی فرضی شے تھی جو یہ عطار کے ہاتھ پہلے ہی فروخت کر چکا تھا۔ حکم شاہی صادر ہوتے ہی اور اشیاء تو آسانی سے جلد ہی مہیا کر لی گئیں مگر وہ فرضی چیز بڑی دقتوں سے دستیاب ہوئی کیونکہ وہ تو صرف ایک ہی عطار کے پاس تھی۔ جب یہ فرضی شے جس میں سونے کا برادہ گندھا ہوا تھا ہاتھ آ گئی تو اس فریب دہندہ نے اسے نسخے کے دوسرے اجزا کے ساتھ ملا کر سر دربار گرم کیا جس سے اس کا سونا پگھل کر الگ ہو گیا۔ حاکم وقت ششدر رہ گیا اور اس شخص کو بے حد انعام و اکرام دیئے جن کو پاکر وہ غائب ہو گیا۔

بہر حال اس قسم کی خام خیالیاں جلد ہی ختم ہوگئیں اور دسویں صدی کے اختتام پر ایک دور ایسا آیا جب توجہ علم کیمیا کی طرف مبذول ہونے لگی۔ اس نئے شعور کے محرک بخارا کے ایک بہت بڑے حکیم اور صاحب علم بوعلی سینا تھے۔ بوعلی سینا نے کیمیاگری اور علم کیمیا دونوں ہی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ان کی قابلیت اور طبی معلومات نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ بوعلی سینا کی شخصیت ہر دور اور ہر اہل علم کے لئے قابل فخر ہے۔ انھوں نے سینکڑوں غلط نظریوں کو رد کیا اور وہی شاید پہلے شخص تھے جنھوں نے یہ اعلان کیا کہ دوسری دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان دھاتوں کے اجزائے ترکیبی تبدیل کر دیے جائیں لیکن ان کی نوعیت بدل دینا دشوار ہی نہیں بلکہ بہت بڑی حد تک ناممکن ہے۔ یہ اعلان کیمیا گروں کے لئے مایوس کن تو ضرور تھا مگر اس سے بڑا فائدہ یہ

ہوا کہ کیمیا گری کے نام پر جو وقت اور دولت برباد ہو رہی تھی اس سے لوگوں کو نجات مل گئی۔

رفتہ رفتہ عرب میں بھی علوم کا چرچا کم ہونے لگا اور دوسرے ملک حصول علم کی طرف راغب ہوئے۔ عربی میں لکھی ہوئی کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں ہونے لگے۔ ترجمہ کرنے والوں میں پہلا نام انگلستان کے ایک صاحب علم رابرٹ کا آتا ہے جس نے کیمیا گری کی پہلی عربی کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا۔ اس کے بعد اور بہت سی عربی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اٹلی کے ایک باشندے جرارڈ (Gerard) نے تقریباً ٧٥ عربی کتابوں کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا۔ ان کتابوں میں جابر۔ رازی اور بوعلی سینا کی تصنیفات بھی شامل ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب کیمیا گری اور علم کیمیا دونوں کا ماحول بدل رہا تھا۔ پھر ماحول کے ساتھ ساتھ ان کا چولا کیوں نہ بدل جاتا۔ چنانچہ بہت سے عربی الفاظ کو لاطینی زبان کے سانچے میں ڈھالا گیا۔ الکیمیا "الکیمی" (Alchemy) میں بدل گیا۔ الکحل" الکوہل" (Alcohol) ہوگیا اور الاکسیر" الکزر" کہلایا۔ اس دور میں عربوں نے کیمیا گری قریب قریب ترک کر دی تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ وہاں کیمیائی تحقیق بھی پس پشت ڈال دی گئی تھی۔ مگر عربی کتابوں کے ترجموں نے دوسرے ملکوں میں کیمیا گری کی وبا پھیلا دی۔ البتہ ان ملکوں کی کیمیا گری توہمات سے بھی منسلک تھی اور تیرھویں صدی عیسوی کے بیکن (Bacon) جیسے روشن خیال توہم پرستی کا شکار بنے ہوئے تھے۔ اس نے کیمیا گری کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک خیالی (Speculative) کیمیا گری اور دوسری عملی (Operative) کیمیا گری۔ مگر ان دونوں اقسام کی کیمیا گری کو علم کیمیا سے کسی قسم کا لگاؤ نہ تھا۔ بیکن نے خود تحریر کیا ہے کہ انھوں نے قریب قریب ڈیڑھ لاکھ زر کیمیا گری کی نذر کیا مگر سب بے سود۔

تیرھویں صدی کے یورپ کے کیمیا گروں میں خصوصیت سے ولانووا کے آرنالڈ (Arnold of Villanova) کا نام آتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر قسم کی سائنس میں تجربہ گاہوں اور تجربات کی ایک خاص اہمیت ہے جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ مگر توہم پرستی اس کے یہاں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ مختلف تجربوں کے مشاہدات سے اس نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ اکثر جگہوں پر مضحکہ خیز ہو گئے ہیں۔ ہاں اگر مشاہدات کی تشریح کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کے تجربات کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اس کا ایک کارآمد تجربہ انسانی خون کا تجزیہ تھا۔ یہ تجربہ تو ہمارے لئے ایک نئی اور مفید راہ عمل تجویز کرتا ہے مگر اس کی جو تشریح آرنالڈ نے پیش کی ہے وہ کوئی معنی نہیں رکھتی۔

یورپ کے دوسرے کیمیا گروں میں پیراسلوس (Paracelsus) کا ذکر بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ پیراسلوس نے کیمیا گری کے اصولوں کی مدد سے مختلف دوائیں تیار کرنے کی مفید تجویزیں پیش کیں اور ان کو عملی طور سے ثابت کرنے میں اکثر کامیابی حاصل کی۔

یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح انگلستان میں بھی کیمیا گری کے شیدائی گزرے ہیں۔ انگلستان کے ایک پرانے شاعر اعظم چاسر (Chaucer) نے اپنی ایک نظم میں بالتفصیل اس فن کا ذکر کیا ہے۔ انگلستان کے کیمیا گروں میں جارج ریپلے (George Ripley) اور کیلی (Kelly) وغیرہ کا نام خاص طور سے آتا ہے۔ مگر یہ لوگ اپنی کیمیا گری کی تحقیق کے دوران میں علم کیمیا کی کوئی خدمت نہ کر سکے۔ اس کے برعکس دور قدیم کے ہندوستان کے متعدد ماہر علوم مثلاً چانسٹرک اور شسرت وغیرہ جن کو کچھ لوگوں نے کیمیا گر بھی سمجھا ہے کیمیا گری سے تو زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے مگر علم کیمیا کو ان سے بہت فیض پہنچا۔

حقیقت یہ ہے کہ کیمیا گری کے در پردہ عرصے تک علم کیمیا ترقی کرتا گیا مگر پھر علم کیمیا گری کے مایوس کن نتائج نے اس کی دلکشی کو ختم کر دیا۔ دوسری جانب علم کیمیا کے امید افزا مستقبل نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اب کیمیا گروں اور علم کیمیا کے ماہرین کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔ کیمیا گری سونا بنانے کی ناکام کوششوں تک محدود رہ گئی مگر علم کیمیا ترقی کی لامحدود وسعتوں میں پھیل گیا اور آج بھی ترقی پذیر ہے۔ ابھی تک کوئی اس کی حدیں قائم نہیں کر سکا اور شاید نہ کر سکے گا۔

نذرِ مومنؔ

عرشؔ ملسیانی

کبھی خنداں کبھی گریاں کبھی حیراں ہوں گے
عاشقی ہے تو بہ ہر رنگ نمایاں ہوں گے

گھر نہیں در نہیں کیا بس گے وطن میں جا کر
میزباں ہوتے جہاں اب وہیں مہماں ہوں گے

بدنصیبی میں کہاں خوابِ عدم کی راحت
کل بھی ہم ساتھ ترے رات شبِ ہجراں ہوں گے

جن کے دامن کو نہیں چھوڑتے اہل دنیا
ہو نہ ہو آپ ہی کے بستہ داماں ہوں گے

خاک ہو جائیں گے اور خاک بھی اڑ جائے گی
زندگی ہے تو بہت کارِ نمایاں ہوں گے

ہم نے ایمان کو پالا ہے برونِ مسجد
اور ہوں گے وہ جو مسجد کے مسلماں ہوں گے

یاد آ جائے اگر ان کی دلِ ویراں میں
پھر تصور میں گلستاں ہی گلستاں ہوں گے

فرشِ خاکی پہ بہت عرشؔ سنایا ہے کلام
مہ و مریخ پہ اب جا کے غزل خواں ہوں گے

✡

پنجاب کے لوک ناچ

شاکر ہما سارتھی

حسلزہ ناچ کا ایک منظر

ڈنکن نے کہا ہے کہ رقص انسانی جسم کے حسن و تقدس کا علم ہے اس قول میں شبہ نہیں مگر یہ اس رقص پر صادق آتا ہے جو فنی لحاظ سے ترقی یافتہ اور مکمل ہو لوک ناچوں کے ضمن میں ہمیں اس قول کو اور وسعت دینا ہوگی۔ کیوں کہ وہ فن کے لحاظ سے نہیں، جذبات و احساسات کے والہانہ اور بے ساختہ اظہار کے لحاظ سے انسانی جسم کے حسن و تقدس کا علم ہی نہیں بلکہ ایک فطری عمل ہونے کے ساتھ ساتھ قومی کردار اور روح کا علم بھی ہے۔

ہر ملک کے لوک ناچ اور لوک گیت وہاں کے عوام کے سادہ اور معصوم جذبات کا اظہار ہوتے ہیں۔ ان ناچوں کی خاموش حرکات اور گیتوں کے رسیلے بولوں میں لوگوں کی امنگیں، فتح مندیاں، ناکامیاں، ہجر و وصال، جنگ و جدال، خوشیاں اور رنجوریاں سموئی ہوتی ہیں دیہاتی عوام ان گیتوں اور ناچوں کے خود ہی مصنف، موجد اور فنکار ہوتے ہیں اس لئے یہ ان کے کردار کی براہ راست ترجمانی کرتے ہیں۔ ثقافت کے ان آئینوں میں لوگوں کی بے ساختگی، بے تکلفی، سادگی اور پاکیزگی جھلکتی ہے ان لوک ناچوں کے ایک ایک پرن، ایک ایک چکر اور ایک ایک بھاؤ میں فطرت کی استادی اور عوام کی روزمرہ زندگی کی رہنمائی کی چھاپ ہوتی ہے۔ اپنی محنت کی کمائی کو دیکھ کر جھوم اٹھنا، مقابل پر فتح حاصل کرکے والہانہ ناچنا، خوشی کے موقعوں پر اچھلنا، پھاندنا، جھومتی گھٹاؤں اور امنڈتے بادلوں کو دیکھ کر لہرا جانا، فطری حرکات ہیں اور انہیں کے تار و پود سے لوک ناچ بنے ہیں۔

دوسرے مقامات کے لوک ناچوں کی طرح پنجاب کے مشہور لوک ناچ بھنگڑہ، کِکلی، گِدّا، لڈّی، سمّی اور جھمر (گھمر) بھی عوام کے معصوم اور پرخلوص جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں مسرت، فتحمندی، کامرانی اور چاہت کے علاوہ یہ ناچ نفرت، طنز اور مظلومیت کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔

بھنگڑہ، کِکلی اور گِدّا مشرقی پنجاب کے مقبول اور مشہور لوک ناچ ہیں۔ لڈّی، سمّی اور گھمر مغربی پنجاب کے جانگلی اور پوٹھوہاری علاقوں میں مقبول اور مروّج ہیں۔ لڈّی، سمّی اور گھمر مشرقی پنجاب میں نہ تقسیم سے پہلے مقبول ہو سکے اور نہ بعد میں مغربی پنجاب کے ہزاروں کی تعداد میں مہاجرین کی آمد کے بعد۔ بھنگڑہ، تقسیم سے پہلے صرف

ضلع گورداسپور اور بٹالہ کے علاقہ میں ہی ناچا جاتا تھا۔ تقسیم کے بعد وہ مشرقی پنجاب کے دیگر اضلاع میں بھی کافی مقبول ہو گیا۔ زیر نظر تصویر میں مشرقی پنجاب کے کسانوں کے گدا ناچوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

بھنگڑہ

بھنگڑہ پنجاب کا مقبول ترین لوک ناچ ہے جو فتح مندی اور کامرانی کے اظہار کے لئے عام طور پر ناچا جاتا ہے۔ اس کا انداز بڑا فطری بے ساختہ اور والہانہ ہوتا ہے۔ اس رقص کے جوش و سرمستی کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اسے فن کے طور پر ناچا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی بناوٹ اور تکلفی فن کاری نہیں ہوتی۔ ناچنے والا بغیر کسی تمہید اور اہتمام کے مجمع کو چیرتا ہوا ڈھولیئے کے سامنے آجاتا ہے اور بے تکان ناچنا شروع کر دیتا ہے دیکھنے والوں میں بیشتر لوگ اس کے نام اور گاؤں تک سے واقف نہیں ہوتے۔ مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی اس کے لئے یہی کیا کم ہے کہ امسال اس نے میلے میں دوسرے گاؤں کے سب گبرو جوان کی کلائی مروڑ دی ہے۔ یا اس برس گندم کی سنہری بالیوں نے اس کے کھلیانوں میں سونا اگل دیا ہے۔ ڈھول کی چوبوں کی ایک ایک ضرب اس کے امڈتے ہوئے جذبات کو مہمیز کرتی ہے اور وہ از خود ناچ اٹھتا ہے۔

بھنگڑہ عام طور پر ڈھول کی سنگت میں ناچا جاتا ہے اسے بیشتر کہروا اور جھومر تال میں ناچتے ہیں یہ دونوں تال چار چار ماتروں کے ہیں۔ جھومر تال زیادہ نشاط انگیز اور چلنت ہوتا ہے۔ خوشی کے اظہار کے لئے یہ بہترین تال ہے۔ اسی لئے یہ تال بھنگڑہ کے لئے مغربی پنجاب کے راول پنڈی ڈویژن میں برتا جاتا ہے اور مشرقی پنجاب میں یہ عام طور پر کہروا تال میں 'نا دھن دھن نا۔ نا دھن دھن نا' کے بولوں سے ناچا جاتا ہے۔ اگر ان تالوں کو تین چکروں میں ختم کریں تو یہ بارہ ماتروں کا ایک تال بن جاتا ہے لیکن ناچنے والے اس کا اتنا خیال نہیں رکھتے۔ وہ ہر چار ماترہ کی ضرب پر پاؤں سے 'سم' بتاتے چلے جاتے ہیں۔ فنی طور پر یہ کہروا یا جھومر تال ہی کہلاتا ہے۔

بھنگڑہ ناچنے کے لئے وقت موسم اور مقام کی کوئی قید نہیں میلوں ٹھیلوں میں چاندنی راتوں میں گاؤں کے کھلے میدانوں میں، بارات کے جلوس کے آگے یا پیر کے مزار کی زیارت کو جاتے ہوئے راستے میں بھنگڑہ ہی پنجاب کے زندہ دلوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ عام طور پر گندم کی فصل کو کاٹنے کے بعد چونکہ گاؤں والوں کو فرصت اور ذہنی فراغت میسر ہوتی ہے اس لئے وہ کسی نہ کسی طرح اپنا خالی وقت ہنسی، کھیل، ناچ، کود اور گا بجا کر گذارنا پسند کرتے ہیں یہ میلوں ٹھیلوں میں دیہات کی ثقافت اپنے بھرپور روپ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ دور دراز کے گاؤں میں کسی پیر کے مزار پر نیاز چڑھانے کی غرض سے لوگ جلوس کی صورت میں رنگ برنگ کے پھریرے لہراتے جوق در جوق امنڈ پڑتے ہیں۔ ان دنوں کھلے کھیتوں کی ہانپتی پگڈنڈیاں دلہن بن جاتی ہیں۔ ڈھول کی سنگت میں شہنائی پر کوئی لوک دھن بجتی ہے اور دو تین منچلے اپنی رنگین پگڑیوں کو دوپٹے کی صورت میں دونوں ہاتھوں میں تھامے سر سے اوپر لہراتے جاتے ہیں اور ڈھول کی تال پر بھنگڑہ ناچتے ہوئے آگے

بڑھتے ہیں۔ جلوس کے لوگ ان کی رہنمائی میں شہنائی کی دھن پر کورس میں لوک گیت گاتے ہوئے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ بھنگڑہ ناچنے والے چار چار ماترؤں کی ضرب پر بل کھا کھا کر دائیں پاؤں کی چاپ سے 'سم' دکھلاتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور پھر بائیں پاؤں کی ایڑی پر گھومتے ہوئے 'خالی' دے کر پھر 'سم' سے دایاں پاؤں زمین پر پٹختے ہیں۔ جب وہ تھک جاتے ہیں تو دوسرے تازہ دم اشخاص ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ غرض منزل آنے تک یہ سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا اور دور دراز کا سفر اس طرح آسان اور پر لطف بن جاتا ہے۔

بھنگڑہ ناچنے کا یہی انداز بارات کے جلوس میں بھی دکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی گاؤں کے کھلے میدان میں تفریح کے طور پر بھنگڑہ کی محفل ایک دائرہ کی شکل میں جمتی ہے۔ آغاز میں ڈھول کی ضربوں پر ناچنے والے مسرت کے اظہار کے لئے بغلیں بجاتے ہوئے جسم کو حرکت دیتے ہیں۔ یکایک کوئی جوشیلا نوجوان مجمع کو چیر کر دائرہ کے بیچ میں آجاتا ہے۔ تالیاں بجنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ڈھول کی ضرب تیز ہو جاتی ہے اور وہ بے قابو ہو کر ناچنے لگتا ہے۔ اس کے انگ انگ میں بجلیوں کی تڑپ بھر جاتی ہے۔ اس کا رواں رواں رقص کرتا ہے، نس نس پھڑکتی ہے، حتیٰ کہ وہ تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ اور جب اس طرح اس کے جذبات کو سکون مل جاتا ہے تو وہ ڈھولئے کو انعام دے کر تماشائیوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

بھنگڑہ ہے تو مردانہ ناچ، لیکن اس کی یہ خاصیت قابل غور ہے کہ اس میں جو گیت گائے جاتے ہیں وہ عام طور پر نسوانی جذبات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ ڈھولا گیت، ہجر و وصال کے تذکرے، محبوب کی بے وفائی کے شکوے اور پنجاب کی رومانی داستانوں کے اقتباسات ان لوک گیتوں کا موضوع ہوتے ہیں۔ کچھ سال پہلے عام طور پر شہروں میں بیساکھی پر بڑا ہڑ بونگ قسم کا بھنگڑہ ناچا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ بات نہیں رہی اور شاید اسی باعث شہروں کے بھنگڑہ میں اب وہ رونق نہیں رہی۔ ڈھولا گیتوں کے علاوہ کوئی سا چلتا ہوا لوک گیت یا پھڑکتا ہوا تھُم جو اس البیلے رقص کا ساتھ دے سکے کورس میں گایا جاتا ہے۔ بھنگڑہ میں آج کل کافی کثیر یونٹ ہو رہی ہے۔ رقص میں حسن پیدا کرنے کے لئے شہروں میں اسے زیادہ فن کارانہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اسے بھی سوشل تقاریب پر ناچا جانے لگا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر بھنگڑہ بیساکھی یعنی بھری پُری اور گندم کی فصل کا ناچ ہے۔ جس میں گندم کی بالیوں کا لہراؤ، پہاڑوں کا اتار چڑھاؤ اور دانوں کی چھان پھٹک کی لے ہوتی ہے۔

ککلی

یہ ناچ دراصل کنواریوں کا ناچ ہے۔ اس ناچ میں دو دو لڑکیاں بالمقابل کھڑی ہو جاتی ہیں اور قینچی بنا کر ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لیتی ہیں۔ پھر ایڑیاں زمین میں گاڑ کر پاؤں کے پنجے آپس میں جوڑ لیتی ہیں۔ جسم پیچھے کی طرف تان لیتی ہیں۔ اور متوازن ہو کر ایڑیوں پر گھومتی ہیں۔ یہ ناچ ایک طرح کا کھیل بھی ہے اور ورزش بھی۔ اس رقص کے ساتھ ساتھ نیم مترنم آواز میں جاندار اور طربیہ گیت بھی گائے جاتے ہیں۔ گیت کے ایک ایک مصرعہ کے اختتام پر ککلی کا ایک ایک چکر پورا ہوتا چلا جاتا ہے۔

ککلی کلیر دی   پگ میرے ویر دی

دوپٹہ میرے بھائی دا   پھٹے منہ جوائی دا

(یہ چہک مہک کلیروں کی وجہ سے ہے۔ پگڑی یعنی شان اور عزت میرے بھائی کی ہے۔ اور دوپٹہ بھی میرے بھائی کو زیب دیتا ہے۔ جوائی کے نام پر پھٹکار) یہاں جوائی کے نام پر پھٹکار شاید قافیہ کی وجہ سے ڈالی گئی ہے۔ ورنہ جوائی کا منہ پھٹکارنا بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اس کا احترام تو سارے گاؤں پر لازم ہوتا ہے۔

ککلی کے گیتوں میں اس کے علاوہ ساس، بہو کی عداوت اور نندبھاوج کے جھگڑوں کا ذکر بھی معصوم ہونٹوں سے بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

گدا

یہ ایک ایسا ناچ ہے جو مختلف موقعوں پر مختلف احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ مشرقی پنجاب میں بعض موقعوں پر گدا مرد بھی ناچ لیتے

ہیں لیکن بنیادی طور پر گدّا صرف لڑکیوں مٹیاروں کا ناچ ہے۔ ایسی لڑکیاں جو ابھی ابھی سنگلی کی معصوم فضا سے نکل کر جوانی کے کٹہرے میں قدم رکھ رہی ہوتی ہیں "کِکلی" ناچتے وقت ان کے معصوم ہونٹوں پر "سنے میری باہنہ مروڑی، جھنکے میرا چوڑا" جیسے بول تھرتھراتے تھے لیکن اب وہ اس گیت کی معنویت سے لجاتی اور جھینپتی ہوئی ناچتی ہیں۔ جوان خون اور رگ پٹھوں کی تازگی کو صرف کِکلی سے تسکین نہیں ہوتی اس لئے وہ باقاعدہ رقص سے اپنے اعضا کی پرورش کرتی ہیں۔

گدّا ناچتے وقت سب لڑکیاں ایک دائرے کی صورت میں کھڑی ہو جاتی ہیں ایک اچھی آواز والی لڑکی گیت کے بول اٹھاتی ہے اور باقی سب اس کے پیچھے پیچھے کورس میں یہ بول دہراتی چلی جاتی ہیں۔ گیت کی لے عموماً کہروا یا جھومر تال ہوتی ہے۔ وہ اسی لے پر پہلے چٹکیاں بجاتی ہیں پھر اپنے دائیں طرف کی ہم رقص کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر سم کی تالی بجاتی ہیں۔ گویا چٹکی پر خالی اور تالی پر سم کی ضرب ظاہر کرتے ہوئے وہ رقص کی لے قائم کر لیتی ہیں اور گیت کے ایک ایک بول میں تال کا ایک ایک چکر بنتا چلا جاتا ہے، چاہے وہ چار ضربوں میں ختم ہو یا تین ضربوں میں۔ یہ گیت کی بحر پر منحصر ہے۔

گدّا میں جوش و خروش کم ہوتا ہے۔ رقص کا چاؤ اور گیت ہی اس کی رونق کو دوبالا کرتے ہیں۔ گدّا کے گیتوں میں بھائیوں سے دلار، ماں سے ہمدردی، ساس، نند سے نفرت، کاہل اور نکھٹو (بیلی) خاوند یا ماہی کے خلاف طنز پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان گیتوں میں آج کے سماج میں مفلس گھرانے کی لڑکی کی بے بسی بھی سسکیاں لیتی ہے۔ بے جوڑ شادیوں کے خلاف بغاوت آمیز طنز کے نشتر ان لوک گیتوں میں ہی ملتے ہیں۔

اس ناچ میں ایک لڑکی دائرہ کے درمیان میں کھڑی ہو کر گیت کے بول شروع کرتی ہے۔ آخری بول پر باقی سب لڑکیاں بار بار اسے دہراتی ہوئی تالیاں پیٹتی ہیں۔ بیچ بیچ میں کوئی منچلی دائرہ میں کھڑی ہوئی اپنی جگہ پر گھوم گھوم کر زور زور سے تالیاں بجاتی ہے اور ساتھ ہی منہ سے "بھوں بھوں" کی آواز نکالی جاتی ہے۔ گدّا ناچ کے اس انداز میں عموماً وہ بولیاں گائی جاتی ہیں جو ضلع لدھیانہ اور فیروزپور کے علاقہ میں خاص طور پر رائج اور مقبول ہیں۔

ذیل کا گیت دیکھئے اس میں بدچلن خاوند کی حرکات کے خلاف ایک احتجاج بلند کیا جاتا ہے۔ بےچاری عورت اپنی ساس کے پاس خاوند کی شکایت کرتی ہے کہ "میں اسے کچھ سمجھائے بجھائے، میں تو ہار گئی ہوں۔ ظالم! روز شراب پیتا ہے۔ افیم کی ڈلیاں کھاتا ہے، اپنی حسین عورت کو چھوڑ کر جھیور کی بیوی کے عشق میں مبتلا ہے اس کے چلن اچھے نہیں ہیں اور یہ عشق کا روگ تو بہت برا ہے۔ اس میں تو چھت پر چڑھنے کے لئے زینے تک کی پروا نہیں رہتی:-

سمجھالے سسے اپنے پُت نوں
نت ٹھیکے ایہہ جاندا
بھر بھر پیوے جام پیالے
فیم بُرکے کھاندا
گھر دی شکر بورے ورگی
گڑ چوری دا کھاندا
گھر دی نار برچھے ورگی
ست مہری دے جاندا
لگیا عشق برا
بن پوڑی چڑھ جاندا۔ لگیا عشق بُرا!!

اب گدّا کا ایک اور روپ ملاحظہ کیجئے۔ ناچ کا انداز وہی ہے مگر چال بدل جاتی ہے۔ اس میں شوخی اور طنز کے نشتر چلنے لگتے ہیں۔ کہروا کی تیز لے (ٹھگن) میں گیت شروع ہوتا ہے اور ساتھ ہی رقص بھی۔ تالی کے لئے جب ہاتھ اٹھتے ہیں تو درمیانی انگلیاں پھن والے سانپ کے ڈنک کی طرح باہر نکل کر طنزیہ بھاؤ بتاتی ہیں۔ گویا ناچنے والیاں کسی کو طعنہ دے رہی ہوں۔ پنجابی میں اس اشارہ کو "مُسری ہونا" کہتے ہیں۔ اوپر کے گیت میں بدکردار شوہر کی شکایت تھی مگر اس گیت میں شوہر کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ اور ساتھ ہی ساس سسر پر تبصرہ بھی ہوتا ہے۔ دیکھئے گیت کے الفاظ اور ان کے

آہنگ میں کتنا طنز ہے۔

بھیڑا کھنگدا رہندا کھئیں کھئیں کھئیں
میری ایس گلّے تاں بندی نہیں
نتّی نتّی سنیارے کول جاندی آں
ماہیے لئی میں چھاپ گھڑائی آں
بھیڑا کہّے مرینا کھئیں ٹھئیں ٹھئیں
سس میری مندی نے ساہورا بھیڑا
بنّا نکھٹو ہڈیاں دا کاڑھا
گلاں گزیندا ہئیں ہئیں ہئیں
میری ایس گلّے تاں بندی نہیں

(میری تو جان عذاب میں ہے۔ وہ (خاوند) ہر وقت کھئیں، کھئیں، کھانستا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے میری اس سے نہیں بنتی۔ میں دوڑ کر سنار کے پاس (ماہی کو تحفہ دینے کے لئے) انگوٹھی بنوانے گئی۔ (ظالم کو پتہ چل گیا) اس نے مجھے ٹھئیں، ٹھئیں گھونسوں سے پیٹ ڈالا۔ اسی لئے میری اس سے نہیں بنتی۔ ساس اور سسر دونوں بُرے ہیں۔ اِدھر خاوند نکھٹو ہے۔ میں تو بڑی مشکل میں پھنسی ہوں۔ وہ ہئیں، ہئیں کر کے یاوہ گوئی کرتا۔ اس لئے میرا اس سے نباہ نہیں ہو سکتا)

نکھٹو اور بدکردار خاوند کے خلاف احتجاج اور طنز کے علاوہ ساس کے جبر و تشدد کے خلاف گِدّا کے گیت بھرے ہوئے ہیں۔ الھڑ اٹھتی جوانیاں معاشرہ اور اپنے ماحول کی گھٹن کا پوری طرح تجزیہ نہیں کر سکتیں۔ اس لئے وہ اس کی تنگ نظری کے لئے ساس کو قصوروار ٹھہراتی ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ کل جب وہ خود ساس بنیں گی تو یہی گیت ان کی بہوئیں ان پر بھی چسپاں کریں گی۔

لوک گیتوں اور لوک ناچوں پر علاقائی مزاج کا اثر ہوتا ہے۔ بعض گیتوں میں مہاجر عورتوں اور لڑکیوں کی جری طبیعتوں کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ ٹسوے بہانا نہیں جانتیں۔ بلکہ ساس کے جبر و جور کے ردِعمل کے طور پر اس کے مدمقابل ہو جاتی ہیں۔

بارہیں برسیں کھٹن گیا سی کھٹ کے لیائیا ناکھاں
جنے کولوں ڈردی آں نہیں تے بھنّا سسو دیاں کھاکھاں

(شوہر کا ڈر نہ ہو تو میں اس ظالم ساس کے کلّے توڑ کے رکھ دوں)

گِدّا کا ایک اور مزاحیہ گیت بہت مقبول ہے لڑکی ایک بڈھے کھوسٹ اور کوتاہ قامت دولہا پر طنز کے ساتھ ساتھ بابل سے گلہ کرتی ہے کہ اس نے اس کے لئے کیسا بر ڈھونڈا ہے۔ اسے دیکھ کر تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہے اور اس کی جوانی جھلس گئی ہے۔ گیت کے بول ہیں۔

بابلا دے ورد نوٹی بڈھڑا میں نہ بہادے۔ ہائے۔ ہائے
بڈھڑا میں نہ بہادے
سیاں دے وچہ کھیڈن گئیاں کھبتوں اُڑدا آدے
بڈھڑا میں نہ بہادے
بیاں دے وچہ کھیڈن گئیاں چُلیے پیچھے چلیری اے
بیتا سڑیا بھوچھن سڑیا سڑی جوانی میری اے
بابلا ور کے دتوڑی ...

مغربی پنجاب کے ناچ

مندرجہ تینوں ناچ مشرقی پنجاب سے مختص ہیں جیسا کہ بتایا گیا ہے جھمّر، لڈی اور سمّی ناچ مغربی پنجاب کے لوک ناچ ہیں مشرقی پنجاب میں نہ تو یہ کبھی ناچے گئے ہیں اور نہ ادھر مقبول ہیں سچی بات تو یہ ہے کہ جھمّر، لڈی اور سمّی ناچ دراصل مغربی پنجاب کے جنگلی علاقوں کے مزاج کے مطابق ہیں۔ بہر حال، ذیل میں تینوں ناچوں کو بھی مختصر الفاظ میں متعارف کیا جاتا ہے۔

جھمّر۔ یہ رقص ساندل بار اور جھنگ کے علاقہ کا مخصوص ناچ ہے جو چاندنی راتوں میں یا مشعلوں کی روشنی میں ناچا جاتا ہے۔ اسے ڈھولئے کے گرد گھیرا بنا کر ناچتے ہیں۔ ڈھولیا جھومر تال پر چوب کی ضربیں دیتا ہے۔ ناچنے والے حرکت میں آتے ہیں اور آہستہ آہستہ لہرا لہرا کر چلتے ہوئے جوش میں آجاتے ہیں۔ اس کے ساتھ 'بار' کے علاقہ میں کبھی کبھی ڈھولے گائے جاتے ہیں۔ یہ رقص مردانہ رقص ہے۔

بقیہ مضمون صفحہ ۳۲ پر

ہندوستان اور لنکا۔ ایک سفر کے تاثرات

سرتاب چند آزاد

اترپردیش کے اراکین مجالس قانون ساز کا ایک وفد ۲۲ جنوری ۱۹۶۰ء کو لنکا گیا۔ میں اس پارٹی کا لیڈر تھا۔ ہم لوگ مدراس سے پاسپورٹ وغیرہ حاصل کرنے کے بعد سیدھے منڈپم کیمپ پہنچے۔ جہاں ہندوستان اور سیلون گورمنٹ کے نمائندوں کے کیمپ ہیں اور جو پاسپورٹ اور ڈاکٹری معائنہ کرنے کے بعد لنکا کے لئے جہاز پر بیٹھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ہندوستانی افسر تو صرف پاسپورٹ کی جانچ کرنے کے بعد ہی اپنا سرٹیفکٹ عطا کر دیتے ہیں مگر لنکا کے سرکاری نمائندے پاسپورٹ کے علاوہ ہیلتھ سارٹیفکٹ کو بھی کافی اہمیت دیتے ہیں۔ خصوصاً چیچک اور کالرا کے ٹیکوں کے سارٹیفکٹ کا بہت غور سے مطالعہ کرتے ہیں۔ کسی بھی ہندوستانی کو خواہ وہ کسی عہدے پر سرفراز ہو، جبتک اس کے پاس چیچک اور ہیضہ کے ٹیکوں کے سارٹیفکٹ نہ ہوں جہاز پر بیٹھنے یا لنکا جانے کی اجازت نہیں مل سکتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لنکا کی سرکار کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کے ملک میں گذشتہ دس برسوں کے اندر ہیضہ اور چیچک کی کوئی واردات نہیں ہوئی ہو۔ لنکا کی آبادی کم ہے اور لنکا کی حکومت ہیضہ اور چیچک سے اپنے ملک کو بالکل محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ خیر، منڈپم کیمپ میں ہم لوگ جملہ کاغذات اور سارٹیفکٹ دکھلانے کے بعد دھنوش کوڈی پہنچے۔ یہاں سرزمین ہند ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی شکل ایک جزیرہ کی ہو۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ہم لوگوں کو دو میل چوڑا سمندر پار کرنا پڑا۔ اس دو میل کے سمندر پر اب پل باندھکر ریل نکالی گئی ہو اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پل کو باندھنے میں ہندوستان کے انجینیروں نے انتہائی قابلیت اور اہلیت کا ثبوت دیا ہو۔ دھنوش کوڈی اور رامیشورم کے گرد و نواح کے اہل ہنود میں یہ روایت عام ہے کہ یہ پل رامائن کے زمانہ میں شری رامچندر نے لنکا کے راجہ راون پر فوج کشی کرتے وقت تعمیر کیا تھا اور وہ اس کو سیت بند کا پل کہتے ہیں۔ اس علاقہ کے عیسائی اور مسلمانوں کے روایات کے مطابق اس پل کا نام آدم کا پل ہو۔ کہا جاتا ہو کہ جب حضرت آدم جنت سے نکل کر دنیا میں پہنچے تو سب سے پہلے یہیں پہنچے۔

دھنوش کوڈی کے بندرگاہ تک ہم لوگ بذریعہ ٹرین پہنچے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں لنکا کو جانے والا جہاز ملتا ہو۔ یہ جہاز ایک ہفتہ میں صرف تین دن لنکا جاتا ہے۔ یہیں پر لنکا اور ہندوستان کے کسٹم کی چوکیاں بھی ہیں جہاں آنے جانے والوں کے سامان کا معائنہ کیا جاتا ہے اور اگر کوئی شے قابل اعتراض یا کسٹم کی ڈیوٹی کے بغیر پائی جاتی ہے تو وہ روک لی جاتی ہے۔ یہاں ہندوستانی اور سیلون کے سکوں کا تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان سے سیلون جانے والوں کو صرف پچھتر روپیہ فی کس لے جانے کی اجازت ہے چنانچہ ہم میں سے ہر ایک نے فی کس پچھتر روپیہ سیلون کے سکوں میں تبدیل کیا۔ اس سے زیادہ جو رقم ہمارے

ہمالیہ کے دامن میں ایک تبتی گاؤں

الموڑہ — تبت سرحد کے بھوٹئے

ضلع الموڑہ کے مشرقی حصہ میں جو ناہموار چٹانوں، عظیم الشان پہاڑوں اور حسین و دل کش مناظر کے لئے مشہور ہے۔ بھوٹئے آباد ہیں۔ تندرست و توانا، محنت کش اور عزم و جرات کے مالک یہ بھوٹئے صحیح معنوں میں سدا گرم سفر کہے جا سکتے ہیں۔ سال میں مشکل سے تین مہینے ایک مقام پر رہنے کے بعد یہ لوگ رخت سفر باندھ لیتے ہیں اور سال کا باقی حصہ گھوم پھر کر خرید و فروخت میں گزار دیتے ہیں۔ ادھر کچھ عرصے سے تبت کے ساتھ ان کی تجارت میں بڑا خلل پیدا ہو گیا ہے لیکن حکومت ان کے معاشی مشکلات کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ وہاں جو ترقیاتی بلاک قائم کیا گیا ہے وہ رفتہ رفتہ اس علاقے کے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر رہا ہے۔ ان صفحات میں تصویروں کے ذریعہ ان بھولے اور سادہ لوح لوگوں کی، جو ایک درخشاں مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں، روزمرہ زندگی کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تاواگھاٹ کے راستے میں ایک دل کش منظر

گوری اور کالی ندیوں کے سنگم پر جول جبی کا میلہ

گلہ اور گلہ بان

تیائے فروخت

ایک گاؤں میں کھڑی فصل کا منظر
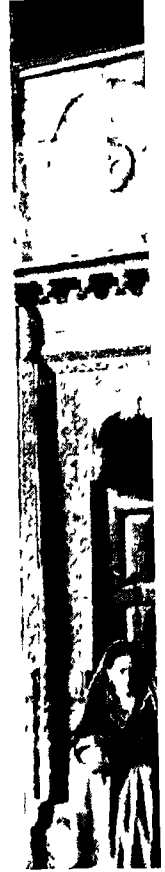
کھوٹیا کاشتکار دھان نکال رہے ہیں

میلہ سے واپسی

ایک گاؤں میں پائپ کے پانی کا بندوبست

ایک بالی ٹکنک میں تربیت پانے والے

ایک پہاڑی سڑک اور داہنی طرف ڈھلوان کھیت

ایک دیہی شفا خانہ
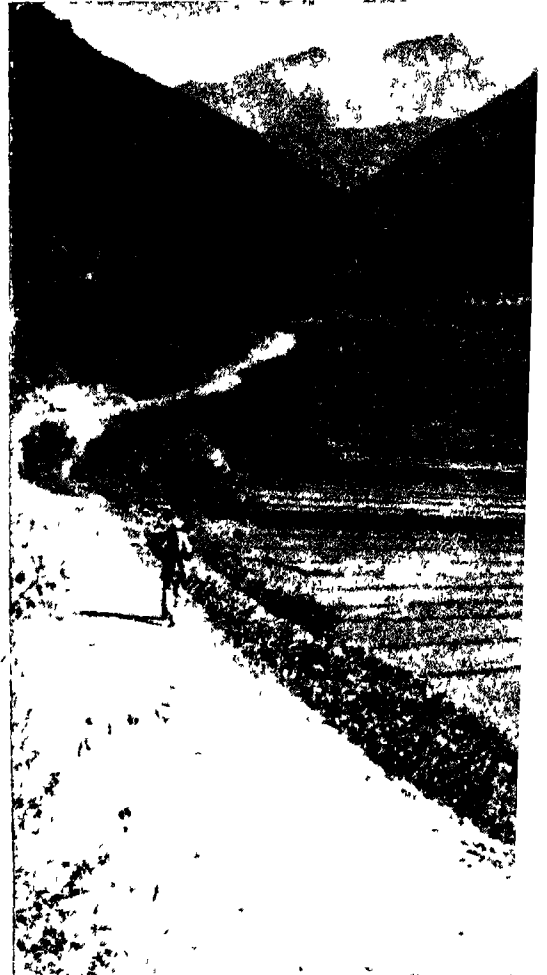
پاس تھی وہ ہم نے وہاں کے قاعدے کے مطابق کسٹم کے دفتر میں
جمع کر دی۔ یہ چیز دلچسپ ہے کہ سیلون اور ہندوستان کے سکوں کے
نام تو ضرور بدلے ہوئے ہیں ورنہ ہندوستانی روپیہ کی قیمت سیلون
کے روپیہ کے برابر ہے اور سیلون کے سینٹ کی قیمت بھی ہندوستانی
پیسہ کے برابر ہے۔ ہندوستان کی طرح سیلون کے روپیہ میں بھی سو سینٹ
(پیسے) ہوتے ہیں۔

دھنوش کوڈی سے روانہ ہونے کے بعد ہمارا جہاز سب سے پہلے تلی منار
پہنچا، جو لنکا کا ایک بندرگاہ ہے۔ دھنوش کوڈی اور تلی منار کے مابین
تقریباً تیس میل لمبا سمندر حائل ہے۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ
تک پہنچنے میں تین گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔ تلی منار میں سیلون کے کسٹم کا
دفتر ہے جہاں ہندوستان سے آنے والے سیاحوں کے سامان کی
جانچ کی جاتی ہے۔ بہرحال تلی منار سے ہم اسی وقت بذریعہ ریل
کولمبو روانہ ہو گئے۔ تلی منار سے اور کولمبو تک تقریباً ڈیڑھ سو میل کا
فاصلہ ہے۔ کولمبو میں ہندوستان کے ہائی کمشنر نے ہم لوگوں کی رہائش
کا انتظام ایک عمارت میں کیا تھا جو ہندوستان کے مشہور مصلح سوامی
رام کرشن کے پیرووں نے لنکا میں تعمیر کی ہے۔ لنکا کے بہت سے
باشندے بھی رام کرشن مشن کے ممبر ہیں۔ گذشتہ دنوں جب ڈاکٹر
راجیندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند لنکا تشریف لے گئے تھے تو انھوں
نے اسی عمارت کے کشادہ میدان میں ایک گیسٹ ہاؤس کا سنگ بنیاد
رکھا تھا اور کئی ہزار روپیہ بھی گیسٹ ہاؤس کی تعمیر کے لئے عطا فرمایا
تھا۔ رام کرشن مشن کولمبو میں سمندر کے کنارے ایک بڑی اہم جگہ
واقع ہے۔ جس سڑک پر یہ عمارت بنی ہے اس کا نام ہندوستان کے
مشہور ریفارمر سوامی وویکانند کے اسم گرامی پر وویکانند روڈ
ہے۔ کولمبو کو دیکھ کر انگلستان کے دارالحکومت لندن کی یاد آجاتی
ہے۔ کولمبو کی کشادہ سڑکیں، خوبصورت بندرگاہ اور عالیشان
عمارتیں اس شہر کو غیرملکی سیاحوں کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔ کولمبو
میں تقریباً دس میل لمبا سمندر کا پختہ ساحل ہے جہاں ہر لمحہ موجیں
ساحل سے ٹکراتی رہتی ہیں۔

کولمبو سے ہم لوگوں کی پارٹی کینڈی گئی جو کولمبو سے ستر میل
شمال کی طرف واقع ہے۔ یہ سیلون کا سب سے خوبصورت شہر ہے۔ یہیں
سیلون یونیورسٹی ہے۔ یہ شہر پہاڑ پر آباد ہے۔ کینڈی میں دنیا کا
سب سے خوبصورت باغ ملتا ہے جو "سیلون بوٹنیکل گارڈن" کے نام سے
مشہور ہے۔ اس باغ میں پیڑ اور پودوں کے لگانے میں جس آرٹ
سے کام لیا گیا ہے وہ اپنے ڈھنگ کا نرالا ہے۔ باغ کے قریب
ہی شہر ہے اور شہر کے وسط میں ایک نہایت خوشنما جھیل ہے جہاں
شام کے وقت کینڈی کے باشندے تفریح کے لئے جاتے ہیں۔ ہندوستان
کی طرح سرشام سے ہی اس جھیل کے کنارے کھلونے اور مٹھائی بیچنے
والے پہنچ جاتے ہیں اور آوازیں لگا لگا کر اپنا مال فروخت کرتے
ہیں۔ کینڈی سے کچھ میل دور نورا ایلیا کا وہ تاریخی مقام ہے جس کو راجہ
راون کی راجدھانی کہا جاتا ہے۔ یہاں راون کا ایک بہت عالیشان
مندر بنا ہوا ہے۔ لنکا کے ہندو باشندے راون کو وہاں کا اوتار
مانتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ نورا ایلیا کے کھنڈروں کے
متعلق وہاں یہ عام روایت ہے کہ وہ راون کے محلوں کے کھنڈر ہیں
ان کھنڈروں کے پاس ہی ایک بہت پرانا باغ ہے جس کو اشوک
باٹیکا سے موسوم کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ راجہ راون نے اسی
باغ میں سیتا جی کو قید کر رکھا تھا۔ رامائن میں بھی اشوک باٹیکا ذکر ملتا
ہے اور رامائن سے اس امر کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ سیتا جی اشوک
باٹیکا ہی میں مقید کی گئی تھیں۔ لنکا میں رامائن کے متعلق بیشمار قصے
مشہور ہیں لیکن وہاں کے لوگ راون کے متعلق بہت اچھی رائے رکھتے ہیں

کولمبو سے تقریباً ۱۲ میل دور کیلینا کا گوتم بودھ کا مندر اور
راون کے چھوٹے بھائی وبھیشن کا قلعہ ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے پہنچنے
کے دوسرے دن اسے دیکھا۔ یہ مقام ہندو اور بودھ دونوں مذہب
کے ماننے والوں کے لئے متبرک ہے۔ گوتم بدھ کے مندر کو دیکھنے کے
لئے دور دراز سے لوگ آتے ہیں۔ اس مندر میں گوتم بدھ کی قد آدم
سے بھی زیادہ اونچی پیتل کی مورتیاں پائی جاتی ہیں۔ دیواروں پر
گوتم بدھ کی زندگی کے تمام اہم واقعات سنہالی زبان میں لکھے ہوئے
ہیں۔ اس مندر کا پجاری ہندوستانی بودھ بھکشوؤں کی طرح پوشاک
پہنتا ہے اور پوجا کرتا ہے۔ پوجا کرنے کے تمام طریقے ہندوستانی

مہنت اور پجاری بھی ہندوستانی پجاریوں کے مانند آنے جانے والوں سے ہاتھ پھیلا کر خیرات طلب کرتے ہیں۔

بودھ مندر کے قریب ہی وبھیشن کا قلعہ اور محل ہے۔ لنکا کی قدیم تاریخ کے مطابق کیلنا راون کے چھوٹے بھائی وبھیشن کی راجدھانی تھا۔ اس محل میں وبھیشن کا ایک بہت بڑا بُت ہے جو ہمہ وقت ایک پردہ سے ڈھکا رہتا ہے۔ دریافت کرنے پر وہاں کے ناظم نے ہمیں بتایا کہ اس بت کو پردہ سے پوشیدہ رکھنے کا سبب یہ ہے کہ وبھیشن کو لنکا کا غدار مانا جاتا ہے۔ اور غدار کی شکل دیکھنا وہاں کی روایت کے مطابق گناہ ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وبھیشن کی شکل انتہائی ہیبتناک ہے اس لئے اسے ہر وقت پردے سے ڈھکا رکھا جاتا ہے۔ ہم لوگوں نے بڑی درخواستیں کیں کہ پردہ ہٹا دیا جائے لیکن محل کے ناظم نے کہا کہ اس مجسمہ کو تو لنکا کے گورنر جنرل اور کسی وزیر کو بھی نہیں دکھایا جا سکتا ہے۔ آخر ہم لوگ بھی مجسمہ کی شکل کو دیکھے بغیر واپس ہوئے۔ اس شہر کے باشندوں میں بھی گوتم بدھ کے متعلق نیز راماین کے متعدد قصے مشہور ہیں۔ مندروں میں بھی ہندوستانی تمدن کا گہرا اثر پڑا ہے اور ان کے تمام رسم و رواج پوجا کرنے کے طور طریقے، مہنت اور پجاریوں کا رہن سہن ہندوستان کے مانند ہے۔

اس شہر کو دیکھنے کے بعد ہم لوگ کولمبو کے مشہور بودھ مندر "بودھ ویلیا" کو دیکھنے گئے۔ اس مندر کی عالیشان عمارت اور شان و شوکت کو دیکھ کر بنارس کے سارناتھ کے بودھ مندروں کی یاد تازہ ہو گئی۔ اس مندر میں بھی گوتم بدھ کی کئی مورتیاں قدِ آدم سے بھی زیادہ اونچی بنی ہیں۔ اس مندر میں بھی یاتریوں کا صبح سے شام تک تانتا لگا رہتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس مندر کا بودھ مہنت لنکا کے بڑے دولت مندوں میں سے ہے۔

کولمبو اور کینڈی سڑک پر ہی لنکا کے سابق وزیر اعظم بھنڈارنائک کی سمادھی ہے۔ ہم لوگ اسے بھی دیکھنے گئے۔ یہ سمادھی سڑک کے بالکل کنارے بھنڈارنائک کی اپنی زمین پر ہے۔ ابھی اس کی تعمیر ہو رہی ہے۔ بھنڈارنائک کی سمادھی پر بھی صبح سے شام تک کافی افراد کا اجتماع رہتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی سمادھی کی مانند اس سمادھی پر بھی لوگ پھول اور گلدستے چڑھاتے رہتے ہیں اور شام تک سمادھی پر کافی پھولوں اور گلدستوں کا انبار جمع ہو جاتا ہے۔

تیسرے دن ہم لوگ لنکا کے مشہور قدیمی شہر انورادھپور گئے جو بودھ زمانہ میں لنکا کے بادشاہ کی دار الحکومت تھا۔ پرانا شہر تو ایک کھنڈر بن چکا ہے جہاں گوتم بدھ کے مندروں کے علاوہ اور کوئی عمارت نہیں ہے البتہ نیا شہر نئے پیمانہ پر بسایا جا رہا ہے اور عالیشان عمارات اور دوکانیں تعمیر ہو رہی ہیں۔

لنکا کے بدھ مذہب کے پیرؤں کے مطابق گوتم بدھ لنکا بھی گئے تھے اور انہوں نے انورادھپور میں ہی وہاں کے راجہ کو بہت نصائح کئے تھے اور بودھ مذہب کا پیرو بنایا تھا۔ انورادھپور کے ایک عالیشان بودھ مندر میں گوتم بودھ کو انورادھپور کے راجہ کے سامنے وعظ دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ شہر لنکا کے بودھوں کے لئے سب سے بڑا متبرک شہر ہے۔ اس میں تقریباً پچاس مندر بنے ہیں۔ یہاں ایک پیڑ بھی ہے جس کی بودھ لوگ پوجا کرتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ یہ پیڑ ہندوستان سے لایا گیا ہے اور وہی پیڑ ہے جس کے نیچے بیٹھ کر ہندوستان میں گوتم بدھ نے تپسیا کی تھی۔ اس پیڑ کا نام "بودھ ورکش" ہے۔ اسی کے پاس ایک بہت بڑا استوپ ہے جو سانچی کے استوپ سے شاید کئی گنا زیادہ بڑا ہوگا۔ اس استوپ کے متعلق وہاں یہ عام روایت ہے کہ گوتم بدھ کی کئی پسلیاں ان کی لاش میں سے نکال کر ہندوستان سے لائی گئی تھیں اور جو اس میں دفن ہیں۔

ان مندروں اور استوپوں میں ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کا گہرا اثر پڑا ہے۔ جو روایات گوتم بدھ کے متعلق ہندوستان میں مشہور ہیں وہی لنکا میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہاں راماین کے متعلق البتہ ہندوستان اور لنکا کے باشندوں میں جداگانہ نظریات ہیں۔ لنکا اور ہندوستان دونوں کی قدیم تاریخ کے مطابق راون لنکا کا راجہ تھا اور وبھیشن اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ مگر فرق یہ ہے کہ لنکا کے باشندے راون کو لنکا کا نیک راجہ اور وبھیشن کو غدار مانتے ہیں اور ہندوستان میں راون کو بدکار اور وبھیشن کو اچھا مانتے ہیں۔

لنکا میں سا ٹھ فی صدی باشندے بودھ مذہب کے پیرو ہیں

اور میں فیصدی کے قریب اہل ہنود ہیں دس فی صدی عیسائی اور تقریباً دس فی صدی مسلمان ہیں۔ لنکا میں ایک دوسرے کے مذہب کے لئے کافی رواداری پائی جاتی ہے۔ لیکن زبان کا مسئلہ وہاں کافی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ وہاں تامل اور سنہالی دو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ تامل جنوبی ہندوستان کی ایک مشہور اور نہایت اہم زبان ہے، علاوہ ازیں انگریزی لنکا میں عام طور سے بولی جاتی ہے۔ ابھی حال میں سنہالی زبان کو لنکا کی قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا ہے جس سے تامل بولنے والے باشندوں میں کافی غم و غصہ کی لہریں موجزن ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تامل زبان کو لنکا کی قومی زبان بنانا چاہئیے تھا۔ موجودہ عام انتخابات میں بھی لنکا میں زبان کا مسئلہ ایک اہم سوال بنا ہوا ہے۔ لنکا کے شمالی حصہ جافنہ میں زیادہ تر ہندو ہیں اور تامل بولنے والوں کی اکثریت ہے جنوبی حصہ میں بودھ مذہب کے پیروؤں کی اکثریت ہے اور انھیں اکثریت کی زبان سنہالی ہے۔ چند برسوں سے سنہالی اور تامل بولنے والوں میں کافی کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے اور لنکا کی سرکار کے سامنے دیگر اہم مسئلوں کے علاوہ ایک زبان کا مسئلہ بھی ہے جس کو ابھی تک حل نہیں کیا جا سکا ہے۔ سنہالی اور تامل دونوں میں بہت سے الفاظ ہندوستانی زبان کے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماں کو تامل میں امّاں کہتے ہیں جو ہندوستانی زبان کا لفظ ہے اسی طرح روٹی کو تامل میں بھی چپاتی ہی کہتے ہیں جو خالص ہندوستانی لفظ ہے۔ اور بھی متعدد ہندوستانی الفاظ تامل اور سنہالی زبان میں استعمال کئے جاتے ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں زبانوں پر ہندوستان کے تمدن کا گہرا اثر پڑا ہے۔

لنکا کے باشندوں کا معیار زندگی گزشتہ دس برسوں میں کافی اونچا ہوا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ لنکا کی آبادی صرف ۹۹ لاکھ کے قریب ہے جس میں سے تقریباً ایک تہائی لوگ کولمبو میں رہتے ہیں۔ لنکا کے گاؤں نہایت خوشنما ڈھنگ پر بسائے گئے ہیں۔ ہر گاؤں میں مکانوں کے چاروں طرف ناریل کے درخت نظر آتے ہیں اور درختوں کے نیچے دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ سرکاری ملازموں کا بھی معیار زندگی کافی اچھا ہے۔ وہاں کم سے کم تنخواہ ڈیڑھ سو روپیہ ہے جو ایک چپراسی کو ملتی ہے۔ مزدور کی یومیہ اجرت چار روپیہ سے کم نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ معمولی تنخواہ کے آدمی سے بڑی تنخواہ تک کا ملازم زیادہ تر اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ سیلون میں تمام بڑے شہروں میں صفائی کا انتظام بہترین ہے۔ کولمبو میں سینٹری گارڈ سڑکوں پر کھڑے رہتے ہیں جو سڑکوں کی صفائی کا دھیان رکھتے ہیں۔ وہ لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ سڑکوں پر کوڑا نہ پھینکیں اور تھوکیں نہیں۔ کوڑا ڈالنے اور تھوکنے کے لئے ذرا ذرا سی دور پر ناریل کی باسکٹ ٹوکریاں لگی ہوئی ہیں۔

سیلون اور ہندوستان کے تمدن میں بہت کچھ یکسانیت ہے۔ جنوبی ہندوستان کے باشندوں اور سیلون کے باشندوں کی پوشاک تقریباً یکساں ہے۔ زیادہ تر لوگ جنوبی ہندوستان کے باشندوں کے مانند تہمد اور قمیض یا بش شرٹ استعمال کرتے ہیں۔ سیلون کے چاروں طرف سمندر ہے اور سیلون خط استوا کے قریب ہے اس لئے سیلون میں کبھی جاڑے کا موسم نہیں ہوتا ہے۔ گرم کپڑوں کو سیلون میں قطعاً استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے دستور کے مانند سیلون میں بھی مہمانوں کو آتے اور جاتے وقت پان پیش کیا جاتا ہے۔ سیلون کے پان میں کتھا نہیں لگاتے ہیں۔ صرف چونا لگا کر کچی چھالیوں کو گولے کے مانند کاٹ کر پان میں رکھ کر دیتے ہیں سیلون کی غذا بھی جنوبی ہندوستان کے باشندوں کی طرح چاول اور مچھلی ہے۔ ناریل کا تیل سیلون میں عام طور سے استعمال کیا جاتا ہے سیلون کے لوگوں کی عبادت گاہیں بالکل ہندوستان کے ڈھنگ پر بنی ہوئی ہیں ہندوؤں کے مندر، بودھوں کے استوپ، عیسائیوں کے گرجا گھر اور مسلمانوں کی مسجدیں بالکل ہندوستانی ڈھنگ پر بنی ہوئی ہیں اور ان عبادت گاہوں میں بالکل ہندوستان کے مانند عبادت یا پرستش کرنے کا طریقہ ہے۔ لنکا کی تاریخ پر بھی ہندوستانی تاریخ کا بہت اثر پڑا ہے۔ گوتم بدھ اور رامائن کے قصے لنکا کے ہندو اور بودھ لوگوں کی زبانوں پر اسی طرح عام ہیں جیسے ہندوستان کے ہندو اور بودھوں میں۔ قصوں میں بہت کچھ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک

[illegible] کے ہندو جو کہ اپنے کو تامل کہتے ہیں وہ ہندوستان میں منائے جانے والے دسہرہ کو غلط فہمی کی بنا پر لنکا کے منافی سمجھتے ہیں۔
لنکا کے باشندوں کا یہ بھی خیال ہے کہ راون کے پتلے کو ہر سال ہندوستان میں جلانا لنکا کی توہین کرنا ہے۔ اس سلسلے میں وہاں کے لوگوں نے ہماری پارٹی سے بھی احتجاج کیا۔ بودھ مذہب کے پیرو راون کے قصے کو صرف ایک روایت سمجھتے ہیں اور ہندوستان کے متعلق انتہائی اچھے خیالات رکھتے ہیں۔ وہ بدھ مذہب کی تہذیب اور تمدن کو ہندوستان کی تہذیب اور تمدن سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ گوتم بدھ چونکہ ہندوستان سے آئے تھے اس لئے ہندوستان کی تہذیب اور تمدن کا لنکا کی تہذیب اور تمدن پر گہرا اثر پڑا ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے مشہور مصلحوں، وویکانند اور رام کرشن کے متعدد پیرو لنکا کے مختلف شہروں میں پائے جاتے ہیں جو لنکا میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کی شمع کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ صرف کولمبو میں رام کرشن مشن کے زیر تحت کئی کالج اور اسکول چل رہے ہیں۔ ان کالج اور اسکولوں میں پڑھنے والے سیلون کے طلبا پر ہندوستان کے تمدن کا گہرا اثر پڑتا ہے۔
بلاشبہ اس طرح کی سماجی انجمنیں ہندوستان اور لنکا کے باشندوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مدد کر رہی ہیں اور ہندوستان اور لنکا کے تعلقات کو اور زیادہ خوشگوار بنا رہی ہیں۔

پنجاب کے لوک ناچ

بسلسلۂ صفحہ ۲۷

لڈی۔ یہ ناچ بھی ڈھولئے کے گرد گھیرا بنا کر کیا جاتا ہے۔ یہ ناچ بھی جھمر کی طرح گو ایک ہی دھن پر کیا جاتا ہے مگر منفرد انداز سے لڑکیاں ایک تال پر پیر اٹھا کر بازو پھیلا پھیلا کر اچھل اچھل کر ناچتی ہیں۔ اور ایک ایک پیر پر ناچتی اور نیم دائرے بناتی ہوئی آزادی سے جسم کو حرکت میں لاتی ہیں۔ بعض اوقات مرد بھی اسے ناچتے ہیں اور کوئی منچلے ناچتے وقت عورتوں کا لباس پہن لیتے ہیں۔ اور آنکھوں کو مٹکا مٹکا کر جنسی جذبات اور رومانی کیفیات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح ناچنے والوں کے کیف و سرمستی میں اضافہ ہوتا ہے۔
سمی۔ یہ ناچ پوٹھوہار کے علاقہ کی جوان لڑکیوں اور نوبیاہتا دلہنوں کا ناچ ہے جسے وہ گھیرا بنا کر ناچتی ہیں۔ آہستہ آہستہ جھوم جھوم کر۔ بانہوں کو لہرا لہرا کر ایک تال پر تالیاں بجاتے ہوئے یہ رقص شروع ہوتا ہے۔ تالی بجاتے ہی جسم دائیں جانب جھکتا ہے۔ بایاں ایک جھٹکے کے ساتھ دائیں سے آملتا ہے۔ پھر ہاتھ بلند ہوتے ہیں اور دایاں پاؤں آگے بڑھ جاتا ہے۔ پھر تالی بجتی ہے۔ بایاں پیر پھر دائیں سے آملتا ہے۔ اسی طرح چکر کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ اس ناچ کے ساتھ عموماً چھوٹے ڈھولا گیت اور ڈھولا۔ سمی کی رومانی داستان سے متعلق گیت گائے جاتے ہیں۔ ڈھولا۔ سمی جنگلی علاقوں کا ایک مشہور رومان ہے۔ سمی کے گیتوں میں عام طور پر بے باک اور دلیرانہ محبت اور نڈر جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

یحییٰ اعظمی

اے کشورِ تہذیب و تمدن کے حسیں تاج   زیبائی و رعنائیِ تعمیر کی معراج
دنیا ہے ترے جلوۂ دیدار کی محتاج   تو دیدۂ عالم کا ہے مسجودِ نظر آج
جنّت ہے تو نقاش کے تہذیبِ عمل کی
یا خواب گہِ ناز ہے ممتاز محل کی

جمنا کے کنارے تری مرمر کی عمارت   ہے خاک پہ اک "نقشِ حسیں" جس سے عبارت
ہے حاصلِ صد فکر و نظر جس کی زیارت   وہ جس کو طرازِ ابدی کی ہے بشارت
کس کے یدِ فن کار نے اس کو ہے تراشا
صدیوں سے ہے جو مرجعِ اربابِ تماشا

یہ نقشِ دل آویز ترا تاج زمیں ہے   یا خاتمِ فردوس کا تابندہ نگیں ہے
نقاش کے تخییل کی فردوس بریں ہے   یا خامۂ فن کار کا شہ کارِ حسیں ہے
یہ تاج نہیں حسن و تجمّل کی ہے معراج
در اصل مصوّر کے تخیّل کی ہے معراج

دامن میں ترے رودِ جمن کی یہ روانی   اور چادرِ مہتاب کی یہ نور فشانی
جلوؤں سے ترے عکس کے ہے رقص میں پانی   اللہ رے عظمت تری موجوں کی زبانی
جھک جھک گئے مگر سر بہ فلک تیرے منارے
کرتے ہیں کچھ اربابِ تماشا سے اشارے

یہ صفحۂ مرمر پہ ترا نقشِ دل آرا   اک سادہ و شفّاف مرقع ہے سراپا
دیکھے کوئی اک حسن کا یہ روضۂ زیبا   دل سے ہے فدا جس پہ بیاضِ یدِ بیضا
وہ زیب و طرازِ اثرِ شاہجہانی
اور حسن و محبّت کی دل آویز کہانی

وہ منظرِ رعنا، ارمِ حسن و محبت
وہ مرقدِ زیبا، حرمِ حسن و محبت
دل جن کے ہیں معمورِ غمِ حسن و محبت
کھائیں نہ یہاں کیوں قسمِ حسن و محبت
تو آج بھی اربابِ نظر کی ہے ادب گاہ
اے روضۂ محبوبِ دل آرامِ شہنشاہ

گنبد پہ ترے خلد کی رحمت ہے برستی
ہے مہبطِ انوار تری حسن کی بستی
دیدار کو ترے بزمِ کواکب ہے ترستی
اُف عالمِ انوار کی یہ حسن پرستی
آنکھیں مہ و انجم کی ترے غم میں ہیں روتی
شبنم کے یہ قطرے ہیں کہ آنسو کے ہیں موتی

یہ نخل روش پر ہیں کہ طوبیٰ کی قطاریں
یہ سرو و صنوبر ہیں کہ جنت کی بہاریں
ہم تجھ کو خیابانِ ارم کیوں نہ پکاریں
کرنوں کے حسیں ہاتھ تجھے کیوں نہ سنواریں
پانی سے بھرے حوض ہیں یا چادرِ مہتاب
یہ جلوۂ بیتاب ہے یا رقص میں سیماب

تو عظمت و تزئیں ہے مری خاکِ وطن کی
زینت ہے ترا نقش حسیں گنگ و جمن کی
تعمیر یہ تیری نہیں معراج ہے فن کی
تعبیر مجسم ہے تو اک خوابِ حسیں کی
ہے دیدۂ زائر میں تو اک نقشِ طرب خیز
شاعر کی نگاہوں میں ہے اک بیتِ دل آویز

یہ تیرا سراپا ہے کہ ایوانِ ادب ہے
یہ تیرا مرقع ہے کہ دیوانِ ادب ہے
ہر سرخیٔ افسانہ ہے عنوانِ ادب ہے
ہر نقشِ دل آویز ترا جانِ ادب ہے
مرمر کے ورق پہ تری رعنائیٔ تحریر
کس شے سے کرے خامۂ عاجز تجھے تعبیر

تو عظمتِ رفتہ کی ہے تابندہ نشانی
تو سطوتِ ماضی کی ہے پائندہ کہانی
ہر نقش کے آگے ہے خجل صنعتِ مانی
ہر حرف ہے اک دفترِ اسرار و معانی
عبرت کا خزینہ ہے تو عظمت کا دفینہ
اک دفترِ معنی ہے یہ مرمر کا سفینہ

اے گلکدۂ باغِ ارم، روضۂ پرنور
سرتا بہ قدم خلدِ نظر، جنت کا نور
دل تیری تمنائے زیارت سے ہے معمور
اک شاعرِ مجبور کہ تجھ سے ہو بہت دور
کرتا ہے ترے تاج کو یہ نظمِ حسیں نذر
الفاظ و معانی کے یہ تابندہ نگیں نذر

چھوٹی بچت

عبدالمجید سہالوی

پنج سالہ منصوبے تیار کر کے ملک کی ترقی اور تعمیر کا جو عظیم الشان پروگرام بنایا گیا ہے وہ جب تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا، ہندوستان کے عوام کا معیار زندگی بلند نہیں ہو سکتا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے بہت کافی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ دوسرے ملکوں سے اس سلسلہ میں قرض لے کر کام چلایا جا سکتا ہے لیکن محض دوسروں پر بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں۔ اپنے ملک، اپنی ذات اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کو خوشگوار بنانے کے لئے ہمیں اپنے دست و بازو اور اپنے عزم و حوصلہ سے کام لینا ہوگا۔ یعنی پنج سالہ منصوبوں کو کامیاب بنانے میں عوام کو بہت بڑا دخل رہے گا۔ اس منصوبہ کے لئے سرمایہ فراہم کرنے میں وہ کئی صورتوں سے مدد کر سکتے ہیں جن میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ چھوٹی بچت اسکیم میں روپیہ لگایا جائے۔ چھوٹی بچت کی کئی اسکیمیں ہیں اور یہ سب حکومت ہند نے تیار کی ہیں۔ ہندوستان کی ہر ریاست میں ان پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔

چھوٹی بچت اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ آپ اپنی آمدنی میں سے کچھ پس انداز کرتے رہیں اور پس انداز شدہ رقم کے سرکاری سرٹیفکٹ وغیرہ خرید لیں۔ حکومت ایک مقررہ مدت کے بعد آپ کو ان سرٹیفکٹوں کے معاوضہ میں آپ کی رقم مع معقول منافع کے واپس کر دے گی۔ اس طرح آپ کے پاس کچھ روپیہ جمع ہو جائے گا۔ اور جب تک آپ یہ رقم واپس نہیں لیتے اس وقت تک اُسے منصوبوں کی تکمیل کے لئے کام میں لایا جائے گا۔ گویا چھوٹی بچت اسکیمیں آپ کے فائدہ کے لئے بھی ہیں اور ملک کے لئے بھی۔ چھوٹی بچت کی یہ اسکیمیں ان لوگوں کے لئے [illegible] ہیں جو اپنی آمدنی سے کوئی بڑی رقم بچا کر کسی منافع بخش [illegible] نہیں لگا سکتے ان اسکیموں میں پانچ روپے ماہوار بلکہ اس سے کم کی رقم بھی لگائی جا سکتی ہے۔

چھوٹی بچت کی اسکیموں میں بارہ سالہ نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ دس سالہ ٹریزری ڈپازٹ سرٹیفکٹ۔ پندرہ سالہ اینوٹی سرٹیفکیٹ اور کمولیٹو ٹائم ڈپازٹ کے علاوہ اور دوسری اسکیمیں بھی ہیں جن کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

بارہ سالہ نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکیٹ

بارہ سالہ قومی منصوبہ بچت سرٹیفکٹ کسی [illegible] جو سیونگ بنک کا کام کرتا ہو، ل سکتے ہیں۔ درخواست کا فارم ڈاکخانہ [illegible] دستیاب ہو سکتا ہے اور سرٹیفکیٹ کی قیمت ادا کر کے آپ خود یا اپنے مختار کے ذریعہ بلا کسی زحمت کے خرید سکتے ہیں۔

یہ سرٹیفکٹ پانچ، دس، پچاس، سو، پانچ سو، ایک ہزار اور پانچ ہزار کی قیمت کے ہوتے ہیں۔ آپ ان میں سے [illegible] قیمت کے سرٹیفکیٹ جس وقت چاہیں پچیس ہزار تک خرید سکتے ہیں۔ دو آدمی مل کر مشترکہ طور پر پچاس ہزار تک خرید سکتے ہیں۔ نابالغوں کی جانب سے بھی یہ سرٹیفکٹ خریدے جا سکتے ہیں۔ انجمنیں، ادارے اور سوسائٹیاں ایک لاکھ تک کے سرٹیفکٹ خرید سکتی ہیں۔

سود: آپ کو ان سرٹیفکٹوں پر ۴۱ء۵ فی صدی سالانہ کی شرح سے سود ملے گا اور بارہ سال کے بعد آپ کو کل رقم مع سود کے مل جائے گی اگر آپ آج ایک سو کی قیمت کا بارہ سالہ قومی منصوبہ بچت سرٹیفکٹ خریدیں تو آپ کو بارہ سال بعد ۱۶۵ روپئے مع سود کے ملیں گے۔

یہ سرٹیفکٹ ایک سال کے بعد آپ کسی وقت بھی اپنی ضرورت کے مطابق بھنا سکتے ہیں لیکن ایسی صورت میں شرح سود کم ہو جائیگی اور آپ کو اتنا سود نہیں ملے گا جتنا بارہ سال پورے ہونے پر فی صدی ملتا۔ خریدنے والے کے انتقال کی شکل میں اس کے ورثاء سرٹیفکٹ ایک سال کی مدت سے پہلے ہی بھنا سکتے ہیں اور اس کی قیمت واپس لے سکتے ہیں۔

بھنانے کا طریقہ۔ جب آپ کو سرٹیفکٹ بھنانا ہو تو اس ڈاکخانہ چلے جائیے جہاں سے آپ نے یہ سرٹیفکٹ خریدے ہیں اور سرٹیفکٹ کی پشت پر ٹھیک ویسے ہی دستخط کیجئے جیسے آپ نے خریدتے وقت کئے تھے اگر دونوں دستخطوں میں کوئی فرق نہ ہوا تو آپ کو اسی وقت سرٹیفکٹ کی قیمت مع سود کے مل جائے گی لیکن اگر دونوں دستخط ایک دوسرے سے نہ ملے تو آپ ڈاکخانہ میں ایسے آدمیوں کو لے جا کر اپنی شناخت کرا دیجئے جو آپ کو بھی جانتے ہوں اور ان کی واقفیت ڈاکخانہ والوں سے بھی ہو۔

اگر آپ بحیثیت ولی یا سرپرست کے کسی نابالغ کی جانب سے سرٹیفکٹ بھنانا چاہیں تو آپ کو اس نوعیت کا ایک بیان تحریر کرنا ہوگا کہ نابالغ زندہ ہے اور آپ اس کی جانب سے روپے وصول کر رہے ہیں۔

اگر سرٹیفکٹ خریدنے والے کا انتقال ہو جائے تو اس سرکل کے پوسٹ ماسٹر جنرل کو اختیار حاصل ہے کہ وہ مرنے والے کے وصیت نامے یا قانون وراثت کے مطابق حاصل کئے ہوئے سرٹیفکٹ کو دیکھ کر ورثاء کو نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ بھنانے کی اجازت دیدے۔

دو آدمیوں کے مشترکہ سرٹیفکٹ کی صورت میں اگر کسی کا انتقال ہو جائے تو ہیڈ پوسٹ ماسٹر کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اس کے بھنائے جانے کا حکم دیدے۔ سرٹیفکٹ بھنانے کے لئے کسی ٹکٹ وغیرہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے

منتقلی اگر آپ اپنے نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ ایک ڈاکخانہ سے دوسرے ڈاکخانہ لے جانا چاہتے ہوں تو ایک منتقلی فارم ڈاکخانہ سے مفت لے آیئے اور اس کو بھر کر سرٹیفکٹ کے ساتھ چاہے اس ڈاکخانہ میں دیدیجئے جہاں سے آپ نے سرٹیفکٹ خریدے تھے چاہے اس ڈاکخانہ میں داخل کر دیجئے جہاں آپ اپنے سرٹیفکٹ اب منتقل کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ کارروائی کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لیجئے کہ جس ڈاکخانہ میں آپ سرٹیفکٹ منتقل کرنا چاہتے ہیں وہ ڈاکخانہ نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ کا کاروبار کرتا ہے کہ نہیں۔

اگر سرٹیفکٹ دوسرے کے نام منتقل کرنا ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے اگر مشترکہ سرٹیفکٹ ہے اور دونوں قریبی رشتہ دار ہیں اور وہ ایک کے نام منتقل کرنا چاہتے ہیں تو یہ کارروائی بڑی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ نابالغ کی جانب سے خریدا ہوا سرٹیفکٹ یا تو خود نابالغ کے نام یا اسکے ورثاء کے نام منتقل ہو سکتا ہے اور کسی کے نام منتقل نہیں کیا جا سکتا۔

منتقلی کی درخواست کے لئے بھی مقررہ فارم ہوتا ہے جسے بھرنا ہوتا ہے اور معمولی فیس بھی ادا کرنی ہوتی ہے سرٹیفکٹ کی منتقلی سرٹیفکٹ خریدنے کی تاریخ کے ایک سال بعد ہی ہو سکتی ہے۔

قرض و ضمانت۔ اگر آپ اپنا نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ قبل از وقت نہیں بھنانا چاہتے لیکن آپ کو روپے کی ضرورت ہے تو آپ سرٹیفکٹ کی ضمانت پر ریزرو بنک اور ان بنکوں سے جن کا ذکر ریزرو بنک آف انڈیا ایکٹ سنہ ۱۹۳۴ء میں کیا گیا ہے قرض لے سکتے ہیں ان کے علاوہ کواپریٹو بنک اور سوسائٹیوں سے بھی سرٹیفکٹ کی ضمانت پر قرض مل سکتا ہے۔

سرٹیفکٹ ضمانت میں دینے کا طریقہ یہ ہوگا کہ جس افسر کے پاس ضمانت کے طور پر سرٹیفکٹ داخل کرنا ہو اس سے سرٹیفکٹ کا مالک یہ تحریر حاصل کر لے کہ وہ سرٹیفکٹ بطور ضمانت کے داخل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کے بعد منتقلی فارم بھر کر اور مذکورہ تحریر اس کے ساتھ نتھی کر کے سرٹیفکٹ ڈاکخانہ میں داخل کر دیا جائے۔

جب ضمانت کی ضرورت باقی نہ رہے تو متعلقہ افسر سے سرٹیفکٹ واپس لے لئے جائیں اور اس سے یہ تحریر بھی حاصل کر لی جائے کہ سرٹیفکٹ

بحال کئے جاتے ہیں اس کے بعد سرٹیفکٹ کے ساتھ یہ تحریر منسلک کر کے ڈاکخانہ سے سرٹیفکٹ پھر اپنے نام منتقل کرائے جائیں۔

نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ ملازمین اور ٹھیکہ دار اپنی ضمانت میں بھی داخل کر سکتے ہیں اس کے علاوہ سرکاری مطالبہ کی ادائیگی میں بھی یہ سرٹیفکٹ اتر پردیش میں دیئے جا سکتے ہیں۔

سرکاری مطالبہ میں دینے کے لئے ڈاک خانہ سے مقررہ فارم حاصل کر کے بھرنا اور سرٹیفکٹ کی پشت پر دستخط کرنا ہو گا اور اس کی تصدیق سرکاری افسر سے کرانی ہو گی۔

گم ہونے کی صورت میں۔ اگر آپ کا سرٹیفکٹ کہیں گم ہو جائے تو آپ فوراً ڈاک خانہ جایئے اور ایک درخواست لکھ کر دیدیجیئے کہ آپ کا سرٹیفکٹ گم ہو گیا ہے آپ کو درخواست میں سرٹیفکٹ کی تفصیلات بھی لکھنی ہوں گی اور یہ بھی لکھنا ہو گا کہ کس طرح گم ہوا۔

آپ کی درخواست پر ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل محکمہ ڈاک و تار گم شدہ سرٹیفکٹ کی جگہ ایک تحریر دیدے گا جو آپ کے لئے سرٹیفکٹ کا کام دے گی۔ لیکن آپ کو اپنی بھول کی قیمت ادا کرنی ہو گی اور اس تحریر کو حاصل کرنے کے لئے پانچ اور دس روپئے والے سرٹیفکٹ پر ۲۵ نئے پیسے، پچاس اور سو روپئے والے پر ۵۰ نئے پیسے پانچ سو اور ایک ہزار والے پر ایک روپیہ اور پانچ ہزار والے سرٹیفکٹ پر پانچ روپئے بطور فیس دینے ہوں گے۔

نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ انکم ٹکس، دولت ٹکس اور سپر ٹکس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں اور ان سے حاصل کی ہوئی آمدنی پر آپ کو ٹکس نہیں ادا کرنا پڑتا۔

بارہ سالہ نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ ان لوگوں کے لئے زیادہ موزوں ہیں جو اپنے روپیے اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والے منافع سے فوری طور پر فائدہ نہ اٹھانا چاہتے ہوں بلکہ اس کے میٹھے پھل کا صبر کے ساتھ انتظار کر سکتے ہوں۔

دس سالہ ٹریزری سیونگ ڈپازٹ سرٹیفکٹ

دس سالہ خزانہ بچت ڈپازٹ سرٹیفکٹ آپ کے لئے اس وقت بہت موزوں ہوں گے جب آپ اپنی پونجی محفوظ رکھ کر اپنے خرچ کے لئے سالانہ نفع حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ ان کے خریدنے سے آپ کا روپیہ اپنی جگہ محفوظ رہے گا اور آپ کو فوری ضروریات پوری کرنے کے لئے ایک رقم سالانہ حاصل ہوتی رہے گی۔

بچوں کی تعلیم، بیواؤں کی امداد، مدرسوں اور خیراتی امور کے لئے اوقاف اور دوسرے اداروں کے لئے بھی یہ دس سالہ ڈپازٹ سرٹیفکٹ بہت موزوں ہوں گے کیونکہ اس میں روپیہ لگا دینے سے سرمایہ محفوظ رہے گا اور اس کے منافع سے ان لوگوں اور اداروں کی امداد ہوتی رہے گی اور یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رکھا جا سکے گا۔

یہ دس سالہ سرٹیفکٹ پچاس اور سو سو روپئے کے خریدے جا سکتے ہیں۔ ایک شخص ۲۵ ہزار تک اور مشترکہ طور پر دو آدمی اور عام ادارے پچاس ہزار تک اور خیراتی ادارے ایک لاکھ تک خرید سکتے ہیں

یہ سرٹیفکٹ اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی تمام شاخوں سے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں سرکاری خزانوں اور تحتی خزانوں سے خریدے جا سکتے ہیں۔ ان پر منافع چار روپئے فی صدی سالانہ کی شرح سے سود کی شکل میں دس سال تک سال بہ سال ملا کرے گا۔ دس سال پورے ہونے پر آپ کو سرٹیفکٹ کی پوری قیمت واپس مل جائے گی۔

اگر آپ کسی ضرورت کی بنا پر دس سال سے پہلے ہی سرٹیفکٹ کی قیمت واپس لینا چاہیں گے تو ایک سال کی مدت گذرنے کے بعد آپ کسی وقت بھی ایسا کر سکتے ہیں لیکن اس صورت میں آپ کو ملنے والی رقم میں کچھ کٹوتی ہو جائے گی جو اس طرح سے ہو گی۔

فرض کیجیئے آپ نے دس سالہ سیونگ ڈپازٹ سرٹیفکٹ خریدے اور آپ کو ایک سال بعد کچھ ایسی ضرورت محسوس ہوئی کہ آپ انھیں بھنانے پر مجبور ہو گئے تو ان میں فی صدی چار روپئے کی کٹوتی ہو جائیگی۔ مطلب یہ کہ آپ کو کوئی سود نہیں ملے گا اور آپ کو آپ کی رقم واپس مل جائے گی۔

اسی طرح دو سال بعد ساڑھے چار، تین سال اور چار سال بعد چھ، پانچ سال بعد سوا چھ، چھ سال بعد چھ، سات سال بعد سوا پانچ، آٹھ سال بعد چار اور نو سال بعد سرٹیفکٹ بھنانے پر سوا دو روپے فی صدی کٹوتی ہو گی۔

یہ دس سالہ سرٹیفکٹ نابالغوں کی جانب سے بھی خریدے جاسکتے ہیں اور اس طرح ان کے سالانہ اخراجات کا دس سال تک مناسب انتظام کیا جاسکتا ہے اور انھیں دس سال بعد ایک رقم یک مشت مل سکتی ہے جو وہ اسے کسی کام میں بھی لگا سکتے ہیں۔

ان سرٹیفکٹوں کے ذریعہ حاصل کی گئی آمدنی انکم ٹکس سے مستثنیٰ ہوتی ہے اور یہ سرٹیفکٹ بطور ضمانت رکھے جاسکتے ہیں نیز ان کو رہن رکھ کر شیڈولڈ بنکوں، کواپریٹیوں بنکوں اور سوسائیٹوں سے قرض بھی لیا جاسکتا ہے۔

پندرہ سالہ انیوئٹی سرٹیفکٹ

یہ سرٹیفکٹ ایسے لوگوں کے لئے موزوں ہیں جو اصل اور سود دونوں کو تھوڑا تھوڑا کرکے اپنے خرچ میں لانا چاہتے ہیں۔ بڑھاپے میں ملازمت سے علٰیحدہ ہونے کے بعد اگر پنشن والی ملازمت نہیں ہے تو زندگی بسر کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کیونکہ پراویڈنٹ فنڈ یا گریجوئٹی وغیرہ کا جو روپیہ ملتا ہے وہ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوجاتا ہے اور بڑھاپے میں دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ اس اسکیم میں رقم لگا دینے سے وظیفہ یا پنشن کی طرح ایک رقم ماہوار ملتی رہتی ہے اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر ہوسکتی ہے

پندرہ سالہ انیوئٹی سرٹیفکٹ پر جو رقم لگائی جاتی ہے اس پر تقریباً چار فی صدی کی شرح سے سود لگتا ہے اور اصل مع سود پندرہ سال تک ماہوار قسطوں کی شکل میں ملتا رہتا ہے۔

۳۳۲۵ روپیے کے پندرہ سالہ انیوئٹی سرٹیفکٹ پر ۲۵ روپیے، ۶۶۵۰ روپیے کے سرٹیفکٹ پر ۵ روپیے، ۱۳۳۰۰ کے سرٹیفکٹ پر ۱۰۰ روپیے اور ۲۶۶۰۰ کے سرٹیفکٹ پر ۲۰۰ روپیے ماہوار پندرہ سال تک ملتے رہتے ہیں۔

ماہوار قسطیں سرٹیفکٹ خریدنے کے ایک ماہ بعد سے ملنا شروع ہوجاتی ہیں۔ انیوئٹی سرٹیفکٹ ایک آدمی ۲۶۶۰۰ روپیے تک اور دو آدمی مشترکہ طور پر ۵۳۲۰۰ روپیے تک خرید سکتے ہیں۔ یہ سرٹیفکٹ نابالغوں کی جانب سے بھی خریدے جاسکتے ہیں۔ انیوئٹی سرٹیفکٹ خریدنے کے لئے درخواست اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی کسی شاخ کو دی جاسکتی ہے اور جہاں اسٹیٹ بنک کی شاخیں نہیں ہیں وہاں اترپردیش کے تمام سرکاری خزانوں اور تحتی خزانوں میں درخواست دی جاسکتی ہے۔ درخواست کے ساتھ سرٹیفکٹ کی قیمت نقد یا چک کی شکل میں داخل کی جاتی ہے۔

انیوئٹی سرٹیفکٹ خریدنے والا جس سرکاری خزانہ یا تحتی خزانے سے ماہوار قسطیں وصول کرنا چاہے وصول کرسکتا ہے اس میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی۔

اگر پندرہ سال سے قبل انیوئٹی سرٹیفکٹ خریدنے والے کا انتقال ہوجائے تو اس کے ورثا کو ماہوار قسطیں ملتی رہیں گی اگر مشترکہ طور پر دو آدمیوں نے انیوئٹی سرٹیفکٹ خریدے ہیں اور ان میں سے ایک کا انتقال ہوگیا تو جو زندہ ہے اسی کو کل ماہوار قسط ملتی رہے گی لیکن کسی صورت میں بھی بقیہ رقم یک مشت واپس نہ ہوسکے گی۔

اگر انیوئٹی سرٹیفکٹ کھو جائیں یا بے احتیاطی کی وجہ سے خراب ہوجائیں تو ان کے بجائے دوسرے سرٹیفکٹ ایک روپیہ فیس داخل کرکے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

ان سرٹیفکٹوں سے حاصل کی ہوئی آمدنی بھی انکم ٹکس سے مستثنیٰ ہے۔

کمولٹیو ٹائم ڈپازٹ اسکیم

یہ اسکیم حکومت ہند نے ایسے لوگوں کے لئے شروع کی ہے جو یکمشت کوئی بڑی رقم جمع نہیں کرسکتے لیکن اپنے خرچ میں کاٹ چھانٹ کرکے ماہوار آمدنی سے کچھ بچا سکتے ہیں تاکہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و شادی اور دوسرے کاموں کے لئے تھوڑا تھوڑا کرکے ایک معقول رقم جمع کرسکیں۔

اس اسکیم کے تحت پانچ سال کی مدت کا حساب اور دس سال کی مدت کا حساب رکھا گیا ہے۔ پانچ سال والے حساب میں ایک شخص پانچ، دس، بیس، پچاس، سو اور دوسو روپیے ماہوار تک ڈاکخانہ کے سیونگ بنک میں جمع کرسکتا ہے لیکن دس سال والے حساب میں ایک شخص سو روپیے ماہوار سے زائد نہیں جمع کرسکتا۔ البتہ دو شخص مشترکہ طور پر دوسو روپیے ماہوار تک جمع کرسکتے ہیں۔ یہ پانچ سالہ اور دس سالہ حسابات نابالغوں کے نام سے بھی کھولے جاسکتے ہیں۔

پانچ سال والے حساب میں ماہوار پانچ روپیے داخل کرنے پر

۳۲۵ روپئے، دس روپئے پر ۶۵۰ روپئے، بیس روپئے پر ۱۳۰۰ روپئے، پچاس روپئے پر ۳۲۵۰ روپئے، سو روپئے پر ۶۵۰۰ روپئے اور دو سو پر ۱۳۰۰۰ روپئے پانچ سال بعد ملیں گے۔

اسی طرح دس سال والے حساب میں ماہوار پانچ روپئے داخل کرنے پر ۷۲۵ روپئے، دس روپے پر ۱۴۵۰ روپئے، بیس روپئے پر ۲۹۰۰ روپئے، پچاس روپئے پر ۷۲۵۰ روپئے اور سو روپئے پر ۱۴۵۰۰ روپئے دس سال بعد ملیں گے۔

داخلہ کا طریقہ۔ ماہوار رقم ہر ماہ کسی تاریخ پر داخل کی جا سکتی ہے ناغہ کی صورت میں جتنے ماہ کے ناغے ہوں گے اتنے ماہ میں حساب مکمل ہوگا یعنی اگر پانچ سال والا حساب ہے اور دو ماہ مقررہ رقم نہیں داخل کی گئی اور اس طرح پانچ سال کی مدت میں دو ناغے ہوئے تو جمع شدہ رقم مع سود کے دو ماہ مزید ادائیگی کے بعد ملے گی یہی صورت دس سال والے حساب میں بھی ہوگی۔

پانچ سال والے حساب میں مجموعی طور پر پانچ سے زائد ناغے نہیں ہونے چاہئیے اور دس سال والے حساب میں اس سے زائد ناغے نہیں کئے جا سکتے۔ اس سے زائد ناغے کی صورت میں حساب ختم کر دیا جائیگا اور جمع شدہ رقم متناسب سود کے ساتھ حساب کی مدت پوری ہونے کے بعد مل جائے گی۔

قرض۔ پانچ سال والے حساب میں ایک سال بعد ایک مرتبہ اور دس سال والے حساب میں دو مرتبہ کسی وقت جمع شدہ رقم کا ۵۰ فی صدی قرض کی صورت میں نکالا جا سکتا ہے جو حساب کی مدت پوری ہونے کے بعد دی جانے والی رقم سے مع سود کے کاٹ لیا جائے گا۔ قرض لی جانیوالی رقم پر سود چھ روپئے فی صدی سالانہ کی شرح سے لگایا جائے گا۔

انتقال۔ اگر حساب کھولنے والا مدت پوری ہونے سے پہلے ہی انتقال کر جائے تو اس کے ورثا اس حساب کو بدستور جاری رکھ سکتے ہیں اور ماہوار رقم ادا کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ حساب ختم کرنا چاہیں تو انھیں جمع شدہ رقم مع متناسب سود کے مل جائے گی۔ دو آدمیوں کے مشترکہ حساب کی صورت میں زندہ رہنے والا شخص تنہا مالک سمجھا جائے گا اور وہ حساب کو جاری رکھ سکے گا چاہے اس کی وجہ سے حساب کی مقررہ مدت میں توسیع کرنی پڑے۔

پاس بک حساب کھولنے والے کو ڈاکخانہ سے پاس بک ملے گی جو اسے ہر ماہ روپیہ داخل کرتے وقت، قرض لیتے وقت، حساب کی مدت پوری ہونے پر یا درمیان میں ختم ہونے پر ڈاکخانہ میں پیش کرنی ہوگی۔

پوسٹ آفس سیونگ بنک ڈپازٹ

یہ ڈاک خانہ میں حساب کھولنے کا عام طریقہ ہے جس سے قریب قریب سبھی لوگ تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں۔ آپ یہ حساب سیونگ بنک کا کام کرنے والے کسی ڈاک خانہ میں دو روپئے کی رقم سے کھول سکتے ہیں اور اس کے بعد ایک روپیہ بھی اگر آپ کے خرچ سے فاضل ہو آپ اپنی پاس بک ڈاکخانہ میں لے جاکر یہ روپیہ داخل کر سکتے ہیں جب آپ کے ۲۵ روپئے ڈاک خانہ میں جمع ہو جائیں گے تو ان پر ڈھائی روپئے فی صدی سالانہ کی شرح سے سود ملے گا۔

آپ جمع کئے ہوئے روپئے میں سے ہفتہ میں ایک مرتبہ اپنی ضرورت کے مطابق روپیہ نکال سکتے ہیں۔ ہفتہ دوشنبہ سے سنیچر تک کا رکھا جاتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آپ کسی ہفتہ میں سنیچر کے دن ڈاک خانہ سے روپیہ نکالیں تو اس کے تیسرے دن دوشنبہ کو نیا ہفتہ شروع ہونے پر روپیہ نکال سکتے ہیں۔

چیک۔ حال ہی میں لوگوں کی آسانی کے لئے چیک کے ذریعہ روپیہ نکالنے کا طریقہ ڈاکخانوں میں بھی رائج کیا گیا ہے لیکن یہ آسانی صرف پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ہے اور فی الحال صرف شہر، ضلع اور قصبوں کے بڑے ڈاک خانوں تک فراہم کی جا رہی ہے۔

چیک ڈھائی سو روپئے سے کم کے حساب پر نہیں جاری کیا جا سکتا۔ اگر آپ چیک کے ذریعہ ڈاک خانہ سے روپیہ نکالنا چاہتے ہیں تو آپکو ڈاک خانہ سے ایک فارم حاصل کرکے جو اس مقصد کے لئے مفت فراہم کیا جاتا ہے بھرنا ہوگا۔

گفٹ (تحفہ) کوپن

تحفہ کوپن شادی بیاہ، رکشابندھن اور سالگرہ کے موقع پر پیش کرنے کے لئے رائج کئے گئے ہیں۔ ایسے موقعوں پر بعض وقت اچھا، مناسب اور کچھ دنوں تک یادگار کے طور پر چلنے والا تحفہ تلاش کرنے میں دشواری

ہوتی تھی حکومت ہند نے گفٹ کوپن اس دشواری کو دور کرنے کے لئے تیار کئے ہیں۔

یہ گفٹ کوپن آپ کو آسانی کے ساتھ ڈاک خانہ سے مل سکتے ہیں۔ یہ کوپن پانچ، دس، پچاس، سو اور ایک ہزار کی قیمت کے ہوتے ہیں آپ انھیں مقررہ فارم پر درخواست دے کر ڈاک خانہ سے حاصل کرسکتے ہیں اور انھیں بچے، بوڑھے، جوان جس کو چاہیں بطور تحفہ کے پیش کرسکتے ہیں۔

تحفہ پانے والا گفٹ کوپن کو بارہ سالہ نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ میں ہر اس ڈاک خانہ سے جو سیونگ بنک کا کام کرتا ہو تبدیل کرا سکتا ہے۔ اگر گفٹ کوپن کو جاری ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر بارہ سالہ نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ میں تبدیل کرلیا جائے گا تو سرٹیفکٹ پر سود گفٹ کوپن کے جاری ہونے کی تاریخ سے لگے گا ورنہ اس تاریخ سے لگے گا جس تاریخ کو گفٹ کوپن سرٹیفکٹ میں تبدیل کیا گیا ہے۔

اگر کسی وجہ سے گفٹ کوپن تحفہ میں نہ دیا جاسکے تو گفٹ کوپن خریدنے والا ایک ماہ بعد ڈاک خانہ سے اس کے بجائے بارہ سالہ نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ لے سکتا ہے اگر خریدار کے پاس پہلے سے نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ اس تعداد میں موجود ہیں جو وہ زیادہ سے زیادہ خرید سکتا ہے تو تین ماہ بعد گفٹ کوپن کی قیمت اس ڈاک خانہ سے جہاں سے گفٹ کوپن خریدا گیا تھا حاصل کی جاسکتی ہے۔

سیونگ اسٹامپ

یہ بچت ٹکٹ بچوں میں پیسہ بچانے کی عادت ڈالنے کے لئے اور ان لوگوں کی آسانی کے لئے رائج کئے گئے ہیں جو ایک وقت میں پانچ روپے والا نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ نہیں خرید سکتے۔

یہ سیونگ اسٹیمپ یعنی بچت ٹکٹ ڈاک خانہ سے ۲۵ نئے پیسے ۵۰ نئے پیسے اور ایک روپئے کے خریدے جاسکتے ہیں۔ ان کے ساتھ ڈاک خانہ سے ایک سیونگ کارڈ مفت ملتا ہے جس پر یہ ٹکٹ چسپاں کردیئے جاتے ہیں اور جب ٹکٹوں کی مجموعی قیمت پانچ روپئے ہو جاتی ہے تو وہ بارہ سالہ نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکٹ میں تبدیل کردیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح بچے شروع ہی سے اپنے لئے کچھ بچانے کے ساتھ ساتھ ملک کی ترقی و تعمیر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگتے ہیں۔

✱

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ (۱۹۵۶ میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ "نیا دور" کے حقوق مالکانہ وغیرہ کے بارے میں حسب ذیل تفصیل شائع کی جاتی ہے۔

۱۔ شائع ہونے کی جگہ	لکھنؤ
۲۔ اوقات اشاعت	ماہوار
۳۔ پرنٹر کا نام اور قومیت اور پتہ	شری ایم جی شوم ۔ ہندوستانی ۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری ۔ اترپردیش ۔ الہ آباد
۴۔ پبلشر کا نام اور قومیت اور پتہ	شری بھگوتی شرن سنگھ ۔ ہندوستانی ۔ ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات اترپردیش ۔ لکھنؤ
۵۔ اڈیٹر کا نام اور قومیت	شری صباح الدین عمر ۔ ہندوستانی ۔ محکمۂ اطلاعات ۔ لکھنؤ
۶۔ اُن اصحاب کے نام جو اس اخبار کے مالک یا حصے دار ہیں یا اس کے تمام سرمایہ کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصے دار ہیں	"نیا دور" سرکاری جریدہ ہے اس لئے اس بارے میں اُن اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس اخبار کے مالک یا حصے دار ہیں یا اس کی ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں بھگوتی شرن سنگھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیل میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہے۔

(دستخط) بھگوتی شرن سنگھ

پبلشر

انتظار

منظر سلیم

راستہ دیکھ رہا ہوں، ابھی آئے گا کوئی
ابھی جذبات کی وادی میں چراغاں ہوگا
ابھی احساس کی دنیا کو سجائے گا کوئی
ابھی یہ زیست کا ویرانہ، گلستاں ہوگا

اس طرح چھلکیں گے ان کھوئی ہوئی آنکھوں کے جام
گرد دھل جائے گی چہرے سے کڑی راہوں کی
اس طرح دیں گے حسیں ہونٹ مسرت کا پیام
دور ہو جائیں گے غم، اور تھکن برسوں کی

ابھی سینے میں اتر آئے گا مہتاب جمال
دل کی تاریکی میں چھیڑے گا کوئی نور کے ساز
موج بادہ کی طرح ذہن میں ابھریں گے خیال
زیست، بن جائے گی اُس جانِ جہاں کی آواز

اس سے پہلے بھی یونہی راستہ دیکھا ہے بہت
زندگی کو یونہی خوابوں میں سنوارا ہے بہت

اردو شاعری میں ہولی

مسیح الزماں

ہولی ہندوستان کے موسم بہار کا تیوہار ہے۔ جب جاڑے کی برفیلی ہواؤں کی تیزی خوشگوار اٹھکھیلیوں میں بدل جاتی ہے، آم کے بور کی خوشبو ہر طرف پھیل کر کوئلوں کو دیوانہ کر چکی ہے اور ہزاروں پیلے پیلے تاج پہنے ہوئے درخت سبز موتیوں جیسی کیریوں سے لد جاتے ہیں، جب لہلہاتی کھیتیوں کی ہریالی زرد دوشالہ اوڑھ لیتی ہے اور پیاری زمین اپنے بچوں کی محنت سے مسکرا کر سونا اگل دیتی ہے تو اس ملک کے رہنے والوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگتے ہیں۔ اپنی محنت کو پھل اور اپنی امیدوں کو کامیابی سے ہمکنار دیکھ کر ان کی نگاہوں سے شراب چھلکنے لگتی ہے، ہونٹوں سے نغمے پھوٹ نکلتے ہیں اور خوشی کی شدت میں بے تاب ہو کر عورت مرد سبھی ڈھولک کی مدھر تھاپ پر جھومنے لگتے ہیں۔ رنگ کی پچکاریاں چلنے لگتی ہیں۔ گلرنگ دھاریں فضا میں لہرانے لگتی ہیں۔ قہقہے گنگناتے ہیں۔ اور شوخیاں ناچتی ہیں۔ نظیر اکبرآبادی اس عالم کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

آ جھمکے عیش و طرب کیا کیا جب رنگ دکھایا ہولی نے
ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی یوں لطف جتایا ہولی نے
ہر خاطر کو خورسند کیا ہر دل کو لبھایا ہولی نے
دف رنگیں نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے
بازار گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے

ہر آن خوشی میں آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں، کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ راگ اور رنگ جھمکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودے ہیں کچھ اچھلے ہیں کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

دیہات کے رہنے والے ہوں یا شہر کے بسنے والے سب ہی اپنی اپنی طرح ہولی مناتے ہیں خوش ہوتے ہیں اور اس خوشی کو طرح طرح ظاہر کرتے ہیں۔ کہیں پینے پلانے کی محفل جمتی ہے کہیں راگ رنگ کا جلسہ سجتا ہے۔ نظیر کے یہ قول۔

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور ساغر کے چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

سامان جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا
وہ سب سامان مہیا ہو اور باغ کھلا ہو ہولوں کا
ہر آن شرابیں ڈھلتی ہوں اور ٹھٹھ ہو رنگ کے ڈوبوں کا
اس عیش مزے کے عالم میں اک غول کھڑا محبوبوں کا
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اور ایک طرف دل لینے کو محبوب بھوئیوں کے لڑکے
ہر آن گھڑی گت بھرتے ہوں کچھ گھٹ گھٹ کے کچھ بڑھ بڑھ کے
کچھ ناز جلاویں لڑ لڑ کے کچھ ہولی گاویں اڑ اڑ کے
کچھ لچکے شوخ کمر پتلی کچھ ہاتھ چلے کچھ تن پھڑکے
کچھ کافر میں مٹکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

شاعر کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ سب سے الگ نظر رکھتا ہے۔ حالات اور مناظر کی ہو بہو تصویریں کھینچنا ہی اس کا کام نہیں بلکہ وہ اپنی تخیل کی مدد سے ایسی چیزیں دیکھ لیتا ہے جو سب کو نظر نہیں آتیں۔ زمین پر ہولی کی جو بہاریں اس نے دکھائی ہیں وہ تو سب ہی دیکھتے ہیں لیکن دیکھئے ــــ وہ آسمان پر بھی ہولی کی سرمستیاں دیکھتا ہے۔

جو گھر کے ابر کبھی اس مزے میں آتا ہے — تو بادلوں میں وہ کیا کیا ہی رنگ لاتا ہے
خوشی سے رعد کبھی ڈھولک کے گیت گاتا ہے — ہوا کو ہولیاں گا گا کے کیا سناتا ہے
تمام رنگ سے پُر ہے بہار ہولی میں

آسمان تو آسمان ہے' اُسے تو ہر طرف ہولی کی بہاریں نظر آتی ہیں۔ دیکھئے پھلواری کی کیا کیفیت ہو رہی ہے۔

گلوں نے پہنے ہیں کیا کیا ہی جوڑے رنگ برنگ — کہ جیسے لڑکے یا معشوق پہنتے ہیں تنگ
ہوا سے پتوں کے بجتے ہیں تال اور مردنگ — تمام باغ میں کھیلیں ہیں ہولی گل کے سنگ
عجب طرح کی مچی ہے بہار ہولی میں

جب اس طرح ساری کائنات ہی ہولی منا رہی ہو تو پھر یہاں کے بسنے والوں کا کیا کہنا۔ خوشی سے بے خود اور کیف میں کھوئی ہوئی حسیناؤں کی حالت جوش نے اس طرح ایک جگہ بیان کی ہے۔

آرائشوں کی فکر نہ زیبائشوں کا ہوش — وارفتگیٔ لالہ رخاں دیدنی ہے آج

نظیر نے اپنے اشعار میں اس وارفتگی کا منظر پیش کیا ہے اور وہ بھی کنھیا جی کے دیس کی وارفتگی کا منظر۔

گھروں سے سانوری اور گوریاں نکل چلیاں — کسمبی وڑھنی اور مست کرتی اچھلیاں
جدھر کو دیکھیں دھوم مچ رہی ہیں رنگ رلیاں — تمام برج کی پریوں سے بھر رہی گلیاں
مزا ہے سیر ہے در ہر کنار ہولی میں

جو کوئی سیانی ہو اس میں تو کوئی ہے ناکند — وہ شور ور ہیں سب رنگ سے نپٹ یکجند

کوئی دلاتی ہے ساتھن کو یار کی سوگند — کہ اب تو جامہ دانگیا کے ٹوٹنے ہیں بند
پھر آ کے کھیلیں گے ہو کر دوچار ہولی میں

اجتماعی مسرت اور خوش حالی کی کتنی خوش آیند تصویر ہے جس میں غم و الم سے دور نشاط و کیف کا راج ہے۔ جیسے جوانی نے روپ نکھارا ہو۔ جیسے فطرت نے دھرتی کے سارے خزانے لٹا دیئے ہوں۔ اور شاعر کی فن کاری اور قدرت دیکھئے کہ وہ ان چہلوں اور شوخیوں کی کیسی جاندار تصویر پیش کرتا ہے۔

یہ عوام کی زندگی اور متوسط طبقے کی چہلیں تھیں لیکن اونچے طبقے کے لوگ بھی' ہندو مسلمان سب' بڑے چاؤ سے اُسے مناتے رہے۔ اور یہ صرف پبلک سے مخصوص نہیں تھا بلکہ راجہ اور نواب' حاکم اور بادشاہ سب کا یہی طریقہ تھا۔ نواب آصف الدولہ کے ہولی منانے کا بیان میر تقی میر نے اس طرح کیا ہے۔

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر — رنگ صحبت سے عجب ہیں خورد و پیر
دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں — جیسے گلدستے تھے جوؤں پر رواں
زعفرانی رنگ سے رنگیں لباس — عطر مالی سے سبھوں میں گل کی باس
رنگ فشانی سے پڑی ہی پھوار — رنگ باراں تھا مگر ابر بہار
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال — جس کے لگتا آن کر پھر منہ ہو لال
برگ گل ملوا اڑاتے تھے عبیر — تھی ہوا میں گرد تا چرخ اثیر
ہاتھی آئے کوہ پیکر کیا بنے — جیسے مدھ ماتے جواں ہوں ان منے

ہولی کی بہاریں رنگارنگ ہیں۔ یہ ہولی جہاں لوگوں کے لئے سرور و کیف' عشرت و سرمستی کا پیغام بن کر آتی ہے وہاں بہتوں کے لئے آنسوؤں کے ریلے بھی لاتی ہے۔ جو لوگ اپنے چاہنے والوں سے دور ہیں ان کے لئے یہی پچکاریاں' یہی مسرتوں میں ڈوبے ہوئے قہقہے' چھری اور کٹار بن جاتے ہیں اور موسم کی شگفتگی دوری کے احساس کو بڑھا کر دل کی ہوک تیز کر دیتی ہے۔

لئے ہاتھوں میں پچکاری پھرت ہیں — عبیر اپنے پیا کے مکھ ملت ہیں
گلال اور رنگ سب کچھ کھیلتی ہیں — گلاب اور مشک اُس میں میلتی ہیں
اری عالم میں ہولی مچ رہی ہے — دف و مردنگ کی گت لگ رہی ہے
سبھی ہنس ہنس کے پی کے سنگ بولیں — خوشی سیتی پیا کے سنگ جھولیں
رنگیلی چوری پر رنگ ڈالیں — بھیگیں ہوری میں گوری ساری ناریں

تمام رات ماجیں دو کو گا ں سکل سب ماری کے من کو بھا دیں
اتی یہ بیکہ کر ہنگامہ ہو لی مرے حق یہ قیامت آج ہولی
(مکٹ کہانی)

انقلاب کے سپاہیوں کے بعد آپ سے برہا کی داستان ملاحظہ ہو۔
سکھی ہا س کے کھیلیں پھاگن ہوری سئے پھر پھر سکھی عمر اکی تھوری
سیجوں کو گیت رنگ اب اگ بھائے مرے تن کو تو پوری سی تجرا دے
سکھی مل مل کے ہوری کو گا دیں مری بیراگ سوں چھاتی جلا دیں
سکھی دو رنگ نہیں یا بھاگ سہے گا ہمارے جیو کا بیراگ سہے گا
پیا لوں آگ جب ہوری پڑے گی بچاری جیو کو تب کیا کرے گی
جذبات سے بھرپور محبت کی ماری کے دل پر جو گزرتی ہے اور وہ مردوں کو دیکھ دیکھ کر سینے پر جو سانپ سا لوٹ جانے کی کیفیت ہوتی ہے ان کا کا بیان نہیں ہے۔ ایک برہنی کے احساسات مقصود پیش کرتے ہیں۔
لگا پھاگن مچی ہوری دو عالم ہزار افسوس ہے یہ دیس بالم
پیا سے پھاگ کھیلیں ناریاں سب اڑا دیں رنگ و پچکاریاں سب
رہیں شرلور سب کی چولیاں کھی عبیر و لال کر کر جھولیاں کھی
کوئی گا دے سکھی کوئی سنا دے پیا ں آہ مجھ کو کچھ نہ بھا دے
اری سکھیو مبارک باد تم کو دئیے اچھے صدا لے بھاگ تم کو
کہے ہیں دل میں سب مجھ کو دوانی چلی یہ ہاتھ سے فصل جوانی
سکھی سب ڈھاک پھولے انوا بورے پیا اب تک نہ مورے آہ بورے
پیا کے غم میں میں ساری گئی سوکھ مرے جوبن کی پھلواری گئی سوکھ
(بارہ ماسہ مقصود)

آپ نے دیکھا۔ ہمارے سماج کے اس گونگے طبقے کے جذبات کو بھی اردو شاعروں نے نظر انداز نہیں کیا جسے عورت کہتے ہیں بلکہ جذبات کے ساتھ ساتھ لب و لہجہ میں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے تاکہ اصلیت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ لیکن ان شعروں سے آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہئیے کہ عورت کی زبان سے صرف برہا کی داستان ہی شاعر بیان کرتا ہے۔ اردو میں کتنی ہی ہولیاں اور گیت ایسے لکھے گئے ہیں جن میں عورتوں کی زبان سے باتیں کہی گئی ہیں۔ گیتوں کا انداز تو عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اودھ پنچ لکھنؤ کا ایک مطبوعہ گیت ملاحظہ ہو۔

جانے نہ دے موہے پنیا بھرن کو روکے ڈگر پچکاری کے مارے
رنگ میں بھگوئے موری بہیاں پکڑ کے کیسے بتاؤ کوئی ساری سنبھالے
آگے کے بول تو ذرا شوخ زیادہ ہیں لیکن ان سے خیال حسرت موہانی کے تین شعروں کی طرف چلا جاتا ہے۔

موپہ رنگ نہ ڈال مراری منتی کرت ہوں تمہاری
پنیا بھرن کا جائے نہ دیہیں شیام بھرے پچکاری
تھر تھر کانپت لاجن حسرت دیکھت ہیں نر ناری

ہولی کا ذکر غزلوں میں بھی ہے اور جدید شاعری میں بھی۔ اردو کا سب سے بڑا شاعر میر تقی میر کہتا ہے۔

موسم عبیر عاشق اصرار سے ملے ہیں کب ہاتھ کھینچتے ہیں معشوق کی نہیں سے
اور اس شعر میں دیکھئے کیسی تصویر کھینچی ہے۔
یکسو گلال منہ پر خوباں کے مل رہے ہیں الجھے ہیں ہاتھ یکسو گیسوئے نار میں سے

اودھ پنچ کی ایک غزل مطبوعہ ۱۸۸۱ء ملاحظہ ہو:

سرخ ہے اس عیرت گل پیرہن کا رنگ آج پھوٹ نکلا پیرہن سے کیا بدن کا رنگ آج
پان کا لاکھا جما کر ناز سے کہتے ہیں وہ غنچۂ گل سے کہو دیکھے دہن کا رنگ آج
ہو گیا ہے سرخ پانی حوض کا مثل گلاب غسل میں چھوٹا مگر تیرے بدن کا رنگ آج
لال ہے چہرہ بھی آنکھیں بھی الٰہی خیر ہو کچھ تو بے ڈھب ہے مرے ماہ کرن کا رنگ آج
رنگ ہولی کا ہے یا پھولا ہے ٹیسو ہر طرف رشک صحرائے جنوں ہے ہر چمن کا رنگ آج
دیکھئے اے پنچ اس مضمون رنگیں کی بہار صفحۂ کاغذ دکھاتا ہے چمن کا رنگ آج

بھوک اور گرانی غریبی کا احساس ہمارے شاعروں کے لئے جنگ عظیم کے بعد کی چیز نہیں۔ احمد علی شوق قدوائی نے ۱۸۷۸ء میں یہ نظم لکھی تھی۔

گرانی میں اب کی جو آئی ہے ہولی نیا سوانگ میں سوانگ لائی ہے ہولی
نہ پوری کچوری نہ آلو نہ اروی دہائی ہے ہولی دہائی ہے ہولی
جلایا تھا جس طرح سوکھے نے ہم کو اسی طرح ہم نے جلائی ہے ہولی
گرانی نے پہلے سے پھیری تھی جھاڑو مگر چھاننے خاک آئی ہے ہولی
یہ افلاس دیکھے یہ ٹیکس اور مہنگی یہ کیوں آئی کیا بوکھلائی ہے ہولی
للائن کی سنتھنی بٹیوا کی سڑیا گرو گا نٹھ کر کے منائی ہے ہولی

ہولی پر اردو شاعری میں اور بھی کہا گیا ہے۔ صرف ہولی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مختلف تیوہاروں مثلاً بسنت، دیوالی وغیرہ پر کافی تعداد میں اشعار ملتے ہیں۔

جستر ۱۸۸۲

غزل

صبغۃ اللہ شہید

وہ جن کو سمجھا ہے دیوانہ ایک دنیا نے
خدائے عشق یہ کہتا ہے وہ ہیں فرزانے

جو ان کا ہو گیا اوروں سے کیا غرض اس کو
جو ان کو جان گیا دوسروں کو کیا جانے

وہاں سے منزل جاناں تھی دور کوسوں دور
جہاں سمجھتے تھے منزل تمام فرزانے

ہزاروں درس حقیقت پڑھا دیئے تو نے
سلام تجھ پہ ہوں لاکھوں شہید پروانے

کرامتیں ہیں یہ سب تیری ذوقِ پابوسی
وہ آج آتے ہیں تربت ہماری ٹھکرانے

الٰہی کون ہے موضوعِ بحث دنیا کا
یہ کس کے نام کی رٹ ہے یہ کس کے افسانے

تمہارے در پہ جو بیٹھے تو مر ہی کے اٹھے
بلایا لاکھ ہمیں دلفریب دنیا نے

وہ تاج و تخت کو بے قدر کیوں نہ سمجھیں جنہیں
ملے ہیں روزِ ازل بندگی کے پروانے

اندھیری رات میں ہیں بند باب کعبہ و دیر
مگر ہے وا درِ توبہ، کھلے ہیں میخانے

دھرے نہ کان ذرا بھی تمہارے مستوں نے
سنانے والوں نے کیا کیا سنائے افسانے

توقف اور ذرا سا بس اے فرشتۂ موت
وہ آئے دیکھ وہ آئے ہمارے سرہانے

سبھوں کو دیتے ہیں اک درسِ استقامت عشق
قدم پہ شمع کے محوِ سجود پروانے

وہ ملدمن ہوں جہانگیر ہو کہ نور جہاں
کرشمے عشق کے ہیں اور اسی کے افسانے

خدائے وامق و فرہاد و قیس کی ہے قسم
کہ رندگان ابد ہیں کسی کے دیوانے

چڑھے جو دار پہ حق کہہ کے بس انھیں کو شہید
کیا مظفر و منصور حق تعالیٰ نے

لغزش

(از) آقا گوندوز

(مترجم) اکمل لتوی

عرفان بے اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں جمیلہ عرفان خانم پہلے سے موجود تھی اور میز پر ایک دبیز و سفید لفافہ رکھتے ہوئے بولے "اس میں پچاس روپئے ہیں۔ تم نے درزی کے لئے مانگے تھے نا! میں تو جارہا ہوں۔ دفتر پہنچنے میں دیر ہوگئی ہے۔ خدا حافظ"

"شکریہ عرفان.."

وہ خط لکھنے میں مصروف تھی۔ خط ختم کرکے لفافہ میں بند کیا اور کھڑی ہوگئی۔ الماری کی طرف چند قدم بڑھ کر ایک دم کچھ اس انداز سے دوبارہ واپس لوٹی جیسے اس کے ذہن میں یک بہ یک کوئی بات آگئی ہو۔ "اُفوہ! کیا بے خیالی ہے!" وہ میز پر پچاس روپئے بھول گئی تھی۔ حالانکہ خادمہ پر کافی اعتبار تھا مگر پھر بھی وہ رقم کو اس طرح سے چھوڑ دینا احتیاط کے خلاف سمجھتی تھی۔

جمیلہ نے لفافہ اٹھایا اور اسے اپنے بیگ میں ڈال کر باہر جانے کی تیاری میں مصروف ہوگئی۔ نصف گھنٹہ کے بعد وہ زینہ اتر رہی تھی۔ جمیلہ دراز قد، آہو چشم اور گداز بدن کی ایک غیر معمولی حسین عورت تھی جس کی عمر مشکل سے تیس سال رہی ہوگی۔

سڑک پر چلتے ہوئے اس نے سارے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھہری اور کچھ سوچنے لگی "کیا ضروری ہے کہ پہلے درزی کے یہاں چلا جائے یا پھر... نہیں! پہلے سلیم سے مل لیا جائے۔" وہ سلیم سے وعدہ کر چکی تھی کہ وہ صبح بہت تڑکے آئے گی۔

جمیلہ نے ایک ٹیکسی کو آواز دی۔ ہمیشہ وہ ٹریموے میں سفر کرتی تھی۔ شوہر کی سخت محنت کے بل پر گھر کا ہر کام ٹھیک چل رہا تھا خود جمیلہ بناؤ سنگار کے لوازمات کو چھوڑ کر دوسرے تمام غیر ضروری اخراجات سے کنارہ کشی برتتی تھی۔ لیکن آج تو اسے جیسے نشہ سوار تھا۔ وہ بے چین تھی کہ کسی طرح سے جلد از جلد اس تکلیف دہ پہاڑ سے چھٹکارا پاکر سلیم سے جا ملے۔

ٹیکسی ایک بڑے فلیٹ کے سامنے جو محلہ ششلی کی ایک سڑک پر واقع تھا رک گئی۔ پہلی منزل کے ایک مکان کا دروازہ کھلا۔ شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے ایک قبول صورت اور تندرست نوجوان نے جب جمیلہ خانم کو دیکھا تو بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ دونوں ایک ایسے ڈرائنگ روم میں داخل ہوگئے جس کی آرائش میں سادگی کو زیادہ دخل تھا اور جس میں فرنیچر بری طرح سے گھرا نہیں گیا تھا۔ ڈرائنگ روم کی زیبائش بھی صاحب خانہ کے ذوق کا اظہار کر رہی تھی۔ اس نوجوان نے کہا:

"اوہ! میری اچھی جمیلہ! تمھارے الفاظ کی پابندی اور جلد آنے کے سبب سے میں کتنا خوش ہوں۔ اے کاش تم بھی جانتیں!"

"صحیح ہے سلیم.... یہاں آنے سے پہلے میں درزی کے پاس جا رہی تھی مگر پھر کچھ سوچ کر یہ طے کیا کہ واپسی میں وہاں ہولوں گی۔

کیا فرق پڑتا ہے؟"

"بہت اچھا کیا تم نے" سلیم نے خوشی کے ساتھ کہا:

خوش گوار وقت گزرا چلا جا رہا تھا۔ جمیلہ خانم اپنا سگریٹ ختم ہی کرنے والی تھی کہ اس کی نظر گھڑی پر پڑ گئی اور گھبرا کر بولی:

"ارے! مجھے یہاں کافی دیر ہو گئی۔ اب تو سیدھے مکان جانا پڑے گا۔ درزی کے یہاں کل جاؤں گی"

جلدی جلدی اس نے اپنا لباس درست کیا۔ آئینہ کے سامنے اپنے بال ٹھیک کیے اور سرخی پوڈر سے اپنے آپ کو سنوار ہی رہی تھی کہ دروازہ کی گھنٹی بجی۔ وہ کانپ گئی۔ ایک دم سے اس نے اپنا سامان آرائش بیگ میں ڈال لیا اور خوف زدہ ہو کر بولی:

"کون ہے؟"

سلیم بے کو بھی معلوم نہیں تھا کہ کون ہے۔ اسلئے اس نے کہا:

"ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں"

دوبارہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سلیم بے نے کہا:

"کسی کو غلط فہمی ہو گئی۔ ہمارے بالائی حصہ میں ڈاکٹر سمیع بے رہتے ہیں۔ انھیں کو تلاش کرنے کوئی آیا تھا"

"اچھا! اب میں جا رہی ہوں کل پھر آؤں گی۔ اس کے بعد دو دن نہیں آسکتی"

یہ کہہ کر جمیلہ خانم باہر نکلی۔ ٹیکسی بلائی اور مکان واپس ہو گئی۔ ٹھیک اپنے مکان کے سامنے، جب ٹیکسی والے کو پیسے دینے کیلئے اس نے بیگ کھولا تو وہ سفید لفافہ غائب تھا جو اس کے شوہر نے اسکو دیا تھا۔ وہ ہراساں ہو گئی۔ پچاس روپئے...... پچاس روپئے کھو گئے تھے!

جمیلہ خانم نے ذہن پر خفیف سا زور دیا۔ اس کو اس امر کا یقین تھا کہ وہ لفافہ اس وقت تک بیگ میں موجود تھا جب اُسنے سلیم کے مکان جاتے وقت ٹیکسی والے کو پیسے دئے تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے بیگ کو صرف ایک بار اور کھولا تھا۔ وہ بھی اسے سرخی اور پوڈر لگانے کے لئے۔ اس نے سوچا کہ اس دوران میں جبکہ دروازے کی گھنٹی بجی تھی شاید اس نے گھبراہٹ میں اس لفافہ کو وہیں گرادیا ہوگا۔ لفافہ یقیناً سلیم کو مل جائے گا اور کل صبح وہ خود ہی اسے دیدے گا۔

اس نے اپنے بیگ کی ریزگاری سے ٹیکسی والے کو پیسے دئے اور اپنے مکان میں داخل ہو گئی۔

دوسرے دن صبح کے وقت جب وہ دوبارہ سلیم کے یہاں گئی تو سلیم نے پھر اسی محبت اور مسرت سے اس کا استقبال کیا۔ لیکن اس نے نہ تو وہ لفافہ ہی دیا اور نہ ہی اس کے متعلق کچھ تذکرہ کیا۔ جمیلہ خانم کو اس پر کچھ تعجب سا ہوا اور آخر اس نے کہا:

"سلیم تم جانتے ہو کہ میں ایک بے پرواسی عورت ہوں۔ میں نے کل یہاں اپنی ایک چیز گرادی تھی ایک سفید لفافہ .. اس کے اندر نوٹ تھے"

سلیم کو تعجب ہوا اس نے دریافت کیا" کیا تمھیں اس کا یقین ہے کہ لفافہ یہاں ہی گرا ہے؟ میں نے تو کوئی چیز دیکھی نہیں"

"ہاں! مجھے یقین ہے کہ لفافہ مجھ سے یہیں گرا ہے کیوں کہ میں نے اپنا بیگ کسی دوسری جگہ کھولا ہی نہیں۔ شاید تمھاری خادمہ نے آج صبح.. "

سلیم نے بات کاٹ کر جواب دیا" خادمہ تو آج صبح آئی ہی نہیں۔ غالبًا بیمار ہو گئی ہے"

"میرے شوہر نے درزی کے لئے پچاس روپئے دئے تھے جو اس لفافہ میں تھے۔ اگرچہ رقم بہت زیادہ نہیں ہے لیکن بہرحال پریشانی کی تو بات ہے ہی"

"لفافہ اگر یہاں گرا ہے تو وہ ہر صورت میں یہاں ہی ہوگا لاؤ کم از کم ایک مرتبہ تلاش تو کر ہی لیں"

سلیم نے کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا۔ پھر میز کرسی کے نیچے دیکھنا شروع کیا۔ لفافہ ایک صوفہ کے نیچے تھا۔ اسے نکالتے ہوئے وہ چلایا۔

"مل گیا۔ جمیلہ!.. تم نے صوفہ کے نیچے گرادیا تھا"

جمیلہ بھی اس بازیافت سے بہت خوش ہوئی اس نے ایک لمبی سانس لی لیکن لفافہ کھولتے وقت اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی

رہ گئیں۔ ہکلاتے ہوئے بدقت اس نے کہا:

"لیکن سلیم! یہ لفافہ تو خالی...!"

سلیم نے بھی حیرت سے استفسار کیا۔

"خالی ہے؟"

"تم خود دیکھو! اس میں کچھ نہیں۔"

دونوں کی گفتگو کے درمیان ایک طویل تکلیف دہ اور تلخ خاموشی کا وقفہ گزرا جسے جمیلہ کے ان الفاظ نے توڑا:

"غالباً آپ کی غیر موجودگی میں خادمہ آئی ہوگی۔ ایک بار اس سے پوچھئے تو سہی۔ پھر اور تلاش کیجئے۔ شاید رقم مل جائے۔ اب تو میں جا رہی ہوں۔ پرسوں پھر آؤں گی۔"

جمیلہ خانم تیزی سے مکان کے باہر نکلی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ پچاس روپئے کھو جانے سے وہ مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ "یہ رقم یقیناً سلیم نے لی ہے۔ اس شخص کو میں اتنی اچھی طرح نہیں جانتی تھی کہ ... ہم دونوں کی واقفیت گذشتہ سال ایک چائے پارٹی میں ہوئی تھی۔ مجھے صرف اس کا نام ہی معلوم ہو سکا تھا۔ میں تو اب تک یہ نہیں جانتی کہ وہ کام کیا کرتا ہے۔ وہ مجھ سے کھیلتا رہا۔ مجھ سے اظہار محبت کرتا رہا۔ مجھے بھی وہ کچھ اچھا معلوم ہوا۔ مجھے اس کی باتوں نے متوجہ کر لیا۔ مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی۔ لیکن اب ... یہ شخص میری رقم چرا رہا ہے۔ بعد میں لفافہ پا جانے کا بہانہ.... دیکھتی ہوں! پرسوں تک اس کے دماغ میں کچھ آ گیا تو یقیناً وہ میری رقم واپس کر دے گا۔"

دوسری طرف سلیم یہ سوچ رہا تھا "یہ عورت کیا مجھے چور سمجھتی ہے؟ معاملہ کیا ہے؟ ناممکن... اس کے طور طریق سے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ تو صاف صاف مجھ پر الزام لگانے ہی کو تھی۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں! فرض کرو یہ عورت اب نہ آئی تو کیا ہوگا؟.... شاید اس کو پچاس روپئے کی ضرورت تھی جس کے لئے اس نے یہ بہانہ تراشا ہے۔ اگر میں پچاس روپئے دے دوں جس کی اس کو ضرورت ہے، خواہ مجھے اپنے اخراجات کے لئے قرض ہی لینا پڑے تو...!"

جمیلہ دو دن بعد دوبارہ اس کے مکان پر آئی۔ سلیم نے خود ہی ایک لفافہ بڑھا دیا اور کہا: "دام! لیجئے اپنے پچاس روپئے۔"

لفافہ لیتے ہوئے جمیلہ نے کہا: "شکریہ!!"

بات ختم ہو گئی۔ لیکن اب دونوں کے دلوں میں محبت کے جذبات نہ پائے جاتے تھے۔ وہ دونوں آمنے سامنے ضرور بیٹھے تھے مگر روپیہ کے معاملے نے دونوں کو اپنی اپنی جگہ پریشان کر دیا تھا۔ بہرکیف تھوڑی دیر بعد جمیلہ واپس چلی آئی۔

دوسرے دن عرفان بے نے اپنی بیگم سے دریافت کیا:

"کیا تم نے درزی کو دام دے دیئے؟"

"نہیں! ابھی تک تو دیئے نہیں۔"

"تم دے بھی کیسے سکتی ہو۔" اس کے شوہر نے کہا اور اپنے جملہ کی کچھ وضاحت کرنے ہی والا تھا کہ جمیلہ نے اپنا بیگ کھولا اور پچاس روپئے دکھاتے ہوئے کہا:

"دیکھو! ابھی تک یہ میرے بیگ میں رکھے ہیں۔"

عرفان بے کا رنگ ایکدم پیلا پڑ گیا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ بہ دقت اس نے پوچھا: "یہ رقم کہاں سے ملی؟"

"ارے! دیوانے!! تمہاری ہی تو دی ہوئی رقم ہے۔ میں کہتی ہوں کہ ....!"

عرفان بے نے اسے کچھ اور کہنے سے روک دیا۔ جمیلہ کے اس بیان پر ایک شبہ پیدا ہو کر تیر کی طرح اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔ آخر کار اس نے کہا:

"میں نے تم کو پچاس روپئے دیئے ہی نہیں تھے.... تمہارے دینے کے لئے جس لفافہ میں پچاس روپئے رکھے تھے وہ لفافہ میں دفتر ہی میں بھول آیا تھا اور اس کی جگہ میں نے تم کو غلطی سے ایک خالی لفافہ دے دیا تھا۔"

اس حادثہ کے بعد جمیلہ اپنے شوہر کو بھی کھو بیٹھی اور سلیم کو بھی....!

(ترجمہ از ترکی)

تحریک امداد باہمی کی کامیابی • • • لکھنؤ میں کم آمدنی والوں کے لیے فلیٹوں کی تعمیر • • • ہندوؤں کے مذہبی اداروں کی جائدادوں کا تحفظ • • • ایک تاریخی کارنامہ • • • آیورویدک اور یونانی طریقہ علاج • • • عام فہم ہندی کے استعمال پر زور • • • شرم دان کے ذریعہ پل کی تعمیر • • • تربیتی پروگراموں میں رابطے کی ریاستی کونسل • • • متفرقات

ریاست کے مرکزی منطقے کے چھ اضلاع یعنی لکھنؤ، اُناؤ، رائے بریلی، ہردوئی، کھیری اور سیتاپور کے اضلاع میں ضلع رائے بریلی امداد باہمی انجمنوں کے قیام کے سلسلے میں سرفہرست رہا۔ اس ضلع کی تمام گاؤں سبھاؤں میں امداد باہمی انجمنیں قائم ہوگئی ہیں۔ ضلع لکھنؤ دوسرے نمبر پر رہا جہاں نو گاؤں سبھاؤں کو چھوڑ کر تمام گاؤں سبھاؤں میں امداد باہمی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا۔ مرکزی منطقے کی ۷،۱۳۱ گاؤں سبھاؤں میں سے ۶۲۲۵ گاؤں سبھائیں امداد باہمی انجمنوں کے دائرۂ اثر میں آچکی ہیں۔ آئندہ چند مہینوں کے اندر بقیہ ۵۰۶ گاؤں سبھاؤں میں امداد باہمی انجمنوں کے قیام کی کوشش کی جا رہی ہے۔

مرکزی منطقے میں قرضہ دینے والی امداد باہمی انجمنوں کی تعداد بڑھ کر ۷،۲۱۱ ہوگئی ہے جب کہ سنہ ۵۸-۱۹۵۷ء کے آخر میں ایسی انجمنوں کی تعداد ۵۰۳۵ تھی۔ ان میں ۱۰۴۳ خدمتی امداد باہمی انجمنیں ہیں۔

دوسرے پنج سالہ منصوبے کے آخر تک ۴۰،۹۹۶،۷ اشخاص کو ممبر بنانے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ گزشتہ جنوری کے آخر تک مجموعی طور پر ۲۷۹،۱۲ اشخاص ممبر بنائے گئے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ مقررہ نشانے کی جلد ہی تکمیل ہو جائے گی۔

امداد باہمی انجمنوں کو مالی اعتبار سے مستحکم بنانے کے لیے اُن کے سرمایہ حصص میں جو اس وقت ۴۲۵۳۵۲۰ روپیہ ہے اضافہ کرنے کی کوششیں کی گئیں خدمتی امداد باہمی انجمنوں نے ۳۹،۹۹۸ روپیہ نئے سرمایہ حصص کے طور پر جمع کیا۔

منڈیوں میں بھی امداد باہمی مارکیٹنگ سوسائیٹیاں قائم کی گئی ہیں یہ سوسائیٹیاں کسانوں کو اپنی پیداوار مناسب قیمت پر فروخت کرنے میں مدد دیتی ہیں اور ان کو قرضے کی سہولتیں بھی فراہم کرتی ہیں۔ سیتاپور اور لکھیم پور کے اضلاع میں ایسی ۲۲ سوسائیٹیاں قائم کی گئی

ہیں جو گزشتہ ساڑھے تین سال سے قابل تعریف کام کر رہی ہیں۔

مرکزی منطقے میں اب تک ۳۴۳۰۱ خدمتی امداد باہمی انجمنوں کا قیام عمل میں آچکا ہے۔

بنک کاری کے بہتر نظام کی اہمیت کے پیش نظر مرکزی منطقے میں نو بینک قائم کیے گئے ہیں۔ ان بینکوں کی مالی حالت مستحکم کرنے کے لیے حکومت نے بھی ان بینکوں کے حصص خریدے ہیں۔ سنہ ۵۹-۱۹۵۸ء کے آخر تک ان بینکوں میں ۱۰ لاکھ روپے کی مالیت کے تمسکات جمع کیے گئے۔

مرکزی منطقے میں سنہ ۵۹-۱۹۵۸ء کے آخر تک ۱۷۹ بیج گودام قائم تھے۔ سال رواں میں مزید ۷ بیج گوداموں کے قیام کی اُمید ہے۔ مالی سال رواں میں ربیع کے ۲۶۵۳۶۵ من اور خریف کے ۴۱۷۰۲ من بیج تقسیم کیے گئے۔ آئندہ سے صرف اول درجے کے بیج تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ۵۵۶۳۶ میں کیمیاوی کھاد تقسیم کی گئی ہے۔ اس وقت ۷۳ بیج گوداموں کی اپنی پختہ عمارتیں ہیں اور چار عمارتیں زیر تعمیر ہیں۔ اور ۱۴ عمارتوں کی تعمیر کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔

مرکزی منطقے میں ۳۵ امداد باہمی کاشت انجمنیں قائم ہیں ان انجمنوں کے پاس ۵۸۷۹ ایکڑ زمین ہے اور ان کے ممبروں کی تعداد ۲۰۲ ہے ان کا سرمایہ حصص ۵۲۹۰۲ روپیہ اور نجی اور کاروباری سرمایہ بالترتیب ۶۸۰۴۲ روپیہ اور ۲۲۶۷۱۷ روپیہ ہے۔ آب پاشی کی سہولتوں میں توسیع اور کیمیاوی کھاد کی فراہمی کے لیے حکومت کی جانب سے ان انجمنوں کو مخصوص مالی امداد دی جا رہی ہے۔

لکھنؤ امداد باہمی دودھ انجمن اپنی عمارت تعمیر کرا رہی ہے اور جدید اور بڑی مشینیں لگائی جا رہی ہیں۔ اس یونین کے ذریعے اس کی انجمنوں کو دودھ دینے والے مویشیوں کی خریداری اور اُن کی نسل بہتر بنانے کے لیے قرضے دیے جاتے ہیں۔ اس یونین کی مالی حالت مستحکم ہے اور یہ منافع میں چل رہی ہے۔

تحریکِ امداد باہمی کو مکمل طور پر کامیاب بنانے کے پیش نظر کل ہند امداد باہمی فیڈریشن دہلی نے امداد باہمی کی تعلیم دینے کے لیے ایک اسکیم شروع کی ہے جس کے تحت ضلع رائے بریلی میں سلون اور سیتاپور میں ہر گاؤں میں امداد باہمی کے تربیتی کلاس شروع کیے گئے ہیں۔

• • •

ریاست کے شہری اور دیہی منصوبہ بندی کے محکمے نے لکھنؤ میں آوٹرم روڈ پر سرکاری دفاتر کے لیے عمارت، مہانگر میں سنیما، ہوٹل، اور رسٹوران کے لیے ایک عمارت، نہرو کراسنگ پر کم آمدنی والوں کے لیے فلیٹوں اور پیپر ملز کے عقب میں گندی بستیوں میں رہنے والوں کے لیے مزید فلیٹوں کی تعمیر کی نئی اسکیمیں قطعی کی ہیں۔

آوٹرم روڈ پر پانچ بڑے بلاکوں پر مشتمل کئی منزلہ عمارت کی تعمیر کی تجویز ہے جس میں وہ تمام سرکاری دفاتر منتقل کر دیے جائیں گے جو لکھنؤ میں مختلف مقامات پر واقع ہیں۔ اس عمارت کے دو بلاک آٹھ منزلہ، دو پانچ منزلہ اور ایک تین منزلہ ہوگا۔ اس کی تعمیر مختلف مرحلوں میں مکمل کی جائے گی۔

پہلے مرحلے میں آٹھ منزلہ بلاکوں کی تعمیر کی تجویز ہے۔ اس اسکیم پر تقریباً ۴۰ لاکھ روپے کے صرفے کا تخمینہ ہے۔

مہانگر کالونی میں رہنے والوں کی سہولت کے پیش نظر سنیما، رسٹوران اور ہوٹل کے لیے عمارت تعمیر کی جائے گی۔ اس میں فلموں کی نمائش کے لیے ایک آڈیٹوریم بھی ہوگا جس میں ۹۵۰ نشستوں کی گنجائش ہوگی۔ اس عمارت کے پچھلے حصے میں زیریں پہلی اور دوسری منزلوں میں ہوٹل کے کمرے ہوں گے جن کی مجموعی تعداد ۲۵ ہوگی۔ رسٹوران زیریں منزل میں ہوگا جو ہوٹل میں مقیم اشخاص کے ڈائننگ ہال کے طور پر بھی استعمال ہو سکے گا۔ اس عمارت کی تعمیر پر تخمیناً ۵ء۳۱ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

لکھنؤ کنٹونمنٹ ایریا میں خریداری کے مرکز کی فراہمی اور مزید رہائشی مکانات کی تعمیر کے لیے نہرو کراسنگ پر دکانوں اور فلیٹوں کی تعمیر کی اسکیم قطعی کی گئی ہے۔ یہ عمارت تین بلاکوں پر مشتمل ہوگی جو ایک کھلی جگہ کے چاروں طرف ہوں گے۔ ہر ایک بلاک کے زیریں منزل میں دکانیں اور پہلی منزل پر فلیٹ ہوں گے۔ یہ فلیٹ ایک کمرے سے لے کر ڈھائی کمروں پر مشتمل ہوں گے۔

لکھنؤ پیپر ملز کے عقب میں گندی بستیوں میں رہنے والوں کے لیے ایک ایک کمرے کے آٹھ فلیٹوں کے بلاک تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔

حکومت اُتر پردیش نے ہندوؤں کے مذہبی اداروں (جائداد کے اتلاف کی روک تھام) سے متعلق بل ۱۹۶۰ء ہندی اور انگریزی میں غیر معمولی گزٹ میں شائع کردیا ہے۔ یہ بل گزشتہ ۱۰ فروری کو ودھان پریشد میں پیش کیا گیا تھا۔

اس بل کا مقصد ایسے مذہبی اداروں کی جائداد کے تحفظ اور ان کے انتقال پر پابندی عائد کرنا ہے۔

اس بل کی دفعات اس کے نفاذ کی تاریخ سے دو سال تک نافذ رہیں گی اور اس کا اطلاق ریاست میں ہندوؤں کے ایسے تمام مذہبی اداروں پر ہوگا جن کی کل سالانہ آمدنی ۱۲۰۰ روپیہ یا اس سے زائد ہے۔

اس بل کی دفعات کے نفاذ کے لیے ریاستی حکومت کمشنروں، اسسٹنٹ کمشنروں اور جانچ افسروں کو مقرر کرسکتی ہے۔

اس بل کے دفعات کے تحت ریاستی حکومت یا کمشنر کو جسے اختیارات تفویض کیے گئے ہیں اگر اندیشہ ہو کہ کسی ہندو مذہبی ادارہ جس کی کل سالانہ آمدنی اس کے خیال میں ۱۲۰۰ روپیہ یا اس سے زائد کی جائداد کے برباد ہونے کا امکان ہے تو وہ جانچ افسر کو یہ ہدایت کرسکتا ہے کہ وہ اس ادارے کا جائزہ لے اور اپنی رپورٹ پیش کرے۔

کمشنر کو بل کے تحت یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی ہندو مذہبی ادارے یا عبادت گاہ کے اندر داخل ہوسکے اور اس کی جائدادوں کے تمام کاغذات کا معائنہ کرسکے اور اس کے فنڈ اور آمدنی کے بارے میں رپورٹ وغیرہ طلب کرسکے۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی حکم دے سکتا ہے کہ فاضل فنڈ ٹرسٹیوں کے پاس یا بینک وغیرہ میں جمع کردیا جائے۔

اس بل کے ذریعے ایسے مذہبی اداروں کے لیے یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ اس کی کسی جائداد کے انتقال کے لیے پہلے سے کمشنر کی تحریری اجازت حاصل کریں۔

اس بل کی دفعات کی خلاف ورزی کرنے والے ایک ماہ تک کی قید محض یا ۵۰۰ روپے تک جرمانہ یا دونوں سزاؤں کے مستوجب ہوں گے۔

اس بل کی دفعات کا اطلاق ہندوؤں کے کسی ایسے مذہبی ادارے پر نہیں ہوگا جس پر شری بدری ناتھ مندر ایکٹ ۱۹۳۹ء کا اطلاق ہوتا ہے۔

ضلع میرٹھ کے موضع سہانی کی شریمتی برما دیوی نے مردوں کے استہزا اور حوصلہ شکن باتوں کی پروا کیے بغیر عزم راسخ کی تاریخی مثال پیش کی ہے۔ شریمتی برما نے رضاکارانہ محنت کے ذریعے ۲۵ دن کے اندر ایک کنوئیں کی تعمیر مکمل کرکے مردوں کے شک و شبہات کو باطل ثابت کردیا۔

شریمتی برما نے گاؤں کے مردوں سے التجا کی کہ گاؤں کے وسط میں ایک کنواں تعمیر کیا جائے تاکہ عورتوں کو پانی کے لیے دور افتادہ کنوئیں تک نہ جانا پڑے۔ گاؤں کے مردوں نے اس تجویز کا مذاق اڑایا اور اُن کی حوصلہ شکنی کی۔ شریمتی برما دیوی کے حوصلے بلند تھے۔ اُس نے گاؤں کی چار عورتوں کو جمع کیا اور سب نے مل کر عہد کیا کہ وہ خود اپنی مشقت اور جانفشانی سے کنوئیں کی کھدائی کریں گی۔

ان کی عرق ریزی اور جذبۂ صادق رنگ لایا اور ۵۰ فیٹ کی گہرائی تک کھدائی ہونے پر سوت سے پانی اُبل پڑا۔ گاؤں کے مردوں نے بھی جو پہلے ان عورتوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے دست تعاون بڑھایا لیکن عورتوں نے ان کی پیش کش کو ٹھکرادیا۔

تمام گاؤں والے اب اس کنوئیں کو نعمت تصور کرتے ہیں شریمتی برما دیوی اب گاؤں والوں کی نظروں میں ہیروئن ہے۔

اس کنوئیں کی تعمیر پر دو ہزار روپیہ خرچ ہوا جس میں ۶۰۰ روپیہ لونی کے ترقیاتی بلاک نے عطیے کے طور پر دیا اور بقیہ رقم مقامی چندے سے حاصل ہوئی۔

ریاست میں آیورویدک اور یونانی طریقہ علاج کی رفتار ترقی کی سالانہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۵۸ء میں یونانی اور آیورویدک کی مختلف ڈسپنسریوں میں تقریباً ۹ لاکھ مریضوں کا علاج کیا گیا اور مزید ۸ آیورویدک اور دو یونانی ڈسپنسریوں کا قیام عمل میں آیا۔

اس کے علاوہ سرکاری آیورویدک اور یونانی ڈسپنسریوں، تجربہ گاہوں اور اکاڈمی کے لیے مزید رقم مخصوص کی گئی۔ اور سنہ ۱۹۵۹-۶۰ء میں دیسی طریق علاج پر ۵۵۲۲۸۰ روپیہ صرف کیا گیا جب کہ اس سے قبل سال میں ۴۱۰۸۳۰۰ روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ رپورٹ میں بتایا

گیا ہے کہ آیور ویدک اور یونانی ڈسپنسریوں میں مریضوں کو وقتی سہولتیں فراہم کرنے کے نقطۂ نظر عارضی علاج کے سکشن بھی کھولے گئے۔ مزید برآں تعلیم گرہ ھنوان میں کیمپ لگا کر بدری ناتھ کے راستے میں اور ہردوار کے اردھ کمبھ میلے میں عارضی طبی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سرکاری آیورویدک اور یونانی تجربہ گاہوں میں ۲۶۲ قسم کی دوائیں تیار کی گئیں۔ ان تجربہ گاہوں میں صرف ریاست کی ڈسپنسریوں کے لیے دوائیاں تیار نہیں ہوتی ہیں بلکہ قومی توسیعی سروس بلاکوں اور ہمارے پڑوسی ملک نیپال کے لیے دوائیوں کے عکس بھی تیار کیے جاتے ہیں

زیر نظر سال میں مزید ۷۷۹ ویدوں اور ۲۰۵ حکیموں کو رجسٹر کیا گیا جس سے ۱۹۵۶ء کے آخر میں ریاست میں ایسے ویدوں اور حکیموں کی تعداد بالترتیب ۱۲۵۶۲ اور ۶۹۳۲ ہو گئی۔

اس کے علاوہ آیورویدک اور یونانی اکاڈمی نے گیارہ مصنفین کو ان کی آیورویدک یا یونانی طریقۂ علاج سے متعلق کتابوں پر انعامات دیئے

• • •

اتر پردیش حکومت نے اس عام خیال کے پیش نظر کہ سرکاری ہندی روز بروز سخت مصنوعی اور روزمرہ کی زبان سے مختلف ہوتی جا رہی ہے، یہ احکام جاری کیے ہیں کہ سرکاری کاموں خاص طور سے عدالتوں میں سہل اور مروج ہندی کا استعمال کیا جائے۔

چیف سکریٹری کی جانب سے تمام ضلع مجسٹریٹوں کے نام جاری کی گئی گشتی چٹھی میں کہا گیا ہے کہ سرکاری دفتروں میں سخت اور مشکل ہندی کے بجائے آسان اور عام فہم ہندی کے عام استعمال کے لیے مناسب ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیے

حال ہی میں ہائی کورٹ کی توجہ بھی اس امر کی جانب دلائی گئی تھی کہ ماتحت عدالتوں میں گواہوں وغیرہ کے بیانات قلم بند کرتے وقت ہندی کے سخت اور بھاری بھرکم الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

دستور ہند کی دفعہ ۳۵۱ میں بھی یہ درج ہے کہ ہندی کو اس طرح فروغ دینا چاہیے جس سے وہ ہماری ثقافت کے مختلف عناصر کے صحیح اظہار کا ذریعہ بن سکے۔

ریاستی حکومت نے ہندی کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق یہ ایک ایسی آسان زبان ہے جو ملک میں اور خاص طور پر اس ریاست میں بولی جاتی ہے۔ یہ ناگری رسم خط میں لکھی جائے گی لیکن اصطلاحی الفاظ انگریزی یا رومن رسم خط میں لکھے جا سکتے ہیں۔

• • •

"جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے" کے پرانے مقولے کو لکھنؤ سے ۲۰ میل دور موضع حسناپور کے باشندوں نے شرم دان کے ذریعے لونی ندی پر ایک پل تعمیر کر کے حرف بہ حرف صحیح ثابت کر دیا ہے۔

یوں تو لونی ایک چھوٹی سی ندی ہے لیکن بارش کے زمانے میں اس میں سیلاب آجانے کے باعث حسناپور یا اس پڑوس کے ۲۵ مواضعات سے بالکل کٹ جاتا تھا جس سے اس علاقے کی اقتصادی زندگی معطل ہو جاتی تھی

اس موضع کے حوصلہ مند اشخاص باہمی صلاح و مشورہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک لونی ندی پر پل تعمیر نہ ہوگا اس وقت تک ان کے مصائب کا خاتمہ نہیں ہو سکتا چنانچہ انھوں نے شرم دان کے ذریعہ پل کی تعمیر کا مصمم ارادہ کیا۔

ضلع منصوبہ کمیٹی نے حسناپور کے باشندوں کے اس عزم محکم کا خیر مقدم کرتے ہوئے دس ہزار روپے کی مالی امداد دی اور اتنی ہی رقم گاؤں والوں نے جمع کی

گاؤں والوں نے شب و روز انتھک کوشش اور محنت کے ذریعہ پل کی تعمیر مقررہ میعاد کے اندر مکمل کر لی۔

اب حسناپور اور اس کے پڑوس کے مواضعات کے ۳۰ ہزار باشندوں کی مصیبت کے دن ختم ہو گئے ہیں اور آج یہ پل ان کی جاں فشانی اور عزم راسخ کا نہ صرف آئینہ دار ہے بلکہ دوسروں کے لیے باعث تقلید بھی ہے۔

• • •

حکومت اتر پردیش نے ریاست بھر میں پیشہ ورانہ تربیتی پروگراموں میں رابطہ قائم کرنے کے لئے ایک ریاستی کونسل کی تشکیل کی ہے۔ نائب وزیر

محنت شری۔ ایچ۔ این بھوگنا اس کے چیرمین اور ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ تربیت اور روزگار شری ایس۔ ایس سنہا اس کے سکریٹری مقرر کئے گئے ہیں۔

یہ کونسل مرکزی حکومت کی سفارشات کے مطابق مقرر کی گئی ہے اور اس کے قیام کا مقصد ریاستی سطح پر نیشنل کونسل کی پالیسی اور پروگراموں پر عمل درآمد اور ریاست بھر میں تربیت کا یکساں معیار برقرار رکھنا ہے۔

ریاستی کونسل مختلف پیشوں کے لئے امتحان کا ایک ریاستی بورڈ مقرر کرے گی اور انجینیرنگ، بلڈنگ، کپڑا اور چمڑے سے متعلق پیشوں اور ایسے دوسرے پیشوں کے لئے بھی نیشنل ٹریڈ سرٹیفکیٹ عطا کرے گی جو مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے ذریعہ اس کے تحت لائے جائیں۔

یہ کونسل تمام ٹکنیکل اداروں کے لئے نصاب تعلیم، سازوسامان، نصاب تعلیم کی مدت اور طریقہ تربیت وغیرہ کی ذمہ دار ہوگی۔ علاوہ ازیں یہ کونسل مختلف تربیتی اسکیموں کے اخراجات کے بارے میں حکومت کو اپنے مشورے پیش کرے گی اور ریاست میں تربیتی پروگراموں کی توسیع میں مدد دے گی۔

متفرقات

درخت لگانے پر انعامات۔ اتر پردیش میں ون مہوتسو کے موقعے پر درخت لگانے کی مہم کو تیز تر کرنے کے پیش نظر حکومت نے شیلڈ، نقد اور سرٹیفکٹوں کی صورت میں انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں تین رننگ شیلڈ رکھی گئی ہیں جن میں ایک گرام سبھا کو دوسری یونیورسٹی کو اور تیسری کسی دوسرے تعلیمی ادارے کو دی جائے گی۔

اس کے علاوہ شیلڈ جیتنے والی گرام سبھا کو ۲۰۰ روپے کا نقد انعام بھی دیا جائے گا اور دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والی گرام سبھاؤں کو بالترتیب ۱۵۰ روپے اور ۱۰۰ روپے کے نقد انعامات دیے جائیں گے۔

درخت لگانے کی مہم میں جو تحصیل اپنے ڈویژن میں بہترین قرار دی جائے گی اُسے "ون روپن شیلڈ" اور اس سلسلے میں ریاست کی بہترین تحصیل کو "اسٹیٹ منتری شیلڈ" دی جائے گی۔

ضلع کی سطح پر انعام جیتنے والوں کا انتخاب ایک کمیٹی کرے گی جو متعلقہ ضلع منصوبہ بندی افسر، ضلع زراعت افسر، اور ڈویژنل فارسٹ افسر اور مجالس قانون ساز کے ممبر پر مشتمل ہوگی۔ ضلع کے نتائج کا ڈویژن کی سطح پر تجزیہ کیا جائے گا اور ڈویژن کی سطح پر جیتنے والوں کے سفارشات کے ساتھ اس کمیٹی کے پاس بھیج دیے جائیں گے جو نائب وزیر زراعت ڈائرکٹر محکمۂ زراعت، ڈیولپمنٹ کمشنر اور محافظ اعلیٰ جنگلات پر مشتمل ہوگی کمیٹی ریاستی سطح پر مقابلہ جیتنے والوں کا قطعی انتخاب کرے گی۔ یہ فیصلہ ۱۵ اگست سے پہلے قطعی ہو جانا چاہیے۔

کھنڈساری کے لیے لائسنس ضروری ہے حکومت اتر پردیش نے کھنڈساری تیار کرنے کے لیے اجرا لائسنس آرڈر مجریہ ۱۹۶۰ء نافذ کردیا ہے جس کے تحت کوئی شخص حاکم اجرا لائسنس سے لائسنس حاصل کیے بغیر بجلی سے چلنے والے کولھو اور مرکز جو مشینوں (سنٹری فوگل) کے ذریعہ کھنڈساری تیار نہیں کرسکتا۔ لائسنس کے لیے درخواستیں متعلقہ علاقے کے گنا انسپکٹر کے ذریعہ شوگر کمشنر کو دینا چاہیے۔

یہاں یہ ذکر نامناسب ہوگا کہ حکومت نے ۳۰ رنومبر ۱۹۵۹ء کو گنے کے ابواب سے متعلق قانون میں چند ترمیمات کے ذریعہ شوگر کمشنر سے لائسنس حاصل کیے بغیر گڑ، راب یا کھنڈساری تیار کرنے کے کسی واحد کے لیے گنے کی فیکٹریوں کے محفوظ علاقوں میں گڑ یا راب تیار کرنا ممنوع قرار دیا تھا۔

اگر کوئی شخص کھنڈساری تیار کرنے کے لیے اجرا لائسنس آرڈر مجریہ سنہ ۱۹۶۰ء یا گنے کے ابواب سے متعلق قانون کے تحت لائسنس حاصل کیے بغیر کھنڈساری گڑ اور راب تیار کرے گا تو اس کے خلاف مذکورہ قوانین کے تحت ضروری کارروائی کی جائے گی۔

کیمیادی کھاد کے بیوپاریوں کو ہدایات۔ کیمیادی کھاد تیار کرنے والوں اور اس کے بیوپاریوں کو مطلع کیا گیا ہے کہ کوئی شخص یا پارٹی کیمیادی کھاد کو حکومت کی مقرر کردہ قیمت یا نرخ سے زیادہ قیمت پر فروخت اور اسٹاک نہیں کرسکتا۔ کیمیادی کھاد کے ہر ایک بیوپاری یا تیار کرنے والے کے لیے یہ لازم ہوگا کہ وہ ڈپو یا اسٹور کے کسی نمایاں مقام پر ہر قسم کی کیمیادی کھاد کا نرخ نامہ آویزاں کرے جس میں اس کی فی ٹن، فی بوری اور فی سیر قیمت درج ہو۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ ہر قسم کی کیمیادی کھاد کی فروخت پر خریدار کو کیش یا کریڈٹ میمو دے۔

مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف کیمیادی کھاد کنٹرول آرڈر ۱۹۵۷ء کی دفعہ ۳ فقرہ (۵) کے مطابق کارروائی کی جائے گی۔

مزید راستوں پر سرکاری بسیں ۔ حکومت اُتر پردیش نے ریاست میں مزید پانچ راستوں کو قومیانے کی اسکیم کو قطعی کرلیا ہے ۔ اُمید ہے کہ جلد ہی ان راستوں پر سرکاری بسیں چلنا شروع ہوجائیں گی ۔

یہ راستے یہ ہیں ــــ رائے بریلی ڈلمئو ــ بھوجپور ـــــــ رائے بریلی ۔ ڈلمئو ۔ اونچا ہار ـــــ کانپور ۔ گنج نیر ـــــــ الہ آباد ۔ **کرچھنا** ۔ اور الہ آباد ۔ کورائوں براہ ناری باری ۔

گزشتہ اکتوبر کے آخر میں ریاست میں ۵۷۵ راستوں پر ۲۸۴۳ سرکاری بسیں چل رہی تھیں ۔

انگریزی کتابچہ کی ضبطی ۔ آندھرا پردیش حکومت نے نومبر ۱۹۵۹ء میں شائع شدہ ”دی چائینیز انڈین بارڈر الیشو“ نامی انگریزی کتابچہ اور ایسی تمام دوسری دستاویزات کو جن میں اس کی نقلیں ترجمے یا اقتباسات ہوں گے بحق سرکار ضبط کرلیا ہے ۔

اس کتابچہ میں جس کو چین کے فلاحی ادارہ کی جانب سے شائع کیا گیا ہے ایسا مواد موجود ہے جس سے حکومت کے خلاف نفرت یا بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے یا ہوسکتی ہے ۔ اور جس کی اشاعت دفعہ ۱۲۴ ۔ الف تعزیرات ہند کے تحت موجب سزا ہے ۔

چینیوں کے خلاف کتاب کی ضبطی ۔ راجستھان حکومت نے ”انو درت کہ بچھ“ نامی ایک ہندی کتاب کو ضبط کرلیا ہے ۔ اس کتاب کے مصنف ایک تیرہ پنتھی سنت ہیں اور یہ رام کرشن پریس دہلی سے شائع ہوئی ہے ۔

اس کتاب میں حکومت کی رائے میں ایسا مواد ہے جس کا مقصد بدنیتی سے دیدہ و دانستہ ہندوستان کے مختلف طبقوں کے درمیان دشمنی اور نفرت کے جذبات کو فروغ دینا ہے اور جس میں سوئتامبر جینیوں کے تیرہ پنتھ فرقہ کے مذہبی جذبات کو جان بوجھ کر برانگیختہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

متھرا ویٹنیری کالج میں داخلہ ۔ یو پی کالج آف ویٹنیری سائنس اینڈ اینیمل ہسبنڈری متھرا کے بی ۔ وی ۔ ایس ۔ سی اور اے ۔ ایچ کے ڈگری کورسوں میں داخلہ کے لئے کالج میں ۲۲ اور ۲۳ جون سنہ ۱۹۶۰ء کو ایک تحریری امتحان ہوگا ۔ درخواستوں کے فارم بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۰ جون سنہ ۱۹۶۰ء ہے ۔

درخواستوں کے فارم مذکورہ کالج سے ۵۰ نئے پیسے ادا کرکے حاصل کئے جاسکتے ہیں ۔ امتحان وغیرہ سے متعلق ضروری تفصیلات کالج کے کیلنڈر میں درج ہیں جو سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری یو ۔ پی الہ آباد سے ایک روپیہ ۶ نئے پیسے بھیج کر حاصل کیا جاسکتا ہے ۔

کالج کے سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء کے تعلیمی سال میں بی ۔ وی ۔ ایس ۔ سی اور اے ۔ ایچ کے پہلے سال میں داخل شدہ طلبا میں سے غریب اور مستحق طلبا میں سے پانچ طلبا کو فیس کی معافی کی مراعات اور بارہ طلبا کو ۲۰ ۔ ۲۰ روپیہ ماہانہ کے وظائف دئیے جائیں گے ۔ علاوہ ازیں دوسرے ۔ تیسرے اور چوتھے سال کے اہل طلبا کو ان کے سابقہ سالانہ امتحانات کے نتائج کی بنیاد پر ۶۵ ۔ ۵۰ ۔ ۴۵ ۔ ۴۰ ۔ ۳۵ ۔ ۳۰ ۔ ۲۵ اور ۲۰ روپیہ ماہانہ کی مالیت کے آٹھ وظائف دئیے جائیں گے ۔ غربت اور اہلیت کی بنا پر وظائف پانے والے طلبا تعلیمی فیس کی ادائیگی سے بھی مستثنیٰ ہوں گے ۔

ابتدائی صحتی واحدے ۔ اتر پردیش حکومت نے مرحلہ اول کے بلاکوں میں ابتدائی صحتی واحدوں کے قیام کے لئے منظوری دے دی ہے ۔

ہر ایک واحدہ میں چار پلنگوں پر مشتمل ایک ایلوپیتھک ڈسپنسری کے علاوہ زچہ بچہ مرکز ایک سینٹری انسپکٹر اور ایک ہیلتھ وزیٹر ہوگا اور ہر بلاک کے تین مختلف مقامات پر زچہ بچہ کے مرکز قائم کئے جائیں گے ۔

بلاک یہ ہیں ـــ سرساواں (الہ آباد) رانی کی سرائے (اعظم گڑھ) بچھ کھیڑا (آگرہ) ۔ لکھوٹی ۔ دان پور (بلند شہر) ۔ حضور پور ۔ جروں (بہرائچ) چرئی گاؤں ۔ چکانیا (وارانسی) میرگنج (بریلی) سلطان گوپال پور (بستی) ، ناگرہ (بلیا) سیو راہی (دیوریا) پوڑی (گڑھوال) کھوراہر ۔ نوتنوا ۔ کوریرام (گورکھپور) ۔ کوٹھاوان ۔ سرسا (ہردوئی) ٹڈوت (میرٹھ) ، سردھنہ (میرٹھ) ، مین پوری (مین پوری) اور اسوھا (اناؤ)

نئے اسپتال ۔ اتر پردیش نے مرحلہ اول کے حضور پور ۔ جروں (بہرائچ) میرگنج (بریلی) چرئی گاؤں (وارانسی) سرسا (ہردوئی) لکھوٹی (بلند شہر) اور سردھنا (میرٹھ) کے بلاک ہیڈ کوارٹروں میں نئے اسپتالوں کی عمارتوں کی تعمیر کے لیے منظوری دے دی ہے ۔

بقیہ مضمون صفحہ ۵۶ پر

توضیح

نومبر ۱۹۵۹ء کے نیا دور میں جناب راز یزدانی رام پوری کا ایک مراسلہ شائع ہوا تھا جس میں موصوف نے راقم الحروف کی کتاب نثری داستانیں کی ایک غلطی کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن اتفاق سے موصوف کے بیان میں بھی ایک تسامح رہ گیا جس کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔

میں نے صاحب بوستانِ خیال کے مربی کا نام مرزا محمد علی رفیع اللہ لکھا تھا اور انھیں جعفر خاں ناظم بنگال کا صاحبزادہ فرض کیا تھا۔ مجھے تسلیم ہے کہ مرزا محمد علی کا لقب رفیع اللہ نہیں تھا نہ وہ جعفر خاں کے لڑکے تھے۔ مجھے فارسی بوستانِ خیال نہ اس وقت مل سکا تھا نہ آج میری لغزش کی ذمہ داری ذیل کی دو تحریروں پر ہے:-

ا۔ برٹش میوزیم لندن کے فارسی مخطوطات کی وضاحتی فہرست میں ڈاکٹر چارلس ریو رقم طراز ہیں: "برٹش میوزیم میں بوستانِ خیال کے ایک مخطوطے کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ قصّہ جعفر خاں ناظم بنگال کے دو لڑکوں نواب نجم الدولہ محمد اسحاق خاں اور نواب رشید خاں سالار جنگ کے لیے ترتیب دیا گیا اور یہ مخصوص نسخہ نواب سراج الدولہ کے لیے ان کے ناظم کتب خانہ عزت اللہ نے تحریر کیا۔ سراج الدولہ بھی خیال کے مربی تھے۔ حیرت ہو کہ ان کے لائبریرین سے یہ لغزش کیونکر ہوئی کہ رشید خاں کو جعفر خاں کا بیٹا قرار دے دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈاکٹر ریو فارسی عبارت کا صحیح مفہوم دریافت نہ کر پائے ہوں۔

۲۔ امپیریل لائبریری کلکتہ Bihar Collection فارسی مخطوطات کے فہرست نگار خاں بہادر مولوی عبدالمقتدر لکھتے ہیں کہ خیال نے یہ قصّہ اپنے سرپرست نواب رشید خاں بہادر معروف بہ مرزا رفیع اللہ اور ان کے دو بھائیوں نواب محمد اسحٰق خاں بہادر اور نواب مرزا علی خاں بہادر کے لئے لکھا ہو جو جعفر خاں ناظم بنگال کے لڑکے تھے۔

معلوم ہوتا ہے خاں بہادر صاحب نے ریو کا بیان دہرا دیا ہے۔ تو رفیع اللہ کی بدعت کے ذمہ دار مولوی عبدالمقتدر ہیں اور مولوی بھی ایسے ویسے نہیں۔ انھوں نے سات آٹھ جلدوں میں خدا بخش لائبریری بانکی پور کے عربی اور فارسی مخطوطات کی وضاحتی فہرست بھی ترتیب دی ہے۔ غریب گیان چند کو عربی دانی کا کوئی دعویٰ نہیں۔ اسٹیٹ لائبریری رام پور میں بوستانِ خیال کا جو فارسی نسخہ ہے اس کے دیباچے میں بھی کاتب نے وہی غلطی کی اور دعائیہ فقرے میں رفع اللہ کے بجائے رفیع اللہ لکھ دیا جس سے 'مرزا محمد علی رفیع اللہ قدر الشان اجلی کی عبارت بن گئی ہے۔

بھوپال میں نہ فارسی بوستانِ خیال موجود ہے نہ اردو ترجمہ راز صاحب کے اعتراض پر میں نے اپنے ماخذ کھوج نکالے اور اس کے بعد قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی عرشی کو لکھا تاکہ وہ پٹنہ اور رام پور کے کتب خانوں میں فارسی بوستانِ خیال کو دیکھ کر مصنف کے مربی کے نام پر روشنی ڈالیں۔ خیال نے تینوں بھائیوں کا نام درج کیا ہے۔ مولانا عرشی نے فارسی کی بعض تواریخ کے حوالوں سے ان بھائیوں کے نام کی صحیح نشان دہی کی۔ میں نے ان تواریخ اور چند دوسرے حوالوں سے ان کی تصدیق کی جس کی تفصیل یہ ہے۔ ان کے والد موتمن الدولہ محمد اسحاق بھی تھے اور تینوں بیٹوں کے نام اور خطابات یہ ہیں: ا۔ نجم الدولہ میرزا محمد مخاطب بہ محمد اسحاق خاں بہادر۔ سیر المتاخرین کے بموجب انھیں اپنے والد کے انتقال کے بعد محمد اسحاق خاں کا خطاب ملا۔ ۲۔ افتخار الدولہ مرزا علی خاں بہادر ۳۔ مرزا محمد علی سالار جنگ ان کی بہن شجاع الدولہ کی بیوی بہو بیگم تھیں۔ (ملاحظہ ہو ماثر الامرا جلد ۳ ص ۲۷، سیر المتاخرین جلد ۳ ص ۳ و انگریزی کتاب شجاع الدولہ جلد اوّل ص ۵ از

ڈاکٹر اے ایل شری واستو)۔ تاریخ محمدی اور بوستان اودھ میں بھی ان کا مذکور ہے۔ ماثرالامرا کے فٹ نوٹ میں تاریخ مظفری سے بھی ان کے نام اسی ترتیب سے درج کئے گئے ہیں۔ خیال کے مربی مرزا محمد علی تھے جن کا لقب خیال کے مطابق نواب رشید خاں تھا لیکن اس لقب کا ذکر کسی تاریخ نگار نے نہیں کیا۔

راز صاحب کا یہ قول کہ موتمن الدولہ اسحاق خاں والی گجرات تھا بے بنیاد ہے۔ ماثرالامرا کے مطابق ان کے والد مرزا غلام علی خاں شوستر سے ہندوستان آئے اور محمد شاہ کے حضور میں بکاول کی خدمت پر متعین ہوئے۔ موتمن الدولہ بھی اوّل خانساماں مقرر ہوئے۔ سیرالمتاخرین جلد سوم ص ۲ کے مطابق موتمن الدولہ آخر عمر میں دیوانی خالصہ کے عہدے پر سرفراز ہوگئے تھے۔ حیرت ہے کہ محمد شاہی دربار کا یہ سردار والی گجرات کیونکر ہوگیا۔ راقم الحروف کے نام قاضی عبدالودود ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "موتمن الدولہ اسحاق خاں کا کوئی سروکار جہاں تک میرا علم ہے گجرات سے نہ تھا"۔

دلی میں مرزا محمد علی رشید خاں نے خیال کی سرپرستی کی۔ ان کے بڑے بھائی مرزا محمد مخاطب بہ محمد اسحاق خاں بھی ان کے قدردان تھے۔ ان دونوں نے خیال کو محمد شاہ کے حضور میں پہنچا دیا جس کی فرمائش پر قصّہ کو آگے بڑھایا گیا۔ ابھی محض مہدی نامہ اور ہمنین نامہ ختم ہوا تھا کہ محمد شاہ کا انتقال ہوگیا۔ وہاں سے خیال سراج الدولہ کے پاس مرشدآباد میں چلے گئے۔ ممکن ہے وہاں جعفر خاں ناظم بنگال کے صاحبزادوں نے بھی خیال کی سرپرستی کی ہو۔ اس طرح برٹش میوزیم کے نسخے کے کاتب یا مرتب فہرست ڈاکٹر ریو نے جعفر خاں اور اور موتمن الدولہ کے صاحبزادوں میں غلط ملط کر دیا ہو۔ سراج الدولہ کے ناظم کتب خانہ کے تحریری نسخے کے بیان کو ہم آسانی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ جعفر خاں کے صاحبزادوں کی سرپرستی کی روایت بے بنیاد نہیں معلوم ہوتی خصوصاً یہ پیش نظر رکھتے ہوئے کہ بوستان خیال کی بیشتر جلدیں بنگال میں تصنیف کی گئیں۔

—— گیان چند

✡

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

بسلسلۂ صفحہ ۵۴

ان عمارتوں کو محکمۂ تعمیرات عامہ کے چیف انجینیر کی نگرانی میں بنایا جائے گا اور ہر عمارت پر ۱۸۵۰۰ روپے سے زیادہ صرف نہیں کیا جائے گا۔

بال منگل دل۔ حکومت اتر پردیش نے مواضعات میں بال منگل دلوں کی تشکیل کی ہمت افزائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چھ سال سے بارہ سال تک کی عمر کے بچے بال منگل دلوں کے ممبر ہو سکیں گے۔ بال منگل دلوں کی تشکیل کا مقصد لڑکے اور لڑکیوں کو مفید شہری بنانا، ان کی صحت بہتر بنانا اور ان کے فرصت کے اوقات گزارنے کے لیے مفید اور دلچسپ طریقے معلوم کرنا ہے۔

ریاست میں نوجوانوں کے تقریباً ۶ ہزار کلب ہیں جن کے ممبروں کی مجموعی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے۔ ان کلبوں کے ممبر ۱۲ سے لے کر ۳۰ سال تک کے نوجوان ہو سکتے ہیں۔ ان کلبوں کے ممبران اپنے فرصت کے اوقات تعمیری کاموں اور اجتماعی ترقیاتی پروگرام کو آگے بڑھانے میں صرف کرتے ہیں۔ مجوزہ بال منگل دلوں میں کم عمر کے بچوں کی شمولیت سے نوجوانوں کی تحریک کو تقویت پہنچے گی۔ وزارت اجتماعی ترقی اور تعاون کے زیراہتمام منعقدہ نوجوانوں کے پروگرام اور بھرپور تربیت کے ریاستی ڈائرکٹروں کے ایک حالیہ جلسے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مواضعات میں بال منگل دلوں کی تشکیل کی ہمت افزائی کی جائے۔

"نیا دور" کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو۔

نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۵ نمبر ۲

ویشاکھ ۱۸۸۲
مئی سنہ ۱۹۶۰ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر
ایم ۔ جی ۔ شوم
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری یو.پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شایع کردہ
محکمہ اطلاعات۔ اترپردیش

عنوانات

اپنی بات

ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور چین کے وزیر اعظم مسٹر چو۔ این۔ لائی کے درمیان سمجھوتے کی جو بات چیت ہو رہی تھی وہ پوری طور پر کارگر نہیں ہوئی۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ آنے والے مہینوں میں سمجھوتے کے امکانات بہتر ہوں گے یا نہیں۔ ایسی حالت میں ملک کے ہر باشندے اور حکومت کا یہ متحدہ فرض ہو جاتا ہے کہ نہ صرف ملک کے اندر امن عامہ برقرار رکھا جائے بلکہ ایسی کوئی بات۔ کی جائے جس سے حکومت کو کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے یا اس کے اخراجات میں اضافہ ہو جائے یا ملک کے تعمیراتی کاموں میں رکاوٹ پڑے۔ یہ امر افسوس ناک ہے کہ اس کے باوجود سوشلسٹ پارٹی نے کچھ ایسے فیصلے کیے ہیں جن سے ریاست کے امن و سکون میں تو خلل پڑے گا ہی عوام کو بھی پریشانیوں میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ سوشلسٹ پارٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ (۱) سرکاری گوداموں پر جن میں اناج اور دوسری چیزیں اسٹاک کی گئی ہیں قبضہ کر لیا جائے (۲) سرکاری دفتروں پر قبضہ کر کے کام روک دیا جائے (۳) ڈاک خانوں اور روزگار کے دفتروں پر دھرنا دیا جائے (۴) پرتی زمینوں اور سرکاری جنگلات کو کاٹ کر ان کی زمین پر قبضہ کر لیا جائے (۵) زنجیر کھینچ کر ریل گاڑیوں کا چلنا ناممکن کر دیا جائے (۶) نہروں کو جگہ جگہ سے کاٹ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس پروگرام پر عمل درآمد شروع کر دینے سے ایک طرف حکومت کے اخراجات میں اضافہ ہوگا، دوسری طرف ہماری تعمیراتی سرگرمیوں پر اس کا اثر پڑے گا اور تیسری طرف عوام کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی لیے اُتر پردیش کے وزیر داخلہ شری کملاپتی ترپاٹھی نے اُتر پردیش کے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ سوشلسٹ پارٹی کی کل ہند مجلس عمل کی جانب سے حکومت کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کو روکنے اور ضبط و نظم برقرار رکھنے میں ارباب نظم و نسق سے پورے طور پر تعاون کریں کیونکہ مجوزہ تحریک ریاست اور پورے ملک کے لیے ضرر رساں اور تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ وزیر داخلہ نے اپنی اپیل میں بتایا ہے کہ لاکھوں روپے کی لاگت سے بنی ہوئی نہروں کو کاٹ دینے سے عوام کا سخت نقصان ہوگا۔ انھیں آب پاشی کے لیے بڑی دقتیں اُٹھانا پڑیں گی اور حکومت کو ان نہروں کو ٹھیک کرانے میں الگ کافی زیر بار ہونا پڑے گا۔ اس وقت ساری ریاست میں گنّے کی سنچائی ہو رہی ہے۔ نہریں کاٹ دینے سے گنّے کی فصل برباد ہو جائے گی۔ جنگلات سے عوام کو کھیتی باڑی اور دوسرے کاموں میں بہت فائدہ پہنچتا تھا انگریزی حکومت نے کوئلے کی کمی پوری کرنے کے لیے بہت سے جنگل کٹوا دیے۔ آج جب کہ زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے کی ضرورت ہے جنگلات کا تحفظ اور بھی مقدم ہو گیا ہے کیونکہ ان کے نہ ہونے سے بارش پر بھی بڑا اثر پڑتا ہے۔ وزیر داخلہ نے اپیل میں آگے چل کر کہا ہے کہ اسی طرح ریلوے ٹرینوں کو روک دینا، روزگار کے دفتروں پر دھرنا دینا، کھانے کی چیزوں کو لوٹنا، ڈاک خانے کے کام میں رکاوٹ ڈالنا، یہ سب سماج دشمن کام ہیں اور ان سے عوام کو زبردست نقصان پہنچے گا۔ وزیر داخلہ نے اپنی اپیل کے آخر میں کہا ہے: "اگر کسی پارٹی کے کچھ مطالبات ہوں تو وہ انھیں جمہوری طریقوں سے عوام اور حکومت کے سامنے پیش کر سکتی ہے۔ لیکن ایسی تحریک کی حمایت نہیں کی جا سکتی جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچے۔ ایسی حالت میں حکومت کو اس کی اُمید ہے کہ عوام سوشلسٹ پارٹی کی اس تحریک میں حصہ نہ لیں گے اور ملک اور سماج کو نقصان پہنچانے والے کاموں کو روکنے میں حکومت کی مدد کریں گے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے وہ بہر طور اپنی ذمہ داری پوری کرنے کی کوشش کرے گی"۔ اُمید ہے کہ ہمارے عوام اس اپیل پر توجہ کریں گے اور ایسا کوئی قدم نہ اُٹھائیں گے جس سے ملک یا ریاست کو کوئی نقصان پہنچے۔

ایڈیٹر

لکھنوی شعراء کے قلمی اردو دیوان ـــــ کتب خانۂ نواب سالار جنگ میں ـــ ۱

نصیر الدین ہاشمی

حیدرآباد کے نواب سالار جنگ مرحوم کے کتب خانہ میں جو اردو قلمی دواوین کلیات اور قصائد کا جو ذخیرہ محفوظ ہے اس میں لکھنؤ کے متعدد شعرا کے دیوان اور کلیات اور قصائد بھی شامل ہیں۔ جن شعرا کے دیوان یا کلیات وغیرہ موجود ہیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) کلیات نواب آصف الدولہ۔ ایک نسخہ (۲) دیوان میر حسن۔ ۳ نسخے (۳) کلیات جرأت۔ دو نسخے (۴) دیوان صاحب قرآں۔ ایک نسخہ (۵) کلیات ہوس۔ ایک نسخہ (۶) کلیات ناسخ۔ پانچ نسخے (۷) دیوان اختر ایک نسخہ (۸) دیوان غضنفر۔ ایک نسخہ (۹) دیوان عشاق۔ ایک نسخہ (۱۰) دیوان اسیر۔ تین نسخے (۱۱) دیوان قمر۔ ایک نسخہ (۱۲) دیوان مرثیہ تنویر۔ دو نسخے (۱۳) قصیدہ انس۔ ایک نسخہ (۱۴) قصیدہ شیفتہ ایک نسخہ (۱۵) قصیدہ قدر۔ ایک نسخہ۔

ان کے علاوہ عیاش، مہجور، خبیر کے دیوان بھی ہیں جن کے متعلق ہنوز یہ تحقیق طلب ہے کہ آیا یہ لکھنوی شعرا ہیں یا دوسرے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی واضح رہے کہ اس کتب خانہ میں میر، سودا، سوز اور انشا کے کلیات بھی موجود ہیں مگر چونکہ یہ شعرا دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ گئے تھے اس لئے ان کے کلیات کی صراحت یہاں نہیں کی جا رہی ہے۔ دواوین وغیرہ کے متعلق مختصر صراحت پیش کی جاتی ہے تاکہ اصحاب علم و فن اور ہمدردان اردو خصوصاً اتر پردیش کے شائقین علم کو معلوم ہو سکے کہ اس کتب خانہ میں کن کن شعرا کا کلام موجود ہے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کا کلام گوشہ گمنامی میں ہو۔

ذیل میں ان دواوین وغیرہ کا یکے بعد دیگرے تعارف کرایا جاتا ہے۔

(۱) کلیات آصف۔

سائز ۱۰ × ۶ ہے اور صفحات ۶۲۰ ناقص الآخر ہے۔

آصف الدولہ ۱۷۹۵ء میں اودھ کی مسند حکومت پر متمکن ہوئے۔ انھیں میر سوز سے تلمذ تھا۔ اس نسخہ میں غزلیات کے علاوہ دوسرے اصناف سخن بھی شامل ہیں۔ چنانچہ اولاً ردیف وار غزلیات ہیں۔ ان کے بعد کسی قدر جگہ چھوڑی گئی ہے۔ غزلیات کے بعد مخمس پھر قطعات ہیں۔ اس کے بعد ایک مسدس ہے۔ پھر بسم اللہ کے ساتھ فارسی غزلیں شروع ہوتی ہیں جو بیس صفحوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ فارسی کلام کے بعد پھر اردو کلام شروع ہوتا ہے اولاً رباعیات ہیں۔ رباعیات کے بعد پھر بسم اللہ کے ساتھ مثنویاں درج ہیں۔ ایک طویل مثنوی حمد میں، دوسری نعت میں، تیسری منقبت حضرت علی میں ہے۔ حضرت علی کی مدح میں ایک مخمس بھی ہے۔ بعض مخمس فارسی غزلیات پر ہیں۔ کلیات کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

کس قدر درد کے شب کرتا تھا کوندا ترا ــــ وہ ہے بیمار تیرا خستہ در نجور ترا
بے خبر اب بھی شتابی سے پہنچ ڈرتا ہوں ــــ کشتۂ ہجر نہ ہو دے کہیں مہجور ترا

ایک مخمس کے چند بند یہ ہیں۔

کاہے کو یوں میں یاروں کی باتیں سنا کروں ــــ کس واسطے یہ جور و ستم نت سہا کروں
دیوانہ وار گلیوں میں کیوں میں پھرا کروں ــــ ناصح کبھی گذر نہ میں اوس طرف جا کروں

پہلو پہ جو نہ رہ سکے اوس کو میں کیا کروں

بدنامیاں تو ساری اسے دل تیرے سر رہے   در در کے ٹوٹ ٹوٹ کے سر پر کے دن بھرے
تس پر بھی تیرا نام وہ لیتے ہوئے ڈرے   ہوتا ہے کون غیر شکایت تیری کرے

شکوہ اگر کروں نہ کروں میں تیرا کروں

امام باڑہ لکھنؤ کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک نظم کے دو بند دیکھئے :

مسجد کا گو یہ سب سے بڑا احترام ہے   لیکن امام باڑہ بھی عالی مقام ہے
وہ آستان حق یہ مکان امام ہے   بندے جو ہیں سو دات دوں ان کا یہ کام ہے

سجدہ اگر ادھر ہے تو ادھر سلام ہے

دونوں مکان عرش کو کہتے ہیں ہمسری   جنت میں قصر جنت اعلےٰ سے برتری
اوج بیاں سے انکی صفت ہے بہت بڑی   کہتے ہیں دیکھ ور و ملک آدم و پری

سجدہ اگر ادھر ہے تو ادھر سلام ہے

ایک مثنوی کا پہلا شعر ہے ؎

خداوندا کہاں طاقت زباں میں   کہ لاؤں وصف تیرا کچھ بیاں میں

(۲) دیوان میر حسن۔

میر حسن کے تین دیوان ہیں۔ یہاں اُن کی مختصر صراحت کی جاتی ہے۔
ایک دیوان کا سائز ″۸ ½ × ½ ″۵ صفحات ۱۰۲ اور کتابت کا سن ۱۲۳۴ھ ہے۔ دوسرے دیوان کا سائز ″۱۱ × ½ ″۶ صفحات ۸۵ اور سن کتابت ۱۲۸۴ھ ہے تیسرے دیوان کا سائز ″۸ × ″۴ صفحات ۹۷ اور کتابت کا سن ۱۳۳۷ھ ہے

میر حسن کا انتقال ۱۲۰۱ھ میں ہوا تھا اس لئے یہ دیوان اُن کے انتقال کے بعد مرتب کئے گئے ہوں گے پہلے اور دوسرے دیوان کا آغاز ذیل کے اشعار سے ہوا ہے۔

گر عشق سے کچھ مجھکو سروکار نہ ہوتا   تو خواب عدم سے کوئی بیدار نہ ہوتا
یارب میں کہاں رکھتا ترا داغ محبت   پہلو میں اگر میرے دل زار نہ ہوتا
دنیا میں تو دیکھا نہ سوائے غم و اندوہ   میں کاش کہ اس بزم میں ہشیار نہ ہوتا

تیسرا دیوان محمد علی عرش ملیح آبادی کا مرتبہ ہے جس کو انھوں نے تذکروں اور بیاضوں سے جمع کیا تھا ایک یادداشت بھی اپنے کلام کے اختتام پر لکھی ہے۔ پہلے دیوان میں غزلیات کے علاوہ رباعیات ہیں۔ دوسرے اور تیسرے نسخے میں صرف غزلیات ہیں۔ پہلا دیوان حسب ذیل رباعی پر ختم ہوا ہے۔

کیا ہوگا اگر اب یہ بھلا ہوگا وہ   پچھتائے گا کہ ہو کہ بُرا ہوگا وہ
جب دل سا رفیق گیا خاک میں مل   جی بھی نہ رہے گا یہ تو کیا ہوگا وہ

دوسرے نسخہ کا اختتامی شعر یہ ہے۔

کہتا ہے جو کوئی تو حسن سو نہیں بھلا   کہتا ہے یہ بہانہ کہ وہ اونٹا ہی بُرا ہے

تیسرے نسخہ کا اختتام یہ ہے۔

جس کو دل چاہتا ہے اوس کو حسن   بات کب اوس کی دھیان پڑتی ہے

میر حسن کا دیوان ڈاکٹر عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ کی نگرانی میں مرتب ہو رہا ہے اس لئے یہاں اُن کے کلام کے متعلق کسی مزید صراحت یا نمونہ کلام کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

(۳) کلیات جرأت۔

جرات کے کلیات کے دو نسخے اس کتب خانہ کی زینت ہیں۔
پہلے نسخہ کا سائز ″۱۴ × ″۸ اور صفحات ۵۳۸ ہیں۔ پہلا صفحہ مُطلا ہے دوسرے نسخہ کا سائز ″۱۱ × ½ ″۶ اور صفحات ۴۸۹ ہیں کتابت کا سن ۱۲۴۱ھ ہے۔

جرات کا انتقال ۱۲۲۵ھ ہی میں ہوا۔ ناسخ نے حسب ذیل قطعہ تاریخ موزوں کیا۔

جب میاں جرات کا باغ دہر سے   گلشن فردوس کو جانا ہوا
مصرع تاریخ ناسخ نے کہا   ہائے ہندوستان کا شاعر موا

ان کے ایک دیوان پر تاریخ کتابت درج نہیں ہے اور دوسرا دیوان انتقال کے سولہ سال کے بعد مرتب ہوا ہے۔ اگرچہ پہلا دیوان ضخیم ہے مگر اس میں غزلیات اور چند "فرد" کے سوا کوئی اور کلام نہیں ہے۔ دوسرے نسخہ میں غزلیات کے علاوہ رباعیات۔ مخمس۔ مسدس۔ ترجیع بند۔ قطعہ ترکیب بند اور مثنویاں شامل ہیں۔ یہ کلیات نواب میر محمد علی خاں کے لئے میر ابوالقاسم طباطبائی نے لکھا ہے۔ (میر محمد علی خاں سالار جنگ ثالث کے دادا نواب مختار الملک سالار جنگ اول کے والد کا نام تھا۔)

پہلے نسخہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے :

گر کیجیے ارادہ تیری قدرت کی رقم کا   تو پہلے ہی سر سجدے میں جھک جائے قلم کا
سرگرم طلب جو ہو تیری راہ میں اوس کا   ہے رہبر کونین ہی ایک نقش قدم کا

اور اختتام اس پہ ہوا ہے :

دل تیرہ کے [illegible] سرگرم ہے آتش اسے قرآن دکھا دے

دوسرے نسخہ کا آغاز یوں ہوا ہے:

نالۂ موزوں سے مصرع آہ کا چسپاں ہوا   زردیِ پر درد اپنا مطلعِ دیوان ہوا
جس نے دیکھا آکے یہ آئینہ خانہ دہر کا   فی الحقیقت نقش اپنے آپ ہی حیراں ہوا

اور اختتام اس شعر پر ہوتا ہے

یہی تاریخ اب اس کی عیاں ہے   یہ حسنِ عاشقی کی داستاں ہے

دوسرے کلیات پر سراج الدولہ (سالار جنگ اول کے چچا) کی دستخطی مہر ثبت ہے اور غرہ رمضان سنہ ۱۲۵۲ھ کو کتب خانہ میں داخل ہونے کی صراحت کی گئی ہے۔

(۴) دیوان صاحب قرآں۔

اس کا ایک نسخہ کتب خانہ ہذا میں ہے۔ یہ دیوان ۱۴" × ۸" سائز کے ۱۹۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلا صفحہ مطلا ہے۔

صاحب قرآں کو اردو شعرا کے ہزلیات گو شعرا میں سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ان کی عریاں نگاری آج سے نصف صدی پہلے قابل ملامت تصور کی جاتی تھی مگر شاید اب اس کو اس قدر معیوب نہ سمجھا جائے۔ بقول شاہ کمال مولف مجموعۃ الانتخاب امام خاں ان کا نام تھا، بلگرام وطن۔ بقول بعض سنہ ۱۸۴۵ء میں ۳۵ سال کا سن تھا اسلئے سنہ ۱۸۱۰ء میں ان کا سن پیدائش قرار دینا چاہیے۔

انتقال کے وقت ستر سال کا سن تھا اس لئے سنہ ۱۸۸۰ء میں ان کا انتقال ہوا ہوگا۔ حالانکہ جنگ آزادی کے وقت وہ زندہ نہیں تھے اس لئے یہ صراحت غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ شاہ کمال کے تذکرہ کے وقت سنہ ۱۸۱۹ء میں یہ کافی مشہور تھے ظاہر ہے کہ ایک نو سال کا لڑکا شعرگوئی میں مشہور نہیں ہو سکتا ہے۔ شاہ کمال کی صراحت حسب ذیل ہے:

"سید امام خاں رضوی بلگرامی   سید امام خاں رضوی بلگرامی
متخلص صاحب قرآں زچند روز بصیغہ   صاحب قرآں تخلص چند روز تک
ملازمت حضور مرشد زادہ عالی شان   مرشد زادہ سلیمان شکوہ کی ملازمت
مرزا سلیمان شکوہ بہادر بود و بہ مکان   میں رہے لکھنؤ میں میرے مکان میں
فقیر در لکھنؤ اکثر گذر می ساخت و بسیار   اکثر آیا کرتے تھے اور مجھ سے بہت
ربط داشت۔ چند غزلیات از دیوانش   ربط تھا ان کے دیوان سے چند
کہ غیر از لطافت خالی نیست و در ہر غزل نام   غزلوں کا انتخاب کیا گیا۔ ہر غزل میں
یک طوائف لکھنؤ داخل است برائے   لکھنؤ کی ایک طوائف کا نام داخل کر دیا
یادگار۔   ہے۔ بطور یادگار انتخاب کیا گیا ہے
در آوردہ حق تعالیٰ سلامت دارد"   خدا ان کو سلامت رکھے

مصحفی نے بھی اپنے تذکرہ ریاض الفصحا میں ان کا حال قلمبند کیا ہے۔

"صاحب قرآں تخلص، ساکن بلگرام۔   صاحب قرآں ایک بلگرامی شخص
شخصے ہاجی زنان طوائف بود۔ فی الحقیقت   ہے جو طوائفوں کا ہاجی (فرقۂ لوسیان
درین فن نظیر خود نہ داشت معنی ہائے   بود) تھا۔ اپنے فن میں درحقیقت نظیر
تازہ در ہجو ایں قوم می بست چوں نوشتن   نہیں رکھتا۔ اس قوم کی ہجو بے مثل کی ہے
آں کلام در تذکرہ بزرگان روا نبود چند   چونکہ اس کے اشعار پسند نہیں کئے
شعر سادہ اش بطریق ندرت بہ قلم آوردہ۔   جاتے اس لئے چند سادہ شعر پیش
مشار الیہ ہفتاد سالگی ازیں حیات   ہیں، ستر سال کی عمر میں انتقال
در گذشت۔"   ہوا۔

کتب خانہ سالار جنگ میں اس نسخہ پر حسب ذیل مہریں ثبت ہیں:

(۱) مہر امجد علی شاہ (۲) مہر کتب خانہ سلیمان جاہ (۳) مہر سلطان الا (۴) مہر امجد علی شاہ سلطان عالم (۵) مہر نثار حسین (۶) مہر سلطان والا جناب (۷) مہر امجد علی شاہ (۸) مہر واجد علی شاہ جان عالم۔

ان مواہیر میں سے چار پہلے صفحہ پر ہیں اور چار آخری صفحہ پر۔ کتاب کا کاتب شیخ احمد علی ہے اور مرزا برہان علی بیگ کے لئے لکھی گئی ہے چنانچہ خاتمۂ کتاب پر اس کی صراحت بھی موجود ہے۔ یہ کتاب خاص اہتمام سے لکھی گئی ہے۔ عمدہ کاغذ ہے اور مطلا و مذہب ہے نستعلیق خوش خط ہے۔

دیوان میں اولاً ردیف وار غزلیات ہیں۔ غزلیات کے بعد مخمس اور مسدس ہے، کچھ قطعے ہیں۔ پہلی غزل یہ ہے:

یہ حسن خداداد ہے یا نور کا جھمکا   عالم سے جمال اوس کا نظر آتا ہے چمکا
کیوں داغ محبت سو جلاتا ہے جگر کو   کیا مثل شرر تجھ کو بھروسہ نہیں دم کا
جا در پے کشتی کوئی محبت کی نہ پوچھو   زاہد کی طرح تو نہیں مشتاق ارم کا
ہاں ہے یہ آزاد کے رہتا ہے مقید   معلوم نہیں کون نگہبان ہے دم کا
دیکھا نہیں ایسا کوئی آزاد مقید   معلوم نہیں کون نگہبان ہے دم کا

گو خالی نہیں ہر یہ جو جام ہاے ہوا ان کے | مذکور بھی سنتے نہیں ایران و دم کا
تو جام مرصع میں مے لعل پیا کر
صاحب قراں مذکور نہ کر عشرت جم کا

دوسری غزل میں آصف جاہ کا ذکر ہے غالباً اس سے مراد آصف الدولہ ہے۔

اس زمانے میں وہ محسن ہے گدا و شاہ کا | دونوں عالم میں ہو جاری فیض آصف جاہ کا
تعزیہ خانہ تیرا ایسا ہو جس کی طرف تو | قافلہ آیا ہو مشہد کا اور بیت اللہ کا
کیوں نہ ہو صاحب قراں کہتا ہوں یہ تو تا ابد | سر پہ میرے دامنِ دولت ہو آصف جاہ کا

صاحب قراں کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں۔

چھیڑتا رہتا ہے صاحب قراں ہر ایک کو اب
آگے محجوب تھا یہ ان دنوں بے باک ہوا

یہ رشتہ ہے محبت کا نہ ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے گا
دل اوس کے دام گیسو سے نہ چھوٹا ہے نہ چھوٹے گا

ایک قطعہ میں مہدی علی خاں بہادر کی مدح کی ہے۔

ہوئی مقبول درگاہِ الٰہی | دعا مہدی علی خاں بہادر
مرے خوشنود آصف جاہ تجھ سے | سدا مہدی علی خاں بہادر
غزل ڈھونڈھو نہیں پڑھتا کبھی کے | سنا مہدی علی خاں بہادر
کہا صاحبقراں پا فتادہ | کجا مہدی علی خاں بہادر

بوسہ تیرے رخسار کا کس طرح لے صاحبقراں
زلفیں تیری دو مار ہیں اک اس طرف اک اوس طرف

سوزِ دل اور داغ جگر دونوں ایک ہیں | تابندگی میں شمس و قمر دونوں ایک ہیں
اے صاحبقراں تیرے فیض سے کچھ ان دنوں ہمیں | جوں آسیا قیام و سفر دونوں ایک ہیں

عرض کرتا نہیں صاحبقراں آصف کے حضور
ان دنوں ہم پہ عجب شام و سحر جاتے ہیں

(۵) کلیاتِ ہوس۔

مرزا محمد تقی خاں المتخلص بہ ہوس میر حسن کے شاگرد تھے۔ سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کے دربار سے تعلق تھا۔ ان کی ایک تصنیف لیلیٰ مجنوں ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دیوان کا ایک نسخہ اس کتب خانہ میں ہے۔ سائز ۸½ × ۵½ ہے۔ صفحات ۱۵۵ ہیں اور سنِ کتابت ۱۲۴۴ھ ہے۔ دیوان کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ؎

اے عشق قدم اب تو تیری راہ میں ڈالا | الآن توکلت علی اللہ تعالےٰ
سو گردشِ افلاک جو پھرتا ہوں شب و روز | ہو رشک صدا تقریرے ہر پاؤں کا چھالا

اس دیوان میں صرف ردیف وار غزلیات ہیں۔ کوئی اور صنف سخن نہیں ہے۔ نمونہ کے طور پر چند شعر پیش کیے جاتے ہیں ؎

اوس سنگ دل کے دل میں کبھی آہ آج تک | اے نالۂ ضعیف نہ تو نے اثر کیا
ایک قطرہ خوں کو دیکھیے اور کوہِ عشق کو | اللہ میرے دل نے بڑا ہی جگر کیا

ہوا قطع رشتۂ زندگی تیری تیغ سے تو بجا ہوا
میرا سر بھی دوش پہ بار تھا میرا تن بھی مجھ پہ وبال تھا

نزع میں ہم نے عجب طرح سے دل شاد کیا | آئی ہچکی تو کہا اوس نے ہمیں یاد کیا
دل مانے تو بھلا اسکے تئیں کیا سمجھے | جیتے ماتا بچھے ناصح نے جو ارشاد کیا
سینہ کے داغ دیکھ لئے میرے خلق نے | وحشت میں پھاڑ کر میں گریباں خجل ہوا

بلبل کا کیا قصور ان نے کیا ہے وطن خراب
ویراں ہیں صحن باغ پڑے ہے چمن خراب

ہوس جب ذکر آجاتا ہے اوس کا | زباں رہتی نہیں ہو وو ہیر بند
ہو گرفتار قفس کا کوئی دمساز نہیں | ہائے بے بالی و پری طاقت پرواز نہیں
ان دنوں اے ہوس میرے ہمراہ | نالہ و درد و آہ و زاری ہے

حلاوت ہم نے جو اس نالۂ شب گیر میں پائی
یہ لذت کب کسی نے آہ بے تاثیر میں پائی

اختتامی اشعار یہ ہیں ؎

مرغوب جنوں پائی پوشاک نہ جب کوئی | ہم جامۂ عریانی لاچار پہن نکلے
کیونکر نہ ہوس جاوے صدقے فلکِ نیلی | نیلم ہی یہ سب گھنا حب یار پہن نکلے

خاتمہ پر لکھا ہے:

"بتاریخ بست و نہم ماہ جمادی الاول ۱۲۴۴ھ روز دوشنبہ باتمام رسید۔"

(۶) دیوان ناسخ۔

شیخ امام بخش ناسخ نے دبستان لکھنؤ کی بنیاد رکھی۔ ان کو لکھنوی طرز کا موجد کہا جاتا ہے۔ ۱۲۵۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے تین دیوان

مرتب ہوئے ہیں۔ پہلا دیوان سنہ ۱۲۳۲ھ میں۔ دوسرا دیوان سنہ ۱۲۴۵ھ میں اور تیسرا دیوان سنہ ۱۲۵۴ھ یعنی انتقال کے بعد مرتب کیا گیا۔ کتب خانہ ہذا میں ان کے دیوان کے پانچ نسخے ہیں۔ یکے بعد دیگرے ان کی صراحت کی جاتی ہے۔

پہلے نسخہ کا سائز ۱۰" x ۶" صفحات ۲۱۲ اور تاریخ کتابت سنہ ۱۲۴۴ھ ہے۔ چونکہ دوسرے اور تیسرے دیوان کے مرتب ہونے سے پہلے اس کی کتابت ہوئی ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناسخ کے پہلے دیوان کا نسخہ ہے۔ اس کے حاشیہ پر کئی غزلیات کا اضافہ ہوا ہے۔ آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ؎

میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا — طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اس دیوان میں صرف ردیف وار غزلیات ہیں۔ ترقیمہ یہ ہے۔

"تاریخ شانزدہم ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۴۴ھ حسب فرمائش خان والا شان یعنی جیون خاں صاحب سلمہٗ دیوان ناسخ اہل ہند از اصل نقل گرفتہ شد کاتب الحروف خاک پائے خلق اللہ یعنی فدوی محمد اللہ خاں بتاریخ مذکور روز دوشنبہ چہار گیری روز برآمد تمام رسید سنہ ۱۲۴۴ھ۔"

دوسرے نسخہ کا سائز ۹" x ۶ ہے اور صفحات ۲۵۰ ہیں۔ تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ یہ دیوان ناقص الاول ہے اس میں صرف ردیف "دا" غزلیات ہیں۔ آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے ؎

مرتبہ کم حرص رفعت سے ہمارا ہوگیا — آفتاب ایسا ہوا اونچا کہ تارا ہوگیا
ان دنوں موزوں جو کچھ رونا ہمارا ہوگیا — خط جدول صاف دریا کا کنارا ہوگیا
ہے تصور نوک مژگاں کا جو ہر دم سامنے — دیدۂ گریاں ہمارا اب ہزارا ہوگیا

اس دیوان پر محترم الدولہ کی مہر ثبت ہے۔

تیسرے نسخہ کا سائز ۹" x ۵½" اور صفحات ۲۳۶ ہیں۔ سن کتابت درج نہیں ہے۔ اس دیوان میں ردیف وار غزلیات ہیں۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

طبل ہوں بوستان جناب امیر کا — روح القدس ہے نام میرے دستگیر کا

اس دیوان میں پرچے چسپاں کرکے کلام کا اضافہ کیا گیا ہے۔ حاشیہ پر بھی کچھ اضافے ہوئے ہیں۔ ردیف "ی" کے غزلیات ختم ہونے پر تمت۔

تمام شد لکھا گیا ہے۔ مگر اس کے بعد پھر ردیف "الف" کی غزلیں اور ردیف "ی" کی چند غزلیں شریک کی گئی ہیں۔ ردیف "الف" کی غزلیں ۶۴ صفحوں پر اور ردیف "ی" کی غزلیں ۱۰ صفحات پر آئی ہیں۔ دوسرا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

دکھا اوس کو جہاں میں غل ہے جس کی آمد آمد کا
الٰہی ہوں بہت مشتاق دیدار محمدؐ کا

اور اختتام اس شعر پر ؎

جو ہے ممدوح اوس کا بھی وہی ممدوح ہے اوس کا
نہیں ناسخ ذرا رہتے ہیں کم سحبان وائل سے

چوتھا نسخہ ۹" x ۵" سائز کے ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناقص الاول ہے۔ صرف ردیف و۔ ہ اور ی کی غزلیات ملتی ہیں۔ آخر میں کچھ رباعیات اور فرد بھی شامل ہیں۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ
لکھنؤ مجھ پہ فدا ہے میں فدائے لکھنؤ
تو نے دیکھے ہیں کہاں رنگیں ادائے لکھنؤ
لالہ و گل کے چمن ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

اور اختتام پر یہ اشعار درج ہیں ؎

اے نالۂ شب گیر نہیں ہوتی صبح — اے اشک کی تاثیر نہیں ہوتی صبح
گزری یک عمر بر شب تار فراق — مثل شب تصویر نہیں ہوتی ہے صبح

آخر میں یہ بھی لکھا ہے۔

"چہار ہزار و پنجصد و نود و نہ بیت در شمار آمدہ است۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دیوان میں ۴۵۹۹ بیت درج ہیں۔ نسخہ پر محترم الدولہ اور اعتصام الملک کے مواہیر بھی ثبت ہیں۔ دیوان کے آخری دو صفحوں میں اور دوسرے شعرا کا کچھ کلام بھی شامل ہے۔

پانچواں نسخہ ۱۰" x ۶½" سائز کے ۲۹۴ صفحوں پر مشتمل ہے۔ تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ پہلا صفحہ مطلا ہے۔ یہ نسخہ ناقص الآخر ہے۔ اس دیوان میں ردیف اور غزلیات کے علاوہ رباعیات اور تاریخی قطعے بھی درج ہیں۔ یہ قطعات سنہ ۱۲۴۸ھ و سنہ ۱۲۵۰ھ کے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ دیوان سنہ ۱۲۵۰ھ کے بعد مرتب ہوا ہے۔ آغاز کے اشعار ہیں۔

اقرارِ نبوت میں ہے اقرار خدا کا انکارِ امامت میں ہے انکار خدا کا
دو نوں سے کنارہ ہی غرض یار ہے عالم ہے گرم ابد تک یونہی بازار خدا کا

جیساکہ ذکر کیا گیا ہے اس دیوان میں کئی تاریخی قطعے شامل ہیں۔ مثلاً مرزا محمد کی شادی، ان کی بیماری سے صحت یابی۔ مرزا کاظم علی خاں کی وفات نواب میر خاں کی وفات، محسن الدولہ کی وفات وغیرہ کی تاریخی قطعے موجود ہیں۔ دو قطعے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

عزیز القدر من مرزا محمد باقبال و حشمت باد الٰہی
چو خوش تاریخ جشن صحت او سلامت باکرامت باد الٰہی (۱۲۴۸ھ)

روز نسبت و ششم محرم حائے وقت این جہاں صد حیف
گفت تاریخ فوت ہاتف غیب حیف نواب میر خاں صد حیف (۱۲۵۰ھ)

(۷) دیوان اختر

اگرچہ لکھنوی شعرا میں واجد علی شاہ کا تخلص بھی اختر تھا مگر یہ دیوان دوسرے اختر شاعر کا ہے جن کا نام میر اکبر علی تھا اور وہ پیرزادہ نواب فخر الدین خاں کے فرزند تھے۔ جرات سے تلمذ حاصل تھا۔ اولاً انجم تخلص تھا پھر اختر کر لیا۔ مصحفی نے ان کا تذکرہ کیا ہے اور کلام کی تعریف کی ہے۔ صنعت آتش بازی میں ان کو دست رس حاصل تھا۔ ان کا دیوان ۸" ½ x ½ ۵" سائز کے ۳۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ آغاز اس طرح ہوا ہے ؎

جب قلم لے کر رقم وصف قد جاناں کیا
کھینچ کر ایک آہ موزوں مطلع دیوان کیا
کیوں نہ اس خالق کی ہو صنعت گری دور از خیال
خلق جس نے یہ طلسم خانۂ دوراں کیا

آخری دو صفحوں پر کاغذ چسپاں ہونے سے گویا ناقص الآخر ہو گیا ہے۔ دیوان میں صرف غزلیات ہیں جو ردیف وار ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں۔

یوں تو دریا سو بہت نکلے ہیں اے انجم و لے
عشق کے دریا سے جو نکلا سو دل ڈوبا ہوا

مجھے اب بے کسی پر اپنے ہر دم گریہ آتا ہے
کہ اس غربت میں چھوٹا مجھ سے سہرو خانماں اپنا

زنداں سے نہ چھوٹے ہم ایام بہاراں میں صحرا کو نکل جاتے کچھ جی تو بہل جاتا

آج انساں کا عجب حال ہے انشاءاللہ اوس کے قدموں پہ وہ پامال ہے انشاءاللہ

(۸) دیوان غضنفر

اودھ کے شہزادے سہراب جنگ خطاب، غضنفر تخلص، جرات کے شاگرد تھے۔ ان کے دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ میں موجود ہے۔ سائز "۱۱ x "۷ صفحات ۹۹ مطلا و مذہب۔ جدول سرخ و سبز خوش خط۔ اودھ کے شاہی کتب خانہ کا نسخہ ہے کیونکہ چار مہریں ثبت ہیں۔ ان میں سے دو مہریں امجد علی شاہ کی ہیں اور دو واجد علی شاہ کی۔ حسب ذیل عبارتیں بھی اس پر درج ہیں۔

(۱) تحویل ذوالفقار خاں (۲) جریدہ شاہزادہ سہراب جنگ تخلص غضنفر۔ (۳) بخط حافظ نور اللہ جیو استاد نستعلیق (۴) بتاریخ سوم شہر ذیقعدہ الحرام سنہ ۱۲۶۱ھ بجائزہ رسید (۵) بتاریخ دہم صفر سنہ ۱۲۶۳ھ بجائزہ رسید۔ (۶) تحویل مصطفی خاں۔

آغاز اس طرح ہوتا ہے؛

اول تو پیمبر خدا پر صلواۃ بعد اون کے علیؑ مرتضیٰ پر صلواۃ
پھر آلِ نبیؐ جو ہیں اور اولادِ علیؑ ہر ایک امیر دوسرا پر صلواۃ

ایک سلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سلام اوس پہ جو راضی تھا گلا اپنا کٹانے پر ... با مغفرت سب کا اٹھانے پر
نہ تھا مطلق خیال اوسکو ستمگر کے ستانے پر نہ دل مصروف تھا نانا کی امت بخشوانے پر
نہ تھا کچھ تشنگی کا غم، نہ کرتا تھا طلب پانی غم امت ہی کھاتا تھا کوئی دن کے دکھانے پر
بدن تھا چور زخموں سے لہو میں غرق بازو تھے جھکا کے سر کو سوئے قبلہ رو بیٹھے تھے شانے پر

آخری بند ہے ؎

غضنفر چاہتا ہے تم سے اپنا مدعا جلدی پذیرا اس سلامی کی کرو لینے دعا جلدی
بلا کر کربلا میں اس کو شاہ کربلا جلدی جبیں سائی کرے جاکر تمہارے آستانے پر

(۹) کلیات بادشاہ محل

عالم تخلص، جان عالم واجد علی شاہ کی بیگم تھیں۔ بادشاہ محل اور خاص محل سے موسوم تھیں۔ ان کا دیوان بیاض عشاق سے موسوم ہے "۱۱ x ½ ۷" سائز کے ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیوان میں اولاً ردیف وار غزلیات ہیں۔ ہر غزل پر نمبر دیا گیا ہے۔ ان کی تعداد ۱۱۱ ہے۔ غزلیات کے

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۱ پر)

لکھنؤ ـ سوا سو برس پہلے

سیّد حسن

لکھنؤ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے شمالی ہندوستان میں ایک تہذیبی و تمدنی مرکز کی حیثیت سے شہرۂ آفاق تھا۔ دُور دُور کے سیاح اس شہر کی سیر کو آتے۔ اس عہد عروج میں عظیم آباد سے بھی ایک ادیب اس عروس البلاد کی سیاحت کو گئے تھے اور انھوں نے اپنی سیاحت کا حال اور لکھنؤ کی دلفریبیوں کا تذکرہ ایک روزنامچے کی صورت میں قلمبند کیا ہے۔ یہ قلمی روزنامچہ جس کا نام سوانح لکھنؤ ہے، پٹنہ یونی ورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں موجود ہے۔ اس سیاح کے بیانات سے آج سے تقریباً سوا سو سال قبل کے لکھنؤ کا ایک بڑا دلکش مرقع آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ نجات حسین خاں مرحوم جنھوں نے روزنامچۂ مذکور (فارسی میں) مرتب کیا ہے پٹنہ کے ایک معزز اور ذی علم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا پورا گھرانا پشتہا پشت سے ادب نواز اور سخن پرور تھا۔ نجات حسین خاں مرحوم خود بھی شاعر اور سخن رس ادیب تھے۔ وہ ۲۲ محرم سنہ ۱۲۵۹ھ مطابق ۲۴ فروری سنہ ۱۸۴۳ء کو جہلم دیکھنے کی غرض سے خشکی کے راستے گھوڑے پر عظیم آباد سے روانہ ہوئے اور ۱۸ صفر (۲۰ مارچ) کو لکھنؤ پہنچ کر وہاں سرائے آغا میر میں بار سفر کھولا۔ خاں صاحب مرحوم نے تقریباً ڈھائی مہینے لکھنؤ میں مقیم رہ کر ۸ جمادی الاوّل (۷ جون) کو وہاں سے مراجعت کی۔ اپنے دوران اقامت میں انھوں نے لکھنؤ کی رنگا رنگ زندگی کا بہت ہی نزدیک سے مطالعہ کیا۔ مجلسوں اور محفلوں میں شرکت کی، جلوسوں اور میلوں کا تماشا دیکھا، دکانوں اور سراؤں کا جائزہ لیا، بازاروں اور بالا خانوں کی سیر کی، کوچہ و برزن میں گھوم پھر کر دیکھا، بھٹیاروں اور طوائفوں سے ملاقاتیں کیں، شاعروں ادیبوں اور دیگر ہنرمندوں کی خدمت میں حاضری دی اور خود ان کے منہ سے ان کا کلام سُنا۔ ان سب تجربوں اور مشاہدوں کا حال خاں صاحب مرحوم نے ایک سیاح کے تحیر و تجسس، ایک زائر کی ارادت و عقیدت اور ایک ادیب کی عکاسی و رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نجات حسین خاں مرحوم شاہ دوراں امجد علی شاہ کے عہد حکومت میں لکھنؤ پہنچے تھے۔ انھوں نے اپنے سفرنامہ میں بادشاہ کی رحم دلی، عدل و انصاف اور رعایا پروری و امن کوشی کی بڑی تعریفیں لکھی ہیں۔ ملک میں اس قدر امن و امان تھا اور بادشاہ نے ایسا عمدہ انتظام کیا تھا کہ لوگ بلا خوف و خطر سفر کرتے تھے اور کوئی بھی کسی امیر یا فقیر سے معترض نہیں ہوتا تھا۔ معموری ملک اور آبادانی سلطنت کے لئے بادشاہ نے بڑی سعی کی تھی۔ رعایا کی خاطرداری اس قدر ملحوظ تھی کہ ٹرمی (؟) صاحب نے پانچ لاکھ روپیہ نذرانہ پیش کرکے افیون کی کاشت والے علاقے کو خریدنے کی کوشش کی لیکن بادشاہ نے قبول نہ کیا کیونکہ "رعایائے شہر بشتر افیونی و غربا اند در صورت ہلاک خواہند شد"۔ بادشاہ کی رحمدلی کے ثبوت میں دو

واقعے بھی نقل کئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ ایک شخص چوری کے جرم میں ماخوذ
ہوا اور اس کا جرم ثابت ہوگیا۔ عدالت سے اس کا ہاتھ کاٹ دینے
کا حکم صادر ہوا۔ جس وقت سزا کی تعمیل کے لئے مجرم کو لئے جا رہے تھے
قضارا بادشاہ کی سواری ادھر سے گزری۔ انھوں نے مجھ دیکھ کر استفسار
حال کیا۔ بادشاہ کو رحم آگیا اور انھوں نے قاضی سے دریافت کیا
اگر قطع یدین کے بدلے صرف انگلیاں کاٹ ڈالی جائیں تو سزا کافی
ہوگی یا نہیں۔ قاضی صاحب راضی ہوگئے اور مجرم کی سزا میں
اس طرح تخفیف ہوگئی۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ موسم گرما میں ایک دن
پنکھا جھلنے والی ایک خواص کو غنودگی آگئی اور پنکھا تاج سلطانی سے
اس طرح ٹکرا گیا کہ تاج سر سے الگ ہوکر دور جاگرا۔ بادشاہ کی والدہ
بہت برافروختہ ہوئیں لیکن شاہانہ عفو و کرم سے خواص معتوب ہوئی۔
بادشاہ نے اسے سونے کی اجازت دے دی اور اس کی جگہ دوسری
خواص کو مروحہ زنی پر مامور کیا گیا۔

نجات حسین خاں مرحوم بتاتے ہیں کہ غازی الدین حیدر
اور نصیر الدین حیدر کے زمانوں کے اعتبار سے امجد علی شاہ کے عہد
میں ملک زیادہ آباد اور پُر رونق تھا، زراعت کی حالت بہتر تھی اور
پیداوار بھی بادشاہ کے حُسنِ نیت کی بدولت روزافزوں تھی۔ غلہ
کی قیمت بازار میں یہ تھی۔ گیہوں کا آٹا روپیہ میں ۲۴ سیر، باسمتی چاول
روپیہ میں پندرہ سیر، معمولی چاول روپیہ میں بیس سیر، ارہر کی دال میں
سیر فی روپیہ، مونگ کی دال روپیہ میں بیس سیر، چنا روپیہ میں تیس سیر،
خصی کا گوشت دو آنہ سیر، گائے کا گھی روپیہ میں پونے دو سیر۔ بازار
کا گھی جس میں کھنڈی کا روغن ملا ہوتا تھا روپیہ میں دو سیر بکتا تھا۔ شہر
میں عام طور سے اسی گھی کا رواج تھا۔ عوام الناس اور بعض خواص
بھی یہی گھی استعمال کرتے تھے۔ خالص دانہ دار گھی گھوسیوں کے یہاں
بھی بمشکل دستیاب ہوتا تھا۔ آمیزش والے گھی کی وجہ سے خاں صاحب
مرحوم کو لکھنؤ کی کوئی مٹھائی چاہے وہ مشہور یا غیر مشہور دوکان کی ہو
پٹنہ کے کوپلی (؟) حلوائی کی مٹھائی کے برابر خوش مزہ معلوم نہ ہوئی۔
ملائی فی سیر بارہ ٹکے کے حساب سے بکتی تھی اور جلاون کی لکڑی روپیہ
میں ساڑھے تین من ملتی تھی۔ لکھنؤ کا سیر گولک پوری پیسے کے حساب

سے بائیس گنڈے کا ہوتا تھا۔ روپیہ سکۂ ضرب امجد علی شاہ چودہ
گنڈے کا ہوتا تھا اور اس کے ایک جانب یہ شعر تھا۔

درجہاں زد سکۂ شاہی بتائید الٰہ   ظلِ حق امجد علی شاہ زمن عالم پناہ

اور دوسری طرف سن جلوس تحریر ہوتا تھا۔ محمد علی شاہ کے سکے پر
ایک طرف یہ شعر

بہ عدل و کرم سکہ زد در جہاں   محمد علی بادشاہ زماں

اور دوسری طرف سن جلوس مسکوک تھا۔ غازی الدین حیدر کے روپے
پر ایک طرف یہ شعر مسکوک تھا ۔

سکہ زد از سیم و زر از فضل ربّ المنن   غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

لکھنؤ پہنچنے کے دوسرے ہی دن نجات حسین خاں صاحب چند ہم نگار
اور صاحبوں کے ساتھ بازار کی سیر کو نکلے اور نخاس کے راستے سے چلے۔
اکبری دروازے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ دروازہ بہت بلند اور
کشادہ ہے، اس کے دکھن جانب نالہ واقع ہے۔ جن شاہی مجرموں
کو خونریزی یا فتنہ انگیزی کے جرم میں قتل یا پھانسی کی سزا ملتی ہے وہ
اسی نالہ میں کیفر کردار کو پہنچائے جاتے ہیں اور ان کے جسم کو دروازے
کی محراب میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ مملکت کے دیگر حصوں سے متمردوں اور
مجرموں کے جو سر آتے ہیں انھیں بھی اسی دروازے میں لٹکایا جاتا ہے
تاکہ شہر کے لوگوں کے لئے باعث عبرت ہو۔ چند قدم اور آگے بڑھ کر
اسی بلندی اور شان کا دوسرا دروازہ ہے۔ اس دروازے میں داخل
ہوکر چند قدم چلنے کے بعد مقابل میں تیسرا دروازہ ملتا ہے۔ ان دونوں
دروازوں پر چھت پاٹ دی گئی ہے جس سے راستہ مسقف ہوگیا
ہے۔ اس سقف کے نیچے دونوں طرف پختہ دوکانیں ہیں جن میں
پاپوش فروش بیٹھتے ہیں۔ ان دوکانوں سے بالائی طرف دونوں
جانب پختہ عمارتیں ہیں جو بارہ دری آصف الدولہ کے نام سے مشہور
ہیں۔ اسی کو پرانا چوک بھی کہتے ہیں۔ یہاں ظہر کے وقت اکثر
دست فروش مختلف رنگ کے نیچے، جو گوشیہ بوٹہ دار، بیلدار اور
چکن کار ٹوپیاں، نفیس اور خوش قماش دریاں شطرنجیاں اور
کھیس، گلاب، موتیا، بیلا، چمپا اور دوسرے پھولوں کے ہار
ہاتھوں میں لئے دلکش آوازیں لگاتے ہیں۔ ہار بیچنے والوں کی

صدائیں کچھ اس طرح کی ہوتی ہیں "کیا معطر پھول ہیں حسینوں کے محبوبوں کے گلوں کے ہار ہیں"

دوسرے دروازے سے گذر کر خاں صاحب جوہری بازار میں داخل ہوئے۔ یہاں قدم رکھتے ہی ان کی آنکھوں کو چکا چوند سی لگ گئی۔ بے اختیار زبان سے شہر کی تعریف نکل جاتی ہے۔

"سبحان اللہ چہ شہریت دلپذیر و چہ مقامیت بے مثل و بے نظیر جائیت دلفریب و مکانیت مطبوع۔ منزہ از نقص و عیب بلندیست بس دلچسپ و خوش سواد۔ دکان ہا بس مملو و آباد و معمورہ ایست از اقسام و انواع چیز ہا"

دکانوں کے متعلق خاں صاحب مرحوم لکھتے ہیں کہ یہاں ہر جنس و قماش کی چیزیں موجود ہیں۔ لکھنؤ کے کاریگر موجدانہ طبیعت رکھتے ہیں اور نئی نئی چیزیں ایجاد کرتے رہتے ہیں یا پرانی ہی چیزوں کو نئی تراش و خراش کے ذریعہ دلکش بنا دیتے ہیں۔ ان کی صنعت گری دیکھ کر صناعان چین کی عقل بھی دنگ ہے۔ بازار میں اہل حرفہ، بزازوں، صرافوں، جوہریوں اور زردوزیوں کی دکانیں ہیں بزازوں کی دکانوں میں دیسی اور ولائتی کپڑے بھرے ہیں۔ یہاں ململ جامدانی، ڈوریا، چارخانہ، کامدانی، انواع و اقسام کے پارچہ جات موجود ہیں، ڈھاکہ سے آیا ہوا مال بھی ملتا ہے۔ جالی لیٹ، کامدار نین سکھ کھیٹی اور سمٹی، انگریزی اور فرانسیسی کپڑوں میں سوتی اور ریشمی چھینٹ، مشروع دانہ دار گلبدن اور ساٹن بھی ہیں۔ بنارس کے دوپٹے، تمامی اور زری کے تھان بھی رکھے ہیں۔ خاص لکھنؤ کے بنے ہوئے کپڑے بیلدار اور گلکار، زرتار و زرنگار و زری کمخواب بھی فروخت ہوتے ہیں۔ ان دکانوں میں جو بزاز بیٹھے ہوئے ہیں ان کا لباس یہ ہے۔ سر پر دستار محمد شاہی، بدن میں نیمہ و جامہ اور پاؤں میں دورنگ کا زیر جامہ۔

صرافوں کی دکانوں میں ایک طرف پیسوں اور روپیوں کی ڈھیریاں اور دوسری طرف سیم و طلا کے ظروف کے انبار ہیں۔ جوہریوں کی دکان نقرئی و سیمیں مرصع کار زیورات سے آراستہ ہیں۔ زردوزوں کی دکانوں میں ایک طرف تو ہر قسم کے گوٹے پٹھے اور بنت رکھے ہیں اور دوسری جانب زردوزی ٹوپیاں اور پاپوش سجے ہوئے ہیں۔ خاص پز، نان پز، کبابی، حلوائی، تنبولی و رنیچہ فروشوں کی دکانوں سے بھی وہی تکلف، ہنر اور سلیقہ نمایاں ہے۔

خاں صاحب مرحوم گکڑ والوں اور بھنگ فروشوں کی دکانوں کی دلچسپ تصویر کھینچتے ہیں۔ دکان پر تخت بچھا ہوا ہے اور اس پر خوش رنگ کھارے کا فرش لگا ہے۔ اس فرش پر پچیس تیس قلیان گکڑ اور اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ پیالیاں سجی ہوئی ہیں۔ ایک جوان شوخ و شنگ عورت خوش وضع پوشاک پہنے نہایت نازو انداز سے سامنے بیٹھی ہے اور گکڑ اور بھنگ کے شائقین کو قلیان اور تازہ بھنگ کی پیالیاں بڑی دلفریب ادا کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ جام پینے والے اس شعر کے مضمون کے مطابق

دل مرا پی کے محبت کی شراب نشے میں بھنگ رہا کرتا ہے[1]

مدہوش اور خود فراموش ہو جاتے ہیں اور حالت سرور وغایت بیخودی میں آتش کے یہ دو شعر پڑھا کرتے ہیں ؎

عار سے عار ہے مجھ مجنوں کو ننگ سے ننگ رہا کرتا ہے
گفتنی حال نہیں ہے اپنا کچھ عجب ڈھنگ رہا کرتا ہے

دکانوں کے آگے بانی بولنے والے فقیر آزادان طریقت اور لطیفہ گو، اشعار ظریفانہ گاتے اور صدا لگاتے پھرتے ہیں۔

کہیں تو نقلیں کرتے ہیں کھڑے بھانڈ کہیں آزاد پھرتے ہیں بنے سانڈ
کہیں قوال گاتے ہیں ترانے کہیں لڑتے ہیں جھگڑ کچھ زنانے

فرنی اور فالودہ فروشوں کے یہاں بھی اسی قسم کا تکلف ہے۔ کھارا بچھے ہوئے تخت پر متعدد دیسیاں لگی ہیں جن میں چینی کی تشتریوں میں فرنی رکھی ہوئی ہے۔ چینی اور مس کی چمچیاں بھی پاس ہی دھری ہیں۔ فالودہ کے پیالے ہیں جو عرق کیوڑہ اور عرق گلاب سے بسے ہوئے خریداروں کے انتظار میں قرینے سے رکھے ہوئے ہیں۔ سبزی

---

[1] یہ شعر آتش کا ہے (س۔ ح)

اور میوہ فروشوں کی دکانوں میں شریفہ، شہتوت، رنگترہ، ترنج، لیموں، کمرک، ناشپاتی اور دیگر پھلوں کے علاوہ مختلف قسم کی ہری ترکاریاں مثلاً کدو جسے لوکی کہتے ہیں، کھنڈا جسے کدو کے شیریں بولتے ہیں، شلجم، چولائی اور میتھی کا ساگ نظر فریب طریقے سے لگی ہوئی ہیں۔

اکثر دکانوں میں آبدار خانے ہیں تاکہ جو لوگ گرمی بازار سے تشنہ ہو جائیں وہ پانی پی کر سیراب ہوں۔ اس کے علاوہ بہت سقے بھی پُرآب مشکیزے اور کٹورے ہاتھوں میں لئے ہوئے صدائیں لگا رہے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ تشنہ کام چند خرمہروں کے عوض ٹھنڈا پانی خرید یں۔ اسی طرح جا بجا پنسلے بھی بٹھائے ہوئے ہیں اور متعدد ہندو ہاتھ میں ڈول اور کٹورے لئے ہوئے پیاسوں کو پانی پلانے کے لئے تیار ہیں۔

راستوں میں شریفوں اور سفید پوش خریداروں کی آمد شد سے بھیڑ لگی ہے۔ ان میں سے اکثر سر پر چوگوشیہ ٹوپیاں، بدن میں چھ کلیوں والے انگرکھے، پاؤں میں ایک برا پیجامے پہنے اور ہاتھ میں بیج لئے ہوئے ہیں۔ انگرکھے کے مقابلے میں بالا برادکالیدہ پیجامے پہنے والے کم ملتے ہیں۔ روسا شہر کی سواری میں ہاتھی اور گھوڑے ہیں جو زرین ساز و یراق سے آراستہ ہیں۔ بعض رئیس اور امیر پالکی میں بھی سوار جا رہے ہیں اور اس طرح اپنی حشمت و جاہ کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان کی سواری بڑے تجمل اور کر و فر سے جا رہی ہے۔ شاہی کہار کار چوبی بانات وردیاں پہنے ہیں۔ پالکی کے جلو میں سوار اور پیادے بھی ہیں جو زرق برق لباس پہنے ہیں۔ عورتوں کی ڈولیاں بھی گزر رہی ہیں۔ نازک اور خوش قطع ڈولیاں ہیں جن کے منقش پائے نقرئی و چوبی ہیں۔ پردے رنگین ایکر نگے کے ہیں جن کے کنارے پٹھے اور بنت ٹکے ہوئے ہیں۔ ان ڈولیوں کے اندر خورشید رو حسین سواریاں اس طرح بیٹھی ہیں جیسے آفتاب ہالے میں ہو۔ ان ماہ رویوں کا ایک ہی جلوہ دیکھ کر انسان ہوش و حواس کھو دیتا ہے ؎

ہوش من از سر برنگ بو زگل از نگاہ ساقیِ سرشار رفت

اس موقع پر خاں صاحب کو ناسخ کے وہ اشعار یاد آ جاتے ہیں جو اس نے لکھنؤ کے فراق میں لکھے تھے۔

پھر رہے ہیں گلعذار لکھنؤ ہے چمن ہر رہ گزار لکھنؤ
گل سے رنگین تر ہیں خار لکھنؤ رشک سے بہتر خمار لکھنؤ
یاد ہیں سب گلعذار لکھنؤ ہے تصور میں بہار لکھنؤ
سارے نقشے سامنے آنکھوں کے ہیں نقش ہے نقش و نگار لکھنؤ

نجات حسین خاں صاحب کے سفر لکھنؤ کا اصل مقصد چہلم کی زیارت تھا۔ چنانچہ امام باڑوں میں حاضری دینے اور مجلسوں میں شرکت کرنے کے علاوہ وہ کئی جلوسوں میں بھی ساتھ رہے۔ تعزیہ کے ایک جلوس کا حال انھوں نے سوانح لکھنؤ میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔

چہلم کے دن وہ بوقت ظہر شیخ خدا بخش کا تعزیہ دیکھنے گھر سے نکلے کیونکہ انھیں معلوم ہوا تھا کہ یہ تعزیہ بہت شان سے نکلتا ہے۔ لوگوں نے بتایا تھا کہ شیخ خدا بخش شاہی آتش باز تھے۔ بعضوں نے کہا تھا کہ اصلی نام خدا بخش نہیں بلکہ خدا یار خاں تھا۔ بہرحال خاں صاحب اپنے رفقا کے ساتھ مسجد دارالشفا کے نزدیک پنج گراں کی چھت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ اسی اثنا میں تعزیہ کا جلوس قریب آ گیا۔ سب سے پہلے سات سانڈنیاں نمودار ہوئیں جن پر سیاہ جھول پڑے ہوئے تھے۔ ان پر جو لوگ سوار تھے وہ بھی سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھے۔ سانڈنیوں کے پیچھے سترہ ہاتھی تھے جن پر سیاہ بانات کے جھول تھے۔ ہاتھیوں پر سر بفلک علم و پرچم تھے جن پر سرخ و سیاہ اطلس کے خوبصورت غلاف تھے۔ ان غلافوں پر طلائی و نقرئی حروف میں اللہ اور پنجتن کے اسمائے گرامی منقش تھے۔ ہاتھیوں کے بعد عہدہ داروں کی آمد ہوئی۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں چاندی سونے اور گنگا جمنی کی برچھیاں، بلم اور عصا تھے جن کی تعداد احاطۂ شمار سے باہر تھی۔ ان کے پیچھے پیادے تھے جو شمشیر و سپر سے مسلح تھے۔ جلوس کے اس حصے کی لمبائی نصف کوس سے زیادہ ہوگی۔ اس کے بعد باجوں کے طائفے آئے۔ روشن چوکی، جھانجھ، تاشے، دف اور نئے قسم قسم کے نقارے اور باجے جن سے 'واحسینا' کی جگر گداز آواز نکل رہی تھی۔ اس کو سن کر سنگدل سے سنگدل انسان بھی مثل موم کے پگھل جاتا تھا، یہاں تک کہ شہنا کی آواز سے بھی جو بہت ہی مکروہ ہوتی ہے طبیعت میں افسردگی

پیدا ہوتی تھی۔ جلوس کے ہمراہ آبدار خانے بھی تخت پر رواں تھے۔ تخت پر برف لگے ہوئے قند کے شربت سبوچوں اور کوزوں میں رکھے تھے اور جلوسیوں کو پلائے جاتے تھے۔ جو لوگ زیارت کے لئے راستہ کے دونوں طرف کوٹھوں پر مجتمع تھے ان تک بھی شربت کے پیالے لمبے لمبے بانسوں میں باندھ کر پہنچا دیئے جاتے تھے۔

آبدار خانوں کے بعد نقرئی وطلائی مرصع کار پنجے اور علم نمودار ہوئے اور ان کے پیچھے دو تین دُلدُل اور تابوت تھے جن میں تیر چھدے ہوئے تھے۔ دُلدُل کی چادریں سرخ شہابی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں علم کے پیچھے اور خدا یار خاں کے تعزیہ کے آگے غربا کے سیکڑوں تعزیے تھے اور ان سب کے اردگرد بے شمار و بے حساب آدمی تھے۔ سر و پا برہنہ اشک ریزاں، آنکھیں جوش گریہ سے سرخ سرخ، سینہ زنی کی کثرت سے سینے رشک گلنار۔ یہ لوگ تعزیہ کے آگے آگے رقت انگیز اور حزن آمیز لہجوں میں مرثیے اور نوحے پڑھتے جاتے تھے۔ چند قدم چل کر رک جاتے اور حلقہ باندھ کر شیون و ماتم کرنے لگتے۔ ماتم کرنے والوں کے بھی کئی کئی حلقے تھے۔ کوئی حلقہ تو اہل شہر کا تھا اور کوئی حلقہ حبشیوں کا۔ کسی حلقے میں ولایتی مغل تھے۔ ان سب حلقوں میں اس دردناک انداز میں ماتم ہوتا تھا کہ عزاداروں کے دل "سیخ غم پر کباب" ہو جاتے تھے۔ "اگر شمر بھی اس ماتم کو دیکھتا تو شہیدان معصوم کے غم میں آنسو بہانے لگتا۔" عزاداروں کی کثرت تخمینہ و اندازہ سے زیادہ تھی۔

"سامان جلوس میں بعض امور خلاف شرع بھی تھے لیکن چونکہ ان تمام تکلفات کا مقصد گریہ ہے لہذا قبیح نہیں ہے۔" جلوس کو دیکھنے کے لئے ہزاروں آدمی اکٹھا ہو گئے تھے۔ امیروں، وزیروں، نوابوں اور شاہزادوں کی سواریاں بھی کثرت سے موجود تھیں۔ ہجوم کی وجہ سے راستہ چلنا دشوار تھا۔ خاں صاحب بمشکل تمام جلوس سے نکل کر بعد از غروب آفتاب صحیح و سلامت گھر واپس آئے اور سجدۂ شکر بجا لائے کیونکہ انھیں خوف تھا کہ ہجوم و نرغہ کی وجہ سے ان کا دم گھٹ جائے گا۔

خاں صاحب تال کٹورہ کی کربلا بھی گئے تھے اور وہاں بھی تعزیہ کا جلوس دیکھا تھا جس کو انھوں نے اپنے سفرنامے میں بیان کیا ہے۔

اس کے علاوہ اسی مقام پر نوچندی کے میلے میں بھی شریک ہوئے تھے اور اس میلے کی بھی کیفیت لکھی ہے، لیکن ان سب کا بیان طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

نجات حسین خاں صاحب جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، لکھنؤ میں وارد ہونے پر اولاً سرائے آغا میر میں ٹھہرے تھے کچھ دن وہاں رہنے کے بعد کٹرہ ابو تراب خاں میں ایک کرایہ کے مکان میں اٹھ آئے لیکن اس عرصے میں سرائے کی بھٹیاری سے ان کی کافی جان پہچان ہو گئی تھی۔ انھوں نے اس بھٹیاری کی شخصیت و سیرت کا دلچسپ خاکہ اپنے روزنامچے میں پیش کیا ہے۔ اس بھٹیاری کا نام بھولا تھا۔ وہ شہر کی تمام سراؤں، یعنی نیم کی سرائے، گڑھی کی سرائے اور سرائے حسین آباد وغیرہ کی بھٹیاریوں کی منہ بولی بڑی بہن تھی۔ بی بھولا کا حلیہ یہ تھا:۔ چوڑا چہرہ جس پر چیچک کے داغ، سانولا رنگ، شوخ چشم، میانہ قامت، گداز بدن، ۴۵ سال سے زیادہ سن لیکن تنزل سن شباب کے باوجود عشوہ گر، بے باک اور عیارہ صفت۔ وضع لباس اور تراش خراش پوشاک کے لحاظ سے دلکش، اطلس کا لہنگا پہنے، جس کے نیفے میں سیمیں گوٹ، بنت اور سنہرے گوکھرو لگے ہوئے۔ پورے لہنگے پر گوٹے کی چھڑیاں، کاندھے پر صندلی رنگ کے جالی لیٹ کا دوپٹہ جس کے حاشیے میں نقرئی پٹھا لگا ہوا، طلائی بالی پتا، جگنو، چمپاکلی کڑا، چھڑا، اور دیگر زریں زیورات سے آراستہ، پاؤں میں زردوزی کا بیش قیمت پاپوش۔

بھولا اپنی برادری میں ممتاز اور عوام و خواص میں مقبول تھی۔ امرا و رؤسا کے دربار میں بھی رسائی رکھتی تھی۔ شرفا و نجبا کی محبت و دابستگی کا بھی دم بھرتی تھی۔ سلاطین و اراکین سلطنت نے اسے ہزاروں روپے، گھوڑے اور تمغے انعام میں دیئے تھے لہذا خوشحال زندگی گزارتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اپنے کام اور فرائض میں مستعد رہتی تھی۔ مسافروں کی خاطر داری و دلجوئی، پخت طعام اور دوسرے اوصاف جو بھٹیاروں کے لئے مخصوص ہیں یعنی رقص و سرود، نقل اور سوانگ، جنگ و جدال، ایجاد دشنام و فحش گوئی، طلاقت لسانی و چرب زبانی، شوخی و چالاکی، کرشمہ و ناز میں ماہر

ہوشیار تھی۔ اس نے خان صاحب کی مہمان نوازی اور خدمت گزاری کے لئے دو ہوا ت بھٹیاریوں جمتی اور عیدیا کو مقرر کر دیا تھا۔ ایک دن جمتی نے سمجھ لیا تھا اور سب کام عیدیا کے سپرد تھے لیکن کم سنی کی وجہ سے اس نے ادائے فرض میں کوتاہی کی تھی اور خاں صاحب کا کمرہ صاف نہ کیا تھا۔ اتفاق سے بھولا بھٹیاری ادھر آنکلی۔ جب اس کی نظر کمرے کی کثافت پر پڑی تو عیدیا کو مارنا شروع کیا یہاں تک کہ اس کے سینے پر چڑھ گئی، اور اس کا دانت اکھاڑ لینے کی کوشش کرنے لگی۔ خاں صاحب نے ڈر کر کہ مبادا مقدمہ ہو جائے اور انھیں گواہی دینا پڑے، بیچ بچاؤ کرایا اور قسم دے کر عیدیا کو چھڑایا۔ بھولا اپنے عروج تاں یونانی کراں بہا اور زیورات قیمتی کے باوجود ہاتھ میں جھاڑو لے کر جاروب کشی کرنے لگی۔ خاں صاحب نے اسے منع کیا لیکن وہ نہ مانی اور کہنے لگی کہ مسافروں کی خدمت کرنا ہمارا فرض اور سرمایۂ افتخار ہے۔ جھاڑو دینے کے بعد اس نے اپنا کھانا منگوا کر اسی کمرے میں کھایا اور تھوڑی دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتی رہی۔ اس کے دریافت کرنے پر خاں صاحب نے شہر کی تعریف کی۔ بھولا نے کہا کہ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں شہر زیادہ رونق دار تھا۔ آج کل تو بادشاہ کی دنائت و پستی طبع کے باعث شہر میں ویرانی کا عالم ہے۔

جب خاں صاحب سرائے چھوڑ کر کرایہ کے مکان میں چلے آئے تو بھولا بھٹیاری ایک دن ان کی ملاقات و مزاج پرسی کے لئے آئی۔ ان دنوں خاں صاحب کی طبیعت علیل تھی۔ ان کے چہرے کی زردی اور آنکھوں کی لالی کو دیکھ کر اسے گمان ہوا کہ شاید یہ کسی مہرو کی بے مہری اور کسی خوبرو کی عدم التفاتی کے شکار ہیں۔ اس نے آتش کا یہ شعر پڑھ کر

رنگ زرد و چشم تر سے کیجئے دعوئ عشق   دو گواہ حال اس قصہ کے لایا چاہئے

ان سے پوچھا: "اے مسافر دل باختہ و بعید الوطن، و اے چہرہ زرد ساختہ در عشق گلبدن

دل آشفتہ و دیدہ خونبار داری   مگر با محبت سر و کار داری

آپ کا حال کیسا ہے اور خیال کہاں ہے؟ شاید دلفریبان لکھنؤ نے آپ کے دل کو اسیر اور جان کو دلگیر کر دیا ہے، اپنا حال جلد بیان کیجئے اور مجھے اس خلجان سے خلاصی دیجئے۔" خاں صاحب نے جواب دیا۔

"دیار غربت میں مجھے کون پوچھتا ہے اور ہمارے ایسے مسافروں کی کون خبر لیتا ہے۔ جب سے میں اس شہر میں آیا ہوں طرح طرح کے رنج و علالت میں گرفتار رہوں۔ کوئی دن بھی راحت و صحت کے ساتھ نہیں گذرا۔ شہر کی آب و ہوا کی ناموافقت سے مثل بلبل بیمار رہوں۔ ایسی حالت میں دلبران لکھنؤ کے سودا کا کہاں موقع ہے۔"

اس گفتگو کے بعد بھٹیاری نے اپنے ایک آشنا نوروز علی کا خط خاں صاحب سے پڑھوایا جو اس نے پردیس سے لکھا تھا۔ انھوں نے خط پڑھ کر مفہوم سے آشنا کیا اور موقع کے مناسب ناسخ کے چند اشعار بھی اپنی طرف سے سنائے۔

دم مرا گھبرا کے کر جاتا سفر گر یہ دم بھر اور آتا نامہ بر
غور سے دیکھوں میں ہر مضموں کو کوئی ساعت دل مرا بہلائے خط

دل باختہ بھٹیاری نے جب خط کا حسرت آگیں مضمون اور اشعار کے مطالب سے تو بہت ملول و محزوں ہوئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک گئے۔

تھوڑی دیر بیٹھ کر بھولا واپس چلی گئی۔ جاتے وقت خاں صاحب نے اسے ایک روپیہ رخصتانہ پان کھانے کے لئے دیا حالانکہ یہ رقم اس کے مرتبے اور لیاقت کے لحاظ سے بہت ہی کم تھی۔ جب وہ جا چکی تو نواب مرزا صاحب (خاں صاحب کے لکھنوی دوست) نے انھیں بتایا کہ یہ عورت ہمیشہ شرفا و نجبا کے عشق میں مبتلا رہتی ہے۔ ہزاروں روپے جو اس نے سلطان نصیر الدین حیدر کے محل سے گانے بجانے کے صلے میں پائے تھے سب اسی محبت میں لٹا چکی ہے۔ چنانچہ کچھ دن پہلے نوروز علی نے جوے میں سات سو روپیہ ہارا تھا۔ اور بوجہ عدم ادائگی رقم ساتھیوں نے اسے گرفتار کر رکھا تھا۔ آخر اسی بھٹیاری نے سب روپیہ ادا کر کے اپنے آشنا کو رہائی دلائی۔

سوانح لکھنؤ میں اس زمانے کی بعض مشہور و متبرک عمارتوں، درگاہوں، سڑکوں اور دروازوں کا بھی ذکر ہے، جن میں سے امام باڑہ حسین آباد، امام باڑہ آصف الدولہ، امام باڑہ آغا باقر، درگاہ حضرت عباس علمبردار، روضہ امام رضا، بارہ دری آصف الدولہ کے حالات اور ان کی آرائش اور روشنی کی کیفیت قدرے مفصل اور

بڑی عقیدت مندی کے ساتھ بیان کی گئی ہے ۔ رومی دروازے کے متعلق خاں صاحب نے بتایا ہے کہ اس نام کے دو دروازے ۔ ایک قدیم تعمیر کا ہے اور دوسرا نو تعمیر ہے ۔ یہ دروازے بہت بلند ہیں اور ان پر متعدد طلائی برجیاں ہیں ۔ دروازۂ سلطان مسمی ۔ فرح بخش کے اوپر سونے کے شیر بنے ہوئے ہیں ۔ رومی دروازے کے سامنے محمد علی شاہ کا محل ہے ۔ موتی جھیل عیش باغ اور بارہ دری آصف الدولہ کی عمارتیں نو تعمیر ہیں ۔ امام باڑہ حسین آباد کے سامنے جو سڑک ہے وہ بہت کشادہ ہے اور اس کے دونوں جانب عالیشان عمارتیں باغ ۔ تالاب، نقار خانے اور جانور خانے ہیں ۔ جانور خانے میں قسم قسم کے دیسی اور ولائتی جانور پلے ہوئے ہیں جن کی نگرانی کے لئے آدمی مقرر ہیں ۔

لکھنؤ اس عہد میں شاعروں، ادیبوں اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین کا مسکن تھا ۔ نجات حسین خاں صاحب نے ان اکابرین شہر سے متعدد بار ملاقاتیں کیں اور ان کا کچھ حال اپنے روزنامچے میں قلمبند کیا ہے ۔ ان کو آتش، انیس، دبیر، ضمیر اور برق ایسے سخنوران عصر کی خدمت میں باریابی اور ان کا کلام سننے کا موقع نصیب ہوا ۔ ان کے علاوہ خاں صاحب نے جن دوسرے باکمالوں سے ملاقاتیں کیں وہ یہ ہیں مرزا عباس صاحب کتاب خوان و مولف گلشن عزا میر احمد صاحب مرثیہ خوان جن کو کبوتروں کا بہت شوق تھا ۔ میر حافظ علی صاحب خوشنویس جو خط شفیعا بہت عمدہ لکھتے تھے، حکیم حاجی صاحب طبیب شہر جن سے خاں صاحب نے کسی طبی مسئلے پر بحث کی، میر امام علی صاحب رسالہ دار لشکر شاہی، مرزا کریم بیگ صاحب جو ایک جنگ آزمودہ سپاہی تھا اور جن کی انگلیاں کسی جنگ میں کٹ گئی تھیں ۔ ان سب لوگوں کی ملاقاتوں کا حال بیان کرنے کے لئے ایک علیحدہ مضمون درکار ہے ۔

لکھنوی شعراء کے قلمی اردو دیوان کتب خانۂ نواب سالار جنگ میں

(سلسلۂ صفحہ ۰)

بعد محبت نامے (خطوط) ہیں ۔ اس کے بعد چند مخمس اور آخر میں چند رباعیات شامل ہیں ۔ اس دیوان کی کتابت سنہ ۱۲۹۶ھ میں ہوئی ہے ۔ آغاز اس طرح ہوا ہے:

محو نظارۂ نگار ہوا ۔۔۔ تیر مژگاں جگر کے پار ہوا

شمع عارض کا دیکھ کر جلوہ ۔۔۔ مثل پروانہ دل نثار ہوا

واجد علی شاہ کی بعض بیگمات کے خطوط کا مجموعہ کتب خانۂ آصفیہ (سنٹرل لائبریری حیدر آباد) میں ہے اور تاریخ غدر الله کے نام سے خطوط کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا ہے ۔ یہ مطبوعہ کتاب اس کتب خانہ میں بھی موجود ہے لیکن آخر الذکر کتاب میں بادشاہ محل کا کوئی خط درج نہیں ہے ۔ بہرحال، یہاں پر بادشاہ محل کے کچھ اور اشعار درج کئے جاتے ہیں ۔

ہجر میں ہم نے یوں گزاری رات ۔۔۔ صبح کی کرکے آہ و زاری رات

ساقیا کس کا جام عشق پیا ۔۔۔ چشم بد دور کیا خمار ہے آج

درد دل بڑھ گیا سوا حد سے ۔۔۔ حال کیا ہوگی اب شفا افسوس

میرے ماتم میں سیہ پوش ہوا اے عالم ۔۔۔ تا قیامت نہیں بدلے گا شب تار کا رنگ

دیوانہ کوئی کہتا ہے وحشی کوئی ہمیں ۔۔۔ سب کچھ سنیں گے شکر ہو جو کچھ سنائے دل

کہتا ہوں جب کہ مرتا ہوں، کہتی ہو جھوٹ ہے ۔۔۔ آخر مرا یقین ہو کیونکر حضور کو

مجھ سا نہ ملے گا جو انھیں کوئی جفاکش ۔۔۔ اس روز میری طرز وفا یاد کریں گے

عشق بتاں میں ہوش سراپا نہیں رہا ۔۔۔ عالم مطیع ہم ہیں دل بیقرار کے

ایک رباعی ملاحظہ ہو ۔

مر مر کے شب ہجر سحر کرتے ہیں ۔۔۔ ضبط قلق و درد جگر کرتے ہیں

جب دیکھتے ہیں عاشق و معشوق بہم ۔۔۔ حسرت سے سوئے چرخ نظر کرتے ہیں

ایک منظوم خط کے چند شعر پیش ہیں ۔

اے مرے راز داں مرے غمخوار ۔۔۔ کیا حقیقت بھلا کروں اظہار

حال دل کا نہیں عیاں کرتے ۔۔۔ شرم سے کچھ نہیں بیاں کرتے

داغ دل میں جلن کچھ ایسی ہے ۔۔۔ حسن بیاں سے زبان جلتی ہے

ایک لحظہ نہیں کل آتی ہے ۔۔۔ مفت افسوس جان جاتی ہے

یاد گیسو میں دم الجھتا ہے ۔۔۔ ہاتھوں سینہ میں دل اچھلتا ہے

رات جیسی گزرتی ہے رو کر ۔۔۔ ایسی گزرے کسی نہ دشمن پر

نہ تو کھاتے ہیں کچھ نہ سوتے ہیں ۔۔۔ یہ غزل پڑھ کے آہ روتے ہیں

غزل

شاد عارفی

نقابِ عارضِ رنگیں میں دلکشی بھی ہے
عیاں سحر کے دھندلکے سے روشنی بھی ہے

جنوں کے ساتھ ہمیں زعمِ آگہی بھی ہے
وہی مثل کہ نہیں پی ہے اور پی بھی ہے

زمانہ ہم سے جو منسوب کر رہا ہے وہ بات
ہمارے منہ سے کبھی آپ نے سنی بھی ہے

نسیمِ صبحِ چمن اس کو کہہ رہا ہوں مگر
کہیں نسیمِ چمن مڑ کے دیکھتی بھی ہے

مزاجِ حسن پہ تہمت ہے غازہ و افشاں
جہاں گلاب میں خوشبو ہے سادگی بھی ہے

گرائی جاتی ہے بالوں کی لٹ جو ماتھے پر
مراد اس سے تخاطب بھی، دلکشی بھی ہے

یہ کہکشاں، یہ شفق اس کی چلمنیں ہی تو ہیں
وہ چلمنیں کہ جنھیں پاسِ دلبری بھی ہے

لبِ شگفتہ و چشمِ غزل فشاں کے سبب
نشاطِ بادہ میں پھولوں کی تازگی بھی ہے

جس التفات کو لازم ہے پردۂ دوری
اسے قریب سے دیکھو تو بے رخی بھی ہے

سمن بروں پہ یہ اظہارِ رائے اے زاہد
سمن بروں نے کبھی تجھ سے بات کی بھی ہے

چلا ہے لے کے ہمیں رہنما جدھر اے شادؔ
ثبوت کیا، کہ یہ منزل کی روشنی بھی ہے

محمد عتیق صدیقی

اودھ کی برائے نام بادشاہی کا ۴ر فروری ۱۸۵۶ء کو خاتمہ ہوا۔ اور یہ علاقہ بھی "کمپنی انگریز بہادر" کی عملداری میں شامل ہوگیا۔ واجد علی شاہ آخری بادشاہ اودھ کی معزولی کے ساتھ ہی ان احکام کا بھی عملاً خاتمہ ہوگیا جو شخصی حکومت کی حیات کے ضامن ہوتے ہیں۔ ان ہی میں اخباروں کے اجرا پر پابندی کا حکم بھی شامل تھا۔ چنانچہ انقلاب حکومت کے چند ہی مہینوں کے بعد لکھنؤ سے کم از کم دو اخباروں کا اجرا ہوا۔ طلسم لکھنؤ (جولائی ۱۸۵۶ء) اور سحرِ سامری (نومبر ۱۸۵۶ء) پہلے اخبار کی مکمل فائل فرنگی محل لکھنؤ کے کتب خانے میں، اور دوسرے کی ناقص فائل مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

یہ دونوں اخبار اس اعتبار سے بے حد اہم ہیں کہ ان کے صفحات میں آزادی کھونے کے دکھ، غلامی کے شدید احساس، انگریز اور انگریزی نظام سے بیزاری کے ساتھ ساتھ اس دور کے لکھنؤ کی اقتصادی زبوں حالی اور سماجی بے اطمینانی کی چلتی پھرتی تصویریں ہم کو نظر آتی ہیں۔ انقلاب حکومت جو تبدیلیاں اپنے جلو میں لایا تھا اور اس کے جو اثرات لکھنؤ اور اہالیان لکھنؤ پر مترتب ہوئے تھے، ان کے پورے پورے اور مستند نقشے بھی ان اخباروں میں ہم کو ملتے ہیں۔

آج کی صحبت کا موضوع سحرِ سامری ہے۔ اس کی پیش نظر فائل میں پہلے دو نمبر نہیں ہیں۔ تیسرے نمبر پر حسب ذیل تاریخ درج ہے۔

"نمبر ۳۔ ۲ر شہر ربیع الثانی ۱۲۷۳ھ ہجری مطابق ۱ر ماہ دسمبر ۱۸۵۶ء روز دوشنبہ"

سرورق کی پیشانی پر سحرِ سامری کے اردگرد یہ چار مصرعے درج ہیں۔

ہر چند کہ سحر سامری نام   اعجاز سے پر نہیں یہ کم ہے
خاکِ رہِ رہوار جبریل   گردِ سُمِ توسنِ قلم ہے

پیشانی کے نیچے اور تاریخ کی سطر کے اوپر حسب ذیل چار مصرعے ایک

ہی سطر میں لکھے ہیں۔

اولاً حمد حضرت خالق جس کے مرسل ہیں مخبر صادق
ثانیاً نعت شاہ جن و بشر جن کو دیتے تھے جبرئیل خبر

تاریخ کی سطر کے نیچے جلی قلم سے ایک سرخی ہے "اشتہار" جس کے تحت سترہ اشعار کی ایک نظم ہے، جس کا مطلع ہے۔

اے خامہ لکھ اشتہار اخبار عالم کو ہے انتظار اخبار

آخری اور سترھواں شعر ہے

قیمت مہ و سال کی رقم ہے اس سے نہ کبھی سوا نہ کم ہے

اخبار کے آخری اور آٹھویں صفحے کی عبارت سے ہم کو ایڈیٹر کا نام معلوم ہوتا ہے جو حسب ذیل ہے :۔

"نثر نثرہ نثار، ریختہ قلم، منشی دوراں، سخن شناس، زباں داں، شاعر بے بدل، عالم باعمل، منشی امیر احمد سلمہ اللہ الاحد"

اس کے نیچے جلی قلم سے یہ "پریس لائن" ہے۔

"شہر لکھنؤ میں سرائے معالی خاں کے پاس بال کرشن کے چھتے سے متصل بیج ناتھ کے اہتمام میں چھپا"

اخبار کے چوتھے نمبر میں ہم کو کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ لیکن پانچویں نمبر میں اخبار کے اشعار کا اہتمام سرے سے بدل جاتا ہے جو دراصل ادارتی تبدیلی کا نتیجہ تھا۔ پیشانی پر سحر سامری کے ارد گرد اب یہ اشعار ملتے ہیں

اخبار خوشنما کا یہ نور طبع چمکا عیاش ہر لفظ (؟) کو انجم سے برتری ہے
تاریخ ہم نے پوچھی ہاتف نے یہ ادا کی اعجاز نقش موسیٰ کیا سحر سامری ہے

تاریخ کی سطر کے نیچے ایک ہی سطر میں جو چار مصرعے لکھے تھے، وہ بھی بدل گئے۔ اب ان کی جگہ پر حسب ذیل اشعار ملتے ہیں

وہی مطلب ہے اللہ الصمد کا وہی خالق ہے ہر نیک اور بد کا
حبیب کبریا، فخر عرب ہے اسی کا مخبر صادق لقب ہے

اشتہار کے اشعار بھی بدل جاتے ہیں، اور ان کی تعداد بھی سترہ سے گھٹ کر تیرہ رہ جاتی ہے۔ نئے اشتہار کا مطلع ہے

دکھا اے خامہ طرز سحر سازی رقم کر نقشۂ جادو طرازی

اور مقطع ہے۔

طلسم راز ہے یہ طلسم عیاش ثنا جس نے کہا شاباش شاباش

سحر سامری کے اسی پانچویں نمبر کے اندرونی صفحات میں "التماس" کے عنوان سے ادارتی تبدیلی کا حال حسب ذیل عبارت میں ناظرین اخبار کو سنایا گیا تھا۔

"راقم صحیفۂ اخبار ناظرین قدر شناس کی خدمت میں عرض پرداز ہے بعد نیاز نامہ طراز ہے کہ اب کی بار اشتہار اس اخبار کا سمع منشی بدایع نگار تبدیل ہوا ہے، التزام تصحیح مضامین دل نشیں بطرز تحسیل ہوا ہو قطعہ تاریخ بھی شامل ہو۔ رعایت نام کی حاصل ہو۔ جوہریان بازار معانی۔ لطف صفات ملاحظہ فرمائیں۔ صیرفیان دارالعیار سخندانی بہ نگاہ انصاف معائنہ فرمائیں"

اس "التماس" میں یا اخبار کے آخری صفحے پر (غالباً جگہ کی قلت کی وجہ سے) اس کا اظہار نہیں کیا گیا ہے کہ اب "اخبار کا منشیٔ بدایع نگار" کون ہے؟ یہ معمّا اخبار کے دسویں نمبر سے حل ہوتا ہے۔ جہاں ایڈیٹر کا نام اس طرح لکھا گیا ہے۔

"کمترین روزگار، رگھبر زائن عیاش، وقائع نگار"

اس کے معنی یہ ہیں کہ سحر سامری کے پہلے چار نمبر "شاعر بے بدل عالم باعمل، منشی امیر احمد (امیر مینائی)" نے مرتب کیے تھے۔ اور پانچویں نمبر سے اس کی ادارت، رگھبر زائن عیاش کی طرف منتقل ہوئی جو اخبار کے آخری دم تک اس کے ایڈیٹر رہے۔

سحر سامری کے صفحات میں جو خبریں شائع ہوئی تھیں، ان کو بہ آسانی پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) لکھنؤ کی خبریں۔ (۲) واجد علی شاہ اور ان کے مقدمے کی خبریں (۳) ہندوستان کے مختلف حصوں کی خبریں۔ (۴) غیر ملکی خبریں (۵) سرکاری گزٹ کے اقتباسات۔

سحر سامری کی مندرجہ بالا ترتیب، خبروں کی اہمیت کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے۔ چوں کہ لکھنؤ کی خبریں سب سے زیادہ اہم تھیں، اس لئے

۱؎ راقم الحروف نے ہندستانی اخبار نویسی میں سحر سامری کے ایڈیٹر کا نام غلطی سے گھبر زائن لکھا تھا وہ صحیح نہیں۔

ان کو پہلے نمبر پر رکھا گیا ہے۔

لکھنؤ کی خبریں

اخبار کے تیسرے نمبر میں "لکھنؤ" کے عنوان سے بہت سی خبریں ہم کو یکجا ملتی ہیں۔ ان کی سرخیاں الگ الگ قائم نہیں کی گئی تھیں۔ ان میں سے دو خبریں پڑھیے۔

"۷ ر فروری سے ۲۵ ر اگست ۱۸۵۶ء تک بحکم نواب گورنر صاحب بہادر بعضے افسران افواج کی تقسیم (تنخواہ) کے لئے خزانۂ کمپنی بہادر سے احکام جاری ہوئے۔ علی بخش خاں رسالہ دار، اور نادر حسین خاں کمیدان پٹالن اصغری، دو دو سو روپئے کی ماہواری (مقرر) ہوئی۔ جو لوگ توپ خانوں کے داروغہ یا تلنگوں کے کپتان تھے، بڑی بڑی عمارت کے سامان تھے، ان کے لئے سو سو روپے تنخواہ ٹھہری۔ بچیوں کے افسروں کو اتنی اتنی روپے دیے کی ماہ بہ ماہ ٹھہری۔ بختی مرٹ صاحب کے نام بھاگن میں پنشن کی تقسیم کا حکم آیا۔ سرکار نے افسروں (فوج) کو تو خوب مطمئن فرمایا۔ خدا کرے کہ ملازمین شاہی کی بھی پرورش ہو جائے۔ ہزارہا آدمی خزانے کا نوکر بے معاشی سے تڑپ رہا ہے، ان کی بھی باری آئے۔ رعیت پروری دور و نزدیک مشہور ہو جائے۔ بربادی... (دیکھنا ہے) امید کی کوفت بے معاشوں کے دلوں سے دور ہو جائے۔"

دوسری بے عنوان خبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہڑتال جو آج وبائے عام کی طرح پھیل چکی ہے، اس کی داغ بیل بھی انگریزی عہد کے آغاز کے ساتھ ہی پڑ چکی تھی۔

"شرف الدولہ بہادر، گنجیات کے متاجر، نے دوکانداران یحییٰ گنج پر ان دنوں کڑاہی کی۔ سب دوکانداروں نے دوکانیں بند کر کے تار والی کوٹھی کی راہ لی، ڈپٹی کمشنر بہادر کی پناہ لی، بے داد کی داد چاہی، اپنی مراد چاہی۔ کئی دن تک بازار بند رہا، خرید و فروخت کا کاروبار بند رہا۔ آخر ڈپٹی کمشنر بہادر کا مزاج انصاف پر آیا، متاجر کے نام اس مضمون کا پروانہ جاری فرمایا کہ اگر دستور کے خلاف نیا سیاق نکالوگے۔ آپ کو آفت میں ڈالوگے۔ دوسرے کو یہ متاجری عطا ہو جائے گی، آزار رسانی تمہارے حق میں بلا ہو جائے گی۔ جب جاری یہ پروانہ ہوا، فریادی اپنے گھر کو روانہ ہوا۔ ناشاد گئے تھے شاد آئے۔"

لکھنؤ کی ایک خبر (۱۵ ر دسمبر ۱۸۵۶ء) سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت غلہ بازار میں عنقا تھا۔ اس خبر کو رگھبر نرائن عیاش نے اپنے مخصوص انداز سے پیش کیا تھا۔ خبر کا عنوان ہے "لکھنؤ میں غلہ کی نایابی"۔

"ان دنوں غلے کی گرانی ہے۔ گرانیِ خاطر کی ارزانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج ہو رہا ہے، آسیائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے۔ فاقہ کشوں کی آہ شرربار سے قرص ماہ جل گیا۔ گردۂ نانِ خورشید لشکرِ غم کے پاؤں کے نیچے کچل گیا۔ جو رفاقہ سے اقا قت نہیں، کون ہے جسے دردِ شاقہ سے رفاقت نہیں۔ بے معاشی نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا۔ جس دانا نے حالِ بربادیٔ سلطنت سنا، رو دیا۔ دورِ عہدِ شاہی کیا مٹا، گویا گیہوں میں گھن لگا۔ ایک تو معاش نہیں، جائے تلاش نہیں۔ دوسرے دورِ غم سے گندمی رنگ ہر بشر نیلا ہوا، گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہوا۔ یہ مثل ہے ایک دوست کی رباعی: "چار بلالے جو دو آئے دے دال میں پانی" "میزبان مہمانوں کو کیا بلائیں، نہ خود کھائیں نہ ان کو کھلائیں۔ خونِ دل بجائے شراب ہے۔ لختِ جگر بجائے کباب ہے۔ بد حواسی سے زوالِ اعتدالِ مزاج ہوا۔ ہر غریب آدمی روٹی کے ٹکڑے کو محتاج ہوا۔ ایک روپیہ کا سولہ سیر آٹا ہے۔ بنیوں کی بن آئی، گو خریداروں کو گھاٹا ہے۔ تیل مہنگا، گھی سستا ہے۔ محتاج روتا ہے، تونگر ہنستا ہے۔ چکنی چپڑی باتوں سے تدبیر نہیں چلتی۔ بہت سر پٹکتے ہیں دال نہیں گلتی۔ حاکم اس طرف عنانِ توجہ موڑتا نہیں، بس کیا کریں کہ اکیلا چنا بھاڑ پھوڑتا نہیں۔"

واجد علی شاہ کی خبریں

واجد علی شاہ کے قیامِ کلکتہ کے کوائف، ان کے مقدمے کی خبریں، جن کی پیروی کے لئے ان کی والدہ اور ان کے ولی عہد لندن گئے تھے، اور واجد علی شاہ کے متعلقین و متوسلین کے متعلق جتنی خبریں سحرِ سامری میں شائع ہوئی ہیں، ان کو اگر یکجا کیا جائے تو ایک چھوٹی سی کتاب بن سکتی ہے۔ ان خبروں کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک تو ہر شخص کو اس کا یقین تھا کہ واجد علی شاہ کے ساتھ کمپنی انگریز بہادر نے زیادتی اور ناانصافی کی ہے۔ دوسرے یہ کہ برطانوی انصاف پر بظاہر ہر شخص کو

بھروسہ تھا اور اسی کی بنا پر اس کا بھی یقین تھا کہ واجد علی شاہ کو ان کا
کھویا ہوا اقبال اور اودھ والوں کو ان کا کھویا بادشاہ واپس مل جائے
گا۔ ہر خبر کی تہہ میں امید کی یہی فسوں کاری کارفرما نظر آتی ہے۔ اس
سلسلے کی پہلی خبر جو پیش کی جا رہی ہے اس کا عنوان ہے "خبر فرحت اثر"
عبارت یہ ہے:۔

"مرزا باقر صاحب، مرزا ولی عہد بہادر کے مصاحب، سفر ولایت
میں ولی نعمت کے ہمراہ تھے افعال کی طرح مقبول بارگاہ تھے۔
وہاں پہونچ کر ولی نعمت نے نامہ بری کا منصب عنایت کیا حضرت
سلطان عالم کے پاس رخصت کیا۔ انگریزی ڈاک کے جہاز پر
سوار ہوئے۔ ۱۶ ربیع الاول ۱۲۷۴ ہجری کو دریلے پار ہوئے۔
حضرت کے نام اپنے حضور کی تحریر لائے۔ گھڑی وغیرہ اور بہت
سے تحائف دل پذیر لائے۔ ان کی زبانی ہے، دلچسپ کہانی ہے۔
ابھی تک ملکہ فرنگ مصروف سیر و شکار ہیں، مسافران لندن محو تماشا
ہیں۔ گر تیر مدعا نشانے سے قریب تر ہے بلکہ فرنگ کی شکار سے جلد
پلٹنے کی خبر ہے۔ بڑے بڑے انگریز جلیل الشان، اونچی اونچی کچہری
پارلیمنٹ کے ارکان ہم زبان ہیں کہ داد گستری کے آئینہ تک تیغ انصاف
کے جوہر نہاں ہیں۔ ادھر ملکہ شکار سے پھریں ادھر برگشتہ طالعوں
کے دن پھر جائیں گے۔ جتنے رستا ہے گردش میں ہیں، رنگ ندامت
کی طرح ستم ملک سے گر جائیں گے پھر وہی بادشاہ اودھ کا ذرہ ذرہ
ہوگا، وہی حشمت کا انداز، وہی سلطنت کا ظہور ہوگا۔ شکستہ خاطروں
کو تسلی دیتے ہیں، اراکین دولت کو تشفی دیتے ہیں کہ گھبرانے کی تا مقام،
دنیا کی کسی بات کو ثبات نہیں۔ ان ہی حکام پارلیمنٹ والے نے
اپنے مکان خالی کر دیئے۔ ایک ایک کو آنکھوں میں جگہ دی، دلوں
میں گھر دیئے۔ ملکہ فرنگ نے پرچہ پیام بھیجا۔ جناب عالیہ (والدہ
واجد علی شاہ) کے نام بھیجا کہ بادشاہی کوٹھی میں اترئیے۔ ہر طرح
کا سامان آرام سرکار سے بے خطر لیجئے۔ اضطرار کا مقام
نہیں، گھبرانے کا ہنگام نہیں، ڈیڑھ مہینے میں ہم آتے ہیں، تمہیں
مراد کو پہنچاتے ہیں۔ مرزا (باقر) صاحب اس تحریر کے آنے سے
دس روز کے بعد گرم سفر ہوئے، بائیس (۲۲) دن راہ میں بسر
ہوئے۔ اس حساب سے اب ملکۂ عالم آگئی ہوں گی، اور جناب عالیہ
مدعا پائی مراد پاگئی ہوں گی۔"

طلسم لکھنؤ مورخہ ۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء میں اس سلسلہ کی خبروں
میں پہلی خبر جو ہم کو ملتی ہے، وہ بے حد دلچسپ ہے۔ خبر سے زیادہ اس
کو پیش کرنے کا انداز دلچسپ ہے۔

"شاخ قلم شگوفہ بہار سے رشک گل زار ہے۔ تختۂ کاغذ آبدار
سرسبزی مضامین سے رنگیں نگار ہے۔ نوسنجی رنگ ہزار داستان
چمن ہے۔ شیریں ادائی مانند طوطی شکر شکن ہے۔ افواہ عام سے
ظاہر ہوا، حال تازہ سے ہر ایک ماہر ہوا کہ موضع پور نیا علاقہ
دریاباد (ضلع بارہ بنکی) میں کسی کھوانی دین برہمن ہے۔ وہ ایمان
میں یکتائے زمن ہے۔ اس نے حضور کمشنر بہادر علاقہ مذکور میں
سوال دیا۔ سو روپے چندہ دلانے کا اظہار کیا۔ صاحب کمشنر
بہادر نے سوال پڑھ کر ارشاد فرمایا کہ جملہ حقوق مالکانہ اور
چندہ وغیرہ جو عہد شاہی میں مقرر تھے، حسب الحکم سرکار کمپنی انگریز
بہادر ضبط ہوئے۔ اب ملنا محال ہے، خلاف حکم ہونا محال ہے۔
سائل نے عرض کی کہ خیر ہم زر سالیانہ اپنا پھاگن کے مہینے میں
لے لیں گے۔ اگر پرمیشر نے چاہا تو استرداد سلطنت کے بعد شاہ عالم پناہ
کا تصدق لے کر صدق دل سے دعائیں دیں گے۔ کمشنر بہادر نے
فرمایا کہ ہم کو اس زبانی قول کا یقین نہ آیا۔ تم نے کس طرح یہ
بات جانی؟ کس حساب سے یہ شکل پہچانی؟ بالفرض اگر یہ ظہور
میں آئے گا تو ہم عہد کرتے ہیں کہ پانچسو روپیہ سالانہ تمہارا سرکار
شاہی سے مقرر ہو جائے گا، ورنہ سچ بتاؤ تمہاری کیا سزا ہو۔ برہمن
نے کہا کہ ہاتھ قلم ہوں۔ اگر فرمائیے تو یہ دونوں شرطیں ہماری آپ
کی رقم ہوں۔ صاحب عالیشان کو منظور ہوا۔ لکھوا لینا ضرور ہوا۔
اسی وقت کاغذ اسٹامپ پر تقریریں مرقومۃ الصدر تحریر ہوئیں۔
رئیسان ضلع کی گواہیاں نقش پذیر ہوئیں۔ ... پروردگار عالم کرم
گستری فرمائے۔ اس خیر خواہ خلائق کی سخن پروری فرمائے۔ وہ
کلام علیہ صداقت سے آشنا ہو، لباس راستی سے پیراستہ ہو۔
سلطان عالم خلداللہ ملکہ مع وارث تخت خلافت کامیاب پھریں۔

نسیم مقدم بہار سے پژمردہ دلوں میں جان آجائے۔ افسردہ تنوں میں شگفتگی تازہ رنگ لائے۔ بعضے بدخواہان سلطنت جو ایسی نیک خبروں کو گپ بتلاتے ہیں، ان حاسدوں کا کلام بتِ پندار کی پرستش سے سراسر بغض للّٰہ پائے جاتے ہیں۔"

۳۔ ہندستان کی خبریں

اس جگہ ہندوستان کی صرف وہ خبریں پیش کی جائیں گی، جو ہیاسی رنگ کی ہوں گی۔ سلطنت اودھ کے خاتمے کے بعد، عام خیال ہوگیا تھا کہ ہندوستان کی باقی تمام ریاستوں کا بھی ایک ایک کرکے خاتمہ ہوجائے گا اور اس طرح سارا ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرنگیں ہوجائے گا۔ اس سلسلے کی پہلی بے عنوان خبر ہم کو یکم دسمبر ۱۸۵۶ء کے مجموعے میں "متفرقات" کے تحت ملتی ہے جو حسب ذیل ہے۔

"اخبار سے نقل ہے کہ سارا راجپوتانہ ممالک انگلیشیہ میں شامل ہوگا، حیطۂ تصرف کمپنی انگریز بہادر میں داخل ہوگا۔ لیکن زمانہ اس کے ظہور کا کسی پر ظاہر نہیں، کوئی اچھی طرح اس سے ماہر نہیں جتنا گیا ہے برملا بیان سے۔ حیدرآباد، کشمیر اور گوالیار میں بدانتظامی سے بڑا فتور ہے، پہلے ان ہی ملکوں کا انتظام منظور ہے۔" فقط

"انگلش مین سے روایت کرتے ہیں، صحیح حکایت کرتے ہیں کہ ریاست اودھ میں انگریزی انتظام ہوا چاہتا ہے۔ اس ریاست کا بھی کام تمام ہوا چاہتا ہے۔ فقط"

ایک اور خبر کا عنوان ہے "بادشاہ دہلی اور ناظم مرشدآباد کی پنشنوں میں تخفیف کی خبر"۔ عبارت حسب ذیل ہے :۔

صاحبان گورنمنٹ کا ارادہ ہے، اس بات پر ہر ایک آمادہ ہے کہ روسائے اضلاع مغربی کے سوا بادشاہ دہلی اور ناظم مرشدآباد جو تنخواہ پاتے ہیں اس میں تخفیف کیجئے، یوں تکلیف دیجئے۔ ناظم مرشدآباد کے چار لاکھ رہ جائیں۔ شاہ دہلی چھ لاکھ پائیں۔ اس صورت میں بارہ لاکھ روپے کی توفیر ہے۔ یہ خوب برآمد کار سرکار کی تدبیر ہے۔ اگر گورنمنٹ عہدناجات وغیرہ میں تجویز ثانی فرمائے اور پنشن داروں کی جائیداد میں تخفیف میں آئے (تو) پچھتر لاکھ روپے کی گنجائش ہو، مال سرکار میں افزائش ہو۔" فقط

ایک بے عنوان مگر دلچسپ خبر سنئے :۔

"صاحب اخبار دوربین، صداقت شعار، راستی آئین، حکایت کرتے ہیں، صحائف انگریزی سے روایت کرتے ہیں کہ ایک فرنگی سارجنٹ جلیل عہدے پر مقرر تھا۔ عجب طرح کا کام کیا۔ مرد سفید پوست، فرنگی نژاد نے ساری قوم کو بدنام کیا۔ ہندوستانیوں کی دیانت داری میں کلام کرتے ہیں، اپنے افعال پر نظر نہیں کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ زر مصارف لشکر اس سرجنٹ کے سپرد ہوا۔ دیانت کے لئے ان سے کہا گیا، مگر ان سے نہ رہا گیا۔ چار دن میں خرد برد ہوا۔ . تقدیر سے افشائے راز ہوا۔ یہاں تک کہ مقدمہ محکمہ گورنمنٹ مارشیل (کورٹ مارشل) میں دائر ہوا۔ حکم ہوا کہ عہدے سے گرا دو، پچاس کوڑے لگا دو۔ دو برس کی قید ہو۔ لیکن سپہ سالار بزرگ، قوم کی رعایت کر گئے۔ عہدے سے موقوف کرنے پر اکتفا کر گئے۔" فقط

ایک بے سر و پا خبر سنئے، جو حبیب الاخبار (بدایوں) سے نقل کی گئی تھی۔ اس نوع کی خبریں آج بھی کبھی کبھی اخباروں میں نظر آتی ہیں۔ قصہ بدایوں ہی کے ایک گاؤں ہیریا کا ہے۔ جہاں ایک تماکو (تمباکو) والے کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ صانع ازل کی قدرت کا کھیل ہویدا ہوا۔ یعنی اسکے ہاتھ میں گوشت کا حقہ مع نیچہ اور چلم نظر آیا کانوں کا سنا نہیں، آنکھوں کا دیکھا ہے۔ کچھ کچھ دھواں منھ سے نکلتا پایا یا، باقی بدن پر ایک سیم کا سالم تھا جیسا کہ نظارہ جمال ہر ایک فاضل و عالم تھا۔ بسم اللہ نام ضامن کی ضامنی دی، ہندو نے بے توسل فال نیک کہی۔ بعضوں نے کہا حسن محض ہے، لب معشوق کی طرح شیریں شمائل ہے۔ مگر اس نے تھوڑی دیر میں ایسا دم مارا کہ بے دم ہوکے ایک دم میں دنیائے فانی سے سدھارا۔ جب وہ آغوش زمیں میں سو گیا، باپ کا دل گل کی طرح غم سے جل کے خاک سیاہ ہوگیا۔ ماں گال پر گال رکھ کر روئی۔ ہمشیر نے گرم آہیں بھر بھر کے جان کھوئی۔ ہر سمت سے مانند نے صدائے نالہ آنے لگی۔ بےکلی کے پیچوں سے جان گھبرانے لگی۔ لوگوں نے یہ حال تباہ دیکھ کے بہت ملال کیا۔ جناب باری سے سر دست پناہ کا سوال کیا۔" (حبیب الاخبار)

اٹھارہ سو ستاون کی خبریں

جنگ آزادی کا آغاز تو مئی کے مہینے میں ہوا، مگر ۱۸۵۷ء کے اوائل ہی سے افلاس کے بادل ہندوستان کے آسمان پر منڈلانے لگے تھے۔ اس سلسلے کی ان گنت خبریں سحر سامری میں ملتی ہیں جن کو ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ ۹ مارچ ۱۸۵۷ء کے اخبار میں ہم کو مولوی احمد اللہ شاہ کے واقعہ فیض آباد کی تفصیلی خبر "فیض آباد" کے عنوان سے ملتی ہے۔

"فیض آباد سے ایک آشنائے ہمدم کا خط آیا۔ یہ حال صاف لکھا پایا کہ ایک شخص مسلمان رئیس زادگان ملک دکن سے، سات آٹھ آدمی ہمراہ لے کے سرائے فیض آباد میں مقیم تھے۔ آپ کو فقیر قرار دے کے انگریزوں سے مستعد جہاد بے خوف و بیم تھے۔ ہر گلی کوچے میں مع ہمراہیاں خاص ہتھیار باندھے پھرتے تھے۔ اکثر مردان پولیس یہ حال دیکھ کے براہ تعرض گھیرتے تھے۔ رفتہ رفتہ خبر ہوئی کہ بلوے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمراہیوں کو ہر وقت آمادہ رکھتے ہیں۔ سپاہیان سرکار نے تکرار (تگ و دو) بے شمار کی۔ ہتھیار لے لینے میں تکرار کی۔ کہا کہ سب سلاح دے دو، یا اسی وقت اپنا راستہ لو۔ جواب دیا کہ ہم نہ ہتھیار دیں گے، نہ کسی سے جھگڑا فساد مول لیں گے۔ الغرض کوتوال صاحب اور تھرن ہل (تھارن ہل) صاحب کمشنر نے سنا۔ استفسار حال کے واسطے طلب کیا ان کو انکار ہوا۔ نہ جانے میں اصرار ہوا۔ آخر صاحب موصوف خود تشریف فرما ہوئے۔ بہت فہمائش کی، گروہ ایک نشنوا ہوئے۔ ناچار ایک کمپنی بلا کے حفاظت کا کام کیا۔ رپورٹ اس مضمون کا بمقام بھدرسہ کہ فیض آباد سے پانچ کوس ہے ڈپٹی کمشنر بہادر کے نام کیا۔ صاحب بہادر یہ حال سنتے ہی سوار ہوئے، مقام واردات پر وارد وہ عالی مقام ہوئے۔ ہنگام طلوع آفتاب جمیع صاحبان والا جناب رونق افزا ہوئے۔ حاکمانہ بلکہ ناصحانہ سمجھایا مگر وہ کج فہم بر سر راستی نہ ذرہ ہوئے۔ حاکم سے مقابلہ آسان جانا اس شعر کا مضمون نہ پہچانا ؎

ہر کہ با فولاد بازو پنجہ کرد ساعد مسکین خود را رنجہ کرد

افسر پلٹن نے سرائے میں جس دم قدم بڑھایا، شاہ صاحب کی طرف سے ایسی ایک تلوار استقبال کو چلی کہ افسر کا ہاتھ جھوٹا ہوا، زخم کاری کھایا۔ ڈپٹی کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ ہنا ایک ایک کو جانے نہ دینا۔ پلٹن کے تلنگے مسلح تھے۔ اسی دم چار آدمی گولیوں کی ضرب سے بے جان کیے، اور شاہ صاحب مع چار آدمی زخمی ہوئے، گرفتار بلا دیے گئے ہوئے"۔

۱۱ مئی کے سحر سامری میں ہم کو موسیٰ باغ کے ہندستانی سپاہیوں کی "بغاوت" کا حال معلوم ہوتا ہے، جو لکھنؤ کے زیر عنوان درج کیا گیا تھا۔

اس دم تیغ زبان قلم رواں ہے۔ آب داری مضامین رنگین کا بیان ہے۔ ان دنوں نیا گل موسیٰ باغ میں شگفتہ ہوا۔ مانند بوئے گل فتنہ راز نہفتہ ہوا۔ چھ سو جوان پلٹن منگلس صاحب جوفی الحال ملازم سرکار کمپنی انگریز بہادر تھے، کارتوس کاٹنے پر میان سے باہر ہوئے۔ عدول حکمی پر کمر باندھ کے کشادہ پیشانی آمادہ فساد و شر ہوئے۔ ایک چٹھی اس پلٹن سے نزدیک افسران فوج منڈیاواں روانہ ہوئی۔ آخر کار یہ بات افشا ہوئی۔ سرکار کو تدارک مد نظر ہوا منظور   ۔ آتش شر ہوا۔ وہ لوگ نافرمانی کے باعث راہ فرمانبرداری سے پھر گئے۔ فوج جنگی سرکار ان کے سروں پر سر دست آپہونچی۔ نرغے میں گھر گئے۔ کچھ تدبیر بن نہ آئی

سحر سامری کی جو جلد اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، اس کے آخری صفحے کی آخری خبر بھی "بغاوت" ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو قران السعدین سے نقل کی گئی تھی۔ سرخی ہے "خبر بنگالہ"

"اخبار کلکتہ سے روایت ہے۔ دور اندیشی کی حکایت ہے کہ پہلا دنوں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی طرف سے اس مضمون کی سرکلر چٹھیاں زیب قلم ہوئی ہیں۔ بنگالہ کے سب مختیاروں (مجسٹریٹوں؟) کے نام رقم ہوئی ہیں کہ اپنے اپنے علاقوں کی خبرداری و حفاظت کریں، ہوشیاری کا دم بھریں۔ یہ خیال صبح و شام ہے، نہایت اندیشے کا مقام ہو کہ انیسویں (۱۹) رجمنٹ کے سپاہی جو نوکری سے یک قلم موقوف ہوئے ہیں، بغض و عناد میں مصروف ہوئے ہیں . . . ۔ رعیت

مندرجہ بالا خبر سحر سامری کے جس نمبر سے نقل کی گئی ہے، اس پر

بقیہ مضمون صفحہ ۳۵

کجا می روی

جلال ملیح آبادی

یہ افق پر چاند، یہ پچھلا پہر — فرشِ گل پر یہ سہانی چاندنی
کھنکتے آبشاروں کی ترنگ — بوئے گل سے یہ ہوا مہکی ہوئی
جگمگاتی، مسکراتی، کہکشاں — رات کی ہے مانگ، تاروں سو بھری
چاندنی میں جھیل کی شفافیاں — ہے عروسِ شب کی جیسے آرسی
یہ ہواؤں کی سبک رفتاریاں — یہ ستاروں کی خنک تابندگی
پنکھڑی پر ضو فشاں شبنم کی بوند — جیسے ہیرے کی کنی ترشی ہوئی
یہ زمیں پر ارغوانی نور سا — یہ فلک پر چمپئی سی روشنی
گنگناتی، فرش پر تازہ حیات — عرش پر انگڑائی لیتی زندگی
از زمیں، تا آسماں رنگینیاں — زندگی، تابندگی، رخشندگی
نور و ظلمت کی حسیں آویزشیں — چاند میں اک لف سی بکھری ہوئی
ان ستاروں کی ملائم چھاؤں میں — کس نے چھیڑی ہے چمن میں بانسری
درد سا، دل میں بدلتا کروٹیں — شمع سی دل میں جلاتی نغمگی
آج وہ جانِ چمن وقتِ سحر — گلستاں میں اتفاقاً مل گئی
عارضِ گلنار پر گلکاریاں — تا کمر زلفِ رسا جھومی ہوئی
پیکرِ رنگیں، سراپا نور سا — رس میں ڈوبی سی شگفتہ چاندنی

میں نے از راہِ تمنا یہ کہا
اے سراپا حسن و جانِ دلبری
اے زیارت گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی"

افسانہ

سچّی محبّت

وحاہب علی سندیلوی

کندی لال شرما نے اپنی ساری زندگی تحصیل علم بلکہ تحصیل علم کے متعلق نئے نئے تجربات کرنے کے لیے وقف کردی تھی۔ جس ڈگری کالج میں وہ زیر تعلیم تھے وہاں انھیں اتنا زمانہ گزر چکا تھا کہ اب بہت سے لوگوں کو یہ بھی نہیں یاد رہا تھا کہ کالج کا سنگِ بنیاد پہلے رکھا گیا تھا یا شرما جی نے کالج میں داخلہ پہلے لیا تھا بلکہ کچھ لوگ جو خلط مبحث کے عادی تھے یہ بھی سمجھتے کہ کالج کا سنگ بنیاد شرما جی ہی نے رکھا تھا۔ پرنسپل یا کسی پروفیسر کو کالج کے متعلق کوئی بہت پرانی بات دریافت کرنا ہوتی تو وہ شرما جی ہی سے رجوع کرتا۔ مثلاً اگر کسی کو معلوم کرنا ہوتا کہ کالج کا گھنٹہ گھر کب بنا تو وہ کالج کے بہت پرانے دیمک زدہ کاغذات سے سرمغزنی کرنے کے بجاے شرما جی سے پوچھ لیتا اور وہ بلا تکلف بتا دیتے کہ فلاں سن میں جب مسٹر چیٹرجی پرنسپل تھے تب گھنٹہ گھر کی عمارت بنا شروع ہوئی تھی اور اس کے دو سال بعد جب مسٹر لیکر پرنسپل ہوئے تھے تب اس میں گھڑی لگی تھی۔ لائبریری کی عمارت اس سے ایک سال پہلے تعمیر ہو چکی تھی اور سائنس ڈیپارٹمنٹ کا بایاں بازو اس کے دو سال بعد بنا تھا جس کا سنگ بنیاد مسٹر تھامس نے رکھا تھا۔ اور گھنٹہ گھر کی گھڑی جب پہلے پہل غلط وقت دیتی تھی تو اس کے خلاف شرما جی نے کالج کی تاریخ میں جو سب سے پہلی ہڑتال کرائی تھی وہ ضرورت سے زیادہ کامیاب رہی تھی وغیرہ وغیرہ۔

ماہرین تعلیم تو اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارا نصاب تعلیم بہت ناقص اور ناکارہ ہے لیکن ہمارے شرما جی اس نتیجے پر اب سے ایک چوتھائی صدی قبل پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جولانیِ طبع کے لیے نصاب تعلیم کے تنگ و تاریک میدان کے بجاے دوسرے روشن اور پُر فضا میدان منتخب کیے تھے مثلاً الکشن، ہڑتال، مرن برت، جلوس، جلسہ، ڈراما، مشاعرہ، فینسی ڈریس، سنیما، غل غپ، گپ شپ وغیرہ وغیرہ اور ان میدانوں سے انھوں نے جو تجربات اور پختہ کاری حاصل کی تھی وہ محدود نصاب تعلیم سے سات جنم میں بھی نہیں سیکھ سکتے تھے۔ میدان کا کوئی کھیل شرما جی نے کبھی نہیں کھیلا تھا لیکن کالج کی ہر ٹیم میں بارھواں نام شرما جی کا ضرور رکھا جاتا۔ شرما جی کے ساتھ کالج کی ٹیم جہاں بھی جاتی وہاں ٹورنامنٹ کے منتظمین سے یا ریفری اور ایمپائر سے یا مخالف ٹیم سے کوئی جھگڑا اور فساد ضرور ہو جاتا اور ایسی صورت میں موقع واردات پر شرما جی کی موجودگی اور ریشہ دوانی ٹیم کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوتی۔ یہ جھگڑے اور فساد زیادہ بڑھے تو ذمہ داران کالج نے ٹیم کا باہر بھیجنا موقوف کر دیا لیکن پھر جب یہ جھگڑے اور فساد زیادہ مہلک صورت میں خود کالج میں ہونا شروع ہو گئے تو ذمہ داران کالج کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑی اور وہ شرما جی کی سرکردگی میں کالج ٹیم کو زیادہ سے زیادہ تر کالج سے باہر ہی رکھنے کی کوششیں کرنے لگے۔ کالج کے ہر اس عہدے پر جس پر کہ کوئی طالب علم منتخب ہو سکتا تھا شرما جی دو دو تین تین مرتبہ فائز ہو چکنے کے بعد اب خود الکشن لڑنے

سے تائب ہو چکے تھے۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ وہ کسی سنگین انتخابی بدعنوانی کی پاداش میں کسی بھی انتخاب میں امیدوار ہونے سے دائمی طور پر محروم کیے جا چکے ہیں لیکن بہرحال الکشن لڑوانا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا اور جس امیدوار کی امداد پر وہ کربستہ ہو جاتے وہ نوّے فی صدی ضرور جیت جاتا ورنہ الکشن میں لپاڈگی اور بلوہ ہو جاتا اور پھر ہڑتالیں شروع ہو جاتیں اور بالآخر پچھلا الکشن رد کر دیا جاتا اور نیا الکشن شروع ہو جاتا۔ فنِ الکشن بازی میں انھیں وہ مہارت تامہ حاصل تھی کہ اکثر دوسرے کالجوں کے الکشن کے موقعوں پر ان کی خدمات معقول معاوضوں پر بھی حاصل کی جاتیں۔ ایک دفعہ کسی کالج کے طلبا نے ایک مرن برت کے لیے شرما جی کی خدمات یومیہ کرائے پر بھی حاصل کی تھیں! خود اپنے کالج میں بات بات پر اسٹرائک کرا دینا یا مرن برت رکھا دینا یا رکھ ڈالنا شرما جی کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کالج کے اساتذہ ان کی صورت دیکھ کر کانپتے تھے۔ چنانچہ بظاہر وہ ان سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کرتے لیکن دل ہی دل میں فریاد کرتے کہ خداوندا وہ مبارک اور مسعود دن کب آئے گا جب اس بلائے بے درماں یعنی اس شرما کے پنجے سے کالج پاک ہو جائے گا۔ شرما جی ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ سات آٹھ مرتبہ کالج سے نکالے جا چکے تھے لیکن اس سے کالج میں اسٹرائک، ہڑتال، مرن برت، ہائے ہائے اور انقلاب زندہ باد کی وہ آندھیاں اور طوفان اٹھتے کہ کالج کی بنیادیں متزلزل ہو جاتیں اور آدم کے جنت سے نکالے جانے کا ہنگامہ ایک داستانِ پارینہ معلوم ہونے لگتا۔ بہت جلد نکالنے والوں کو خود اپنے نکالے جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا اور وہ شرما جی کو واپس بلا کر ان کی خوشامد کرنا شروع کر دیتے۔ شرما جی طریقۂ تعلیم کے بنیادی مسائل میں کچھ اس طرح الجھے رہتے کہ انھیں کورس کی کتابوں پر توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا بلکہ اکثر چونکہ کورس کی نئی کتابیں شرما جی کے مشورے کے بغیر تبدیل کر دی جاتیں لہٰذا وہ ان کے ناموں سے غیر مانوس رہتے۔ لیکن اس کے باوجود اگر دنیا میں واقعی صحیح قدرشناسی ہوتی تو وہ بی، اے فائنل میں سات سال فیل کیے جانے کے بجائے خود اپنے کالج کے پرنسپل ضرور بنا دیے گئے ہوتے۔

قدرت کو بھی شاید یہی منظور تھا کہ شرما جی ایک سدا بہار طالب علم بنے رہیں۔ اپنے ہلکے پھلکے چھوٹے ڈیل ڈول، بڑی بڑی معصوم آنکھوں اور داڑھی مونچھوں سے مستغنی چہرے کی بنا پر انھوں نے کچھ ایسا حلیہ پایا تھا کہ ان کی عمر پچیس سال سے پینتالیس سال کے اندر کچھ بھی بتائی جا سکتی اور خواہ وہ اپنے سابق ہم جماعت استادوں کے ساتھ ہوں اور خواہ وہ اپنے ان نوخیز ہم جماعت بچوں کے ساتھ ہوں کہ جن کے والد بھی ان کے ہم جماعت رہ چکے تھے وہ کہیں بے جوڑ یا بے تکے نہیں معلوم ہوتے۔

یوں تو شرما جی بڑے پرجوش ہنگامہ خیز ادبلاغ و بہار طبیعت کے انسان تھے لیکن ان کی وضع قطع انتہائی سادہ اور بے تکلف تھی۔ ہمیشہ کھدّر کا کرتا پائجامہ اور چپل پہنتے۔ سردیاں ہوتیں تو اس لباس میں ایک بنڈی کا اضافہ کر لیتے۔ نہ انھوں نے کبھی ٹوپی پہنی اور نہ کبھی اپنے بڑے بڑے پریشان بالوں کو تیل یا کنگھے کا شرمندۂ احسان کیا البتہ جب وہ کوئی فلسفیانہ گفتگو کرتے تو اپنی پتلی نازک انگلیوں سے اپنے بال اوپر کھینچ کر ان میں کچھ ضبط و نظم پیدا کر لیتے۔ کھانے کے معاملے میں شرما جی انتہائی آزاد خیال بد پرہیز اور گڑبڑ جھالا واقع ہوئے تھے۔ البتہ تمباکو سے خواہ وہ کسی صورت میں بھی ہو انھیں سخت نفرت تھی۔ سگرٹ کو وہ ہاتھ نہ لگاتے، البتہ کبھی کبھی دوستوں کے اصرار پر سادہ پان کھا لیتے اور ناتجربہ کاری کے باعث اس کی پیک اپنے دامن پر ضرور گرا لیتے۔ شراب کے نام ہی سے وہ برافروختہ ہو جاتے، اور اگر کسی لڑکے کے متعلق اس لغزش کا علم ہو جاتا تو اس کا فوراً بائیکاٹ کر دیتے۔ شرما جی نے آزاد خیالی، زندہ دلی اور بے راہ روی کی بڑی بڑی منزلیں طے کی تھیں لیکن انھوں نے کبھی کوچۂ عشق میں اپنے نام کا پتھر لگوانے کی کوشش نہیں کی تھی مطلب یہ کہ اس سلسلے میں مصری کی مکھی بنے ہوں تو بنے ہوں کبھی شہد کی مکھی نہیں بنے تھے۔ وہ ہر عورت کا بڑا احترام کرتے اور کالج میں پڑھنے والی لڑکیوں کو تو وہ اپنی سگی بہنوں سے کم نہ سمجھتے اور ان سب کے بلا شرکت غیرے خود ساختہ سرپرست بنے رہتے۔ ہر لڑکی کو ان کی نیک نیتی پر پورا اعتماد تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ان کی ہر چلائی ہوئی تحریک میں یہ لڑکیاں نمایاں حصہ لیتیں اور ان کو پیار سے شرما جی کے بجائے شرما بھائی کہا کرتیں۔ دراصل نہ تو شرما جی ضرورت سے زیادہ شریف النفس تھے اور نہ ان کے فطری تقاضے ہی کند تھے بلکہ وہ عورتوں کے معاملے میں کچھ پیدائشی حجیبو واقع ہوئے تھے اور مردوں کے مقابلے کا یہ شیر کسی عورت کو دیکھتے ہی بھیگی بلی بن جایا کرتا۔

شرما جی مجھ پر خاص طور سے مہربان تھے اور مجھ سے ہمیشہ انتہائی محبت خلوص اور بے تکلفی سے ملتے۔ سچ پوچھیے تو ان کی یہ دوستی مجھے ورثے میں ملی تھی۔ شرما جی کسی پرائمری اسکول میں نہ صرف والد صاحب کے ہم جماعت بلکہ خاص دوستوں میں سے تھے اور اگرچہ مدت ہوئی ان دونوں کا اسکول کا ساتھ چھوٹ گیا تھا

(والد صاحب بیس سال سے وکالت کر رہے تھے) لیکن دوستی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ شرما جی یوں تو مجھ سے بحیثیت ایک دوست کے ملتے لیکن جب انھیں مجھ پر کوئی حکم چلانا مقصود ہوتا تو فوراً چچا بن جاتے اور ڈپٹ کر فرماتے :-

"کیوں بے بھتیجے ! اپنے حقیقی چچا سے یہ نافرمانی ؟ ؎
کبھی ہم چچا تھے جو اپنے چچا کے بھتیجے ہمارے چچا ہو رہے ہیں"

اور میں اپنے "حقیقی چچا" کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جاتا ! مجھے بھی جب ان سے کوئی خاص کام لینا مقصود ہوا تو میں ان کو اپنا چچا ہونا یاد دلا دیتا اور وہ رام ہو جاتے۔

ایک مرتبہ میں دسمبر کی بڑی چھٹیوں کے بعد شام کو گھر سے ہاسٹل واپس آیا اور اپنے کمرے میں اسباب رکھنے کے بعد فوراً شرما جی کے کمرے پر پہنچا تو دیکھا کہ دروازے میں قفل پڑا ہوا ہے لیکن اندر بجلی جل رہی ہے۔ ایک دروازے سے جھانکا تو دیکھا کہ فرش پر بہت سی کتابوں کے درمیان شرما جی اکڑوں بیٹھے ہوئے کچھ بڑبڑا رہے ہیں۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو زور سے گرجے " پڑھ رہا ہوں، مخل مت ہو" میں نے کہا "میں ہوں آپ کا بھتیجا !" شرما جی کا دل فوراً پسیج گیا اور اُنھوں نے دوسرا دروازہ جو اندر سے بند تھا کھول دیا۔ میں نے کہا "چچا یہ کیا ؟" کہنے لگے "ایک دروازہ باہر سے مقفل کر دیتا ہوں اور دوسرا اندر بند کر لیتا ہوں تاکہ پڑھائی میں کوئی مخل نہ ہو سکے !"

میں نے کہا " پڑھائی ؟ یہ پڑھائی کی بد پرہیزی آپ نے کب سے شروع کر دی ؟ نصیب دشمناں یہ مرض اس سے پہلے تو آپ کو کبھی لاحق نہیں ہوا تھا ؟ آپ تو چھپے رستم نکلے ! "

ہنسنے لگے : " کچھ نہیں یوں ہی ! سوچا اس سال کچھ پڑھ ہی ڈالوں۔ امتحان تو بہرحال کبھی نہ کبھی پاس ہی کرنا ہے نا ! "

شرما جی کے کمرے کا جغرافیہ بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ کرسی، میز اور پلنگ کمرے میں ایک طرف کنارے دیوار سے کچھ اس طرح لگا دیے گئے تھے جیسے وہ ناقابل استعمال ہو چکے ہوں۔ بیچ کمرے میں چٹائی پر دری کا فرش تھا اور اس پر ہر طرف کتابوں اور کاپیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جاسوسی ناولیں اور فلمی رسالے جو عام طور سے شرما جی کے زیر مطالعہ رہتے اور جن کا ہاسٹل بھر کا ذخیرہ ان کے پاس جمع رہتا، ستلی سے بندھے ہوئے دو بڑے بڑے بنڈلوں میں منتقل ہو کر میز کے نیچے کچھ اس انداز سے رکھے ہوئے تھے جیسے کباڑی کی دوکان پر جانے کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں۔ کمرے کے شوخ اور طرح دار کلنڈر بھی غالباً انھیں بنڈلوں میں باندھے جا چکے تھے اور دیوار پر صرف ایک کرشن جی کی تصویر باقی رہ گئی تھی جس میں وہ ایک ایسے والہانہ انداز سے بانسری بجا رہے تھے کہ اس کی آواز کانوں کو نہیں بلکہ دل کو محسوس ہوتی۔ دیوار میں بنی ہوئی الماری پر خلاف توقع ایک تیل کی شیشی ایک آئینہ اور کنگھا بھی نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں سابقہ بدنظمیوں اور افراتفری کا کوئی نشان نہیں تھا۔ کپڑے، چپل، لوٹا، مسواک اور دوسری چیزیں اپنی مناسب جگہوں پر رکھی ہوئی تھیں البتہ کتابوں اور کاپیوں کے طومار سے کمرے کا فرش ایک میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ میں نے اس سارے منظر کو دیکھا اور اس کے امکانات ذہن نشین کرنے کی کوشش کی تو مبہوت رہ گیا۔

" شرما جی یہ انقلاب عظیم کیسے اور کیوں ؟ کیا اس مرتبہ کالج کے زنخیز بچوں کو تیمم کر جانے کا ارادہ ہے ؟" ہم دونوں فرش پر کتابوں کے اوپر بیٹھ گئے۔

" بھائی تم سے کیا چوری " شرما جی نے بڑی محجوبیت سے کچھ ایسے انداز میں کہا جیسے کوئی اقبال جرم کر رہے ہوں۔ " میرا ارادہ ہے کہ اس سال پاس ہی کر ڈالوں بی، اے۔"

" لیکن یہ کیوں ؟ امتحان پاس کرنے کے آپ کیسے قائل ہو گئے ؟ آپ ان تکلفات میں پڑتے تو آج سے پچیس برس قبل ہی گریجویٹ ہو چکے تھے ! اور بی، اے فائنل میں تو ابھی آپ کو کچھ ایسا زمانہ بھی نہیں گزرا ہے ! "

" آج سویرے ہی حساب لگایا تھا یہ آٹھواں سال ہے " اور یہ کہتے ہوئے شرما جی نے کتابوں کے نیچے سے نکال کر مجھے ایک چارٹ دکھایا جو حسب ذیل تھا :-

پہلا سال	انگریزی میں فیل
دوسرا سال	حاضری پوری نہ تھی
تیسرا سال	انگریزی اور تاریخ میں فیل
چوتھا سال	کالج سے نکال دیا گیا
پانچواں سال	انگریزی، تاریخ اور فلسفے میں فیل
چھٹا سال	مرن برت رکھا تھا

ساتواں سال تاریخ اور فلسفے میں فیل

میں نے کہا "ابھی تو اس چارٹ میں بڑی گنجائشیں باقی ہیں۔ آپ تین مرتبہ باضابطہ اور صرف چار مرتبہ بے ساختہ فیل ہوئے ہیں۔ ابھی آپ تاریخ اور فلسفے میں علٰحدہ علٰحدہ اور انگریزی اور فلسفے میں ایک ساتھ فیل نہیں ہوئے ہیں۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ "

شرما جی نے میری بات کاٹ کر کہا "چلتے ہی چلے جاؤگے بھتیجے یا اپنے چچا کی بھی سنوگے! بات اصل یہ ہے کہ اب کی میرا پاس ہونا حد سے زیادہ ضروری ہے جو اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے! یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے! اور ہاں مجھے اپنے ایک انتہائی ذاتی اور اہم معاملے میں تم سے مشورہ بھی کرنا ہے لیکن خبردار اس کا ذکر کسی دوسرے سے نہ کرنا۔"

شرما جی کا رازدارانہ لہجہ دیکھ کر مجھے بھی سنجیدہ بننا پڑا: "چچا آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ آپ کی بات اور نکل جائے اور میرے منھ سے؟ آپ کے بہت پرانے اور مخلص دوست کا بیٹا ہوں یا کوئی اور؟"

"خیر، تمہارے باپ تو پیٹ کے بہت ہلکے تھے اور ایک دفعہ اپنی چغل خوری سے مجھے ایک مولوی صاحب سے پٹوایا بھی تھا۔ لیکن مجھے تمہارے کردار پر اعتماد ہے۔ تم مس اوشا بخشی کو جانتے ہو؟"

"ارے وہی بڑدنی جس کے چہرے پر دو چار چیچک کے داغ بھی ہیں۔ سوکھی۔ چرخ!"

شرما جی بڑے غضبناک لہجے میں بولے "بس! بس! آج کل کے لونڈے صرف لپے پُتے چہروں کو حسین سمجھتے ہیں! ظاہر داری پر مری جا رہی ہے دُنیا! چشم بصیرت، حسُن صورت نہیں، حسُن سیرت دیکھتی ہے۔"

"واقعی حسن سیرت میں تو اوشا بخشی آپ اپنا جواب ہے! میں نے ایسی پاکیزہ، سنجیدہ اور سلیم الطبع لڑکی تو اپنی زندگی میں دیکھی ہی نہیں۔" مجھے بہر حال شرما جی کو ٹھنڈا ہی کرنا تھا۔

"بالکل ٹھیک! ہاں تو جب میں پچھلی مرتبہ مرن برت رکھ رہا تھا تو اس نے بڑی ہمدردی کی تھی میرے ساتھ۔"

"یعنی؟" میں نے پوچھا۔

"یعنی روز شام کو وہ کھانا لے آتی تھی میرے لیے! وہ شام کو جب مجھے دیکھنے آتی تو کھانے کی ایک پوٹلی میرے سرہانے رکھ جایا کرتی!"

"اچھا تو تبھی مرن برت کے دوران آپ کا وزن گھٹنے کے بجائے کچھ بڑھ گیا تھا!"

"فضول بکواس نہ کرو! ہاں تو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوگئی اور ہم لوگوں نے قسم کھائی کہ اگر پنڈت نرددش نرائن بخشی یعنی اوشا کے والد راضی ہو جائیں گے تو ہم ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن جائیں گے۔ چنانچہ میں پنڈت نرددش نرائن بخشی کے پاس پہنچا بلکہ ہر دوسرے روز پہنچنے لگا لیکن اپنی درخواست پیش کرنے کا مجھے کوئی موقع ہی نہ ملتا۔ اور ادھر اوشا جلدی کر رہی تھی۔ خیر، ایک روز جب میں بخشی جی کے یہاں پہنچا تو وہ بڑے غصّے میں بید لیے اپنے کتّے کو مار رہے تھے اور تم جانتے ہو کہ میں کوئی ظلم اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں نے جاتے ہی اُن کا بید پکڑ لیا۔ انھوں نے گرج کر کہا "ابے تو کون ہے جو آئے دن میرے یہاں اپنی منحوس صورت لے کر آیا کرتا ہے۔ چھوڑ میرا بید!" میں نے یہی موقع غنیمت سمجھا اور فوراً کہہ دیا کہ میں آپ کی لخت جگر اوشا سے شادی کرنا چاہتا ہوں! پھر کیا ہوا؟ خیر تفصیلات تو بہت ہیں انھیں جانے دو۔ بخشی جی بلکہ اُن کے ملازمین مجھے اُن کے ڈرائنگ روم میں لے گئے اور شام سے رات کے ڈھائی بجے تک مجھے اور بخشی جی سے مختلف موضوعات مثلاً شادی، طلاق، ضبط تولید، استری دان، جنسی مساوات اور عورت کی اقتصادی آزادی وغیرہ وغیرہ پر بحث ہوتی رہی۔ تم جانتے ہو کہ میری زبان جب ایک دفعہ کھل جاتی ہے تو پھر بند ہونے کا نام نہیں لیتی۔ قصہ مختصر میری درخواست پر بخشی جی نے اپنا آخری اور محتم فیصلہ یہ سُنایا کہ اگر اس سال میں بی، اے پاس کر لوں تو وہ نتیجہ نکلنے کے پندرھویں دن اوشا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر مجھے دُنیا کا سب سے خوش انسان بنا دیں گے ورنہ اگر اس کے بعد پھر کبھی میں نے ان کی کوٹھی کے احاطے میں قدم رکھا ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ خیر تفصیلات غیر ضروری ہیں۔ میں نے مودبانہ احتجاج کیا کہ جب میں اور اوشا دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو یہ "جوئے شیر" والی شرط لگانے سے کیا حاصل؟ بخشی جی نے بڑے جوش میں جواب دیا "میری لڑکی اس سال قطعاً بی، اے پاس ہو جائے گی اور میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ میرا داماد میری لڑکی سے کم تعلیم یافتہ ہو۔ اور ہاں چونکہ میں ریٹائرڈ جج ہوں لہٰذا اگرچہ ایسا ہونے کا امکان نہیں لیکن انصاف کی خاطر یہ بھی

کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میرے داماد کی بیوی اس سے کم تعلیم یافتہ ہو اس لیے اگر اوشا فیل ہو گئی اور تم پاس ہو گئے تو بھی میں یہ رشتہ رد کر دوں گا۔ البتہ اگر تم دونوں ہی فیل ہو گئے تو بات دوسری ہے۔ لیکن میری اوشا تو ہمیشہ فرسٹ ڈویژن پاس ہوتی رہی ہے تم اپنی خیر مناؤ۔"

اس کے بعد میں نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن بخشی جی نے یہ کہہ کر مجھے اپنے کمرے سے نکال دیا کہ "نہ آج سے تم اوشا سے ملنا اور نہ امتحان کے نتیجے سے قبل میرے پاس آنا ورنہ نہ صرف اس رشتے کو ختم سمجھنا بلکہ اسپتال میں اپنے لیے جگہ مخصوص کرا لینا۔" اب بتاؤ اس نیم پاگل انسان سے میں اور کیا کہتا! چپ چاپ کمرے سے باہر نکل آیا جہاں اوشا نہ صرف میرا انتظار کر رہی تھی بلکہ ہماری گفتگو انتہائی کرب اور بے چینی سے سن رہی تھی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے آنکھوں میں آنسو اور دلوں میں تمناؤں کی ایک دنیا لیے لیکن زبان سے ایک لفظ کہے بغیر جدا ہو گئے! اور غالباً ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے! اب بتاؤ میں کیا کروں؟ کورس کی ان نامعقول اور ناہنجار کتابوں سے مغز پچی نہ کروں تو کیا دریا میں پھاند کر اپنی جان دے دوں؟"

میں شرما جی کی یہ داستانِ محبت سن کر دنگ رہ گیا اور ان کو لاکھ سمجھایا کہ چھوڑیے اس اوشا کی بچی کو۔ اس سال فیل ہو گئے تو کیا ہوا؟ پار سال دوسری لڑکیاں ہم جماعت ہو جائیں گی ان میں سے کوئی اوشا سے بھی اچھی ڈھونڈھ لیجیے گا! اور پھر محض ایک لڑکی کی خاطر کورس کی کڑوی اور کسیلی کتابیں چاٹ کر زندگی بدمزہ کرنے سے فائدہ! اتنے دنوں جیسے زندگی کو جاودانی بہیم دوانی ہر دم جواں رکھا ہے ویسے ہی اب بھی رکھیے۔ ع آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شرما جی پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ "ہائے اوشا" اور "وائے اوشا" ہی کرتے رہے۔

اس کے بعد ان کو دائرۂ انسانیت میں لانے کے لیے میں نے اغوا، فرار، افلاطونی محبت اور خفیہ شادی وغیرہ کے امکانات ذہن نشین کرانا چاہے۔ لیکن شرما جی نے مجھے بری طرح جھڑک دیا: "میں کسی عورت کو حاصل کرنے کے لیے شرافت سے گرا ہوا کوئی طریقۂ کار اختیار کرنا بلکہ سوچنا ہی ننگِ انسانیت سمجھتا ہوں! اور ہاں میں تمھیں بھی بتلائے دیتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے کسی ایسے طریقۂ کار کی ترغیب دی تو میں یہ نظر انداز کرتے ہوئے کہ تم میرے حقیقی بھتیجے ہو تم سے مکمل قطع تعلق کر لوں گا۔"

ا

وشاکھا ۱۰۰۲

مجبوراً میں نے شرما جی کو ان کی کتابوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ دو چار روز میں ان کا یہ بخار اتر جائے گا۔ لیکن وہ پڑھنے میں ڈوبے تو ایسا ڈوبے کہ پھر ابھرنے کا نام ہی نہ لیا۔ پڑھائی کی خاطر انھوں نے ہوسٹل چھوڑ کر ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا جو ہر وقت اندر سے مقفل رہتا تاکہ ان کے یار دوست آ کر مخل نہ ہو سکیں۔ انھوں نے اپنے بڑے بڑے بالوں کے بجائے سر گھٹا ڈالا اور اپنی خوبصورت کھوپڑی چھپانے کے لیے کالج آتے وقت وہ ایک چھوٹی سی گاندھی کیپ بھی لگانے لگے۔ کالج کے پروفیسروں اور طالب علموں میں شرما جی کی اس نئی اور انتہائی غیر متوقع کروٹ سے حیرت و استعجاب کا ایک تہلکہ مچ گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ آخر شرما جی بیچارے پڑھائی کے اس مہلک میعادی بخار میں کیسے مبتلا ہو گئے۔ کوئی کہتا کہ پڑھ نہیں رہے ہیں بلکہ اپنی سوانح عمری قلمبند کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا کہ دروازے بند کر کے جعلی نوٹ چھاپنے کی مشق کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا کوئی عورت بھگا لائے ہیں اسی لیے یہ پردہ داری ہے البتہ جب اوشا بخشی کے سامنے شرما جی کی پڑھائی کا چرچا ہوتا یا کالج میں وہ خود شرما جی کو دیکھ پاتی تو اس کے چہرے پر سرخیاں پھیلنے لگتیں۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی گہرائیاں اور بھی گہری ہو جاتیں۔ اس کے منھ سے باہر نکلے ہوئے دونوں دانت بڑی دل آویزی سے چمک اٹھتے اور فرطِ محبت سے اس کا انگ انگ ایک پرکیف انگڑائی لیتا ہوا دکھائی دینے لگتا۔

بالآخر وہ تاریخی رات بھی آ گئی جس کی صبح کو امتحان شروع ہونے والا تھا۔ میں شرما جی کا حال چال دیکھنے ان کے گھر پر پہنچا تو خلافِ معمول دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں اندر پہنچا تو دیکھا کہ شرما جی اپنا اسباب باندھے بڑی بے چینی سے ٹہل رہے ہیں۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ خداوندا یہ کیا نیا شگوفہ کھلا؟

"کیا ارادے ہیں چچا؟"

"میں گھر واپس جا رہا ہوں ابھی نو بجے کی گاڑی سے۔ نوکر تانگہ لینے گیا ہے۔"

"اور امتحان؟"

"میرے لیے امتحان ختم ہو چکا۔"

"کیا مطلب؟"

"چار مہینے پڑھتے پڑھتے دن رات ایک کر دیے لیکن ہنوز روزِ اوّل ہے! جو کتاب پڑھتا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی نئی دریافت کی ہوئی دنیا

کا جغرافیہ پڑھ رہا ہوں! جانتا ہوں کہ میرا ذہن گول ہے لہذا امتحان میں بیٹھنے سے فائدہ؟ ع میں ہوں اپنی شکست کی آواز " شرما جی نے بڑی مایوسی سے کہا

" میں بھی امتحان میں نہیں بیٹھ رہا ہوں " میں نے مُنھ بسور کر کہا۔

مجھے دفعتاً ایک لاجواب ترکیب سُوجھ گئی تھی۔

" تم کیوں نہیں بیٹھ رہے ہو؟ " شرما جی نے چچا بن کر تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

" والد صاحب نے فرمایا تھا کہ مجھے اس سال فرسٹ ڈویژن لانا چاہیے ورنہ امتحان میں شریک نہ ہونا چاہیے۔ اس سال میری تیاری فرسٹ ڈویژن والی نہیں ہے لہذا میں امتحان میں نہیں بیٹھ رہا ہوں "

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

شرما جی نے اپنے بستربند کے کسے ہوئے تسموں کو اور زیادہ کستے ہوئے کہا۔

اتنے میں ملازم تانگہ لے کر آ گیا اور اس کے اور تانگے والے کے ہاتھوں شرما جی کا اسباب اُٹھ اُٹھ کر تانگے پر جانے لگا۔ شرما جی میری جانب الوداعی بغل گیری کے لیے بڑھے تو میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا " چچا میں نے زندگی بھر تمھاری نصیحتیں اور ہدایتیں مانی ہیں حتیٰ کہ دو دفعہ کالج سے نکالے جانے کی نوبت آ گئی تھی لیکن میں نے تمھارے احکام سے منھ نہیں موڑا۔ اب ایک میری درخواست ہے یعنی آپ کے اکلوتے حقیقی بھتیجے کی ضد بلکہ بالکل ہٹ ہے اسے منظور کر لیجیے "

" کہو! کہو! میں نے نوکر سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ کورس کی ساری نئی کتابیں جو میں نے خریدی ہیں وہ کل تمھارے کمرے میں ڈال آئے۔ "

" چچا کورس کی کتابیں گئیں چولھے بھاڑ میں! میں دوسری بات کہہ رہا ہوں! میں امتحان یقیناً پاس کر سکتا ہوں لیکن فرسٹ ڈویژن میں نہیں۔ میرا سال تو بے کار جا ہی رہا ہے۔ میرے اور آپ کے مضامین ایک ہی ہیں۔ ایسا کیوں نہ کیجیے کہ میں آپ کے نام سے کاپیاں لکھوں اور آپ میرے نام سے۔ آپ پاس ہو جائیے گا اور مجھے فیل ہو جانے کا کوئی غم نہ ہوگا "

شرما جی کے چہرے پر تفکر کی گہری لکیریں نمودار ہوئیں پھر ایک دم سے بشاشت چھا گئی لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ مایوسی میں تبدیل ہونے لگی۔ " تم میرے لیے یہ قربانی کر رہے ہو! میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

میں نے بات کاٹ کر کہا " میں کوئی قربانی نہیں کر رہا ہوں۔ آپ بے جا تکلف کر کے نہ صرف اپنی زندگی بلکہ اوشا کی زندگی خطرے میں ڈال رہے ہیں "

اوشا کا نام سنتے ہی شرما جی پگھل گئے اور مجھ سے بے اختیار لپٹ کر انھوں نے میری تجویز منظور کر لی۔ تانگے پر سے اسباب واپس منگا لیا گیا۔ میری تجویز کے سارے نشیب و فراز پر اچھی طرح سے غور کر لیا گیا اور " اوشا زندہ باد " کے نعروں کے ساتھ شرما جی اپنا بستر کھول کر سونے کے لیٹ گئے اور میں ہاسٹل واپس چلا گیا۔

امتحان آیا اور چلا گیا اور ہم لوگوں کی سازش کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگی

نتیجہ نکلنے کے دن قریب آئے تو مجھے تار دے کر شرما جی نے اپنے گھر بلا لیا۔ نتیجہ نکلا تو اخبار دیکھتے ہی مجھے چکر آ گیا اور اخبار میرے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر گر پڑا۔ میں سکنڈ ڈویژن میں پاس تھا اور شرما جی فیل تھے! شرما جی نے اخبار اُٹھا کر دیکھا تو خوشی کی بے اختیارانہ چیخ کے ساتھ بیٹھے ہوا میں اُچھلے اور رقص کرتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے " بھتیجے تو نے میری عزّت رکھ لی! تو نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے کہ تا زندگی نہیں بھول سکتا! " میں حیرت سے اُن کا منھ دیکھنے لگا۔ وفورِ مسرت سے اُن کے آنسو نکل رہے تھے۔ بڑی دقت سے گلوگیر آواز میں بولے " دیکھو اوشا بھی فیل ہے! اگر میں پاس ہو جاتا تو میری اوشا ہمیشہ کے لیے میرے ہاتھوں سے نکل جاتی! "

بعد میں شرما جی کی بہت سی غیر مربوط گفتگو سے پتہ چلا کہ پنڈت نرد شرن (؟) کے حکم کے بموجب شرما جی اوشا سے مے تو نہیں لیکن بخشی جی کے کتے کے توسل سے وہ آپس میں خط و کتابت کرتے رہے تھے۔ شرما جی ہاسٹل چھوڑ کر بخشی جی کے گھر کے قریب اسی مصلحت سے مکان لیا تھا کہ وہاں وہ کتے کو کھانے کی چیزوں کی رشوت دے کر لے آیا کرتے (اور بالآخر وہ خود آنے لگا تھا)۔ اوشا نے اس کی گردن میں ایک ایسا پٹہ سی کر باندھ دیا تھا کہ اس کے اندر ایک جیب بھی تھی جس میں کوئی خط بآسانی رکھا جا سکتا تھا۔ امتحان کے قریب شرما جی جب اپنی کامیابی سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے اوشا کو مطلع کر دیا تھا کہ اُن کا جہاز ڈوب رہا ہے۔ اوشا کو میری اور شرما جی کی سازش کا علم نہ ہونے پایا تھا لہذا اس غریب نے

بقیہ مضمون صفحہ ۴۴ پر

ستارۂ تخریب

قاضی نذرالاسلام کی ایک شہرۂ آفاق تخلیق "ناش تارا" کا منظوم ترجمہ

نسیم کنجاہی

میں ہراک دور میں آتا ہوں پیغامِ قضا لے کر
میں ہر اک عصر میں تکمیلِ محشر بن کے آتا ہوں
میں انجم پارۂ تخریب ہوں سوزِ قیامت ہوں
مری پیشانی روشن ہے جہنم کے شراروں سے
میں وہ شعلہ ہوں جو پلتا ہے مظلوموں کی آہوں میں
جہنم کے مغنّی کا سرودِ آتشیں ہوں میں
مرے سینے میں سوتی ہے تباہی بد دعاؤں کی
وہ آوازِ فغاں ہوں میں جو گاہے قلبِ یزداں سے
میں بن کر داغ رہتا ہوں غمِ گیتی کے سینے میں
سراپا بد دعا ہوں میں جہاں کو پھونک ڈالوں گا
مری سانسوں میں پھنکاریں بھری ہیں اژدہا[1]ؤں کی

میں ہراک عہد میں آتا ہوں پیغامِ بلا لے کر
میں اپنے ساتھ اک طغیانِ آتش خیز لاتا ہوں
میں قاصد اہرمن کا ہوں پیامِ مرگ و آفت ہوں
خراجِ آتشیں لیتا ہوں بجلی سے ستاروں سے
میں وہ بجلی ہوں جو پوشیدہ رہتی ہے گناہوں میں
قضا کی سیمت ہے مجھ میں سوزِ آخریں ہوں میں
مری آنکھوں میں رقصاں ہے سیاہی بد دعاؤں کی
ابھرتی ہے حکایت ہائے جورِ نوعِ انساں سے
کہ جیسے پھول لالے کا ہو صحرا کے سفینے میں
جو میرے راستے میں پڑ گیا میں اس کو کھا لوں گا
مری آنکھوں میں روحیں مسکراتی ہیں وباؤں کی

---

[1] ہر چند کہ یہ قافیہ اہل زبان کے نزدیک محلِ نظر ہوگا، لیکن میں اپنی دانست میں اسے جائز سمجھتا ہوں۔ نسیم کنجاہی

تڑپ بجلی کی، بادل کی گرج، طوفاں سمندر کا
مری آنکھوں میں ہے لرزاں مرے بالوں سے ہے پیدا!
لیے پھرتا ہوں جھنڈا میں تباہی کا خلاؤں میں
میں بربادی کے ذرّوں کو سموتا ہوں ہواؤں میں
میں اِذن اب دے رہا ہوں اپنے آتش ناک تیروں کو
تباہی کا سبق دیتا ہوں اِن بے باک تیروں کو

اجل کے پھر دمامے کی تو سُنو میری صداؤں میں
وہ دیکھو تیرتی ہیں موت کی چیخیں فضاؤں میں

وہ میں نے دُم کی مشعل سے لگا دی آگ دُنیا میں
وہ شعلے گا رہے ہیں موت کا پھر راگ دُنیا میں
اُفق پر سُرخیاں چھانے لگیں خونِ جہنّم کی
وہ سانسیں رُک چلیں پھر محفلِ خورشید و انجم کی
یہ آگ اور خوں کا کھیل اِس سے بھی پہلے میں نے کھیلا ہے
مری موجِ نفس طوفاں کا محشر خیز ریلا ہے
بھنور کا جوش، غصّہ رعد کا، میرے خیالوں میں
فلک کی بجلیاں گوندھی گئی ہیں میرے بالوں میں
مری ہیبت سے ہے جلوہ قدس کے بالا نشینوں کا
اُلٹ دیتا ہوں تختہ آسمانوں کا زمینوں کا
میں کیا ہوں کچھ نہ پوچھو مجھ بلائے ناگہانی کی
قلم سے موت کے لکھتا ہوں سُرخی زندگانی کی
مری رگ رگ میں وہ سیّال آتش دوڑی پھرتی ہے
جو زہریلے لبوں سے نارِ دوزخ کے ٹپکتی ہے
اِسی مے کے نشے میں لڑکھڑاتا، جھومتا، گاتا
میں اس راہِ فنا کے دامنوں سے ہوں گزر جاتا
سرابِ انگیزی، عصیاں کی ڈرا سکتی نہیں مجھ کو
کوئی شے اپنے مرکز سے ہلا سکتی نہیں مجھ کو
مرے دہشت فزا گیتوں میں شعلوں کی ہے طغیانی
میں ہوں رندِ خراباتی مرے ہیں گیت بھی وحشی
سمندر کا خروشِ تند میرے شور کے آگے
ہوائے تند و پُرہیبت ہیں جیسے گیت بھونروں کے
تباہی کے پریشاں خواب جو قوموں نے دیکھے ہیں
مری آتش فگن زلفوں کے ہیبت ناک سائے ہیں
یتیموں کی قیامت سوز فریادیں بھی بلتی ہیں
ابھی تک میرے بالوں میں تڑپتی ہیں مچلتی ہیں
کسی دن یہ طلسمِ ہستی انسان توڑیں گی
یہ سحرِ سامری کو بھی جگائے بن نہ چھوڑیں گی
تباہی کا ستارہ ہوں میں اِک سوزِ قیامت ہوں
میں قاصد اہرمن کا ہوں پیامِ مرگ و آفت ہوں

مجھے، افلاک پر قدسی نقیبِ حشر کہتے ہیں
میں ہر اک دَور میں آتا ہوں پیغامِ قضا لیکر

بعض اشعار کا غلط انتساب ـ ۵

حنیف نقوی سہسوانی

پروفیسر مسیح الزماں حرفِ غزل صفحہ ۸ پر لکھتے ہیں کہ "غزل وہی اچھی ہوگی جس میں تاثیر موجود ہو۔ جس میں تاثر ہے چاہے جس کی رودادِ محبت بیان کی ہو لیکن پڑھنے والے کو یہی معلوم ہو کہ اس کی داستان ہے جیسا کہ جگر نے کہا ہے ؎

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے"

مسیح الزماں صاحب سے اس شعر کے انتساب میں سہو ہوا ہے۔ یہ مطلع جگر کا نہیں سیماب اکبرآبادی کا ہے۔ سیماب نے اسی غزل میں ایک مطلع اور بھی کہا ہے ؎

چمک جگنو کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

محبوب کے لیے فعل کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے حرفِ غزل صفحہ ۲۹ پر یہ شعر مثلاً غالب کے نام سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ انتسابی غلطی مسیح الزماں صاحب کے اتفاقی سہو خیال یا لغزشِ قلم کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ شعر غالب کا نہیں مومن کا ہے۔

ہم نکالیں گے سن اے موجِ ہوا بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

یہ شعر بھی مومن ہی کا ہے لیکن یوسف حسین نے اردو غزل میں غالب کے حوالے کر دیا ہے۔ اس غزل کا مقطع ضرب المثل کی حیثیت حاصل کر چکا ہے ؎

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو مے کدے سے تو دنیا بدل گئی

اردو غزل میں یہ شعر گستاخ رام پوری سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسی نام سے کسی دوسری کتاب میں بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ لیکن درحقیقت شاعرِ خمریات ریاض خیرآبادی کی تخلیق ہے اور ان کے مجموعۂ کلام ریاض الرضوان میں صفحہ ۴۰۲ پر موجود ہے[ا]

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ثاقب لکھنوی کا یہ شعر رام پور کے ایک ماہنامے میں شائع شدہ ایک مضمون میں عزیز لکھنوی کے نام سے نقل کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے بھی کسی ماہنامے میں یہی شعر کسی دوسرے شاعر کے نام سے پیش کیا جا چکا ہے۔ ثاقب کا یہ بدرجۂ شعر بھی بہت مشہور ہے ؎

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

[ا] "یہ شعر ریاض الرضوان میں درج ہے مگر حسرت موہانی کی رائے یہ ہے کہ گستاخ رام پوری کا ہے۔ بہرحال ریاض کا نہ سہی ان کے ایک ہم مشرب کا ہی سہی" (نقوش مولفہ چراغ حسن حسرت صفحہ ۳۱۶)

عزیز لکھنوی کے مشہور ترین اشعار یہ ہیں ؎

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن   بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

معجزہ شق القمر کا ہے مدینے سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

چمن میں کس مزے سے چھیڑتی ہے غنچہ و گل کو
مگر باد صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

صفی گونڈوی کا یہ شعر بہت پیارا بھی ہے اور مشہور بھی ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے ہفتہ وار ھماری زبان مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۸۵ء میں اسے اپنے پسندیدہ اشعار کے ذیل میں نقل کیا ہے لیکن غلطی سے صفیؔ کے بجائے آتش لکھنوی سے منسوب کر دیا ہے۔

ہے اس آفت کا ٹبک سیر کہ راکب اس کا
حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن میں ٹفن

انشا نے اس زمین میں جارج سوئم کی مدح میں قصیدہ کہا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اس کی تشبیب کے کچھ اشعار نقل کرنے کے بعد "تعریف اسپ" کی مثال میں یہ شعر بھی پیش کیا ہے۔ مگر کلام انشا مرتبہ مرزا محمد عسکری مسترحم تاریخ ادب اردو (از ڈاکٹر رام بابو سکسینہ) میں اس کی عدم موجودگی سے یہ انتساب مشکوک ہو جاتا ہے۔ کلام انشا کی ترتیب میں مختلف نسخوں میں اشعار کی کمی و بیشی اور لفظی اختلافات کی تصریح کا خیال رکھا گیا ہے۔ اردو قواعد کی ایک کتاب اساس اردو میں بھی صفحہ ۱۲۱ پر اغراق کی تعریف میں اس شعر کی مثال دی گئی ہے اور مندرجہ ذیل لفظی تغیرات کے ساتھ اسے انشا ہی سے منسوب کیا گیا ہے ؎

ہے اس آفت کا ٹبک سیر کہ راکب اس کا
حاضری کھائے سپاٹو میں تو لندن میں ٹفن

معلوم نہیں کہ دونوں نقلوں میں کون سی نقل صحیح ہے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اساس اردو میں منقول مصرع ثانی، آزاد کی نقل سے زیادہ صاف اور رواں ہے۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دیں است حسین دیں پناہ است حسین
سر داد و نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

فارسی کی یہ رباعی بہت مشہور ہے اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے منسوب کی جاتی ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے روح انیس کے مقدمے میں اس رباعی کو "امام حسین کے عظیم الشان کارنامے پر مذہبی زبان میں خواجہ معین الدین اجمیری کا مختصر اور جامع تبصرہ" قرار دیا ہے لیکن درحقیقت یہ رباعی خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ہمنام شاعر معین کاشانی کی طبع زاد ہے ؎

آں خواجہ کہ خویش را ہلاکو می گفت
وز کبر سخن بہ چشم و ابرو می گفت
بر کنگرۂ بارگہ اش فاختہ را
دیدم کہ نشستہ بود و کوکو می گفت

تذکرۂ شمع انجمن مولفۂ نواب صدیق حسن خاں میں یہ رباعی فارسی کے مشہور رباعی گو شاعر عمر خیام نیشاپوری کے ذکر میں نقل کی گئی ہے۔ خیام سے منسوب دوسری بہت سی رباعیوں کی طرح یہ رباعی بھی الحاقی ہے۔ اس دعوے کی تائید کے لیے کسی خارجی شہادت کی ضرورت نہیں۔ پہلا مصرع ہی ایک مکمل ثبوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ خیام ہلاکو سے کئی صدی قبل کا شاعر ہے لہذا یہ قول کہ

آں خواجہ کہ خویش را ہلاکو می گفت
در کبر سخن بہ چشم و ابرو می گفت

کسی طرح اس کا کلام نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر پوری رباعی کو اس سے منسوب کرنا تاریخی و ادبی بصیرت کے خلاف ہے۔ عوام اور تذکرہ نگاروں نے اسی طرح دوسری بے شمار رباعیاں بھی عمر خیام سے منسوب کر دی ہیں جس کی وجہ سے رباعیات خیام کے کسی مروجہ مجموعے کے بارے میں مستند و معتبر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

میں نے ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں فارسی کی نصابی کتاب گنجینۂ دانش مرتبۂ جلال الدین احمد جعفری میں مولانا ابو سعید ابوالخیر کی یہ کچھ

رباعیاں پڑھی تھیں جن میں یہ رباعی بھی شامل تھی۔ اس کے بعد جب تذکرہ شمع انجمن کے مطالعے کا اتفاق ہوا تو اس میں یہ رباعی فضل الدین محمد فضل کاشانی سے منسوب پائی۔ لیکن تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ صاحبِ "شمع انجمن" کا بیان صحیح نہیں۔ یہ رباعی دراصل مولانا ابوسعید ابوالخیر ہی کی ہے۔ نکہت سہسوانی نے بھی اپنی تصنیف[1] "سرقہ و توارد" میں شمع انجمن کے حوالے سے اسے فضل کاشانی ہی سے منسوب کیا ہے۔

کشافِ حقائق و نکاتِ توحید
آں راکبِ دوشِ احمدی شاہِ شہید
خود معنیِ آیاتِ کلامِ الٰہی است
تفسیرِ حسینی است بقرآنِ مجید

میر حسن نے اپنے تذکرۂ شعرائے اردو میں اس رباعی کو اپنے والد میر ضاحک کا کلام ظاہر کیا ہے۔ لیکن تذکرۂ مذکور کے مدون صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مقدمے میں لکھتے ہیں کہ یہ رباعی ضاحک کی نہیں لطف اللہ شیرازی کی ہے اور فارسی کے تذکروں میں اُن کے نام سے نقل بھی کی جاتی رہی ہے۔ صدر یار جنگ کے اس بیان سے میر حسن کے انتساب کی تردید ہو جاتی ہے۔ معلوم نہیں کس غلط فہمی کی بنا پر انھوں نے اسے ضاحک سے منسوب کر دیا۔ ممکن ہے کبھی پڑھتے سُنا ہو یا اُن کی بیاض میں لکھے ہوئے دیکھا ہو جیسا کہ اکثر اہلِ ذوق اپنے پسندیدہ اشعار نوٹ بک میں لکھ لیا کرتے ہیں۔

سعدیا روزِ ازل حسن بہ ترکاں دادند
عقل و دانش ہمہ با مردمِ یوناں دادند
ناز و انداز و کرشمہ ہمہ با مردمِ ہند
خری و احمقی و جہل بہ افغاں دادند

جیسا کہ مصرعِ اول سے ظاہر ہوتا ہے یہ قطعہ شیخ سعدی کی جانب منسوب ہے۔ مگر از روئے حقیقت شیخ موصوف سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پہلے مصرعے میں تخلص کی موجودگی اس ثبوت کے لیے کافی نہیں کہ یہ سعدی کا کلام ہے۔ میر سے غلط طور پر منسوب قطعوں کی مثالیں اس سے پہلے گزر چکی ہیں۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

یہ شعر حافظ شیرازی کے نام سے تحریر و تقریر میں نقل کیا جاتا ہے مگر کلیاتِ حافظ میں اس کا کہیں وجود نہیں۔ اس شعر کے علاوہ حافظ کے مروجہ مجموعہ کلام میں بہت سی ایسی غزلیں اور اشعار شامل ہیں جو مستند نسخوں میں نہیں ملتے۔ اس الحاقی کلام کی نشاندہی بذاتِ خود ایک وسیع موضوع ہے اس لیے یہاں اس پر بحث کی گنجائش نہیں۔

برقعے کو اُٹھا چہرے سے وہ بُت اگر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
اے ناقۂ لیلیٰ! دو قدم راہ غلط کر
مجنونِ زخود رفتہ مگر راہ پر آوے

قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے مجموعۂ نغز میں یہ دونوں شعر محتشم علی خاں حشمت کے کلام میں نقل کیے ہیں لیکن اصل میں میر کی تخلیق ہیں۔ میر نے اس زمین میں دو غزلیں کہی ہیں۔ یہ دونوں شعر پہلی غزل کے ہیں جو کلیاتِ میر مرتبۂ عبادت بریلوی میں دیوانِ اول صفحہ ۳۰۱ پر موجود ہیں۔ انتخابِ کلامِ میر مرتبۂ ڈاکٹر عبدالحق میں بھی صفحہ ۱۴۹ پر ان دونوں غزلوں کا انتخاب موجود ہے۔

کہے ایک جب سُن لے انسان دو
زباں حق نے دی ایک اور کان دو

ممتاز الرشید نے اصنافِ سخن میں اس شعر کو تلوک چند محروم کے نام سے پیش کیا ہے لیکن دراصل ذوق دہلوی کا ہے اور دیوانِ ذوق میں فردیات کے ذیل میں موجود ہے۔

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں

---

[1] نکہت اُردو و فارسی کے ایک قادر الکلام اور باکمال ادیب و شاعر تھے۔ "سرقہ و توارد" آپ کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے واحد جامع و مبسوط کارنامہ ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں سرقہ، توارد اور ترجمہ وغیرہ کی مفصل تعریف و تشریح کی گئی ہے۔ اور دوسرے حصے میں عربی، فارسی اور اُردو کے اشعار کی مثالیں دی گئی ہیں۔ پہلا حصہ کئی سال قبل جامعہ ملیہ دہلی کے میگزین جامعہ میں شایع ہو چکا ہے۔

آہ میں اپنی اثر ڈھونڈھے ہے لے مجذوب کیا
جیدِ مجنوں کی نہ شاخیں ہم نے جھپیاں دیکھیاں

مجموعۂ نغز قدرت اللہ قاسم جلد دوم میں صفحہ ۱۵۴ پر یہ دونوں اشعار سودا کے پسرِ متبنیٰ مجذوب کے ذکر میں نقل ہوئے ہیں لیکن کلیاتِ سودا (مرتبۂ عبدالباری آسی مطبوعہ نول کشور پریس) اس زمین میں ایک مکمل غزل موجود ہے جس میں یہ مطلع اور مقطع بھی شامل ہے تخلص "مجذوب کیا" سے قبل "تو" کے اضافے کے ساتھ سودا ہی کا ہے۔ گرنہ تو مجموعۂ نغز ہی معتبر و مستند ہے اور نہ کلیاتِ سودا کے مروجہ نسخے ہی قابلِ اعتبار ہیں اس لیے کسی صحیح فیصلے تک پہنچنا دشوار ہے۔ امکان غالب یہی ہے کہ یہ مکمل غزل مجذوب ہی کی ہوگی۔ مگر مرتبین کی زیادتی یا غیر محققانہ روش کی بدولت کلیاتِ سودا کی زینت بنی ہوئی ہے۔

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں
آئے تھے کیوں عدم سے کیا کر چلے جہاں میں
یہ مرگ و زیست دونوں آپس میں لڑتیاں ہیں

تذکرہ میرحسن مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی میں یہ دونوں شعر فتح علی شیدا شاگرد سودا کے کلام میں نقل ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے مطلع سودا اور سید محمد میر سوز دو شاعروں کے انتخاب کلام میں شامل کیا ہے۔ جہاں تک سوز سے انتساب کا تعلق ہے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا نہیں ہوگا۔ البتہ کلیاتِ سودا میں دونوں اشعار کی موجودگی کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سودا کا کلام ہے لیکن چونکہ سودا کے کلیات کا کوئی مطبوعہ نسخہ مستند و معتبر نہیں اور عام نسخوں میں ان کے بعض شاگردوں کی مثنویاں اور اشعار بھی شامل ہیں۔ اس لیے میرحسن کا بیان زیادہ قرینِ صحت اور قابلِ ترجیح ہے۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے اور مصحفی کے ایک شاگرد منو لال صفا کی تخلیق ہے۔ مولوی سید عبدالباقی نے تاریخ قلعۂ اسٹین میں صفحہ ۸۱ پر اس کا مصرعِ اول نقل کیا ہے لیکن بجائے صفا کے غالب کا قول قرار دیا ہے۔ اس شعر کے ساتھ صفا کا تذکرہ پہلی بار جلوۂ خضر میں کیا گیا ہے۔ ورنہ اکثر ناقلین نے شاعر کے بارے میں لاعلمی ہی کا اظہار کیا ہے۔

✡

سحرِ سامری

بسلسلۂ صفحہ ۲۲

حسب ذیل نمبر اور تاریخ درج ہے
نمبر ۷ بہ ۲۲ شہر رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸ مئی ۱۸۵۷ء۔ جلد ۱۔
ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی سحرِ سامری کے ایک آدھ نمبر شائع ہوئے ہوں، جو ہم تک نہ پہنچے ہوں۔ گمان غالب ہے کہ بغاوت شروع ہوتے ہی لکھنؤ کی زندگی میں جو انقلاب رونما ہوا تھا، اس نے سحرِ سامری کے کارخانے کو بھی درہم برہم کر دیا ہوگا۔

غزل

حسرت لکھنوی

اگر مجاز حقیقت میں ساز ہو جائے
نیاز آئینہ پردازِ ناز ہو جائے

گزر یقین کا تا حدِ ناز ہو جائے
بلند اتنی نگاہِ نیاز ہو جائے

ابھی برس کے نکل جائے گا یہ ابرِ شیخ
ذرا سی دیر کو حکمِ جواز ہو جائے

وہ سب کے سامنے دل میرا چاک کرتے ہیں
میں ڈر رہا ہوں نہ افشائے راز ہو جائے

ہوا ہے یہ دلِ آشفتہ حال کا عالم
کہ جس طرح کوئی بے ربط ساز ہو جائے

مجھے یقین ہے آنا بھی ہو تو موت نہ آئے
اگر کچھ اور شبِ غم دراز ہو جائے

ہیں جتنے بندے پھر اتنے خدا نظر آئیں
خدائی اس کی اگر خانہ ساز ہو جائے

نہ کام آئیں دعائیں، مگر غرض تو یہ ہے
نصیب قربِ درِ کارساز ہو جائے

اسے نصیب ہو معراجِ بندگی بخدا
جو بندوں میں کوئی بندہ نواز ہو جائے

ملے جو شیب میں کیفیت شباب حسیرؔ
تو ایک سجدہ میں پوری نماز ہو جائے

غزل

سورج کول سرور

وہ رشکِ آفتاب آئے ادھر کیا
ہماری شامِ غم کی ہو سحر کیا

مقدر ہی میں جب ناکامیاں تھیں
کوئی تدبیر ہوتی کارگر کیا

خلش موجود ہے دل میں ابھی تک
غضب یہ ڈھا گئی ان کی نظر کیا

تمنّا ہو جنھیں منزل رسی کی
انھیں اندیشۂ طولِ سفر کیا

حقیقت اس کے چہرے سے عیاں ہے
بتائے گا ہمیں اب نامہ بر کیا

طلسمِ رنگ و بو ہے بزمِ ہستی
نظر اس پر کریں اہلِ نظر کیا

میں ہوں پروردۂ آغوشِ طوفاں
مری کشتی کو پھر طوفاں کا ڈر کیا

سرورؔ اپنی خبر جن کو نہیں ہے
تمھارے حال کی ان کو خبر کیا

طلسم ہوش ربا میں مکارمِ اخلاق

راز یزدانی

داستانوں کے اصطلاحی مفہوم پر صرف دو سلسلے حاوی ہوتے ہیں۔ پہلا داستان حمزہ صاحبقراں کے دفاتر کا سلسلہ اور دوسرا بوستانِ خیال کا۔ چونکہ بوستانِ خیال کے مصنف کا مقصد داستان سرائی سے کہیں زیادہ اظہارِ قابلیت تھا اس لئے بوستانِ خیال اصول داستان پر پوری نہیں اترتی اور بوستانِ خیال کے جو ترجمے ہمارے سامنے ہیں ان سب میں کم و بیش سفاہتِ بیاں موجود ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ بوستانِ خیال میں کچھ اپنے مصنف کے "ہچو منے دیگرے نیست" کے دعوے سے، کچھ مترجموں کی ناواجب ایرادی کے سبب، عوام کے حالات سے وہ ربط نہیں جو داستان حمزہ اور علی الخصوص طلسم ھوش ربا میں ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ داستانوں کے یہ دونوں سلسلے شاہوں، شہریاروں اور تاجروں کے طبقوں سے زیادہ قریب ہیں اور ان میں جن سرداروں کا ذکر ہے وہ بھی بیشتر اپنے اپنے ملکوں کے بادشاہوں کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ان کا ربط عوام کی معاشرت اور عوامی طبقوں کی معاشرت اور عوامی اقدارِ حیات سے بنیادی طور پر بھی کم ہونا چاہیے۔ پھر بھی مجھے یہ کہنے میں عذر نہیں کہ داستان میں ایک اخلاقی اور نفسیاتی تعلیم ضرور ملتی ہے اور اس کی موجودگی کا واحد سبب داستان کا یہ تخلیقی اور بنیادی تصور ہے کہ خیر یا نیکی ہمیشہ بدی یا شر پر غالب ہے ظاہر ہے کہ اس تخلیقی اور بنیادی تصور کا پھیلاؤ ایسے کردار پیدا کئے بغیر ناممکن ہے جو اس تصور کی تشریح اپنے کردار اور افعال سے کرتے ہوں اس لئے داستان میں نکوکاروں کے اذکار اور بدکاروں کے تذکرے اور ان کے باہمی تصادم کی کیفیت لازم و ملزوم ہیں۔

ایک مشکل یہ ضرور ہے کہ جس زمانہ میں یہ سلسلے لکھے گئے اور ترجمہ ہوئے اس میں نکوکاری اور اخلاقی مکارم کے عام تصور بھی عیاشانہ نہ سہی تو بھی مسرفانہ زندگی کے عواقب ضرور حادی ہو چکے تھے۔ ان عواقب نے جو فضا پیدا کر دی تھی وہ حقیقی نکوکاری اور حق پرستی کے "سچے" اصولوں کے مخالف تھی۔ بوستانِ خیال میں یہ فضا اک ناگوار اثر آج کے پڑھنے والے پر پیدا کرتی ہے کیوں کہ اس کے ایک صاحبقراں کا زمانہ (میرا مطلب معزالدین ابونعیم صاحبقرا اکبر سے ہے) وہ ہے جب مذہبی حکومتوں کا دور تھا۔ ایسی عام مذہبی فضا کے عام تصور پر کم سے کم صاحبقراں اکبر کے طبعی رجحانات تو گراں ہی گزرتے ہیں گو صاحبقراں اعظم اور صاحبقراں اصغر (شہزادے خورشید تاج بخش اور شہزادہ بدر منیر) مقابلتاً گوارا ہوں کیوں کہ ان کے واقعات عام مذہبی فضا سے پہلے کے ہیں۔ لیکن داستان حمزہ اور علی الخصوص طلسم ھوش ربا میں یہ گرانی

قطعی محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ جن واقعات کا ذکر اس سلسلہ میں
کیا جاتا ہے وہ دنیا کی آخری عام مذہبی فضا سے قطعی پہلے کے بتائے
گئے ہیں یہاں تک کہ طلسم فتنہ نور افشاں میں جو ہوش ربا کے فوراً
بعد کا طلسم ہے میلاد بانی اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا ذکر ہے
اسی بنا پر میں نے یہ طے کیا ہے کہ متذکرہ بالا عنوانات کے تحت جو
کچھ لیا جائے وہ صرف طلسم ہوش ربا سے لیا جائے۔

ان اقتباسات میں جو کچھ ہے اس کی حیثیت ایک بڑی حد تک
تاریخی بھی ہے یعنی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف کس قسم کے
رسم و رواج میں گھرے ہوئے تھے۔ یعنی ہم کل کہاں تھے اور آج
کہاں ہیں۔ گو مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں بھی عذر نہیں کہ ان
اقتباسات سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ کم و بیش آج بھی ہمارے
معاشرے میں نظر آتا ہے اور ممکن ہے کہ ہماری جوان نسل کے لئے
اس کا مطالعہ اس حیثیت سے کچھ اصلاحی نتائج بھی پیدا کرے اور
ہمارا جوان طبقہ معائب کا ذکر پڑھ کر کچھ عبرت بھی حاصل کرے۔ اگر
ایسا ہوا تو یہ بھی ایک مبارک نتیجہ ہوگا۔ بہر حال ان محاسن اور معائب
کا ذکر مجھے کسی عنوان فائدے سے خالی نظر نہیں آتا۔

داستان حمزہ مع طلسم ہوش ربا کے تقریباً ۵۲۳۶۱
صفحات پر مشتمل ہے اور صرف طلسم ہوش ربا ۹۲۲۲ صفحات یعنی
تقریباً دس ہزار صفحات پر اور ظاہر ہے کہ جو داستان خیر و شر کے
معرکوں پر منحصر ہو اس میں تقریباً ہر دس صفحوں کے بعد کوئی بات
مل سکتی ہے جو قابل ذکر ہو اس لیے طلسم ہوش ربا سے ہی یہ خوشہ چینی
کی جائے تو اس کی وسعت ایک ضخیم تصنیف تک پہنچ کر بھی گا تنگی
داماں کرتی نظر آئے گی۔ اس خیال سے میں انھیں عام باتوں کا
ذکر کرتا ہوں جو ایک سرسری سے مطالعہ کے دوران میرے نوٹس
میں آگئیں اور اتنی ہی باتیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مکارم
اخلاق اور عام انسانی معائب کو ڈھونڈا جائے تو طلسم ہوش ربا کا
سلسلہ اپنے تمثیلی واقعات کی تمثیلی حیثیت میں کسی اخلاقی کتاب سے
زیادہ ہے۔

میں نے بعض مقامات پر تشریحی نوٹ بھی دیدیے ہیں اور بعض
مقامات سے قارئین پر بھروسہ کرکے بغیر کسی تشریح کے گزر گیا ہوں۔
مجھے توقع ہے کہ میرا یہ بھروسہ مجھے مایوس نہیں کرے گا۔

ایثار و قربانی۔ داستان میں دو فرقے ہیں ایک اہل حق کا اور دوسرا
اہل باطل کا۔ ان دونوں کی کشمکش پہلے صفحہ سے شروع ہو کر آخری صفحہ
تک باقی رہتی ہے۔ اہل حق کو فروغ ہوتا جاتا ہے اور اہل باطل کے
وسائل پے در پے شکستوں سے تنگ ہوتے جاتے ہیں۔ جنگ و جدل
کی اس داستان میں سرفروشی ایثار اور قربانی کی کھلی تعلیم متعدد
جگہ ملتی ہے مثلاً

افراسیاب حجرہ ہائے بلا کھول چکا ہے۔ تیسرا حجرہ لڑ رہا ہے۔
احتشاق نقارہ نواز۔ نقارہ جمشیدی پر دو چوبیں لگا چکا ہے۔ پہلی
چوب کی آواز سے مہرخ وغیرہ کو سحر فراموش ہوا دوسری چوب
پر یہ سب اندھے بہرے ہو گئے، تیسری چوب باقی ہے جس پر یہ سب
بیہوش ہو کر گر پڑیں اور جلادان حجرہ جو بارہ ہزار ہیں ان کے سر کاٹ
لیں۔ نقارہ کا پھٹنا احتشاق کا مارا جانا اور مسحورین کا اچھا ہونا
ملک احول مربع نشین کی قربانی پر موقوف ہے۔ عین وقت پر وہ
میدان جنگ میں پہنچتا ہے نور افشاں جادو اسے معرکہ کی پوزیشن
سمجھاتا ہے اور وہ سربازی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اب دیکھئے۔

"جب خواجہ عمرو سامنے آئے ملک احول نے آواز دی اے ہنر بردشت
طراری والے نہنگ بحر عیاری یہ غلام ناکام لشکر اسلام پر نثار
ہوتا ہے۔ چند کلمات وصیت کرنا منظور ہیں۔۔۔۔ میں اپنے بندگان
خدا کے واسطے جان دیتا ہوں یقین کامل ہے کہ ایک دھماکہ چھوڑ کر
دنیا سے اٹھوں لیکن میرے جنازے کو اسد نوجوان نظر کردہ بزرگان
کاندھا دیں۔ اپنے دست حق پرست سے قبر میں اتاریں، دعا
مغفرت واجب و لازم ہے۔ یہ مسافر سفر ملک عدم کا عازم ہے۔
اس نقارے کا ٹوٹنا، مرنا اس نابکار کا میرے خون پر موقوف
ہے۔ یہ جاں باز جان بچانے کی فکر میں ان سب سرداروں کی
معروف ہے یہ کہہ کر طرف آسمان کے ہاتھ اٹھائے پکار اٹھا کر
اے سمیع و علیم اے رحیم و کریم صبر عطا کر۔ اپنے ہاتھ سے اپنا سر
قلم کروں ثابت قدم رہوں، ہاتھ نہ کانپے۔ قلب نہ تھرائے بکرات

اپنا گلا کاٹوں..... یہ کلمات حسرت آیات جو بہ آواز اس حق پسند نے کہے، عمرو و برق و قراں و چالاک کے چھاتیں کھلنے لگے..... مرداں عالم کے قلب تھرا گئے، بعضوں کو غش آ گئے..... عمرو نے بیقرار ہو کر آواز دی کہ اے احول نوجوان اے صاحب ایمان بخدا تیرے الفاظ نے تیر بن کر کلیجے کو مشبک کر دیا۔ ہم جان سے مارے جائیں لیکن تو اپنے کو بچا، میدان کارزار سے نکل جا۔ احول نے کہا میں وصیت کر چکا اب میری ثابت قدمی کی دعا کیجئے۔ اب سب صاحبوں کا خدا حافظ و ناصر تھراتا ہوا طرف نقارے کے چلا خنجر مرن مع کھینچ اپنے ہاتھ سے اپنے گلے پر رکھا خنجر کو رگڑ دیا سر اس سردار کا کٹا۔ لہرا کر نقارے پر گرا۔ سب کو یہ معلوم ہوا کہ تو دہ بارود میں کسی نے آگ رکھ دی ۔ نقارہ جمشیدی مثل شکم ظالم شق ہوا۔ اسی نقارے سے اک برق سبز چمکی۔ سر پر احتقاق کے پڑی۔ اس بے حیا کے بھی دو ٹکڑے ہوئے۔ جلاد فتنہ آ گئے ان سب کے بھی سر پھٹے۔" (۶/۱۶، ۱۷)

ملکہ یاقوت سخنداں مالک حجرۂ ہیجم لڑ رہی ہے۔ اس کے قبضے میں سفر طلسمی ہے جس کو اس نے طلب کر لیا ہے۔ عفریت جیگل مار مار کے جوار کے دانوں کی طرح لشکر اسد اور سرداران اسد کو کھا رہا ہے۔ آخر وقت میں کوکب و نور افشاں آتے ہیں

"اتنے میں کوکب نے پیٹ کر کلائی پر تیغہ مارا بتحہ برق تاب پڑا چھنا کے کی آواز آئی جیسے گھڑیال پر موگری پڑتی ہے۔ کلائی پر اس بے حیا کی خط بھی نہ پڑا نور افشاں نے گرتے گرتے گولا مارا۔ اس گولے نے اتنا تو کام کیا کہ اس پہاڑ (عفریت) کو پانچ قدم پیچھے ہٹا دیا کوکب نے یاقوت کو للکارا کہ او نالائق خود آگے نہیں بڑھتی۔ اسی کے بھروسے پہ گھر سے آئی ہے۔ نور افشاں نے افراسیاب کو ڈانٹا۔ آواز دی "او افراسیاب' آج تو میرے تیرے دو چار ہاتھ چلیں۔ تیرے گھر میں کتاب خانہ جمشید ہی ہے۔ میں علم سینہ رکھتا ہوں۔ میرے تیرے بڑا فرق ہے تیرے محافظ نگہبان موجود ہیں ہمارا تکیہ پروردگار پر ہے دنیا میں مددگار ہمارا اسد نامور ہے یہ نہ ہوگا کہ اپنے سامنے ایک سائیس کو بھی ضائع ہوتے دوں۔ پہلے مجھے کھا لے تب عفریت

آگے بڑھے" (۶/۱۷)

عفریت کی تسخیر دل گردوں اور خون پر محبوب کاکل کشا کے منحصر تھی۔ شرط یہ تھی کہ کوئی ساحرہ حسین نوجوان جو حافظ القاب سامری ہو اپنی خوشی سے جان دے' اس کا خون گلو اور دل گردے عفریت کھائے تو قبضے میں آئے۔ یوں طلسم نورافشاں درھوش با میں لقاب سامری صرف محبوب کاکل کشا کے قبضے میں تھے۔ نورافشاں جان لڑائے سحر کر رہا تھا۔ اور عفریت کو روک رہا تھا کہ محبوب کاکل کشا پہنچ گئی اب دیکھئے:

"محبوب کاکل کشا مردانہ وار، نہ بیتاب نہ بیقرار، خوشی میں جان دینے کی چہرہ گلنار، سامنے اس نامدار کے آئی۔ گرد پھری تصدق ہوئی۔ کہا اے شہریار یہ لونڈی نثار ہوتی ہے جان دینے کے خیال میں ہیں روتی ہے۔ اعمال گزشتہ کا بڑا خیال ہے قلب پر ہجوم رنج و ملال ہے۔ خدا حضور کا انجام بخیر کرے۔ تا دور گردوں آپ کا کز دسکہ جاری رہے۔ کنیزوں کو سرفراز کیجیے گا۔ میرے جنازے کو کاندھا دیجیے گا۔ قبر پر فاتحہ پڑھئے گا۔ سب سردار ساتھ ہوں گے۔ یہی کنیز کی تلاوی ہے' خانہ آبادی ہے' کہ لک درلک بندگان خدا پر نثار ہوتی ہوں اسد غازی نے یہ کلمات حسرت آیات سن کر تلوار کھینچ کر اپنے گلے پر رکھی۔ کہا اے نور افشاں' ان قواعد طلسمی میں آگ لگے۔ سب کا میں سردار ہوں۔ اگر میں اپنی جان دوں تو سزاوار و زیبا ہے۔ قافلہ سالار کو چاہئے کہ اپنے کارواں سے آگے رہے (۶/۱۰۱)۔ محبوب ماہ رخسار نے نیمچہ ہلالی کمر سے کھینچا اپنے ہاتھ سے اپنے گلے پر رکھا کچھ الفاظ پڑھ کر کھینچا۔ ستارۂ سحری لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔" (۶/۱۰۲)

غرض محبوب کا خون پی کر اور دل گردے کھا کر عفریت طلسمی اسد وغیرہ کے قبضے میں آ گیا۔ اس نے یاقوت اور اس کے باپ ملک اخضر کو پہلے حربہ میں چبا ڈالا۔ اب لشکر افراسیاب پر تباہی آئی۔ محیط کوہ نشین ایک ساحر از روئے قواعد طلسمی افراسیاب کی جان کا محافظ قرار پایا تھا۔ آفات چہار دست افراسیاب کی دادی اپنے شوہر نیرنگ جادو کے مشورے سے اس کو لینے کوہ محیط پہنچی۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ افراسیاب غاصب تھا اور لاچین کو قید کر کے بادشاہ بن بیٹھا تھا۔

سامنے چھوٹوں کو نہ بولنا چاہئے۔ پہلے میں ان سے کلام کرلوں پھر آپ سے بھی موجود ہوں۔ یا پہلے آپ ہی اٹھئے" (۲۹۵)

" بدیع الزماں نے کہا اگر قبلہ و کعبہ مجھ کو واپس نہ لاتے میں اس نالائق کو ضرور قتل کرتا اس نے ادب قاعدے کو فراموش کیا برائے تسلیم صاحبقراں نہ جھکا۔" ۳۳ـ۹۳۲

یہ واضح ہو کہ نورالدہر بیٹا ہے بدیع الزماں کا اور بدیع الزماں بیٹا ہے حمزہ صاحبقراں کا۔ یہاں صورت یہ ہوئی تھی کہ نورالدہر نے سحر میں مبتلا ہو کر خورشید روشن تن کو سجدہ کرلیا تھا اور طبل جنگ بجوایا تھا۔ احسان کا بدلہ احسان۔ طبل جنگ بج چکا ہے۔ صبح کو مقابلہ ہوگا۔ ملک مراد شاہ قلم کوہ کا بوڑھا بادشاہ اپنے جواں بیٹے شمشاد کوہی سے (جسے اسد نے قید ساحراں سے چھڑایا تھا) کہہ رہا ہے۔

" اے نور نظر تم ایسے مقام پر قید تھے کہ تا قیامت رہا نہ ہوتے۔ خدا آقائے نامدار کو سلامت رکھے ان کے قدم کی برکت سے رہائی ہوئی۔ ساتھ ان کے جان لڑانا قدم پیچھے نہ ہٹانا۔ میں پیر زمیں گیر بھی لڑ بھڑ کر نثار ہو جاؤں گا۔ خدا تلوار کی موت دے۔" (ساتویں جلد)

کوکب سے سوئے مزاجی ہو چکی ہے اس کا ماہ یڑھا گیا ہے۔ صاحبقراں کہہ رہے ہیں:

"صاحبو۔ بڑے غضب کی بات ہے وہ اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرتا۔ جبر بھی اس نے اپنے دل پر اختیار کیا۔ اپنے کلیجہ پر چھری پھیری۔ اپنی بیٹی کو قتل کیا۔ خواہ قید رکھا ہو کسی کو کیا دخل ہے۔ ہمارے لشکر سے جو کوئی صاحب کوکب کی طرف جانے کا قصد کریں گے ہمیں بہت شاق ہوگا۔ ہم کسی طرح کوکب سے مقابلہ کرنے پر راضی نہیں حقیقت میں وہ ہمارا محسن ہے اس نے ہم پر احسان کیا۔ وہ بار احسان سب صاحبوں پر پہنچا (مذہب کے معاملہ میں خواجہ عمرو نے صاحبقراں کو ابھارنا چاہا۔ جواب ملا . . .) یہ غصہ بھی بے کار ہے مثل مشہور ہے کہ موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود۔ ہدایت کرنا ہمارا کام ہے۔ سخن ناشنوا کا بدانجام ہے۔ ہم کسی مقدمہ میں کوکب کے دخل نہ دیں گے۔" ۹۴ـ۱۹۵

عورت کی فطرت۔ جس زمانہ میں افراسیاب اور کوکب سے میل تھا کوکب ملکہ رضواں جادو، افراسیاب کی بہن پر مائل ہوا اور رضواں کو بھی کوکب سے محبت ہوئی۔ ملاقات بھی ہوئی۔ نامہ و پیام بھی رہے۔ پھر کوکب مسلمانوں کا شریک ہوگیا اور یہ محبت فراموش شدہ ہوگئی۔ کوکب نے اپنی نانی ملکہ مشتری ستارہ طلعت کے انتقام میں افراسیاب کی نانی ملکہ ماہیان زمرد پوش کو قتل کرنا چاہا اور ماہیان، ہفت دربند بنا کے سرحد باغ ظلمات میں چھپی (ساتویں جلد) تو رضواں جادو کو پانچواں دربند اور اس کی مصاحب فیروزہ گوہر پوش کو چوتھا دربند ملا۔ کوکب جب دربند فیروزہ پر پہنچا تو وہ حیلۂ فرماں برداری کرکے سامنے آئی اور چاہا کہ مکر سے شراب سحر پلا کر کوکب کو گرفتار کرے لیکن کوکب نے چوٹ نہیں کھائی ناچار ہو کر فیروزہ نے اپنی امداد کے لئے رضواں جادو کو بلایا۔ فیروزہ کی امید کے خلاف کوکب کو دیکھ کر رضواں جادو کی محبت عود کر آئی اور کوکب اور فیروزہ میں شکوہ شکایت ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر فیروزہ نے افراسیاب جادو کو اطلاع کردی۔ وہ فوراً پہنچا اور پہنچتے ہی،

" افراسیاب نے نعرہ کیا او رضواں گیسو بریدہ، ننگ خاندان، دشمن کے ساتھ بہ راز و نیاز دونوں دربند دشمن کے قبضہ میں کرادئے۔ رضواں نے جو آتے ہوئے افراسیاب کو دیکھا کہا اے شہنشاہ غضب ہوا، افراسیاب آ پہنچا۔ کوکب تیغہ کھینچ کر بڑھا۔ افراسیاب زمین پر آیا۔ اس باغ پر بہار میں سحر چلنے لگے۔ نخل تر و تازہ جلنے لگے۔ افراسیاب ہر مرتبہ قصد کرتا ہے کہ کوکب سے منہ پھیر دوں، رضواں پر جا پڑوں۔ کوکب روشن ضمیر سینہ سپر کرکے سامنے ہوتا ہے بلکہ اشارہ کرتا ہے کہ اے رضواں نکل جا۔ رضواں کا دل نہیں قبول کرتا کہ اس بلا میں کوکب کا ساتھ چھوڑ [illegible] ایسے وقت میں محبت سے منہ موڑوں۔ چاہتی ہے میں قتل ہو جاؤں مگر کوکب بچ جائے افراسیاب طرف کوکب کے متوجہ ہوا یعنی تلوار کا ہاتھ مارا۔ کلائی پر افراسیاب کی گودہ پڑا۔ ارے کہہ کر پیچھے ہٹا۔ کلائی پر آبلہ پڑ گیا۔ بہ قہر و غضب طرف رضواں کے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ اس نے گولہ مارا۔ کوکب کو میرے ہاتھ سے بچایا ورنہ یہ وار خالی نہ جاتا۔ غصہ میں تلوار ٹیک کر جست کی۔ برابر رضواں کے پہنچ گیا۔ کوکب نے پلٹ

کر دیکھا رضواں جادو اور افراسیاب سے بھیچ چلنے لگا۔ رضواں نے بڑی جرأت کرکے کئی ہاتھ مارے۔ افراسیاب نے سب وار خالی دیئے۔ روکتے روکتے ایک مقام پر کمر بتا کے سر پر ہاتھ مارا۔ رضواں نے سپر سحر کو اٹھا دیا۔ تیغ برق تاب افراسیاب سپر سحر سے کب رکتا ہے۔ سپر کے دو ٹکڑے ہوئے سر بچ گیا۔ رضواں نے اپنے کو بچایا افراسیاب کا وار خالی نہ گیا۔ اس ماہ پیکر کے دو ٹکڑے ہوئے۔ ستارۂ سحری لہرا کے زمیں پر گرا۔ شمع انجمن گل ہوئی کوکب روشن ضمیر قہر و غضب میں افراسیاب پر جا پڑا، کہا او نامرد کیا کیا۔ تجھ کو حجاب نہ آیا ارے بے شرم ہے۔" جلد ہفتم ۳۳ / ۳۴

اس اقتباس سے بھی بہن کے لیے جو اقدام پر بھائی کا عقد محبوب کے لئے اپنی جان دے دینے کا جذبہ۔ عورت کی محبت کا جوش اور فطرتِ انسانی کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے۔

اقربا کی باہمی محبت تاریک نے برہمن سے مقابلہ کرکے اسے سحر سے بیکار کر دیا مگر برہمن سے پہلے بہار لڑنے نکلی تھی وہ مقابلے برہمن کے دفعتاً آجانے پر بچ گئی۔ اب حیرت تاریک سے کہہ رہی ہے۔

"دادی اماں، سامری و جمشید نے بڑی خیر کی میری بہن بہار جادو بچ گئی اب اگر وہ سامنے بھی آجائے خیال رکھئے گا اس کی سرکشی پر غصہ نہ آئے۔ بہ سہولت گرفتار کرکے میرے سپرد فرمایئے گا۔" ۴۵۵ / ۹

حیرت کے متعلق ملکہ بہار کا تردد۔ بو۔ فتح ہوش ربا "بہن کی محبت بہن سے" کی دوسری مثال

"بہار نے اسد نامدار سے عرض کی کہ حضور کو کنیز کا خیال رہے شوہر اس کا مارا گیا شہنشاہ لاچین کے احکام کا خیال نہ فرمایئے۔ ان کو سلطنت کا خیال تھا وہ ملی۔ حیرت کے ساتھ کد کریں گے ہم نے بھی ابتدائے جاں بازی کی ہمارے بھی حقوق سرکار دولتمدار پر ہیں اسکا معاوضہ یہی ہے کہ گستاخی پر حیرت کی تقصیر نہ فرمایئے گا" ۹۶ / ۷

ملکہ ناہید مرصع پوش کوکب کی زوجہ اصلی نے ملکہ حنائے گلگوں پوش محبوبۂ کوکب کو اسیر کر لیا قتل کر رہی ہے۔ کوکب نے چاہا کر سب کے سحر دفع کرتا ہوا قریب ملکہ کے پہنچے دو چار کلمے سخت بھی کہے۔ پہلو میں شہزادہ جمشید ن کوکب کھڑا تھا۔ اس نے یہ معرکہ دیکھا کہ باپ ہماری ماں کو سر میدان سخت و سست کہہ رہا ہے:

"پکار کر کہا کہ قبلہ و کعبہ واہ کیا کمال کیا ایک شخص کے واسطے سر میدان ہماری ماں کو ایسے کلمات سخت کہے۔ صاحب آپ کو خیال حفظ مراتب ہیں تو آپ کی حرمت گزاری اور قاعدہ سب بے کار یہ کہہ کر جمشید جھپٹا۔ سر پر کوکب کے گولا مارا برابر کے بیٹے کا سحر دوسرا ہوتا تو سر پھٹ جاتا کوکب نے جان تو بچالی مگر سر میں درد ہونے لگا۔" ۲۵۲ / ۲

گھر آئے دشمن کی عزت۔ آخر عمرو بگڑا اور استقبال کے لیے بارگاہ حیات میں گیا۔ کوکب روشن ضمیر جوش ہو کر برائے امداد آیا

"ہرکاروں نے افراسیاب کو خبر دی شہنشاہ کوکب روشن ضمیر آتے ہیں افراسیاب برائے استقبال چلا۔ کہتا ہے کہ میں عمرو کے آ پہنچے حیات نے کہا وہ چھوکرا ہے۔ میں اسے کیا سمجھتا ہوں۔ افراسیاب نے کہا اب گھر آیا ہے۔ استقبال ضرور ہے۔" (۳۱۱ / ۲)

دوست سے محبت۔ صاحبقراں میدانِ جنگ ہوش ربا میں پہنچے خواجہ عمرو لڑتے بھڑتے سامنے آئے۔

"امیر یا تو فرط سے جو اسے یار وفادار کو بعد عرصہ دراز دیکھا دریائے خون میں نہایا ہوا اداس اداس، افتاں و خیزاں پکار کے آواز دی۔

از کجا میرسی اے آہوئے فرخندہ قدم
باد قرباں سرت حلقۂ مرغان ارم

خواجہ تمہارے دیکھنے کو ترس گئے آؤ ہمارے سینہ سے لپٹ جاؤ۔" (۶۵ / ۲)

خواجہ کو خداوند جمشید نے کشتہ سحر کیا اور سر خواں میں رکھ کر حمزہ صاحبقراں کو بھیج دیا۔ اس سر کو دیکھ کر صاحبقراں رو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔

"ہائے یار وفادار کہہ کر صاحبقراں گر پڑے۔ پکار کر آواز دی جانِ جہاں میرا دل بے سبب بے قرار نہ تھا۔ ایک روح دو جسم تھے۔ یہ صدمہ اس پر گزرا۔ کیوں کر میرے دل کو بے قراری نہ ہوتی۔ روح بے چین تھی کیوں، خواجہ ہمارے تمہارے یہ وعدہ نہ تھا۔ ہم کو تم نے ساتھ نہ لیا، سفر ملک عدم میں بڑی جلدی کی.... بادشاہ نے اپنے کو تخت سے گرا دیا۔ تاج پھینکا۔ فرماتے تھے، یارو آج تاج سر اسلام

گرگیا ۔ صاحبقراں نے سرداروں کی جانب دیکھ کر فرمایا۔
ارے نامردو مثل عورتوں کے کیا باتیں کرتے ہو۔ کوئی تم میں ایسا
نہیں ہے جس کی عمر دینے جان بخشی نہ کی ہو جیل کر اس کے خون
کا بدلا لو"۔ (۹۰۹ ـ ۹)
سرداروں اور سپاہیوں سے محبت ۔ ایک ہفتہ میں چالیس سرداران
نامی و ساحران گرامی بارگاہوں سے غائب ہو چکے۔ اسد نے رنجیدہ ہو کر
خواجہ عمرو کو بلوایا۔ جیسے ہی خواجہ آئے، دیکھا اسد نامدار غصہ میں بیٹھا ہے۔
شکنتے پیشانی پر، تیور پر بل، زلف خلی کو پیچ و تاب، آنکھیں ابلی ہوئی۔ عمرو
گھبراگیا کہا یا صاحبان آپ کو سوائے لوٹ مار کے کچھ اور بھی فکر ہے آپ لے
لشکر میں کیا قیامت برپا ہوئی۔ باعیان و بہادر و چیدہ چالیس سردار
غائب ہوئے لشکر افراسیاب میں ان کا نشان نہیں ہے۔ آخر کہاں گئے
کون لے گیا آپ افسر شاطراں ہیں۔ آپ ان کا حال بتائیے میں اپنے
سرداروں کو آپ سے لوں گا یا مجھ کو بتا۔ سمجھئے کہ میرے سردار قلعہ آہن
میں ہیں، میں جا کر اپنی جان دوں یا ان کو رہا کر دوں"۔ (۲۹ـ۹)
ملکہ ناریک شکل کش بلائے حجرہ دم سے خواجہ عمرو کا معاہدہ ہوتا ہے۔
کہ جس سردار کو وہ گرفتار کرے اسے کھائے نہیں، قید کر لے ناریک کی
خوراک کے لیے خواجہ روز دس آدمی دیں گے اس معاہدہ کا ذکر دربار میں
ہے خواجہ کہہ رہے ہیں۔
"اپنے لشکر والوں کو نہ دوں گا۔ اگر کل ہوش رباوہ بخش دے ایک
سائیس اپنے لشکر کا نہ دوں گا"۔ (۲۴ـ۶)
مروّت ۔ زندان طلسمی سے اسد خواجہ عمرو اور بدیع الزماں کو چھڑانا چاہتے ہیں۔
لاچین بھی وہیں قید ہے بدیع الزماں اپنی رہائی سے پہلے اسد سے کہتا ہے۔
"اے فرزند مروت شرط ہے۔ یہ بادشاہ عالی جاہ (لاچین) بارہ برس
سال سے قید ہیں ایسا نہ ہو پھڑک کر دم نکل جائے انھیں پہلے سے رہا کرو"۔ $\frac{۱۲۲۰}{۶}$
غرض کہاں تک عرض کروں مکارم اخلاق میں سے کوئی شعبہ
ایسا نہیں جو طلسم ہوش ربا میں موجود نہ ہو۔

سچّی محبّت

بسلسلۂ صفحہ ۲۹

شرما جی کے جہاز کو ڈوبتا سمجھ کر جو اپنی کشتی بھی ڈبو دی تھی! اس کو کہتے ہیں سچی محبت!
"کشتی جی کا کتّا سگ لیلیٰ کی نسل سے معلوم ہوتا ہے"۔ شرما جی نے
فرمایا
"سچ پوچھیے تو جو ڈگری مجھے ملنے والی ہے اس کا مستحق وہی بے زبان
کتا ہے"، میں نے عرض کیا
نتیجہ نکلنے کے پورے پندرہ دن بعد اوشا کی شادی اوشا شرما ہو گئیں۔
مجھے اپنی ناگہانی کامیابی سے کچھ ایسی شرم آئی کہ میں نے مضامین بدل کر شرما جی
اور اوشا کے ساتھ پھر بی۔ اے میں داخلہ لے لیا اور اس سال اوشا فرسٹ
ڈویزن، میں سکنڈ ڈویزن اور شرما جی تھرڈ ڈویزن میں کامیاب ہو گئے! ع
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

غزل

موج علگ

مہک اٹھا ہے مرا خون آرزو کیسے
بچاؤں ضبطِ محبت کی آبرو کیسے

بہار بن کے ترے پیرہن کی لرزش سے
اٹھے ہیں چار سو طوفانِ رنگ و بو کیسے

نہ پوچھ عشق کی محرومیاں بوقتِ شباب
نظر نظر سے گریزاں تھے خوبرو کیسے

گلوں کا بھیس بدل کر تمہارے دیوانے
ہوئے ہیں بزمِ گلستاں میں سرخرو کیسے

نہ پوچھ کون سے دانشوروں کا ساتھ ملا
محال ہو گئی منزل کی جستجو کیسے

کسی کے لطف و ستم میں جو امتیاز رہا
اُبھر اُبھر کے مٹے نقشِ آرزو کیسے؟

مری حیات کے زخموں کو موج پہچانو
ڈھلا ہے شیشۂ اشعار میں لہو کیسے؟

✡

غزل

عطا محمد شعلہ

رچا نہیں ہے طبیعت میں شعلہ یوں ہی گداز
ہزار ٹھوکریں کھائیں، سہے ہزاروں کے ناز

خوشی تو چٹکی بجاتے میں کل کی بات ہوئی
غمِ حیات نے پائی غضب کی عمرِ دراز

عجیب لطف دیا طرزِ داغ و حسرت نے
اگرچہ عشق کے گذرے بہت فسانہ طراز

تمام عمر یہ سوچا چلیں زمانے کے ساتھ
نہ ایک بار بھی ہم کر سکے زمانے سے ساز

غمِ حیات کا کیا ڈر کہ ہم تو دیکھ چکے
کسی کے عشق میں شعلہ بہت نشیب و فراز

دلؔ شاہجہانپوری

شکیل رضوی سیتاپوری

امیر مینائی کے شاگردوں کی تعداد یوں تو بہت ہے مگر ان میں بہت کم ایسے ہیں جو مشہور ہوئے۔ ان کے بہت سے شاگرد تو ایسے ہیں جن کا نام بھی لوگ نہیں جانتے حالانکہ ان کے اشعار اکثر زبان پر رہتے ہیں۔ اس کی سب سے اچھی مثال جگر بسوانی ہیں۔ آپ بھی امیر کے بہت اچھے شاگرد تھے اور بہت ہی اچھا کہتے تھے۔ ان کے بہت سے آوارہ گرد اشعار لوگوں کی زبان پر ہیں اور دوسروں سے منسوب کیے جاتے ہیں مگر جگر بسوانی کو بحیثیت شاعر جاننے والے بہت کم ہیں۔ چنانچہ اسی گمنامی کا شکار رہ کر مئی ۱۹۵۸ء کو انھوں نے وفات پائی۔ جگر بسوانی کی وفات کے بعد امیر کے صرف ایک شاگرد دلؔ شاہجہاں پوری رہ گئے تھے جو امیر کے جانشین بھی ہوئے اور اپنے زمانے میں کافی شہرت بھی پائی۔

دلؔ شاہجہاں پوری کا پورا نام ضمیر حسن خاں تھا آپ کا سلسلۂ نسب شاہ قاسم سلیمانی تک پہنچتا ہے جو سلسلۂ قادریہ کے ایک بزرگ تھے یہ عرب سے ہندوستان تشریف لائے اور قلعۂ چنار گڑھ میں ۱۰۱۶ھ میں انتقال کیا۔ پھر ان کا خاندان شاہجہاں پور میں جا کر سکونت پذیر ہو گیا۔ دل صاحب ۱۸۷۵ء میں شاہجہاں پور ہی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام احمد حسن تھا جن کا انتقال دلؔ صاحب کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اس کے بعد آپ کی پرورش آپ کے ماموں نے کی۔ انھوں نے شروع میں ان کو فارسی اور عربی کی تعلیم کے علاوہ طب کی بھی تعلیم دلائی۔ پھر اپنی صاحبزادی سے آپ کی شادی کر دی۔ دلؔ صاحب نے اپنے والد سے ترکے میں ملی ہوئی جائداد کی دیکھ بھال شروع کر دی اور آبائی پیشہ طب بھی اختیار کیا۔ تمام عمر شاہجہاں پور ہی میں مقیم رہے اور ۲۴ دسمبر ۱۹۵۹ء کو وفات پائی۔ ان کے علم میں ان کی وفات کے بعد امیر مینائی کا کوئی شاگرد اب زندہ نہیں۔

دلؔ شاہجہاں پوری ایک فطری شاعر تھے اور فطرت نے تمام شاعرانہ صلاحیتیں ان میں ودیعت کر دی تھیں۔ وہ شاعر گر کے ہاتھوں شاعر بنے تھے۔ اگر ہم ان کے حالات زندگی اور گرد و پیش کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ماحول کو شاعری سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ اس بات کی طرف پیارے صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے جہاں صوفیا اور فقرا ہی کے نام ملتے ہیں۔ دلؔ خود ایک زمیندار، ایک تاجر اور ایک اچھے حکیم تھے اور کبھی کبھی ٹھیکیداری کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ ماحول شعر و شاعری کا ماحول نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے باوجود دلؔ شاہجہاں پوری کا اپنے دور کے صف اول کے شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ اور یہی چیز اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ فطری شاعر تھے۔

اصناف شاعری میں غزل کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے اور درحقیقت یہ بڑی نازک صنف ہے جس میں عشق کے معاملات کو سمجھنا اور برتنا بڑا مشکل کام ہے۔ یوں تو ہر شاعر عشق کی کیفیت کو بیان کرتا ہے اور عشقیہ مضامین کو نظم کرتا ہے مگر کامیاب وہی ہے جو ان عشقیہ جذبات کی رو میں اعتدال سے نہ گزرنے پائے بلکہ ان کے اظہار بیان میں ابتذال سے اپنا دامن بچائے رہے۔ یہی وہ نازک منزل ہے جہاں پر کھوٹا اور کھرا آسانی سے پرکھ لیا جاتا ہے یہاں پر اگر شاعر سنبھل گیا تو اس کی شاعری حقیقی معنوں میں شاعری ہوتی ہے اور اگر جذبات کے سیل رواں پر قابو نہ پا کر شائستگی اور سنجیدگی کو کھو بیٹھا تو اس کی

شاعری ابتذال اور پھکڑپن کے حدود میں پہنچ جاتی ہے۔ دلؔ چونکہ فطرتاً متین اور سنجیدہ واقع ہوئے تھے اس لیے اُن کی شاعری میں بھی وہی سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہے جو جذبات کے اظہار میں توازن قائم رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنی تمام شاعری میں اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے کہ کہیں بھی غیر سنجیدہ بات نہ کہی جائے۔ اسی لیے ان کی شاعری کا دامن اس ابتذال سے پاک ہے جس سے ہمارے بڑے بڑے شعرا یہاں تک کہ میرؔ بھی نہ بچ سکے۔ دلؔ کی یہ خوبی ان کی شاعری کو معیاری بناتی ہے۔ اپنے دور کے شاعروں میں انھیں ممتاز کرتی ہے

اس کے یہ معنی نہیں کہ دل کے اشعار میں حسن و عشق کی چاشنی نہیں پائی جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے محبت کی نازک سے نازک کیفیات کو بڑے دلکش انداز کے ساتھ نظم کیا ہے۔ اُن کے اشعار کو دیکھ کر تو بعض مرتبہ یہ احساس ہوتا ہے کہ دلؔ نے حسن و عشق کی جو کیفیات بیان کی ہیں وہ اُن پر واقعی کسی زمانے میں گزر چکی ہیں مگر جیسا کہ نیازؔ فتحپوری صاحب نے کہا ہے دلؔ صاحب کے شباب کا کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جسے ان کے معاشقے سے تعبیر کیا جائے۔ پھر بھی جب دلؔ حسب ذیل اشعار کہتے ہیں تو یہی خیال آتا ہے کہ وہ آپ بیتی سُنا رہے ہیں ؎

یاد ہے اے ہم نشیں وہ بھی زمانا یاد ہے
دل کا آنا یاد ہے پہلو سے جانا یاد ہے
جس جگہ نظریں لڑی تھیں وہ ہر منظر سامنے
جس جگہ ہوش اُڑ گئے تھے وہ ٹھکانا یاد ہے
وہ مری بے تابیاں، وہ جوشِ چشمِ اشک بار
وہ کسی گُل پیرہن کا مُسکرانا یاد ہے
اِک بُتِ کافر ادا نا آشنا کے عشق میں
یاد ہے رہ رہ کے وہ آنسو بہانا یاد ہے

دو شعر اور ملاحظہ کیجیے ؎

یاد ہیں آج تک وہ دن مستِ بہار تھی نظر
حلقے کے پھول کھل گئے جب کوئی مسکرا دیا
گو لطفِ صحنِ گلستاں اک خواب ہو گیا ہے
میری نظر میں اب تک وہ مسکرا رہے ہیں

ان اشعار کا انداز اس قدر والہانہ ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ یہ اُن کے واردات عشقیہ کے اشارے ہیں۔

محبوب کی بے اعتنائیوں کا ذکر وہ اس انداز میں کرتے ہیں ؎

تو دل آزار رہا درد کا درماں نہ ہوا
چارہ سازِ خلشِ ناوکِ مژگاں نہ ہوا
سُن لے مجروح دل کو مُسکرا کر دیکھنے والے
اسی کا نام ہے ناسُور در ناسُور ہو جانا
ہم جس کے کہہ رہے ہیں وہ ہنگامِ جوشِ آہ
اس کے سوا کچھ اور بھی ہے ماجرائے دل

فراق یار اور شب انتظار کی کیفیت کو بھی بڑے پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے ؎

نہ وہ آرامِ جاں آیا نہ موت آئی تب وعدہ
اسی دھن میں ہم اُٹھ اُٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں
کسی کی رات منا کی رات عیش کی رات
بدل رہا ہے کوئی کروٹیں سحر کے لیے
میری قسمت کے ستارے کاش تو ہو جلوہ گر
رات نکھری حسرتِ رخ بر ماہِ تمام آ ہی گیا

آخری شعر میں قسمت کے ستارے کی تشبیہ کتنی لطیف اور نادر ہے۔

اس مفہوم کو قریب قریب سبھی شاعروں نے نظم کیا ہے کہ جب محبوب عاشق کے سامنے نہیں ہوتا تو اُس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے ہیں مثلاً یہ کہ محبوب سے ملنے پر یوں گفتگو ہوگی، یوں شکوے شکایتیں ہوں گی، اس طرح حالِ دل بیان ہوگا۔ مگر جب اس کا محبوب سے سامنا ہوتا ہے تو اُس پر رُعبِ حُسن ایسا طاری ہو جاتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کہہ پاتا۔ دلؔ نے اسی مفہوم کو نظم کیا ہے مگر کتنی سادگی کے ساتھ ؎

دفعتاً پھر بھُول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد
ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
نگاہِ شوق رہی ہم زبانِ دل لیکن
کسی طرح نہ بنا شرحِ آرزو کرتے

ان کو اپنے محبوب سے بے حد محبت ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ محبوب کی موجودگی سے زندگی کے جو تلخ لمحات عیش و نشاط میں بدل گئے ہیں وہ محبوب کے رخصت

ہو جانے کے بعد پھر نہ مل سکیں گے ؎

اِس نکھرتی چاندنی میں یہ لبِ جو بار بار
شاہدِ دل کش ادا کی گل فشانی پھر کہاں
یاد رکھنا وقتِ رخصت ہی جو ہے چشمِ التفات
تم کہو گے ہم سُنیں گے یہ کہانی پھر کہاں
مجھ سے رخصت ہونے والے لب کو جنبش کچھ تو دے
پھر کہاں موجِ تبسم کی روانی پھر کہاں

اس کے باوجود بھی جب محبوب رخصت ہوتا ہے تو صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے۔ بے قراری اور بے چینی بڑھ جاتی ہے ؎

شکیب و ضبط بھی لے یک بیک یار لیتا جا
پلٹ چلا ہے تو دل کا قرار لیتا جا
یہ لختِ دل یہ گریباں کے تار لیتا جا
جنونِ عشق کی ہر یادگار لیتا جا

محبوب کی تسلیوں سے بے قرار ہو کر وہ کہتے ہیں ؎

وقتِ رخصت تسلیاں دے کر
اور بھی تم نے بے قرار کیا

اُن کا محبوب شوخ بھی ہے اور اُن سے جھوٹے وعدے بھی کرتا ہے مگر دیکھئے وہ کس انداز سے اس کا اظہار کرتے ہیں ؎

فقط ہر وعدہ ہی وعدہ نہیں وہ آنے کا
پکارتا ہے یہ انداز مسکرانے کا
کیا ہے اِس اقرار کا مطلب دلِ حسرت نصیب
مسکرا کر وہ یہ کہتے ہیں ضرور آئیں گے ہم

مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے عشق کا تصوّر یہ ہے کہ محبوب کو بھی عاشق سے محبت ہوتی ہے اور عاشق کو تکلیف میں دیکھ کر محبوب کے دل میں بھی درد ہوتا ہے ؎

چبھتے تھے خارِ صحرا محمل نشیں کے دل میں
پیشِ نگاہ جب تک قیسِ برہنہ پا تھا

اپنے عاشق کو دیکھ کر محبوب کی نگاہیں شرمسار ہو جاتی ہیں، جبیں عرق آلود ہو جاتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں ؎

تغیّر یہ اندازِ تمکیں میں کیسا
عرق بر جبیں تم پشیماں نظر سے
مزاجِ حسن برہم میں تغیّر
کوئی تو راز اے جانِ جہاں ہے
یہ تیور اور ہی کچھ کہہ رہے ہیں
پشیمانی نگاہوں سے عیاں ہے

دلؔ کے محبوب کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہرجائی یا شاہدِ بازاری نہیں اور اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ ان کی تمام تر شاعری میں کہیں بھی رقیب کا ذکر نہیں۔ دل کے یہاں داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت کی بھی مثالیں ملتی ہیں جہاں وارداتِ قلبی، زخمِ دل، جگر سوزیوں، ناکامیوں اور جگر چاکیوں کا ذکر ہے وہاں محبوب کے خارجی حسن، اس کے لب و رخسار، خمِ کاکل، چشمِ فسوں ساز، قدِ رعنا، رفتار و گفتار کا بھی نقشہ ملتا ہے۔ مگر اس نقشے میں بھی ایک قسم کی سنبھلی ہوئی کیفیت ہے اور یہ تمام مرقعے بھی عریانی اور ابتذال سے بالکل پاک ہیں۔ کہیں کہیں خارجیت اور داخلیت کی ہم آہنگی بھی ہے اور یہ حسین امتزاج شعر کے تاثر کو دوبالا کر دیتا ہے ؎

ہنسے جو زخمِ جگر اور چوٹ کھائیں گے
لہو رُلائے گا انداز مسکرانے کا

جانِ بہار تجھ پہ نشاطِ ارم نثار
پھر ایک بار میری طرف مسکرا کے دیکھ

حیرت زدہ ہوں شوخیِ رفتار دیکھ کر
دیکھیں قیامتیں تجھے یار دیکھ کر

اس کے علاوہ دلؔ نے خارجی مناظر کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ مست گھٹاؤں، پُر کیف ہواؤں، نسیمِ سحری اور بادِ بہاری کی تصویریں بڑی جاندار ہیں ؎

کھیلتی تھی یوں چمن میں شوخیِ موجِ نسیم
بے تکلف ہر کلی کو مسکرا دینا پڑا
آئی بہار نخلِ چمن ہیں بہار پر
برسا رہے ہیں پھول ہر اک بادہ خوار پر

دلؔ کی شاعری میں عشقِ مجازی کے ساتھ ساتھ عشقِ حقیقی کی بھی مثالیں ملتی ہیں یعنی اُن کی شاعری میں تصوّف پورے طور پر موجود ہے جو انیسویں صدی کے آخر تک مسلمان شعرا میں پایا جاتا تھا۔ دلؔ کے نزدیک

بھی انسان کُل کا ایک جزو ہے جس سے وہ جدا ہو گیا ہے، و محبت ہی وہ شے ہے جس کے ذریعہ انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ محبت ہی اصل منزل کی صحیح رہنمائی کرتی ہے ؎

محبت ہے مقصد محبت ہے منزل
محبت کو رہبر بناتا چلا جا
محبت میں ہے سوز و سازِ حقیقت
محبت کے نغمے سناتا چلا جا

انسان کو محبت کے اس بحرِ بے کراں میں غرق ہو جانا چاہیے کیوں کہ اسی میں غرق ہو کر وہ اصل منزل تک پہنچتا ہے یانی کی گہرائیوں میں ساحل ملتا ہے ؎

دریائے محبت میں پہنچائے خدا تجھ تک
ڈوبے گی جہاں کشتی اپنا وہیں ساحل ہے

صوفیا کے خیالات کے مطابق دنیا میں جو کچھ ہے محبوبِ حقیقی کا پرتو ہے، ہر شے میں اسی کا نور ہے، ہر جگہ اسی کی ذات پرتو فگن ہے، ذروں میں اسی کی تنویر ہے اور گل و گلشن میں اسی کی رعنائیاں ؎

ذروں میں بھی اک ہم کو تنویر نظر آئی
اسرارِ حقیقت کی تعبیر نظر آئی
ہر پھول مرقع ہے رعنائی قدرت کا
ایک ایک کلی ہم کو تصویر نظر آئی

اس لیے انسان کو چاہیے کہ ان چیزوں کے پس پردہ ذات واحد کو پہچانے اور ان چیزوں کو جو محض عارضی تعینات کے پردے ہیں راہ سے ہٹا دے۔ [illegible] کے لیے تعین زمان و مکاں کیا معنی ؎

کہیں تو نظر آئے گی شکل مقصد
حجابات حائل اٹھاتا چلا جا
ہوئی قیدِ تعین لے کلیم اک پردۂ حائل
نگہ کو چاہیے حجاب بیاز طور ہو جانا

بہر حال عشق کی راہیں بڑی دشوار گزار ہوتی ہیں۔ اس میں پیہم ناکامیوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انسان کبھی بے خودی میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور کبھی ذوق و شوق میں منزل سے آگے نکل جاتا ہے ؎

کسی کی جستجو میں اک مقام ایسا بھی آتا ہے
جہاں منزل تو کیا اپنا نشانِ دل نہیں ملتا
وارفتگی دل نے پہنچا دیا کہاں تک
منزل ہے ابھی پیچھے ہم آگے جا رہے ہیں

اور جب انسان مستقل محرومیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرتے ہوئے، تمام دشوار گزار راہوں سے ہوتا ہوا، تعینات کے پردوں کو ہٹاتا ہوا، سرگرم بندگی رہ کر آگے بڑھتا جاتا ہے تو آخر میں یہ مقام آ جاتا ہے ؎

نہ رہا فرق عابد و معبود
عشق کی بندگی بھی ہے اک راز

دنیا اور زندگی کے بارے میں بھی دل صاحب نے وہی صوفیانہ خیالات نظم کیے ہیں۔ دوسرے صوفی شعرا کی طرح دل کے نزدیک بھی دنیا کی ہر چیز فانی ہے یہاں کسی کو ثبات نہیں یہاں کا حسن عارضی ہے۔ خود انسان کی ہستی محض دو چار نفس کا وقفہ ؎

ہاں اک نظر ادھر بھی او محو خود نمائی
غنچے بہار گل پر کیوں مسکرا رہے ہیں
اُداس شمع سحر، ڈوبتے ہوئے تارے
خموش درس ہیں دنیائے بے خبر کے لیے
اس عالم فانی میں ہستی دو چار نفس کا وقفہ ہے
جس سمت سے آئے تھے راہی آمادہ ہیں پھر جانے کو

دل فلسفۂ جبر کے بھی قائل ہیں۔ ان کے خیال میں انسان بالکل مجبور ہے۔ وہ خود کچھ نہیں کر سکتا۔ عشق بھی مجبور ہے جس حال میں محبوب رکھے صبر و شکر کے ساتھ رہنا چاہیے ؎

آزاد بظاہر ہوں یہ سچ ہے مگر ناصح
مجبور حقیقت میں مختار نہیں ہوتا
عشق ہر حالت میں ہے مجبور یہ سمجھا ہوں راز
گھر کو صحرا دیکھ کر، صحرا کو زنداں دیکھ کر

دل کا انسان بھی بڑا تغیر پذیر اور سیماب صفت ہے ؎

کبھی ناشگفتہ غنچہ، کبھی برگِ گل پہ شبنم کبھی پیکرِ تبسم، کبھی اشکبار ہوں میں

بقیہ مضمون صفحہ ۵۶

رباعیات

اختر رضوانی

(۱)

دلدوز ترانہ ہے کہ دل کی دھڑکن
یہ ایک فسانہ ہے کہ دل کی دھڑکن
ہر سانس پہ کچھ درد سوا ہوتا ہے
رفتارِ زمانہ ہے کہ دل کی دھڑکن

(۲)

موجوں میں نیا رنگ جما سکتا ہوں
گرداب میں اک دھوم مچا سکتا ہوں
یہ فخر مجھے ہے کہ میں طوفانوں سے
اس پار سفینے کو لگا سکتا ہوں

(۳)

تنہائی میں دھیمی سی صدا دیتا ہے
خاموش چراغوں کو جلا دیتا ہے
اکثر شبِ فرقت میں غمِ ہجراں میں
یہ دل کا تڑپنا بھی مزا دیتا ہے

(۴)

افتادِ طبع عظمتِ فن تک پہنچی
یہ روشنی ظلمت کے گہن تک پہنچی
اوّل تھی فقط آہ و فغاں تک محدود
آخر یہ ہمہمہ دار و رسن تک پہنچی

(۵)

اکثر شبِ ہجراں سے لپٹ جاتا ہوں
ہر چاکِ گریباں سے لپٹ جاتا ہوں
جب صبحِ وطن یاد مجھے آتی ہے
میں شامِ غریباں سے لپٹ جاتا ہے

(۶)

نفرت کا یہ کردار ہے زنگ آلودہ
یہ حربۂ بیکار ہے زنگ آلودہ
جھک جائے گی اک اذنِ فلک شکنی سے
ناداں! تری تلوار ہے زنگ آلودہ

(۷)

رہیئے گا کسی مستِ مے و جام کے ساتھ
ایسے میں کٹے گی بڑے آرام کے ساتھ
مضمونِ محبّت پہ بہ عنوانِ جلی
لکھ دیجیے نام اپنا مرے نام کے ساتھ

سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء کی خریف مہم کے سلسلے میں انعامات • • الحاق شدہ کالجوں کے اساتذہ اور حکومت • • اقامتی فوجی اسکول کا پہلا سشن • • مغربی گنڈک نہر منصوبہ • • صنعتی مصالحتی مشنری کو موثر بنانے کی سفارش • • • دیہی صنعتوں کی ترقی • • دیہی علاقوں میں انسانی وسائل کو بروئے کار لانے کا منصوبہ • • دیہی رقبوں میں آسائشوں کی فراہمی • • شرم دان کے ذریعے منصوبوں کی تکمیل • • ہندی مصنفین کو انعامات • • • ردھانوں کے لیے تربیتی سہولتیں • • متفرقات

حکومت اتر پردیش نے ریاستی اور مرکزی وزارتِ اجتماعی ترقی کی بلاک اسکیموں کے تحت سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء کی خریف مہم کے انعامی مقابلے کے تحت حسب ذیل انعامات کا اعلان کیا ہے۔

ریاستی اسکیم کے تحت ہر ایک سرگرم اور اچھا یا بلاک میں بہترین گرام سبھا کو بالترتیب ۵۰۰ اور ۲۵۰ روپیہ بطور انعام دیا جائے گا۔ اور ہر ایک ضلع کے بہترین سرگرم بلاک کو ہر سیزن میں ایک رننگ شیلڈ دی جائے گی۔ اور سرگرم بلاکوں میں بہترین فیلڈ افسر یا افسروں کو مجموعی طور پر ۱۵۰ روپیہ انعام کے طور پر دیا جائے گا۔

مرکزی وزارت اجتماعی ترقی کے تحت ہر ایک ضلع کی بہترین گاؤں سبھا کو ۲۵۰ روپیہ، ریاست کی بہترین گاؤں سبھا کو ایک ہزار روپیہ ہر ایک ضلع کے بہترین گرام سیوک کو ۱۵۰ روپیہ اور ریاست کے بہترین گرام سیوک کو ۹۰۰ روپیہ انعام دیا جائے گا۔ انعامات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ڈویژن	ضلع کا بہترین گرام سیوک	ضلع کی بہترین گاؤں سبھا
بریلی ڈویژن		
شاہجہاں پور	مہیندر سنگھ	بھوریا
پیلی بھیت	دیا رام یادو	[illegible]
بریلی	مہیندر دیو شرما	پٹی بہاری پور
بدایوں	دھرم پال سنگھ	سہاور شاہ
رام پور	جیون رام شرما	سگھان کھیڑا
بجنور	ہر رام سنگھ	سیل پور
مرادآباد	موہن سنگھ	ڈھوی
گورکھ پور ڈویژن		
گورکھ پور	شیو شنکر پانڈے	جانگال اکلا نمبر ۲

ڈویژن	ضلع کا بہترین گرام سیوک	ضلع کی بہترین گاؤں سبھا
بستی	رام آسرے پانڈے	بھیریا
اعظم گڑھ	جٹا شنکر شرما	بہادر سنورا
دیوریا	بھیرو پرشاد	مجھنا رحیم

میرٹھ ڈویژن

ڈویژن	ضلع کا بہترین گرام سیوک	ضلع کی بہترین گاؤں سبھا
دہرہ دون	پریم سنگھ	عجب پور
سہارن پور	نثار احمد	شیر پور
بلند شہر	جے پال سنگھ	بھیر دنگی
میرٹھ	ڈی' ڈی' تیاگی	جوالا گڑھ
مظفر نگر	مہابیر سنگھ	منڈیت

آگرہ ڈویژن

ڈویژن	ضلع کا بہترین گرام سیوک	ضلع کی بہترین گاؤں سبھا
علی گڑھ	برج موہن لال شرما	جوموہاں
مین پوری	سنتوش سنگھ	اشوک پور ہر کھٹھانی
ایٹہ	رام کرشن شرما	بنڈاری
متھرا	برہمانند	جنسٹھ
آگرہ	بابو لال	ہولی پورہ

وارانسی ڈویژن

ڈویژن	ضلع کا بہترین گرام سیوک	ضلع کی بہترین گاؤں سبھا
وارانسی	لالتا سنگھ	امیر پور
جون پور	سیتلا پرشاد سنگھ	پرمانند پور
بلیا	کپل دیو پانڈے	رودھنہ
مرزا پور	درگا پرشاد سنگھ	چوکیا
غازی پور	رام اگرہ سنگھ	رام پور

لکھنؤ ڈویژن

ڈویژن	ضلع کا بہترین گرام سیوک	ضلع کی بہترین گاؤں سبھا
اناؤ	برج موہن تیواری	(کور ضلع اور ریاست کی سطح پر بہترین) فتحپور (دوسری بہترین گاؤں سبھا)
رائے بریلی	رام داس یادو	رادھا بام پور
لکھنؤ	رام راج سنگھ	مگھا واں
لکھیم پور کھیری	سنت رام مصرا	لکھی ملا پور
ہردوئی	ماتا پرشاد شکلا	بھاداسی
سیتا پور	اندر بکرم سنگھ	ٹکولی

جھانسی ڈویژن

ڈویژن	ضلع کا بہترین گرام سیوک	ضلع کی بہترین گاؤں سبھا
باندہ	جینی سنگھ	چٹ سرا
ہمیر پور	بلدیو سنگھ	سوپا
جھانسی	سالک رام جیسوال	بلیما کلاں
جالون	جگن ناتھ سنگھ	ماہلی

کمایوں ڈویژن

ڈویژن	ضلع کا بہترین گرام سیوک	ضلع کی بہترین گاؤں سبھا
ٹہری گڑھوال	مگن چندر کپور	ڈیبا جاکھل
پوڑی گڑھوال	دربان سنگھ	کانڈی
نینی تال	تیج سنگھ	گوکل نگر
الموڑہ	بشن سنگھ	گھڑمولی

الہ آباد ڈویژن

ڈویژن	ضلع کا بہترین گرام سیوک	ضلع کی بہترین گاؤں سبھا
کان پور	سریندر پرتاب سنگھ	دھرم نگد پور
فتح پور	لاما شنکر سنگھ	کوریاں
فرخ آباد	ویریندر پال سنگھ	باشار
اٹاوہ	رام پال سنگھ	فتح پور
الہ آباد	کے. کے. شکلا	(ضلع اور ریاست کی سطح پر بہترین ـــ) رام آدھار مصرا۔ (ضلع کی سطح پر بہترین) امرسا

فیض آباد ڈویژن

ڈویژن	ضلع کا بہترین گرام سیوک	ضلع کی بہترین گاؤں سبھا
بہرائچ	چندر ویر سنگھ	کھنگا ہا

ڈویژن	ضلع کا بہترین گرام سیوک	ضلع کی بہترین گاؤں سبھا
گونڈہ	گجیندر سنگھ	دولت پور
پرتاپ گڑھ	چندر بھان سنگھ	پریاں واں
بارہ بنکی	بینی مادھو سنگھ	کھرسوٹیا
سلطان پور	بھگوناتھ سنگھ	دھوندھو
فیض آباد	اودھ نرائن ورما	مرزا پور نموں

● ● ●

اتر پردیش کے وزیر تعلیم پنڈت کملا پتی ترپاٹھی نے آگرہ یونیورسٹی سے الحاق شدہ کالجوں کے جونیر ٹیچروں کے وفد سے کہا کہ حکومت اس سوال پر ہمدردانہ غور کر رہی ہو کہ حال میں اُتر پردیش کے غیر سرکاری کالجوں کے سینیر اور جونیر ٹیچروں کے لیے جو گریڈ نافذ کیے گئے ہیں اُن کو ملا کر ایک کر دیا جائے۔

آگرہ یونیورسٹی کے ٹیچروں کی انجمن اور آگرہ یونیورسٹی سے الحاق شدہ ڈگری کالجوں کے ۱۰۲ سینیر ٹیچروں کی جانب سے وفدوں نے ۱۹ اپریل کو لکھنؤ میں وزیر تعلیم سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی۔

وزیر تعلیم نے کہا کہ وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ ڈگری کالج کے ٹیچروں کو وہی تنخواہ ملنی چاہیئے جو یونیورسٹی کے ٹیچروں کو ملتی ہے لیکن ایسا کرنے میں مالی دشواریاں حائل ہیں

جونیر ٹیچروں کے وفد نے یہ تسلیم کیا کہ ڈگری کالجوں میں تنخواہ کے نظرثانی شدہ اسکیل کا نفاذ ٹیچروں کی حالت بہتر بنانے کی جانب ایک اہم اقدام ہے لیکن وفد نے اس امر پر زور دیا کہ جونیر اور سینیر ٹیچروں کے ناموں کے بجائے ان سب کو اسسٹنٹ پروفیسر کے نام سے موسوم کیا جائے علاوہ ازیں اس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ایسے ٹیچروں کو جو ملازمت میں ہیں پیشگی سالانہ ترقی دی جائے۔ تاکہ وہ تنخواہ کے اسکیل کی نظرثانی سے حسب تناسب مستفید ہو سکیں وفد نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ریسرچ الاؤنس جو اس وقت صرف شعبوں کے صدروں کو ملتا ہے ایسے تمام ٹیچروں کو دیا جائے جو منظور شدہ ریسرچ کے کام کے سلسلے میں رہنمائی کرتے ہیں۔

وزیر تعلیم نے وفد سے کہا کہ حکومت ٹیچروں کی حالت بہتر بنانے کے لیے برابر کوشاں رہی ہو اس لیے انھیں مایوسی سے دوچار نہیں ہونا چاہیے

بلکہ یہ توقع رکھنی چاہیے کہ مستقبل میں ان کو اور زیادہ سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

سینیر ٹیچروں نے یہ مانگ کی کہ اُن کی تنخواہ کا اسکیل وہی ہونا چاہیے جو شعبوں کے صدروں کا ہے۔ اس کے جواب میں وزیر تعلیم نے کہا کہ سینیر ٹیچروں کی تنخواہ کے اسکیل پر نظرثانی کی جا چکی ہے اور یہ امر مناسب نہیں ہے کہ اُن کا اور شعبوں کے صدروں کا ایک ہی اسکیل رکھا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومت یہ نہیں چاہتی کہ تنخواہ کے اسکیل پر نظرثانی سے کسی ٹیچر کو کوئی نقصان ہو اور اسی لیے شعبوں کے صدروں کی تنخواہ کا ایک نیا اسکیل بنایا گیا ہے

● ● ●

ریاست کے نوجوانوں کو ابتدائی فوجی تربیت دینے کے لیے انڈین ملٹری کالج دہرہ دون کے نمونے پر سروجنی نگر لکھنؤ میں ریاستی حکومت ایک قائمی سینک اسکول قائم کر رہی ہے تاکہ وہ دفاعی افواج میں کمیشن پا سکیں۔

اسکول کا سیشن ۱۵ جولائی ۱۹۶۰ء سے شروع ہوگا۔ اس اسکول میں داخلہ تحریری اور زبانی امتحانات کے نتائج کی میعاد پر کیا جائے گا۔ تحریری امتحان عام ہندی، ریاضی اور عام معلومات پر ہوگا۔ یہ امتحانات لکھنؤ میں جون ۱۹۶۰ء میں ہوں گے۔ امتحانات کی ٹھیک ٹھیک جگہ اور تاریخ کے بارے میں امیدواروں کو بعد میں مطلع کیا جائے گا۔

امتحانات میں شریک ہونے کی درخواستیں (دو کاپیاں) مقررہ فارم پر ڈپٹی سکریٹری جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ لکھنؤ کو ۱۵ مئی ۱۹۶۰ء تک بھیج دینا چاہیے۔ درخواست کا فارم اور دیگر تفصیلات مذکورہ ڈپٹی سکریٹری سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مذکورہ تاریخ کے بعد بھیجی جانے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

اُمیدواروں کی عمر یکم جولائی ۱۹۶۰ء کو دس سال ہونا چاہیے لیکن ۱۲ سال نہیں ہونا چاہیے۔ اسکول میں داخلہ کے لیے منتخب امیدواروں کو منتخب فوجی اسپتالوں میں اپنا ڈاکٹری معائنہ کرانا ہوگا۔ اور صرف ایسے امیدواروں کے داخلہ پر غور کیا جائے گا جو صحت کے اعتبار سے ٹھیک پائے جائیں گے

● ● ●

کثیر مقصدی مغربی گنڈک نہر منصوبے کے لیے اتر پردیش، بہار اور نیپال کی حکومتوں نے اپنی رضامندی دے دی ہے۔ مجوزہ نہر گنڈک ندی

کے دائیں کنارے سے نکالی جائے گی۔ اسکیم کے تحت اس ندی کے کنارے ایک بند تعمیر کیا جائے گا۔ اس منصوبے کے اخراجات اتر پردیش اور بہار کی حکومتیں برداشت کریں گی۔ حکومت اتر پردیش نے اس منصوبے کے متعلق تفصیلی سروے کے لیے ۱۵ لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے۔

اس منصوبے کی تکمیل سے اتر پردیش میں گورکھپور اور دیوریا کے اضلاع اور بہار میں ضلع سارن کو آبپاشی کی مزید سہولتیں مہیا ہوں گی۔ منصوبے کے تحت نیپال اور اتر پردیش میں ایک ایک بجلی گھر قائم کیا جائے گا۔

اس علاقے کی اہم فصلیں بھدئیں، دھان اور گنا ہیں۔ اس منصوبے کے پورا ہو جانے سے اس علاقے میں اگھن دھان کی کاشت ہو سکے گی اور گنے کے زیر کاشت رقبے میں اضافہ ہوگا جو یہاں کے کسانوں کے لیے حد درجہ منفعت بخش ہوگا۔

یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہے کہ پہلے دو پنج سالہ منصوبوں سے پہلے گورکھپور اور دیوریا کے اضلاع میں آبپاشی کی سہولتیں دستیاب نہیں تھیں۔ پنج سالہ منصوبوں کے تحت اس وقت تک ۱۰۴۳ ٹیوب ویلوں اور نہروں کے ذریعہ مجموعی طور پر ۲۶٫۴۱ لاکھ ایکڑ زمین کی آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ مذکورہ نہر کے چالو ہو جانے سے اس رقبے میں مزید اضافہ ہوگا۔

• • •

تو تشکیل ریاستی تخمینہ اور محلہ رآمد بورڈ نے جس کا پہلا جلسہ لکھنؤ میں نائب وزیر صنعت اور محنت شری ایچ۔ این ہوگنا کی صدارت میں ہوا یہ سفارش کی ہے کہ صنعتی مصالحتی مشنری کو اور زیادہ موثر بنانے کے اقدامات کیے جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ صنعتی تنازعات پرامن اور دوستانہ طور پر طے ہو سکیں۔

جلسہ میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ مصالحتی افسروں کو چاہیے کہ وہ فریقین سے بات چیت کر کے ان کا اعتماد حاصل کرنے اور ان کے اختلافات کو خوشگوار ماحول میں دور کرنے کی پوری پوری کوشش کریں۔

بورڈ کی ایک اہم سفارش یہ ہے کہ اس امر کا پورا خیال رکھا جائے کہ مل مالکوں کی انجمنیں اور لیبر یونین غیر قانونی ہڑتالیں اور تالہ بندیاں نہ ہونے دیں۔ سفارش میں اس امر پر بھی زور دیا گیا ہے کہ وہ ضابطہ اخلاق کی پابندی کرنے کے لیے آپس میں سمجھوتہ کر لیں کہ بصورت عدم پابندی متعلقہ فیکٹری یا مزدوروں کا استحقاق ختم کیا جا سکے۔

بورڈ نے اس امر پر زور دیا ہے کہ تنازعات کے تصفیہ کی کارروائی جلد از جلد مکمل کی جائے۔ اس سلسلہ میں مزدوروں کی جانب سے یہ کہا گیا کہ موجودہ طریقہ کار سے صنعتی نزاع کے قطعی تصفیہ میں ایک سال لگ جاتا ہے جبکہ بورڈ کے چیرمین نے کہا کہ اس میں عام طور پر تین ماہ سے زیادہ وقت نہیں لگتا۔ انھوں نے ممبروں کو یقین دلایا کہ بورڈ کے سامنے صنعتی تنازعات کے تصفیوں سے متعلق گزشتہ تین ماہ کے اعداد و شمار پیش کیے جائیں گے۔

بورڈ نے اس امر پر بھی زور دیا کہ مل مالکوں اور مزدوروں کے مختلف اداروں کو صنعتی تنازعات کا جائزہ لینے اور ان کو طے کرانے کے لیے بجائے پڑتال کمیٹیاں قائم کرنا چاہئیں۔ اگر سمجھوتہ نہ ہو سکے تو ان کمیٹیوں کو مصالحت کی آخری کوشش کے طور پر اس کے اسباب سے لیبر کمشنر کو مطلع کرنا چاہیئے۔ بورڈ نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ لیبر کمشنر کو وصولی سرٹیفکٹوں کے اجرا سے قبل فریقین کو مصالحت کے لیے بلانا چاہیئے۔

بورڈ نے یہ بھی سفارش کی کہ بورڈ کے فیصلوں کے مناسب نفاذ کے لیے لیبر کمشنر کے دفتر یا ریاستی حکومت کے صدر مقام میں ایک علیحدہ سیل قائم کیا جائے۔

اس سے قبل بورڈ کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے شری بہوگنا نے ممبروں سے کہا کہ وہ کم سے کم مدت میں صنعتی خوش حالی کے مقصد کے حصول کے لیے ایک صحت مند ماحول پیدا کرنے میں مدد دیں۔ انھوں نے کہا کہ قوانین کے ذریعہ تنازعات کے تصفیہ سے عارضی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے لیکن مل مالکوں اور مزدوروں کے تعلقات مستقل طور پر خوشگوار اور دوستانہ بنانے کا واحد ذریعہ اخلاقی بندشیں ہیں۔

• • •

کھادی اور دیہی صنعتوں کے کل ہند کمیشن کے ایک عارضی فیصلہ کے مطابق سال رواں میں اتر پردیش کو دی جانے والی سالانہ مالی امداد بڑھا کر ۵۰٫۶۵ لاکھ روپیہ کر دی گئی ہے۔ گزشتہ تین برسوں کے دوران ریاست کو ۳۰ لاکھ روپیہ سے لے کر ۴۰ لاکھ روپیہ تک سالانہ امداد دی گئی۔ اس رقم میں سے ۲۱٫۳۳ لاکھ روپیہ ایسی اسکیموں کے لیے مخصوص

کیا گیا ہے جن پر حکومت کے ذریعہ عمل درآمد ہوگا اور ۴۱ء۵۴ لاکھ روپیہ امداد باہمی انجمنوں اور رجسٹرڈ اداروں کی اسکیموں کی تکمیل پر صرف کیا جائے گا۔

مذکورہ مالی امدادی رقم میں سے ۵۰ء۳۵ لاکھ روپیہ قرضہ اور ۲۵ء۳۰ لاکھ روپیہ مالی امداد کی صورت میں منظور کیا گیا ہے۔

دیہی کلیدی صنعتوں کی ترقی سے متعلق ریاستی محکمہ صنعت کے پروگرام کے لئے ۱۴ اقسام کی دیہی صنعتیں منتخب کی گئی ہیں۔ جن میں تیل، امبر چرخہ، اناج اور دالوں کی پروسسنگ، چمڑہ، گڑ اور کھنڈسازی، ہاتھ سے کاغذ بنانے اور کمبل وغیرہ کی صنعتیں شامل ہیں۔

علاوہ ازیں کمیشن نے ریاستی محکمہ نگہداشت مویشیان کو کھال اتارنے کے چھ مرکزوں اور محکمہ زراعت کو قومی توسیعی سروس بلاکوں کے علاقوں میں شہد کی مکھی پالنے کے پانچ واحدوں کے قیام کے لئے بالترتیب ۴۳۳۲۰ روپیہ اور ۱۶ ہزار روپیہ دینے کی عارضی منظوری دی ہے۔

یہ مالی امداد افراد کو نہیں بلکہ امداد باہمی انجمنوں یا اداروں کو دی جاتی ہے۔ ریاست میں دیہی صنعتوں کی ۱۲۵۰ امداد باہمی انجمنوں کا قیام عمل میں آچکا ہے جن کو اس پروگرام کے تحت مالی امداد مل رہی ہے۔ یہ مالی امداد آلات اور مشینوں کی خریداری۔ انجمنوں کے لئے سرمایہ حصص اور کاروباری سرمایہ کی فراہمی۔ گوداموں وغیرہ کی تعمیر۔ اور آلات کی تیاری وغیرہ کے لئے دی جاتی ہے۔

• • •

حکومت اترپردیش تیسرے منصوبہ کی اسکیموں پر عمل درآمد کیلئے دیہی علاقوں میں انسانی طاقت کے وسائل کو بروئے کار لانے کے منصوبوں پر غور وخوض کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں منصوبہ بندی کمیشن نے ایک ایسا پروگرام مرتب کرنے کا مشورہ دیا ہے کہ جس میں ایسے تعمیراتی منصوبے جن میں ہنرمند اور غیر ہنرمند مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے اور عوام کے ذریعہ شروع کئے گئے کام شامل ہوں علاوہ ازیں پروگرام میں ایسی اسکیمیں جن کے ذریعہ انسانی طاقت کے وسائل کو بروئے کار لاکر منفعت بخش بنایا جاسکے اور ایسے مقامی ترقیاتی کام بھی شامل ہوں جو عوام اپنی محنت کے ذریعہ مکمل کرتے ہیں اور ان کے لئے حکومت

کچھ مالی امداد دیتی ہے۔

پہلے زمرہ کے کاموں کے تحت آبپاشی۔ انسداد سیلاب، زمین کی بازیابی اور مٹی کے تحفظ اور بڑی سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کی اسکیمیں آئیں گی۔ ایسے منصوبوں کی تکمیل میں عوام کو شریک کرنے کیلئے جو عام طور پر متعلقہ محکمے کی جانب سے ٹھیکیداروں کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہونچتے ہیں محکمہ تعمیرات عامہ نے یہ ہدایت جاری کی ہے کہ ۲ ہزار روپیہ تک کی لاگت کے کام ٹنڈر طلب کئے بغیر مزدوروں کی امداد باہمی انجمنوں یا گاؤں پنچایتوں کے ذریعہ کرائے جائیں۔ اس حد کو بڑھا کر ۱۰ ہزار روپیہ تک کرنے کی تجویز حکومت کے زیر غور ہے۔

محکمہ آبپاشی نے بھی ۵۰۰۰ روپیہ تک کی لاگت کے کام کو مزدوروں کی امداد باہمی انجمنوں اور گاؤں پنچایتوں کے ذریعہ کرانے کے لئے رضامندی ظاہر کی ہے۔ اضلاع اور بلاکوں میں اس وقت بہت سے منصوبے ٹھیکیداروں کے ذریعہ زیر تکمیل ہیں۔ ان کاموں کو بھی مزدوروں کی انجمنوں اور گاؤں پنچایتوں کے ذریعہ مکمل کرانے کے امکانات کا جائزہ لیا جا رہا ہے تاکہ ان کے منافع کی رقم سے دیہی عوام کی فلاح اور بہبود کی اسکیموں پر عمل درآمد میں مدد مل سکے۔

• • •

ریاستی حکومت نے اجتماعی ترقیاتی پروگرام کو مزید تقویت دینے کے پیش نظر ایک تین نکاتی پروگرام مرتب کیا ہے جس کے تحت ہر گاؤں میں پینے کے صاف پانی، ٹرنک روڈ یا ریلوے اسٹیشن سے ملانے والی سڑک اور ۶ سال سے ۱۱ سال تک کے بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم کی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں گی۔

اس تین نکاتی پروگرام میں گاؤں کے تمام باشندوں کے لئے جن میں ہریجن بھی شامل ہیں پینے کے پانی کی فراہمی کے مسئلہ کو اولیت دی جائے گی۔ اس سلسلہ میں خود کوشی کی بنیاد پر منصوبے شروع کئے جائیں گے اور ان کے لئے سرکاری امدادی رقم کو بتدریج کم کیا جائے گا۔ ضلع منصوبہ بندی افسروں کو اس امر کی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ بتائیں کہ ان کے علاقوں میں اس کام کے لئے کم سے کم کتنی امدادی رقم درکار ہوگی نیز دان کے ذریعہ تعمیر شدہ سڑکوں کو ٹھیک حالت میں رکھنے

کی ذمہ داری گاؤں والوں پر ہوگی اور خاص خاص جگہوں پر امدادی رقم سے پلیاں تعمیر کی جائیں گی۔

محکمۂ تعلیم نے ایک جامع سروے کے بعد پرائمری اسکول کی عمارتوں کے جائے وقوع کے بارے میں اپنی رپورٹ دے دی ہے۔ ہر ایک پرائمری اسکول کی عمارت کی تعمیر کے لئے ۲ ہزار روپیہ کی مالی امداد دینے کی تجویز ہے۔ جس میں مقامی لوگوں کے چندہ کے ذریعہ مزید اضافہ کیا جائے گا۔ مواضعات میں ابتدائی تعلیم کی توسیع کے لئے صرف پنچائتیں ذمہ دار ہوں گی۔

• • •

تیسرے منصوبہ کے دوران شرمدان مہم کو آگے بڑھانے کے لیۓ ایسے منصوبوں کی تکمیل عوام شرمدان کے ذریعہ کریں گے جو موضع اور بلاک کی سطح پر تمام تر مقامی محنت اور وسائل یا بلاکوں اور اضلاع سے مالی امداد اور تکنیکل امداد کے ذریعہ پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔

شرمدان مہم کے اجتماعی ترقیاتی پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے شروع کی گئی دوسری مہموں کا اہم جزو بنانے کے لئے ریاست میں حال میں ایک مخصوص مہم چلائی گئی تھی۔ حکومت کی جانب سے یہ ہدایت جاری کردی گئی ہیں کہ پورے سال کے لئے ہر ایک گاؤں اور بلاک میں باضابطہ طور پر شرمدان کا پروگرام مرتب کیا جائے۔

شرمدان کے سلسلہ میں صحت مند مقابلہ کو فروغ دینے کے لئے حکومت نے مال کے دس ڈویژنوں میں سے ہر ایک ڈویژن کے بہترین ضلع کو شرمدان کے لئے انعامات دینے کے بارے میں مجموعی طور پر ۵۰ ہزار روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔ اضلاع کو بھی بہترین گرام سبھا کو ایک ہزار روپیہ تک انعام دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔

شرمدان کے ذریعہ کئے گئے کاموں کا تخمینہ کرنے کے لئے ہر ایک ڈویژن میں تخمینہ کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں۔

• • •

حکومت اُتر پردیش نے ۱۲۶ ہندی مصنفین کو ان کی اعلیٰ تصانیف پر ۵۰،۸۰۰ روپے کے انعامات دیے ہیں۔ ریاستی آیورویدک کالج لکھنؤ کے ڈاکٹر رام سوشیل سنگھ کو ۱۰۰۰ روپے کا سب سے بڑا انعام دیا گیا ہے۔

شری بھگوتی چرن ورما لکھنؤ، اچاریہ نریندر دیو مرحوم، شری پدھ شنڈ میمانسک وارانسی، اور ڈاکٹر بھولا شنکر دیاس وارانسی کو ۱۰۰۰ روپے کے انعام دیے گئے ہیں۔

شری کیدار ناتھ شاستری (نئی دہلی)، ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی (لکھنؤ)، شری اُدے شنکر بھٹ (دہلی)، شری پدم لال پنّا لال بخش (الٰہ آباد)، شری شانتی پریہ دیدی (وارانسی)، ڈاکٹر سرجو پرشاد دوبے (لکھنؤ)، ڈاکٹر گوپی ناتھ تیواری (گورکھپور)، شری مدن موہن پانڈے (کان پور) اور پروفیسر لی جین (مودی نگر) کو ۶۰۰۔۶۰۰ روپے کے انعام دیے گئے۔

علاوہ ازیں ۱۱۲ مصنفین کو ۵۰۰۔۴۰۰۔۳۰۰۔۲۵۰۔۲۰۰ اور ۱۰۰ روپے کے انعامات دیے گئے ہیں۔

• • •

حکومت کی عارضی تجاویز کے تحت گاؤں سبھاؤں کے پردھانوں، اُپ پردھانوں، گاؤں پنچایتوں کے ممبروں اور ضلع کے نوجوانوں کے لیڈروں کو اجتماعی ترقی کے متعلق معلومات بہم پہنچانے اور تربیت دینے کے لیے ہر ایک ضلع میں ایک تربیتی مرکز کے قیام کا پروگرام بنایا گیا ہے۔

یہ تربیتی ادارہ غیر سرکاری ایجنسی کے ذریعے چلایا جائے گا۔ اس کے دائرہ اثر میں تقریباً ۹۰۰ گرام سیوکوں کے حلقے ہوں گے اور اس کے ذریعے ۹۰۰۰ نوجوانوں کے لیڈروں، ۹۰۰۰ خواتین ورکروں، ۲۵۰۰ پردھانوں اور اتنی ہی تعداد میں اُپ پردھانوں کو تربیت دی جائے گی۔

مجوزہ اداروں میں دو قسم کے تربیتی کورس ہوں گے۔ پہلا کورس پردھانوں، اُپ پردھانوں، نوجوانوں کے منتخب لیڈروں اور خواتین ورکروں کے لیے ہوگا اور اس کی مدت ایک ماہ ہوگی۔ سال میں اس قسم کے چھ کورس ہوں گے۔ ہر کورس میں ۵۰ اشخاص کو تربیت دی جائے گی۔ دوسرے کورس کی تعلیم گشتی تربیتی کیمپ کے ذریعے دی جائے گی جو گاؤں سبھاؤں کے ممبروں، نوجوانوں کے منتخب لیڈروں اور خواتین ورکروں کی تربیت کے لیے مختصر مدت کے لیے نیائے پنچائتوں کے ہیڈ کوارٹر پر منعقد کیے جائیں گے۔ منتخب گرام سیوکوں کو موجودہ مرکزوں اور بلند شہر کے تربیتی اور توسیعی پروجیکٹوں اور جھانسی اور گورکھپور کے زراعتی اسکولوں میں ایک ماہ کے لیے اعلیٰ تربیت دی جائے گی۔

متفرقات

سکھ گردوارہ بل۔ ریاستی حکومت کی جانب سے جاری کیے گئے ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ ۴ مارچ ۱۹۶۰ء کو لوک سبھا میں یہ تجویز منظور کی گئی ہے ملک کی مختلف ریاستوں میں واقع سکھ گردواروں کے بہتر نظم و نسق کے لیے جو بل پیش کیا گیا ہے اس کے متعلق عوام کی رائے معلوم کرنے کی میعاد ۳۰ جولائی ۱۹۶۰ء تک کے لیے بڑھا دی جائے۔ پریس نوٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ اس بل میں دلچسپی رکھنے والے اشخاص اور عوامی اداروں کو اس سے متعلق اپنی رائیں اور تبصرے ریاستی حکومت کو ۱۵ جولائی ۱۹۶۰ء سے قبل بھیج دینا چاہیے تاکہ انکو لوک سبھا سکریٹریٹ کو وقت پر بھیجا جا سکے۔

اس سلسلے میں رائیں اور تبصرے براہ راست لوک سبھا سکریٹریٹ یا کسی مرکزی وزارت کو نہیں بھیجنا چاہیے۔

زرعی یونیورسٹی کے طلبا کے لیے نئی اسکیم۔ مجوزہ زرعی یونیورسٹی کے انتظامیہ بورڈ نے یونیورسٹی کے طلبا کے لیے ایک نئی اسکیم "سیکھو اور کماؤ" منظور کی ہے۔ بورڈ کے ایک پہلے جلسے میں معمولی ترمیم کے ساتھ یہ تجویز منظور کی گئی کہ ہفتے میں ۱۲ گھنٹے کام کرنے کے معاوضے میں طلبا کو تعلیمی فیس کی ادائگی سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ بورڈ نے یہ بھی طے کیا کہ کام کے معاوضے میں طلبا کو تعلیمی فیس کی ادائگی سے مستثنیٰ کرنے کے بجائے انکو نقد مزدوری دی جائے۔

تصحیح

"نیا دور" (مارچ ۱۹۶۰ء) میں سلیمان اریب صاحب کی غزل کے مطلع کا پہلا مصرع غلط چھپ گیا ہے۔ صحیح شعر یہ ہے:

دنیا نہ کائنات کا مارا ہوا ہوں میں
اک حسن بے ثبات کا مارا ہوا ہوں میں

(۲) "نیا دور" (اپریل ۱۹۶۰ء) کی اشاعت میں "چھوٹی بچت" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے اس کے لکھنے والے عبدالمجیب سہالوی صاحب ہیں۔ غلطی سے کتابت میں عبدالمجید سہلوی لکھ دیا گیا ہے۔

—— ایڈیٹر

دل شاہجہان پوری

بسلسلۂ صفحہ ۴۸

چند اور اشعار ملاحظہ فرمایئے جو اقبال کے انداز میں کہے گئے ہیں ؎

تو محو ترنم ہے محسوس ہوا کہ شر
خاموش فضاؤں میں نغمے ترے سنتا ہوں
پابند مری وحشت، آزاد مری فطرت
آغوش سلاسل میں پروردہ صحرا ہوں

دل کو اس کا بھی احساس تھا کہ شاعری میں خصوصیات شعری کا ہونا ضروری ہے ؎

بیاں میں جوش نہیں دل کشی زباں میں نہیں
جو یہ نہیں تو کوئی حسن داستاں میں نہیں

اپنی ایک نظم "شاعر" میں شاعر کی خصوصیات بتاتے ہوئے انھوں نے اُن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا شاعر کو خیال رکھنا چاہیئے۔ اشعار میں تاثر ہونا چاہیے۔ شاعر سامع کے دل کو ایک تحریر عطا کرے۔ ذہن انسانی کو جلا بخشے اور فکر کی گہرائیوں میں ڈوب کر ایسے خیالات کو جنم دے جو نظام زندگی بدل سکیں نیز اس کے اشعار میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ اتنا جوش ہو کہ وہ فلسفی کے خیالات اور منطقی کے دلائل کو بھی پاش پاش کر دے ؎

لطافت سے جو ہر تخیل کو رنگیں بناتا ہو
فصاحت کا، بلاغت کا اک دریا بہاتا ہو
جو حسن فکر سے بزم سخن کو جگمگاتا ہے
اچھلتے ڈوبتے تارے جو اکثر توڑ لاتا ہے
خیال فلسفی بدلے یہ استدلال شاعر ہے
دلیل منطقی توڑے یہ قیل و قال شاعر ہے

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہو کہ دل صاحب کا شاعری کے بارے میں تصور بہت بلند تھا۔ وہ شاعری کو مقصدی بنانا چاہتے ہیں اور اس سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک شاعری محض ذوق جمال کو تسکین دینا نہیں بلکہ انسانی ذہنیت کی تربیت کر کے، اس کو ایک اعلیٰ مقصد کے لیے اکسانا بھی ہے۔

نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۵ نمبر ۳

جیٹھ ۱۸۸۲

جون ۱۹۶۰ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری یو۔پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

عنوانات

اپنی بات

کوہستان ہمالہ کی سربفلک، برف پوش چوٹیوں نے اتر پردیش کے شمالی علاقہ کو جو اس کے دامن میں واقع ہو حقیقی معنوں میں دامانِ باغبان و کف گلفروش بنا دیا ہو۔ اس پہاڑی علاقہ کا ہر مقام اپنی نظر فریبی اور دل نوازی کے باعث سیاحوں کو دعوت نظارہ دیتا ہو۔ ان مقامات میں مسوری، نینی تال، المورہ، رانی کھیت، چکراتا، لینس ڈاؤن وغیرہ خصوصی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مسوری کو اتر پردیش کی پہاڑیوں کی رانی کہا جاتا ہو اور اپنی خوبصورتی اور اپنے حسین گرد و پیش کی وجہ سے وہ ہے بھی اس لقب کا مستحق۔ وہ سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر دہرہ دون سے ۱۴ میل دور واقع ہے اور اس کے چاروں طرف ایسے حسین مناظر ہیں کہ "نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد"۔ میجر ہرسے نامی ایک یوروپین نے ۱۸۱۱ء میں اس آراضی کو جہاں مسوری آباد ہو ایک معمولی رقم دے کر خرید لیا تھا۔ ایک سال بعد ۱۸۱۲ء میں یہی آراضی اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دی۔ کچھ عرصہ کے بعد کمپنی نے ملحقہ زمینیں بھی خریدیں اور فوجی سپاہیوں کے لئے یہاں ایک آرام گاہ بنائی گئی۔ انگریزی حکومت بعض ممتاز نظر بندوں کو بھی یہیں بھیجتی رہی۔ مثلاً امیر دوست محمد خاں والیٔ افغانستان ۱۸۴۲ء میں، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لڑکے راجہ دلیپ سنگھ ۱۸۵۲ء میں اور امیر یعقوب خاں والیٔ افغانستان ۱۸۷۹ء میں یہاں نظر بند کئے گئے۔ ۱۹۰۱ء میں دہرہ دون — ہردوار ریلوے لائن کھل جانے سے مسوری تک آنے جانے کی تمام سہولتیں بھی فراہم ہو گئیں اور ایک پہاڑی مستقر کی حیثیت سے اسے روز افزوں شہرت حاصل ہوتی گئی۔ گرمیوں کے مہینوں میں وہاں بڑی خوشگوار ٹھنڈک رہتی ہے اور جولائی اور اگست کی بارش کے بعد اس کا موسم اور زیادہ کیف آور ہو جاتا ہو۔ نینی تال کی آبادی اور شہرت میں ۱۸۴۲ء سے اضافہ شروع ہوا تھا یہاں تک کہ وہ حکومت اتر پردیش کا گرمائی مستقر بن گیا۔ نینی تال کی اہمیت کا اصل راز اس کی خوبصورتی میں مضمر ہے۔ نینی تال کی جھیل جس کے تین طرف پہاڑیاں ہیں اس مقام کو ایسا قدرتی حسن عطا کرتی ہو جو کشمیر کے علاوہ شاید کہیں اور نہ ملے۔ نینی تال کا نام بھی اس جھیل اور وہاں کے قدیم نینا دیوی کے مندر کے ناموں سے مل کر بنا ہے۔ دراصل نینی تال کا سارا علاقہ جھیلوں کا علاقہ ہے مثلاً سات تال، بھیم تال، لوکچیا تال، کھرپا تال، رام گڑھ وغیرہ۔ نینی تال جانے کے لئے کاٹھ گودام ریلوے اسٹیشن پر اترنا ہوتا ہے اور وہاں سے لوگ بذریعہ بس یا موٹر نینی تال تک جاتے ہیں۔ المورہ اتر پردیش کا ایک خوبصورت پہاڑی شہر ہونے کے علاوہ تاریخی حیثیت سے بڑی قدیم جگہ ہے۔ تاریخ بتاتی ہو کہ اس کا وجود چاند راجاؤں کے دور میں بھی پایا جاتا تھا۔ کسی شہر میں جو آسانیاں پائی مل سکتی ہیں وہ تمام سہولتیں یہاں ہمیشہ میسر ہوتی ہیں۔ اتر پردیش کے مشہور اور حسین پنڈاری آبشار تک پہنچنے کے لئے المورہ سے ہی جانا ہوتا ہو۔ المورہ اور نینی تال کے قریب رانی کھیت ہے جو سطح سمندر سے ۶۰۰۰ ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ رانی کھیت اپنے پھلوں کے باغات اور خوبصورت گھنے جنگلوں کے لئے بھی بہت مشہور ہے۔ یہاں سے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ چکراتا، مسوری سے ۴۰ میل اور دہرہ دون سے ۶۲ میل کے فاصلہ پر سطح سمندر سے تقریباً سات ہزار فٹ بلندی پر واقع ہو۔ لینس ڈاؤن پانچ چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک اور خوبصورت جگہ ہے اور اتری ریلوے کے کوٹ دوار اسٹیشن سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں سے لینس ڈاؤن تک موٹریں برابر آتی جاتی رہتی ہیں۔ ان مقامات کے علاوہ اتر پردیش کے پہاڑی علاقہ کا ہر حصہ اپنی اپنی جگہ پر فطرت کی گل کاری اور نقاشی کا ایک حسین شاہکار ہے اور اس علاقہ میں کہیں بھی پہنچ جائیے ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست۔ نیا دور کی اس اشاعت میں چند ایسے ہی پُر فضا اور دلکش مناظر کی کچھ تصویریں پیش کی جا رہی ہیں۔

— ایڈیٹر

غزل

نیا دور کو جنوری ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں ڈاکٹر سمپورنانند وزیر اعلیٰ اتر پردیش کی ایک طرحی غزل شائع کرنے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔ ذیل میں ہم ان کی ایک اور غزل انھیں کی تحریر میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ غزل انھوں نے ایک مشاعرہ میں جو اتر پردیش کے اراکین مجالس قانون ساز کے زیر اہتمام لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا پڑھی تھی اور ہماری درخواست پر نیا دور کو اشاعت کے لئے عنایت فرمائی ہے۔ (ایڈیٹر)

بیخود ہیں بیخودی کی سزا پا رہے ہیں ہم
مثل حباب بن کے مٹے جا رہے ہیں ہم

معبود کون؟ مشق عبادت یہ کس لئے
ناحق یہ بوجھ سر پہ لئے جا رہے ہیں ہم

واعظ شراب پینے دے ہم سے گلا نہ کر
ساقی پلا رہا ہے پئے جا رہے ہیں ہم

ہوگی تری گزر نہ کبھی جس دیار میں
زاہد وہیں نہ چھیڑ وہیں جا رہے ہیں ہم

آنند کے کرشمے سبھی سوز و ساز ہیں
ہر نے میں صوت غیب سنے جا رہے ہیں ہم

سمپورنانند

ڈاکٹر سمپورنانند لکھنؤ کے ایک مشاعرہ منعقدہ، مئی ۱۹۵۸ء میں اپنی غزل پڑھ رہے ہیں

بیخود ہیں بے خودی کی سزا پا رہے ہیں ہم
مثل حباب بن کے مٹے جا رہے ہیں ہم

معبود کون، مشق عبادت یہ کس لئے
ناحق یہ بوجھ سر پہ لئے جا رہے ہیں ہم

واعظ شراب پینے دے ہم سے گلا نہ کر
ساقی پلا رہا ہے پئے جا رہے ہیں ہم

ہوگی تری گزر نہ کبھی جس دیار میں
زاہد ہمیں نہ چھیڑ وہیں جا رہے ہیں ہم

آنند کے کرشمے سبھی سوز و ساز ہیں
ہر نے میں صوتِ غیب سُنے جا رہے ہیں ہم

سمپورنانند

لکھنوی شعراء کے قلمی اردو دیوان — کتب خانۂ نواب سالار جنگ میں — ۲

نصیر الدین ہاشمی

(۱۰) دیوان و قصائد اسیر

اسیرؔ کے دیوان کے تین نسخے اور قصائد کا ایک نسخہ اس کتب خانہ میں ہے۔ اُن کا پورا نام سید مظفر علی خاں، اسیرؔ تخلص اور تدبیر الدولہ مدبر جنگ خطاب تھا۔ قصبۂ امیٹھی کے رہنے والے تھے۔ باپ کا نام سید مدد علی تھا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم علمائے فرنگی محل سے حاصل کی۔ غلام ہمدانی مصحفیؔ کے شاگردوں میں شامل تھے مگر شاگردی کے تین سال بعد ہی مصحفی کا انتقال ہوگیا۔

نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں شاہی ملازمت میں شامل ہوئے۔ امجد علی شاہ کے زمانہ میں سررشتہ دار اور داروغہ جیل رہے۔ اس کے بعد آٹھ نو سال تک واجد علی شاہ کے مصاحب رہے۔ واجد علی شاہ نے خطابات سے سرفراز فرمایا تھا۔ ان کے کلام کو بھی آپ درست کرتے تھے۔ جب واجد علی شاہ کو معزول کرکے کلکتہ بھیج دیا گیا تو آپ کو نواب یوسف علی خاں والئ رامپور نے رامپور طلب کرکے اپنا استاد بنایا۔ بہت پُرگو تھے۔ بہ قول بعض چھ دیوان مرتب کئے تھے۔ سنہ ۱۲۹۹ھ (سنہ ۱۸۸۲ء) میں ۸۴ سال کی عمر میں رام پور میں انتقال ہوا۔ اسیرؔ کے شاگردوں میں امیرؔ مینائی، احمد علی شوقؔ اور واسطیؔ مشہور ہوئے۔

کتب خانۂ سالار جنگ میں اُن کے دیوان کے جو نسخے موجود ہیں ان میں پہلے نسخہ کا سائز "½ ۱۱ × "۷ اور صفحات ۵۱۵ ہیں۔ تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ دوسرے نسخہ کا سائز "۱۰ × ½ "۶ ہے اور صفحات ۳۰۸ ہیں۔ اس نسخہ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ خود مصنف نے اس کی تصحیح کی ہے۔ تیسرے نسخہ کا سائز "½ ۱۲ × "۸ ہے اور صفحات ۲۵۲۔ تاریخ کتابت سنہ ۱۲۸۸ھ ہے۔ ناقص الاول ہے۔ قصائد کا سائز "۱۰ × "۶ ہے اور صفحات ۲۶۴ ہیں۔

دیوان اسیرؔ کے پہلے نسخہ میں ردیف وار غزلیات کے بعد رباعیات قطعات اور مخمس شامل ہیں کئی تاریخی قطعات بھی ہیں جو بعض اصحاب کے انتقال وغیرہ سے متعلق ہیں۔ تاریخی قطعات سنہ ۱۲۹۱ھ تک شامل ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دیوان کی کتابت سنہ ۱۲۹۱ھ کے بعد ہوئی ہے۔ آغاز کلام اس طرح ہوتا ہے۔

بسم اللہ جادہ ہے رہِ معبود کا   قاری قرآں مسافر منزل مقصود کا
ہر بلا میں تھا وہی حامی، معاون، چارہ گر   نوح کا، ایوب کا، یعقوب کا، داؤد کا

یہ نسخہ اُن کے پانچویں دیوان کا ہے کیونکہ دیوان کے آخر میں اس کی صراحت موجود ہے۔

کتب خانہ ہذا کے دوسرے نسخہ میں ردیف وار غزلیات کے بعد چند تاریخی قطعات درج ہیں ان میں امجد علی شاہ کے انتقال اور واجد علی شاہ کے جلوس کی تاریخیں بھی شامل ہیں۔ یہ نسخہ ناقص الاول ہے۔ آغاز یہ ہے:

آئینہ چمکا یہ تیرے عکس سے   عاشق معشوق نما ہوگیا
آج ہے کچھ اور تھا کل اور کچھ   دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا

امجد علی شاہ کے وفات کے کئی تاریخی قطعے ملتے ہیں۔ ایک درج ذیل ہے۔

شاہ عادل، نیک طینت نیک خصلت، نیک خو
ترک دنیا کرد در دلہا نمایاں شد قلق
...... غیب پرسیدم چو تاریخ وفات
گفت شد امجد علی جنت مکاں واصل بحق
(۱۲۶۳ھ)

اگرچہ تاریخ کتابت درج نہیں ہے مگر چونکہ اس میں تمام تاریخیں سنہ ۱۲۶۳ھ سے متعلق ہیں اس لئے اسی سن کو تاریخ کتابت تصور کرنا چاہیئے۔

تیسرا نسخہ سنہ ۱۲۸۸ھ میں لکھا گیا ہے افسوس ہے کہ یہ بھی ناقص الاول ہے۔ ایک آدھ صفحہ نہیں ہے۔ اس کا آغاز یہ ہے۔

نکلا زبان غیب سے اوّل جو لفظ کن   دو ٹکڑے ہوکے کاف کرِ نون دہن ہوا

یا سب اپنے بھی ہو گئے گلیں لحد سے ہم — تختہ پڑے پڑے تہ تربت بدن ہوا

اس دیوان میں ردیف وار غزلیات کے علاوہ رباعیات، تاریخی قطعے مخمس اور ترجیع بند شامل ہیں۔ اس دیوان کی خصوصیت یہ ہے کہ خود اسیر نے اس کو دیکھ کر تصحیح کی ہے۔ حاشیہ پر کلام کا اضافہ کیا ہے، اشعار میں ترمیم کی ہے، شعر قلمزد کر کے دوسرے لکھے ہیں۔ خاتمہ پر اسیر کے دستخط بھی موجود ہیں یعنی "حقیر سید مظفر علی خاں اسیر" درج ہے اور سنہ ۱۲۸۹ھ درج ہے۔

دیوان کلب علی خاں کے مدحیہ ترجیع بند پر ختم ہوتا ہے۔ اس کا آخری بند یہ ہے۔

اوس کا نظیر دہر میں کوئی نہیں اسیر — رحمت سے فیض یاب ہیں طفل و جوان و پیر
دست خدا کی طرح ضعیفوں کا دستگیر — آیا فقیر در پہ اگر، ہو گیا امیر

گر لعل احمر است دگر بے بہا در است
رشحے ز فیض کلب علی خاں بہادر است

کلام اسیر پر کام کرنے والوں کے لئے اس دیوان سے بہت کچھ مدد ملے گی۔

اسیر کے قصائد چودہ معصومین کی شان میں لکھے گئے ہیں۔ علاوہ قصائد کے مجموعہ میں قطعات اور رباعیات بھی ہیں۔ آخر میں ایک طویل مخمس اور ایک مسدس درج ہے۔ قصائد بھی ردیف وار ہیں۔ آغاز اس طرح ہوا ہے۔

کہہ کے بسم اللہ لکھیئے وصف ایسے شاہ کا — یہ بسم اللہ بھی جادہ ہے جس کی راہ کا
میکدۂ قرآں ہے مجھ میخوار عالی جاہ کا — ہے مزہ منہ میں کباب مرغ بسم اللہ کا

قطعات میں تین قطعات حضرت فاطمہؑ حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت امام زین العابدین وغیرہ کے وفات کے متعلق ہیں۔ کئی قطعات فارسی میں ہیں۔ اس نسخہ کا اختتام ایک مسدس پر ہوا ہے جس کا آخری بند یہ ہے۔

دیکھیئے صدموں سے حیراں ہے اسیر — دیر سے خاطر پریشاں ہے اسیر
گو اسیر کنج زنداں ہے اسیر — آپ کا اب بھی ثناخواں ہے اسیر

آیئے حاجت روائی کیجئے
یا علی مشکل کشائی کیجئے

(۱۱) دیوان قمر

مرزا قمر الدین احمد خاں نام قمر تخلص تھا افتخار الدولہ خطاب تھا۔ حاجی کے لقب سے مشہور تھے۔ لکھنؤ وطن تھا۔ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ غازی الدین حیدر کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ان کے باپ مرزا فخر الدین احمد خاں عرف مرزا محمد جعفر تھے جو آصف الدولہ وزیر الملک شاہ اودھ کے برادر نسبتی تھے۔

قمر کا دیوان نہایت ضخیم ہے۔ "۱۲ × ½۸ سائز کے ۴۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیوان کے پہلے صفحہ پر اقتدار الدولہ، محتشم الملک، مہدی علی خاں ضیغم جنگ کی مہر ثبت ہے اور آخری صفحہ پر چار مہریں ہیں۔ ایک پر شیخ مرزا محمد حیات ثبت ہے اور ایک پر "یا حافظ" ثبت ہے۔ دو مہریں پڑھی نہیں جاتیں۔

دیوان میں ردیف وار غزلیات ہیں۔ ہر ردیف کے بعد جگہ چھوڑی گئی ہے۔ آخر میں ایک مخمس اور ایک واسوخت بھی شامل ہے۔ نمونہ کلام پیش ہے:

وصف اوس کا لکھے یا کرے کچھ قصد بیاں کا
طاقت نہ قلم کی ہے نہ مقدور زباں کا
جو حق ہے سمجھنے کا اوسے کیا کوئی سمجھے
کب پہنچے ہے واں وہم و گماں وہم و گماں کا

غم کھانے سے جیتا ہے یہ بیمار تمہارا — کچھ غم کے سوا اس سے تو کھایا نہیں جاتا
جو وہ حاجت روائے عاشقاں ہے — میری حاجت روائی ہو چکی بس
کس کے خرام ناز کا پہنچا ہے تو دھیان — کبک دری نے چھوڑ دیا کوہسار کیوں
نہیں معلوم ہوتا کس کو کہتے ہیں کہ اے یار د
مجھے تو شغل بیداری جو آگے تھا سو اب بھی ہے
خون دل عاشق ہے کہ یہ رنگ حنا ہے — تو اپنے کف پا میں ذرا دیکھ تو کیا ہے
وقت سحر باغ میں کھولے جو بند قبا — ماج لیا صبح سے اوس کے تن پاک نے

(۱۲) دیوان تنویر

سید کاظم نام تنویر تخلص۔ میر اکبر علی مقبول کے فرزند۔ مرثیہ گوئی میں نام آوری حاصل کی۔ فیض آباد کے متوطن تھے۔ سرکار اودھ میں داروغہ کی خدمت پر سرفراز تھے مگر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کس سررشتہ سے متعلق تھے۔ رشک لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کے کلام کے دو نسخے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ایک دیوان کا سائز "۹ × "۶ اور صفحات ۲۶۶ ہیں۔ کتابت کی تاریخ ۱۲۸۴ھ ہے۔

یہ دیوان ناقص الاول ہے۔ پہلے دو صفحے نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ

بعد باقی اوراق کرم خوردہ بھی ہیں۔ دیوان میں ردیف وار غزلیات ہیں۔ ان کے بعد مخمس۔ ممکن ہے کہ یہ مصنف کا اصلی نسخہ ہو کیونکہ کاٹ چھانٹ موجود ہونے کے علاوہ ہر ردیف کے بعد جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اکثر غزلوں کے ساتھ "دیدہ شد" کی صراحت بھی کی گئی ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یا تو مصنف نے خود دوبارہ دیکھا ہے یا ان کے استاد نے دیکھا ہے۔ دیوان میں ایک جگہ سنہ ۱۲۶۲ھ، ایک جگہ سنہ ۱۲۷۳ھ اور تیسری جگہ سنہ ۱۲۷۶ھ درج ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیوان کی ترتیب کئی سال میں ہوئی ہے۔ شروع کا ایک شعر ہے ؎

بجھا کے زہر میں دیجئے فتیلۂ مرہم — چراغ دیدۂ زخم جگر نہیں دیکھا

دیوان کے اختتام پر کسی شاعر متخلص بہ ضیا کا تاریخی قطعہ بھی درج ہے جس کا پہلا شعر پڑھا نہیں جاتا۔ دوسرا شعر ہے۔

ضیا بہر اتمام تاریخ گفتم — قوانین اشعار پُرنور گویا
۱۲۸۴ھ

تنویر کے کلام کا دوسرا نسخہ ۹ x ۶ سائز کے ۳۶۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نسخہ کی کتابت سنہ ۱۲۸۴ھ میں ہوئی ہے۔ اس مجموعہ میں ایک مثنوی اور باقی مرثیے ہیں۔ چند قصائد بھی شامل ہیں۔ آغاز کا ایک شعر ہے۔

ہے کدھر اے ساقیِ وحدت نما — دے مے گلگوں تحمید و ثنا

(۱۳) قصیدہ انس

میر مہر علی نام اور انس تخلص۔ میر مستحسن خلیق کے فرزند اور میر حسن صاحب سحرالبیان کے پوتے۔ انیس کے بھائی تھے اور اُن کی طرح یہ بھی مرثیے لکھا کرتے اور حیدرآباد میں مجلس عزا کے لئے آتے رہتے تھے۔ زیر بحث قصیدہ مختارالملک سالار جنگ اول کی مدح میں ہے اور کافی طویل ہے۔ اُسے سنہ ۱۲۹۸ھ (سنہ ۱۸۸۱ء) میں پیش کیا گیا تھا۔ آغاز یہ ہے۔

رقم کر اے قلم حمدِ الٰہی — کہ مٹ جائے گناہوں کی سیاہی
لکھوں جس پر ثنائے حق تعالے — وہی کاغذ ہے جنت کا قبالہ

قصیدہ میں اولاً حمد ہے، پھر نعت، اس کے بعد منقبت حضرت علی اور اس کے بعد ساقی نامہ ہے۔ پھر مختارالملک کی مدح۔ ساقی نامہ کا آغاز یہ ہے۔

پلا ساقی شراب حوض کوثر — کہ ہو جائے رواں طبع سخنور

کچھ اور اشعار یہ ہیں ؎

بنا اتش منحصر بر کار ملک است — بصد نظم و نسق مختار ملک است

اہم ہے مدح مخدوم فلک فر — ثنا دریا کی ہو قطرے سے کیونکر

اس سلسلہ میں ممدوح کے عدل اور انصاف کی تعریف، شجاعت، صفت اصطبل، وصف قصر، سخاوت کے بعد دعا پر قصیدہ ختم ہوتا ہے۔

(۱۴) قصیدہ شیفتہ

میر سرفراز علی خاں شیفتہ امیر کے شاگرد تھے۔ یہ قصیدہ نواب مختارالملک سالار جنگ اول کی مدح میں کہا گیا ہے۔ دو مطلعے ہیں۔ آغاز اس طرح ہوا ہے ؎

یہ انقلاب زمانہ سے ہے تغیر حال — کہ رخت زیست ہوا ہے ہر اک مدن کو وبال
چراغ دہر میں کوڑے کا لال تھا مشہور — سو بے تمیزی سے ہے مثل لعل لالوں لال

دوسرا مطلع ہے ؎

بڑھائے عمر زمانہ جو وہ بلند اقبال — ہزار ماہ کا ہو ماہ لاکھ سال کا سال

اور اختتام اس پر ہوا ہے ؎

ہیں جب تلک مہ و خورشید چرخ پر قائم — رہے ہمیشہ درخشندہ اختر اجلال
تمام اہل زمانہ ہوں تابع فرماں — یہی مدام رہے حاکم جنوب و شمال

(۱۵) قصیدہ سید غلام حسین قدر بلگرامی

یہ قصیدہ نواب میر لایق علی خاں عمادالسلطنت مختارالملک ثانی کی مدح میں لکھا گیا ہے۔ قدر بلگرام کے مردم خیز خطے سے تعلق رکھتے تھے۔ چار استادوں سے انھوں نے تلمذ حاصل کیا چنانچہ کہتے ہیں۔

سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند — پھر غالب و تجر نے بتائے پیوند
مجھ سا بھی زمانے میں ہوگا اے قدر — بدنام کنندۂ نکو نامے چند

آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

تر رہا محتسب قاضی و مفتی کا خطر — ہے برانڈی کہیں شمپین کہیں بوتل بیئر
کہیں زاہد ہے کہیں شیخ کہیں اعظم مست — خانقہ سونی ہے محراب تہی خم منبر

گریز ہے۔

لیجیے پہنچ کے حضور جاؤں مثال آصف — اوس کا مداح بنوں ہے جو سلیماں منظر
وہ سلیماں ہے نواب منیرالدولہ — میر لایق علی و لایق و ذی فہم و ہنر
خود سخی ابن سخی، باپ وزیر آپ وزیر — میر عالم کے گھرانے میں بڑا نام آور

قدر نے نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کی مدح میں بھی ایک قصیدہ بمقام کلکتہ گزرانا تھا۔ اس کے صلہ میں چار سو روپیہ ماہوار مقرر

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۱ پر)

قدیم ہندوستان میں لباس اور آداب

سید سامی حسن نقوی

جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان کو برصغیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں کے مختلف حصوں کی آب و ہوا یکساں نہیں ہے اور رہنے والوں کے عادات و اطوار، لباس رہن سہن، زبان، آداب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہاں تین مہینہ مسلسل سڑی ہوئی گرمی پڑتی ہے اور اس کے فوراً بعد برسات شروع ہو جاتی ہے۔ ان موسمی حالات میں ظاہر ہے اہلِ ہند کا لباس اہلِ خراسان و خوارزم جیسا نہیں ہو سکتا جو اپنے جسم کو سخت سردی کے سبب موٹے موٹے اونی کپڑوں میں لپیٹے رہتے ہیں۔ اس لیے آج کل کی طرح قدیم ہندوستان میں بھی لوگ زیادہ تر گھٹنوں کے اوپر تک دھوتی باندھتے تھے اور جسم کے باقی حصہ کو سخت گرمی کے باعث کھلا ہوا رکھتے تھے۔ لیکن یہی لوگ سردی میں موٹے موٹے کپڑے بھی پہنتے تھے۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کے قدیم باشندے سینے پرونے کے فن سے ناواقف نہیں تھے۔

بعض عالموں کا خیال ہے کہ سینے پرونے کا فن ہندوستان میں راجہ ہرش وردھن کے زمانہ سے پہلے ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اپنے دعوے کی تائید میں یہ لوگ ہیون سانگ کا ایک قول نقل کرتے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ ہندوستان کے لوگ بہت قدیم زمانہ میں سینے پرونے کے فن سے واقف تھے اور وضع وضع کے کپڑے پہنتے تھے جس کی تفصیل مختصراً ذیل میں پیش کی جائے گی۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سوئی (سوچی یا سیتی) کا لفظ ویدوں اور براہمن گرنتھوں میں استعمال ہوا ہے۔ رگ وید میں قینچی کو "بھورج" کہا گیا ہے۔ ویدوں میں چمڑے کے تھیلوں کا بھی ذکر ملتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت لوگ نہ صرف کپڑے کو بلکہ چمڑے کو بھی سینا جانتے تھے جو یقیناً ایک مشکل کام تھا۔ "تیتریہ براہمنوں"[1] میں تین قسم کی سوئیوں کا ذکر ملتا ہے جو لوہے، چاندی، یا سونے کی بنائی جاتی تھیں۔ سشروت سمھتا[2] میں باریک دھاگے سے سینے پرونے کا تذکرہ ملتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ریشمی کپڑے کو لوگ "تارپیہ" اور اونی کپڑے کو "شمول" کہتے تھے۔ "دراپی" بھی ایک سلا ہوا کپڑا ہوتا تھا جسے خاص طور پر جنگ میں پہنا جاتا تھا۔ کالی داس[3] کے ڈراموں میں مختلف قسم کی ایسی

---

[1] یجر وید کے تین حصے ہیں: سمھتا، براہمن اور اپنشد۔ براہمنوں کے بھی دو جز ہیں۔ تیتریہ براہمن اور ست پاٹھ براہمن [2] سشروت چوتھی صدی عیسوی کے ایک عالم ہیں جنھوں نے فن طب پر سام حب تصنیف کی۔ [3] شکنتلا کے مشہور مصنف، کالی داس کے زمانہ کا تعین اب تک صحیح صحیح نہیں ہو سکا ہے اور ہم کالی داس کی زندگی اور دیگر تفصیلات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ روایت بتاتی ہے کہ وہ اجینی کے راجہ وکرما دتیہ کے دربار کا ایک رتن تھا اس راجہ نے وکرم سمبت کی ۵۸ ق م میں بنیاد رکھی۔ بعض لوگ پانچویں صدی عیسوی کو کالی داس کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں۔

پوشاکوں کا ذکر ملتا ہے جن پر کشیدہ کاری کی جاتی تھی۔

چوتھی صدی قبل مسیح کے حالات ہمیں میگستھنیز[1] کی اِنڈیکا سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سیلوکس نکیٹر کا سفیر تھا جسے کئی سال چندر گپت موریہ کے دربار میں رہنے کا موقع ملا۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ زیب و زینت اور آرائش کے عاشق ہیں۔ ان کی پوشاک ہیرے جواہرات سے آراستہ ہوتی ہے اور وہ نفیس ترین ململ کی چھینٹیں استعمال کرتے ہیں۔ لوگوں کی روزمرہ زندگی کے بارے میں اس نے ہمیں بڑی دلچسپ باتیں بتائی ہیں۔ عام طور پر "شریفانہ سادگی" اسے ہندوستانیوں کی نمایاں خصوصیت معلوم ہوئی۔ ویدک عہد کے لوگوں کی طرح اس نے لکھا ہے یہ لوگ بھی ایک چادر اوڑھتے تھے جو پنڈلیوں تک پہنچتی تھی۔ دوسری چادر کندھوں پر ڈالتے اور تیسری سر پر لپیٹتے تھے اُن کے لباس نہایت شوخ رنگوں سے رنگے جاتے تھے۔ وہ اپنی داڑھیاں بھی رنگتے تھے۔ شوخ رنگوں کو پسند کرنا اہل ہند کی ہمیشہ نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ گرمی کے موسم میں چھتری کے ذریعہ وہ اپنی حفاظت کرتے تھے۔ امیر اور کھاتے پیتے لوگ کان میں ہاتھی دانت کی دُریاں اور طلائی زیورات پہنتے تھے اور ململ کی چھینٹیں اور سفید چمڑے کے بنے ہوئے اونچی ایڑی کے جوتے جنھیں بڑے سلیقہ سے سجایا جاتا تھا استعمال کرتے تھے۔

بدھ مذہب کی مقدس کتاب دھمنا پیٹک[2] میں مختلف قسم کے جوتوں کی ایک طویل فہرست مندرج ہے جو اس وقت لوگ استعمال کرتے تھے۔ اس میں لکھا ہے کہ لوگ طرح طرح کے سلیپر نیلے، پیلے سرخ بھورے، کالے، نارنگی اور سیکڑوں قسم کے جوتے، جن کے کنارے انھیں رنگوں سے رنگے جاتے تھے استعمال کرتے تھے۔ کناروں میں کئی کئی رنگ کی پٹیاں ڈالی جاتی تھیں۔ ان جوتوں کو شیر، چیتے، تیندوے ہرن، بلی، گلہری اور الو کی کھالوں سے سجایا جاتا تھا۔ گوٹے اور لیس کے کام کے جوتے پہنے جاتے تھے جن پر سوئی کام کی پٹیاں ٹکی ہوتی تھیں۔ اسکے علاوہ دوسرے مختلف رنگوں اور نمونوں کے جوتے پہنے جاتے تھے جو تیتر کے پروں سے مشابہ ہوتے تھے اور جنھیں مینڈھے یا بکرے کے سے سینگ باہر کو نکلے ہوتے تھے۔ انھیں بچھو کی پونچ سے سجایا جاتا تھا، اور اُن میں چاروں طرف مور کے پر ٹکے ہوتے تھے۔ اون کے بنے ہوئے جوتے بھی لوگ پہنتے تھے جن پر بلور، موتی یا فیروزے ٹکے ہوتے تھے یا سونے، چاندی، شیشہ، ٹین، سیسہ اور پیتل وغیرہ کا کام بنا ہوتا تھا۔ ان میں سے بعض ہیرا جڑاؤ بھی ہوتے تھے۔

عیسوی سن کی پہلی اور دوسری صدیوں میں ہندوستان میں یوہچی قوم نے اپنی حکومت قائم کی۔ راجہ کنشک اسی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس زمانہ میں لوگ عام رواج کے مطابق ایک چادر کمر تک لپیٹتے تھے اور دوسری کاندھوں پر ڈالتے تھے۔ خاص خاص موقعوں پر سر پر ایک پگڑی بھی باندھتے تھے۔ اس عہد کے سکوں پر جو تصویر بنی ہے اس سے اس زمانہ کے لباس پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یوہچی لوگ پاجامہ، کوٹ، اور جوتا پہنتے تھے لیکن عام لوگ سلے ہوئے کپڑے پہننا خلاف مذہب سمجھتے تھے۔

دریائے جمنا کے کنارے الہ آباد کے پاس کنور نامی گاؤں میں مہاتما بدھ کا ایک مجسمہ دستیاب ہوا ہے جو ۱۳۹ء کا شاہکار ہے۔ اس میں بدھ جی ایک سادہ سا کنٹوپ اوڑھے بیٹھے ہیں جس کے لمبے لمبے کان دونوں طرف لٹکے ہوئے ہیں۔ ان کا دھڑ ننگا ہے اور کمر میں ایک لنگی ہے جو ٹخنوں تک پہنچ رہی ہے۔ الہ آباد ہی کے ضلع میں کوشامبی نامی مقام پر شیو جی اور پاروتی کا ایک دوسرا مجسمہ دستیاب ہوا ہے جس میں دیوی کے سر پر بعض ڈچ عورتوں جیسا ایک بھاری بھرکم ٹوپ ہے۔ اس میں ترچھی کلغی لگی ہے جو سر کے آگے کو نکل گئی ہے اور جس کے سرے دونوں

---

[1] یونانی سفیر جس کی اصل کتاب تو ضائع ہو گئی ہے لیکن بعد کے لاطینی اور یونانی مورخوں نے اس کے اقتباسات اپنی کتابوں میں جا بجا نقل کئے ہیں۔

[2] بمعنی قانون۔ سنہ ۲۵۰ ق م سے پہلے کی تصنیف ہے جس میں تین فصلیں ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام کھنڈک ہے جس میں لباس پہننے، تپ کرنے، جوتا پہننے اور اسی قسم کے دیگر مسائل کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

...پرے سے ...زیور ختم ہوتے ہیں۔ اس کے بیچ میں ایک لمبا ... ہے۔ ... بھاری بھرکم زیور کانوں میں اور موٹے موٹے کڑے ہاتھوں میں بھی پہنے ہے۔

اجنتا کی نقاشیاں جن میں سے بیشتر سنہ ... اور سنہ ۶۴۲ء کے درمیان کی تخلیق ہیں اس عہد کے لباس پر بڑی مفید اور کارآمد روشنی ڈالتی ہیں۔ اجنتا کی تصویروں میں ناچ کی ایک تصویر ہے جس میں کئی ناچنے والی عورتیں دکھائی گئی ہیں۔ یہ عورتیں لہراتی ہوئی ساریوں کے نیچے دھاری دار پاجامے اور انگیا یا کرتی پہنے ہیں جن میں سے بعض کی آستینیں منڈھی ہیں اور بعض کی پوری۔ جو عورتیں مردنگ بجاتی ہوئی پیش کی گئی ہیں ان میں سے کچھ پورا لباس پہنے ہیں اور کچھ نیم عریاں حالت میں ہیں۔

اجنتا کی ایک دوسری تصویر سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورتیں مختلف قسم کی چھینٹوں کے کپڑے پہنتی تھیں اور ان کی انگیا کمر تک آتی تھی جس کی آستینیں منڈھی ہوتی تھیں۔ یہ بات ہمیں سیاہ فام عورت کی اس تصویر سے ظاہر ہوتی جس میں وہ گود میں ایک بچہ کو لئے کھڑی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ نوکرانیاں عام طور پر انگیا پہنتی تھیں۔ اس کے برخلاف گھر کی مالکائیں کمر تک جسم کو یا تو برہنہ رکھتی تھیں یا پھر ساری میں ملبوس رہتی تھیں اور کانوں میں بُندیاں، گردن میں موتیوں اور ہیروں کی کنٹھ مالا اور ہاتھوں میں پہنچیاں اور کڑے پہنے رہتی تھیں۔

بانڑ بھٹ[1] نے جو تصویر اپنی کتاب میں اپنے زمانہ کے ہندوستان کی کھینچی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھتری عام طور پر لمبی لمبی ڈاڑھیاں رکھتے تھے۔ بانڑ نے اپنی کتاب میں کڑھائی کے خوبصورت ڈیزائنوں کا بھی ذکر کیا ہے جو مختلف قسم کے کپڑوں پر اس زمانہ میں بنائے جاتے تھے۔

ہیون سانگ نے ہندوستان کے لباس کی بڑی دلچسپ اور اہم تفصیل اپنے سفرنامہ میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے: "راجہ اور امراء سب زیورات استعمال کرتے ہیں۔ موتیوں کی مالائیں، سونے چاندی کی انگوٹھیاں، کڑے، کانوں میں بُندیاں اور کنڈل پہننے کا رواج عام ہے۔" ہندوستانیوں کے عادات و اطوار کا ذکر کرتے ہوئے ہیون سانگ

لکھتا ہے: "یہ لوگ چٹائیوں پر بیٹھتے اٹھتے اور سوتے ہیں۔ شاہی خاندان کے افراد، سرکاری افسروں اور بڑے آدمیوں کی چٹائیاں بیاکش میں تو اتنی ہی ہوتی ہیں لیکن بہت آراستہ پیراستہ ہوتی ہیں۔ ان کے کپڑے باقاعدہ تراشے نہیں جاتے۔ اکثر و بیشتر یہ لوگ نئے اور سفید کپڑے زیب تن کرتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے کپڑوں اور زیورات کو یہ لوگ پسند نہیں کرتے۔ مرد اپنی دھوتی کو کمر سے باندھ لیتے ہیں اور باقی کو بغل میں سمیٹ کر جسم کے داہنے طرف لٹکا لیتے ہیں۔ عورتوں کا لباس عموماً زمین میں گھسٹتا رہتا ہے۔ وہ اپنے کاندھوں کو مکمل طور پر ڈھکے رہتی ہیں۔ لوگ سر پر ٹوپی کلغی پہنتے ہیں جنہیں پھولوں کے ہار اور ہیروں کے کنٹھے ٹکے رہتے ہیں۔"

بدھ مذہب کے علاوہ دیگر لوگوں کے بارے میں وہ کہتا ہے: "ان کے کپڑے ریشمی، سوتی اور اونی ہوتے ہیں۔ بعض لوگ مور کے پر زینت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بعض گلے میں ہڈیوں سے بنی ہوئی مالا پہنتے ہیں۔ کچھ لوگ سر سے کوئی کپڑا استعمال نہیں کرتے اور ننگے سر رہتے ہیں لیکن کچھ درختوں کی چھال اور پتوں سے جسم کو ڈھکتے ہیں۔ بعض لوگ بڑی گھنی مونچھیں رکھتے ہیں اور سر کے بالوں کو اوپر ایک مقام پر سمیٹ کر جوڑے کی صورت میں باندھ لیتے ہیں۔"

"چھتری اور برہمن بہت صاف ستھرا لباس پہنتے ہیں اور نہایت سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ عام لوگ بھی صفائی کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ کھانا کھانے سے پہلے ہر شخص اشنان کرتا ہے۔ یہ لوگ بچا ہوا کھانا بالکل نہیں کھاتے۔ ایک دوسرے کا برتن بالکل استعمال نہیں کرتے۔ کھانا کھانے کے بعد دانتوں کو مسواک سے صاف کرتے ہیں اور ہاتھ منہ دھوتے ہیں۔ جب تک ان باتوں سے فارغ نہیں ہوتے اس وقت تک ایک دوسرے کو چھوتے تک نہیں۔ حوائج ضروری سے فراغت کے بعد بھی وہ اپنے بدن کو دھوتے ہیں اور صندل اور زعفران کی خوشبو لگاتے ہیں۔ جب راجہ غسل کرتا ہے تو ڈھول بجاتے ہیں اور ڈھول کی تال پر خدا کی حمد و ثنا کی نظمیں گاتے ہیں۔ پوجا پاٹ کرنے سے پہلے بھی یہ لوگ ہاتھ منہ دھوتے

---

[1] راجہ ہرش وردھن کی سوانح حیات 'ہرش چرت' کا مشہور مصنف

بہروپ نگر

اُمید ذباشوی

یہ تو روپ کا بازار یہ بہروپ نگر
یہ تجلیّ کی دُوکانوں پہ سسکتے زیور
اُف یہ تاریک اُجالے یہ شبِ آثارِ سحر

عشق کے نام سے بیوپار یہاں ہوتا ہے
غنچے کا روپ لیے خار یہاں ہوتا ہے

جلوہ ہر رنگ میں خود عام یہاں ہوتا ہے
حُسنِ معصوم کا نیلام یہاں ہوتا ہے
عشق کا نام بھی بدنام یہاں ہوتا ہے

چند سکّوں کے لیے جسم یہاں بکتا ہے
بنتِ مریم کے تقدس کا جہاں بکتا ہے

زندہ لاشوں کی یہ بستی یہ جوانی کے کفن
اُف یہ بے باک ادائیں یہ حیا سوز چلن
عصمتوں کے یہ مقابر یہ وفا کے مدفن

ظلمتِ شب یہاں کہلاتی ہے تنویرِ سحر
یہاں نیلام پہ چڑھ جاتی ہے ساقی کی نظر

اُف یہ گہنائے ہوئے چاند یہ پژمردہ گلاب
یہ جوانی کے طلسمات محبت کے سراب
اُف یہ آوارہ تمنائیں یہ گم راہ شباب

حُسن خود دعوتِ نظّارہ یہاں دیتا ہے
جلوہ گستاخ نگاہوں کو اماں دیتا ہے

اُف یہ کمہلائی ہوئی زرد جبیں یہ میسوں کا دیار
اُف یہ کمہلائے ہوئے غنچے سرِ راہ گزار
اُف یہ خود "اپنے ہی" ذوقِ طرب آگیں کا شکار

یہی وہ شمعیں جو تنویر سے بیگانہ ہیں
یہ ہیں وہ خواب جو تعبیر سے بیگانہ ہیں

زر کسوٹی ہے یہاں عشق و محبت کے لیے
وقف ہیں جلوے یہاں کورِ بصیرت کے لیے
ایک منڈی ہے یہ جسموں کی تجارت کے لیے

جُرم ہے نام یہاں لیسنا وفاداری کا
سکّہ ہر وقت یہاں چلتا ہے عیاری کا

کفر و ایماں کے لیے طنز ہے ان کا کردار
اُف یہ ابلیس کی تخئیل کے رنگین شہکار
اُف یہ خالق سے بغاوت کے انوکھے ہتیار

حُسن کے نام کی رسوائی یہاں ہوتی ہے
جو تجلّی ہے وہ ہرجائی یہاں ہوتی ہے

اُف یہ بکتے ہوئے جذبات سرِ راہ گزر
یہ جراثیم کے گودام یہ امراض کے گھر
ہر نئی شب لیے یہاں زہرِ تازہ کا سفر

یہ ہیں وہ راہیں جو منزل کو بھلا دیتی ہیں
نقشِ الفت کا اُبھرتے ہی مٹا دیتی ہیں

رہِ عشق، محبت نہیں ملتی ہے یہاں
نقدِ دل کی کوئی قیمت نہیں ملتی ہے یہاں
گل کو ہنسنے کی اجازت نہیں ملتی ہے یہاں

زر کی جھنکار میں گھنگرو یہاں کھو جاتے ہیں
نغمے پابند یہاں حرص کے ہو جاتے ہیں

لیکن اس سب کے خطاوار ہیں یہ رسم و رواج
ایسے ماحول کا خالق ہے حقیقت میں سماج
دیتے ہیں شیخ و برہمن بھی یہاں آکے خراج

اِن خرابات کو سرمایہ اماں دیتا ہے
مکر کے تیروں کو یہ اپنی کماں دیتا ہے

رمزیہ اور اُردو ادب

سلام سندیلوی

رمزیہ ایک صنفِ سخن کا نام ہے جس کو انگریزی میں "الیگری" (Allegory) کہتے ہیں۔ رمزیہ میں تین خصوصیتوں کا ہونا ضروری ہے۔ پہلی خصوصیت رمزیہ کی یہ ہے کہ اس میں غیر مرئی خیال کو مرئی شے اور غیر ناطق کو ناطق تصور کر لیا جاتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایسی چیزوں کا ذکر ایک افسانوی انداز میں کیا جاتا ہے۔ تیسری اہم خصوصیت رمزیہ کی یہ ہوتی ہے کہ اس افسانہ سے کوئی اخلاقی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہو۔

اس لحاظ سے داستان اور رمزیہ میں فرق ہے۔ داستان میں صرف کسی قصہ کو دلچسپ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس قصہ میں ضعیف الاعتقادی کے بھی عناصر شامل رہتے ہیں۔ عموماً دیو پری کی باتوں پر داستان کی بنیاد ہوتی ہے۔ جادو اور ساحروں کا ذکر مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ لیکن کبھی داستان کو اس مقصد سے نہیں لکھا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے ناظرین کو کوئی اخلاقی درس دیا جائے۔ داستان کا مقصد صرف ناظرین کی دلچسپی کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ داستان گوئی کا رواج زیادہ تر بادشاہوں، راجاؤں، رئیسوں اور امیروں کا دل بہلانے کے لئے ہوا اور الف لیلہ۔ داستان امیر حمزہ۔ بوستان خیال وغیرہ کو اس زمرہ میں شامل کیا جا سکتا ہے

داستان کے برخلاف رمزیہ میں مصنف کی نظر میں اخلاقی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ درس، سبق اور نصائح اگر براہ راست پیش کئے جائیں تو زیادہ کارگر نہیں ہوتے ہیں۔ اس لئے رمزیہ کا مصنف ان کو کہانی کا روپ دیتا ہے۔ انسان ابتدا ہی سے کہانی کہنے اور کہانی سننے کا عادی رہا ہے چنانچہ مصنف جب اپنی بات کو کہانی کے انداز میں پیش کرتا ہو تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ناظرین اس رمزیہ سے حسب دل خواہ اثر قبول کر سکیں۔ اس لحاظ سے رمزیہ داستان سے جدا ہے۔ جہاں تک دونوں میں مماثلت کا تعلق ہے وہ صرف ایک بات میں ہے۔ رمزیہ اور داستان دونوں میں ضعیف الاعتقادی کے عناصر شامل رہتے ہیں اگرچہ دونوں کی ضعیف الاعتقادی کے مقصد میں فرق ہوتا ہے۔

رمزیہ نگاری ہم کو مختلف اصناف سخن میں ملتی ہے۔ اس کا وجود نظم اور نثر دونوں میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ رمزیہ ناول بھی لکھے گئے ہیں، رمزیہ ڈراموں کی بھی تخلیق کی گئی ہے، رمزیہ مضامین پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے اور رمزیہ نظموں کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ رمزیہ ہم کو ادب میں مختلف انداز میں ملتا ہے۔ رمزیہ کے سلسلہ میں یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ رمزیہ ہم کو دُنیا کے تقریباً ہر ادب میں ملتا ہے۔ سنسکرت میں جس کا شمار دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں کیا جاتا ہے، رمزیہ ادب کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ سنسکرت کی مشہور رمزیہ تخلیق کلیلہ دمنہ ہے جس کا مصنف وشنو شرما کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب غالباً راجہ ہرش وردھن کے آخری دور میں لکھی گئی ہے[1]۔ کلیلہ دمنہ سنسکرت

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ کلیلہ دمنہ کے مصنف اور زمانۂ تصنیف کے بارے میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس لئے یقینی طور پر اس کے مصنف کا نام اور اس کے زمانۂ تصنیف کا فیصلہ کرنا ایک اہم کام ہے۔ پہلوی ادب میں کلیلہ دمنہ کے مصنف کا نام حکیم بید پائے بتایا گیا ہے۔ مگر سنسکرت ادب میں وشنو شرما کا نام اس کے مصنف کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔

ادب میں رمزیہ کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس میں ایک برہمن ایک راجا کو ناصحانہ انداز میں کہانیاں سناتا ہے۔ ایک کہانی سے دوسری کہانی پیدا ہوتی ہے اور یہ سلسلہ بڑی دور تک چلا جاتا ہے۔ برہمن اپنے نصائح کو حیوانوں کی زبان میں پیش کرتا ہے۔ اس میں شیر کو بادشاہ تسلیم کیا گیا ہے۔ کلیلہ دمنہ "دو گیدڑ" اس کے مصاحبین میں سے ہیں۔ کلیلہ ذہین اور نیک طینت ہے۔ دمنہ چالاک اور بد اندیش ہے۔ وہ شیر سے ایک بیل کی غیبت کرتا ہے اور اس کو قتل کروا دیتا ہے مگر آخر میں خود بھی شیر کا شکار ہو جاتا ہے۔ قابل مصنف نے ہم کو کلیلہ دمنہ کے قصہ کے ذریعہ سے یہ سبق دیا ہے کہ کسی شخص کو کسی کے ساتھ بدی نہ کرنا چاہئیے اور یہی رمزیہ نگاری کا مقصد بھی ہے۔ کلیلہ دمنہ کا ترجمہ پہلوی زبان میں بھی ہوا۔ پہلوی زبان سے اس کا ترجمہ ابن المقفع (وفات ۷۵۶ء) نے عربی زبان میں کیا۔ یہ کتاب عربی میں کافی اہمیت رکھتی ہے اور عربی کے ابتدائی درجات میں داخل ہے۔ اس کے بعد ملا حسین واعظ کاشفی (وفات ۱۵۰۵ء) نے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ عربی سے فارسی میں کیا اور اس کا نام انوار سہیلی رکھا۔ انوار سہیلی کا خلاصہ ابو الفضل نے شہنشاہ اکبر کے حکم سے فارسی میں کیا اور عیار دانش نام رکھا۔

فارسی میں عطار کی مثنوی منطق الطیر بھی رمزیہ ادب کے زمرہ میں رکھی جا سکتی ہے۔ اس میں تصوف کے مسائل کو پرندوں کی زبان میں ادا کیا گیا ہے۔ تمام پرندے ہُدہُد کی رہنمائی میں سیمرغ بادشاہ کی تلاش میں نکلتے ہیں اور وادیٔ طلب، وادیٔ عشق، وادیٔ معرفت، وادیٔ استغنا، وادیٔ توحید، وادیٔ حیرت اور وادیٔ فنا کو طے کرتے ہوئے آخر میں سیمرغ کی ذات میں اپنی ہستی کو فنا کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ شاہ رخ مرزا کے عہد میں محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری نے دستور عشاق کے نام سے فارسی میں ایک مثنوی رمزیہ انداز میں لکھی جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اسی قصہ کو محمد یحییٰ نے شبستان خیال اور حسن و دل کے نام سے بھی لکھا ہے جسن و دل نثر میں لکھی گئی ہے۔

عربی ادب میں رمزیہ کی دیگر مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ عہد عباسی کے تیسرے دور میں بصرہ میں کچھ اراکین کی ایک جماعت کی تشکیل ہوئی جس میں مختلف اسلامی ممالک کے باشندے شریک تھے۔ اس جماعت کا نام "اخوان الصفا" تھا۔ اس جماعت کے اراکین نے اسلامی فلسفہ کے بارے میں ۵۱ رسائل لکھے اور ان کا نام "رسائل اخوان الصفا" رکھا۔ اس کا رسالۂ اوّل رمزیہ ادب کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس میں جنوں کے بادشاہ کی عدالت میں انسان اور حیوان کی پیشی ہوتی ہے اور دونوں اپنے اپنے مطالبات پیش کرتے ہیں۔ اس میں انسان اپنے کو اشرف المخلوقات ثابت کرتا ہے۔ اس طرح سے اس رسالہ کے ذریعہ انسان کی برتری اور بزرگی کو واضح کیا گیا ہے۔ اسی دور میں ابو العلا معری (۳۶۳ھ تا ۴۲۹ھ) نے تمثیلی انداز میں کچھ نظمیں لکھیں مثلاً مناجات حیوان، مرغ و کبوتر کے مکالمے، بھیڑیے اور بکرے کے مناظرے وغیرہ۔ اس انداز بیان سے درس عبرت کے علاوہ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اپنے اصلی جذبات کو عوام سے پوشیدہ رکھے۔

انگریزی ادب میں بھی رمزیہ نگاری کی بیش بہا مثالیں پائی جاتی ہیں اور تقریباً قدیم عہد سے ملتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اینگلو سیکسن عہد میں اس کی مثالیں بہت کم ہیں مگر اینگلو رومن دور میں رمزیہ ادب کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ اس دور میں ۱۲۲۰ء میں (The Owl and The Nightingale) جس کے مصنف کا نام نکولس ڈی گلڈ فورڈ (Nicholas de Guild Ford) ہے۔ اس نظم میں مصنف نے الو کو عقل اور بلبل کو شباب فرض کیا ہے اور دونوں میں مباحثہ کے بعد عقل کو شباب پر ترجیح دی ہے۔ اس کے بعد سرگیوین (Sir Gaywayne) نے Pearl کے زیر عنوان ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں شاعر نے اپنی دو سالہ مرحوم بچی کو موتی تصور کیا ہے اور اس کی قبر کو "کنج گلشن" سے تعبیر کیا ہے اور اس طرح رمزیہ انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ Piers Plowman بھی ایک مشہور رمزیہ کتاب ہے جس کا مصنف ولیم لینگ لینڈ William Langland ہے۔ اس نظم میں تمثیلی انداز میں صداقت پر زور دیا گیا ہے۔

قرون وسطیٰ میں بھی انگریزی ادب میں رمزیہ ادب کی تخلیق کی گئی۔ چاسر کی مشہور نظم Parlement of Foules اسی دور میں لکھی گئی ہے۔ اس میں سارے پرند فطرت کی دیوی کے سامنے جمع ہو کر اپنا زوج تلاش کرنے کے مسائل پر بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ اس دور کی ایک اور

مشہور رمزیہ تصنیف ہے جس کا نام Flower and the Leaf ہے۔ اس کے مصنف کا نام انگریزی ناقدوں نے نہیں لکھا ہے مگر اتنا پتہ چلا ہے کہ اس کی مصنف کوئی عورت ہے۔ اس نے پھول کو تساہلی اور پتی کو محنت سے تعبیر کیا ہے اور اس طرح دونوں میں مناظرہ کر کے محنت کو تساہلی پر ترجیح دی ہے۔ یہ انگریزی ادب میں رمزیہ کی ایک حسین مثال ہے

انگریزی ادب کے دورِ جدید میں بھی رمزیہ کی مثالیں مختلف انداز میں ملتی ہیں۔ اسکلٹن (Skelton) ہنری ہشتم کی فضول خرچی روکنے کے لئے Magnyfycence ڈراما تمثیلی انداز میں لکھا اسپنسر (Spenser) کی مشہور رمزیہ تخلیق Faerie Queene اسی دور کی پیداوار ہے اور اس کی بیس سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ پھر بھی وہ نامکمل رہی کیونکہ اس کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اسی میں اسپنسر نے رمزیہ انداز میں انگلینڈ کی عظمت کو بلند کیا ہے۔ فینز فلیچر (Phineas Fletcher) نے (The Purple Island) کتاب رمزیہ انداز میں لکھی ہے۔ اس نے جسم انسانی کو ایک جزیرہ تصور کیا ہے جس میں نیکی اور بدی کے جذبات میں جنگ ہوتی ہے۔

(Bunyan) کی Pilgrim's Progress بھی رمزیہ ادب کی ایک عمدہ مثال ہے۔ جو ناول کی شکل میں ہے اور جو ۱۶۷۸ء میں لکھی گئی ہے۔ اس میں مصنف نے زندگی کی وادی میں روحوں کے سفر کو دکھایا ہے۔ اڈیسن (Addison) رمزیہ مضامین لکھے ہیں The Endeavour of Mankind to get rid of their Woes اس کا مشہور رمزیہ مضمون ہے۔ جان سوئفٹ John Swift کی مشہور رمزیہ کتاب Tale of Tub ہے جو رومن چرچ کے طرفداروں پر ایک حملہ ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر جانسن کے مضامین بہت اہمیت رکھتے ہیں اور انھیں رمزیہ ادب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ بہرحال انگریزی ادب میں بھی رمزیہ نگاری کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔

ہندی ادب میں بھی رمزیہ کی مثالیں موجود ہیں۔ اس میں سب سے مشہور کتاب ملک محمد جائسی کی پدماوت ہے۔ ملک محمد جائسی نے پدماوت میں افسانوی انداز میں تصوف کے مختلف مسائل حل کئے ہیں۔ طوطا ہیرامن، رانی ناگ متی، راجہ رتن سین، پدمنی، اور علاء الدین جیسے معمولی ناموں میں تصوف کی بے پناہ گہرائیاں پوشیدہ ہیں۔

اردو ادب میں بھی رمزیہ کی مثالیں ملتی ہیں گو اس میں شک نہیں ہے کہ اردو میں رمزیہ ادب ترجموں کے ذریعہ داخل ہوا ہے یہ ترجمے زیادہ تر فارسی زبان سے کئے گئے ہیں۔ اردو رمزیہ ادب کی تخلیق قطب شاہی عہد میں کی گئی ہے اس دور کے مشہور شاعر اور انشاپرداز ملا وجہی گزرے ہیں۔ ان کی مشہور رمزیہ کتاب سب رس ہے جو ۱۶۳۵ء میں لکھی گئی ہے۔ اس کو ۱۹۳۲ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن ترقی اردو، حیدرآباد سے شائع کیا۔ سب رس کے خیالات خود ملا وجہی کی تخیل کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ملا وجہی نے ان خیالات کو محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی نثر کی کتاب حسن و دل سے اخذ کیا ہے وجہی نے نہایت حسین انداز میں حسن و عشق کے معاملات کو پیش کیا ہے۔ اس میں عقل و عشق کا معرکہ بھی پایا جاتا ہے۔ دل اور حسن کی ملاقات بھی ہوتی ہے۔ نظر کی جاسوسیاں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ رقیب کی چیرہ دستیاں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ غمزہ کی نزاکتیں بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہیں اور زلف کی برہمی بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ مختصر یہ کہ سارے کردار مل کر تصوف کی ایک حسین اور معنی خیز فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ سب رس اردو ادب میں رمزیہ کی پہلی اور کامیاب کوشش ہے۔

دورِ مغلیہ میں بھی دکن رمزیہ ادب کی تخلیق کا مرکز رہا۔ طوطی نامہ اس دور کی رمزیہ تصنیف ہے۔ کلیلہ دمنہ کی طرح طوطی نامہ بھی دراصل سنسکرت میں لکھی گئی تھی۔ اصل سنسکرت نام "سوگا شپتتی" ہے۔ اس میں ایک طوطے نے ستر کہانیاں کہی ہیں جو درس و عبرت سے معمور ہیں۔ ان میں سے ۵۲ کہانیوں کا انتخاب مولانا ضیاء الدین بخش بدایونی نے ۷۳۰ھ میں کیا اور طوطی نامہ اس کا نام رکھا لیکن اس کی فارسی بہت مشکل ہے۔ اس کے بعد ملا سید محمد قادری نے ان میں سے ۲۵ کہانیوں کو آسان فارسی میں منتقل کیا مگر طوطی نامہ نام برقرار رکھا۔ اس کا ترجمہ غواصی نے اردو نظم میں ۱۰۴۹ھ میں کیا اور طوطی نامہ ہی نام رکھا۔ اس کے علاوہ ۱۰۷۶ھ میں ابن نشاطی نے ان کہانیوں کو اردو نظم کا جامہ پہنایا اور طوطی نامہ نام رکھا۔

دکن سے اردو کا رواج شمالی ہند میں ہوا۔ ہم اس دور کو اردو نثر کا دوسرا دور کہہ سکتے ہیں مگر اس دور میں رمزیہ ادب کی تخلیق کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ البتہ اردو نثر کے تیسرے دور میں رمزیہ ادب کے نمونے ملتے ہیں۔ اس

زمانہ میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین نے اردو میں مختلف رمزیہ کتب کا ترجمہ کیا۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں حیدر بخش حیدری نے ملا محمد قادری کے طوطی نامہ کا ترجمہ کیا اور اس کا نام بھی طوطی نامہ رکھا۔ اس طوطی نامہ کا ترجمہ سنہ ۱۸۶۰ء میں ہندی میں بھی ہو چکا ہے۔ میر بہادر علی حسینی نے بھی اردو میں ایک رمزیہ کتاب ترتیب دی جس کا نام اخلاق ہندی ہے۔ اخلاق ہندی کی کہانیاں بھی سنسکرت ادب کی ملکیت ہیں۔ سنسکرت سے فارسی ادیبوں نے ان کہانیوں کو اخذ کیا۔ اس طرح فارسی میں اس کے دو ترجمے ہوئے۔ ایک کا نام نگارِ دانش ہے۔ دوسرے ترجمے کا نام مفرح القلوب ہے۔ میر بہادر علی حسینی نے ڈاکٹر گلکرائسٹ کے حکم سے مفرح القلوب کا ترجمہ سنہ ۱۸۰۲ء میں کیا اور اخلاق ہندی اس کا نام رکھا۔

مظہر علی خاں ولا نے ہفت گلشن کے نام سے ایک رمزیہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کا مواد ایک فارسی تصنیف سے اخذ کیا گیا ہے جو ناصر علی خاں واسطی بلگرامی کی تصنیف ہے۔ مظہر علی خاں ولا نے سنہ ۱۸۰۲ء میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کی فرمائش سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں بھی اخلاقی کہانیاں موجود ہیں۔ اسکے علاوہ خرد افروز بھی ایک رمزیہ کتاب ہے جسکو شیخ حفیظ الدین نے ابو الفضل کی کتاب عیارِ دانش سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ شیخ حفیظ الدین کے بعد دیگر حضرات نے عیارِ دانش سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس طرح سے انیسویں صدی کے آخر تک عیارِ دانش کے تقریباً سات ترجمے اردو میں ہو گئے۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۱۰ء میں مولوی اکرام علی صاحب نے رسالہ اخوان الصفا کا ترجمہ عربی سے اردو میں کیا۔ اس رسالہ نے اردو کے رمزیہ ادب میں ایک اور اضافہ کر دیا۔

اردو نثر کے چوتھے دور میں رمزیہ ادب کی طرف کم توجہ کی گئی۔ تاہم فقیر محمد خاں گویا نے ۱۸۳۵ء میں انوار سہیلی کا ترجمہ کیا اور اس کا نام بستانِ حکمت رکھا ہے۔ دراصل اس دور میں اردو کے ادیب سنجیدہ نثر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور آزردہ، امام بخش صہبائی، مولوی ضیاء الدین اور غالب وغیرہ اردو میں ایک نئی نثر کی بنیاد رکھ رہے تھے اس لئے قصہ کہانیوں کی طرف کم توجہ کی گئی مگر پھر بھی اردو ادب سے رمزیہ انداز ختم نہیں ہوا۔ اردو نثر کے پانچویں دور میں رمزیہ ادب کی طرف ایک نئے انداز سے توجہ کی گئی۔ اس دور میں اردو ادب میں رمزیہ فارسی کتب سے ترجموں سے نہیں داخل ہوا بلکہ نثر نگاروں نے خود ذاتی طور پر رمزیہ مضامین لکھے۔ خصوصاً سرسید احمد خاں کے کچھ مضامین رمزیہ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مضمون "امید کی خوشی" کو اردو کے رمزیہ ادب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ سرسید کے علاوہ محسن الملک نے بھی رمزیہ مضامین لکھے ہیں۔ اس سلسلہ میں "موجودہ تعلیم و تربیت کی تشبیہ" کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ شرر لکھنوی کے بہت سے رمزیہ مضامین ان کے رسالہ دلگداز میں شائع ہوئے ہیں اور کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

اردو نثر کے چھٹے دور میں بھی رمزیہ ادب کی طرف توجہ کی گئی۔ حالی کے چند مضامین میں تمثیلی رنگ موجود ہے۔ ان کا مضمون "زبان گویا" تمثیلی رنگ میں لاجواب ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تصنیف نیرنگ خیال رمزیہ نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ نیرنگ خیال کے مضامین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی ایما سے لکھے تھے۔ کرنل ہالرائڈ نے ان کو انگریزی اساطیر کے نکات سمجھائے اور ان سے فرمائش کی کہ اس انداز پر وہ اردو میں بھی مضامین لکھیں مثلاً انگریزی تھیالوجی میں وقت کو ایک پیر کہن سال کیا گیا ہے۔ غصہ کو ایک کالی اور بادی عورت تصور کیا گیا ہے۔ عشق کی ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکے سے تعبیر کی گئی ہے۔ افواہ اور شہرت کو ایک ایسی بڑھیا عورت سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں اور حسن کو ایک ایسی پری تسلیم کیا گیا ہے جو سمندر کے کف سے پیدا ہوئی ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد نے جو خیالستان کے بادشاہ ہیں اپنی قوت تخیل سے کام لیا اور اردو میں ان سارے خیالات کو سمونے کی کوشش کی۔ اس طرح نیرنگ خیال کے سارے مضامین جانسن اور اڈیسن کے مضامین کے آزاد ترجمے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزاد کا اصل رنگ نیرنگ خیال میں مکمل طور سے ابھرا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آب حیات میں آزاد نے ایک ناقد کے فرائض مکمل طور سے نہیں انجام دئے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دربار اکبری میں آزاد ایک مورخ کی حیثیت سے زیادہ کامیاب نہیں رہے ہیں۔ یہ قول بھی درست ہو سکتا ہے کہ سخندان پارس میں آزاد نے ایک فاضل محقق ہونے کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ مگر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ نیرنگ خیال میں آزاد ایک مکمل انشاپرداز کی حیثیت سے

جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے نیرنگ خیال اردو کے رمزیہ ادب میں ایک بلند مقام رکھتی ہے۔

اردو نثر کے علاوہ اردو نظم میں بھی رمزیہ نگاری ملتی ہے مگر اردو نظم میں رمزیہ نگاری اپنی کمل خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر نہیں ہے۔ اگرچہ اردو نظم میں انوار سہیلی کے کچھ ترجمے ہوئے ہیں مگر ان ترجموں کے علاوہ مستقل تصانیف رمزیہ انداز میں غالباً نہیں کی گئی ہیں۔ مختلف شعرا کی کچھ نظمیں البتہ ملتی ہیں جن میں رمزیہ نگاری کی شان پائی جاتی ہے — نظیر اکبرآبادی کی نظم "ہنس پریا" کو اس زمرہ میں رکھا جا سکتا ہے اس کے علاوہ حالی کی چند نظموں کو بھی رمزیہ ادب کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً "دستر اور ہوقت کا مناظرہ" رمزیہ نگاری کی اچھی مثال ہے۔ اس طرح اقبال کی کچھ نظموں میں بھی رمزیہ انداز ملتا ہے۔ مثلاً ان کی فارسی نظم "شبنم" اور اردو نظم "شعاع امید" میں رمزیہ کے عناصر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں مگر اردو نظم میں کوئی مستقل تصنیف "منطق الطیر" کے طرز پر نہیں ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اردو شاعری اور خصوصاً غزل کی شاعری مکمل طور سے رمزیت اور اشاریت کی حامل ہے۔ لہٰذا شاید الگ سے اور خاص طور پر تمثیلی شاعری کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

بہر حال دور جدید میں اردو ادب میں خالص رمزیہ نگاری کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ نیرنگ خیال کے بعد اس قسم کی کوئی اہم تصنیف وجود میں نہیں آئی اس لئے نیرنگ خیال کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھنا چاہیے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ دور جدید میں عقلیت کا سورج طلوع ہوا اور احساس و ادراک کی شعاعیں ہر طرف پھیلنے لگیں۔ شاعروں اور انشاپردازوں کے سامنے حیات و کائنات کے نئے نئے مسائل رونما ہوئے۔ اس لئے وہ ضعیف الاعتقادی کی دلدل سے باہر نکل آئے اور حقیقت پسندی کی راہ پر گامزنی کرنے لگے۔ وہ لوگ اس کو بخوبی سمجھ گئے کہ اس دور کے مسائل قصہ کہانی کی مدد سے حل نہیں کئے جا سکتے ہیں۔ اسی لئے اس دور میں ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی بنیاد پڑی۔ ناول اور افسانہ میں ہماری زندگی کے مختلف مسائل کا حل نظر آتا ہے۔ اس میں سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی اور تعلیمی گتھیوں کو مکمل طور سے سلجھایا جا سکتا ہے۔ اسی لئے افادیت کے نقطۂ نظر سے ناول نگاری اور افسانہ نگاری کو بہت فروغ حاصل ہوا اور رمزیہ نگاری کی اہمیت اور عظمت کم ہوتی گئی۔

✱

غزل

سید نواب افسر

ہے بے خودی میں غمِ دوجہاں سے بیگانہ
کہیں سے رازِ سکوں پا گیا ہے دیوانہ

جنوں نواز ہیں یہ ناصحانِ فرزانہ
خرد بھی گرمِ عمل ہے بہ کارِ دیوانہ

بہ قدرِ شوق نہیں ہے، بہ قدرِ زیست سہی
کسی طرح سے چلے تو نظامِ مے خانہ

ہے کتنا رحم کے قابل یہ جبرِ فطرت بھی
کہ بے شعورِ طلب جل رہا ہے پروانہ

بس اتنا فرق ہے افسانہ اور حقیقت میں
جو آج ہے وہ حقیقت، جو کل تھا افسانہ

بہاریں گرد قدم بن کے ساتھ ساتھ چلیں
چمن سے کون یہ گزرا ہے بے نیازانہ

صلائے عام ہے جو جتنی پی سکے وہ پیے
کھلا ہوا ہے غمِ زندگی کا مے خانہ

وہی سُنے تو سُنے اور کیا سُنے گا کوئی
بغیرِ لفظ و بیاں کہہ رہا ہوں افسانہ

نظامِ نو میں کم از کم یہ شرط ہے ساقی
کہیں سے مانگ کے لایا نہ جائے پیمانہ

غزل

کاوش بدری

سو رنگ کے آفات ہیں اور ایک مرا دل
پھر بھی نظر آتی نہیں مشکل کوئی مشکل

بے خوف و خطر جوشِ جنوں گرمِ سفر ہے
ہیں دار و رسن کتنے ابھی راہ میں حائل

دل کیا ہے مرا زخمہ زنِ بربطِ ہستی
غم کیا ہے مرا نغمۂ صد طوق و سلاسل

کچھ اس کے سوا اور بھی ہیں حُسن کے جلوے
تا چند کروں تذکرۂ لیلیٰ محمل

تیرے لب و رخسار میں رقصاں شفقِ شام
میری نگہِ شوق میں غلطاں تپشِ دل

ہے تابِ نظارہ تو بڑی چیز ہے دُنیا
ہے کون سا جلوہ جو نہیں دید کے قابل

ذرات کی محفل سے مہ و کاہکشاں تک
نظارے ابھی کتنے ہیں تحریر کے حامل

بھولے سے نہ جا نا مری دیوانہ وشی پر
اے گردشِ ایام! نہیں تجھ سے میں غافل

کب ہستیٔ موہوم ہے کاوش مری ہستی
ہے کون یہاں تیرے سوا رونقِ محفل!

بادشاہ محل عالم

تمکین کاظمی

بادشاہ محل کا ذکر سب سے پہلے عبدالغفور خاں نساخ نے اپنے تذکرۂ سخن شعرا میں کیا ہے (صفحہ ۵۰ مطبوعۂ نول کشور سنہ ۱۲۹۱ھ)۔ اُن کے الفاظ ہیں ـــ

"ترتیبِ تذکرہ کے وقت مٹیا برج میں رہتی تھیں۔ ستار خوب بجاتی تھیں اور شعر بھی اچھا کہتی تھیں۔ صاحبِ دیوان و مثنوی تھیں"

اسی کو دیکھ کر تذکرۃ النساء نادری نے (صفحہ ۱۲۹) تذکرہ ماہ درخشاں نے (صفحہ ۴) تذکرہ مشاہیر نسواں نے (صفحہ ۳۹۰) تذکرہ بہارستان ناز نے (صفحہ ۶۵-۶۶) پر موصوفہ کے حالات اور شعر نقل کیے ہیں مگر کسی نے نواب محل خطاب لکھا ہے تو کسی نے "یکے از نسوانِ شبستان واجد علی شاہ" لکھ دیا ہے۔

اشہری مرحوم نے اپنی کتاب ایشیائی شاعرات (صفحہ ۱۴۲) میں بادشاہ محل کی زمزمہ سنجیوں کو پس چلمن بیٹھ کر سننے کا تذکرہ کیا ہے ـــ

"حضرت جانِ عالم محمد واجد علی شاہ 'ارم آرام' بادشاہ اودھ کے محلاتِ معلیٰ میں خاص محل کا درجہ خاص ہے۔ خاص محل کا دیوان چھپ گیا ہے۔ جب جناب نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیِ ریاست بھوپال کلکتے تشریف لے گئیں تو خاص محل نے اپنا دیوان نواب شاہجہاں بیگم کو اور نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے اپنا دیوان شیریں خاص محل صاحبہ کو دیا۔ مجھ کو بوجہ ملازمت روبکاری جناب شاہجہاں بیگم صاحبہ جنت آرام پس چلمن سے حضور خاص محل زمزمہ سنجیوں کے سننے کا اتفاق ہوا۔ حضور ممدوحہ کی زبان بجائے خود فصاحت کی کان سمجھنا چاہیے۔ اور طبقۂ نسواں کی شاعری میں ان کی شاعری کو خاص جگہ دینا لازم ہے۔"

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا کے کتب خانے سے مجھے دیوانِ عالم مل گیا اور مثنویِ عالم بھی اتفاق سے فراہم ہو گئی۔ مگر یہ دونوں کتابیں بھی بادشاہ محل کے حالات بتا نہیں سکتیں۔ اس لیے جانِ عالم کی کتاب محل خانۂ شاہی اور مثنوی حزنِ اختر سے استفادہ کرنا پڑا۔ ان دونوں کتابوں کی معلومات کا نچوڑ یہ ہے کہ بادشاہ محل نواب علی تقی خاں مرحوم ابن شرف الدولہ ابن مدار الدولہ کی لڑکی تھیں۔ ۱۵ شعبان سنہ ۱۲۵۳ ہجری کو شادی ہوئی، مگر میاں بیوی کے تعلقات جلد ہی کشیدہ ہو گئے۔ چنانچہ واجد علی شاہ نے لکھا ہے: "مجھ میں اور میری زوجہ میں پانچ مہینے تک وہ محبت اور خلوص جو زن و شوہر میں ہونا چاہیے قائم رہا۔" اسی زمانے میں بادشاہ محل کے جو ان دنوں اعظم بہو کہلاتی تھیں، لڑکا تولد ہوا جس کا نام نوشیرواں قدر رکھا گیا اور اسی فرزند دلبند کی ولادت کی خوشی میں خود واجد علی کو ناظم الدولہ، فخر الملک، محمد واجد علی خاں بہادر، صولت جنگ، مرزا خورشید حشمت، خطاب سرفراز ہوا۔ سنہ ۱۲۵۵ ہجری میں بادشاہ محل سے ایک اور لڑکا تولد ہوا۔ جب واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو انھیں "مخدرۂ معظمہ"، نواب بادشاہ محل" خطاب ملا اور پانچ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔

محل خانۂ شاہی ذی الحجہ سنہ ۱۲۶۹ ہجری میں ختم ہوئی اس لیے اس میں کچھ حالات نہیں ہیں۔ مثنوی حزنِ اختر سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ محل کلکتے میں واجد علی شاہ کے ہمراہ تھیں۔ دراصل یہ اُن کا ایثار تھا کہ لکھنؤ میں اپنے محل کو اس بیٹے نوشیرواں قدر کو چھوڑ کر وہ واجد علی شاہ کے

ساتھ کلکتے چلی گئی تھیں۔ اس لڑکے کے متعلق واجد علی شاہ نے لکھا ہے:—

پھر تھا لڑکا سب سے نوشیرواں ۔۔۔ کہ وہ لکھنؤ میں ہوا تھا دہاں
جو نوشیرواں سے ملے لفظ قدر ۔۔۔ عیاں نام اُس کا ہو شبل بدر
وہ بائیس کا تھا سن و سال میں ۔۔۔ کلاں تھا پسر سیر احوال میں
مگر حکم اللہ جو ہو گیا ۔۔۔ وہ مجنوں صفت تھا نہیں شک ذرا
تمیز و بد و نیک اُس کو نہ تھی ۔۔۔ وہ گو ننگا بھی بہرا بھی تھا آدمی
وہ جو کچھ تھا وہ تھا مرا لعل تھا ۔۔۔ مرض صرع کا بھی تھا بحال تھا
کروں شرح اب لطفِ اللہ کی ۔۔۔ کہ شادی بھی کی میں نے اُس ماہ کی
جو زوجہ ہے اُس کی وہ ہے شہر یار ۔۔۔ یہ ہو گر ملے اس میں ہو لطفِ یار
جنوں میں بھی وہ اس کا نقصان تھا ۔۔۔ وہ تھا تن کی جاں جان کی جان تھا
وہ تھا لکھنؤ میں سُن لے ماہِ عید ۔۔۔ اِسی لکھنؤ میں ہوا وہ شہید

کلکتے میں بادشاہ محل نے واجد علی شاہ کو کافی آرام پہنچانے کی کوشش کی۔ چنانچہ واجد علی شاہ کو اُن کے یہاں سے بھی خاصہ جاتا تھا۔ خود واجد علی شاہ نے لکھا ہے ؎

محل خاص ہے جو مرا نیک نام ۔۔۔ وہاں سے بھی آتا ہے خوانِ طعام

افسوس ہے کہ مثنوی حزنِ اختر بھی ۱۲۷۴ھ ہجری میں ختم ہو جاتی ہے اور اُس کے بعد کے حالات کہیں نہیں ملتے۔

مثنوی عالم ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ء میں طبع ہوئی۔ اس مثنوی کے سرورق پر لکھا ہے "کتاب فصاحت توامان، بلقیسِ دوراں، مخدرۂ عظمیٰ، نواب بادشاہ محل صاحبہ دام اقبالہا" اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دنوں بادشاہ محل زندہ تھیں۔ دیوانِ عالم موسوم بہ "بیاضِ عشاق" ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء میں طبع ہوا۔ سرورق کی عبارت سے تو بادشاہ محل کی زندگی اور موت کا پتہ نہیں چلتا البتہ دیوان کے اختتام پر لکھا ہے: "الحمد للہ تعالیٰ شانہٗ کہ دیوانِ بلاغت مع تصنیفا مریمِ عصر، بلقیسِ دہر، ملکہ مخدرۂ عظمیٰ، نواب بادشاہ محل صاحبہ مرحومہ باختتام رسید۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ۱۳۱۷ھ میں اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ اس طرح یہ تعین کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہ محل طباعت مثنوی کے بعد یعنی ۱۳۰۹ھ میں حیات تھیں اور طباعت دیوان کے وقت یعنی ۱۳۱۷ھ میں وفات پا چکی تھیں۔ اس لیے سن انتقال ۱۳۰۹ھ سے ۱۳۱۷ھ تک کوئی ہو سکتا ہے۔ بہر حال افسوس ہے کہ سن وفات کا تعین ہم نہیں کر سکتے۔

دیوانِ عالم "۱۰" × "۱/۲ ۶" سائز کے ۱۱۶ صفحات اور ۱۷ سطری مسطر پر طبع ہوا ہے۔ چوتھا اڈیشن مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ پیش نظر ہے۔ اس میں ۹۰ صفحات پر ۱۱۴ غزلیں ہیں اور ۹۰ سے آخر تک مخمس، رباعیات اور متفرق قطعات وغیرہ ہیں۔

دیوان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے ساتھ واجد علی شاہ کی بے اعتنائی اور پھر سلطنت اودھ کے انتزاع نے عالم کے کلام کو درد انگیز بنا دیا تھا۔ گو ان کے کلام میں لکھنؤ کا رنگ جھلکتا ہے مگر اکثر و بیشتر اشعار تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہیں اور بڑے سیدھے، صاف اور سلیس ہیں۔ روزمرّہ بھی بڑا عمدہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

صبح کی میں نے کروٹیں لے کر ۔۔۔ رات کو دل جو بے قرار ہوا

ہم دم و ہم سخن و مونس و ہم راز کوئی ۔۔۔ اور نہ دم ساز کوئی
جز غم و درد ترے کوئی بھی غم خوار نہیں ۔۔۔ ہاں مگر دیدۂ نم

یادِ رخ و گیسو میں سدا ہم نے بسر کی ۔۔۔ رو رو کے کبھی شام کی اور گاہ سحر کی

واجد علی شاہ نے ۱۳۰۵ھ میں انتقال کیا۔ بادشاہ محل ان کے انتقال کے بعد بھی زندہ رہیں۔ شوہر کے مرنے کے بعد کا ایک شعر ہے ؎

تھی آرزو نہ قدموں سے تا مرگ ہوں جُدا
پر کیا کروں نصیب نے تجھ سے چھڑا دیا

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑی پتی ورتا تھیں اور شوہر سے محبت بھی کرتی تھیں اور اس کا احترام بھی ؎

نہ ہو تا حکم سے باہر کبھی تا زیست آخر تک ۔۔۔ ہمیشہ جادۂ طاعت پہ عالم اپنا سر رکھنا

تارے گن گن کے سحر ہو گئی ہم کو عالم ۔۔۔ سرِ افلاک نظر آیا جو بستر اپنا

چند شعر اِدھر اُدھر سے اور پیش کر رہا ہوں ان سے عالم کی شاعری اور طبیعت کا مزید اندازہ ہو جائے گا ؎

جتا کر مجھے عشق کیا کیجیے گا ۔۔۔ لیا ہے جو دل تو وفا کیجیے گا
خود ہوئے رسوا مجھے رسوا کیا ۔۔۔ جس جگہ بیٹھے مرا چرچا کیا
آبلے کیوں چشمِ عاشق کو نہ تلووں سے ملا ۔۔۔ لائق پابوسِ جاناں کیا خاتمی میں تھا

کیا جو قید سے تو نے مجھے رہا صیاد　　بتا تو کون سی مجھ سے ہوئی خطا صیاد

عالمؔ! یہ بہار اور یہ دن، سنیو نہ ہرگز　　عشاق پہ کرتے ہیں جوانی میں ستم وعظ

گھر سے نکال کر مجھے در در پھرائے گا　　بے خانماں کرے گا مجھے دیارِ عشق

ہو جو بازارِ محبت کے چلن سے واقف　　کھوٹے داموں کوئی یوسف کا خریدار نہ ہو

پھر شوق سے حضور سُنا لیجئے گا لیساں　　ثابت کیا تو ہوتا ہمارے قصور کو

رباعیاں بھی کہی ہیں مگر ان میں کوئی بات پیدا نہ کر سکیں نمونتہً دو تین پیش ہیں:—

آنکھوں سے یم اشک سدا بہتے ہیں　　کس سے کہیں دل پہ جو الم سہتے ہیں
کرتے ہیں جلا جلا کے عاشق کو خاک　　ثابت کہ بتوں دل پہ جیں رہتے ہیں

اے دل! تو رہِ عشق میں رسوا ہو گا　　اچھا نہیں گیسو کا جو سودا ہو گا
حاصل نہیں کچھ اور سوا ایذا کے　　پچھتائے گا دیکھنا جو شیدا ہو گا

گر مہر تری او بتِ پُر فن ہو جائے　　موقوف ابھی فغان و شیون ہو جائے
عالمؔ کو غرض نہیں ہے کچھ عالم سے　　تو دوست رہے زمانہ دشمن ہو جائے

غالباً دیوان پہلی بار ۱۲۸۴ھ میں مکمل اور مرتب طبع ہوا ہے کیونکہ خود ہی تاریخ کہی ہے:—

کیونکر یہ کلام ہو نہ سب کو مرغوب　　بندش مضمون تمام ہیں خوش اسلوب
لکھی تاریخ طبع دل نے اُس کی　　چھاپا گیا "کلیاتِ عالمؔ" کیا خوب

۱۲۸۴ھ

ممکن ہے پہلا ایڈیشن ۱۲۸۳ھ میں چھپا ہو کیونکہ ہمارے پیش نظر طبع چہارم ہے۔

مثنوی عالمؔ دیوان ہی کی تقطیع پر ۱۷ سطری مسطر کے ۱۲۰ صفحات پر طبع ہوئی ہے۔ اس کا قصہ وہی قدیم طرز کا ہے۔ ایک شاعرہ کی اولین اردو مثنوی میں جو چیزیں ہو سکتی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ لیکن باقاعدہ مثنوی گو شعرا کی مثنویوں سے اس کا مقابلہ کرنا بے سود ہے۔ ایک خاتون کا کلام ہونے کی حیثیت سے اس مثنوی کا ایک علیحدہ مقام ہونا چاہیے۔ بہر حال ذیل میں حمد، نعت اور منقبت اور ساقی نامہ کے اشعار پیش کیے جاتے ہیں:—

حمد

اُس نے پیدا کیے ہیں لوح و قلم　　تا خطِ بندگی لکھے عالم
بس خداوند نام ہے اس کا　　بندہ ہر خاص و عام ہے اس کا
جانتے ہیں سب اس کو ربِ غفور　　ملک و جن و انس وحش و طیور
اسی یکتا کے محو رہتے ہیں　　وحدہٗ لاشریک کہتے ہیں

نعت

مےِ عرفاں کے دے مجھے ساغر　　ساقیا لکھوں نعت پیغمبر
شان میں خاتم الرسالت کی　　سندی مہر ہے نبوت کی
جسم بے سایہ سے یہ پیدا ہے　　اپنے خالق کی طرح یکتا ہے

منقبت

چلے دوبارہ بادۂ اطہر　　میرا ساقی ہے ساقیِ کوثر
ہے ید اللہ سے مرا مطلب　　مجھے دستِ سبو سے کیا مطلب
کیوں نہ ہو دل سے اعتقادِ علی　　کہ مجھے حرزِ جاں ہے نادِ علی

ساقی نامہ

ساقیا! لا وہ بادۂ گلرنگ　　فکرِ رنگیں ہے جس کی ایک ترنگ
اپنی مستی نیا اثر دکھلائے　　بعد مے بن کے مرغ مضموں آئے
جب سے کچھ شعر گوئی کی ٹھانی　　مدتوں تک رہی غزل خوانی
اب یہ جی میں ہے لکھوں اک قصا　　یا خدا دے مری زباں میں مزا

اس کے بعد داستان اس عنوان سے شروع ہوتی ہے۔—

"داستان سرشار شاہ بادشاہ کی، پیدائش دخترِ رشکِ ماہ کی، ملکہ جہاں افروز نام رکھ کر منتی کرنا اس کو کرامت شاہ کا، اور روزِ تولد ملکہ پیدا ہونا دل پذیر دخترِ سوداگر اور بزم افروز دخترِ وزیر کا، ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا، پرورش پانا تینوں مہ جبینوں کا، باہم رابطۂ اخلاص و محبت ہونا ان نازنینوں کا۔"

قصہ یہ ہے کہ سرشار شاہ نامی ایک بادشاہ تھا۔ اُس کے لڑکے پیدا ہونے کے کچھ عرصے بعد مر جاتے ایک دفعہ محل میں اُمید سے ہونے کی خوش خبری مصاحبات نے سُنائی تو اُس کو بہت ملال ہوا کہ کاش حمل ساقط ہو جائے ورنہ لڑکا پیدا ہو کر جلد ہی مر

جلنے لگا۔ اس پر مصاحبوں میں سے ایک نے ایک با خدا فقیر "کرامت شاہ" کا تذکرہ کرکے عرض کیا کہ آپ اُن سے دُعا کی خواہش کیجیے، پھر کام بن جائے گا۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور جب لڑکی تولد ہوئی تو شاہ جی کی گود میں دے دی گئی اور شاہ جی نے اس کو بیٹی بنا کر جہاں افروز نام رکھا۔ شاہ زادی زندہ رہی اور جوان ہوئی تو اُس نے شاہ جی سے پریوں کے تخت کی خواہش کی جسے شاہ جی نے فراہم کر دیا اور شہزادی لگی فرّاٹے بھرنے۔ سکندر شاہ کے بیٹے شہزادہ آئینہ طلعت کے بھی جوانی کے دن تھے۔ وہ ایک دن ایسے باغ میں تھا کہ شہزادی اپنے تخت پر اُدھر سے گزری اور شہزادے کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ اُدھر ایک پری شہزادے پر عاشق ہو کر شہزادے اور اُس کے وزیر زادے دونوں کو اُٹھا لے گئی مگر مطلب حاصل نہ ہونے پر دونوں کو داخل زنداں کر دیا۔ ادھر شہزادی نے فراق یار میں اپنی حالت دگرگوں کر لی۔ آخر وزیر زادی جوگن بن کر شہزادے کو ڈھونڈھنے چلی۔ برہان شاہ نامی ایک جادوگر بادشاہ اُس کی فریفتہ ہو گیا اور اُس نے دیو کو مار کر شہزادے اور وزیر زادے کو رہا کر دیا۔ اس اثنا میں پریوں کے راجہ کے بھتیجے نے شہزادی کو اُڑا لیا۔ وزیر زادی شہزادے کو لائی تو شہزادی ندارد تھی۔ اُس نے کرامت شاہ سے سارا ماجرا بیان کیا کرامت شاہ وراں پرستان پہنچ کر راجہ کے مہمان ہو گئے اور شہزادی کو چھڑا لائے۔ انجام کار جہاں افروز اور سلطان شاہ کی شادی اور برہان شاہ اور دل پذیر کی شادی ہو گئی اور ہر ایک خوش خوش اپنے اپنے والدین کے ساتھ رہنے لگا۔ اب دیکھیے کہ عالم نے شہزادی کی آمد شباب کی تصویر کس انداز میں کھینچی ہے:—

بارھویں سال میں قدم آیا   زلف شبگیں میں پیچ و خم آیا
آمد آمد ہوئی جوانی کی   غمزہ و ناز، دل ستانی کی
ہوئی دل میں اُدھیڑ بُن پیدا   ہو گیا چوب تر میں گھن پیدا
خواہشیں جی کو گدگدانے لگیں   فتنۂ خفتہ کو جگانے لگیں
شکلیں بھانے لگیں بناوٹ کی   گھاتیں خود آ گئیں لگاوٹ کی

عالم کو موسیقی سے واقفیت بھی تھی اور اس فن سے دلچسپی بھی۔ اس کا پتہ ان اشعار سے چلتا ہے:—

گائیں یوں سر کو تان کر ٹپا   مٹ گیا زور شور شوری کا
دُھن اگر آ گئی الاپنے کی   کر دیا بجو باورے کو سڑی
لیتی تھی ایسی آن بان سے تان   کہ کھڑا تھا تان سین بھی کان

ہنسنے والا ہر ایک روتا تھا   جگر سنگ آب ہوتا تھا
روح داؤد کی ثنا خواں تھی   خوش گلوئی پہ ان کے قرباں تھی
گاہ ڈھولک تو گاہ سارنگی   جس کی لے آئی خوب خوب بجی
جب لگائی ستار پر مضراب   کر دیا ٹکڑے پیار خاں کا رباب
پھونا پھلنا سارا بھول گئے   خوف سے ہاتھ پاؤں پھول گئے
ہر کتھک کو ہوا بتانے لگیں   انگلیوں پر انھیں نچانے لگیں

باغ کا ذکر آیا تو اس کی بہار ایسی دکھائی کہ واہ وا:—

بوستاں کی نظر جو آئی بہار   دل پژمردہ کھل گیا اک بار
پٹریاں تھیں چمن کی سب رنگیں   نسترن تھی کہیں کہیں نسریں
رو رکیفیتوں پہ تھا لالہ   ساغر مے لیے تھا متوالا
ارغواں جیسے لال انگارہ   چشم نرگس کی محو نظارہ
برگ سوسن میں تھی مسی کی بہار   گل پیادہ کہیں، کہیں اسوار
راست بازاں سرد تھے لب جو   فاختہ ان پہ کرتی تھی کو، کو
اک طرف غنچے مسکراتے تھے   پیرہن میں نہ گل سماتے تھے
رَوِشوں پر تو پھر رہے تھے مور   پہلوئے گل میں عندلیب کا شور
لہریں لیتے تھے جوئے بار چمن   شور کرتے تھے آبشار چمن
سبز طوطوں کی سرخ وہ منقار   باغ کی جس سے بڑھ گئی تھی بہار
تاک انگور پر تھا وہ عالم   مست تاکا کریں جسے پیہم
خوشے اس طرح سے لٹکتے تھے   زاہد خشک جن کو تکتے تھے
زلف سنبل تھی رشک زلف بتاں   چشم نرگس تھی چشم حور جناں
نہریں سب آب صاف سے لب ریز   اُن میں فواروں کی وہ چھوٹ تیز
مہندی کی ٹٹیاں قرینے کی   جیسے جدول ہو سبز مینے کی

مثنوی رموز عشق کا مشہور شعر ہے ؎

رخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں   چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

عالم کا ایک شعر ہے ؎

غنچہ و گل چٹکتے، کھلتے ہیں   دیکھنا دونوں وقت ملتے ہیں

جلسۂ رقص و سرود کے حال میں بھی بعض فن کارانہ اشعار پائے جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عالم کو اس فن لطیف سے نہ صرف مناسبت بلکہ خاصی واقفیت تھی ؎

(بقیہ مضمون صفحہ [illegible] پر)

رُباعیات

عمر انصاری

لیلائے غزل

کاجل کی اَنکھڑیوں میں نازک سی لکیر
شانوں پہ گیسوؤں کی لمبی زنجیر
خاموش لبوں پر یہ تبسّم جیسے
ساغر کی تہوں سے اک اُبھرتی تنویر

حیات

رنگِ رُخِ کائنات ہم کیا جانیں
دُنیا کے معاملات ہم کیا جانیں
سائے میں اجل کے آنکھ کھولی ہم نے
کہتے ہیں کسے حیات ہم کیا جانیں

یادِ ماضی

ٹکرائیں فضا میں سنگ آہن جیسے
کانٹوں میں پھنسا کسی کا دامن جیسے
یوں آتی ہے دل میں یادِ ماضی اکثر
پلٹے کوئی چوٹ کھا کے ناگن جیسے

آرزو

نغمہ کوئی زیرِ لب ہی گایا ہوتا
افسانۂ زندگی سُنایا ہوتا
گزرے تھے وہ جب اِدھر سے لے کے مژدہ
تم نے ہی کوئی دیا جلایا ہوتا

آسرا

مانا کہ نہیں کسی کی ہمت پرواز
مانا کہ نہیں قریب کوئی دمساز
زنداں میں مگر کہاں سے آجاتی ہے
کانوں میں رَچی بسی کسی کی آواز

بختِ خفتہ

موتی کسی مانگ میں پرو بھی نہ سکے
رونا چاہا تو کھل کے رو بھی نہ سکے
اللہ رے بختِ خفتہ یہ تیرے نصیب
ہم تو کبھی نیند بھر کے سو بھی نہ سکے

نگاہِ ساقی

آئے ہوئے حادثات ٹل جاتے ہیں
خم زلفِ حیات کے نکل جاتے ہیں
اُٹھتی ہے جدھر جدھر نگاہِ ساقی
صدیوں کے بجھے چراغ جل جاتے ہیں

مے کشی

جینے کی ہے آرزو تو جینا سیکھو
چاکِ دلِ کائنات سینا سیکھو
پینا مئے ناب کا ہنسی کھیل نہیں
پینا ہے تو پہلے اشک پینا سیکھو

کڑوے گھونٹ

اب تو ہمیں جینا بھی نہیں آتا ہے
جینے کا قرینہ بھی نہیں آتا ہے
کتنی ہی کڑی کیوں نہ سنا دے کوئی بات
ماتھے پہ پسینا بھی نہیں آتا ہے

شباب

گھبراتا ہے دل مرا جہاں جاتا ہے
کرتا ہوا نالہ و فغاں جاتا ہے
للکار کے رہزنوں کو لے عہدِ شباب
تنہا مجھے چھوڑ کر کہاں جاتا ہے

چاند کی پیدائش اور موت

محمد اسحٰق صدیقی

اب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ زمین گیند کی طرح گول ہے اور سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے۔ گیند کی طرح گول چیز کو کُرہ کہتے ہیں۔ جو کُرے سورج کے چاروں طرف گھومتے ہیں انھیں سیارہ کہتے ہیں۔ سیارہ کے معنی ہیں "گردش کرنے والا" ہماری زمین بھی ایک سیارہ ہے۔ اس کے علاوہ آٹھ سیارے اور ہیں یعنی کل نو سیارے ہیں جن کے نام سورج کی طرف سے گننے پر یوں ہیں:۔

۱۔ عطارد ۲۔ زہرہ ۳۔ زمین
۴۔ مریخ ۵۔ مشتری ۶۔ زحل
۷۔ یورانس ۸۔ نیپچون ۹۔ پُلوٹو

ایسے بھی کُرے ہیں جو سیاروں کے چاروں طرف گھومتے ہیں۔ ان کروں کو چاند کہتے ہیں۔ ہماری زمین کا تو ایک ہی چاند ہے لیکن مریخ کے ۲، نیپچون کے ۲، یورانس کے ۵، زحل کے ۹ اور مشتری کے ۱۱ چاند ہیں۔ گویا کل ۳۱ چاند ہیں۔ عطارد، زہرہ اور پلوٹو کا ایک بھی چاند نہیں ہے۔

ہر سیارے اور اس کے ہر چاند کی بناوٹ ہماری زمین سے ملتی جلتی ہے۔ وہ گیند کی طرح گول ہیں، اندر سے ٹھوس ہیں اور مختلف مادوں کے بنے ہیں لیکن جس طرح کی جاندار ہستیاں اور پیڑ پودے ہماری زمین پر ہیں ویسے کسی بھی سیارے یا چاند پر نہیں ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ صرف مریخ ہی ایک ایسا سیارہ ہے جہاں معمولی قسم کی ہریالی ہو سکتی ہے۔

نظامِ شمسی

سورج اور اس کے چاروں طرف گھومنے والے سیاروں کو "نظامِ شمسی" یا "سورج کا خاندان" کہتے ہیں۔ سورج ان سیاروں کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔ تمام سیارے اس کے چاروں طرف

حسن فطرت کے نمونے

اتر پردیش کے پہاڑی مقامات مثلاً مسوری، نینی تال، رانی کھیت، الموڑہ، چکراتا، لینس ڈاؤن وغیرہ عالمگیر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ جگہیں جنت نگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی صحت گاہیں بھی ہیں۔ گرمیوں میں ملک کے اطراف و کناف سے لوگ یہاں آتے ہیں اور ان کے دلفریب اور حسین مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اتر پردیش کے قدرتی حسن کے نمائندے صرف یہی مقامات نہیں ہیں بلکہ ہمالہ کے دامن میں واقع یہ سارا پہاڑی علاقہ فطرت کے جمال و جلال کا مظہر ہے اور اس کی ہر گھاٹی اور ہر برف پوش چوٹی اس علاقہ میں آنے والوں کے لئے تسکین روح و نظر کا سرمایہ فراہم کرتی ہے۔ ان صفحات پر اتر پردیش کے پہاڑی علاقہ کے چند ایسے ہی پُرفضا مقامات کی تصویریں شائع کی جا رہی ہیں۔

رنگسٹی۔ داہنی طرف ترشول
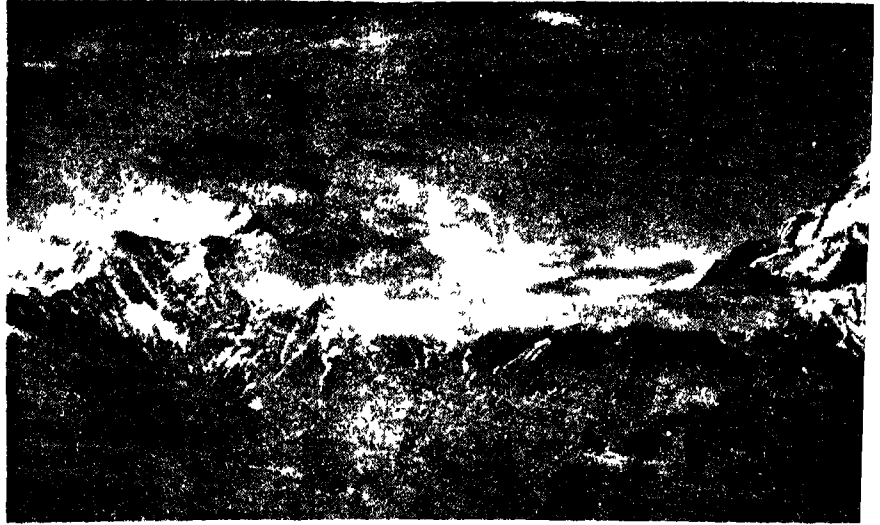
کوسانی ضلع الموڑہ سے ہمالیہ کا منظر

بدری ناتھ کے قریب برف

گڑھوال کی ایک گھاٹی

چمولی کے قریب دریائے الکندا

بدری ناتھ جاتے ہوئے دریائے الکندا

بدری ناتھ (گڑھوال) کا ایک منظر

سری نگر کی وادی (گڑھوال)

بدری ناتھ جاتے ہوئے ہمالیہ کا نظارہ

ایک ہی سطح پر اور ایک ہی سمت میں چکر لگاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ سیارے (اور تمام چاند) اپنی اپنی کیل پر بھی لٹو کی طرح ناچتے ہیں۔ کیل سے مراد ایک فرضی لکیر ہے جسے محور کہتے ہیں۔ لیکن لٹو اور سیاروں کی چال میں ایک بڑا فرق ہے۔ لٹو زمین پر ناچتا ہے لیکن چاند اور سیارے نہ کسی چیز پر ٹکے ہیں اور نہ کسی چیز سے لٹکے ہیں۔ اگر آپ ناچتے ہوئے لٹو کو ہوا میں اچھال دیں اور وہ وہیں ناچتا رہے تو یہ صورت سیارے یا چاند کی گردش کی ہوگی لیکن پھر بھی ایک فرق رہے گا۔ لٹو کے چاروں طرف ہوا ہے لیکن سیارے اور چاند جہاں گھوم رہے ہیں وہاں ہوا بھی نہیں ہے۔ اس جگہ کا نام ہے خلا۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جو چاند، سورج، سیاروں اور ستاروں کے درمیان پائی جاتی ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ جہاں آج نظام شمسی ہے وہاں پہلے گیس کا ایک بادل تھا۔ اس بادل میں مختلف مادوں کے ذرے گیس یا دھوئیں کی صورت میں پائے جاتے تھے۔ یہ بادل آگ سے بھی زیادہ گرم تھا اور بھنور کی صورت میں گردش کئے جا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سمٹتا گیا یہاں تک کہ بیچ کا حصہ سورج بن گیا اور کنارے کا حصہ پھٹ کر سیاروں کی شکلوں میں تبدیل ہو گیا۔ سیاروں کے ساتھ ساتھ ان کے چاند بھی بنے۔ سیارے اور ان کے چاند پہلے سورج کی طرح گرم تھے لیکن وہ سورج کے مقابلے میں بہت چھوٹے تھے اس لئے جلد ٹھنڈے پڑ گئے۔ خلا میں بے انتہا سردی ہوتی ہے اس لئے ان کی گرمی بھی آہستہ آہستہ خلا میں غائب ہو گئی۔ جو سیارہ اور چاند جتنا بڑا تھا اسے ٹھنڈا ہونے میں اتنا ہی زیادہ وقت لگا لیکن ان میں سے بعض کا اندرونی حصہ ابھی پگھلی ہوئی حالت میں ہے۔ خود ہماری زمین کے اندر آگ بھری ہوئی ہے۔

نظام شمسی میں سورج کی وہی حیثیت ہے جو خاندان میں باپ کی ہوتی ہے۔ چاند اور سیارے اس کی اولاد ہیں۔ لیکن انگریز سائنس داں جارج ڈارون (۱۸۴۵ء۔ ۱۹۱۲ء) کی رائے میں زمین اور اس کے چاند میں بہن بھائی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ ماں اور بیٹے کا ہے۔ اس جارج ڈارون نے برسوں جوار بھاٹے پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ چاند کی پیدائش اور جوار بھاٹے میں گہرا تعلق ہے اور چاند خود ہماری زمین کا ایک ٹکڑا ہے۔ جوار پانی کے چڑھاؤ کو اور بھاٹا اتار کو کہتے ہیں۔ اگر آپ سمندر کے کنارے رہتے ہیں یا آپ کو سمندر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ پانی ۶ گھنٹے تک آہستہ آہستہ ساحل کی طرف بڑھتا ہے اور پھر ۶ گھنٹے تک آہستہ آہستہ اترتا ہے۔ ۲۴ گھنٹوں میں دو بار ایسا ہوا کرتا ہے۔

جوار بھاٹا ہونے کی وجہ اصل چاند کی کشش ہے۔ یہ بات انگریز سائنس داں نیوٹن (۱۶۴۲ء۔ ۱۷۲۷ء) نے دریافت کی تھی۔ زمین کو اپنے محور پر ایک بار گھومنے میں ۲۴ گھنٹے لگتے ہیں۔ اس کا ہر حصہ باری باری چاند کے سامنے سے گزرتا ہے اور جب کوئی سمندر اس کے سامنے آتا ہے تو اس کا پانی چاند کی کشش کی وجہ سے اوپر کی طرف اٹھنے لگتا ہے یا یوں کہئے کہ چاند پانی کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ جب وہ سمندر چاند کے سامنے سے گزر جاتا ہے تو وہاں کا پانی اپنی پہلی جگہ لوٹ جاتا ہے۔ زمین کی محوری گردش کی وجہ سے پانی عموماً سمندر کے اس حصے میں جمع ہوتا ہے جو اس وقت چاند کے پورب میں ہوتا ہے اور پھر یہ پانی آہستہ آہستہ پورب سے پچھم کی طرف بڑھتا ہے۔

جوار بھاٹا پیدا کرنے میں سورج کا بھی حصہ ہے۔ سورج چاند کے مقابلے میں بہت بڑا ہے لیکن چونکہ زمین سے بہت دور ہے اس لئے پانی پر اس کی کشش چاند کے مقابلے میں آدھی ہے۔ چنانچہ جتنی اونچی لہریں چاند سمندروں میں پیدا کرتا ہے سورج اس کی آدھی اونچی لہریں پیدا کرتا ہے۔

جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندروں کا پانی برابر حرکت کرتا رہتا ہے اور اسی لئے سڑنے نہیں پاتا۔ اتار کے وقت سمندروں کا پانی اس مٹی اور کوڑے کو بہا لے جاتا ہے جو دریا اپنے دہانوں پر جمع کر دیتے ہیں ورنہ جہازوں اور کشتیوں کو آمد و رفت میں دشواری ہو۔ چڑھاؤ کے وقت جہاز بندرگاہوں تک پہنچ جاتے ہیں ورنہ پانی کم ہونے کی وجہ سے انھیں ساحل سے دور ٹھہرنا پڑے اور مال کے ڈھونے میں کافی روپیہ صرف ہو۔ اگر سمندروں میں جوار بھاٹا نہ ہوتا تو دنیا کے بڑے بڑے بندرگاہ بے کار ہو جاتے اور اس سے تجارت کو نقصان پہنچتا۔ جہاں جوار بھاٹے سے یہ فائدے ہیں وہاں ایک نقصان بھی ہے۔ وہ یہ کہ زمین اپنے محور پر پچھم سے پورب کی طرف گھومتی ہے مگر جوار کی

حالت میں سمندر کی لہریں پورب سے پچھم کی طرف بڑھتی ہیں۔ پانی کی اس مخالف حرکت کی وجہ سے زمین کی محوری گردش میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جیسے سائیکل کا پہیہ بریک لگنے سے رکنے لگتا ہے ویسے ہی سمندر کی لہریں بریک کا کام کرتی ہیں۔ ان کی وجہ سے زمین کی محوری گردش سست ہوتی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دن لمبا ہوتا جاتا ہے۔ دن اس مدت کو کہتے ہیں جو زمین کو اپنے محور پر ایک بار گھومنے میں لگتا ہے زمین کی محوری گردش جتنی تیز ہوگی دن اتنا ہی چھوٹا ہوگا اور زمین کی محوری گردش جتنی سست ہوگی دن اتنا ہی لمبا ہوگا۔ لیکن دن کی طوالت میں اسقدر آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا ہے کہ ہم اسے ساری زندگی محسوس نہیں کرسکتے یہ فرق ہزاروں برس میں بھی نہیں محسوس ہو سکتا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ دن ۰۰۰،۲۰،۱ سال میں ایک سکنڈ کی رفتار سے بڑھ رہا ہے۔ یہ رفتار اگرچہ غیر معمولی طور سے سست ہے پھر بھی اس کا اثر دور رس ہے۔

زمین کی محوری گردش سست ہونے کے معنی ہیں کہ اس میں گھومنے کی طاقت کم ہو رہی ہے۔ یہ طاقت آہستہ آہستہ چاند میں سرایت کرتی جا رہی ہے اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ چاند کی گردش کا راستہ چوڑا ہوتا جاتا ہے اور وہ زمین سے سو سال میں ۵ فیٹ کی رفتار سے دور ہو رہا ہے اس وقت چاند کا زمین سے اوسط فاصلہ ۰۰۰،۲۲۹ میل ہے۔ حساب لگانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب چاند زمین سے بہت دور ہو جائے گا۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب چاند زمین سے نہ صرف بہت قریب تھا بلکہ دونوں آپس میں ملے ہوئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں زمین اور چاند دو سیاروں کی جگہ پہلے ایک ہی سیارہ تھا۔ یعنی ہماری زمین تو موجود تھی اور چاند غائب تھا۔ لیکن اس وقت زمین کی صورت کیا تھی ؟

شروع میں زمین اندر سے لیکر باہر تک آگ کا ایک زبردست گولا تھی۔ اس وقت وہ اب سے ۲½ گنا بڑی تھی۔ اس کے بڑے ہونے کے دو سبب تھے۔ ایک یہ کہ اس وقت تک اس نے چاند کو پیدا نہیں کیا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ کافی گرم تھی اور یہ سب جانتے ہیں کہ گرم کرنے سے چیزیں بڑھتی ہیں اور ٹھنڈا کرنے سے سکڑتی ہیں۔ اب زمین آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہونے لگی یہاں تک کہ اس کے اوپر خشکی کی ایک پرت جم گئی۔ ہمارے چاند کی پیدائش کا وقت قریب آ رہا تھا!

اس وقت زمین کی محوری گردش اب سے کئی گنا تیز تھی وہ اپنے محور پر بدستور تیزی سے ناچتی رہی، یہاں تک کہ اس کی شکل بدلنے لگی۔ پہلے وہ موسمی کی طرح گول تھی۔ پھر خربوزے کی طرح چپٹی ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے ناشپاتی کی شکل اختیار کر لی۔ ظاہر ہے کہ یہ انوکھی صورت زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکتی تھی اس لئے اس کا لمبوترا سرا ٹوٹ گیا اور وہ زمین سے ہزاروں میل دور جاکر زمین کی کشش کی وجہ سے اس کے چاروں طرف گھومنے لگا۔ اس کی صورت بھی آہستہ آہستہ گول ہو گئی۔ یہ ہمارے چاند کی پیدائش تھی؛

پہلے زمین موسمی کی طرح گول تھی

پھر خربوزے کی طرح چپٹی ہو گئی

بعد میں ناشپاتی کی جیسی ہو گئی

اس کا لمبوترا سرا ٹوٹ گیا

اور ہمارا چاند بن گیا

چاند زمین کے کس حصے سے علاحدہ ہوا تھا؟ کیا ہماری زمین کے کسی حصے میں کوئی بھی ایسا نشان باقی ہے جسے دکھا کر ہم یہ کہہ سکیں کہ یہ ہے وہ جگہ جہاں سے زمین کا ایک حصہ علاحدہ ہو کر ہمارا چاند بن گیا؟ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ جگہ بحر پیفک (بحر الکاہل) ہے۔ بحر پیفک دنیا کا سب سے بڑا سمندر ہے جو زمین کے تقریباً آدھے حصے پر چھایا ہوا ہے۔ زمین کی سطح پر جس قسم کی چٹانیں پائی جاتی ہیں وہ بحر پیفک کی تہہ میں نہیں ہیں اور جس قسم کی چٹانیں زمین کے نیچے پائی جاتی ہیں وہ بحر پیفک کی تہہ میں اوپر نظر آتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاں آج بحر پیفک ہے وہاں پہلے خشکی تھی اور جب خشکی کا کچھ حصہ علاحدہ ہو گیا تو ایک بڑا سا گڑھا پیدا ہو گیا جس میں رفتہ رفتہ پانی بھر گیا۔[1]

جب زمین کا ایک حصہ اس سے ٹوٹ کر علاحدہ ہو گیا تو اس کی وجہ سے جو گڑھا پیدا ہوا اسے بھرنے کے لئے زمین کی دوسری طرف والا حصہ کھسکا اور اس کوشش میں بیچ سے پھٹ گیا۔ اس طرح دنیا کا دوسرا بڑا سمندر یعنی بحر اٹلانٹک (بحر اوقیانوس) پیدا ہوا۔ اس کے کنارے کنارے جو براعظم ہیں ان کے ساحل آپس میں اتنے ملتے جلتے ہیں گویا کسی نے انھیں زبردستی پھاڑ کر جدا کر دیا ہو۔ اگر ہمارے لئے ان براعظموں کو ملانا ممکن ہوتا تو ہم دیکھتے کہ وہ آپس میں قریب قریب بالکل جڑ جاتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ جب چاند زمین سے علاحدہ ہوا تو وہ تقریباً ۹۰ میل کے فاصلے پر تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ زمین سے دور ہوتا گیا اور اب زمین سے اس کا اوسط فاصلہ ۲۲۹۰۰۰ میل ہے۔ شروع میں چاند کو زمین کے گرد گھومنے میں پانچ گھنٹے لگتے ہوں گے اور زمین بھی اس وقت اپنے محور کا ایک چکر پانچ گھنٹوں میں پورا کرتی ہوگی گویا اس وقت ایک مہینہ ایک دن کے برابر ہوتا ہوگا (کیوں کہ مہینہ اس مدت کو کہتے ہیں جو چاند کو زمین کا ایک چکر کرنے میں لگتا ہے) لیکن اب دن ۲۴ گھنٹوں کا اور مہینہ ۲۹ دنوں کا ہوتا ہے۔

پہلے چاند اپنے محور پر بھی بہت تیزی سے گھومتا تھا۔ زمین سے قریب ہونے کی وجہ سے پہلے چاند پر زمین کی کشش بھی زیادہ تھی۔ اس کشش کی وجہ سے چاند کے پگھلے ہوئے مادے میں جوار بھاٹا آتا ہوگا۔ اس جوار بھاٹے نے چاند کی محوری گردش کو رفتہ رفتہ اتنا سست کر دیا کہ اب اسے اپنے محور پر ایک بار گھومنے میں اتنا ہی وقت لگتا ہے جتنا کہ اسے زمین کے چاروں طرف گھومنے میں لگتا ہے یعنی ایک مہینہ اور اسی لئے ہماری طرف چاند کا ہمیشہ ایک ہی رخ رہتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے زمین کی محوری گردش سست ہوتی جاتی ہے، دن لمبا ہوتا جاتا ہے اور چاند زمین سے دور ہوتا جاتا ہے۔ چاند جتنا زمین سے دور ہوگا اتنا ہی زیادہ وقت اسے زمین کا چکر کرنے میں لگے گا۔ گویا دن کے ساتھ ساتھ مہینہ بھی لمبا ہو رہا ہے۔

ایک زمانہ ایسا آئے گا جب دن مہینہ کے برابر ہو جائے گا یعنی زمین کو اپنے محور پر گھومنے میں اتنا ہی وقت لگے گا جتنا چاند کو زمین کے چاروں طرف گھومنے میں لگے گا۔ حساب لگانے سے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت کا دن ہمارے موجودہ ۵۵ دنوں کے برابر ہوگا اور مہینہ بھی اتنا ہی لمبا ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح چاند کا ہماری طرف ہمیشہ ایک ہی رخ رہتا ہے ویسے ہی چاند کی طرف زمین کا ہمیشہ ایک ہی رخ رہیگا۔ لیکن یہ کیفیت وقتی ہوگی کیونکہ چاند کی طرح سورج بھی سمندروں میں جوار بھاٹا پیدا کرتا ہے۔ اس لئے سورج کی کشش کی وجہ سے زمین کی محوری گردش اور سست پڑ جائے گی اور دن آہستہ آہستہ مہینہ سے لمبا ہو جائیگا لیکن یہ صورت بھی عرصے تک قائم نہ رہے گی۔

جب چاند زمین سے ۲۴۰۰۰ میل دور چلا جائے گا تو اس کا آگے بڑھنا رک جائے گا اور وہ زمین کی طرف لوٹنے لگے گا۔ اسی طرح جیسے اوپر پھینکا ہوا پتھر آہستہ آہستہ نیچے گرنے لگتا ہے۔ چاند میں گردش کرنے کی جو طاقت ہے وہ آہستہ آہستہ چاند سے زمین میں منتقل ہونے لگے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین کی محوری گردش تیز ہونے لگے گی اور جیسے جیسے زمین کی گردش تیز ہوتی جائے گی چاند اس کے پاس آتا جائے گا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب گھڑی میں کوک بھری جاتی ہے تو اس کی کمانی کس جاتی ہے اور

[1] پانی جو لاکھوں پہاڑوں سے نکلنے والی مختلف گیسوں کے میل سے پیدا ہوا اور زمین پر جہاں جہاں گڑھے تھے وہاں وہاں بھر گیا۔

وہ پھر آہستہ آہستہ کھلتی ہے۔ چاند کا رفتہ رفتہ زمین سے دور ہونا ایسا ہے جیسے کمانی کھل رہی ہو اور اس کا رفتہ رفتہ زمین کے قریب آنا ایسا ہے جیسے کمانی کسی جا رہی ہو۔

چاند زمین کے قریب آتے آتے اتنا قریب آجائے گا کہ اس کا زمین سے فاصلہ . . ۱۱ میل رہ جائے گا اور اس وقت اس پر زمین کی کشش اتنی بڑھ جائے گی کہ وہ اسے برداشت نہ کرسکے گا۔ زمین کی کشش کے زور سے وہ پھٹ کر چکنا چور ہو جائے گا۔ اس کے ٹکڑے زمین کے گرد ایک گھیرا بنا کر اس چوڑی کی طرح گھومنے لگیں گے جو ہمیں زحل کے گرد نظر آتی ہے خیال کیا جاتا ہے کہ پہلے زحل کے دس چاند تھے لیکن ایک چاند گردش کرتے ہوئے اس کے بہت قریب پہنچ گیا اور اس کی کشش کے زور سے پھٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ اس کے یہی ٹکڑے ہمیں زحل کے گرد ایک چوڑی کی صورت میں گردش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جب چاند پھٹ جائے گا تو اس کے ٹکڑے آہستہ آہستہ زمین پر برسیں گے اور جب وہ تمام ختم ہو جائیں گے تو چاند کا وجود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا اور ہماری زمین اکیلی رہ جائے گی۔ یہ چاند کی موت ہوگی!

لیکن ابھی اس حادثے کو پیش آنے میں کروڑوں سال باقی ہیں اس لئے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ شاید اس سے بہت پہلے انسان کی نسل ہی زمین سے مٹ چکی ہوگی۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ چاند کا خاتمہ اسی طرح ہوگا جیسا کہ بعض سائنس داں سوچتے ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ چاند، یہ زمین اور یہ سورج کسی اور طرح تباہ ہوں جس کا علم ہمیں نہیں ہے

چاند زمین سے بہت قریب آجائے گا
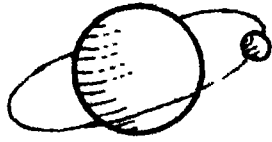
یہاں تک کہ زمین کی کشش کے زور سے پھٹ جائے گا
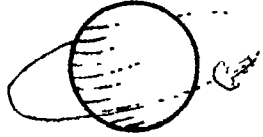
چاند کے ٹکڑے زمین کے گرد گھومنے لگیں گے
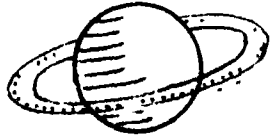
یہ ٹکڑے آہستہ آہستہ زمین پر برسیں گے یہاں تک کہ ختم ہو جائیں گے
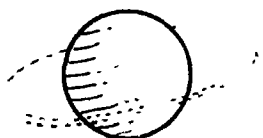
اور تب ہماری زمین اکیلی رہ جائے گی یعنی اس کا کوئی چاند ہی ہوگا نہ شب ماہ

بارِ تخیّل

بیمل کرشن اشک

نظر میں پھرنے لگی آج پھر تری صورت
دماغ بارِ تخیّل سے کلبلانے لگا
دھڑک رہا ہے دلِ زار بے قراری سے
تمام جسم تصور سے جھنجھنانے لگا

تو میرے پاس کھڑی ہے شجر کے سائے میں
پلک پلک پہ چراغِ الم جلائے ہوئے
لرز رہے ہیں ترے ہونٹ درد کی لے پر
نفس نفس میں غمِ عاشقی رچائے ہوئے

نہ جانے وادیٔ فرقت وسیع کتنی ہے
جدھر نگاہ اٹھی تیرگی نظر آئی
ہزار ضبط کیا لاکھ دل کو سمجھایا
لبوں سے آہ نہ نکلی تو آنکھ بھر آئی

میں تیرے غم سے پریشاں تو میرے دکھ سے اداس
جو رات آئے گی وہ درد لے کے آئے گی
کبھی تجھے مرے غم میں کرے گی رنجیدہ
کبھی مجھے ترے غم میں لہو رلائے گی

میں بد نصیب بہت خوش نصیب انساں ہوں
ہر آدمی کے مقدر میں غم نہیں ہوتا
ہر آدمی کو ودیعت نہیں ہوئے آنسو
ہر آدمی پہ یہ لطف و کرم نہیں ہوتا

مگر یہ لطف و کرم جان لے کے جاتا ہے
میں غم زدہ ہی سہی تو کہیں اداس نہ ہو
مجھے کبھی سے بہت سوچنے کی عادت ہے
یہ میری عادتِ کہنہ کبھی ترے پاس نہ ہو

تری نظر میں بھی پھرتی نہ ہو مری صورت
دماغ بارِ تخیّل سے کلبلاتا ہو
دھڑک رہا ہو دلِ زار بے قراری سے
تمام جسم تصور سے جھنجھناتا ہو

جون ۱۹۶۰ء — جیٹھ ۱۸۸۲

چودھری محمد علی ـــــ خطوط کے آئینے میں

شارب ردولوی

ایک انگریز مصنف کا قول ہے کہ "A man's soul lies naked in his letters" "ایک شخص کی رُوح اس کے خطوط میں برہنہ نظر آتی ہے۔" ایک امریکی مورخ نے لکھا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی انسان کے بارے میں جاننے کے لیے اس کے خطوط ایک بہت بڑا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آج کی زندگی میں جیسے جیسے ادب اور ادیب کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور جس طرح دونوں میں نئے نئے گوشے تلاش کیے جا رہے ہیں خطوط کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے شاذ و نادر ہی کسی کے خطوط چھپتے تھے لیکن اب ادیب کی شخصیت اور اس کے نفسیاتی مطالعہ کے لیے اُس کے خطوط کی اشاعت برابر ہوتی رہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خطوط سے بہت سے نہ حل ہونے والے مسائل اور بہت سی گتھیوں کے حل مل جاتے ہیں اور اس طرح ان کی اہمیت ایک ادبی دستاویز کی سی ہو جاتی ہے۔ نجی خطوط (اور یہاں صرف نجی خطوط کا ہی ذکر ہے) کے حصول میں دشواری بھی ہوتی ہے اس لیے کہ کوئی بھی شخص یہ سوچ کر ایسے خط نہیں لکھتا کہ اس کی زندگی کے کسی حصے میں یا اُس کے مرنے کے بعد اُن کی تلاش ہوگی اور وہ شائع کیے جائیں گے۔ اسی لیے ان کی نقل رکھنے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن جب کبھی ایسے خطوط حاصل ہو جاتے ہیں تو وہ اتنے اہم ہوتے ہیں کہ کبھی کبھی تو تاریخ کا رُخ موڑ دیتے ہیں، ادب میں نئے باب کھول دیتے ہیں اور مکتوب نگار کی شخصیت کو انتہائی روشن کر دیتے ہیں۔ غالب کے خطوط نے کیا کیا؟ صرف یہی نہیں کہ اُن کے بعض لاینحل اشعار کا مطلب پیش کر دیا، اس زمانے کے بعض ادبی مباحث سے متعارف کرایا یا بعض سیاسی حالات پر روشنی ڈالی بلکہ غالب کی صحیح شخصیت پیش کر دی۔ اُن کی وہ شخصیت جس تک ادبا، نقاد اور محققین کو پہنچنے میں صدیاں لگ جاتیں، وہ شخصیت آن واحد میں خطوط کے ذریعے ہر ایک کے سامنے آگئی۔ اس طرح کسی بھی شخصیت کے خم و پیچ کو سمجھنے کے لیے اس کے خطوط کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

لیکن خط لکھنا نہ کاری گری ہے نہ آئینہ سازی۔ اور اگر کوئی خط کاری گری اور آئینہ سازی کے نظریے سے لکھا جائے تو اُسے آپ کاری گری اور آئینہ سازی تو کہہ سکتے ہیں لیکن خط نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے ادب میں ایسی کاری گری اور آئینہ سازی کے شاہکار بھی ہیں لیکن وہ جذبات اور تاثرات سے مبرّا، مکتوب نگار کی شخصیت سے خالی اور صرف کاریگری کے نمونے ہیں۔ خطوط کی اہمیت مکتوب نگار کے دلی جذبات اور کیفیات کی آئینہ داری سے ہے۔ لنکن سپنسر [illegible] نے لکھا ہے کہ "خطوط کو عظیم بنانے میں گہرا اخلاص، سوز کی صحیح تصویر کشی اور والہانہ انداز بیان کا بڑا دخل ہے۔" اور یہ ہے بھی بالکل صحیح۔ اگر خطوط میں یہ چیزیں نہ ہوں تو مضمون نگاری اور خطوط نگاری میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ چودھری محمد علی کے خطوط میں وہ تمام باتیں ملتی ہیں جو ایک اچھے مکتوب میں ہونا چاہیے اور جن کی بنا پر ان کے خطوط کو اس دور کے عظیم خطوط میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

چودھری محمد علی ایک مزاح نگار اور ایک صاحب طرز اور فطرت نگار افسانہ نویس کی حیثیت سے اُردو ادب میں ایک عظیم مرتبہ رکھتے ہیں۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ چودھری محمد علی کا سا پیرایۂ بیان ہمارے عہد کے کسی افسانہ نگار کو

نہیں عیب ہو۔ اکتشکولی محتشم علی شاہ حقیقی اور گناہ کا خوف
کے مطالعے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا قلم ہمیشہ اُسی موضوع پر اُٹھتا تھا
جو زندگی کے حقائق سے بہت قریب ہوتا تھا۔ وہ اپنے افسانوں میں ہمیشہ اس
ماحول کو پیش کرتے تھے جس میں وہ خود رہتے تھے۔ وہ کبھی گرد و پیش سے بے خبر
نہیں رہے اسی لیے وہ تصوریت اور ماورائیت کی خلاؤں میں نہیں بھٹکے۔

چودھری محمد علی ایک عجیب دل کش، پُر بہار اور دلچسپ شخصیت کے
مالک تھے۔ وہ یوپی کے ایک مشہور قصبے ردولی (ضلع بارہ بنکی) میں پیدا ہوئے۔
ان کے والد چودھری احسان رسول صاحب ردولی کے تعلقداروں میں تھے۔
یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط پوری طرح قائم ہو چکا تھا۔
دو تہذیبوں کے ٹکراؤ نے لوگوں کو سخت کشمکش میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ہر شخص زندگی
کے ٹھوس حقائق سے فرار ڈھونڈھ رہا تھا اور اس کا آسان راستہ عیش کوشی
رنگ رلیاں تصنع اور بناوٹ تھی۔ زمیندار ہوں، تعلقدار ہوں یا نواب، سب
اپنی حیثیت کے مطابق دادِ عیش دے رہے تھے۔ چودھری محمد علی نے اسی ماحول
میں آنکھ کھولی۔ چودھری احسان رسول صاحب خود بڑے طبیعت دار، رنگین
مزاج اور شوقین آدمی تھے لیکن ان کی عمر نے وفا نہیں کی۔ چودھری محمد علی ابھی
ڈھائی تین سال کے تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ احسان رسول صاحب
کی عمر انتقال کے وقت تقریباً اٹھائیس سال رہی ہو گی۔ اُن کے انتقال کے
بعد علاقہ کورٹ آف وارڈس میں چلا گیا اور چودھری محمد علی کی تعلیم و تربیت
کی ذمہ داری کورٹ آف وارڈس کی طرف سے مقرر کردہ انگریزی منیجر کے سپرد
ہوئی۔ انھوں نے کالون تعلقدار کالج لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ چودھری صاحب
اپنے زمانے کے سب سے زیادہ شریر اور سب سے زیادہ ذہین طالب علم تھے!

چودھری محمد علی شکل و صورت کے بڑے حسین، وجیہ اور بڑے نفیس مزاج،
با مذاق، خوش گفتار، خوش وضع اور خوش لباس آدمی تھے۔ مطالعہ بے حد
وسیع تھا۔ اُردو فارسی عربی اور انگریزی پر بڑی دسترس تھی۔ ہومیوپیتھی کے
بہت اچھے ڈاکٹر تھے۔ اس فن کی معلوم نہیں کتنی کتابیں انھوں نے انگلینڈ اور
امریکہ سے منگا ڈالی تھیں۔ گانے سے بے انتہا شوق تھا اور موسیقی کی ہر اونچ نیچ
سے واقف تھے۔ ادھر کسی نے غلط الاپ شروع کی یا بے موقع مُرکی لی اُدھر انھوں
نے ڈانٹا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ردولی کے بعض قوالوں کو اُن کے سامنے گاتے
ہوئے پسینہ آتا تھا۔ اُن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ جیسے لوگوں میں

بیٹھتے اس وقت وہ ویسے ہی ہو جاتے تھے۔ ان کے لیے یہ بات مشہور تھی کہ ان کے
پاس بیٹھنے والا خواہ بوڑھا ہو یا جوان، عورت ہو یا مرد یا بچہ کبھی "بور" نہیں ہوا۔ اسی لیے
ان کی صحبتوں اور محفل میں ہر طرح کے لوگ نظر آتے تھے۔ اُن کے خطوط بھی قریب
قریب سبھی قسم کے لوگوں کے نام ہیں۔ اُن کے مکتوب الیہم مختلف طبیعت، مختلف
مذاق اور مختلف عمر کے لوگ ہیں لیکن ان تمام خطوط میں چودھری صاحب کی شخصیت
ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کے خطوط خواجہ غلام السیدین کے نام ہوں یا نیاز
فتح پوری کے نام، سید علی ظہیر کے نام ہوں یا ہمایوں مرزا کے نام، میجر ابو جعفر کے
نام ہوں یا ڈاکٹر حسین ظہیر کے نام، نواب عسکر یار جنگ کے نام ہوں یا راجہ صاحب
سلیم پور کے نام، للّن صاحب، شاہ آفاق، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، حکیم
حسن عباس اور ہما بیگم کے نام ہوں یا نجے، عتیق اور وجو صاحب کے نام،
اُن کے انداز، خلوص، والہانہ پن، سادگی، نفسیات و جذبات، گھریلو پن،
رنگینی اور بے تکلفی میں کہیں فرق نہیں آنے پاتا۔ یہی ان کی سب سے بڑی خوبی
ہے جو اُن کو تصنع اور بناوٹ کے الزام سے بچاتی ہے۔ انھوں نے ایک بار ایک
گفتگو میں کہا تھا کہ "میں نے آج تک کوئی عورت بدصورت نہیں دیکھی۔ عورت
ایک ہیرا ہے جس پر معلوم نہیں کب، کس رُخ سے روشنی پڑے اور اس کا وہ پہلو
چمک اُٹھے۔" آج اُن کے اس جملے کو میں ان کے خطوط کے لیے استعمال کر رہا ہوں
کہ ان کا ہر خط ایک ایسا ہزار پہل ہیرا ہے کہ معلوم نہیں کب اُس پر کس رُخ سے
روشنی پڑے اور اس کی چمک سے لوگ حیرت زدہ رہ جائیں۔

یوں تو چودھری محمد علی نے بہت سے لوگوں کو خطوط لکھے ہیں لیکن ان
کے زیادہ تر خطوط ان کی بیٹی ہما اخلاق حسین کے نام ہیں۔ باپ اور بیٹی کی
محبت اور خطوط کا ذکر ہمارے ادب میں اکثر ملتا ہے لیکن ان خطوط میں جو
محبت، والہانہ پن اور بے تکلفی ہے وہ کہیں شاذ ہی نظر آئے گی۔ ہما بیگم صرف اُن
کی بیٹی ہی نہیں تھیں بلکہ ان کی سب سے اچھی رفیق اور دوست، اُن کی اسسٹنٹ
اور سکریٹری، اُن کی مشیر اور ان کی روحانی اور دلی خوشیوں کا مرکز تھیں اور
بقول ہما بیگم کے "میرے اور میاں جان مرحوم کے درمیان ایک مستقل اور
پائیدار Understanding یعنی سمجھوتا تھا جس کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔" خود
چودھری صاحب بھی اپنی اس بیٹی کے بغیر اپنے کو نامکمل سمجھتے تھے اور اس کا
اظہار بھی انھوں نے اپنے اکثر خطوط میں کیا ہے۔ شملے سے ہما بیگم کو
ایک خط میں لکھتے ہیں: ــــ

ہما پیاری ۔ دعائیں قبول کرو اور کیا عرض کروں ۔ شعلہ میرے بعد سے بھرا پڑا ہے مگر آنکھیں ایک اور ہی کو ڈھونڈھ رہی ہیں ؎

در چمن بود زلیخا و جہت می گفت

یا بزنداں کہ در انجمن آرائے ہست

اور ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :—

"— اگر ہما نہ ہو تو دُنیا نہ ہو —" (۲۷ر مئی ۱۹۴۳ء)

ان اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کو ہما بیگم سے کتنی محبت تھی ۔ اس محبت اور باپ بیٹی کے درمیان اس سمجھوتے کو شاید کوئی صاحب دل ہی سمجھ سکے !

چودھری صاحب کے خطوط میں طنز و مزاح کا ایک امتزاج ہے جو مشکل سے کہیں نظر آئے گا ۔ وہ ہر بات میں مزاح کا پہلو کسی نہ کسی صورت ضرور پیدا کر لیتے تھے اور اس مزاح میں ایسی بے ساختگی ملتی ہے کہ طبیعت زعفراں زار ہو جاتی ہے ۔ ہما بیگم کو ایک میراثن کے بارے میں لکھتے ہیں جس کا شوہر بمبئی میں تھا :—

. . . حیدری[1] ، کجن[2] کے ساتھ گانا سیکھ رہی ہے ۔ میرے خیال میں باوجود بے وقوفی کے اس کو کچھ نہ کچھ آ ضرور جائے گا آج ایک ہارمونیم بھی اُس کے لیے ۱۲۰ روپے کا مول لیا جا رہا ہے ۔ دن بھر ہنسا کرتی ہے اور بہت خوش ہے مگر جب میاں کا خیال آ جاتا ہے تو رونے پر تیار ہو جاتی ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ میراثیوں کے یہاں غیر مرد سے گانا سیکھنا منع ہے میرے خیال میں حسین باندی نے اپنی جلن اور حسد میں تین پیسے کا خون کیا ہے اور اُس کے شوہر کو بمبئی میں حال لکھ بھیجا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو وہ کہتا تھا کہ وہیں رہو اور میں خرچ بھیجے جاؤں گا یا نادری حکم بھیجا ہے کہ فوراً چلی آؤ ۔ میں نے اس کو صلاح دی ہے کہ کرایہ کا روپیہ مانگ بھیجے جب روپیہ آ جائے تو لکھ بھیجے کہ چیتھڑے لگائے تھی اُس کے کپڑے بنوا لیے اور روپیہ بھیجو تو آؤں ۔ اول تو روپیہ بھیجے گا نہیں اور اگر بھیجے تو کہے کہ یہاں قرض دار ہو گئی تھی اگر اس کو ادا نہ کرتی تو یہاں سے غیر جگہ کیونکر جاتی اس کے اوپر ضرور لڑائی ہو جائے گی اور ملاپ ہوتے ہوتے

کم سے کم چھ مہینے تک جائیں گے تب تک کچھ نہ کچھ ضرور آ جائے گا ۔

اس کے علاوہ وہ خطوط دیکھیے جو انھوں نے ایک بیگم صاحبہ کو لکھا تھا جن کا نام نہیں ظاہر کیا ہے ۔ چودھری صاحب لوگوں کو ہومیو پیتھک کی دوائیاں تقسیم کیا کرتے تھے ۔ یہ اُن کا بہت پرانا شغل تھا ۔ ان بیگم صاحبہ نے لکھا تھا کہ تمھاری دوا کے لیے استخارہ آتا ہے اس لیے دوا بھیج دو ۔ ان کو دوا کے ساتھ ایک خط میں لکھتے ہیں :—

. . . قریب تھا کہ مجھ کو بھی دوا دینے میں استخارہ منع آ جائے اسی وجہ سے میں نے استخارہ نہیں دیکھا ۔ آخر کچھ انصاف ہے "گھر گھوڑی نخاس مول" ! کیسے دوا تجویز کروں ۔ کیسے مرض کی تشخیص کروں ۔ تقریباً ہر شے کا دن کے تمام سادات ابوالخیرات کا یہی حال ہے مگر کیا کروں دوا دینے کا کام ہی اپنے سر لیا ہے ۔ دوا نہ دوں تو کیا کروں ۔ یہ گولیاں اسی طرح ارسال ہیں جیسے بعض شریر لڑکے رات کو ڈھیلے پھینکتے ہیں ۔ اگر لگ گیا تو واہ وا ، اگر نہ لگا تب بھی لوگ پریشان تو ہوں گے ہی ۔ اگر خدانخواستہ اس دوا سے آپ کو دو ہزار دست آ جائیں یا دو ہزار قے آ جائیں یا نصیب دشمناں آپ کا خطوط ٹل گیا تو مجھ سے شکایت نہ کیجیے گا ۔ اندھے کی داد نہ فریاد ۔ . . .

ان اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ چودھری صاحب کس قدر باغ و بہار طبیعت کے آدمی تھے ۔ زبان کی شیرینی اور بے تکلفی نے مزاح کا رنگ دوبالا کر دیا ہے ۔

ہما بیگم تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان چلی گئی تھیں ۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو ہندوستان میں جو سانحۂ عظیم ہوا اور ہندوستان جس عظیم شخصیت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا اس کی تعزیت اپنی بیٹی کو دیتے ہوئے لکھتے ہیں :—

ہما پیاری ! دعائیں ۔ گاندھی کا پُرسا قبول کرو ۔ ایک شخص نے کہا تھا کہ سقراط کو دُنیا نے زہر کا پیالا دیا ۔ عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دی اور گاندھی کو سیسے کی گولیاں ۔ دُنیا نے کچھ ترقی نہیں کی ۔ جہاں تھی وہیں ہے ۔ . . . . اور پھر دُنیا کی حالت ہزار نہ بدلے لیکن سوا ہندوستان یا کسی بالکل وحشی ملک کے گاندھی مرحوم و مغفور کے ساتھ یہ برتاؤ کہیں نہ ہوتا ۔"

---

[1] میراثن کا نام [2] چودھری صاحب کی صاحب زادی

خط میں ایجاز و اختصار کے باوجود پُرکاری اور رنگینی ہو، رمز و اشارت ہو، یہ چیز بہت مشکل ہو لیکن چودھری محمد علی کے خطوط میں اختصار کے باوجود وہی کیفیت ہے وہی اشاریت اور خلوص ہے۔ شاہ آفاق صاحب کو لکھتے ہیں:۔

آفاق بیٹا۔ آج کیا پروگرام ہے۔ اگر گاؤں جاتے ہو تو بسلامت روی و باز آئی۔ اگر گھر پر کوئی مشغلہ ہو تو چشم ما روشن دِل ما شاد، گر بیکار بیٹھے ہو تو کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست۔

یہ پورا خط تین سطروں پر مشتمل ہے۔ یہ ضرور ہو کہ اس میں محاوروں کا استعمال کا التزام کیا گیا ہے لیکن کاریگری یا ٹھونک پیٹ سے انھیں ٹھونسا نہیں گیا ہے۔ ان کا استعمال اس بے ساختگی سے ہوا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس جگہ پر کوئی دوسرا لفظ استعمال ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں ایسی روانی ہے جو بے ساختہ ہو جانے والے اشعار میں ہوتی ہے۔ یہ خط انھوں نے آفاق صاحب کو بلانے کے لیے بھیجا تھا۔ خود دیر سے انتظار کر رہے تھے لیکن وہ نہیں آسکے تھے۔ پھر بھی یہ نہیں لکھا کہ "چلے آؤ"!

چودھری صاحب ہر ایک سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ جس سے ملتے تھے بڑے خلوص سے ملتے تھے۔ اُن کے دل میں کینہ یا حسد کبھی نہیں رہا۔ یہ سب دوستی، محبت اور خلوص، پاکیزگی اور لطافت خطوط میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ایک خط سے ایک چھوٹا سا حصہ اور نقل کرتا ہوں جو اُن کی طبیعت اور شخصیت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ وہ بیمار تھے اور ایک مہینہ اسپتال میں گزار کر آئے تھے۔ یہ خط ہما بیگم کے نام ہے۔——

. . . . . میں اسپتال میں ایک مہینہ کچھ دن رہ کر چلا آیا تھا۔ پھوڑوں کے زخم اب بھی باقی ہیں مگر نہ ایک دن چلنا چھوٹا ہے اور نہ ہنسنا بولنا کم ہوا۔ صورت سے بیمار نہ تب کوئی کہہ سکتا تھا نہ اب۔ ڈاکٹر لوگ کہتے ہیں زخم کے اندمال میں بڑھاپے کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے جسم کا حال رُوح کے معاملے میں پھر غنیمت ہو۔ روحی تکالیف کی برداشت صرف اس وجہ سے قبول ہے کہ جانتا ہوں آگے اور زیادہ ہونے والی ہے۔ کہاں تک دکھڑا روؤں۔ جانے دو۔ جب انگلستان میں فاتحین کا یہ حال ہو جو تم نے لکھا ہے تو ہم لوگ کس گنتی شمار میں ہیں۔ دُنیا کی حالت اُس بیمار کی ایسی ہے جو بیمار پڑا ہو اور بد پرہیزی نہ چھوڑے۔

ایک خط اور نقل کرتا ہوں جس میں اُن کی شخصیت اور اُن کے مزاج کی رنگینی زیادہ واضح شکل میں نکھر کر سامنے آجاتی ہو۔ یہ ایک عجیب غریب خط ہے جو بعض مجبوریوں کی بنا پر کبھی سپردِ ڈاک نہیں کیا جا سکا۔ یہ بات میری موجودگی کی ہے کہ اُن کے پاس ٹانڈہ ضلع فیض آباد سے ایک پوسٹ کارڈ آیا جس میں کسی صاحب نے لکھا کہ "ہم لوگ یہاں رنگ ریزوں کی ایک جماعت بنا رہے ہیں۔ سُنا ہو آپ بھی رنگ ریز ہیں اس لئے مطلع کیجیے کہ آپ کے یہاں اور کتنے رنگ ریز ہیں، ہم آپ کے یہاں بھی اپنی جماعت کی شاخ قائم کرنا چاہتے ہیں۔"

خط چودھری صاحب نے پڑھ کر مجھے دے دیا۔ میں نے پڑھا اور تھوڑی دیر اس پر دلچسپ گفتگو رہی۔ اس کے بعد کہنے لگے لاؤ! ان کو جواب لکھ دوں۔ انھوں نے جواب لکھا۔ شام کا وقت تھا۔ حسبِ معمول اُن کے بچپن کے دوست اور ساتھی ڈپٹی بدر الحسن صاحب آگئے۔ خط وہ لکھ چکے تھے۔ جواب میں اپنے ساتھ رنگریزوں کی صف میں ڈپٹی صاحب کو بھی سمیٹ لیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کو وہ خط انھوں نے سُنا دیا۔ معلوم نہیں کیوں وہ بُرا مان گئے۔ اس وقت شاید وہ اس مذاق کو سمجھ نہیں سکے۔ چودھری صاحب کو ان کی ناراضگی سے سخت صدمہ ہوا اور اپنے اوپر غصہ آیا۔ اس غصے میں انھوں نے اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ اس کے بعد خط کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ وہ ٹکڑے پھینکنے سے پہلے میں نے لے لیے تھے۔ یہ ایک امانت ہے اس لیے آج میں انھیں جوڑ کر پیش کر رہا ہوں۔ شاید اُن کی رنگا رنگ شخصیت کو یہ خط اُجاگر کر سکے:۔

رودولی

۵٦۔٦۔۰٧

محترمی حمید اللہ رنگ ریز زاد لطفہٗ۔ سلام مسنون۔ ہم لوگ بہت رنگریز یہاں ہیں اور ڈپٹی بدر الحسن صاحب ہماری جماعت کے سکریٹری ہیں۔ آپ کا خط پاکر تمام برادری رنگ ریزاں کو بڑی خوشی ہوئی۔ اس کی خط و کتابت جو کیجیے گا وہ سکریٹری جماعت جناب ڈپٹی بدر الحسن صاحب سے کیجیے گا۔ ڈاکٹر محمد اسمٰعیل سے دریافت کر لیجیے گا۔

راقم — محمد علی عفی عنہٗ

اِس خط کے علاوہ اوپر دیے ہوئے تمام اقتباسات اُن خطوط سے لیے گئے ہیں جو "گویا دبستاں کھل گیا" میں شائع ہو چکے ہیں۔ چودھری صاحب کے خطوط میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے ذیل میں میں چند ایسے خطوط کی نقلیں پیش کرتا ہوں جو اب تک شائع نہیں ہوئے۔ پہلے تین خط (مولانا) حکیم حسن عباس کے

تاثیر ہی چودھری صاحب کے قریبی عزیز ہیں اور رشتے میں بھتیجے ہوتے ہیں۔ چودھری صاحب ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ملازمت کی وجہ سے حکیم صاحب کا قیام زیادہ تر ردولی سے باہر رہتا تھا لیکن جتنے دنوں وہ ردولی میں رہتے تھے چودھری صاحب یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اُن کے سامنے سے ہٹیں۔ آخری خط شاہ آفاق احمد کے نام ہے جو انھیں بے حد عزیز تھے۔ شاہ آفاق احمد درگاہ مخدوم احمد عبدالحق قدس سرہ کے سجادہ نشین شاہ حیات احمد کے صاحبزادے ہیں۔ ان کا مستقل قیام ردولی ہی میں تھا لیکن کبھی کبھی بعض ضرورتوں سے باہر چلے جاتے تھے تو ان کی چند دن کی غیر حاضری بھی چودھری صاحب کو شاق گزرتی تھی۔

(خطوط بنام حکیم حسن عباس صاحب)

(۱) حسن عباس بیٹا۔ دعا ہائے فراواں۔ الحمد للہ رب العالمین۔ تمہارے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ کمرے کے سب دروازے کھول دیے ہیں۔ اور دل کی کھڑکی تو تمہارے لیے ہر وقت کھُلی ہے۔

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

گریہ نہ کرنا کہ ابھی سے حصول ثواب کے لیے رو دل بھر کے چیخ لگانا شروع کردو۔

دعاگو۔ محمد علی عفی عنہ۔ ۳۔ ۷۔ ۵

(۲) نور چشم حسن عباس سلمٗہ۔ دعا۔ تمہارے خطوط سے تمہاری تشویش جو میری بیماری کی وجہ سے لاحق ہے معلوم ہوتی تھی اور میں کم بخت تم کو نہ لکھ سکا مگر یہ جانتا تھا کہ مسیب نے مطلع کر دیا ہوگا کہ زندہ ہوں اور اچھا ہوں۔ معلوم نہیں جسم کی بیماری زیادہ ہوتی ہے یا دل کی بیماری۔ آج کل اَلَم تَرَ کَیفَ اکثر پڑھتا ہوں۔ سوتے وقت وہ دعا پڑھ کر دل کو مضبوط کرتا ہوں جو رسول اللہ نے فتح مکہ کے بعد پڑھی تھی تاکہ دل کو ڈھارس ہوتی رہے۔

اس وقت بھی خط لکھنے کو دل تیار نہیں ہے مگر فرض ادا کر رہا ہوں۔ کل طاہرہ سے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی صبر کو دعا کہتی ہے۔

دعاگو۔ محمد علی عفی عنہ

(۳) عزیزی سلمٗہ۔ دعا۔ تمہارے دو کارڈ آئے دونوں سے دلی تعلق

ٹپکتا ہے۔ خدا تم کو تمہاری سعادت اور محنت کا اجر دے۔ میرے بچنے کی کوئی صورت ابھی تک نہیں بندھی۔ البتہ پھوڑے وغیرہ کی تکلیفیں برقرار ہیں۔ باہر جانے کا موقع نہیں آتا۔ چلتا پھرتا ہوں۔ بخار نہیں ہے مگر دل کو چین نہیں ہے۔ مالی تکالیف روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔

ابتدائے جور ہے روتا ہے کیا

آگے آگے دیکھ تو ہوتا ہے کیا

دعاگو۔ محمد علی عفی عنہٗ

(بنام شاہ آفاق احمد)

آفاق بیٹا۔ دعائیں۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ تمہارا دل میرے دل کا مقیاس الجذبات ہے۔ مگر دل کی آواز کے ساتھ ساتھ تم کو میری خواہش کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اگر مقتضائے وقت یہ ہو کہ دو چار دن زیادہ باہر ٹھہرنا چاہیے تو گھر واپس آنے میں جلدی نہ کرنا۔ چھاتی پر پتھر دبانا بعض اوقات ضروری ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میرا دل کس قدر تم سے باتیں کرنے کو چاہتا ہے۔ مگر ایک کارڈ لکھنا بھی جوئے شیر لانا ہو جاتا ہے۔ قیصر وسیٹ کارڈ پکڑے ہیں میں لکھ رہا ہوں۔ مگر اللّٰہ تعالیٰ کس ہی کی گردن الگ نہیں جھکتی۔ دوسروں نے قلم سے لکھ لکھ کر سب کو الگ بڑھی کر دیا ہے۔ ڈاک کا وقت الگ پکار پکار کہہ رہا ہے کہ ہم بادشاہ کے کہنے سے بھی نہ رکیں گے۔ اب بیٹا تم ہی بتاؤ کیا کروں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دعاگو۔ محمد علی عفی عنہ

ان چند اقتباسات سے جو پیش کیے گئے ہیں، چودھری محمد علی کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ بحیثیت ادیب اور افسانہ نگار کے، بحیثیت ایک مخلص دوست کے، بحیثیت ایک شفیق باپ کے، بحیثیت ایک گفتگو کرنے والے کے۔ ان کے خطوط میں طنزیہ اور مزاحیہ چٹکیاں بھی ہیں، سلاست اور بے تکلفی بھی، برجستگی اور بے ساختگی بھی، بیماری اور پریشانی کا ذکر بھی، شادی کے تقاضے اور موت کی تعزیت بھی۔ یہ تمام چیزیں ان کی شخصیت کی ایسی خوش نما اور دل فریب تصویر پیش کرتی ہیں جس کا جواب غالب کے بعد اردو مکتوب نگاری میں ملنا مشکل ہے۔

✱

افسانہ

ستّر روپے کی پھانسی

هنسراج رهبر

میں بس کے چلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک دیہاتی عورت میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"بھائی صاحب! اس کا ذرا خیال رکھئے گا۔ شاہدرے اتار دیجئے گا" کوئی نیچے کھڑا مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"ضرور۔ آپ بے فکر رہیئے" میں نے جواب دیا اور وہ شخص چلا گیا۔ بس چل پڑی تھی۔

وہ عورت اسے دور تک دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میری طرف پلٹ کر محبّت بھرے لہجے میں بولی "میرا بھائی ہے۔ یہاں بس میں کام کرتا ہے۔ بے چارہ مجھے بس پر بٹھانے یہاں تک آیا تھا۔ اپنے پاس سے ٹکٹ خرید کر دیا اور یہ ایک روپیہ بھی دے گیا۔ کہنے لگا کہ بچوں کے لئے کوئی چیز خرید لینا . . ."

"اپنا ٹکٹ دکھاؤ" ٹکٹ چیکر نے اس کی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

عورت نے ٹکٹ دکھا دیا۔ اس کے پاس ایک کنستر بھی تھا۔ اگر بوجھ دس سیر سے زیادہ ہو تو سرکاری بسوں میں اس کا ٹکٹ الگ سے خریدنا پڑتا ہے۔ چنانچہ چیکر نے کنستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا

"اس میں کیا ہے؟"

"میری دھوتی ہے" عورت نے فوراً کنستر کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ دو چکھے ہیں۔ اس ہنڈی میں اچار ہے۔ میرے بھائی نے دیا ہے"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" چیکر نے ہنستے ہوئے کہا۔ پاس کھڑے دوسرے لوگ بھی اس کی سادگی پر ہنس پڑے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بدھیا"

"کیا کہا! بدھیا؟"

"ہاں، میرا نام بدھیا ہے۔ چھوٹی لائن کی گاڑی پکڑوں گی۔ وہاں ـــ ہمارا گھر ہے" اس نے گاؤں کا نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ پھر ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"بیٹھے بٹھائے ستر روپے کی پھانسی لگ گئی"

"ستر روپے کی پھانسی! کیا مطلب؟" میں چونکا۔

"غریب آدمی کو مفت میں ستر روپے کا ڈنڈ بھرنا پڑے تو اس کے لئے پھانسی ہی ہے۔ جب آدمی کی عقل ماری جاتی ہے تو اسے کچھ نہیں سوجھتا۔ عقل نہ ماری جاتی تو یہ کام ہی کیوں کرتا؟"

میرے پوچھنے پر اس نے اپنی بپتا کی کہانی مجھے تفصیل سے کہہ سنائی

"بات یوں ہوئی کہ میرا گھر والا چھ سات دن پہلے دہلی آیا تھا۔ آتے وقت گاؤں کے بنئے نے اسے گھی کا ایک کنستر دے دیا تھا کہ تم اسے دہلی میں بیچ آنا۔ گھی ستر روپے میں بکا۔ سیدھا سادھا آدمی۔ اس نے ستر روپے کبھی کاہے کو دیکھے تھے۔ روپے لے کر عقل بوکھلا گئی اور وہ ٹھگ لیا گیا۔"

"یہ کیسے ہوا؟" میں نے پوچھا۔

کنستر میں اس کی جو دھوتی پڑی تھی اس میں بندھی ہوئی ایک گرہ کھول کر بڑھیا نے کوئی پاؤ بھر کی ایک ڈلی نکالی اور مجھے دکھاتے ہوئے بولی:-

"ستر روپے میں یہ سونا خریدنے گیا۔ عقل ہی تو ماری گئی تھی بھلے سونا کون بیچے گا! اور ستر روپے میں اسے اتنا سونا کون دے دے گا؟"

پیتل پر ملمع چڑھا ہوا تھا۔ ڈلی دیکھتے ہی مجھے کئی واقعات یاد آگئے، شہر میں ٹھگوں کا ایک گروہ ہے جو بھولے بھالے اور معصوم دیہاتیوں کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔ ٹھگ راستے میں سونے کی ایک نقلی ڈلی پھینک دیتے ہیں۔ جب دیہاتی بے چارہ قریب پہنچتا ہے تو ایک ٹھگ لڑکا اس ڈلی کو اٹھا کر بھاگتا ہے اور دوسرا ٹھگ لپک کر اسے پکڑ لیتا ہے۔ اب جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرا ٹھگ لڑکے کو ڈانٹ کر کہتا ہے "تم نے سونا اٹھایا ہے میں تمہیں تھانے لے چلوں گا"

بھولا دیہاتی تجسس اور حیرت کی تصویر بنا یہ تماشا دیکھنے لگتا ہے۔ آخر فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ میں نے، تم نے اور اس دیہاتی نے یہ ڈلی بیک وقت دیکھی ہے اس لئے اس پر ہم تینوں کا مساوی حق ہے۔ آؤ ہم تینوں اسے بانٹ لیں۔ اب ڈلی تو تقسیم نہیں ہو سکتی۔ بانٹنے کے لئے نقد روپیہ چاہیئے۔ ڈلی کی قیمت تو بہت زیادہ آنکی جاتی ہے مگر ان دونوں ٹھگوں کے پاس نقد کچھ نہیں ہوتا اس لئے دیہاتی کے پاس جو روپیہ ہوتا ہے ٹھگ وہی لے کر مطمئن ہو جانے کا اظہار کرتے ہیں۔ بات کھل جانے کا اندیشہ۔ جو ملے غنیمت ہے۔ دیہاتی سمجھتا ہے کہ مجھے چار یا پانچ گنی قیمت کا سونا مل گیا۔ یہ واقعہ بھی اسی ڈھب کا معلوم ہوتا تھا۔ بہر حال بڑھیا نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"وہ سونا لے کر گاؤں پہنچا تو سب نے کہا کہ تم مورکھ ہو۔ شہر میں ٹھگ لئے گئے۔ یہ سن کر وہ جھلا گیا اور اس جھلاہٹ میں کسی بات کا بہانہ لے کر مجھے پیٹنے لگا۔ میں نے کہا کہ عقل تمہاری ماری گئی اور پیٹتے مجھے ہو۔ بتاؤ اس میں میرا کیا دوش ہے؟"

بڑھیا اپنی بپتا کی یہ کہانی ایسے ہموار سے لہجے میں سنا رہی تھی جیسے یہ بپتا خود اس پر نہیں کسی دوسرے پر گزری ہو۔

"جب عقل ماری جاتی ہے تب ہی تو بھوجا لگتا ہے" بڑھیا نے بات جاری رکھی "اب اس نے مجھے دلی بھیجا کہ سنار کو دکھا لاؤ۔ دلی میں بھی یہ سوچ کر چلی آئی کہ دو چار دن اس سے دور رہوں گی۔ اتنے میں اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ نہیں، دکھانے کو کیا دھرا ہے؟ پیتل تو صاف دکھائی دیتا ہے۔"

"سنار کو دکھایا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"دکھایا کیوں نہیں۔ دکھایا۔ اس نے بھی پیتل بتایا۔ جو تھوڑا بہت بھرم تھا وہ بھی جاتا رہا۔ گھر جا کر کہوں گی تو پھر میری چھاتی پر چڑھ بیٹھے گا۔ بھائی تو کہتا تھا کہ دیوالی تک یہیں رہو۔ کیسے رہ جاتی؟ بچوں کو وہاں چھوڑ آئی ہوں"

"تمہارا گھر والا کام کیا کرتا ہے؟"

"سڑک پر بیٹھ کر تالوں کو چابی لگاتا ہے۔ روپیہ سوا روپیہ بن جاتا ہے۔ اسی سے گھر کا خرچ چلتا ہے۔ ہمارے پاس ستر روپے کہاں سے آئیں گے؟"

"مشکل ہے" میں نے کہا

"اسی سے تو کہتی ہوں کہ ستر روپے کی پھانسی گلے لگ گئی۔ بنا تو اپنے روپے مانگے گا اور وہ میری چھاتی پر چڑھ دوڑے گا۔ کہہ دوں گی کہ میرے پاس کیا دھرا ہے۔ تجھے جو گھر میں دکھائی دیتا ہے، لے لے۔ اور کیا ہوگا مار پیٹ لے گا۔ بلا جیسے آتی ہے ویسے ہی ٹل بھی جاتی ہے۔"

بس چھوٹی لائن کے اسٹیشن پر آکر رکی۔ مسافر اترے بڑھیا بھی اتری اور میں نے کنستر اتارنے میں اس کی مدد کی۔ خاوند کا غصہ اسے ڈرا رہا تھا لیکن بچوں کی تمنا اسے گھر کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔

اس واقعہ کو سال بھر سے زیادہ عرصہ گزر گیا لیکن مجھے بڑھیا کا معصوم چہرا اور ہموار لہجہ کبھی نہیں بھولتا۔ یہ چہرہ یاد آتے ہی میں سوچنے لگتا ہوں کہ بڑھیا اب گھر پہنچ گئی ہوگی۔ اس کا گھر والا غصے میں آگ بگولا ہوا اس کی چھاتی پر چڑھ دوڑا ہوگا اور اسے پیٹ رہا ہوگا۔ بڑھیا بے قصور ہوتے ہوئے بھی سب کچھ چپ چاپ برداشت کر رہی ہوگی، کیونکہ وہ جینا چاہتی ہے!

کشمیر کی دست کاریاں

خورشید احمد

کشمیر اپنے روح پرور مناظر، صحت بخش آب و ہوا، خوب صورت باغات، دل کش سبزہ زار اور جاذبِ نظر پھولوں، لذیذ اور شیریں پھلوں اور میووں ہی کے لیے مشہور نہیں ہے بلکہ اپنی دست کاریوں کے لیے بھی اعلیٰ شہرت کا مالک ہے۔ یہ کہنا خلافِ واقعہ نہ ہوگا کہ دست کاری اہلِ کشمیر کی روح میں سرایت کر چکی ہے اور ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ قوموں کے کردار کی تعمیر ماحول اور گرد و پیش کے حالات ہی سے ہوتی ہے۔ حسین مناظرِ قدرت اور پُرکیف ماحول نے کشمیر کو جہاں حسن کی دولت بخشی ہے وہاں اہلِ کشمیر کے تخیل کو پُرکاری اور اُن کے جذبات کو لطافت بھی عطا کی ہے جو اُن کی فن کارانہ تخلیقات کی آئینہ دار ہے۔

زمانۂ قدیم میں کشمیر کی دست کاریوں کو جو فروغ حاصل ہوا اس کی ایک وجہ اہلِ کشمیر کا وہ ذہنی سکون اور فارغ البالی تھی جو انھیں سادہ زندگی بسر کرنے کی بدولت نصیب تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان کو تمام تفکرات اور اُلجھنوں سے آزاد ہو کر اپنے فن پر توجہ مذکور کرنے کا پورا موقع ملتا تھا۔ اگرچہ زندگی کی سختیوں اور زمانے کی ناسازگاری نے وہ کیفیت باقی نہیں رکھی ہے لیکن کشمیر کے دست کاروں کو اپنے ہنر اور فن سے ابھی تک جس قدر وابستگی ہے وہ اُن کے ذوقِ جمال کی نشاں دہی کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دست کاریاں اُن کے لیے معاش کا ذریعہ ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ ان کا بیش قیمت ورثہ ہے جو انھیں اپنے اجداد سے ملا ہے اور وہ بھی اسے محفوظ رکھنا اپنا مقدس فریضہ سمجھتے ہیں۔

ایک کشمیری فنکار زنجیرہ کا کام کر رہا ہے

کشمیر کی دست کاریوں کی باقاعدہ ترقی اور تنظیم پندرھویں صدی میں سلطان زین العابدین کے عہد میں ہوئی۔ زین العابدین سلطان سکندر کا لڑکا تھا۔ ۱۳۹۸ء میں کشمیر میں سلطان سکندر کی حکومت تھی۔ جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو سکندر نے زین العابدین کو تیمور کے پاس سمرقند بھیجا۔ تیمور نے اُسے نظر بند کر دیا لیکن شہر میں اس کے گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس وقت تیمور سمرقند کو فنونِ لطیفہ اور دست کاریوں کا مرکز بنانے

[illegible] تھا۔ چنانچہ وہ جن ملکوں کو فتح کرتا وہاں کے بہترین فن کاروں اور دست کاروں کو اپنے ساتھ سمرقند لاتا۔ یہی وجہ ہے کہ زین العابدین کو اپنے سمرقند کے قیام کے دوران میں ایشیا کے مختلف حصوں کے فنون لطیفہ اور دست کاریوں کا نہ صرف علم ہوا بلکہ ان سے دلی لگاؤ بھی پیدا ہو گیا جس نے آگے چل کر اسے ایک ہنر پرور بادشاہ بنا دیا۔ ۱۴۲۰ء میں تیمور کے انتقال پر زین العابدین بہت سے فن کاروں کو کشمیر لایا اور یہاں نہ صرف ان دست کاریوں کو اُس نے رائج کیا بلکہ ان کی باقاعدہ تنظیم بھی کی۔ یہ دست کاریاں آج بھی کشمیر میں باقی ہیں۔ مغلوں اور افغانوں کے عہد میں بھی یہاں کی دست کاریاں ترقی پذیر رہیں۔ لیکن سامنت شاہی نظام کے قیام کے بعد سے یہاں کی صنعتیں اور دست کاریاں مائل بہ تنزل ہونے لگیں۔ اور رفتہ رفتہ ان کی حالت خاصی خراب ہو گئی۔ بہر حال کشمیر سے سامنت شاہی نظام کے خاتمے پر ان دست کاریوں کی حالت سدھری ہے جس میں کشمیر کی عوامی حکومت کی توجہ کو بڑا دخل ہے۔ حکومت کشمیر یہاں کی دست کاریوں کی بقا اور ترقی کے لیے ٹھوس اقدامات کر رہی ہے۔

ٹکسٹائل اور دوسری غیر ٹکسٹائل۔ ٹکسٹائل دست کاریوں میں کشیدہ کاری، شال بافی، قالین سازی، گبھّا اور نمدہ سازی وغیرہ دست کاریاں شامل ہیں۔ غیر ٹکسٹائل دست کاریوں میں لکڑی کی نقاشی، پیپر ماشی، چاندی کے ظروف، چمڑے کا سامان، نر، سید کی مصنوعات وغیرہ آتی ہیں۔ یہاں صرف ٹکسٹائل دست کاریوں کا مختصر طور سے ذکر کیا جا رہا ہے۔

کشیدہ کاری کشمیر کی ایک مخصوص اور قدیم صنعت ہے۔ جہاں تک تحقیق سے پتہ چلتا ہے کشیدہ کاری کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی میں سلطان زین العابدین کے دورِ حکومت (۱۴۲۳-۱۴۷۲ء) میں ہوا۔ سلطان زین العابدین اپنی ہنر پروری اور عدل گستری کے باعث بڑا ہر دل عزیز تھا۔ اُس نے ایرانی دست کاروں کی مدد سے کشمیر میں کشیدہ کاری کی صنعت رائج کی۔ سری نگر اور اننت ناگ جو سری نگر سے ۳۴ میل کے فاصلے پر ہے اس صنعت کا خاص مرکز ہیں۔ کشمیر کی کشیدہ کاری اپنے دیدہ زیب ڈزائنوں، خوش نما رنگوں اور دست کاری کے اعلیٰ نمونوں کے لیے دُنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اگرچہ ان ڈزائنوں کی تشکیل اور رنگوں کی ترتیب میں بڑی ندرت ہوتی ہے لیکن بنیادی خیال بالعموم کشمیر کے خوش نما مناظر اور مقامی پھولوں اور پودوں ہی سے استعمال ہوتا ہے۔

کشیدہ کاری کا حسن بھی نرالا اور عجیب ہوتا ہے۔ [illegible] ایک ساتھ مل کر کام کرتے ہیں کیونکہ مخصوص وضع اور ڈزائن کا ماہر سوزن کار یا دست کار ہوتا ہے۔ پہلے نقاش خانہ ساز دوشالی اور چوبی ٹھپے سے اصل ڈزائن کپڑے پر بنا دیتا ہے۔ پھر اُونی اور ریشمی دھاگوں سے جن کے رنگ بڑے ہی خوش نما اور پیارے ہوتے ہیں ان گل بوٹوں کی کڑھائی کی جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو سامان تیار ہوتا ہے وہ کسی ایک دست کار یا کشیدہ کار کی محنت کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ متعدد سوزن کار کی متحدہ کوشش کا ثمرہ ہوتا ہے۔

شال بافی۔ زمانۂ قدیم سے کشمیر شال بافی کے لیے مشہور رہی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دست کاری اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ رامائن اور مہابھارت۔ یہاں کی شالیں دربار زادوں کے نوادر میں شمار ہوتی تھیں۔ افغان اور مغل شہنشاہ غیر ملکوں کو جو تحائف بھیجتے تھے اُن میں کشمیری شالوں کو فوقیت حاصل ہوتی تھی۔

کشمیر کی دوسری دست کاریوں کی طرح شال بافی کو بھی سلطان زین العابدین کے عہد میں بڑا فروغ ہوا اس لیے کہ اُس نے اس قدیم دست کاری کی باقاعدہ تنظیم کی اور اس کی ترقی کے لیے اس نے ترکستانی دست کاروں کو کشمیر بلایا۔ اگرچہ اب کشمیر میں اس قسم کی زیادہ شال نہیں بنتی جیسی قدیم زمانے میں بنتی تھی اور مشین کے بنے ہوئے سستے کپڑوں نے بھی اس دست کاری کو نقصان پہنچایا ہے پھر بھی کشمیری شال کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت بھی سالانہ تقریباً دس ہزار شالیں برآمد ہوتی ہیں۔

کشمیری شال بہترین نرم و ملائم اون سے جو پشمینہ کہلاتا ہے تیار ہوتی ہے۔ یہ اُون تبتی بھیڑوں کا ہوتا ہے جو تبت اور مشرقی لداخ کے بلند خطوں میں پائی جاتی ہیں اور وہیں سے یہ اُون سری نگر میں درآمد ہوتا ہے۔ یہاں عورتیں اُسے چرخے پر کاتتی ہیں۔ جب دھاگہ تیار ہو جاتا ہے تو مخصوص بنکر جو شال بافی کے ماہر ہوتے ہیں کھڈیوں پر بڑی احتیاط کے ساتھ شال کی بُنائی کرتے ہیں۔ اس وقت تقریباً پانچ ہزار افراد شال بافی اور اُس کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ کشمیری شال دو قسم کی ہوتی ہے۔ (۱) کانی اور (۲) املی۔ کانی شال کھڈی پر تیار کی جاتی ہے۔ پہلے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بُن لیے جاتے ہیں اور پھر [illegible] ہے کہ سیون کا پتہ لگانا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ املی شال [illegible] کاری ہوتی ہے۔ کشمیری شال کو جو [illegible]

اور رفاقت، خوش رنگوں کی آمیزش اور سوئی کے باریک ترین کام کی وجہ سے ہے۔ پشمینے کے علاوہ سستے قسم کی اونی شال بھی کشمیر میں تیار ہونے لگی ہے۔ یہ شال مشین کے بُنے ہوئے دھاگے سے تیار کی جاتی ہے جو باہر سے آتا ہے۔ اب امرتسر میں بھی مشین سے دھاگہ تیار ہونے لگا ہے۔ مگر یہ شال ملائمت، گرمی اور پائداری میں پشمینے سے کم تر ہوتی ہے۔ چند سال سے کلّو شال بھی رائج ہو گئی ہے جو مقابلتاً سستی اور خوش نما ہوتی ہے۔ کشمیر کی حکومت نے اس صنعت کو ترقی دینے کے لیے پشمینہ اون سستے داموں پر مہیا کرنے کا انتظام کیا ہے۔

قالین سازی۔ کشمیر کے قدیم ترین قالین جو دستیاب ہوئے ہیں وہ سلطان زین العابدین کے عہد کے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کشیدہ کاری کی طرح قالین سازی کی صنعت کا آغاز بھی اسی بادشاہ کے دور میں ہوا۔ ابتداءً یہاں کے قالین ایرانی وضع کے ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ کشمیریوں نے خود اپنے ڈیزائن ایجاد کیے جو آج بھی بہت مقبول ہیں۔ کشمیر کے قالین اپنی ساخت، رنگوں کی پختگی اور ڈیزائنوں کی ندرت کے باعث کشمیر کی دست کاری کا ایسا نمونہ پیش کرتے ہیں کہ امریکہ اور فرانس کے کارخانوں کے بنے ہوئے قالین ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قالین کی بُنائی سے پہلے ڈیزائن تیار کر لیا جاتا ہے اور کاری گر کی آسانی کے لیے ایک ایک دھاگے کی بُنائی اور گرہ (تاصہ ہاں) ڈالنے کا طریقہ اور عمل لکھ لیا جاتا ہے۔ کاری گر اس کی حرف بہ حرف پیروی کرتا ہے اور مطلوبہ رنگ کے دھاگوں کی مقررہ گرہیں لگاتا جاتا ہے۔ جب گرہیں مکمل ہو جاتی ہیں تو دھاگے کاٹ دیے جاتے ہیں۔ قالین کی دبازت کٹے ہوئے دھاگے کی موٹائی اور لمبائی پر منحصر ہوتی ہے۔ اس وقت کشمیر کی قالین سازی کی صنعت ترقی پر ہے اور بیرونی ملکوں میں بھی ان کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔

گبھا اور نمدہ سازی۔ اس کا شمار بھی کشمیر کی اہم ترین گھریلو صنعتوں میں ہے۔ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس صنعت کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ کشمیر کے سن رسیدہ لوگوں کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ کابل کا رہنے والا ایک شخص عبدالرحمان قصبہ ترال (کشمیر) میں آ کر کابل بھٹ کے یہاں مقیم ہوا اور اس نے اپنے میزبان کے لیے ایک زین تیار کیا جس پر کشیدہ کاری کی گئی تھی اور یہی زین اس صنعت کی بنیاد بنی۔ رفتہ رفتہ اس نے ترقی کر کے گبھوں اور نمدوں کی موجودہ شکل اختیار کر لی۔ یہ بھی ... کشمیر کی چوبی چھتوں کی رہین منت ہے۔
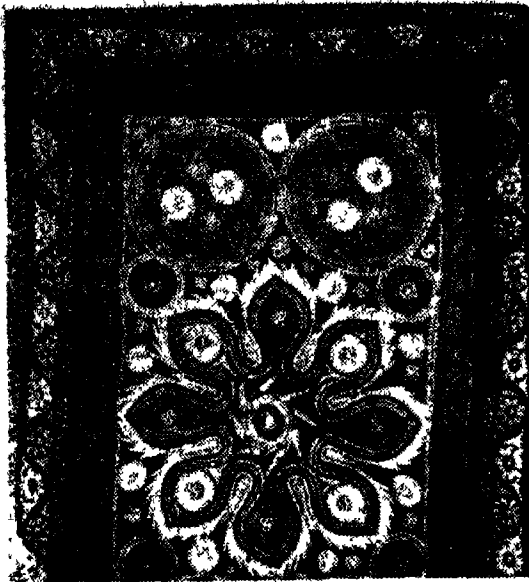
گبھے کا ایک نمونہ

اس زمانے کے ایک ماہر کاریگر کو یہ چھتیں دیکھ کر گبھے اور نمدے بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ کشمیر میں چوبی چھتوں میں لکڑی کے چھوٹے بڑے اور مختلف وضع کے ٹکڑے اس طرح جڑتے ہیں کہ ان سے خوش نما بیل بوٹے اور خوب صورت ڈیزائن تیار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان چھتوں کی وضع دیکھ کر اس کاری گر کی تخلیقی قوت متحرک ہوئی اور اس نے گبھے اور نمدے ایجاد کیے۔ ہو سکتا ہے کہ گبھوں کی ایجاد میں فقیروں کے پیوند دار چوغے محرک بنے ہوں جو اونی کپڑوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے جوڑ کر تیار کیے جاتے تھے۔ بہر حال گبھوں کی ایجاد جس طرح بھی ہوئی ہو یہ یقینی ہے کہ یہ دست کاری سوا سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔ کشمیر کے ایک ہنر پرور حکمراں رنبیر سنگھ کے عہد میں اس دست کاری کو بڑا فروغ ہوا۔

کشیدہ کاری کی طرح گبھا سازی کا خاص مرکز بھی سری نگر سے ۳۴ میل جنوب میں قصبۂ اننت ناگ ہی ہے۔ نمدے سری نگر میں بنتے ہیں۔ گبھا سازی کا طریقہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ گبھوں کے لیے پرانے اور بوسیدہ کمبل اور لوئیاں گھروں سے جمع کر لی جاتی ہیں پھر انھیں دھو کر صاف کیا جاتا ہے اور رنگ لیا جاتا ہے۔ کشمیر میں تین قسم کے گبھے تیار کیے جاتے ہیں۔ ایک وہ جن پر کشیدہ کاری ہوتی ہے۔ یہ پورے پورے کمبل یا لوئی سے بنتے ہیں۔ ...

[illegible]

[illegible] ان گل بوٹوں [illegible] کاری کی جاتی ہے [illegible] کے مختلف رنگ کے [illegible] تراش کر اور انہیں جوڑ کر تیار کیے جاتے ہیں۔ ان گل بوٹوں وغیرہ کے لیے پہلے کمبل یا پٹو کے ٹکڑے رنگ لیے جاتے ہیں اور پھر ان رنگین ٹکڑوں سے مطلوبہ وضع کے پھول پتیاں وغیرہ تراش لی جاتی ہیں۔ یہ گبے بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ تیسری قسم کے گبوں میں گل بوٹے تو اسی طرح تیار کیے جاتے ہیں البتہ ان گل بوٹوں کے درمیان درمیاں میں کشیدہ کاری بھی کی جاتی ہے۔ نمدا موٹے نرم بالوں سے (ہاتھ سے) بنایا جاتا ہے اور اس پر ہلکے اور گہرے رنگ کے اون سے کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔

گبے کی طرح نمدہ سازی بھی کشمیر کی خاص صنعت ہے۔ نمدہ بھی فرش پر بچھانے کے کام میں آتا ہے۔ نمدہ سازی کی صنعت بھی چینی ترکستان سے کشمیر پہنچی۔ ابتداءً نمدے خود کشمیر میں نہیں بنتے تھے۔ بلکہ کچھ عرصے پہلے تک چینی ترکستان سے یہاں آتے تھے۔ کشمیر میں اونی دھاگوں سے ان پر گل بوٹے بنائے جاتے تھے۔ تجارتی پابندیوں کی وجہ سے نمدے باہر سے آنا بند ہو گئے ہیں اور اب کشمیر ہی میں نمدے بھی تیار ہونے لگے ہیں۔ نمدے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ قسم کا نمدہ وہ ہوتا ہے جو خالص اون سے بنتا ہے۔ دوسری قسم کے نمدے میں ستر فی صدی اون اور تیس فی صدی سوت ہوتا ہے اور تیسری قسم کے نمدے پچاس فی صدی اون اور پچاس فی صدی سوت کے بنتے ہیں۔ دوسری [illegible] صنعت [illegible] میں اس کی مانگ [illegible] تھا ایک مدت تک ایک معیار تیار کیا ہے اور دوسری طرف اون اور سوت کی آمیزش کی مقدار پر پابندی عائد کر کے نمدہ کو اعلیٰ [illegible] اس طرح یہ صنعت ایک بار پھر ترقی کر رہی ہے

اونی سامان : کشمیر اپنے نفیس اور ملائم اون کے لیے مشہور ہے۔ یہاں اون کے مختلف سامان مثلاً ڈریسنگ گاؤن، جیکٹ، چوغے، زنانہ کوٹ، ہیٹ، ٹوپیاں وغیرہ تیار کی جاتی ہیں۔ ان چیزوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان پر دل کش اور دیدہ زیب گل کاری کی جاتی ہے۔ کشمیر میں اونی کپڑا ہاتھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ (ہاتھ کے بُنے ہوئے اونی کپڑے میں پٹو (ٹوئیڈ)، پٹی (دبیز کمبل) اور لوئی (ملائم کمبل) بہت مشہور ہے۔ کشمیری ٹوئیڈ نہ صرف گرم اور پائدار ہوتا ہے بلکہ بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ارزاں بھی ہوتا ہے۔

اونی کپڑے کے علاوہ کشمیر میں ریشمی کپڑا بھی کھڈیوں پر تیار کیا جاتا ہے۔ کھڈی پر ریشمی کپڑا بننے والے کاری گروں نے مختلف وضع کے کپڑے بنائے ہیں جن میں سے کچھ مشین سے تیار کیے ہوئے کپڑوں سے بھی بہتر ہوتے ہیں۔ کشمیر کے ریشمی کپڑے پر بلاک پرنٹنگ کی سی چھینٹ بھی چھاپی جاتی ہے۔ یہ کام ایک نجی کارخانے میں ہوتا ہے۔

بادشاہ محل عالم

(بسلسلۂ صفحہ ۲۲)

گوری سارنگیوں پہ بجنے لگی اِک پری وش اُدھر اُچکنے لگی
روپ بان اور گنگری پر تھا سُر کے پلٹوں سے سب کو محو کیا
اس نزاکت سے سُر دکھائی تھی آتے آتے نظر نہ آتی تھی

ایک شوخ کردار کو اِس طرح پیش کرتی ہیں ؎

تھی مگر دل پذیر اک بے باک اُچپلی، گرم، ڈھیٹھ اور چالاک

ہجراں نصیب لڑکیوں کی شام کے وقت بے قراری کس عمدگی سے ظاہر کی ہے ؎

گھر میں جب شام چراغ جلنے لگے اُن کے سینے کے داغ جلنے لگے

شہزادے اور شہزادی کی ملاقات ہوتی ہے اور شہزادہ قریب آتا ہے تو شہزادی کہتی ہے ؎

اِک ذرا ہٹ کے پاس سے بیٹھو سنبھلو صاحب! حواس سے بیٹھو

مثنوی کے خاتمے پر جانِ عالم کے لیے دُعا کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی جانِ عالم کی زندگی ہی میں مکمل ہوئی تھی ؎

جو پڑھے جو لکھے اُسے جو لاہے اس کو عیش و طرب [illegible]

[illegible]

تیسرے پنج سالہ منصوبے پروگرام کے چار زمرے ● ● ● اناج کی پیداوار کے عارضی نشانے ● ● ● انسانی طاقت کے وسائل کا استعمال ● ● ● خدمتی امداد باہمی انجمنیں ● ● ● بہتر بیج کی پیداوار کا پروگرام ● ● ● رام گنگا پل کی تعمیر ● ● ● مشرقی اضلاع میں آمد و رفت کی سہولتیں ● ● ● بنیادی اور سماجی علوم میں تحقیق ● ● ● بصری طریقوں سے پیشہ ورانہ رہنمائی ● ● ● ایک مثالی گاؤں ● ● ● پیشہ ورانہ رہنمائی کا پروگرام ● ● ● چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی تعریف ● ● ● بدری ناتھ — کیدار ناتھ یاترا کی سہولتیں ● ● ● اوزار سازی کی صنعت کے لیے درخواستیں ● ● ● متفرقات

ریاست کے تیسرے پنجسالہ منصوبہ کو چار زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے زمرہ کے تحت ایسے پروگرام آتے ہیں جو گاؤں یا بلاک کی سطح پر بلاک کے عملہ کی تکنیکی رہنمائی میں تمام تر مقامی محنت اور وسائل سے مکمل کئے جائیں گے۔ اس زمرہ میں ایسے پروگرام بھی شامل ہوں گے جو شرم دان اور مقامی عوام اور پنچایت کے ذریعہ جمع کئے گئے سرمایہ سے پایۂ تکمیل کو پہونچیں گے۔ اس نوعیت کے پروگرام میں تالابوں، بندھیوں اور نالیوں کی مٹی اور پانی کا تحفظ اور دیگر زراعتی پروگرام شامل ہوں گے۔

دوسرے زمرہ کے تحت ایسے پروگرام ہوں گے جو عوام بلاک اور گاؤں کی سطح پر ضلع اور بلاک کی مالی اور تکنیکی امداد کے ذریعہ مکمل کریں گے۔ اس میں کنوؤں کی کھدائی، پلیوں، پرائمری اسکول کی عمارتوں اور ڈسپنسریوں کی تعمیر وغیرہ کے پروگرام شامل ہوں گے۔

تیسرے زمرہ میں پیچیدہ اسکیمیں شامل ہوں گی جن پر محکموں کی جانب سے عملدرآمد ہوگا لیکن اس ضمن میں عوام کے مقامی نمائندوں سے صلاح و مشورہ کیا جائے گا۔ یہ اسکیمیں اسپتالوں اور ہائر سکنڈری اسکولوں کی تعمیر، ٹیوب ویل لگانے، پیداواری کارگاہوں کے قیام اور سڑکوں اور پلوں کی تعمیر سے متعلق ہوں گی۔

چوتھے زمرہ کے تحت صنعت، آبپاشی اور بجلی کے بڑے منصوبے آئیں گے جن پر ریاست کی سطح پر سرکاری وسائل یا نجی صنعت کاروں کے ذریعہ عملدرآمد ہوگا۔

● ● ●

ریاستی حکومت نے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے تحت مزید اناج کی پیداوار کے عارضی نشانے مقرر کئے ہیں۔ مختلف ڈویژنوں کے لئے مقررہ نشانوں (ٹن میں)

کا تقسیم حسب ذیل ہے۔

میرٹھ ـ ۔۔۔۵۹۰ ـ آگرہ ـ ۔۔۔۹۰۴ ـ جھانسی ـ ۔۔۔۔۴۹

وارانسی ـ ۔۔۔۵۴۴ ـ گورکھپور ـ ۔۔۔۔۶۱۲ ـ لکھنؤ ـ ۔۔۔۶۲۹ ـ

بدھیلکھنڈ ـ ۔۔۔۵۹۸ ـ الہ آباد ـ ۔۔۔۶۶۷ ـ فیض آباد ـ ۔۔۔۶۷۹

اور کمایوں ۔۔۔۷۰۳ ـ

اناج کی پیداوار کی مہم کے علاوہ مٹی اور پانی کے تحفظ کے ایک عام پروگرام پر بھی عملدرآمد کیا جائے گا۔ یہ پروگرام چھوٹے بند بنانے، دریابرآمد مٹی کی سطح برابر کرنے، پھلی دار فصلوں کی کاشت، ایندھن اور عمارتی لکڑی کے درخت لگانے اور گاؤں کی افتادہ زمینوں میں بہتر قسم کی گھاس اگانے وغیرہ پر مشتمل ہوگا۔

ہر گرام سیوک کے حلقہ کے ہر سرگرم بلاک میں ۲۵ ایکڑ کی یونٹوں میں تمام گرام سیوک اور پرانتیہ رکھشک دل کے بلاک آرگنائزر اس پروگرام کی تکمیل کریں گے۔ مٹی اور پانی کے تحفظ کے ذریعہ زراعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے یہ یونٹیں مظاہرہ مرکزوں کی حیثیت سے کام کریں گی۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پرانتیہ رکھشک دل کے بلاک آرگنائزروں کو مٹی اور پانی کے تحفظ کی بنیادی باتوں کی پہلے سے معقول تربیت دی جا چکی ہے۔

• • •

ریاست کے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے تحت گاؤں اور بلاک کے منصوبوں کا مقصد زراعتی پیداوار بڑھانے کے لئے انسانی طاقت کے جملہ وسائل کو پورے طور پر بروئے کار لانا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے ذریعہ ایسے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ روزگار کے مواقع بہم پہنچانا ہے جن کو اس وقت پورے سال کے لئے روزگار دستیاب نہیں ہے۔

ڈیولپمنٹ کمشنر نے تمام ضلع مجسٹریٹوں کے نام اپنی ایک گشتی چٹھی میں اس امر پر زور دیا ہے کہ دیہی علاقوں میں مزید روزگار کے مواقع بہم پہنچانے کے لئے آبپاشی اور کھیتی کے جدید طریقوں کے ذریعہ زراعتی پیداوار بڑھانے اور بڑے پیمانہ پر پروسسنگ یا دوسری صنعتوں کی ترقی کے اقدامات کرنا چاہئیں۔ چٹھی میں مزید کہا گیا ہے کہ انسانی طاقت کے وسائل کو بروئے کار لانے کے لئے ہر ایک دیہی علاقہ میں کاموں کا جامع پروگرام مرتب کرنا ضروری ہے۔

کاموں کا پروگرام چار زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے اول ایسے کام جو ریاست اور لوکل باڈیز کے منصوبوں میں شامل ہیں اور جن کی تکمیل کے لئے غیر ہنرمند اور نیم ہنرمند مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ دوئم ایسے کام جو ان سے براہ راست مستفید ہونے والے یا مقامی لوگ مکمل کرتے ہیں۔ سوئم ایسی اسکیمیں جن کے تحت گاؤں والوں کے لئے نفع بخش کام کئے جائیں۔ چہارم ایسے ترقیاتی کام جن کو مقامی حکومت کی کچھ مالی امداد سے مکمل کرتے ہیں۔

پہلے زمرہ کے تحت آبپاشی، انسداد سیلاب، زمین کو قابل کاشت بنانے، مٹی کے تحفظ، اور بڑی سڑکوں اور پلوں کی تعمیر وغیرہ کے منصوبے آتے ہیں۔ یہ کام عام طور پر متعلقہ محکمہ جات ٹھیکیداروں کے ذریعہ مکمل کراتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ کوشش کی جائے گی کہ ان کاموں کی تکمیل میں حتی الامکان مقامی لوگوں کو شریک کیا جائے۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ ایک مقررہ حد تک گاؤں پنچایتوں اور مزدوروں کی امداد باہمی انجمنوں کے ذریعہ ایسے کاموں کی تکمیل ہوگی۔

دوسرے زمرہ کے تحت کھیتوں کی نالیوں کی تعمیر اور ان کی دیکھ بھال اور مٹی کے تحفظ کے کام وغیرہ آتے ہیں۔

تیسرے زمرہ کے تحت گاؤں والوں کے لئے نفع بخش کام آتے ہیں جیسے تالابوں، اور پنچایت گھروں کی تعمیر، پانی کی نکاسی اور مشترکہ چراگاہوں وغیرہ کی اسکیمیں۔

چوتھے زمرہ کے تحت ہر ایک گاؤں کے لئے پینے کے صاف پانی اور ۶ سال سے لے کر ۱۱ سال تک کے بچوں کو ابتدائی تعلیم کا بندوبست وغیرہ آتے ہیں۔

• • •

تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے تحت ریاست بھر میں امداد باہمی انجمنوں کا جال بچھانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ منصوبہ کی مدت میں یہ کوشش کی جائے گی کہ دیہی علاقوں میں تمام کنبے ان انجمنوں کے دائرہ اثر میں آجائیں۔ اس امر کے پیش نظر کہ گاؤں کے کچھ لوگ شاید ان انجمنوں کے ممبر بننے میں دلچسپی نہ لیں، دیہی کنبوں کے [illegible]

مقرر کیا گیا ہے۔

یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ نو تشکیل امداد باہمی انجمنوں کا دائرہ عمل وہی رکھا جائے جو گاؤں سبھاؤں کا ہے تاکہ بعد میں کسی بھی مرحلہ پر ان کو خدمتی امداد باہمی انجمنوں میں تبدیل کیا جا سکے۔ ایک دیہی امداد باہمی انجمن دو یا تین گاؤں سبھاؤں کو ملا کر قائم کی جا سکے گی بشرطیکہ گاؤں والے اس کے لئے متفق ہوں اور اس کی کل آبادی تقریباً ایک ہزار ہو۔

ہر بلاک میں جن گاؤں سبھاؤں میں یکم اپریل سنہ ۱۹۶۱ء تک خدمتی امداد باہمی انجمنوں کا قیام عمل میں نہ آیا ہوگا وہاں کے لئے پروگرام بنایا جائیگا جو تیسرے منصوبہ کے پہلے دو برسوں میں مکمل کیا جائے گا۔

پس ماندہ یا منتشر آبادی کے پہاڑی اضلاع کے علاقوں میں قرضہ دینے کے لئے قرضہ یونینیں، اور دوسرے کاموں کے لئے دیہی امداد باہمی انجمنیں قائم کی جائیں گی منصوبہ کے پہلے دو برسوں کے دوران ۲۰ قرضہ یونینیں قائم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

ہر ایک بلاک میں ایسی انجمنوں کی جو بند ہو گئی ہیں یا پورے طور پر کام نہیں کر رہی ہیں نو تنظیم کی جائے گی تاکہ منصوبہ کی مدت کے آخر تک یہ انجمنیں وہ تمام سہولتیں فراہم کر سکیں جو خدمتی امداد باہمی انجمنیں مہیا کرتی ہیں۔

تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے آخر تک امداد باہمی انجمنوں کے ممبروں کی کل تعداد ۵،۰ لاکھ ہو جانے کی امید ہے۔ ان ممبروں کے قرضے دینے کے لئے ۱۰۰ کروڑ روپیہ فراہم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے جس میں سے ۵،۰ کروڑ روپیہ کے قلیل مدت، ۱۵ کروڑ روپیہ کے درمیانی مدت اور ۱۰ کروڑ روپیہ کے طویل مدت کے قرضے دیے جائیں گے۔

• • •

تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے تحت بہتر بیجوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے ہر بلاک میں تین امداد باہمی اور ایک زراعتی بیج گودام اور ۲۰ ایکڑ کا ایک فارم ہوگا۔ اور اس سلسلہ میں گاؤں اور بلاکوں کا منصوبہ ہر ایک بیج گودام کی بنیاد پر بنایا جائے گا۔ جس میں کم سے کم ۲ ہزار من بہتر بیج کا اسٹاک ہوگا۔ اس ضمن میں ہر ضلع سے اپنا پروگرام بنانے کے لئے کہا گیا ہے

ایسے اضلاع میں جو ٹڈی کے حملوں سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہیں سرگرم بلاکوں کے علاقوں میں یہ پروگرام شروع کئے جائیں گے۔

یہ پروگرام کانپور۔ اناو۔ سیتاپور۔ بدایوں۔ فتح گڈھ۔ جونپور۔ غازی پور اور لکھیم پور کھیری کے اضلاع میں شروع کرنے کی تجویز ہے۔

منصوبہ کی مدت میں مذکورہ اضلاع میں ہر ایک گرام سیوک کے حلقہ میں تقریباً ۲۰۰ ایکڑ زمین میں مقامی لوگوں کی مدد سے مٹی اور پانی کے تحفظ کا کام شروع کرنے کی تجویز ہے۔

• • •

رام گنگا کے پل پر جو بریلی متھرا روڈ پر اس وقت زیر تعمیر ہے جولائی سنہ ۱۹۶۱ء سے آمد و رفت شروع ہو جائے گی۔ ریاست کی بڑی سڑکوں کے پلوں میں یہ سب سے لمبا پل ہے۔

اس کا ذیلی ڈھانچہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے اور بیموں کے ڈھالنے کے کام کی رفتار بھی روبہ ترقی ہے۔ بیموں کے ڈھالنے کے بعد ان کو نصب کر دیا جائے گا۔

پل تک جا رہی سڑک کے راستہ میں ۷۰ لاکھ مکعب فیٹ مٹی کا کام ہو چکا ہے اور سردار نگر نالہ پر ۴۱ فیٹ لمبے پل کی تعمیر کا کام بھی تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔

رام گنگا کا پل ۲۲۰۰ فیٹ لمبا اور ۲۴ فیٹ چوڑا ہوگا اور اس میں ۱۴ در ہوں گے۔ اور ملک کے تمام پری اسٹرسڈ کنکریٹ کے بنے پلوں میں اس کا شمار کیا جائے گا اور اس پر سے زیادہ سے زیادہ بوجھ برداشت کرنے کی صلاحیت ہوگی۔

اس پل کی تعمیر جس پر تقریباً ۷۰ لاکھ روپیہ صرف ہونے کا اندازہ ہے ۱۹۵۷ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کے مکمل ہونے کے بعد ریاست کے مغربی حصوں میں ہر موسم میں آمد و رفت کی سہولتیں فراہم ہو جائیں گی۔

• • •

مشرقی اضلاع اور ریاست کے دوسرے حصوں کے درمیان سڑک کے ذریعہ آمد و رفت کی سہولتوں کی فراہمی کے لئے راپتی اور گھاگرا پر تقریباً چار کروڑ روپیہ کی لاگت سے تعمیر کئے جا رہے ہیں۔

لکھنؤ گورکھپور روڈ پر راپتی کے اوپر بوڈ گھاٹ پل۔ گورکھپور۔ غازی پور۔ وارانسی شاہراہ پر گھاگرا کے اوپر دھری گھاٹ پل۔ اور لکھنؤ گورکھپور سڑک پر سرجو ندی کے اوپر پل کی تعمیر کی تکمیل سے ریاست

کے مشرقی اضلاع میں ہر موسم میں آمد و رفت کے لئے موثر سڑکوں کا جال بچھ جائے گا۔

راپتی کے اوپر اونچی سطح کا پل نہ ہونے سے برسات کے موسم میں ریاست کے مغربی علاقوں سے سڑک کے ذریعہ گورکھپور شہر جانا بہت دشوار ہوتا ہے۔

راپتی کے اوپر ۴۳ء۱۴ لاکھ روپیہ کی تخمینی لاگت سے ۱۳۴۳ فیٹ لمبے پل کی تعمیر نومبر ۱۹۵۸ء میں شروع کی گئی تھی۔ اور یہ امید کی جاتی ہے کہ یہ پل آئندہ سال میں مکمل ہو جائے گا اور آمد و رفت کے لئے کھول دیا جائے گا۔ اس پل پر دونوں طرف ۲۴ فیٹ چوڑی سڑک اور پانچ فیٹ چوڑا پیدل راستہ ہوگا۔

لکھنؤ۔ گورکھپور شاہراہ پر اجودھیا کے قریب سرجو ندی کے ۳۲۵۴ فیٹ لمبے پختہ پل کی تعمیر کے لئے ۸۰ لاکھ روپیہ کی لاگت سے گائڈ بند تعمیر ہو گئے ہیں۔ یہ پل ڈیڑھ کروڑ روپیہ کی لاگت سے تعمیر ہوگا۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سال برسات کے بعد اس کی تعمیر شروع ہو گی۔ اس پل کی تعمیر سے مشرقی اتر پردیش کی اقتصادی ترقی میں بہت مدد ملے گی۔

دھری گھاٹ کے مقام پر گھاگرا کے اوپر پل کی تعمیر کے لئے خاکے اور تخمینے تیار کئے جا رہے ہیں اس پل کی تعمیر پر تقریباً ۹۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

• • •

تحقیق رابطہ کانفرنس نے جس کا جلسہ لکھنؤ میں حال میں ریاستی ادارۂ منصوبہ بندی تحقیق اور عمل کے زیر اہتمام ہوا، بنیادی متعلقہ اور سماجی علوم میں تحقیق کے درمیان رابطہ قائم کرنے اور اس سے اور زیادہ مفید نتائج حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

اس کانفرنس میں جس کا افتتاح وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند نے کیا، تقریباً ۹۰ ممتاز سائنس دانوں، تحقیقی اداروں کے ڈائرکٹروں، تعلیمی اور تحقیقی اداروں کے ایڈمنسٹریٹروں، ترقیاتی کاموں میں سرگرم عمل مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے نمائندوں اور ایسے مسائل میں دلچسپی رکھنے والے عوامی لیڈروں نے شرکت کی۔

تحقیقی سرگرمیوں میں رابطہ کے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کے تفصیلی مطالعہ کے لئے مندوبین نے اپنے کو پانچ گروپوں میں تقسیم کر لیا۔

کانفرنس نے ان گروپوں کے مشوروں سے اتفاق کرتے ہوئے اس امر کی پر زور سفارش کی ہے کہ مختلف تحقیقی سرگرمیوں میں موثر رابطہ قائم کرنے کے پیش نظر وزیر اعلیٰ کی صدارت میں جلد ہی تحقیق میں رابطے سے متعلق ایک ریاستی بورڈ قائم کیا جائے۔ کانفرنس نے اس سلسلہ میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ یہ بورڈ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے شعبہ جات۔ یونیورسٹیوں اور نجی اداروں کے نمائندہ سائنسدانوں اور تحقیق کرنے والوں پر مشتمل ہو۔

کانفرنس کی مزید تجویز یہ ہے کہ اس بورڈ کے تحت متعدد چھوٹے بورڈ قائم کئے جائیں جو اس کی رہنمائی اور نگرانی میں زراعت، نگہداشت مویشیان، ٹیکنالوجی، صحت عامہ، اور سماجی علوم وغیرہ سے متعلق تحقیقی سرگرمیوں میں رابطہ قائم کریں۔

کانفرنس نے یہ بھی تجویز پیش کی ہے کہ مذکورہ بورڈ کو ریاست میں تحقیقی سرگرمیوں سے متعلق ڈائجسٹ نکالنے کے علاوہ سیمیناروں اور کانفرنسوں کے انعقاد کا بند و بست کرنا چاہئے۔

سماجی علوم میں تحقیق کی اشد ضرورت کے پیش نظر کانفرنس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بورڈ کو رابطہ قائم کرنے اور رہنمائی سے متعلق اپنے لائحہ عمل کے بارے میں اپنے قیام کے فوراً بعد فیصلہ کرنا چاہئے۔

تحقیق میں رابطے سے متعلق گروپ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ رابطہ کا مفہوم کسی صورت میں بھی بہت زیادہ قید و بند عائد کرنا نہیں ہو۔ گروپ نے اس امر پر بھی زور دیا ہے کہ تحقیق کے سلسلہ میں افراد کو پہل کرنے اور اپنے نقطہ ہائے نظر پیش کرنے کے مواقع بہم پہنچانا چاہیے۔

کانفرنس نے دوسرے گروپ کی یہ سفارش منظور کی کہ بورڈ کو عام آدمی پر اثر انداز ہونے والے مختلف مسائل مناسب تحقیقی اداروں کو بھیج دینا چاہئیں اور اسے بنیادی تحقیق کو مناسب اہمیت دینا چاہئے۔ اس گروپ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ تجربات کے ذریعہ تحقیق کے نتائج کی افادیت معلوم کرنا چاہئے۔

تیسرے گروپ نے ترقی کے میدان میں تحقیقی سرگرمیوں میں رابطہ قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

ریاست میں تحقیقی وسائل کو بروئے کار لانے سے متعلق گروپ نے

[illegible] اور علاوہ ازیں ان سے متعلق وسائل کا اندازہ لگانے کی تجویز پیش کی۔

ایک گروپ نے یہ سفارش کی ہے کہ سماجی اور اقتصادی تعمیر سے متعلق ریسرچ کونسل کو ضرورت پڑنے پر سماجی تحقیق کے موضوعات کے انتخاب کے سلسلہ میں رہنمائی کرنا چاہیے۔ اس گروپ نے یہ بھی تجویز پیش کی ہے کہ خاندان میں سماجی تبدیلیاں لانے کے لیے بچوں اور عورتوں کے موضوعات سے متعلق خصوصی طور پر تحقیق کی جائے۔

• • •

نوجوانوں کے روزگار سے متعلق ریاستی مشاورتی کمیٹی نے اس امر پر زور دیا ہے کہ نوجوانوں کو اپنے پیشوں کے انتخاب میں مدد دینے کے لئے بصری طریقوں کو اپنایا جائے۔ کمیٹی کے خیال میں مختلف نوعیت کے پیشوں سے متعلق عملی مظاہروں کے ذریعہ نوجوانوں کو اپنے لئے موزوں ترین پیشہ کا انتخاب کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ اس امر کے پیش نظر کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ طلبا کی جماعتوں کو وقتاً فوقتاً ریلوے اور روڈویز کی ورکشاپوں وغیرہ میں لے جایا جائے تاکہ وہ مختلف پیشوں کے بارے میں موقع پر ضروری معلومات حاصل کر سکیں۔

کمیٹی نے جس کا جلسہ حال ہی میں شری جی۔ آر۔ ناگر ڈائرکٹر محکمہ تربیت اور روزگار کی صدارت میں ہوا اس خیال کا اظہار کیا کہ پیشہ ورانہ رہنمائی اسکول کے مرحلہ پر شروع ہونا چاہیے اور طلبا کو ماڈلوں، نقشوں، فلموں، لٹریچر اور لکچروں کے ذریعہ مختلف پیشوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کیلئے تمام اسکولوں میں پیشوں سے متعلق معلومات کی فراہمی کے واحدوں کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔ طلبا کو اپنی پسند کے پیشوں کی خاص خاص باتوں اور متعلقہ سہولتوں اور مواقع کے بارے میں پوری واقفیت ہونا چاہیے۔

پیشہ ورانہ رہنمائی کے پروگرام کو اور زیادہ جامع اور موثر بنانے کے پیش نظر کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پیشہ ورانہ رہنمائی اور محنت اور تعلیم کے محکموں کے پروگراموں کے درمیان مکمل رابطہ ہونا چاہیے۔ کمیٹی کے خیال میں محکمہ تعلیم کو نوجوانوں کے میلان طبع کے مطالعہ پر اپنی پوری توجہ دینا چاہیے اور محکمہ محنت کو پیشہ ورانہ رہنمائی کے پروگرام بہتر بنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو کلرکی کے کاموں کے بجائے دوسرے کاموں کی جانب متوجہ کرنے کی تدابیر پر غور کرتے ہوئے کمیٹی نے یہ رائے ظاہر کی کہ نوجوانوں کو باغبانی اور مرغبانی وغیرہ جیسے کاموں کو شروع کرنے پر آمادہ کرنا چاہیے اور ان کو اس سلسلہ میں ضروری سہولتیں بہم پہنچانا چاہیئے۔ کمیٹی نے یہ محسوس کیا کہ اس ضمن میں اس وقت تک خاطر خواہ کامیابی نہیں حاصل ہو سکتی جب تک ہاتھ کی محنت کے کام کیلئے سماج کے نقطہ نظر میں تبدیلی نہیں ہوتی اور طلبا میں محنت کے وقار کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔

مذاکرات کا آغاز کرتے ہوئے شری ناگر نے بتایا کہ ریاستی حکومت کی جانب سے اب تک پیشہ ورانہ رہنمائی کے پانچ واحدے قائم کیے گئے ہیں اور مالی سال رواں میں ایسے مزید چار واحدے قائم کیے جائیں گے علاوہ ازیں علی گڑھ اور بنارس کی یونیورسٹیوں میں دو روزگار بیورو کھولے گئے ہیں۔

• • •

ضلع آگرہ میں لارنڈا گاؤں اس وقت منظر عام پر آیا جب امریکہ کے صدر آئزن ہوور اپنے ہندوستان کے حالیہ دورہ کے دوران وہاں گئے۔ یہ گاؤں اجتماعی ترقیاتی پروگرام کے تحت ترقی کا آئینہ دار ہے۔ اس کی حسن کارکردگی کے پیش نظر کچھ لوگوں کا یہ خیال غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ ہمارے اجتماعی منصوبے غیر ملکیوں کے صداقت ناموں کے سہارے زندہ ہیں۔

اس گاؤں میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اس حقیقت کا احساس وہاں جانے سے ہی ہو سکتا ہے کیونکہ مشاہدہ اصل یقین ہے۔ اس گاؤں کے ۸۳۵ باشندوں نے اپنا مقدر آپ بنانے کا عزم کیا ہے۔ اجتماعی ترقیاتی پروگرام کے تحت وہ اپنی سماجی اور اقتصادی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ گاؤں کے ۱۰۴۰ ایکڑ کے کل رقبہ میں سے ۹۵۸ ایکڑ زمین زیر کاشت ہے۔ اور کل رقبہ کے ۹۵ فیصدی میں بہتر قسم کے بیج بوئے گئے ہیں۔ کاشت کے جدید طریقوں کو اپنانے سے گیہوں کی پیداوار میں ۵۰ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔

گاؤں والوں کو تحریک امداد باہمی کی افادیت کا بخوبی احساس

ہے اور ان کے ۱۰ فیصدی کیلئے امداد باہمی انجمنوں کے ممبر ہو گئے ہیں امداد باہمی انجمنوں کے ذریعہ جو اناج فروخت ہوتا ہے اس کی مالیت ۱۰ ہزار روپیہ ہے۔

انسدادی ٹیکوں اور گاؤں والوں کی احتیاطی تدابیر کی بنا پر گزشتہ چار برسوں سے گاؤں میں مویشیوں کی کوئی بیماری نہیں پھیلی ہے۔ گاؤں میں مرغیوں اور سوروں کی پرورش گاہ کے قیام سے گاؤں والوں کی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے۔

اس گاؤں کی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ ہر طرف صاف ستھرا ماحول ہے۔ نہ کہیں مکھیاں ہیں اور نہ گرد وغبار یہاں سڑکوں اور گلیوں میں اینٹیں بچھی ہوئی ہیں۔ گاؤں کی فضا میں رہٹ اور جدید زرعی آلات کی صدائے بازگشت اس کی ترقی اور خوشحالی کی نشاندہی کرتی ہے۔

• • •

حکومت اترپردیش نے پیشہ ورانہ رہنمائی کے پروگرام میں رابطہ قائم کرنے کے لئے آٹھ ممبروں پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ نظامت تربیت اور روزگار کے پانچ واحدوں اور محکمۂ تعلیم کے نفسیات بیورو کے منطقائی اور ضلع واحدوں کے ذریعہ اس وقت پیشہ ورانہ رہنمائی کی جا رہی ہے۔ ان واحدوں کے ذریعہ نوجوانوں کو ان کے فطری رجحان اور ضروری استعداد کے پیش نظر تعلیم اور پیشے کے انتخاب کے سلسلے میں مشورے دیئے جاتے ہیں۔

کمیٹی اس امر کا خیال رکھے گی کہ امیدواروں کی صلاحیت اور ان کے میلان طبع سے متعلق معلومات۔ پیشوں سے متعلق کتابچوں اور روزگار کی صورت حال کے بارے میں رپورٹوں سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ علاوہ ازیں کمیٹی ایسی تجاویز پر بھی غور کرے گی جن کے ذریعہ روزگار دفتروں اور اسکولوں میں اجتماعی اور انفرادی طور پر تبادلہ خیالات کے ذریعہ پیشہ ورانہ رہنمائی کے طریقہ کار کو بہتر بنایا جا سکے۔

طلبا کے مفاد کے پیش نظر اسکولوں میں پیشوں کے انتخاب سے متعلق کانفرنسوں کا انتظام کیا جائے گا اور روزگار دفتروں اور اسکولوں میں فلمیں دکھائی جائیں گی۔

کمیٹی اسکولی لڑکوں کو صنعتی مرکزوں میں لے جانے کا بھی انتظام کرے گی۔

لیبر سکریٹری اس کمیٹی کے چیرمین اور ریاستی پیشہ ورانہ رہنمائی افسر اس کے سکریٹری ہیں۔ کمیٹی کے دیگر ممبروں میں ڈپٹی سکریٹری لیبر شری ایس۔ اے۔ احمد۔ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم۔ ڈائرکٹر ریاستی نفسیات بیورو اور ڈائرکٹر تربیت اور روزگار وغیرہ شامل ہیں۔

• • •

مرکزی حکومت کی جانب سے چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی جو نئی تعریف کی گئی ہے اسکے مطابق اب اس زمرہ میں ایسے تمام صنعتی واحدے شامل ہو جائینگے جس میں لگا ہوا اصل سرمایہ ۵ لاکھ روپے سے زائد نہ ہوگا چاہے اس میں کتنے ہی آدمی کام پر لگے ہوں۔

مذکورہ تعریف کے تحت لگے ہوئے سرمایہ میں وہ سرمایہ بھی شامل کیا جائے گا جو غیر منقولہ اثاثہ جیسے زمین عمارت اور مشینوں وغیرہ میں لگا ہوا ہوگا۔ ایسی صورت میں جبکہ صنعتی واحدہ کرایہ کی عمارت میں ہو۔ لگے ہوئے سرمایہ کی مقررہ حد کے تعین میں ایسی عمارتوں کی اصل مالیت کو بھی شامل کیا جائے گا لیکن اس سلسلہ میں مزدوروں کے مکانات اور ان کو فراہم کی گئی آسائشوں پر صرف کی جانے والی رقم شامل نہیں کی جائے گی۔

اس نئی تعریف سے چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے اور اب اس کے تحت متعدد درمیانی درجہ کی صنعتیں آجائیں گی اور صنعتی واحدوں کی بڑی تعداد مرکزی اور ریاستی حکومت کی جانب سے دی جانے والی مختلف قسم کی تکنیکی اور مالی امداد پانے کی مستحق ہو جائے گی۔

• • •

تیرتھ گاہوں کے یاتریوں کے لئے بدری ناتھ۔ کیدارناتھ کے راستہ پر ہر قسم کی سہولتیں مہیا کر دی گئی ہیں۔ تاہم یاتریوں کو خود اپنے مفاد کے پیش نظر ایسی احتیاطی تدابیر کرنا چاہئیں تاکہ وہ ناگہانی پریشانیوں سے محفوظ رہ سکیں۔

یاتریوں کو چاہیئے کہ وہ روانہ ہونے سے پہلے ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے لے لیں اور اس سے متعلق سرٹیفکٹ اپنے ہمراہ لے جائیں

سڑکیں نہ ہونے پر یاتریوں کو رشی کیش یا کوٹ دوار پہونچنے پر ٹیکے لینا پڑیں گے۔

یاتریوں کی سہولت کے لئے رودر پریاگ۔ پیپل کوٹی۔ اور جوشی مٹھ میں قلیوں گھوڑوں اور ڈانڈیوں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یاتریوں کے لئے راستے کے گوداموں میں اناج کا کافی اسٹاک جمع کر دیا گیا ہے۔

کیدار ناتھ جانے والے یاتری گنڈ چٹی تک موٹر میں سفر کر سکتے ہیں لیکن بعد کے ۲ میل کا سفر پیدل۔ گھوڑے یا ڈانڈیوں کے ذریعہ طے کرنا ہوگا۔

اگرچہ پیپل کوٹی سے جوشی مٹھ تک موٹر سڑک کی تعمیر ہو گئی ہے لیکن معمولی سی بارش سے کبھی یہ راستہ بند ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں یاتریوں کو پیپل کوٹی سے بدری ناتھ تک کا راستہ پیدل گھوڑے یا ڈانڈیوں سے طے کرنا ہوگا۔

بدری ناتھ کے دوار ۲ر مئی سے درشن کے لئے کھلیں گے۔

• • •

ریاستی نظامت صنعت کی جانب سے فی واحدہ ۱۰ لاکھ روپیہ کے اصل سرمایہ سے مشینوں کے اوزار بنانے کے پلانٹ لگانے کی ایک اسکیم شروع کی جا رہی ہے۔

ریاست میں اوزار سازی کی صنعت کی ترقی کے روشن امکانات ہیں۔ تیسرے پنج سالہ منصوبہ میں صنعتی ترقی کو نمایاں اہمیت دیے جانے کے پیش نظر مستقبل قریب میں مشینوں کے اوزار کی مانگ میں بہت زیادہ اضافہ ہونے کی امید ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق ایسے اوزاروں کی کل مانگ میں سالانہ تقریباً ۲۰ فی صدی کے اضافہ کی امید ہے۔

ایسے واحدے قائم کرنے کے خواہشمند صنعت کاروں کو انڈسٹریل ڈیولپمنٹ اینڈ ریگولیشن ایکٹ سنہ ۱۹۵۱ء کے تحت لائسنسوں کے اجرا کے لئے اپنی درخواستیں متعلقہ ڈسٹرکٹ انڈسٹریز افسر کے توسط سے ڈائرکٹر آف انڈسٹریز (ہیوی اینڈ سٹرزیکشن)۔ یو۔ پی کانپور کو بھیجنا چاہئیں۔

مُتفرقات

تصویر ضبط۔ حکومت اترپردیش نے کتاب بعنوان "تاریخ ایران" (ہسٹری آف پرشیہ) کی جلد اول کے مقابل صفحہ پر شائع شدہ پیغمبر اسلام حضرت محمد اور حضرت جبرئیل کی تصویر ضبط کر لی ہے۔ حکومت کو یقین ہے کہ مذکورہ تصویر کی اشاعت کا مقصد دیدہ و دانستہ اور بد دیانتی کے ساتھ ہندوستان کے مسلم شہریوں کے مذہبی اعتقادات کی اہانت کرنا اور ان کو ٹھیس پہنچانا ہے۔ اس لئے حکومت نے مذکورہ تصویر اور ایسی تمام دستاویزات جن میں تصویر دوبارہ شائع کی گئی ہو بحق حکومت ضبط کرنے کا اعلان کیا ہے۔

پولیس ایکٹ نافذ۔ حکومت اترپردیش نے ضلع فیض آباد کے گوشائیں گنج اور بھدرسا کے قصبوں میں پولیس ایکٹ کی دفعہ ۳۴ (۱) ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۶۰ء سے نافذ کر دی ہے۔

انڈے سیلس ٹکیس سے مستثنیٰ۔ حکومت اترپردیش نے اس امر کے احکام جاری کئے ہیں کہ یکم مئی سنہ ۱۹۶۰ء سے انڈوں کی بکری پر سیلس ٹکیس عائد نہیں ہوگا۔

بادشاہ محل عالم

(بہ سلسلہ صفحہ ۴۰)

ختم قصہ تو ہو گیا عالم — رات دن مانگ اب دعا عالم
ہے جب تک کہ مہر میں نور — مہدی دیں کا جب تلک ہو ظہور
نوجواں بادشاہ خوش اقبال — والی لکھنؤ خجستہ خصال
جو کہ مشہور جان عالم ہے — رونق بوستان عالم ہے
فخر ایراں بنائے خطۂ ہند — رہے رونق فزائے خطۂ ہند

مثنوی عالم میں شادیوں اور رسوم وغیرہ کی تفصیل بھی ملتی ہے جو مشرقی تمدن کی روشن جھلکیاں دکھاتی ہے طوالت کی وجہ سے ایسے اشعار میں نے چھوڑ دیے ہیں۔ بہرحال مثنوی دلچسپ اور کارآمد ہے۔

نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۵ نمبر ۴

آشاڑھ ۱۸۸۲

جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

جلد سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

اُتر پردیش کے گورنر سری وی. وی. گری، ریاست کیرالہ کے گورنر مقرر کر دیے گئے ہیں اور اُن کی جگہ کیرالہ کے گورنر ڈاکٹر بی. رام کرشن راؤ نے اُتر پردیش کے گورنر کی حیثیت سے پہلی جولائی کو اپنا عہدہ سنبھال لیا ہے۔

ڈاکٹر بی. رام کرشن راؤ جنگِ آزادی کے ایک آزمودہ کار سپاہی اور ایک بیدار مغز مدبر ہی نہیں بلکہ ایک کہنہ مشق صحافی، شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ انگریزی، سنسکرت اور تلگو کے علاوہ وہ فارسی اور اُردو کے بھی ماہر ہیں اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں وہ فارسی میں امتیاز (distinction) حاصل کر چکے ہیں۔ زمانۂ طالب علمی کے بعد بھی اُنھیں اُردو اور فارسی سے کافی دل چسپی رہی اور آج بھی ان زبانوں سے انھیں گہرا ذوق و شوق ہے۔ سنسکرت اور تلگو کے وہ اچھے شاعر بھی ہیں۔ ڈاکٹر رام کرشن راؤ ۱۳ مارچ ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ نظام کالج سے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد اُنھوں نے فرگوسن کالج پونہ میں داخلہ لیا۔ انھیں دنوں ہندستان کے مشہور رہنما لوکمانیہ تلک کا انتقال ہوا اور رام کرشن راؤ نے جو اُسی زمانے سے کھدر پہننے لگے تھے اپنے بعض دوستوں کے ساتھ کالج بند کرانے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ طالب علمی ہی کے دور میں اُنھوں نے اخبارات میں قوم پرورانہ نقطۂ نظر سے مضامین بھی لکھنا شروع کر دیے تھے۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ امتحان کی طرح اُنھوں نے بی اے کا امتحان بھی اوّل درجے میں پاس کیا اور مزید تعلیم کے لیے انھیں بمبئی یونی ورسٹی کی طرف سے اسکالرشپ ملنے لگا۔ لا کالج میں داخلے کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے انجمن اسلام ہائی اسکول میں ملازمت کر لی اور قانون کی تعلیم بھی جاری رکھی۔ ۱۹۲۳ء میں اُنھوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور اپنی موجودہ اہلیہ شریمتی اننت لکشمی دیوی سے شادی کی۔ (ان کی پہلی بیوی کا جن سے تیرہ برس کی عمر میں اُن کی شادی ہو گئی تھی ۱۹۲۰ء میں انتقال ہو گیا تھا) اسی سال اُنھوں نے حیدرآباد ہائی کورٹ میں وکیل کی حیثیت سے پریکٹس شروع کر دی لیکن ان کی تحریروں اور دوسری سرگرمیوں نے برطانوی ریزیڈنٹ کو اُن کی طرف سے اتنا مشکوک کر دیا کہ سکندرآباد کی انگریزی عدالتوں میں پریکٹس کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے انھیں دو برس تک جدوجہد کرنا پڑی۔ بہرحال جلد ہی ان کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا اور سیاسی، سماجی، اقتصادی اور ثقافتی کوئی شعبہ ایسا نہ رہ گیا جس میں وہ حصہ نہ لیتے ہوں۔ ۱۹۲۳ء میں کوکیناڈا میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اجلاس میں آندھرا کے عوام کثیر تعداد میں شریک تھے اس لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس کی گئی جو تلگو، ہندی اور اردو تینوں زبانوں سے واقف ہو تاکہ وہ ہندی اور اُردو کی تقریروں کا تلگو میں فوراً ترجمہ کر سکے۔ اُس وقت مسز سروجنی نائیڈو کی نظر انتخاب "نوجوان رام کرشن راؤ" (جیسا کہ مسز نائیڈو انھیں کہا کرتی تھیں) پر پڑی اور یہ اہم خدمت اُن کے سپرد کی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد رام کرشن راؤ نے اپنے کچھ ساتھیوں کی مدد سے حیدرآباد ریاستی کانگریس کی تشکیل کی اور ۱۹۴۲ء کی "ہندستان چھوڑو" تحریک میں گرفتار بھی کر لیے گئے۔ اسی زمانے میں انھیں دو مرتبہ ہائی کورٹ کی ججی پیش کی گئی اور دو مرتبہ ریاست حیدرآباد کی وزارت میں بھی انھیں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ لیکن اُنھوں نے ہر مرتبہ یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب تک کانگریس حکومت کا بار نہیں سنبھالتی وہ کوئی منصب قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ آخر جب کانگریس حیدرآباد کی مخلوط وزارت میں شامل ہونے پر تیار ہو گئی تو ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک وہ حیدرآباد کے وزیر مال اور وزیر تعلیم رہے۔ اس کے بعد جب حیدرآباد میں عوامی حکومت قائم ہوئی تو اُس کی قیادت رام کرشن راؤ کے سپرد ہوئی۔ ریاست آندھرا کی تشکیل میں بھی ڈاکٹر رام کرشن راؤ کا بڑا ہاتھ رہا۔ ریاست حیدرآباد کے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد انھیں ریاست کیرالہ کا گورنر بنا دیا گیا اور اب وہ اُتر پردیش کے گورنر مقرر ہوئے ہیں جہاں کے وزیر اعلیٰ بھی ایک کہنہ کار مدبر ہونے کے علاوہ متعدد زبانوں کے ماہر اور ادیب ہیں۔

• نیا دور کا آئندہ شمارہ (اگست ۱۹۵۶ء) اسپیشل نمبر ہوگا اور اگست کے پہلے ہفتے میں شایع ہو جائے گا۔ یہ نمبر حسب سابق معمول سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ نیا دور کے گزشتہ اسپیشل نمبروں کی روایات کے مطابق اس نمبر میں ملک کے مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کے خصوصی مقالات، نظمیں اور غزلیں شایع ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ شمارہ متعدد تصاویر سے بھی مزین ہوگا۔ ان خصوصیات کے باوجود پرچے کی قیمت میں کوئی اضافہ نہ کیا جائے گا۔ جو حضرات نیا دور کے سالانہ خریدار بننا چاہتے ہیں یا جو حضرات نیا دور کی ایجنسی لینا چاہتے ہیں وہ محکمۂ اطلاعات، اُتر پردیش، لکھنؤ کو فوراً مطلع کریں۔

ایڈیٹر

غزل

ماآنی حاشی

شیوہ آزادانہ ہے، مسلک فقیرانہ مرا
اس خطا پر رکھ دیا ہے نام دیوانہ مرا

سب کچھ اپنا ہے اگر ہو عزم مردانہ مرا
ساغر و مینا تو کیا ہو جائے مے خانہ مرا

منتظر تھی برق کل تک تو مری تعمیر کی
آج ہی تجلی کی حسرت اور سیہ خانہ مرا

قصۂ دُنیائے فانی تو ہوا جاتا ہے ختم
اے حیاتِ جاوداں! اب چھیڑ افسانہ مرا

اب نہیں وابستہ مے خانے سے کوئی آرزو
زندہ رہ ساقی کہ ہے لب ریز پیمانہ مرا

شمع کے آغوش میں جلنا تو ہی خلدِ وصال
دوزخ ہجراں میں دیکھے سوز پروانہ مرا

لے چلی ہو دارِ فانی سے ابد کی راہ پر
موت کو معلوم تھا شاید یہ کاشانہ مرا

آشیاں بنتا رہا اور بجلیاں گرتی رہیں
رہ گیا محروم آبادی سے ویرانہ مرا

دیکھتا ہوں اقتدار و عشرتِ شاہی کے خواب
کیا ہوا ساقی جو ہے خرقہ فقیرانہ مرا

غزل

شفیق جونپوری

ہے آج تک نظر میں وہ عالم بہار کا
دل تھا کہ پھول تھا چمن روزگار کا

بڑھتی تھی اُن کے وعدوں سے میعادِ زندگی
کیا ہو گیا وہ دَور مرے انتظار کا

تغیرِ گلستاں کا نہ کر رنج باغباں
یہ انقلاب ہے چمن رُوزگار کا

اب مہر و مہ کو چاہیے جدّت پسند ہوں
صدیوں سے سلسلہ ہے یہ لیل و نہار کا

نرگس بہت نہ ناز کر آنکھوں کے حُسن پر
انداز بھی تو ہو نگہِ اعتبار کا

دونوں سے ماورا ہو گلستاں کا اہتمام
عہدِ خزاں رہے نہ زمانہ بہار کا

اللہ رے بے خودی کہ اُسی آستاں پہ میں
درباں سے پوچھتا تھا پتہ کوئے یار کا

ساقی یہ تیری ذات سے ہی فصلِ گُل کی قدر
پھر مے پرست نام نہ لیں گے بہار کا

تو آ رہی ہے وادیِ جاناں سے اے صبا
کیا حال تھا شفیقِ غریب الدیار کا

شعر و نغمہ

نادم سیتاپوری

جسم فروشی سماج اور سوسائٹی کا جتنا بڑا گناہ ہے اس کی اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ایک زمانے میں لکھنؤ کی بعض طوائفیں "علم مجلس" کی اتنی ماہر سمجھی جاتی تھیں کہ اکثر شرفا اپنے کمسن بچوں کو ان کی آغوش تربیت کے سپرد کر دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ لوگ عام پیشہ ور طوائفوں کی سی زندگی بسر نہ کرتی تھیں۔ چنانچہ ان کے کوٹھے اس عہد میں دراصل تہذیب و اخلاق کی درسگاہیں تھیں جہاں سے ناپختہ شعور اخلاق کی ان قدروں سے ہم آغوش ہو جاتے تھے جو انھیں ایک پاکیزہ سوسائٹی کے سوا کہیں دوسری جگہ نہیں مل سکتی تھیں۔ علم مجلس، تہذیب و اخلاق، برجستگی اور بے ساختگی کے ساتھ ساتھ ان طوائفوں کے کوٹھے ادبی اور علمی مسائل کی ضیا باریوں سے بھی منور رہتے تھے اور بعض طوائفیں تو زبان کی ماہر بھی ہوتی تھیں

شاہان اودھ کے زمانے میں جہاں ان طوائفوں کو ناچ گانے کے ہنر سکھائے جاتے تھے وہاں انھیں باقاعدہ درسی کتابیں پڑھانے کا بھی عام رواج تھا۔ پھر یہ تعلیم درسیات کی عام تعلیم ہی تک محدود نہیں تھی۔ آمد نامہ۔ گلستان۔ بوستاں اور نعمت ایمن کا ذکر نہیں، یہ تعلیم اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک کہ انھیں فن شعر و ادب پر پورا پورا عبور حاصل نہ ہو جاتا تھا۔ اور یہ تھا بھی اس لئے ضروری کہ اس زمانے میں کوئی جاہل اور بد تہذیب طوائف کسی مہذب سوسائٹی میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ اگر کسی طوائف نے کسی محفل میں غلط ناموزوں یا عامیانہ غزل گائی تو اسے اہل محفل اپنی کھلی ہوئی توہین و تحقیر سمجھتے تھے

شائستہ مذاق، لطیف چوٹیں اور پرکیف طنز ہمیشہ لکھنؤ کی خوش مذاقی کی جان سمجھی گئی۔ ہر چھوٹے سے چھوٹا آدمی کسی بڑے سے بڑے آدمی پر اپنے حدود کے اندر رہ کر "لطیف چوٹ" کر سکتا تھا جسے کبھی برا نہیں سمجھا جاتا۔ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے "جلوۂ" (مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ) میں اسی قسم کا ایک دلچسپ لطیفہ نقل کیا ہے جو اس دور کے شائستہ مذاق کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

"ایک عالم دین فینس پر سوار چوک کے اندر سے گزر رہے تھے کہ ایک نہایت ہی کم رو اور سیاہ فام عورت فینس کے قریب پہنچی اور جھک کر آداب بجا لائی۔ کہاروں کے قدم رک گئے۔ عالم نے پوچھا!

"کیا نام ہے تمہارا؟"

وہ بولی:

"کنیز کو مصری جان کہتے ہیں سرکار"

"خوب ـــ" عالم نے مسکراتے ہوئے کہا "بھئی مصری تو نہیں تم تو "شیرہ" معلوم ہوتی ہو"

"خیر سرکار ـــ ہم "شیرہ" (ہمشیرہ) ہی صحیح ـــ! عورت نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا"

شائستہ طنز و مزاح کا یہ وہ اعلیٰ نمونہ ہے جو کسی زمانے میں لکھنؤ کی روایتی زندہ دلی کی جان سمجھا جاتا تھا۔ مولانا عبد الحلیم شرر نے ایسی ہی

شائستہ محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھنؤ کی تہذیب و تمدن پر جو تاریخی تبصرہ کیا ہے وہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ سماج کے اس بدنام طبقے نے جہاں سوسائٹی کو برائیوں سے زہر آلود کیا وہاں اسی طبقہ کی بعض عورتوں نے ہماری مجلسی زندگی کو علم، اخلاق اور معاشرتی قدروں کے کچھ ایسے تحفے بھی دیئے جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شرر نے لکھا ہے ۔

"یورپ کی طرح یہاں مردوں کی کسی صحبت میں شریف و پاکدامن عورتیں نہیں شریک ہو سکتیں اور احباب کی محفل میں جب کوئی عورت نظر آ جائے تو یقین جان لیجیے کہ وہ "عصمت فروش" بازاری رنڈی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کی صحبتوں میں شریف و شائستہ عورتوں کے شریک ہونے کی وجہ سے بازاری عورتوں کا درجہ اور مرتبہ سوسائٹی میں اس قدر گر گیا ہے کہ کسی شریف خاندان کا دروازہ ان کے لئے نہیں کھل سکتا اور نہ شرفا کے کلبوں اور سوسائٹیوں میں وہ قدم رکھ سکتی ہیں بخلاف اسکے ایک حد تک سارے ہندوستان میں اور اسی طرح لکھنؤ میں "بازاری عورتوں" کو یہ رتبہ حاصل ہو گیا کہ مہذب اور شائستہ امراء کی محفلوں میں ان کے پہلو بہ پہلو بیٹھیں اور یہاں اس مذاق میں یہاں تک ترقی ہوئی کہ بعض "معزز رنڈیوں" نے خود اپنے گھروں میں ایسی ہی نشست و برخاست کی محفلیں قائم کر دیں جن میں جاتے (ہوئے) بہت سے مہذب لوگوں کو بھی شرم نہیں آتی۔ لکھنؤ میں جو دھرائن ـــــ بی حیدر جان اور اسی پائے کی چند رنڈیوں کے مکان اچھے خاصے "شرفا کے کلب" تھے جن میں صاحب محفل یعنی ان "بی صاحبہ" کی طرف سے حقے پان کی بخوبی خاطر کی جاتی۔" (گذشتہ لکھنؤ یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ ص۳۲۹)

ملک الشعرا، قاضی محمد صادق خاں اختر کے شاگرد رشید میر آغا علی شمس نے بھی جو اپنے زمانے کے ایک اچھے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ "تحقیق الفاظ" میں ماہر سمجھے جاتے تھے اپنی مشہور مگر کمیاب کتاب نقل محفل (مطبوعہ مطبع گلزار محمدی لکھنؤ) میں لکھنؤ کی مشہور ارباب نشاط "زہرہ و مشتری" کی ماں امام باندی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے اس دور کی رنڈیوں کی نجی زندگی کا وہ نقشہ سامنے آ جاتا ہے جس کا آج ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

"ذکر یہ تھا کہ اگر ایک امام کی شہادت کا دن ہو اور دوسرے امام کی ولادت کا، تو اظہار خوشی کرنا چاہیئے یا غم۔ امام باندی نے بیساختہ جواب دیا۔ کہ نہ ہنسنا چاہیئے نہ رونا۔ حق المقدور" شادی مرگ ہونا چاہئے"

غرض رقص، موسیقی، بذلہ سنجی لطیفہ گوئی، حاضر جوابی اور طنز و مزاح کے علاوہ لکھنؤ کی بعض طوائفوں نے شعر و ادب کی جو ٹھوس خدمات انجام دی ہیں وہ بجائے خود ایک تذکرے کا درجہ رکھتی ہیں اور گزشتہ لکھنؤ کے دامن پر بکھرے ہوئے یہ ان گنت موتی آج بھی کہیں کہیں تذکروں میں نظر آ جاتے ہیں جن کا مختصر ذکر ماضی رفتہ کی وہ یادیں ہیں جو بہت جلد ہمارے ذہن و شعور سے دور بھاگتی چلی جا رہی ہیں۔ ذیل کی سطروں میں چند ایسی ہی طوائفوں کا بہت مختصر اور سرسری تذکرہ کیا جاتا ہے جو نہ صرف سخن فہم تھیں بلکہ سخن گو بھی تھیں۔ ان شاعرات کے بارے میں ہم صحیح طور پر معلوم نہیں کر سکتے کہ ان کا دور و زمانہ کیا تھا۔ پھر بھی جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے اس سے اصل موضوع پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے ۔

امراؤ۔ تذکرۂ بہارستان ناز میں امراؤ کی نسبت یہ لکھا گیا ہے۔

"امراؤ تخلص۔ نام امراؤ جان صاحب ذہن رسا۔ شیریں زبان۔ لکھنؤ کی رہنے والی۔ طبیعت نہایت عالی۔ سب سے طرز نرالی۔ اگرچہ کلام اس کا زیادہ نہیں ملا لیکن یہ چند شعر یاد تھے۔ بہ نظر "مشتے نمونہ از خروارے" لکھ دیئے گئے" (صفحہ ۱۹۔ مطبوعہ مطبع عثمانی میرٹھ ۱۲۸۱ھ)

صاحب تذکرہ ماہ درخشاں (مطبوعہ مطبع شاہجہانی بھوپال) تحریر فرماتے ہیں۔

"امراؤ تخلص۔ امراؤ جان شوخ دیدہ۔ شیریں زبان از ارباب نشاط لکھنؤ بود گاہے زبان بہ سخن موزوں می کشود"

بہارستان ناز میں امراؤ کے پانچ شعر اور تذکرہ ماہ درخشاں میں اردو کے چار شعر نقل کئے گئے ہیں ؎

امراؤ کیا کہوں کہ شب ہجر نیش غم   چبھتا رہا ہر اک رگ جاں میں سحر تلک
گر مجھ کو صبر کا کل خمار نہ ہوتا   تو یوں میں بلاؤں میں گرفتار نہ ہوتا
پلا دے ساقیا زوروں پہ ہے عالم جوانی کا   لگا دے خم مرے منہ سے شراب ارغوانی کا
نقاہت کو مری ناطاقتی مجھ پر رلاتی ہے   ہنساتا ہے ضعیفی میں مرا عالم جوانی کا
یہ دل جب سے کہ خلوت خانۂ آئینہ رو کا ہے   طلا ہے دیدۂ حیراں کو عہدہ پاسبانی کا

امیر۔ غالباً امیر جان نام تھا۔ امیر تخلص۔ تذکروں میں کہیں کہیں سرسری

ذکر ملتا ہے اور دو تین شعر بھی ۔ نمونۂ کلام میں کئی تذکرہ نویسوں نے صرف یہی تین شعر نقل کئے ہیں ۔

جدھر کو دیکھنے سے جان آ رہی جاتی ہے — اسی طرف کو نظر بار بار جاتی ہے
یہ یقین تھا کہ نہ چھوڑا اسارکوچے میں — صبا لئے مرا مشت غبار جاتی ہے
یہ محو دید رخ گل ہے بلبل شیدا — نہیں خبر کہ چمن سے بہار جاتی ہے

حسن ۔ حسن کے متعلق تذکرہ بہارستان ناز میں یہ دو لفظی ذکر ملتا ہے

"حسن وزیر جان نام بنت گوہر جان، ساکن پاٹانالہ، لکھنؤ ۔ اور کچھ حال معلوم نہیں ۔"

نالۂ سوزاں جو کھینچا رو کے میں نے ہجر میں — رشک سے بجلی جلی ۔ شرمندہ ابر تر ہوا
وہ مریض غم ہوں میں جس کو دوا آئی نہ راس — سر پہ جب صندل لگایا اور درد سر ہوا

(بہارستان ناز صفحہ ۲۴)

حور ۔ منا جان نام ۔ حور تخلص ۔ محمد رضا طور سے شرف تلمذ حاصل تھا ۔ عہد واجدی کی "ڈیرے دار" طوائفوں میں ممتاز حیثیت رکھتی تھی ۔ اس کے کلام میں ایک صدی ادھر کے لکھنوی رنگ کی کافی جھلک موجود ہے ۔

جو پہنایا دوں میں گنے کا توڑا لے پری تو نے — مسلسل پا لئے دیوانہ ہوا زنجیر آہن سے
بدی کی جس نے ہم سے ہم نے اس کے ساتھ نیکی کی — ہماری خو ہے یہ ہم دوستی کرتے ہیں دشمن سے

زہرہ ۔ امراؤ جان نام چھٹن صاحب عرفیت ۔ زہرہ تخلص ۔ خیرآباد ضلع سیتاپور کی ڈیرے دار طوائف امام باندی کی بڑی لڑکی تھی ۔ خیرآباد میں پیدا ہوئی لکھنؤ میں تعلیم پائی ۔ اس کی دوسری بہن قمرن جان (عرف منجھو صاحب) مشتری اپنے دور کی ان باکمال عورتوں میں تھی جس کے علم و فضل کا چرچا سارے ہندوستان میں برسوں رہا اور یہ دونوں بہنیں "زہرہ و مشتری" کے نام سے کچھ اس طرح مربوط ہو گئیں کہ ایک ہی کردار کا شبہ ہوتا تھا ۔ گذشتہ لکھنؤ میں شرر نے ان کا ذکر کسی مقام پر کیا ہے تحریر فرماتے ہیں ۔

"لکھنؤ میں بعض رنڈیوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ بڑے بڑے ڈھاڑی ان کے سامنے کان پکڑتے تھے ۔ "زہرہ و مشتری" جو شاعرہ بھی تھیں گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں ۔

(گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۲۰۵)

زہرہ ۱۲۶۵ھ کے لگ بھگ خیرآباد میں پیدا ہوئی اور جیسا بیان تذکرہ مشاہیر نسواں (مطبوعہ مطبع خادم التعلیم لاہور ۱۹۰۳ء) ۱۳۱۵ھ میں وفات پائی ۔ تذکرہ "بہارستان ناز" میں زہرہ کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے :-

"زہرہ تخلص ۔ امراؤ جان نام ۔ بی چھٹن صاحبہ مشہور شعر گوئی میں مشاق ۔ شوخ طبعی میں شہرہ دور دور ۔ میر آغا علی شمس کی شاگرد ہیں اور انھوں نے ہی بنایا ہے ۔ "میرجی" کا شہرہ اظہر من الشمس ہے زہرہ کی زبان کو انھوں نے چمکا یا ہے ۔ شاگرد اگر اچھا ہو تو فخر استاد ہے ۔ زہرہ کی بدولت "میاں شمس" کی ہر دم سب کو یاد ہے ۔ اب بی مشتری کی تحریر سے معلوم ہوا کہ پانچ برس سے اس شاعرہ نے کسی رئیس عالی خاندان سے عقد کر لیا ۔ اپنا دامن تر گہر ہائے توبہ و استغفار سے بھر لیا ۔ ایھوں کی صحبت نے اچھا ہی اثر دیا ۔ خدا کرے پھر کی عادت نہ اختیار کرے ۔ ہمیشہ کے لئے پردہ نشینی ہی اپنا شعار کرے ۔"

(تذکرہ بہارستان ناز صفحہ ۲۹)

غالب کی زندگی میں ان کے خلاف لکھنؤ میں جو ادبی ہنگامہ آرائی شروع ہوئی تھی یہ "زہرہ و مشتری" اس میں پیش پیش تھیں ۔ غالب کے خلاف ان کے مضامین (اودھ اخبار) میں برابر شائع ہوا کرتے تھے ۔

بعض لوگوں کا قیاس ہے کہ یہ امراؤ جان دراصل مرزا رسوا کا وہی کردار تھی جسے رسوا نے امراؤ جان ادا کے روپ میں پیش کیا ہے ۔ اور اس قیاس فرمائی کا پس منظر رسوا کا وہ کمیاب ناول افشائے راز (مطبوعہ نگارستان پریس لکھنؤ) اپریل ۱۸۹۶ء ہے جس کی تمہید "ذکر داستان" میں مرزا رسوا کا یہ تصدیق نامہ شامل ہے ۔

میں امراؤ جان کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب ان کی نواب صاحب (زہرہ) سے ملاقات تھی ۔ انھیں دنوں میری نشست بھی اکثر وہاں رہتی تھی اس سرگزشت (افشائے راز) میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کے حرف بحرف صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے ۔"

زہرہ (امراؤ جان) کے دیکھنے والے اگرچہ صفحۂ ہستی سے معدوم ہو چکے ہیں لیکن اپنے اسی ناول میں مرزا رسوا نے امراؤ جان کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے وہ "زہرہ" کی منھ بولتی تصویر ہے ۔ مرزا رسوا تحریر فرماتے ہیں

" ہائے "امراؤ جان" خدا بخشے، کیا مردم شناس رنڈی تھی ۔ سانولی سی۔ لمبی سی بہت ہی تیار ۔ اور اس تیاری پر انتہا کی جامہ زیب ۔ رفتار

پر ناک کے پاس چند چیچک کے داغ تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ستارے جڑے ہیں۔

(وقائع دلاذ ص ۴۲)

یہی تصویر "تذکرہ" کے دیکھنے والوں نے پیش کی ہو۔ مرزا رسوا کا زمانہ اور امراؤ جان زہرہ کا زمانہ کم و بیش ایک ہی تھا۔ اس لئے یہ قیاس حقیقت سے کچھ قریب ہی نظر آتا ہے دور نہیں۔

زہرہ کے کلام کا کوئی مجموعہ شایع نہیں ہوا اگر اس دور کے گلدستوں اور تذکروں میں اب بھی اس کی کہنہ مشقی کے نمونے کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

تو نے ہر ایک کی سُنی باتیں میرا مطلب بھی کچھ بھلا سمجھا
ہائے بے فائدہ خراب ہوا عشق کی میں نہ انتہا سمجھا
ہم معرکۂ عشق میں شیرانہ کھڑے ہیں میدان سے اب پاؤں ہٹایا نہیں جاتا
امتحاں ہے اگر مرا منظور آیئے آزمایئے دل کو
نہ ہوئی شہر و دشت میں تسکیں اب کہاں لے کے جایئے دل کو
کس کی آنکھوں میں تجلی رخ یار نہیں کون موسیٰ کی طرح طالبِ دیدار نہیں
نہیں جاتی نہیں جاتی یہ تمہاری عادت ہاں جو اک بار زباں پر ہو تو سو بار نہیں
ہے عجب گرمیٔ بازار مرے یوسف کی مشتری چرخ پہ زہرہ کی خریدار نہیں
مرا درد دل یار نے کھو دیا ہوا آدمی کی دوا آدمی

سردار۔ سردار بیگم نام تھا اور سردار ہی تخلص۔ لکھنؤ کے کسی باوضع خاندان سے اظہار نسبت کرتی تھی مگر لکھنؤ کے مضافات میں اس کے رقص و سرود کی جھنکار مدتوں باقی رہی۔ بہارستان ناز میں اس کے بہت سے متفرق اشعار اس کی پختہ کلامی کے ثبوت میں پیش کئے گئے ہیں۔ دو شعر نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

دل مرا اٹھ گیا زمانے سے موت آئے کسی بہانے سے
ہم تو عاشق ابھی کے ہو بیٹھے دل سے صبر و قرار کھو بیٹھے

شیریں۔ بیگا نام۔ شیریں تخلص۔ چوک کی مشہور ڈیرے دار طوائف تھی ابتدائے مشق سخن خواجہ وزیر کے شاگرد میر محمدی بیتہر سے کی۔ پھر شیخ امداد علی بحر سے اصلاح لینے لگی۔ مشہور ہے کہ مرنے کے بعد اس نے ایک پورا دیوان چھوڑا تھا جو زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہا۔ فارسی میں بھی کہتی تھی۔

ستا ہی کو وہ پکس سے کیوں لوٹائے دل بہتر یہ ہو کہ کوئی کسی سے نہ لگائے دل
کیونکر نہ ہوں حواس جو قابو سے جائے دل اے کاش موت آئے کہ کسی پر نہ آئے دل

گرا جو ہاتھ سے ساقی کے شیشہ ہو گیا ثابت ہماری زندگانی کا ہوا لبریز پیمانہ
نہیں مسند تو کیا پروا۔ خدا برا پنا تکیہ ہے فقیری میں بھی لے شیریں ہے آج اپنا ہو شاہانہ

شیرمل۔ وحید نام۔ شیریں تخلص تھا بہارستان ناز میں صرف اتنا لکھا ہے "لکھنؤ میں یہ ایک رنڈی ہے گر شیریں کلام اور کچھ راقم کو اس کا حال معلوم نہیں"۔ (ص ۶۱-۶۲) یہ چند شعر بھی درج ہیں۔

فصل گل آئی ہو لے دست جنوں دھیان رہے ٹکڑے دامن ہو سلامت نہ گریبان رہے
دل پسا جاتا ہے قدموں کے تلے صاحب کے پاؤں آہستہ سے رکھنے کا ذرا دھیان رہے
آرزو کوئی نہ بن آئی فلک کے ہاتھوں دل بیتاب میں لاکھوں مرے ارمان رہے

مشتری۔ قمرن جان عرف منجھو صاحب کا تخلص۔ امراؤ جان زہرہ کی بہن اور امام باندی کی چھوٹی لڑکی۔ خیر آباد (ضلع سیتاپور) میں پیدا ہوئی۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے زمانے میں لکھنؤ کی علمی اور ادبی سوسائٹیوں کی جان سمجھی جاتی تھی۔ غالب کی زندگی میں ان کے خلاف لکھنؤ میں جو محاذ قائم ہوا تھا مشتری، اس کی بہن زہرہ اور اس کے استاد میر آغا علی شمس اس کے خاص رکن تھے۔ اودھ اخبار میں برسوں زہرہ و مشتری کے مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔ خان بہادر نواب رضا علی خاں وحشت کلکتوی مشتری کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"مشتری سیتاپور ضلع خیر آباد (خیر آباد ضلع سیتاپور صحیح ہے) کی ایک مشہور رقاصہ تھی مگر ہمیشہ لکھنؤ میں رہی۔ نام قمرن جان تھا۔ عرف بی منجھو۔ علم موسیقی میں گھسیٹ خاں اور حیدر علی قوال کی شاگرد تھی۔ مشتری کا ایک دیوان فارسی موسوم بہ خانۂ خیال (خانۂ خیال مشتری کے فارسی مجموعہ نثر کا نام ہے) طبع ہو گیا ہے یہ شعر بہت جلد کہتی تھی۔ جب مہندر سنگھ والیٔ پٹیالہ لکھنؤ میں آئے مشتری نے سر محفل چند اشعار مدح میں نظم کئے اور اجازت لے کر ان کو پڑھا۔ مہاراجہ بہت محظوظ ہوئے اور ایک ہزار روپے انعام میں مرحمت کئے۔"

(ماہنامہ آج کل۔ خطوط نمبر۔ اپریل ۱۹۵۱ء ص ۱۹)

مشتری اردو میں تو کم کہتی تھی البتہ فارسی میں اسے دستگاہ کامل حاصل تھی۔ اس کی فارسی غزلیات کا مجموعہ ترانۂ خیال (معروف بہ دیوان مشتری) اور فارسی نثر کا مجموعہ خانۂ خیال مطبع گلزار محمدی لکھنؤ نے شایع کئے تھے۔ یہ تمام غزلیں مختلف صنعات کا ایک فنکارانہ نمونہ ہیں۔

مجموعے کے آخری حصے میں امیر مینائی، داغ دہلوی، آغا حسن ازل، قدر بلگرامی اور خواجہ عشرت (لکھنوی) وغیرہ کے قطعات تاریخ شامل ہیں۔ وفات ۱۸۸۲ء میں ہوئی بشتری کا اردو کلام قریب معدوم ہے کہیں کہیں بکھرے ہوئے کچھ اشعار مل جاتے ہیں۔

اس وقت آپ میری عیادت کو آئے ہیں — جب من چلے گلے سے اترتی دوا نہیں
نا حق ہیں ناز حسن سے بیٹے نیاز کے — بندہ نواز آپ کسی کے خدا نہیں
شاید کسی مجرور کا ہے آبلۂ دل — یہ گنبد چرخ ستم ایجاد نہیں ہے

دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ ان دو تین اشعار میں کھینچا ہے۔

یہ زمانہ عالم خواب ہے پئے تشنہ مثل سراب ہے
جو عیاں ہے نقش بر آب ہے جو مکان ہے مثل حباب ہے

نہ بھرے عدم سے جو چل بسے ہے سزا جزا کی خبر کسے
یہ ہیں سب ہمیں کے مباحثے نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے

گئی باغ دہر سے فصل گل نہیں بلبلوں کا وہ شور و غل
نہ وہ مے کے ہیں نہ جام مل۔ نہ ترانے، نہ کباب ہے

برسا کرتے ہیں جدائی میں ترے روتے — اور دیدہ کبھی بھادوں کبھی ساون ہو کر
گر دارغ جوم کے ہم رنگ کا بوسہ لیں گے — سو کہیں گے کشور ماتا رہیں لندن ہو کر
دل سے اخلاص گھٹا لطف گھٹا پیار گھٹا — پر نہ وہ ناز ترا اے بت عیار گھٹا
بیوفائی سے تری اور وفاداری سے — دل کبھی بار بڑھا اور کبھی بار گھٹا

گئیں بھی آئیں بھی برسیں بھی گھٹائیں — بارش دیدۂ تر کا نہ کبھی تار گھٹا
منتظر ہجر کی شب اللہ رے طوفان الم — تارے بھی نظر آتے ہیں شب تار گھٹا
صاف رخ لوٹے سے نیلا ہوا اور بیخ بیخ — نسترن بن گیا لالہ گل سوسن بن کر

گوہر۔ بہارستان ناز (ص ۵۹) میں مرقوم ہے:

"گوہر تخلص، لعل بے بہا" نام۔ لکھنؤ کی کوئی کسبی ہے خوش گو گل اندام"

حسرت و یاس و الم اور شب تنہائی ہے — اپنی قسمت میں یہی انجمن آرائی ہے
تھا ابھی ذکر تمہارا کہ ابھی تم آئے — میری تاثیر زباں کھینچ کے لے آئی ہے
مژدہ اے شوق ہم آغوشی کہ جاگے ہیں نصیب — لے کے انگڑائی وہ کہتے ہیں کہ نیند آئی ہے

ناز۔ گوہر جان کی لڑکی امیر جان کا تخلص تھا۔ چوک کی نامور طوائفوں میں اس کا شمار تھا۔

لے گیا بام پہ وہ حور شمائل مجھ کو — آج معراج کا رتبہ ہوا حاصل مجھ کو
اور مہماں ہوں کوئی دم کا ذرا ٹھہرو تو — کیا چلے جاؤ گے اب چھوڑ کے بسمل مجھ کو؟
گرم ہاں یار نے کیں غیر سے بیسے آگے — صفت شمع جلایا سر محفل مجھ کو

چشم احباب میں افزوں مری عزت ہوگی
تم جو "تو" لکھ کے بٹھا دو سر محفل مجھ کو

یہ ہیں تاریخ کے وہ دھندلکے جن کے پیچھے صرف سماجی برائیاں ہی نہیں تھیں بلکہ کچھ ایسی اچھائیاں بھی تھیں جسے اردو ادب کی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔

✡

شعر میں فضا

(بسلسلہ صفحہ ۱۶)

اور قنوطیت کے روایتی نہیں بلکہ عقلی اور سائنسی صلاحیت کا قائل نہیں ہے اور شعر کو محض سرمایۂ تفریح اور ذہن کا ابال سمجھتا ہے جس کا مقصد ٹھیک بازی کی محفلوں، میلوں ٹھیلوں، شادی بیاہ، ختنہ اور عقیقہ کی محفلوں میں گا بجا کر خوش ہو لینا ہے تو شعر میں فضا کی اہمیت کو سمجھنا کیسا وہ اس لفظ پر غور کرنا بھی فضول وقت برباد کرنا سمجھے گا، اس لیے کہ اس کے نزدیک شعر بس شعر ہے۔ یہ سب اس میں کچھ نہیں ہوتا —— اور ایسے ادب شناس سے ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے۔

مقبرۂ نِدان محل

شمیم تصدق حسین

لکھنؤ کی قدیم ترین عمارتوں میں تین مقبرے ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ یہ تینوں مقبرے نوابین اودھ کے دور کے پہلے کی یادگار ہیں اور اسی لیے وہ نوابین اودھ کی تعمیرات سے بالکل میل نہیں کھاتے بلکہ ان میں اکبری دور کے فن تعمیر کی جھلک صاف نمایاں ہے۔ یہ مقبرے ایک ہی احاطے میں پہلو بہ پہلو لکھنؤ کے دو مشہور محلوں امین آباد اور نخاس کے درمیان واقع ہیں۔

مقبرۂ اوّل

احاطے کے مغربی سمت میں سب سے پہلا وہ مقبرہ ہے جسے شہنشاہِ اکبر کے ایک صوبیدار "شیخ عبدالرحیم" نے عہد اکبری میں اپنے جیتے جی بطور اپنی دائمی خواب گاہ کے تعمیر کرا کے اس کو "نِدان محل" ("ندان" بمعنی نا آفری) کے نام سے موسوم کیا تھا۔ بعد میں نادانوں نے اسے "نادان محل" کہنا شروع کر دیا اور اب وہ عموماً اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ مقبرہ ایک سنگی چبوترے پر واقع ہے جس میں خوش نما نقش و نگار بنے ہیں۔ شروع شروع میں اس کو پتھر کے بارہ نقشی کھمبے سنبھالے تھے اور چاروں طرف سے کھلا ہوا تھا مگر بعد میں دل کش سنگی جالیاں لگا کر دروں کی بندش کر دی گئی اور آمد و رفت کے لیے جنوبی سمت میں ایک جوڑی بھی لگا دی گئی۔ مقبرے کے چاروں طرف برآمدہ بھی ہے جس کے کھمبے سفید چتی دار سنگِ سرخ کو تراش کر بنائے گئے ہیں جو دہلی کی عمارتوں میں عام طور سے استعمال کیا گیا ہے۔ کھمبوں کی پیشانیوں پر قدیم طرز کی محرابیں ہیں جنھیں سنگی بریکٹوں وغیرہ سے بھی سجایا گیا ہے۔ مقبرے کا ایک گول خشتی گنبد ہے اور اندرونی حصے میں سنگِ مرمر کی دو قبریں ہیں۔ ایک تو شیخ عبدالرحیم کی ہے اور دوسری کے متعلق مشہور ہے کہ اس میں اُن کی رفیقۂ حیات محو خواب شیریں ہیں۔ شیخ صاحب کی قبر کے تعویذ پر آیات قرآنی بخط نسخ کندہ ہیں اور اس کا ساز بھی نہایت جاذب نظر ہے۔ دونوں قبروں کے سرہانے جانب شمال اکبری دور کے کسی صاحب کمال خطاط کا تحریر کردہ سورۂ یٰسین بھی بخطِ ثلث موجود ہے جو نوادرِ روزگار میں سے ہے۔ مقبرے کا فرش بھی شطرنجی کے طرز کا رنگین چوکوں سے نہایت خوش نما بنا ہوا ہے۔

ستول کھمبا

مقبرۂ اوّل سے پانچ چھ قدم آگے جانب شرق ستول کھمبے کی ایک چھوٹی سی عمارت ہے۔ دہلی میں بھی ایک عمارت بنام "چونسٹھ کھمبا" موجود ہے۔ جہانگیر نے بارہ دری کے مانند بہترین سنگ مرمر کے چونسٹھ قابل دیدکھمبے لگاکر ۱۶۰۱ء میں اس کی تعمیر شروع کی تھی۔ تئیس برس کے بعد ۱۶۲۳ء میں وہ تکمیل کو پہنچی۔ اس پُرشوکت عمارت میں جہانگیر کے دودھ شریک بھائی اور ان کے رشتہ دار مدفون ہیں۔

تک سکا ہے۔ اس عمارت کے مشرق میں چند قدم کے فاصلے پر ایک مسجد بھی واقع ہے۔ مشہور ہے کہ ابتدا میں اسی مقام پر ایک مختصر سی مسجد بھی تعمیر ہوئی تھی جس کو بعد میں کسی وجہ سے منہدم کرا کے ایک دوسری خشتی مسجد بڑے پیمانے پر تعمیر کرا دی گئی جو تاحال اچھی حالت میں موجود ہے۔

مقبرۂ سوم

مسجد سے تین چار قدم بر جانب مشرق شیخ ابراہیم چشتی کا مقبرہ واقع ہے جو شیخ عبدالرحیم کے باپ یا پیرو مرشد تھے۔ پروفیسر برائن کی تحقیق میں

شیخ عبدالرحیم کی تعمیر کردہ اس سولہ سنگی کھمبے کی عمارت اور جہانگیر کے چونسٹھ کھمبے والی عمارت کی طرز ایک ہی ہے۔ شیخ عبدالرحیم نے اپنی عمارت کا نام "ستول کھمبا" رکھا تھا۔ وہ ایک بلند چبوترے پر واقع ہے جس میں خوش نما نقش و نگار ہیں اور اس کی سنگی چھت کی تزئین بھی نہایت دل فریب گل بوٹے بنا کر کی گئی ہے۔ اس کے کھمبے منقش اور در محراب دار مقبرۂ اول کے مانند ہیں۔

اس عمارت میں شیخ صاحب کے پانچ عزیز قریب مدفون ہیں جن میں دو کی قبریں سنگ مرمر کی ہیں اور تین کی بھورے رنگ کے نفیس پتھر کی مگر صاحبانِ قبر کے ناموں اور رشتوں کا باوجود تلاش و جستجو سراغ نہیں

موصوف شیخ عبدالرحیم کے والد تھے۔ مقبرہ ایک چوکور عمارت ہے جو بغیر کرسی کے فرش زمین پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس کی دیواروں کی چنائی کنجور پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے کی گئی ہے اور بالائی حصے میں ایک گول خشتی گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ مزار کا تعویذ سنگ مرمر کا سادہ مگر نفیس ہے اور دروازہ کی پیشانی پر جو جنوبی جانب واقع ہے حسب ذیل قطعۂ سنۂ وفات تحریر ہے:—

قضا را شیخ ابراہیم چشتی — کہ بود او در زماں فرد یگانہ
شد آں قطب جہاں از ملک فانی — بسوئے عالم فانی روانہ

زسالِ فوتِ او ہر کس کہ پرسد
بگو رفت از جہاں قطبِ زمانہ
۹۶۱ھ

چونکہ موصوف کی وفات سنہ ۹۶۱ ہجری (مطابق ۵۳-۱۵۵۴ء) میں واقع ہوئی اس لیے یہ بیان مبنی برحقیقت ہوگا کہ یہ ابراہیم سوری کا عہدِ حکمرانی تھا جو شیر شاہ سوری بانیِ خاندان کے بعد چوتھے تاجدار تھے۔ اس لحاظ سے یہ مقبرہ اس احاطے کی قدیم ترین عمارت ہے۔ بہرحال یہ تینوں مقبرے کچھ عرصے سے محکمۂ تحفظ آثارِ قدیمہ کی نگرانی میں لے لیے گئے ہیں۔

شیخ عبدالرحیم

شیخ عبدالرحیم کا وطن قصبۂ بجنور ضلع مراد آباد تھا۔ تنگیِ معاش سے عاجز آکر اور سفر کو وسیلۂ ظفر خیال کرکے انھوں نے دہلی کی راہ لی۔ وہاں یاوریِ قسمت سے اکبرِ اعظم کی سرکار میں ایک معمولی اسامی پر فائز ہو گئے اور ایک مدت تک ایسی جفاکشی اور تن دہی سے خدمات بجا لائے کہ زیرِ تختِ شاہی منصب داروں کے زمرے میں کھڑے ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اکبر نجوم کا بڑا معتقد تھا۔ ایک روز شاہی منجموں نے یک زبان ہو کر کہا کہ دو دن دس ساعت اعلیٰ حضرت کے لیے نحس ہیں۔ اس مدت میں سرکار فرماں روائی سے دست بردار ہو جائیں تو بہتر ہے۔ بکھر کی نظرِ انتخاب شیخ عبدالرحیم پر پڑی۔ انھوں نے ان کی جانشینی بخوشی خاطر منظور کر لی۔ چنانچہ مدتِ مقررہ کے لیے اکبر تاج و تخت سے دست بردار ہو گیا اور شیخ صاحب ان کی قائم مقامی کرنے لگے۔ جب مدتِ معینہ میں فقط دو ساعتیں باقی رہ گئیں تو بقول سید کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ بادشاہ نے پوشاک طلب کی۔ خواجہ سرا لے کر حاضر ہوا۔ اتفاقاً تاجِ شاہی میں ایک سانپ تھا۔ اُس نے خواجہ سرا کی انگلی میں ڈس لیا وہ زمین پر آ رہا اور حقِ نمک ادا کر گیا۔ نجومیوں نے عرض کی کہ یہی آفتِ سماوی تھی جو اس پر گزر گئی اب حضرت شوق سے جلوس فرمائیں۔ چنانچہ شیخ صاحب تختِ شاہی سے اُتر آئے اور بادشاہ نے جلوس فرمایا۔ مولوی ذکاء اللہ دہلوی تاریخِ ہندوستان میں تحریر کرتے ہیں کہ تاج و تخت سے دست برداری صرف چند گھنٹوں کے لیے عمل میں لائی گئی تھی اور یہی قول حقیقت سے قریب معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ اگر اکبر تین یوم کے لیے منصب فرماں روائی سے علیحدہ ہوتا تو یہ اہم واقعہ آئینِ اکبری میں ضرور جگہ پاتا اور دیگر معاصر مورخین بھی اس سے چشم پوشی نہ کرتے۔

بہرحال اکبر نے اس کے بعد شیخ عبدالرحیم کو علاقہ کوہ متعلق نظامت بہرائچ اور لکھنؤ بطور جاگیر عطا فرمایا۔ چنانچہ وہ بڑی شان و شوکت سے لکھنؤ میں داخل ہوئے اور دریائے گومتی کے قریب ایک بلند مقام پر اپنی بیویوں کے لیے

پانچ عالیشان محل تعمیر کرائے جنھیں "پنج محلا" کہتے تھے اور ایک قلعہ اپنی رہائش کے لیے بھی بنوایا۔ مشہور ہے کہ اس قلعے کے ایک مکان میں چھپّن دروازے تھے اور معماروں نے ہر دروازے کے اوپر دو مچھلیاں بنائی تھیں اسی وجہ سے اس کو "مچھی بھاون" کہتے تھے۔ بعدہٗ کثرتِ استعمال سے "مچھی بھون" مشہور ہو گیا۔ قلعے کے جنوب میں ایک عالی شان دروازہ تھا جس پر گول محراب بنی تھی "شیخن دروازہ" کے نام سے معروف تھا۔ شیخ عبدالرحیم کے جانشینوں نے اس کی چھت سے ایک ننگی تلوار لٹکا رکھی تھی تاکہ پھاٹک کے نیچے سے جو گزرے اُسے سر جھکانا پڑے اور اس طرح شیخ زادوں کی عظمت کا اظہار ہو۔

شیخ عبدالرحیم نے جہانگیر کے دورِ تاجداری میں یعنی ۱۶۰۵ء کے بعد کسی سال وفات پائی اور اپنے ہی تعمیر کردہ مقبرے نزدان محل میں سپرد لحد کیے گئے۔ اُن کی رحلت کے بعد عرصے تک اُن کے ورثا قابض و متصرف جاگیر رہے۔ شیخ عبدالرحیم کے دُنیا سے رخصت ہونے کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اُن پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے اور بجز اس امر کے کہ اُنھوں نے ایک بڑا پروار چھوڑا تھا یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ اُن کا جانشین کون ہوا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ شیخ عبدالرحیم کے بعد کتنے شیوخ منصب جاگیرداری پر فائز ہوئے اور وہ کب تک زندہ رہے۔

شیخ زادوں کا زوال

بادشاہِ دہلی محمد شاہ نے اودھ کے شاہی عمال کی بے عنوانیوں اور زمیں داروں کی سرکشی کا حال سُن کر ۱۷۲۰ء میں نواب سعادت خاں برہان الملک کو اودھ کی صوبہ داری کا خلعت عطا کر دیا۔ تاریخ تقرری سنہ ہجری میں یہ ہے —

چو یافت میر محمد امیں سعادت خاں
بہ نظم ملکِ اودھ خلعت از شہ شاہاں
ز ماہ و سال ولم جُست، ہاتفے فرمود
ہزار و یک صد و سی بعدِ روز ہجرت داں

نواب سعادت علی خاں کی پشت پر کسی فوج کی اعانت نہ تھی اور انھیں خیال تھا کہ شیخ زادے آسانی سے اُنھیں صوبیداری نہ سپرد کر دیں گے۔ یہ سوچ کر اُنھوں نے مغلوں کی ایک کثیر تعداد کو جن کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہ تھا ایک خوش گوار مستقبل کی اُمید بندھا کر اپنے پاس جمع کیا۔ پھر نواب نے اپنے توپ خانے سے کچھ توپیں منتخب کر کے ساتھ لیں اور گھر میں جو کچھ زیور وغیرہ تھا اُسے فروخت کر کے توپوں کے لیے بیل خریدے اور بڑے لاؤ لشکر سے آگرے پہنچے۔ وہاں کے صوبیدار نے ضیافت کا بندوبست کرنا چاہا مگر نواب نے مصلحتِ وقت سمجھ کر زرِ نقد لے لیا اور اپنی مفلوک الحال فوج میں تقسیم کر دیا۔ وہاں سے کوچ کر کے بریلی آئے۔ وہاں بھی یہی صورت پیش آئی۔ اس کے بعد فرخ آباد میں داخل ہوئے وہاں کے نواب نے بڑی خاطر تواضع کی اور کچھ ضروری ساز و سامان بھی پیش کیا۔ اُنھوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ لکھنؤ کے شیخ زادے بڑے سرکش و متمرد ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ آپ گنگا کے اُس پار اُتر کے براہ راست لکھنؤ میں داخل نہ ہوں بلکہ اُس کے نواحی مواضعات میں قیام کریں، بعدہٗ حکمتِ عملی سے لکھنؤ میں داخل ہوں۔ لکھنؤ اور قصبات کے شیخوں میں دلی صفائی نہیں ہے غالباً قصبات کے شیوخ آپ کے اقتدار کو اپنے حق میں ذریعہ عافیت سمجھ کر آپ کے طرف دار ہو جائیں اور ان کی حمایت سے لکھنؤ کے شیخوں کا زور ٹوٹ جائے۔ ان مشوروں کے بعد نواب نے پہلے نواح کاکوری میں قیام کیا۔ وہاں کے شیوخ واقعی لکھنؤ کے شیخ زادوں کے مخالف تھے اُنھوں نے نواب کی آمد کو اپنی فلاح و ترقی کا ذریعہ سمجھ کر نواب کو ہر طرح کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا اور کہا کہ آپ علانیہ ہمراہ فوج شہر میں داخل نہ ہوں کیونکہ ہر کمیں گاہ پر ہتھیار بند سپاہی تعینات رہتے ہیں وہ لڑنے بھڑنے کو تیار ہو جائیں گے۔ اور ہوا بھی یہی۔ نواب ناکام شہر میں بھی داخل نہ ہو سکے اور لشکر اکبری دروازے کے جنوب میں کئی مہینے تک خیمہ زن رہا۔

جب کوئی تیر نشانے پر نہ بیٹھا تو آخر نواب نے ایک ترکیب سے کام لیا اور شیخ زادوں سے رفتہ رفتہ اتنا میل جول بڑھایا کہ وہ ان کا کلمہ پڑھنے لگے اور اُن کے دلوں میں نواب کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ رہا۔ بعد چندے نواب نے ایک تقریب میں اُنھیں مدعو کیا۔ سات ہزار کی جمعیت سے وہ نواب کے مہمان ہوئے۔ اِدھر یہ حضرات خورد و نوش اور خوش گپیوں میں مصروف تھے اُدھر نواب نے مع فوج ہاتھی پر جا کر مچھی بھون پر دھاوا بول دیا پہلے شیخن دروازے کی تلوار کو کاٹ کر زمین پر گرا دیا پھر خیمہ خاص بھی پھاٹک کے روبرو نصب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا بڑے بڑے شیخ زادے نواب کے

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۰۹ پر)

شعر میں فضا

محمد عقیل

ہماری شاعری میں شعر فہمی اور شعر گوئی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور ہمیشہ لگایا جاتا رہا ہے اور لگایا جاتا رہے گا۔ سخن شناس شعر کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہی چند باتوں پر غور کرنے لگتے ہیں۔ الفاظ کی بندش کیسی ہے، چست یا سست۔ زمین کیسی ہے، بلند یا پست۔ قافیہ کا انتخاب کس طرح کیا گیا ہے ایطاء تو نہیں پیدا ہوتا۔ صحیح بیٹھتا ہے یا نہیں۔ سامنے کا ہے یا دور سے لایا گیا ہے۔ معمولی ہے یا غیر معمولی۔ جھنکار کیسی ہے۔ شکست ناروا تو نہیں آجاتی۔ ردیف لپٹتی ہے یا نہیں۔ خیالات سامنے کے ہیں یا غیب سے آئے ہیں۔ سننے والوں کے دل کی بات کہی گئی ہے یا کسی نئی بات کی تلاش ہے۔ بحر مترنم ہے یا غیر مترنم۔ اوزان گھٹتے بڑھتے تو نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ فہرست ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ کہیں معنی و بیان کا جھگڑا ہے تو کہیں عمومیت اور اچھوتے پن کی آویزش۔ مگر اس کے باوجود بہت ساری اور باتیں بھی ہیں جو فن شاعری اور خاص طور پر اس کی روح سے وابستہ ہیں، جن کی طرف شعوری طور سے ہمارے شعر گویوں اور سخن فہموں کو توجہ دینا چاہیے۔ ان میں سے ایک شعر کی فضا ہے جو ان تمام لوازمات شاعری سے مل کر بنتی ہے مگر جس کے مناسب قیام کے بغیر شعر اور شاعری دونوں بے روح سی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔

شعر میں فضا درحقیقت وہ ماحول ہے جو شاعر اپنے خیال، الفاظ کے انتخاب، قافیوں کی جھنکار، وحدت اثر، بحر کے انتخاب، تال و سم کے زیر و بم اور ایک مخصوص ترنم سے پیدا کرتا ہے جو اس کی پوری نظم یا غزل پر طاری ہوتا ہے اور جو کبھی کبھی اس بات کا بھی نقیب بن جاتا ہے کہ ایک مخصوص نظم یا غزل کے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے یا کیا ہونے والا ہے۔ نظم یا غزل کے گرد و پیش رومان برس رہا ہے یا بادلوں کی گھن گرج کے ساتھ ایک طوفان امنڈتا آتا ہے۔ اسے شعر سے الگ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر بہت اصرار کیا گیا تو اسے صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ فضا ایک آہنگ ہے، ایک صوت ہے، ایک لَے ہے یا بازگشت جو شعر، شیشہ، برتن، پتھر ہر چیز سے پیدا ہوتی ہے جو شعر، شیشہ اور برتن کے باہر ایک رو سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی مگر وہ مخصوص آواز ان تمام چیزوں سے اس طرح وابستہ ہے کہ پتھر کے گرنے کی آواز کو برتن کی جھنکار سے نہیں ملا سکتے اور نہ شیشے کی شکستگی کی آواز کو ثابت شیشے کی جھنکار سے مماثل کیا جا سکتا ہے۔ سننے والا فوراً محسوس کرے گا کہ یہ شیشے کے ٹوٹنے کی صدا ہے اور یہ شیشے پر ضرب پڑنے کی جھنکار، اور اگر یہ آہنگ ایسے موقعوں پر ان کیفیات کا ساتھ نہیں دیتی تو وہ فضا نہیں پیدا ہو پاتی جو مطلوب تھی۔ اچھی شاعری کی تکمیل ایسی ہی فضا کے قیام کے بغیر نہیں ہو سکتی

فضا کے قیام میں الفاظ کو بہت سنبھل سنبھل کر اپنا پارٹ ادا کرنا ہوتا ہے۔ ان کی ہلکی سی لغزش فضا میں ناخوشگوار تعاش پیدا کر دیتی ہے۔ ان کی آوازیں نظم یا غزل میں ایک دوسرا جسم تیار کرتی ہیں۔ ایسا جسم جو صرف قوتِ سامعہ ہی سے محسوس کیا جا سکتا ہے، ضبط تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ جس کے ساتھ سننے والے کے مذاق، احساس اور صلاحیت کا ایسا پیمانہ لگا رہتا ہے جو قوس قزح کے ہفت رنگوں کی طرح اترتا چڑھتا رہتا ہے۔ الفاظ سے

ذرا سا دھوکا کھایا اور قوسِ قزح کا وجود معرضِ خطر میں آگیا۔ شبلی نے بھی اسی طرح کی ایک بات کہی تھی گرزرا الگ سی۔ وہ الفاظ کی صرف صوتی اہمیت ہی پر زور دے کر رہ گئے۔ وہ کہتے ہیں :—

"اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے اور چونکہ آوازیں بعض شیریں، دل آویز اور لطیف ہوتی ہیں مثلاً طوطے و بلبل کی آواز اور بعض کروہ مثلاً کوے اور گدھے کی آواز۔ اسی بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض شستہ، سُبک، شیریں اور بعض ثقیل بھدے۔ پہلے قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں اور دوسرے کو غیر فصیح۔"

یہاں میرے کہنے کا مطلب دوسرا ہے۔ وہ یہ کہ یہ الفاظ تصویریں بناتے ہیں دیتی نہیں بلکہ ان چیزوں کی جن کے لیے وہ لائے گئے ہیں اور یہ تصویریں مکمل اُس وقت تک نہیں ہو سکتیں جب تک کہ الفاظ کی یہ آوازیں تصویروں کے ساتھ اُن کے ماحول کو بھی نہ لے آئیں۔ فحاشی کی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ دیکھنے، پڑھنے، لکھنے اور سننے والوں پر لذت کا احساس نہ طاری کر دیا جائے جب تک کہ وہ اپنے گرد و پیش اُس کے تمام لوازمات کو متشکل محسوس نہ کرنے لگیں، ان کے اعضا پر ان خیالات کا اثر نہ پڑنے لگے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو فحاشی کی تصویروں میں نقص ہے۔ علم طب، علم حیوانیات اور جنسیات کے ماہرین کی تشریحی تصویریں یہاں تک کہ عملی تشریحی تصویریں بھی سنجیدگی سے مطالعہ کے لیے ہوتی ہیں۔ اِن کے مطالعے کے وقت کسی مریضانہ نفسیاتی رجحان رکھنے والے ہی کے دل میں فحش تصور اُبھر سکتا ہے اس لیے کہ ان تصویروں اور ان کی تشریح میں فحاشی کی فضا کا کوسوں پتہ نہیں رہتا۔ کسی مصور یا بُت تراش کی بنائی ہوئی تصویر یا مجسمۂ فن کا اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے اور انشا، رنگین، جان صاحب، جعفر زٹلی، زانی اور فاجر کی ریختی اور دوسری شعری تخلیقات، جرأت کی کربلا بھانڈ والی نظم، ان سب کا شمار فحشیات میں ہوگا۔ فضا یا ماحول اسی کا نام ہے۔ سردار جعفری کی ایک طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" اس طرح شروع ہوتی ہے :—

سیاہ رنگ بھریرے ہوا میں اُڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے یہ رات سر اُٹھائے ہوئے

سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں ہار سیاہ
سیاہ چمن ہیں، یہ پھول مسکرائے ہوئے
سیاہ وادی و صحرا ہے سیاہ دریا ہیں
سیاہ دشت، یہ کھیت لہلہائے ہوئے
سیاہ رنگ کے ساحر یہ لبادوں میں
سیہ حصار، یہ تیوریاں چڑھائے ہوئے

اور ان اشعار کے بعد جعفری ایک شعر اور لکھ دیتے ہیں جو ان کی اس سیاہی کی وضاحت بھی کر دیتا ہے ؎

ضمیرِ عہدِ غلامی کی تیرگی ہے یہ رات
جو پھر رہی ہے اندھیرے سے منہ چھپائے ہوئے

مگر ان کے اس شعر تک پہنچنے سے پہلے ہی پڑھنے والے کو یہ احساس اچھی طرح ہو جاتا ہے کہ یہ سیاہی کس لیے ہے اور اس کا کیا مفہوم ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کا پس منظر تاریکی ہی تاریکی ہے اور وہ تاریکی تقدیرِ آدم سے متعلق نہ سہی تو اس کی ارضِ حسین سے تعلق ضرور ہے۔ اس نظم کے پڑھنے سے اس دور کے متعلق کوئی اچھا تصور پڑھنے والے کے ذہن میں نہیں اُبھر سکتا۔ اب اِسی بحر، ردیف اور قافیے میں جعفری مریم کے حسن، جوانی اور دل کی ہلچل پیش کرتے ہیں :—

ہوا میں اُڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح
فضا کے سینے میں اک آگ سی لگائے ہوئے
سرک رہے ہیں اندھیرے کے مخملیں پردے
نکل رہا ہے کوئی جسم کو چُرائے ہوئے
اُبھر رہا ہے کوئی وقت کے تلاطم سے
جبیں پہ قوسِ قزح کی کماں جھکائے ہوئے
خمارِ نیم شبی کا ہے آنکھ میں کاجل
ہتھیلیوں پہ حنا کے کنول جلائے ہوئے
سڈول اور سُبک بازوؤں کی لرزش میں
شباب و شعر کی انگڑائیاں دبائے ہوئے

ان اشعار میں جوانی کی اُمنگوں اور شباب کے نغموں کی ایک ایسی فضا قائم ہو گئی ہے جسے بہت واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کون سی چیز

جو ایک مقام پر اسی نظم کے اشعار میں تاریکی، بدنظمی، نفرت اور غصّے کا احساس بھر دیتی ہے اور دوسری جگہ پر پڑھنے اور سننے والوں پر ایک رنگین اور ریشمی چادر ڈال دیتی ہے اور چاروں طرف رومان برسنے لگتا ہے۔

اس موقعے پر خیال کی بھی اہمیت کا سوال اُٹھایا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ جیسا خیال ہوگا اسی طرح کا اثر شعر میں پیدا ہوگا۔ اس میں صرف یہاں تک مانا جاسکتا ہے کہ خیال کو بنیادی حیثیت ضرور حاصل ہے۔ بغیر خیال کے شعر کی عمارت کھڑی ہی نہ ہو سکے گی۔ اسے خام مواد سمجھا جاسکتا ہے۔ حالی نے ایسے ہی موقعے پر پانی اور پیاسے کی مثالیں سامنے رکھی تھیں۔ ان کے نزدیک پانی چاہے سونے کے پیالے میں رکھ لیا جائے چاہے شیشے کے پیالے میں یا مٹی کے آب خورے میں پانی وہی رہے گا۔ اس کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا۔ مگر سونے یا چاندی وغیرہ کے پیالے میں اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اور مٹی کے پیالے میں کم ہو جاتی ہے[۱]۔ مجھے اس مثال سے اختلاف ہے۔ حالی اور ان کا دور جس طبقے سے متعلق تھا وہاں ممکن ہے چاندی یا سونے کے پیالے میں پانی کی عظمت بڑھ جاتی رہی ہو مگر ایک پیاسے کی نگاہ سے اگر جائزہ لیا جائے تب ہی پانی کی صحیح قدر کا احساس کیا جاسکتا ہے عام طور پر یہ بات سُنی جاتی ہے کہ چینی یا شیشے کے پیالے میں پیاس نہیں بجھتی۔ خیر اسے غلط بھی سمجھ لیا جائے تو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مٹی کے برتن میں پانی اور پیاس کے جتنے لوازمات پورے ہوتے ہیں اُتنے اور کسی برتن میں نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہندوستان ایسے گرم ملک میں مٹی کے برتنوں ہی میں ٹھنڈک، سوندھاپن اور پانی کی ایک خاص مہک ممکن ہے جو پیاس کی فضا کو آسودہ کردیتی ہے۔ صرف ضرورت کو شیشے کے پیالے، مشک، اونٹ کے پیٹ سے نکلے ہوئے پانی اور نیم گرم یا گرم پانی سے بھی رفع کیا جاسکتا ہے۔ مگر آسودگی نہیں ہو سکتی۔ خیال کے لیے بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ شعر و ادب کی دُنیا میں صرف خیال ہی کی حکومت نہیں ہو سکتی۔ بہت سے ایسے خیالات ہیں جنھیں بہت سے ناشاعر یا نیم شاعر بھی جنم دے لیتے ہیں۔ عشق و محبت جسے دُنیائے شاعری میں اتنی اہمیت دی جاتی ہے اس کے متعلق کسی ماہر حیوانیات سے پوچھا جائے تو وہ اسے جنسی جبلّت (Sex instinct) کہہ دے گا جو ہر ذی روح میں موجود ہے اور زیادہ وضاحت چاہی جائے گی تو Chromasoms اور Fertilization وغیرہ کی بحث چھیڑ دے گا جسے عشق کے شاعرانہ تصور سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بنیادی بات وہی ہے جو ماہر حیوانیات کہتا ہے۔ اب سوچیے کہ اگر اس خیال کو نظم کر دیا جائے تو عاشقانہ شاعری ہوگی؟ کبھی نہ ہوگی۔ اس لیے کہ عاشقانہ شاعری کو جس رومانی، حسین اور رنگین فضا کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس میں موجود نہیں ہے اور اس فضا کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم سننے والوں کے جمالیاتی احساس کو بیدار نہ کریں اور نہ صرف بیدار کریں بلکہ سننے والوں کے احساسات ایسی رنگین اور رومانی فضا میں تیرنے نہ لگیں۔ شعر میں محبت کا احساس بہتوں نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اخیر اُلفت یہی نہیں ہے کہ جل کے آخر ہوئے پتنگے
ہوا جو یاں کی یہی ہے یارو، غبار بن کر اُڑا کرو گے — میرؔ

برسات کی اِس رات میں اے دوست تری یاد
اک تیز چھُری ہے جو اُترتی چلی جائے — فراقؔ

کھڑے جو ہوتے ہو تم، آن آن کوٹھے پر
کروگے حُسن کی کیا تم دُکان کوٹھے پر — نظیرؔ

رات باتوں میں یہاں تو نے گزاری خواجہ
صدقے تیرے کسی ڈھب سے اُسے لا ری خواجہ — انشاؔ

راتوں کو مرے رونے کا سماں بیدار ستارے دیکھتے ہیں
اور میرے جنوں کے عالم کو عالم کے نظارے دیکھتے ہیں
باغوں کے مناظر دیکھتے ہیں، نہروں کے کنارے دیکھتے ہیں
یوں شرح محبت کرتا ہوں، میں تم سے محبت کرتا ہوں — اختر شیرانی

اِن سبھی اشعار میں محبت اور عشق کا خیال کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے مگر ہر شعر میں عشق کی پوری فضا نہیں اُبھر پاتی۔ کہیں عشق ہے کہیں بوالہوسی، کہیں تمسخر اور کہیں محض نفسانی خواہشات۔

شاعری شاعر کے عمل اور ردِّ عمل کا نتیجہ ہے۔ فضا، خیال، الفاظ اور ان کی نغمگی کی ایک مخصوص مناسبت اور ملاپ کا نتیجہ ہے۔ چاہے خیال ہماری سماجی باتوں سے متعلق ہو یا زندگی کی اُن بنیادی حقیقتوں کی طرف

---

[۱] مقدمۂ شعر و شاعری صفحہ [illegible] لاہور ایڈیشن

نہیں لے جاتا ہو جن پر اکثر شعر کا جادو نہیں چل پاتا۔ جہاں تخیل کی کارفرمائی زیادہ دخل نہیں رکھتی جب تک ان حقیقتوں کو ابلاغ یا فینسی (Romantic) کا رنگ نہ دے لیا جائے۔ بھوک پیاس زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ مرنا زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ زندہ رہنا اور زندگی کی کیف سامانیوں سے حظ اٹھانا انسان کی سب سے بڑی خواہش رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کی زندگی کا حظ الگ رنگ ہے اور کسی کا بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور اسے ایک کامیاب زندگی گزارنے کا راستہ بتانا۔ یہ بات بھی زندگی کی بنیادی حقیقت بن گئی۔ خیال کی اہمیت یہیں تک رہی مگر اس بھوک پیاس اور مرنے جینے، بنی نوع انسان کی فلاح وغیرہ سے شواہد مرثیت پیدا کی۔ مرثیت کو واقعات کربلا مل گئے۔ واقعات کربلا کو انیس مل گئے۔ انیس کو ایسا فن مل گیا جس نے مرثیت کو "بڑا شاعر مرثیہ گو" سے نکال کر ایک بیج میدان میں پہنچا دیا مگر ان سے باتوں میں فضا کہاں گئی؟ فضا ہے اور شعر بھی مگر اس نے ذرا وسعت لے لی ہے۔ ابھی فضا، معمولی فضا، مختصر اور طویل۔ ذرا دور تصور کیجیے جب مرثیہ غزل کی ہیئت میں لکھا جاتا تھا اس دور کے مرثیوں میں مرثیت کی ابھی فضا نہیں بن پائی۔ یہاں پورے تام فضا ہے۔ قافیوں اور ردیف کی آہنگ کا تموج وسعت خیال اور ... الفاظ اس کے بعد

یارو مجھ کو تو فقاق ... واسطے ... دحید کے واسطے

یہ برسہ گھر ہنی ... کے واسطے یا ظالمو کی برش خنجر کے واسطے

جیسے مرثیے لے جہاں سننے والا ماحول میں نہیں ڈوبتا بلکہ سن لیتا ہے اور ثواب دارین کے خیال سے متاثر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر جب ہم

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے

اس طرف لشکر اعدا میں صف آرائی ہے یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے

برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں

مار لو پیاسے کو ہے شور ستمگاروں میں

زخمی بازو ہیں جگر زخم ہے بدن میں نہیں تاب ڈگمگاتے ہیں تھک جاتی ہے قدموں کی رکاب

پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہیں آنکھیں پر آب تیغ سے دیتے ہیں ہزار کا اعدا کو جواب

شدت ضعف میں جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں

سیکڑوں تیر ستم تن سے گزر جاتے ہیں

ابھی ان میرے پہلوؤں میں سمٹنے گا بچو! تڑپنے گا کلیجہ مرا دل دھڑکے گا بچو!

داغ تو دنیا سے مجھے کھونے گا بچو! دن ڈھلے کے شب کی گل ہو گیا جھلنے گا بچو!

راحت کسی کروٹ کسی پہلو نہ ملے گی

مر جاؤں گی زلفوں کی جو خوشبو نہ ملے گی

جیسے مرثیوں میں پہنچتے ہیں تو مرثیت کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ چاروں طرف آہ و بکا، ماتم و فریاد، شور و شین کی فضا قائم ہو جاتی ہے جو اپنا اثر سننے کے بعد تک قائم رکھتی ہے۔ دنیا کی بنیادی حقیقتیں اور خیال ہر جگہ موجود ہے۔ ابتدائی مرثیوں میں بھی اور آخری مرثیوں میں بھی۔

بھوت پریت اور ما فوق الفطرت ہستیوں کے قصے ہمیشہ کہے سنے جاتے رہے ہیں اور شاید قصہ گو اپنی دلچسپی کے لیے انھیں مختلف شکلوں میں ہمیشہ قائم رکھے۔ اگر ان فوق فطری ہستیوں کی تشریح میں پوری کتاب لکھ دی جائے تب بھی ان کی جادوگری اور تخویف کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ مگر شیکسپیر میکبتھ میں ڈنکن کا قتل ایسی تاریکی اور خوفناک حالت میں پیش کرتا ہے اور امنظر چڑیلوں، بھوتوں اور تاریکیوں کا اکھاڑہ بن جاتا ہے۔ تمام واقعات رات ہی میں پیش آتے ہیں۔ پورے ڈرامے میں سورج صرف دو مرتبہ چمکتا دکھایا جاتا ہے۔ جہاں روشنی ہے وہاں بھی تاریکی کا خوف ہے۔ لیڈی میکبتھ اتنی دلیر ہے مگر رات کی سیاہی سے ڈر کر جلتی ہوئی موم بتی اپنے پاس رکھتی ہے۔ خون کی چمک ہے خنجر کی چمک ہے۔ چڑیلوں کی آمد اپنے ساتھ ایک بے پناہ طوفانی کیفیت لاتی ہے جو ساری آبادی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتی ہے۔ ایک خلفشار اور تخویف کا عالم ہے جو سارے ڈرامے پر طاری ہے۔ شیکسپیر کی زبان، بیان اور اشارے اس فضا کو موقعے کی مناسبت سے بڑھا اور گھٹا کر تقریباً پورے ڈرامے پر اسے محیط کیے رہتے ہیں۔ میر حسن اور نسیم کی مثنویوں میں پریوں اور دیوؤں کے تذکروں کے موقع پر ایک تحیر کی فضا چھائی رہتی ہے۔ انیس، شیکسپیر، میر حسن اور نسیم نے اگر الفاظ کی قدر و قیمت ان کے اتار چڑھاؤ، گھن گرج، ترنم اور جھنکار، رنگینی اور وسعت کو ملحوظ نہ رکھا ہوتا تو ایسی فضا قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ اب اگر کوئی الفاظ کی بنائی ہوئی تصویروں، ان کی قدر و قیمت، ادب کی ایسی صلاحیت جو انسان کے اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہو، شعر میں تحریک، تخویف، نفرت، غم و غصہ

(بقیہ مضمون صفحہ ...)

ہندی شاعری میں تلسی داس کا درجہ

بشیشور پرساد منور لکھنوی

تلسی داس ہندی زبان کے سب سے بڑے دور آفریں شاعر ہیں۔ یہ فیصلہ صرف ہندوؤں یا ہندستانی عالموں ہی کا نہیں ہے یورپ والے بھی انھیں ہندی زبان کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں! انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بھی یہی رائے ظاہر کی گئی ہے۔ یہی خیال گریرسن اور ایڈمنڈ گریوز ایسے ماہران علوم مشرق کا ہے۔ پروفیسر پنڈت و نشی دھر دیا الٹکالے نے ایک مرتبہ اپنے ایک مقالے میں جو رسالہ زمانہ کانپور میں شائع ہوا تھا لکھا ہے کہ سورداس کے بعد جس شاعر اعظم کا نام مشہور ہوا وہ تلسی داس تھے۔ یوں تو تلسی داس کی شاعری کی زبان پوربی ہے لیکن اس میں برج بھاشا بہت ملی ہوئی ہے۔ تلسی داس نے اپنی راماین سے ہندی شاعری میں نئی جان ڈال دی۔ اگر مقبولیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندی میں تلسی داس سے بڑا کوئی شاعر نہیں ہوا۔ کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ "سور سور تلسی ششی اڈگن کیشو داس"

सूर सुर्य तुलसी शशी उदगन केशो दास,
अब के कवि खेदत्त सम जहं तहं करे प्रकाश।

یعنی جہاں تک ہندی شاعری کا تعلق ہے سور داس آفتاب ہیں، تلسی داس ماہتاب ہیں اور کیشو داس ستارے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ تلسی داس نے راماین ایسی بے نظیر تخلیق پیش کر کے جس کا اصلی نام رام چرت مانس ہے، ہندی زبان کو ایک ایسا مستقل اور لافانی شاہکار عطا کیا ہے جس کے سبب سے وہ یقیناً سورداس سے کہیں زیادہ عظمت و شہرت کے مالک ہو جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سورداس کی کرشن کے پریم سے بھری ہوئی شاعری ایک عجیب وجدانی کیفیت رکھتی ہے اور ان کے بھجن ہر گھر میں گائے جاتے ہیں لیکن انھوں نے تلسی داس کے رام چرت مانس کی طرح کوئی مستقل شاہکار پیش نہیں کیا اس لئے اگر فوقیت کا تاج تلسی داس کے سر پر رکھ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ تلسی داس کی راماین آج بھی ہندی کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ ہر گاؤں اور ہر شہر میں ان کا رام چرت مانس اس شوق سے گایا اور سنا جاتا ہے کہ اب وہ لوگوں کی روزانہ زندگی کا جزو اعظم بن گیا ہے۔ چناں چہ ایک انگریز ماہر مشرقیات نے کہیں لکھا ہے کہ دور موجودہ میں ہندوؤں کا مذہب ہندو ازم نہیں ہے بلکہ راماینزم (یا راماین کا مت) ہے کیونکہ اتر، دکھن، پورب، پچھم ہندوستان میں آپ جہاں چلے جائیے آپ کو ہر ہندو گھرانے میں تلسی کرت راماین کا ایک نسخہ ضرور ملے گا۔ لوگ اس کا پاٹھ کر کے اس کے کردار کی پیروی کرنا اپنے لئے روحانی مسرت اور دائمی نجات کا باعث سمجھتے ہیں۔

جس طرح کالی داس کو سنسکرت کا۔ فردوسی کو فارسی کا اور انیس کو اردو کا شیکسپیئر قرار دیا جاتا ہے اسی طرح تلسی داس کو ہندی زبان کا شیکسپیئر کہا جاتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ دونوں کا زمانۂ وجود قریب قریب یکساں ہے۔ شیکسپیئر اس زمانے میں پیدا ہوا جب انگلستان میں پہلی ملکہ الزبتھ کا راج تھا۔ ہندوستان میں تلسی داس نے اس دور میں آنکھیں کھولیں جب مغل شاہنشاہ اکبر اعظم کی حکومت تھی۔ دونوں میں بہت سی باتیں ملتی ہیں۔ دونوں میں ایک فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ شیکسپیئر

شاعر اور شاعر محض تھا مگر تلسی داس شاعر ہونے کے ساتھ ایک تارک الدنیا فقیر بھی تھے۔ البتہ دونوں باکمال شاعر تھے۔ دونوں کے کلام میں فصاحت ہے، بلاغت ہے، روانی ہے، سلاست ہے اور اسلوب نگارش میں انفرادیت ہے۔ دونوں عشق و معرفت کے رموز سے آگاہ ہیں لیکن شکسپیر عالم باعمل نہیں ہے۔ تلسی داس عالم باعمل ہیں۔ دونوں نے اپنے شاہکاروں کے ذریعہ انسانی جذبات اور احساسات کے حسین ترین مرقع پیش کئے ہیں۔ دونوں کے کردار تاریخی ہیں۔ مفروضہ نہیں ہیں۔ شکسپیر تمثیل نگار ہے اور ایسا تمثیل نگار جس کا جواب آج تک دنیا میں پیدا نہ ہو سکا۔ تلسی داس نے بھی اپنی رامائن میں بعض جگہ تمثیل نگاری سے کام لے کر اپنے کرداروں میں مزید جان ڈال دی ہے۔ بھگت کال کے ایک شہرۂ آفاق مصنف نے تلسی داس کو والمیک کا اوتار مانا ہے حقیقت یہ ہے کہ تلسی داس کی رام چرت مانس کا سرچشمہ والمیک ہی کی رامائن ہے چھوٹا ہے لیکن بعض مقامات پر تلسی داس نے والمیک کے پلاٹ میں کچھ ڈرامائی تبدیلیاں کر دی ہیں جس سے رامائن کا حسن دوبالا ہو گیا ہے مثلاً پرشرام جی کا واقعہ۔ والمیک کی رامائن میں پرشرام پلاٹ میں اس وقت نمودار ہوتے ہیں جب سیتا سوئمبر کے بعد رامچندر کی برات جنک پور سے ایودھیا واپس جانے لگتی ہے لیکن تلسی داس کے رام چرت مانس میں ہم پرشرام جی کو سیتا سوئمبر کے دوران میں جب رامچندر جی شو دھنش توڑ چکتے ہیں غیض آلود پاتے ہیں۔ شو دھنش کے ٹوٹنے پر ان کا عتاب راجا جنک پر نازل ہوتا ہے کہ جس سے رامچندر جی کے چھوٹے بھائی لکشمن جی کو طیش آجاتا ہے اور وہ پرشرام جی کی غیض و غضب کا بھری محفل میں سخت جواب دیتے ہیں۔ دونوں میں بہت کہا سنی ہوتی ہے۔ آخر کار رامچندر جی کے اشارے سے لکشمن جی خاموش ہو جاتے ہیں اور رامچندر جی عاجزی اور احترام کے ساتھ پرشرام جی پر حقیقت حال کا انکشاف کرتے ہیں۔ اس وقت پرشرام جی کی تشفی ہو جاتی ہے اور وہ مطمئن و آسودہ ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس سین میں تلسی داس کا ڈرامائی آرٹ پورے شباب پر ہے اور یہ ان کی رامائن کا حسین ترین حصہ ہے۔

جس طرح شکسپیر کے ڈراموں کا ماخذ انگلستان اور یونان و روم کی قدیم تاریخیں ہیں اسی طرح تلسی داس نے بھی والمیک کی رامائن نیز ویدوں، پرانوں اور شاستروں سے اپنے رام چرت مانس کا چراغ جلایا ہے انھوں نے اپنی تخلیق کے ابتدائی شلوک میں خود فرمایا ہے۔

نانا پران نگم آگم سمّتم۔ یدرامائنے نگدتم کوچ دنیتو پی
سوانتہ سکھا ئے تلسی رگھو ناتھ گاتھا بھاشا نبند متی منجل ماتنوتی

یعنی تمام پرانوں، ویدوں، شاستروں نیز دیگر گرنتھوں میں جو باتیں لکھی گئی ہیں تلسی داس نے انھیں باتوں کو اپنے ذاتی جذبات کی ہٹ دے کر من وعن بیان کر دیا ہے اور وہ بھی اپنی طبیعت کو خوش کرنے کے لئے۔

تلسی داس کے رام چرت مانس کا انداز نگارش بہت کچھ جائسی کی پدماوت سے ملتا جلتا ہے۔ بعض مرتبہ جائسی کے کلام پر تلسی داس کے ارشادات کا دھوکا ہو جاتا ہے اور اس طرح جائسی کے کلام میں تلسی داس بولتے ہوئے نظر آتے ہیں جائسی تلسی داس سے بہت پہلے ہوئے ہیں۔ اس سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے تو کچھ بے جا نہیں کہ تلسی داس پر جائسی کی بڑی گہری چھاپ ہے اور خاص طور پر ان مقامات پر جہاں دونوں باکمالوں نے عشق و معرفت کے میدان میں اپنی اعجاز بیانی کے جوہر دکھائے ہیں۔

تلسی داس کی رامائن غالباً ہندی زبان میں پہلی رامائن ہے مگر ان کے اس نقش اول کے سامنے کوئی بھی نقش ثانی آج تک ٹھہر نہیں سکا۔ خود تلسی داس کی دوسری تصنیفیں جن کی تعداد تیرہ چودہ ہے اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں۔ ونے پتریکا ان کی ایک اور مشہور تصنیف ہے لیکن رام چرت مانس کا درجہ اسے بھی نہیں حاصل ہو سکا۔ یہ بات اور بھی عجیب ہے کہ اگرچہ رامائن اور ونے پتریکا دونوں ایک ہی مصنف کے شاہکار ہیں لیکن دونوں کی زبان اور دونوں کے انداز نگارش میں وہی فرق نظر آتا ہے جو رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب اور رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد میں پایا جاتا ہے۔ سرور اور سرشار کے زمانۂ وجود میں کسی قدر فرق ہے اور دونوں کے زمانہ کا مذاق تحریر بھی یکساں نہیں اس لئے ان دونوں کے انداز نگارش میں فرق کا ہونا قدرتی بات ہے لیکن تلسی داس کی دو تخلیقات میں اتنا فرق کیوں ہے، اس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تلسی داس نے رامائن عوام کے لئے لکھی اور ونے پتریکا خواص کے لئے۔ اس کا تعلق سب سے پہلے تلسی داس کی ذات سے ہے اس کے بعد دوسروں سے مگر جس طرح رامائن کی چوپائیاں اور دوہے بچے بچے کی زبان پر پائے جاتے ہیں، ونے پتریکا کے بھجن بھی کلاسیکل موسیقی کی محفلوں میں عام طور پر نغزد وس گوش بنتے ہیں۔

تلسی داس پیدائشی شاعر تھے۔ مروجہ علوم میں انھیں کم عمری ہی میں کامل دستگاہ حاصل ہو گئی تھی۔ وید، پران، شاستر، اُپنشد اور گیتا کے مطالعہ سے ان کی باطنی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ سنسکرت پر کافی عبور تھا۔ شروع شروع میں اُنھوں نے سنسکرت زبان ہی میں شعر کہا۔ لیکن ان کی طبیعت ترک دنیا پر مائل ہو گئی اور انھوں نے اپنی بقیہ زندگی کا ہر لمحہ رام بھگتی میں وقف کر دیا۔ اس کا باعث ان کی پاک دامن رفیقۂ حیات رتنا ولی کا ایک فقرہ تھا۔ شادی کے بعد ایک مرتبہ ان کی رفیقۂ حیات اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ تلسی داس ان کے فراق میں بے چین ہو کر فوراً ہی اپنی سسرال جا پہنچے۔ انھیں دیکھ کر ان کی بیوی رتناولی نے انھیں غیرت دلائی کہ اگر اتنی بے تابی ایشور بھگتی کے لئے ہوتی تو جنم سپھل ہو جاتا۔ یہ ایک چنگاری تھی جس نے تلسی داس کے دل میں چھپی ہوئی رام بھگتی کو بھڑکا دیا اور پھر بقول غالبؔ "آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا"۔ تلسی داس سسرال سے واپس آکر دنیا سے کنارہ کش ہو گئے اور بیراگ اختیار کر لیا۔ تلسی داس کی بھگتی ان کے شاعرانہ کمالات اور اُن کی کرامات کی خبر شدہ شدہ مغل دربار تک پہنچی۔ بادشاہ وقت نے تلسی داس کو بلوا کر ان سے کرامات دکھانے کا مطالبہ کیا اور آخر میں اُنھیں نظر بند کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اُنھیں رہائی اُس وقت ملی جب اُن کے محبوب بھگوان رام کے خاص مقرب ہنومان جی نے اپنی غیبی طاقت سے کام لے کر شاہی محل میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ یہ ایک روایت ہے جس کی نہ میں تردید کرتا ہوں نہ تائید لیکن ہر باکمال فقیر کے ساتھ ہر دور میں کشف و کرامات وابستہ ہو جاتے ہیں۔ تلسی داس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

رام چرت مانس کے ترجمے قریب قریب ہر شائستہ زبان میں ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں ایک اور منظوم ترجمہ انگریزی میں شائع ہوا ہے اور ایک روسی زبان میں۔ فارسی میں اس کا ترجمہ کسی صاحب دیوی داس نے کیا تھا جو برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ کانپور کے سکینہ کالستھ منشی سورج پرشاد تصور نے اس کا لفظ بہ لفظ منظوم ترجمہ فرمایا ہے۔ یہ ترجمہ چھپ چکا ہے اور اس کی ایک جلد میرے پاس ہے۔ اگرچہ منشی جگناتھ پرشاد خوشتر سنگھ دیال کا ترجمہ میرے چچا منشی رام سہائے تمنا میرے والد مرحوم ملک الشعرا منشی درگا پرشاد نادر کی ... اُنھیں بذات خود اعلیٰ پایہ کی

اور بھی تصانیف ہیں لیکن ان کا ماخذ تلسی کرت رامائن ہی ہے۔ چکبست نے بھی اس کا کچھ حصہ لکھا ہے۔

تلسی داس کو بھگوان کے درشن بھی ہوئے ہیں اور ان کو یہ سعادت ہنومان جی کے توسل سے حاصل ہوئی ہے۔ چترکوٹ میں دو بار رام اور لکشمن کا دیدار ہوا مشہور ہے۔

چترکوٹ کے گھاٹ پر بھئی سنتن کی بھیر
تلسی داس چندن گھسیں تلک دیت رگھوبیر

चित्रकूट के घाट पर भई सन्तन की भीड़
तुलसी दास चन्दन घिसें तिलक देत रघुवीर

ان کی نگاہ میں گیان یعنی معرفت اور بھگتی یعنی عشق کی یکساں منزلت تھی مگر ان کا ذاتی مسلک بھگتی تھا۔ رامائن کے اتر کانڈ میں اُنھوں نے گیان پر بھگتی کو فضیلت دی ہے وہ وششٹ ادویت کا فلسفہ مانتے تھے۔ رامانج آچاریہ کے اسکول سے ان کا تعلق تھا۔ ان کی نشٹھا داس نشٹھا تھی یعنی بھگوان کو وہ اپنا مخدوم و مولا سمجھتے تھے اور خود کو اُن کا خادم اور بندہ۔ دونوں کے درمیان عبد و معبود کا رشتہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ تلسی داس کی رامائن میں اکثر مقامات پر ہنومان جی کی عطا کردہ غیبی اصلاحیں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ونے پتریکا کو تو ہنومان جی کے ذریعہ جب رامچندر جی کے دربار میں پیش کیا گیا تو اس پر بھگوان نے خود اپنے ہاتھ سے دستخط کر کے اُسے قبول فرمایا۔ تلسی داس کو اسی بھگتی اور گیان کی وجہ سے ہندی زبان کا حافظ کہا جا سکتا ہے اور جس طرح دیوان حافظ سے فال نکالی جاتی ہے اُسی طرح بہت سے لوگ تلسی داس کی رامائن سے فال نکالتے ہیں۔

تلسی داس کے دوہوں اور چوپائیوں میں عشق و معرفت کی عقدہ کشائیاں ہیں۔ یہ دوہے اور چوپائیاں زبان زد خلائق ہیں۔ بعض دوہوں اور چوپائیوں کے ذریعہ اخلاقی درس و تدریس بھی کی گئی ہے۔ ان کے بعض اقوال تو حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ضرب المثل بن گئے ہیں مثلاً

جاسو راج پریہ پرجا دکھاری
سو نرپ اوش نرک ادھکاری

जासु राज प्रिय प्रजा दुखारी,
सो नृप अवश्य नरक अधिकारी।

یعنی جس طرح راجا کے عہدِ حکومت میں رعایا دکھی ہوتی ہے وہ ضرور دوزخ میں جاتا ہے۔

۵ " پربھتا پاسے کاہ مدنا ہیں "

یعنی اختیار حاصل کرنے پر کسے غرور نہیں ہو جاتا۔

سیا رام سب سب جگ جانی کرناں برنا جور جگ بانی

اس چوپائی میں تلسی داس نے ہمہ اوست کا فلسفہ بیان کیا ہے وہ دنیا میں ہر طرف اپنے معبود کا جلوہ دیکھ کر اس کے سامنے دست بستہ فرقِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

جات پات پوچھے نا کوئی ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئی

یعنی جو خدا کو یاد کرتا ہے وہ خدا کا ہو کے رہے گا۔ اس میں چھوٹے بڑے ہریجن غیر ہریجن کسی کی تخصیص نہیں ہے۔

اپنے ایک بھجن میں انھوں نے اپنے ذاتی معتقدات کی کیا خوب عکاسی کی ہے۔

تو دیال دین ہوں تو دانی ہوں بھکاری

ہوں پر سدھ پاتکی تو پاپ پنج ہاری

ناتھ تو انا تھ کو انا تھ کون موسوں

موہ سمان آرت نہیں آرت پر تو سوں

برہم تو ہے جیو ہوں تو ٹھاکر میں چیرو

تات مات سکھا گرو سب ودھ ہت میرو

میرو تیرو نا تو انیک مانئے جو بھاوے

جیوں تیوں تلسی کرپال چرن سرن پاوے

तू दयाल दीन हो तो दानी हूं भिखारी,

हूं पै सुद्ध पातकी तू पाप पुंज हारी।

नाथ तू अनाथ को अनाथ कौन मों सों,

मो समान आरत नहीं आरत पर तो सों।

ब्रह्म तू है जीव हूं तू ठाकुर मैं चेरो,

तात, मात, सखा, गुरु सब बिधिहित मेरो।

मेरो तेरो नातो अनेक मानिये जो भावे,

ज्यों त्यों तुलसी कृपालु चरन सरन पावे।

یعنی تلسی داس بھگوان رام کی شکل میں اپنے معبود سے عرض پرداز ہیں کہ آپ رحیم و کریم ہیں۔ میں عاجز و معذور۔ آپ بخشندہ کل ہیں میں ایک گداۓ رسوا۔ میں گناہگار ہوں آپ دافعِ عذاب۔ آپ مجھ بیکس کے والی و وارث ہیں۔ مجھ سے زیادہ کوئی مصیبت زدہ نہیں اور آپ سے بڑھ کر کوئی مصیبت کا دور کرنے والا نہیں۔ آپ برہم یعنی ذاتِ مطلق ہیں میں جیو یا روحِ صغیر ہوں آپ میرے مولا و مخدوم ہیں میں بندۂ ناچیز۔ آپ ہی میرے باپ ہیں آپ ہی میری ماں ہیں آپ ہی گرو ہیں اور آپ ہی میرے دوست ہیں۔ غرضکہ ہر صورت سے آپ میرے ہیں۔ میرے اور آپ کے درمیان لاکھوں رشتے ہیں جو رشتہ آپ کو پسند ہو وہ مان لیجئے۔ خادم تلسی داس کا تو مقصد یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے آپ کے قدمِ مقدس کی پناہ حاصل ہو جائے۔

تلسی داس کا جنم ضلع باندہ کے مقام راجاپور میں ہوا تھا۔ کہتے ہیں پورے بارہ ماہ ماں کے پیٹ میں رہ کر آنکھیں کھولیں۔ بچپن ہی میں وہ ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔ ایک نوکرانی چنیا نے انھیں پالا پوسا۔ وہ بھی تھوڑے دنوں کے بعد چل بسی پھر انھیں گرو نرہری داس کی قربت اور سرپرستی حاصل ہو گئی۔ برطانوی انسائیکلوپیڈیا کے مطابق ان کا زمانۂ وجود ۱۵۳۲ء اور ۱۶۲۳ء کے درمیان ہے۔

انھوں نے اپنے گرو کی ہدایت سے سنسکرت کے بجائے ملک کی مروجہ زبان ہندی میں جسے بھاکا کہا جاتا تھا' شاعری شروع کی اور سمبت ۱۶۳۱ میں ان کی رام چرت مانس کا آغاز خاص نومی کے دن ہوا۔ اس عظیم الشان کارنامے کی تکمیل تقریباً ڈھائی سال میں ہوئی سمبت ۱۶۸۰ میں ساون مہینے کی کرشن پکش (اندھیرا پاکھ) کی تیسری تاریخ کو بنارس کے اسی گھاٹ پر گوسوامی جی نے رام رام کہتے ہوئے اپنے قالبِ خاکی کو خیرباد کہا۔ انگریزی حساب سے ان کا سال وفات سمبت ۱۶۲۳ کی تھ سے ملتا ہے۔

افسانہ

کمی

رفعت نواز

امپیریل ہوٹل کے بڑے ہال میں داخل ہوتے ہی میں تو حیرت کے مارے بھونچکا رہ گیا۔ گزشتہ آٹھ سال میں ذرا بھی تو تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ یکلخت میرے قدم ٹھٹھک گئے اور میرے منہ سے "ارے" زور سے نکل گیا۔ اسی لمحہ مجھے اپنی پوزیشن کا خیال آیا۔ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ میرا چپراسی سر پر ہولڈال لئے گم سم کھڑا تھا اور اس کے برابر ہوٹل کا منیجر مجسم 'حاضر جناب' بنا موجود تھا۔ میں نے چپراسی سے کہا کہ کمرہ میں سامان رکھ دو اور منیجر سے کہا کہ باتھ روم میں نہانے کا انتظام کر دیا جائے۔ دونوں اپنے اپنے متعلق حکم سُن کر چلے گئے اور میں بڑے ہال کے دائیں جانب بچھی ہوئی میز کی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ یہی تو میری مخصوص جگہ تھی۔ یہاں بیٹھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ یوں ہی آدھ گھنٹہ تو یہاں ضرور بیٹھوں گا ـــــ گو میں بہت تھک چکا تھا اور اسٹیشن سے آتے ہوئے راستہ بھر میں ٹانگے میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ ہوٹل جاتے ہی نہاؤں گا اور خوب سوؤں گا۔

امپیریل ہوٹل کے اس بڑے ہال سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ میں نے اپنا عنفوانِ شباب اسی بڑے ہال میں گھنٹوں بیٹھ کر گزارا تھا!

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں فرسٹ ایر میں پڑھتا تھا۔ کالج میں کئی نئے دوست بن گئے تھے۔ ادبی کتابیں پڑھنے کا چسکا بھی لگ گیا تھا۔ سیاست میں بھی دلچسپی لیتا تھا اور کھیل کود کا تو میں پہلے ہی سے دلدادہ تھا۔ روز شام کو ساڑھے چھ سات بجے سے اس بڑے ہال میں یار دوستوں کی محفل جمتی، ادبی بحثیں ہوتیں، سیاست پر بات چیت ہوتی، کھیل کود کی باتیں ہوتیں اور فلموں کا تذکرہ ہوتا۔ ہر شخص اپنی چائے کے پیسے خود ادا کرتا، سگریٹ پھونکے جاتے، گھنٹوں محفل گرم رہتی۔ ان دنوں سب سے اہم موضوعِ سخن رومان تھا۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی منظورِ نظر ضرور رکھتا تھا۔ شام کو ہر ایک اُس کا ذکر ضرور کرتا، لب و رخسار کے چرچے ہوتے اور بات عام طور پر گالی گلوچ پر ختم ہوتی۔ ہر شخص اپنی منظورِ نظر کو حسن میں یکتائے روزگار ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ تکرار پہلے تو بے تکلف گالیوں سے شروع ہوتی اور آخر کار نوبت تو تو میں میں تک پہنچ جاتی اور محفل ایک دم برخواست ہو جاتی۔ دوسرے دن وقتِ مقررہ پر سب کے سب اکٹھے ہو جاتے۔ کل کے جھگڑے کو سب فراموش کر چکے ہوتے اور بڑے انہماک سے ایک دوسرے کی باتیں سُنی جاتیں۔ مگر گفتگو کا اختتام ہمیشہ کی طرح گالیوں پر ہوتا۔

وہ بھی خوب دن تھے۔ ہوسٹل میں رہنا، جی کھول کر خرچ کرنا، کھانا پینا، آوارگی غرض خوب شرارتیں کرتے تھے۔ بعض دفعہ تو شرارت کی بنا پر سپرنٹنڈنٹ تک بات پہنچ جاتی۔ گالیاں تو ہماری زندگی کا اہم جزو بن گئی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کو جب بھی مخاطب کرتے گالی ہی دیتے ـــــ ہمارے دوست بھی بھانت بھانت کے تھے۔

ایک دوست تھا انند۔ وہ دن بھر آوارہ گردی کرتا اور گھوم پھر کر امپیریل ہوٹل کے اس بڑے ہال کے اسی کونے میں آ کر بیٹھ جاتا ـــــ دیا سلائی کی ڈبیا پر پنسل اسکیچ بنایا کرتا اور سگریٹ پھونکا کرتا۔ بلا کا سگریٹ نوش

تھا۔ بھاری سے بھاری برانڈ کی سگریٹ سے گھٹیا برانڈ کی سگریٹ تک پی لیتا۔ اکثر خاموش رہتا۔ لیکن جب بولنے پر آتا تو اتنی گپیں ہانکتا کہ ہم بور ہوجاتے۔ جب بھی بات کرتا، مائیکل انجلو، گوگان، گوگ اور چغتائی کی تصویروں کی بات کرتا جو ہمارے پلے خاک نہ پڑتیں۔ ہم چڑ کر اسے ٹوک دیتے، وہ غصہ ہوجاتا اور ہمیں بدذوق اور جاہل کہتا لیکن اسکیچ خوب بناتا تھا۔ ایک بار نظر بھر کے ماڈل کو دیکھتا اور منٹوں میں اسکیچ بنا کر رکھ دیتا۔ ہم سب اسے چڑانے کو نکما اور بیکار کہتے مگر دل سے سب اس کی قدر کرتے تھے۔

"لڑکے دو اچھی چائے لانا ذرا" برابر کی میز سے ایک نوجوان نے زور سے آواز دی اور بڑے انداز سے سگریٹ سلگانے لگا۔

ہم بھی تو اسی طرح آرڈر دیا کرتے تھے۔ چائے کی ایک ایک پیالی پی کر گھنٹوں بیٹھا کرتے۔ منیجر آکر درخواست کرتا کہ "براہ کرم سیٹ خالی کر دیجئے گاہک واپس لوٹ رہے ہیں" تو ہم اس سے الجھ پڑتے اور کہتے کہ کیا ہم مفت کی چائے پیتے ہیں؟ کیا ہم گاہک نہیں ہیں؟" وہ بیچارہ خاموش ہوجاتا، اور لوٹ جاتا ـــــ ان دنوں کسی کے کہے کا برا تو معلوم ہی نہ ہوتا تھا۔ اپنی پوزیشن کا خیال آتا تھا نہ بے عزتی کا۔ کوئی کچھ بھی کہے، ہم اپنی سی کیے جاتے تھے۔ آج کل تو کسی کی ایک بات بھی سنی نہیں جاتی۔ ذرا ذرا سی بات پر غصہ آجاتا ہے۔ ماتحتوں پر بگڑ جاتا ہوں۔ بات بات پر سوچنے لگتا ہوں کہیں یہ میری پوزیشن کے خلاف تو نہیں، اس کام کے کرنے سے میری بے عزتی تو نہیں ہو گی۔ ہمیشہ یہی خیال رہتا ہے کہ میں تحصیل دار ہوں، ایک تحصیل کا سب سے بڑا افسر ـــ لوگ میری کتنی عزت کرتے ہیں، ہاتھ جوڑ کر، نظریں نیچے کیے گفتگو کرتے ہیں اور بعض بعض دفعہ میں کتنی بے اعتنائی برتتا ہوں!

اشفاق کہا کرتا تھا "سب بدل جائیں گے مردہ توندیں بڑی بڑی توندیں نکل آئیں گی۔ سب ایک دوسرے کو بھلا دیں گے۔ اپنی افسری کے ٹھاٹ میں اکڑتے پھریں گے۔ کوئی کسی کو یاد نہیں رکھتا۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔" سچ تو کہتا تھا اشفاق ـــــ بڑا لاپروا ہڈیوں کا ڈھانچہ اشفاق جو نظمیں لکھا کرتا تھا اور غضب کے ترنم سے پڑھا کرتا۔ جب بھی نئی نظم ہوتی وہ اسی میز پر چڑھ کر بیٹھ جاتا اور ہم سب اس کے گرد کرسیاں کھینچ کر بیٹھ جاتے۔ وہ لہک لہک کر نظم سناتا اور ہم واہ واہ کے شور سے ہنگامہ برپا کر دیتے ـــــ

"صاحب نہا لیجئے، پانی تیار ہو گیا۔" چپراسی نے بڑے ادب سے کہا۔

"اچھا ـــ تم جاؤ ـــ میں نہا لوں گا ـــ ہاں اگر تمہیں نیند آرہی ہو تو سو جاؤ" میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔

اشفاق کہا کرتا تھا دنیا کی کسی چیز کو ثبات نہیں، زندگی تغیر سے عبارت ہے۔ ہر چیز بدل جاتی ہے، گہرے سے گہرے دوست اجنبی بن جاتے ہیں، بھائی بہن بھول جاتے ہیں، کبھی کبھی ماں باپ بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں، نفسا نفسی کا زمانہ ہے، زندگی کی لمبی دوڑ میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا، پھر کیوں نہ ہم بھی زندگی سے کھیلیں۔ کیا زندگی صرف دولت کمانے، موٹروں میں گھومنے، بنگلوں میں رہنے اور خوبصورت عورتوں سے شادی کرنے کا نام ہے؟ بہت سے ایسے بھی تو ہیں جو رات کو فٹ پاتھ پر خالی جیبیں لے سوتے ہیں اور صبح اٹھتے ہیں تو یوماً جدید رزقاً جدید کا نعرہ لگاتے ہیں، زندہ پیسہ رہا کھا پی لیا، نہ ملا تو مست قلندر بنے پھرتے رہے۔

اس کے برخلاف مسعود تھا جو ہمیشہ خوبصورت ڈرائنگ روم، نئے ماڈل کی کار اور نیلی جھیل کی سی آنکھیں اور سنہرے بالوں والی لڑکی کے خواب دیکھا کرتا۔ اس کا خیال تھا ان چیزوں کے بغیر زندگی نامکمل رہتی ہے۔

اب میری میز کی قریب کی میزوں پر بھی لوگ بیٹھ گئے تھے اور ہال میں شور ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ بیرا تین بار بہت سلیقے سے مجھ سے آرڈر پوچھ گیا تھا اور میں انجان بنا بیٹھا رہا تھا۔ مجھے قدرے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ تھکن سے میں نڈھال ہو رہا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ نہا لینے کے بعد مجھے نیند آجائے گی اور میں چاق چوبند ہوجاؤں گا۔ میں بس کے ذریعہ سو میل طے کر کے آرہا تھا۔ ادھر تین راتوں سے میں پوری طرح سو بھی نہ سکا تھا۔ اور کل صبح دس بجے مجھے تحصیلداروں کی ایک کانفرنس میں بھی شریک ہونا تھا۔ لیکن پھر

بھی میں اپنی کرسی سے نہ اُٹھا۔ میرے کپڑوں پر شکنیں پڑ گئی تھیں جوتوں پر گرد جم گئی تھی اور بالوں میں دھول بسی ہوئی تھی۔ ذرا سا اُٹھ کر میں نے قریب لگے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ اس حلیہ میں تو میں پہچانا بھی نہ جا سکتا تھا۔

"صاحب پانی تیار ہے"۔ ہوٹل کے بیرے نے آہستہ سے کہا۔

"جاؤ مجھے نہیں نہانا"۔ میں نے جھلا کر کہا۔ نہانا مجھے ہے یہ کم بخت اتنے پریشان کیوں ہیں۔ بیرا چپ چاپ چلا گیا۔ پھر میں سوچنے لگا مجھے اچانک غصہ کیوں آ گیا تھا۔ بیچارے نے کون سی بری بات کہی تھی۔ یکایک مجھے یاد آیا کہ میں یادوں میں کھویا ہوا تھا اور اس نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میں نے بیرے کو بلایا۔ اور اس کے ہاتھ میں دو روپئے کا نوٹ تھما دیا اور غسل خانے کی طرف چلا گیا۔

نہانے کے بعد میں پھر اسی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اب ہوٹل میں شور نسبتاً کم تھا۔ ہال بھر میں پانچ سات آدمی بیٹھے تھے۔ ریڈیو سے پرانی فلموں کے گیت آ رہے تھے جن میں سے اکثر میرے سنے ہوئے تھے۔ اور دور اندر کچن روم سے پیالیوں اور برتنوں کے ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے یوں ہی بڑے ہال کی دیواروں کو دیکھنا شروع کیا۔ کئی تصویریں آٹھ سال قبل کی تھیں کچھ نئی تصویروں کا بھی اضافہ ہوا تھا۔ ہوٹل کے مالک کا لڑکا جو اس زمانے میں شاید تیسرے درجہ میں پڑھتا اب کافی بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی تصویر مالک کی تصویر کے برابر تھی، اجنتا کی ایک تصویر اب بھی ثریا کی تصویر کے برابر لگی تھی۔

امپیریل ہوٹل میں بہت کم تبدیلی ہوئی تھی ــــ منیجر وہی تھا، مالک وہی تھا، فرنیچر بھی تقریباً وہی تھا۔ سجاوٹ میں بھی کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا البتہ بیرے بدل گئے تھے اور الکٹرک ٹیوب بھی بدل گئے تھے پہلے بڑے بڑے سو کینڈل پاور کے بلب ہوا کرتے تھے اب سفید لانبے ٹیوب تھے۔

اب مجھے خواہ مخواہ وحشت ہونے لگی تھی اور تنہائی کا بھی احساس ہونے لگا تھا حالانکہ میں تنہا رہنے کا عادی تھا۔ ہفتوں میں دو دو دن پڑا رہتا، بہت کم بات چیت کرتا، یار دوستوں سے مہینوں ملاقات نہ ہوتی، ماں باپ بہن بھائی سے سال میں ایک بار ملتا تھا۔

اس ہوٹل میں خوب چہل پہل تھی مستعد بیرے تھے، میرا فرمانبردار چپراسی تھا، آرام دہ بستر تھا، میں نہا بھی چکا تھا صرف بستر پر لیٹنے کی دیر تھی۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ میری عادت ہے کہ سونے سے قبل کسی کتاب یا رسالہ کا مطالعہ ضرور کرتا ہوں میں نے شنکر زدہ ٹیگور دیکھنا شروع کیا مگر جلد ہی اکتا گیا میں نے بیرے کو تھوڑے آلو چپس لانے کو کہا اور انھیں آہستہ آہستہ کھانے لگا۔ بہت جلد میں اس شغل سے بھی اکتا گیا ــــ بغیر کسی خیال کے میں بڑے ہال میں پھر آ گیا اور گم سم سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب میرا دماغ بالکل خالی تھا۔ آرام و اطمینان کی ہر چیز مجھے مہیا تھی پھر بھی نہ جانے میں کیوں بے چین تھا۔ عزت، عہدہ، آرام سب ہی کچھ تو میسر تھا مجھے ــــ اس بھری پری دنیا میں میں اور کیا چاہتا تھا میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

ایک شخص تیزی سے ہال میں داخل ہوا اور میری میز سے ایک میز چھوڑ کر ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس کی بغل میں کوئی موٹا سا رسالہ تھا۔ اس نے بیرے کو سادہ چائے کا آرڈر دیا اور رسالہ کھول کر پڑھنے لگا۔ میں نے یوں ہی رسالہ کی جانب غور سے دیکھا، نیا دور تھا ــــ وہ بڑے انہماک سے مطالعہ میں مشغول تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں اشفاق کا خیال آ گیا وہ جب بھی ہوٹل میں آتا اس کے بغل میں کوئی کتاب یا رسالہ ضرور ہوتا میں نے ذرا سا اُٹھ کر اس شخص کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہی چہرہ تھا، وہی آنکھیں، ستواں ناک، گالوں میں قدرے گڑھے، پتلے پتلے ہونٹ، ذرا بڑھی ہوئی داڑھی، سگریٹ کے جلد جلد کش لینے کا وہی انداز اور مطالعہ کا وہی انہماک۔ میں اس کے قریب کی میز تک پہنچ گیا۔ میں نے دھیرے سے پوچھا۔ "معاف فرمائیے، کیا آپ کا نام اشفاق زیدی ہے؟"

"جی ہاں" اس نے بے توجہی سے کہا۔ پھر ایکبار اس نے مجھے نظر بھر کر دیکھا اور اُٹھ کر مجھ سے بے ساختہ لپٹ گیا "ابے سالے تم ہو سریندر کہاں مر رہے تھے اتنے دن سے؟ سنا ہے تم تحصیلدار و تحصیلدار کچھ بن گئے ہو اور ایک ماسٹرنی سے لونڈیا سے شادی بھی کر رہے ہو۔ خوب ٹھاٹ ہیں تمہارے ان دنوں ــــ خیر اب ہم سے نخرے نہ کرو۔ اور سیدھے سیدھے اسپشل چائے کا آرڈر دو"۔

مجھے اچانک یاد آ گیا کہ یہی تو وہ کمی تھی جو مجھے دیر سے بے چین کئے ہوئے تھی۔

زیور کی دلدادہ تھارو عورتیں

بن باسی تھارو

رمیش ترپاٹھی

چتوڑگڑھ کی جنگیں آج ماضی کے ایک ہنگامہ خیز خواب کی صرف یاد ہی کی طرح باقی رہ گئی ہیں۔ عہدِ وسطیٰ میں یہاں بڑی زبردست جنگیں ہوئی تھیں جن میں ہندوستان کے بہادر راجپوتوں نے خوب خوب دادِ شجاعت دی تھی۔ یہ سلسلہ اتنے عرصے تک رہا کہ ایک ایک کرکے تمام راجپوت کام آگئے اور ہزاروں راجپوت عورتیں اور بچے بے سہارا ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حالت دیکھ کر یہ راجپوت عورتیں کچھ منتخب اور قابلِ اعتماد ملازموں اور بہی خواہوں کے ہمراہ دور دراز کے جنگلوں میں جا چھپیں۔ اگرچہ اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن ضلع کھیم پور، نینی تال اور پیلی بھیت کے ترائی کے جنگلوں میں بسنے والے تھارو مذکورۂ بالا بیان کا زندہ ثبوت ہیں۔ اُن راجپوت عورتوں نے جو جنگی میں یہاں آکر بس گئیں تھیں آخر اپنے ہم راہ آئے ہوئے وابستگانِ خاندان اور ملازموں کے ساتھ شادیاں کرلیں اور ان سے جو اولاد ہوئی اُنھیں تھارو کہا جانے لگا۔

تھاروؤں کی تقسیم دو زمروں میں ہو سکتی ہے۔ ایک رانا تھارو اور دوسرے ڈنگوریا تھارو۔ رانا تھارو اپنے آپ کو اونچے طبقے کا بتاتے ہیں۔ اُترپردیش کے محکمۂ جنگلات نے ان کو کھیتی کرنے اور گاؤں بسانے کے لیے زمین دی ہے۔ یہ سیلانی تھارو اپنی مرضی کے مطابق کھیتی کرتے ہیں۔ جب اور جہاں چاہا کاشت کی اور جب چاہا زمین چھوڑ دی۔ محکمۂ جنگلات بھی اِن سے صرف مزروعہ آراضی کا معمولی سالگان لیتا ہے۔ فارسٹ گارڈ کا یہ لوگ بڑا احترام کرتے ہیں۔ اِن کے حکم پر گاؤں کے سبھی لوگ جنگل کی سڑکوں کی صفائی یا دوسرے تعمیراتی کام کرنے کے لیے بلاعذر آموجود ہوتے ہیں ورنہ دوسری جگہ مزدوری کرنا تھاروؤں کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔

تھاروؤں کے گاؤں بہت ہی صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ عادتاً تھارو نیک اور مہمان نواز ہوتے ہیں۔ مہمان کے دروازے پر پہنچتے ہی یہ لوگ بیٹھنے کے لیے چارپائی بچھا دیتے ہیں۔ تھاروؤں میں مشترکہ خاندان کی طرح [illegible] کا

ڈونگوریا تھارو مچھلیاں پکڑ رہے ہیں

اپنا خالی وقت تھارو عورتیں حقّہ نوشی اور خوش گپیوں میں گزارتی ہیں

(بائیں) تھارو جنگل کی سڑک کی صفائی کر رہے ہیں

(دائیں) تھارو دوں کا

ٹولہ بیل گاڑی کے ذریعہ گاؤں کی طرف آرہا ہے

تھارو عورتیں صرف اسی قدر لباس پہنتی ہیں جس سے ان کی ستر پوشی ہو جائے۔
اپنے تنگ اور شوخ رنگ کے لباس یہ خود ہی تیار کرتی ہیں

ہولی کے موقع

راناتھارو کی دو دوشیزائیں دھان کوٹ رہی ہیں

رانا تھارو لڑکیاں آٹا پیس رہی ہیں

زائیں بولی مل رہی ہیں ۔

ڈگھوریا دوشیزائیں دھان کوٹ رہی ہیں ۔

رانا تھارو کی دوشیزائیں ہولی کا رقص کرتی ہوئی
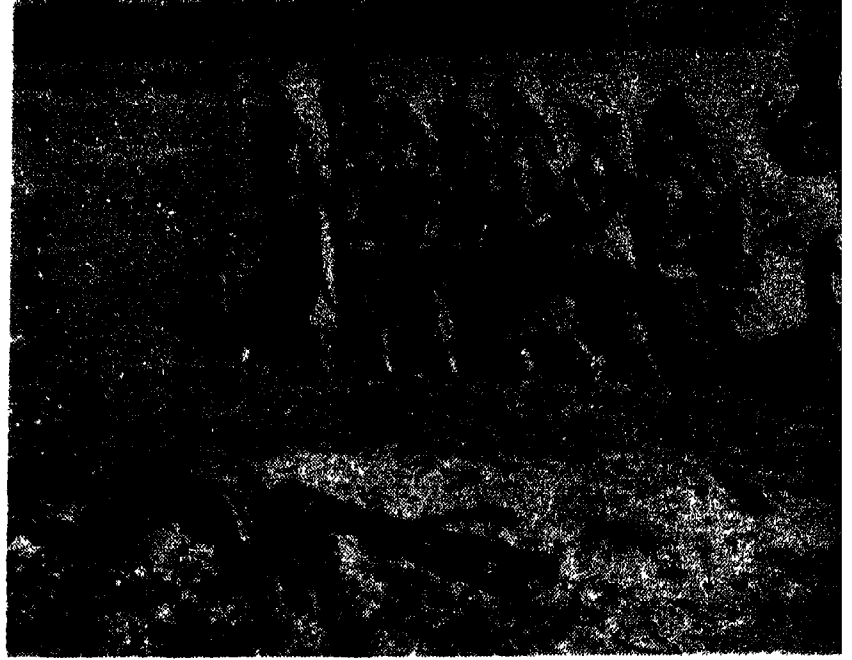
ڈنگوریا تھارو کی دوشیزائیں اور نوجوان ہولی کے موقع پر رقص کرتے ہوئے

ہولی کے سوہار کے موقع پر ہونے والے ناچ کیلئے مخصوص لباس میں ملبوس تھارو نوجوان ڈھول کی تال کا انتظار کر رہے ہیں۔

رواج ہے۔ ایک خاندان میں تیس سے پچاس یا زائد افراد بھی ہوتے ہیں۔ خاندان میں عورتوں کو بڑی اہمیت ہوتی ہے اور مردوں کے مقابلے میں ان کا درجہ بلند سمجھا جاتا ہے۔ جائداد اور املاک کی مالک بھی وہی سمجھی جاتی ہیں۔ گوشت اور چاول تھاروؤں کی خاص غذا ہے۔ ہر خاندان میں باورچی خانہ جائے رہائش سے علیحدہ ہوتا ہے جس کا دروازہ پورب رُخ ہوتا ہے۔ عورتیں مردوں کو عام طور پر اپنے چوکے میں کھانا نہیں کھلاتیں بلکہ انھیں الگ جگہ پر کھلایا جاتا ہے۔ ڈنگوریا تھارو خاص طور سے تیار کیا ہوا کھانا کھاتے ہیں۔ پہلے چاول اُبال کر رکھ دیا جاتا ہے اور کئی دن بعد جب وہ تقریباً سڑ جاتا ہے اور کیڑے پڑ جاتے ہیں تو اس میں گوشت اُبال کر ڈالا جاتا ہے۔ پھر مسالہ ڈال کر چاول متھ کر حلوے کی طرح کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح تیار کیا ہوا کھانا یہ پورا خاندان بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ تھارو شراب کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ اِدھر دن ڈھلا اُدھر اُن کے بچے، جوان اور بوڑھے شراب کی بھٹی کی جانب چل پڑے۔ اس سال کھیم پور چندن بانکی شراب کی بھٹی کا ۱۰۰ ۶۰ روپے کا سرکاری ٹھیکہ تھا۔ اسی سے تھاروؤں کی شراب نوشی کی کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جھگڑے فساد تھاروؤں کے یہاں بالکل نہیں ہوتے۔ البتہ شراب کے نشے میں اگر کوئی تنازعہ ہو بھی جاتا ہے تو گاؤں پنچائتیں فیصلہ کرتی ہیں۔ ان پنچائتوں کا صدر گاؤں پردھان ہوتا ہے۔ گاؤں پردھان کا عہدہ نسلاً بعد نسل چلتا ہے۔ تنازعہ کے مجرم کو عام طور پر پورے گاؤں کو بطور جرمانہ شراب پلانا پڑتی ہے کسی گھر میں موت ہو جانے یا خاص خاص موقعوں پر شراب کا دور چلنا انتہائی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

تھارو اپنے کام متحدہ اور اجتماعی طور پر کرتے ہیں۔ نائی، درزی، کمہار، بڑھئی وغیرہ کے کام یہ لوگ خود کر لیتے ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ خوب صورت چالاک اور گھر کے کام دھندے میں سلیقہ مند ہوتی ہیں۔ عورتیں صرف اتنا ہی لباس پہنتی ہیں جس سے ستر پوشی ہو جائے۔ زیور اور سنگار کی دوسری چیزوں کی طرف ان کا میلان زیادہ ہوتا ہے۔ ڈنگوریا تھارو عورتوں کے بال بنانے کا طریقہ، ان کا سنگار اور پوشش رانا تھارو عورتوں سے مختلف ہوتی ہے۔ بہر حال گلے میں چاندی کے پرانے سکوں کا ہار، کانوں میں بھاری جھمکے، پیروں میں تنگ کڑے اور شوخ رنگین لباس پہن کر جب خوب صورت اور نوجوان تھارو عورتیں جنگل میں نکل پڑتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت خود مختلف دل کش روپ میں زمین پر اُتر آئی ہے۔

تھاروؤں کے ہر گاؤں میں ایک "دیو استھان" ہوتا ہے جہاں منتیں مانی جاتی ہیں اور پوجا پاٹ ہوتا ہے۔ تھاروؤں کو بھوت پریت پر بڑا اعتقاد ہوتا ہے۔ گاؤں میں ایک بھرّا ہوتا ہے جو منتروں کے ذریعے بھوت پریت کے

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۶۱ پر)

غزل

حافظ مارسی

منتظر چشمِ التفات رہی
میں یہ سمجھا کہ میری بات رہی

یوں تو رہنے کو کائنات رہی
موت ہی حاصلِ حیات رہی

راہِ غربت میں دیکھ کر تنہا
ہم سفر غم کی کائنات رہی

اُٹھ کے ہر موج بن گئی ساحل
ڈوبنے والے تیری بات رہی

عشق تنہا رہا جہاں بھی رہا
حُسن کے ساتھ کائنات رہی

خاکِ پروانہ صبح نے دیکھی
شمع کے ساتھ رات رات رہی

اپنے حافظ کو کیجیے رخصت
پھر ملے گا اگر حیات رہی

غزل

جمال صابری

حجاب دل میں رہے سامنے وہ آ نہ سکے
یہ وہ نقاب تھا ہم بھی جسے اُٹھا نہ سکے

جنونِ ضبطِ محبت اسی کو کہتے ہیں
کہ میری آنکھ میں آنسو بھی جھلملا نہ سکے

وہ بے دلی تھی قفس میں دلِ فسردہ کو
نسیمِ صبح کے جھونکے بھی گدگدا نہ سکے

وہ پھول کون سے موسم میں مسکرائیں گے
بہار میں بھی جو شاخوں پہ مسکرا نہ سکے

جو سر جھکا ترے قدموں پہ عین مستی میں
اُسے حوادثِ عالم کبھی جھکا نہ سکے

ہجومِ ساغر و مینا تھا اور اجازتِ عام
قصور ہے یہ ہمارا کہ جام اُٹھا نہ سکے

وہ کیا جگائیں گے تقدیر کی بہاروں کو
جو اپنے فرض کے احساس کو جگا نہ سکے

وہ شمعِ عشق نسیمِ کرم کو سہہ نہ سکی
ہوائے ظلم کے جھونکے جسے بجھا نہ سکے

چمن میں پھول ہنسے اور فلک پہ چاند ہنسا
مگر جمال کے ارمان مُسکرا نہ سکے

میر کا شیوۂ گفتار

سعیدہ وارثی

فنِ تعمیر ہو یا رقص و موسیقی، مصوری ہو یا شعر و ادب، فنونِ لطیفہ کی شاخوں میں بنیادی طور پر کوئی اختلاف نہیں ہوتا ملہاں ان میں نوعی فرق ضرور پایا جاتا ہے۔ مثلاً یہی کہ ان سب کا واسطۂ اظہار الگ الگ ہوتا ہے۔ رقص کا ذریعۂ اظہار بدن ہے، تعمیر و صنم سازی کا سنگ و خشت و دھات، فنِ مصوری کا واسطۂ اظہار رنگ و روغن ہے اور فنِ شعر و ادب کا میڈیم زبان و الفاظ ـــــ انھیں تمام واسطہ ہائے اظہار کا حسین و لطیف، رفیع و وسیع، پُرمعنی و پُر اثر استعمال فن کاری ہے۔ صنعت گری مواد و ہیئت دونوں سے وابستہ ہے اگرچہ مواد کی حیثیت بنیادی ہوتی ہے لیکن اس کے اظہار و پیش کش کے لیے جو وسیلے برتے جاتے ہیں اُن کی بھی کچھ کم اہمیت نہیں۔

شاعری فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ مرکب، ترقی یافتہ اور نازک ترین فن ہے۔ امکانات سے لب ریز اور صد پہلو شاعری میں رقص و وجد بھی ہے، فنِ تعمیر کا حُسن بھی اور موسیقی اور مصوّری کے جلوے بھی ـــ فنِ شاعری کی جانچ محض علم العروض کے اوزان پر نہیں ہوتی، یہ دراصل اندازِ بیان کی داخلی اور خارجی قدروں کا سنگم ہے۔" واسطۂ اظہار کو کامل فنی نمونہ بنانا فن کار کی شخصیت و انفرادیت، اس کے جذبات کے گداز، اس کے تخیل کی پرواز، اس کے ادراک کے توازن، اس کے نفیس و اعلیٰ ذوق، اس کی سلجھی ہوئی قوتِ انتخاب، اس کی صلاحیتِ ترکیب و تعمیر اور اُس کی ہنرمند پیش کش پر منحصر ہے۔

اس روشنی میں میر کی شاعری کا جائزہ لیجیے تو وہاں بھی اندازِ بیان کے پردے میں اس کے کردار کی داخلی خصوصیات جھلکتی ہوئی ملیں گی۔ وہ خود کہتا ہے ؎

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا   وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

میر کی زندگی غم سے عبارت تھی اس لیے اُن کے سارے کلام میں غم سناکی کی کیفیت ہے۔ میر کی شاعری اور ان کی زندگی میں ایک حسین ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی سیرت نے ان کے انداز و اسلوب کی تعمیر میں بڑی مدد کی ہے۔ وہ تشنگی، وہ بے چینی، وہ کسک اور وہ ضبطِ غم جو ان کے کلام کی خصوصیات ہیں وہ ان کی سیرت اور ان کے ماحول کی آئینہ دار ہیں ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے   درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میر نے اپنے تجربات و دلی کیفیات کو بیان کرنے میں تصنع اور بناوٹ سے کام نہیں لیا بلکہ اپنی وارداتِ زندگی کو من و عن بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ اپنے دل کی آگ اور خونِ جگر کو ڈھالنے کے لیے بڑی صناعی سے کام لیتے ہیں ؎

صناعِ طرفہ ہیں ہم، عالم میں ریختہ کے
جو میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

میر کی شاعری نے اس وقت پرورش پائی جب کہ دلّی لُٹ چکی تھی شعر و شاعری کی محفلوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور شعر و ادب کے قدرداں برائے نام رہ گئے تھے لیکن پھر بھی جو باقی تھے انھوں نے اس وقت بھی علم و ادب کی قدردانی اور سرپرستی حتی الوسع کی۔ میر نے بھی اس سے

فائدہ اُٹھایا مگر اُنھوں نے اپنے آپ کو زمانے کے ہاتھوں بیچا نہیں اور خواص سے بھی رسمی تعلق رکھا۔ اصل رشتہ تو ان کا عوام سے تھا۔ اس لیے ان کی زبان میں سادگی و پُرکاری، سلاست اور دھیماپن ملتا ہے۔ وہ خود بھی اس کا اقرار کرتے ہیں ؎

شعر میرے ہیں سب خواص پسند　　پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میر کا اندازِ بیان خاص طور پر غزلوں کے حسبِ حال ہے۔ غزل کی زبان میں جو نرمی، صفائی، روانی، بے تکلفی، شیرینی، نمکینی، کشش، شوخی، ملاحت، فصاحت اور گھلاوٹ ہونا چاہیے وہ میر کے یہاں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ وہ لفظوں کے انتخاب میں فصاحت و بلاغت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ وہ ایک کامل صناع ہیں۔ انھیں خود بھی اس کا گہرا احساس ہے ؎

نہ دیکھو کبھی موتیوں کی لڑی　　جو دیکھو مری گفتگو کی طرف

ہر بیت میں کیا میر تری باتیں گتھی ہیں
کچھ اور سخن کر کہ غزل سلکِ گہر ہے

زُلف سا پیچ دار ہے ہر شعر　　ہے سخن میر کا عجب ڈھنگ کا

اپنی گفتگو کو موتیوں کی لڑی کہنا، غزل کی ہر بیت میں گتھی ہوئی باتوں کو 'سلکِ گہر' سے تعبیر کرنا اور اپنے شعر کو محبوب کی زلفِ پُرخم سے تشبیہ دینا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ میر پر اسلوب کے تمام پہلو روشن تھے اور وہ ان سب کا گہرا شعور رکھتے تھے۔

فن کاری عشوہ گریِ زبان ہے۔ جس طرح محبوب کی ادائیں عشوہ ساماں ہوتی ہیں اسی طرح ادیب زبان و اسلوب سے عشوہ طرازیاں کرتا ہے۔ وہ اپنے تجربات کے اظہار کے لیے نئے امکانات پیدا کرتا ہے۔ زبان و بیان کے نئے گوشے، نئے زاویے، نئے طور طریقے، پیش کش کے نئے انداز و اسلوب، تازہ سہارے، جدید علامتیں، تشبیہات و استعارات، رمز و کنایہ اور صنعت گری کے ہزاروں ہتھکنڈے اختراع کرتا رہتا ہے۔ قادر الکلام شاعر مضمحل اور مردہ لفظوں میں بھی اپنے نفسِ گرم، اپنی شخصیت کے اثر اور اپنی ندرت ادا سے نئی روح پھونک دیتا ہے۔ رمز و ایما کی مدد سے وہ ایک ایک لفظ میں عظیم فلسفوں کو، تاریخی صداقتوں کو اور پوری پوری داستانوں کو بیان کر جاتا ہے۔ گل و بلبل، موج و زنجیر، دشت و جنوں، بہار و خزاں، قفس و آشیاں وغیرہ یہ تمام علامتیں کوئی نئی نہیں۔ آج دو سو سال سے ہمارے شاعر ان علامتوں اور استعاروں کو برت رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان میں معنویت کی وہی تازگی اور تندیِ صہبا کی وہی کیفیت ہے۔ دراصل یہ اعجاز ان لفظوں کا، ان استعاروں کا اور ان کنایوں کی سحر کاری اور طلسمی خاصیت کا ہے۔ ان لفظوں میں صدیوں کا تحت الشعوری احساس رچا ہوا ہے، روایتوں کی ایک وسیع دُنیا، جذبات کی ایک لمبی تاریخ پوشیدہ ہے۔ اسی لیے یہ تمام الفاظ ہمیشہ ہمارے شاعروں کی دلچسپی کا باعث رہے ہیں۔ میر نے بھی اپنی عشقیہ شاعری میں رمز و ایما سے کام لے کر اس میں طلسمی اثر بھر دیا ہے۔ غزل کا دامن اتنا وسیع نہیں کہ اس میں ساری باتیں تفصیل اور تفسیر سے بیان کی جا سکیں۔ اس کا حسن تو ایجاز و ایما ہی میں ہے۔ میر نے یہی اصول برتا ہے۔ دیکھیے ؎

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

دشت و جنوں کا مضمون بہت پرانا ہو چکا ہے لیکن میر نے اپنی ندرتِ بیان اور طرفگیِ خیال سے اس فرسودہ موضوع میں بھی تازگی و شگفتگی پیدا کر دی ہے ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اور ذرا اس رمز و کنایہ کی گفتگو کو تو سُنیے ؎

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

عموماً میر تشبیہات و استعارات سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ مگر جب کبھی ایسا کرتے بھی ہیں تو ایسے سادہ اور سلجھے ہوئے انداز میں کہ اس سے کلام میں اور بھی چمک اور نکھار آ جاتا ہے ؎

شام سے کچھ بُجھا سا رہتا ہے　　دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

کتنی معمولی اور سادہ تشبیہیں ہیں لیکن میر کے مشاہدے سے قریب۔ حقیقت میں انھوں نے اپنی ان تصویروں میں زندگی کے تجربات سے ہی رنگ آمیزی کی ہے۔

اردو زبان میں اگر ہندی کے الفاظ بھی استعمال کیے جائیں تو کلام میں ملاحت اور چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ میر کے یہاں ہندی کے اکثر آسان اور چھوٹے الفاظ بڑی خوبصورتی سے جڑے ہوئے ملتے ہیں جس سے ان کی گفتگو میں بڑی مٹھاس پیدا ہو گئی ہے۔ کلام میں لطافت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب وہ لفظوں کے امتزاج اور قافیوں کی تکرار سے غنائی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اکثر اس کیفیت کو رواں اور مترنم بحروں کے ذریعے بھی پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ ذرا ان اشعار کو گنگنایئے اور پھر دیکھیے کیا کیفیت ہوتی ہے۔ ان محرومیوں میں کتنی حسرتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ جذباتی فضا کتنی سامعہ نواز ہے ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے   میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ   سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

میر کو چونکہ عوام سے باتیں کرنا تھیں اس لیے انھوں نے روزمرہ اور محاوروں کا استعمال بڑی بے تکلفی سے کیا ہے۔ مثلاً

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر   پھر ملیں گے اگر خدا لایا

کہیں کہیں بے تکلفی کو اجاگر کرنے کے لیے میر نے اپنے اشعار میں بھائی، صاحب، میاں، جی وغیرہ لفظوں کا استعمال کیا ہے ؎

نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت   کہو میر جی آج کیوں ہو خفا سے

میر کے خطابیہ انداز میں جو دل ربائی ہے وہ تو بس پڑھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ یہ شاعرانہ چال بھی کتنی دل کش ہے ؎

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤگے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

اور اس شعر کو دیکھیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو دوست آپس میں چھیڑ چھاڑ کر رہے ہیں ؎

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب، کچھ تم نے خواب دیکھا

اس نے تکلفانہ اور خطیبانہ انداز میں نفسیاتی رنگ کس قدر شوخ اور گہرا ہو جاتا ہے ساتھ ہی اجزائے کلام کی اصلی ترتیب سے دل آویزی پیدا ہو جاتی ہے۔

میر نے تجربات عشق کی جزئیاتی تفصیل بڑے فن کارانہ طور پر پیش کی ہے جو صرف پڑھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ انداز بیان کی دل آویزی تو خیر میر کا شیوۂ خاص ہے ؎

میر سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم   ہو کے چپکے سے وہ شرمائے بہت

میر کو نفسیاتی کیفیات کا جائزہ لینے میں مہارت حاصل تھی۔ ذرا یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

چلا نہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

کس طرح مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑ جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

میر کے انداز بیان میں نشتریت اور طنز کے عنصر کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔ غالب اور مومن دونوں ہی نے اپنے اپنے میدان میں تیر و نشتر سے وار کیے ہیں لیکن میر کے یہاں اگرچہ غالب کی سی شگفتگی اور مومن کا جیسا تیکھا پن نہیں ہے پھر بھی ایک انفرادیت ہے۔ ان کے طنز میں بھی ان کی زندگی کی ناکامیوں اور تلخیوں کا ذکر ہے۔ ان کے اس لہجے میں شوخی اور تیکھا پن نہیں بلکہ ایک طرح کا دھیما پن ہے۔ صبر و ضبط کا جذبہ ہے۔ مثلاً فلک سے اس کی ستم ظریفی کی شکایت کی بھی تو اس انداز سے ؎

ہم تو سہ گزرے کج روی تری   نہ نبھے گی پر اے فلک یہ چال

میر کے یہاں انداز بیان کا اتنا تنوع ہے کہ اس کو دیکھ کر شاعر کی قادرالکلامی پر ایمان لائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ وہ خود صاحب ہنر ہے در اس نے دوسروں کو بھی یہ ہنرمندی سکھائی ہے اور اسلوب بیان کی نئی نئی راہیں کھولی ہیں۔ غزل کے میدان میں اس کا اپنا انفرادی رنگ ہے۔ اس کی طرز نگارش میں اس کی سیرت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ خلوص اور ایمانداری کے ساتھ ہی کہا ہے۔

ہندوستانی موسیقی کا ارتقا

ملک نومشرا

موسیقی کی ابتدا کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ ہندو اس کو اپنے دیوتاؤں سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے خالق برہما تھے لیکن شیو جی مہاراج نے اس کو دنیا سے روشناس کرایا۔ بھرت رشی نے اس علم کو اپسراؤں تک پہنچایا اور انسانوں تک پہنچانے کا کام نارد جی نے کیا۔ چاروں ویدوں میں بھی راگوں کی بابت درج ہے۔ یوں تو ہزاروں راگ ہیں لیکن پرانے راگ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شیو جی نے ایجاد کئے، چھ ہیں۔ ان کے علاوہ اور تین راگنیاں بھی ہیں۔ بھیروں سری، مالکوس، ہنڈول، دیپک اور میگھ۔ راگنیاں ٹوڑی، آسا وری اور رام کلی ہیں۔ آریوں نے ان راگوں کو سات سروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ یہ ساتوں سر مختلف اونچی نیچی آوازوں میں ہیں۔ ان سات سروں کو ہندی میں سپتک کہتے ہیں۔

موسیقی کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کو موسیقار نامی پرندے سے ایجاد کیا گیا۔ اس پرندے کو سنسکرت میں دیپک لاٹ، عربی میں قفنس، یونانی میں فینقس اور فارسی میں آتش کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ موسیقار کے متعلق مشہور تھا وہ کوہ قاف میں رہتا ہے۔ اس کی عمر ایک ہزار برس ہوتی ہے اور جب اس کی موت کے دن قریب ہوتے ہیں تو وہ گھاس پھوس اکٹھا کرتا ہے اور اس کے ارد گرد ناچتا ہے۔ پھر اس کی آواز سے اس گھاس میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ اسی میں جل جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سات آوازیں مختلف جانوروں سے لی گئی ہیں۔ جیسے کھرج (سا) مور کی آواز سے، رکھب (رے) پپیہے سے، گندھار (گا) بکری سے، مدھم (ما) کلنگ سے، پنچم (پا) کوئل سے، دھیوت (دھا) گھوڑے سے اور نکھاد (نی) ہاتھی سے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ موسیقی فیثا غورث نے ایجاد کی جو حضرت سلیمان کا شاگرد تھا۔ مصریوں کا کہنا ہے کہ موسیقی ان کے دیوتاؤں کی ایجاد ہے۔ بہرحال یہ مختلف روایات ہیں۔ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موسیقی وہ چیز ہے جس کے وسیلے سے انسان نے اپنے ابتدائی جذبات اور خیالات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ موسیقی کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ گانا، بجانا اور ناچنا۔ ہندی میں انھیں گائن، وادن اور نرت کہتے ہیں اور ان سب کو ملا کر سنگیت کہا جاتا ہے۔ ہماری تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ہماری موسیقی کو بھی ترقی ہو رہی ہے۔ ہماری اس تہذیب و تمدن کے کئی دور گزرے ہیں۔ ایک دور آریوں کا تھا جن کی موسیقی کا خاص مقصد بھگتی تھا یعنی وہ سنگیت کے ذریعہ خدا کی عبادت کرتے تھے۔ اس عہد میں موسیقی کی زبان سنسکرت تھی۔ شروع میں انھوں نے سنگیت کے جو اصول وضع کئے اس میں وہ بعد میں تبدیلی کرتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ شروع میں صرف چار سر ہی قایم کئے گئے یعنی سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ ان چار سروں سے راگوں کو صحیح زندگی نہیں مل سکتی انھوں نے تین سروں (پا۔ دھا۔ نی) کا اور اضافہ کر دیا اور ان سات سروں میں ہزاروں راگوں کو مختلف اوقات اور ہر موسم

کے مطابق ڈھال دیا۔ رفتہ رفتہ اس موسیقی کو دسویں صدی عیسوی میں مزید ترقی ہوئی اور تیرھویں صدی میں اس کا رنگ اور بھی نکھر گیا۔ اسی زمانے میں ایک کتاب سنگیت رتناکر لکھی گئی جس کے مصنف پنڈت سارنگ دیو تھے۔ ماہرین موسیقی کا کہنا ہے کہ یہ کتاب ہندوستانی موسیقی کی صحیح ترجمان ہے جیسے کہ بتایا گیا ہے پہلے موسیقی کے پس پشت زیادہ تر مذہبی جذبات کارفرما تھے۔ اس کے بعد موسیقی کو شاہی خاندان کے ارکان کی تعلیم کا ایک جزو سمجھا جانے لگا۔ پھر بھی عوام کے لئے موسیقی کا تصور مذہبی ہی رہا۔ رفتہ رفتہ موسیقی نے سنسکرت کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کو بھی اپنا وسیلہ بنایا مثلاً جنوب میں تیلگو اور تامل اور شمال میں برج بھاشا۔ اس کے علاوہ اس نے مقامی زبانوں سے بھی کام لیا اور کہا جاتا ہے کہ دھرپد جو موسیقی کی پہلی سیڑھی ہے، مقامی زبانوں کا سہارا لے کر ہی ترقی کی راہوں پر گامزن ہوئی۔

موسیقی کا دوسرا دور مسلمان سلاطین دہلی کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ علاوہ اورنگ زیب کے ہر مسلمان بادشاہ نے موسیقی کی سرپرستی اور ہمت افزائی کی اور حقیقت یہ ہے کہ سلاطین دہلی کی حکومت قائم ہونے کے بعد ہندوستانی موسیقی نے ایک نیا موڑ لیا۔ اس دور میں ہندوستانی موسیقی نہ صرف تکمیل کو پہنچی بلکہ وہ عبادت گاہوں سے نکل کر درباروں اور امراء کی محفل تک آ گئی۔ اسی دور میں ہندوستانی موسیقی میں نئی نئی اختراعات ہوئیں۔ پرانے سازوں میں بھی نئی نئی تبدیلیاں کی گئیں۔ امیر خسرو نے پکھاوج سے طبلہ اور وینا سے ستار ایجاد کیا۔ مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی نے بڑے بڑے ماہرین موسیقی بھی پیدا کیے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں تان سین، بابا ہری داس، بیجو باورا جیسے فنکار موسیقی کو ایک حیات جاودانی بخش گئے۔

دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد موسیقی میں نئی چیزوں کا اضافہ ہوا۔ مثلاً امیر خسرو نے دھرپد سے ہٹ کر کچھ اور چیزیں ایجاد کیں جیسے قوالی۔ ترانہ۔ غزل وغیرہ۔ دھرپد اور دھمار کو پھر بھی بدستور اہمیت رہی۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں "خیال" کا اضافہ ہوا۔ "خیال" سے مراد ہے کسی خاص راگ اور اس راگ کی خاص کیفیت کا تصور۔ اس کے موجد نعمت خاں سدا رنگ تھے جو محمد شاہ رنگیلے کے ہاں حیثیت بین کار کے ملازم تھے۔ ان سے نئے راگوں کی تخلیق کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ مسلمان سنسکرت زبان سے ناواقف تھے۔ اس لئے وہ ہندوستان کی موسیقی کا صحیح لطف اُٹھانے سے قاصر تھے۔ چنانچہ بعض ماہرین فن نے اسی خیال سے کہ مسلمان بادشاہ اور امرا بھی اس موسیقی سے لطف اندوز ہو سکیں، موسیقی کے کچھ نئے راگ تیار کئے۔ خیال کی ایجاد کے بعد موسیقی عام پسند ہونے لگی۔ اس میں سدا رنگ اور ان کے بھائی ادا رنگ کا بڑا حصّہ ہے۔ انھوں نے خود بھی اور اپنے شاگردوں کے ذریعہ بھی خیال کو بہت زیادہ مقبول بنا دیا۔ راگ میں جو بات پہلے نہیں تھی وہ اب پیدا ہو گئی۔ ایک خاص قسم کی اٹھان اور اتار چڑھاؤ میں زیادہ گنجائش نکل آئی اور ہندوستانی موسیقی میں ایک نئے قسم کا حسن جلوہ گر ہو گیا۔ ٹھمری دراصل واجد علی شاہ کی رہین منت ہے اور انھیں کے عہد میں اسے کافی عروج ہوا۔ غرض سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کے دور میں جن ماہرین نے ہندوستانی موسیقی کو ترقی دی بلکہ اس پر احسان کیا ان کی تعداد کافی ہے۔ ان لوگوں میں امیر خسرو کا نام سرفہرست ہے۔ اُن کے علاوہ سلطان حسین شرقی، راجہ مان سنگھ والئی گوالیار، سلطان مظفر گجراتی، نائک بخشو، نائک بیجو، نائک گوپال، بابا ہری داس، بابا رام داس، تان سین، چاند خاں اور سورج خاں، تان ترنگ خاں، لال خاں کلاونت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد فن موسیقی کی ترقی پر بہت اثر پڑا۔ لیکن یہ اثر زیادہ دیرپا نہیں ثابت ہوا۔ ملک میں متعدد ریاستیں ضرور قائم ہو گئی تھیں مگر ان سب نے ماہرین موسیقی کی ہر طرح عزت افزائی کر کے نہ صرف ہندوستانی موسیقی کو زندہ رکھا بلکہ اسے تقویت بخشی۔ ان ریاستوں میں قابل ذکر گوالیار، رام پور، بڑودہ وغیرہ ہیں۔ والیان ریاست ماہر گویوں کی سرپرستی کرنے میں مسرت محسوس کرتے تھے اور انھیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس طرح ہندوستانی سنگیت کا یہ فن برابر ترقی کی طرف قدم بڑھاتا رہا۔ لیکن عوام الناس اسے کچھ زیادہ عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ یہ چیز البتہ موسیقی کے لئے ہمت شکن تھی۔ آخرکار اس نازک دور میں دو ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے نہ صرف ہندوستانی موسیقی کو زوال سے بچایا بلکہ اسے عوام سے روشناس کرایا۔ یہ دو قابل قدر ہستیاں، پنڈت وشنو دگامبر پلسکر اور پنڈت بھاتکھنڈے کی تھیں۔

پنڈت جی نے تمام ہندوستان کا دورہ کر کے بڑے بڑے شہروں میں سنگیت کے ودیالے (اسکول) قائم کیے اور عوام کو دعوت دی کہ وہ اس اعلیٰ فن سے فیضیاب ہوں۔ آہستہ آہستہ عوام نے سنگیت کی روحانی اہمیت کا اعتراف کرنا شروع کیا اور اپنی تنگ نظری ختم کر کے اس فن کی واقفیت حاصل کرنے لگے۔ بھاتکھنڈے جی کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے ہندوستانی موسیقی کو Notate کیا اور اسے کتابی شکل میں لائے۔ اس سے پہلے سنگیت پر بہت سی کتابیں لکھی گئی تھیں لیکن ہندوستانی سنگیت کو Notation کی شکل میں کبھی نہیں پیش کیا گیا تھا۔ یہ کام بھاتکھنڈے جی نے اپنی ان تھک کوششوں سے انجام دیا۔ بڑے بڑے استادوں سے انھوں نے استھائی، انترہ سن کر ان کا Notation کیا اور ان کو کتاب کی شکل میں منظر عام پر لائے۔ سنگیت سیکھنے میں جو آسانیاں آج محسوس ہوتی ہیں وہ پنڈت جی کی انھیں کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان دو ناموں کے ساتھ ساتھ ایک اور ہستی کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ وہ ذات ہے شری نارائن راؤ کی جو پنڈت ملوسکر جی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے بھجنوں کے راگ اور راگنیاں تیار کر کے عوام میں موسیقی کے لیے ایک خاص دلچسپی پیدا کر دی۔

ہندوستانی موسیقی کی ترقی کا سبب ایک اور بھی تھا یعنی یہ فن چند مشہور "گھرانوں" میں بٹ گیا مثلاً آگرہ گھرانا، کیرانہ گھرانا، پٹیالہ گھرانا اور گوالیار گھرانا۔ ان گھرانوں نے بڑے بڑے ماہرین فن پیدا کیے اور ان کا نام آج بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔ آگرہ گھرانے نے جو فنکار پیدا کیے ان میں قابل ذکر حاجی سجان خاں، میاں گھگھے خدابخش، شیر خاں، غلام عباس خاں، کلن خاں، نثار حسین عرف نتھن خاں، آفتاب موسیقی فیاض خاں صاحب اور عبداللہ خاں ہیں۔ آگرہ گھرانا پہلے دھرپد کے لیے زیادہ مشہور تھا لیکن گھگھے خدابخش سے اس گھرانے میں خیال کی آمد ہوئی۔ گھگھے خدابخش کی آواز بچپن میں دھرپد گانے کے قابل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس کمی کو انھوں نے بہت محسوس کیا چنانچہ جب وہ بڑے ہوئے تو اپنا گھر چھوڑ کر گوالیار میاں نتھن پیر بخش کے پاس چلے گئے اور ان کے ساتھ رہ کر اس درجہ محنت کی کہ ان کی آواز میں غضب کی مٹھاس اور تاثیر پیدا ہو گئی۔ یہ کمال حاصل کر کے وہ اپنے گھر واپس آئے اور جب ان کے بزرگوں نے انھیں سنا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ بعد میں گھگھے خدابخش آگرہ میں حسینی گوتے کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے گانے میں یہ خصوصیت تھی کہ جس محفل میں وہ گاتے تھے ساری محفل رونے لگتی تھی۔

ان کے بعد شیر خاں، غلام عباس خاں، کلن خاں، ایسی مشہور و معروف ہستیاں پیدا ہوئیں۔ شیر خاں نے کرناٹک اور مہاراشٹر کو آگرہ کی گائیکی سے واقف کرایا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے نتھن خاں نے آگرہ گھرانے کی گائیکی میں ایک نیا رنگ پیدا کیا۔ اس رنگ کو محمد خاں نے مختلف طریقوں سے پیش کر کے ایک امتیازی حیثیت حاصل کی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے مبارک علی خاں نے اس رنگ کو فنی طور سے اور پختہ کیا۔ اس رنگ میں انھوں نے جو چیز خصوصی طور پر پیدا کی وہ تھی "بول تان"۔ اس چیز نے آگرہ گھرانے کو ایک امتیازی حیثیت بخش دی۔ آگرہ گھرانے کے ایک اور مشہور فرد غلام عباس تھے۔ ان کے بعد استاد فیاض خاں نے اس گھرانے کی شہرت کو اور چار چاند لگا دیے اور آفتاب موسیقی کہلائے۔ ان کی فنی خصوصیات اتنی ہیں کہ ان کا ذکر کرنے کے لیے ایک کتاب درکار ہے پھر بھی کچھ اشارہ کرنا ضروری ہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انھیں ہر چیز پر یکساں عبور حاصل تھا۔ دھرپد، دھمار، خیال، ٹپہ، ٹھمری اور غزل سبھی چیزیں اس طرح گاتے تھے جیسے ہر صنف ان کی اپنی ملکیت ہو۔ شاعری بھی کرتے تھے اور پریم پیا کے نام سے انھوں نے بہت سی چیزیں لکھی ہیں جو آج بھی اکثر گائی جاتی ہیں۔ آگرہ گھرانے کی گائیکی کو بام عروج پر پہنچانے کا جو کام فیاض خاں نے کیا ہے، وہ شاید اس گھرانے کی کسی اور ہستی نے نہیں کیا۔ ان کے بعد استاد ولایت حسین خاں جو حیات ہیں اس گھرانے کی گائیکی کے سچے نمائندہ ہیں۔ ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے فنکاروں میں ہوتا ہے۔ راگ کی سچائی اور لے کاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

کیرانا گھرانا بھی اپنی مثال ہے۔ اس گھرانے میں بھی بہت سی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں جو موسیقی کے آسمان پر ستاروں کی طرح چمکیں۔ ان میں قابل ذکر، بین کار صادق علی خاں اور ان کے بیٹے بندے علی خاں ہیں جو سارے ہندوستان میں مشہور ہیں گانے اور بجانے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی۔ ان میں مشہور

مراد خاں بین کار، ننھے خاں دھرپد بیئے وغیرہ تھے۔ ننھے خاں کے شاگرد عبداللہ رحمٰن خاں جے پور والے تھے جن کے شاگرد عبدالکریم خاں صاحب ہوئے۔ عبدالکریم خاں صاحب کو دنیائے موسیقی میں ایک خاص شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے گلے میں ایسی تاثیر تھی کہ سننے والا تڑپ اٹھتا تھا۔ ان کو ٹھمری گانے میں کمال حاصل تھا اور ان کی گائی ہوئی مشہور ٹھمریاں "پیا بن نہیں آوت چین" اور "جمنا کے تیر" کے ریکارڈ آج بھی ذوق و شوق سے سنے جاتے ہیں۔ ان کے چند مشہور شاگرد یہ ہیں۔ گنیش رام چندر۔ بڑے بوا۔ سوامی گندھرو، سوامی گندھرو کے شاگرد بھوراج، بھیم سین جوشی، گنگو بائی ہنگل، فیروز دستور اور ہیرا بائی وغیرہ ہیں۔

گوالیار گھرانے میں بھی بہت سی مشہور ہستیاں پیدا ہوئیں۔ جیسے سرگباشی راجہ بھیا پونچھ والے اور کرشنا راؤ پنڈت جو آج بھی صفحۂ ہستی پر موجود ہیں۔ رام پور والے مشتاق خاں گوالیار گھرانے کے ممتاز نمائندے ہیں۔ یہ رام پور دربار کے خاص گوئیے ہیں۔ رام پور دربار کے ایک اور مشہور فن کار احمد جان تھرکوا خاں صاحب ہیں جو ہندوستان کے ماہرین طبلہ میں سے ایک ہیں۔ آپ فرخ آباد باج اور دہلی باج کے ماہر ہیں۔

رام پور گھرانے کے سب سے بڑے استاد جو آج بھی حیات ہیں استاد علاؤالدین خاں صاحب ہیں۔ آپ ہندوستان کے چوٹی کے سرودئیے ہیں لیکن ایسے "جینس" (Genius) ہیں کہ وائلن، بانسری اور ستار ایسا ہی بجاتے ہیں جیسے سرود۔ راگوں کی سچائی کو قائم رکھتے ہوئے انھوں نے نئی نئی راہیں اور نئے نئے ڈھنگ پیدا کئے ہیں اور ہندوستانی موسیقی کو ایک نیا راستہ دکھا دیا ہے۔ یہ راستہ وہ ہے جس پر ان کے بیٹے علی اکبر خاں اور ان کے داماد روی شنکر، دونوں اپنی انفرادی حیثیت کا اظہار کرتے ہوئے چل رہے ہیں۔ ان دونوں نے نہ صرف ہندوستان میں ہی نام پیدا کیا

بلکہ غیر ممالک کا دورہ کرکے ان ملکوں کے رہنے والوں کے دلوں میں ہندوستان کی موسیقی کا ایک خاص احترام پیدا کر دیا ہے۔

جن گھرانوں کے افراد کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ موجودہ دور میں ہندوستانی موسیقی کے اور بھی فن کار پائے جاتے ہیں۔ جو لوگ کلاسکی موسیقی سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ پنڈت اونکار ناتھ ٹھاکر کا نام تو ضرور جانتے ہوں گے۔ اپنی خوبصورت آواز کے لئے وہ ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ پنڈت رتن جنکر بھی چوٹی کے گویوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ہندوستانی موسیقی کے بارے میں جتنی ٹیکنیکل (Technical) واقفیت ان کو ہے اتنی کسی کو نہیں۔ پنڈت دلیپ چند ویدی بھی بہت نامور گوئیے ہیں۔ ان کے علاوہ بڑے غلام علی خاں، امیر خاں، نثار حسین خاں، کرشنا راؤ شنکر وغیرہ دوسرے مشہور گوئیے ہیں۔ ساز بجانے والوں میں اُستاد حافظ علی خاں، ولایت خاں وغیرہ بڑی شہرت کے حامل ہیں۔

آزادی مل جانے کے بعد ہماری قومی حکومت نے رقص و موسیقی کی جو سرپرستی کی ہے وہ اسے آج تک نصیب نہ ہوئی تھی۔ موجودہ حکومت نے نہ صرف اس کی فنکارانہ حیثیت پر نظر رکھی بلکہ موسیقی کو ہندوستان کی ثقافت کا ایک حصہ سمجھ کر اسے ترقی دینے کی اور مقبول بنانے کی کوشش کی۔ جابجا یونیورسٹیوں میں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں اس فن کو تعلیم کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے اور سیکھنے والوں کو معقول وظائف بھی دیئے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو سے خصوصی پروگرام نشر کئے جاتے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ عوام ان بڑے بڑے ماہرین فن کو آسانی سے سن سکیں۔ جن کی آواز سننے کے لئے وہ برسوں بے چین رہتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب شریف اور تعلیم یافتہ گھروں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی موسیقی کو ایک فن کی حیثیت سے سیکھ رہی ہیں اور اس میں اپنا نام کر رہی ہیں۔

’میرا ننّھا جواں ہوگا‘

میرا پھاوڑا بھی ہے ننھّے کی نظروں میں لکڑی کا گھوڑا،
کوئی دھما دھما سا باجا بجاتے ہیں اس کے لئے تار برقی کے کھمبے!
ہوائی جہازوں کی آواز بھی، دُور دیسوں کا اِک اجنبی گیت ہے،
ہر اِک بات میں نقل آبا کی کرنا۔ یہ معصوم بچپن کی اِک ریت ہے!

مگر کل سنبھالیگا جب ہوش تو کھیل سارے یہ، اپنے صحیح روپ میں،
نمودار ہونے چلے آئیں گے، زندگی کی کڑی دھوپ میں!
یہی پھاوڑا اس کے ہاتھوں میں محنت کا اوزار بن جائے گا،
غمِ زندگی بھی پھر اس کی توجّہ کا کچھ کچھ طلبگار بن جائے گا!

ہماری یہ جدّوجہد آج کی نذرِ اِک عالمِ نو ہے...
جس میں سنبھالے گا کل ہوش ننھّا!
وہ اِک عالمِ نو ذرا اور بھی دور ہوگا جو غم سے،
جہاں ہوں گی خوشیاں ذرا اور نزدیک ہم سے!

آج بھی پہلے کی طرح ہماری مصنوعات آپکے گھروں کو زیادہ صاف، زیادہ تندرست اور زیادہ مطمئن بنانے میں مددگار ثابت ہورہی ہیں۔ لیکن آج ہم...
کل کے لئے کام کر رہے ہیں جب زیادہ آرامدہ زندگی کے لئے آپکی بڑھتی ہوئی ضروریات اور زیادہ سہولتوں کی طلبگار ہونگی۔ اور ہم زیادہ وسیع ذرائع، نئی ایجادوں اور نئی مصنوعات سے اس وقت بھی آپکی خدمت کے لئے تیار پائے جائینگے!

PR. 1-X52UD

جرعاتِ اقبال

"پیام مشرق" سے ترجمہ

صالحہ عرشی

مرا دل بے قرارِ آرزو ہے — میرے سینے میں شورِ ہائے و ہو ہے
میں کیا بولوں کہ روزو شب مجھے تو — خود اپنے آپ ہی سے گفتگو ہے

پریشاں گلستاں میں مثلِ بو ہوں — نہ جانے کیوں میں محوِ جستجو ہوں
برآئے آرزو یا بر نہ آئے — شہیدِ سوز و سازِ آرزو ہوں

زمیں کو رازدانِ آسماں کر — مکاں کو شرحِ رمزِ لامکاں کر
ہر اک ذرّہ سوئے منزل رواں ہے — تو ریگِ راہ کو اپنا نشاں کر

خضر سے ایک دن بولا سکندر — شریکِ سوز و سازِ بحر و بر ہو
بس اب تو چھوڑ دے ساحل نشینی — ذرا طوفاں میں چل اور زندہ تر ہو

ضمیرِ کن فکاں تیرے سوا کیا
نشانِ بے نشاں تیرے سوا کیا
ذرا بے باک تر ہو زندگی میں
یہ دنیا ہے یہاں تیرے سوا کیا

✡

غزل

کرشن موہن

مہ و مہر سے ہم عناں ہو گئے ہم
کمند افگنِ لامکاں ہو گئے ہم

شناسائے رنگِ جہاں ہو گئے ہم
کہ بے فکرِ سود و زیاں ہو گئے ہم

خرد کی بدولت کہاں ہو گئے ہم
غبارِ رہِ کارواں ہو گئے ہم

تھے راست، دنیا نے کج کر دیا ہے
کبھی تیر تھے اب کماں ہو گئے ہم

بڑا ناز تھا ہوش مندی پہ ہم کو
اچانک اسیرِ بتاں ہو گئے ہم

تری یاد دل میں، ترا ذکر لب پر
سراپا تری داستاں ہو گئے ہم

ہمیں بے خودی میں بہت لطف آیا
کہ گم ہو کے منزل نشاں ہو گئے ہم

جمالِ نگاراں پہ اشعار کہہ کر
قرارِ دلِ عاشقاں ہو گئے ہم

قتیلِ ہوس تھے تو آتش نفس تھے
محبت میں تو بے زباں ہو گئے ہم

عجب ہے کبھی ہو گئے تجھ سے سرکش
کبھی ساجدِ آستاں ہو گئے ہم

لگی آگ، اٹھے درد کے راگ دل سے
ترے غم میں آتش بیاں ہو گئے ہم

جو من اپنا روشن ہوا کرشن موہن
حدیں مٹ گئیں بیکراں ہو گئے ہم

گم گشتگی

کرشن ادیب

جہاں تو نے چھیڑے محبّت کے قصّے
جہاں تو نے گائے تھے اُلفت کے نغمے
دریچے وہ زرکار اب بھی کھُلے ہیں
جھروکے وہ زرکار اب بھی کھُلے ہیں
نہ جانے بھلا تو کہاں کھو گئی ہے
کہ سائے سے یادوں کے لہرا رہے ہیں

وہ ہونٹوں کی گرمی، وہ ہاتھوں کی نرمی
تکلّم کا جادو، تبسّم کی شوخی
نگاہوں کی تیری وہ ضوپاشیاں بھی
اُداسی کے آغوش میں کھو گئی ہیں
محبّت کے مرقد میں سب سو گئی ہیں

ترے بعد دل کا سکوں کھو گیا ہے
کہ زخموں سے میرے لہو بہہ رہا ہے
سسکتی اُمنگوں کو نیند آ گئی ہے
کہ دل نشۂ غم میں سرشار ہو کر
کسی خواب کے شہر میں کھو گیا ہے

لیے سرد ہونٹوں پہ کوئی تمنّا
میں اُن ریگزاروں میں اب آ گیا ہوں
جہاں بے بسی ترجمانِ نفس ہے
نہ بانگِ درا ہے، نہ بانگِ جرس ہے
کہ منزل کا میری نشاں کھو گیا ہے

حزیں خلوتوں میں تو بھولے سے آ کر
کبھی تشنہ نظروں کو شاداب کر دے
کہ خوابیدہ تاروں کو لرزش سی دے کر
اُمیدوں، اُمنگوں کو بے تاب کر دے

کشمیر کی دست کاریاں — ۲

خورشید احمد

نیا دور کی گذشتہ اشاعت (جون) میں کشمیر کی ٹیکسٹائل دستکاریوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ غیر ٹیکسٹائل دستکاریوں میں لکڑی کا کام، پیپر ماشی، چاندی کا سامان، بید کی ٹوکریاں اور بکس اور دیگر چیزیں نیز چمڑے کا سامان بہت مشہور ہے۔ ذیل میں ان دستکاریوں کا ذکر اختصار سے کیا جا رہا ہے۔

لکڑی کا کام۔ کشمیر میں جنگلوں اور عمدہ قسم کی لکڑیوں خصوصاً اخروٹ کی لکڑی کی بہتات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لکڑی کے کام کو غیر ٹیکسٹائل صنعتوں میں ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ اخروٹ کی لکڑی صفائی، پائداری اور خوبصورتی کی وجہ سے لکڑی کے کام کے لئے نہایت موزوں ہوتی ہے چنانچہ کشمیر کے لکڑی کے کام میں اخروٹ کی لکڑی کی نقاشی یہاں کی خصوصیت ہے۔

دوسرے دستکاروں کی طرح لکڑی کا کام کرنے والے بھی اپنے جمالیاتی شعور کا اظہار لکڑی کی نقاشی کے ذریعہ اسی مہارت کے ساتھ کرتے ہیں جس مہارت کا مظاہرہ یہاں کے شنگر، چاندی کا کام کرنے والے اور سوزن کار کرتے ہیں۔ بڑی بڑی عمارتوں اور چھوٹے چھوٹے خوشنما مکانوں سے لیکر ڈرائنگ روم اور کھانے کے کمرے کے فرنیچر اور روزمرّہ کے استعمال تک کی بے شمار چیزیں لکڑی کی تیار کی جاتی ہیں۔

لکڑی کے کاموں میں ابھرا اور کٹا ؤ کا کام بہت ہی خوبصورت اور دستکاروں کی خداداد قابلیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کٹاؤ کا کام تو بڑا نازک بھی ہوتا ہے۔ اس میں پھول پتیاں اور ان کے رگ ریشے جس تفصیل سے بنائے جاتے ہیں وہ دیکھنے والوں کو محو حیرت کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا اخروٹ کی لکڑی کی نقاشی یہاں کی خصوصیت ہے۔ اخروٹ کی لکڑی کے فرنیچر اور دوسری چیزیں نہایت صاف اور خوبصورت ہوتی ہیں۔ اخروٹ کی لکڑی کے سامان میں سنگار بکس، زیور کے صندوقچے، ٹرے، ڈبے، لیمپ اسٹینڈ اور سگریٹ کیس وغیرہ بہت عمدہ بنتے ہیں جن پر بڑی مہارت سے نقاشی کی جاتی ہے۔

لکڑی کا سامان تیار کرنے میں بھی بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ پہلے لکڑی کو کاٹ کر خاص طریقے سے خشک کیا جاتا ہے پھر ان میں سے بہترین قسم کے ٹکڑے منتخب کر لئے جاتے ہیں اور خراب لکڑی علیحدہ کر دی جاتی ہے۔ لکڑی کو اس لئے خشک کیا جاتا ہے کہ گرم خطوں میں پہنچ کر یہ سامان ٹیڑھے نہ ہو جائیں۔ لکڑی کی صنعت کو فروغ دینے کے لئے حکومت کشمیر کی جانب سے لکڑی کو خشک کرنے کے ایک کارخانہ (Seasoning Kiln)

کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ جہاں بہت کم مدت میں اسٹیم کے ذریعہ لکڑی کو خشک کر لیا جائے گا اور پھر اس سے سامان تیار کیے جائینگے۔

بہت سی دوسری دستکاریوں کی طرح لکڑی کی دستکاری بھی کشمیر کی ایک قدیم دستکاری ہے۔ لکڑی کی نقاشی میں بیشتر چنار اور آئرس کی پتیاں اور بیل بوٹے بہت مقبول ہیں۔

پیپر ماشی۔ کی صنعت یا کاغذ کی دست کاری کشمیر کی اپنی دستکاری ہے۔ سلطان زین العابدین کشمیر کا ایک عظیم اور ہنر پرور حکمراں گزرا ہے۔ آپ نے اپنے عہد حکومت (۱۴۲۳ء تا ۱۴۷۲ء) میں بہت سے غیر ملکی دستکاروں اور صناعوں کو بلا کر کشمیر میں آباد کیا اور ان کے فن کو کشمیر میں فروغ دیا۔ کاغذ کی دستکاری بھی اسی بادشاہ کے عہد میں سمرقند سے کشمیر پہنچی۔

کشمیر کی یہ مشہور دستکاری باہر کے اثرات سے بہت کم متاثر ہوئی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ صنعت اب بھی ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اصل ایرانی دستکاروں کی نسل سے ہیں۔ کاغذ کی دستکاری کو "کاری قلمدانی" یا کمان گری کہتے ہیں۔ اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس صنعت کا آغاز کیونکر ہوا لیکن مشہور ہے کہ قدیم ایرانی سورماؤں کے منقش تیر و کمان سے اس صنعت کی ابتدا ہوئی ہے اور قرین قیاس بھی یہی ہے۔ اسی لئے اسے اب بھی "کمان گری" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ پیپر ماشی کے بیشتر دستکار سری نگر کے محلہ کمان گر پورہ میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو فارس کے دستکاروں کی نسل سے بتاتے ہیں اور شیعہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ صرف ایک سُنّی گھرانا ایسا ہے جس میں پیپر ماشی کا کام ہوتا ہے۔ پیپر ماشی کی مصنوعات پر طغرا بنانے کا کام سارے کشمیر میں صرف ایک شخص جانتا تھا جس کا نام نارن مُوہت ساگر تھا۔ یہ ایک پنڈت تھا۔ اسکے کوئی اولاد یا قریبی رشتہ دار بھی نہ تھے اور نہ اس نے یہ فن کسی کو سکھایا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ فن "علم سینہ" ہو کر اسی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کشمیر میں پیپر ماشی کے بڑے بڑے باکمال دستکار گزرے ہیں۔ آخری باکمال دستکار سید تراب تھے جن کا تقریباً ۵۰ برس ہوئے انتقال ہو گیا۔

کاغذ کی مصنوعات ردی کاغذ اور چیتھڑوں سے تیار کی جاتی ہیں ان مصنوعات کی تیاری کا عمل بھی بہت طولانی ہوتا ہے۔ ایک چیز کی تیاری میں کئی کئی دن اور بعض وقت کئی کئی ہفتے لگ جاتے ہیں۔ پہلے ردی کاغذ چیتھڑوں کو کوٹ اور پیس کر لُبدی تیار کی جاتی ہے۔ اور پھر طلوبہ شکل کے [illegible]

کے سانچوں میں دبا دبا کر سامان تیار کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد دھوپ میں اسے خوب اچھی طرح خشک کر لیا جاتا ہے۔ خشک ہو جانے کے بعد اس پر سفید رنگ چڑھایا جاتا ہے۔ پھر اس پر مختلف پختہ رنگوں سے باریک برش کی مدد سے نقاشی کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں یہ رنگ سمرقند اور یارقند سے آتے تھے۔ اب یہ رنگ باہر سے نہیں آتے بلکہ پتھر اور دیگر معدنیات سے اندرون ملک ہی تیار کئے جاتے ہیں۔ سنہرے اور روپہلے کام کے لئے خالص سونے اور چاندی کے ورق استعمال کئے جاتے ہیں۔ جب نقاشی کا کام مکمل ہو جاتا ہے تو اس پر وارنش کرتے ہیں تاکہ پانی میں بھیگنے یا دھوپ میں رہنے کی وجہ سے یہ چیزیں خراب نہ ہوں۔

پیپر ماشی کی مصنوعات پر نقاشی میں چنار کی پتیوں، ایرانی گلاب، بادام اور چیری کے شگوفوں، لالہ اور سنبل، رام چڑیا اور بلبل کی شکلیں دلکش رنگوں میں اس خوبصورتی اور جزوی تفصیلات کے ساتھ بنائی جاتی ہیں کہ ان کی نزاکت و نفاست اور دل کشی کا واقعی لطف نیز کاریگر کی محنت و دیدہ ریزی کا صحیح اندازہ آتشی شیشے سے دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔

کاغذ سے منقش قلمدان، ٹرے، بسکٹ رکھنے کے ڈبے، دیوار پر آویزاں کرنے کے لئے آرائشی ٹرے، سگرٹ کیس، گلدان، صندوقچے، شلف، زیورات کے صندوقچے، رنگین میز لیمپ، کھلونے، چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور بے شمار دوسری چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ سیاحوں کیلئے یہ چیزیں بڑی ہی جاذبیت رکھتی ہیں۔ بیرونی ملکوں میں امریکہ اور یورپ میں یہ مصنوعات بہت مقبول ہیں۔

چاندی کا سامان۔ چاندی کے ظروف اور ان پر خوشنما نقاشی بھی کشمیر کی ایک اہم صنعت ہے۔ کشمیر کی یہ صنعت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ چاندی اور دوسری دھاتوں سے برتن اور طرح طرح کی دوسری چیزیں بنانے اور ان پر نقاشی کا کام انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا۔ خصوصیت سے چاندی کی نقاشی یہاں کے دست کاروں کی مہارت کا اعلیٰ نمونہ ہوتی ہے۔ چاندی کے سامان میں پیالے، صراحیاں، واز، تشتریاں، کافی کی کیتلی (روزمرہ کے استعمال کے لئے نیز آرائش کے لئے بھی یہ کیتلیاں بنائی جاتی ہیں) اور بے شمار دوسری چیزیں شامل ہیں۔

کشمیر میں مختلف مصنوعات کے دستکار اور کاریگر کسی مخصوص علاقہ یا محلہ میں رہتے ہیں مثلاً جنتر کشیدہ کار اور سوزنی کار سری نگر اور اننت ناگ میں گبھے اور نمدے کے کاریگر قصبہ اننت ناگ میں اور پیپر ماشی کے دستکار سری نگر کے محلہ کمان گرپورہ میں رہتے ہیں۔ لیکن چاندی کا کام کرنے والے کاریگروں کا معاملہ جداگانہ ہے۔ یہ کاریگر کسی خاص محلہ یا کشمیر کے کسی خاص حصہ میں نہیں رہتے بلکہ ریاست بھر میں پھیلے ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ چاندی کا بہترین کام سری نگر ہی میں ہوتا ہے اور ماہرین سری نگر ہی میں پائے جاتے ہیں۔

چاندی کے سامان دو نمونوں کے ہوتے ہیں۔ ایک شالی نمونے کے اور دوسرے چنار نمونے کے ہوتے ہیں۔ شالی نمونے کا کام باریک ہوتا ہے۔ اسکے بیل بوٹے بڑی نزاکت اور صفائی سے نقش کئے جاتے ہیں۔ دوسرے نمونے کی چیزوں پر چنار کی پتیاں اور کنول کے پھولوں کی نقاشی کی جاتی ہے ان کے علاوہ ایک نمونہ اور بھی رائج ہے جو لاسا اسٹائل کہلاتا ہے اور تبت سے متاثر ہوتا ہے اس نمونے کے سامان لداخ کے علاقہ تک محدود ہیں۔

چاندی کے علاوہ کشمیر میں تانبے کے بھی برتن بہت بنتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہاں کے تانبے کا کام خاص طور سے تبت کے بودھوں کی نقل ہے۔ تانبے کی چیزوں میں تشتریاں اور سماور وغیرہ کافی مشہور ہیں۔

چائے نوشی کشمیریوں کی عادت ثانیہ ہے جس طرح دونوں وقت کھانا

ضروری ہوتا ہے اسی طرح چلنے ان کی زندگی کا اہم جز بن گئی ہے یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں سماور بہت مقبول ہیں۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس میں سماور نہ ہوتا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ سماور روس کی ریاست تاجکستان کی دین ہے کشمیر کے مسلمان تانبے کے سماور اور یہاں کے پنڈت پیتل کے سماور استعمال کرتے ہیں۔ ساخت کے اعتبار سے دونوں سماور ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔

بید کا سامان۔ کشمیر میں بید کی صنعت کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے بید کے سامان میں کانگڑیاں خصوصیت رکھتی ہیں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ یہ مثل کانگڑی پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ کشمیر میں سردی بلا کی پڑتی ہے یوں تو قدرت نے کشمیر کو اون کی جو دولت بخشی ہے اور جیسا اون یہاں دستیاب ہے کہیں اور نصیب نہیں لیکن سامنت شاہی نظام نے کشمیری عوام کو صدیوں سے جس غربت و افلاس میں مبتلا کر رکھا تھا اسکے پیش نظر غریب عوام اچھے مکانات، عمدہ قسم کے اونی لباس، بہترین حمام اور اچھی قسم کی انگیٹھیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ وہ کشمیر کی سردی سے بچنے کے لئے کوئی سستی اور سہل الحصول چیز ایجاد کرتے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لئے کانگڑیاں تیار کیں۔

کانگڑی کی ایجاد اس لئے اور بھی آسان ہو گئی کہ کشمیر میں عمدہ قسم کا ولائتی بید وافر مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔ کانگڑی دستی انگیٹھی ہوتی ہے۔ جس میں مٹی کا ایک چھوٹا کونڈا یا گول برتن ہوتا ہے اور اسکے چاروں طرف بید کا ایک فریم سا بناتے ہیں۔ مٹی کے اس کونڈے میں کوئلہ جلایا جاتا ہے۔ جو سردی سے محفوظ رکھتا ہے۔ کانگڑی کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ کشمیری اسے اپنے گلے میں لٹکائے رہتے ہیں حقیقت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ کانگڑی لوگ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ دستی ہونے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ بید کی ٹوکری کی طرح اس میں بھی ہینڈل لگا ہوتا ہے۔ یہ ضرور آسانی ہوتی ہے کہ لوگ جہاں جاتے ہیں اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔

کانگڑی کے علاوہ بید کی مختلف سائز کی ٹوکریاں جسے کنڈیا بھی کہتے ہیں، کرسیاں، فوٹو فریم مختلف شکل کے خوبصورت گلدان، دیواروں میں آویزاں کرنے کے لئے گلدان اور پلنے وغیرہ بنتے ہیں۔ یہ کشمیر کی ایک جدید صنعت ہے اور اس نے گزشتہ چند برسوں میں کافی ترقی کی ہے۔

چمڑے کا کام۔ جموں اور کشمیر میں چمڑا کمانے اور چمڑے کے دوسرے سامان بنانے کا کام دیہی صنعت کے طور پر ہوتا ہے اور دیہاتوں نیز شہروں میں غیر منظم طور پر پھیلا ہوا ہے۔ گاؤں میں جوتا بنانے والے یہ کاروبار قدیم طریقوں سے اپنے گھروں ہی میں خود کرتے ہیں یا بیوپاریوں اور ساہوکاروں کے حسب منشا کرتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران البتہ اس صنعت میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے حکومت کشمیر کی مدد سے شل ٹینگ میں ایک چھوٹی سی چمڑا کمانے کی فیکٹری قائم کی۔ لیکن جنگ کے خاتمہ پر مال کی مانگ نہ ہونے کے باعث یہ فیکٹری بند ہو گئی۔ بہر حال ۱۹۵۳ء میں کشمیری عوامی حکومت کے قیام کے بعد دوسری اہم صنعتوں کے ساتھ چمڑے کی صنعت بھی پانچ سالہ منصوبے میں شامل کر لی گئی اور شل ٹینگ کی فیکٹری کو حکومت نے اپنے انتظام میں لے لیا اور اسکے استحکام و ترقی کے لئے کوشاں ہے۔

کشمیر کا چمڑے کا سامان بھی اپنی خوبصورتی اور پائیداری کے لئے مشہور ہے۔ یہاں چھوٹے ہینڈ بیگ سے لے کر بڑے بڑے سوٹ کیس تک تیار ہوتے ہیں۔ کشمیر کے ہاتھ کے بنے ہوئے خوبصورت جوتے خصوصاً فر سلیپر بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ شاید ہی کوئی سیاح ایسا ہوتا ہو جو کشمیر کے ہاتھ کے بنے ہوئے جوتے اور فر سلیپر اپنے ساتھ نہ لاتا ہو۔ ہاتھ کے یہ بنے ہوئے جوتے مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی ہلکے بھی ہوتے ہیں۔ ان پر خوبصورت اور دل کش کشیدہ کاری بھی ہوتی ہے۔ چمڑے کے کرسی کے کشن بھی بنتے ہیں جن پر نفیس اور دیدہ زیب کشیدہ کاری کی جاتی ہے یہ کشن بھی بہت مقبول ہیں۔ ان کے علاوہ سیکڑوں چھوٹے بڑے چمڑے کے سامان تیار ہوتے ہیں۔

فر کا سامان۔ یہ بھی یہاں کی ایک خاص صنعت ہے۔ کشمیر کے فر کے سامان کی کافی مانگ ہے۔ چونکہ یہاں سیاہ گوش اور لومڑی وغیرہ کثرت سے پائی جاتی ہیں اس لئے ان کی کھالوں سے مختلف سامان بنانے کا کام ہوتا ہے اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ کشمیر کے فر سلیپر بہت مشہور ہیں۔ فر سلیپر کے علاوہ فر کے دل کش اور جدید طرز کے کوٹ، دستانے اور ٹوپیاں [illegible] کشمیر کی فر کی ٹوپیاں بھی بہت مقبول ہیں فر کے اعتبار سے [illegible]

انسانی طاقت کے وسائل کو بروئے کار لانے پر زور • • • تیسرے منصوبہ میں خدمتی امداد باہمی انجمنیں • • • جنگلات کی ترقی • • • دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کا نو تشکیل ریاستی بورڈ • • • گنے سے کھنڈساری کے حصول میں اضافہ • • • گاندھی جی کے خطوط اور تحریروں کو یکجا کرنے کی اسکیم • • • گرام سیوکوں کے تربیتی مرکز کی کارگزاری • • • درمیانی طبقے کیلئے تعمیر مکانات کی اسکیم • • • متفرقات

ریاست کے تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت گاؤں اور بلاک کے منصوبوں کا مقصد زراعتی پیداوار بڑھانے کے لئے انسانی طاقت کے جملہ وسائل کو پورے طور پر بروئے کار لانا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے ذریعہ ایسے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ روزگار کے مواقع بہم پہنچانا ہیں جن کو اس وقت پورے سال کے لئے روزگار دستیاب نہیں ہے۔

ڈیولپمنٹ کمشنر نے تمام ضلع مجسٹریٹوں کے نام اپنی ایک گشتی چٹھی میں اس امر پر زور دیا ہے کہ دیہی علاقوں میں مزید روزگار کے مواقع بہم پہنچانے کے لئے آبپاشی اور کھیتی کے جدید طریقوں کے ذریعہ زراعتی پیداوار بڑھانے اور بڑے پیمانہ پر پروسنگ یا دوسری صنعتوں کی ترقی کے اقدامات کرنا چاہئیں۔ چٹھی میں مزید کہا گیا ہے کہ انسانی طاقت کے وسائل کو بروئے کار لانے کے لئے ہر ایک دیہی علاقہ میں کاموں کا جامع پروگرام مرتب کرنا ضروری ہے۔

کاموں کا یہ پروگرام چار زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے اول ایسے کام جو ریاست اور لوکل باڈیز کے منصوبوں میں شامل ہیں اور جن کی تکمیل کیلئے غیر ہنرمند اور نیم غیر ہنرمند مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ دوم ایسے کام جو ان سے براہ راست مستفید ہونے والے یا مقامی لوگ مکمل کرتے ہیں۔ سوم ایسی اسکیمیں جن کے تحت گاؤں والوں کیلئے نفع بخش کام کئے جائیں۔ چہارم ایسے ترقیاتی کام جن کو مقامی لوگ حکومت کی کچھ مالی امداد سے مکمل کرتے ہیں۔

پہلے زمرہ کے تحت آبپاشی، انسداد سیلاب، زمین کو قابل کاشت بنانے، مٹی کے تحفظ، اور بڑی سڑکوں اور پلوں کی تعمیر وغیرہ کے منصوبے آتے ہیں۔ یہ کام عام طور پر متعلقہ محکمہ جات ٹھیکیداروں

کے ذریعہ مکمل کرائے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ کوشش کی جائے گی کہ ان کاموں کی تکمیل میں حتی الامکان مقامی لوگوں کو شریک کیا جائے۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ ایک مقررہ حد تک گاؤں پنچایتوں اور مزدوروں کی امداد باہمی انجمنوں کے ذریعہ ایسے کاموں کی تکمیل ہوگی۔

دوسرے زمرہ کے تحت کھیتوں کی نالیوں کی تعمیر اور ان کی دیکھ بھال اور مٹی کے تحفظ کے کام وغیرہ آتے ہیں۔

تیسرے زمرہ کے تحت گاؤں والوں کیلئے نفع بخش کام آتے ہیں جیسے تالابوں اور پنچایت گھروں کی تعمیر، پانی کی نکاسی اور مشترکہ چراگاہوں وغیرہ کی اسکیمیں۔

چوتھے زمرہ کے تحت ہر ایک گاؤں کیلئے پینے کے صاف پانی اور ۶ سال سے لیکر ۱۱ سال تک کے بچوں کو ابتدائی تعلیم کا بندوبست وغیرہ آتے ہیں۔

● ● ●

زراعتی ترقی کے سلسلے میں تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت ریاست بھر میں خدمتی امداد باہمی انجمنوں کا جال بچھانے کا بھی نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ منصوبہ کی مدت میں یہ کوشش کی جائے گی کہ دیہی علاقوں میں تمام کنبے ان انجمنوں کے دائرہ اثر میں آجائیں۔ اس امر کے پیش نظر کہ گاؤں کے کچھ لوگ شاید ان انجمنوں کے ممبر بننے میں دلچسپی نہ لیں، دیہی کنبوں کے ۷۵ فیصدی کو ممبر بنانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ نو تشکیل امداد باہمی انجمنوں کا دائرہ عمل وہی رکھا جائے جو گاؤں سبھاؤں کا ہے تاکہ بعد میں کسی بھی مرحلہ پر ان کو خدمتی امداد باہمی انجمنوں میں تبدیل کیا جا سکے۔ ایک دیہی امداد باہمی انجمن دو یا تین گاؤں سبھاؤں کو ملا کر قائم کی جا سکے گی بشرطیکہ گاؤں والے اس کیلئے متفق ہوں اور اس کی کل آبادی تقریباً ایک ہزار ہو۔

ہر بلاک میں جن گاؤں سبھاؤں میں یکم اپریل سنہ ۱۹۶۱ء تک خدمتی امداد باہمی انجمنوں کا قیام عمل میں نہ آیا ہوگا وہاں کے لئے پروگرام بنایا جائے گا جو تیسرے منصوبہ کے پہلے دو برسوں میں مکمل کیا جائے گا۔

پسماندہ یا منتشر آبادی کے پہاڑی اضلاع کے علاقوں میں قرضہ دینے کے لئے قرضہ یونینیں اور دوسرے کاموں کیلئے دیہی امداد باہمی انجمنیں قائم کی جائیں گی۔ منصوبہ کے پہلے دو برسوں کے دوران ۱۲۰ قرضہ یونینیں قائم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

ہر ایک بلاک میں ایسی انجمنوں کی جو بند ہو گئی ہیں یا پورے طور پر کام نہیں کر رہی ہیں تو تنظیم کی جائے گی تاکہ منصوبہ کی مدت کے آخر تک یہ انجمنیں وہ تمام سہولتیں فراہم کر سکیں جو خدمتی امداد باہمی انجمنیں مہیا کرتی ہیں۔

تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے آخر تک امداد باہمی انجمنوں کے ممبروں کی کل تعداد ۷۵ لاکھ ہو جانے کی امید ہے۔ ان ممبروں کو قرضے دینے کیلئے ۱۰۰ کروڑ روپیہ فراہم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے جس میں ۷۵ کروڑ روپیہ کے قلیل مدت، ۱۵ کروڑ روپیہ کے درمیانی مدت اور ۱۰ کروڑ روپیہ کے طویل مدت کے قرضے دیئے جائیں گے۔

● ● ●

حکومت اتر پردیش تیسرے منصوبہ کے تحت ریاست میں جنگلات کی ترقی پر ۳ کروڑ روپیہ اور مٹی کے تحفظ پر ۵۰ لاکھ روپیہ صرف کرنے کی تجویز رکھتی ہے۔

جنگلات کی ترقی کیلئے وضع کی گئی اسکیموں کی تفصیل یوں ہے:
(۱) اقتصادی اور صنعتی اہمیت کے درخت لگانے کی اسکیم۔ ایک کروڑ روپیہ (۲) جنگلات کے وسائل کا سروے ۵ لاکھ روپیہ۔ (۳) ورکنگ پلان اور ریسرچ۔ ۲ لاکھ روپیہ۔ (۴) پرانے جنگلات کی ترقی کی اسکیم۔ ۲ لاکھ روپیہ۔ (۵) عمارتی لکڑی کو محفوظ رکھنے کی اسکیم ۵ لاکھ روپیہ۔ (۶) جنگلات میں رسل و رسائل کی ترقی ۵۰ لاکھ روپیہ۔ (۷) جنگلات کا تحفظ ۵ لاکھ روپیہ۔ (۸) آگ سے تحفظ کی اسکیم۔ ۱۰ لاکھ روپیہ۔ (۹) جنگلی جانوروں کا تحفظ ۲۵ لاکھ روپیہ۔ (۱۰) عملہ کی تربیت ۲۰ لاکھ روپیہ اور جنگلات سے متعلق پیداوار اور عمارتوں کی تعمیر ۴۰ لاکھ روپیہ۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ پسماندہ علاقوں میں ترقیاتی اور پیداواری اسکیموں کو اولیت دی جائے۔

حکومت کو یہ بھی امید ہے کہ اتراکھنڈ کے پسماندہ اور دور دراز

علاقوں کے لئے خصوصی فنڈ حاصل ہو سکے گا۔

• • •

دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے ریاستی بورڈ کی نو تشکیل کی گئی ہے۔ اس کے چیرمین وزیر اعلیٰ ہوں گے جن کے پاس صنعت کا محکمہ بھی ہے۔ اس نئے بورڈ میں چیرمین کے علاوہ ایسے دو ممبران باعتبار عہدہ اور ۲۴ غیر سرکاری ممبران ہوں گے جو ریاست کی تقریباً تمام اہم اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

یہ بورڈ جس کی مدت ۲ سال ہو گی دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی تنظیم اور ترقی اور ان کی مصنوعات کو ملک اور بیرون ملک میں فروخت کرنے کے سلسلہ میں ریاستی حکومت کو اپنے مشورے پیش کرے گا۔ اس مقصد کے پیش نظر نو تشکیل بورڈ اسکیمیں شروع کرے گا اور ان کی جانچ اور نگرانی بھی کرے گا۔ اس کے علاوہ ان اسکیموں پر عمل درآمد کیلئے مالی امداد کی بھی سفارش کرے گا۔

یہ بورڈ نمائشوں اور دیگر ذرائع سے معیاری اور کوالٹی مارکڈ اشیا کے استعمال اور ان کی تیاری کی ہمت افزائی کرے گا اور ان کو مقبول بنائے گا۔ اس مقصد کیلئے پیداوار کے بہتر طریقوں کے مظاہرے بھی کئے جائیں گے۔

اس بورڈ کے ممبران بہ اعتبار عہدہ حسب ذیل ہیں۔

نائب وزیر صنعت۔ نائب وزیر منصوبہ بندی۔ سکریٹری محکمہ صنعت۔ سکریٹری محکمہ منصوبہ بندی۔ سکریٹری محکمہ مالیات۔ سکریٹری محکمہ بجلی۔ سکریٹری محکمہ گنا اور امداد باہمی۔ سکریٹری محکمہ زراعت۔ نگہداشت مویشیان اور جنگلات۔ سکریٹری محکمہ محنت۔ سکریٹری محکمہ غذا۔ ڈائرکٹر صنعت۔ ڈائرکٹر فروٹ یوٹیلائزیشن۔ کمشنر نگہداشت مویشیان۔ رجسٹرار کوآپریٹو۔ کمشنر شکر اور گنا۔ چیف انجینیر بجلی۔ ڈائرکٹر انچارج اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ کانپور۔ مینجنگ ڈائرکٹر اسمال انڈسٹریز کارپوریشن لمیٹڈ کانپور اور ایجنٹ اسٹیٹ بینک آف انڈیا۔ (لکھنؤ)

غیر سرکاری ممبران درج ذیل ہیں:

مسز شری دیوی منڈن دبھوا ایم۔ ایل۔ اے۔ اچاریہ دیپانکر ایم۔ ایل۔ اے۔ لال بہادر سنگھ ایم۔ ایل۔ اے۔ سکھی رام بھارتیہ ایم۔ ایل۔ اے۔ رام کمار شاستری ایم۔ ایل۔ سی۔ محمود علی خاں ایم۔ ایل۔ اے۔ نواب سنگھ یادو ایم۔ ایل۔ سی۔ عتیق الرحمٰن ایم۔ ایل۔ اے۔ جیپت رائے کپور ایم۔ پی (آگرہ)، روشن لال چترویدی ایم۔ پی۔ سریندر کمار علی گڑھ۔ آنند پرشاد اگروال وارانسی۔ راج ناتھ کنندا آگرہ۔ سی۔ ایم سکھیا آگرہ۔ عبدالحیٔ سلیجا کانپور۔ کے۔ پی بھارگو آگرہ۔ شمشیر سنگھ تالوجا کانپور۔ آنند پرکاش گوئل میرٹھ۔ دوارکا ناتھ مراد آباد۔ بیربھان ساہ فرخ آباد۔ کے۔ بھاٹیہ غازی آباد۔ جے پرکاش غازی آباد۔ بلراج آنند میرٹھ جی۔ پی نوٹیال چمولی گڑھوال۔ بیچن رام گپتا ایم۔ ایل۔ اے۔ بھدوہی۔ (وارانسی)۔ رام منوہر لکھنؤ۔ سیتارام ٹنڈن الہ آباد۔ پی۔ این گپتا آگرہ۔ ٹی۔ پی بھلا سابق ممبر پبلک سروس کمیشن لکھیم پور کھیری۔ آنند پرکاش سینجا کانپور۔ جی۔ ایس بیدی کانپور۔ پی پی اگروال وارانسی۔ پی۔ این کپور کانپور۔ عبدالرحمٰن مہتو مدن پورہ وارانسی۔ خلیفہ مقبول حسن مراد آباد۔ کیدار ناتھ وید مودی نگر میرٹھ۔ آفتاب حسین میرٹھ۔ این۔ ڈی اگروال الہ آباد۔ رائے پریم چندر وارانسی۔ حامد حسن خاں قنوج ضلع فرخ آباد۔ ہمنت کمار میرٹھ۔ اور رام چندر سر آگرہ۔

محکمہ صنعت کے سکریٹری بورڈ کے سکریٹری کا کام انجام دیں گے۔

• • •

گنے سے کھنڈساری کی کم ریکوری (حصول) کھنڈساری صنعت کی ترقی کی راہ میں بنیادی رکاوٹ تھی۔ ریاستی ادارہ منصوبہ بندی تحقیق اور عمل کی جانب سے گزشتہ چار برسوں کے دوران میں کئے گئے تجارتی تجربات کے نتیجہ میں یہ رکاوٹ دور ہو گئی ہے۔

کھنڈساری واحدوں میں پہلے گنے سے کھنڈساری کی ریکوری کا اوسط ۵ر۵ فیصدی تھا۔ لیکن چھ رولروں کی ایک بہتر قسم کی پیرائی یونٹ تیار کرنے سے یہ اوسط بڑھ کر ۵ر۷ فیصدی ہو گیا ہے۔ اس یونٹ کا ڈیزائن نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف شوگر ٹیکنالوجی کانپور کے اشتراک سے تیار کیا گیا ہے۔

اس نئی یونٹ سے جو فائدہ ہو رہا ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ کھنڈ ساری کی ریکوری میں صرف ۵ فیصدی اضافہ سے ایک من گنے کی پیرائی پر یونٹ کی آمدنی میں تین آنہ کا اضافہ ہوتا ہے۔ جو ۰۰۰ من یومیہ گنا پیرنے کی صلاحیت والے بہتر قسم کی کھنڈ ساری یونٹ کی صورت میں ۵۰۰ روپیہ یومیہ سے زائد ہوتا ہے۔ ادارہ مذکور کی جانب سے جو تجربات جاری ہیں ان کی بنیاد پر یہ امید کی جاتی ہے کہ آئندہ سال تک ریکوری کا ۶ فیصد بڑھ کر ۰ ہو جائے گا۔

اس یونٹ کا ڈیزائن مشین بنانے والوں کو دیدیا گیا ہے۔ تاکہ وہ اس کو تجارتی پیمانہ پر تیار کریں۔

کھنڈ ساری کی تیاری کے طریقہ میں مزید اصلاح کے لیے ایک نئے قسم کی بھٹی تیار کی گئی ہے جس میں گنے کا گیلا کھوجڑ ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا ڈیزائن بھی شوگر ٹیکنالوجی نے تیار کیا ہے۔

اس بھٹی میں گنے کا گیلا کھوجڑ براہ راست استعمال کیا جا سکتا ہے جس کو پہلے خشک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بھٹی کھلے کڑاہا کی شکر کی صنعت کیلئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ پرانے قسم کی بھٹی کے مقابلہ میں اس میں کفایت ہوتی ہے اور مسلسل کام ہوتا ہے۔

• • •

مہاتما گاندھی کے خطوط اور ان کی تحریروں و تقریروں کو یکجا کرنے کے ذیل میں حکومت ہند کی اسکیم کے تحت ریاستی حکومت نے اتر پردیش گاندھی ساہتیہ سانگری سنکلن سمیتی کی تشکیل کی ہے۔ اس سلسلہ میں ریاستی کمیٹی کا خاص مقصد ریاست کے عوام سے گاندھی جی کے لکھے ہوئے خطوط وغیرہ کو ان کی اصل یا نقل کی شکل میں حاصل کر کے حکومت ہند کے حوالے کر دینا ہوگا تاکہ انھیں گاندھی جی کی تخلیقات میں شامل کیا جا سکے جو ایک مکمل مجموعے کی شکل میں شائع کی جا رہی ہیں۔ اسکے علاوہ ریاستی کمیٹی ... [illegible]

کمیٹی کے صدر اتر پردیش کے وزیر تعلیم شری کملاپتی ترپاٹھی نے ریاست کے شہریوں سے اپیل کی ہے کہ وہ کمیٹی کے کاموں میں اشتراک و تعاون کریں۔

اپیل میں کہا گیا ہے کیوں کہ گاندھی جی نے ہماری قومی زندگی کے ہر دور کو متاثر کیا ہے اس لیے ریاست کے متعدد اشخاص کے پاس ان کے خطوط موجود ہوں گے۔ لہٰذا انھیں جمع کرنا ایک دشوار عمل ہے۔ ان خطوط کی اصل درکار ہے اور اگر خطوط کے مالکان ان کی اصل دینے پر رضامند نہ ہوں تو ان کی نقل لے لی جائے گی یا ان کی مرضی پر انھیں خطوط کا عکس دیدیا جائے گا۔ اور مسودے کی اصل یا تو بھیجنے والے کو واپس کر دی جائے گی یا نئی دہلی میں دستاویزوں کے قومی محافظ خانے یا لکھنؤ کے محافظ خانے میں محفوظ کر دیا جائے گا۔ یہ کام اس صورت میں اور بھی آسان ہو جائے گا اور پڑھنے والوں کی نظر میں ان خطوط کی معنوی اہمیت بھی بڑھ جائے گی اگر خطوط مہیا کرنے والے ان سے متعلق ضروری تفصیلات جیسے خط کی تاریخ کس ضمن میں لکھا گیا واقعات کی مختصر تفصیل خطوط میں دیے گئے اشخاص اور جگہوں سے متعلق ہلکی سی تشریح بھی لکھ کر بھیج دیں۔ اس کام کی افادیت صرف ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کیلئے بھی ہے لہٰذا اس عظیم کام کو زیادہ سے زیادہ اشتراک کی ضرورت ہے۔

ان خطوط کے علاوہ گاندھی جی سے متعلق دیگر اہم چیزیں بھی تحفظ کیلئے بھیجی جا سکتی ہیں کمیٹی نے گزارش کی ہے کہ جن افراد کے پاس گاندھی جی سے متعلق کوئی بھی اہم چیز ہو وہ ہندی سمیتی کے سکریٹری شری رام ناتھ سمن رائل ہوٹل بلڈنگ لکھنؤ سے رابطہ قائم کریں۔

• • •

گورکھپور کی تحصیل سے ۱۰ میل دور جگاؤں میں واقع تربیتی ادارہ میں گرام سیوکوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ ریاستی تربیتی پروگرام کی تکمیل میں گرام سیوک کو نمایاں مقام حاصل ہے ... [illegible]

گرام سیوکوں کی تربیت میں چرگاواں کے تربیتی اور توسیعی مرکز کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اس ادارہ کا قیام جنوری ۱۹۵۲ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس ادارہ میں ۵ اجنوری ۱۹۵۳ء کو گنے پرانتیہ رکھشک دل، زراعت اور پنچایت کے محکموں سے ۴۰ گرام سیوکوں کی پہلی جماعت کا چھ ماہ کے کورس میں داخلہ ہوا۔ بعد ازاں گروپ لیول ورکروں کی ایک جماعت کا داخلہ ہوا۔ اور اس مرکز کی تربیت کی افادیت کے پیش نظر تربیت پانے والوں کی تعداد بہت جلد بڑھ کر ۴۰۸ ہو گئی۔

۱۹۵۸ء میں منعقدہ ڈولپمنٹ کمشنروں کی کل ہند کانفرنس کی سفارش کے مطابق اس مرکز میں چھ ماہ کے کورس کی جگہ دو سالہ مربوط کورس شروع کیا گیا۔ اس مرکز میں یکم جولائی ۱۹۵۹ء سے ۱۵۱ افراد کا ایک گروپ تربیت حاصل کر رہا ہے۔ ایک قومی توسیعی سروس بلاک اس مرکز سے ملحق ہے تاکہ تربیت پانے والے گرام سیوک کے فرائض کے بارے میں عملی تجربہ حاصل کر سکیں۔

اس مرکز میں صبح کے وقت تربیت پانے والے جسمانی ورزش میں حصہ لیتے ہیں۔ بعد ازاں کاذ گاہوں اور فارم اور باغ کے شعبوں میں عملی کلاسیں شروع ہوتے ہیں۔ تربیت پانے والوں کی معلومات میں اضافہ کیلئے پابندی کے ساتھ اجتماعی بحث و مباحثہ اور لکچروں کا انتظام کیا جاتا ہے۔

تربیت کی تکمیل کے بعد گرام سیوک اپنے اپنے علاقوں میں چلے جاتے ہیں جہاں وہ کسانوں کی اقتصادی حالت بہتر بنانے میں پورے جوش و خروش سے کام کرتے ہیں۔

• • •

ریاستی حکومت کی جانب سے سال رواں کے دوران میں درمیانی طبقہ کے افراد کے لئے تعمیر مکانات کی اسکیم کے لئے ۵۰ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔

اس اسکیم کے تحت جو ریاست میں ۱۹۵۸-۵۹ء میں شروع کی گئی تھی ایسے افراد کو جن کی سالانہ آمدنی ۶ ہزار روپیہ سے زیادہ لیکن ۱۲ ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں ہے اور جن کے پاس اپنا ذاتی مکان نہیں ہے۔ مکان کی تعمیر کے لئے ساڑھے پانچ سے لے کر ۶ فی صدی تک سالانہ سود پر ۲۰ ہزار روپیہ تک کے طویل مدت کے قرضے دیئے جاتے ہیں۔ غیر معمولی معاملوں میں ریاستی حکومت اس شرط کو نرم کر سکتی ہے۔

اسکیم کے تحت وضع کئے گئے قواعد کے تحت امیدواروں کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ مکان کی تعمیر کی تخمینی لاگت کی جس میں زمین کی مالیت شامل ہے، کم سے کم ۲۰ فی صدی رقم خود لگانے کی پوزیشن میں ہو اور تسلی بخش ضمانت دے سکیں۔ قواعد کے مطابق مجوزہ مکان کا رقبہ عام طور پر ۷۰۰ مربع فیٹ سے کم نہیں ہونا چاہیئے۔

ریاستی حکومت کی جانب سے مجوزہ مکان کا نقشہ، ڈیزائن اور تخمینہ کی جانچ اور منظوری کے بعد قرضے منظور کئے جائیں گے۔

اسکیم کے تحت قرضے مع اصل و سود ۲۵ سالانہ مساوی قسطوں میں ادا کرنا ہوں گے۔ امیدوار کو قرضہ کی آخری قسط کی ادائیگی سے ایک سال بعد قرضہ کی پہلی قسط واجب الادا ہو گی۔ لیکن قرضہ لینے والے اگر چاہیں تو قرضہ اس سے کم مدت میں بھی ادا کر سکتے ہیں۔

ریاستی حکومت کی جانب سے ۱۹۵۸-۵۹ء میں اس اسکیم کے لئے ۲۷ لاکھ روپیہ اور اس کے بعد کے سال میں ۴۳ لاکھ روپیہ منظور کیا تھا۔ گزشتہ مالی سال کے آخر تک صرف ۲۶ اشخاص نے اس اسکیم سے فائدہ اٹھایا۔ انہیں ۴۲۷۰۰۰ روپیہ کے قرضے دئے گئے۔

متفرقات

سیونگز بینک کے قواعد میں ترمیم۔ حکومت ہند نے ڈاکخانہ کے سیونگز بینک کے قواعد میں کچھ ترمیم کر دی ہے جس کے نتیجہ میں ڈاکخانوں میں فوجیوں کے اور مشترکہ کھاتوں سے روپیہ نکالنے پر موجودہ پابندیاں ختم کر دی گئی ہیں۔

اس نئی سہولت کے مطابق ڈاکخانہ کے حکام کو پہلے سے نوٹس دیئے بغیر مذکورہ کھاتوں سے جتنی بھی رقم چاہیں نکال سکتے ہیں۔

[illegible] خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو۔

مقبرۂ یدان محل

(بسلسلہ صفحہ ۱۲)

معزالدین خاں، شیخ صدرالدین محمد خاں، شیخ مجدالدین احمد خاں وغیرہ وغیرہ دست بستہ حاضر ہوئے اور مجبوراً سر تسلیم خم کیا۔ بعد گفتگوئے معاملات وانفصالِ مقدمات نواب نے فرمایا کہ ہمارے رہنے کو قلعہ خالی کر دو۔ شیوخ نے مہلت مانگی کہ ہمارے لڑکے چیچک میں مبتلا ہیں غسل صحت تک تعمیل ارشاد سے معاف رکھا جائے، نواب نے منظور کر لیا۔ ہفتہ عشرہ کے بعد شیوخ حسبِ عدہ اپنا مال واسباب ڈھو لے گئے اور جو کچھ باقی رہ گیا وہ نصیبِ غازیان ہو گیا۔ نواب داخل قلعہ ہو گئے اور اُسے "دارالامارت" قرار دیا۔ بعدہٗ اس فتح وفیروزی کی یادگار میں پھاٹک کے سامنے اپنی فرودگاہ کے مقام پر چھ سات ہزار روپے کے صرف سے ایک نقار خانہ تعمیر کرایا جو ۱۸۵۷ء تک قائم تھا۔

قلعہ مچھی بھون پر قبضہ کرنے کے باوجود نواب پانچسو ساٹھ روپیہ ماہوار شیوخ کو بطور کرایہ ادا کرتے رہے۔ نواب برہان الملک کے بعد اُن کے جانشین نواب صفدر جنگ بھی پانچسو روپیہ ماہوار کرایہ دیتے رہے مگر نواب شجاع الدولہ کے دورِ فرماں روائی میں صرف دو سو رہ گئے۔ وجہ یہ تھی کہ جب صفدر جنگ کو شکست دینے کے بعد نواب احمد خاں والی فرخ آباد کی سپاہ نے لکھنؤ پر قبضہ جمایا تو شیخ معزالدین خاں نے تمام شیخ زادوں کو جمع کر کے پٹھانوں کو وہاں سے نکال دیا اور صفدر جنگ کی حکومت بحال کر دی۔ اس کے بعد سے انھوں نے نواب کے دربار میں بھی جانا چھوڑ دیا۔ آخر نواب شجاع الدولہ کے بیٹے نواب آصف الدولہ نے شیخ زادوں کی کل عمارات خود لے لیں اور ان کے معاوضے میں محلہ و دگانواں متصل پل کا پنج ورثاء شیخ عبدالرحیم کو دے کر کرایہ دینا بالکل موقوف کر دیا۔ اس کے بعد یہ حکم بھی نافذ کر دیا کہ چوری چکاری کا انتظام شیخ زادے کریں کیونکہ بحیثیت زمیں دار حق زمیں داری لیتے ہیں مگر شیوخ نے یہ شرط قبول نہ کی۔ اس وقت سے محصول فروخت مکانات داخل سرکار نواب ہونے لگا۔

شیخ زادے برائے نام زمیں دار رہے۔ اس وقت بھی دوگانواں میں کئی فرقوں کی مخلوط آبادی ہے اور مکانات بھی کثرت سے تعمیر ہو گئے ہیں مگر شیخ زادوں سے قرابت رکھنے والوں میں صرف ایک صاحب یہاں باقی رہ گئے ہیں۔

بن باسی تھارو

(بسلسلہ صفحہ ۲۵)

اثرات سے ان کو محفوظ رکھتا ہے۔ بھرا دوا علاج بھی کرتا ہے۔ تھارو عام طور پر قرب وجوار کے کسی دولت مند مسلمان کو اپنا ساہوکار چن لیتے ہیں۔ وہی اُن کے گاؤں کا بنک ہوتا ہے اور اُسی کے ذریعے انھیں "کچھی" ہاتھ آتی ہے۔

تھارو ہولی بڑے جوش وخروش سے مناتے ہیں سسرال سے لڑکیاں اپنے میکے میں آجاتی ہیں۔ مقررہ وقت پر ہولی جلائی جاتی ہے اور پھر عورتیں اور مرد ہولی کی راکھ کے چاروں طرف ناچتے ہیں۔ ناچ ختم ہونے پر مرد آمنے سامنے کھڑے ہو کر ایک دوسرے کے پیر چھوتے ہیں اور "جے رام بھیا، جے رام" کہتے ہیں۔ عورتیں ایک دوسری کے سامنے کھڑے ہو کر تین بار ایک دوسرے کے کندھوں کی طرف قدرے جھکتی ہیں گویا گلے مل رہی ہیں۔ اس کے بعد شراب کا دور چلتا ہے اور ہولی کی راکھ کے چاروں طرف عورتیں اور مرد ناچتے ہیں۔ دوسرے دن سے گاؤں کے اندر ہر گھر کے سامنے روزانہ ہولی کا اجتماعی ناچ ہوتا ہے۔ یہ پروگرام پندرہ دن تک چلتا ہے۔ جس گھر کے دروازے پر ناچ ہوتا ہے اُس گھر کے مالک کو ناچنے والوں کو دعوت دینا پڑتی ہے۔ ان پندرہ دنوں میں گاؤں کی نوعمر لڑکیاں ہولی کے سلسلے میں لوگوں سے "پھگوا" مانگتی ہیں اور جو رقم اس طرح ملتی ہے اس سے شراب اور بیڑی پیتی ہیں۔

تھارو اور دوسری جاتیوں کے لوگوں کو بھی اپنے خاندان میں شامل کر لیتے ہیں اور اس کو "میت بنانے" کی رسم کہتے ہیں۔ جس تھارو خاندان کا "میت" بنا ہو اُسے بیس آنے پیسے اور گڑ دے کر اور اُس سے بیس آنے پیسے اور گڑ لے کر اور سارے گاؤں کو شراب پلا کر "میت" یا اس خاندان کا رکن بنایا جاتا ہے۔

نقد و تبصرہ

جذباتِ مشرق از سردار دیوان سنگھ مفتون۔ قیمت بارہ روپے صفحات ۵۳۶۔
ملنے کا پتہ۔ سردار دیوان سنگھ مفتون۔ ایڈیٹر ریاست۔ دہلی

سردار دیوان سنگھ مفتون اردو کے مشہور و معروف صحافی ہیں۔ اُردو کے ہفتہ وار ریاست کے مدیر کی حیثیت سے دُنیائے صحافت میں اُنھیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اخبار ریاست میں وہ جذباتِ مشرق کے عنوان سے دو کالموں میں ہندی اور بعض دوسری زبانوں کے منتخب اشعار مع اُردو ترجمے کے برابر شایع کرتے رہتے تھے۔ اب اسی چیز کو اُنھوں نے کتابی صورت میں شایع کر دیا ہے۔ سردار دیوان سنگھ کے دیباچے کے بعد پروفیسر سید احتشام حسین، جناب شورش کاشمیری، مولانا عبدالمجید سالک مرحوم، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، جناب نیاز فتح پوری، مولانا اجمل خاں، کنور مہیندر سنگھ بیدی، جناب علی جواد زیدی، ڈاکٹر محمد حسن، جناب کرشن چندر، جناب گوپی ناتھ امن، جناب منشی غلام محمد وغیرہ کے تبصرے ہیں۔ بعد میں زیادہ تر ہندی اور اُن کے علاوہ فارسی، عربی، پنجابی وغیرہ زبانوں کے کچھ منتخب اشعار، مشکل الفاظ کے معنی اور ان کے نیچے شعر کی تشریح اُردو میں ہے۔ اشعار کا انتخاب سردار دیوان سنگھ کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرتا ہے اور جو شعر بھی ہے وہ اپنی جگہ جذباتِ مشرق کا سچا ترجمان معلوم ہوتا ہے۔ ترجمہ یا تشریح بہت واضح اور سلیس ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

نوائے حیات یہ جناب یحییٰ اعظمی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جس کا دوسرا ایڈیشن اضافہ و ترمیم کے ساتھ دارالمصنفین اعظم گڑھ نے شایع کیا ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۴۲ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے چھاپا تھا۔ قیمت مجلد چار روپے، غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ دارالمصنفین شبلی، اعظم گڑھ۔ کتابت طباعت ستھری

یحییٰ اعظمی کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کے بارے میں جو رائے ظاہر کی تھی اس کا ملخص یہ ہے کہ یحییٰ اعظمی صاحب صرف شاعری نہیں کرتے بلکہ شاعر ہیں۔ مولانا کی یہ پیشین گوئی بھی صحیح ثابت ہوئی ہے کہ "اُن کا کلام عام طور پر مقبول ہوگا"۔ یحییٰ اعظمی صاحب کی شاعری اکتسابی نہیں فطری ہے اور اُن کے کلام میں مضمون کی بلندی، محاکات، تشبیہ و استعارات کی ندرت، شدتِ جذبات اور جوشِ بیان بھی کچھ پایا جاتا ہے۔

گاتا جائے بنجارا ساحر لدھیانوی کی فلمی گیتوں کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ۔ ٹائٹل دیدہ زیب۔ ناشر ستار پبلیکیشنز ۲۷۹۱۔ دریا گنج دہلی ۶۔ طابع ہیری آرٹ پریس، دہلی۔ سول ایجنٹس، پنجابی پستک بھنڈار دریبہ کلاں، دہلی۔

ستار پاکٹ بکس نے ملکی اور غیر ملکی فن کاروں کی تخلیقات اور شاہکاروں کو برائے نام قیمت پر شایع کرنے کا انتظام کیا ہے جو یقیناً قابلِ مبارک باد ہے۔ عرصے سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی ادارہ یا پبلشنگ ہاؤس اردو کے ناولوں، افسانوں کے مجموعوں، قدیم و جدید شعرا کے دواوین کو کم قیمت پر شایع کرنے اور اس طرح اُنھیں عوام تک پہنچانے کے لیے آگے بڑھے۔ موجودہ زمانے میں کاغذ کی کم یابی اور طباعت کی مشکلات اور گرانی نے اس ضرورت کو اور بھی شدید کر دیا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ ستار پاکٹ بکس نے اس دیرینہ ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قدم اُٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں ایک قابلِ لحاظ بات یہ ضرور ہے کہ ٹائٹل کور کی طرح اگر کتابت اور طباعت پر بھی توجہ کی جائے تو بہت جلد یہ سلسلہ مقبولِ عام بن جائے۔

جہاں تک ساحر لدھیانوی کا تعلق ہے اُن کی ذات دُنیائے شاعری میں محتاجِ تعارف نہیں۔ فلمی دُنیا میں رہنے کی وجہ سے وہ گیت بھی لکھتے ہیں مگر ان گیتوں میں اُنھوں نے نہ صرف اپنی شاعرانہ عظمتوں کو برقرار رکھا ہے بلکہ ان کے ذریعے انھوں نے اُردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔

گاتا جائے بنجارا ستار پاکٹ بکس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اس سلسلے کی دوسری کڑیاں ہیں راہ گزر یاد آیا، دیدۂ تر، تین چکے اور تنکے کا سہارا۔

راہ گزر یاد آیا اور **دیدۂ تر** یہ دونوں مطبوعات بالترتیب دت بھارتی اور عادل رشید کے ناول ہیں۔ یہ دونوں جانے پہچانے لکھنے والے ہیں۔ ان ناولوں کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری فلمی دنیا کس قسم کی دُنیا ہے۔

تین چکے۔ یہ گلشن نندہ کا ناول ہے۔ گلشن نندہ صرف اُردو ہی میں نہیں لکھتے بلکہ ہندی میں بھی لکھتے ہیں۔ اُن کے رومانی اور غیر رومانی دونوں طرح کے ناول یکساں طور پر کامیاب رہتے ہیں۔

تنکے کا سہارا مصنفہ کرپا شنکر بھاردواج۔ بھاردواج کا یہ ناول اُن کے مطالعہ و نظر کی گہرائی اور ان کی فنی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ نفسیات کے تجزیے اور جذبات کی عکاسی پر اُنھیں عبور حاصل ہے۔ زیرِ نظر ناول میں بھاردواج کی یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔

رنگ برنگ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$، ناشر مرکزِ ادب، مدراس۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ تاج بک ڈپو، مسجد بڑی سیٹ، مدراس نمبر ۳۔ کتابت طباعت ستھری۔ گرد پوش دل کش۔

مرکزِ ادب نے ریاست مدراس کے موجودہ نمائندہ شعرا کی غزلوں کا انتخاب رنگ برنگ کے نام سے شایع کیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس میں ہر مدرسۂ فکر اور ہر دبستاں کی نمائندگی ہو جائے۔ اس مرکز کی تشکیل جنوری ۱۹۵۹ء میں اس مقصد سے عمل میں آئی ہے کہ ریاستِ مدراس یعنی تامل ناڈ کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو ضایع ہونے سے محفوظ رکھا جائے۔ یہ مجموعہ اسی مقصد کی جانب پہلا قدم ہے۔ ابتدا میں ان شاعروں کا جن کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا جھلکیوں کے عنوان سے مختصر تعارف بھی دے دیا گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ان شاعروں کا سنِ پیدائش بھی درج کر دیا جاتا۔

گلی گلی رام لعل کے تازہ افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت چار روپے۔ پنچ پبلشرز۔ سروری منزل۔ امین آباد۔ لکھنؤ۔

رام لعل اب اردو ادب کے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں شامل ہو چکے ہیں۔ اُن کے افسانے زندگی کے صحیح عکاس اور ماحول کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

زیرِ نظر مجموعے میں دام لعل کی تمام خصوصیات نمایاں ہیں۔

ذہن اور انقلاب — حسن شہیر کی نظریاتی تنقیدوں کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ۔ کتابستان۔ الہ آباد۔

حسن شہیر اُردو کے اچھے لکھنے والوں میں اپنی ایک خاص جگہ بناتے جا رہے ہیں ان کی تحریروں اور تنقیدوں میں زندگی کے بنیادی مقصد اور ادب و زندگی کے باہمی رشتے کو واضح کرنے کا جذبہ نمایاں رہتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں بھی انھوں نے اپنے بقول "انسان کے ذہن اور اس کے سماجی رشتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے" اور اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ دوسروں کو بھی دعوتِ فکر دیتا ہے۔ مجموعۂ مضامین میں بعض کے عنوانات یہ ہیں۔ — خیال و معنی، احساس و شعور، خیالات کی میکانکی تشکیل، خارجی اور داخلی اعمال، ذہن اور انقلاب، انقلاب و ادب وغیرہ۔

دیہاتی معالج — حصۂ اول حصۂ دوم — قیمت حصۂ اول تین روپے، حصۂ دوم ڈھائی روپے۔ ملنے کا پتہ ہمدرد (وقف) لیبوریٹریز۔ دہلی

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی نہ صرف اپنی دواؤں اور دواخانوں سے بلکہ اپنے لٹریچر سے بھی خواص و عوام کی خدمت کر رہا ہے دیہاتی معالج حصۂ اول و حصۂ دوم اسی سلسلے کی قابلِ قدر کڑیاں ہیں یہ کتابیں اُردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی شایع کی گئی ہیں پہلے حصّے میں حفظانِ صحت کے عام اصول بیان کیے گئے ہیں اور پانی، غذا، نیند، لباس، حمل، زچہ بچہ کے سلسلے میں معلومات کار آمد معلومات بہم پہنچانے کے علاوہ دیہات میں پائی جانے والی ۱۶۶ جڑی بوٹیوں، ان کے خواص اور ترکیبِ استعمال کا ذکر ہے۔ دوسرے حصّے میں سر، آنکھ، کان، جگر، پھیپھڑوں، مردانہ اور زنانہ امراض، جلدی امراض وغیرہ کے بارے میں معلومات ہیں اور ان کا ایسا علاج بتایا گیا ہے جو موثر اور مفید بھی ہے اور دیہات میں بآسانی ہو سکتا ہے دونوں حصوں میں متعدد ڈائیگرام اور تصویریں بھی ہیں۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔ ہر حصّے میں تقریباً ۲۳۰ صفحات ہیں۔ اپنی افادیت کے لحاظ سے دونوں کتابیں اس قابل ہیں کہ شہر اور دیہات دونوں جگہ کے رہنے والے اپنے پاس رکھیں

نبضِ حیات — شفا گوالیاری کی غزلوں اور رباعیات کا مجموعہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ: (۱) مکتبۂ افکار، بھوپال۔ (۲) مکتبۂ کردار، بھوپال اور (۳) روزانہ ندیم بھوپال۔

شفا گوالیاری کا شمار خوش فکر شعرا میں ہے۔ نبضِ حیات کی غزلوں اور رباعیوں کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ زمانے کے واردات نے انھیں جس قدر متاثر کیا ہے اُسے انھوں نے بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔

اُردو ادب اور جمود — آفتاب اختر کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ قیمت دو روپے چار آنے۔ ملنے کے پتے: دانش محل امین الدولہ پارک، لکھنؤ (۲) ادارۂ فروغِ اردو، امین الدولہ پارک، لکھنؤ اور (۳) مکتبۂ فکر و ادب، ۸۵۔ وزیر گنج، لکھنؤ۔

آفتاب اختر کے مضامین پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ایک اچھے اور سنجیدہ تنقید نگار کی تمام صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں انھوں نے جس انداز میں تنقید کی ہے وہ اُن کے ناقدانہ شعور اور ذوقِ سلیم کی نشاندہی کرتی ہے۔

ویران بہاریں — ستیش بترا کے افسانوں کا مجموعہ۔ ملنے کا پتہ: پنچ پبلشرز، سروری منزل، امین آباد۔ قیمت تین روپے۔

ستیش بترا کے ۱۲ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اُردو افسانہ نگاروں میں ستیش بترا اپنی جگہ بناتے جا رہے ہیں اور یہ افسانے اس امر کا ثبوت ہیں کہ اُن کا مستقبل بڑا اُمید افزا ہے۔

اندازہ — از گوبند رام انداز۔ ناشر — یونی ورسل پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، لکھنؤ

غالب نے اپنے بارے میں کہا تھا کہ "غالب کا ہے انداز بیاں اور" ذوق نے بھی میر کے انداز کے متعلق کہا تھا "نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب" لیکن حقیقت میں اگر کسی شاعر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا انداز بیان کسی اور کو نصیب نہ ہوگا تو وہ اندازہ کے مصنف گوبند رام انداز ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے اشعار سے اُردو شاعری کے لیے نئی راہیں کھول دی ہیں — ایسی نئی راہیں جن پر چلنا ہر کسی کے بس کی تو بات نہیں۔ گوبند رام انداز ایک معنی میں غالب سے بھی خوش قسمت ہیں غالب کو یہ کہنا پڑا تھا کہ "شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن" مگر انداز کی شاعری کا شہرہ اُن کی زندگی ہی میں پھیل چکا ہے۔ غالب کو اُن کے مرنے کے بعد جتنا نصیب ہوئے۔ انداز کا اندازہ ان کی زندگی ہی میں کارڈ بورڈ کے رنگین سرورق اور آفسیٹ کاغذ پر لاک کی چھپائی اور رنگین نقوش کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جہاں تک انداز کی بلند پروازی، جدتِ ادا اور "نازک خیالیوں" کا تعلق ہے، ہر مصرع پکار پکار کر یہ کہہ رہا ہے کہ ع

"ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود" انداز ہر قسم کے بندھنوں سے آزاد رہنا چاہتے ہیں اور ان کا نعرہ ہے ع طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم۔ چنانچہ اُن کی ہر نظم اور اُن کی غزل کا ہر مصرع ان کے جدت پسند ہونے کا ثبوت دیتا ہے پہلی نظم کا پہلا بند ملاحظہ ہو

> اوائے زندگی کا اک نقش ہوں | تری سایہ داری کا اک عکس ہوں
>
> اور زمانے میں ترا اک شخص ہوں۔

ایک غزل کے دو شعر بھی پیش ہیں۔ پڑھیے اور لطف اُٹھائیے ؎

> آج آبرُوئے زندگی کو فسانہ بنائے بیٹھا ہوں | یادگار کو خود اپنی دیوانہ بنائے بیٹھا ہوں
>
> وقت تھا جب حلوں کو طے کیا کرتا تھا | اب عموں کا آبشاروں میں لیے بیٹھا ہوں

اور یہ وہ معمے ہیں جن کا حل انداز ہی کا ذہنِ رسا ڈھونڈ سکتا ہے۔ کتاب پر قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً جناب انداز اپنے کلام کے شائقین کو اسے تحفۃً پیش کرتے ہوں گے۔

فکر و نظر — مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا سہ ماہی رسالہ۔ مدیر ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ قیمت سالانہ ۴ روپے۔ رسالے کے اجرا کے متعلق مدیر کی طرف سے یہ بتایا گیا ہے ... "یہ خواہش ہوئی کہ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اردو میں ایک ایسا سہ ماہی علمی اور ادبی رسالہ شایع ہو جس میں یہاں کے اساتذہ اپنے خیالات پیش کر سکیں۔ اور ان کے علاوہ دوسرے اہلِ قلم کو بھی دعوت دی جائے..." ظاہر ہے کہ جس رسالے کو ایسے حضرات کا تعاون حاصل ہوگا اس کے معیاری ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ زیرِ نظر نمبر میں ڈاکٹر عابد حسین، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر نذیر احمد، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، اور خلیق احمد نظامی کی تخلیقات شامل ہیں اور اسی سے رسالے کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملنے کا پتہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جلد ۱۵ نمبر ۶

بھادوں ۱۸۸۲

ستمبر ۱۹۶۰ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر

صباح الدین عمر

پبلشر

بھگوتی شرن سنگھ

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر

ایم۔ جی۔ شوم

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

پندرہ اگست ۱۹۶۰ء سے ہماری آزادی نے یہ چودھویں سال میں قدم رکھا ہے۔ جب ہم پیچھے مڑ کر اتر پردیش میں آزادی کے تیرھویں سال پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں مسرت ہوتی ہے کہ ہمارا کارواں راہ کی دشواریوں کے باوجود اپنی منزل کی طرف تیز گامی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ ہماری محض خوش فہمی نہیں بلکہ واقعات اس کا ثبوت دیتے ہیں اور اعداد و شمار اس کی گواہی۔ یہ پیش قدمی کسی ایک شعبے میں نہیں ہوئی ہے بلکہ ہر میدان ہمارا جولاں گاہ بنا ہوا ہے اور شہر اور دیہات دونوں میں حیات نو کی کرنیں کھیل رہی ہیں۔ دیہات میں چھوٹی بچت تحریک کی کامیابی، شرمدان کے ذریعے متعدد ترقیاتی کاموں کی تکمیل، وسیع ربیع و خریف مہم میں شرکت، تعاون، دس ہزار حد حتی امداد باہمی انجمنوں کی تشکیل، ثبوت ہے اس بات کا کہ ہمارے عوام میں ایک نیا جوش عمل پیدا ہو گیا ہے۔ یہ ایک فال نیک ہے ہمارے مستقبل کے لیے کیونکہ جب عمل کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور کام کرنے کی لگن دل میں سما جاتی ہے تو انسان پہاڑ سے جوئے شیر لا سکتا ہے، زمین کے سینے کو چیر کر اس سے سونا اگلوا سکتا ہے اور سمندروں میں غوطہ لگا کر موتی نکال سکتا ہے۔ زرعی پیداوار میں اضافے کی بھی ہر ممکن کوشش ہو رہی ہے اور اس سلسلے میں ایک اہم قدم پھول باغ میں ایک زرعی یونیورسٹی کا افتتاح ہے۔ عن قریب پہاڑی علاقوں اور شہروں میں زمینداری کا خاتمہ ہو جائے گا اور یو۔ پی خاتمۂ زمینداری و اصلاح اراضی ایکٹ ۱۹۵۰ء منظور کر کے اصلاح اراضی کا جو منصوبہ بنایا گیا تھا وہ اس کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ اس سال جوتوں کی حد بندی کے بل کو بھی آخری شکل دے دی گئی ہے اور چکبندی کا کام بھی بدستور رہا۔ سیلاب کی روک تھام کے بھی معقول انتظامات کیے گئے اور پانی کی نکاسی کا الگ بندوبست کیا گیا۔ لیکن کوئی ملک اس وقت تک پوری طرح ترقی نہیں کر سکتا جب تک صنعتی نقطۂ نگاہ سے بھی وہ کافی مستحکم نہ ہو۔ اس حقیقت کو محسوس کر کے حکومت اتر پردیش زراعت کے ساتھ ساتھ ریاست کی صنعتی ترقی کی بھی کوشاں رہی۔ ریہاند باندھ جس سے ایک طرف آب پاشی کی سہولتیں میسر ہوں گی اور دوسری طرف کارخانوں کے استعمال کے لیے کافی بجلی فراہم ہو سکے گی تکمیل کے قریب ہے۔ آزادی کے تیرھویں سال ریہاند اور رام نگر میں المونیم اور سوڈا ایش فیکٹریاں قائم ہوئیں۔ گورکھپور ماجوئن میں ایک فرٹیلائزر فیکٹری اور رشی کیش میں ایک اینٹی بائیوٹکس فیکٹری قائم کرنے کی الگ تجویز ہے۔ اس طرح اتر پردیش جلد ہی صنعتی حیثیت سے بھی ملک میں ممتاز ہو جائے گا۔ آزادی کے تیرھویں سال شمالی سرحد کی طرف سے ہم کو کچھ خطرات لاحق ہو گئے۔ حکومت اتر پردیش نے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے بلکہ اسے دور کرنے کے فوراً مؤثر اقدامات کیے اور نینی تال، الموڑہ، گڑھوال اور ٹہری کے اضلاع سے کچھ علاقے علیحدہ کر کے تین نئے ضلعوں کی تشکیل کی گئی اور ان کا ایک نیا ڈویژن 'اتراکھنڈ ڈویژن' بنا دیا گیا۔ یہ ڈویژن براہ راست چیف سکریٹری کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ ان علاقوں کی ترقی کے لیے بھی خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ سرحد کے ہر پہلو پر دفاع اور حفاظت کے خیال سے پی اے سی کے سپاہی اور پولیس وائرلیس یونٹوں کی بھی تعیناتی کر دی گئی ہے۔ جہاں تک دوسرے شعبوں کا تعلق ہے ریاستی بجلی بورڈ کے پاس جتنے ڈیزل پلانٹ تھے ان سب پر کام شروع کر دیا گیا اور مزید آٹھ ڈیزل پلانٹوں کے لیے آرڈر دے دیا گیا۔ سگرولی ضلع مرزاپور میں ساڑھے چار لاکھ کا ایک تھرمل پلانٹ لگانے کے ابتدائی انتظامات مکمل کیے گئے۔ گھریلو صنعتوں کی ترقی کے لیے مشرقی اضلاع کے ۲۵ قصبوں میں بجلی فراہم کرنے کا قطعی طور سے فیصلہ کیا گیا۔ رسل و رسائل کی آسانیاں بہم پہنچانے کے لیے پانچ سو میل سے زیادہ لمبی نئی پختہ سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ گڑھ مکتیشور میں گنگا پر، اجودھیا میں سرجو پر، بریلی کے قریب رام گنگا پر اور متھرا میں جمنا پر بڑے پل بنانے کا جو منصوبہ تھا اس پر کام ہوتا رہا۔ مزدوروں، پس ماندہ طبقوں اور مندرجہ فہرست اقوام کی فلاح و بہبود کے اقدامات بدستور جاری رہے۔ ملازمتوں میں مندرجہ فہرست اقوام کی ناکافی نمائندگی کے اسباب کی جانچ کرنے کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر کیا گیا۔ کانپور، آگرہ، وارانسی، الہ آباد اور لکھنؤ میں کارپوریشن قائم ہوئے۔ گاؤں اور بلاک سطح پر لامرکزیت لانے کے لیے ضلع پریشد بل دوبارہ تیار کیا جا رہا ہے۔ اسی سال یہ بھی طے کیا گیا کہ پہاڑی اضلاع کے علاوہ ہر ضلع میں گاؤں پنچایتیں مقامی کام کریں۔ تیسرے منصوبے میں لازمی ابتدائی تعلیم رائج کرنے کی تجویز ہے۔ اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لیے تربیت یافتہ استادوں کی بہت ضرورت پڑے گی، اس لیے آزادی کے تیرھویں سال ۴۰ نئے نارمل اسکول کھولے گئے۔ عدالتوں میں بقایا مقدمات کو ختم کرنے اور فیصلوں میں جو تاخیر ہوتی ہے اسے دور کرنے کے سلسلے میں مناسب کارروائی کی گئی۔ پولیس فورس کو نئے تقاضوں کے مطابق لانے کے لیے ایک پولیس کمیشن مقرر کیا گیا۔ سرکاری ملازموں اور لوکل باڈیز کے ملازموں کے گرانی بھتے میں اضافے کا اعلان کیا گیا۔ اردھ کمبھ کے میلے میں جہاں چالیس لاکھ یاتریوں کا اجتماع ہوا تھا ایسا معقول انتظام کیا گیا کہ اس میں ایک آدمی بھی زخمی نہ ہونے پایا۔

اتر پردیش میں آزادی کے تیرھویں سال جو نمایاں کام کیے گئے ان کی ایک جھلک ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اور تفصیل نیا دور کی اسی اشاعت میں آگے پیش کی جا رہی ہے۔ اسے دیکھنے سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ ایک سوشلسٹ طرز کا سماج بنانے کے لیے ہمارا جو مطمح نظر ہے اس میں ہمیں کس حد تک کامیابی ہو رہی ہے۔ . . . ([illegible])

آل احمد سرورؔ

لالہ و گل کے سایہ میں تم نے دھوم مچائی جشن منائے
ویرانوں میں ہم نے کیا کیا اپنے لہو سے پھول کھلائے

اپنی نظر میں اب بھی لئے ہیں خوابوں کا آئینہ خانہ
یہ میلی، مٹیالی دنیا آئے ہم سے آنکھ ملائے

سایہ سایہ چلنے والے، دن کی دھوپ کو جھیلیں کیسے
شوق کی رکھیں لاج کہاں سے جو شعلوں سے کھیل نہ پائے

کیسی ہے تصویر تمنا، جب بھی ادھوری اب بھی ادھوری
بیتابی نے دل کی لاکھوں نقش بنائے نقش مٹائے

خواب مرا تعبیر کسی کی یہ اندھیر نہ دیکھا ہوگا
اک چنگاری سے یاروں نے کتنے راکھ کے ڈھیر بنائے

ان کی اداؤں کے جادو کو دنیا والے بھول ہی جاتے
کیسے چاؤ سے اپنے دل میں ہم نے سارے رنگ بسائے

اپنی نظر کی مستی سب کچھ ساقی کا انعام فسانہ
جو سرشار تھے چھک کر نکلے پیاسے لیکن پیاسے آئے

شمع کی لَو ہے مدھم اب تک شعلۂ شوق کہاں سے آتا
پروانوں کے بدلے ہم نے دیکھے چلتے پھرنے سائے

★

شاد کی غزل گوئی

احمد ادرسوی

اردو غزل نگاروں کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ ہمارے بڑے سے بڑے غزل گوؤں کے دیوانوں میں بھرتی اشعار کی کثرت پائی جاتی ہے۔ یہ بھرتی یا سستے اشعار یا بہتر مضمون کی تلاش میں وجود میں آتی ہیں کہ روایتی تقاضے انھیں قید و بند سانچے میں لائے ہیں۔ یہ نقلی اور بے جان اشعار قافیوں اور ردیفوں کی رعایت سے ابھرتے ہیں۔ شاعر کی نادر کاری کبھی کبھی ان میں بھی جان ڈال دیتی ہے اور اسلوب کی خوش ادائی چمک دمک بھی پیدا کر دیتی ہے لیکن یہ جادو ساحری دیر تک نہیں چلتا اور رات کی چاندنی چھٹکتے ہی ماند پڑنے لگتی ہے

میرے خیال میں ولی، سراج، درد، میر، سودا، شور، غالب، مومن، ذوق، آتش، مصحفی، ناسخ، جوشش، داغ، شاد، آزاد، حسرت، فانی، اصغر، جگر، فراق، جمیل وغیرہ کی غزلوں سے انتخاب شائع کرنا چاہیے اور ان کے بقیہ مرحوم اشعار کو کتب خانوں اور تحقیقاتی اداروں کے سپرد کر دینا مناسب ہوگا تاکہ وہ رسمی رسموں کے مطابق اُن کی تکفین و تدفین کر دیں اور سالانہ عرس منا کر ایصالِ ثواب کی خاطر فاتحہ خوانی، تبرکات کی نمائش اور قوالی کی محفلیں منعقد کر دیا کریں۔

شاد عظیم آبادی کے دیوانوں میں بھرتی اشعار کی کمی نہیں۔ ملاحظہ ہوں تبرکات ———

کیا کیا عرق آیا جو ہم آغوش ہوئی دھوپ
ایسی تو قیامت میں حظا پوش ہوئی دھوپ

بہار ۱۸۸۲

سر رکھ دیا شوخ نے ترے پاؤں کے اوپر
قربان ہوا ذات کی پابوس ہوئی دھوپ

دیتی ہے پیار کے دل کو تری لن ترانیاں
ہم سے نہ تھا خطاب تو ہم سے شماعت

مار ڈالیں گی یہ بدپرہیزیاں
یوں نہ آہیں لے دلِ بیمار کھینچ

اٹک گئی ہے تری کاکلِ رسا میں روح
پھنسی ہے آکے عجب طرح کی بلا میں روح
کبھی نہ آئے گا حاشا کسی طرح کا غبار
رہے گی مر کے بھی اُس کوے جاں فزا میں روح

دربارِ پُر جلال میں سُلطانِ عشق کے
جُز تیرے اور کس کو ہے اے تبسم ترا رسوخ
لیل و نہار رہ در دل دار پر خموش
بڑھتا ہے رفتہ رفتہ یوں ہی بیش تر رسوخ

خامۂ شوق نہ حیراں ہو برائے کاغذ   صفحۂ دل مرا حاضر ہے بجائے کاغذ

ہرگز کبھی کسی سے نہ رکھنا دلا غرض ۔ جب کچھ غرض نہیں تو زمانے سے کیا غرض

اُس شوخ کو اے شادؔ عبث ہم نے لکھا خط
صد حیف کہ قاصد سے لیا اور نہ پڑھا خط

آنکھوں میں شرم ہے نہ کسی کا ہے اب لحاظ
اگلوں کے ساتھ اُٹھ گیا سارا ادب لحاظ

ساکت ہیں بعدِ مرگ تو اسر سے پاؤں تک
مُہریں لگا گئی ہیں قضا سر سے پاؤں تک

اُجالا جس سے تھا چاروں طرف وہ ہم نہیں ہیں ہم
اندھیرے گھر میں شمع کشتہ سے کچھ کم نہیں ہیں ہم

مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ اور بہت سے سسکتے، دم توڑتے، مردہ قطعی مصنوعی و نقلی اشعار حضرت شادؔ کے کلام میں جا بہ جا ملتے ہیں۔ میں نے انھیں نظر رد کر دیا ہے۔ اگر شادؔ کی عظمت ان مجہول اشعار سے وابستہ نہیں تو یہ غزل کی ریت کے روگ ہیں۔ شادؔ ان اشعار کے باوجود بڑے غزل نگار ہیں لہذا ہمیں اُن اشعار کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو شعریت بداماں ہیں۔ میں نے ایک مضمون (مطبوعۂ نیا دور ۲۶ جنوری ۱۹۶۰ء) میں لکھا تھا کہ شادؔ کی کامیاب غزلوں میں ایک مرکزی تجربہ رسا بسا ہوا ہوتا ہے لیکن یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ شادؔ کی بہت سی غزلیں ناکامیاب ہیں۔ ہاں بعض نامراد غزلوں میں ایک آدھ شعر اچھا بھی نکل آتا ہے۔ ایسا فن کاری کی ناپختگی کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ روایاتِ غزل کی سنگینی کے سبب ہوا ہے۔ روایات کی غلامی روح فرسا ہوتی ہے اور اِن سے آزادانہ استحصال جان کسب ہے، پ، چ، ذ، ظ، ض وغیرہ حروف والی ردیفوں کی جانب بڑی بڑی سنگلاخ زمینوں میں اُستادی کے ہاتھ دکھلانے کی کوششیں نہایت ہی مضحکہ اور غیر فن کارانہ ہوتی ہیں۔ شادؔ بھی اس پُر تصنع کاری گری کے شکنجے میں کسے گئے ہیں۔

شادؔ کا صحیح شاعرانہ مقام متعین کرنے سے پہلے یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ اب تک شادؔ کی غزلوں کے صرف دو مجموعے شایع ہوئے ہیں، کلامِ شادؔ اور میخانۂ الہام۔ ان کے علاوہ بہت سا کلام غیر مطبوعہ ہے جو اُن کے شاگردوں، عزیزوں اور مداحوں کے پاس ہے۔ ایک غیر مطبوعہ منتخب دیوان غالباً راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں ہے۔ عرصہ ہوا نواب مہدی صاحب عظیم آبادی کے یہاں سے وہ دیوان مذکور اشاعت کے لیے لے گئے تھے۔ زار عظیم آبادی صاحب کی روایت ہے کہ انتخاب سخن فہموں کے ایک بورڈ[1] نے کیا تھا اور جو حضرت شادؔ کی پسندیدگی اُسے حاصل ہوئی تھی۔ نہ معلوم انتخاب کیوں شایع نہ ہوا۔ علامہ جمیل مظہری کی یاد یہ کہتی ہے کہ انتخاب کا کام سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء سے شروع ہوا۔ شادؔ فروری سنہ ۱۹۲۷ء میں فوت ہو چکے تھے۔

بہر کیف، شادؔ اردو غزل گوئی کی دنیا میں ایک منفرد اور بلند مقام رکھتے ہیں۔ اب میں اُن کی شاعری کے محاسن کو بے نقاب کرتا ہوں۔

خدا سب سے بڑا سائنس داں بھی ہے اور فن کار بھی۔ بداعتِ ارض و سما اسی کا کام ہے۔ کائنات اور فطرت کی صورت گری ہی ان کے اندر وجودیت، تاثیر اور انفرادیت پیدا کر کے معنویت کو آشکارا کرتی ہے۔ لہذا وجود اور ہیئت کی اہمیت عالمِ اظہار میں نمایاں ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس عالمِ کون و فساد میں معنی کو صورت سے الگ کر کے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہیئت اتنی موزوں ڈھلی ہوئی، سہل، سڈول اور شفاف ہو کہ معنی کی کلیاں بہ سکون و سلامتی اور بہ خیر و خوبی جلوہ بار ہوں۔ شعور و احساس کی دنیا میں صورت و معنی مربوط و متحد ہوتے ہیں۔ لہذا فنونِ لطیفہ میں صورت و معنی کے درمیان خطِ فاصل نہیں کھینچ سکتے۔ وجودِ فن ایک کُل ہے۔ اجزائے فن کو الگ الگ کرنا حیاتِ فن کے کلی احساس و ادراک کے لیے مہلک ہے۔ یوں زندگی اور فن دونوں کی تفہیم کے لیے ان کی میکانزم کا تجزیہ بھی کرنا پڑتا ہے لیکن حیات اور فن کے ہمہ جہتی و مکمل تاثرات ماورائے تجزیہ ہیں۔ وجود ایک جاندار تکمیل کا نام ہے۔ کامل وجود آپ اپنا ثبوت ہے۔ فن کا اثباتِ وجود تکمیلِ فن سے وابستہ ہے۔ اب وہ بحثیں پرانی ہو گئیں کہ معنی زیادہ اہم ہوتے ہیں یا صورت کی اہمیت فائق ہے۔ گرچہ

---

[1] انتخابی بورڈ میں غالباً مندرجہ ذیل حضرات تھے (۱) زار عظیم آبادی (۲) علامہ جمیل مظہری (۳) نواب محمد مہدی صاحب اور (۴) مصطفیٰ نواب صاحب۔

ہوئی صورت اور بے جان ہیئت فن نہیں۔ بنی ہوئی صورت جسم ہے اور جاندار ہیئت مظہرِ معنی۔ جسم و معنویت کی مخلوط و مربوط تاثیر کا نام آرٹ ہے۔

جس طرح فطرت آپ اپنا مقصد ہے اسی طرح صنعت بھی آپ اپنا مقصد ہے مخلوقات اپنی حیثیتوں سے مقصدِ فطرت پر منطبق ہوتی ہے اور اُس کی ترجمانی بھی۔ بہرحال فطرت کی جلوہ گری برائے فطرت ہے کسی اور مقصد کی نہیں۔ فطرت کو نہیں، انسان کو ہمیشہ فطرت کی تسخیر درکار رہی ہے۔ آرٹ تسا فت کا لطیف ترین مظہر ہے جو بشرِ فطرت کو اپنے پیمانوں میں ڈھالتا ہے۔ فن فطرت کو اپنے لیے استعمال کرتا ہے۔ فن کار کے لیے تصوراتی اور عملی طور پر فطرت کے اصول صحیح ہیں۔ لہٰذا فن برائے فن کا اطلاق ہوتا ہے لیکن اس کی تقابت سطحی، چھچھلی اور معنی صورت گری سے تعبیر ہے۔ یہ مجروح ہوتی ہے صورت، معنی کی ہم وجودیت حیاتِ فن ہے۔ فن کی ایک منفرد زندگی ہوتی ہے کامیاب فن برائے فن اس جہت سے فن برائے زندگی بھی ہے۔ دو باتیں ذہن نشین کر لینی چاہییں اوّل تو یہ کہ فن کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ آپ فن میں زندگی ڈھونڈ ھیے اور اگر نہ ملے تو آپ فن کی اس لاش کو دفن کر دیجیے لیکن زندگی فن کے تابع نہیں کہ آپ اپنی کسی اضافی پیمائش کے تحت نہیں لا سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ زندگی ایک بسیط اور ہمہ گیر حقیقت ہے اس کے اظہارات اور تعبیرات لامحدود ہیں آپ اگر زندگی کے کسی ایک گوشے یا رُخ سے جھانک کر دیکھیں اور اُس زاویۂ خاص سے آپ کو کسی فنی نمونے میں عکسِ حیات نہ ملے تو دوسرے زاویوں کے پردے بھی اُٹھائیے اور دیکھیے کہ کس کونے دستی نظر آتی ہے یا نہیں۔ ضروری نہیں کہ فن کار نے انھیں دریچوں کو کھولا ہو جس سے آپ عموماً جھانکنا پسند کرتے ہیں آپ کی تصویرِ تنویر اور تعبیرِ حیات فن کار کے مشاہدات اور تعبیرات سے جُدا ہو سکتی ہیں۔ آپ اپنی ذہانت و دانشوری کی خاطر اپنے مخصوص سماجی کنوئیں کو سمندر نہ سمجھیے۔ آپ فن میں روشنی، شیرینی، معنویت و زندگی ضرور تلاش کیجیے کیونکہ آرٹ میں گورستان کا سناٹا نہیں ہوتا گرمیِ حیات ہوتی ہے۔ کامیاب فن کاری ہمیشہ زندگی ساماں اور برائے زندگی ہوتی ہے۔ فن برائے فن جب اعلیٰ مقام پر پہنچے گا تو وہاں زندگی بھی برافگندہ نقاب جلوہ آرا ہوگی۔ دنیائے فن میں فن کی وجودیت ہی ضامنِ حیات ہے۔ گر فن کاری

کی فضاؤں میں بھی ارتقا، مراتب، طبقات و درجات ہوتے ہیں۔ میں تو یہاں تک تسلیم کر لینے کے لیے تیار ہوں کہ طبعِ سطح پر ہم فن برائے فن اور فن برائے زندگی کے نظریے پر اپنی ہم وجودیت کو استوار کر سکتے ہیں۔ سکون و امن کی فضا میں یہ صورت نظر آئے گی کہ دونوں کے درمیان کوئی آہنی پردہ نہیں، محض ایک باریک مگر خطرناک حجاب نارسائی ہے جسے جلد از جلد اُٹھا پھینکنا چاہیے۔ انسانی آرٹ صرف زندہ یا مردہ ہوتا ہے نظریوں کی دھما چوکڑی سے فنونِ لطیفہ کی موت قریب آجاتی ہے۔ بڑے فن کار نظریوں سے بے پروا ہو کر فن میں روح پھونکتے رہتے ہیں

دبستانوں کی بنیاد بھی نظریوں پر ہوتی ہے۔ شاؔد کے زمانے میں اُردو دنیا میں دو دبستانوں کی دھوم مچی تھی۔ دبستانِ دلّی اور دبستانِ لکھنؤ۔ دلّی کے انسانی داخلیت کو سب کچھ سمجھتے تھے اور لکھنؤ کے دبستانوں کا اوڑھنا بچھونا خارجیت تھی۔ یاد رہے بڑے فن کاروں اور دبستانیوں میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے۔ دلّی اور لکھنؤ کے بڑے شاعروں کے فن میں ہم ایک خاص میلانات کا مطالعہ کر سکتے ہیں، مگر ہم انھیں بدایا دبستان نہیں پاتے عصرِ شاؔد میں بالخصوص دبستانِ لکھنؤ کے اوسط درجے اور ادنیٰ طبقے کے شعرا محض خارجی رکھ رکھاؤ، رعایتِ لفظی اور محاورہ بندی کے زنجیری ہو کر رہ گئے۔ دہلی بڑے فن کاروں سے خالی ہو چکی تھی اور لکھنؤ کے جلیل القدر شاعروں پر رنگِ دبستاں کی گہری چھاپ پڑنے لگی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ عظیم آباد و حیدرآباد وغیرہ مراکزِ اُردو پر بھی خارجیت کا سایہ پڑنے لگا تھا۔ عظیم آباد کی روایتِ شاعری سجّاد اور راسخ کی پروردہ تھی لیکن اواخر اُنیسویں صدی میں لکھنوی دبستان کے اثرات نے رنگِ قدیم کو پھیکا کر دیا تھا اور اہلِ فن خارجیت کا شکار ہونے لگے تھے۔ عظیم آباد کو ہم مشرقی دلّی کہہ سکتے ہیں۔ دلّی اُجڑی تو پٹنہ بھی ویران ہوا۔ یہاں والوں کو بھی لکھنؤ کی چمک دمک موہنے لگی۔ شاؔد نے ہوا کا رُخ پلٹ دیا اور شاؔد و آزاؔد نے کلاسیکی تعمیر کے پہلو بہ پہلو شاعری کی عصری عمارتیں بھی بنائیں۔

شاؔد کے فن کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں کے محاسن ملتے ہیں۔ شاؔد نے ایک گنگا جمنی رنگِ تغزل پیدا کیا۔ ایک حساس اور باشعور فن کار کی طرح شاؔد نے دونوں کی خوبیاں دیکھ لیں، اُن کی کمزوریوں کو بھی خوب سمجھا اور خوبیوں کے امتزاج سے اپنی فن کاری

کے کامیاب حصے کی طرح ڈالی۔

آرٹ میں داخلیت کی خوبیاں اور خامیاں دونوں ہی ہو سکتی ہیں اسی طرح خارجیت کے محاسن اور معائب بھی پائے جاتے ہیں اگر احساسات، جذبات، واردات، تخیلات و افکار کی ہی پیش کش ہوتی رہے تو فن کی دنیا محدود ہو جائے گی اور اکتاہٹ پیدا ہونے لگے گی۔ معاملہ بندی، واقعہ نگاری، منظر کشی اور پیکر تراشی کی بھی حسی تاثیرات ہوتی ہیں۔ بہت سے اصناف سخن میں معروضیت و خارجیت کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھایا جا سکتا مثلاً عشقیہ و رزمیہ مثنوی کی تخلیق میں، ڈرامہ نگاری، داستان سرائی، ناول نویسی اور افسانہ طرازی کرتے ہوئے غزل گوئی اور نئی نظم سرائی کے فن کی ترکیب میں بھی خارجیت کے خوب صورت تار و پود ہوتے ہیں۔ دوسری جانب معاملہ بندی اور واقعہ سرائی بے مزہ اور بے اثر ہو جاتی ہیں اگر ان میں احساس کی لطافت، جذبے کا سوز و گداز، تخیل کی رفعت اور فکر کی ندرتیں نہ ہوں۔ بعض عناصر کا کم و بیش ہونا اور بات ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ کامیاب فن کاری میں توازن کی ضرورت ہے داخلیت اور معروضیت دونوں میلانات کے امتزاج سے تخلیق حسن و تاثیر کرنی پڑتی ہے زبان کی سلاست و فصاحت، نفاست و رکھ رکھاؤ، اس کے محاورے اور کہاوتیں، اسلوب، لب و لہجہ اور رعایتیں، لفظوں کا چناؤ، گھٹاؤ اور بڑھاؤ وغیرہ کی اہمیت بھی مسلم ہے کیونکہ انھیں شیشوں سے حسن کیف و معنی جلوہ ریز ہوتا ہے بقول غالب ؎

چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

شاد نے ایک باشعور فن کار کی طرح یہ بھی محسوس کیا کہ عظیم آباد کا پرانا رنگ سخن نئے حالات میں چمک نہیں سکتا کیونکہ میلانات ادب متحرک ہوتے ہیں اور تجربوں، اسلوبوں، معنی آفرینیوں اور شیوہ بیانیوں کا مجموعی اثر سماج کے سرمایۂ ادب و فن پر پڑتا رہتا ہے۔ شاد نے اپنے شعری فن میں دور روایتوں اور زمانے کی جدت کو برمحل استعمال کیا اور سمویا ہے۔ چونکہ شاد کی نظم نگاری میرا موضوع نہیں، اس لیے میں صرف اُن کی غزلوں سے مثالیں دوں گا ملاحظہ ہو شاد کا آرٹ ــــ

مرے شعروں میں جلوہ شاہد معنی کا پیدا ہو

نظر آتا ہے لفظوں کا فقط ہلکا سا اک پردہ

شاد کی غزلوں میں جا بجا معنویت کی قیمتی جلوہ گری ہوتی ہے لیکن اس شاہد کے لیے باطنی بصیرت کی ضرورت ہے ؎

چشم باطن صاف کرو، دل کا دھو ڈالو غبار

پھر سمجھ لینا ہے آساں شاد کی تحریر کا

مندرجۂ ذیل شعر کی دل گیر معنویت محسوس کیجیے ؎

یاس پر بھی تو ہر اک دل کو کسی سے ہے اُمید

یہ بھی اسرار ہے اے پرکس حاد تیرا

باطنی کیفیات کی فن کارانہ پیش کش کی اور مثالیں حسب ذیل ہیں ؎

سب ہی ہوش کہتے ہیں فسانہ آپ کا ۔۔۔ سنتا ہوں اور ہنستا ہی دیوانہ آپ کا

عصر نگاہ نے ساقی کی نبد و بست کیا ۔۔۔ شراب بعد کو دی پہلے سب کو مست کیا

دُرد دیتا ہی جو ساقی تو تردد کیا ہے ۔۔۔ جام پر دامن تر رکھ کے ذرا چھان لیا

نہ جان اروں کا مجمع تھا نہ تتا توں کا میلا تھا

خدا جانے کہاں مرتا تھا میں جب واکسیلا تھا

گھروندا یوں کھڑا تو کر لیا ہے آرزوؤں کا

تماشا ہی جو وہ کہہ دیں کہ میں اک کھیل کھیلا تھا

کمال حسن کو قدرت نے دل نواز کیا ۔۔۔ یہ وہ عطا تھی کہ خود حسن نے بھی ناز کیا

غم میں جو آ نہ سکے دل میں سما جاتی ہو ۔۔۔ ظرف دیکھے کوئی اس چھوٹے سے پیمانے کا

چھپائے گا کسی دن عرش تک کو اپنے دامن میں

دکھا دے گا تماشا یہ کھیل کر مشت غبار اپنا

شاد کی شاعری میں تخیل و معنویت کی جلوہ گری بڑی فن کارانہ سادگی کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہ سادگی بجل، نرل، سہل، شستہ، سلیس، رواں اور نکھری ہوئی ہوتی ہے۔ اُن کے ہاں نہ تو ثقالت ہے اور نہ سپاٹ سادگی۔ اُن کے اسلوب میں رچی ہوئی، بیدار و پُر اثر سادگی، سلیس و نفیس سادگی، حسین و فصیح سادگی پائی جاتی ہے۔ اسے ہم کلاسیکی طرز بیان کہہ سکتے ہیں ؎

بڑھے نہ کیسے بھی کلہ دیکھ کر طرزِ رقم میرا
عصا موسیٰ نبی کا، تیغ حیدر کی، قلم میرا

نہیں کم نعمتِ دارین سے نعمت مصائب کی
مرے سجدے کو جھک جاتا ہے رہ رہ کر قلم میرا

کامیاب آرٹ واقعی ایک معجزہ ہے، عطائے خاص ہے، فیضِ سماوی ہے، ساحری نہیں ہے۔ ساحری دیرپا نہیں ہوتی، فن سدا دواں ہے ع

حُسن کا کعبہ جاودانی ہے

رہ رہ کے اک دھواں سا نکلتا ہے چاک سے
جو کچھ نہ ہو وہ کم ہے دلِ شعلہ ناک سے

دیوانہ مر گیا مگر اب تک بھی ہے جنوں
لپٹے ہیں دونوں ہاتھ گریباں کے چاک سے

حُسنِ تعلیل و تعبیر کی مدد سے کتنی گہری حقیقت بیاں کی گئی ہے۔ کتنا پُر معنی شعر ہے۔ رازِ حیات و رموزِ عشق ماورائے زندگی و موت زماں و مکاں کی قید و بند سے آزاد ہیں۔ کہتے ہیں ؎

جو سُننے اُسے بھی حوصلہ ہے، جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے
یہ فسانہ زلفِ دراز کا، کہیں زندگی سے دراز ہے

شاد نے نظریۂ اضافیت کو محبت کی مطابقت کے ماتحت لا کر کتنی خوبصورتی سے اقدارِ حیات و معیارِ زندگی کے لاینحل مسئلے کو حل کیا ہے ؎

میں بدلے ساقی مرا لقا، یہی مے کشی کا ہے مسئلہ
وہی حکم دے تو حلال ہے، وہی روک دے تو حرام ہے

شاد نے تجرباتِ محبت کی لطیف معنویتوں کو حُسن کارانہ طور پر اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے ؎

مری طرف سے حرم میں نہ کچھ صبا کہنا	سلام زہد کو اور عشق کو دعا کہنا
خطاب کس کی طرف ہے سمجھ تو لے واعظ	تجھے نہ ہو مجھے مشکل ہے یا خدا کہنا

شاد کے تغزل میں صوفیانہ میلانات نمایاں ہیں۔ اُن کی عقیدہ شاعری کا یہی وسطی دھارا ہے لیکن شاد کے ہاں نرے صوفیانہ خیالات نہیں بلکہ ان عرفانی تجربوں کا بھرپور شاعرانہ اظہار ہے۔ آرٹ صرف تجربے کی پیش کش کا نام نہیں، خواہ وہ کتنا ہی قیمتی تجربہ کیوں نہ ہو، بلکہ تجربوں کے جذبی و تخیلی جذب و قبول، ترکیبِ تازہ، تعبیرِ نو اور ہنرمندانہ، حسین اور پُراثر پیش کش کا نام ہے۔ شاد ایک فن کار کی طرح صوفیانہ تجرباتِ محبت کو پیش کرتے ہیں۔ فن کی دُنیا میں تجربے ذاتی اور حقیقی بھی ہو سکتے ہیں اور تخیلی و اتفاقی بھی۔ کوئی ضروری نہیں کہ بیوگی پر نظم لکھنے کے لیے کوئی شاعر زن بیوہ بھی ہو جائے۔ اسی طرح صوفیانہ تجربات کو شاعرانہ طور پر ایک ایسا شاعر بھی پیش کر سکتا ہے جو عملی و نجی زندگی میں صوفی نہ ہو ؎

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاد کا ذہنی، شاید جذبی میلان بھی صوفیت کی جانب تھا۔ بہر کیف اُنھوں نے محبت و عشق کے عرفانی و مثالی لمسِ یالی در حُسن کارانہ تجلیاں بخشی ہیں۔ نظارہ فرمایئے ؎

وہی نکہت وہی خوشبو، وہی نازکی وہی،
پھول نے نقش اُتارا ہے سراپا تیرا
شاد غزلیں نہیں آیاتِ زبوران کو سمجھ
لحن داؤد سے کچھ کم نہیں نغمہ تیرا

زلفِ شب کی ہر گرہ میں سر بسر تو ہی تو تھا
وہ رخسار دل آویزِ سحر تو ہی تو تھا
تو نے جب جب یار سے پوچھا کہ تھا پردے میں کون
آنکھ والوں کی پکار اُٹھی نظر، تو ہی تو تھا
وہ جو تسکیں کی جھلک سی تھی ہر اک دُکھ درد میں
اُس جھلک میں بھی مری جاں جلوہ گر تو ہی تو تھا

موجِ پیمانۂ الفت پہ ہے گیسو تیرا	طاق مے خانۂ توحید ہے ابرو تیرا
مہک اُٹھا چمنِ دہر کا پتہ پتہ	راز چھپنے نہیں دیتی تری خوش بو تیرا
یاس پر بھی تو ہر اک دل کو تجھی سے ہے اُمید	یہ بھی اعجاز ہے اے نرگسِ جادو تیرا

وہ عالم گیر جلوہ اور وہ حُسن مشترک تیرا
خدا جانے ان آنکھوں کو ہوا کس کس پہ شک تیرا

سُنیں کہ ہم نہ سُنیں تو سے جو دیا ہی جواب
ہجوم یاس میں جب جب تجھے پکارا ہے۔

اُٹھا نقاب کہ جینے سے سوال ہونے لگے　　اب اور کچھ تری جانب خیال ہونے لگے

تری خوشی کا ہی نام جنّت ترے غصے کا لقب جہنّم
اِسی میں تیری رضا اگر ہے تو ہم کو دوزخ بھی ہے گوارا

کرے نگاہ کسی اور پہ رشک تیرا　　کہیں رقیب نہ بنے حسن مشترک تیرا

ساقیا! تو نہ مرے شکر کا مطلب سمجھا　　تب تو پیمانۂ حالی کو لبالب سمجھا
میرے مطلب کو نہ دل اور نہ مرا لب سمجھا　　جب ہوں میں جس کے اشارے سے وہی سمجھا
بے ادب لیتے ہیں نام اس کا اگر لیتے دے　　بار رجب پہ ہے کا اوروں کو نہ لے کب سمجھا

میں تو شرمندہ ہوا بیچ میں پڑ کر ناحق
کہ دعا بھی تھی تری دست دعا بھی تیرا

دل کی وسعت کو بڑھایا یار تیرے دھیان نے
تھا تو قطرہ اس قدر پھیلا کہ دریا ہو گیا

شادؔ صوفیت کے معروف عقائد و نظریات کو نظم کرنے کے درپے نہیں ہوتے، بلکہ انفرادی رنگ میں اپنے تجربات و خیالات خوبصورتی سے پیش کر دیتے ہیں۔ انھیں فن کی فکر زیادہ رہتی ہے، تصوّف کی تبلیغ کی نہیں بیٹھے ہوئے راستے سے وہ ہٹ کر بھی چلتے ہیں ؎

کعبہ و دیر میں جلوہ نہیں یکساں اُن کا
جو یہ کہتے ہیں ٹٹولے کوئی ایماں اُن کا

اس شعر کے متضاد معنی لیے جا سکتے ہیں لیکن غزل کا دوسرا ہی شعر میرے خیال میں واضح اشارہ کر دیتا ہے ؎

جستجو شرط ہے گھبرائے نہ خواہاں اُن کا
گھر بتا دے گا کوئی مردِ مسلماں اُن کا

شادؔ کی شاعری میں مجازی محبت کی آئینہ داری کرنے والے اشعار بھی بہت ملتے ہیں لیکن ان اشعار کی تعبیریں رنگِ حقیقت بھی کی جا سکتی ہیں۔ چند اشعار سنیے، اُن کا حُسنِ بیان دیکھیے، اور اُن کے شاعرانہ اسلوب بیاں پر سر دھنیے ؎

کنول ہیں چاند ستاروں کے جابجا روشن　　شبِ وصال میں اللہ رے اہتمام ترا

شانہ اُلجھا ہی الگ آئینہ حیراں ہو رہا　　پیچ کُھلتا نہیں اے زلف سمن بو تیرا

بار سبو وہی اُٹھائے جس پہ ہو فضل سے فروش
راہِ خشک پر بھی کیا بوجھ ہے جا نماز کا

آرٹ میں تمثیل، ایما و رمز، اشارہ، مجاز، کنایہ و استعارہ کی دُنیا میں اتنی ہمہ جہتی ہو سکتی ہے کہ قرینہ جس طرف ہو سلیقے سے معنی کا رُخ موڑ لیجیے۔ مشاہدۂ حق کو بھی ساغر و مینا کی ایمائیت کا سہارا لینا پڑتا ہے اور ناز و غمزہ کو دشنہ و خنجر کی کاٹ استعمال کرنی ہی پڑتی ہے۔ شادؔ کہتے ہیں ؎

نگاہ و ناز و ادا و غمزہ شریک سب میرے قتل میں ہیں
رہے گا کوئی نہ پاک دامن جو خون اُبلا رگِ گلو کا

اُن کی نگاہِ ناز جو ملیٹی تو دیکھنا　　منہ دیکھتی رہے گی حقیقت مجاز کا
عالم کو خود پسند ہیں نیرنگ سازیاں　　اس میں قصور کیا نگہ فتنہ ساز کا

محبتِ عرفانی کے اظہار کا منزّہ و مصفّا اسلوب ملاحظہ فرمائیں ؎

دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال　　لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

ـــــ اور اس کے پہلو بہ پہلو وہ رنگ مجاز دیکھیے جس میں حقیقت کی دمک بھی ہے ؎

بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ہے ارماں، ناب اُٹھنے کی کہاں
جامہ زیبی کا بھلا اے صنم تنگ قبا! کچھ تو دامن کو جھکا

اس شعر کی رمزیت کتنی کائناتی اور ماورائی ہے۔ "مری خاک" سے انسانی خاک کا تصوّر بندھتا ہے، بنی آدم کے جذبۂ عشق و مستی کا خیال آتا ہے، نوعِ بشر کی بے بس آرزو مندی کی پُر اثر تصویر کھنچ جاتی ہے ـــــ "ناب اُٹھنے کی کہاں"

بقیہ مضمون صفحہ ۲۰ پر

صبح ہوتی ہے کس قدر بے چین

سید صدیق حسن کرنوی

عام طور سے صبح کو مسرتوں کا پیغام سمجھا جاتا ہے اور طلوعِ سحر سے مسرتی حالت ہوتی کیفیت کے ساتھ کی۔ لیکن خود صبح کے دل پر کیا گزرتی ہے، اسکے کیا احساسات ہوتے ہیں، اس پر شاید توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اس نظم کی تخلیق کا باعث یہی سادہ سی خیال ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ نظم میں صبح یا "سحر" کے اس پہلو کو پیش کیا جائے۔

اے سحر، ہمنوائے دورِ شباب
کیوں ہے بے چین، کیوں ہے تو بیتاب
کیوں تری فتنہ ریز چشم خوں ناب
تشنہ ہے، تشنہ ہے، نہیں سیراب
تجھ کو دنیا کی وسعتوں میں کیا
غم کا بھی آسرا نہیں ملتا

کس کی بے چین آرزو کے لئے
بے قراری کا تاج سر پہ دھرے
اپنی سفاک سبز کرنوں سے
سینۂ شب کو چاک چاک کئے
پلکوں پلکوں تو پھرتی رہتی ہے
اور کس کی تلاش کرتی ہے

دشت و صحرا میں کوہساروں میں
مرغزاروں میں، سبزہ زاروں میں
گلستانوں میں لالہ زاروں میں
عشرت افزا بھری بہاروں میں
دل میں ہر پھول کے لگا کر آگ
ڈھونڈتی پھرتی ہے تو اپنا سہاگ

کبھی شبنم کو تو رلاتی ہے
کہیں گل کی ہنسی چراتی ہے
کہیں بلبل کا دل دکھاتی ہے
کہیں سبزہ مسلتی جاتی ہے
کیا ترا دل کہیں نہیں لگتا
چین تجھ کو کہیں نہیں ملتا

درد و غم کی کشادہ راہوں میں
حسرتوں کی پناہ گاہوں میں
کسی بے کس کی سرد آہوں میں
کسی مظلوم کی نگاہوں میں
کیا ترا کوئی ہمنوا نہ ملا
کیا ترا کوئی ساتھ دے نہ سکا

بھادوں ۱۸۸۲

ستمبر ۱۹۶۰ء

میری پلکوں کی چھوڑ کر بستی　　منہ اندھیرے چلے تھے کچھ راہی
مل گیا تھا انھیں تو اک ساتھی　　گریۂ شبنم سحر گاہی
یہ بھی کیا تیرے پاس آ نہ سکے
یہ بھی کیا تجھ سے دور دور رہے
ہجر کی تند و تیز انجمن میں　　فرقتوں کے عریض دامن میں
بلبل خوشنوا کے شیون میں　　غم کے مارے دلوں کی دھڑکن میں
کیا نہیں ایسا کوئی بھی دمساز
تیری آواز پر جو دے آواز
تونے دیکھا جو ہر طرف چھایا　　زلف شب کا گھٹا گھٹا سایا
خود گریباں کو اپنے چاک کیا　　اور بخشا جہاں کو اجیالا
تیرے عزم جواں کے تیور سے
سوئے انساں بھی خواب سے چونکے
دے کے دنیا کو اپنی آنکھ کا نور　　تونے کر دی ہیں ظلمتیں کافور
سطح قلزم ہو یا فراز طور　　تری کرنوں سے کون ہے مہجور
قصر شاہی ہو یا غریب کا گھر
ترا احسان سب کی گردن پر
نور کی یہ ڈھلی ہوئی کرنیں　　قلب فطرت کی دھڑکنیں جن میں
جو پیام حیات لاتی ہیں　　تو ہی لائی ہے ان کو دنیا میں
زندگی کی یہ لہر، زیست کی ضو
تری روشن جبیں کا ہے پرتو
کوئی منزل کہیں نہ تیرا قیام　　تو ہے دلدادۂ فسون خرام
تج کے اپنا سکون اور آرام　　تونے دنیا کو یہ دیا پیغام
جستجوئے سکون، تلاش قرار
ہے حقیقت میں زندگی سے فرار
میں نے مانا کہ تجھ کو مل نہ سکا　　اپنی قربانیوں کا کوئی صلا
ہے یہی لیکن اے شہید وفا　　رسم خیز حیات کا نقشا
بزم سود و زیاں کی بات یہی
زندگی کے ہیں تجربات یہی
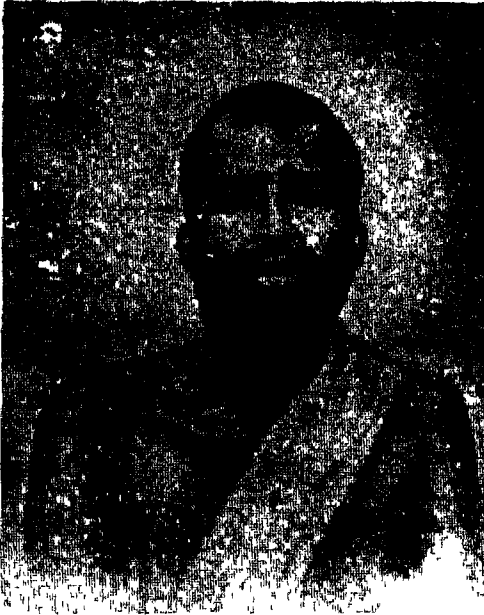
سوامی رام کرشن

حامد اللہ افسر

دنیا میں صوفیائے کرام کا گروہ ایک ایسا گروہ ہے جو رنگ و نسل ذات پات اور مختلف مذاہب کا فرق روا نہیں رکھتا۔ اس گروہ کے لوگ ہر ملک اور ہر مذہب کے ماننے والوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ انسان اور انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔

سوامی رام کرشن پرم ہنس کا شمار دور حاضر کے برگزیدہ ہندو صوفیوں میں ہے آپ کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے عمر بھر اس امر کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کے تمام مذاہب میں بنیادی مطابقت اور ہم آہنگی ہے۔ سوامی جی درحقیقت ایک عارف کامل تھے اور ہندوستان کی حقیقی روحانی ثقافت کے علم بردار۔ ان کی زندگی "روح" کی "مادہ" پر فتح کا مظاہرہ ہے وہ روحانی شعور کی ان گہرائیوں تک پہنچ گئے تھے جہاں زمان و مکاں کے حدود باقی نہیں رہتے اور جس کی اپیل عالم گیر ہوتی ہے۔ ہر پر خلوص روح ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات کی طرف بے تحاشا کھنچتی ہے خواہ وہ روح کسی مذہب اور کسی فرقہ سے تعلق رکھتی ہو۔ سوامی رام کرشن نے ہمیں بتایا ہے کہ انسان کی روح ملکوتی ہے اس کی الوہیت اس کے غلط عمل یا "کرم" اور بھٹکے ہوئے خیالات سے دھندلی پڑ سکتی ہے لیکن وہ مٹ نہیں سکتی۔ ان کا قول ہے کہ اپنی ذات میں خدا کو پانا اور پھر تمام مردوں اور عورتوں کو خدا کا مظہر سمجھ کر ان کی خدمت کرنا روحانی سرگرمیوں کی منزل مقصود اور حیات انسانی کا فرض منصبی ہے۔

سوامی رام کرشن ۱۸ فروری سنہ ۱۸۳۶ء کو کمارپوکور میں پیدا ہوئے۔ کمارپوکور بنگال کے ہگلی ضلع میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جہاں دھان کے کھیت، کیلے کے درختوں اور چند جھیلوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے گاؤں کے جنوب میں ایک چھوٹی سی ندی ہے اور ایک آم کا باغ ہے۔ سوامی رام کرشن کے والد خودی رام چٹو پادھیائے کی شادی چندرا دیوی سے سنہ ۱۷۹۹ء میں ہوئی اس زمانے میں خودی رام جی اپنے آبائی گاؤں ڈیرے پور میں رہتے تھے جو کمارپوکور سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ ان کا بڑا لڑکا رام کمار ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوا اور ان کی پہلی لڑکی کیتانی سنہ ۱۸۱۰ء میں۔ سنہ ۱۸۱۴ء میں گاؤں کے زمین دار نے خودی رام جی سے ایک جھوٹی گواہی دینے کیلئے کہا جس کو انھوں نے منظور نہیں کیا۔ اس پر زمین دار نے ان پر ایک جھوٹا مقدمہ قائم کر کے ان کی ساری زمین چھین لی۔ جب ڈیرے پور میں گزر بسر کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو وہ کمارپوکور چلے گئے۔ اس گاؤں کے زمین دار نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور انھیں اتنی زمین دیدی کہ وہ آسانی سے پیٹ پال سکیں۔

کمارپوکور میں آنے کے دس سال بعد خودی رام جی نے رامیشورم

کی پیدل یاترا کی۔ رامیشورم ہندوستان کی جنوبی حد پر ہے۔ وہاں کے مندر میں شیوجی کی مورتی ہے جس کی رامیشور کے نام سے پوجا کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب رام چندر جی راون کو زیر کرکے ہندوستان واپس آ رہے تھے تو انھوں نے یہ مورتی اس مندر میں رکھی تھی۔ اس یاترا کے دو برس بعد خودی رام کا دوسرا لڑکا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے رامیشور رکھا۔ ۱۸۳۵ء میں انھوں نے گیا کی یاترا کی۔ اس متبرک مقام پر خودی رام نے خواب دیکھا کہ "وشنو مہاراج کہہ رہے ہیں کہ میں پھر دنیا میں آ رہا ہوں اور اب کے تمھارے گھر میں میرا جنم ہوگا۔" انھیں دنوں سوامی رام کرشن کی ماں پر بھی کمار پوکور میں شیوجی کے مندر میں کیفیت طاری ہو گئی تھی اور انھیں یہ دکھایا گیا تھا کہ تمھارے پیٹ سے ایک رشی جنم لینے والا ہے۔ غرض ۱۸ فروری ۱۸۳۶ء کو وہ بچہ پیدا ہوا جو آگے چل کر رام کرشن کے نام سے مشہور ہوا۔ گیا کے خواب کی مناسبت سے اس کا نام گدادھر (عصا بردار) رکھا گیا جو وشنو کا ایک لقب ہے۔

گدادھر بچپن میں بہت تندرست و توانا تھے اور اپنی عمر کے سب بچوں کی طرح بہت شریر اور بے چین۔ کھیل کود اور اچھل پھاند میں ان کا دل لگتا تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ بہت سمجھ دار اور ذہین رس تھے اور خدا نے انھیں غیر معمولی اور حیرت انگیز قوت حافظ عطا فرمائی تھی۔ اپنے باپ کی گود ہی میں انھوں نے اپنے اسلاف کے نام اور بہت سے بھجن یاد کر لیے تھے۔ جب کچھ بڑے ہوئے تو گاؤں کے پاٹھ شالہ میں لکھا پڑھا سیکھا۔ اسی چھوٹی سی عمر میں انھیں ہندو دیومالا یا علم الاساطیر اور رزمیہ نظموں کی کہانیوں اور سورماؤں کے کارناموں سے بڑی دل چسپی تھی۔ اس قسم کی کہانیاں وہ گاؤں کے ان پڑھ لوگوں کو اکثر سنایا کرتے تھے۔ انھیں مصوری سے بھی ذوق تھا اور انھوں نے گاؤں کے کمہاروں سے مٹی کی مورتیاں بنانے کا کام بھی سیکھا تھا لیکن ریاضی سے وہ ہمیشہ گھبرائے۔

گدادھر کی عمر چھ یا سات سال کی ہوگی جب پہلی مرتبہ ان پر پریم آنند یا وجد کی کیفیت طاری ہوئی۔ جون یا جولائی کا مہینہ تھا۔ وہ دھان کے کھیتوں کے بیچ میں ایک پٹیا پر مُرمُرے چباتے ہوئے جا رہے تھے۔ اوپر نظر جو اٹھائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ آسمان پر سیاہ بادل چھاتے جا رہے ہیں اور برف کی طرح سفید سفید قازوں کی ایک قطار سامنے سے گزر رہی ہے۔ سفید اور سیاہ کے تقابل کی خوبصورتی اور دل فریبی نے بچے کو مست اور محو کر دیا۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور بے سدھ اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا اور سارے مُرمُرے بکھر گئے۔ گاؤں کے کچھ لوگ اُدھر سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے اسے گود میں اٹھایا اور گھر پہنچا دیا۔ اس واقعہ کے ایک مدت بعد گدادھر اکثر کہا کرتے تھے کہ "اس دن ایک ناقابلِ بیان کیفیت میں نے محسوس کی تھی۔"

گدادھر کو وجدانی کیفیت سے یہ پہلا سابقہ تھا لیکن اس میں بھی حسن کارانہ جذبہ اور فطری جمال کی کشش کارفرما تھی جو انھیں خدا کے قریب تر لائی۔ بنگال فنکاروں اور شاعروں کی سرزمین ہے۔ رام کرشن اسی سرزمین کے پھول تھے جس نے سارے عالم کو معطر کر دیا۔ ننھے منے رام کرشن پر اسی وقت سے نظریں پڑنے لگیں۔

گدادھر کی عمر سات سال تھی جب ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس واقعے نے انھیں اور بھی متاثر کیا۔ پہلی مرتبہ انھیں اس امر کا اندازہ ہوا کہ زندگی ناپائیدار ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ اکثر بغیر کسی سے کہے سنے نکل جاتے اور گھنٹوں آم کے باغ میں یا شمشان میں بیٹھے خدا جانے کیا کیا سوچا کرتے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ گھر کے دھندوں میں اپنی ماں کی مدد کرنے لگے۔ پڑھنے لکھنے اور مذہبی کہانیاں سننے کا شوق انھیں اور زیادہ ہو گیا۔ ان یاتریوں اور سادھو سنتوں میں بھی اب وہ بہت دلچسپی لینے لگے جو پوری جاتے ہوئے کمار پوکور سے گزرتے تھے۔ ان مقدس یاتریوں نے گدادھر کو ہندو مہاکاویہ یا رزمیہ نظموں کی کہانیاں اور سنیاسیوں اور خدا رسیدہ بزرگوں کی داستانیں اور خود اپنی مہمات کے افسانے سنائے۔ گدادھر ان کی سیوا کرتے ان کیلئے پانی بھر بھر کر لاتے، ان کیلئے ایندھن اکٹھا کرتے اور ان کی عبادت اور ان کے دھیان گیان اور مراقبے کی حالت کو غور سے دیکھا کرتے۔

نو سال کی عمر میں گدادھر کو جنیو پہنایا گیا۔ اس سے انھیں خاندانی دیوتا رگھو ویر کی پوجا کا حق حاصل ہو گیا اور ایک برہمن کی زندگی کی سخت پابندیاں ان پر عاید ہو گئیں۔ جنیو پہنانے کی رسم جاری ہی تھی کہ انھوں نے ایک شودر عورت کا پکایا ہوا کھانا کھا لیا۔ اس سے ان کے عزیز و اقربا کو بڑا دکھ ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ بات یہ تھی کہ

ایک مرتبہ فصل کو دیں انھوں نے اس عورت سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے گھر بھوجن کروں گا۔ اس دن وہ بھی وعدہ پورا کرنے گئے تھے۔ بہرحال "رگھوبیر" کی پوجا کی اجازت ملنے کے بعد گویا ان کے دھیان گیان کی مشق اور تربیت کا دور شروع ہو گیا اور وہ اس میں اس قدر غرق ہو گئے کہ پتھر کی مورتی ان کیلئے دیوا بن گئی

اسی زمانے میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ تیوہاروں کے سلسلہ میں کامارپوکور میں ڈراما کھیلا جا رہا تھا اس ڈرامے کا خاص اداکار جو شیو جی کا پارٹ ادا کرنے والا تھا بیمار پڑ گیا اور اس کی جگہ کام کرنے کیلئے گدادھر کو منتخب کیا گیا جب انھیں شوجی کا پارٹ ادا کرنے کیلئے سجایا بنایا گیا ان کے جسم پر راکھ ملی گئی بالوں کی سجاوٹ کی گئیں، ترسول ان کے ہاتھ میں دیا گیا۔ ایک مالا ان کے گلے میں پہنائی گئی تو گدادھر بے سدھ سے ہو گئے اور اسٹیج پر بہت آہستہ آہستہ کچھ لوگوں کے سہارے آئے حاضرین نے خوب تالیاں بجائیں۔ وہ اس حالت کو ان کی ایکٹنگ کا کمال سمجھنے لگے کچھ ہی دیر بعد یہ بات معلوم ہو گئی کہ وہ دھیان میں ایسے غرق ہیں کہ انھیں اپنی سدھ بدھ نہیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ان کے چہرے سے ان پر دھیان تمانا تھا۔

گدادھر کے بڑے بھائی رام کمار ۱۸۴۹ء میں کلکتہ چلے گئے اور کچھ دنوں بعد انھوں نے گدادھر کو بھی وہیں بلا لیا اس وقت ان کی عمر سولہ سال کی تھی۔ انھیں کلکتہ کے بعض خاندانوں میں پجاری کی خدمات سپرد ہوئیں جو انھوں نے بڑی محبت اور خوش اسلوبی سے انجام دیں مگر ان کی پوجا کا طریقہ پیشہ ور پجاریوں سے مختلف تھا۔ وہ گھنٹوں مورتیوں کو سجاتے سنوارتے اور بھجن گاتے رہتے۔ پوجا میں ان کے جوش و خروش اور خلوص کا اثر لوگوں پر بہت ہوا رام کمار نے اپنے حساس بھائی کے طریقوں کی مخالفت تو نہیں کی لیکن ان کی خواہش یہ ضرور تھی کہ وہ دنیا سے اتنے بے پروا نہ رہیں رام کمار نے انھیں سمجھایا کہ تم تعلیم حاصل کرو، آخر تمھیں بحیثیت ایک برہمن کے بہت سے فرائض انجام دینے ہیں اور یہ فرائض بغیر مہا ونا ستر اور علم نجوم حاصل کئے انجام نہیں دئے جا سکتے۔ گدادھر نے بہت جوش میں جواب دیا "بھائی مجھے پیٹ پالنے کے لئے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے مجھے ایسے گیان کی ضرورت ہے جو میرے دل کو روشن کر دے اور جس سے مجھے سکون اور اطمینان نصیب ہو۔"

کلکتہ اس وقت ہندوستان کا دارالسلطنت تھا اور اس دور کی معاشرت اور ثقافت کا مرکز تھا مگر وہاں سماج کے اعلیٰ طبقوں میں حرص و ہوس کا بازار گرم تھا اور کبھی کبھی جب کوئی مذہبی رسم وہ ادا کرتے تھے تو وہ بالکل بے روح سی ہوتی تھی۔ گدادھر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انھوں نے کامارپوکور کے سیدھے سادے لوگوں میں بالکل اس کے برعکس کیفیت دیکھی تھی۔ جن سادھوؤں اور سراگیوں سے بچپن میں انھیں واسطہ پڑا تھا انھوں نے جو ہندوستان ان کی نظر کے سامنے پیش کیا تھا وہ اس سماج سے بالکل مختلف تھا۔

اسی زمانے میں کلکتے میں ایک مالدار بیوہ عورت رہتی تھی یہ عورت شودر تھی اور اس کا نام رانی رسمنی تھا۔ یہ بڑی قابل، سمجھدار اور باہمت عورت تھی اور رانی کی فیاضی، تقدس اور خدا پرستی کا بڑا چرچا تھا۔ اس کی ریاست کا انتظام اس کے داماد ماتھر موہن کرتے تھے۔ رانی نے [illegible] میں دکھشنیشور میں جو کلکتہ سے چار میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں تھا ۲۰ ایکڑ زمین خریدی اور وہاں کئی مندر تعمیر کرائے اور ایک بہت خوبصورت باغ لگایا۔ ان مندروں میں سب سے زیادہ خصوصیت جس مندر کو حاصل تھی وہ کالی ماتا کا مندر تھا جہاں اس کی پوجا بھوا تارنی (محافظ کائنات) کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ اس مندر کا افتتاح ۳۱ مئی ۱۸۵۵ء کو بڑے دھوم دھام سے کیا گیا۔ گدادھر اپنے بڑے بھائی رام کمار کے ساتھ دکھشنیشور آ گئے۔ رام کمار یہاں کالی ماتا کے پجاری مقرر ہو کر آئے تھے۔ یہاں آ کر گدادھر جی کا نام رام کرشن ہو گیا۔ کہتے ہیں یہ نام ماتھر بابو نے رکھا تھا۔ آئندہ سطور میں ہم ان کو رام کرشن ہی کے نام سے یاد کریں گے۔

شروع شروع میں سوامی رام کرشن کو اپنے بھائی کے یہاں آنے اور اچھوت رسمنی کا پجاری بننے پر اعتراض تھا۔ جو بھوجن مندر میں پکتا تھا اور مورتیوں پر چڑھایا جاتا تھا اس کے کھانے پر بھی انھیں اعتراض تھا کیونکہ ہندوؤں میں رواج ہے کہ صرف برہمنوں کے گھر میں تیار کیا ہوا کھانا مورتیوں پر چڑھایا جا سکتا ہے لیکن مندر کی خوبصورتی

اس کے نواح کی مقدس فضا، چاروں طرف کے جنگل کی تنہائیاں، بھائی کی محبت اور سب سے زیادہ گنگا کا قرب، ان سب چیزوں نے انکے دل پر قبضہ جما لیا اور وہ دکھشنی میشور کو پسند کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ماتھر بابو نے سوامی رام کرشن کے اوصاف کا اندازہ کرلیا۔ انکی خواہش یہ تھی کہ وہ کالی ماتا کے مندر کے پجاری بن جائیں مگر سوامی رام کرشن آزاد رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ مندر کے زیورات اور دوسری قیمتی چیزوں کی ذمہ داری سے گھبراتے تھے۔

انہی دنوں دکھشنی میشور میں ایک نوجوان لڑکا ہردے آیا یہ لڑکا سوامی رام کرشن کا رشتہ دار تھا اور بچپن میں ان کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ وہ بہت سمجھ دار، پھرتیلا اور موقع شناس تھا۔ اس نے سوامی رام کرشن کی بڑی خدمت کی اور سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہنے لگا۔ ماتھر بابو کے اصرار پر سوامی جی نے اس شرط پر پجاری کے فرائض ادا کرنے کی خدمت منظور کرلی کہ ہردے کو ان کی مدد کیلئے مقرر کیا جائے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ رادھا کانت مندر کے پجاری کے ہاتھ سے کرشن جی کی مورتی گر پڑی اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پنڈتوں نے رانی کو رائے دی کہ دوسری مورتی مندر میں رکھیں کیونکہ ٹوٹی ہوئی مورتی کی پوجا شاستروں کی رو سے ٹھیک نہیں ہے۔ رانی کو کرشن جی کی یہ مورتی بہت پسند تھی، انھوں نے سوامی رام کرشن کی رائے پوچھی اس وقت ان پر کچھ محویت سی طاری تھی بولے "آخر مورتی بدلی کیوں جائے اگر آپ کے داماد کی ٹانگ ٹوٹ جائے تو کیا آپ انھیں نکال باہر کریں گی اور ان کی جگہ دوسرا داماد لائیں گی؟ یہی معاملہ مورتی کا بھی ہے آپ اس مورتی کی مرمت کرا دیجیے۔" رانی کو ان کی رائے بہت پسند آئی۔ مورتی کی مرمت خود سوامی جی نے کر دی۔ وہ پجاری جس سے مورتی ٹوٹی تھی برخاست کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ سوامی رام کرشن رادھا کانت مندر کے پجاری مقرر ہو گئے۔

رام کمار جی کا ۱۸۵۶ء میں انتقال ہو گیا۔ اب سوامی جی کے دل پر دنیا کی بے ثباتی کا نقش اور زیادہ گہرا ہو گیا اور ان کی محویت اور استغراق میں بہت اضافہ ہو گیا۔

کالی ماتا کی پوجا نے اب دوسرا رنگ اختیار کیا۔ سوامی رام کرشن کو یہ آرزو ستانے لگی کہ میں "کائنات کی ماں" کے درشن کروں۔ جو وقت مندر کی دیکھ بھال اور پوجا پاٹ سے بچتا اسے وہ "ماتا" کے دھیان میں صرف کرنے لگے۔ اس مقصد کیلئے انھوں نے ایک ایسی جگہ تلاش کرلی "جہاں کوئی نہ ہو"۔ مندر کے شمال میں ایک بہت گھنا جنگل تھا سنتے ہیں پہلے وہاں مرگھٹ تھا اس لئے لوگ دن میں بھی وہاں جاتے ہوئے گھبراتے تھے اور مشہور تھا کہ اس جگہ بھوت پریت ہیں سوامی رام کرشن وہاں رات رات بھر دھیان گیان میں گزارتے اور صبح ہوتے اپنے کمرے میں آتے اس وقت ان کی آنکھیں سوجی ہوئی ہوتیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خوب روئے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سوامی رام کرشن کی خواہش کے مطابق پانچ درخت لگائے گئے ہیں۔ یہ جگہ "پنچ وٹی" کے نام سے مشہور ہے۔

اب اکثر ایسا ہونے لگا کہ پوجا کے لگے بندھے طریقوں اور قاعدوں کا بھی وہ خیال نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ گھنٹوں مورتی کے سامنے بیٹھے رہتے اور کملا کانت اور رام پرشاد کے بھجن گاتے رہتے۔ وہ روتے، چیختے اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ان کی حقیقی ماں ان سے بچھڑ گئی ہے اور اس سے ملنے کے لئے وہ تڑپ رہے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے منھ سے نکلتا: "اے ماں کیا سچ مچ تیرا وجود ہے یا یہ سب محض افسانہ ہے؟ محض شاعری ہے اور حقیقت میں کچھ نہیں ہے؟ اگر تیرا وجود ہے تو پھر میں کیوں تیرے دیدار سے محروم ہوں کیا دھرم محض ایک وہم ایک خیال ہے اور تو انسان کی قوت متخیلہ کا ایک کرشمہ ہے؟" کالی دیوی کے عشق نے انھیں دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس کی مورتی کو مس کرنا، اس کو سینے سے لگانا، اس کے منھ سے ایک لفظ سننا، اس میں زندگی کے آثار پانا، یہی ان کی زندگی کا خاص مقصد بن گیا۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ دو دو تین تین گھنٹے چٹائی پر بے حس و حرکت بیٹھے رہتے تھے۔ اکثر وہ ایسے مدہوش اور محو ہو جاتے کہ انھیں اپنی خبر نہ رہتی۔ کھانا پینا چھوٹ جاتا اور ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے وہ سونا تو جانتے ہی نہیں۔

آخر ان کی آرزو بر آئی اور انھیں "کالی ماتا" کا دیدار نصیب ہوا۔ اس کا حال خود ان کی زبان سے سنئے: "مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی

نے جیسے دل کو ایک بھیگے ہوئے تولیے کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا ہو اور میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس زندگی میں تو مجھے ماتا کی حقیقت سے آگاہی میسر نہیں ہوگی مگر مجھ سے ماتا کی جدائی بھی اب برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ زندگی بے کار معلوم ہونے لگی۔ اس وقت میری نظر اس تلوار پر پڑی جو ماتا کے مندر میں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ایک دیوانے کی طرح جھپٹ کر تلوار اٹھائی کہ اپنی زندگی کو ختم کر دوں۔ یکایک ماتا نے خود کو مجھ پر منکشف کر دیا۔ مندر اور ساری عمارتیں میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ وہاں کوئی چیز باقی نہیں رہی اور ان سب چیزوں کی جگہ گیان اور آگاہی کا اتھاہ اور بے پایاں سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا جہاں تک نظر جا سکتی تھی چمکتی ہوئی موجیں شور کرتی ہوئی دل ہلاتی ہوئی ہر چہار جانب سے میری طرف بڑھ رہی تھیں تاکہ مجھے نگل جائیں۔ میرا دم پھول رہا تھا۔ میں ہانپ رہا تھا۔ موجوں کے اس طوفان میں پھنس کر میں دفعتاً گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا تھا مگر میرا دل "مہا آنند" یا کامل مسرت و راحت سے لبریز تھا اور ماتا کا ظہور محسوس کر رہا تھا"۔ اس روز جب سوامی جی کو ہوش آیا تو انکی زبان سے "ماتا" نکلا۔

اس کے بعد سے ان پر اکثر وجد کی سی کیفیت طاری ہونے لگی یہاں تک کہ مندر میں رہنے والے انھیں دیوانہ سمجھنے لگے۔ ان کے بہی خواہوں نے ان کا علاج بھی کرایا مگر ان پر کسی دوا کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انھیں کبھی کبھی خود بھی یہ خیال ہوتا تھا کہ میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ وہ اکثر بہ آواز بلند "ماتا" کو پکارتے "ماتا! مجھے منتر نہیں آتے۔ میں شاستروں سے واقف نہیں۔ مجھے تم سکھا دو کہ میں تم تک کیوں کر پہنچوں۔ تمھیں کیونکر حاصل کروں۔ میری محافظ اور میری جائے پناہ اور میری رہنما تم ہی ہو"۔ ہوتے ہوتے ان کے زہد و اتقا کا اثر سب پر ہونے لگا اور وہ لوگ تک جو ان کو سیدھے راستے سے بھٹکا ہوا سمجھتے تھے اور نکتہ چینی کیا کرتے تھے سوامی جی کے تقدس اور ان کی بے ریائی، دیانت داری اور پارسائی سے بہت متاثر ہونے لگے۔

کمار پوکور میں ۱۸۵۸ء میں یہ خبریں پہنچیں کہ سوامی رام کرشن کی صحت خراب رہتی ہے اور دنیاوی معاملات کی طرف وہ بالکل توجہ نہیں کرتے۔ ان کی والدہ یہ خبریں سن کر بہت پریشان ہوئیں۔ انھوں نے اصرار کر کے انھیں گاؤں میں بلا لیا۔ وہاں بھی ان کا حال نہیں بدلا۔ بچپن کے دوست احباب سے اب انھیں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ دن اور رات کا زیادہ حصہ ایک شمشان میں گزارتے تھے۔ آخر

اس میں ماں کے پاس کچھ دن رہنے کے بعد ان کی صحت بہتر ہو گئی اور ان کی بچپن کی خوش طبعی عود کر آئی۔ ماں نے سوچا کہ ان کی شادی کر دینی چاہئے۔ بیوی انھیں دنیا سے قریب تر لے آئے گی۔ اس وقت سوامی جی کی عمر ۲۳ سال تھی۔ انھوں نے خود بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی عادت کے مطابق شادی کو بھی انھوں نے خدا کی مرضی پر محمول کیا ہو۔ انھوں نے خود ہی ماں کو یہ بھی بتایا کہ لڑکی کس خاندان میں ڈھونڈنی چاہئے۔

کمار پوکور کے پاس ہی ایک گاؤں جے رام باڑی تھا۔ وہاں ایک پانچ سالہ لڑکی ساردامنی اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی اور اسی عمر میں وہ دعائیں مانگا کرتی تھی کہ "اے خدا مجھے نیک اور پاک دامن بننے کی راہ دکھا"۔ وہ چاند کو دیکھتی تو کہتی "اے خدا چاند میں بھی دھبے ہیں۔ میرے کردار کو ایسا بنا دے کہ اس میں کوئی دھبہ نہ ہو"۔ سوامی رام کرشن کے ساتھ شادی کیلئے یہی لڑکی منتخب کی گئی۔

شادی کی رسم ادا ہو گئی۔ ہندوستان میں بچپن کی شادی کا رواج بہت پرانا ہے مگر اصل میں یہ بیاہ نہیں ہوتا تھا بلکہ سگائی ہوتی تھی۔ بیاہ اس وقت مکمل ہوتا تھا جب لڑکی بالغ ہو جاتی تھی۔ مگر سوامی جی کی سگائی ہمیشہ سگائی ہی رہی۔ سوامی جی تقریباً ڈیڑھ سال کمار پوکور میں ماں کے پاس رہنے کے بعد دکھشنیشور چلے آئے۔

کالی ماتا کے مندر میں قدم رکھتے ہی ان کا جوش و خروش پھر عود کر آیا وہی وجدانی حالت۔ وہی "دھیان گیان" کا انداز۔ وہی سوز و دروں، وہی گریہ و زاری اور وہی دنیا و مافیہا سے بے خبری۔

رانی رسمنی کا ۱۸۶۱ء میں انتقال ہو گیا اور ماتھر بابو رانی کی جائداد کے منتظم مقرر ہوئے۔ ماتھر بابو سوامی رام کرشن کے بڑے معتقد تھے اور ان کی تمام ضرورتوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔

اسی زمانے میں ایک برہمن خاتون دکھشنیشور میں آئیں۔ یہ مشرقی بنگال کی ایک ہندو راہبہ یا سنیاسنی تھیں اور تانترک اور ویشنو طریقوں

کی پوجا میں مہارت رکھتی تھیں۔ ان کی عمر تقریباً پچاس سال تھی اور
چند کتابیں اور دو چار موٹی جھوٹی ساریاں ان کا کل اثاث البیت تھا۔
سوامی رام کرشن نے بہت عزت و احترام کے ساتھ اس برہمن راہبہ
کا خیر مقدم کیا اور اپنے روحانی تجربوں اور مراقبوں وغیرہ کا حال
سنایا اور کہا "لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں"۔ برہمن راہبہ نے جواب دیا "بیٹا!
اس دنیا میں سب ہی دیوانے ہیں۔ کچھ روپیہ کیلئے دیوانے ہیں کچھ جسمانی
آرام و راحت کیلئے کچھ نام و نمود کیلئے تم خدا کیلئے دیوانے ہو" انھوں
نے یہ بھی کہا کہ "تم پر جو حالت طاری ہے اسے شاستروں میں "مہا بھاؤ" کے
نام سے یاد کیا گیا ہے جو خدا کی محبت کی ایک انتہائی وجد انگیز کیفیت ہے۔
اس کے اظہار کی انیس جسمانی علامتیں بیان کی گئی ہیں جن میں گریہ وزاری
اعضائے جسم کی لرزش اور سوز دروں بھی شامل ہیں"۔

اب سوامی جی برہمن راہبہ کو ماں کہنے لگے اور وہ انھیں "بال کرشن"
سمجھنے لگیں۔ کیرتن اور مراقبہ اور سمادھی کے موقعوں پر انھوں نے سوامی جی
کی حالت کا بغور معائنہ کیا اور یہ رائے قائم کی کہ "یہ کیفیت سوائے بھگوان
کے اوتار کے اور کسی پر طاری نہیں ہو سکتی"۔ انھوں نے بار بار اس امر کا اعلان
کیا کہ رام کرشن مہاتما بدھ اور چیتنیہ کی طرح بھگوان کے اوتار ہیں۔ مگر ماتھر بابو
باوجود اس کے کہ وہ سوامی رام کرشن کی روحانی عظمتوں کے قائل تھے
انھیں اوتار ماننے کو تیار نہیں تھے اس برہمن راہبہ نے کہا کہ "دو دانوں اور
مہاپنڈتوں کی سبھا منعقد کرو۔ میں اس مسئلہ پر لوگوں سے گفتگو کروں گی"۔
ماتھر بابو اس پر راضی ہو گئے اور نٹ مندر میں یہ سبھا منعقد ہوئی اس
زمانے کے دو مشہور پنڈت ویشنو اچارن اور گورن خاص طور پر مدعو کئے
گئے پہلے ویشنو اچارن مع چند اور پنڈتوں کے آئے۔ برہمن راہبہ نے اپنا
خیال ان پر ظاہر کیا اور شاستروں کی سند پیش کی۔ پنڈتوں نے دھرم کے
اس اہم مسئلہ پر بحث شروع کی۔ سوامی رام کرشن بھی بیچ میں بیٹھے ہوئے تھے
بحث کے بعد سری ویشنو اچار اٹھے اور انھوں نے اعلان کیا کہ "سوامی رام
پر "مہا بھاؤ" کی کیفیت طاری ہوئی ہے۔ مہا بھاؤ خدا کے انسانی روپ میں
ظاہر ہونے کی علامت ہے۔ یہ سن کر سوامی رام کرشن نے جھک کر ماتھر بابو
کے کان میں کہا "دیکھئے یہ بھی وہی بات کہہ رہے ہیں کم سے کم اس سے یہ تو
معلوم ہو گیا کہ میں کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوں" جب کچھ دن بعد پنڈت
گورن وہاں پہنچے تو ایک اور سبھا منعقد کی گئی اور اس سبھا نے بھی برہمن راہبہ
اور ویشنو اچارن کے خیالات سے اتفاق کیا مگر ان سب باتوں کا سوامی رام
کرشن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

مدتوں کی عبادت و ریاضت کے بعد سوامی رام کرشن کو سکون میسر
ہو گیا اور وہ لوگوں کو ایک معمولی انسان نظر آنے لگے اور ان کے گرد مجمع
رہنے لگا۔ اب انھوں نے سادھو سنتوں سے ملنا جلنا اور ان کی صحبت
سے فائدہ اٹھانا بھی شروع کر دیا۔

دکھشنی ایشور کی مقدس فضا اور ماتھر بابو کی فیاضی اور قدر دانی
اکثر سادھوؤں اور دھرماتماؤں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی اور بڑی بڑی
مقدس ہستیاں دکھشنی ایشور میں عبادت و ریاضت کیلئے آتی رہتی تھیں
سوامی رام کرشن کا مطالعہ بہت معمولی تھا لیکن دھرم شاستر سے وہ پورے
طور پر آگاہ تھے۔ یہ سب انھوں نے بڑے بڑے مذہبی علما و فضلا کی صحبت سے
حاصل کیا تھا۔ ایک دفعہ ایک چیلے نے پوچھا کہ "آپ کو اس قدر وسیع مذہبی
معلومات کیوں کر حاصل ہوئیں؟" تو انھوں نے جواب دیا "میں نے پڑھا لکھا کچھ نہیں
جو کچھ حاصل کیا ہے بڑے بڑے پنڈتوں کی صحبت سے حاصل کیا ہے۔ میں نے
ان کی ودیا کی مالا بنائی اور اسے ماتا کے چرنوں میں رکھ دیا"

سوامی رام کرشن کا عقیدہ تھا کہ سب مذہبوں کی منزل ایک
ہی ہے۔ راستے مختلف ہیں۔ اب انھوں نے مختلف مذاہب کے متعلق
عملی تجربات بھی شروع کئے ۱۸۶۶ء کے اختتام پر انھوں نے ایک
مسلمان بزرگ کو اپنا پیر بنایا اور ان کی رہنمائی میں مسلمانوں کا سا لباس
پہن کر "اللہ اللہ" کا ورد کیا۔ نمازیں بھی ادا کیں اور ہندو دیوی دیوتاؤں
کو بالکل فراموش کر دیا یہاں تک کہ وہ کالی ماتا کو بھی بھول گئے اور
مندر میں رہنا اور وہاں آنا جانا ترک کر دیا آس پاس کے علاقے میں یہ
بات مشہور ہو گئی کہ سوامی جی مسلمان ہو گئے مندر کے باہر ایک جھونپڑی
میں رہنے لگے وہ کہتے ہیں کہ "تین روز بعد مجھے ایک نورانی صورت نظر آئی جو
میری روح میں سما گئی اس کے بعد وہ پھر مندر میں چلے آئے"۔

ان کے ایک چیلے متھورن ملک ۱۸۷۳ء میں ان کی فرمائش پر انھیں
انجیل کے بعض حصے پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ سوامی جی پر حضرت عیسیٰ کی
زندگی کے واقعات کا بڑا اثر ہوا۔ تین روز تک پھر وہ کالی ماتا کے مندر میں

نہیں گئے۔ چوتھے روز انھوں نے ایسا محسوس کیا جیسے عیسیٰ خود
ان کے دل میں اتر گئے ہوں۔ اس کے بعد وہ پھر "ماتا" کے
چرنوں میں پہنچ گئے۔

سوامی جی کہتے ہیں: "میں نے سب مذہبوں پر عمل کیا ہے۔ ہندو مذہب،
اسلام، عیسائیت۔ اور میں ہندوؤں کے مختلف فرقوں کی راہ پر بھی چلا
ہوں میں نے یہ پایا کہ ایک ہی خدا ہے جس کی طرف سب جا رہے ہیں۔ ہاں
راستے مختلف ہیں تمھیں چاہیے کہ ایک مرتبہ سب مذہبوں پر چل کر دیکھو۔
میں جس طرف دیکھتا ہوں لوگوں کو مذہب کی آڑ لے کر لڑتے ہوئے پاتا ہوں
ہندو، مسلمان، برہمو، وشنو وغیرہ سب ہیں لیکن وہ اتنا نہیں سوچتے کہ جسے "کرشن"
کہتے ہیں وہی شیو ہے اور اسی کو عیسیٰ اور اللہ کہتے ہیں۔ رام ایک ہی ہے نام
بہت سے ہیں۔ ایک تالاب کے بہت سے گھاٹ ہیں، ایک گھاٹ سے ہندو
گھڑوں میں پانی بھرتے ہیں اور اسے جل کہتے ہیں، دوسرے سے مسلمان
مشک میں پانی بھرتے ہیں اور اسے پانی کہتے ہیں، تیسرے سے عیسائی پانی
بھرتے ہیں اور اسے واٹر کہتے ہیں کیا پانی اور واٹر جل نہیں ہے؟ کس قدر مضحکہ خیز
بات ہے۔ چیز ایک ہی ہے نام مختلف ہیں۔ سب کو اپنے اپنے مذہب پر قائم
رہنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص حقیقت میں دل سے خدا کو تلاش کرنا چاہتا ہے
تو وہ اپنا مقصد حاصل کر لے گا چاہے وہ کوئی طریقہ کیوں نہ اختیار کرے۔

سوامی رام کرشن ۱۸۶۷ء میں اپنے گاؤں کمارپوکر تبدیل آب و
ہوا کی غرض سے آئے۔ وہاں کی خاموش اور پر امن فضا اور سیدھے سادے
لوگ جن میں سے اکثر ان کے بچپن کے ساتھی تھے اور ہرے بھرے کھیتوں نے
ان کی صحت کو بہت فائدہ بخشا۔ ان کی بیوی سارداد یوی بھی جو اب چودہ
سال کی تھیں کمارپوکر پہنچ گئیں۔ وہ بھی اپنا زیادہ وقت پوجاپاٹ میں
گزارتی تھیں۔ سارداد یوی اب ان کی سیوا کرنا چاہتی تھیں۔ سوامی جی نے
انھیں اجازت دیدی۔ ان چند دنوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ایک دفعہ
کہا تھا: "مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے ایک گھڑا شانتی سے بھر کر میرے
دل میں رکھ دیا ہے۔ میری راحت کا کون اندازہ کر سکتا تھا!" مگر دکشنیشور
لوٹنے کے بعد ان کی پھر وہی حالت ہو گئی۔

جب سارداد یوی تک یہ خبر پہنچی کہ سوامی جی دیوانے ہو گئے ہیں
۱۸۷۲ء میں وہ اپنے پتی کی سیوا کرنے کے لیے اپنے پتا کے ساتھ اتنی میل
پیدل چل کر دکشنیشور پہنچیں۔ جیسے ہی سوامی جی کی نظر ان پر پڑی کہنے لگے:
"تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ ماتھر بابو اب نہیں ہیں۔ تمھاری دیکھ بھال
کون کرے گا اور تمھارے آرام کا کون خیال رکھے گا!" اس وقت ماتھر بابو
کا انتقال ہو چکا تھا۔

اب سوامی جی اپنی نوجوان بیوی کی تربیت کی طرف رجوع ہوئے۔
انھیں گھرداری کے ڈھنگ سکھائے اور مختلف خیال اور مختلف مزاج کے
لوگوں سے برتاؤ کرنے کے طریقے بتلائے۔ روحانی زندگی کے بھید آشکار کیے۔
پرارتھنا، دھیان، جپ اور سمادھی کی مشق کرائی۔ سب سے پہلا سبق جو سارد ا
دیوی نے سیکھا یہ تھا: "خدا سے ہر شخص پریم کرتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے چاند
کو سب بچے بہت پسند کرتے ہیں۔ ہر شخص کو خدا کی عبادت کا یکساں حق حاصل
ہے۔ اپنے فضل و کرم سے وہ سب کو اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ اگر تم اس کی دل
سے عبادت کرو گی تو تم بھی اس کا جلوہ دیکھو گی۔"

سارداد یوی کے دکشنیشور میں آنے کے چند مہینے بعد سوامی رام کرشن
نے ایک دن کالی ماتا کی ایک خاص پوجا کا انتظام کیا اور ماتا کی مورتی
پوجا کے لیے رکھنے کے بجائے انھوں نے سارداد یوی کو ماتا کی جگہ بٹھا دیا اور
دیوی اور پجاری دونوں بے سدھ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب سوامی جی کو
ہوش آیا تو انھوں نے بھجن گانے شروع کیے اور اپنی مالا بھی جاگتی دیوی
کے قدموں پر رکھ کر خود بھی ان کے چرنوں میں گر پڑے۔ اُپنشد میں ایک جگہ
آیا ہے: "اے خدا تو ہی عورت ہے، تو ہی مرد ہے، تو ہی لڑکا ہے، تو ہی لڑکی
ہے، تو ہی بوڑھا ہے، تو ہی جوان ہے، تو ہی کائنات کے اندر مختلف شکلوں میں
ظاہر ہوتا ہے۔"

اپنی شادی سے سوامی جی نے اس بات کو واضح کیا کہ انسان کے روحانی
ارتقا میں شادی کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ ضبطِ نفس، پاک دامنی،
پرہیزگاری خدا تک رسائی کے لیے ضروری چیزیں ہیں اور یہ بیوی کی مدد
سے بہت خوبی کے ساتھ حاصل ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی سے
ثابت کر دکھایا کہ میاں بیوی روحانی ساتھیوں کی طرح زندگی بسر کر سکتے
ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی ایک گرہست اور ایک جوگی کی زندگی کا مرکب تھی۔

ایک دن سارداد یوی نے سوامی جی کے پاؤں دباتے ہوئے پوچھا: "آپ
مجھے کیا سمجھتے ہیں؟" فوراً جواب ملا: "ماتا جس کی پوجا مندر میں کی جاتی ہے

میری ماں پھر اسی نے مجھے جنم دیا ہے اور وہی اس وقت میرے پاؤں دبا رہی ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ کالی ماتا تمھارا روپ بھر کر میرے پاس آگئی ہے"!

خود سارداد یوی کو اپنے پتی کی صحبت میں طرح طرح کے روحانی تجربات ہوئے۔ ان کا بیان ہے "جب میں ان کی مختلف حالتیں دیکھتی تھی تو جو عجیب و غریب عروج و انبساط میری روح کو حاصل ہوتا تھا وہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ الہامی جوش کے اثر میں وہ کبھی کبھی بعض دقیق اور پیچیدہ مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ کبھی ہنستے تھے کبھی روتے تھے اور کبھی سمادھی میں بالکل بے حس و حرکت ہو جاتے تھے۔ یہی کیفیت ساری ساری رات رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو ان پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ میں خوف سے کانپنے لگتی تھی اور سوچا کرتی تھی کہ دیکھئے رات کیوں کر کٹتی ہے۔ مہینوں اسی طرح گزر گئے۔ آخر ایک دن انھیں معلوم ہو گیا کہ میں رات رات بھر اس لئے جاگا کرتی ہوں تو انھوں نے مجھے ہدایت کی کہ "میں سو جایا کروں۔"

سوامی رام کرشن کی ملاقات ۱۸۷۵ء میں کیشب چندر سین سے ہوئی۔ کیشب برہموسماج[1] کے مشہور لیڈر تھے۔ وہ مع اپنے چند احباب کے دکھشنیسور سے چند میل کے فاصلہ پر بیل گھاریہ میں جے گوپال سین کے یہاں قیام پذیر تھے۔ یہیں سوامی جی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی۔ بعض حیثیتوں سے دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ادصاف کے مالک تھے لیکن دونوں کی باطنی کشش اتنی قوی تھی کہ وہ ساری عمر ایک دوسرے کے دوست رہے۔ کیشب چندر مورتی پوجن کو بت پرستی سے تعبیر کرتے تھے اور ہندو دیوتاؤں کی مثالیہ اور مجازیہ توضیح کرتے تھے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے اور بڑے فصیح البیان مقرر تھے اور اکثر رسالوں میں مضامین لکھتے رہتے تھے اور ان کی بڑی شہرت تھی۔ سوامی جی کو ابھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ ایک غیر معروف گاؤں میں خلوت گزین تھے۔ کیشب چندر معاشرتی اصلاح کے علم بردار تھے سوامی جی کے نزدیک زندگی کا مقصد خدا کی معرفت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کیشب چندر خود کو حضرت عیسیٰ کا چیلا سمجھتے تھے۔

سوامی جی کالی ماتا کے بیٹے سادے فرزند تھے۔ کیشب چندر بال بچوں والے آدمی تھے اور اپنے بچوں کی تربیت اور فلاح و بہبود میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ سوامی جی پرم ہنس تھے، سنیاسی تھے اور دنیوی علایق سے قطعاً بے تعلق تھے۔ ان تمام اختلافات کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے تھے اور ایک دوسرے سے بڑے خلوص کے ساتھ ملتے تھے اور دونوں میں اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں دکھشنیشور میں بھی اور برہمو سماج کے مندر میں بھی ہوتے ہونے برہمو سماج کے دوسرے لیڈروں پر بھی سوامی جی کا اثر ہونے لگا گو وہ لوگ سوامی جی کے بعض راہبانہ اور مرتاضانہ طریقوں کو عوام کے لئے ناقابل عمل سمجھتے تھے وہ لوگ ان کی سمادھی کو بھی کسی اعصابی عارضے سے تعبیر کرتے تھے لیکن اس کے باوجود سوامی جی کی مقناطیسی شخصیت کی طرف برابر کھنچے چلے آتے تھے۔

برہمو سماج کے رسالوں میں ۱۸۷۹ء کے قریب سوامی رام کرشن پر متعدد مضامین نکلے جن کو پڑھ پڑھ کر اکثر تعلیم یافتہ بنگالی سوامی جی کی خدمت میں آنے لگے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی آمدورفت بہت زیادہ ہو گئی اور قریب قریب ہر عقیدے کے آدمی سوامی جی کے پاس آنے لگے جنھیں کٹر ہندو بھی تھے، برہمو بھی تھے، ویشنو بھی تھے، سناتن دھرمی بھی تھے، تعلیم یافتہ بھی تھے، جاہل بھی تھے، بوڑھے بھی تھے، جوان بھی، مہاراجہ بھی تھے، فقیر بھی تھے، فلسفی بھی تھے، دنیادار بھی تھے۔ سب ان سے فیض پاتے تھے کوئی محروم نہ رہتا تھا۔

سوامی جی نے کبھی معلم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہ فرمایا کرتے تھے "یہ خیال کہ لوگ مجھے گرو سمجھیں یا پتا سمجھیں یا معلم سمجھیں میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔" جب وہ آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھے رہتے تھے تب بھی ان کا کچھ عجیب پراسرار اثر لوگوں پر پڑتا تھا۔ انھوں نے کبھی کسی مذہب کے بانی ہونے کا یا کسی نئے فرقہ کے قائم کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس کے باوجود انھیں

---

[1] برہمو سماج انیسویں صدی کی وہ اہم تحریک ہے جس نے ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ میں بڑا حصہ لیا۔ برہمو تحریک کے بانی راجہ رام موہن رائے تھے۔ یہ سماج انھوں نے ۱۸۲۸ء میں قائم کیا۔ سماج کا مقصد تھا "اس کی پرستش کرنا جو ازلی اور ابدی ہے۔ قدیم اور غیر متغیر ہے۔ وہی کائنات کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی اس کی حفاظت کرتا ہے"۔ اس سماج میں ہر مذہب اور ہر ذات اور ہر قوم کے لوگ شامل ہو سکتے تھے۔

اتھادرما کا مذہبی حوسس تھا وہ سب مذہبوں کو سچا جانتے تھے۔ اپنے چیلوں کے ساتھ ان کا برتاؤ ایک ماہر باغبان کا سا تھا جو زمین درست کر دیتا ہے اور گھاس پھوس اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ بچوں کو قدرت نے اُگنے اور بڑھنے کی قوت عطا کی ہے۔ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق نشو و نما پائیں گے اور سب میں الگ الگ پھول اور پھل لگیں گے۔ انھوں نے کبھی اپنے خیالات کسی پر لادنے کی کوشش نہیں کی۔ انھیں تمام انسانوں کی مشکلات کا اچھی طرح اندازہ تھا وہ جانتے تھے کہ جو چیز ایک شخص کیلئے بہتر ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسرے کیلئے بھی بہتر ہو

سوامی جی کے گلے میں ۱۸۸۵ء میں تکلیف ہو گئی۔ زیادہ دیر تک باتیں کرنے تو اس تکلیف میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور صبح سے شام تک انھیں بولنا پڑتا تھا مرض بڑھتا رہا۔ آخر علاج کے لئے ان کو تمام پوکورے آئے جو کلکتہ کے شمالی حصہ میں ہے چند روز بعد شاردا دیوی بھی وہیں آگئیں بیماری برابر طول کھینچتی رہی تین چار مہینے کے بعد ڈاکٹروں کے مشورے سے شمالی کلکتہ کے ایک دوسرے حصے کوسی پور کے مکان میں انھیں منتقل کر دیا گیا جہاں وہ آٹھ مہینے تک بیمار رہے۔

ایک دن پنڈت ششادھر نے کہا کہ اگر سوامی جی اپنی تمام توجہ اپنے گلے کی طرف مرتکز کر دیں تو تکلیف دور ہو جائے گی۔ شاستروں میں ہے کہ یوگیوں میں اس طرح اپنی تکلیفیں دور کرنے کی طاقت ہوتی ہے سوامی جی نے فوراً انھیں سرزنش کی "آپ جیسے وِدوان پنڈت کے لئے اس قسم کی تجویز پیش کرنا شرم کی بات ہے۔ میں بھلا یہ کیوں کر کر سکتا ہوں کہ اپنی توجہ خدا کی طرف سے ہٹا لوں اور اس گوشت اور خون کے پنجرے کی طرف پھیر دوں۔"

نرندر اور دوسرے چیلوں نے کہا "کم سے کم ہمارے لئے ایسا کیجئے۔"

سوامی جی نے جواب دیا: "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس تکلیف سے خوش ہوں۔ میری صحت کا بحال ہونا ماتا کی مرضی پر ہے۔"

اگست ۱۸۸۶ء کی پندرہ تاریخ تھی اتوار کا دن تھا۔ سوامی جی کی نبض ناہموار ہو گئی اور سانس لینا مشکل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے کہا مجھے بھوک معلوم ہو رہی ہے۔ کچھ رقیق غذا ان کے منھ میں ڈالی گئی۔ تھوڑی سی غذا ان کے حلق سے اتر گئی اور باقی بہہ کر ٹھوڑی پر آ گئی۔ چیلے جو پاس کھڑے تھے انھیں پنکھا جھلنے لگے بدن اکڑ گیا۔ رات گئے تک یہی حالت رہی لیکن آدھی رات بعد وہ اٹھکر تکیوں کے سہارے بیٹھ گئے نرندر اُن کے پیر اپنی گود میں رکھ کر دبانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے کہا مجھے لٹا دو اور ترنم کے ساتھ کالی ماتا کا نام جپنے لگے پھر گلے میں ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی وہ ایک طرف کو جھک گئے۔ یہ اُن کی مہا سمادھی تھی!

شاردا دیوی اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سوامی جی کے انتقال کی خبر سن کر وہ رونے لگیں۔ اسی وقت ان کے کانوں میں آواز آئی: "میں تو صرف ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا ہوں۔"

شاد کی غزل گوئی

بسلسلۂ صفحہ ۹

"بھی" کے لفظ سے تمنا کی شدت، وسعت اور ابدیت ظاہر ہوتی ہے "جامہ زیبی" اور "صنم تنگ قبا" کی حسین ترکیبیں کتنی معنویت بہ آغوش ہیں "جامہ زیبی" سے حسنِ ازل کی حد کامل ہو جاتی ہے اور انسان اُس کی دُہائی دیتا ہے لیکن ہمارے ارمان پورے ہو نہیں پاتے۔ بشر ہمیشہ تشنہ و محروم ہے۔ ہماری محرومی سے اُس کے حسنِ کامل پر حرف نہیں آتا وہ ہماری جہت سے "صنم تنگ قبا" ہے۔ لیکن "تنگ قبائی" سے بھی تو نکھار اور اُبھار ظاہر ہوتا ہے۔ نکھار اور اُبھار حماں کے تیکھے پن، کٹیلے پن، نکیلے پن اور انیلے پن کی دلیلیں ہیں۔ "کچھ تو دامن کو جھکا!" کی طلب میں کتنی تھکی ہوئی حسرت سامانیاں الہ کناں ہیں۔ "دامن" کا لفظ کائنات بہ داماں ہے۔ شعر پھر پڑھیے، بولتی ہوئی تصویر کی آفاقی پیش کش کو عظیم و بے کراں کینوس پر اُبھرتے ہوئے چشم تصور سے دیکھیے اور تخیلی صنم سازی کی ڈرامائی رفعت و افتادگی کے ابعاد کا جائزہ لیجیے شعر کا داستانی اور محاکاتی رنگ بھی کتنا روشن، جلیل و جمیل ہے۔

بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ہے ارماں، تاب اُٹھنے کی کہاں

جامہ زیبی کا بھلا اے صنم تنگ قبا! کچھ تو دامن کو جھکا!

سلسلۂ شاد کی یہ دوسری کڑی تھی۔ تیسری کڑی میں شاعر کے فن کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

کاظمی بانو ضیا

دیارِ شوق کی نظر نظر کو دیکھتی ہوں میں
نظر نظر میں اک نئی سحر کو دیکھتی ہوں میں

ابھی سفر کی زندگی نصیب ہی کہاں مجھے
ابھی کھڑی ہجومِ رہ گزر کو دیکھتی ہوں میں

تلی دَلی سی ہر کلی، جلا بجھا سا ہر دیا
مآلِ شامِ رنگ و بو سحر کو دیکھتی ہوں میں

مری نظر کا پھیر ہے کہ انقلابِ آسماں
لباسِ راہزن میں راہبر کو دیکھتی ہوں میں

غمِ جہاں سے بھی سوا ہیں میری غم پسندیاں
کہ مسکرا کے اپنی چشمِ تر کو دیکھتی ہوں میں

جو کارواں ہے مختصر تو کوئی غم نہیں مجھے
کہ کارواں کے جذبۂ سفر کو دیکھتی ہوں میں

حدیثِ شوق چھیڑیے ہجومِ رنج و یاس میں
جدھر ہے تھوڑی روشنی ادھر کو دیکھتی ہوں میں

نگاہ اشتیاق کی گواہ، شامِ آرزو
دیا جلائے کب سے رہ گزر کو دیکھتی ہوں میں

غمِ جہاں کا اے ضیا میں غم کروں تو کس لئے
کہ ہر شبِ سیاہ میں سحر کو دیکھتی ہوں میں

ذوق اور فنِ موسیقی

محمد انصار اللہ نظر

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات وغیرہ میں متعدد مقامات پر شیخ محمد ابراہیم ذوق کی علمِ موسیقی سے واقفیت کا بیان کیا ہے! ایک جگہ لکھتے ہیں

"وہ (استاد ذوق) کہتے تھے کہ اگرچہ شعر کا مجھے بچپن سے عشق ہے مگر ابتدا میں دنیا کی شہرت اور ناموری اور تفریحِ طبع نے مجھے مختلف کمالوں کے رستے دکھائے۔ چند روز موسیقی کا بھی شوق ہوا اور کچھ حاصل بھی کیا مگر حادثِ پیش سے ایک بڑا صاحب کمال گویا آیا، اُس سے ملاقات کی باتوں باتوں میں اس نے کہا کہ جو گانے کا شوق کرے اُس کے لئے تین سو برس کی عمر چاہیئے۔ سو برس سیکھے، سو برس سُنتا پھرے اور جو سیکھا ہے اُسے مطابق کرے پھر سو برس بیٹھ کر اوروں کو سُنائے اور اُس کا لطف اٹھائے۔ یہ سُن کر دل برداشتہ ہو گیا اُدھر یہ بھی خیال آیا کہ ابراہیم اگر بڑا کمال پیدا کیا تو ایک ڈوم ہو گئے۔ اِس پر بھی جو کلاونت ہوگا وہ ناک چڑھا کر یہی کہے گا کہ "عطائی" ہیں۔[1]"

ذوق نے بقول آزاد مرشد زادوں کے مشغلۂ موسیقی کے لئے کئی غزلیں کہی تھیں۔ اِن میں سے ایک غزل کا ایک مصرع ہے ع

۱۔ دشمنِ جاں یک بہ یک سارا زمانہ ہو گیا

---

[1] آبِ حیات ۵۰۸ [2] دیوان ذوق مرتبہ آزاد مطبوعہ علمی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۳۳ء مطابق ۱۳۵۱ھ : ۲۲

مولانا محمد حسین آزاد اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یہ غزل ایک مرشد زادے کی فرمایش سے کہی تھی انھیں گانے بجانے کا بہت شوق تھا اسی کے لئے غزل کہلائی تھی[3]" ایک اور جگہ ان غزلوں کے بارے میں مزید تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ چار غزلیں مرقوم الذیل ابتدائی مشق کی ہیں اور انھیں غزلوں میں سے ہیں جنھیں استاد مرحوم کہتے تھے کہ بعض مرشد زادوں کی فرمائش سے ان کے مشغلۂ موسیقی کے لئے لکھ دی تھیں[4]"۔

۱۔ ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو
۲۔ عبث تم اپنا رکاوٹ سے منھ بناتے ہو[5]
۳۔ جو کھوے قدِ یار کی تصویر دکھا دو
۴۔ دم ذبح تیغِ جفا میں جب تری بہتا آبِ حیا ہو[6]

---

[3] دیوان ذوق مرتبہ آزاد مطبوعہ ۱۹۳۳ء ۸۱

[4] ایضاً : ۱۶۲

[5] یہ غزل ۱۲۴۸ھ سے قبل کی ہے اس کا یہ مطلع گلشن بے خار مولفۂ شیفتہ ۱۲۴۸ھ میں بھی نقل ہوا ہے۔

[6] اس غزل کے متعلق مولانا محمد حسین لکھتے ہیں "ایک بڈھے نے ایک دن کہا کہ ہمیں تمھارے استاد کی ایک غزل یاد ہے وہ بے چارہ بے علم تھا اور طولِ عمر نے بدحواس کر دیا تھا غلط سلط جو کہتا گیا میں نے لکھ لیا۔ استاد کو

مولانا محمد حسین ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ "غزلوں کے علاوہ ذوق نے ہزاروں گیت، ٹپے، ٹھمریاں، ہولیاں کہیں (لیکن) ان باتوں میں وہ اپنی شہرت نہ چاہتے تھے[۵]" بہرحال یہ ٹھمریاں، ہولیاں وغیرہ سب ضائع ہوگئیں اور آج اس بیان کی واقعیت پر بھی شبہ ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ امر کہ ذوق کے تلامذہ میں بعض ایسے بھی تھے جو گیت اور ٹپے وغیرہ ہی لکھتے تھے آزاد کے مذکورہ قول کی تصدیق کے لئے بہت ہے۔ ذوق کے ان تلامذہ میں دولت رام شفق[۶] کا نام خصوصاً قابل ذکر ہے جو علم سے بہرہ ور نہ ہونے کے سبب کامیاب غزل اور نظم کہنے میں کامیاب نہ ہوسکتے تھے۔ چنانچہ ٹپے اور ٹھمریاں ہی لکھتے تھے اور اس کے لئے مشہور رہوئے۔ ذوق سے اُن کا تلمذ خود اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ذوق نہ صرف ٹپے اور ٹھمریاں وغیرہ لکھتے تھے یا لکھ سکتے تھے بلکہ اس میدان میں بھی اُن کو استادی کا درجہ حاصل تھا۔ اسکے علاوہ ٹپہ، ٹھمری، ہولی اور گیت وغیرہ ہندی گانے کی قسمیں ہیں اور اُن کا لکھنا بھی ذوق کی موسیقی سے واقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ نقل کرتا ہوں جو مولانا محمد حسین آزاد نے دیوان ذوق میں تحریر کیا ہے۔

"ایک دن ٹہل رہے تھے حافظ ویران ساتھ تھے۔ تقاضائے سنّ سے تھک کر بیٹھ گئے اور وقت معین سے زیادہ دیر ہوئی انھوں نے قریب جاکر خیال کیا تو کچھ گنگنا رہے ہیں اور چٹکی سے جوتی پر کھٹ کھٹ کرتے جاتے ہیں پوچھا کہ ابھی آپ فارغ نہیں ہوئے؟ فرمایا کہ حضور نے چلتے ہوئے ایک ٹھمری کے دو تین انترے سنائے تھے کہ اسے پورا کردیا اس وقت اس کا خیال آگیا پوچھا کہ یہ جوتی پر آپ چٹکی کیوں مارتے تھے؟ فرمایا کہ دیکھتا تھا اس کے لفظ تال پر ٹھیک بیٹھتے ہیں یا نہیں[۸]"

ذوق کی موسیقی سے واقفیت کا اندازہ مولانا محمد حسین آزاد کے ان بیانات ہی سے نہیں ہوتا ہے بلکہ خود ذوق کے متعدد اشعار اس امر کا ثبوت ہیں کہ انھیں ہندوستانی موسیقی اور ایرانی موسیقی دونوں سے کافی لگاؤ تھا۔ یہ تو یقینی طور سے نہیں کہا جاسکتا کہ ذوق کو گانے بجانے کا بھی شوق تھا یا یہ کہ وہ موسیقی کے واقعی بڑے ماہر تھے لیکن ان اشعار سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ انھیں ایرانی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی دونوں کے تمام اصطلاحات وغیرہ کا ضرور کافی علم تھا مثلاً ان کا ایک شعر ہے ؎

مائل موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا[۹]
کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چاروں مت

یہ شعر اگرچہ قصیدہ کا ہے لیکن اس سے یہ بہرحال ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر ایرانی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی دونوں سے واقف ہے "بارہ مقام" ایرانی موسیقی کے اور "چاروں مت" ہندوستانی موسیقی کی اصطلاحات

لاکر سنائی تو ہنسے اور فرمایا بہت لڑکپن کی غزل ہے کہاں سے ہاتھ آگئی سرسری طور پر درست کرکے لکھوادی۔" (دیوان ذوق مرتبہ آزاد ۱۶۴)۔
ایک ہی غزل کے متعلق یہ دو مختلف بیانات ملتے ہیں نہیں کہا جاسکتا کہ یہ فرق کیوں واقع ہوا۔ اگر اوّل الذکر (مندرجہ اصل متن) یہ خیال کریں تو یقیناً یہ غزل آغاز شباب سے پہلے کی نہیں ہوسکتی کیونکہ ذوق نے فن موسیقی کو حاصل کرنے کے بعد ہی "متعلق موسیقی" کیسلئے غزلیں لکھنی شروع کی ہوں گی لیکن بحوالہ الذکر بیان کی روشنی میں یہ غزل "بہت لڑکپن" کی کاوش ہے۔

۵ دیوان ذوق مرتبہ آزاد مطبوعہ ۱۹۳۳ء ۳ ۴۵ وغیرہ آب حیات مصنفہ آزاد ۵،۶ وغیرہ۔

۶ شفق تخلص دولت رام گلفروش باشندہ دہلی، سعید رشق محقق ناجوانہ شاگرد ذوق ہیں، ہندی کی ٹھمری اور ٹپہ وغیرہ بھی کہتے ہیں جن میں "چھیل رنگ" تخلص کرتے ہیں، نصیباً رنڈی جو گانے والی مشہور تھی حضرت اس پر فریفتہ تھے اس کی فرمائش سے اکثر چیزیں بنایا کرتے تھے اب غدر کے بعد جب رنڈی مذکور نے کسی یار سے نکاح پڑھوا لیا تو ان عزیز نے بھی ٹھمری، ٹپہ کہنا چھوڑ دیا۔
(بحوالہ تذکرہ آثار الشعرائے ہنود مصنفہ منشی دیبی پرشاد بشاش مطبوعہ ۱۸۸۵ء : ۸۲) اس کے علاوہ دیکھئے خمخانۂ جاوید جلد پنجم مصنفہ لالہ سری رام (ذکر شفق) وغیرہ۔

۸۔ دیوان ذوق ص۴۶ ۔ آب حیات ص۶۱۵ واضح رہے کہ حافظ ویران نابینا تھے۔

۹ دیوان ذوق مرتبہ آزاد مطبوعہ ۱۹۳۲ء میں پہلا مصرعہ اس طرح تحریر ہے "ماہر موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا۔" لیکن دیوان ذوق مطبوعہ علی پرنٹنگ پریس لاہور ص۸۵ اور دیوان ذوق مطبوعہ مطبع نول کشور کانپور جنوری ۱۸۸۱ء

ہیں جن کی تشریح آگے کی جائے گی۔

یہی نہیں کہ ذوق نے اپنے اشعار میں موسیقی کی اصطلاحات اور مزامیر وغیرہ کا ذکر کرکے اپنی موسیقی دانی کا ثبوت دیا ہے بلکہ اُن کے اس قسم کے اشعار کے مطالب سمجھنے کے لئے بھی موسیقی کی اصطلاحات وغیرہ سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ جو شخص ان اصطلاحات سے واقف نہیں ہے وہ ایسے شعروں کا مطلب نہ خود سمجھ سکتا ہے نہ دوسروں کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ اور اگر سمجھانے کی کوشش کرے گا تو اس کا بیان کردہ مطلب غلط ہوگا۔ مثلاً ذوق کا ایک شعر ہے ؎

تا خراسان و عراق و زابل و نیریز سے
نغمہ ریز فارس آباد ان کرے اپنا مقام

ڈاکٹر سر شاہ سلیمان صاحب جیسی فاضل ہستی نے بھی اس شعر کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور خراسان و عراق و زابل و نیریز کو چار ملکوں کا نام لکھا ہے[10] حالانکہ یہ سب علم موسیقی کے اصطلاحات ہیں۔ لفظ "مقام" نے بھی غالباً انھیں دھوکا دیا۔ بہرحال، ذوق نے اس قسم کی اصطلاحات کو بہ کثرت نظم کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

بزم خسرو میں جیسے اے باربد بزم سخن
سب یہ کہتے ہیں کہ تو نکتہ سرائی میں ہے طاق
تیرا قانون ترے پاس خط مسطر ہے
چھیڑے زابل و نیریز و خراسان و عراق
تیرے آگے ترے مضموں ہیں بہ شہہائے قلم
دم کشی پہ ہے سر دست کمربستہ دیاق

ان اشعار کا مطلب سمجھنے کے لئے ان تمام اصطلاحات سے بھی واقفیت ضروری ہے جو ان اشعار میں آئے ہیں۔ سب سے پہلے خسرو اور باربد کے تعلق کو سمجھ لیا جائے۔ خسرو پرویز ہرمز بن نوشیرواں کا بیٹا اور شیریں[11] کا عاشق تھا۔ یہ بادشاہ موسیقی کا بھی بڑا قدرداں تھا۔ اس کا درباری مغنی باربد تھا جسے بادشاہ کی خدمت میں ہمہ وقت جانے کی اجازت تھی اور یہی خصوصیت اس کی اس نام آوری کا سبب ہوئی۔ "باربد" دو لفظوں سے مرکب ہے۔ بار۔ بد۔ بار بہ معنی دخل و رخصت اور بد بمعنی خداوند و دارندہ۔ باربد کو اپنے فن میں وہی شہرت اور عظمت حاصل ہے جو حاتم کو سخاوت میں یا رستم کو شجاعت میں ہے ـــــ ذوق کو بادشاہ نے "ملک الشعرا" کا خطاب دیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ "قوت مشقی جو ذوق کو تھی ریختہ گویوں میں کسی کو نہیں"[12]۔ بادشاہ بھی ان کی ہر طرح قدر کرتے تھے۔ چنانچہ ذوق نے خود کو "باربد بزم سخن" کہا اور اپنے ممدوح (بادشاہ) کو "خسرو"۔ (واضح رہے کہ لفظ خسرو بادشاہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے)۔ "قانون" لغت میں "اصل ہر چیز، وسط کتاب، مسطر جدول و میز مقیاس ہر شے کے معنی میں آتا ہے۔ سریانی یا یونانی زبان کا لفظ ہے۔" اصطلاح میں اس سے ایک ساز مراد لیتے ہیں جو ایک تختہ کی طرح ہوتا ہے اور اس پر بہت سارے تار لپٹے ہوتے ہیں۔ ان تاروں سے راگ پیدا ہوتے ہیں۔ ذوق نے اس لفظ کو لغوی اور اصطلاحی دونوں معنوں میں نظم کرکے بندش کا حق ادا کیا ہے۔ باربد کے ساتھ "قانون" کا ساز لاکر "بزم" میں نغمے پیدا کئے ہیں۔ "زابل و نیریز و خراسان و عراق" یہ چاروں مقامات موسیقی ہیں۔ "مقام" اصطلاح میں "پردۂ سرود" کو کہتے ہیں۔ فارسی موسیقی میں کل بارہ مقامات مقرر ہیں۔ یہ بارہ مقامات بارہ بروج[13] فلکی کی مناسبت سے ہیں اور ان کی ترتیب اس طرح ہے۔ اول رہاوی، دوم حسینی، سوم راست

---

[10] قصائد ذوق مرتبہ شاہ سلیمان صاحب مطبوعہ ۱۹۳۲ء

[11] شیریں کا ایک عاشق فرہاد بھی تھا جو کوہکن کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے پہاڑ کھود کر نہر نکالی تھی۔ ذوق نے کوہکن اور خسرو دونوں کا ذکر ایک شعر میں کیا ہے ؎
دل سنگین خسرو پر بھی ضرب اے کوہکن پہنچے ۔ اگر تیشہ سر کہسار پہ مارا تو کیا مارا

[12] گلشن بے خار مولفہ شیفتہ مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۴ء ص۲۴۔ آثار الصنادید مصنفہ سر سید مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۶ء ص۱۱۸-۱۱۹۔ سخن الشعرا از عبدالغفور خاں نساخ مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۴ء۔ طور کلیم مصنفہ نور الحسن خاں مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۲۹۸ھ : ۳۸ وغیرہ۔

[13] بارہ بروج ان کے خواص اور دیگر تفصیلات آئندہ ذوق کے علم نجوم کے سلسلہ میں انشاء اللہ پیش کروں گا۔

چہارم حجاز، پنجم بزرگ، ششتم کوچک، ہفتم عراق، ہشتم صفاہان، نہم نوا، دہم عشاق، یازدہم زنگلہ، دوازدہم بوسلیک۔ ہر مقام کے لئے دو گھنٹہ کا وقت مقرر ہے۔ اس طرح دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں پر ان کو تقسیم کر دیا گیا ہے تفصیل اوقات یہ ہے :

۱۔ رہاوی ۔ صبح صادق سے طلوع آفتاب تک ۔
۲۔ حسینی ۔ طلوع آفتاب سے ایک پہر دن چڑھے تک ۔
۳۔ عراق ۔ ایک پہر دن چڑھے سے دوپہر تک ۔
۴۔ راست ۔ عین دوپہر میں ۔
۵۔ کوچک ۔ دوپہر سے ایک پہر دن ڈھلے تک ۔
۶۔ بوسلیک ۔ ایک پہر دن ڈھلے سے ایک پہر دن رہے تک ۔
۷۔ عشاق ۔ ایک پہر دن رہے سے زردئی آفتاب تک شام
۸۔ زنگلہ ۔ ایک پہر رات گئے تک ۔
۹۔ حجاز ۔ دو گھڑی رات گئے تک ۔
۱۰۔ بزرگ ۔ آدھی رات سے پہلے تک ۔
۱۱۔ نوا ۔ آدھی رات گئے تک
۱۲۔ صفاہان ۔ بعد آدھی رات طلوع صبح صادق تک ۔

ہر مقام کی پستی اور بلندی سے ایک ایک "شعبہ" کا استخراج کیا گیا ہے۔ اس طرح ہر مقام کے دو شعبے ہوئے اور شعبوں کی مجموعی تعداد چوبیس ہوئی ۔ دو دو مقامات کو ترکیب دے کر "ایک آہنگ" ایجاد کیا گیا اور کل چھ آہنگ مقرر ہوئے۔ اس طرح مختلف شعبوں سے چند نغمات نکالے گئے۔ ان سب کی تفصیل طوالت بے جا کا سبب ہو گی اس لئے صرف شعبوں کے ناموں پر اکتفا کرتا ہوں۔

رہاوی ـــ ۱۔ نوروز عرب ـــ چھ نغمات سے مرکب ہے
۲۔ نوروز عجم ـــ چھ " " "
حسینی ـــ ۱۔ دوگاہ ـــ دو " " "
۲۔ محیر ـــ چھ " " "
راست ـــ ۱۔ پنجگاہ ـــ پانچ " " "
۲۔ مبرقہ ـــ
حجاز ـــ ۱۔ سہ گاہ ـــ تین " " "
۲۔ حصار ـــ آٹھ نغمات سے مرکب ہے
بزرگ ـــ ۱۔ ہمایوں ـــ
۲۔ ہفت ـــ
کوچک ـــ ۱۔ رکب ـــ چھ " " " " "
۲۔ بیات ـــ پانچ " " " " "
عراق ـــ ۱۔ مخالف ـــ پانچ " " " " "
۲۔ مغلوب ـــ آٹھ " " " " "
نوا ـــ ۱۔ نوروز خارا ـــ پانچ " " " " "
۲۔ ماہور ـــ چھ " " " " "
صفاہان ـــ ۱۔ نیریز ـــ پانچ " " " " "
۲۔ نشاپور ـــ چھ " " " " "
عشاق ـــ ۱۔ زابل ـــ تین " " " " "
۲۔ اوج ـــ آٹھ " " " " "
زنگلہ ـــ ۱۔ چہارگاہ ـــ چار " " " " "
۲۔ عزال ـــ پانچ " " " " "
بوسلیک ـــ ۱۔ عشیران ـــ دس " " " " "
۲۔ صبا ـــ پانچ " " " " "

شعر مذکور میں زابل و نیریز دو شعبوں کے نام ہیں۔ عراق مقام موسیقی ہے اور خراسان ایک نغمہ ہے۔ عراق سے صفاہان تک (جس کا شعبہ نیریز ہے) دن اور رات کے تقریباً تمام اوقات پورے ہو جاتے ہیں۔ شعر میں بارھوں مقامات کا نظم کرنا ضروری نہ تھا اس لئے ذوق نے صرف منتخب چار مقامات کا ذکر کر کے بات پوری کر دی۔ "(چار دُ مت" ہندی موسیقی کی اصطلاح ہے اور ان سے دن اور رات کے وہ مختلف اوقات ظاہر ہوتے ہیں جن میں مختلف راگ گائے جاتے ہیں)

ذوق نے، اپنے بعض دوسرے اشعار میں بھی ایرانی موسیقی کے "مقامات" کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ؎

نغمہ ناہید لقب جس کا ہے رقاص فلک تھا چپ و راست رہ آہنگ رہاب و عشاق[۱۴]

---

[۱۴] یہاں فی الحقیقت "رہاوی" ہونا چاہئے۔ یہی آہنگ "اور" عشاق" کے

دوسرے مصرعہ میں نہ صرف مقام اول ودھم کا نام آیا ہے بلکہ اصطلاح "آہنگ" کا صرف بھی کیا گیا ہے۔ اس اصطلاح کا صرف ایک اور شعر میں اس طرح بھی کیا گیا ہے ؎

ذوق مستی سے ہے طاؤس چمن میں رقاص
شوق آہنگ سے ہے سرو پہ قمری قوال

اب ذوقؔ کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

مدھم و پنچم، کھرج، گندھار، دھیوت اور نکھاد
نغمۂ ہندی کا ہو وے سات سُر سے انتظام

اس شعر میں ہندی موسیقی کا حوالہ ہے۔ سُر ہندی موسیقی کی اصطلاح ہے اور یہ سات ہیں۔ ان کی حقیقت اس طرح ہے کہ موسیقی کے پنڈتوں نے گانے کی مددتوں کے مطابق چند آوازوں کو تناخت کیا اُن کو اصطلاح میں شُرتی کہتے ہیں۔ سارنگ دیو نے سنگیت درپن میں بائیس شُرتیاں بیان کی ہیں[۱۵] انھیں سے سات سُر اخذ کئے گئے ہیں۔ ذوقؔ نے اس شعر میں صرف چھ کے نام لئے ہیں۔ ساتویں سُر یعنی رکھب کا ذکر نہیں کیا اور یہ غالباً ضرورتِ شعری کے سبب سے ہے۔ ان ساتوں سُروں کے نام کے پہلے حرف کو ملا کر "سرگم" بناتے ہیں۔ وہ اس طرح: سا (सा)۔ سرج یا شڑج یا کھرج۔ رے (रे)۔ رکھب۔ گا (गा)۔ گندھار۔ ما (मा) مدھم۔ پا (पा) پنچم۔ دھا (धा) دھیوت۔ نی (नी) نکھاد یا نشاد۔ ہندی میں لفظ "سُر" دو طرح لکھا جا سکتا ہے۔ सुर سُر اور स्वर سوَر

سُر سات ہیں۔ सुर سُر سے مُراد آواز کی کمی و زیادتی سے لیتے ہیں۔ مثلاً اونچا سُر تیز آواز کو کہتے ہیں۔

ذوقؔ ان سروں کی تفصیلات سے بھی واقف معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے:

اس قدر سازِ طرب ساز کی آواز بلند
چھیڑیں گر تارِ کھرج کا تو ہو پیدا دھیوت

اسی طرح ایک اور شعر ہے ؎

ہوگے جس سازِ خدا ساز کو آغوش میں آج
تار چھیڑو گے کھرج کا تو سنو گے پنچم

اصل یہ ہے کہ کھرج پہلا سُر ہے اور بہت نیچے سُروں میں گانا عموماً ممکن نہیں ہوتا اسی طرح بہت اونچے سُر میں بھی گا لینا ہر شخص کا کام نہیں یہی ایک سبب ہو سکتا ہے کہ ذوقؔ نے سات سُر گنائے لیکن رکھب کا نام لینا ضروری نہ سمجھا۔ بہرحال آخر الذکر دونوں اشعار کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ آج خوشی کا عالم یہ ہے کہ اگر پہلے سُر میں بھی ساز چھیڑیں تو آواز اتنی تیز اور بلند ہوگی گویا دھیوت اور پنچم جیسے اونچے سُروں میں ساز چھیڑا گیا ہو۔

جس طرح فن شعر کے لئے علم عروض لازم و ملزوم ہے اسی طرح موسیقی میں "تال" مقرر ہیں۔ فارسی میں ان کو "بحر اصول" کہتے ہیں ہندی موسیقی میں ان کی تعداد بارہ ہے اور فارسی میں سترہ۔ ان کی تفصیل یہاں ضروری نہیں معلوم ہوتی البتہ دونوں مقامات پر بعض "تالوں" کے نام مشترک ہیں۔ مثلاً فاختہ ضرب یا اُصول فاختہ (فارسی) یا سُر فاختہ (ہندی) اور چہار ضرب (فارسی) یا چوتالہ (ہندی) وغیرہ۔ تال کے لئے کچھ آوازیں (بول) مقرر ہیں جو طبلہ کی آوازوں کے مطابق ہیں مثلاً "دھا دِھن دِھن دھا۔ دھا دِھن دِھن دھا۔ دھا دِھن دِھن دھا۔ تا تِن تِن تا۔" ان آوازوں کی مطابقت ہی سے رقص و سرود کو مربوط طور پر جاری رکھا جاتا ہے۔ ایک شعر میں ذوقؔ نے تال دینے کے مخصوص انداز کو بیان کیا ہے ؎

پتلیاں ناچتی ہیں چشم کے گھر میں بے ساز
جنبشِ دستِ مژہ دے ہے اس انداز سے تال

مناسب ہوگا۔ شاید کتابت کی غلطی سے "رہاب" لکھا گیا ہے اس شعر میں ذوقؔ نے "شش آہنگ" میں سے ایک کا ذکر کیا ہے یعنی وہ آہنگ جو رہاوی و عشاق کی ترکیب سے مستخرج ہے اور رقاص فلک "اسی آہنگ" کے ساتھ محو رقص ہے۔ ص۱۴ الف۔ ثریا چند ستاروں کے مجموعہ کا نام ہے ان کو ترتیب دے کر چلتر نگ بنا لیا خوب ہے۔ ایاق یا ایاغ پیالے کو کہتے ہیں۔ گویا ہر ستارہ ایک پیالہ ہے

[۱۵] معارف النغمات مصنفہ محمد نواب علی خاں مطبوعہ نور المطابع لکھنؤ (طبع ثانی)

سُر اور تال کی مطابقت سے راگ پیدا ہوتے ہیں، یہ راگ چھ ہیں اور ہر راگ کے لئے اوقات مقرر ہیں۔ یعنی سال کے بارہ مہینوں پر ان کو تقسیم کرکے ہر ایک کے لئے دو دو ماہ مقرر کئے گئے اور دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے ہر راگ کے لئے چار گھنٹے کا وقت معین کیا گیا۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ بھیرو یا بھیروں۔ کوار اور کاتک کے مہینوں میں دو گھڑی رات رہے سے صبح تک۔

۲۔ مالکوس۔ اگھن اور پوس میں طلوع آفتاب سے ایک پہر دن چڑھے تک۔

۳۔ ہنڈول۔ ماگھ (یا ماہ) اور پھاگن میں ایک پہر دن چڑھے سے قریب دوپہر تک۔

۴۔ شری راگ۔ چیت اور بیساکھ میں بعد سہ پہر سے شام تک۔

۵۔ میگھ ملار راگ، ملار راگ۔ ساون بھادوں میں آدھی رات سے صبح کاذب تک لیکن بارش کے دنوں میں روز و شب۔

۶۔ دیپک راگ۔ جیٹھ اساڑھ میں دوپہر سے ایک پہر دن رہے تک۔

ایک بات یہاں اور عرض کردوں کہ راگ کی آواز جس مقام پر ٹوٹے گی وہاں لازماً تال کو بھی پورا ہو جانا چاہئیے یعنی یہ کہ کسی تال کے درمیان میں آواز ختم نہیں کی جاسکتی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ راگ کو جاری رکھتے ہوئے دوسری تال شروع کردی جائے۔ مثلاً "خط الف" سے ایک راگ شروع ہوا۔ پھر اسی خط پر پہنچ کر تال بھی ختم ہوئی اور مغنی نے بھی سانس لی پھر اسی خط سے راگ شروع ہوا، "ب" پر تال ضرور ختم ہوئی

الف
راگ
ب
الف

لیکن مغنی نے راگ کو جاری رکھا۔ اب یہ راگ بغیر خط الف تک پہنچے (جہاں دوسری تال ختم ہوگی) ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس بات کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ تاوقتیکہ بحر کے تمام ارکان پر کوئی مصرعہ حاوی نہ ہو وہ موزوں نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر شاعر اپنے میں اتنی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ ارکان کی تعداد دو چند بھی کرسکتا ہے مثلاً ایک مصرعہ کے لئے عام وزن ہے " فعولن فعولن فعولن فعولن "۔ اب ان کی تعداد دو چند بھی کی جاسکتی ہے۔ یعنی ایک ہی مصرعہ میں آٹھ بار تکرار کی جاسکتی ہے مثلاً ؎

تمنا نہیں ہے کہ امداد دل کو تپش کا صلہ ہو کہ شرر قلق ہو
یہی حق ہے قاتل اگر حق دلادے یہ بسمل ترے پاؤں پر جاں بحق ہو

گویا اوزان کی تکرار تو ممکن ہے لیکن تاوقتیکہ تکرار مکمل نہ ہو جائے مصرع موزوں نہ ہوگا یعنی اگر بجائے آٹھ مرتبہ کے "فعولن" کی پانچ چھ یا سات بار تکرار کرکے ہم شعر مکمل کرنا چاہیں تو وہ غیر موزوں ہی رہے گا۔ اسی طرح موسیقی میں تال کی تکرار تو ممکن ہے مگر ایسی صورت میں تال پوری کرنی ہی ہوگی۔ وہ مقامات جہاں پر مغنی سانس ختم کرتا ہے "سَم" کہلاتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ سَم راگ کے اختتام پر ہی واقع ہو۔ یہ اول و آخر اور درمیان سب ہی مقامات پر وجود میں آسکتا ہے۔ ذیل کے شعر میں راگ اور سَم کے اس تعلق کی طرف اشارہ ہے ؎

اثرِ نغمۂ شیریں سے جہاں بھول گیا
کہ سوا راگ کی سم کے ہے کوئی اور بھی سم

یعنی راگ "تال اور سَم" سے مرکب ہوتا ہے۔ راگ اور سُر وغیرہ کی ترکیب سے لَے بنتی ہے۔ اس لَے کو قائم رکھنے کے لئے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ راگ تال سے غیر مطابق نہ ہو جائے بیشتر طبلہ کا استعمال کرتے ہیں۔ [illegible] محاورۃً طبلہ کو گانے کا کوتوال بھی کہہ دیتے ہیں۔

ہر راگ سے چند راگنیاں استخراج کی گئی ہیں۔ ان میں بعض ثقیل ہیں اور بعض غیر ثقیل یا نازک۔ مثلاً ہنڈول راگ کی راگنیاں حسب ذیل ہیں:- ۱۔ رام کری یا رام کلی۔ ۲۔ دیساکھ۔ ۳۔ للت ۴۔ بلاول۔ ۵۔ پٹ منجری۔ ان پانچ کے علاوہ اور بھی بعض راگنیاں ہیں۔ ہر ایک کا تفصیلی ذکر کچھ ضروری نہیں معلوم

ہوتا البتہ اصولاً ہر راگ سے پانچ راگنیاں منسوب ہیں۔ ذوق کا ایک شعر ہے ؎

لے کے انگڑائی کہیں ہنسنے لگی رام کلی
بھٹی ملتی ہوئی آنکھوں کو کہیں اپنی للت

اس شعر میں شاعر نے رام کلی اور للت دو راگنیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اوقات بھی وہی ہیں جو اصل راگ کے لئے مقرر ہیں۔ یعنی یہ راگنیاں بسنت رت میں صبح کے وقت لطف دیتی ہیں۔ جس قصیدہ کا یہ شعر ہے وہ ذوق نے عید کے موقع[۱۲] پر پیش کیا تھا یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ قصیدہ کس سال پیش کیا گیا تھا اور ماہ عید سے اس سال کون سا ہندی مہینہ مطابق ہوا تھا بہر حال جو شاعر وقت کے التزام کے ساتھ راگنیوں کا ذکر کر رہا ہو اس کے متعلق یہ ضرور خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس نے موسم کا بھی لحاظ ضرور کیا ہوگا اور یہی بات اُس کے علم موسیقی کے لئے عمدہ دلیل ہو سکتی ہے۔

قصائد ذوق میں متعدد مزامیر (باجوں) کا ذکر بھی ملتا ہے مثلاً ؎

بدر تھالی میں قمر تھالی میں نظر آتا ہلال	خدمت دائرہ داری میں تھا ہر رنگ سے طاق
اسکا طنبور جو دیتا تھا سُر کو بہتا	بزم خورشید سے ہوتی تھیں شعاعیں اترا ق
تیر گردوں کا خوشی سے تھا جو دل لہراتا	دے کے ترتیب ثریا کو بہ اقسام ایاق،

جلترنگ ایسی بجاتا تھا کسب جدیق لعبتان فلکی صورت اہل اذواق

طنبور یا طنبورہ ایک مشہور باجا ہے جس میں تار لگے ہوتے ہیں اس کا ذکر ایک شعر میں سنیئے ؎

تار طنبور نئی آج رگ سنگ صفا
بے زباں زمزمہ سازی کرے موج زمزم

جلترنگ بھی ایک ہندی ساز ہے۔ چھوٹی چھوٹی شیشہ کی پیالیوں میں پانی بھر لیتے ہیں اور دونوں ہاتھوں میں ایک ایک ڈنڈی لے کر مارتے ہیں۔ اس سے ایک مترنم آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس آواز کو اصول موسیقی سے مربوط اور متوازن کرنے کے لئے پیالیوں کے پانی کی مقدار کو کم و بیش کیا جاتا ہے۔

نے قلیاں کو کبھی گر منہ سے لگاتا ہے کوئی
تو وہ بھرتی ہے ہم آوازی شہنائی کا دم

شہنائی وہ ساز ہے جو صرف خوشی کے موقع پر بجایا جاتا ہے۔ اس لئے محاورہ شہنائی بجنا خوشی ہونے کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

یہ لعبتان فلک پر ہوا خوشی کا جوش
سہاگ گانے لگی زہرہ بن کے موسیقار

سہاگ جیسا کہ شعر کے الفاظ سے ظاہر ہے ایک قسم ہندی گانے کی ہے جو شادی کے اوقات پر گایا جاتا ہے۔ موسیقار ایک پرند کا نام ہے جس کی چونچ میں بے شمار سوراخ ہوتے ہیں اور ان سوراخوں سے گوناگوں آوازیں نکلتی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حکما نے اسی کی آوازوں سے علم موسیقی کا استخراج کیا ہے۔ اس کے علاوہ موسیقار ایک ساز کو بھی کہتے ہیں جس میں بڑی چھوٹی نلیاں لگی ہوتی ہیں اور یہ سب مثلث کی شکل میں بنائی جاتی ہیں۔ ذوق نے بھی یہاں اسی ساز سے کام لیا ہے۔

ذوق کے دوسرے قصائد میں بھی نغمہ و سرود کی مختلف کیفیات کا ذکر ملتا ہے جس سے ان کا علم ثابت ہے۔ یہ فن موسیقی سے واقفیت ہی کا نتیجہ ہے کہ ذوق کی غزلیں ہی نہیں بلکہ قصائد بھی مترنم اور دل کش ہیں۔ مشاعروں میں کبھی ذوق اپنا کلام خود سُناتے تھے بلکہ اکثر بادشاہ کا کلام بھی پڑھتے تھے۔ ان سب کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ذوق کو فن موسیقی سے کافی لگاؤ تھا۔

---

[۱۲] ذوق نے بہادر شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ میں کہا ہے ؎

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

قمری اور شمسی مہینوں میں ہر سال میں تقریباً دس دن کا فرق ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر حساب لگائیں تو اس قصیدہ اور قصیدہ "شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت" کے درمیان تقریباً آٹھ یا نو سال کا وقفہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہندو سال کا زمانہ ماگھ اور پھاگن کا ہے اور اس قصیدے کی تالیف کے وقت عید انہیں مہینوں میں سے کسی تاریخ میں ہوئی تھی جب کہ دوسرے قصیدہ میں ساون میں مہ شوال دکھائی دیا ہے۔ اس کے علاوہ مطلع میں لفظ "پھر" نظم ہونے سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے پہلے بھی ساون میں عید ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر رام کرشنا راؤ یوم آزادی کے موقع پر گورنمنٹ ہاؤس میں قومی پرچم لہرا رہے ہیں

جشن آزادی

حسب سابق اس سال بھی ۱۵ اگست کو سارے ملک میں یوم آزادی پورے جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا۔ اتر پردیش کے گورنر ڈاکٹر رام کرشنا راؤ نے اس موقع پر اپنے پیغام میں ان خطرات کا ذکر کرتے ہوئے جو ہماری شمالی سرحد کو پیدا ہو گئے ہیں نیز ان اختلافات کا حوالہ دیتے ہوئے جو لسانی اور نظریاتی اختلاف کے باعث ملک کے بعض حصوں میں پیدا ہو گئے ہیں اس بات پر زور دیا کہ ہمیں چھوٹی چھوٹی باتوں اور تنگ خیالیوں کو اپنے دل و دماغ سے یکسر نکال دینا چاہئے اور اس احساس سے کام لینا چاہئے کہ ہم ہمیشہ ہندوستانی رہیں گے۔ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند نے بھی اپنے پیغام میں گروہ بندی اور فرقہ پرستی میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے پنج سالہ منصوبوں اور ترقیاتی اسکیموں کی تکمیل کیلئے اپنی مدد کی دعوت دینے کی اپیل کی

محکمۂ اطلاعات کے پروگریس میوزیم میں ۱۶ اگست کو بچوں کی طرف سے ایک دیہاتی پروگرام

ساون بھا
آنکھوں میں

تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

سمت کا ستی ے

سدرہ دور ہوئے مالی کو مشکل مشگل

ری برساتیں
ہیں جل تھل کے

۔ سا کوئی حی نہ ، ۔ کوئی رکھا ، ۔ ہل

صاف ستھرا بادل

لستیاں چلتی ہیں سڑکوں پہ ہے ایسا جل تھل

پرچھائیں کا تعاقب

مظہر سلیم

لفافے کو دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

میں نے گھبراہٹ میں اسے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کچھ بھی ہو اس بار اس لفافے کو بغیر کھولے ناہید کے حوالے کر دوں گا۔ اس سے قبل بھی متعدد بار یہ فیصلہ کر چکا تھا ظاہر تھا کہ بیوی کی سہیلی کا خط کھول کر پڑھ لیا اور اس کے بعد خواہ مخواہ نئی شادی شدہ زندگی میں اختلافات کی گنجائش پیدا کرنا کوئی دانشمندی کی بات نہ تھی مگر جانے کیوں ہر بار میں اپنے فیصلے میں ناکام ہوتا تھا۔ یہ صورت صرف افروز کے خط کے سلسلے میں تھی۔ دوسرے عزیزوں یا بیوی کی دوسری دوستوں کے خطوط سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی میں کبھی انھیں کھولتا تھا۔ ہر بار میرا ضمیر ملامت کرتا مگر ایک انجانے تجسس کے تحت میں افروز کا خط کھول ضرور لیتا۔ شاید اس لئے کہ افروز کی ذات سے ایک قسم کا رومان سا وابستہ تھا۔ وہ بہت دور ایک دوسرے ملک میں رہتی تھیں۔ ادب اور آرٹ کا بڑا اچھا ذوق رکھتی تھیں۔ تصویریں بناتی تھیں۔ خوبصورت اور غیر شادی شدہ تھیں اتنی ہی باتیں ان سے دلچسپی لینے کے لئے کافی تھیں مگر اس سے زیادہ ایک بات اور تھی اور وہ یہ کہ افروز، ناہید کے بھائی جمال سے محبت کرتی تھیں وہ دونوں ایک دوسرے سے ملے نہیں تھے مگر طویل خطوط لکھتے تھے۔ بلکہ یہاں تک طے تھا کہ جمال اپنے خاندان سے ترک تعلق کر کے افروز کے وطن چلے جائیں گے اور وہاں ان دونوں کی شادی ہو جائیگی۔ لیکن افسوس کہ جمال کا عین شباب میں انتقال ہوگیا اور ان کی داستان محبت نامکمل رہ گئی۔ بعد میں ناہید سے افروز کی دوستی ہوگئی اور وہ انھیں طویل خطوط لکھنے لگیں جو میرے دفتر کے پتے پر آتے تھے۔ ان خطوط میں جمال سے افروز کی محبت وغیرہ کا بالکل ذکر نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی خاص رومانی باتیں نہیں درج ہوتی تھیں جو میرے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہو سکیں مگر پھر بھی جانے کیا کمزوری تھی کہ انھیں کھول کر پڑھ لیتا تھا۔

میں نے پریشانی کی حالت میں دو تین سگریٹیں مسلسل پی ڈالیں اور کام میں مصروف ہونے کی کوشش کرنے لگا مگر کسی طرح مجھے اطمینان نہ حاصل ہوا۔ آخر میں نے لفافہ جیب سے نکالا اسے الٹ پلٹ کر دیکھا وہی چھوٹے چھوٹے خوبصورت الفاظ لفافے کے ایک گوشے میں سادگی کے ساتھ پتہ درج کرنے کا وہی انداز۔ وہی پراسرار کیفیت۔ اچانک میری نگاہ ٹکٹ پر پڑی اور میں حیرت میں پڑ گیا وہ لفافہ ہندستان ہی سے بھیجا گیا تھا۔ فوراً میرے دل میں خیال آیا کہ شاید افروز کا کوئی جاننے والا ہندستان آرہا ہو اور انھوں نے اسے لفافہ دیدیا ہو کہ ہندستان پہنچنے پر ٹکٹ لگا کر پوسٹ کر دینا تاکہ جلدی مل جائے۔ بظاہر یہ جواز کافی تھا مگر میں نے سوچا کہ ناہید کو یہ کہہ کر مطمئن کر لوں گا کہ ہندستان سے پوسٹ ہوا تھا اس لئے تجسس کے جذبے سے مجبور ہو کر میں نے لفافہ کھول لیا۔

آخر میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ صرف چند سطروں کا خط تھا مگر مجھے حیرت اور الجھن میں گرفتار کرنے کے لئے ان چند سطروں میں بھی کافی مواد موجود تھا۔ میں نے جلدی جلدی پرچے کو پھر سے تہ کر کے لفافے کے اندر رکھا اور جلدی جلدی سگریٹ کے کش لینے لگا۔ اب ناہید کو مطمئن

کرنے ہی کا سوال نہیں تھا اب میں بالکل دوسری قسم کی الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

"خیریت تو ہے ؟"

میرے دوست ڈاکٹر کمار نے جو دفتر میں میرے ساتھ کام کرتے تھے اور میرے پاس ہی بیٹھتے تھے پوچھا اور میں چونک پڑا اسنا بدایی الجھن ۔ میں پہلے بعد دیکھنے کی سرگرمیاں نہ تھی اور میری دلی پریشانیاں میرے چہرے سے ظاہر ہونے لگی تھیں ورنہ ڈاکٹر کمار جیسے "فلسفی" جو کسی کے ۔ اتی معاملات تو درکنار دفتر کے معاملات سے بھی دلچسپی لینا گناہ سمجھتے تھے کیوں مجھے ٹوکتے۔

"ہمارے یہاں ایک مہمان آرہی ہیں" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں اٹھی سا کہا

"تو کیا ہوا ؟"

"وہ ایک بیرونی ملک سے آرہی ہیں"

"یہ بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی"

"وہ ہماری رشتہ دار نہیں ہیں محض بیوی کی دوست ہیں"

"یہ اور اچھی بات ہے"

"بھئی ہم لوگوں نے کبھی آج تک انہیں دیکھا ہی نہیں۔ صرف خط و کتابت رہی ہے اور محض اتنے سے تعلق پر اتنا طویل طویل سفر"

"آپ بات کا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔ اور بس"

"مگر ڈاکٹر صاحب۔ اب کیا عرض کروں"

"بھئی سیدھی سی بات ہے رہنے کی ضرورت ہو مجھ سے لو تمھارے یہاں جگہ کم ہو تو ہمارے یہاں ٹھہرا دو"

"نہیں نہیں ایسی کوئی دقت نہیں ہے۔ وہ اکیلی دلی آکر ایک سکھ کرنل کے یہاں ٹھہری ہیں"

"تم ادھر جاسوسی کتابیں پڑھتے رہے ہو کیا؟"

ڈاکٹر کمار نے طنزیہ انداز میں کہا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

میں بیٹھا کر خاموش ہو گیا۔ یہ بھی خوب رہی۔ میں تو سیدھی سادی حقیقت بیان کر رہا ہوں اور ڈاکٹر کمار کا خیال ہے کہ میں نے معمولی سی بات کو پراسرار بنانے کی کوشش کی ہے۔

میں نے کام میں جی لگانے کی بہترا کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا کچھ تو افروز کے آنے کی خوشی بھی کچھ اس بات پر حیرت کہ کیا دو اجنبی خواتین میں ایسے گہرے مراسم بھی قائم ہو سکتے ہیں کہ ایک خاتون دور دراز کا سفر کر کے دوسری

سے ملنے چلی آئے۔ نیز کیا ہمارے جیسے پسماندہ ملکوں میں ایسی جرأت غیر معمولی نہیں اور ان سب سے زیادہ اپنی مالی مشکلات کا احساس۔ آخر پریشان ہو کر دفتر سے کوئی دو گھنٹے پہلے بھاگ لیا گھر پہنچ کر کھلا ہوا لفافہ دے کر نابید کی تیوریوں پر بل دیکھنے سے بچنے کے لئے میں نے فوراً ہی سارا واقعہ بیان کر دیا وہ حیرت اور پریشانی میں مبتلا ہو گئیں تب میں نے خط دیا۔ لیکن اس بار انھوں نے خط کے کھول لینے پر احتجاج نہ کیا کچھ عجیب کھوئی کھوئی اداس اداس سی نظر آنے لگیں۔ شاید سوچ رہی ہوں کہ بھائی کی زندگی میں افروز آئی ہوتیں تو سب لوگ کیسی خوشیاں مناتے انھوں نے بہت کم باتیں کیں۔ بس صرف اتنا کہا کہ میری گود میں ذراسی بچی ہے مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ ان کی خاطر داری کیسے ہو سکے گی اور بس۔ ان کی یہ خاموشی اگلے دن بھی برقرار رہی میں نے گھر کی صفائی اور افروز کے خیر مقدم کی تیاریوں کے سلسلے میں چھٹی لے لی تھی وہ بچی کے رونے کی پروا نہ کرتے ہوئے میرا ہاتھ بٹاتی رہیں مگر ان کے چہرے پر نہ رونق آئی اور اداسی بدستور برقرار رہی جو اس خبر کے سنتے ہی طاری ہو گئی تھی۔

اگلے دن دفتر میں ڈاکٹر کمار نے بتایا کہ کل تمھیں فوجی صدر دفاتر سے کسی کیپٹن شرما نے فون کیا تھا ان کا فون نمبر یہ ہے اور یہ کہ تم ان سے بات کر لو۔ انھوں نے خاص طور سے تاکید کی ہے میں نے ان کو یقین دلایا کہ کسی فوجی کیپٹن سے میری جان پہچان نہیں ہے شاید کوئی غلط فہمی ہوئی۔ مگر ڈاکٹر کمار نے میری بات کو غلط قرار دیا اور خاموش ہو گئے میں نے ان کے سگار کے دھوئیں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا کہ یکے بعد دیگرے یہ جو حیرت میں ڈالنے والی باتیں ہو رہی ہیں ان کے پیش نظر کوئی عجیب بات نہ ہو گی اگر کسی فوجی کیپٹن نے مجھے فون کیا ہو۔

میں نے کاغذات کو بے دلی سے الٹنا پلٹنا شروع ہی کیا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ چپراسی نے ریسیور اٹھایا اور دوسرے لمحے میرے ہاتھ میں ریسیور دے دیا واقعی یہ کیپٹن شرما ہی تھے جو مجھے بتا رہے تھے کہ دلی سے کرنل صاحب نے اطلاع دی ہے کہ میری کوئی عزیزہ آکر ان کے یہاں مہمان ہوئی ہیں اور دو ایک روز میں یہاں آئیں گی میں نے عرض کیا کہ مجھے ان کا خط مل چکا ہے کہنے لگے کرنل صاحب نے انھیں ہدایت کی ہے کہ میں آپ کے گھر کا پتہ معلوم کر لوں اور ان کے مہمان کو یہاں پہنچنے پر آپ کے گھر تک پہنچا آؤں۔ میں نے کہا آپ کیوں زحمت کیجئے گا۔ مگر وہ مطمئن نہ ہوئے کہنے لگے جی وہ بات یہ ہے کہ کرنل صاحب کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ میں کار لے کر ضرور اسٹیشن

حاضر ہوں گا۔ پھر ذرا سے توقف کے بعد کہا کہ آپ خود کیوں نا کرنل صاحب سے بات کر لیجیے۔ میں نے کہا کہ اس کی کیا ضرورت ہے وہ وہاں سے غالباً روانگی سے قبل تار دے دیں گی اور میں اسٹیشن پہنچ جاؤں گا۔ مگر انھوں نے فوراً ہی اپنے یہاں کے آپریٹر کو ہدایت کی اور دلی میں کرنل صاحب کے یہاں سے فون ملانے کو کہا۔ اور ذرا ہی دیر بعد میں انھیں کرنل صاحب سے باتیں کرتے ہوئے سن سکتا تھا۔ پھر کیپٹن شرما نے مجھے مخاطب کیا اور کہا کہ اب آپ خود کرنل صاحب سے بات کر لیں۔ میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں ہلو کرنل صاحب کہا اور کرنل صاحب نے کہا کہ آپ مس افروز سے پروگرام طے کر لیجیے۔

"آداب عرض" دور سے آتی ہوئی باریک آواز میرے کانوں میں گونجی اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ریسیور میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر میز پر گر پڑے گا۔ میں نے کن انکھیوں سے ڈاکٹر کمار کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا موٹا سا سگار منھ سے علاحدہ کیے ہوئے میری طرف دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

"آپ کو کل صبح فرصت ہوگی؟" افروز کی آواز سنائی دی۔

"جی ہاں۔" میں نے گھبراہٹ میں تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"تو پھر میں آج شام کو روانہ ہو کر کل صبح پہنچ جاؤں گی۔ آپ اسٹیشن آجائیے گا۔"

"بہتر ہے۔"

ذرا دیر تک خاموشی چھائی رہی میں کہنا چاہتا تھا کہ آپ کے آنے سے ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہوگی مگر میرے منھ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

"ماہرہ بہن کو آداب کہیے۔"

"بہتر ہے۔"

پھر خاموشی چھا گئی جو اتنی دیر تک چھائی رہی کہ میں نے یہ سمجھ کر کہ دوسری طرف سے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا ہے فون رکھ دیا۔

"میں انھیں صاحب سے بات کر رہا تھا یعنی اب آپ دیکھیے نا کتنی عجیب بات کہ ابھی ابھی چند منٹوں کے اندر میں نے ان سے بات بھی کر لی۔"

"بہتر ہے" ڈاکٹر کمار نے میرے جوش و خروش کا مذاق اڑاتے ہوئے جواب دیا اور افروز کے متعلق مجھ سے باتیں کرنے لگے۔

صبح اسٹیشن پر میری جو حالت تھی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں کبھی ایسی لڑکی کے استقبال کے لیے اسٹیشن جانا پڑا ہو جس سے پہلے کبھی ملاقات نہ ہوئی ہو۔ ہمارے یہاں افروز کی بس ایک تصویر تھی وہ سائیڈ بورڈ کی تھی ان کی اور کئی تصویریں بھی آئی تھیں مگر وہ حمال کے سامان کے ساتھ میری سسرال میں بند تھیں جو شہر سے کچھ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اتنی جلدی وہاں جا کر ان تصویروں کو دیکھ کر افروز کی شکل صورت کا صحیح تصور کرنا ممکن نہ تھا بہرحال ٹرین آئی۔ میں دو تین بار بھاگا بھاگا ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر کاٹ آیا مگر کوئی خاتون ایسی نظر نہ آئیں جن پر مجھے افروز ہونے کا یقین ہو پاتا۔ آخر مایوس ہو کر ایک کنارے کھڑا ہو گیا مگر جب ٹرین پر چڑھنے والی سواریوں کی ریل پیل ذرا کم ہوئی تو یہ سوچ کر کہ وہ آئی ہوں گی تو ظاہر ہے کہیں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہوں گی ایک بار پھر چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوا ٹرین کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف چلا۔ ایک جگہ اچانک میری نظریں ایک ایسی صاحبہ پر پڑیں جو دوسرے لوگوں سے ذرا سا الگ تھلگ ہٹے ہوئے کھڑی تھیں اور پاس ہی قلی اٹیچی کیس لیے ہوئے کھڑا تھا میں نے سوچا شاید یہی ہوں مگر اس جگہ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں کچھ اور برقعہ پوش خواتین سوار ہوتی نظر آئیں اس لیے یہ خیال کر کے شاید ان کے ساتھ ہوں آگے بڑھ گیا لیکن میں نے سوچا کہ وہ لوگ تو شاید پردہ نہیں کرتیں اس لیے کوئی اور صاحبہ ہوں گی دوسری طرف سے واپس لوٹا تو وہ صاحبہ بدستور اسی جگہ کھڑی تھیں البتہ انھوں نے نقاب الٹ دی تھی اور چاروں طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے انھیں کسی کا انتظار ہو۔ سرخ و سفید چہرہ، کھوئی کھوئی سی بڑی بڑی آنکھیں اور خاصا قیمتی لباس۔ ان سے مخاطب ہونے کی میری ہمت نہ پڑی دراصل میں انھیں دیکھتا رہا آخر جرأت کر کے ان کے قلی کے پاس پہنچا۔ اس سے پوچھا کہ یہ دلی سے آئی ہیں۔ میرے اس سوال پر انھوں نے میری طرف دیکھا اور میرا نام لیا آخر وہ افروز ہی تھیں جلدی جلدی مسکراتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ دراصل وہ برقعہ اس لیے ساتھ لائی ہیں کہ ان کو معلوم تھا کہ میری سسرال پرانے خیال کی ہے شاید کبھی ضرورت ہو اس لیے رکھا ہو۔

بہرحال وہ میری توقعات سے زیادہ خوبصورت اور برجستہ تھیں لوگ انھیں مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ "آپ نقاب ڈال لیجیے۔"

میں نے خوشی میں ہنستے ہوئے ان کے حسن کو خراج تحسین ادا کیا۔ انھوں نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولیں "اجی اب ایسا بھی کیا" اور ہم لوگ ہنس پڑے

"ناہید بہن نہیں آئیں؟"

"بھئی دراصل ہم لوگوں کے یہاں بھی سدا آدمی ہیں۔ شاید ناہید نے آپکو اطلاع دی ہو۔"

"مبارک ہو۔ ادھر مجھے ان کا کوئی خط نہیں ملا۔ میں ادھر ذرا گھومتی پھرتی رہتی ہوں۔ ممکن ہے خط آیا ہو، کہیں کھو گیا ہو۔"

"ممکن ہے"

"مگر جناب آپ لوگ ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ناہید بہن کو کیسا لایا مگر نہ آنا تھا نہ آئیں۔ اسلئے مجھے ملانے نکلیں۔ سمجھی ہوں گی کہ اکیلی لڑکی ہے جانے آئے گی یا نہیں مگر میں آ ہی گئی۔"

"آپ دلی میں کیسے ٹھہری تھیں؟"

"جی، وہ کرنل صاحب ہماری گلی کے بہت اچھے تعلقات تھے ہم لوگ اکٹھا رہتے تھے۔ کرنل صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ان کی بیوی میری سہیلی تھی۔ ان سے ملنے چلی گئی۔ کرنل صاحب کسی طرح آنے ہی نہ دیتے تھے۔ اب واپسی پر ان کے یہاں پھر جانا ہوگا۔"

"بہت خوب"

"کرنل صاحب کو تصویروں کا بہت شوق ہے"

"اچھا!"

"مگر سرحبت تصویریں وغیرہ جاک نہیں کھینچتی۔"

"اچھا تب تو وہ بہت بور ہوتے ہوں گے۔"

"جی ہاں بے حد بور ہو رہے ہیں۔ بڑی شکایت کر رہے تھے مگر میں اسے کیا سمجھا لی۔ میں ان سے جانتی ہوں۔ وہ دوسرے مزاج کی لڑکی ہے۔"

"مگر صاحب، بڑی کوفت ہوتی ہے اگر بیوی ہم خیال نہ ہو۔ میرا مطلب ہے کہ اگر مزاج مختلف ہوں تو۔"

"جی ہاں"۔ انھوں نے کسی قدر جھکتے ہوئے کہا۔ "آپکو معلوم ہے کرنل صاحب کہنے لگے کہ افروز تم سے میری شادی ہوئی ہوتی تو بڑا لطف آتا۔" اور وہ اداسی کے ساتھ ہنس پڑیں۔ میں ان کے اچانک اداس ہو جانے پر چونک سا پڑا۔ ساتھ ہی ساتھ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ چند منٹ کی ملاقات میں افروز مجھ سے اتنی بے تکلفی سے بات کرنے لگی ہیں۔ میں ذرا دیر تک خاموش رہا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔

"مگر کرنل صاحب نے آپ سے —"

"ارے جناب وہ تو مذاق کر رہے تھے۔ میری شادی آپ کے بھائی سے ہو سکتی تھی۔"

"آپ کا مطلب مذہبی رکاوٹ سے ہے؟"

"جی ہاں"

"تو کیا مذہبی رکاوٹ نہ ہوتی تو آپ کرنل صاحب سے شادی کر لیتیں"

"آپ بڑی چالاکی سے confession کراتے ہیں۔"

اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مس افروز کرنل صاحب سے کسی زمانے میں کوئی جذباتی لگاؤ رکھتی ہوں مگر دوسرے ہی لمحہ میں نے اس خیال کو دل سے نکال دیا۔ ظاہر تھا کہ جمال سے وہ جنتی شدت سے محبت کرتی تھیں اور انھیں جس قسم کے خطوط انھوں نے لکھے تھے (جن کو میں نے جمال کی موت اور اسی شادی کے بعد بغور مطالعہ کیا تھا) ان کے پیش نظر ایسا سوچنا ہی بیکار تھا۔

"واپسی پر مجھے کرنل صاحب کار سے بھجوانے کو کہتے تھے۔ بے چارے بڑے مخلص آدمی ہیں"

"شاید خود ہی پہنچانے جاتے!"

انھوں نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور خاموش ہو گئیں۔ شاید انھیں میری بات بری لگی تھی۔ اس کے بعد وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ انھوں نے میری تحریریں اپنے یہاں کے پرچوں میں دیکھی ہیں اور یہ بہت اچھا ہوا کہ ناہید کی شادی مجھ سے ہو گئی۔

اتنے میں گھر آ گیا۔ وہ ناہید سے بڑے تپاک سے ملیں۔ ناہید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے افروز کی آنکھیں نمناک نہیں ہوئیں۔ بس وہ ہر در رشتے سے زیادہ سنجیدہ ہو گئیں اور ان کی اس سنجیدگی سے ان کا حسن کچھ بڑا تھکا تھکا سا، بڑا ڈھال ڈھال سا نظر آنے لگا اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ افروز کسی زمانے میں واقعی بہت خوبصورت رہی ہوں گی لیکن اب بڑھتی ہوئی عمر، پورے خاندان کی تباہی و بربادی اور تنہائی کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کی خوبصورتی مائل بہ زوال ہو گئی ہے۔

کھانا انھوں نے برائے نام کھایا۔ چند گھنٹوں میں پتہ چلا کہ بے حد نفاست پسند اور موڈی واقع ہوئی ہیں۔ ناہید سے تیزی اور جوش کے ساتھ باتیں کرتے کرتے اچانک خاموش ہو جاتیں اور ایسا محسوس ہوتا کہ یا تو کسی گہری

سوچ میں مبتلا ہوگئی ہیں یا کوئی بات ناگوار لگی ہو شام تک ایسا لگا کہ ناہید سے انھیں جتنی باتیں کرنی تھیں کر چکیں اب جتنی بھی باتیں کرتی تھیں مجھ ہی سے کرتی تھیں ہم لوگوں کی زندگی سے بھی ان کی دلچسپی ختم ہوگئی ناہید نے سخت محنت سے ان کے کھانے کے لیے جو چیزیں تیار کی تھیں ان سے بھی انھوں نے کوئی دلچسپی نہ لی شام کو کہیں باہر نکلنے کا خیال تھا مگر سردی زیادہ پڑ رہی تھی اور ناہید بچی کو لے کر نہیں نکل سکتی تھیں اس لئے انھوں نے اس پروگرام کی کوئی خاص حمایت نہ کی اور افروز نے بے دل ہو کر پلنگ پر لیٹ رہیں ذرا دیر خاموش پڑی رہیں پھر کتابوں کی الماری الٹ پلٹ ڈالی اور ایک ایک کتاب اور رسالہ کھول کر دیکھا۔ کچھ کتابیں جن میں ڈی ایچ لارنس کے خطوط اور نظمیں بھی تھیں انھیں بہت پسند آئیں۔ میں نے کہا جاتے وقت آپ یہ کتابیں لیتے جائیے گا تو ان کا موڈ اچانک ٹھیک ہوگیا اور وہ پھر مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں۔ ناہید کا دھوڈ گھر میں ان کے لئے۔ ہونے کے برابر ہوگیا۔ مجھے حسرت ہو رہی تھی کہ اسی دن کا سفر کرکے اس سے ملنے آئی ہیں اور انھیں کو لفٹ نہیں دے رہی ہیں اس کے خلاف ساری باتیں مجھ سے کر رہی ہیں ناہید کو بھی برا لگ رہا تھا مگر وہ بیچاری کر ہی کیا سکتی تھیں۔ مجبوراً بچی کو سلانے کے لئے لیٹیں تو خود بھی سو گئیں تھکی ہوئی تھیں کچھ دیر بعد انھیں صبح میں آگئی

"آپ کو معلوم ہے کہ میں جس گھر میں رہتی ہوں وہ اچھا خاصا محل ہے اتفاقاً الاٹ ہوگیا تھا" انھوں نے لیٹے لیٹے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میرا گھر بہت چھوٹا لگتا ہوگا بڑی زحمت ہوگی آپ کو اس ماحول میں" میں نے معذرت کی۔ مجھے بری طرح احساس تھا کہ ایک کمرے کے چھوٹے سے گھر میں ان کو ٹھہرانا بڑی زیادتی ہوگی میرے دوسرے گھر کے سامان رکھنے والے چھوٹے کمرے میں کسی طرح میرا پلنگ رکھ جائے اور بڑا کمرہ ناہید اور افروز کے رہنے کے لئے خالی ہو جائے مگر انھوں نے اس کے اندر سونے سے انکار کر دیا اور مجبوراً مجھے بھی اسی کمرے میں لیٹنا پڑا میں اسی صورت حال پر دل ہی دل میں سخت نادم تھا مگر مجبوری تھی کیا کرتا۔

"نہیں خیر ایسا تو نہیں اکیلے اس گھر میں بڑی وحشت ہوتی ہے مگر کسی کو ساتھ رکھنا بھی مناسب نہیں ورنہ کسی خاندان کو ٹھہرا لیتی بات بات میں تو لوگ اپنے لئے کھڑا کر لیتے ہیں"

"جی ہاں یہ تو ہے" "دراصل مجھے کھلی جگہ میں رہنے کی بڑی آرزو ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی ایسا گھر ملے جہاں میں کچھ پیڑ پودے لگا سکوں گملوں میں گلاب کیسے شاداب ہوں، پھر یہ کہ جاڑوں میں انھیں بہت کم دھوپ ملتی ہے اس لئے ان میں پھول نہیں کھلتے"

"تو آپ لوگ آخر ہمارے یہاں کیوں نہیں آ جاتے" اچانک انھوں نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "بڑا لطف آئے گا اس بڑے سے گھر میں جیسے کمرے آپ پسند کریں اپنے استعمال میں لے سکتے ہیں میرے لئے تو صرف ایک کمرہ ہی کافی ہوگا۔؟

نہیں وہاں اور بہت کچھ مل سکتا ہے۔ آپ کو کوئی اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ میرے کئی جاننے والے اچھے عہدوں پر کام کرتے ہیں وہ یقیناً آپ کی مدد کریں گے" انھوں نے ناخن کاٹتے ہوئے کہا

میں نے سگریٹ سلگائی۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگا: "واقعی افروز کے ساتھ رہنے میں بڑا لطف آئے گا اور ممکن ہے کوئی اچھی ملازمت بھی مل جائے لیکن ترک سکونت کے لئے یہ کوئی اچھا جواز نہ ہوگا"

"اور آپ کو نوکری کرنے کی ضرورت بھی شاید نہ پڑے مجھے کافی زمینیں ملنے والی ہیں شہر سے قریب ہی بڑی سی سڑک کے کنارے۔ آپ وہاں جتنے گلاب چاہیں لگا سکتے ہیں۔ گلاب کے علاوہ پھلوں کے باغات لگا سکتے ہیں کھیتی کروا سکتے ہیں کوئی بھی کام کر سکتے ہیں۔ تھوڑی بہت رقم بھی مل سکتی ہے"

میں نے شکر گزار آنکھوں سے افروز کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ کسی انجانی مسرت کے لمس سے دمک اٹھا تھا میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیوں اچانک اتنی خوش نظر آنے لگی ہیں۔

"وہیں انھیں زمینوں پر ایک چھوٹا سا کاٹیج بھی بن سکتا ہے۔ میرے پاس کچھ روپے ہیں۔ انھیں آپ استعمال کر سکتے ہیں" میں ان کے بچوں کے جیسے جوش و خروش پر مسکرانے لگا۔ میں نے سوچا کہ وہ کتنی جلدی حقائق کو نظر انداز کرکے خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی ہیں۔

"وہاں ایک کمرہ ملے گا آپ کے لکھنے پڑھنے کا بن سکتا ہے" افروز نے اسی جوش کے ساتھ کہا۔

"اور ایک کمرہ آپ کے لئے جسے آپ اپنا اسٹوڈیو بنا سکیں گی" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور افروز خوشی سے اچھل پڑیں۔ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئیں اور جلدی جلدی اپنے کھلے ہوئے لمبے لمبے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگیں۔ ایک عجیب اضطرابی کیفیت ان پر طاری ہوگئی۔

"بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ تو پھر آپ چل رہے ہیں نا؟"

"جی ہاں" میں نے ان کی اس کیفیت کو جو بڑی پرکشش تھی برقرار

رکھنے کے لئے جھوٹ بولا۔

"یقین مانیئے زندگی حرکت کا نام ہے، مجھے گھومنے پھرنے، سیر کرنے، نئے نئے لوگوں سے ملنے کا بڑا شوق ہے، زندگی تبدیلیوں کا نام ہے۔"

"بے شک" میں نے آہستہ سے جواب دیا، ان کی دلکش شخصیت کا جادو اب مجھ پر چلنے لگا تھا۔

"آپ کو معلوم ہے ایک بار میں یورپ جاتے جاتے رہ گئی۔"

"اچھا، وہ کس سلسلے میں"؟

"مجھے ایک یورپی آرٹسٹ نے شادی کا آفر دیا تھا"

"پھر کیا ہوا؟"

"میں نے ٹال دیا، ان دنوں میرا دل دکھا ہوا تھا۔ اب بھی یورپ جانے کے خواب دیکھا کرتی ہوں۔"

"اس خواب میں اس آرٹسٹ کی صورت بھی نظر آتی ہے کہ نہیں؟"

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑیں، بچی کُنمنائی۔ ناہید نے کروٹ بدلی، تب شاید انھیں ناہید کی موجودگی کا احساس ہوا اور وہ دھیرے دھیرے باتیں کرنے لگیں۔

"دوسروں کے راز معلوم کرنے کے لئے جو طریقہ آپ استعمال کرتے ہیں وہ مجھے بہت پیارا لگتا ہے"۔ انھوں نے معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا اور میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ میں بھی انھیں پیارا لگتا ہوں اس لئے میں نے اس یورپی آرٹسٹ کے بارے میں اپنے سوال پر زور نہ دیا۔ رات گئے تک یونہی باتیں ہوتی رہیں۔ رات گئے میں نے چائے تیار کی۔ ہم دونوں نے چائے پی اور ان کو الاٹ ہونے والی وسیع آراضی پر پھلوں کے باغات لگانے کے خواب دیکھتے ہوئے سو گئے۔

اگلے دو تین دنوں میں چونکہ میں نے دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی اس لئے ان سے کافی باتیں رہیں۔ ان کے ساتھ شہر کے خاص خاص مقامات دیکھے، وہ کرنل صاحب، یورپی آرٹسٹ اور خود اپنے بارے میں ان کی رائیں سنا رہا۔ ناہید بچی کی وجہ سے باہر گھومنے کے پروگراموں میں نہ شریک ہوئیں اور بقول خود ان کے وہ کھانا اور ناشتہ تیار کرنے والی نوکرانی بن کر رہ گئیں پھر انھیں لے کر میں اپنی سسرال گیا تاکہ وہ جمال کی والدہ سے مل سکیں۔ میرا خیال تھا کہ وہاں پہونچ کر وہ بے قابو ہو جائیں گی، جمال کی قبر کو دیکھ کر رو پڑیں گی۔ مگر میرا خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔ انھوں نے راستے یا گھر میں جمال کے بارے میں ایک بات بھی نہ کی۔ جیسی ہنستی بولتی تفریح کے موڈ میں گئی تھیں ویسے ہی لوٹ آئیں۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ جمال کی قبر کہاں ہے۔ مجھے ان کے اس رویہ پر سخت حیرت اور افسوس ہوا لیکن چونکہ وہ مجھ پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہو چلی تھیں اور میں پوری طرح غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا اس لئے میں نے ان کے متعلق کسی قسم کی بری رائے کرنے کی جرأت نہ کی۔

لیکن اسی اثنا میں ان کا بڑھتا ہوا التفات رنگ لایا اور ناہید کو شکایت پیدا ہو گئی، چنانچہ انھوں نے دو ایک بار طنزیہ جملوں کے ذریعہ اس کا اظہار بھی کیا۔ انھیں افروز سے ایک طرف تو یہ شکایت تھی کہ ان سے بالکل اجنبیوں کی طرح پیش آ رہی تھیں اور دوسری طرف مجھے اپنی عنایتوں کے دام میں اسیر کر رہی تھیں اور بار بار اپنے ساتھ چلنے پر اصرار کرتی تھیں۔ بار بار اس وسیع آراضی کا ذکر کرتی تھیں جو انھیں عنقریب الاٹ ہونے والی تھی۔ ظاہر تھا کہ ناہید کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی ان باتوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

مگر ان دنوں مجھے جانے کیا ہو گیا تھا کہ مجھے ناہید کے رویہ سے الجھن ہونے لگی اور یہ الجھن اتنی بڑھی کہ میں نے اس کا ذکر افروز تک سے کر دیا۔

"جانے کیا بات ہے کہ تمام اچھے لوگوں کو خراب بیویاں ملتی ہیں" انھوں نے اداسی کے ساتھ کہا۔ "لیکن اچھے لوگوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بندھن کو توڑنے کی جسارت نہیں کر پاتے۔ تمام عمر پریشان رہتے ہیں مگر نجات نہیں حاصل کرتے۔ میں نے ان کی اس بات کو کھلی ہوئی دعوت تصور کیا لیکن بات کو اتنا آگے بڑھانے کا چونکہ کوئی سوال ہی نہ تھا اس لئے خاموش رہا۔ البتہ یہ ضرور کیا کہ چھٹی منسوخ کر کے دفتر چلا گیا۔ دفتر میں طبیعت بہت پریشان تھی۔ جانے کیا ہو گیا تھا کہ کام میں جی ہی نہیں لگتا تھا۔ مجبوراً ڈاکٹر کمار کو ساری باتیں کہہ سنائیں۔ وہ مسکرا مسکرا کر سگار پی پی کر میری باتیں سنتے رہے۔ میں ان سے ہمدردی کا طالب تھا مگر وہ تو جیسے بالکل بت بن گئے تھے۔

"دراصل اس کہانی میں المیہ کردار آپ کا نہیں مس افروز کا ہے"۔ آخر کار کافی دیر کے بعد وہ بولے "وہ کسی سے شادی نہ کریں گی۔ وہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والی خاتون معلوم پڑتی ہیں۔ کرنل صاحب، جمال، یورپی آرٹسٹ یا خود آپ سبھی ان کے لئے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ خود اپنے آدرش کی پرچھائیوں کا پیچھا کرتی ہوئی دور دراز علاقوں میں بھاگی بھاگی پھرتی ہیں۔ میں انھیں دیکھوں تو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ وہ تھک چکی ہیں کہ نہیں"۔

ڈاکٹر کمار خاموش ہو گئے، شام کو جب میں گھر لوٹنے لگا تو اچانک انھوں

نے کہا "وہ خود بڑی اداس لڑکی ہیں اور جہاں بھی جائیں گی وہاں اداسی پھیلا کر لوٹیں گی"

گھر پہونچا تو ڈاکٹر کمار کی بات بالکل صحیح نظر آئی۔ ناہید چپ چاپ منھ پھیلائے ہوئے بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں ایسا لگتا تھا کہ وہ جی بھر کے روئی ہیں۔ غالباً انھوں نے میرے بارے میں ناہید سے بات کی تھی اور تلخی کی نوبت آگئی تھی۔ افروز بھی بڑی خاموش خاموش تھیں کچھ دیر بعد انھوں نے بتایا کہ وہ کرنل صاحب کو ٹیلی گرام دے آئی ہیں۔ کل صبح واپس دلی جا رہی ہیں۔ کرنل صاحب انھیں اسٹیشن پر مل جائینگے۔ وہ رات ہم لوگوں نے بڑے اضطراب اور کرب کے ساتھ گزاری۔ صبح کو اسٹیشن پر میں انھیں رخصت کرنے گیا۔ وہ بیحد اداس تھیں۔ مشکل سے کوئی بات کر پا رہی تھیں۔ ٹرین پر بیٹھ گئیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں اپنے ایک ملنے والے سے جو ڈبے میں بیٹھے تھے یہ کہنے چلا گیا کہ میری ایک عزیز دلی اکیلے جا رہی ہیں، راستے میں ذرا خیال رکھنا۔ لوٹ کر آیا تو انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بڑی جذباتی آواز میں بولیں۔

"چلئے نا۔ آپ میرے ساتھ چلئے۔ یہ روپئے لیجئے ٹکٹ لے آیئے۔"

میں دنگ رہ گیا۔ میں نے کہا پھر کبھی آؤں گا۔ ٹرین کو حرکت ہوئی اور انھوں نے اپنا رومال میرے ہاتھ میں دے دیا جو ان کے آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ "میٹھ لیجئے ماڑیں پر جلئے بھی" آخری بار انھوں نے کہا اور ٹرین آگے بڑھ گئی۔

پھر اس کے بعد انھوں نے ناہید کو کوئی خط نہ لکھا۔ میرے نام البتہ ان کے کئی خطوط آئے جنھیں میں نے کھول کر پڑھنے کی جرأت تک نہیں کی۔ وہ اپنے پیچھے کافی اداسیاں چھوڑ گئی تھیں۔ ہماری چھوٹی سی دنیا میں وہ ایک ایسا طوفان بنکر آئی تھیں جس کے اثرات کئی مہینے تک باقی رہے اور بڑی مشکل سے ناہید اور میرے تعلقات پھر پہلے جیسے ہو سکے۔

مردم شماری

بقیہ صفحہ ۴۹

تمام باتیں صاف صاف درج ہوئی ہیں اور اس کو آگاہ کر دیا جاتا ہے کہ اس کی عدم تعمیل پر جرمانہ اور قید کی سزا ہو سکتی ہے۔

حکومت کو جو عوام کی نمائندگی کرتی ہے اور جو ان کی فلاح کی خواہاں ہوتی ہے عوام کی حالت کی معتبر اور مفصل معلومات ہونا چاہیئے تاکہ وہ ان کی فلاح و بہبود کا باقاعدہ بندوبست کر سکے۔ یہ معتبر معلومات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہیں جب شہری مردم شماری کے وقت پورا پورا اشتراکِ عمل کریں اور ایسی اطلاعات فراہم کریں جو صداقت پر مبنی ہوں۔ اگرچہ مردم شماری بنیادی طور پر افراد سے متعلق ہے لیکن آخری تجزیہ میں جس میں بحیثیت مجموعی لاتعداد نجی معلومات اعداد و شمار کی شکل میں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ ذاتی یا انفرادی حیثیت کلیتاً کھو جاتی ہے۔ مستقبل کے منصوبوں کی تشکیل ان مجموعی معلومات کی بنیاد پر ہی ہوتی ہے۔

رضاکارانہ اور اعزازی ۔ ہندوستان میں مردم شماری کا کام ہمیشہ باہمی امداد، رضاکارانہ اشتراک اور اعزازی طور پر کیا گیا ہے۔ بیسیوں برس سے مردم شماری کا کام اس لئے رضاکارانہ طور پر نہیں ہو رہا ہے کہ حکومت کے وقار اور اقتدار کا معاملہ تھا بلکہ اس لئے کہ عوام میں اس کی ضرورت کا کا احساس اور اشتراک کی اہمیت کا جذبہ پایا جاتا رہا ہے۔ ہر مردم شماری کے موقع پر ہر طبقہ کے افراد مثلاً مدبرین، ڈاکٹر، وکلا، سماجی کارکن، اساتذہ اور دوسرے لوگوں نے مردم شماری کے کاموں کے لئے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کی ہیں۔

کامیاب مردم شماری عوام اور حکومت کے درمیان مکمل تعاون کی آئینہ دار ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ہوتا ہے جب دونوں کو صحیح اور مکمل مردم شماری کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو۔ اس سلسلہ میں ہندوستان نے ایسی روایت قائم کی ہے جس پر اس کے عوام جائز طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اب بھی یہ عوام ہی پر منحصر ہے کہ وہ اس روایت کو آئندہ فروری۔ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء میں ہونے والی مردم شماری میں بھی برقرار رکھیں۔ ملک کے طول و عرض میں ایک صحیح اور مکمل مردم شماری کی اتنی شدید ضرورت اس سے پہلے کبھی اور محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت محسوس ہو رہی ہے جبکہ ہمارا تیسرا پنجسالہ منصوبہ شروع ہونے جا رہا ہے۔

کچھ غالب کے بارے میں

نثار احمد فاروقی

مجھے دیوان غالب اردو کا ایک مطبوعہ نسخہ ملا جو دسمبر ۱۸۸۲ء (مطابق صفر ۱۳۰۰ھ) میں منشی نولکشور کے مطبع سے چھپا تھا۔ یہ صفحہ ۲۰۲ پر تمام ہو جاتا ہے۔ اس میں کسی شخص نے یہ اہتمام کیا ہو کہ غالب کے جو اشعار متداول دیوان میں نہیں ہیں وہ حاشیہ پر نقل کر دیے ہیں۔ گو کہاں سے نقل کئے، اس کا حوالہ نہیں دیا۔ مثلاً آ ( ) سادہ صفحے پر دو قصیدہ نقل ہوا ہے جو غالب نے شیو نارائن آرام کو لکھ کر بھیجا تھا۔

ملاذ کشور و لشکر پناہ شہر و سپاہ

جناب عالی ایلن برون والا جاہ

اس کے آخر میں لکھا ہے "اصل قصیدہ تصنیف غالب است از نام شیو نارائن اولاد حسن ۲۳ مارچ ۱۸۸۸ء" لیکن ظاہر ہے کہ یہ اردوئے معلیٰ سے نقل ہوا ہوگا۔

اسی طرح کچھ اور غزلیں اور اشعار ہیں جو اب دیوان غالب نسخۂ عرشی میں آگئے ہیں اس لئے ان کا تذکرہ یا تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ لیکن صفحہ ۱۰ پر ایک غزل نقل ہوئی ہے جس میں چھ شعر ہیں۔ اس کا پانچواں شعر آب زدگی کے باعث پڑھا نہیں جاتا۔ بعض اور الفاظ بھی مخدوش ہیں۔ چونکہ ناقل نے حواشی میں غالب کا کلام نقل کرنے کا التزام کیا ہے اس لئے یہ غزل بھی (جس کے مقطع میں تخلص اسد آیا ہے) اس نے غالب ہی کی سمجھ کر نقل کی ہے۔ یہ نسخۂ عرشی میں بھی نہیں ہے۔ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ غالب کی زائیدۂ فکر ہے تا وقتیکہ قدیم تر سند نہ ملے۔

رفعے زخم میں جانچ ہوا گھلنا مرے تن کا ‏ ‏ سمجھتا ہے مجھے جرّاح آنسو چشم سوزن کا

پہنچتے ہی مرے قتل ہو شکست رنگ دشمن کا ‏ ‏ بنا ہے گردش قسمت مجھے

وہ کشتہ ہوں کہ اک پیمانۂ بادہ ہو مرا قاتل ‏ ‏ تتیمہ موج مے ہے خونکن بے میرے اس کا

دیا ہوگا ترے صحر کو میری ناتوانی نے ‏ ‏ کہ ہر تار گریباں پر گماں ہو میری گردن کا

کھٹک جائے جو آنکھوں میں بتہ میری شب غم کے

جو رشید لے آکر سپیدۂ صبح روشن کا

بحر مجھے یہ غالب کا رنگ سخن نہیں، اس کی پیروڈی معلوم ہوتی ہے۔

(۲)

غالب کی وفات پر بہت سی تاریخیں کہی گئیں۔ دیبی پرشاد سحر بدایونی کا دیوان مطبع منشی نولکشور سے جون ۱۸۶۹ء میں شایع ہوا تھا۔ اس میں بھی صفحہ ۱۱۱ پر رجب علی بیگ سرور کی تاریخ وفات اور غالب کی تین تاریخیں ملتی ہیں۔ پہلا قطعہ فارسی میں ہے جس کا عنوان ہے۔

قطعۂ تاریخ وفات نواب اسد اللہ خاں بہادر دہلوی

مُرد چو او، ایں ہمہ بے حال شدند ‏ ‏ شعر و سخن نثر و ہنر علم و فضل (۱۲۸۵ھ)

دوسرا قطعہ تاریخ اردو میں ہے:

تھا شاعر نامی یہی اب دنیا میں

افسوس یہ ہے کہ مر گیا غالب بھی

ہے ستمر یہ مصرع مرے لب پر جاری

"دنیا سے آج چل بسا غالب بھی"

تیسرا قطعہ بھی اردو میں ہے جس کے چوتھے مندرجۂ ذیل مصرع سے تاریخ برآمد ہوتی ہے:

فن کار کی موت

(دانش فرازی)

آج کی رات نہ جا
آج کی رات بہت بھاری ہے
سارے ماحول پہ غم طاری ہے
لڑکھڑاتے ہیں سُبک سیر ہواؤں کے قدم
سہمے سہمے سے ہیں دیوار خرد کے سائے
شعلۂ سازِ جنوں خیز بھی مدھم مدھم
آج فریاد بھی معبد سے پلٹ آتی ہے
زرد پتے ہیں سر شاخ بکھرنے کے قریب
اور قندیل کی لَو دیر سے تھراتی ہے
کل یہی رات تھی، پر یوں کبھی سنسان نہ تھی
اتنی مایوس و الم ناک و پریشان نہ تھی
آج کی رات نہ جا
برف گرتی ہے بہت دیر سے دھیرے دھیرے
در و دیوار پہ چھایا ہے جگر سوز سکوت
جیسے مرگھٹ کی فضا، جیسے بیاباں کا سماں
بستر مرگ پہ فن کار ہے اس طرح خموش
جیسے تخلیق کے دن سوچ میں یزداں کا شعور
آج ہر ذرۂ گیتی ہے سراپا مہجور
آج اک شعلہ ہے یوں برف کے ملبے کے تلے
بے بسی آئی ہے خود حسرت دیدار لیے
آج کی رات کا سناٹا ہے نغمے کا کفن
آج کی رات کا احساس ہے سینے کی جلن

(۲)

مٹ گئے دیکھ سونے لوح اُفق نرم خطوط
آج کی رات نمایاں ہے بہت چاند کا داغ
پھول افسردہ ہیں، ہر سمت شکستہ ہیں ایاغ
عزلت دیر میں ہیں سر بہ گریباں اصنام
موت خود آج ہے مغموم و پریشان و ملول
اس کو فن کار کے مرنے کا کوئی درد نہیں
وہ اسی سوچ میں ہے دیر سے مہجور و حزیں
مر کے بھی یہ مرے زنداں سے نکل جائے گا
فن کے لافانی تصور کی سُبک راہوں میں
ابدی حُسن کی گُل پوش و حسیں باہوں میں
مسکراتا ہوا ہر وقت نظر آئے گا
پھر مرے ماتھے پہ اُبھرے گی پسینے کی لکیر
آپ ہی آپ پگھل جائے گی میری زنجیر

گینڈا

مرتبہ محمد اسحاق صدیقی

گینڈا ہاتھی کے بعد ہمارے ملک کا سب سے بڑا جانور ہے۔ اس کا تعلق کھر رکھنے والے جانوروں کے اس خاندان سے ہے جس میں گھوڑے گدھے اور زیبرا وغیرہ شامل ہیں لیکن اس کے ہر پاؤں میں بجائے ایک کے تین کھر ہوتے ہیں جو ہاتھی کے پاؤں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ گینڈے کی اونچائی کندھے تک ۵ سے لے کر ۶ فٹ تک، لمبائی ۱۰ سے لے کر ۱۲ فٹ تک اور وزن ۵۰ سے لے کر ۸۴ من تک ہوتا ہے۔

گینڈے کی خصوصیت اس کی ناک کا سینگ ہے جو نر اور مادہ دونوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایک سے لے کر ۲ فٹ تک لمبا ہوتا ہے۔ یہ سینگ دراصل سخت بالوں کا بنا ہوتا ہے جو آپس میں مضبوطی سے چپکے ہوتے ہیں۔ دوسرے جانوروں کے سینگ کی طرح اس کا تعلق سر یا چہرے کی ہڈیوں سے نہیں ہوتا لیکن ناک کی ہڈی ابھری ضرور ہوتی ہے اور یہی ابھار سینگ کی بنیاد ہوتا ہے۔

مشہور ہے کہ گینڈا اپنے سینگ سے دشمن کا پیٹ پھاڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کا اصلی ہتھیار سینگ نہیں بلکہ سامنے کے دانت ہیں جن سے وہ کاٹنے کی کوشش کرتا ہے اور جنگلی سور کی طرح گہرا زخم پیدا کر سکتا ہے۔ غصے کی حالت میں یہ ہاتھی کی بھی پروا نہیں کرتا اور اسے بری طرح زخمی کر دیتا ہے۔

گینڈے کا سر بڑا اور بھونڈا ہوتا ہے۔ آنکھیں اور کان چھوٹے لیکن نتھنے بڑے ہوتے ہیں۔ دیکھنے کی طاقت کم لیکن سننے اور سونگھنے کی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ گینڈے کی کھال کا رنگ سیاہی مائل بھورا ہوتا ہے اور وہ نہایت مضبوط اور موٹی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں حس بھی نہیں ہوتی چنانچہ گرمی کے موسم میں دوسرے جانوروں کی طرح وہ بھی مکھیوں سے بہت پریشان رہتا ہے۔ گردن پر اس کھال کی کئی چنٹیں ہوتی ہیں۔ کندھے، کولھے اور ٹانگوں پر یہ اندر کی طرف مڑی ہوتی ہے جس کی وجہ سے گینڈے کا جسم ایسا لگتا ہے گویا ڈھالوں سے ڈھکا ہوا ہو۔ یہ کھال بے بال کی ہوتی ہے اور اس پر آبلے سا ابھار پائے جاتے ہیں۔

انیسویں صدی کے شروع میں گینڈا مشرقی اور مغربی ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں پایا جاتا تھا لیکن بیسویں صدی کے آغاز تک اس کی تعداد گھٹ کر درجنوں رہ گئی۔ یعنی سو سال کے اندر اندر اس کی نسل نابود ہونے کے قریب ہو گئی۔ اس کا سبب گینڈے کا اندھا دھند شکار تھا۔ جیسے جیسے انسانوں کی آبادی بڑھتی گئی، جنگلوں کو صاف کر کے شہر بسائے گئے اور دوسرے جنگلی جانوروں کے ساتھ گینڈے کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ آخر گینڈے کی نسل کو برقرار رکھنے کا احساس پیدا ہوا اور اس کے شکار پر پابندی عائد کر دی گئی۔

آسام میں ۱۹۰۸ء میں دریائے برہمپتر کے جنوبی کنارے کے جنگل جانوروں کے لئے محفوظ کر دیئے گئے اور کازی رنگا مامن (KAZIRANGA WILD LIFE SANCTUARY) کا قیام ظہور میں آیا۔ اس مامن کا رقبہ ۱۶۵ مربع میل ہے۔ پہلے وہاں ایک درجن سے زائد

گینڈے کا سینگ اور داس

گینڈے نہتے مگر اب وہاں تقریباً ۲۵۰ گینڈے ہیں۔ لوگ یہاں دور دور سے گینڈے کو اُس کے قدرتی ماحول میں دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہر سال یہاں ایک یا دو گینڈے زندہ عجائب گھروں کے لئے پکڑے جاتے ہیں اور اچھے داموں پر بکتے ہیں۔ مغربی بنگال میں تورسا ندی کے کنارے جل داپرا امن (JALDAPARA SANCTUARY) ہے جس کا رقبہ تقریباً ۳۹ مربع میل ہے۔ یہاں بھی تھوڑے سے گینڈے پائے جاتے ہیں۔ آسام اور مغربی بنگال کے بعد گینڈے کا خاص مسکن نیپال ہے جہاں کے جنگلوں میں تقریباً ۳۰۰ گینڈے موجود ہیں لیکن انسانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی نے ان کے مستقبل کو تاریک بنا دیا ہے اس لئے حکومت ان کی حفاظت کا انتظام کر رہی ہے۔

مغربی ہندوستان میں اب گینڈا نہیں پایا جاتا۔ اگر آپ گینڈے کو اُس کے قدرتی ماحول میں دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو مغربی بنگال، آسام یا نیپال جانا ہوگا۔ کازی رنگا امن (KAZIRANGA SANCTUARY) میں اُسے دیکھنے کے لئے خاص انتظام ہے۔ دُور سے تماشہ دیکھنے والوں کے لئے ۲۴ فٹ اونچے ستونوں پر ایک کمرہ بنایا گیا ہے جس کے چاروں طرف ایک چوڑا برآمدہ ہے۔ یہاں سے آپ آس پاس کا سارا علاقہ دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ گینڈے کو قریب سے دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو ہاتھی پر بیٹھ کر جانا ہوگا۔ آسام کے محکمۂ جنگلات نے اس کام کے لئے چھ ہاتھی رکھ چھوڑے ہیں صبح یا شام کو تین گھنٹے کے لئے آپ کو ایک ہاتھی دس روپئے کرایہ دے کر مل سکتا ہے چونکہ گھاس بہت اونچی ہوتی ہے اس لئے آپ آسانی سے گینڈے کو نہیں دیکھ سکتے۔ جب اُس کے چلنے سے گھاس ہلے تو پیچھا کرکے اُسے کھلی جگہ میں لا کر دیکھ سکتے ہیں۔ اگر کئی ہاتھی ایک ساتھ اُسے گھیر لیں تو دیکھنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ اسی لئے تماشائیوں کو پارٹی بنا کر جانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ گینڈے کی تصویریں کھینچنے کے لئے خصوصاً یہ طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے کیونکہ جب تک گینڈے کو ہر طرف سے گھیر کر مناسب جگہ نہ لایا جائے اُس کی اچھی تصویر نہیں کھنچ سکتی۔ گرمی سے بچنے کے لئے گینڈا دن میں سوتا اور رات کو چرتا ہے۔ سونے کے لئے ایسی جگہ چنتا ہے جہاں خوب سایہ ہو۔ یہ جگہ گھاس کے درمیان چھپی ہوتی ہے۔ اسے بھینسوں کی طرح پانی میں نہانا اور کیچڑ میں لوٹنا بہت پسند ہے۔ گینڈا ہمیشہ ایک ہی جگہ پاخانہ پھرتا ہے۔ رفتہ رفتہ اُس کے فضلہ کا ایک ٹیلہ بن جاتا ہے۔ غلاظت کا یہ انبار گھاس کے درمیان چھپا ہوتا ہے۔ گینڈے کے پاؤں تلے گھاس کے بار بار دبنے سے ایک لمبا راستہ بن جاتا ہے جسے گینڈے کی سُرنگ کہتے ہیں۔ گینڈا رفع حاجت کے لئے اس سُرنگ میں اُلٹے پاؤں داخل ہوتا ہے۔ گینڈے مل جل کر رہنا پسند نہیں کرتے۔ وہ عموماً تنہا یا جوڑا بنا کر رہتے

ہیں۔ مادہ کو حاصل کرنے کے لئے نر گینڈے آپس میں لڑتے ہیں۔ جو جیتا ہے مادہ اُسی کے ساتھ چلی جاتی ہے لیکن یہ ساتھ صرف ایک موسم کے لئے ہوتا ہے۔ آپس میں لڑنے کی وجہ سے نروں کے سینگ اکثر ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نر کے مقابلے میں مادہ کا سینگ (جو لڑنے بھڑنے کے کام نہیں آتا) زیادہ لمبا اور نکیلا ہوتا ہے۔ سینگ زندگی بھر بڑھتا رہتا ہے اس لئے ٹوٹنے کے بعد دوبارہ نکل آتا ہے۔ عجائب گھروں کے گینڈے دیوار یا کٹہرے سے اپنا سینگ رگڑتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سینگ جنگلی گینڈے کے سینگ کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے ہیں۔

گینڈے کی مادہ ۷ یا ۸ سال کی عمر میں بچہ پیدا کرنے کے قابل ہو جاتی ہے اُس کے ہر چوتھے سال صرف ایک بچہ ہوتا ہے۔ حمل کی مدت ۱۶ مہینے ہے۔ پیدائش کے وقت بچہ کندھے تک ۱½، ۲ فٹ اونچا اور قریب ۴۰ پونڈ وزنی ہوتا ہے۔ اُس وقت اس کی ناک پر سینگ نہیں ہوتا۔ وہ پیدا ہوتے ہی چلنے پھرنے لگتا ہے۔ دوسرے جانوروں کے بچے اپنی ماں کے پیچھے چلتے ہیں لیکن گینڈے کا بچہ اپنی ماں کے آگے چلتا ہے۔ اس کی ماں اُسے ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھتی ہے تاکہ کوئی درندہ اُس پر پیچھے سے حملہ نہ کر دے۔ علاوہ ازیں وہ اسے اپنے سینگ سے آگے بڑھنے کے لئے ہنکاتی رہتی ہے۔ بچے کو اپنی ماں کے ساتھ کئی سال رہنا پڑتا ہے جب وہ کافی بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی ماں اُسے بھگا دیتی ہے۔ گینڈے کی عمر ۵۰ سال تک ہوتی ہے۔

یوں تو گینڈا ایک نہایت بدمزاج اور خطرناک جانور ہے لیکن پالنے پر چند دنوں میں ہل رہا ہے۔ عجائب گھروں کے پالتو گینڈے گھاس کے علاوہ پھل، سبزی، روٹی اور مٹھائی بھی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ اُن میں سے بعض تو اتنے ہل جاتے ہیں کہ ان کی پیٹھ پر سواری کی جا سکتی ہے۔ وہ تماشائیوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور اکثر اپنا سر کٹہرے پر رکھ دیتے ہیں تاکہ کوئی اسے سہلائے۔ جب اُسے کانوں کے پیچھے سہلایا جاتا ہے تو وہ بلی یا کتے کی طرح خوش ہوتے ہیں۔

عجائب گھروں کے لئے زندہ گینڈے پکڑے جاتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے گینڈے کے آنے جانے کے راستے کا پتہ لگاتے ہیں۔ اس کے بعد اُس کے راستے میں ایک بڑا سا گڑھا کھود دیتے ہیں۔ اس کے اوپر پتلی پتلی شاخیں بچھا دیتے ہیں اور اس کے بعد اسے اچھی طرح گھاس اور جھاڑیوں سے ڈھانپ دیتے ہیں۔ جب گینڈا اس پر سے گزرتا ہے تو اس کے بوجھ سے شاخیں ٹوٹ جاتی ہیں اور گینڈا گڑھے میں گر پڑتا ہے۔ اسے باہر نکالنے کے لئے یہ ترکیب کرتے ہیں کہ جس طرف گینڈے کا منہ ہوتا ہے ادھر ایک دوسرا لیکن زیادہ گہرا اور ڈھلوان گڑھا کھود دیتے ہیں۔ دونوں گڑھوں کے درمیان ایک دیوار حائل ہوتی ہے جب یہ دوسرا گڑھا تیار ہو جاتا ہے تو اُس میں گینڈے کو لے جانے والی گاڑی ٹھیل دی جاتی ہے (اس گاڑی کا دروازہ پیچھے کی طرف ہوتا ہے اور اُس کے دونوں پٹ کھلے رہتے ہیں) اس کے بعد بیچ والی دیوار گرا دی جاتی ہے گینڈا سامنے جگہ دیکھ کر گاڑی کے اندر چلا جاتا ہے اور قبل اس کے کہ وہ گھبرا کر باہر نکلے دروازہ بند کر کے مضبوط رسیوں سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ گاڑی ہاتھی کی مدد سے باہر کھینچ لی جاتی ہے اور گینڈا ایک نئے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔

گینڈے کو پکڑتے وقت اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ وہ بجائے دن کے رات کو گڑھے میں گرے تاکہ دوسرے دن سویرے سویرے اُسے اپنی منزل پر پہنچا دیا جائے۔ اگر دھوپ تیز ہو جائے تو اس کی زندگی خطرہ میں پڑ سکتی ہے کیونکہ گینڈا باوجود بھاری بھرکم ہونے کے نہایت نازک جانور ہے اور اسے آدمی سے بھی جلد لو لگتی ہے۔

بسا اوقات گینڈے کے بچے کو پکڑنے کے لئے مضبوط رسی کا لمبا جال استعمال کیا جاتا ہے۔ اس جال کو ہاتھوں سے اونچا کئے ہوئے آدمی اُس جگہ کو گھیر لیتے ہیں جہاں گینڈا اچرتا ہے۔ وہ چپکے چپکے اُس کی طرف بڑھتے ہیں۔ جب وہ آدمیوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھتا ہے تو بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن سنگینوں کی مدد سے اُس کی پیش قدمی روک دی جاتی ہے اور پھر اُسے جال میں اُلجھا کر باندھ لیتے ہیں۔ بہرحال گینڈے کو پکڑنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے۔ اس لئے اس کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے آج کل ہندوستانی گینڈا ۲۰۰۰۰ روپے تک بکتا ہے۔

گینڈے کی کمیابی کا ایک سبب اُس کا سینگ بھی ہے مشرقی ممالک خصوصاً چین میں اُس کے سینگ کی بڑی مانگ رہی ہے۔ اسے دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور استعمال کرنے کے مختلف طریقے

ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے اُسے پیس کر چُورا کر لیا جاتا ہے۔ پھر اُسے ململ کے ٹکڑے میں باندھ کر پانی میں اُبالتے ہیں اور جب پانی کا رنگ چائے کی طرح ہو جاتا ہے تو اُسے پی لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پُرانے زمانے میں راجہ مہاراجہ اکثر گینڈے کا سینگ استعمال کرتے تھے۔ وہ گینڈے کے سینگ کے بنے ہوئے پیالے بھی کام میں لاتے تھے تاکہ اگر پینے کی چیز میں زہر ملا ہو تو پتہ چل جائے مشہور ہے کہ جب زہر ملی ہوئی چیز اس پیالے میں رکھی جاتی ہے تو اُس کے باہر پسینے کی ایسی بوندیں نظر آنے لگتی ہیں۔ غرض، انہیں اوصاف کی بنا پر گینڈے کا سینگ بہت مہنگا بکتا رہا ہے۔ چنانچہ ایک زمانے میں ہندوستانی گینڈے کے سینگ کے لئے اُس کے وزن کا نصف سونا دینا پڑتا تھا۔

گینڈے کی کھال کی ڈھالیں بنائی جاتی ہیں۔ نیپال میں گینڈے کے سینگ کے بنے ہوئے تعویذ اور کڑے شہزادے اور امرا پہنتے ہیں تاکہ بیماریاں اور خبیث روحیں دور رہیں۔ وہ گینڈے کا گوشت بھی بڑی لذت سے کھاتے ہیں۔ مہاراجہ یودھا شمشیر جنگ بہادر رانا جو ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۵ء تک نیپال کے وزیراعظم تھے گینڈے کے نرم تلوؤں کا گوشت بہت شوق سے کھاتے تھے۔ مرحوم بڑے اچھے شکاری بھی تھے اور اُنہوں نے اپنی زندگی میں جتنے گینڈے مارے شاید ہی کسی نے مارے ہوں۔ کہتے ہیں کہ نیپال والوں کا ایک عقیدہ ہے کہ دیوتاؤں اور بزرگوں کی روحوں کو گینڈے کا گوشت اور خون بہت پسند ہے۔ چنانچہ وہاں ابھی تک یہ دستور تھا کہ جب شاہی خاندان میں کسی مرد کا انتقال ہو جاتا تو اس کے بیٹے پر فرض ہو جاتا کہ وہ گینڈے کے پیٹ میں بیٹھ کر پوجا کرے۔ پوجا کرنے کے لئے پجاری پہلے گینڈے کو مارتا ہے۔ اُس کے بعد اُس کا پیٹ پھاڑ کر اتنا صاف کرتا ہے کہ اندر بیٹھنے کی گنجائش ہو جائے۔ جب وہ گینڈے کے پیٹ میں گھس کر اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے تو پروہت منتر پڑھنا شروع کرتا ہے، اور وہ شخص گینڈے کے سینگ یا کھال کے بنے ہوئے پیالے میں گینڈے کا خون بھرتا ہے اور مُردوں کے نام پر گراتا ہے۔

گینڈے کا گوشت، خون، کھال اور سینگ ہندوستان کے بھی بعض حصوں میں مقدس مانے جاتے ہیں لیکن چونکہ ہر شخص کے لئے گینڈے کو مارنا یا اُس کا خون حاصل کرنا ممکن نہیں اس لئے گینڈے کے سینگ یا اس کی کھال کے بنے ہوئے پیالے میں پانی، دودھ، دہی، گھی یا شہد بھر کر مُردوں کے نام پر گراتے ہیں اور اگر گینڈے کے سینگ یا کھال کا بنا ہوا برتن میسر نہیں ہوتا تو پوجا کرتے وقت اُس کی کھال کا بنا ہوا چھلا انگلی میں پہن لیتے ہیں۔ ہندوستان کی بعض ذاتیں گینڈے کے پیشاب کو جراثیم کُش مانتی ہیں اور اُسے ہانڈی میں بھر کر دروازے پر لٹکاتی ہیں تاکہ بیماریاں اور بھوت پریت دُور رہیں۔

گینڈے ہندوستان کے علاوہ بعض دوسرے ملکوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ دراصل گینڈے کی پانچ قسمیں ہیں جن میں سے تین ایشیا (ہندوستان، جاوا اور سماترا) میں پائی جاتی ہیں اور دو افریقہ میں۔ افریقہ میں دو طرح کے گینڈے پائے جاتے ہیں کالے اور سفید۔ دراصل دونوں کا رنگ سُرمئی ہوتا ہے۔ سفید گینڈا ہندوستانی سے بڑا اور کالا ہندوستانی گینڈے سے کچھ چھوٹا ہوتا ہے۔ دونوں کی ناک پر دو دو سینگ ہوتے ہیں جو تلوار کی طرح لمبے اور نکیلے ہوتے ہیں۔

جاوا کا گینڈا ہندوستانی گینڈے سے کچھ چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی اونچائی کندھے تک ۵ ½ سے لے کر ۶ فٹ تک ہوتی ہے۔ سینگ ۹ یا ۱۰ انچ سے زائد لمبا نہیں ہوتا اور صرف نر میں پایا جاتا ہے۔ اس کی کھال پر پچی کاری کا گمان ہوتا ہے۔ دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہو۔ یہ گینڈا درختوں کی پتیاں کھاتا ہے اور جنگلوں میں رہتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ بنگال، آسام، برما، سیام، انڈوچین، ملایا، جاوا اور سماترا تک پایا جاتا تھا۔ اب صرف جاوا کے مغربی سرے پر پایا جاتا ہے جہاں سرکار کی طرف سے اس کی حفاظت کا انتظام ہے۔

سماترا کا گینڈا سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی اونچائی کندھے تک ۴ سے لے کر ۴ ½ فٹ تک ہوتی ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً ۸ فٹ اور وزن ۲۸ من کے قریب ہوتا ہے۔ اس کے دو سینگ ہوتے ہیں۔ اگلے سینگ کی لمبائی ۲ ½ فٹ اور پچھلے کی ۳ سے لے کر ۶ انچ تک ہوتی ہے۔ اس کی کھال پر چھوٹے چھوٹے بال ہوتے ہیں۔ یہ گھنے جنگلوں میں رہتا ہے اور درختوں کی پتیاں کھاتا ہے۔ ایک زمانے میں بورنیو، سماترا، ملایا، برما اور آسام تک پایا جاتا تھا۔ اب صرف ملایا اور بورنیو میں ہوتا ہے۔ گینڈے کی کمیابی کے پیش نظر ہر ملک میں اُس کے شکار پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

غزل

شاہد صدیقی

کہاں تک شامِ فرقت کی خموشی بڑھتی جائے گی
میں جب آواز دوں گا آپ کی آواز آئے گی

شرارِ شوق سے خالی ہیں سینے اہلِ محفل کے
تو پھر خسترا کیلی شمع کب تک جھلملائے گی

میں اپنے غم کو بے پایاں سمجھتا تھا، خبر کیا تھی
تری تصویر میرے آنسوؤں میں مسکرائے گی

ہجومِ آرزو پر منحصر ہے زندگی دل کی
یہ طوفاں ختم ہوگا جب، تو کشتی ڈوب جائے گی

کسی قیمت پہ بھی جو ہم کو خوش ہونے نہیں دیتی
یہی دُنیا ہمارے ذکر پر آنسو بہائے گی

یہ بزمِ حسن ہے اور میں اَدب دانِ محبت ہوں
یہاں میری خموشی داستاں بننے نہ پائے گی

اندھیرے راستوں کا غم نہیں اربابِ ہمت کو
پہنچ جائیں گے منزل تک تو منزل جگمگائے گی

یہ شامِ ہجر کا عالم، یہ سنّاٹے کی سرگوشی
تو کیا صبحِ شبِ غم بھی ترا پیغام لائے گی؟

جو دل ہوگا تو مٹ جائے گا اُمیدِ مسرت میں
کلی ہوگی تو مرجھانے سے پہلے مسکرائے گی

میں شامِ غم کی تنہائی سے بھی مانوس ہوں شاہدؔ
یہ تنہائی مجھے میرے ہی افسانے سُنائے گی

غزل

کھول پرشاد کنول

کس نے دیکھا پلٹ کر مجھے پیار سے، زخم دل کا ہر اک مسکرانے لگا
کس کی نظروں نے چھیڑا مرا سازِ دل، درد بھی جھوم کر گنگنانے لگا

کس کی پائل کی رن جھن پڑی کان میں، گھل گیا مد مرے گیت کی تان میں
رنگ خوابوں سے کس کے پرا کرنے، شوق پھر اپنی محفل سجانے لگا

کس کے ماتھے سے پھوٹی کرن نور کی، بات پھیلی ہوئی شعلۂ طور کی
جل اٹھے کس کے جادوں سے من کے دیئے، ذرہ ذرہ مرا جگمگانے لگا

کس کے لب پر تبسم کی چٹکی کلی، موجِ مستی کی لہرا کے ہر سو چلی
جام اس کا جو آنکھوں سے چھلکا ادھر، ایک عالم اُدھر ڈگمگانے لگا

ہم جو دیر و حرم میں بھٹکتے رہے، پھول بھی خار بن کر کھٹکتے رہے
گل کی چاہت میں منزل وہ آئی کہ اب ہم کو کانٹوں پہ بھی پیار آنے لگا

سُرورجہان آبادی

مرتاب حمد آزاد

جب میں ایم۔ اے (اردو) کا طالب علم تھا سرورجہان آبادی کی ایک نظم بعنوان "تاج محل" جو میرے کورس میں تھی پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اسی وقت سے مجھے ان کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی جستجو پیدا ہوئی جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں ایک قصبہ ہے جہاں کائستھوں کی اکثریت ہے سرورؔ اسی قصبہ کے متوطن تھے۔ یہ قصبہ کسی زمانہ میں اپنی ادبی صحبتوں کے لئے مشہور تھا۔ چنانچہ سرورجہان آبادی کے دَور میں اور اُن کے بعد بھی وہاں متعدد مشاعرے ہوئے جن میں ہندوستان کے مشہور و معروف شعراء نے شرکت کی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۴۷ء میں میں نے جہان آباد جاکر حضرت سرورؔ کے سوانح حیات اور ان کے کلام کے متعلق مواد فراہم کرنے کا ارادہ کیا۔ جہان آباد پہنچ کر میری ملاقات برؔیاں جہان آبادی سے ہوئی جو اردو ادب سے اچھا ذوق رکھتے تھے اور سرورؔ کے دور کے رشتہ دار بھی ہوتے تھے۔ حضرت سرورؔ کے دَور میں کئی مشاعروں کی نظامت بھی کرچکے تھے۔ انہوں نے ایک مشاعرہ میں شرکت کرنے والے شعرا کے کلام بھی مجھے دکھائے۔ یہ مشاعرہ برؔیاں صاحب نے خود ہی منعقد کرایا تھا اور اس بزم کی صدارت جناب حکم بریلوی نے کی تھی۔ برؔیاں صاحب نے خود ہی اپنی وہ غزل بھی دکھائی جو انہوں نے اس مشاعرہ میں پڑھی تھی ان کے مطلع کا ایک مصرعہ اب بھی مجھے یاد ہے۔ ع جگر کو تھام لوگے گر سنوگے داستاں میری
یہ ایک غیرطرحی مشاعرہ تھا اور اس میں حضرت سرورجہان آبادی نے بھی ایک غزل پڑھی تھی جو حسبِ الوطنی کا مرقع تھی۔ میں نے ان کے دیوان میں یہ غزل نہیں پائی البتہ مجھے برؔیاں صاحب نے بتایا کہ یہ غزل انھوں نے بریلی کے ایک نوجوان شاعر کو کسی مشاعرہ میں پڑھنے کو دی تھی اور اس نے بعد کو انھیں واپس نہیں کی۔ غزل کا مطلع تھا ؎

مجھے ملے جو کبھی اختیار آزادی
بہشت بیچ کے لے لوں دیارِ آزادی

جناب برؔیاں جہان آبادی نے مجھے بتایا کہ اس مشاعرہ میں جناب حکم بریلوی کی ایک غزل بہت مقبول ہوئی اور مندرجہ ذیل شعر کو جناب سرور جہان آبادی نے کئی کئی دفعہ اصرار کرکے پڑھوایا۔

کارِ دنیا، فکرِ عقبیٰ، یادِ حق، عشقِ بتاں
چار دن کی زندگی میں ہائے کیا کیا کیجیے

برؔیاں صاحب نے فرمایا کہ اس مشاعرہ کے بعد حضرت سرورؔ کو اکثر جناب حکم بریلوی کا یہ شعر پڑھتے ہوئے پایا گیا۔ وہ اس شعر کو کئی کئی بار پڑھتے اور سر دھنتے تھے۔

برؔیاں صاحب کی عمر اُس وقت ستر سال سے کم نہ ہوگی جسم کے بھاری اور قد لانبا، سفید بال، کشادہ پیشانی اور رنگ گیہواں۔ انہوں نے جناب سرورجہان آبادی کے سوانح حیات کے متعلق جو کچھ فرمایا اُس سے یہ معلوم ہوا کہ سرورجہان آبادی ایک معزز کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انکے والد کا نام جناب پیارے لال تھا۔ خود سرورؔ صاحب کا پورا نام درگا سہائے تھا۔ اُن کے والد پیارے لال صاحب فارسی اُردو کے بڑے فاضل تھے۔ سرکار کے محکمہ مال میں نوکر تھے اور بہت شستہ اُردو بولتے تھے۔ گو وہ شاعری

نہیں کہتے تھے مگر شعر و سخن کا بڑا ذوق تھا۔ جہان آباد میں کوئی ایسا مشاعرہ ان کی زندگی میں نہیں ہوا جس میں انھوں نے شرکت نہ کی ہو۔ کئی بار تو وہ مشاعروں میں شعرا کا کلام سننے کے لئے لکھنؤ اور دہلی تشریف لے گئے۔ اُردو ادب سے اُن کی اس غیر معمولی دلچسپی کا اثر حضرت سرور پر بھی پڑا اور وہ کمسنی میں ہی شعر کہنے لگے۔ وہ کس سے اصلاح لیتے تھے اس کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ برّیاں صاحب کہتے تھے کہ وہ کسی کو اپنا اُستاد نہیں مانتے تھے اور اپنے والد سے ہی مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ مگر میں نے چند خطوط دیکھے جو ایک صاحب نثار لکھنوی نے انھیں لکھے تھے۔ ان خطوں میں ان کے کلام کے متعلق کچھ ہدایتیں بھی ہوتی تھیں۔ انھیں خطوط کی بنیاد پر جہان آباد کے کچھ حضرات کی رائے یہ تھی کہ حضرت سرور نثار لکھنوی سے ہی اصلاح لیتے تھے اور انھیں کو اپنا اُستاد مانتے تھے۔ بہر حال مجھے تفصیل سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ حضرت نثار لکھنوی کون بزرگ تھے۔ جناب جگر بریلوی مرحوم نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ نثار اس زمانہ میں لکھنؤ کے ایک اچھے شاعر تھے لیکن ان کی ساری عمر تنگ دستی میں بسر ہوئی اور اپنے ہم عصروں میں شہرت حاصل نہ کر سکے۔ اسی سلسلہ میں برّیاں صاحب نے یہ بتایا کہ نثار لکھنوی حضرت سرور کے مکان پر کئی بار تشریف لائے تھے اور بریلی اور جہان آباد کے دو ایک مشاعروں میں انھوں نے شرکت بھی کی تھی مگر وہ سرور کے استاد نہیں بلکہ دوست تھے۔ نثار صاحب کا کوئی شعر مجھے تلاش کرنے پر بھی نہیں مل سکا۔

بدقسمتی سے سرور کو کم عمری ہی سے شراب نوشی کی عادت پڑ گئی تھی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ نوجوانی ہی میں عالم فانی کو خیرباد کہہ کر عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر صرف تیس سال کی تھی۔ سرور کے متعلق ایک عام روایت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنا بہت سا کلام شراب فراہم کرنے کے لئے چند پیسوں کی خاطر دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس میں کچھ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ سرور کا دیوان نہایت

مختصر اور مع دیباچہ تقریباً چالیس صفحات سے زیادہ نہیں ہے۔ البتہ برّیاں صاحب کے یہاں مجھے اُن کے کلام کا ایک قلمی نسخہ دیکھنے کو مل گیا۔ یہ نسخہ مطبوعہ دیوان[1] سے دو گنا تھا۔ اشعار بھی اسی لحاظ سے تقریباً دو چند تھے۔ یہ نسخہ سرور کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں تھا اس لئے یہ دعوےٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں تمام اشعار سرور ہی کے تھے۔

سرور صاحب نہایت خوشخط تھے۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کئی خطوط میں نے برّیاں صاحب کے یہاں دیکھے۔ ان خطوط کا صرف خط ہی اچھا نہ تھا بلکہ اُن کی زبان بھی بڑی سلیس اور شستہ تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور نظم کے علاوہ اچھی نثر بھی لکھتے تھے۔

سرور جہان آبادی نظم اور غزل دونوں کہتے تھے۔ ان کی نظمیں جذبات نگاری اور حب الوطنی کا بڑا حسین مرقع ہیں۔ "تاج محل" کے عنوان سے حضرت سرور جہان آبادی نے جو نظم لکھی ہے اور جس سے ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی وہ محل شہنشاہ شاہجہاں اور ممتاز محل کے عشق و محبت کی زندہ جاوید تصویر ہے۔ شہنشاہ شاہجہاں، ممتاز محل کی وفات کے بعد دریائے جمنا کے کنارے تاج محل کی عمارت کو دیکھ کر حسرت و یاس کے عالم میں گذری ہوئی زندگی اور جوانی کی تمنا کرتا ہے لیکن پھر اُسے یہ خیال آتا ہے کہ اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ گذری ہوئی زندگی اور جوانی دونوں کا واپس آنا ناممکن ہے۔ شاہجہاں کے اس خیال کو حضرت سرور نے اس شعر میں نظم کیا ہے ؎

لیکن محال ہیں یہ دونوں خیال سرور ارماں بھی مر مٹیں گے بعد وصال میرے

نظموں کی طرح سرور کو غزل گوئی پر بھی عبور تھا۔ مگر میں نے اُن کے قلمی نسخہ کے پہلے ہی صفحہ پر جو غزل دیکھی وہ اُن کے مطبوعہ دیوان میں نہیں پائی جاتی۔ مجھے پوری غزل تو یاد نہیں ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

میں جب فریاد کرتا ہوں تو وہ رُخ پھیر لیتے ہیں
شکایت اور شکووں سے پریشاں ہے زباں میری

میں نے ان کے اس شعر کو کئی دوسرے حضرات کی زبانی بھی سُنا

[1] سرور کے کلام کے دو مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ ایک زمانہ پریس کانپور سے جس میں اُن کی وہ نظمیں شامل ہیں جو رسالہ زمانہ میں وقتاً فوقتاً شایع ہوتی رہتی تھیں، دوسرا جام سرور کے نام سے جسے انڈین پریس الہ آباد نے شایع کیا تھا۔ ایڈیٹر

اس لئے یہ اور بھی تعجب ہے کہ اُن کے مطبوعہ دیوان میں اس غزل کو کہیں جگہ نہیں ملی۔ بریاں صاحب کا خیال تھا کہ اُن کی یہ غزل اس قابل نہ تھی کہ ان کے دیوان میں جگہ حاصل کرتی مگر مجھے اس میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اس غزل کو بھی شراب نوشی کے لئے کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا ہو۔

جہان آباد میں ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قصیدہ دیکھنے کا بھی موقع مل گیا جو انھوں نے شاید اپنے کسی دوست یا عزیز کی شادی کے سلسلہ میں لکھا تھا۔ جب میں نے بریاں صاحب سے یہ کہا کہ یہ قصیدہ نہ اُن کے دیوان میں ہے نہ قلمی نسخہ میں اور اس کی کیا وجہ ہو تو وہ مجھے اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے۔ صرف یہ جواب دیا کہ اس طرح کی متفرق چیزیں اکثر ملیں گی جنھیں اُن کے دیوان میں جگہ نہیں مل سکی۔ اس قصیدہ کا مطلع تھا ؎

یوں بہار آئی چمن میں باغ رضواں بن گیا
دشت کا منظر بیاباں سے گلستاں بن گیا

قصیدہ کے علاوہ مجھے اُن کے کچھ متفرق اشعار بھی دیکھنے کو ملے جو اُن کے دیوان میں نہیں پائے جاتے۔ ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے ایک دو اشعار لکھ کر چھوڑ دیئے ہوں اور غزل یا نظم مکمل نہ ہو سکی ہو۔

سرور نے اپنے مطالعہ کے لئے جو کتابیں خرید کی تھیں، انھیں بھی مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں میر کا ایک دیوان بھی تھا۔ اس کی جلد پر غالباً سرور کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ شعر درج تھا ؎

کس کو سناؤں قصّے اپنے غمِ نہاں کے   اک جان ناتواں ہے سو ظلم آسماں کے

کہا نہیں جا سکتا کہ یہ شعر حضرت سرور کا ہے یا کسی دوسرے شاعر کا۔ بریاں صاحب بھی اِس بات کی تصدیق سے قاصر رہے۔ بہر حال اس مطلع کی کوئی غزل مجھے اُن کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ دیوانوں میں سے کسی میں بھی نہیں ملی۔ یا تو انھوں نے صرف مطلع کہہ کر چھوڑ دیا یا یہ کسی دوسرے شاعر کا مطلع تھا جو اُنھیں بہت پسند آیا اور انھوں نے دیوان کی جلد پر لکھ لیا۔ بریاں صاحب نے قطعی طور سے یہ بھی نہیں بتایا کہ یہ مطلع اُنھیں کے ہاتھ کا لکھا ہے۔ بہر حال کسی نے بھی لکھا ہو خط حضرت سرور کے خط سے ضرور ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُنھوں نے پوری غزل لکھی ہو اور جہان آباد کی روایت کے مطابق کسی دوسرے کو دیدی ہو۔

میں نے حضرت بریاں سے استدعا کی کہ وہ سرور کا غیر شائع شدہ کلام مجھے عطا فرما دیں تاکہ اُس کے شائع کرنے کے متعلق کوئی کارروائی یا مشورہ کیا جا سکے۔ مگر انھوں نے یہ کہہ کر مجھ سے انکار کر دیا "نہ جانے کتنے ایسے اصحاب آئے اور کئی دفعہ مجھ سے اُن کے کلام کی نقلیں لے گئے مگر اُن کا شائع کرانا تو کجا انھوں نے لوٹ کر مجھے جواب تک نہ دیا۔ اب اگر خدا نے چاہا تو ہمیں لوگ ان کے غیر شائع شدہ کلام کے شائع کرنے کا انتظام کریں گے۔" مجھے پتہ چلا ہے کہ بریاں صاحب کا بھی حال ہی میں انتقال ہو گیا۔ خدا جانے وہ سرور کے غیر مطبوعہ کلام کو کسی کے حوالے کر گئے یا نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے سرور کے اس غیر مطبوعہ کلام کا پتہ لگا کر اُسے شائع کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اُردو ادب میں اس سے بیش قیمت اضافہ ہو گا۔

مَردُم شماری

کیا آپ ہر ماہ کے شروع میں اپنے گھر کے اخراجات کا بجٹ بناتے ہیں۔ کیا آپ اپنی آمدنی کے مطابق ضرورتوں کی ادائگی جیسے کہ انکم ٹیکس، بچوں کی پڑھائی، ڈاکٹر کی فیس، بیمہ، اور بس ادا کرنے کے لئے ایک تھوڑی سی رقم علیحدہ علیحدہ رکھتے ہیں۔ یا آپ بغیر کوئی بجٹ بنائے الٹا سیدھا خرچ کرتے ہیں اور بعد میں کف افسوس ملتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کی اور آپ کے کنبے کی فلاح و بہبود کا انحصار بڑی حد تک ایک متوازن بجٹ پر ہوتا ہے۔ یہ بجٹ بناتے ہوئے آپ محض اپنی آمدنی اور گھر کے افراد ہی کو مدنظر نہیں رکھتے بلکہ گزشتہ وعدوں حال کی ضرورتوں اور مستقبل کے مطالبات کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

خاندان کی فلاح و بہبود کا انحصار جس طرح اس کے بجٹ پر ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح ملک کی فلاح اس کی آمدنی اور مطالبات کے صحیح تخمینے پر منحصر ہوتی ہے قوم کے بجٹ میں بھی کئے گئے وعدوں موجودہ ضرورتوں اور مستقبل کے منصوبوں کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔ اپنی دولت کو طبی امداد ہر سطح کی تعلیم زراعت صنعت اور نظم و نسق کی مدوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ انسانی طاقت کے ذریعہ حاصل کئے گئے وسائل کی بھی اس ضمن میں بڑی اہمیت ہے لیکن بجٹ کا بنانا اسی وقت ممکن ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ قوم کی دولت کو کتنے افراد میں تقسیم کرنا ہے۔ تمام طبقوں کے افراد کے مطالبات ایک سے نہیں ہوتے اور ہر طبقہ قوم کی دولت بڑھانے میں اپنی علمی استعداد کے مطابق تعاون کرتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں یہ معلوم کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ ملک میں کتنے افراد ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں۔ بس تمام علاقوں کے رہنے والوں کی تعداد کا شمار کرنا، اُن کی عمر، معاشی معیار، ان کی ضرورتیں، پیشے اور عام صحت وغیرہ سے متعلق تفصیلات کو یکجا کرنے کا نام مردم شماری ہے۔

قومی جائزہ۔ چونکہ ملک کے عوام کی تعداد وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے لہٰذا قومی بجٹ کو زیادہ موثر بنانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مقررہ وقفے کے ساتھ مردم شماری کی جائے۔ اس طرح یہ مردم شماری جو ہندوستان میں ہر دس سال بعد کی جاتی ہے ایک ایسے قومی جائزے کے مانند ہے جو حکومت کو متواتر اس کے ان وعدوں کی وسعت کا احساس دلاتا رہتا ہے جو وہ اپنی قوم سے کر چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہونے والی ترقیوں، پورے کئے گئے وعدوں اور غیر مکمل اسکیموں کا ایک گوشوارہ بھی ہوتا ہے۔

ایک فرد کی طرح قوم کو بھی اپنی روزمرہ زندگی کو منظم کرنا چاہئے۔ بجٹ بہر حال حساب وسائل اور انہیں استعمال کرنے کے ذرائع کا ایک تخمینہ ہے۔ بجٹ کا انحصار آبادی کی تعداد پر ہوتا ہے جس کے متعلق صحیح معلومات ہمیں صرف مردم شماری کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس لئے مردم شماری خواہ وہ کئی سال کے وقفوں ہی سے کیوں نہ ہو انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ کسی قوم کی انسانی طاقت، اس کے وسائل اور دوسری قوتوں کا تخمینہ جاننے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

ہندوستان کیلئے اہم معلومات۔ ہر ملک میں مردم شماری ہی قومی منصوبوں کی بنیاد ہوتی ہے۔ ہندوستان کے لئے تو یہ اور بھی اہم اور

ضروری ہے جس سے وسیع پیمانے پر منصوبہ بند ترقی کا بیڑا اُٹھایا ہے ۔ قومی منصوبہ بندی کا مقصد عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا، ان کی صحت، تعلیم، صفائی اور صنعتی قوت، طاقت اور زرعی پیداوار میں اضافہ کرنا ہے ۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی منصوبہ اس وقت تک مرتب نہیں ہو سکتا جب تک اسے ملک کی آبادی اور اس کی ضروریات کی صحیح معلومات فراہم نہ کی جائیں ۔ مثال کے طور پر کپڑے ہی کو لیجئے ۔ اس کا تعین کہ ہر شخص کو کس قدر کپڑا مل سکتا ہے اسی وقت ہو سکتا ہے جب ملک بھر کے کپڑے کے کارخانوں کی کل پیداوار اور آبادی کی تعداد معلوم ہو ۔

یہی بات غذا کے معاملہ میں بھی ہے ۔ کفالت اس وقت قائم ہو سکتی ہے جب ایسے لوگوں کی تعداد معلوم ہو جائے جن کا پیٹ بھرنا ہے اور ایک دن میں ایک آدمی کو کم سے کم کس قدر غذا کی ضرورت ہے ۔ ہر کمیٹی کا خواہ وہ سماجی ہو یا سیاسی اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ کتنے لوگوں کے لئے منصوبہ بنانا ہے ۔ ہر منصوبے کے واسطے مردم شماری کے اعداد ہی مواد فراہم کرتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ معقول مردم شماری کے بغیر کوئی منصوبہ بندی نہیں کی جا سکتی ۔

ملک بھر میں مردم شماری ۔ مردم شماری کو زیادہ موثر اور مفید بنانے کیلئے اسے ملک گیر ہونا چاہئے اور بیک وقت تمام علاقوں میں اس کا انتظام ہونا چاہئے ۔ یہ ایک انتہائی وسیع عمل ہے جس میں کثیر مصارف ہوتے ہیں اور اس کے لئے نظم و نسق کی ساری مشینری کو مصروفِ کار ہونا پڑتا ہے ورنہ ساری محنت اور اخراجات رائگاں جائیں گے ۔

شہریوں کے حقوق کا تحفظ کرے اسے فرائض کو پوری طرح ادا کرے بعض معاملات میں تکا بیت کو سختی کے ساتھ قائم رکھے اور ایسی معلومات فراہم کرنے میں جو ہم مرتبہ قدروں کی حامل ہوں حکومت کے پاس اعتبار کا ہونا لازم ہے ۔

شہری کے حقوق اور فرائض ۔ ایک شہری کے وہ کون سے حقوق ہیں جنکی ضمانت کی جائے گی اور مردم شماری کے بارے میں اس کے فرائض کیا ہیں ۔ مردم شماری کے وقت شہری سے بعض معلومات ایسی فراہم کرنا ہوتی ہیں جو صیغہ راز کی ہوتی ہیں اور جن کو وہ بعض وقت اپنے قریب ترین دوست سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے ۔ یہ سوالات عمر ۔ شادی اور پیشہ سے متعلق ہوتے ہیں ۔ اس لئے حکومت اس امر کی ضمانت کریگی کہ مردم شماری کے سلسلہ کوئی بھی معلومات جو کسی فرد سے حاصل کی گئی ہوں سختی کے ساتھ صیغہ راز میں رکھی جائیگی اور یہاں تک کہ کسی عدالت میں بھی ظاہر نہیں کیا جائے گا ۔

مردم شماری کے سلسلہ میں شہری کی جانب سے فراہم کی جانے والی کوئی بھی معلومات اس کے خلاف بجز مردم شماری کے مخصوص جرائم جیسے صحیح معلومات کو چھپانے یا ان سے انکار کرنے کے علاوہ کسی بھی انتظامی یا عدالتی تحقیقات یا مقدمہ میں کبھی بھی استعمال نہیں کی جائے گی ۔

حکومت اس کی بھی ضمانت کرتی ہے کہ مردم شماری کے بارے میں شہری کی جانب سے فراہم کی جانے والی معلومات کو جبری بھرتی ٹیکس لگانے یا دوسری انتظامیہ تحقیقات جیسے مقاصد کیلئے کبھی بھی استعمال نہیں کیا جائے گا ۔

یہ ضمانتیں جو مردم شماری کی تحقیقات کی بنیاد ہیں شہری کے ذہن سے تمام شکوک و شبہات رفع کر دینگی اور ان کو اس بات پر آمادہ کرینگی کہ وہ سوالات کا صحیح صحیح جواب دیں ۔

جہاں تک فرائض کا تعلق ہے ہر شہری کا یہ فرض ہے کہ وہ سوالوں کا صحیح صحیح اور اپنے علم کے مطابق جواب دے ۔ اس کو مردم شماری افسر کے کہنے کے مطابق عمل کرنا چاہئے ۔ مثال کے طور پر وہ اپنے مکان کا نمبر باقاعدہ لگا دے اور مردم شماری کرنے والے کے روبرو اپنے گھر کے تمام افراد کو پیش کرے ۔

ذمہ داریاں ۔ ایک شہری کا فرض مردم شماری افسر کے طور پر کام کرنا بھی ہے اگر اسے اس عہدہ پر مقرر کیا جائے ۔ ایسی حالت میں اس کو حکومت کی جانب سے اختیارات حاصل ہوں گے اور اس کو بعض فرائض بھی انجام دینا ہوں گے ۔ جو شہری مردم شماری افسر مقرر کیا جائے اس کو چاہئے کہ وہ عوام سے قریبی تعلقات قائم رکھے اور دوسرے شہری سے ان سوالوں کے علاوہ جو مردم شماری کی کارروائی سے متعلق تجویز کئے گئے ہیں کوئی اور سوال نہ کرے مثال کے طور پر ایک مردم شماری افسر کے لئے یہ ممنوع قرار دیا گیا ہے کہ وہ کسی شہری سے یہ سوال کرے کہ اس کی کل آمدنی کیا اور وہ کون کون سے ٹیکس ادا کر رہا ہے یا کچھ قسم کے ایسے سوالات کرے جو مردم شماری کے سوالنامہ میں شامل نہیں ہیں ۔ اس کے علاوہ مردم شماری افسر کو نہ تو شہری سے حاصل کی جانے والی معلومات کو توڑنا مروڑنا چاہئے نہ جان بوجھ کر تفصیلات کا غلط اندراج کرنا چاہئے ۔ مردم شماری افسر کو جو پروانہ تقرری ملتا ہے اس میں اس کے حقوق اور فرائض سے متعلق

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۵ پر)

اتر پردیش میں آزادی کا تیرھواں سال

ہمہ گیر ترقی کے کامیاب اقدامات

اتر پردیش میں آزادی کے تیرھویں سال یعنی ۱۵ اگست ۱۹۵۹ء تا ۱۵ اگست ۱۹۶۰ء تک ہر سمت نمایاں ترقی ہوئی۔ زرعی پیداوار میں اضافہ کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اتر پردیش کو صنعتی حیثیت سے مستحکم بنانے کی مساعی کا سلسلہ جاری رہا۔ تعلیم، علاج و معالجہ اور امداد باہمی کی سہولتوں میں اضافہ ہوا اور دیہاتی زندگی کو خوشگوار بنانے کے اقدامات کئے گئے ذیل میں حکومت اتر پردیش کی بعض سرگرمیوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

محکمہ زراعت: اسی سال ترقی زراعت کو بڑھانے کی مہم پر مبنی محکمہ کی کوششوں کی بدولت ۲،۶۸۵ لاکھ ٹن کے مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں ۲،۸۹۴ لاکھ ٹن کیمیاوی کھاد استعمال کی گئی۔ اور ۵۴ ٹن کے مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں ۵ لاکھ ٹن کمپوسٹ کھاد کسانوں میں تقسیم کی گئی۔ علاوہ ازیں ۵۲ ہزار ٹن کھاد [illegible] اور تقسیم کی گئی۔ زمین کو اور زیادہ زرخیز بنانے کیلئے ریاست کے مواضعات میں ۲۳۸،۱۰ لاکھ ٹن کمپوسٹ تیار کی گئی۔ "زیادہ اناج پیدا کرو" اسکیم کی رفتار تیز کر دی گئی اور اس کے تحت بہت سے مزید فارم اور بیج گودام قائم کئے گئے۔

کھیتی کے جدید طریقوں کو مقبول بنانے پر خاص توجہ دی گئی۔ زیر نظر مدت میں ۱۶،۹ لاکھ ایکڑ میں جاپانی طریقہ سے دھان کی کاشت۔ اور ۳۶۴،۷ لاکھ، ۸۸۰،۸ لاکھ، ۳،۲۴۰ لاکھ اور ۳،۰۲،۲ لاکھ ایکڑ زمین میں بالترتیب گیہوں، دھان، مکا، باجرہ، اور ربیع کی فصلوں کی قطاروں سے بوائی کی گئی۔ علاوہ ازیں ۶۲۸،۱۵ لاکھ ایکڑ زمین میں اتر پردیش کے طریقہ کو گیہوں کی کاشت کا کامیاب مظاہرہ کیا گیا۔

[illegible] کے پس ماندہ اور پہاڑی علاقوں میں مخصوص اسکیمیں شروع کی گئیں۔ اس ضمن میں کنٹوں میں آلو کی ترقی کی اسکیم، مشرقی اضلاع میں ضمنی فصلوں کی اسکیم اور مشرقی اتر پردیش میں کامیابی کی ہمہ جہت ترقی کے لئے طویل مدت کے قرضہ کی اسکیم کے تحت نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

مٹی کے کٹاؤ کی جانچ کے لئے ۳۲۶۸۱ ایکڑ زمین کا جائزہ سروے کیا گیا۔ اور ۲۱۹۷۱ ایکڑ زمین میں مٹی کے تحفظ کے اقدامات کئے گئے۔

تجارتی فصلوں کے سلسلہ میں جوٹ اور تلہن کی پیداوار مقررہ نشانہ سے تجاوز کر گئی۔ گنے کی پیداوار بڑھانے کے لئے ۸۰ چھوٹے ٹیوب ویل اور ۳۲۳۲ پختہ کنوئیں تعمیر کئے گئے۔ علاوہ ازیں ۹۱۴۴ کنوئیں کھدوائے گئے اور ۱۹۵۲ کنوؤں میں رہٹیں اور ۱۷۵ کنوؤں میں پمپنگ سیٹ لگائے گئے۔

مویشیوں کی ترقی پر خاص زور دیا گیا اور جدید اصولوں کے مطابق مویشیوں کی افزائش نسل کے لئے پوری ریاست کو نو حلقوں میں تقسیم کیا گیا۔

غذائی محاذ ۔ مختلف ضروری اقدامات اور سستے اناج کی دکانوں کے ذریعے ریاست بھر میں بڑی مقدار میں اناج کی فروخت سے قیمتوں میں اضافہ کی روک تھام کی گئی۔ اس سال ربیع کے اناج کا بازار بھاؤ سابقہ سال کے مقابلہ میں عام طور پر کم رہا۔ ہنگامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے محفوظ ذخیرہ جمع رکھنے کی پالیسی کے مطابق لیوی سسٹم کے تحت

گیہوں اور چاول کی خریداری جاری رہی ہے۔

زیر نظر مدت میں ریاست میں ۵۶۶۹ سستے اناج کی دکانیں قائم تھیں۔ ان دکانوں کو مجموعی طور پر ۵ ۔ ۲۴ ٹن اناج دیا گیا علاوہ ازیں رولر آٹا ملوں کے ذریعہ بڑی مقدار میں گیہوں سے تیار شدہ اشیاء بھی ان دکانوں کے ذریعہ سپلائی کی گئیں۔ ریاستی حکومت کے پاس مئی سنہ ۱۹۶۰ء کے آخر میں ۳۳۸۵ ۲ ٹن اناج کا اسٹاک تھا۔

آبپاشی کا نیا ریکارڈ ۔ خریف کے سیراب علاقہ میں ۲،۴ لاکھ ایکڑ سے زائد کے اضافہ سے ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا جس سے کل سیراب علاقہ ۱۴ لاکھ ایکڑ سے زیادہ ہوگیا۔ جبکہ اس سے قبل کے سال میں سیراب علاقہ ۲۴،۵ ۲ لاکھ ایکڑ تھا۔ زیر نظر مدت میں ربیع کے ۵۰ لاکھ ایکڑ سے زیادہ رقبہ کی آبپاشی کی گئی جبکہ سنہ ۵۷-۱۹۵۶ء میں ۹۵ ر ۴۶ لاکھ ایکڑ کی آبپاشی ہوئی تھی۔

آبپاشی کی بڑی اور درمیانی اسکیموں پر ۵۵ ر ۲۸ ۳ لاکھ روپیہ اور چھوٹی اسکیموں پر ۲۴ ر ۱۱۵ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ زیر نظر مدت انسداد سیلاب کی اسکیموں پر ۱۱ ر ۱۷ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ نالیوں کی لمبائی بڑھ کر ۲۵۴ میل اور ٹیوب ویل کی تعداد ۴۶۴ ہوگئی۔

زیر نظر مدت کے آخر میں چھوٹے اور دوسرے منصوبوں کی آبپاشی کی متعلقہ اسکیموں کے ذریعہ آبپاشی کی صلاحیت بڑھ کر ۳۹ ر ۳۵ لاکھ ایکڑ ہوگئی۔

جرگو بند ۔ اہرکھوری بند اور بالسکی ساگر کی تعمیر مکمل ہوگئی اور ان سے آبپاشی کے لئے پانی ملنے لگا ہے ۔ دھری گھاٹ بند نہر کا پانی ضلع بلیا میں پہنچ گیا۔

آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں کے تحت ۶۳ ٹیوب ویل کو بجلی مہیا کی گئی اور وہ کام کرنے لگے ۔ پہاڑی اضلاع میں گولوں اور چھوٹی نالیوں کی تعمیر جاری ہے میدانی علاقوں میں آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں اور جنوبی اضلاع میں بندوں کی تعمیر اور پانی کی نکاسی کی اسکیمیں قریب تکمیل ہیں۔

ریاست کے پہاڑی اضلاع ۔ مشرقی اضلاع ۔ اور بندیلکھنڈ میں مرکزی حکومت کی مالی امداد سے آبپاشی کی متعدد چھوٹی اسکیمیں شروع کی گئیں۔ علاوہ ازیں مغربی اضلاع میں پانی کی نکاسی اسکیموں پر عملدرآمد شروع کیا گیا ۔ ان تمام اسکیموں پر مجموعی طور پر ۶ ر ۸۰ ۲ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ ان اسکیموں پر مارچ سنہ ۱۹۶۰ء تک ۵۶ ر ۲۸ ۳ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

اصلاحات آراضی ۔ زیر نظر مدت میں چک بندی اسکیم متعدد نئے اضلاع اور تحصیلوں میں شروع کی گئی سرکاری مالیات کی وصولی سے متعلق قانون مجریہ سنہ ۱۹۶۰ء نافذ کر دیا گیا اور ... زمینداری قانون ترمیم کیا۔

موجودہ جوتوں کی حد کے تعین سے متعلق قومی پالیسی کے مطابق ریاستی حکومت نے مجالس قانون ساز میں ایک بل پیش کیا جو دونوں ایوانوں کی مشترکہ منتخبہ کمیٹی کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ اس بل کے تحت ۵ افراد تک کے کنبہ کیلئے اچھے قسم کی زمین کی صورت میں ۴۰ معیاری ایکڑ کی حد مقرر کی گئی ہے۔ پانچ سے زیادہ افراد پر مشتمل کنبہ کی صورت میں ہر ایک زائد ممبر کے لئے ۸ ایکڑ اچھے قسم کی زمین کا اضافہ کیا گیا ہے مگر یہ اضافہ کسی صورت میں ۲۴ ایکڑ سے زائد نہیں ہوسکتا۔

تحریک امداد باہمی ۔ تحریک امداد باہمی کے تحت زیر نظر سال کا سب سے نمایاں کارنامہ جو جاری رہنے کی ریکارڈ مدت میں ابھرا ہے زیادہ تر ہمہ مقصدی امداد باہمی انجمنوں کا قیام ہے۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ابھی ایک تاریخی تقریر میں اسے "صحیح سمت میں ایک عظیم اقدام" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تعداد تمام دوسری ریاستوں کی ہمہ مقصدی امداد باہمی انجمنوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے ۔ اس کام کے لئے بے پناہ جوش و خروش کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۸۵۰۰۰ سے زیادہ نئے ممبر بنائے گئے اور ۱۶ لاکھ روپیہ سرمایہ حصص کے طور پر جمع کیا گیا۔ زیر نظر مدت میں ۱۵۷۰۰ مواضعات دیہی امداد باہمی انجمنوں کے دائرہ اثر میں آگئے۔

اجتماعی ترقی ۔ اجتماعی ترقی کے میدان میں زیر نظر مدت میں عوام کی فلاح و بہبود کے پروگرام کی رفتار تیز کر دی گئی۔ علاوہ ازیں اس سال بنیادی اداروں جیسے پنچایتوں ۔ امداد باہمی انجمنوں اور دیہی اسکولوں کے ذریعہ غیر سرکاری افراد کو مختلف پروگراموں کی تکمیل کی ذمہ داری منتقل کرنے کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

دیہی پنچایتوں کو مضبوط بنانے اور ان کو زیادہ ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے قابل بنانے کے لئے زیادہ روپیہ تحویل کر کے بلاک میں گاؤں سبھاؤں کو دیا گیا۔ پنچایتوں کو مقررہ رقم میں سے اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے اور ان کو مکمل کرنے کی آزادی ہوگی۔

زراعتی پیداوار کے پروگرام پر عمل درآمد اور کھیتی کے جدید طریقوں کی توسیع کی ذمہ داری ترقی پسند کسانوں اور گرام سہائکوں کے سپرد کی گئی۔

گرام سہائکوں کو بہتر اور موثر طور پر کام کرنے کے قابل بنانے کے لئے ان کے لئے ترقی کورسوں کا انتظام کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ۱۰۱ لاکھ سے زیادہ گرام سہائکوں کو تربیت دی گئی اور ہر ایک تربیت یافتہ گرام سہائک سے درخواست کی گئی کہ وہ پانچ سے لیکر دس کسانوں کو تربیت دے اور ان کے پیداواری پروگرام کی تکمیل میں مدد کرے۔

زیر نظر سال میں غیر سرکاری افسروں اور اداروں میں ملک رفاقتی کمیٹیوں کے ممبروں کو امداد باہمی ترقی کے اصولوں اور توسیعی پروگرام کی وسعت سے متعلق تربیت دینے کا اہم پروگرام شروع کیا گیا۔ تاکہ ممبران زیادہ موثر طور پر کام کر سکیں۔

صنعتی ترقی ۔ بھاری صنعتوں کی ایک مشاورتی کمیٹی اور دیہی و چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں سے متعلق ورکنگ گروپ کی جانب سے عارضی پروگرام تیار کئے گئے۔ مشرقی اضلاع۔ پہاڑی اضلاع اور بندیلکھنڈ ڈویژن کے پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ علاقوں کی ترقی کے لئے مخصوص اسکیمیں تیار کی گئیں بعض اضلاع میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے فروغ کے لئے مزید اقدامات کئے گئے۔

ریاست میں سال مذکور میں صنعتی معاملات کی رفتار ترقی بہت سست رہی۔ گزشتہ تین برسوں میں فیکٹری ایکٹ ۱۹۴۸ء کے تحت ۷۶۴ نئے کارخانے قائم کئے گئے اور ۲۴۴ نئے صنعتی واحدوں کو لائسنس جاری کئے گئے۔

زیر نظر سال میں پیداوار کے سلسلہ میں جو اعداد و شمار فراہم کئے گئے ان کے مطابق چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے سیکٹر میں ۱۹۵۷ء کے مقابلہ میں ۱۹۵۹ء میں ۲۶ فی صدی کا اضافہ ہوا جبکہ اس مدت میں روزگار کے میدان میں ۳۵ فی صدی کا اضافہ ہوا۔

پبلک سیکٹر میں گورنمنٹ سیمنٹ فیکٹری کی توسیع کا کام بہت سرعت سے جاری رہا جس سے اُمید ہے کہ ۱۹۶۱ء سے ۱۴۰۰ ٹن سیمنٹ روزانہ تیار ہو سکے گی۔ گورنمنٹ پریسیژن انسٹرومنٹ فیکٹری میں زیر نظر مدت میں طبی آلات تیار ہونے لگے۔

پرائیویٹ سیکٹر میں مرکزی حکومت نے بریلی میں ۱۲ کروڑ روپیہ کی لاگت سے مصنوعی ربڑ کا ایک کارخانہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ رینو کوٹ کے علاقہ میں الومینیم فیکٹری کے قیام کے لئے ضروری انتظامات کو قطعی کیا گیا۔

وارانسی کی سوڈا ایش فیکٹری اور کانپور میں ساڑھے تین کروڑ روپیہ کی لاگت کی ہے۔ کے ریحان فیکٹری میں کام شروع کر دیا گیا۔ ٹرانسفارمر اور سوئچ گیر تیار کرنے والی ایک فیکٹری بھی قائم کی گئی۔

ملک میں روسی امداد سے قائم ہونے والے دواسازی کے پانچ کارخانوں میں سے اینٹی بایوٹکس کا ایک کارخانہ اس ریاست کو الاٹ کیا گیا جو ضلع دہرہ دون میں رشی کیش میں قائم کیا جائے گا حکومت ہند نے اتر پردیش میں ۲۷ کروڑ روپیہ کی لاگت سے کیمیاوی کھاد کی فیکٹری قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مالیاتی کارپوریشن نے مجموعی طور پر ۴۷ء۳۴۴۲۳ روپیہ کے قرضے تقسیم کئے۔

مواضعات کو بجلی ۔ اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کی ہائیڈل یونٹ کے تحت بجلی گھروں کی مجموعی پیداواری صلاحیت دسمبر ۱۹۵۹ء تک ۱۸۹۲۷ کلوواٹ تھی جبکہ ۱۸۹۲۷ کلوواٹ بجلی پیدا کی گئی۔ ریاستی بجلی بورڈ نے دیہی صنعتوں کو فروغ دینے کے پیش نظر ۴۲ قصبوں میں بجلی فراہم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ریہاند پروجیکٹ کے بجلی سے متعلق سیکشن پر اپریل ۱۹۵۹ء سے مارچ ۱۹۶۰ء تک ۲۱/۱۶۴ لاکھ روپیہ صرف کیا گیا۔

کانپور میں ۳۰ کلوواٹ کی پیداواری صلاحیت کا ایک ڈیزل بجلی گھر قائم کیا گیا۔ جمنا مرحلہ دوئم پر کھدائی اور مکمل جائزہ کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ پہلے منصوبہ کے ۴ ریاستی ٹیوب ویلوں کے علاوہ مزید ۸۲ ٹیوب ویلوں کو بجلی فراہم کی گئی۔ اس کے علاوہ زیر نظر سال میں کالپی (جالون)۔ اورئی (جالون)۔ جالون۔ ملک (رامپور)۔ ہستنا پور (میرٹھ)۔ بلیا (اعظم گڑھ) کے قصبات کو بجلی فراہم کی گئی۔

پرائیویٹ سیکٹر میں بجلی کی پیداواری صلاحیت ۱۹۵۹ء میں بڑھ کر ۱۴۸۱۴۵ کلوواٹ اور صارفین کی تعداد بڑھ کر ۲۰۷۴۶۸ ہو گئی۔

ریاست میں صنعتوں کو مزید فروغ دینے کے لئے یو۔ پی بجلی ڈیوٹی ایکٹ ۱۹۵۲ء میں ترمیم کی گئی جس کے تحت سامان تیار کرنے اور ان کی پروسیسنگ اور مرمت کرنے سے متعلق صنعتوں کو بجلی ڈیوٹی کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

مزدوروں کی فلاح ۔ زیر نظر مدت میں دو تخمینہ کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا جن میں ایک کا کام مزدور فلاحی اداروں کے کاموں کا جائزہ لینا تھا اور دوسری کمیٹی کا کام مصالحتی اداروں بشمول مزدور عدالتوں

اور صنعتی عدالتوں کی کارکردگی کی جانچ کرنا تھا۔ ایک کمیٹی نے صنعتی مزدوروں کی صحت سے متعلق جائزہ لینے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور دوسری کمیٹی نے سہ رانہ سالی میتن اسکیم کے جائزہ کا کام پایہ تکمیل کو پہنچایا۔

زیر نظر مدت میں مزید ۹ مزدور فلاحی مرکز، ۱۲۶۰ نئے مکانات، ۱۱۲ نئی ٹریڈ یونینوں کا رجسٹریشن اور دو ریسی اور تعلیمی کیمپوں کی تنظیم کی گئی۔ حکومت نے ان ٹریڈ یونینوں کو جو اپنے ممبران کی ثقافتی، علمی اور سماجی ترقی کا کام کر رہی ہیں مالی امداد دی۔ ٹریڈ یونین ہال تعمیر کرنے سے متعلق ایک نئی اسکیم کی ابتدا کی گئی جس کے لئے ریاستی حکومت نے بجٹ میں ۵ ہزار روپیہ کی رقم مقرر کی اور ایسے ہالوں پر آنے والی مجموعی لاگت کا نصف حصہ دینے کی پیشکش کی جو ٹریڈ یونینوں کی جانب سے ریاست کے پانچ بڑے شہروں میں تعمیر کئے جائیں گے۔

زیر نظر سال کے دوران میں قالین کی صنعت میں کام کرنے والوں اور کانپور امپرومنٹ ٹرسٹ اور ڈویلپمنٹ بورڈ کے ملازمین کی اجرت کی کم سے کم شرح مقرر کی گئی۔ ریاست میں مزید ۶ روزگار دفتر کھولے گئے اور نوجوانوں کو پیشہ کا انتخاب کرنے میں مدد دینے کے لئے پیشہ ورانہ رہنمائی سے متعلق مزید چار ادارے قائم کئے گئے۔

سڑک اور پل۔ زیر نظر سال میں مزید ۵ میل لمبی پختہ سڑکیں تعمیر کی گئیں اور متعدد زیر تعمیر پلوں کو مکمل کرکے آمد و رفت کے لئے کھول دیا گیا۔ اس کے علاوہ ریاستی محکمہ تعمیرات عامہ کے ذریعہ بہت سی عمارتیں تعمیر کی گئیں اور تعمیری کاموں میں کفایت شعاری پیدا کرنے کے پیش نظر نئے طریق کار دریافت کرنے کے لئے تحقیقات کی گئیں۔

ریاست کے دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت اس وقت تک ۲۲۶،۲۳ لاکھ روپئے کی لاگت سے ۶۳ پل بن کر تیار ہو چکے ہیں اور ۵۵ پلوں پر تعمیر کا کام جاری ہے۔ بعض اہم پل جن کی تعمیر اس سال مکمل ہو چکی ہے اور جن کو آمد و رفت کے لئے کھول دیا گیا ہے یہ ہیں۔ ضلع لکھنؤ میں بنتھرا، ہردوئی روڈ پر گگوا نالہ کا پل۔ ضلع مرادآباد میں ڈبائی بسر پلا۔ چندوسی روڈ پر سون ندی کا پل۔ ضلع بستی میں بستی۔ نوگڑھ روڈ پر بوڑھی راپتی کا پل۔ ضلع بدایوں میں ڈباٹی ببہرپلا۔ چندوسی روڈ پر بردوان ندی کا پل۔ اور ضلع دہرہ دون میں سونگ ندی کا پل۔ زیر تعمیر پلوں میں سے اہم پل یہ ہیں ——

دریائے راپتی پر برڈگھاٹ پل۔ گڑھ مکتیشور میں گنگا کا پل۔ ضلع اعظم گڑھ میں الہ آباد گورکھپور روڈ پر ٹونس ندی کا پل۔ بریلی متھرا روڈ پر رام گنگا کا پل اور متھرا۔ رایا روڈ پر جمنا کا پل

دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے پہلے چار سال کے اندر پختہ سڑکوں کی لمبائی بڑھ کر ۱۳۴۰۴ میل ہو گئی ہے اور یہ امید کی جاتی ہے کہ مالی سال رواں کے اختتام تک ان کی لمبائی ۱۴۰۰۰ میل تک پہنچ جائے گی۔

ریاست میں اس وقت ۲۹۱۴ روڈویز بسیں ۶۰۸ راستوں پر جن کی لمبائی ۳۵،۷۷ میل ہے، چل رہی ہیں۔ ان بسوں کے علاوہ ۱۶۲۵ ٹرک اور ۵۰ ٹیکسیاں بھی ہیں۔ زیر نظر سال میں حکومت کو روڈویز سے ۲ کروڑ روپیہ کا خالص منافع ہوا۔ الہ آباد کے اردھ کمبھ میلہ کے موقع پر لاکھوں زائرین کی سہولت کے پیش نظر اتر پردیش روڈویز کی جانب سے غیر معمولی انتظامات کئے گئے۔ سنہ ۱۹۵۹-۶۰ء کے پہلے چھ مہینوں میں بسوں کے چلانے کے خرچ میں ۸۰۸۹۰۰ روپیہ کی بچت ہوئی۔

حکومت خود اختیاری۔ ریاست میں کانپور۔ الہ آباد۔ وارانسی۔ آگرہ اور لکھنؤ کے شہروں میں کارپوریشنوں کے قیام کے بعد لوکل سیلف گورنمنٹ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ یو۔ پی کارپوریشن ایکٹ سنہ ۱۹۵۹ء کے تحت منتخب کارپوریٹروں کے ذریعہ پہلی بار ان شہروں کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

زیر نظر سال میں شہری علاقوں میں پانی کی سپلائی کی ۵ نئی اسکیمیں چلائی گئیں اور گذشتہ سالوں کی پانی کی سپلائی اور نکاسی کی ۱۷ اسکیموں پر کام جاری رہا۔ صنعتی مزدوروں کے لئے مکانات کی تعمیر کی اسکیم کے تحت نئے مکانات اور کوارٹروں کی تعمیر جاری رہی۔ اس سلسلہ میں کانپور میں ۴۴۰ اور گووندپوری (میرٹھ) میں ۱۳۲ مکانات کی تعمیر مکمل ہوئی۔

کم آمدنی والوں کے لئے مکانات تعمیر کرنے کی اسکیم کے تحت یو۔ پی کوآپریٹیو بینک اور لوکل باڈیز کے ذریعہ افراد کو ۱۸،۱۷ لاکھ روپیہ دیا گیا۔ اس مقصد کے لئے تعلیمی اداروں کو ۱۵۹۵۵۲ روپیہ کے قرضے اور کانپور۔ الہ آباد۔ اور علی گڑھ کے آنکھ کے اسپتالوں کو ۱۱۱۳۹۸ روپئے کے قرضے دیئے گئے۔ اس کے علاوہ سرکاری ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر کے لئے ۴۲۵۹۸۰۳ روپیہ منظور کیا گیا۔

گندی بستیوں کو صاف کرنے کی اسکیم کے تحت کانپور۔ الہ آباد۔ وارانسی، آگرہ اور لکھنؤ کی کارپوریشنوں کو ۳۰ لاکھ روپیہ بطور قرضہ اور ۳۳ لاکھ روپیہ بطور مالی امداد دیا گیا۔ زیر نظر مدت میں کانپور میں ۲۸ - الہ آباد میں ۱۲۰ - وارانسی میں ۲۴ - آگرہ میں ۵۱ اور لکھنؤ میں ۹۶ مکانات کی تعمیر مکمل ہو گئی۔

دیہی علاقوں میں تعمیر مکانات کی اسکیم کے تحت جو گذشتہ سال شروع کی گئی تھی منتخب مواضعات میں القرابی طور پر لوگوں کو ۲۲ لاکھ سے زائد روپیہ تقسیم کیا گیا۔ اس وقت یہ اسکیم ریاست کے ۷،۱۵ مواضعات میں چل رہی ہے۔

اتر پردیش کی پنچایتوں نے ترقیاتی پروگراموں خاص طور سے زراعتی پیداوار اور بقایا ٹیکسوں کی وصولیابی میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی۔ زیر نظر سال میں پنچایتوں نے پینے کے پانی کی فراہمی کے لئے ۱۰۲۴۳ کنوئیں تعمیر کئے اور ۱۰۳۴۵ دستی پمپ لگائے۔ اس کے علاوہ ۴۹۹ نئی نالیاں ۲۸۴ میل لمبی پختہ سڑکیں اور ۲۸۸۸ میل لمبی خام سڑکیں تعمیر کیں۔

پنچایتوں نے ۱۲۹۸۱۴ روپیہ بطور بقایا ٹیکس وصول کیا عدالتی پنچایتوں نے ۲۷۹۶۵ مقدمات فیصل کئے جن میں سے ۵۸۰۹ مقدموں میں مصالحت ہو گئی۔

توسیع تعلیم۔ ریاست میں ابتدائی۔ ثانوی۔ اعلیٰ اور فنی تعلیم کے میدان میں نمایاں ترقی ہوئی۔ معیار تعلیم بلند کرنے کے لئے بہت سی نئی اسکیمیں چلائی گئیں۔ پرائمری اسکولوں کی تعداد گذشتہ سال کے مقابلہ میں ۳۶۰۰۰ سے بڑھ کر ۳۸۰۰۰ ہو گئی۔ لڑکوں کے لئے ۴۲ اور لڑکیوں کے لئے ۶ نئے نارمل اسکول کھولے گئے جن سے دو سال میں ۴۸۰۰ تربیت یافتہ ٹیچر نکلیں گے اور اس طرح ریاست میں پرائمری اسکول کے ٹیچروں کی تعداد بڑھ کر ۸۴۰۰۰ ہو جائے گی۔ لڑکیوں کے لئے ۱۰ نئے جونیر ہائی اسکول کھولے گئے اور ۹۸۰ سینیر بیسک اسکولوں میں لائبریریاں قائم کی گئیں۔

حکومت نے اس سال تعلیم کے میدان میں سب سے اہم جو فیصلہ کیا وہ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن ترمیمی ایکٹ کا نفاذ تھا۔ اس ایکٹ کے ذریعہ امدادی اسکولوں کے ٹیچروں۔ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹروں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کے پرنسپلوں کی شرح تنخواہ پر نظر ثانی کی گئی۔ اور مدرسین کی ملازمت کا تحفظ کیا گیا۔ لڑکوں کے پانچ تعلیمی اداروں کو بسیں مہیا کی گئیں اور ۶۰ ہائر سکنڈری اسکولوں کو مالی امداد پانے والے اسکولوں کی فہرست میں شامل کیا گیا۔

ریاست میں ۱۹۴۶ میں صرف پانچ یونیورسٹیاں اور ۱۲ ڈگری کالج تھے جبکہ اس وقت ان کی تعداد بالترتیب ۸ اور ۱۰۲ تک پہنچ گئی ہے۔ اور میرٹھ اور کانپور میں یونیورسٹی قائم کرنے کی مانگ حکومت کے زیر غور ہے۔

اس کے علاوہ نجی ڈگری کالجوں کے ٹیچروں کی شرح تنخواہ پر بھی نظر ثانی کی گئی اور فوجی تربیت دینے کے لئے ایک نیا اسکول سروجنی نگر لکھنؤ میں کھلا گیا جس میں ۱۰ سال سے ۱۲ سال کی عمر کے بچوں کا داخلہ کیا جاتا ہے۔

طبی سہولتیں۔ ریاست کے دیہی اور شہری علاقوں میں حفظان صحت اور طبی سہولتوں میں مزید توسیع کی گئی۔ انسداد ملیریا پروگرام نے اتر پردیش بھر کا احاطہ کر لیا اور فائلیریا کی روک تھام کے اقدامات بھی تیز تر کر دئے گئے کوڑھ کی روک تھام کے لئے مزید دو مرکز بارہ بنکی اور اعظم گڑھ میں کھولے گئے۔

دیہی علاقوں میں ۳۰ اور شہری علاقوں میں ۵ خاندانی منصوبہ بندی کلینک قائم کئے گئے۔ محکمہ منصوبہ بندی کی جانب سے پہلے مرحلہ کے بلاکوں میں ۱۶۸ ابتدائی صحی واحدے کھولے گئے جس سے ریاست میں ان واحدوں کی تعداد بڑھ کر ۲۰۷۰ تک پہنچ گئی۔

فلاحی اقدامات۔ ریاست میں انسداد عصمت فروشی قانون چھ شہروں میں نافذ ہوا اور محکمہ نے عصمت فروشی کے اڈوں سے نکالی گئیں لڑکیوں کو بحالیاتی تربیت دینے کے لئے دہرہ دون میں ایک پناہ گاہ قائم کی۔ جسمانی طور پر معذور اشخاص جیسے اندھے، گونگے، بہرے افراد کے لئے لکھنؤ، گورکھپور، بریلی اور آگرہ کے چار ریاستی اسکولوں میں عام اور پیشہ ورانہ تعلیم مفت بہم پہنچائی گئی۔ علاوہ ازیں ریاستی حکومت نے ان نجی سماجی اداروں کو تقریباً ایک لاکھ روپیہ کی مالی امداد منظور کی جو اندھے بہرے اور گونگے بچوں کے اسکول چلا رہے ہیں اسی طرح عورتوں اور بچوں کے نجی اداروں کو تقریباً ۱۴ لاکھ روپیہ کی مالی امداد منظور کی گئی۔

پسماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود اور بے گھر اشخاص کی آبادکاری، فہرست مندرج اقوام، سابق جرائم پیشہ قبائل اور دوسرے پسماندہ طبقوں کی سماجی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے پر زیادہ زور دیا گیا۔ چنانچہ اس مقصد کے

پیش نظر حکومت کی جانب سے ۲۴ ترقیاتی اسکیمیں چلائی گئیں

ہریجنوں کی تعلیم پر ایک کروڑ روپیے زائد خرچ کیا گیا اور سات لاکھ سے زائد ہریجن طلبا ان سہولتوں سے مستفید ہوئے۔

سابق جرائم پیشہ قبائل کے بچوں کے لئے آشرم کے طرز کے دو اسکول گاکوری اور الہ آباد میں کھولے گئے اور ان افراد کو جو کلیان پور (کان پور) گورکھپور اور مرادآباد کی بستیوں میں آباد ہوگئے ہیں زراعتی زمین اور دوسری سہولتیں فراہم کی گئیں۔

ریاستی حکومت نے زیر نظر سال میں مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے ۳ بے گھر کنبوں کو آباد کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کی اس سے قبل ایک ہزار بے گھر کنبوں کو بسانے کی ذمہ داری حکومت لے چکی ہے۔

ان ۳ بے گھر کنبوں میں ۷، ۱ کنبوں کو بہرائچ، ہلدی بھیت، نینی تال، بجنور اور رامپور کے اضلاع میں ۸۰ لاکھ روپیے کے صرفہ سے آباد کیا جا چکا ہے۔

ضبط و نظم - نہی دفاعی انجمنوں نے جن کی تعداد ۸۷ ہے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ حکومت نے ایسی دفاعی انجمنوں کو آتشیں اسلحہ جات کے لائسنس فیاضی کے ساتھ جاری کئے۔

پولیس کے نظم و نسق کو بہتر بنانے اور جدید ضروریات پورا کرنے کے مد نظر متعدد اقدامات کئے گئے اس سلسلہ میں یو۔ پی پولیس کمیشن کی تقرری قابل ذکر ہے۔ تعزیری اصلاحات کے سلسلہ میں نئے تجربات کرنے کے لئے ستار گنج (نینی تال) میں قیدیوں کے لئے ایک زراعتی اور صنعتی کیمپ کھولا گیا۔

تصحیح

نیا دور جولائی سنہ ۶۰ء میں جناب جگت موہن کی غزل کے دو مصرعے غلط چھپ گئے ہیں جس کا ہمیں افسوس ہے

تیسرے شعر کے پہلے مصرعے میں کھو گئے کے بجائے "ہو گئے" شائع ہو گیا ہے صحیح مصرعہ یوں ہے "خرد کی بدولت کہاں کھو گئے ہم"۔ چوتھے شعر کے پہلے مصرعے میں ہم نہیں لکھا گیا۔ صحیح مصرعہ یہ ہے "تھے ہم راست دنیا نے کج کر دیا"

ایجنٹوں کی ضرورت

"نیا دور" کے لیے ہندوستان کے ہر شہر میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے

ایجنسی کی شرائط

دفتر رسالہ نیا دور محکمہ اطلاعات (اترپردیش) لکھنؤ سے معلوم کیجیے

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہرحال متفق ہو۔

چراغِ منزل

یہ ہاتھ ہیں، چہرے پہ ہیں جھریاں یا بڑھاپے کا ڈھلا ہوا حال ہے ۔
انہی جھریوں میں مگر عقل و دانش کے کچھ ایسے نکتے نہاں ہیں،
جو اس طفلِ کمسن کو محنت، محبت کے دستور سکھلائیں گے،
چراغوں کی مانند جو منزلوں کی اسے راہ دکھلائیں گے ۔
جواں ہو کے اپنے تجربوں سے سیکھے گا، ڈھونڈے گا خود اپنی راہیں،
پھر آئے گا وہ دن جب اس نوجواں کی جو مضبوط باہیں،
ہزاروں جواں بازوؤں کی رفیق و مددگار بن جائیں گی ۔۔
وہ بازو جو مصروفِ محنت ہیں اک عالمِ نو کی تعمیر کے واسطے
وہ اک عالمِ نو ذرا اور بھی دور ہوگا جو غم سے،
جہاں ہونگی خوشیاں ذرا اور بڑھ کر ہم سے ۔

آج بھی، پہلے کی طرح، ہماری مصنوعات آپ کے گھروں کو زیادہ صاف، زیادہ تندرست اور زیادہ مطمئن بنانے میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ لیکن آج ہم ۔۔۔
کل کیلئے کام کر رہے ہیں، جب زیادہ آرام دہ زندگی کیلئے آپکی بڑھتی ہوئی ضروریات، اور زیادہ سہولتوں کی طلبگار ہونگی۔ اور
۔۔۔ ہم زیادہ وسیع ذرائع، نئی ایجادوں اور نئی مصنوعات سے اُسوقت بھی آپ کی خدمت کیلئے تیار پائے جائینگے ۔

آج اور ہمیشہ ۔۔۔ ہندوستان لیور کا آدرش ہے گھر گھر کی خدمت ۔

PR. 4 X92UD
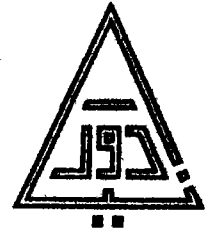
جلد ۱۵ نمبر ۷

آشون ۱۸۸۲
اکتوبر ۱۹۶۰ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ : ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر
ایم ۔ جی ۔ شوم

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات ۔ اترپردیش لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

ہندوستان کی خاک نے تو بہت سی عظیم المرتبت اور جلیل القدر ہستیاں پیدا کی ہیں لیکن گوتم بدھ کے زمانے سے اس وقت تک اس سرزمین نے مہاتما گاندھی سے زیادہ بلند پایہ اور ہمہ صفات ہستی کو جنم نہیں دیا۔ اس ملک میں اشوک اعظم بھی ہوا ہے اور اکبر اعظم بھی، مگر اشوک اور اکبر کے نام صرف تاریخ کی زینت ہیں اور مہاتما گاندھی کا نام اس وقت بھی دلوں پر منقش ہے اور آنے والی نسلوں کے دلوں پر بھی نقش رہے گا۔ گاندھی جی، پوربندر (کاٹھیاواڑ) میں ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کا پورا نام موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔ گاندھی جی کے باپ اور دادا کاٹھیاواڑ کی ایک چھوٹی سی ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ گاندھی جی نے ابتدائی تعلیم اپنے صوبے میں حاصل کی اور میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھیں لندن بھیج دیا گیا جہاں اُنھوں نے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ بیرسٹری پاس کرنے کے بعد وہ ہندوستان آئے لیکن ۱۸۹۳ء میں ایک مقدمے کے سلسلے میں جنوبی افریقہ گئے اور کچھ مختصر وقفوں کے علاوہ ۱۹۱۴ء تک جنوبی افریقہ ہی میں رہے۔ جنوبی افریقہ گاندھی جی کے سیاسی، اخلاقی، روحانی اور صحافتی تجربات کی سرزمین ثابت ہوا۔ وہاں کی حکومت نے وہاں کے رہنے والے ہندوستانیوں پر بہت سی ایسی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جو ہر خوددار شخص کے لیے انتہائی ذلت آمیز تھیں۔ بعض موقعوں پر گاندھی جی کو بھی ان ذلتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ آخر مہاتما گاندھی نے پہلی بار اپنی "مقاومت مجہول" کی تحریک شروع کی اور حکومت ٹرانسوال کے قوانین کے خلاف "ستیہ گرہ" کا آغاز کیا۔ گاندھی جی نے افریقہ ہی میں ایک "آشرم" کی بنیاد ڈالی اور مجرد زندگی بسر کرنے کا عہد بھی وہیں کیا۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے "انڈین اوپی نین" نامی ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔ گاندھی جی نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے جنوبی افریقی حکومت سے جنگ کرنے کا جو طریقہ وضع کیا تھا اس میں اُنھیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ ۱۹۱۵ء میں وہ مستقل طور سے ہندوستان آ گئے۔ جنوبی افریقہ میں اُنھوں نے جو کارنامہ دکھایا تھا اُس نے اُنھیں پہلے ہی ہندوستان گیر شہرت کا مالک بنا دیا تھا لیکن جب وہ ہندوستان آئے تو کچھ عرصے تک خاموشی سے حالات کا مطالعہ کرتے رہے۔ اُس وقت تک پہلی جنگ عظیم جاری تھی اور گاندھی جی کی ہمدردیاں برطانیہ کے ساتھ تھیں۔

لیکن برطانیہ کی وعدہ خلافیوں اور ہندوستان میں اُس کے رویے نے گاندھی جی کو حکومت ہند کی مخالفت پر کمر بستہ کر دیا۔ اسی زمانے میں رولٹ بل پیش ہوا اور جلیان والا باغ کا حادثۂ خونیں پیش آیا۔ گاندھی جی اس سے قبل چمپارن کے کسانوں کی ستیہ گرہ وغیرہ میں حصہ لے چکے تھے لیکن ہندوستان گیر سطح پر اُنھوں نے حکومت کے خلاف ابھی تک کوئی تحریک شروع نہ کی تھی۔ آخر اُنھوں نے ہندوستان کی سیاسیات میں پوری سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا اور اُن کے میدان میں آتے ہی ہندوستانی سیاسیات کا رُخ بدل گیا۔ اُن کی قیادت اور ہدایت میں سارے ملک میں عدم تعاون کی تحریک شروع ہو گئی اور ہزاروں آدمیوں نے ملک بھر میں اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ گاندھی جی کی ساری تحریک عدم تشدد پر مبنی تھی اسی لیے جب چوری چورا میں تشدد کا ایک واقعہ ہوا تو گاندھی جی نے تحریک بند کر دی۔ یہ وہ دور تھا جب ہندو مسلمان دوش بدوش تحریک آزادی میں حصہ لے رہے تھے لیکن تحریک بند ہونے کے بعد بدقسمتی سے ملک کے بعض گوشوں میں ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے جس سے مغموم ہو کر گاندھی جی نے مرن برت رکھ لیا اور اُسے اس وقت توڑا جب ہندو مسلم رہنماؤں نے صلح آشتی کا عہد و پیماں کیا۔ اُس وقت سے حصول آزادی تک گاندھی جی کی ہدایت میں انگریزی حکومت کے خلاف متعدد تحریکیں چلیں لیکن ان تمام تحریکوں میں گاندھی جی نے حق و صداقت اور عدم تشدد کو لازمی شرط قرار دیا تھا۔ گاندھی جی کو ان تمام تحریکوں میں مختلف میعاد کی سزائیں بھی دی گئیں مگر ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے پائی۔ اس دوران میں گاندھی جی نے پہلے ہفتہ وار "ینگ انڈیا" (انگریزی) اور "نوجیون" (ہندی) نکالنا شروع کیا پھر "ہریجن" کی اشاعت شروع کی۔ ۱۹۳۷ء کے انتخاب میں کانگریس کو ہندوستان کے اکثر صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی اور وائسرائے وقت سے گفت و شنید کے بعد کانگریس نے ان صوبوں میں وزارت کی تشکیل قبول کر لی۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں جب برطانیہ نے ہندوستان کی مرضی کے بغیر اُسے دوسری جنگ عظیم میں شامل کر دیا تو کانگریس نے بطور احتجاج وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی کی زیر ہدایت کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک منظور کی۔ گاندھی جی اور اُن کے رفقائے کار فوراً گرفتار کر لیے گئے مگر اس مرتبہ سارا ہندوستان ان کی گرفتاری سے ایسا مشتعل ہوا کہ پورے ملک میں "توڑ پھوڑ" شروع ہو گئی۔ آخر جنگ ختم ہوئی۔ گاندھی جی اور اُن کے ساتھی چھوڑ دیے گئے اور برطانوی حکومت نے ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں اُن سے اور دوسرے رہنماؤں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ اس گفت و شنید کا سلسلہ عرصے تک جاری رہا۔ بالآخر اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہو گیا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو اس سارے عرصے میں سیاسیات کے علاوہ کسی دوسرے شعبۂ زندگی کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ ملا ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی طاقتور ترین حکومت کے مقابلے میں عدم تشدد کی جنگ کی قیادت کرتے ہوئے بھی اُنھوں نے سماجی، تعلیمی، اقتصادی غرض ہر شعبے میں اپنا نظریہ پیش کیا اور جو کچھ کہا اس پر عمل بھی کر دکھایا۔ اس لحاظ سے گاندھی جی ہندوستان کی جنگ آزادی ہی کے رہنما نہ تھے بلکہ ایک زبردست سماجی مصلح، ایک بڑے ماہر تعلیم، ایک حقیقت بیں ماہر اقتصادیات، ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے علمبردار، عورتوں کے سب سے بڑے ہمدرد، مزدوروں کے انتہائی بہی خواہ، اچھوتوں کے سب سے بڑے محسن اور دیہاتیوں کے سب سے بڑے دوست بھی تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ دنیا کو اخلاقیات کا سبق دیا اور یہ بتایا کہ سیاسیات میں بھی صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ اُنھوں نے عدم تشدد کی جنگ میں کامیابی حاصل کر کے سارے عالم کو اہنسا کی عظمت کا احساس کرا دیا۔ اُنھوں نے پسے اور دبے ہوئے ہندوستانیوں کے دلوں میں ایک اخلاقی طاقت پیدا کر دی۔ اُنھوں نے ہندوستانی عورتوں کو مردوں کے ہم سر بنا دیا۔ اُنھوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر ہندوستانیوں کو ہندو مسلم اتحاد کا نہ فراموش ہونے والا سبق سکھا دیا۔ اُنھوں نے شہر والوں کی توجہ دیہات والوں کی طرف منعطف کرا کے دیہات کی زندگی میں ایک حیات تازہ پیدا کر دی۔ اُنھوں نے چھوت چھات کے خلاف تبلیغ کر کے ہندوستان کے رہنے والے ہر انسان کو ایک دوسرے کے برابر کھڑا کر دیا۔ اُنھوں نے گھریلو دھندوں کی اہمیت بتا کر لاکھوں آدمیوں کو روزگار سے لگا دیا۔ اُنھوں نے منشیات کے خلاف پرچار کر کے ہزاروں خاندانوں کو تباہی سے بچا لیا۔ غرض اُنھوں نے اپنے قول و عمل سے ہندوستان کے رہنے والوں ہی کو نہیں بلکہ ساری دنیا کو وہ سبق دیا جو خوف و شبہات کی اس فضا میں ہر قوم کے لیے مشعل ہدایت ثابت ہو سکتا ہے۔ ہندوستان اس جلیل القدر ہستی پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے!

[illegible]

مہاتما گاندھی کی عظمت

ملارام وفا

زمانہ کیوں نہ کرے احترام گاندھی کا
کہ احترام کے لائق ہے نام گاندھی کا

ملی ہے دیدۂ باطن کو روشنی اس سے
چراغِ راہ ہدا ہے کلام گاندھی کا

وہ بہرہ یاب سرورِ دوام ہوتا ہے
جو صدقِ دل سے پڑھتا ہو جام گاندھی کا

ریا سے پاک تھا اس کے شعار کا دامن
ریا کو دور ہی سے تھا سلام گاندھی کا

کہاں کسی کو یہ رفعت نصیب ہوتی ہے
کہاں ہے قسمتِ ہر کس مقام گاندھی کا

سرِ نیاز جھکا ہے وہیں عقیدت سے
جہاں زبان پہ آیا ہے نام گاندھی کا

ثباتِ عزم میں تھا جو خلوصِ نیت بھی
رہا نہ کام کوئی ناتمام گاندھی کا

ضمیرِ قوم تھا صدیوں سے وقفِ خوابِ گراں
اسے جگانا تھا بے شبہ کام گاندھی کا

ہوئی وطن کو اہنسا سے حاصل آزادی
یہ معجزہ تھا نیا لاکلام گاندھی کا

یہ زیرِ بحث سماجی نظام ہیں جتنے
ہے پائدار تر ان سے نظام گاندھی کا

جہاں میں خاتمہ جنگ وجدل کا ہو جائے
اگر بنائے عمل ہو پیام گاندھی کا

"نور اللغات" کے متروکات پر ایک نظر - ۲

آسر لکھنوی

سحر ہو جانا۔ صبح ہو جانا

آسر۔ کوئی وجہ نہیں بتائی گئی کہ سحر ہو جانا کیوں قابل ترک اور صبح ہو جانا مطبوع ہے حالانکہ سحر اور صبح دونوں عربی کے الفاظ ہیں یہی سلسلہ رہا تو عالباً آیندہ بھور ہو جانا سویرا ہو جانا تڑکا ہو جانا اور دیگر الفاظ کی نوبت آئے گی اور زبان کا کھورا ہو جائے گا۔

سدا۔ ہمیشہ۔ خواص نے اس کا استعمال ترک کر دیا ہے۔

آسر۔ خواص کی نہ کہیئے، وہ دن دور نہیں جب یہ سدا بہار کو ہمیشہ بہار سدا سہاگن کو ہمیشہ سہاگن۔ سدا رنگیلے کو ہمیشہ رنگیلے اور نہ معلوم کیا کیا بانک لگائیں گے۔ اور زبان کو باؤ ڈنڈا بنا دیں گے ایک بات قابل غور ہے کہ بیشتر چن چن کے ہندی الفاظ نکال باہر کئے جاتے اور ان کی جگہ فارسی و عربی الفاظ ٹھونسے جاتے ہیں۔ اپنی علمیت جتانے اور زبان کو ثقیل اور کھدابدا بنانے کے سوا اور تو کوئی لم سمجھ میں آتی نہیں۔ (میرے مخاطب فصحا ہیں)

سر۔ بالفتح کی جگہ سر بکسر فصحا کی زبانوں پر ہے۔

آسر۔ عام حکم لگا دیا گیا حالانکہ فصاحت اس کی مقتضی ہے کہ فارسی الفاظ کے ساتھ سر بالفتح اور ہندی الفاظ کے ساتھ بالکسر حسب موقع بولئے ورنہ لوگوں کو گمان ہوگا کہ آپ کا سر (بالکسر) پھر گیا ہے کہ سردار (بالفتح) کو سردار (بالکسر) بولتے ہیں۔

سر پرسے۔ سر سے داغ

ہمسری تجھ سے کرے گر آسماں صدقے کر ڈالیں ترے سر پر سے ہم

آسر۔ حضرت مؤلف کے مجوزہ طریقے سے پڑھیئے اور دیکھئے کہ داغ کا مصرع بامعنی بھی رہتا ہے یا مہمل ہو جاتا ہے۔ "ہم ترے سر سے صدقہ کر ڈالیں" فقرہ مہمل ہو گیا البتہ ایک صورت ہے کہ پر اور سے دونوں کو نکال کر "سر صدقے" کر ڈالیں تو لیں اور کہیں کہ "سر صدقہ" دیا (سر بالکسر) مگر ایسی صورت میں شاید کہا جائے کہ عورتوں کی بولی بول رہے ہیں کیونکہ "سر صدقہ دیا" ان کی زبان ہے الغرض وہی مثل ہے کہ گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل۔

سمیت۔ مع ساتھ۔

آہ سوزاں سے جلا دوں گا میں انبار سمیت

اب اکثر فصحا استعمال نہیں کرتے۔

آسر۔ معلوم ہوتا ہے کہ فصحا کا دماغ چل گیا ہے۔ ایک فقرہ ہے: "جلسے میں اپنے احباب سمیت آئیے گا" یعنی میں ان کو بھی آپ کی وساطت سے مدعو کر رہا ہوں" جلسے میں اپنے احباب کے ساتھ آئیے گا" یعنی ان سے علیحدہ نہ آئیگا موانست و یکجہتی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہی حال" جلسے میں مع احباب کے آئیے گا" کا ہے یعنی علیحدہ نہیں ان کی معیت میں۔ اس نازک فرق مفاہیم سے قطع نظر کسی لفظ کو متروک قرار دینے کے لئے معقول وجہ ہونا چاہیئے۔ سمیت کا استعمال ممنوع کیوں ہو۔

سندیا۔ پیغام داغ

سن کے وہ حال مرا فرماتے ہیں آئے ہیں آپ محبت کا سندیا لے کر

آسر۔ دیکھتے جایئے۔ چن چن کے ہندی الفاظ خارج کئے جاتے ہیں

ہیں اور زبان کی گھلاوٹ جس میں ہندی کو بہت کچھ دخل ہے ملیا میٹ کی جارہی ہے۔ آپ سندیا نہ بولیے اگر اسے زبان سے خارج کیوں کیجیے۔ داغ کے شعر میں لفظ سندیلے سے معشوق کی نسوانیت اور کردار پر روشنی پڑتی ہے "خالی ہاتھ کیا جاؤں ایک سندیا لیتا جاؤں" کیا پیغام سندیسے کا بدل ہو سکتا ہے اور نہ معلوم زبان کے کتنے لطائف کا خون ہو جائے گا۔

سو۔ ناسخ

مجھ پر جو کچھ ہوا سو مرے جی کے ہاتھ سے
ہے غیر کا قصور نہ تقصیر یار کی

بعض نے ترک کر دیا ہے۔ اس جگہ تو بولتے ہیں۔

"جو ہو سو ہو" مستثنیٰ ہے۔

آثر۔ سو خارج ہو نا کیا دوبارہ اپنا تسلط جما رہا ہے۔ جیسا کہیں عرض کر چکا۔

سلانا۔ سلوانا ناسخ

ایسا خفا ہوا مرے نالوں سے لے حنوں
ظالم نے جائے چاک گریباں سلائے ہونٹ

آثر۔ دونوں کو رہنے دیجیے "سلے سلائے کپڑے" کہیے گا یا سلے سلوائے "اس کرتے کی سلائی اچھی نہیں" "یا سلوائی اچھی نہیں"

سیو۔ سیب

آثر۔ عوام سیب کو سیو کہتے ہیں۔ یہ خواص کی زبان پہ کبھی تھی مگر اب ہے۔ عوام آپ کی ایک سماعت نہ کریں گے۔ آپ لاکھ جھینکیے پیٹیے۔

کروانا۔ اس جگہ کرانا فصیح ہے۔

آثر۔ یہ وہم ہی وہم ہے۔ دونوں فصیح ہیں اور دونوں مستعمل ہیں۔ اس نے بھائیوں میں لڑائی کروا دی یعنی جھگڑا کرانا خوب آتا ہے۔ کیا دونوں فصیح نہیں۔

کمتی۔ کم۔ شاد

کیا غم رونے کی کمتی شاہ مجھ ناشاد کو
خون دل پر آ رزد ہے جان پر ارماں سمیت

آثر۔ کم سے کمتی کا مفہوم ادا ہی نہیں ہوتا۔ کمی کہیے تو ایک بات بھی تھی۔ البتہ کمتی بجائے کمی زیادہ تر عورتیں بولتی ہیں۔

کھلانا۔ کھلوانا

آثر۔ دونوں رکھیے کہ بعض جگہ تو مطلب مختلف ہو جاتا ہے۔ مثلاً میں نے فقیر کو کھانا کھلایا (اپنے پیسے سے) میں نے فقیر کو کھانا کھلوایا (دوسرے شخص سے)

گر۔ اگر کا مخفف۔ فارسی شعرا کے کلام میں موجود ہے اردو نثر میں گر متروک ہے اور نظم میں اگر فصیح ہے۔ گرچہ کی جگہ اگرچہ فصیح ہے۔

آثر۔ یہ دیباچے کی عبارت ہے (صفحہ ۱۰) اس کے برخلاف اصل لغت کے صفحہ ۲ پر یہ اندراج ہے کہ الف کلمہ کی ابتدا میں زائد آتا ہے۔۔ گر سے اگر یعنی گر اصل لفظ ہے۔ لہذا بیان میں تضاد ہوا۔ میری تحقیق یہ ہے کہ گر اصل لفظ ہے، لہذا اگر اور گر دونوں کو رکھیے۔ یہ درست ہے کہ نثر میں اگر ہی اکثر و بیشتر بولتے ہیں۔ مگر نظم میں گر اور اگر دونوں بلا تامل استعمال ہوتے ہیں۔

مکھڑا۔ رخ

آثر۔ یہ بھی انکھڑیوں کی طرح بڑا پیارا لفظ ہے اور ہرگز قابل اخراج نہیں۔ منھ، چہرہ یا رخ بگڑ بھی جاتا ہے مگر اس کی رعنائی قائم رہتی ہے ورنہ مکھڑا نہیں رہتا۔

ناؤ۔ کشتی

آثر۔ ناؤ منجدھار میں ہے۔ کشتی منجدھار میں ہے سے فصاحت میں بڑھ کر نہیں تو کمتر بھی نہیں۔ دونوں رکھیے۔

نہ جانے۔ اس جگہ کیا جانے فصیح ہے۔

آثر۔ دونوں فصیح ہیں اور دونوں رکھیے۔ میرا ہی شعر ہے۔

نہ جانے چوٹ یہ کیسی آثر نے کھائی ہے
کہ پھر نہ ہاتھ کبھی قلب زار سے اٹھا

سہرے

خطا معاف ملامت ہے بات ہونے کی
ہر ایک بات کا جب ہے جواب "کیا جانے"

اگر قابل ترک ہے تو "جانے" ہے۔ ہر چند یہ بھی بڑا مزا دے جاتا ہے جب کلام صنف نازک سے منسوب ہو۔ مثلاً

میں تصدق ترے پھر پوچھ کہ دل
جانے کس طور چلا جاتا ہے

کبھی کیا جاہیئے بجائے کیا جانے کہتے ہیں۔ مثلاً

کیا جاہیئے کس نے اسے یہ بات سکھا دی
جب تم کو پکارا ہے مرے دل نے صدا دی

نگر۔ بستی۔ آبادی ۔

آثر۔ نگر ہرگز قابل ترک نہیں۔ دل کا نگر اجڑ کے پھر نہیں بستا۔ نگر کی جگہ بستی یا آبادی پڑھ کر دیکھئے اسکے بعد فیصلہ کیجئے۔

موڑانا۔ جھکانا

آثر۔ یہ موڑنا رائے تیغ سے کالے رائے نکلے کے ہے۔ اسکے ترک کا خیال بھی نہ کیجئے۔ اس میں جو ادا نکلتی ہے جھکانے میں کہاں۔ اس نے گردن جھکا دی۔ اس نے گردن موڑ دی۔ ایک سے رضامندی کا اظہار ہوتا ہے دوسرے سے شرم و حیا کا ایک سوالی پیکر رعنائی آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ گردن جھکا دی اس جنا عانہ دلبری سے مطلقاً ناآشنا ہے۔

نیارا۔ جدا۔ الگ

آثر۔ یہ بھی قابل ترک نہیں اس کا جو کام ہے نیارا ہے۔ کیا جدا یا الگ سے یہ مطلب ادا ہوتا ہے؟

وصلت۔ اس کی جگہ وصل مستعمل ہے۔

آثر۔ وصال اصالت کے ساتھ روا رہے وصل بسلاً و عدد وصلت دونوں رکھیے۔

ہاں۔ ناسخ نے معنی گھر کہا ہے ؎

اسکے ہاں آفتاب عارض سے دل ہی آنکھوں سے شب رات نہیں

آثر۔ یہ محض قیاس آرائی ہے۔ ہاں یہاں استعمال ہوا ہے نہ کہ معنی گھر۔

اس کے علاوہ نوراللغات میں جن متروکات کا تذکرہ ہے مجھے ان سے اتفاق ہے اور ان کی ایک معقول تعداد ہے۔

یہاں سے دوسری بحث شروع ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ فصحائے حال نے مندرجہ ذیل اصول قرار دیئے ہیں۔ (میں نے صرف وہی نقل کئے ہیں جن کے متعلق حضرت مؤلف سے اختلاف ہے اور وہی نمبر قائم رکھے ہیں)

۴۔ صحت لفظی کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً اپنے قدسے کی

خیر خواہی نا۔ اپنی بہتری چاہنا۔ اپنا نفع چاہنا۔ صحیح فتح بفتح اوّل و دوم ہے لیکن اس جملے میں زبانوں پر فتحہ ہی ہے۔

آثر۔ بحث اور مثال صحت لفظی کی گر لفظ وہ انتخاب کیا گیا جس میں اعراب و تلفظ سب کچھ بدل گئے ہیں۔ عائے حطی بطرز ہائے ہوز مخلوط استعمال ہوتی ہے۔ باضافہ یائے مجہول۔

۹۔ بھیجئے۔ دیکئے۔ لیجئے۔ کیجئے وغیرہ کی ایک ہی گرانا اور موزون معلن استعمال کرنا غیر فصیح ہے۔

آثر۔ متیر شعرا اس اصول کے پابند نہیں۔ یہ ذاتی پسند یا ناپسند کا معاملہ ہے اور اس کو عام اصول قرار نہیں دیا جا سکتا بعض شاعر عدم عطف و اضافت کی حالت میں آسمان اور دیگر ماثل الفاظ کے نون آخر کلمہ کا اعلان ضروری سمجھتے ہیں بعض اس کی پروا نہیں کرتے۔ آپ سب کو ایک ہی ڈھرے پر کیوں لگا سکتے ہیں۔

۱۲۔ علامت جمع کی ہا اسکے استعمال سے فصحا احتراز کرتے ہیں مثلاً داغہائے عشق روشن ہو گئے کی جگہ میرے داغ عشق روشن ہو گئے، کہیں گے۔

آثر۔ اس سے قطع نظر کہ سب کے اضافے کا کیا جواز ہے اگر اس قاعدے کو تسلیم کر لیا جائے تو "ہا" کے تیر میں جلوہائے نو بنو، پرو بالہائے رنگ و بو، ادا ہائے دلبری اور نہ معلوم کتنے لطیف و خوش آئند فقروں کو خیر باد کہنا ہوگا

۱۳۔ آخر کلمہ کی یائے معروف کو مشدد استعمال کرنا غیر فصیح ہے۔ جیسے (داغ) کہوں کیا حال تباہی دل کا۔

اثر۔ اس طرح ایرانی شاعری بھی دائرہ فصاحت سے خارج ہو جائیگی۔

۱۴۔ جان، جوان، دین وغیرہ وہ الفاظ فارسی جو اردو میں باعلان نون بولے جاتے ہیں جب ان کی ترکیب فارسی میں رہتی بعض شاعر باعلان نون ہی استعمال کرتے ہیں۔ اکثر متاخرین نے اس پر عمل نہیں کیا۔ امیر ؎

کھولے ہوئے جوڑا تجھے اے جان نہیں دیکھا
اس باغ میں سنبل کو پریشان نہیں دیکھا

اثر۔ میں ان متاخرین کی دور اندیشی پر صاد کرتا ہوں۔

۱۶۔ سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں کے ساتھ اسم واحد لانا جائز ہے ناسخ ؎
تھی امید رہائی کی دل ناسخ کو لاکھ زنجیر ترے گیسوئے خمدار کی تھی

تسلیم ؎
ہمارے مژگاں کے عشق سے دل میں سیکڑوں داغ لاکھوں روزن تھا

لیکن جمع لانا زیادہ صحیح ہے۔

آتش۔ میں اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس قاعدے کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب مضاف الیہ مرکب تعدادی ہو اور ان میں سے ہر ایک مضاف الیہ کی طرف ایک ہی طرح ایک ہی شے کو مضاف کیا جائے۔ ایسی صورت میں مضاف اکثر واحد بولا جاتا ہے اور یہ صورت جائز ہی نہیں بلکہ فصیح بھی جانی ہے اور معنویت میں اضافہ کرتی ہے۔ واحد کے استعمال سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ہر فرد لا استثناء۔ جمع کی صورت میں یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ ناسخ کے شعر میں لاکھ زنجیر سے یہ مراد ہے کہ لاکھ زنجیریں تھیں اور ان میں کی ہر ایک لا استثنا دل سے لپٹی ہوئی تھی۔ اگر زنجیر بصیغۂ جمع ہوتا تو یہ استفادہ نہ ہوتا۔ یہی بات تسلیم کے شعر میں ہے۔ دل میں سیکڑوں داغ اور لاکھوں روزن تھے اور ان میں کا ہر ایک لا استثنا عشق حال مژگاں کا عطیہ تھا۔ آتش کا یہ شعر لیجئے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

ہزار ہا شجر ہیں ان میں کا ہر ایک لا استثنا سایہ دار و مسافر نواز ہے۔

۲۔ مؤنث کے لئے علامت مصدری میں تبدیلی کرنا یعنی کرنا، ہونا وغیرہ کی جگہ کرنی، ہونی وغیرہ جائز ہے۔ ناسخ

اگر دہلیز چھونے کی تجھے تقریر دینی ہے
ہمارے ہاتھ بندھوا اپنے دروازے کے بازو سے

آتش۔ یہ حضرت جلال لکھنوی کے اختراع کی پیروی ہے میں اپنے ایک دوسرے مضمون کی متعلقہ عبارت نقل کئے دیتا ہوں۔

حضرت جلال لکھنوی کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب علامت مصدری میں تغیر ہوگا تو اس کی کوئی شناخت نہ رہے گی، حالانکہ کلام متقدمین میں جہاں علامت مصدری (ی) آئی تو اُتار کے گر (نا) کی تانیث ہے۔ مصادر کی صرف یا گردان میں علامت مصدری ہمیشہ مخفی رہتی ہے مثلاً وہ رویا، وہ روئی، وہ گیا، وہ گئی، یہ سمجھنے میں مطلق تکلف نہیں ہوتا کہ یہ مصادر رونا، جانا کے مشتقات ہیں مگر (نا) سے علامت مصدری (ی) گوگو رہتی ہے۔ استدلال کم سے کم میرے فہم سے خارج ہے۔

حضرت جلال کا یہ دعوٰی حقیقت سے بعید ہے کہ متاخرین فصحائے لکھنؤ مصدر کی شکل نہیں بدلتے۔ ان کے ہمعصر امیر مینائی جہاں کہتے ہیں کہ ؎

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہیں ایک کمسن کے لئے

وہیں یہ بھی فرماتے ہیں ؎

بڑھا اس قدر ہجر میں دردِ دل
مجھے سانس لینی بھی مشکل ہوئی

ولہ ؎

جانی ہے کون سے محل کی لط
ملنیں پھرتی ہیں کیوں تیکے دئے

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے، مصدر کے بعد جو فعل آئے اس میں تغیر کیجئے گا یا فعل بحالہ رہنے دیجئے گا۔ مثلاً امیر مینائی کے مصرع میں اگر سانس لینا پڑھیئے گا تو اس کے بعد مشکل ہوا کہیئے گا یا مشکل ہوئی۔ دونوں صورتوں میں کیوں اور کس قاعدے کے ماتحت ایسی حکایت یا کیوں اختیار کیجئے کہ سہولت کے بدلے پیچیدگیاں بڑھیں۔ ذوقِ سماعت پر فیصلہ چھوڑ دیجئے۔

۲۴۔ مصادر سمجھنا اور لانا کے فاعل کے ساتھ لفظ (نے) کا نہ لانا فصیح ہے۔ یہ الفاظ تانیث و تذکیر، وحدت و جمع میں مفعول کے تابع نہیں ہوتے بلکہ فاعل کے تابع ہوتے ہیں مثلاً میں یہ رسالہ لایا۔ میں سمجھا (مذکر کے لئے) وہ کتاب لائی۔ وہ سمجھی (مونث کے لئے)

آتش۔ یہ قاعدہ مصادر متعدی سے متعلق ہے اس میں دس نہیں بلکہ دس مستثنیات ہیں:-

(۱) بولنا۔ ۲۔ بھولنا ۳۔ لانا۔ ۴۔ ہارنا۔ ۵۔ جیتنا ۶۔ سمجھنا ۷۔ پکارنا ۸۔ پڑھنا ۹۔ سیکھنا ۱۰۔ سوچنا۔

نمبر ۱، ۲، ۳ میں اہل دہلی و لکھنؤ کا اتفاق ہے۔ باقی سات کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکثر اہل لکھنؤ ان کے ساتھ "نے" کا استعمال خلاف فصاحت سمجھتے ہیں اور اہل دہلی کے کلام میں اس کا استعمال پایا جاتا ہے۔ الا ماشا اللہ۔ (منقول از قاموس الاغلاط)

باقی اندراجات دیباچۂ نوراللغات کے متعلق مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔

فراق

چشمِ سیہ سے گھٹا جو اُٹھی ہے
مے خانے پر جھوم پڑی ہے

ہوتے ہوتے صبح ہوئی ہے
کٹتے کٹتے رات کٹی ہے

نغمہ ہے مے ہے مستی ہے
ساقی پھر بھی کوئی کمی ہے

دنیا میں نفسی نفسی ہے
سب کو اپنی اپنی پڑی ہے

دے دے ہم اہلِ دل کو دوعالم
یہ تو ہماری کم طلبی ہے

دیس کو دیکھا دیس ہمارا
کتنا بڑا ہے کتنا دُکھی ہے

لٹ چھٹکائے، بال سنوارے
یاد تری دل سے گزری ہے

کہتی ہے جو تری خاموشی
اے لبِ جاناں بات وہی ہے

لاکھ عذابِ جہاں ہیں یارو
ایک عذابِ محبت بھی ہے

مجھ کو کفن سرکا کے دیکھو
غم کی رات بھی کٹ جاتی ہے

پچھلا پہر ہے مے خانے میں
نرگسِ میگوں جاگ رہی ہے

کیا کہنا زلفوں کی درازی
سچ ہے بڑوں کی بات بڑی ہے

اِک ساغر اے چشمِ خماریں
مے خانے میں صبح ہوئی ہے

یارو، وہ کیا نعمت ہے کہ جس سے
دُنیا کی دُنیا خالی ہے

میری حیات اور غزلوں پر
موت نے بھی انگڑائی لی ہے

اے غمِ جاناں، اے غمِ جاناں
کیا تو ہی غمِ دوراں بھی ہے

وقتِ سخن اُس کے لبِ نازک
جیسے کوئی کلی کھلتی ہے

وقت نہ کٹنے والے دیس میں
صبح بھی کی ہر شام بھی کی ہے

جس کو بانکپن کہیے، تیری
اک ادائے کج کلہی ہے

شاید اُس نے پلک جھپکائی
دل پر پرچھائیں سی پڑی ہے

کاش یہ دُنیا دُنیا ہوتی
دُنیا میں دُنیا کی کمی ہے

صدمۂ ہجر نہ دے پچھلی شب
یار رات ہی اب کتنی ہے

سُن کے فراق کہانی تیری
فطرت کی آنکھوں میں نمی ہے

غزل

گورکھپوری

پیمانے کی رگت جو دُکھی ہے
شیشے کو بھی چوٹ لگی ہے

چشمِ سیہ میں جو سمٹی ہوئی ہے
مے خانے کی رات وہی ہے

بزمِ ادب گو بھری ہوئی ہے
پھر بھی میری جگہ خالی ہے

جس سے دُنیا حالُت سی ہے
یارو وہ بھی دُنیا ہی ہے

ہر غم کٹ جاتا ہے لیکن
بات یہ ہے تیرا غم بھی ہے

اے دلِ غمگیں، اے دل غمگیں
دیکھ کہیں دُنیا میں خوشی ہے

کہتے چلو افسانۂ ہجراں
یارو رات کی رات پڑی ہے

کون بتا سکتا ہے "یہ دھرتی
کس محور پر گھوم رہی ہے

عشق اُٹھا دُنیا سے شبِ غم
جیسے کوئی شمع بجھی ہے

درد بھرے اشعار سُنا کر
دیکھیں کوئی رُوتا بھی ہے

اب تو آجا، اب تو آجا
ہوتے ہوتے رات ہوئی ہے

دادِ سخن اس کو کہتے ہیں
اس کی نظر بھی بول اُٹھی ہے

کوئی سخن ہو ایک ہی مطلب
کوئی بات ہو بات وہی ہے

خاک میسر ہے اس در کی
میری جبیں قسمت کی دھنی ہے

برق نظر میرے تن من میں
آگ لگا کر دُور کھڑی ہے

درد سے ہر پیکر ہے عبارت
جو رگ ہے کچھ دُکھتی ہوئی ہے

عشق کی بستی میں کیا سُوجھے
یہ نگری اندھی نگری ہے

تیری صدائے قُم کے صدقے
نبضِ عالم ڈوب رہی ہے

ترکِ محبت پر بھی دل میں
درد اُٹھا ہے ٹیس اُٹھی ہے

اہلِ کارواں چال نہ چوکیں
رین اندھیری راہ کڑی ہے

زلف میں ہے جو آنکھ میں ہے جو
رات وہی ہے بات وہی ہے

عشق ابھی اک راز ہے، لیکن
دُنیا آنکھیں مار رہی ہے

تم بھی فراق اب آنکھیں کھولو
رہتی دُنیا جاگ رہی ہے

گاندھی جی کا تعلیمی نظریہ

عشرت علی صدیقی

گاندھی جی کا مقصد زندگی محض ہندستان کو آزاد کرانا نہیں تھا۔ ان کے نزدیک آزادی ایک مقصد نہیں بلکہ ایک ذریعہ تھی ملک کو اور اس کے باشندوں کو ترقی اور خوشحالی، خودداری اور خودشناسی کی راہ پر لگانے کا۔ وہ انسان کو آزاد کرانے سے زیادہ انسان کو انسان بنانے کے لئے کوشاں تھے۔ اور اسی لئے اپنی پبلک زندگی کے آغاز ہی سے تعلیم کے مسئلے سے دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی یہ دلچسپی نظریاتی نہیں بلکہ عملی تھی اور اگرچہ انھوں نے تعلیم کے فن اور فلسفے کا کبھی کوئی باضابطہ مطالعہ نہیں کیا مگر جب تعلیم کے متعلق ان کے خیالات واردھا اسکیم اور بنیادی تعلیم کے منصوبے کی شکل میں دنیا کے سامنے آئے تو ان خیالات اور دنیا کے بہت سے ماہرین تعلیم کے خیالات میں ایک حیرت انگیز مماثلت پائی گئی۔ جس منزل تک دوسرے لوگ کتابیں پڑھ کر پہنچے تھے وہاں تک گاندھی جی اپنی ذہانت اور اپنے تجربوں کی بدولت پہنچ گئے۔ اور اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ انھوں نے ہر مسئلے کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھا اور انسانی فطرت کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا۔

وہ دوسروں سے زیادہ اپنے اوپر ناقدانہ نگاہ ڈالتے تھے اور اسی لئے جب وہ جنوبی افریقہ گئے جہاں ان کی پبلک زندگی کی ابتدا ہوئی تو اپنے ذاتی تجربوں کی بنا پر ان کے ذہن میں یہ احساس موجود تھا کہ ہندستان میں بدیسی حکومت کا رائج کیا ہوا نظام تعلیم صد درجہ ناقص ہے۔ ان کو غیر زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی دشواریاں معلوم تھیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کتابی تعلیم انسان کی عملی زندگی میں اسے زیادہ فائدہ نہیں پہنچاتی اور تعلیم کے اعلیٰ یا اونچے متوسط طبقے تک محدود ہونے کی وجہ سے سماج میں ایک نئی تفریق بڑھتی جا رہی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے جسمانی محنت سے نہ صرف یہ کہ گریز کرتے تھے بلکہ اس سے گھن بھی کرتے تھے۔ گاندھی جی کا ضمیر جس پر رسکن اور ٹالسٹائے کی تصنیفوں کے مطالعے سے جلا ہو گئی تھی اور جو آفاقی محبت اور محنت کی عظمت کی ضرورت کو محسوس کرنے لگا تھا اس صورت حال کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ جنوبی افریقہ میں گوروں اور کالوں کی نسلی تفریق مٹانے کی جدوجہد کو ٹھیک سے چلانے کے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ کالوں کے آپس میں کسی قسم کی تفریق نہ رہے اور ہر قسم کی جسمانی محنت گاندھی جی کے نظریہ حیات کا ایک لازمی جزو بن گئی۔ یہ گویا کام کے ذریعہ تعلیم کے نظریے کی (جو بنیادی تعلیم کا ایک بنیادی اصول ہے) ابتدا تھی۔

پہلا تجربہ

اپنے تمام دوسرے نظریوں کی طرح اس نظریے کا تجربہ بھی گاندھی جی نے اپنے گھر سے شروع کیا۔ ڈربن میں انھوں نے اپنی زندگی بہت سادہ بنالی اور جوہانسبرگ میں تو وہ سالک ہوتے ہوئے بھی سنیاسی بن گئے۔ اپنے انگریز ساتھی مسٹر ہنری پولک اور اپنے بچوں کے ساتھ وہ آٹا پیستے اور گھر اور پاخانے تک کی صفائی کرتے۔ اس دور میں وہ اپنے بچوں کی کتابی یا نصابی تعلیم پر مناسب دھیان نہیں دے سکے اور اپنی خودنوشت سوانح عمری میں انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی انھیں یہ اطمینان بھی تھا کہ بچوں کے کردار کی تعمیر کی طرف سے انھوں نے کوئی بے پروائی نہیں برتی۔

کردار کی تعمیر پر انھوں نے فینکس فارم میں کسی قدر زیادہ توجہ دی۔ یہ فارم جنوبی افریقہ میں اس لئے بنایا گیا تھا کہ وہاں سے انڈین اوپی نین اخبار نکالا جا سکے، اخبار میں کام کرنے والے فارم پر بھی کام کریں اور سب کو گزر بسر بھر کی اجرت دی جائے۔ اس بستی میں کوئی تیس بچے تھے۔ اور ان کا نظام الاوقات کچھ اس طرح کا تھا۔ اسکول میں پڑھائی ۳ گھنٹے، کھیت پر کام ۲ گھنٹے اور چھاپہ خانہ میں کام ۲ گھنٹے۔ اگر وقت مل جاتا تو بچے رات میں بھی کچھ پڑھ لیتے اور کھیت میں کام کے دوران اکثر گاندھی جی ان سے اہم مسئلوں، بڑے انسانوں، یا اسی طرح کے کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرتے۔ تعلیم کے میدان میں یہ گاندھی جی کا پہلا قابل ذکر تجربہ تھا۔

پیشہ ورانہ تربیت

فینکس فارم پر انھیں اجتماعی زندگی اور آشرم کی ضرورت محسوس ہوئی اور ٹرانسوال کا ٹالسٹائے فارم تعلیمی مسئلوں اور نظریوں کی ایک خاصی بڑی لیباریٹری بن گیا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ "معیاری حالات میں سچی تعلیم صرف والدین دے سکتے ہیں" اور چونکہ وہ ٹالسٹائے فارم کی بستی میں سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے بچوں کی تعلیم انھوں نے اپنے ذمہ لے لی۔ اس تعلیم میں انھوں نے دل کی تربیت یا کردار کی تعمیر کو اولیت دی۔ کتابوں کی تعلیم پر زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے اور جسمانی یا پیشہ ورانہ تربیت پر کوئی آٹھ گھنٹے یومیہ صرف کئے جاتے تھے۔ اس تربیت کا مقصد گاندھی جی کے نزدیک "لڑکوں اور لڑکیوں کی ہمہ گیر ترقی" تھا اور اس پر ان کی توجہ کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے جرمن ساتھی مسٹر کالن باخ کو موچی کا کام سیکھنے کے لئے ایک کیتھولک خانقاہ میں بھیجا اور ان سے یہ کام خود سیکھ کر بچوں کو سکھایا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو کھیت باغ اور گھر میں بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح ان کی ورزش ہو جاتی تھی اور وہ محنت سے عظمت کا اصول سیکھ لیتے تھے لیکن اس وقت تک پیشے یا کام کو تعلیم کی بنیاد نہیں بنایا گیا تھا جیسا کہ بعد میں بنیادی تعلیم کی اسکیم میں ہوا۔

اس اسکیم کی بنیاد ایک طرح سے ٹالسٹائے فارم ہی میں رکھی گئی تھی اور وہاں کے بعض دوسرے تجربے جن کا ذکر گاندھی جی نے کیا ہے یہ تھے :- بچے کتاب سے پڑھی ہوئی بات اتنی اچھی طرح یاد نہیں رکھ پاتے جتنی اچھی طرح استاد کے منہ سے سنی ہوئی بات اور استاد سے سبق سن کر وہ اس سے جو سوالات کرتے ہیں ان سے بچوں کی ذہانت اور لیاقت کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ دماغی اور جسمانی ورزش کی طرح اخلاقی اور روحانی ورزش بھی ضروری ہے اور اس کا انحصار استاد کی زندگی اور کردار پر ہے جو مثالی نوعیت کا ہونا چاہیئے۔ اگر اچھے اور برے بچوں کو ایک ساتھ پڑھایا جائے اور ایک ساتھ رہنے دیا جائے (بشرطیکہ ان پر والدین یا سرپرستی کی نگرانی قائم رہے) تو اچھے بچے خراب نہیں ہوں گے۔ اور بچوں کو الگ تھلگ رکھنے سے ان کو برائی سے الگ نہیں رکھا جا سکتا۔

سابرمتی آشرم

جنوبی افریقہ کے ان تجربوں کو گاندھی جی نے ہندستان میں اپنے سابرمتی آشرم میں بھی رائج کیا۔ یہاں ان کے بعض ساتھیوں نے ان کی کچھ باتوں سے اختلاف کیا لیکن دو باتوں پر سب متفق تھے۔ ایک یہ کہ تعلیم بڑی حد تک خود کفیل ہو یعنی تعلیمی ادارے اپنا خرچ خود نکال لیں۔ اور دوسرے یہ کہ دیہی زندگی اور قومی تہذیب سے تعلیم کا قریبی تعلق قائم کیا جائے۔ اس زمانے میں جو تعلیمی نظام رائج تھا اس میں گاندھی جی کے نزدیک، جیسا کہ انھوں نے یکم ستمبر ۱۹۲۱ء کے 'ینگ انڈیا' میں لکھا تین خاص خرابیاں تھیں۔ ایک یہ کہ اس نظام کی بنیاد بیرونی تمدن پر تھی اور قومی تمدن کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز کر دیا گیا تھا بلکہ طلبا کو اس سے متنفر کیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس میں صرف دماغ کی تربیت پر توجہ دی جاتی تھی اور دل اور ہاتھ پاؤں کی تربیت کی کوئی فکر نہیں کی جاتی تھی جس کی وجہ سے طلبا میں وسیع النظری نہیں پیدا ہوتی تھی اور وہ جسمانی محنت اور اپنے خاندانی پیشوں سے بھاگنے لگتے تھے۔ اور تیسرے یہ کہ ذریعہ تعلیم ایک غیر ملکی زبان تھی اور اس طرح طلباء کی صلاحیتیں پوری طرح اجاگر نہیں ہونے پاتی تھیں۔ اس مضمون میں گاندھی جی نے تعلیم کی گرانی اور ہندوستان کی غریبی کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکالا تھا کہ تعلیم کا سب یا تھوڑا خرچ طلبا کی اپنی محنت سے نکلنا چاہیئے۔

سابرمتی آشرم کے قیام کے چند ہی سال بعد ملک میں سیاسی تحریک زور پکڑ گئی اور دوسری باتیں قدرتی طور پر پس پشت جا پڑیں۔ لیکن تعلیم کے مسئلے پر گاندھی جی توجہ دیتے رہے اور ۱۹۳۲ء میں جب وہ یرودہ جیل میں قید تھے تو انھوں نے مندرجہ بالا اصولوں، ملک کے حالات اور بچوں کی نفسیات پر مبنی نظام تعلیم کا ایک خاکہ مرتب کر لیا۔

واردھا اسکیم

اس خاکے کی انھوں نے پانچ سال بعد واردھا کی کل ہند قومی تعلیمی کانفرنس میں وضاحت کی اور ان کی رہنمائی میں کانفرنس نے قومی تعلیم کے چند بڑے اصول طے کر دیئے۔

۱۔ پورے ملک میں ۷ سال سے ۱۴ سال تک کے سب بچوں کے لئے مفت اور لازمی تعلیم رائج کی جائے۔

۲۔ ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو۔

۳۔ جسمانی محنت اور پیداواری کام کو تعلیم کا مرکزی نقطہ رکھا جائے اور بچے کے حالات کی مناسبت سے جہاں تک ہو سکے اسی کام کی بنیاد پر اس کی دوسری صلاحیتوں کو ابھارا جائے۔

۴۔ تعلیمی اداروں میں ہونے والے کاموں سے بتدریج استادوں کی تنخواہ نکل آئے۔

کانفرنس کی مقرر کی ہوئی ایک کمیٹی نے جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے انہی اصولوں کی بنیاد پر ایک تعلیمی اسکیم مرتب کر دی جسے کانفرنس کی جگہ کی مناسبت سے واردھا اسکیم اور اس کے فیصلے کے مرکزی خیال کی مناسبت سے بنیادی تعلیم کی اسکیم کہا جاتا ہے۔

نظریے کی ندرت

گاندھی جی کے بہت دوسرے کاموں کی طرح ان کے تجویز کردہ تعلیمی نظام میں بھی سادگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ ندرت اور آفاقیت کی جھلک ملتی ہے۔ اور جس طرح بعض لوگوں نے ان کے ستیہ گرہ کے طریقے، قانون شکنی کے لئے نمک بنانے کی تدبیر، ڈانڈی مارچ، کھادی اور چرخے کی ترویج، چھوت چھات کے خلاف تحریک اور ہندستان چھوڑ دو کے نعرے پر نکتہ چینی کی اس طرح ان کے تعلیمی نظریے کی بھی مخالفت کی گئی ہے۔ لیکن جس طرح ان کی تجویز کی ہوئی دوسری تدبیروں کا کوئی کارگر اور قابل عمل بدل نہیں پیش کیا جا سکا اسی طرح کوئی متبادل تعلیمی نظام بھی نہیں مرتب کیا جا سکا۔

جس زمانے میں واردھا اسکیم مرتب کی گئی تھی اس زمانے میں تعلیم کا اوسط بہت کم تھا۔ اور حکومت کی طرف سے صاف لفظوں میں کہہ دیا گیا تھا کہ مروجہ نظام کے تحت مفت تعلیم کا عام کرنا ناممکن ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تعلیم تھوڑے سے آدمیوں کی اجارہ داری بنی رہتی یہی لوگ قومی زندگی کے ہر شعبے پر چھائے رہتے اور سماج کی اونچ نیچ ایک دائمی چیز بن جاتی یا تیں قومی مفاد کے منافی تھیں اور تعلیم کو خود کفیل بنانے کے متعلق گاندھی جی کا نظریہ اسی حقیقت کے احساس پر مبنی تھا۔

بدیسی حکومت ترکے میں جو تنگ نظری چھوڑ گئی ہے وہ اس کی سیاسی ترکیبوں کی پیداوار ہے اور ان ترکیبوں کو کامیاب بنانے کے لئے اس نے اپنے مطلب کا تعلیمی نظام رائج کیا تھا۔ دل کی تربیت پر گاندھی جی کا زور انہی ترکیبوں کے توڑنا اور ہندستانیوں کی پرانی رواداری کی بحالی کا ایک ذریعہ تھا۔ ایسی تربیت کے نتائج گاندھی جی فینکس بستی، ٹالسٹائی فارم اور سابرمتی آشرم میں دیکھ چکے تھے اور ایسے ہی حالات وہ پورے ملک میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔

جسمانی محنت کی افادیت بھی ایک آزمائی ہوئی چیز تھی۔ سابقہ تجربوں سے ثابت ہو چکا تھا کہ اس طرح لوگوں میں بھائی چارہ کا احساس بڑھتا ہے اور تعاون کا جذبہ ترقی کرتا ہے۔ اس زمانے کے نظام تعلیم میں اس بات پر توجہ نہ دیے جانے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ان گنت ذاتوں میں ایک نئی ذات کا اضافہ ہو گیا تھا اور پڑھے لکھے لوگ دوسروں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے بلکہ ایک طرح سے اچھوت سمجھتے تھے۔ وہ ہاتھ پیر کے کام سے کتراتے اور اپنے خاندانی پیشوں سے بھاگتے تھے اور بے روزگاری کی مصیبت میں گرفتار رہتے تھے۔ اس طرح نظام تعلیم کے نقائص سے سماج میں ایک ٹیڑھا پن پیدا ہو گیا تھا اور کردار کی صحیح تعمیر دشوار ہو گئی تھی۔

کام کے ذریعے تعلیم

گاندھی جی کی سیاسی سماجی اور معاشی تحریکوں کی طرح ان کی تعلیمی تحریک کا بھی اصل مقصد یہ تھا کہ انسان کو انسان بنایا جائے اور اس کا کردار بلند کیا جائے۔ اسی بنا پر اور اپنے سابقہ تجربوں سے سبق حاصل کر کے انھوں نے کام یا حرفہ کو ابتدائی تعلیم کا مرکزی نقطہ قرار دیا۔ نہ صرف ہندستان بلکہ یورپ کے بھی بہت سے ماہرین تعلیم اور ماہرین نفسیات یہ مانتے ہیں کہ اس طرح تعلیم زیادہ مکمل اور بامقصد بن جاتی ہے۔ کام کی بنیاد پر تعلیم حاصل کرنے سے طالب علم تعلیم کو جبر نہیں بلکہ تفریح سمجھتا ہے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے اس میں باہمی تعاون کا جذبہ ترقی کرتا ہے اور خود غرضی کا جذبہ دبتا ہے۔ اسے اپنی اُپج دکھانے کا موقع ملتا ہے جس سے

… دماغی پرورش ہوتی ہے اور اس میں کچھ سوچ کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔

علم الاعضا اور علم نفسیات کے ماہرین یہ مانتے ہیں کہ جسمانی کام اور ذہنی نظام میں قریبی تعلق ہوتا ہے۔ جب ہاتھ پاؤں نئی حرکتیں کرتے ہیں تو دماغ میں نئے مرکز کھلتے ہیں اور نئی حس ابھر آتی ہے۔ حسیات کی ترقی سے دماغ کی ترقی ہوتی ہے اور اس طرح جسمانی کام سے دماغی توازن اور ذہن کی تیزی پیدا ہوتی ہے۔ اسی بنا پر بعض دماغی بیماریوں کا علاج جسمانی محنت کے ذریعے کیا جاتا ہے اور روس، یورپ اور امریکا میں تعلیم کے نئے طریقوں مثلاً ایک ٹی وی ٹی اسکول اور پروجکٹ یا کام پلکس میتھڈ میں پڑھائی سے زیادہ کڑھائی پر توجہ دی جاتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ جسمانی محنت سے بچے کی فالتو قوت جو دب کر اس کے اور سماج کے لئے نقصان کا باعث بن سکتی ہے نکل جاتی ہے اور بچہ اپنی آئندہ زندگی کے لئے زیادہ اچھی طرح تیار ہو جاتا ہے۔

سائنسی انداز

اسکولوں میں سکھائے جانے والے کاموں کے سلسلے میں گاندھی جی نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ بچوں سے کام مروجہ اور فرسودہ ڈھنگ سے نہیں بلکہ سائنسی انداز میں لیا جائے۔ اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بنیادی تعلیم کے ذریعے بچوں سے محنت لینے کا طریقہ جس کے خلاف ہر مہذب ملک میں قانون بن گئے ہیں، رائج کیا جا رہا ہے وہ ایک خراب کارخانے اور اچھے اسکول میں فرق نہیں کرتے۔ اسی طرح جو لوگ حرفہ کی تعلیم کو صنعتی ترقی کے خلاف سمجھتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندوستان میں گھریلو دستکاریوں اور چھوٹی صنعتوں کے لئے اب بھی بہت بڑی گنجائش موجود ہے۔ اس کے علاوہ کسی حرفہ کو مرکز بنا کر دماغ کی جو تربیت ہو گی وہ دوسرے کاموں میں بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

خود کفالت

تعلیم کو خود کفیل بنانے کے متعلق گاندھی جی کے نظریے کو بھی بعض لوگ ناقابل عمل بتاتے ہیں لیکن اس حقیقت سے وہ بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ہندستان کی وسیع آبادی کو دیکھتے ہوئے حکومتوں کی آمدنی کے ذرائع بہت محدود اور مفت اور لازمی تعلیم کے نفاذ کے لئے ناکافی ہیں۔ گاندھی جی نے اس سلسلے میں ایک بار کہا تھا کہ امریکا جیسے دولت مند ملک میں بھی بہت سے لوگوں کو اپنے تعلیمی اخراجات نکالنے کے لیے جسمانی محنت کرنا پڑتی ہے۔ ایک دوسرے موقع پر انھوں نے کہا تھا کہ جن لڑکوں کو اسکولوں میں فیس کی رعایت مل جاتی ہے اکثر ان میں ایک طرح کا احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے جبکہ جو لڑکے اپنی محنت مثلاً بڑھئی گیری یا اسی طرح کے کسی اور کام سے اپنی تعلیم کا خرچ پورا کرتے ہیں ان میں ایسا کوئی احساس پیدا نہیں ہوتا۔

فطرت شناسی کا شاہکار

بہر حال اب یہ بحث فروعات میں شمار کی جائے گی اس لئے کہ ملک دھیرے دھیرے اس منزل کی طرف بڑھ رہا ہے جب ابتدائی تعلیم عام مفت اور لازمی ہو جائے گی۔ اس نے دوسری سمتوں میں بھی ترقی کی ہے۔ لیکن اس ترقی اور گاندھی جی کے تعلیمی نظریے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس نظریے کا کا مقصد انسانی کردار کی تعمیر ہے اور اس مقصد سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس تعمیر میں گاندھی جی فرد کو سماج سے الگ نہیں بلکہ اس کا ایک جزو سمجھتے تھے اور یہ بات سوشلزم کے منافی نہیں ہے۔ وہ تعلیم کے ذریعہ جس قسم کا سماج قائم کرنا چاہتے تھے اس کے بنیادی اصول سوشلسٹ سماج کے بنیادی اصولوں سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں لیکن گاندھی جی مقصد پر جتنی توجہ دیتے تھے اتنی ہی توجہ وہ ذرائع پر بھی دیتے تھے۔ ان کے مقصد کی طرح ذرائع بھی پاکیزہ ہوتے ہیں ایسی حالت میں ذریعہ خود مقصد بن جاتا ہو اور اس لئے گاندھی جی کے تعلیمی نظریے کو موجودہ حالات میں بھی رائج کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے بنیادی اصولوں پر اٹل ضرور تھے لیکن حق کے متلاشی ہمیشہ رہتے تھے اور تجربے اور حالات کی مناسبت سے پروگرام کی تفصیلات میں رد و بدل کرتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود ان کا یہ نظریہ فطرت شناسی کا ایک شاہکار ہے۔

✡

دوپہر

راہی معصوم رضا

کون ہے یہ
جو برگد کے میٹھے سائے میں
بیٹھ کے ماتھا پونچھ رہی ہے

گنگا کی تنزیب کا کرتا
اور اس پانی سے کرتے میں
گومتی اور سرجو کی کلیاں

دامن پر
اور چاکِ گریباں پر
شہروں کی بیل ٹنکی ہے۔
دیہاتوں کے پھول کڑھے ہیں
جمنا کے چنچل پانی کا نرم دوپٹہ
لہروں کی چنگل جس کو چنتی رہتی ہے
مینڈھوں کے دھاگے میں
جس کے
لمبے، کالے بال گندھے ہیں
بنسی کی میٹھی تانوں کی چادر اوڑھے
" رسیا " اور " بدسیا " کے آویزے پہنے
پیروں میں " ٹونے " کے چھلے
" سوہے " اور " جنتے " کے گھنگھرو

سانس نئی برسات کی خوشبو
بیلے اور چنبیلی کی چاندی میں ہے جوہی کا نگینہ
سرسوں کے پھولوں کا ٹیکہ
گیہوں کی بالی کا جھپکا
ہاتھوں میں " بابل " کی چوڑی
" بربے " کے تانبے کے کنگن پر خوابوں کے سنہرے پتّر
ماتھے پر متھرا کی بندی
ہونٹوں پر کاشی کی سرخی
رخساروں پر
شام اودھ کی شفق کی لالی
پور پور میں رچی ہوئی محنت کی مہندی
آنکھوں میں " کجری " کا سرمہ
ماضی، حال اور مستقبل کی
آدھی
پوری
کچھ تصویریں

یہ ہادن[1]، بچوں کی ماں ہے
پھر بھی جواں ہے

---

[1] جن لوگوں کو اعداد شمار میں بہت دل چسپی ہو وہ "یوجن" پڑھیں۔ راہی

لکھنؤ کے چند نامور شعرا —— ایک پرانے روزنامچے کی روشنی میں

سید حسن

میں نے اپنے مضمون "سوا سو سال پہلے کا لکھنؤ" مطبوعہ نیا دور بابت ماہ مئی ۱۹۶۰ء میں عظیم آباد کے ایک ادیب نجات حسین خاں مرحوم کے ایک قلمی سفرنامے[1] کی بنیاد پر آج سے تقریباً سوا سو سال قبل کے لکھنؤ کے تمدن کا ایک نقشہ پیش کیا ہے۔ نجات حسین خان نے مارچ، مئی ۱۸۴۳ء میں لکھنؤ کی سیاحت کی تھی اور اپنے سفر کے حالات اس سفرنامے میں تاریخ وار قلم بند کر لیے تھے۔ انھوں نے نہ صرف شہر اور اس کی سرگرمیوں کی سیر کی تھی بلکہ یہاں کے شاعروں اور دانش مندوں سے بھی ملاقاتیں کی تھیں۔ انھوں نے آتش، انیس، دبیر، ضمیر اور برق کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کے کلام کو خود ان کی زبانی سنا تھا۔ اس سفرنامے میں آتش کی ملاقات کا حال کچھ تفصیل سے بیان ہوا ہے اور اس ممتاز عصر شاعر کے بارے میں بعض نئی باتیں بتائی ہیں، لیکن افسوس ہو کہ دوسرے شاعروں کی ملاقاتوں کے حال مختصر ہیں پھر بھی جو کچھ لکھا ہے وہ بہت پر ارزش ہو کیونکہ وہ ایک ہم زمان ادیب کی راے اور بیانات ہیں۔

آتش۔ نجات حسین خاں نے آتش سے اُن کے گھر پر دو دفعہ ملاقات کی۔ پہلی مرتبہ ۲۵ مارچ ۱۸۴۳ء کو اور دوسری دفعہ ۳ اپریل کو۔ جب وہ پہلی مرتبہ آتش کے یہاں گئے اُس وقت آتش نہایت سادہ وضع میں درویشانہ انداز سے کرتہ پہنے چٹائی کے فرش پر بیٹھے تھے۔ اُن کا چہرہ نورانی، داڑھی سفید قامت کشیدہ اور سِن ستّر سال کے قریب تھا۔ خواجہ آتش نے کمال مہربانی اور غایت اخلاق کے ساتھ نجات حسین خاں کا استقبال کیا اور اُن سے سفر لکھنؤ کا مقصد اور عظیم آباد کے حالات دریافت کیے۔ اس کے بعد شعر و سخن کا تذکرہ چھڑا۔ آتش نے اپنی چار غزلیں اور دو قصیدے سنائے۔ ایک قصیدہ امجد علی شاہ کی ستائش میں اور دوسرا حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں تھا۔ ان کے علاوہ آتش نے اپنے شاگرد میر دوست علی خلیل کے ایک قصیدے کے چند اشعار بھی سنائے۔ دوسری ملاقات میں پہلے تو ان خبروں پر گفتگو ہوئی جو شاہجہاں آباد کے تازہ اخباروں سے ملی تھیں۔ پھر شعر خوانی ہوئی۔ اس دفعہ بھی آتش نے اپنی ایک غزل کے آٹھ اشعار خاں صاحب کو سنائے۔ سفرنامے میں ان پانچوں غزلوں کے اشعار نقل ہوئے ہیں لیکن بدقسمتی سے قصیدے کا کوئی شعر بھی روزنامچہ نگار نے نقل نہیں کیا۔ بہرحال، نجات حسین خاں کے بیانات سے اتنا تو منکشف ہو جاتا ہے کہ آتش نے قصیدے بھی لکھے تھے اور تذکرہ نگاروں کا یہ خیال کہ آتش نے کبھی کسی کی مدح سرائی نہیں کی غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر قصیدے کے چند اشعار بھی نقل ہو جاتے تو اُردو قصیدہ گوئی کی تاریخ میں ایک بڑا اہم اضافہ ہوتا۔

جس زمانے میں نجات حسین خاں نے آتش سے ملاقاتیں کیں ان دنوں

---

[1] یہ قلمی روزنامچہ جس کا نام سوانح لکھنؤ ہے پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات کی ملکیت ہے۔

[illegible]
[illegible]

[illegible] ایک بات ہے کہ نجات حسین خاں نے آتش کے سوانحی [illegible] مطالعہ میں ان کا وہ کلام جو ان کی زبان سے سنا تھا نقل نہیں کیا۔ البتہ کلام کا انتخاب چند غزلیں دیے ہیں۔ جن غزلوں کے اشعار نقل کیے ہیں ان کے مطلعے یہ ہیں:

(۱) باغباں انصاف پر بلبل سے آیا چاہیے
کھینچیں اس کو زیرِ گل کی نہایا چاہیے (۱۲ اشعار)

(۲) بیت ہیں دو ابروے زیبائے یار
مصرعہ برجستہ ہے بالائے یار (۱۴ اشعار)

(۳) پڑ گئی آنکھ جو ان چاند سے رخساروں پر
وحشتی کبک نظر آ گئے انگاروں پر (۵ اشعار)

(۴) خورشید حشر سے ہے سینے کا داغ روشن
اندھیرے جو کہے اس کو چراغ روشن (۳ اشعار)

(۵) موسم گل ہو جنوں ہو شور و شر ہو [illegible]
جن پڑھا رہا ہے دیوانوں کے سر پر [illegible] (۷ اشعار)

یہ پانچوں غزلیں پہلی ملاقات میں آتش نے خاں صاحب کو سنائی تھیں اور یہ سب کی سب دیوان دوم میں شامل ہیں۔

دوسری ملاقات میں خواجہ صاحب نے جو غزل سنائی وہ یہ تھی:

دل کو فزوں چمن کی مٹی سے سر پایا ۔۔۔ گیسوے سے میں نے اپنے چہرے کو زرد پایا
سوئے ہیں گیسوؤں کی زنجیر کے جنوں نے ۔۔۔ مجنوں سے مجھ کو ذرّۂ صحرا نورد پایا
خال رخ صنم کو گرمی کی نہ گرمی ۔۔۔ کافور کی طرح سے [illegible] سرد پایا
ہونے لگی ہویدا تیر نگہ سے سازی عشق ۔۔۔ گلشن سفید گالے رنگ اپنا زرد پایا
کس کس ستارے سے شب کے [illegible] ۔۔۔ آنکھوں کو تیری ہم نے مرد برد پایا
کرتے تصور اس کو نصور پر حضرت ۔۔۔ ہوتا جو تیر سے خط سا کچھ لاجورد پایا

۵۲ میں نے اپنے مضمون "آتش سے ایک بہاری ادیب کی ملاقات" مطبوعہ معارف اعظم گڑھ (مئی ۱۹۵۶ء) میں ان ملاقاتوں کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔

[illegible]
[illegible]

یہ غزل بھی دیوان دوم میں بحسب و موجود ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس زمانے میں کہی گئی ہو۔ کیونکہ دیوان دوم ۱۲۶۱ھ میں یعنی نجات حسین خاں کی ملاقات کے ایک برس کے بعد شائع ہوا تھا۔

دبیر۔ مرزا دبیر کا مرثیہ سننے کے شوق میں نجات حسین خاں ۳ مارچ ۱۸۴۶ء کو نواب تہور مرزا صاحب کے ساتھ مولوی محمد مرزا صاحب کے امام باڑے میں حاضر ہوئے لیکن ان کے پہنچنے کے قبل مرزا دبیر اپنا کلام سنا کر منبر سے نیچے اتر چکے تھے۔ یہ ایک عام مجلس تھی۔ تقسیم شربت کے بعد نواب مرزا صاحب نے خاں صاحب کا مرزا دبیر سے تعارف کرایا۔ اس وقت مرزا دبیر منبر کے نیچے بیٹھے تھے۔ خاں صاحب کا بیان ہے:

"دبیر کا جثہ نحیف، قامت میانہ اور رنگ سبز مائل بہ سیاہی تھا۔ کاندھے پر سرخ رنگ کا ایک رومال رکھے ہوئے تھے۔"

نواب مرزا صاحب نے خاں صاحب کو دبیر سے ملاتے ہوئے کہا:

"یہ زیارت تعزیہ و عزاداران و مرثیہ گویان و کملائے عصر لکھنؤ از دہر کی زیارت کو تشریف لائے ہیں۔"

یہ سن کر دبیر نے خاں صاحب کو نزدیک بلایا اور اپنی قربت سے مفتخر فرمایا۔ اس ملاقات میں کیا باتیں ہوئیں، روزنامچے میں کچھ مرقوم نہیں ہے۔

دوسری مرتبہ خاں صاحب خود مرزا دبیر کے مکان پر مجلس عزا میں شریک ہوئے۔ یہ ایک خاص مجلس تھی اور اس میں دبیر نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ خاں صاحب کا بیان ہے کہ مرزا دبیر ہر مہینے کی گیارھویں تاریخ کو اپنے گھر میں مجلس منعقد کرتے تھے اور اس میں نئے نئے مرثیے تحت اللفظ سنایا کرتے تھے۔ اسی مجلس میں انھوں نے اپنے ایک شاگرد تخلص بہ منیر کا بھی مرثیہ خود پڑھ کر سنایا۔ اہل حاضرین نے خوب خوب داد دی۔ خاں صاحب کہتے ہیں:

"اگر اس مرثیے پر حضرت قدسی نے قلیل اصلاح کی تھی تو منیر نے بہت اچھا لکھا تھا اور یقین ہے کہ استاد کے بعد نام روشن کرے گا۔ لیکن گمان ہے کہ

۵۳ لکھنؤ کے ایک صاحب جاگیر اور اہل وثیقہ رئیس جو خاں صاحب کے شناسا ہو گئے تھے۔
۵۴ سید اسمعیل حسین منیر شکوہ آبادی۔

گزشتہ ہی دنوں میں جس طرح دبیر نے اپنے اُستاد سے سبقت ہو کر اپنے مور
پر ناموری حاصل کی تھی، اسی طرح ان کا شاگرد بھی اُستاد کی پیروی کرے گا۔"

پچیسویں ربیع الثانی ۱۲۵۹ھ (۲۶ مئی ۱۸۴۳ء) کو خاں صاحب پھر مرزا
دبیر کی مرثیہ خوانی کی مجلس میں شریک ہوئے۔ یہ مجلس امام باڑہ میر باقر میں منعقد
ہوئی تھی۔ امام باڑے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس کی عمارت نہایت وسیع اور رنگارنگ جھاڑ فانوس، دیوارگیروں
اور انواع تکلفات سے آراستہ تھی۔"

تقریباً دس بجے دن کے وقت مرزا دبیر منبر پر تشریف لائے اور ایک طولانی مرثیہ
بکمال متانت و بلاغت شہدائے کربلا رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دردناک
احوال میں پڑھا۔ اس مرثیے میں انھوں نے تازہ واقعات کا بھی تذکرہ کیا تھا
جو ماہ ذیحجہ ۱۲۵۸ھ میں کربلائے معلٰی میں پیش آئے تھے۔ مجلس میں حاضرین کی
تعداد دو ڈھائی ہزار کے قریب تھی۔ سب پر گریہ کا عالم طاری تھا۔ خاں صاحب لکھتے ہیں

"مرزا شاعرانہ طبیعت، طلاقت بیانی، پُرگوئی اور خوش خوانی میں
اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

انیس میر انیس سے مرثیہ سننے کے لیے نجات حسین خاں ۲۶ ربیع الاول ۱۲۵۹ھ
(۲۷ اپریل ۱۸۴۳ء) کو مصطفٰے خاں کے تعزیے خانے میں گئے۔ یہ مقام اُن کی جائے
اقامت سے دور تھا لیکن اشتیاق نے راستہ آسان کر دیا۔ مجلس میں مجمع کثیر تھا۔ پہلے
ایک مسن شخص نے منبر پر آ کر حدیث و فضائل امام بیان کیے۔ پھر انیس نے کمال
فصاحت و بلاغت و متانت اور رعایت تکلفات شاعری سے آراستہ مرثیہ سُنا کر
حاضرین میں گریہ و بکا پیدا کیا۔ ہر چہار طرف سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی داد بلند
ہوتی رہی۔ خاں صاحب لکھتے ہیں:

"انیس کے کلام کی خوبی میں کوئی شبہہ نہیں۔ خاندانی شاعر ہیں۔
آج کل دبیر کے سوا ان کا کوئی نظیر نہیں بلکہ خواص تو انھیں کو ترجیح
دیتے ہیں۔"

ضمیر میر ضمیر کا کلام سُننے کا خاں صاحب کو زبردست اشتیاق تھا، چنانچہ
۱۱ ربیع الاول ۱۲۵۹ھ (۱۲ اپریل ۱۸۴۳ء) کو وہ حاجی مولانا سید حسن صاحب
کے یہاں مجلس میں ضمیر کا کلام سننے کے لیے شریک ہوئے۔ یہ مجلس ہر سیہ خوانی کی تھی۔
حاضرین کا اتنا ہجوم تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، بہت سے لوگ خیموں کی طنابیں
پکڑے کھڑے تھے۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی کلام سُننے کو آئی تھیں اور اُن کے
لیے قنات باندھ کر الگ جگہ بنائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ آس پاس کے مکانوں
کی چھتوں پر بھی بے شمار عورتیں موجود تھیں۔ حاضرین کے لیے پان بھی لائے گئے
لیکن بھیڑ کی وجہ سے انھیں ٹھیک سے تقسیم کرنا ممکن نہ تھا، لہٰذا بانٹنے والوں نے
گلوریوں کو ہاتھ میں لے کر مجمع میں پھینکنا شروع کیا۔ کسی کو گلوری ملی کسی کو نہ ملی۔
خاں صاحب کو مجمع کے وسط میں جگہ ملی تھی جہاں ایک تخت بچھا ہوا تھا اور اُس
پر ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ ۴ بجے شام کے قریب مرزا دبیر کے اُستاد میر ضمیر تشریف
لائے اور کرسی پر بیٹھے۔ پہلے انھوں نے چند ظریفانہ رباعیاں پڑھیں، اس کے
بعد اپنا تصنیف مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ مجمع میں ہر طرف خندہ اور قہقہے کی
آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ چار گھنٹے تک یہی کیفیت رہی۔ پھر میر ضمیر نے پڑھنا
ختم کیا اور اس کے ساتھ مجلس بھی برخاست ہوئی۔

پانچ دن کے بعد یعنی ۱۶ ربیع الاول کو نجات حسین خاں میر ضمیر کی ملاقات
کے لیے اُن کے گھر کو گئے۔ میر ضمیر اُن کے ساتھ اخلاق و محبت سے پیش آئے اور
اُن کے حالات دریافت کیے۔ پھر "زبان ریختہ" میں انھوں نے جو سات بند
تصنیف کیے ہیں اُن میں سے چند خاں صاحب کو سُنائے اور وعدہ کیا کہ جمعہ
کے دن مع بیاض خاں صاحب کے یہاں آئیں گے اور مزید کلام سنائیں گے۔ میر ضمیر
سے دوبارہ ملاقات ہوئی یا نہیں اور انھوں نے حسبِ وعدہ اپنا اور کلام سُنایا یا

۵۔ خاں صاحب لکھتے ہیں کہ جب علی پاشا سلطان ترکی کی جانب سے بغداد کا حاکم
ہو کر آیا تو اُس نے اپنے ایک سپہ سالار کو کسی بغض و عناد کے باعث کربلا پر چڑھائی
کا حکم دیا، چنانچہ ۱۱ ذیحجہ ۱۲۵۸ھ کو کربلا پر فوج کشی کی گئی اور بارہ ہزار سے زیادہ
باشندگان کربلا مقتول ہوئے۔ دو ہزار آدمی تو حرم حضرت عباس علمبردار میں شہید
ہوئے۔ حملہ آوروں نے مقبروں پر کے تمام ساز و سامان نقرئی و طلائی قندیلیں اور
مال خزانہ وغیرہ کو لشکر میں تقسیم کر دیے۔ معلوم نہیں یہ بیان کہاں تک درست ہے کیونکہ
تلاش کے باوجود کسی تاریخ کی کتاب میں اس واقعے کا ذکر نہ ملا
خاں صاحب کے بھائی اُن ہی دنوں عتبات مقدسہ کی زیارت کو تشریف لے گئے
تھے، انھیں بہت تشویش تھی۔

۶۔ سفرنامے میں مرثیے کے اشعار تو نہیں ہیں لیکن اس کے مطالب کو تفصیل سے
بیان کیا گیا ہے۔ یہ پورا مضمون ہزل، فحش اور استہزا پر مشتمل ہے۔

لیکن اِن کے بارے میں خاں صاحب نے کچھ نہیں لکھا۔

برقؔ ۔ نجات حسین خاں یکم ربیع الثانی (۱۱ اپریل) مغرب کے وقت مرزا کریم بیگ کے ساتھ محمد رضا برقؔ کی ملاقات کو گئے۔ برقؔ کا سن خاں صاحب کے اندازے کے مطابق اس وقت تقریباً پچاس سال کا تھا۔ اُن کا حلیہ یہ لکھا ہے "گندمی رنگ، پست قامت، ہاتھ پاؤں لاغر۔" ایک سفید مسند پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے اور چالیس پچاس سپاہی پیشہ شریف و نجیب اشخاص اُن کے گھیرے بیٹھے تھے۔ اُن میں سے اکثر نوکری کے اُمیدوار تھے۔ ان لوگوں سے شاہی فوج اور اس کی آراستگی و انتظام کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ برقؔ خاں صاحب سے بغل گیر ہوئے اور جب اُن کے نزدیک سے چند آدمی اُٹھ کر چلے گئے تو خاں صاحب کو اُنھوں نے قریب بلا کر مسند پر بٹھایا اور ان کے وطن کا حال اور لکھنؤ آنے کا سبب پوچھا۔ چونکہ اُس وقت انتظامِ لشکر کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی شعر و سُخن کی باتیں نہ ہو سکیں اور اس موضوع کو دوسری ملاقات پر ملتوی کر دیا گیا۔ واپسی کے وقت راستے میں مرزا کریم بیگ نے خاں صاحب کو بتایا کہ "بعض حضرت بادشاہ کی طرف سے پانچ سو سوار برقؔ کے تعلق ہیں"۔ مرزا کریم بیگ نے یہ بھی بتایا کہ برقؔ کے والد کا نام کاظم علی[۵] ہے جو خود ایک نامور شاعر تھے۔ برقؔ کو ناسخؔ سے تلمذ ہے اور اپنے اُستاد کے ممتاز شاگردوں میں ہیں۔ غزل گوئی میں خاصی مشق حاصل کی ہے اور مرثیے بھی اچھے کہتے ہیں جن میں حضرات ائمہ معصومین کی شجاعت و دلاوری کے مضامین خوب باندھتے ہیں۔ ایامِ جوانی میں فرطِ جوش سے اکثر جانہ جنگیوں میں مبتلا ہوئے اور زخم کھائے ہیں جن کے متعدد نشانات اعضا پر موجود ہیں۔

قایلؔ ۔ سید علی جان قایلؔ[۶] اصلاً عظیم آبادی ہیں لیکن اُن کی شاعری کا بیشتر زمانہ لکھنؤ اور کانپور میں گزرا۔ نواب قدسیہ محل کے یہاں ملازم تھے۔ نجات حسین خاں کی اُن سے پہلی ملاقات ۱۰ صفر ۱۲۵۹ھ کو راستے میں ہو گئی جب کہ خاں صاحب مرزا دبیرؔ کی مجلس مرثیہ خوانی سے واپس آ رہے تھے۔ اُس وقت دونوں میں مختصر گفتگو ہوئی، لیکن ایک نے دوسرے کے مکان کا پتا نشان پوچھ لیا تھا۔ چنانچہ ۱۵ ربیع الاول کو صبح کے وقت قایلؔ خاں صاحب کے یہاں بغرض ملاقات آئے اور دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ ناسخؔ کے شاگردِ رشید مرزا مہدی قبولؔ کے مکان واقع محلہ مفتی گنج میں رہتے ہیں۔ قایلؔ نے قبولؔ کے کمالات کی ایسی تعریف کی کہ خاں صاحب کو بھی اُن سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور انھوں نے چلتے وقت اپنا نوکر قبولؔ کا گھر دیکھنے کو قایلؔ کے ساتھ کر دیا۔ خاں صاحب یکم ربیع الثانی (۱۱ مئی) کو بازدید کے لیے قایلؔ کے یہاں گئے اور تھوڑی دیر تک اُن کے ساتھ رہے لیکن مرزا قبولؔ سے ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ وہ اس وقت تک دربارِ سلطانی سے واپس نہیں آئے تھے۔

تین روز کے بعد قایلؔ پھر خاں صاحب کی ملاقات کو آئے اور اس مرتبہ اپنے اُستاد کے ایک شاگرد متخلص بہ مستورؔ[۷] کو بھی ساتھ لائے۔ دونوں نے غزلیں سنائیں۔ قایلؔ نے رخصت ہوتے وقت خاں صاحب سے دیوانِ ناسخؔ کی قیمت پانچ روپے وصول کر لی۔

قبولؔ ۔ مرزا مہدی قبولؔ سے خاں صاحب کی ملاقات نہ ہو سکی، لیکن منصب علی صاحب کے یہاں ایک بزرگ ملا محمد نامی سے اُن کے حالات معلوم ہوئے۔ اُن بزرگ نے یہ بھی کہا کہ "قبولؔ کی تقریر تک تو درست نہیں ہے، شاعری کیا کریں گے۔"

ناسخؔ ۔ نجات حسین خاں کے سفرِ لکھنؤ سے چار پانچ سال قبل ناسخؔ کی وفات ہو چکی تھی، اس لیے خاں صاحب کو ناسخؔ سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ لیکن روزنامچے میں مولف نے ناسخؔ کا نام بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ لیا ہے اور اکثر آدمیوں سے ناسخؔ کے بارے میں گفتگو کی ہے جن میں سے ایک بزرگ وہی ملا محمد ہیں جنھوں نے قبولؔ کے حالات ان کو بتائے تھے۔ ملا محمد صاحب نے ناسخؔ کے اوصاف بیان کیے اور اُن کے اشعار بھی سنائے۔ ملا صاحب نے ناسخؔ کو دیکھا تھا چنانچہ اُنھوں نے بتایا کہ شیخ ناسخؔ بہت قانع اور متوکل تھے۔ نواب معتمد الدولہ آغا میر کو شیخ سے بہت ارادت تھی۔ اُس نے شیخ کا تین چار سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے دربار میں بُلانا چاہا، لیکن شیخ نے منظور نہ کیا۔ البتہ امثال امراء اور

(بقیہ مضمون صفحہ ۳۴ پر)

---

[۵] اس ضمن میں جناب شیخ تصدق حسین صاحب کا مضمون "دربارِ واجدی کے کچھ نام ور شاعر" مطبوعہ نیا دور لکھنؤ خاص نمبر اگست ۱۹۵۹ء ملاحظہ ہو۔ اس مضمون میں کاظم علی کا تخلص صلحؔ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ 'صالح' نام کا جز ہے۔ واجد علی شاہ کی مشہور تصنیف 'بنی' میں بھی 'صلح' ہی لکھا ہے۔

[۶] ان کا نام تذکرۂ سراپا سخن، میں سید علی جان، اور تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں سید علی خاں لکھا ہے۔

[۷] مستورؔ کے متعلق تحقیق نہ ہو سکی کہ اُن کا نام وغیرہ کیا تھا۔

کائنات

حسن معصود

کائنات بظاہر مکان (SPACE) اور مکان میں گھومتی ہوئی مادی اشیاء پر مشتمل ہے۔ ان اشیاء کی تین بڑی بڑی قسمیں ہیں (۱) سدائم (NEBULAE) (۲) ستارے (STARS) اور (۳) سیارے (PLANETS)۔ ان تینوں کا آپس میں تعلق محض اتنا ہے کہ ہر دوسرا پہلے کا ایک حقیر ٹکڑا ہے۔

"مکان" کی وسعت کا اندازہ لگانا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے بقول سی ای ایم جوڈ "انسانی دماغ ایسی بے اندازہ پہنائیوں کا تخیلاتی احاطہ کرنے سے بھی قاصر ہے" پھر بھی ہم اس کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر بات بنتی نہیں کم از کم ایک سیارہ (فرض کیجئے زمین) کا حجم ہم کو معلوم ہے (قطر تقریباً آٹھ ہزار میل، محیط تقریباً ۲۵ ہزار میل اور وزن تقریباً ۵ر۹۸ × ۱۰ میٹرک ٹن)۔ یہ سیارہ (زمین) ایک ستارہ (سورج) کا حقیر ٹکڑا ہے ——— حقیر اس معنی میں کہ سورج زمین سے دس لاکھ گنا بڑا ہے۔ گویا زمین سورج کے مقابلہ میں بلحاظ جسامت مٹر کا ایک دانہ ہے۔ اس سے آپ کو زمین کے مقابلے میں سورج کے حجم کا اندازہ ہو جائیگا۔ اب یہ سوچیے کہ یہ ستارہ (سورج) بھی ایک سدیم (کہکشاں) کا بس ایک ذرہ ہے۔ ذرہ اس لئے کہ یہ سدیم (کہکشاں) سورج کے ایسے بلکہ سورج سے بھی ہزاروں گنا بڑے اربوں ستاروں پر مشتمل ہے۔ اب آپ کو ایک سدیم کی جسامت کا بھی اندازہ ہو گیا۔ لیکن اس پر حیرت نہ کیجئے۔ اس کائنات میں کہکشاں کے ایسے لاکھوں کروڑوں سدائم اور بھی موجود ہیں جو مکان کی پہنائیوں میں اس طرح تیرتے پھر رہے ہیں جیسے جہاز سمندر میں۔ سدائم اور ستاروں کی اس بے اندازہ تعداد کے باوجود "مکان" کا زیادہ تر حصہ خالی پڑا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے ایک بہت بڑے مکان میں رائی کا ایک دانہ پڑا ہوا ہو۔ اس تمثیل سے آپ کو مکان (SPACE) کی وسعت کا کسی قدر اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اب ذرا یہ سوچیے کہ اس کائنات میں ہماری زمین کا کیا درجہ ہو سکتا ہے۔ سر جیمس جینس (Sir James Jeans) کے استعارے کی زبان میں ہماری یہ زمین "دنیا بھر کے سمندروں کی ریت کے ایک ذرہ کا دس لاکھواں حصہ ہے" یعنی ایک ایسا ذرہ جو صرف خوردبین ہی سے نظر آ سکتا ہے۔

کائنات کا ارتقاء

کائنات کی آفرینش کے سلسلہ میں یہ خیال ہے کہ پہلے ساری کائنات مادی ذرات کا مجموعہ تھی۔ اس میں کوئی حرکت نہیں پائی جاتی تھی اور ان ذروں میں دو اندرونی قوتیں یعنی کشش اور مدافعت ایک دوسرے کے مساوی تھیں، اس طریقے سے کائنات کی شکل ہمیشہ ایک لطیف مادے کی مانند رہنی چاہیے تھی لیکن اس منتشر مادے میں اختلال اور خلل پیدا ہوئی۔ اس خلل اختلال کی توجیہہ میں سائنس کا دماغ اپنی دقیقہ رسی کے باوجود لاچار نظر آتا ہے۔ بہرحال اس اختلال کی وجہ سے مادے میں انجماد (CONDENSATION) ہونے لگا۔ انجماد کی وجہ سے بے حس و حرکت ذرات بڑے بڑے گیسی مادوں کے مختلف تودوں میں بٹ گئے۔ ایسے تودوں

کو ہم سدائم (NEBULAE) کہتے ہیں۔ گویا سدائم مادّے کی وہ قدیم ترین صورتیں ہیں جو گرم سفید گیسی مادّوں کے چکر کھاتے ہوئے بڑے بڑے تودوں پر مشتمل ہیں۔ انجماد بڑھنے کی وجہ سے سدائم کے باہمی فاصلوں میں زیادتی ہونے لگی کشش اور مدافعت کی قوتیں جو پہلے مساوی تھیں اب کم پیش ہو گئیں اور قوت مدافعت، قوت کشش سے بڑھ گئی۔ اس وقت سدائم ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ جیسے جیسے سدائم کا درمیانی فاصلہ زیادہ ہوتا گیا کشش میں کمی اور مدافعت میں زیادتی ہوتی گئی اور ان کے ایک دوسرے سے دور ہونے کی رفتار بھی بڑھتی گئی۔ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا اور اس طرح کائنات کے پھیلاؤ میں اضافہ ہوتا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سدیمی تودے نسبتاً سرد ہونے لگے ہیں اور جوں جوں یہ سرد پڑتے گئے گیسی مادّہ جس سے یہ مرکب ہوتے ہیں منجمد ہو کر کثیف تر مادّے کے جھرمٹوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ جھرمٹ چھوٹے چھوٹے ملے ہوئے نقطوں کا گچھا نظر آتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہ جھرمٹ بھی اپنے اپنے سدیمی تودے کے حلقے کے اندر، ایک دوسرے سے جدا اور نمایاں ہو کر چمکنے لگتے ہیں۔ یہ کثیف تر مادّے کے چمکیلے جھرمٹ دراصل ستارے ہیں۔ اوّل اوّل یہ جھرمٹ سدیم کے بیرونی سطح پر ظاہر ہوتے ہیں پھر یہ سدیم جیسے جیسے پرانے ہوتے جاتے ہیں کثیف تر جھرمٹ کی تعداد مرکز کی طرف بھی نمایاں ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آتا ہے جبکہ یہ سدیم گرم سفید گیسی مادّے کے بجائے ستاروں کا بہت بڑا مجموعہ بن جاتا ہے جیسا کہ ہماری کہکشاں ہے۔

سدائم

انتہائی طاقت ور دوربین کی مدد سے اب تک کائنات میں دو کروڑ ایسے سدائم یا "ستاروں کے جھرمٹوں" کا وجود ثابت ہو چکا ہے سوائے کہکشاں کے ستاروں کے یہ جھرمٹ خالی آنکھ سے نظر نہیں آتے۔ معمولی دوربین کی مدد سے بھی ستاروں کے یہ جھرمٹ دیکھنے میں روشنی کا ایک دھبہ یا بادل کا ایک ٹکڑا نظر آتے ہیں اس لئے اس کا نام سدیم رکھا گیا ہے جس کے لغوی معنی کہر، دھند یا بادل کے ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے مشہور سائنس داں سر ولیم ہرشل (۱۷۳۸ء — ۱۸۲۲ء) نے اس کو "کائناتی جزیرے" کے نام سے بھی موسوم کیا ہے۔ سر ولیم ہرشل ہی وہ پہلا سائنس داں ہے جس نے اپنی خام دوربین کی مدد سے یہ ثابت کیا تھا کہ روشنی کے یہ دھبے دراصل کروڑوں اور اربوں ستاروں کے مجموعے ہیں اور یہ پیشین گوئی کی تھی کہ دوربین کی طاقت جیسے جیسے بڑھے گی ان کے ستارے بھی الگ الگ نمایاں طور سے دکھائی دیں گے۔ اس کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی کیونکہ آج ہم کیلی فورنیا میں ماؤنٹ پالومر کی دو سو انچ قطر والی دوربین کی مدد سے، جو دنیا میں سب سے طاقت ور دوربین ہے، اس کا عین مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابھی کائنات میں لاتعداد ایسے سدائم ہیں جو ابتدائی حالت میں ہیں اور کثیف تر جھرمٹوں کی شکل اختیار نہیں کر پائے ہیں۔ گویا سدائم بننے کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ یہ سارے سدائم متحرک ہیں اور بڑی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ اور دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ شاید اسی لئے سائنس داں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ کائنات پھیل رہی ہے۔

کہکشاں اور نظام شمسی

سدائم کے ان لاتعداد مجموعوں میں کم از کم ایک سدیم ایسا ضرور ہے جو رات کے وقت ہم کو خالی آنکھ سے بھی نظر آتا ہے۔ اس سدیم کو ہم لوگ کہکشاں کہتے ہیں۔ خالی آنکھ سے کہکشاں آسمان کے بیچوں بیچ ایک چوڑا سفید راستہ دکھائی دیتا ہے جیسے نور کا دریا بہہ رہا ہو اس لئے دوربین کی ایجاد سے قبل زمانہ قدیم میں کہکشاں کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی گئیں لیکن گلیلیو نے ۱۶۱۰ء میں دوربین ایجاد کر کے ان تمام قیاس آرائیوں کو باطل قرار دے دیا اور بتایا کہ یہ نور کا دریا دراصل کروڑوں اور اربوں ستاروں کا مجموعہ ہے۔ ہمارا سورج، کہکشاں کے انھیں اربوں ستاروں میں سے ایک معمولی سا ستارہ ہے۔

ستاروں کی تعداد کا صحیح تعین مشکل ہے۔ پھر بھی سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ صرف کہکشاں نامی سدیم میں ستاروں کی تعداد ایک کھرب ہے۔ سورج کے سوا باقی تمام ستارے زمین سے اس قدر دور ہیں کہ یہ چھوٹے چھوٹے روشنی کے نقطے معلوم ہوتے ہیں اس لئے کسی ستارے کے سائز کو صحیح طور پر بتانا مشکل ہے۔ لیکن ماہر فلکیات نے اس روشنی سے جو ستارے زمین پر ڈالتے ہیں ان کی سائز کی پیمائش کا ایک بلا واسطہ طریقہ نکالا ہے۔ صرف

چند ستارے ہماری زمین سے معمولی طور سے بڑے ہیں لیکن بیشتر ستارے ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک میں ہماری جیسی سیکڑوں ہزاروں زمینیں سما سکتی ہیں اور بعض ستارے تو اتنے بڑے ہیں کہ سورج جیسے سیکڑوں ستاروں کو نگل جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ یہ تو صرف کہکشاں نامی سدیم کے ستاروں کی بات ہوئی۔ ذرا تصور کیجئے کہ پوری کائنات میں جہاں کہکشاں جیسے کروڑوں سدائم موجود ہیں ستاروں کی تعداد کا کیا عالم ہوگا۔ یوں سمجھئے کہ زمین کے سمندری ساحلوں پر پڑے ہوئے ریت کے مجموعی ذرّوں سے بھی زیادہ۔ اتنے عظیم اور وسیع ستاروں کی اتنی بڑی تعداد کے باوجود مکان کی بیشتر جگہ خالی پڑی ہے۔ مکان کی خلا کا اندازہ آپ اس طرح لگا سکتے ہیں کہ اگر ایک ستارہ سائز میں ایک سمندری جہاز کے برابر ہوتا تو دو پڑوسی ستاروں کا درمیانی فاصلہ دس لاکھ میل سے بھی زیادہ ہوتا۔ قریب ترین ستارہ (سورج کے علاوہ) کی روشنی کو بھی زمین تک پہنچنے میں سوا چار سال لگ جاتے ہیں اور آپ جانتے ہیں روشنی کی رفتار کیا ہے؟ ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ۔ جب نزدیک ترین ستاروں کی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں اتنا عرصہ لگتا ہے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دور اور پھر دور ترین ستاروں کی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں کتنا عرصہ لگتا ہوگا۔ اسی لئے یہ کہنا درست ہے کہ بعض ستاروں کی روشنی ابھی تک ہماری زمین پر نہیں پہنچی ہے۔

ستارے اپنی جگہ پر قائم نہیں ہیں بلکہ ایک خاص رفتار سے حرکت کرتے رہتے ہیں۔ وہ چونکہ زمین سے بہت زیادہ فاصلے پر ہیں اس لئے ان کی حرکت کا صحیح اندازہ بہت مشکل ہے لیکن اتنا ظاہر ہے کہ ستاروں کی یہ حرکت بھی نیوٹن کے کلیے کے مطابق سیاروں کی حرکت کے مانند قوتِ کشش اور قوتِ مدافعت کے زیر اثر ہوتی ہے۔ ستارے حرکت کرتے ہیں تو گویا کہکشاں حرکت کرتی ہے۔ جب کہکشاں حرکت کرتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دوسرے سدائم بھی حرکت کرتے ہیں۔ کہکشاں کے دوسرے ستاروں کی طرح خود ہمارا سورج ... ۱۲ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ستارہ "نسرِ واقع" (Vega) کی طرف جا رہا ہے۔

اس سے قبل یہ بتایا گیا ہے کہ سدائم اور ستاروں کی بے اندازہ تعداد کے باوجود مکان زیادہ تر خالی ہے اس لئے دو ستاروں کا ٹکرانا یا ایک دوسرے کے نزدیک آجانا ایک نادر الوقوع واقعہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ان کا نظام بھی درہم برہم ہو جاتا ہے اور کوئی دو ستارے یا تو ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں یا ایک دوسرے سے نزدیک آجاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آج سے تقریباً دس ارب سال پہلے کم از کم ایک بار ایسا ہی حادثہ رونما ہوا ہوگا جبکہ ایک اجنبی ستارہ فضائے بسیط میں چلتے چلتے ہمارے سورج کے قریب آ گیا ہوگا ـــــ اس قدر قریب کہ اس کی قوتِ جاذبہ کا اثر سورج پر پڑنے لگا ہوگا اور سورج کی سطح پر ایک گیس کا پہاڑ سا بلند ہوا ہوگا ٹھیک اسی طرح جس طرح چاند کی کشش کی وجہ سے ہمارے سمندر میں مدوجزر اٹھتا ہے۔ جیسے جیسے اجنبی ستارہ قریب آتا گیا یہ پہاڑ بلند ہوتا گیا اور آخر کار ایک عظیم الشان ستون کی شکل میں اجنبی ستارہ کی طرف بڑھا اور پھر سورج سے الگ ہو گیا لیکن اتنا نہیں کہ اس کے اثر ہی سے بالکل نکل جائے۔ شروع شروع میں یہ ستون اپنے منبع سورج ہی کی طرح تاب کار گیسوں کے مادے پر مشتمل تھا لیکن کچھ عرصے کے بعد اس کے اندر کا مادّہ بتدریج منجمد ہونا شروع ہوا اور اس انجماد کے دوران میں اس کے الگ الگ ٹکڑے ہو گئے۔ سورج کے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لاکھوں کروڑوں سال تک اپنے کُل (سورج) کے گرد بڑے بے ڈھنگے انداز میں حرکت کرتے رہے ہوں گے کیونکہ اجنبی ستارہ کی قوت جاذبہ کا بھی اس پر کچھ اثر پڑ رہا ہوگا۔ کبھی ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے اور کبھی دور اور کبھی ایک دوسرے کے ساتھ اس زور سے ٹکراتے کہ آپس میں جُڑ جاتے۔ اس طرح بڑے ٹکڑے چھوٹے ٹکڑوں کو اپنے ساتھ ملا ملا کر چند بڑے اجسام میں بٹ گئے۔ اس وقت تک اجنبی ستارہ بھی دور جا چکا تھا اس لئے ان اجسام کا مدار جو پہلے بہت بے ڈھنگا تھا اب طویل بیضوی شکل اختیار کر گیا۔ پھر جب یہ اجنبی ستارہ بہت دور چلا گیا تو یہ تمام اجسام اُس اجنبی ستارہ کے حلقۂ اثر سے مکمل طور سے آزاد ہو کر صرف سورج کے حلقۂ کشش میں آ گئے اور ان کے مدار بھی رفتہ رفتہ دائرے کی شکل اختیار کر کے متعین ہو گئے۔ پھر یہ اجسام جو پہلے تاب کار گیسی مادّوں پر مشتمل تھے آہستہ آہستہ سرد پڑنے گئے اور بالآخر ٹھوس مادّوں کے گولے بن گئے۔ یہی گولے ہمارے نظامِ شمسی کے سیارے ہیں جو تعداد میں نو ہیں اور جن کے نام عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نیپچون اور پلوٹو ہیں۔ ان میں سے زمین ہمارا اپنا سیارہ ہے۔ سیارے کی روشنی اپنی روشنی نہیں ہوتی بلکہ

وہ سورج کی روشنی ہی کو منعکس (Reflect) کرتا ہے۔

چاند

ستاروں کا سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوگا بلکہ ان کے اپنے ستارے بھی پیدا ہوئے جنھیں ہم چاند کہتے ہیں اور جو تعداد میں ۳۱ ہیں۔ تقریباً تمام چاندوں کی پیدائش اسی طرح ہوئی جس طرح ستاروں کی۔ فرق اتنا ہے کہ ستارے سورج سے پیدا ہوئے اور چاند ستاروں سے۔ ہم جانتے ہیں کہ سب ستارے شروع شروع میں گیسی حالت میں تھے اور وہ سورج کے گرد نہایت طویل بیضوی راستے پر گردش کر رہے تھے۔ ہر دفعہ وہ سورج کے نہایت قریب سے ہوکر گذر رہے تھے۔ سورج کی کشش ان پر پڑتی رہی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے جسم سے بھی گیسی مادے کے کچھ شعلے پھوٹ پڑے مگر یہ شعلے بہ لحاظ جسامت ستاروں کے مقابلے میں بہت چھوٹے تھے اس لئے وہ ٹھیک اسی طرح ستاروں کے تابع بن گئے جس طرح ستارے سورج کے۔ ان ۳۱ چاندوں میں سے دو تین ستاروں کو چھوڑ کر سبھی ستاروں کو کچھ نہ کچھ چاند ملے۔ ہمارے زمین کے حصے میں بھی ایک چاند آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے زمین کے حصہ کا چاند سب چاندوں سے بڑا اور شاندار ہے اور یہی چاند ہمارا قریب ترین پڑوسی ہے۔

نظام شمسی کے نو ستاروں اور ۳۱ چاندوں میں سے کم از کم ایک ستارہ (زمین) پر زندگی پائی جاتی ہے جس کا انتہائی اور غالباً آخری نمونہ ہم انسان ہیں۔

جہاں تک کہکشاں میں زندگی کا تعلق ہے یقینی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں بھی زمین کی طرح زندگی پائی جاتی ہے۔ ابھی تک ہمارے مشاہدہ میں ایسی کوئی بات نہیں آئی ہے جس کی بنا پر ہم یہ دعویٰ کر سکیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم کو اپنے علم و فہم کی کم مائیگی کا بھی اعتراف کر لینا چاہیے کیونکہ ابھی تو ہم اپنے نظام شمسی کے دوسرے ستاروں کے بارے میں بھی ٹھیک سے آگاہ نہیں ہیں۔

بہرحال کائنات کے ارتقاء کے متعلق اب تک جو باتیں بتائی گئی ہیں مختصراً اس کے چھ مدارج قائم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) یکساں پھیلے ہوئے مادّے میں اتفاقیہ اختلال کی وجہ سے کثافت میں کمی بیشی ہوئی۔

(۲) اس کے نتیجے کے طور سے مادّے کے بڑے بڑے تودے سدیم کی صورت میں ایک دوسرے سے علاحدہ ہوکر فضا میں پھیلنے لگے۔

(۳) یہ سدیم بتدریج ستاروں کے جھرمٹ میں بدل گئے۔

(۴) ستاروں سے ستاروں کی پیدائش ہوئی۔

(۵) ستاروں سے ستارے یا چاند نکلے۔

(۶) کم از کم ایک ستارہ (زمین) پر زندگی کا وجود ہے۔ دوسرے ستاروں کے متعلق یقینی طور سے نہیں معلوم۔

لکھنؤ کے چند نامور شعرا

(سلسلہ صفحہ ۱۰)

دل جوئی کے خیال سے صرف بندہ روپیہ ماہانہ لینا قبول کیا تھا۔ دن بھر گھر میں بند رہتے تھے۔ صرف عصر کے وقت چار یا پانچ بجے مکان کا دروازہ کھولتے تھے۔ اُس وقت شاگردوں اور دوسرے لوگوں کو باریابی کی اجازت تھی۔ اگر کوئی خلاف وقت آتا تو انھیں بہت ناگوار ہوتا۔ چنانچہ ایک شخص نے کئی دفعہ خلاف وقت حاضر ہوکر لاطائل گفتگو سے شیخ کی سمع خراشی کی۔ شیخ بہت پریشان ہوئے۔ ایک دن اُس شخص کی موجودگی میں مکان کے پردوں میں آگ لگا دی۔ جب شعلہ بھڑکا تو وہ شخص بہت متحیر ہوا اور شیخ سے اس آتش زنی کا سبب پوچھا۔ شیخ نے فرمایا کہ "اب تو مکان بھی جل رہا ہے آپ یہاں کیونکر ٹھہر سکیں گے۔" یہ سن کر وہ شخص سخت شرمندہ ہوا اور پھر اُن کے یہاں خلاف وقت آنا موقوف کر دیا۔[۱] پھر ملا صاحب نے ناسخ کے مندرجہ اشعار بھی سنائے جو بقول اُن کے ناسخ نے ایک دن موسم برسات میں ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر لکھے تھے:۔

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی
اگرچہ آئی اور برسات پھول پھولے ہیں ہوئی شگفتہ طبیعت نہ ہم ملولوں کی

اُمید وصل میں ہم جھولتے ہیں برسوں سے
وہاں رقیبوں میں تیاریاں ہیں جھولوں کی

---

[۱] اس واقعے کو آزاد نے بھی آب حیات میں قدرے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

غزل

اثر انصاری

جیسے جیسے لب و رخسار کی یاد آتی ہے
زندگی نور کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے

ہر قبائے گلِ رنگیں مرے دامن کی طرح
چاک ہوتی ہے تو دیوانوں کے کام آتی ہے

تیز ہو جاتی ہے لَو شمعِ نفس کی اثر
جیسے سچ مچ ترے دامن کی ہوا آتی ہے

چور زخموں سے ہے، بوجھل غم و آلام سے ہے
زندگی چلتی ہے دو گام تو تھک جاتی ہے

بجھ گئے ہیں مرے اشکوں کے شرارے لیکن
نظریں ملتی ہیں تو اک شمع سی جل جاتی ہے

چارہ سازِ غمِ دل ہے وہ تری یادِ حسیں
درد بن کر مرے پہلو میں جو رہ جاتی ہے

مستیِ بادۂ سرجوش، الٰہی توبہ!
آنکھ کھلتی ہے تو پیمانے سے ٹکراتی ہے

یہی کیا کم ہے تری چشمِ عنایت اے دوست
گلِ مقصود سے دامن مرا بھر جاتی ہے

آج پھر بزمِ تخیل میں اُجالا ہے اثر
نگہِ حسنِ پشیماں مجھے یاد آتی ہے

راحت علی خاں نشتر

شکوہ سنجِ غمِ دل تھا خاموش
ہنس دیا ناز سے وہ رہزنِ ہوش

حیف! ساقی کہ ترے ہاتھ میں جام
اور محروم ہو ہم بادہ نوش

ساقیِ ہوش ربا کیا جانے
کون مے خانے میں بیٹھا ہے خموش

دَورِ انجم ہے بہت تیز خرام
آنکھ کیا دیکھے، سُنے کیا اب گوش

کارِ تعمیرِ جہاں ہے جاری
زندگی آج بھی ہے خانہ بدوش

ہیں کرشمے نگہِ ساقی کے
کوئی ہشیار نہ کوئی مدہوش

زندگی کیفِ مسلسل ہے نشتر
عالمِ عشق میں فردا ہے نہ دوش

غالب کی مثنوی ابرِ گہربار کی پہلی طباعت

مخمس سروری

مرزا غالب کی فارسی منظومات میں ابرِ گہربار ایک ایسی مثنوی ہے جو عجب عمدہ سمجھی جاتی ہے اور ناتمام ہونے کے باوجود طویل بھی ہے۔ یہ مثنوی ان کے کلیات میں موجود ہے۔ لیکن چونکہ غالب کی زندگی میں کلیات سے علاحدہ بھی چھپی تھی اس لئے تصانیف غالب کی فہرست میں اس کو بھی شامل کر لینا چاہیئے۔ چونکہ اس کی طباعت صرف ایک مرتبہ ہی عمل میں آئی تھی اس لئے اس کے نسخے اس وقت نایاب ہیں۔

غالب کے فارسی کلیات میں کل گیارہ مثنویاں ہیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۲۲۰۳ ہوتی ہے۔ ان میں دس مثنویاں تو نہایت مختصر اور ان کا موضوع مدحت و توصیف اور تقریظ و تقریب کے علاوہ کچھ نہیں۔ سب کے آخر کی مثنوی ابرِ گہربار ہے اور جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے یہ مثنوی ناتمام ہونے کے باوجود طویل بھی ہے۔ اس کے اشعار کی تعداد گیارہ سو سے زائد ہے اس کا یہ مطلب ہوا کہ بقیہ دس مثنویوں کے اشعار تعداد کے لحاظ سے اس ایک مثنوی کے بھی برابر نہیں ہوتے۔

ابرِ گہربار میں غالب شاہنامۂ فردوسی اور سکندرنامۂ نظامی کے رنگ میں غزواتِ نبوی کو منظوم کرنا چاہتے تھے لیکن وہ مثنوی کے ابتدائی ابواب ہی سے آگے نہ بڑھ سکے۔ حمد و مناجات، حکایت، نعت و بیان معراج، منقبت مغنی نامہ اور آخر میں ساقی نامہ کے بعد مثنوی ادھوری رہ گئی۔ غالب کی یہ مثنوی اگر ان کے ارادے کے مطابق مکمل ہو جاتی تو یقیناً ان کا یہ بھی ایک زبردست ادبی کارنامہ ہوتا۔ جس قدر بھی وہ لکھ سکے ہیں اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر پورے خلوص اور دل کی گہرائیوں سے قلم اٹھایا تھا لیکن زمانے نے اور خود ان کے خانگی حالات نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ اس ناتمام مثنوی کو تمام کرتے۔ میں اس موقع پر یہ بھی کہوں گا کہ غالب نے یہ کام نہ جانے کس ترنگ میں شروع کیا تھا ورنہ وہ جس طبیعت کے شاعر تھے اور ان کے مزاج میں جو لاابالی پن تھا اس کے لحاظ سے مثنوی کے تلازمات و تکلفات کا بار اٹھانے کے وہ ہرگز قائل نہ تھے۔ اتنی بڑی مثنوی کو پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے لئے بڑی عالی نگاہی اور وقت کی ضرورت تھی۔ غالب کے پاس یہ دونوں چیزیں مفقود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ حمد و نعت اور منقبت و مناجات میں وہ عام قاعدے سے ہٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور اکثر جگہ عجز و انکسار کے بجائے شاعرانہ تعلی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن جذبات و خیالات کی بلندی، قدرتِ بیان، اور مضامین نو کے انبار بھی اس مثنوی میں موجود ہیں۔

مناجات کے ذیل میں زمانے کی شکایت اور اپنی ناقدری کا شکوہ خدا کے حضور میں یوں پیش کرتے ہیں۔

ہر آئینہ مارا کہ تر دامنیم   ز دیوانگی ما خرد دشمنیم

ز آلودگیہا گرانی بود   ہمہ سختی و سخت جانی بود

ز ہر شیوہ ناسازگاری رسد   ز ہر گوشہ صد گونہ خواری رسد

کہ چوں شعلے ما ساقی آرد ہیچ   نیابیم جز گردش از جام ہیچ

حکایت میں بھی شکوہ و شکایت کا عنصر غالب ہے، البتہ پیرایۂ بیان

اور طرزِ نگارش نے داستان گوئی کے حسن میں ایک نئی قسم کی رنگ آمیزی کی ہے۔
اس کے بعد نعت کا حصّہ شروع ہوتا ہے۔

محمّد کز آئینۂ روئے دوست   جو بینش بداست دانا کرا دست
زہے روشن آئینۂ ایزدے   کہ دروی گمحیدہ زنگِ خودے
زواز سال پردۂ بر زدہ   ز ذاتِ خدا بجکرِ سر زدہ
تماشے دیرینۂ کردگار   لوی اردار جویش امید وار
تن از نور یا بودہ سرچشمۂ   دلے ہمچو مہتاب در چشمۂ
ہر جام از تشنۂ جرعہ خواہ   ہر گام از دسحر سر راہ
کلامش بدل در فرود آمدن   ز دم حستہ بیتی نزد آمدن
بدستش کشاد قلم نار سا   بگلکش سواد رقم نارسا
برفتار صحرا گلستاں کمی   بگفتار کافر مسلماں کمی
بدنیا ردیں رو ستائی دہی   بعقبیٰ ز آتش رہائی دہی

اس کے بعد ذکر رسول اکرم کے ذیل میں معراج کا بیان لکھی ہے۔ رسول اللہ کا عرش پر عروج، سات آسمانوں کی سیر نور السمٰوات والارض تک عرفان د رسائی، یہاں غالب نے بستر کی گرمی اور واپسی پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملاقات کا جس طرح ذکر کیا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عام مسلمانوں کی طرح وہ بھی جسمانی معراج پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے قلم مدحت رقم کو حضرت علی کی تعریف و توصیف کے لئے جنبش دی ہے۔

علی راست بعد از نبی جائے او   ہماں حکم کل داد دا جرائے او
ہمانا بس از خاتم المرسلیں   بود تا بہ مہدی علی جانشیں
نژاد علی با محمّد یکیست   محمّد ہماں تا محمّد یکیست
ازیں نغمہ کانیک رہ ہوش زد   بدل دوق مدحِ علی جوش زد
ز کویش بگلشن سخن می کنم   ستم بر گل و نسترن می کنم
ز لطفش بگفتار جواں می نہم   سخن را سکر در دہاں می نہم
ز لطفش بہستی خبر می دہم   برنگ رواں دجلہ سر می دہم
علی آں زدوشِ نبی رفر فش   علی آں ید اللہ را کف کفش

اس منقبت کے آخری حصے پر پہونچ کر غالب نے اپنے متعلق یوں لکھا ہے۔

چہ کاہد ز بیزولے گرداں سپہر   چہ کم گردد از جوئی ماہ و مہر
کہ دل خستۂ دہلوی مسکنے   ز خاک نجف باشدش مدفنے

خدایا بدیں آرزویم رساں   ز اشکِ من آبی بکویم رساں
نفس در کشم حالے گفتار نیست   تو دانی و ایں از تو دشوار نیست

اس حصے کے بعد ہی مغنی نامہ شروع ہوتا ہے، جس میں غالب مغنی کو آواز دیتے ہیں، اس کے وہ اشعار کافی اثر انگیز ہیں جن میں مغنی سے کہتے ہیں کہ میری روح میں جو جوہر شعر چھپا ہوا ہے تو اسے اپنے نغمۂ دل فرزند کن جاں پرور سے چمکائے۔

مغنی نامہ کے بعد ساقی نامہ ہے جس پر مثنوی ابر گہربار ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں بھی زمانے کی شکایت اور ناقدریٔ فن کا تذکرہ موجود ہے۔ ساقی نامہ اس شعر پر جاکر ختم ہو جاتا ہے ؎

ترا بخت در کار یاری دہاد
بہ پیوند دیں استواری دہاد

یہ مثنوی صرف ۴۲ صفحات میں چھپی تھی۔ سرورق پر نہایت خوبصورت خط میں مثنوی ابر گہربار لکھا گیا ہے۔ کتاب کے نام کے اوپر ایک سطر میں مصنف کا نام یوں لکھا گیا ہے:-

"از تصانیف افصح الفصحا، نجم الدولہ، دبیر الملک، نواب اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب"

اور کتاب کے نام کے نیچے یہ عبارت درج ہے:-

"بکمالِ تصحیح کہ ہر صفحہ بہ نظر مصنف گزشتہ بسعی سید فخر الدین"

پھر سب سے نیچے جلی حروف میں مطبع کا نام ہے:-

"در مطبع اکمل المطابع واقع اندرون شہر دہلی طبع شد"

کتاب کے شروع میں مصنف کا دیباچہ بھی شامل ہے جو صفحہ ۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۲ کے نصف پر جاکر ختم ہوتا ہے۔ اسی صفحہ ۲ سے مثنوی (ابر گہربار شروع ہوتی ہے جو صفحہ ۳۵ پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد چھوٹے چھوٹے دو قصائد لارڈ ایلگن اور جان لارنس کی شان میں ہیں اور دو قطعات گورنر وقت اور منٹگمری کی مدح میں درج ہیں۔ پھر چار بیت کا ایک اور قطعہ ہے جو اجمیر میں میر سعادت علی کی مسجد و چاہ کی تعمیر سے متعلق ہے۔ آخر میں دس رباعیات ہیں۔ چونکہ غالب کی یہ تمام منظومات "سبد چین" (طبع جدید۔ مکتبہ جامعہ ۱۹۳۸ء) میں موجود ہیں، اس لئے ان کے متعلق کچھ اور تحریر کرنا بے فائدہ ہے۔

اصل کتاب صفحہ ۳۹ پر ختم ہو جاتی ہے۔ صفحہ ۴۰ پر ۱۲ سطروں کی تقریظ ہے جس کو خود مرزا غالب نے تحریر کیا ہے۔ اس تقریظ میں بیان کیا گیا ہے کہ فارسی کلیات کی طباعت کے بعد حکیم غلام رضا خاں نے مثنوی (ابر گہربار) کو علاحدہ چھاپنے کا اہتمام کیا۔ تقریظ کے بعد نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب، مرزا قربان علی بیگ سالک، مرزا ارشاد علی بیگ رضوان اور مرزا یوسف علی خاں عزیز کے قطعات تاریخ فارسی میں اور دو شعر کا ایک قطعہ مرزا باقر علی خاں کامل کا اردو میں ہے۔ ان قطعات کا مادہ تاریخ ۱۲۸۰ھ ہے صفحہ ۴۱ پر دو کالم کا غلط نامہ ہے، جس کی پیشانی پر "صحیح نامہ مثنوی (ابر گہربار)" لکھا ہے۔ اس صحیح نامہ کے دوسرے کالم کے نیچے کسی قدر جلی خط میں یہ عبارت ہے:-

استہار

اس کتاب کو بے اجازت حضرت مصنف مدظلہ اللہ تعالےٰ کے کوئی صاحب بقصد انطباع نہ فرماویں۔ فقط

طباعت غالب کی تمام تصانیف ان کی زندگی میں طبع ہو چکی تھیں اور یہ تصانیف کن چھاپہ خانوں اور کس کے زیر اہتمام طبع ہوئیں، ان کا حال خود غالب کے خطوط سے معلوم ہو جاتا ہے۔ لیکن مثنوی (ابر گہربار) کی طباعت اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفۃً یا قیمتاً بھیجنے کے سلسلے میں وہ اپنے خطوط میں بالکل خاموش ہیں[1]۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے اس کی طباعت کو چنداں اہمیت نہ دی اور چونکہ یہ مثنوی کلیات میں شامل تھی ہی اس لئے اس کا ایک دوسری تصنیف کی صورت میں چھپنا بے معنی سی بات تھی

مطبع اکمل المطابع اور اس میں کام کرنے والے چاروں اشخاص سے غالب کو ایک تعلق خاطر تھا۔ چنانچہ منشی بہاری لال مشتاق کو وہ لکھتے ہیں۔

"بہاری لال! اس نونہال باغ دولت یعنی غلام رضا خاں کی دوام صحبت کو اپنے طالع کی یاوری سمجھو۔ یہ دانش مند ستودہ خو امیر نامور ہونے والا ہے اور مراتب اعلیٰ کو پہنچنے والا ہے۔ اس کی ترقی کے ضمن میں تمہاری بھی ترقی ہونے والی ہے۔ میاں! سچ تو یوں ہے کہ اکمل المطابع اجمل المطابع ہے۔ حکیم غلام نبی خاں خلاصۂ خوبان روزگار ہیں۔ نکو خوئے نیکو کردار ہیں۔ میر فخر الدین آزاد منش اور سعادت مند نوجوان ہیں۔ کم گفتار اور مرنجاں و مرنج ہیں۔ تم چاروں شخص پیکر صدق و صفا و مہر و ولا کے چار عنصر ہو۔ جہاں آفریں تم چاروں صاحبوں کو خوشنود و دل شاد اور اکمل المطابع کو بارونق اور آباد رکھے"

(اردوئے معلی ص ۳۸۲)

ان مراسم کے پیش نظر یہ خیال ہوتا ہے کہ مرزا غالب اپنے مشفقانہ جذبات سے مغلوب ہو کر غلام رضا خاں کی گزارش کو رد کر سکے اور انھیں مثنوی چھاپنے کی اجازت دے دی۔ اور چونکہ بہرحال یہ ان کی تصنیف تھی اس لئے اس کی تصحیح کی زحمت بھی گوارا کی۔

دیباچہ:- اس کتاب پر غالب نے جو دیباچہ لکھا ہے، اس میں کوئی غیر معمولی بات تو نہیں، لیکن چونکہ غالب جیسے نامور اور یگانۂ روزگار شاعر کی تحریر ہے، اس لئے اس کو یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"نامیزد سخن در سپاس گزاری سدار فیاض است دنجفا نشہائے سترگ و بخششہائے شگرف شمردہ می شود گمان خود تائی را در باریں روایت مبادی نتری بخشندہ ند۔ دیدہ وران را از دیدہ جلا فرودآئی را نظمے دادہ اند سخن گستران را دل از سینہ بیرون بر چوں خواستند کہ

---

[1] نواب علاؤ الدین احمد خاں نے "ابر گہربار" کا ایک نسخہ طلب کیا تو اس کے جواب میں غالب اپنے ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ کے خط میں تحریر کرتے ہیں "اے میری جان! مثنوی (ابر گہربار) کون سی فکر تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا۔ کلیات میں موجود ہے۔ مرزا شہاب الدین خاں نے بھیجدی، میں کر رکیا بھیجتا" اس کے علاوہ (احوال غالب) میں ایک حوالہ یہ بھی ملتا ہے کہ ۱۲۸۵ھ میں جب حقیر بلگرامی نے مارہرہ سے عریضۂ شاگردی کے ساتھ دو فارسی غزلیں اور دو اردو غزلیں غالب کی خدمت میں ارسال کیں تو آٹھ دن کے بعد غالب نے جواب خط کے ساتھ ابر گہربار کی ایک جلد بھیجی تھی۔ میرے خیال میں خطوط غالب یا غالب کے نام کے کسی اور کے خطوط میں اس مثنوی کا کوئی چرچا نہیں (تسنیم مورتی)

قوت ناطقہ بدیں آخوا سفے بکر کہ بہ اسد اللہ غالب تا موراست پیوند پذیر دہ پرورش نمک طرز عرفی شیرازی و آمیزش شکر ادائی نظیری نیشاپوری شور انگیزی و گلو سوزی حسن برشتہ آں شاہد معنی افزود نہ غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی را در فرجام کش و دل کش لفظ و معنی کار از آں گزشت کہ دیگرے را در اندیشہ گزرد ہیچ بہ نشتن مثنوی دلنشیں افتاد فردوسی طوسی رابہ رہنمائی و نظامی گنجوی رابہ نیرو فزامی گماشتند و ضمیر ند و اثر پذیرمن چناں فزود آمد کہ عزوامت خدا و ند دنیا و دیں حضرت امام المرسلین سلام علیہ من رب العالمین بہ بند نگارش اندر آرم توحید مناجات و منقبت و ساقی نامہ و معنی نامہ بپیدائی پذیرفت باچہ مانی وخبا گر بیا سخنہائے دلا ویز و مہر انگیز گفتہ آمد تزہ در مناجات بہ شیوۂ ابداع بدان سان رہداد و للہ الحمد کہ سخن سرودہ شد کہ سروشان بہشتی رالب از شور ہا یا ہوی بجنبانند و در بارۂ معراج عروج فکر آں پایہ یافت کہ سخن از جائیکہ میرفت ہم ہما نجا رسید گفتار بنا شناسا کہ بہ ترہات پارسی گویان ہند خو گرفتہ اند و آنرا بہ بہائے گراں میفروشند ہمیخر ند من خدا داد نطق مرا چوں جنید داد آسنت کہ دریں گروہ فرع جوہر شناسیں ہمگنان بہ یک انداز ہنیست تا ہمہ ہیچ میس باشند بلکہ من خود در نوردکلام کردن نکتہ ہائے باریک تراز موی بخنداں گم گشتہ ام کرکس را در نظر تو ام آمد مثنوی (ابر گہر بار) نام نہادہ بودم ہمانا آں امینی میغ ہماں قطرہ فشانے کرد و دجلہ ریز نسد دینا فتن تو ہیق داستان طرازی ببیبے وارد عام کہ در قلمرو ہند از نہ ہی در دستاق ودانا و نادان و پیر و جوان کم کس باشد کہ آنرا انداز حقا کہ ایں سیرنگ آسمانی کہ در صورت سرکشتی سیاہ بظہور پیوست ورقہا روان و در رندہا روان توانگراں را زر در خزانہ و سخن وراں را سخن مدد مان گزاشت نانگار پیر ہفتاد سالہ در نجور و غمزدہ و دل فگار از زیستن بیزار و مرگ ناگاہ یعنی چہ مرحلۂ دشوار گزار بین ایستن و اشبعین بیابان رسد گوئی شب عمر سر آمد و سفیدۂ صبح کفن در دمیدنست ؎

وقت آنست کہ از خواب گراں برخیزم

پائے در رہ نہم و از سر جاں برخیزم

ہر آئینہ بعد مردن دعائے آمرزش بکو دہیتم داشتہ بدنیقد رخشنود م کہ ہیچ گاہ یا دم نیارند زمن خود بداں تیزرم کہ غم مرگ من خورند و مرا یاد آورند عبارت را دریں دو بیتی انجام میدہم و خامہ از دست دیندار سمتوری از سر می نہم ؎

گویند جہانیاں در رو مندگی گوئے

گر بد منکوہ و زنگویندگی گوئے

ہر چند کہ بد زیستم و بد مردم

بیکاں پس مردہ بد نگویندگی گوئے

کتاب کے آخر میں جو تقریظ اور تاریخی قطعات ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

تقریظ۔ "در انجام ایں نظم نظامی نظام ہم از جانب غالب مستہام بسر انگشت خامۂ مشکفام سوئے ایں اشارت بشارت میرود کہ دریں زماں سرا سر امن و اماں کہ ہر گاہ از مغفرت لفظ تم بہ تقدیم میم کہ معنید معنی اتمام است بر آورند شمارۂ سال حال زیبا ترین صورتے بر آید سعادت و اقبال نشان حکیم غلام رضا خاں ابن عالیجاہ حکیم مرتضیٰ خاں ابن فرزانۂ یگانہ حکیم محمد صادق علی خاں مرحوم مثنوی (ابر گہر بار) را پیرایہ انطباع ارزانی داشت و دو قصیدہ و چند قطعہ و رباعی کہ پس از طبع کلیات پارسی از مبداء فیاض بمن حوالت رفتہ بود بر سواد آں نگارش افزود فاتحہ و خاتمہ از تحریرات از آنجا کہ بانیائے وی عقیدتی داشتم و با پدرش محبتے دارم و نیز نقش ہو الاول و ہو الآخر کہ نظر گاہ اہل وحدتست اینجا کرسی می نشست نگاشتن ہر دو نثر صورت بست کار فرما را بہ روائی ایں خواہش شادی کار گزار را از بند کاہش آزادے روزی باد"

قطعات

اب قطعات ملاحظہ ہوں۔

قطعہ تاریخ طبعزاد خان عالیشان نواب شہاب الدین احمد خاں بہادر مرحوم

دمیکہ ابر گہر بار منطبع گردید — رخش سعی رضا خاں دفتر اقبالش

ز سال طبع چو کردم سوال ثاقب گفت — ز روئے فضل بود شمع معرفت حالش

ایضاً

چو ابر گہر بار شد منطبع — ز ثاقب شنو حسن فرجام آں

کہ جمعش زہے نظم سحرآفریں داناز ہمین است تاریخ اتمام آں

قطعہ تاریخ مرزا قربان علی بیگ خاں سالک ابن نواب عالم بیگ خاں مرحوم

زہے نظم دبیر الملک غالب کہ از ہر حرف او حسنے است پیدا

بیاضش لوں بیاض صبح امید سوادش در دل مردم سویدا

بجستم سال طبع از رہ الہام سروشے گفت "نظم عقل افزا"

۱۲۸۰ھ

قطعہ تاریخ مرزا تمشاد علی خاں ابن نواب عالم بیگ خاں مرحوم

اگر مشتاق اسرار من آئے نام حق سرائیہائے غالب

سخن شد رہ ؤ جادہ راز سر رنیض جانفزائیہائے غالب

بہا نیزد زہے ابر گہر بار سے جادو نوائیہائے غالب

آں نازک خیالی در بلاغت بہیں سکیں سیائیہائے غالب

جو سدہ مطبوع عنوان سال طبعش گو بہر تماشا ہائے غالب

۱۲۸۰ھ

— قطعہ تاریخ سراج الشعرا سلطان الذاکرین میرزا یوسف علی خاں عزیز

بخوبی چو ایں مثنوی طبع گردد کہ ہر حرف دلفظش ستائش سزاوار

ز افکار عالب علی کل غالب رشد جون خطوط شعاع مو دار

عزیز ایں جنیں مصرع سال گفتہ شدہ باز سے مطبوع ابر گہر بار

— قطعہ تاریخ مرزا باقر علی خاں کامل

ہوئی جب منطبع ابر گہر بار ہوئے احباب جان و دل سے طالب

ندا غیب سے کامل کو آئی یئے تاریخ کہہ دے "رمز غالب"

۱۲۸۰ھ

سرورق : مثنوی ابر گہر بار کے اس نسخے کا سرورق اس وقت کے رواج کے مطابق نقش و نگار سے مزین ہے اور اس کی خوبصورتی اور جاذب نظر تزئین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی معمولی مصور کی کاوش نہیں ہے بلکہ اس زمانے کے کسی نامی فنکار نے اس سرورق کو سنوارا ہے۔ اس کے بیل بوٹے فن کار کی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس طرح کتاب کے اندر لوح کے بنانے میں بھی مصور نے بڑا کمال دکھایا ہے، لیکن افسوس کہ مصور کا نام نہیں معلوم ہے۔ مختارالدین احمد صاحب (احوال غالب میں لکھتے ہیں کہ دہلی کے دو ہی مصور ایسے تھے جن سے غالب اپنی کتابوں کے سرورق کی تزئین کا کام لیتے تھے، ایک محمد افضل دوسرا محمد خدا بخش لیکن ابر گہر بار کے مصور کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ ممکن ہے انھیں دونوں میں سے کوئی ایک ہو اس کی تحقیق کرنا میرے لئے امر محال ہے۔

فرہنگ ابر گہر بار کے اس نسخے کے حاشیے پر غالب نے بعض لفظوں اور اصطلاحوں کے معنی و مطالب بھی لکھے ہیں۔ سبد چین اور دستنبو کی فرہنگوں کی طرح اس فرہنگ میں بھی بعض لفظوں کے معنی اردو میں ہیں۔ چونکہ یہ فرہنگ دوسرے مجموعوں میں نقل نہیں ہوئی اس لئے اس کا یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کشتی	خوشی	ملاگ	شمسیر
رایج	سورھٹی کی نشادی	اینت	زہے دہے
بسیج	قصد	صناگر	مطرب
:	سیار	شاخابہ	اس نہر کو کہتے ہیں جو کسی
تیر	اسم عطارد		دریا میں سے کاٹ کر
دستان	دل فریب آواز خوش		جاری کریں
جمالی	ساقی	فرگاہ	بارگاہ
دیزہ	خصوصاً	زنہاری	سامن
بندار	داروغہ توشہ خانہ	جشن سدہ	نام جشنے کہ پارسیان آورند
کلادہ کردن	جمع کردن		قوس کند
ایمنی	حقیقی	بنگ	مخفف فرہنگ
میغ	ابر	تاری	مخفف تاریک
فرتاس	قدرت وکرامت	شکوہ	بدگوئی
ازدر	لائق	پیشرو	الاپ
دوروزسے	تندرستی	ایوار	سفر روز
تبل	سست وکاہل	مرغولہ	کنگری
وہ	ڈالک ترنگ کے نیچے رکھتے ہیں	جادہ	چال
راہیدہ	خوب و نیک	برمی	صدقہ و قربان
جادو گردش	انقلاب	کسائی	شخصیت
اصطکاک	آواز کشودن	درود	صاحب [illegible]
سخن	ورد کردن		
رہی	غلام	سرادن جانے	حالی [illegible]

گاندھی جی

بدر جمالی

(۱)

اعتبارِ نظر بدل ڈالا!
رنگِ ہر رہ گزر بدل ڈالا
تیری انسان دوستی نے یہاں
نظمِ شام و سحر بدل ڈالا

(۲)

صلح اور آشتی ترا مسلک
اور بشر دوستی ترا ایماں
تجھ سے انسانیت عروج پذیر
تجھ سے پائندہ عظمتِ انساں

(۳)

زندگی سے تجھے محبت تھی!
آدمی سے تجھے محبت تھی
عام تیرا خلوص تیرا کرم
ہر کسی سے تجھے محبت تھی

(۴)

متزلزل ترے ارادوں سے
قصرِ تخئیلِ جابرانِ فرنگ
کس قدر جلد ہو گئے مسحور!
تیرے نغموں سے ساحرانِ فرنگ

(۵)

تیری بے باکی اور حق گوئی
عزم و ہمت کی زوردار دلیل
رہروِ منزلِ خودی کے لیے
ظلمتِ شب میں نور کی قندیل

(۶)

ترا نقشِ قدم چراغِ راہ!
عزمِ منزل کو دعوتِ تگ و تاز
مرغِ محبوس میں ہوئی پیدا
خود بخود آج جرأتِ پرواز

(۷)

آج بھی راج گھاٹ کے ذرّے
دے رہے ہیں پیامِ بیداری
اُٹھو آگے بڑھو، بڑھے جاؤ!
تا بہ کے شیوۂ نگوں ساری

(۸)

یہ زمانہ بہت غنیمت ہے
قدر ہر لمحۂ بہار کرو!!
جس پہ باپو تھے گامزن تم بھی
پھر وہی راہ اختیار کرو

(۹)

تیرگی کا طلسم ٹوٹ گیا!!
اِن اجالوں کو اور عام کرو
حوصلہ، عزم اور یقیں لے کر
دوستو! خدمتِ عوام کرو

اتر پردیش کے جنگلات سے متعلّق صنعتیں

ریاست اتر پردیش کے جنگلات کی خاص پیداوار عمارتی لکڑی اور ایندھن ہے۔ عمارتی لکڑی سال، چیر، دیودار اور اسنا کے درختوں سے حاصل ہوتی ہے جس کا معتدبہ حصّہ محکمۂ ریلوے کو سلیپروں کی صورت میں مہیا کیا جاتا ہے۔ چیر سے رال بھی پیدا کی جاتی ہے اور شیشم کی لکڑی عام طور سے فرنیچر تیار کرنے کے کام آتی ہے۔ سیمل اور گیتنل سے دیا سلائی کی تیلیاں تیار کی جاتی ہیں بید سے زنجیر اور ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ ریاست کے جنگلات میں دواؤں کے لیے جڑی بوٹیاں بھی وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں۔

بڑے اور درمیانی درجے کی ایسی صنعتوں کے قیام کا آغاز جن کا تمام تر انحصار جنگلات کی پیداوار پر ہے ۱۹۱۹ء سے ہوا جب کہ بریلی کے قریب کلٹر بک گنج میں رال اور تارپین کی فیکٹری قائم کی گئی۔ اس کے علاوہ کلٹر بک گنج میں بابن فیکٹری اور عزت نگر میں کتھا کی فیکٹری قائم کی گئی۔ بعدازاں دیا سلائی فیکٹری اور پلائی ووڈ فیکٹریوں کا بھی قیام عمل میں آیا۔

رال اور تارپین ملک میں رال اور تارپین کی مجموعی پیداوار کا نصف حصہ اتر پردیش میں پیدا ہوتا ہے کلٹر بک گنج کی رال اور تارپین کی فیکٹری میں تقریباً ۳۵۰ اشخاص کام کرتے ہیں جس میں تقریباً دو لاکھ من رال اور ۴ لاکھ ٹن تارپین سالانہ تیار کی جاتی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں اس فیکٹری میں ۵۰،۸۰ لاکھ روپے کی مالیت کی ۱۸۶۵۲۳ من رال اور ۱۲۰،۱۱ لاکھ روپے کی مالیت کا ۲۰۸۱۳۰ گیلن تارپین تیار کیا گیا۔ فیکٹری کی مزید توسیع کے بعد رال اور تارپین کی پیداوار میں ۵۰ فی صدی اضافہ ہو جانے کی امید کی جاتی ہے۔

حال ہی میں بعض چھوٹے چھوٹے واحدوں کا قیام عمل میں آیا ہے جن میں دو بریلی میں ایک الموڑہ میں اور ایک ایک واحدہ کوٹ دوار اور رشی کیش میں واقع ہے۔

دیا سلائی کی صنعت۔ کلٹر بک گنج کی ویسٹرن انڈیا میچ کمپنی لمیٹڈ ریاست میں بڑے پیمانے کی دیا سلائی کی واحد فیکٹری ہے جس میں تقریباً ۷۰۰ اشخاص کام کرتے ہیں ۱۹۵۸ء میں اس فیکٹری میں ۳۹۵۶۹۰۰ روپے کی مالیت کی دیا سلائیاں تیار کی گئیں جس کے لیے سیمل کی ۹ لاکھ مربع فٹ لکڑی استعمال میں لائی گئی۔

کتھا اور کچ کی صنعت۔ اتر پردیش میں اس وقت کتھے کی تین فیکٹریاں ہیں جو عزت نگر، ہلدوانی اور نجیب آباد میں واقع ہیں۔ ان تینوں فیکٹریوں میں تقریباً ۱۵۵ اشخاص کام کرتے ہیں۔ صرف عزت نگر کی فیکٹری میں ۱۲ لاکھ روپے کی مالیت کا ۵۰۰ ٹن کتھا تیار کیا جاتا ہے اس کے علاوہ ہلدوانی کی فیکٹری میں ۳۵ ٹن کتھا اور ۱۴۰ ٹن کچ اور نجیب آباد کی فیکٹری میں ۱۳ لاکھ روپے کی مالیت کا ۱۰۰ ٹن کتھا اور ۳۰۰ ٹن کچ سالانہ تیار ہوتا ہے۔

ان جنگلاتی علاقوں میں جہاں کھیر کے درخت فروخت کیے جاتے ہیں کتھا تیار کرنے کی گھریلو صنعتیں ہیں۔ یہ کتھا فیکٹری میں تیار ہونے والے کتھے سے کچھ کم درجے کا ہوتا ہے۔

کاغذ کی صنعت۔ ریاست میں کاغذ کی دو ملیں ہیں۔ ایک اسٹار پیپر ملس سہارن پور اور دوسری اپر انڈیا کوپر پیپر ملس لکھنؤ ہے ۱۹۵۸ء میں دونوں ملوں

میں ۴۴۳۱ اشخاص نے کام کیا اور تقریباً ۸۵۰۰ ٹن کاغذ تیار کیا گیا۔ سہارنپور کے مل میں توسیع کی جارہی ہو اور وہاں جلد ہی ڈرافٹ پیپر تیار ہونے لگے گا۔

کالپی (ضلع جالون) میں ہاتھ سے بنا ہوا کاغذ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک گھریلو صنعت ہے جس میں تقریباً چار سو دست کاروں کے کنبے کام کرتے ہیں۔

پلائی وڈ کی صنعت۔ اُتر پردیش میں ایک بڑے پیمانے اور دو چھوٹے پیمانے کی پلائی وڈ کی فیکٹریاں ہیں۔ سیتاپور کی فیکٹری میں جو اس قسم کی ریاست میں سب سے بڑی فیکٹری ہے ۱۵ لاکھ مربع فیٹ پلائی وڈ سالانہ تیار ہوتی ہے۔ پلائی وڈ کی دو چھوٹی فیکٹریاں نجیب آباد اور جوالا پور میں ہیں۔

بابھ کی صنعت۔ کلٹر بک گنج میں ۱۹۱۹ء میں بابن کی ایک فیکٹری قائم کی گئی تھی جو ۱۹۵۳ء میں خام مال کی گرانی اور پرانی مشینوں کے باعث بند ہوگئی تھی۔ اس فیکٹری کو دوبارہ چلانے کے اقدامات کیے جارہے ہیں اور اُمید ہے کہ تیسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران اس میں مال تیار ہونا شروع ہوجائے گا۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتیں

آرائیں اور فرنیچر کی صنعت۔ ریاست میں آرائیں زیادہ تر بخی حلقے میں ہیں اور ریاست بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ فرنیچر کی صنعتیں تمام ریاست میں قائم ہیں۔ ان صنعتوں کے اہم مرکز بریلی، دہرہ دون اور الٰہ آباد ہیں محکمہ صنعت کی جانب سے بریلی میں لکڑی کے کام سے متعلق ایک تربیتی مرکز قائم ہے جہاں اس صنعت میں لگے ہوئے اشخاص کو تربیت دی جاتی ہے۔

لکڑی پر نقاشی۔ لکڑی پر نقاشی کے کام کے خاص مرکز سہارنپور اور نگینہ میں جہاں سگریٹ کے بکس، چائے کی کشتیاں، میزیں، کتابوں کی الماریاں وغیرہ تیار کی جاتی ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں اس صنعت کے ۱۲ واحدے تھے جن میں ۱۳۰۰ اشخاص کام کرتے تھے۔ لکڑی سے کھلونے تیار کرنے کی گھریلو صنعتوں کے اہم مرکز وارانسی اور امروہہ میں واقع ہیں۔

لکڑی کو پختہ کرنے کا کام: پختہ عمارتی لکڑی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے حال ہی میں بریلی، الٰہ آباد میں ایک ایک مشین لگائی گئی ہے۔

کھیل کود کے سامان کی صنعت۔ ریاست میں میرٹھ میں جو کھیل کود کے سامان کی صنعت کا سب سے بڑا مرکز ہے تقریباً ۸۷ واحدے قائم ہیں۔ ان واحدوں میں ۱۵۰۰ اشخاص کام کرتے ہیں۔ یہاں ۱۹۵۸ء میں ۳۲ لاکھ روپے کی مالیت کا کھیل کود کا سامان تیار کیا گیا۔

بیڑی سازی کی صنعت۔ اتر پردیش میں بیڑی سازی کی صنعت کے اہم مرکز الٰہ آباد، مرادآباد، وارانسی، جونپور، فرخ آباد، جھانسی، اعظم گڑھ، مرزاپور، باندہ، غازی پور اور بلیا ہیں۔ جہاں ۳۷۰۰۰ اشخاص کام کرتے ہیں۔ اس صنعت پر تقریباً ۷ لاکھ روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ بیڑیوں کی زیادہ تر کھپت ملک ہی میں ہوتی ہے۔

چمڑہ کمانے کی صنعت۔ کانپور میں چمڑہ کمانے کے ایک بڑے واحدہ کے علاوہ ریاست میں چمڑے کمانے کا کام گھریلو صنعت کے طور متعدد جگہوں پر کیا جاتا ہے۔ اس میں ببول کی چھال اور ہڑ استعمال کی جاتی ہے۔

بانس اور بید کی صنعت۔ بانس اور بید کا سامان جنگلات سے ملے ہوئے ایسے علاقوں میں تیار کیا جاتا ہے جہاں بانس اور بید کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ شہروں میں اس کے بڑے مرکز بریلی اور الٰہ آباد ہیں۔

رسّی بنانے کی صنعت۔ جنگلات کے قریب کے مقامات میں گھاس اور بیل سے رسّی تیار کی جاتی ہے۔ ان جنگلاتی گھاسوں اور بیلوں سے ٹوکریاں اور چٹائیاں بھی تیار کی جاتی ہیں۔

ریشم کی صنعت۔ اس صنعت کو فروغ دینے کے لیے ۱۹۴۸ء میں ایک اسکیم شروع کی گئی تھی۔ اسکیم کے تحت اس وقت دہرہ دون اور راٹاوہ کے اضلاع میں کام ہو رہا ہے۔ ۱۹۵۸ء کے آخر میں تقریباً ۲۵۰۰ اشخاص اس صنعت میں لگے ہوئے تھے اور ۱۹۵۸-۵۹ء میں تقریباً ۵۰۰۰ پونڈ ریشم کے کوئے تیار کیے گئے۔

خاص مہک والے تیل کی صنعت۔ ان خاص مہک والے تیل کی صنعتوں میں جن کا انحصار جنگلاتی پیداوار پر ہے ایک صنعت خس کے تیل کی ہے۔ یہ تیل خس کی جڑوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ ریاست میں خس کے تیل کی سالانہ پیداوار ۲۰۰۰ پونڈ ہے۔ اس کے علاوہ بی بی والا (ضلع دہرہ دون) میں روشا گھاس سے تیل تیار کرنے کا ایک واحدہ قائم ہے۔ جنگلوں میں شہد، جڑی بوٹیاں، کھالیں اور سینگیں جمع کر کے بہت سے لوگ اپنی روزی کماتے ہیں۔

اس طرح جنگلات ہمارا قیمتی ورثہ ہیں۔ ریاست میں صنعتوں کو فروغ دینے اور اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جنگلات کی دولت میں مزید اضافہ کیا جائے۔

اتر پردیش شاہ راہ ترقی پر

دوسرے منصوبے میں غذائی پیداوار بڑھانے کے اقدامات ... کسانوں کا عزم ... غذائی پیداوار میں اضافے کے لیے انعامات کی اسکیم ... آب پاشی کے چھوٹے منصوبوں کی کامیابی ... سنچائی کی بڑی اور درمیانی درجے کی اسکیمیں ... دست کاری کے تربیتی پروگرام کی توسیع ... پانی کی فراہمی کی اسکیم ... ترقیاتی سرگرمیوں کا مرکز ... ایک اور سری نگر ... مزید ۲۰ ڈگری کالجوں کا قیام ... اسپورٹس تربیتی کیمپوں کی تنظیم ... نئے سرحدی اضلاع میں طبی سہولتیں ... شکر ملوں کے مزدوروں کے لیے مزید طبی آسانیاں ... نئی پناہ گاہیں ... متفرقات

اتر پردیش میں غذائی پیداوار بڑھانے کے لئے علاوہ دیگر امور کے کھیتی باڑی کے جدید طریقے رائج کر دیئے۔ بڑی تعداد میں گرام سہائکوں کو تربیت دینے اور خریف و ربیع مہموں کی تنظیم کے اقدامات کئے گئے۔ یہ اطلاع محکمہ منصوبہ کی ایک رپورٹ میں دی گئی ہے جس میں دوسرے منصوبہ کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور منصوبہ کے آخری سال یعنی ۶۱-۱۹۶۰ء کے پروگرام کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ دوسرے منصوبہ کے اختتام تک ۵۶-۱۹۵۵ء کی ۱۱۶ء۰۷ لاکھ ٹن کی غذائی پیداوار سے ۲۴ لاکھ ٹن زیادہ غذائی پیداوار ہونے کی توقع ہے۔ جس کی تفصیل یوں ہے کہ منصوبہ کے پہلے چار برسوں میں مزید ۲۱۶۰ لاکھ ٹن غذائی پیداوار ہونے کی توقع ہے۔ اس طور پر منصوبہ کے آخری سال میں مقررہ نشانہ کے حصول کے لئے مزید ۲۶۸۰ لاکھ ٹن کی پیداوار کے حصول کے لئے کوشش کی جا رہی ہے۔

دوسرے منصوبہ کے دوران میں آبپاشی کے وسائل کو بہتر طور پر کام میں لایا گیا اور قومی توسیعی سروس بلاکوں کے ذریعہ ایک توسیعی ایجنسی قائم کی گئی۔ اور آٹھ لاکھ ایکڑ سے زیادہ زیر کاشت رقبہ کی زراعتی جوتوں کی چک بندی کی گئی اور ۲۱۹۰ خدمتی امداد باہمی انجمنوں کی تنظیم کی گئی۔ اور بیجوں کی فراہمی کے پروگرام کے تحت ۷۷۷ بیج فارم قائم کئے گئے۔

۶۱-۱۹۶۰ء کے پروگرام کی تفصیلات کے بارے میں رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ غذائی پیداوار میں اضافہ کے لئے بڑی مقدار میں بہتر بیج اور کیمیاوی کھاد تقسیم کی جائے گی۔ پروگرام کے تحت ۱۰ لاکھ ایکڑ میں جاپانی طریقہ سے دھان کی کاشت اور ۳۲ لاکھ ایکڑ میں اتر پردیش کے طریقہ سے گیہوں کی کاشت کرنے کی تجویز ہے۔ اور آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں کے ذریعہ مزید ۲۶۹۷ لاکھ ایکڑ رقبہ کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ علاوہ ازیں زیر نظر سال میں ۵۰۰۰ خدمتی امداد باہمی انجمنوں اور ۲۰ امداد باہمی کاشت انجمنوں کی تنظیم کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

بڑی اور درمیانی اسکیموں کے ذریعہ آبپاشی کے جو وسائل مہیا کئے گئے ہیں ان کو پورے طور پر بروئے کار لانا غذائی پیداوار میں اضافہ کے پروگرام کا اہم عنصر رہا ہے۔ فیلڈ پروگرام میں رابطہ قائم کرنے اور فیلڈ ورکروں کو وقتاً فوقتاً ضروری مشورے دینے اور ان کی رہنمائی کرنے کے لئے ریاستی سطح پر ایک اعلیٰ سطح کی کمیٹی مقرر کی گئی۔

دیہی عوام کی موثر رہنمائی کے مقصد کے پیش نظر گرام سہائکوں کی تربیت کا تجربہ جاری رہا۔ اس پروگرام کا مقصد ترقی پسند کسانوں کو غذائی پیداوار بڑھانے کے جدید طریقوں کی تربیت دینا ہے۔

زیر نظر سال میں زراعتی پیداوار کی اسکیموں پر مجموعی طور پر ۲۰۳٫۲۳ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

اس مقصد کے پیش نظر کہ ریاست کے تمام اضلاع پودوں

کے متعلقہ سے متعلق واحدوں کے دائرہ اثر میں آجائیں ریاست میں پروڈ کے متعلقہ سے متعلق مزید ۷۲ مرکز قائم کئے گئے اور بلاکوں میں کیڑوں کو ہلاک کرنے کی دواؤں اور مشینوں کا اسٹاک کرنے کے انتظامات کئے گئے۔

اجتماعی ترقیاتی منصوبوں کی رفتار ترقی سے متعلق رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دوسرے منصوبہ کے پہلے چار برسوں میں اجتماعی ترقیاتی منصوبہ پر صرف کی جانے والی مجموعی رقم کا تقریباً ۸۲ فی صدی خرچ ہوا۔ منصوبہ کے پہلے دو برسوں میں تنظیمی دقتوں اور عمارتی سامان کی کمی کی بنا پر منصوبوں کی رفتار ترقی میں زبردست رکاوٹ پیدا ہوئی۔ منصوبہ کے دوسرے سال میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اکتوبر ۱۹۶۳ء کی مدت تک نئے بلاک بتدریج کھولے جائیں۔ اس لئے ریاست کو کم تعداد میں بلاک الاٹ کئے گئے جس کی بنا پر جتنی رقم صرف ہونا تھی اتنی صرف نہ ہو سکی۔

۱۹۵۹ء کے آخر تک ریاست کے مجموعی رقبہ کی تقریباً ۵۲ فی صدی اور تقریباً ۵۲.۴ فی صدی دیہی آبادی اجتماعی ترقیاتی بلاکوں کے دائرہ اثر میں آگئی۔

پروگرام کے تحت بلاکوں میں زراعتی ترقی۔ فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ اور دوسری اور ملی جلی فصلوں کی توسیع پر خاص زور دیا گیا۔ علاوہ ازیں بلاکوں میں رسل و رسائل کی ترقی، تعمیر مکانات پینے کے پانی کی سہولتوں کی فراہمی اور دریاؤں کی روک تھام پر بھی توجہ دی گئی۔ ۶۰-۱۹۵۹ء سے اجتماعی ترقی کے پروگرام میں ایک نئے موڑ کا آغاز ہوا جبکہ گاؤں کی سطح پر منتخب نمائندوں کو اس کی تکمیل کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ ۶۱-۱۹۶۰ء میں پہلے مرحلہ کے مزید ۴۷ بلاک قائم کرنے کی تجویز ہے۔

• • •

اترپردیش کی تاریخ میں پہلی بار گاؤں والوں نے یہ عہد کیا ہے کہ وہ آئندہ منصوبہ کے دوران میں اناج کی پیداوار میں تقریباً ۶۰ لاکھ ٹن کا اضافہ کریں گے جبکہ غذائی پیداوار کا مجوزہ سرکاری نشانہ ۵۵ لاکھ ٹن ہے۔ پیداوار کا مجوزہ اضافہ ۶۱-۱۹۶۰ء کے بنیادی سال کی تخمینی غذائی پیداوار سے ۴۷ فی صدی زائد ہوگا۔

اناج کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے عوام کے عہد سے خاطر خواہ نتائج حاصل ہوں گے کیونکہ یہ فیصلہ انھوں نے از خود کیا ہے اور یہ اوپر سے عائد نہیں کیا گیا ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ غذائی پیداوار بڑھانے کے لئے گاؤں میں پیش قدمی کرنے کے جذبہ کو پیدا کرنے کے لئے حسب سابق حکومت کی جانب سے نشانے مقرر نہیں کئے گئے۔ تاہم حکومت کے ذریعہ مختلف گاؤں سبھاؤں کو تیسرے پنجسالہ منصوبہ کی مقاصد کی خاص خاص باتوں سے آگاہ کرنے اور مالی امداد کیمیاوی کھادوں اور بیجوں کی فراہمی کے انتظامات کئے گئے۔ عام جلسوں کے ذریعہ یہ امر دیہی عوام کے ذہن نشین کیا گیا کہ فی ایکڑ پیداوار میں اسی صورت میں اضافہ ہو سکتا ہے جبکہ ضرورت کے مطابق بہتر قسم کے بیجوں کا استعمال کیا جائے اور کھیتی کے جدید طریقوں کو اپنایا جائے۔

گاؤں سبھاؤں سے کہا گیا ہے کہ وہ آبپاشی کے چھوٹے کاموں جیسے پختہ کنوؤں کی کھدائی۔ رہٹیں اور پمپنگ سیٹ لگانے کے علاوہ گولوں کو صاف اور گہرا کرنے کے جامع پروگرام مرتب کریں۔ یہ امر بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ ان پروگراموں کے لئے منصوبہ کی مدت میں سرگرم یا اچھا بلاکوں کو سالانہ ایک لاکھ روپیہ تک بطور قرضہ ملنے کی توقع ہے۔ ویلیج لیول ورکر، پنچایت سکرٹری اور امداد باہمی سپروائزر یا گاؤں کے ٹیچر کی مدد سے زراعتی اور پیداواری ذیلی کمیٹیوں اور فلاحی ذیلی کمیٹیوں نے گاؤں کی سطح پر منصوبے بنانے کا کام شروع کیا۔ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ منصوبہ بنانے کے سلسلہ میں گاؤں سبھائیں تفصیلات میں نہ الجھ جائیں گاؤں کے منصوبہ کی تیاری کے لئے ایک آسان فارم مقرر کیا گیا ہے جس میں بعد میں ایسے منصوبوں کو شامل کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے جن میں گاؤں والوں کو خاص دلچسپی ہو۔

ہر ایک گاؤں سبھا نے تین مدوں یعنی غذائی پیداوار، امداد باہمی انجمنوں کی ترقی اور کم سے کم بنیادی آسائشوں کی فراہمی کے تحت اپنا پروگرام مرتب کیا۔ گاؤں سبھا کے جلسوں میں آئندہ پانچ برسوں کے لئے دوسرے پروگراموں کے ساتھ ساتھ ہر گاؤں کے لئے غذائی پیداوار کے مقررہ نشانوں پر تبادلۂ خیالات کیا گیا۔ ان جلسوں میں جو غذائی نشانے مقرر کئے گئے تھے ان کو ملا کر بلاک کی سطح پر نشانے مقرر کئے گئے۔ اور بلاک کی سطح پر مقررہ نشانوں کی بنیاد پر ضلع کی سطح پر نشانے مقرر کئے گئے اور اضلاع نے اپنے اپنے نشانے

ریاست کے بہتر کارکردگی کے پیش دیئے گئے ہیں۔

• • •

غذائی پیداوار بڑھانے کی مہم کو تیز تر کرنے کے لئے ریاستی حکومت مرکزی وزارت غذا و زراعت اور مرکزی اجتماعی ترقی کی اسکیمیں کچھ ردوبدل کے ساتھ اس سال دوبارہ شروع کی جائیں گی۔

ریاستی اسکیم کے اخراجات خود کو شی کے لئے مالی امداد سے پورے کئے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں ضلع مجسٹریٹوں کو ضروری رقم دے دی گئی ہے۔

ریاستی اسکیم کے تحت سرگرم بلاکوں میں سے ہر وکیج لیول ورکر کے حلقہ کی بہترین گاؤں سبھا کو ہر فصل میں ۵۰ روپیہ کا انعام دیا جائیگا۔

ہر سرگرم بلاک کی بہترین گاؤں سبھا کو ۲۵۰ روپیہ۔ ہر چھاپا بلاک کی بہترین گاؤں سبھا کو ۲۰۰ روپیہ اور ہر ضلع کے بہترین سرگرم بلاک کو (ہر ڈویژن کے ایک ضلع کو چھوڑ کر جس کو انعام میں ڈویژن شیلڈ ملے) اور ہر ضلع کے بہترین چھاپا بلاک کو (ہر ڈویژن کے ایک ضلع کو چھوڑ کر جس کو ڈویژنل شیلڈ ملے) ہر فصل میں باری باری سے رننگ شیلڈ ملے گی۔

منطقہ کے بہترین سرگرم بلاک اور چھاپا بلاک کو ایک مستقل شیلڈ دی جائے گی۔

منطقہ کے بہترین سرگرم بلاک کو سالانہ ۵ ہزار روپیہ بطور انعام دیا جائے گا۔

ان انعامات کے علاوہ ہر سرگرم بلاک سے چار گرام سہائکوں۔ ہر ضلع سے ایک بہترین ٹیوب ویل آپریٹر۔ ہر ضلع سے ایک بہترین پنچایت سکریٹری۔ ہر ضلع سے ایک بہترین کوآپریٹر سپروائزر۔ ہر ضلع سے ایک بہترین ایگریکلچرل سپروائزر۔ ایک بہترین گنا سپروائزر۔ ہر ضلع سے ایک بہترین ٹیچر اور ہر ضلع سے ایک بہترین گرام سیوک کو دسمبر۔ جنوری کے دوران میں ہندوستان کے مختلف مقامات دکھانے کا انتظام کیا جائے گا۔

• • •

ریاستی حکومت کی جانب سے آبپاشی کے چھوٹے منصوبوں کی تکمیل پر زیادہ زور دیئے جانے کی پالیسی کی بنا پر دوسرے پنج سالہ منصوبے کے پہلے چار برسوں میں مزید ۲۹۶ لاکھ ٹن اناج پیدا ہوا امید کی جاتی ہے کہ سنہ ۱۹۶۱ء میں اس کی بدولت مزید ۱۰ لاکھ ٹن اناج کی پیداوار ہوگی۔ یہ اطلاع آبپاشی کے چھوٹے منصوبوں کی رفتار ترقی سے متعلق ریاستی حکومت کی حالیہ رپورٹ میں دی گئی ہے۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ دوسرے منصوبہ کے تحت آبپاشی کے چھوٹے منصوبوں کے لئے مجموعی طور پر ۲۲۰۵۰۰ ۱ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔ منصوبے کے پہلے تین برسوں میں ان اسکیموں پر ۶۹۰۵۲ لاکھ روپیہ کے مقررہ صرفہ کے مقابلہ میں ۱۰۳۶۱.۴ لاکھ روپیہ صرف ہوا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے بندوں کی تعمیر کے بجائے جن پر کثیر رقم صرف ہوتی ہے چھوٹے منصوبوں کی تکمیل پر زور دیا جا رہا ہے۔ جن کی بنا پر نسبتاً کم مدت میں زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہوا ہے۔

ریاستی محکمۂ آبپاشی کی جانب سے شروع کی گئی اسکیموں کے بارے میں رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دوسرے منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں ۹۱۴۱۱۹ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اس ضمن میں جو نمایاں کام ہوئے ان میں اپر گنگا نہر کی نالیوں کی توسیع، ۶۳۰ ٹیوب ویلوں کی تعمیر اور ۵۲۷ ٹیوب ویلوں کو بجلی کی فراہمی شامل ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں مزید ۳۵۰ ٹیوب ویل تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔ محکمۂ آبپاشی کی جانب سے پانی کی نکاسی کی اہم اسکیمیں شروع کی گئی ہیں جن کی تکمیل سے بہت بڑا رقبہ زیر کاشت آجائے گا۔

محکمۂ منصوبہ بندی کی اسکیموں کے تحت کسانوں اور امداد باہمی انجمنوں کو مارچ سنہ ۱۹۶۲ء کے آخر تک پختہ کنوؤں اور رہٹوں کی تعمیر۔ پرشین واٹر ویل لگانے کے لئے مجموعی طور پر ۲۲۴۱۰ لاکھ روپیہ قرضہ اور مالی امداد کے طور پر دیا گیا۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ ریاست کے گنا کی کاشت کے علاقوں میں آبپاشی کی چھوٹی اسکیمیں شروع کرنے کے لئے سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۲۵ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔ کسانوں کو پختہ کنوؤں کی تعمیر کے لئے ۳۰ لاکھ روپیہ کے تقاوی قرضے دینے کی تجویز ہے۔

آراضی کے سدھار کی اسکیم کے بارے میں رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس اسکیم کی تکمیل کے لئے ۶۰۲۱۹۰۲ لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے۔ ریاست میں زمین کو قابل کاشت بنانے کی دو بڑی اسکیمیں [illegible]

ضلعوں میں باقاعدہ زیر عمل ہیں۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ مالی سال رواں کے دوران میں افضل گنج کالونی (ضلع بجنور) میں زمین کی بازیابی کی اسکیم کے لئے ۵۰ ہزار روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت اب تک ۱۹۹ ایکڑ زمین کو قابل کاشت بنایا جا چکا ہے۔ ضلع رامپور میں افضل گڑھ اور بانولی نگر میں فصلوں کو جنگلی جانوروں کی تباہ کاریوں سے محفوظ کرنے کے لئے باڑھ لگانے کی اسکیم ۹۹۰۰۰ روپیہ کی لاگت سے مکمل ہو چکی ہے۔

جوتوں کی چک بندی کی اسکیم جو سنہ ۱۹۵۴ء میں شروع کی گئی تھی اس وقت ریاست کے ۳۲ اضلاع میں زیر عمل ہے۔ اسکیم کے تحت پہلے منصوبہ کی مدت میں ۱۸۹۵۰ ایکڑ آراضی کی چک بندی ہو چکی ہے۔ دوسرے منصوبے کے تحت ۵۰ لاکھ ایکڑ کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۵۹-۶۰ء کے لئے ۱۰ لاکھ ایکڑ آراضی کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۵۹ء تک ۱۰۳۴۸ ایکڑ آراضی کی چک بندی ہو چکی تھی۔ امید کی جاتی ہے کہ سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۱۰ لاکھ ایکڑ کی چک بندی ہو جائے گی۔ اس طور پر دوسرے منصوبہ کے آخر تک ۵۰ لاکھ ایکڑ آراضی کی چک بندی کے مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں ۵۱۸۹۵۰ ایکڑ کے رقبہ کی چک بندی ہو جائے گی۔

• • •

ریاست میں دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے پہلے چار برسوں کے دوران میں آبپاشی اور بجلی کے منصوبوں کی رفتار ترقی سے متعلق محکمہ منصوبہ بندی کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ آبپاشی کی بڑی اور درمیانی درجہ کی اسکیموں کے لئے سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء کے دوران میں ۵۰۶،۱۶ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ سال مذکور میں منصوبہ کی اسکیموں کے لئے تخمیناً ۲۱ لاکھ روپیہ کی مالیت کے غیر ملکی زرِ تبادلہ کی ضرورت پڑے گی۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ پہلے پنجسالہ منصوبہ کی نامکمل اسکیموں کو مارچ سنہ ۱۹۶۱ء تک مکمل کرنے کی تجویز ہے۔ ٹانڈہ۔ دھری گھاٹ اور کوالو پمپڈ نہروں میں بقیہ پمپ لگا دیئے جائینگے۔ نانک ساگر پر کام کے جلد ہی مکمل ہو جانے کی امید ہے۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ شاردا ساگر بند کی تعمیر کے جون سنہ ۱۹۶۱ء تک مکمل ہو جانے کی امید ہے۔ اور نالیوں کی تعمیر تیزی سے کی جائے گی۔ اور تیسرے منصوبہ کے دوران میں سیجا پروجکٹ اور ماتاٹیلہ مرحلہ دوم پر عملدرآمد جاری رہے گا۔ تیسرے منصوبہ کے لئے مجوزہ اسکیموں کے تخمینے سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء میں تیار ہو جائینگے۔

بجلی کے منصوبوں کے بارے میں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دوسرے پنجسالہ منصوبہ میں بجلی کی اسکیموں کو اولیت دی گئی تھی اور ان کے لئے ۴۲،۶۲ کروڑ روپیہ مقرر کیا گیا تھا اور بعد میں یہ رقم بڑھا کر ۶۰،۱۳ کروڑ روپیہ کر دی گئی تھی۔ سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء کے دوران میں اس مقصد کے لئے ۱۰۸۴،۲۶۹ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ دوسرے منصوبہ کے آخری سال میں گنگا گرڈ کی توسیع (مرحلہ اول۔ دوم۔ اور سوم) کھیٹما ہائیڈل بجلی گھر شاردا ٹرانسمشن لائن۔ مشرقی علاقے کے بجلی کے منصوبوں۔ تیھری ہائیڈل اسٹیشن اور مین پوری تھرمل اسٹیشن کے منصوبوں پر عملدرآمد جاری رہے گا۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ اتر پردیش میں کل زیر کاشت رقبہ ۴۱۸ لاکھ ایکڑ ہے۔ پہلے پنجسالہ منصوبہ کے آغاز میں آبپاشی کے ریاستی وسائل کے ذریعہ ۷۰ لاکھ ایکڑ کے رقبہ کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم ہو چکی تھیں۔ اور بعد میں سیراب رقبہ بڑھ کر ۹۰ لاکھ ایکڑ ہو گیا۔ رپورٹ میں یہ امید ظاہر کی گئی ہے کہ دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے آخر میں مزید ۲۴،۳۰ لاکھ ایکڑ کے رقبہ کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی جاسکیں گی۔

• • •

حکومت اتر پردیش نے ریاستی محکمہ صنعت کی جانب سے چلائے جانے والے صنعتی تربیتی اداروں کے دستکاروں کی تربیت کے پروگرام کو وسیع اور بہتر بنانے کا فیصلہ کیا ہے جس سے منطقہ کی ضروریات پوری ہو سکیں اس سلسلہ میں جو اوّل اقدام کیا جائے گا وہ ضلع تربیتی مشاورتی کمیٹیوں کی تشکیل ہو گی جس کے لئے حال ہی میں احکام جاری کر دیئے گئے ہیں۔

یہ کمیٹیاں جو صنعتی اداروں سے منسلک ہوں گی ادارہ کے متعلقہ منطقہ کی صنعتوں کی ضروریات کا جائزہ لیں گی۔ اور ایسے تربیتی پروگرام کی تجاویز پیش کریں گی جو مقامی ضروریات کو پورا کر سکیں گی۔

ریاست میں اس وقت ۱۵ صنعتی تربیتی ادارے قائم ہیں جو تقریباً ۵۰۰۰ لڑکوں اور لڑکیوں کو تقریباً تین درجن پیشوں میں تربیت دیتے ہیں۔

ان ضلع کمیٹیوں میں صنعتوں اور مزدوروں کے دو دو نمائندے، ایک مقامی ایم۔ ایل۔ اے متعلقہ ضلع صنعت افسر اور مقامی روزگار افسر شامل ہوں گے۔ کمیٹی کا صدر ایک غیر سرکاری ممبر اور ادارہ کا پرنسپل اس کا سکریٹری

[illegible] سال زیر نظر کا سب سے اہم واقعہ یو۔ پی۔ اسپورٹس کونسل کے زیر اہتمام

ریاست میں موجودہ تعلیمی سال سے مزید ۲۰ ڈگری کالجوں کا قیام عمل میں آگیا ہے جس سے اتر پردیش میں ان کالجوں کی تعداد بڑھ کر ۱۴۴ ہو گئی ہے۔

ان ڈگری کالجوں میں ۱۹ کالج آگرہ یونیورسٹی اور بقیہ ۴ گورکھپور یونیورسٹی سے ملحق ہیں۔

آگرہ یونیورسٹی سے الحاق شدہ کالج یہ ہیں۔ کل بھاسکر آشرم ایگریکلچر کالج الہ آباد۔ برہمانند دویالیہ کالج راٹھ ہمیرپور۔ ڈے اے۔ وی کالج علی گڑھ۔ وردھمان کالج بجنور۔ کے۔ ایل۔ ڈے۔ اے۔ وی کالج روڑکی۔ ایس۔ اے۔ وی کالج بھرتنا۔ اٹاوہ۔ کبیر کالج ڈبائی بلند شہر۔ اترا کالج اترا باندہ۔ جے۔ ایس ہندو کالج امروہہ مراد آباد۔ کنیا مہا ودیالیہ کالج بریلی۔ راجپوت مکٹا شور کالج دھنلنا میرٹھ۔ بدری وشال کالج فتح گڑھ۔ لالہ موتی رام بابو رام کالج ہلدوانی نینی تال۔ رائے بریلی ڈگری کالج رائے بریلی۔ گرو رام رائے کالج دہرہ دون۔ اور بل دیو آریہ کنیا کالج مراد آباد۔

گورکھپور یونیورسٹی سے ملحق کالج یہ ہیں: تلک کالج پرتاپ گڑھ۔ کسان کالج بہرائچ۔ نیشنل کالج بڑہل گنج۔ گورکھپور۔ اور ہابرٹ کالج ٹانڈہ فیض آباد۔

• • •

اتر پردیش میں سنہ ۱۹۵۹ء کے دوران میں مجموعی طور پر ۱۴ اقامتی تربیتی کیمپوں کی تنظیم کی گئی۔ یہ اطلاع ریاستی اسپورٹس کونسل کی رفتار ترقی سے متعلق حالیہ رپورٹ میں دی گئی ہے۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ یہ کیمپ ریاست کے مختلف اضلاع میں ضلع اسپورٹس کونسلوں اور اسکولوں کے ضلع انسپکٹروں کی زیر نگرانی منعقد کئے گئے۔ ہر ایک کیمپ ۱۵ دنوں کے لئے تھا۔ ان کیمپوں میں ۲۰۹۵ افراد کو تربیت دی گئی۔

ان کیمپوں کے علاوہ دس مرکزی اور مدرسین کے لئے ۱۲ تربیتی کیمپوں کی بھی تنظیم کی گئی۔ مرکزی کیمپوں میں مجموعی طور پر ۱۴۶ افراد کو تربیت دی گئی۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ سنٹرل اسپورٹس اسٹیڈیم لکھنؤ میں نومبر سنہ ۱۹۵۹ء یونیورسٹیوں کے درمیان کھیلوں کا پہلا مقابلہ منعقد کیا گیا۔ یہ مقابلہ ہاکی، کرکٹ، باسکٹ بال، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس، فٹ بال، ٹینس اور کھیل کود میں ہوا۔

دسمبر سنہ ۱۹۵۹ء میں ہندوستانی ورزشوں کی تیسری ریاستی تقریب کا انعقاد تھا جس میں ۱۹ ٹیموں نے شرکت کی۔

کونسل نے زیر نظر سال میں ۱۹ کلبوں اور اداروں کو ۱۱۵۰۰ روپیہ کی مالی امداد منظور کی۔ اس میں سے کونسل چیمبر کلب لکھنؤ کو ۲۰۰ روپیہ۔ کاشی جمنا دار السنی کو ۱۵۰۰ روپیہ۔ گوروکل کانگڑی ہردوار کو ۷۵۰ روپیہ۔ اور یو۔ پی سول سکریٹریٹ ایسوسی ایشن کو ۸۰۰ روپیہ دیا گیا۔

زیر نظر مدت میں مجموعی طور پر ۱۲۵۰۶۰ روپیہ خرچ کیا گیا جس میں سے کھیل کود کی ترقی پر ۹۹۳۰۷ روپیہ۔ کھیلوں کا معیار بلند کرنے پر ۱۹۰۰۹ روپیہ۔ اور اسٹیڈیموں وغیرہ کی تعمیر پر ۱۶۵۰۰ روپیہ صرف ہوا۔ علاوہ ازیں ریاست کے کھیل کود سے متعلق اداروں اور منطقائی کونسلوں کو اپنی سرگرمیاں تیز تر کرنے کے لئے ۲۱۰۱۶ روپیہ سالانہ مالی امداد کے طور پر دیا گیا۔

• • •

حکومت اتر پردیش کی جانب سے ریاست کے نئے سرحدی اضلاع یعنی اترکاشی، چمولی اور پتھورا گڑھ میں طبی سہولتوں کی فراہمی کے لئے مالی سال رواں کے آغاز سے اب تک ۵٫۲۶ لاکھ روپیہ صرف کیا جا چکا ہے۔ اس رقم میں [illegible] طبی عملہ کی تنخواہ کے اخراجات شامل نہیں ہیں۔

ان اضلاع کی موجودہ ڈسپنسریوں کو ضلع اسپتالوں کی سطح پر لانے کے لئے ان کا درجہ بلند کر دیا گیا ہے جس پر مجموعی طور پر ۵۰ ہزار روپیہ خرچ ہوا۔ علاوہ ازیں ۷۰ ہزار روپیہ کے صرفہ سے ان اضلاع کی دیہی ڈسپنسریوں کا درجہ بھی بلند کر دیا گیا ہے۔ ان اضلاع میں ۲ ویٹرنری اور ویدک ڈسپنسریاں اور تین گشتی طبی امدادی دستے بھی قائم کئے گئے ہیں جن پر بالترتیب ۶۶ ہزار اور ۵۲۵۰۰ روپیہ صرف ہوا۔

تپ دق کے مریضوں کو مالی امداد بہم پہونچانے کے لئے ان تین اضلاع میں سے ہر ضلع کے لئے ۵۰ ہزار روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ہر ضلع کو صفائی کے بہتر انتظامات کے لئے ۱۰ ہزار روپیہ دیا گیا ہے۔

• • •

ریاست کی شکر اور پاور الکحل کی صنعتوں کے مزدوروں کی فلاح اور ترقی سے متعلق خدمات کی مشاورتی کمیٹی کی جانب سے جس کا ایک جلسہ

آج یہاں وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند کی زیر صدارت منعقد ہوا شکر ملوں کے مزدوروں کو مزید طبی سہولتوں کی فراہمی کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔
کمیٹی نے سیتاپور کے آنکھ کے اسپتال میں ۱۴ پلنگوں اور بستی۔ گونڈہ گورکھپور۔ سیتاپور اور بجنور کے ضلع اسپتالوں میں چار چار پلنگوں پر مشتمل وارڈوں کی تعمیر کے لئے ضروری رقم کی منظوری دینے کا فیصلہ کیا

کمیٹی نے دیوریا۔ میرٹھ۔ مظفر نگر اور سہارنپور کے ضلع اسپتالوں میں شکر ملوں کے مزدوروں کے لئے چار چار پلنگ مخصوص کرنے کے لئے بھی ضروری رقم دینے کا فیصلہ کیا۔

کمیٹی نے شکر ملوں کے ذریعہ تعمیر مکانات کی اسکیم کی ۳۰ جون سنہ ۱۹۶۰ء تک کی کارکردگی کا جائزہ لیا۔ اسکیم کے تحت مذکورہ تاریخ تک ۷۱ شکر ملوں میں ۱۲۹۲ کوارٹروں کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ ریاست میں صرف دو ملوں یعنی ایم۔ کے شوگر ملز ایم کولہ (دیوریا)۔ اور کانپور شوگر ورکس لمیٹڈ کٹھ کوئیاں (دیوریا) نے ابھی تک کوارٹروں کی تعمیر شروع نہیں کی ہے۔

ان کوارٹروں کی تعمیر کے سلسلہ میں شکر ملوں کو ۳۰ جون سنہ ۱۹۶۰ء تک ۳۲۲۴۵۰۶ روپیہ ادا کیا گیا۔

• • •

ریاستی حکومت نے مالی سال رواں کے دوران میں عصمت فروشی کے اڈوں سے چھڑائی گئی عورتوں کو ان کی بحالی کے لئے تربیت دینے کے واسطے مزید پانچ پناہ گاہیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سال اس ضمن میں ۲٫۵ لاکھ روپیہ صرف ہوگا جس کا نصف مرکزی حکومت برداشت کرے گی۔

یہ پناہ گاہیں ان پندرہ اضلاع میں سے کسی پانچ اضلاع میں قائم کی جائیں گی جہاں انسداد عصمت فروشی قانون پورے طور پر نافذ کیا گیا ہے۔

ہر پناہ گاہ میں پچاس عورتوں کے قیام کی گنجائش ہوگی۔ پناہ گاہ میں عورتوں کی دستکاریوں کی تربیت دی جائے گی۔ ہر پناہ گاہ کے ساتھ ایک تربیتی اور پیداواری مرکز ملحق کرنے کی بھی تجویز ہے تاکہ ان کو مفید گھریلو صنعتوں کی تربیت دی جا سکے۔

اس وقت دہرہ دون میں صرف ایک پناہ گاہ قائم ہے جہاں ۸۰ عورتیں مقیم ہیں۔ اس پناہ گاہ میں مزید ۴۰ عورتوں کے قیام کی گنجائش ہے عصمت فروشی کے اڈوں پر چھاپوں کے بعد چھڑائی گئی بڑی تعداد میں عورتیں ضلع کی عارضی پناہ گاہوں میں مقیم ہیں

مُتفرقات

دو اُردو کتابیں ضبط۔ حکومت آندھرا پردیش کے ایک اعلانیہ کے مطابق تاریخ اسلام کا تاریک دور نام کی اردو کتاب جس کے مصنف منظور حسین بخاری ہیں بحق سرکار ضبط کر لی گئی ہے۔

یہ کتاب جو سرگودھا مغربی پاکستان میں طبع ہوئی ہے محمود احمد عباسی کی خلافت معاویہ و یزید نامی کتاب کا جواب ہے جس کو ضبط کیا جا چکا ہے۔ خلافت معاویہ و یزید روحانی کتب خانہ ٹی بکش دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

اردو کی ایک دوسری کتاب خونی سفر جس کے مصنف ایم۔ اسلم اور ناشر خواجہ بدر السلام فروغی ہیں حکومت پنجاب کے ایک اعلانیہ کے مطابق ضبط کر لی گئی ہے۔ یہ کتاب نقوش پریس لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

مذکورہ کتابوں کا ہر نسخہ اور ایسی تمام دستاویزات بھی جن میں ان کے اقتباسات یا ترجمے وغیرہ شامل ہوں بحق سرکار ضبط کر لی گئی ہیں۔

ان کتابوں میں ایسا مواد موجود ہے جس کا مقصد دیدہ و دانستہ اور بدنیتی کے ساتھ ہندوستان کے مختلف طبقوں کے درمیان دشمنی اور منافرت کے جذبات کو پروان چڑھانا ہے۔

بسوں کے مزید راستے۔ حکومت اتر پردیش کے محکمہ نقل و حمل نے ریاست میں بسوں کے مزید چار راستوں پر سرکاری بسیں چلانے کی اسکیمیں قطعی کی ہیں۔ یہ راستے حسب ذیل ہیں۔
بریلی۔ شیش گڑھ براہ دھنیٹھی اور ساہی۔ کانپور۔ بیلہ۔ بندھونا۔ اعظم گڑھ۔ مجھ ارا اور لکھیم پور۔ آئیرہ۔

مالی سال رواں کے دوران میں مزید ۲۴ راستوں پر روڈویز بسیں چلانے کی تجویز ہے۔

یو۔ پی گورنمنٹ روڈویز کی ۲۹۱۴ بسوں کے ذریعہ سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء کے دوران میں تقریباً ۱۱ کرور ۲۶ لاکھ مسافروں نے سفر کیا۔ ۲۰۸ راستوں ...

پر چلنے والی ان بسوں نے زیر نظر مدت میں ۶،۳۶، ملین کی مسافت طے کی۔

جانوروں کی لاش کے لئے نقد۔ محکمہ نگہداشت مولیشیان نے جس کی جانب سے اب تک لکھنؤ شہر کی میونسپل حدود کے اندر جانور کی لاش بغیر کسی قیمت کی ادائیگی کے ہٹائی جاتی تھی اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ مردہ جانور کے مالک یا اس کی غیر موجودگی میں کسی ایسے شخص کو پانچ روپیہ ادا کیا جائے گا جو اس سلسلہ میں محکمہ مذکور کو مطلع کرے گا۔ محکمہ کی گاڑی کے ذریعہ جانور کی لاش کے ہٹائے جانے کے بعد متعلقہ شخص کو ادائیگی کی جائے گی۔ لیکن گائے اور بھینس کے کھچڑوں کی لاش کی صورت میں کوئی رقم نہیں دی جائے گی۔

عوام سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں جانوروں کی لاشوں میں کام لانے سے متعلق افسر سے فوری طور پر محکمہ نگہداشت مولیشیاں کے دفتر واقع بادشاہ باغ لکھنؤ میں ذاتی طور پر ملیں یا ان کو ٹیلیفون نمبر (۴۹۸۹) پر مطلع کریں۔ تاکہ لاش کو بلا تاخیر ہٹایا جاسکے۔

یہ اسکیم ۴ ستمبر ۱۹۶۰ء سے نافذ ہو جائے گی۔

ٹبیشور میں پولیس ایکٹ کا نفاذ۔ حکومت اترپردیش نے ضلع آگرہ میں ہونے والے ٹبیشور کے علاقہ میں ۲۵ اکتوبر سے ۸ نومبر ۱۹۶۰ء تک کے لئے پولیس ایکٹ کی دفعہ ۳۴ الف کا نفاذ کرنے کے احکام جاری کر دئے ہیں۔

اس کے علاوہ ضلع بارہ بنکی کے قصبہ زیدپور میں جہاں باقاعدہ بازار لگتا ہے اور ضلع الہ آباد کے نینی بازار اور موضع فینی میں جن کو کارپوریشن کے حدود میں شامل کر لیا گیا ہے پولیس ایکٹ کی مذکورہ دفعہ مستقل طور پر نافذ کر دی گئی ہے۔

فارسی رسم خط میں دستاویز۔ رجسٹریشن مینول حصہ دوم کے متعلقہ قاعدہ میں ایسی ترمیم کر دی گئی ہے جس سے رجسٹری کے لئے پیش کئے گئے فارسی رسم خط میں اردو میں لکھے ہوئے دستاویزات بھی قبول کئے جائیں گے۔

یہ اطلاع ۱۵ ستمبر کو یو۔پی کونسل میں وزیر مالیات سری علی ظہیر نے سری محمد محمود عالم خان کے ایک سوال کے جواب میں دی۔ انھوں نے مزید بتایا کہ اس ضمن میں ریاست کے سب رجسٹراروں کو علاحدہ سے بھی یہ احکام جاری کر دئیے گئے ہیں کہ وہ اردو میں لکھے ہوئے دستاویزات قبول کریں۔ ایک ضمنی سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ ۳ جنوری ۱۹۵۹ء کو تمام متعلقہ افسروں کو یہ اطلاع بھیج دی گئی تھی۔

ڈف مائین

(سلسلہ صفحہ ۲۶)

تھی اس میں ایک سی پاکیزگی تھی اپھر دونوں نے ایک دوسری کو دیکھا منھ سے بولنے کی سکت نہ تھی مگر نظروں نے مبارک باد کا فرض ادا کر دیا تھی تحیت اپنائیت کسی مساوات کیسی محبت تھی ان نظروں میں۔ ساحی کھڑا ہوا سے دور۔ بہت دور۔ وہ دونوں صرف ماں تھیں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کو سمجھنے والی۔ اور دونوں بچے اپنے ننھے ننھے ہونٹ ہلا کر ایک ہی انداز میں ماؤں سے اسرار اس مانگ رہے تھے !!

آزردہ اور فتوائے جہاد

[illegible] احمد فاروقی

نیا دور لکھنؤ کے جمہوریت نمبر (جنوری ۱۹۶۰ء) میں جناب کوثر چاند پوری کا مضمون "مفتی صدر الدین آزردہ" شائع ہوا تھا اس سلسلے میں مجھے ایک ایسی غلط فہمی کا ازالہ کرنا مقصود ہے جو بہت دنوں سے عام چلی آتی ہے خدا جانے یہ کہاں سے چلی اور کس نے اسے عام کر دیا۔ مضمون نگار نے لکھا ہے:

"آزردہ پر انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد اس لیے عتاب نازل ہوا تھا کہ انھوں نے جہاد کے فتوے پر دستخط کر دیے تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے لیکن کسی نے اس روش پر قائم نہ رہنے دیا۔ قلعے کی آمد و رفت جاری رہی اور دربار میں بھی شرکت کرنی پڑتی تھی مگر عدالت کا کام حکم کے باوجود بند کر دیا تھا جب بخت خاں بریلی سے دہلی آیا تو اس نے علما و مشائخ سے جہاد کا فتویٰ حاصل کیا مفتی صاحب نے بھی اس پر دستخط کیے مگر وہ اسے پسند نہ کرتے تھے اس لیے آخر میں انھوں نے "کتبت بالجبر" کے الفاظ لکھ دیے اور "بالجبر" کے "ب" کے نقطے (دانستہ) نہیں لگائے ایسی صورت میں یہ لفظ "کتبت بالخیر" بھی پڑھا جا سکتا تھا اور "کتبت بالجبر" بھی ... تحقیقات کے سلسلے میں پیشی کی نوبت آئی تو مفتی صاحب کو فتوے دکھا کر سوال کیا گیا انھوں نے جواب میں کہا دستخط میں نے ضرور کیے ہیں مگر خوشی سے نہیں چنانچہ فتوے میں صاف لکھ دیا ہے کتبت بالجبر۔ مفتی صاحب کو بری کر دیا گیا۔"

کوثر صاحب نے اس روایت کا ماخذ ظاہر نہیں کیا۔ لیکن یقین ہے کہ انھوں نے یہ روایت کسی ایسی کتاب سے لی ہو گی جو آزردہ کے انتقال سے کئی برس کے بعد لکھی گئی ہو۔ ورنہ جس فتوے کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ۱۸۵۷ء میں دہلی کے اخبار "الظفر" میں شائع ہوا تھا جس میں یہ دریافت کیا گیا تھا کہ:

"اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں"

جواب دیا گیا کہ "درصورت مرقومہ فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے۔"

اس پر دستخط اس عہد کے ۳۴ علما اور مفتیوں نے کیے تھے جن میں شیخ نذیر حسین محدث دہلوی، مولوی رحمت اللہ اور مفتی صدر الدین بھی شامل ہیں۔ مفتی صدر الدین آزردہ کے دستخط چھٹے نمبر پر ہیں۔ آپ نے کہیں کتبت بالجبر یا کوئی اور لفظ لکھا ہوا نہیں ہے۔ اس فتوے کی نقل کتاب "فتوائے آزادی" شائع کردہ ادبی پبلشرز بمبئی میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ اصل فتویٰ جامعہ ملیہ دہلی کی جوبلی کے موقع پر نمائش کے لیے پیش کیا گیا تھا اور آغا حیدر حسن دہلوی (نظام کالج حیدرآباد) کی ملکیت ہے۔ اس فتوے کی عبارت سید خورشید مصطفی رضوی کی تالیف کتاب "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" میں بھی بطور ضمیمہ شامل کی گئی ہے۔

ہندستانی اخبار نویسی کے مولف محمد عتیق صدیقی کا بیان ہے کہ ۱۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی اردو اخبار کا نام تبدیل کر کے بادشاہ کے

نام پر "الظفر" کر دیا گیا تھا۔ دریں صورت اس تاریخ کے بعد ہی فتویٰ شائع ہوا ہوگا۔

مفتی صدر الدین آزردہ نہایت بلند کردار، اولوالعزم اور صاحب فہم و تدبیر انسان تھے یہ ان کے کردار سے بعید تھا کہ وہ دستخط کرتے اور ایسے الفاظ لکھ دیتے جن سے پانسا اُلٹ پڑ جانے پر دامن بچایا جا سکے۔ آزردہ کے حالات اور سیرت و اخلاق کے لئے جناب کوثر چاند پوری نے اوّلین ماخذ کو نظر میں نہیں رکھا۔ آثار الصنادید مصنفہ سر سید احمد خاں کے علاوہ اُن کے شاگرد نواب صدیق حسن خاں بہادر نے شمع انجمن، ابجد العلوم، اتحاف النبلاء المتقین باحیاء المآثر الفقہا المحدثین اور الفرع النامی وغیرہ میں بھی ان کے حالات لکھے ہیں۔

ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ مذکورہ فتوے پر مولانا فضل حق خیر آبادی کے دستخط نہیں تھے جیسا کہ غلط مشہور ہو گیا ہے۔ وہ ایک غلط فہمی میں پکڑے گئے تھے۔ ان کے ہم نام "فضل حق شاہ جہاں پوری" نے مولوی احمد اللہ کی بہت مدد کی تھی۔ اُن کا نام خفیہ کی رپورٹوں میں درج تھا وہ تو انگریزوں کے ہتھے نہیں چڑھے، مولانا فضل حق خیر آبادی پکڑے گئے۔ اپنی بے گناہی جتانے کے لئے انھوں نے کوشش بھی کی مگر تید فرنگ ہی میں قید جسم و جاں سے بھی آزاد ہونا قسمت میں لکھا تھا۔ مولانا فضل کے بارے میں یہ اہم انکشاف سب سے پہلے مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے ایک مضمون (مطبوعۂ رسالہ تحریک۔ اگست ۱۹۵۷ء) میں کیا تھا ابھی چند ماہ پہلے اسی رسالے میں حضرت مالک رام نے مولوی فضل حق خیر آبادی کے مقدمے کی پوری روداد بھی شائع کر دی ہے جس سے مولانا عرشی کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

(۲)

جناب کوثر چاند پوری نے اسی مضمون میں آزردہ کا سنہ ولادت ۱۲۰۴ ہجری بتایا ہے اور اس کے مطابق عیسوی سال ۱۷۹۷ء لکھا ہے درآں حالیکہ ۱۲۰۴ ہجری ستمبر ۱۷۸۹ء سے شروع ہو کر اگست ۱۷۹۰ء میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آزردہ کا سال ولادت لفظ "چراغ" سے بر آمد ہوتا ہے (۱۲۰۴ھ) لیکن عیسوی سنہ صحیح نہیں دیا گیا! اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مفتی صاحب کو "بری کر دیا گیا"۔ ان کی کل جائداد ضبط ہو گئی تھی بعد میں آدھی چھوٹ گئی وہ بھی ازراہ ترحم نہ کہ انھیں بے گناہ سمجھتے ہوئے۔

غالب نے ایک خط میں لکھا ہے:

"جناب مفتی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روبکاریاں ہوئیں، آخر صاحبان کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی اب نصف جائداد پر قابض ہیں اپنی حویلی میں رہتے ہیں کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔"

اس سے مفتی صدر الدین خاں کا جائداد کی واگذاری کے لئے لاہور جانا معلوم ہوتا ہے۔ آخری دنوں میں نواب رامپور بھی کچھ مالی امداد کیا کرتے تھے۔ صدر الدین خاں کی حویلی، جامع مسجد سے چتلی قبر کی طرف جاتے ہوئے داہنے ہاتھ کو پڑتی ہے۔ اب اس کا بہت کم حصہ اپنی اصلی حالت پر باقی رہا ہے۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ مفتی صدر الدین آزردہ نے انقلابیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو علم بغاوت بلند ہوا ہے اور عبد اللطیف کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ مئی کے دربار میں دوسرے امراء و اعیان کے ساتھ مفتی صدر الدین آزردہ اور غالب بھی حاضر تھے۔ البتہ بعد میں جب حالات دوسرا رنگ اختیار کرنے لگے تو ۱۰ جون ۱۸۵۷ء کو بادشاہ کی یہ پیش کش کہ وہ فوجداری مقدمات فیصل کریں انھوں نے مسترد کر دی تھی اور ڈپٹی کرم علی خاں کو یہ کام سونپا گیا تھا۔

اسی طرح عید قرباں کے موقع پر جب شہریوں میں باہمی مناقشہ خطرناک صورت حال اختیار کرنے لگا تو شاہ احمد سعید دہلوی جہاد کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اس موقع پر عبد اللطیف نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ:

"پس خسرو بزبان مفتی صدر الدین خاں کہ مردے سنجیدہ گوشے شگفتہ خوئے پُر از علم و ادب بود سخنے نہاد و بہ مولانائے مذکورہ فرستاد و ایں شعر از خامۂ خود بنگاشت۔

رخ متاب اے یار گر پیشت نیازارد کسے
نازنیں آں بہ کزد ہرگز نیازارد کسے

پس مولانا بہ ایمائے والا کمر کشاد۔"

نقد و تبصرہ

اصل الاصول فی بیان مطابقۃ الکشف بالمعقول والمنقول
قیمت ۳۰ روپے ، ملنے کا پتہ ، رجسٹرار مدراس یونیورسٹی

سید شاہ عبدالقادر مہربان فخری گیارھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں جنوبی ہند کے ایک ممتاز صاحب تصانیف عدیدہ فاضل تھے تصوف میں انھیں عالمانہ درک تھا۔ فارسی شعرگوئی کا بھی انھیں ذوق تھا۔ وہ مشق شعر میں میر غلام علی آزاد بلگرامی سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

ان کے زمانے میں مجدد الف ثانی کے نظریہ وحدت الشہود نے خاصہ فروغ حاصل کر لیا تھا اور اس کے نتیجے میں ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کے بارے میں گرما گرم بحثیں ہو رہی تھیں۔ شاہ فخری وحدت الوجود کے زبردست حامی تھے چنانچہ انھوں نے اپنے ایک شاگرد کی فرمائش پر فن تصوف کے متعلق فارسی زبان میں نہایت کد و کاوش اور تحقیق سے ایک مبسوط کتاب اصل الاصول تحریر فرمائی۔ اس میں انھوں نے معقولات اور منقولات کے درمیان کلی مطابقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعدد اکابر علما و فلاسفہ کے اقوال پیش کیے ہیں اور ان سے بحث کی ہے۔ الہیات و مابعد الطبیعات کے بہت سے اہم مسائل کی اس ضمن میں وضاحت ہو گئی ہے۔ یہ عالمانہ علمی تصنیف مطبوعات کی دنیا میں اب تک نہیں آ سکی تھی۔ مقام مسرت ہے کہ جناب افضل العلما محمد یوسف کوکن عمری ریڈر عربی و فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی نے ادھر توجہ فرمائی اور اس کے کئی نسخے بہم پہنچا کر باہمی مقابلہ کے بعد مسودہ کتاب کی تصحیح فرمائی، اس کے مضامین کی فہرست مرتب کی اور اپنے مقدمے کے ساتھ جس میں مصنف کے خاندانی حالات، ان کی علمی جلالت اور ان کی دیگر تصنیفات کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سات سو تیس صفحات کی کتاب کو ٹائپ میں شایع کیا۔ اس طرح مولانا محمد یوسف کوکن نے ایک بڑی علمی خدمت انجام دی ہے اور ان کے ساتھ مدراس یونیورسٹی بھی اس علمی خدمت کی ہمت افزائی پر قابل مبارکباد ہے۔

آئینۂ اصلاح ؛ از جوش ملسیانی۔ قیمت تین روپے۔ صفحات ۱۷۶۔
پبلشر: مرکز تصنیف و تالیف نکودر (پنجاب)

حضرت جوش ملسیانی اردو کے کہنہ مشق شاعر اور ادیب ہیں ان کا شمار اردو کے اساتذہ میں ہوتا ہے اور ان کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ انھوں نے ان شاگردوں کے کلام پر اپنی اس گراں قدر تصنیف میں چار سو سے زیادہ اصلاحات مع دلائل شایع کی ہیں۔ سونے پر سہاگا یہ کہ "شعرہائے گفتنی" کے عنوان سے جناب جوش ملسیانی نے شعر کے حسن و قبح اور زبان و بیان کی اہمیت و معنویت پر وہ فنی نکات بھی بیان کیے ہیں جو نو آموز شاعروں کے لیے نہایت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

کاروانِ وطن ؛ از تلوک چند محروم۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی۔
قیمت ساڑھے سات روپے۔ ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی۔

جناب تلوک چند محروم اردو کے مشہور و معروف اور نغز گو شاعر ہیں جن کی شاعری محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے بیسویں صدی کے اوائل سے شعر کہنا شروع کیا اور اس دوران میں انھوں نے نہ معلوم کتنی غزلیں نظمیں اور رباعیات کہیں۔ کاروانِ وطن ان کی سیاسی منظومات کا مجموعہ ہے اس سے قبل ان کے کلام کے دو مجموعے شایع ہو چکے ہیں، گنجِ معانی اور رباعیاتِ محروم۔ کاروانِ وطن میں ۱۹۰۵ء سے لے کر اس وقت تک کی سیاسی نظمیں شامل ہیں اور اس کے دو حصے ہیں درماں و جرس اور منزل۔

کاروانِ وطن کی نظموں سے محروم کی صرف شاعرانہ قادر الکلامی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ ان کے بے پناہ جذبۂ حب الوطنی کا بے ساختہ اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ تلوک چند محروم کے زیر نظر مجموعے میں گوکھلے، تلک، سودیشی تحریک، سائمن کمیشن، گول میز کانفرنس، کیمونل اوارڈ، قحط بنگال، پاکستان، جشن آزادی، مہاتما گاندھی، کشمیر، ۲۶ جنوری، آزاد، غرض اس قسم کے سبھی موضوعات پر نظمیں پائی جاتی ہیں اور اس لیے بہ قول حضرت نیاز فتحپوری "ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی گزشتہ نصف صدی کی تاریخ بھی ہے، جذباتی تصویر بھی . . . ."

عالم برزخ کا ایک مشاعرہ ؛ از ڈاکٹر سید محمد حسنین۔ قیمت ۱۲ آنے۔
صفحات ۶۰۔ ناشر: ایوان اردو۔ پٹنہ

میر سے میراجی اور مجاز تک ۲۱ شاعروں کی روحوں کو ڈاکٹر سید محمد حسنین نے عالم برزخ کے ایک مشاعرے میں جمع کر دیا ہے اور ہر ایک سے اس کا نمائندہ کلام

سنوارنے کی تقریب چاہئی ہے۔ شعرائے کرام ایک دوسرے کے رنگ پر چوٹیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ جب مجاز کی باری آتی ہے اور وہ فاضل مصنف کی ایما سے "بول اَرے او دھرتی بول" کی نظم پیش کرتے ہیں تو ساقی میں بھی تابِ شنیدن نہیں رہتی اور اساتذہ کرام کی روحیں ایک ایک کرکے چل دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ نظم مجاز کی نمائندہ نظم نہیں ہے۔ پھر مجاز کی اسی نظم کا کیوں انتخاب کیا گیا۔ مجاز ایسا شاعر نہ تھا کہ حالی یا متقدمین اُس کے کلام پر مُنھ بناتے۔ مگر اس تمثیل میں مجاز کو ایسا ہی پیش کیا گیا ہے۔ شاید مصنف کے نزدیک ڈرامائی ضرورت کا یہی تقاضا تھا۔

بے ساختہ اور بے ضابطہ، سائز ۳۰×۲۰/۸، صفحات ۲۵۶، قیمت دو روپے بارہ آنے، ملنے کا پتہ: نصرت منزل، سدیلہ ضلع ہردوئی۔

وجاہت علی سدیلوی کے ۲۵ مزاحیہ افسانوں اور خاکوں کا یہ مجموعہ "اَدبی دنیا"، پارک روڈ، گوئن روڈ، لکھنؤ سے چھپا ہے۔

ظرافت اور مزاح آسان چیز نہیں۔ بعض وقت مزاح نگاری کی کوشش پھکڑ پن ہو کر رہ جاتی ہے۔ لطیف مزاح اور پھکڑ پن میں صرف ذوقِ سلیم حدِّ فاصل ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ وجاہت صاحب کے مذاقِ سلیم کا آئینہ دار ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ بیان و زبان کی صفائی اور سادگی نے بے ساختہ اور بے ضابطہ کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔

انتخابِ فتنہ مرتبہ نادم سیتاپوری۔ ناشر: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

اُنیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں اردو کے متعدد مزاحیہ اخبار نکلتے تھے جن میں اودھ پنچ کو تو ایک خصوصی درجہ حاصل ہی تھا، ریاض خیرآبادی کا مزاحیہ ہفتہ وار "فتنہ" بھی ظرافت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا تھا۔ اودھ پنچ کے انتخابات شایع ہو چکے ہیں لیکن "فتنہ" کا کوئی انتخاب ابھی تک شایع نہیں ہوا تھا۔ ملک کے مشہور اہلِ قلم جناب نادم سیتاپوری نے "انتخابِ فتنہ" شایع کرکے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ شروع میں نادم سیتاپوری صاحب نے اُنیسویں صدی کے اُردو اخباروں کی ظرافت اور ریاض خیرآبادی کی صحافتی و ادبی زندگی پر ایک مبسوط اور سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے جو بجائے خود ایک قابلِ قدر چیز ہے۔

گفتنی از محمود سعیدی۔ ناشر: مکتبہ تحریک، ۹۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی۔

محمود سعیدی نے اُردو کے مشہور شاعروں میں اپنے لیے ایک جگہ حاصل کر لی ہے اور زیرِ نظر مجموعہ جس میں اُن کی نظمیں، غزلیں، رباعیات اور قطعات شامل ہیں اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ اُن کی یہ نظمیں اور غزلیں ثابت کرتی ہیں کہ اُن کا انداز اور احساس ایک انفرادیت لیے ہوئے ہے۔

اُردو رسم الخط اور اُس کی اہمیت۔ مصنف محمد امین عثمانی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے، صفحات ۷۶۔ ناشر: ایشیاٹک لٹریری سوسائٹی، لکھنؤ۔

اُردو رسم الخط کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن حلقوں کو جواب دیے گئے ہیں جو اُسے ناقص سمجھتے ہوئے بدل دینا چاہتے ہیں۔ کاش اندازِ بیان معاندانہ و مناظرانہ نہ ہوتا۔ اِس لیے کہ یہ بحث تعصب کا نہیں غور و فکر کا معاملہ ہے اور مصنف کا تبحرِ علمی بھی سنجیدگی کا متقاضی ہے۔

رگِ سنگ صفحات ۹۱، قیمت ایک روپیہ، ناشر: کاوش بدری۔ ملنے کا پتہ: مدینہ پریس، ترپلیکین، مدراس ۵۔

اس سے قبل جنوبی ہند کے نوجوان شعرا کا منتخب مجموعہ کلام مرکزِ ادب مدراس کے زیرِ اہتمام شایع ہو چکا ہے۔ ضرورت تھی کہ یہاں کے نوجوان شاعروں میں سے الگ الگ شاعر کا کلام کتابی شکل میں شایع کیا جاتا۔ چنانچہ اس کمی کو دانش فرازی کے قطعات کو کتابی شکل میں ادارہ منزل، مدراس کے زیرِ اہتمام شایع کرکے پورا کر دیا گیا ہے۔ رگِ سنگ کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دانش اُردو ادب میں اپنی جگہ پیدا کرتے جا رہے ہیں۔

عکسِ خیال۔ ناشر و مصنف ارشد صدیقی ساگری، سائز ۳۰×۲۰/۸، صفحات ۶۴، قیمت دو روپے، اسٹوڈنٹس ایڈیشن ایک روپیہ، ملنے کا پتہ: مکتبہ دانش کدہ، بھوپال۔

کسی زبان کا منظوم ترجمہ آسان کام نہیں، لیکن ارشد صدیقی نے انگریزی نظموں کے ترجمہ کی دشوار گزار منزل کو بہت آسانی سے طے کیا ہے اور شعریت کو باقی رکھتے ہوئے جذبات اور احساسات کے ربط کو بھی خوبی سے قائم رکھا ہے۔

رقصِ جام: یہ حنیف سیابی کی رباعیات اور قطعات کا مختصر سا مجموعہ ہے جسے حافظ محمد عاشق پرنٹر قومی پریس، سہارن پور نے چھوٹے سائز پر شایع کیا ہے۔ قیمت بارہ آنے، ملنے کا پتہ: حنیف سیابی، محلہ چوب فروشاں، سہارن پور۔ حنیف کے یہاں فکر کی گہرائی ہے اور وہ جو کہتے ہیں موثر پیرائے میں کہتے ہیں۔

"خوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے"

سیّد علی سکندر جگر مراد آبادی

ولادت مراد آباد، ۱۸۹۰ء وفات گونڈہ، ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء

ایک عظیم شاعر —— ایک عظیم انسان

ص ۔ ع

موت سے کس کو رستگاری ہے۔ اس دنیا میں جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا بھی ہے لیکن بعض موتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے ساتھ ہزاروں کو مردہ کر دیتی ہیں۔ جگر مراد آبادی کی موت بھی انہیں موتوں میں ہے۔ اُن کی وفات صرف ایک شاعر کی وفات نہیں بلکہ ایک انجمن کی موت ہے۔ اُن کے مرنے سے دنیا ایک "انسان" سے اور ہندوستان ایک سچے محب وطن سے محروم ہو گیا ہے جگر کا۔ تغزل ہمارے ذہن و دماغ پر تیس برس تک حکومت کرتا رہا۔ جگر کی شاعری کی رندی و سرمستی ہمیں رُبع صدی سے زیادہ مسحور کیے رہی۔ جگر کے اشعار کی چبھن ہمارے دلوں میں اور سے بھی چلی آتی ہے۔ جگر کے لطیف اشارات و کنایات ابھی تک ہمارے قلوب کی دھڑکن بنے ہوئے ہیں۔ جگر اپنے ساتھ ان سب کو لیتے چلے گئے۔ جگر کی وفات کا ایک دائم ناک پہلو یہ ہے کہ اُن کی موت نے ہم سے ایک ایسے شاعر کو چھین لیا جس کی شاعری اور جس کی زندگی میں وہ ہم آہنگی پائی جاتی تھی جو ہر شاعر کے حصے میں نہیں آتی ہے

تکلف سے تصنع سے بری ہے شاعری اپنی   حقیقت میں جو ہے وہی ہے زندگی اپنی
جگر رہ جائے بس کر آہ جو اک کائنات سائل   نہ ایسی شاعری اپنی ، نہ ایسی زندگی اپنی

جگر کی شاعری سے سبھی واقف ہیں۔ اُردو کے ناقد اس پر تبصرہ کر چکے ہیں اور کرتے رہیں گے لیکن شاعر کے علاوہ جگر کچھ اور بھی تھے۔ ایک انسان، ایک پیکر انسانیت، ایک محب وطن اور حقیقی معنوں میں خلوص و محبت کا ایک مجسمہ

جگر کی ہے زندگی محبت نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت
جگر کے دل میں ہے سب کی عزت جگر ہے یاروں کا یار بھی

اُردو کے نوجوان شعرا میں مشکل ہی سے کوئی ایسا شاعر ہوگا جسے جگر جانتے ہوں اور جس کی اُنھوں نے ہر طرح ہمت افزائی نہ کی ہو۔ اُن کے جاننے والوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جس کے لیے وہ خلق مجسم نہ بن گئے ہوں۔ اُن سے ایک دفعہ بھی جو ملا وہ ہمیشہ کے لیے اُن کے خلوص و محبت کا کبھی نہ مٹنے والا نقش اپنے دل پر لے کر اُٹھا۔ کسی کا دل توڑنا، کسی سے انکار کرنا، کسی کو رنجیدہ کر دینا یا کسی کی کوئی فرمائش ٹال جانا جگر کی فطرت ہی میں نہ تھا۔ وہ اگر کوشش بھی کرتے تو اس میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ اور تو اور انھوں نے اپنی "بیماری دل" میں بھی جس نے "آخر اُن کا کام تمام کیا" دوستوں ہی کی ہر خوشی کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر دیا۔

تقریباً تین برس ہوئے، جگر صاحب قلب پر دورہ پڑنے کے بعد بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے اور لکھنؤ کے ایک مشہور معالج کے پاس بغرض مشورہ گئے۔ راقم الحروف اُن کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں دیکھنے کے بعد کہا کہ "جگر صاحب، میں نسخہ اُس وقت لکھوں گا جب آپ مجھ سے دو وعدے کریں۔ ایک تو یہ کہ آپ کسی کے بلانے پر کہیں جائیں گے نہیں، دوسرے یہ کہ اگر آپ کبھی کہیں چلے بھی جائیں یا کچھ لوگ آپ کے پاس آئیں تو آپ انھیں غزل نہ سنائیں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ کو آپ کے احباب کہیں بلائیں گے تو آپ جائیں گے ضرور اور اگر آپ سے کوئی غزل سنانے کی فرمائش کر بیٹھے گا تو آپ اُسے غزل بھی سنائیں گے۔ آپ پر دل کا دورہ پڑ چکا ہے اور یہ تمام باتیں مرض کو گھٹائیں گی نہیں بلکہ اُس میں اضافہ کریں گی۔ آپ دوا استعمال کیجیے گا اور بے احتیاطی رہے گی تو فائدہ کوئی نہ ہوگا۔" جگر صاحب نے جواب دیا "جی نہیں آپ جیسا فرمائے ہیں میں اس پر عمل کروں گا۔" یہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھنا ہی شروع کیا تھا کہ۔۔۔ صاحب نے ایک دل دُکھا دینے والا "ڈاکٹر صاحب! آج کچھ احباب نے شام کو بُلایا ہے۔ نہ جاؤں گا تو اُن کی دل شکنی ہوگی۔" ڈاکٹر صاحب نے قلم رکھ کر بڑے اطمینان سے پوچھا "اگر آپ سے غزل سنانے کی فرمائش کی جائے گی تو آپ غزل بھی سنائیں گے؟" جگر صاحب نے بڑی معصومیت سے بولے "ڈاکٹر صاحب، آپ ہی بتائیے، انکار کیسے کر سکوں گا؟" ڈاکٹر صاحب نے پھر کہا "تو آپ ہو آئیے۔ میں کل نسخہ لکھوں گا۔" شام ہوئی تو جگر صاحب سب کے منع کرنے کے باوجود اپنے احباب کے یہاں وقت مقررہ پر پہنچے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ انھیں نہ صرف غزل بھی پڑھنا ہے۔ جگر صاحب نے پڑھے اور دو گھنٹے تک غزلیں سناتے رہے! یہ تو صرف ایک واقعہ ہے لیکن ایسے واقعات نہ معلوم اُن کی زندگی میں کتنے گزرے۔ جگر کے اسی مزاج کا پرتو اُن کے اشعار میں نظر آتا ہے

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگر   آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

ہر چند کائناتِ دو عالم میں لے جگر   انساں ہی ایک چیز ہے انساں اگر ملا

جب تک انساں پاک طینت ہی نہیں   علم و حکمت علم و حکمت ہی نہیں

آدمی کے پاس سب کچھ ہے مگر   ایک تنہا آدمیت ہی نہیں

جگر صاحب لوگوں کو مسخر کر لینے کی قدرت رکھتے تھے اور اسی کو وہ انساں کی سب سے بڑی

دیوانہ گیا

(حضرت جگر مرادآبادی کے انتقال پر)

مطر سلیم

(۱)

روٹھ کر یوں وہ رفیقِ جام و پیمانہ گیا
ساتھ اُس کے جیسے مے خانے کا مے خانہ گیا

اُس کے جاتے ہی جنوں کے ہوش پر بجلی گری
اُس کے اُٹھتے ہی خرد کا ذوق رندانہ گیا

تیرگی میں تھرتھرا کر رہ گئی شمعِ جمال
جان دے کر محفلِ خوباں سے پروانہ گیا

تذکرے باقی رہے زلف ولب و رخسار کے
حُسن کی رنگینیوں کا آئینہ خانہ گیا

چھیڑ کر افسانۂ غم، توڑ کر سازِ غزل
اپنی دُھن میں جانے کس جانب وہ دیوانہ گیا

داستانِ عشق و جنوں کی نامکمل رہ گئی
داستاں گو، بزم سے خود بن کے افسانہ گیا

شاعری کو فخر تھا جس پر وہ شاعر چل بسا
زندگی کو ناز تھا جس پر وہ دیوانہ گیا

(۲)

لغزشِ پائے جنوں سے راستے پیدا ہوئے
منزلیں پائیں خرد والوں نے، تقدیریں بنیں

فیضِ بادہ سے زمیں تک آ گئے، خورشید و ماہ
آسماں پر جام و پیمانہ کی تصویریں بنیں

خارزارِ زندگی میں آنکھ سے ٹپکا لہو
وقت کے سینے پہ خوابِ دل کی تعبیریں بنیں

ذہن و دل کی جُراتیں، فکر و نظر کی وسعتیں
اِس ہوس کے دَور کی ظلمت میں تنویریں بنیں

وادیٔ افکار میں آئی بہارِ جاوداں
ذرّے ذرّے پر لبِ عارض کی تصویریں بنیں

برگِ گل پر طبع کی جولانیاں شبنم کہیں
ظلم کے سر پر کہیں بے تاب شمشیریں بنیں

جس نے ایسے نقش چھوڑے جاوداں ہی اُس کا نام
جاوداں اس کی محبت، اس کا دل، اس کا پیام

تلوک چند محروم

محفل سے اٹھا صاحبِ آدابِ غزل　　افسوس کہ ٹوٹا دلِ بیتابِ غزل
اے میکدۂ سخن میں آنے والو　　چھلکا ہے جامِ بادۂ نابِ غزل

(۲)

الفت کو بسا کے تن بدن میں جاں میں　　الجھا نہ کبھی تیز این و آں میں
گو دیر و حرم سے تھی الگ ذاتِ جگر　　سب روتے ہیں اس کو ہند و پاکستاں میں

(۳)

شاعر ہے کوئی عزیزِ دلہائے عوام　　اور بزمِ خواص میں کسی کا ہے مقام
قدرت نے جگرؔ کو یہ فضیلت بخشی　　مقبول خاص و عام ہے اس کا کلام

(۴)

سالک ہے وہی جو منزلوں پہ چھا جائے　　واعظ ہے وہی جو محفلوں پر چھا جائے
شاعر ہے وہی، علی سکندر کی طرح　　جو ساری قوم کے دلوں پر چھا جائے

(۵)

تھی جانِ سخن جو ذات، تجھ میں نہ رہی　　وہ تازگیٔ حیات تجھ میں نہ رہی
اے بزمِ سخن جگرؔ کی خاموشی سے　　وہ دور گیا وہ بات تجھ میں نہ رہی

نغمے کی موت

سید احتشام حسین

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا یعنی ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو جگر مرادآبادی نے اس دنیا کو خیرباد کہا کئی سال سے ان کی صحت خراب ہی ہوتی جا رہی تھی اور ان کے دوستوں، عزیزوں اور عقیدت مندوں کا یہ اندیشہ بیجا نہ تھا کہ ان کی زندگی کا چراغ کسی لمحہ گل ہو سکتا ہے۔ اس اندیشے اور یقین کی حد تک پہونچے ہوئے اندیشے کے باوجود جگر کے انتقال نے ان کے جاننے والوں کو اسی طرح متاثر کیا جیسے اچانک خبر سے ہونا چاہئے تھا اور اگرچہ انھوں نے ستر سال کی عمر پائی لیکن یہی احساس ہوا کہ وہ قبل از وقت ہم سے جدا ہو گئے۔ یہ بات اس حقیقت کی غماز ہے کہ ان کی حیثیت محض ایک شاعر کی نہیں تھی بلکہ وہ ایک روایت بن گئے تھے اور ان کی شخصی اور شاعرانہ زندگی میں ایک ایسی کشش اور جاذبیت کے بالکل تھے جس سے محرومی احساس زیاں پیدا کرتی ہے۔ جگر کو جو ہر دلعزیزی، محبوبیت اور مقبولیت اپنی زندگی میں اور شاعرانہ زندگی کے بڑے حصے میں حاصل رہی وہ بہت کم شاعروں اور فن کاروں کے حصے میں آئی ہے۔ ۱۹۳۰ء سے پہلے ہی مشاعرے ان کے بغیر سونے معلوم ہونے لگے تھے اور بہت سے لوگ صرف انھیں سننے اور دیکھنے کے لئے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔

غالباً ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ میں اعظم گڑھ میں آٹھویں درجے کا طالبعلم تھا۔ شعر و ادب سے میری دلچسپی کا آغاز ہو چکا تھا اور الٹے سیدھے اشعار موزوں ہونے لگے تھے۔ ان دنوں جگر صاحب اپنے کاروبار کے سلسلہ میں اکثر اعظم گڑھ جایا کرتے تھے۔ دارالمصنفین، مولانا اقبال سہیل اور مرزا احسان احمد بیگ کی وجہ سے وہاں شعر و ادب کا چرچا رہتا تھا، چھوٹے چھوٹے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اصغر گونڈوی بھی ہوتے تھے جگر ہفتوں اعظم گڑھ اور وہاں کے دوسرے قصبات میں قیام کرتے تھے۔ کاروبار محض ایک بہانہ تھا اس طرح انھیں لوگوں سے ملنے اور شاعرانہ مشاغل میں وقت گزارنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے مشاعرہ مرزا احسان احمد کے یہاں تھا اور طرح تھی ع

جلووں کے اژدہام نے حیراں بنا دیا

اس میں آپ کو اصغر، جگر، سہیل اور احسان سبھی کی غزلیں ملیں گی۔ یہ واقعہ اس لئے بھی یاد ہے کہ میں نے شاید پہلی دفعہ باقاعدہ غزل کہی تھی اور جب مقطع کے لئے تخلص کی تلاش ہوئی تو قافیہ کی آسانی کے لئے حیراںؔ تخلص رکھ لیا تاکہ اس مصرعہ میں معنی پیدا ہو جائیں ع

حیراں کو تم نے اور بھی حیراں بنا دیا

جگر کو پہلی دفعہ قریب سے دیکھنے اور ان کی سحر کار آواز کو سننے کا موقع ملا۔ غزل کے اعتبار سے سہیل، اصغر اور احسان کی غزلیں بھی لاجواب تھیں لیکن سننے والے جگر ہی کے جادو میں گرفتار ہوئے اس وقت ان کی شاعری کا رنگ بھی نکھر رہا تھا اور آواز پر بھی جوانی تھی۔ مستی اور سرشاری نے کلام اور طرز ادا دونوں میں آتش نفسی پیدا کی تھی اور ناممکن تھا کہ سننے والا اس سے متاثر نہ ہو۔ ان کی آواز دوسرے شاعروں سے مختلف اور ان کا لہجہ دوسرے لہجوں سے الگ تھا۔ ان کے مزاج اور ان کی شاعری دونوں کا رشتہ داغ سے مل جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ ان سے علاحدہ ہیں۔ فضاؤں کے اختلاف سے لہجہ کا بدل جانا، موثرات سے خیالوں کی دنیا میں تغیر کا پیدا ہو جانا اور سامعین کے تبدیل ہو جانے سے نغمہ کی ترتیب کا تبدیل ہو جانا فطری ہے اس لئے جگر، داغ کی قدیم دنیا کے مقابلہ میں جدید عہد کے شاعر ہیں۔ جہاں داغ کی غزلیں آسودگی بخشنے میں ناکام رہتی ہیں وہاں جگر کامیاب ہو جاتے ہیں کیونکہ بقول رشید احمد صدیقی ان کی شاعری میں وہ عناصر ہیں جو اس دور کے آشوب و آزمائش میں غزل کو تب و تاب دے رہے ہیں۔

جگر کے بارے میں عام طور سے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک رومانی شاعر

ہیں۔ وہاں مستی کا تصوّر اتنا تہہ دار ہے کہ بعض اوقات محض اس لفظ کے استعمال سے وہ ساری باتیں سامنے آجاتی ہیں جن سے ان کی شاعری میں توانائی اور سرور و مستی کی آمیزش ہوئی ہے۔ یہ صورت حال کچھ ایسی ہے کہ بیسویں صدی بلکہ تقریباً پچاس سال کی مدت اور سیاسی و عالمی آزمائشوں کی کوششوں کا سبب۔ پہلے مجموعۂ کلام داغ جگر کا شاعر وہ نہیں ہے جو آتش گل کا ہے۔ ہی نہیں شعلۂ طور کے جگر اور آتش گل کے جگر میں فرق ہے۔ یہ فرق محض پختگی اور مشاقی کا سبب نہیں بلکہ ارتقائے ذہن و شعور کا سبب ہے۔ اس بیان ہی نہیں ہوتا، ذہن بھی بیدار ہوتا ہے، گرد و پیش کی دنیا سے رشتہ مستحکم ہو جاتا ہے اور شاعر اپنی شخصیت اور انفرادیت کی توسیع کرتا ہے۔ اکثر فنکاروں کی زندگی اور کلام کے مطالعہ سے یہ دلچسپ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگرچہ ان کی ابتدا اور انتہا میں بہت سی تبدیلیاں حائل ہوتی ہیں اور کئی عبوری دور آتے ہیں لیکن شخصیت کے اکثر و بیشتر پہلو وہی رہتے ہیں

جگر مرادآبادی کے رنگ تغزل پر غور کرتے ہوئے جہاں بیسویں صدی کی غزل گوئی کی خصوصیات اور اسالیب کی نگارش کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے وہاں ان کے تاثرات اور نفسی میلانات کو بھی دیکھنا لازمی ہے۔ جگر کی ابتدائی شاعری پر داغ کے اثر کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کے پہلے مجموعہ کا نام داغ جگر ہے۔ ممکن ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر داغ کا لفظ اس نام میں اسی وجہ سے شامل ہو لیکن حقیقت کیا ہے؟ جگر کی عمر صرف پندرہ سال کی رہی ہوگی جب داغ کا انتقال ہو گیا۔ اس صورت میں ان سے اصلاح لینے کی کیا صورت ہو سکتی ہے، یہ غور کرنے کی بات ہے۔ اصلاح کے باقاعدہ سلسلہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا، ہاں داغ کے رنگ یا اسلوب کی پیروی ممکن ہے لیکن جب ہم جگر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو داغ کی امتیازی خصوصیات ان کے یہاں واضح طور پر نہیں ملتیں۔ داغ کی مقبولیت کی وجہ سے لطف زبان اور معاملہ بندی سے ملتے جلتے حسن و عشق کے بیان کو عام پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا۔ اس لئے دوسرے شاعروں کی طرح اگر جگر نے بھی ان خصوصیات کو اپنایا تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ نظریۂ شاعری، نظریۂ حسن و عشق اور نظریۂ زندگی سب میں وہ داغ سے مختلف ہیں۔ داغ کے یہاں حسن و عشق کا وہ احترام نہیں ہے جو جگر کے یہاں ہے، نہ زندگی کی وہ ترجمانی ہے۔ داغ اور جگر کا موازنہ ضمناً آگیا کیونکہ اردو شاعری میں استادی اور شاگردی کے رشتہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کچھ لوگوں نے جگر کو داغ اسکول سے وابستہ کر کے اس انفرادیت کو نظر انداز کیا ہے جو شروع ہی سے جگر کے یہاں پرورش پا رہی تھی۔ اسی طرح رسا یا تسلیم سے جگر کو کتنا فیض پہنچا یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ تسلیم اپنا رشتہ نسیم دہلوی سے ملاتے اور مومن تک پہنچتے تھے۔ گو ان کے کلام میں مومن کا رنگ تغزل نہیں ملتا لیکن قرأت کے پیچیدہ عمل سے جگر کبھی کبھی مومن کے قریب نظر آتے ہیں۔ جس طرح مومن کی شاعری میں واقعاتی رنگ ہے اسی طرح جگر بھی اپنی غزلوں میں اپنی ہی محبت کا بیان کرتے ہیں۔ اس لئے شروع ہی سے جگر کے کلام میں خلوص اور صداقت کے جوہر نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک زمانے میں جگر کا یہ جملہ زبان زد تھا کہ "شعر کہا نہیں جاتا، ہو جاتا ہے"۔ اگر اس سے وہی وجدانی صداقت مقصود ہے جو تجربات کی وجہ سے شعر بن جاتی ہے تو یہ بالکل درست ہے کیونکہ غزل کے اشعار میں داخلی تجربہ اور اس کے پر کیف بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر اس سے بیان کی بے ساختگی مقصود ہے تو اس سے بھی جگر کا کلام مالا مال ہے۔ مقصد یہی ہے کہ جو سچائی ان کے یہاں ابتدا میں پائی جاتی تھی وہ آخر وقت تک باقی رہی کیونکہ جذبات ان کے لئے حقیقت تھے۔ بعد کی شاعری میں جگر کو جذبات کے ساتھ ساتھ ضرور ... کہیں کہیں تصوف یا ماورائیت کی آمیزش ہو گئی۔

مجھے حق کی صداقت یہ بھی تسلیم ہو چلا تھا میرے دل سے کہہ گئی کیا وہ نگاہ ناقدانہ

حسن کو بھی کہاں نصیب جگر   وہ جو اک شے مری نگاہ میں ہے

لیکن ایسے اشعار بہت کم ملیں گے۔ جگر نے ہمیشہ ایک غزل گو شاعر کی طرح حسن و عشق کا تصور جذبہ کے راستے سے کیا ہے۔ کھلے کھلے ان کے بیان میں فکری عنصر کی آمیزش ہوتی ہے لیکن ایسا کم ہے کہ جذبے کے غلبے نے تخیل کی راہیں بند کر دی ہوں اور شاعری محض اعصاب کی پکار بن کر رہ گئی ہو۔ عشق اور رندی کے ابتدائی طوفان میں یقیناً جذبہ ہی رہنما ہوتا ہے۔ احتیاط، سوچ بچار، فکر سب حلقۂ بیرون در معلوم ہوتے ہیں لیکن زندگی کی کشاکش اس طوفان کا ریلا برداشت کرنے کے سلسلے میں بہت کچھ سبق بھی دیتی ہے اور شعور کا دائرہ (اس میں حسن و عشق کی حقیقت کے شعور کا دائرہ بھی شامل ہے) پھیلتا ہے۔ کامیابی اور ناکامی کی دھوپ چھاؤں، وصل کی نوازش اور ہجر کی محرومی کی آنکھ مچولی کاروبار محبت کی بڑی صداقتیں ہیں۔ انھیں کی رنگا رنگی سے ہزارہا تصویریں بنتی ہیں، ہزار ہا رنگین نقش بنتے اور مٹتے ہیں۔ اگر ان کی مصوری محض شاعری کے بل بوتے پر کی جائے تو یہ صرف ایک روایت کی پرستش ہوئی اور اگر انھیں خود اپنی زندگی کے حقائق تسلیم کر کے پیش کیا جائے تو وہ جاندار شاعری وجود میں آتی

ہے جو اپنے والہانہ پن، خلوص اور صداقت اظہار کی وجہ سے خود ایک روایت بن جاتی ہے۔ جنسی ہیجان سے وجود میں آنے والی عشقیہ شاعری کبھی سطحی اور مبتذل ہو جاتی ہے اور کبھی مرتفع ہو کر جمالیاتی تجربہ بنتی اور ذہنی آسودگی پیدا کرتی ہے۔ جگر کے یہاں دونوں صورتیں ملتی ہیں، اس لئے مجنوں کا یہ خیال درست نہیں معلوم ہوتا کہ جگر کی شاعری بالکل سطحی ہے اور محض جلد کو چھوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کے وہ شعراء جن کی دنیا محض حسن و عشق تک محدود تھی ان کا فکری سرمایہ بہت ہلکا تھا۔ جرأت، مومن، داغ سب اپنے اپنے رنگ کے اچھے شاعر ہیں لیکن انھوں نے زندگی کے صرف چند پہلوؤں سے چمن آراستہ کئے۔ زمانے کے مطالبات نے جگر کو ان شعراء کی صف سے آگے بڑھا دیا۔ بیسویں صدی میں عشق و محبت کے تجربے بھی نئی نفسیاتی الجھنوں اور سماجی پیچیدگیوں کا شکار رہیں اور ان کا سادہ بیان بے اثر ہوتا ہے۔ جگر نے اس راز کو پالیا اور سادگی کو پرکاری عطا کی۔ اس پرکاری کو تفکر کہنا درست ہو گا لیکن اسے سطحی کہنا بھی درست نہیں۔ محض جنسی تسکین اور ہیجان سے پیدا ہونے والی شاعری متضاد عارضی لمحات کی شاعری ہوتی ہے لیکن جب اس میں شاعر کی شخصیت ابھر آئے اور تجربوں کا تسلسل نمایاں ہو جائے تو وہ سطحیت سے آگے نکل جاتی ہے۔ جگر کے یہاں تجربوں کے اسی تسلسل نے صداقت پیدا کی اور ان کے اظہار میں ایسی تہذیب اور ترتیب پیدا کی جو ان کے شائستگی مزاج پر دلالت کرتی ہے۔

اگرچہ جگر نے کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں، جن کو غزل نما نظمیں کہنا زیادہ موزوں ہوگا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ صرف غزل کے شاعر ہیں اور غزل کا دامن کتنا ہی وسیع ہو زندگی کے سارے تجربوں کو نہیں سمیٹ سکتا۔ غزل کی یہ بنیادی خامی ابھی ہے جس سے ہر غزلگو کو سابقہ پڑا۔ اس لئے جگر کا مطالعہ غزل کے دائرے کے اندر ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہاں زندگی کی مربوط اور مکمل تصویر کشی کا امکان نہیں ہے لیکن اشاروں کنایوں میں، رمزیہ تمثیلوں میں اور نشتر آگیں جملوں اور فقروں میں تجربات حسن و عشق کو جذبات کا لباس پہنا کر پیش کرنا کسی حد تک تکرار اور تعمق کی تلافی کرتا ہے۔ جگر نے اپنی داستان زندگی اور اس کے تجربات اسی طرح بیان کئے ہیں اور ان کے گہرے مطالعہ سے ہمیں ان کے تجربوں کی انفرادیت اور ان کی شخصیت کے بنیادی خد و خال کا سراغ ملتا ہے۔ وہ اچھے غزلگویوں کے دور میں اپنی ایک الگ آواز رکھتے تھے جو دوسروں کی آواز میں گم نہیں ہوئی۔ اس کا اصل سبب ممکن ہے ان کے اسلوب اور انداز بیان کو قرار دیا جائے لیکن اگر اس میں ان کے جذبات کی صداقت اور محبت پر کامل یقین کو بھی شامل کر لیا جائے تو موجودہ دور کے غزلگویوں میں جگر کے مقام کا تعین کسی قدر آسان ہو جائے

گا۔ جگر کوئی پیغام نہیں رکھتے۔ اگر کوئی پیغام ہے تو وہ حسن و محبت پر یقین اور اس کے احترام کا پیغام ہے۔ آخری دور کی شاعری میں اس پیغام کی معنویت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے ایسے اشعار سوچ سمجھ کر کہے ہیں ؂

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

اے کمال سحر کے دلوانے
ماورائے سحر بھی ہے اک بات

کہاں کا حسن کہ خود عشق کو خبر نہ ہوئی
رہِ طلب میں کچھ ایسے بھی امتحاں گزرے

کبھی کبھی تو اسی ایک مشتِ خاک کے گرد
طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گزرے

حقیقت یہ ہے کہ ان اشعار میں بھی اس طرح کا کوئی پیغام نہیں ہے جیسا کہ کچھ لوگ اقبال اور دوسرے شعراء کے یہاں تلاش کرتے ہیں لیکن عشقیہ شاعری کے پردے میں اور رموز حسن و عشق کے حجابات کو برقرار رکھتے ہوئے جو باتیں کہی گئی ہیں وہ فکر انگیز ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب عشق و سرمستی کا ابتدائی ہیجان تھا تو جگر کے خیالات میں پختگی اور ارتفاع بے شک پایا اور اپنی ذات سے ہٹ کر نگاہ دوسروں تک بھی گئی۔ جب جنسی محبت ہی زندگی میں مرکزی مقام رکھتی تھی اس وقت حادثات و واقعات کی وہ دنیا نظر ہی نہیں آتی تھی جس کے اثرات محبت کی زندگی پر بھی پڑتے رہتے ہیں لیکن واقعات کی منطق نے ان کا احساس کرنے پر بھی مجبور کیا ؂

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ ادھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی

بہت حسین مناظر بھی حسن فطرت کے
نہ جانے آج طبیعت پہ کیوں گراں گزرے

جب یہ صورت پیدا ہوئی تو جگر کو اپنے مزاج اور تصورفن میں کسی بڑی تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ غزلوں ہی کے رموز و اشارات میں یہ تجربات بھی ڈھل گئے۔ چونکہ جگر کو غزل کی لطافت اور نزاکت کا شدید احساس تھا اور وہ اسے نظم گوئی سے زیادہ عظیم فنکاری سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے عام طور سے ایسے خیالات کو اپنی غزلوں میں جگہ نہیں دی جو ان کے نظریہ کے مطابق غزلوں میں جگہ نہیں پا سکتے تھے تاہم جب بنگال کے قحط کی الم ناک اور دل شکن کہانیاں ان کے کانوں تک پہونچیں تو ان کی زباں سے یہ اشعار نکل گئے ؂

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

ہستی ... اس کو شاہد مستور سے کہاں
شاعر ہے رند بیکر سرِ عریاں ہے آج کل

ساز حیات ساز شکستہ ہے ان دنوں
بزم خیال جنت ویراں ہے آج کل

جگر نے اس نظم کو غزلوں سے الگ کہا ہے لیکن ظاہر کر دیا ہے کہ شاعری کا دائرہ غزلگوئی کے دائرہ سے وسیع تر ہو۔ نظریۂ شعر یا نظریۂ زندگی میں یہ تبدیلی ان کے ابتدائی تصورات

ذات کا تسلسل ہے۔ ان کی شاعری اور زندگی میں مادرائیت یا جمالی تصوریت کی کوئی جگہ نہ تھی۔ ذاتی واردات نے بیان سے آگے بڑھ کر ان کی شاعری کو ایک مخصوص انداز سے ہمکنار کیا اور ان کی شخصیت کے تسلسل اور ان کی انسانی گہرائی کا پتہ دیتا ہے۔ وہ صوفیانہ یا روحانی تصورات جو اصغر کے اثر سے ان کے یہاں پیدا ہوئے، وہ ان کی ہستی اور زندگی میں کوئی بنیادی مقام نہیں رکھتے اور وہ استعارات میں ان کا بیان ہے، وہ ان کے بہترین اشعار میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے محض حسن و عشق کا شاعر کہنا بھی ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرنا ہے۔ خود ایسا حسین، عام اور عالمگیر موضوع ہے جو فن کے پیکر میں ڈھل جانے کے بعد ہی خود بخود عظمت اختیار کر لیتا ہے۔

اب رہی جگر کے اسلوب اور انداز بیان کی بات تو یہ بھی ان کی شخصیت اور انفرادیت سے متعلق ہے۔ انھوں نے غزل کی اصل روح کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی۔ اپنے جذبات کی شریف و متانت اور شگفتہ حقائق سے اپنے اسلوب میں تازگی اور انفرادیت پیدا کی۔ اسلوب شخصیت اور طرز خیال کا پابند ہوتا ہے۔ یہ ایک مجسم ادیب جو صرف زندگی نے ان کے طرز اظہار میں توانائی پیدا کی۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ان کی شاعری کا جادو محض اسلوب کی جدت کا جادو ہے تو اسے یہ بھی کہنا پڑے گا کہ صرف اسلوب تاثر نہیں پیدا کر سکتا ہے۔ حالانکہ اگر کہیں چھوٹے چھوٹے زبان و بیان کا لطف تاثر بھی پیدا کر دے تو وہ اس اثر کا بدل نہیں ہو سکتا جو جذبہ کی صداقت یا خیال کی رعنائی سے خود بخود آ جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلوب کی یہی تازگی، جذبہ کی یہی صداقت شخصیت کا یہی انمیں اظہار کی یہی پرکار سادگی فکر کی کمی کا بدل بن جاتی ہے اور جگر کی تمام فنی قلت کے باوجود طے کر کے لطیف احساسات کو جگاتی اور محبت کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑ کر نغمہ پیدا کرتی ہے۔ محبت کے تاثر میں جو غنائیت پوشیدہ ہے وہ جگر کے یہاں الفاظ میں سرایت کر گئی ہے۔ ان کے الفاظ کے انتخاب، تراکیب اور بندش سے نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ افسوس کہ اردو کا ایک نغمہ گر نہ رہا۔ اس کی آواز کا جادو اب دیکھنے میں نہ آئے گا لیکن وہ نغمے جو اس نے اپنے اشعار کو سونپ دیئے ہیں وہ زندہ رہیں گے اور محبت کرنے والوں کے دلوں کی دھڑکن بنتے رہیں گے۔

ایک عظیم شاعر

سوز و شوق، سوز و ساز، درد وطن یہ زندگی ہوا بھی کرے گی کا کہیں
ہندوستان نے ایک نئے جمہوری دستور اساسی وضع کیا تو جگر کو اس سے خوشی ہوئی اور ایک محب وطن کی طرح انھوں نے یہ آرزو کی کہ ؎

بہار آئے اور اس شان سے بہار آئے
کہ پھول ہی پھول کانٹوں پہ بھی نکھار آئے

پھر یہ بتایا کہ ؎

یہ کیسے کی یہ ساقی گری کی ہے توہین
کوئی ہو جام بکف کوئی شرمسار آئے

صیاد نے حسن چمن کو اجاڑ دیا تھا اسے پھر سے سنوارنے کے لیے ان کا یہ پیغام تھا ؎

خلوص ہمت اہل چمن پہ ہے موقوف
کہ شاخ خشک میں بھی پھر سے رنگ و بار آئے

اسی جذبے کا اظہار اس شعر میں بھی ہوا ہے ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

شعار کیسا ہونا چاہیئے، اس کے بارے میں کہتے ہیں ؎

وسیع مسلک، فراخ فطرت، خلوص بیان، خلوص نیت
انھیں عناصر پہ ہے وطن کے وقار کا انحصار اب بھی

ایک عظیم انسان

(سلسلہ صفحہ ۵۴)

لیکن جب یہ محسوس کرتا ہے کہ "میاں جنوں" اور "تنظیم میخانہ" ابھی "ناقص" ہو تو وہ خود بے تاب ہو کر کھڑا ہوتا ہے اور ساقی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاک وطن ساقی
خدا حافظ! چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

ساتھ ہی ساتھ اسے یہ بھی یقین ہے کہ تاریکیاں ختم ہو کر رہیں گی اور حیات کی کرن ظلمت کو دور کر دے گی ؎

سو دیسے کا اب سی دلیل صبح صادق ہے
افق سے زندگی کی دیکھ وہ ابھری کرن ساقی

حافظ شیرازی نے ساقی کا جام اس لیے طلب کیا تھا کہ جنت میں "کنار آب رکنا باد" اور "گلگشت مصلی" نہیں نصیب ہوگا اور جگر نے نظم کے آخر میں یہ جام اس لیے طلب کیا ہے کہ جنت میں "سواد ساحل گنگا" نہ مل سکے گا۔

وطن کا یہ شیدائی، انسانیت کا یہ علمبردار، خلوص و محبت کا مجسمہ، ایثار و شرافت کا یہ پیکر، حسن پرستی کو بار تھا حسن نے عشق کو خودداری عطا کی تھی، جو ہر محفل سخن کی جان تھا، جس نے اردو غزل کو ایک نئی رعنائی بخشی تھی، جس کا ترنم کانوں میں ہر وقت گونجا کرتا تھا، جس کی زندگی پر رشک آتا تھا، اب ہمارے درمیان نہیں رہ گیا ہے کہ وہ باقی ہے لیکن "بزم جانانہ" نہیں۔ پیمانۂ غزل آبدیدہ ہے کہ اس کا پرستار اٹھ گیا۔ زلف محبوب بکھری ہوئی ہے اور اس کا سنوارنے والا نہیں رہ گیا ہے۔ محفل شعر قائم ہے مگر شمع بجھ گئی ہے!

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو۔

جلد ۱۵ نمبر ۸

کارتک ۱۸۸۲

نومبر سنہ ۱۹۶۰ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم

مطبوعہ
یوپی گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

اب سے تقریباً ۴۰۰ برس پہلے جب دلّی کے شہنشاہ فرخ سیر نے فارسی اور سنسکرت کے ایک نامور کشمیری عالم پنڈت راج کول کو دلّی آنے کی دعوت دی تو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ وہ مستقبل کے ہندوستان کی ایک ایسی عظیم ہستی کے مورث بن رہے ہیں جس کے لیے موجودہ صدی اور اس کے بعد کا ہر ہندوستانی اُن کا ہمیشہ کے لیے ممنون کرم رہے گا۔ لیکن یہ حقیقت بہر حال اپنی جگہ ہے کہ مغل شہنشاہ کے اس اقدام نے تقریباً دو سو برس بعد جب ہندوستان کی تاریخ میں ایک نیا باب کا آغاز کیا اور ملک کو وہ جواہر عطا کیا جس کی سادگی اور درخشندگی نے تیرہ و ظلمت کدۂ ہندوستان کی آزادی کا چراغ روشن کر دیا اور جس کی قوت نے حوصلہ و ہمت کے ایسے جذبات اُن سیاہ دلوں میں بھی پیدا کر دیے جو آج اپنی عالم پر چھائے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کا یہ جواہر جس کی آب و تاب نے یورپ والوں تک کو حیران کر رکھا ہے ہندوستان کا عظیم وزیر اعظم اور محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو ہے جو آج سے ۷۲ سال پہلے ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو ہندوستان کے مقدس ترین شہر پریاگ (الٰہ آباد) میں پیدا ہوا۔

پنڈت جواہر لال کے جد امجد جب دلّی پہنچے تو بادشاہ نے اُن کی بڑی قدر و منزلت کی اور نہر سعادت خاں کے کنارے انھیں ایک جاگیر عنایت کی (بعد میں اسی نہر کی رعایت سے پنڈت راج نرائن کول کی اولاد کا خاندانی نام نہرو پڑ گیا) لیکن مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ نہرو خاندان کے افراد کو بھی زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا اور یہ جاگیر بھی ختم ہو گئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے پردادا پنڈت لکشمی نرائن نہرو لال قلعے میں مغل بادشاہ کے دربار میں کمپنی کے پہلے وکیل مقرر کیے گئے اور پنڈت جواہر لال نہرو کے دادا پنڈت گنگا دھر نہرو ۱۸۵۷ء سے پہلے دلّی کے کوتوال کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں نہرو خاندان دلّی سے آگرے منتقل ہو گیا۔ آگرے ہی میں ۱۸۶۱ء میں پنڈت جواہر لال کے والد پنڈت موتی لال نہرو پیدا ہوئے۔ تعلیم کے بعد وہ آگرے سے الٰہ آباد چلے گئے اور وہیں ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے انھوں نے نام پیدا کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو الٰہ آباد ہی میں ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے اور شہزادوں کی طرح اُن کی پرورش ہونے لگی۔ کھاتے پیتے گھر کے اکلوتے لڑکے ہونے کی وجہ سے اس کا اندیشہ ہو سکتا تھا کہ لاڈ پیار انھیں خراب نہ کر دے لیکن کم عمری میں معقول تعلیم و تربیت اور اپنی فطری صلاحیتوں کے باعث بچپن ہی میں جواہر لال کے "ستارۂ بلندی" چمکنے لگا اور وہ کم عمری ہی میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیج دیے گئے جہاں انھوں نے ہیرو اور کیمبرج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ آئی سی ایس کا امتحان دینے والے تھے مگر کم عمری کی وجہ سے اس امتحان میں شریک نہ ہو سکے اور بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے وہ ۱۹۱۲ء میں الٰہ آباد لوٹے اور الٰہ آباد میں بیرسٹری شروع کر دی۔ انگلستان کے قیام کے دوران وہ آئرلینڈ، ناروے، فرانس اور جرمنی وغیرہ گھوم آئے تھے۔ الٰہ آباد پہنچنے کے بعد پنڈت جواہر لال کے لیے کئی راستے کھلے ہوئے تھے۔ اگر وہ مستقل طور سے بیرسٹری کرنے لگتے تو الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ایک چیف جسٹس (یا گرم کوٹ بیرسٹر) کے رتبے تک وہ اپنے باپ سے بھی بڑھ جاتے۔ بیرسٹری کے علاوہ وہ ایک بڑے سائنس داں، ادیب یا مؤرخ بھی ہو سکتے تھے لیکن اُن کی حساس طبیعت نے اُن کی دلچسپیوں کا رُخ سیاست کی طرف موڑ دیا۔ شروع شروع میں اُن کے خیالات، لوکمانیہ تلک کے افکار سے ملتے تھے لیکن جب مہاتما گاندھی نے ہندوستان کی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا تو جواہر لال اُن سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو گئے۔ گاندھی جی کو انھوں نے ہندوستان کا سچا ترجمان اور نمائندہ سمجھا اور گاندھی جی میں انھیں "اس قدیم اور مظلوم ملک کی روح" نظر آنے لگی۔ یہیں کہ جواہر لال کو گاندھی جی سے کبھی اختلاف رائے کا موقع ہی نہیں پیدا ہوا۔ ایسے متعدد موقعے آئے جب جواہر لال اور گاندھی جی نے مختلف مسائل کو مختلف زاویوں سے دیکھا لیکن آخر کار جواہر لال نے گاندھی جی سے اتفاق کیا۔ بعض موقعوں پر دونوں میں ابتدائی اختلاف ہونے کے باوجود جواہر لال کے دل میں گاندھی جی کا ہمیشہ بے پایاں احترام رہا اور دوسری طرف گاندھی جی کے دل میں جواہر لال کی محبت اور وفا ہمیشہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ گاندھی جی نے لکھا "کسی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مجھ میں اور جواہر لال میں کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ ہم دونوں میں کشیدگی پیدا ہونے کے لیے اختلاف رائے سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔" ایک دوسرے موقع پر گاندھی جی نے جواہر لال کے بارے میں یہ کہا "وہ (جواہر لال) کہتے ہیں کہ میں اُن کی (گاندھی جی) زبان نہیں سمجھتا اور میں (جواہر لال) ایسی زبان استعمال کرتا ہوں جو اُن کے (گاندھی جی) لیے اجنبی حیثیت رکھتی ہے لیکن زبان دو دلوں کے اتحاد میں مانع نہیں ہو سکتی اور میں یہ جانتا ہوں کہ جب میں نہ رہوں گا تو وہ (جواہر لال) میری ہی زبان بولنے لگیں گے۔" مہاتما گاندھی کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد اُن کی یہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی اور آج امن عالم اور بقائے باہم وغیرہ کے مسائل میں جواہر لال دنیا کے سامنے وہی حل پیش کر رہے ہیں جو گاندھی جی پیش کرتے اگر وہ زندہ ہوتے۔ جواہر لال نے خوف اور شکوک و شبہات کی اس دنیا میں "جیو اور جینے دو" کے پانچ اصول (پنچ شیل) پیش کرکے نہ صرف دنیا کو اس کا صحیح راستہ دکھایا ہے بلکہ گاندھی جی کی جانشینی کا حق ادا کر دیا ہے۔ جواہر لال پنچ شیل کے نہ صرف سب سے بڑے مبلغ ہیں بلکہ انھوں نے ایسے معاملات میں جن کا راہ راست ہندوستان سے تعلق ہے عمل کرکے یہ دکھا دیا ہے کہ وہ جو کہتے ہیں اُسے برتتے بھی ہیں۔ گاندھی جی ہی کی طرح جواہر لال نہرو نے صداقت شعاری کو بھی اپنا ایسا شعار بنا لیا ہے کہ وہ اس سے کسی حال اور کسی صورت میں روگردانی کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ نہر سوئز کا معاملہ ہو یا آسٹریا کا، روس کے بارے میں کچھ اظہار خیال کرنا ہو یا امریکہ کی کسی پالیسی کے متعلق اپنی رائے دینا ہو، جواہر لال سچ بولنے سے گریز نہیں کریں گے اور اُن کی حق گوئی کسی مصلحت کے تابع نہ ہوگی۔ سچ بولنے میں وہ اس کا خیال نہ کریں گے کہ اُن کی راست گوئی کسی ملک کے تعصب کو اُن سے ناملائم کر دے گی یا خوش رکھے گی۔ ہو سکتا ہے کہ آزاد ہندوستان کے وزیر اعظم کی صاف گوئی شروع شروع میں کچھ کو پسند نہ آئی ہو لیکن اب ہر ملک کو یہ اعتراف ہے کہ اگر صحیح اور دیانت دارانہ معنوں میں کوئی ملک غیر جانب دارانہ اور صفائی سے اپنی رائے ظاہر کر دینے والا ہے تو وہ ہندوستان ہے۔ اسی لیے حصول آزادی کے چند برسوں کے اندر اندر ہندوستان کی آواز کو ایک خاص وزن حاصل ہو گیا ہے اور دنیا کے تمام ممالک میں جواہر لال کا ایک خاص احترام کیا جانے لگا ہے۔ جواہر لال شروع سے آفاقیت پسند رہے ہیں۔ وزیر اعظم ہونے سے پہلے انھوں نے متعدد بار اس خیال کا اظہار کیا کہ ہندوستان کا مسئلہ عالمی مسائل سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور ایک ملک کے مسئلے کا دوسرے ممالک پر اثر پڑتا ناگزیر ہے۔ جواہر لال اب بھی اسی خیال کے حامل ہیں۔ آفاقیت اُن کی رگ رگ میں بس گئی ہے۔ اُن کے سامنے جب کوئی مسئلہ آتا ہے تو اُن کی نگاہیں ہندوستان کی سرحدوں کو پار کرکے سارے عالم کا احاطہ کر لیتی ہیں اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اس مسئلے کا اثر ہندوستان پر کیا پڑے گا اور دنیا کے دیگر ممالک اس سے کتنے متاثر ہوں گے۔ جواہر لال کی اسی وسیع النظری نے نہ صرف ہندوستان، ایشیا اور افریقہ بلکہ نہیں بلکہ ساری دنیا کا ایک ممتاز رہنما بنا دیا ہے اور اُن کی حیثیت صرف ایک بڑے ملک کے وزیر اعظم ہی کی نہیں بلکہ ایک عظیم بین الاقوامی شخصیت کی ہو گئی ہے۔ اس آفاقیت پسندی کے ساتھ ساتھ جواہر لال کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے وطن عزیز کو خوش حال اور اقتصادی نقطۂ نگاہ سے مستحکم بنانے کے لیے وقف ہے۔ حصول آزادی سے قبل انھوں نے جس ہمت و جرأت سے جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا اور جس خندہ پیشانی سے انھوں نے قید و بند کے مصائب برداشت کیے تھے اسی عزم و استقلال سے وہ ملک سے بے روزگاری، غریبی، جہالت اور تنگ نظری دُور کرنے کی جنگ میں حصہ لے رہے ہیں اور خدمت وطن کے لیے اُسی طرح ہنستے ہوئے اور مسکراتے ہوئے انھوں نے اپنے اوپر آرام حرام کر لیا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کو بچوں سے بھی بڑی اُنسیت ہے۔ بچے بھی اُن سے بڑا پیار کرتے ہیں اور اسی لیے انھیں "چاچا نہرو" کہتے ہیں۔ حسن اتفاق سے پنڈت جواہر لال نہرو کی سالگرہ کے دن عالم گیر پیمانے پر بچوں کا دن بھی منایا جاتا ہے۔ بچے ملک کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ بچوں ہی پر ملک کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے کیونکہ یہی بچے جوان ہو کر ملک کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اگر کسی ملک کے بچے معقول تعلیم و تربیت نہ پائیں اور تندرست نہ ہوں تو آگے چل کر وہ ناکارہ اور معذور ثابت ہوں گے اور ملک اہل افراد کا محتاج بن کر رہ جائے گا۔ اسی لیے بچوں کا دن منانے کا یہ مقصد رکھا گیا ہے کہ ہم میں بچوں کی اہمیت کا احساس پیدا ہو اور ان کی تعلیم و تربیت اور صحت و تندرستی کی طرف ہماری توجہ مبذول ہو۔ ہندوستان کے سامنے دیگر مسائل کے علاوہ بچوں کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے اسی لیے ہمیں اس دن بچوں کے سلسلے میں خاص غور و فکر کی ضرورت ہے۔

امن کی تصویر

سالک لکھنوی

دیے جوہر نگاہِ شوق کو، تاثیر پیدا کی
زمینِ ہند نے اک امن کی تصویر پیدا کی

چمن زارِ وطن میں اُس کی رحمت نے ترس کھاکر
امانت دارِ منزل خاکِ دامن گیر پیدا کی

کمندِ جبر و استبداد ٹکڑے ہوگئی جس سے
وہ آیا جس نے ہر تخریب میں تعمیر پیدا کی

ستارے ٹوٹ کر نکلے، فضا میں روشنی دوڑی
ہمارے نالۂ شب گیر نے تاثیر پیدا کی

زمانے میں ہر اک جانب فروغِ ظلمتِ شب تھا
یہ کہیے مالکِ تقدیر نے تنویر پیدا کی

جواہر لال آئے امن کے عالم نے کروٹ لی
عمل کی سرزمیں نے خاک سے اکسیر پیدا کی

جبینِ جوہرِ نایاب نے خود روشنی دے دی
خطِ تقدیر نے وہ شوخیِ تحریر پیدا کی

نگاہِ شوق نے حلقے بنائے وقتِ نظارہ
تجلّی نے تجلّی کے لیے زنجیر پیدا کی

زمانے کی نگاہوں کے لیے جس کی ضرورت تھی
زمیں کے ذرّے ذرّے نے وہی تصویر پیدا کی

یہی ہے وہ جواہر لال جس نے غم اُٹھاکر بھی
عمل کی زندگی میں سعیِ دامن گیر پیدا کی

صبو سے، جام سے، شیشے سے، اُبلی موجِ آزادی
اِسی ساقیِ مے خانہ نے وہ تقدیر پیدا کی

یہی جوہر ستارہ بن کے چمکا عرشِ ہستی پر
اِسی جوہر نے ہر ظلمت میں اک تنویر پیدا کی

نظر اُٹھنے سے پہلے ہی تری تصویر سے اُڑ کر
شکستِ رنگ نے اپنی بھی اک تصویر پیدا کی

ہر اک مِلّت اسیری چاہتی تھی جس کی اے سالکؔ
نگاہِ حرّیت نے آج وہ زنجیر پیدا کی

نہرو

نسیم کشاہی

چمن کو مژدۂ صبحِ بہار ہے نہرو — نویدِ رحمتِ پروردگار ہے نہرو

کہو صبا سے کرے رقص صحنِ گلشن میں — کہ بزمِ ہند میں جلوہ فشار ہے نہرو

نہیں ہے اہلِ گلستاں کو بیمِ رنج و خزاں — حریفِ گردشِ لیل و نہار ہے نہرو

کر اپنی خوبیٔ قسمت پہ ناز اے بھارت — کہ تیرا قائدِ عالی تبار ہے نہرو

ہے اعتراف ہمالہ کی سربلندی کو — کہ آج دہر میں گردوں وقار ہے نہرو

یہ بحرِ ہند کی موجوں سے پوچھ لے کوئی — عمیق ظرف ہے اور بے کنار ہے نہرو

بس ایک نام کہ لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہے — عجیب نعمتِ بے اختیار ہے نہرو

غرور کیوں نہ کرے اس پہ اہلِ گنگ و جمن — فلک نصیب ہے، انجم شکار ہے نہرو

یہ فخرِ بدھ بھی ہے اور نازِ گاندھی بھی — کہ شہرِ امن کا اک تاجدار ہے نہرو

اسے عرب بھی رسول السّلام کہتے ہیں — قلوبِ اہلِ حرم کا قرار ہے نہرو

اگرچہ شعلوں کی زد میں ہے کائنات ابھی — یقیں ہے سب کو کہ ابرِ بہار ہے نہرو

بصد غرور اسے میرِ کارواں کہیے — ہر ایک گام پہ جب کامگار ہے نہرو

پیامبر ہے صداقت کا اور اخوت کا — حدیثِ عشق کا بھی رازدار ہے نہرو

یہ ایشیا کا ہے قائد، زعیمِ عالم بھی — زمانے بھر میں بس اک نامدار ہے نہرو

بجا ہے ہند کو دارالاماں اگر کہیے — جب اس کا رہبرِ الفت شعار ہے نہرو

نہ کیوں عوام کریں اس پہ جان کو قرباں — عوام کے لیے مصروفِ کار ہے نہرو

یہود ہوں کہ مسلماں کہ سکھ و عیسائی — ہر ایک دل کو متاعِ قرار ہے نہرو

فرشتہ ہے یہ سعادت کا اور نیکی کا — غرض کہ باپو کی اک یادگار ہے نہرو

یہ احترام ہے اقوامِ دہر میں اُس کا — کہ چشمِ دہر میں اعجاز کار ہے نہرو

رہا ہے قافلہ سالارِ عہدِ آزادی — وطن کا سب سے بڑا جاں نثار ہے نہرو

ہر ایک لمحہ ہے فکر اُس کو امنِ عالم کی — ہر ایک رنگ میں رنگِ بہار ہے نہرو

غمِ حیات کی چارہ گری میں دیر نہیں — کہ آج ہند میں منصوبہ کار ہے نہرو

ہمارے دیس میں جمہوریت ہے جلوہ گر — عدوئے طوق و سلاسل و دار ہے نہرو

ہے شہسوار اگر عرصۂ سیاست میں — جہانِ علم میں جادو نگار ہے نہرو

نسیم اہلِ چمن کو سنا بھی دو مژدہ
کہ آج قاصدِ فصلِ بہار ہے نہرو

اترپردیش میں اُردو افسانہ نگاری

محمد حسن

فن کی علاقائی وفاداری کی نوعیت بڑی عجیب ہوتی ہے۔ بیک وقت فنونِ لطیفہ کا شعبۂ زبان اور مکان کی قیود سے ماورا بھی ہوتا ہے اور زمان اور مکان کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ فن زندگی کی طرح وقت کی قید سے آزاد بھی ہے اور مقید بھی ہے۔ اسی لئے ہر فنی شہ پارے کو پرکھتے وقت ایک طرف اس کی آفاقی اور ابدی قدر و قیمت پیش نظر رکھی جاتی ہے تو دوسری طرف اس بات کا خیال بھی رکھا جاتا ہے کہ اس میں ماحول اور وقت کی کس حد تک عکاسی ہوئی ہے۔ اترپردیش میں مختصر افسانے کا جائزہ ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر لینا چاہیئے۔

مختصر افسانہ دراصل زندگی کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے کا نتیجہ ہے افسانہ نگار گویا اپنے افسانے کے ذریعے محض اپنی تخیلی اور جذباتی روداد ہی نہیں کہتا بلکہ زندگی کا ایک خاص رخ بھی پیدا کرتا ہے۔ اس حد تک ہر مختصر افسانہ ایک طرح کی فلسفیانہ تعمیم ہے۔ سماج کا ایک خاص رخ سے مطالعہ اور زندگی کے بارے میں ایک نقطۂ نظر کی پیش کش ہے۔ لیکن یہ تعمیم، یہ نقطۂ نظر افراد اور واقعات کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر لکھنے والا اپنے زمانے اور اپنے ماحول ہی سے کردار اور واقعات چنتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ تعمیم مقامی رنگ اور علاقائی تہذیب کے سانچے میں ڈھل کر آتی ہے۔ اس لئے افسانہ آفاقی ہوتے ہوئے بھی مقامی اور مقامی ہوتے ہوئے بھی آفاقی حقیقتوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

مختصر افسانے میں شاعری اور ڈرامہ سے کہیں زیادہ مقامی رنگ ہونا لازمی ہے۔ شاعری افراد اور واقعات سے بلند ہو کر صرف خیالات سے بحث کر سکتی ہے لیکن بھرپور پس منظر کے بغیر مختصر افسانے کا تصور کرنا دشوار ہے۔ یہاں افراد اور واقعات کے پیچھے روحِ عصر کی ہلکی سی لہر کارفرما رہتی ہے۔ یہاں کرداروں کی نشست و برخاست، ان کی بات چیت، ان کی اندرونی کشمکش اور طرزِ فکر کے پیچھے ان کے گرد و پیش کی آواز بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ گویا افسانہ نگار اپنے زمان و مکان کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں میں ڈوب کر ابدی سچائیوں تک پہنچتا ہے۔ زندگی اور کائنات کے بارے میں اس کا تصور ان ہی مقامی رنگ میں رنگی ہوئی صداقتوں سے بنتا ہے اور ان ہی کی مدد سے ظاہر ہوتا ہے۔

اترپردیش کو اردو افسانہ نگاری میں رہنما کی حیثیت حاصل ہے۔ افسانہ نگاری اردو میں اولیت کا سہرا عام طور پر منشی پریم چند کے سر باندھا جاتا ہے اور منشی پریم چند صرف اس لحاظ ہی سے اترپردیش کے باسی نہ تھے کہ وہ یہاں پیدا ہوئے تھے بلکہ اس لحاظ سے بھی اترپردیش سے ان کا گہرا تعلق تھا کہ انھوں نے اس سرزمین کی آواز کو بڑے غور سے سنا اور یہاں کی تہذیبی وراثت کو بڑی وسعتِ قلب کے ساتھ اپنایا۔ پریم چند کے افسانے اس وراثت کی کڑی تھے جو فسانۂ آزاد سے ہمیں ملی تھی۔ فسانۂ آزاد، لکھنؤ کے زوال آمادہ تمدن کی داستان ہے۔ لیکن اس کا دائرہ بڑا وسیع ہے جس میں محض اعلیٰ گھرانوں، نوابوں اور امیروں کے دیوان خانوں کی زندگی کا عکس ہی نہیں بلکہ لکھنؤ کی زندگی۔ بیکراں ہمہ جہت اور ہر طرف بکھری ہوئی زندگی۔ کی تقریباً تمام سطحوں کی عکاسی

کی گئی ہے۔ پنڈت رتن ناتھ در نے "جھمکا" ہی کہا تھا۔ اس جھمکے میں کہیں بٹیرباز، پتنگ باز، ورق برق نواب، منہ پیٹ بڑھیاں، زرد رو مصاحبوں کے موجود ہیں۔ کہیں فقیر گاڑیوں کے پیچھے دعائیں دیتے جاتے ہیں۔ پولیس کا سپاہی تیور جھکے، ٹھنگی کے نکڑ ریلوے بابو ٹھاکر صاحب (جو کسی قریبی گاؤں سے میلہ دیکھنے آئے ہیں)۔ انگریز حاکم کوٹ پتلون میں اکڑتا ہوا، بہنے نیتی کے مسلمان ترکی ٹوپی ٹانکے نکالی ہوئی، ملاؤں میں نرم دھوتیاں ہوا میں اڑاتے ہوئے —— " غرض یہاں ہر طرح کے انسانوں کا مجمع ہے۔ اس مجمع میں زندہ جیتے پھرتے باتیں کرتے چلتے انسانوں کا ایک سمندر موجزن ہے۔

پریم چند کے یہاں یہ سمندر اور زیادہ وسیع ہو کر افق تا افق پھیل جاتا ہے — گو اس کی طوفانی کیفیت میں نرمی اور ٹھہراؤ آجاتا ہے اور تندی کی جگہ مٹھاس اور شوکت و جبروت کی جگہ حسن و جمال پیدا ہو جاتا ہے۔ پریم چند نے پہلی بار مختصر افسانے کو فن کی حیثیت سے اختیار کیا اور اسے شہر کی حدبندیوں سے آگے لے جا کر اتر پردیش کی عوامی زندگی سے ہم آہنگ کر دیا۔ فسانۂ آزاد میں شہر کی داستان تھی — اس شہر کی داستان جسے مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہا گیا ہے۔ پریم چند کے افسانے ان قصبوں شہروں اور دیہاتوں کی داستانیں ہیں جنھیں ہندوستان میں مغربی تمدن کے غلبے کے اولیں نمونے کہا جا سکتا ہے۔

پریم چند کے افسانے پر کئی اثرات منعکس ہوئے تھے۔ تکنیک کے اعتبار سے پریم چند نے مغربی مصنفین کے علاوہ بنکم چندر چٹرجی اور شرت چندر سے بہت کچھ استفادہ کیا تھا لیکن فکری اعتبار سے برہمو سماج اور گاندھی واد کے اثرات ان کی کہانیوں میں نمایاں ہیں۔ یہ کہانیاں فنی پختگی اور تکنیک کے اعتبار سے حرف آخر نہیں کہی جا سکتیں لیکن ان میں اس زندگی کی ہماہمی اور پھیلاؤ ہے جو قومی آزادی کی تحریک کے ابتدائی دور میں پیدا ہو رہا تھا۔ گاندھی جی نے پہلی بار قومی آزادی کی لڑائی کو ہندوستان کی عوامی لڑائی بنا دیا اور اس کی آواز بازگشت پسماندہ دیہاتوں میں بھی سنائی دینے لگی۔ اتر پردیش کے گاؤں گاؤں میں گاندھی جی کا پیغام اور کانگرس کا نعرۂ آزادی گونجنے لگا اور پہلی بار یہ احساس ہوا کہ دیہات کو بھی فن کا موضوع بنایا جا سکتا ہے اور کسانوں کی زندگی میں بھی وہ رس اور وہ توانائی ہے جو فن میں ڈھالی جا سکتی ہے۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں میر داستان کا تاج بادشاہوں اور شہزادوں کے سر سے اتار کر متوسط درجے کے نوجوانوں کے سر پر رکھا تھا، پریم چند نے اسے عام انسان بلکہ ایک عام کسان کے سر پر رکھ دیا۔ پریم چند سے قبل شاید ہی کوئی افسانہ نگار رحمن شیخ اور سیج وفائی جیسے کرداروں کو افسانے کا موضوع بنانے کی جرأت کرتا

پریم چند اپنے تصوراتی اور عینیت پرست نقطۂ نظر کے باوجود اردو افسانے کی دنیا میں سب سے بڑے حقیقت پسند ہیں۔ انھوں نے اتر پردیش کی عوامی زندگی کی بڑی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانوں کی دنیا دکھ اٹھاتی، ہنستی گاتی، مظلوم مگر غیر مفتوح جنتا کی دنیا ہے، جہاں آلھا کی تانیں بھی اڑتی ہیں، ہولی کی رنگ رلیاں بھی ہوتی ہیں، برسات میں باغوں میں جھولے بھی پڑتے ہیں اور ان پر دیہات کی معصوم کنواریاں ملہاریں بھی چھیڑتی ہیں اور غیر ملکی حکومت کا ظلم و ستم مشیت کی ستم ظریفی اور زمانے اور ماحول کی چیرہ دستی کوئی بھی اس باطنی سرمستی پر اثرانداز نہیں ہو پاتی۔

اس لحاظ سے اتر پردیش میں افسانہ نگاری کی داستان حقیقت نگاری ہی سے شروع ہوتی ہے گو تھوڑے عرصہ بعد سجاد حیدر یلدرم نے ترکی ادبیات اور رومانی نثر نگاری کی کچھ ایسی چاٹ لگائی کہ حقیقت نگاری کی جگہ روایت نے لے لی۔ ان میں اتر پردیش کی قصباتی اور دیہاتی زندگی کا عکس نہیں ہے بلکہ شہروں کی تہذیب کی جھلکیاں بھی کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔ زیادہ تر ان افسانوں کا پس منظر خوابوں کے جزیرے ہیں، تخیلی جنتیں ہیں، ماورائی فضائیں ہیں۔ ان کے کردار ایک رومانی دھن میں کھوئے ہوئے ہیں اور ان کی توجہ کردار نگاری کی نزاکتوں اور واقعات کے پیچ و خم سے زیادہ حسن و لطافت سے بھرپور اور شعریت سے معمور نثر لکھنے پر مرکوز رہتی ہے۔ اس روایت کو نیاز فتح پوری نے اور آگے بڑھایا۔ ان کہانیوں سے فائدہ تو ضرور ہوا کہ مشرقی ادبیات کے ان ذخیروں تک ہماری رسائی ہونے لگی جن کی طرف ابھی توجہ نہیں کی گئی تھی، اور نثر نگاری کا ایک ایسا اسلوب پیدا ہوا جس کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ مگر اس قسم کے افسانوں سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ حقیقت نگاری کی وہ روایت کم سے کم وقتی طور سے ختم ہو کر رہ گئی جسے پریم چند کے افسانوں نے شروع کیا تھا۔ نیاز فتح پوری کے افسانے ایک بیقرار روح اور بیدار ذہن کی روداد ہیں۔ ان کے یہاں عمل کم ہے، تخیلی سفر زیادہ ہے۔ ان کی دنیا میں جذبات ہی سب کچھ ہیں، واقعات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان افسانوں کا موضوع زیادہ تر عشق و عاشقی ہے لیکن ان میں ایسی جمالیاتی حس کا مظاہرہ ہوتا ہے جو روزمرہ کی معمولی سے معمولی حقیقتوں میں بھی حسن اور کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔

اردو افسانہ نگاری کا ایک دوسرا اہم موڑ تھا اور اس کی رہنمائی بھی

اترپردیش سے ہی ہوئی۔ مجنوں گورکھپوری اور قاضی عبدالغفار نے اسے رومانی انداز سے سماجی معنویت اور گہرائی بخشی۔ مجنوں گورکھپوری کی افسانہ نگاری ان کے طویل افسانے "زیدی کا حشر" سے شروع ہوتی ہے جو نیاز کے افسانے "شہاب کی سرگذشت" سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ شہاب ایک تخیلی نوجوان ہے، اور زندگی کی سنگین حقیقتوں سے بھاگ کر تصور اور تخیل ہی میں پناہ دیتا ہے۔ مگر زیدی "بیکل باطن" کی تسلی کے لئے عمل اور جد و جہد کی پناہ گاہ تلاش کرتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کے دوسرے افسانوں میں نفسی پختگی اور زیادہ نمایاں ہوئی گو جذباتیت کا عنصر پھر بھی غالب رہا۔ مجنوں گورکھپوری نے ہارڈی کی قنوطیت اور مایوسی کو اردو میں ایک نئے انداز سے پیش کیا، لیکن ان کے افسانوں میں زیادہ سماجی معنویت اور پختگی کا احساس ملتا ہے۔ قاضی عبدالغفار نے سماجی معنویت کا آہنگ اور زیادہ بلند کیا۔ ان کی خوبصورت متوازن مگر پرجوش نثر میں محض جذباتیت ہی نہیں ہے۔ جذباتیت کے ساتھ ساتھ سماج کی بہتری کا تصور، اس کے لئے لگن اور جوش کے ساتھ کام کرنے کا حوصلہ اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا عزم بھی موجود ہے۔ قاضی عبدالغفار رومانی ادیبوں میں حقیقت پسندی سے سب سے زیادہ نزدیک ہیں۔

اس دور میں بھی پریم چند کی حقیقت پسندی کی روایت مکمل طور پر مفقود نہیں ہوئی اور اس سے متاثر ہو کر خود اترپردیش میں بھی کئی افسانہ نگاروں نے کہانیاں لکھیں جن میں اعظم کریوی اور علی عباس حسینی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں نے اپنی کہانیوں کا تانا بانا زیادہ تر قصباتی اور دیہاتی زندگی سے حاصل کیا اور اترپردیش کی عوامی زندگی کی حقیقتوں کو پیش نظر رکھا۔ ان کی نثر میں رومانی نثر نگاروں کی سی شدت، جوش، شعریت اور اڑان نہیں تھی۔ لیکن ان کے قدم مضبوطی کے ساتھ اپنی سرزمین پر جمے ہوئے تھے۔ ان افسانوں میں اترپردیش کی زندگی کا نکھار ملتا ہے اور علی عباس حسینی نے اس زندگی کو فنی چابکدستی کے ساتھ نئے سانچوں میں ڈھالا۔ خاص طور پر ان کے افسانے 'میلہ گھومنی' اور 'ہار جیت' میں یہ فضا نمایاں طور پر ملتی ہے۔ 'ہار جیت' کو خود مصنف نے ۱۹۴۳ء میں اپنا بہترین افسانہ قرار دیتے ہوئے لکھا تھا "مجھے 'ہار جیت' اس لئے پسند ہے کہ . . . وہ مجھے ایسی فضا کی یاد دلاتا ہے جس میں میرا بچپن گزرا ہے، جب میں گاؤں کے ٹھاکر کے پوتے کی حیثیت سے باراتوں کی شرکت میں بھیجا جاتا تھا اور آموں کے باغوں میں چھپر کھٹ پر براجمان ہو کر اہیروں کے کھیل اور مقابلوں سے لطف اندوز ہوتا تھا اور وہ مجھے اس لئے بھی پسند ہے کہ وہ ہندوستان کی ایسی قوم کے تذکرے پر مبنی ہے جس میں اب بھی حرارت ہے، زندگی ہے اور کچھ مردانگی ہے۔ اور جو تھوڑی سی توجہ اور تعلیم سے نہ معلوم کیا سے کیا بنائی جا سکتی ہے۔"

(میرا بہترین افسانہ ۔ مرتبہ محمد حسن عسکری)

یوں تو پریم چند کے آخری زمانے ہی سے اردو افسانے میں ترقی پسندی کی تحقیق شروع ہو چکی تھی لیکن پریم چند کے انتقال کے کچھ دن بعد اردو افسانہ کی باگ ڈور ترقی پسندوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ ترقی پسندی کا مفہوم اس دور میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ افسانے میں تخیلی اور رومانی داستانوں کے بجائے حقیقت پسندی اور سماجی معنویت کو جگہ دی جائے۔ قومی آزادی میں جد و جہد، سماجی ناانصافیوں کے خلاف جہاد، مذہبی تنگ نظری اور سماجی تعصبات (خصوصاً جنس کے معاملے میں) کے خلاف احتجاج کیا جائے۔ یہ وہ دور تھا جب مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں میں مارکس اور فرائڈ کے فلسفوں کا اثر نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ اشتراکی سماج کی بنیاد پڑ چکی تھی اور دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں اشتراکی جماعتیں قائم ہو چکی تھیں۔ مارکس کی تعلیم کے بنیادی اصول یہ تھے کہ خیال اور فرد کے بجائے مادہ سماج اور ذرائع پیداوار ہی ہمارے تمام سماجی اداروں کی تشکیل اور تعمیر کی ذمہ دار ہیں، تاریخ فرد کی داستان نہیں بلکہ مظلوم اور ظالم طبقوں کی مسلسل آویزش کی داستان ہے اور تمام قدریں طبقاتی اور اضافی ہیں۔ زندگی اسی تضاد اور آویزش سے آگے بڑھتی ہے اور ماحول کی تبدیلی سے انسان کی داخلی زندگی کو بھی سنوارا جا سکتا ہے۔ فرائڈ نے انسانی نفسیات کی بعض پیچیدگیوں کو حل کیا اور بتایا کہ ہماری غلطیاں ہمارے خواب اور ہمارے اعصابی امراض دراصل ہماری خواہشات کا نتیجہ ہیں جو جبلی ہیں اور جنہیں ہمارے شعور نے سماجی مصلحتوں کی بنا پر کچل ڈالا ہے اور وہ تحت الشعور میں جذب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور جب کبھی شعور کی گرفت کمزور ہوتی ہے تو یہ خواہشات نکلیں ہل کر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ فرائڈ نے یہ بھی بتایا کہ ان خواہشات میں جنسی جذبے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

ترقی پسندی کا ابتدائی دور خاصا طوفانی دور تھا جس میں مارکسیت کا انقلابی جوش، فرائڈ کی بت شکنی اور رومان پرستوں کی جذباتیت مل جل کر ایک ہو گئی تھیں۔ اس دور کے عام موضوعات کا اندازہ لگانے سے

ہوسکتا ہے جس تب مذہب کی مخالفت اور جنس سے لگاؤ کا مظاہرہ
کچھ اس انداز سے ہوا تھا کہ وہ کتاب چھپتے ہی ضبط ہو گئی لیکن اس نئے
رجحان سے یہ فائدہ ہوا کہ سماجی معنویت اور حقیقت پسندی کی طرف میلان
بڑھنے لگا گو اس میدان میں جذباتیت کا غلبہ پھر بھی قائم رہا جنس اور مذہب
کی تنگ نظری کے خلاف بغاوت اس دور کے محبوب موضوع تھے۔ لیکن
ان موضوعات کے پس منظر میں اتر پردیش کی سماجی زندگی کے بعض سے
گوشے اردو افسانے میں راہ پا گئے۔ سجاد ظہیر کا افسانہ 'نیند نہیں آتی'
احمد علی کا 'مہاوٹوں کی ایک رات' رشید جہاں کا 'دلی کی سیر' اس سلسلے
میں نمونتاً پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ افسانے فنی اعتبار سے مکمل ہوں
نہ ہوں مگر ان میں بت شکنی کا جوش اور باغی کا حوصلہ ضرور پایا جاتا ہے
ان میں حقیقت سے نبرد لینے کا ولولہ بھی ہے اور طوفانوں سے آنکھ ملانے
کی جرأت بھی

اردو افسانے میں ترقی پسندی کی روایت کافی دن تک چلتی رہی مگر یہ
عجیب بات ہے کہ اتر پردیش کے افسانہ نگاروں میں اس روایت کا انتہا پسندانہ
رجحان مقبول نہیں ہوا کیونکہ آگے چل کر سماجی بت شکنی کے اس جوش نے
سیاسی رنگ روپ اختیار کر لیا تھا اور ترقی پسندی ایک ہمہ گیر نقطۂ نظر سے
زیادہ عملی سیاست کا پروگرام بن کر رہ گئی تھی۔ اسی طرح جنسی جذبے اور
فرائڈین اثر کے ماتحت افسانہ نگاری کا جو میلان شروع ہوا تھا اس کے پاؤں
بھی اتر پردیش میں نہیں جمے گو یہاں کے معدودے چند لکھنے والوں نے اسے
پھیلانے اور پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔ مثلاً محمد عسکری کے افسانوں
میں نیم شعوری (Stream of Consciousness) کی
تکنیک غالباً سب سے پہلے وسیع پیمانے پر استعمال کی گئی اور بعد کو قرۃ العین حیدر
نے بھی اسے اپنے افسانوں میں برتا۔ یہ بات یقیناً قابل غور ہے کہ اتر پردیش
کے لکھنے والوں میں گھن گرج جنسی اعصاب زدگی کبھی زیادہ مقبول نہیں ہوئی

اس زمانے میں چند ایسے افسانہ نگار بھی تھے جو طوفانی گھن گرج اور
قابل تشنیع سے الگ رہ کر متوازن اور متین لب و لہجے کو برقرار رکھے ہوئے
تھے۔ ان کی کہانیوں میں جذباتی ابال اور چونکا دینے والے دھماکے یا سستی
لذت کے سامان نہیں تھے بلکہ زندگی کو ایک نئے رخ سے دیکھنے کی کوشش
تھی۔ ان میں حیات اللہ انصاری کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

حیات اللہ نے اگر صرف ایک افسانہ 'آخری کوشش' لکھا ہوتا تب بھی وہ
ہمارے عظیم افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہونے کے مستحق تھے۔ حیات اللہ
اس اعتبار سے بھی ہمارے لئے اہم ہیں کہ اتر پردیش کی سماجی زندگی کی عکاسی
جس طرح انھوں نے کی ہے اس طرح اور کسی افسانہ نگار نے نہیں کی ہے۔
حیات اللہ ایک خاص نظریے کے قائل ہیں اور اسی کے مطابق وہ ہماری
سماجی زندگی کو ایک نئے رخ سے پیش کرنا چاہتے ہیں ان کی بعض کہانیوں
میں یہ تبلیغی انداز خشک فلسفیانہ شکل اختیار کر گیا ہے۔ (مثلاً 'ماں بیٹ' میں)
لیکن ان کے بعد کی کہانیوں میں یہ فنی پختگی ان کے نظریاتی جوش و خروش پر غالب
آ گئی ہمارے افسانوں میں گویا سان کے افسانوں کی جسمانی تمازت اور چونکا دینے
والی کیفیت کا عام رواج رہا ہے۔ چیخوف کے افسانوں کی سی متانت لطیف
اور سادہ انداز اور فکر و بصیرت کو برانگیختہ کرنے والی ایک ہلکی سی برقی رو اردو
افسانے میں بہت کم ملتی ہے۔ اس سلسلے میں راجندر سنگھ بیدی کے بعد شاید
حیات اللہ انصاری کا سب سے بلند مقام ہے۔

حیات اللہ کو جذبات کی شدت کو فن کی شیریں لطافت میں ڈھالنے
کا ہنر آتا ہے ایلیٹ نے فنکار کی شخصیت کو دکھ جھیلنے والے کی شخصیت سے
الگ بتایا تھا۔ کیونکہ فنکار جذبے کی رو میں بہنے کے بجائے جذبے سے اوپر
اٹھ جاتا ہے اور اپنے آپ کو وقتی احساس کے حوالے نہیں کرتا۔ حیات اللہ
کی کہانیوں میں یہ ٹھہراؤ یہ منطقی ٹھنڈک اور فکری توازن بڑی حد تک موجود ہے۔
'آخری کوشش' سے لے کر 'جھولی زنجیر' 'ماں اور بیٹا' 'موزوں کا کارخانہ'
'شکستہ کنگورے' اور 'چچا جان' تک یہی فنکارانہ چابکدستی اور حسن کاری ملتی ہے۔

حیات اللہ انصاری کے علاوہ جن لوگوں نے پچھلے دور میں کامیاب
افسانے لکھے ان میں چودھری محمد علی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ چودھری صاحب
اس معاشرت کے پروردہ تھے جو اودھ کے آخری دور کی یادگار کہی جا سکتی
ہے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف روپ دیکھے تھے۔ اور ہر روپ میں نشاط
زیست حاصل کیا تھا۔ چودھری صاحب کے افسانے واقعات کے انتخاب اور
کردار نگاری کی نزاکتوں کے اعتبار سے اس قدر اہم نہیں جتنے ان کے انداز بیان
کے لحاظ سے اہم ہیں۔ ان کی زبان ستھری اور شائستہ ہے اور انھوں نے
روزمرہ کی سادگی میں شعریت اور شگفتگی کا حسن پیدا کر دیا ہے۔ 'تیسری جنس'
جیسے نازک موضوع پر بھی چودھری محمد علی نے اپنے طرز کی ندرت اور تازگی

برقرار رکھی ہے۔

عہد حاضر کے لکھنے والوں میں رضیہ سجاد ظہیر نے کئی ایک کرداری کہانیاں لکھیں جن میں 'لنگڑی ممانی' اور 'امت والے فقیر' کے کردار نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کی کہانیوں میں مغربی اتر پردیش کے لہجے اور انداز گفتگو کی مخصوص کھنک سنائی دیتی ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر گھریلو زندگی کے گہرے مشاہدے سے اپنی کہانیوں کا مواد حاصل کرتی ہیں اور چونکا دینے والے انداز کے بجائے متوازن لب و لہجے سے اپنی کہانیوں کے تاثر کو اور زیادہ دلنشین اور تیکھا بناتی ہیں۔

اس کے علاوہ پرانے لکھنے والوں میں اختر انصاری کی افسانہ نگاری کا اسلوب بھی ندرت اور تازگی سے معمور ہے۔ اختر انصاری کے افسانوں میں 'یادداشت' اور 'آپ بیتی' کا پہلو نمایاں ہے۔ ان کے افسانے دراصل احساس اور تخیل کی کامرانیوں کے نشان ہیں۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے واقعے میں آفاقی حقیقتوں کی جھلک دیکھ لیتے ہیں۔ تکنیک کے اعتبار سے بھی انھوں نے بعض اہم تجربے کئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک حساس دل اور ایک دوررس نظر رکھنے والے فنکار کی موجودگی کا ہر لمحہ احساس ہوتا ہے۔

نئے لکھنے والوں میں خصوصیت کے ساتھ چار افسانہ نگار قابل ذکر ہیں رام لعل، اقبال فرحت اعجازی، رتن سنگھ اور مسیح الحسن رضوی

رام لعل نے پچھلے چند برس میں 'ادھ سی' اور 'ایک شہری پاکستان کا' جیسے دو اہم افسانے لکھے ہیں۔ یوں تو وہ ایک مدت سے لکھ رہے ہیں مگر 'ادھ سی' میں ان کا فن بلندی پر نظر آتا ہے۔ رام لعل اگر جنس زدگی اور لذتیت سے بچے رہے اور فکر و شعور کی پختگی اور سماجی معنویت پر زور دیتے رہے تو یقیناً وہ بہت جلد ہمارے افسانہ نگاروں کی فہرست میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکیں گے۔

اقبال فرحت اعجازی کے پاس بے تکلف انداز بیان اور چٹکیلے مکالموں کا جادو ہے۔ کہیں کہیں تکنیک کے تجربے بھی انھوں نے انوکھے انداز بیان سے کئے ہیں۔ پھر اقبال کے ہاں مشاہدے کی قوت اور جرأت فکر کا بھی فقدان نہیں ہے۔ "شیرو" جیسے افسانوں میں انھوں نے بڑی چابکدستی سے تاثر قائم کیا ہے۔

رتن سنگھ کے افسانے ہلکے پھلکے تاثر کے افسانے ہیں گو وہ بھی رام لعل کی طرح غالباً بجائے پیدائش کے اعتبار سے اتر پردیش کے نہیں ہیں مگر اب ان کے افسانوں کا پس منظر یہی علاقہ ہے۔ رتن سنگھ بڑے لطیف اشاروں سے ہماری سماجی اور باطنی زندگی کے باریک پہلوؤں کی عکاسی اور ان کی تنقید پیش کر دیتے ہیں۔ 'بادبان' ان کا ایک کرداری افسانہ گو خاتمہ کے اعتبار سے میلوڈرامائی ہو گیا ہے مگر رتن سنگھ کے افسانوں کی خصوصیت لطیف تاثر اور ہلکے اشاروں کے استعمال ہی ہیں، مثلاً 'مریم' یا بعض دوسرے افسانوں میں

مسیح الحسن رضوی کے افسانے 'کفارہ' نے پہلی بار ادبی دنیا کو متوجہ کیا۔ فسادات اور ہجرت پر بہت سے افسانے لکھے گئے مگر مسیح الحسن رضوی کے افسانے میں جو ٹھہراؤ، خلوص اور جو شیریں توازن تھا وہ بہت کم افسانوں کے حصے میں آیا ہے۔ اس خصوصیت کو بعد کے افسانوں میں بڑی حد تک قائم رکھا گیا ہے مثلاً 'سیتی' 'ہم سایہ' اور بعض دوسرے افسانوں میں گو موضوع کی وسعت آئی ہے مگر تاثر کی لطافت اور نزاکت گھن گرج یا میلوڈراما کے بغیر بات کہنے کا انداز برقرار رکھا گیا ہے۔

ان کے علاوہ شاہد مہدی، بشیشر پردیپ اور بعض دوسرے افسانہ نگار بھی اس دور میں ابھرے۔ اقبال مجید نے 'عدہ چچا' 'ٹوٹی چمنی' 'دو آبمہ در آئینہ' جیسی بھرپور کہانیاں لکھیں جن میں اتر پردیش کی زندگی کے مختلف پہلو اجاگر ہوئے ہیں اور مجموعی طور پر ہماری زندگی کے بارے میں ایک نئی بصیرت کی جوت جگمگاتی نظر آتی ہے۔

اتر پردیش کا اردو افسانہ سے دو اور حیثیتوں سے بھی گہرا تعلق ہے ایک اس حیثیت سے کہ اتر پردیش کے رہنے والے جو یہیں پیدا ہوئے اور یہیں پروان چڑھے باہر جا کر اور وہاں رس بس کر بھی یہاں کی زندگی کو فراموش نہیں کر سکے ہیں اور ان کے افسانوں میں اتر پردیش کی عوامی زندگی کی صدائے بازگشت گونجتی ہے۔ ایسے افسانہ نگاروں میں خصوصیت کے ساتھ انتظار حسین قرۃ العین حیدر اور ابوالفضل صدیقی کے نام لئے جا سکتے ہیں

انتظار حسین نے بار بار میرٹھ کی گلیوں کا ذکر کیا ہے ان میں یاد ماضی کا حسن اور یہاں کے تہذیبی رچاؤ کا عکس موجود ہے۔ ان افسانوں میں اتر پردیش اس تہذیب کا گہوارہ نظر آتا ہے جہاں عوامی زندگی روایات و داستانوں سے بھرپور تھی جہاں پتنگ کی دوڑ دھاڑ نظر آنے پر لڑکوں کے جھنڈ کے جھنڈ

دل پہنے تھے، جہاں کے جوانیے والوں کی آواروں میں بھی رس تھا، جہاں وحشت بگولیاں اور جانوروں کے بھی شادی بیاہ ہوتے تھے اور وہ بھی انسانی برادری ہی کا ایک جزو تھے، جہاں کی زندگی بھرپور اور تر و تازہ تھی اور جہاں انسان تنہائی اور ویرانی کے معنی سے ناآشنا تھا۔

قرۃ العین نے اس سے آگے بڑھ کر اتر پردیش کو اس تہذیب کے گہوارے کی حیثیت سے دیکھا جس کو عہد عتیق سے واجد علی شاہی دور تک اور اس دور سے تقسیم ہند تک ہندو اور مسلم شرفاء نے مل جل کر پروان چڑھایا تھا۔ قرۃ العین کے افسانوں میں اتر پردیش کی زندگی کے بہت سے ثقافتی گوشے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ خصوصاً پوربی اتر پردیش کے گیت، ملہاریں ۔۔۔ عوامی کہانیاں اور اس علاقے کی بولی ٹھولی کا مزا۔ انھوں نے یہ سب کچھ اردو افسانے میں بڑی خوبصورتی سے سمو دیا ہے۔

دراصل اتر پردیش محض ایک علاقے کا نام ہی نہیں ہے۔ مختلف توانا تہذیبی روایتوں کا نام بھی ہے۔ اتر پردیش کا نام سنتے ہی عہد قدیم میں تہذیب کے گہوارے متھرا اور کاشی اور پریاگ کا دھیان آتا ہے۔ پھر جونپور کے شرقی بادشاہوں کی طرف دھیان منتقل ہو جاتا ہے جنھوں نے فنون لطیفہ کی سرپرستی کر کے اتر پردیش کی تہذیبی روایت میں شاندار اضافہ کیا۔ ادھر ان بولیوں کا خیال آتا ہے جنھوں نے اس علاقہ میں جنم لیا۔ ایک طرف برج کا علاقہ ہے جہاں سری کرشن کی بانسری گونجتی تھی اور سور داس کے شیریں اور میٹھے بھجن جہاں پہلی بار لکھے اور گائے گئے تھے۔ دوسری طرف اودھ کی نگری ہے جہاں تلسی داس نے اودھی کو اپنایا اور دنیا کا وہ اکیلا آسمانی صحیفہ لکھا جو انساں کا تصنیف کیا ہوا ہے۔ پھر یہیں سید محمد جائسی کے نغمے گونجے اور اودھی میں پدماوت کی شیرینی نے دل موہ لئے۔ جہاں کھڑی بولی کا سب سے بڑا علاقہ ہے اور جس جگہ کی زبان نے ہندوستان کے کونے کونے میں اپنا سکہ جمایا ہے۔

یہی اتر پردیش ہے جو افسانوں کی جنم بھومی ہے اور خود افسانہ بھی ہے۔ ابوالفضل صدیقی کو اتر پردیش کے اسی افسانوی پہلو سے پیار ہے۔ وہ یہاں کے جنگلوں، شکاری جانوروں اور ان کا شکار کرنے والے انسانوں کی داستانیں لکھتا ہے۔ کبھی یہاں زمینداری کے خاتمے کا نقشہ کھینچتا ہے جس سے ڈھکی ڈیوڑھیوں اور جاگتے کھیتوں کا نیم المیہ نیم طربیہ ڈرامہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور شوکت صدیقی بھی اسی اتر پردیش کے رہنے والے تھے جنھوں نے اردو افسانہ نگاری میں اہم مقام حاصل کیا۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ متوسط گھرانوں کی آویزشوں، یہاں کی ناہمواریوں اور محرومیوں کا نقشہ کھینچتی ہیں اور اکثر ان کے افسانوں کا پس منظر یا تو اتر پردیش ہوتا ہے یا یہاں کے مہاجر۔ شوکت صدیقی کے بہترین افسانے یہیں لکھے گئے۔ 'تانیتا' اتر پردیش ہی کے ایک برخاست شدہ فوجی کی داستان ہے۔ 'تیسرا آدمی' کا پس منظر بھی الموڑہ اور نینی تال کے اردگرد کا علاقہ ہے۔

اس کے علاوہ اتر پردیش کی ایک اور حیثیت بھی ہے۔ اس صوبے میں ہمارے ایسے ادیب اور افسانہ نگار بھی اب آکر بس گئے ہیں جو دوسرے علاقوں میں پلے بڑھے تھے (رام لال، رتن سنگھ اور شیتر پرکاش کا ذکر پہلے آچکا ہے) ان میں سب سے اہم کام بلونت سنگھ کا ہے جو اردو افسانہ نگاری میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں۔ بلونت سنگھ پنجاب کی دیہاتی زندگی کی بھرپور تصویر کشی کے لئے مشہور ہیں اور آج بھی بلونت سنگھ کا محبوب موضوع یہی ہے۔ 'پہلا پتھر' جو غالباً ان کے دور کا بہترین افسانہ ہے اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے! اسی طرح ان کے حالیہ افسانوں کی فضا بھی پنجاب کے دیہات ہی کی ہے۔ پھر بھی اتر پردیش میں بلونت سنگھ کے سکونت اختیار کرنے سے یہ امید ضرور پیدا ہوتی ہے کہ اتر پردیش کی دیہی زندگی بھی ان سے خراج وصول کئے بغیر نہ رہے گی۔

اس مختصر سے جائزے سے یہ اندازہ ہو گا کہ اتر پردیش اردو افسانے کی تاریخ میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ گو اب بھی اس کی عوامی زندگی کی پوری کیفیت اس کے باغوں، میلوں ٹھیلوں اور چوراہوں کا راگ رنگ، اس کے گیت کا رس، اس کے نشاط و الم اور ان کا اجتماعی آہنگ ہنوز پوری طرح افسانوں کی شکل میں نہیں ڈھل سکا ہے، پھر بھی اتر پردیش میں اردو افسانہ نگاری کا ارتقا خاصی تیز رفتاری سے ہوا ہے اور اس سرزمین سے اردو افسانے کو نیا موڑ اور نیا میلان بخشنے والے کئی باکمال فنکار اٹھے ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسا فنکار بھی جلد ہی پیدا ہو جو یہاں کی عوامی زندگی کی ساری مستی اور سارے رچاؤ کو افسانے میں سمو سکے اور اس سرزمین کو اپنے فن کی عقبی زمین کی حیثیت دے کر غیر فانی بنا دے۔

قدیم ہندوستان میں دولت اور فارغ البالی

سید سخی حسن نقوی

قدیم ہندوستان میں تجارت اور صنعت و حرفت کی حیرت انگیز ترقی اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ ملک میں مال و دولت کی کثرت تھی اور تمام لوگ، خواص و عام، یکساں طور پر اطمینان، آسائش اور فارغ البالی کے ساتھ زندگی گذارنے کے عادی تھے۔ ہندوستان کا شمار دنیا میں سب سے زیادہ مالدار ملک کی حیثیت سے کیا جاتا تھا اور ہندوستان کی دولت ضرب المثل بن گئی تھی۔

چھٹی صدی قبل مسیح کے رہائشی مکانات میں جو سامان عیش و عشرت مثلاً گھر کا سازوسامان (فرنیچر) لباس اور زیورات ملے جاتے تھے وہ صرف چند مخصوص لوگوں یا کسی خاص طبقہ کے لوگوں کا اجارہ نہیں تھا بلکہ عوام کی زندگی کا معیار بھی قریب قریب یہی تھا، یہاں تک کہ سادھو لوگ بھی اپنی روزمرہ زندگی میں بیش قیمت ظروف اور سازوسامان استعمال کرتے تھے اور اس وقت تک استعمال کرتے رہے جب تک کہ انھیں مذہبی احکامات کے ذریعہ ایسا کرنے کی باقاعدہ طور پر ممانعت نہ کر دی گئی۔

اس زمانہ کی کھانے پینے کی خاص چیزوں میں چاول، گیہوں، ترکاریاں، مچھلی، گوشت، دودھ سے بنی ہوئی مختلف چیزیں مثلاً دہی، مکھن وغیرہ، اور پھلوں کی ایک کثیر تعداد اور ان کے عرق شامل تھے۔ بہت سی قسم کی شرابیں بھی استعمال کی جاتی تھیں۔ معاصر ادب شاہد ہے کہ شاستروں میں مسکرات کی ممانعت کے باوجود ان کا استعمال، خاص کر امیر اور کھاتے پیتے گھرانوں میں عام تھا۔ عابدوں اور زاہدوں کو چھوڑ کر عام طور پر لوگ موسیقی، ناچ رنگ، ناٹک اور مختلف قسم کی دیگر تفریحات کے ذریعہ زندگی کو دلکش اور پُرلطف بنانا جانتے تھے۔

قدیم زمانہ کے ادب میں ہندوستانی سوداگروں کی روایتی دولت کے بیشمار قصے مندرج ہیں۔ کوشل کا ایک مشہور سوداگر، اناتھ پنڈک، ایک بہت خوبصورت سبزہ زار جو سراوستی میں واقع تھا، مہاتما گوتم بدھ کو نذر کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا مالک صرف اس شرط پر اسے فروخت کرنے کے لئے تیار تھا کہ اسے اتنی اشرفیاں قیمت میں دی جائیں جتنی اس میدان میں پھیلائی جا سکیں۔ اناتھ پنڈک نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ بھرہُت کے اسٹوپ میں سنگ پر کندہ ایک تصویر جو دوسری صدی قبل مسیح کی یادگار ہے تمام اس منظر کو کہ اشرفیوں سے بھری ہوئی گاڑیاں کس طرح اس میدان میں انڈیلی گئیں بڑی فصاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

جینیوں کی ایک مذہبی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آنند نامی ایک گرہستی کے پاس جس نے اپنا مذہب تبدیل کرنے کے بعد جین مت قبول کر لیا تھا ایک خزانہ تھا جس میں چار کروڑ اشرفیاں ایک محفوظ مقام پر جمع تھیں، چار کروڑ اشرفیاں سود پر لگی ہوئی تھیں، چار کروڑ اشرفیوں کے بقدر اس کے پاس جائداد تھی اور چار گلے جانوروں کے تھے جن میں سے ہر ایک میں دس ہزار مویشی تھے۔ اس قسم کے قصے دراصل مبالغہ پر مبنی ہیں لیکن ان سے بہر حال ملک کی دولت و ثروت اور فارغ البالی کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی دولت کا اندازہ مخیر سوداگروں کے ان گرانقدر عطیات سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے مختلف اداروں کے نام وقف کر دئے تھے۔ مثال کے طور پر کارلے کا وسیع و عریض غار جو ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت غار ہے، تنہا ایک سوداگر کا عطیہ تھا

قدیم ہندوستان کا تمام مذہبی ادب بتاتا ہے کہ لوگ بڑے عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ بدھ مذہب کی مقدس کتاب "وناپیٹاک" جو ۲۵۰ ق م کی تصنیف ہے، پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے مکانات کئی کئی منزل کے ہوتے تھے جن میں اینٹ، پتھر اور لکڑی استعمال کی جاتی تھی۔ نقش جھلکے ہوتے تھے۔ ان میں بھی اینٹ پتھر اور لکڑی لگائی جاتی تھی۔ کمرے ہوتے تھے جن کی دیواروں پر طرح طرح کے نقش و نگار اور تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ مسقف بالاخانے، برآمدے، پچھے، اور حمام ہوتے تھے جن میں انگیٹھیاں، ٹینیاں اور تہہ خانے رکھے جاتے تھے جنھیں کھولتے ہوئے پانی سے غسل کے بعد ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

"وناپیٹاک" ہی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان مکانوں میں مستطیل، مربع، کرسیاں، ہتھے دار کرسیاں، کئی کئی پائے والی کرسیاں، جھولن یا بید کی نشست والی کرسیاں، پلنگ پیڑیاں اور وضع وضع کی مسہریاں جن کے پائے مختلف جانوروں کی شکل کے بنائے جاتے تھے اور منقش ہوتے تھے، پائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ طرح طرح کے بیش قیمت لباس اور زیورات جن میں ہیرے اور دوسرے جواہرات جڑے ہوتے تھے، اور بیش قیمت سونے، چاندی، بلور، زمرد، تانبے اور سیسے کے برتن استعمال کئے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض پر تصویریں سی ہوتی تھیں اور ہیرے جڑے ہوتے تھے۔

قدیم ہندوستان میں دولت کی فراوانی تھی اور چاروں طرف فارغ البالی، اور عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ بہت سے جدید ممالک کے برعکس ہندوستان میں غریبوں اور بھکاریوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس زمانہ میں آج کل کی طرح کی فیکٹریاں اور بڑے بڑے کارخانے قائم نہیں تھے لیکن گھریلو صنعتیں، جن کی تنظیم باقاعدہ طور پر ہوتی تھی، ہر گھر کے لئے روزگار فراہم کرتی تھیں۔ قحط اور دوسری آسمانی بلائیں بالکل مفقود و معدوم تو نہ تھیں البتہ ان کا وقوع بہت کم اور بڑے طویل وقفوں کے بعد ہوتا تھا۔

چھٹی صدی قبل مسیح سے یونانی لوگ ہندوستان میں آنے شروع ہوئے۔ یونانیوں نے اپنے ملک واپس جا کر ہندوستان کے بارے میں عجیب و غریب قصے نقل کئے۔ یہ لوگ طبعاً ویسے تو روایت پسند واقع ہوئے تھے لیکن ساتھ ہی خلاف عقل باتیں بیان کرنے میں بھی تامل نہ کرتے تھے۔ یونانی سیاح ہیروڈوٹس[1] جسے تاریخ میں روایت کا باوا آدم مانا گیا ہے، اپنی کتاب میں ہندوستانی "چیونٹیوں" کا ذکر کیا ہے جن کے متعلق وہ کہتا ہے کہ کتے کی برابر جسیم ہوتی تھیں اور طلائی گرد کے ڈھیر کے ڈھیر ادھر سے ادھر اٹھا کر پھینک دیتی تھیں، اور اگر کوئی سونا اٹھا کر لے جانا چاہتا تھا تو اس پر حملہ آور ہوتی تھیں۔ ایک دوسرا یونانی فوجی افسر نیرکس[2] جو سکندر اعظم کے ساتھ تھا، ہیروڈوٹس کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے سونا کھودنے والی "چیونٹیوں" کی کھالیں بچشم خود دیکھی ہیں۔

معلوم نہیں یونانی مورخوں کا ان "چیونٹیوں" سے کیا مطلب ہے لیکن ان باتوں سے اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ خارجی ممالک کے لوگ ہندوستان کی دولت کے بارے میں بڑی شاندار رائے رکھتے تھے اور ہندوستان کو ایک بہت دولتمند ملک کی حیثیت سے جانتے تھے۔

ایک تیسرا یونانی مورخ کلیٹارکس[4] جو سکندر اعظم کا ہم عصر تھا ہندوستان کے ایک درباری تیوہار کی شان و شوکت کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے، "ہاتھیوں کی جھولیں سونے چاندی سے آراستہ ہوتی ہیں۔ رتھوں کو گھوڑے کھینچتے ہیں۔ بیل گاڑیاں بھی ہوتی ہیں۔ فوج کا مظاہرہ پوری شان و شوکت کے ساتھ ہوتا ہے۔ سونے چاندی کے بیش قیمت برتن جن میں ہیرے اور دیگر جواہرات جڑے ہوتے ہیں کثرت کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں۔"

واتسیاینا[5] کی کام سوتر (کتاب اول، باب چہارم) سے

---

[1] اس کے تین حصے ہیں۔ "ست دھنگ"، "گھنڈک" اور "یری دریا تھم"

[2] یہ پانچویں صدی ق م میں ہندوستان آیا۔ [3] اس کے اقوال اریاس نے (یونانی مورخ ۹۵ء تا ۱۷۵ء) اپنی انڈکا میں جا بجا نقل کئے ہیں۔

[4] اس نے سکندر اعظم کی سوانح حیات مرتب کی تھی۔ [5] ارتھ شاستر کے مشہور مصنف کوٹلیہ کے کئی نام ہیں۔ چانکیہ، وشنو گپت، دراصل پکشل سوامی، ملناگ، اور واتسیاین۔

اس عہد کے متوسط طبقہ کی زندگی کا صحیح نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اس کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ متوسط طبقہ کے لوگ عیش وعشرت کی زندگی گذارتے تھے جس میں نفاست اور خوش ذوقی کی جھلک صاف طور پر نمایاں تھی۔ اُن کے سماجی مشاغل میں شراب اور عورت کو کافی دخل تھا۔ اُن کا ذریعہ یہ تھا کہ وہ صابن، صندل، یا اُبٹن سے غسل کرتے، ڈاڑھی مونڈتے، اور مونچھوں کو چڑھائے رکھتے تھے۔ ہر سونے کے کمرہ میں حسب ذیل چیزوں کا ہونا ضروری تھا — کتابیں، گانے بجانے کے مختلف ساز، مصوری کے لوازم، مختلف قسم کے گھریلو کھیلوں مثلاً شطرنج اور چوسر وغیرہ کی بساط، تاش کی ایک گڈی تفریحاً کھیلنے کے لئے اور دوسری خاص طور پر جوا کھیلنے کے لئے۔ ہر گھر کے ساتھ ایک باغ یا چمن ہوتا تھا جس میں طرح طرح کے خوبصورت پھول، طوطا مینا اور دوسرے پالتو پرندوں کے پنجرے، اور ایک "ڈولا" یا جھولا ملتا تھا جس میں چھوٹے بڑے سب جھولتے تھے۔

میگستھنیز[1] نے جو ہندوستان کی تصویر کھینچی ہے اُس سے بھی ہندوستان کی دولت وثروت، خوشحالی اور فارغ البالی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "اہلِ ہند کے پاس ذرائع معیشت کی بہتات ہے۔ یہاں کے لوگ فنون کے ماہر ہیں۔ اُن لوگوں سے جو پاکیزہ ہوا کھاتے اور تازہ اور شفاف پانی پیتے ہیں، یہی امید کی جا سکتی ہے۔ یہاں کی زمین ہر قسم کے پھل پھلار پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ دھاتیں بھی اُگلتی ہے مثلاً سونا، چاندی، تانبا، لوہا، ٹین اور دوسری دھاتیں جنھیں مختلف قسم کی مصنوعات، زیورات، اور آلات حرب بنانے کے کام میں لایا جاتا ہے۔"

میگستھنیز لکھتا ہے "ہندوستان میں جوار کثرت سے پیدا ہوتی ہے جس کو حسب منشا وضرورت نہروں اور دریاؤں سے پانی دیا جاتا ہے۔ مختلف قسم کی دالیں مثلاً مٹر اور ارہر وغیرہ، چاول اور دیگر اناج پیدا ہوتے ہیں جنھیں غذا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ زمین ایسے پودے اُگاتی ہے جنھیں جانوروں کے چارہ کے کام میں لایا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر خودرو ہوتے ہیں۔ یہ بات تحقیق ہو گئی ہے کہ ہندوستان میں قحط نہیں پڑتا اور کھانے پینے کی چیزوں کی کبھی کمی واقع نہیں ہوتی۔"

چندر گپت موریہ کے محل کے بارے میں میگستھنیز نے کہا ہے: "محل کے اندر سونے کے ٹھوس برتن جن میں سے بعض چھ چھ فٹ چوڑے ہیں، استعمال کئے جاتے ہیں۔ برتن تانبے کے بھی ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی ہیرے اور دوسرے جواہرات جڑے ہوتے ہیں۔ شاہی کرسیوں پر بڑے خوبصورت نقش ونگار بنے ہوتے ہیں۔ راجہ ہوادار میں نکلتا ہے جو سونے اور قیمتی پتھروں سے سجا ہوتا ہے۔ اسی طرح راجہ کی سواری کے گھوڑوں اور ہاتھیوں کی جھولیں سونے اور دوسرے جواہرات سے آراستہ ہوتی ہیں۔"

فاہیان نے جو پانچویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا لکھا ہے کہ ہندوستان میں "خوش حالی اور فارغ البالی کا عام دور دورہ ہے۔" اسی طرح ہیون سانگ جو ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا راجہ ہرش وردھن کے بارے میں لکھتا ہے: "راجہ ہر پانچویں سال پریاگ میں ایک عظیم الشان میلہ لگواتا ہے جس میں وہ اپنی تمام دولت جو وہ پانچ سال تک برابر جمع کرتا رہتا ہے خیرات کر دیتا ہے یہاں تک کہ آخر میں راجہ اپنا تاج سر سے اور ہیروں کی مالا گلے سے اتار کر خیرات کر دیتا ہے۔" قنوج کے جلوس کا ذکر کرتے ہوئے ہیون سانگ لکھتا ہے۔ "ہر صبح کو ایک چھوٹا سا بدھ جی کا طلائی مجسمہ ۳ فٹ اونچا شاہی محل سے مینار تک لے جایا جاتا ہے۔ خود راجہ اندر دیوتا کے بھیس میں شریک رہتا ہے اور موتیوں، سونے چاندی کے پھولوں، اور دوسرے بیش قیمت پتھروں کی بکھیر کرتا ہوا جاتا ہے۔"

یونانیوں کی طرح مسلمان مورخوں نے بھی ہندوستان کی تمام دولت کی قصیدہ خوانی کی ہے۔ "لاتعداد دولت" اور "سونے کی کثرت" جیسی ترکیبیں نویں صدی عیسوی کے مسلمان سیاحوں کے بیانات میں جابجا ملتی ہیں۔ عرب مورخوں نے اُس بے شمار اور بے حساب دولت کا جو مسلمان حکمراں یہاں سے حاصل کر کے مال غنیمت کے طور پر اپنے ملک کو لے گئے اپنی کتابوں میں جابجا ذکر کیا ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں محمد بن قاسم نے ملتان فتح کیا تو وہاں اُسے ایک خزانہ ہاتھ لگا جس میں تیرہ ہزار دو سو من سونا صرف ایک

[1] یونانی سفیر، جو سلیوکس نکیٹر کی طرف سے چندر گپت موریہ کے دربار میں کئی سال رہا۔

سمندر میں سے برآمد ہوا تھا۔

محمود غزنوی کا مورخ نامی، عتبی لکھتا ہے[۱] : "راجہ جے پال کی مالا میں سچے موتی، بیش قیمت جواہرات، اور یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ اس مالا کی قیمت دو لاکھ دینار جانچی گئی تھی۔"

بھیم نگر کے قلعہ کا ذکر کرتے ہوئے عتبی کہتا ہے۔ "اس قلعہ میں اتنی دولت جمع تھی کہ سلطان کے پاس اتنے اونٹ اور دوسری سواریاں نہیں تھیں جن پر لاد کر وہ یہ تمام دولت اپنے ملک کو لے جاتا۔ کاتب اس کی فہرست تیار کرنے اور محتسب اس کی قیمت کا تعین کرنے سے قاصر تھے۔ بھیم نگر کے مال غنیمت میں قیمتی دھاتیں، موتی، مالائیں اور گلے میں پہننے کے دوسرے زیورات شامل تھے۔ چاندی کے سکوں کی تعداد سات کروڑ سکۂ شاہی اور طلائی عددوں کا وزن سات لاکھ چار سو من تھا۔ ریشمی کپڑے اور دیگر خوبصورت اور بیش قیمت کپڑے اتنی کثیر تعداد میں حاصل ہوئے کہ بڑے بوڑھے اور تجربہ کار لوگوں کا کہنا تھا کہ اس قدر بیش قیمت سامان انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس سامان میں ایک چاندی کا مکان تھا جو وضع قطع کے لحاظ سے امیروں کے گھروں سے مشابہ تھا۔ یہ تیس گز لمبا اور پندرہ گز چوڑا تھا۔ اس کی دیواریں چادر کی تھیں جنھیں حسب ضرورت توڑا یا جوڑا جا سکتا تھا۔ ایک یونانی ریشم کا شامیانہ تھا جو چالیس گز لمبا اور بیس گز چوڑا تھا۔ اس کی دو چوبیں سونے کی اور دو چاندی کی تھیں۔ سلطان نے ایک ایسے افسر کو اس قلعہ کی حفاظت پر متعین کیا جو اس کا سب سے زیادہ معتمد تھا۔ جب سلطان غزنی پہنچا تو اس نے تمام مال غنیمت کو اپنے محل کے صحن میں پھیلانے کا حکم دیا۔ اس میں موتی تھے جو ستاروں کے مانند چمک رہے تھے، اور انگاروں کے مانند دہک رہے تھے۔ ہیرے تھے جو قد و قامت اور وزن میں بڑے بڑے اناروں کے برابر تھے۔ تمام دیکھنے والوں کی رائے تھی کہ انھوں نے کبھی اتنی دولت دیکھی نہ سنی، اور نہ کہیں اس کے بارے میں پرانی کتابوں میں پڑھا۔ اس دولت کو شاہ ترکستان کے سفیر تغاخان نے بھی دیکھا۔ وہ یہ سب دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ قارون کے پاس بھی اتنی دولت نہ تھی۔

فتح قنوج کے بیان میں متھرا کے ایک مندر کا ذکر کرتے ہوئے عتبی لکھتا ہے کہ "اس میں پانچ مورتیاں پانچ پانچ گز اونچی خالص سونے کی تھیں اور ہوا میں معلق تھیں۔ ان کی آنکھوں کی جگہ دو بڑے بڑے ہیرے لگے ہوئے تھے جو اتنے بیش قیمت تھے کہ سلطان بغیر سوچے سمجھے انھیں پچاس ہزار اشرفی کے عوض خرید سکتا تھا۔ ایک دوسری مورتی میں ایک نیلے رنگ کا ہیرا جڑا ہوا تھا جس کی چمک دمک نورانی لہروں کی یاد دلاتی تھی۔ ایک اور مورتی میں سے چار ہزار چار سو مثقال سونا حاصل ہوا۔ ان تمام مورتیوں میں سے کل ملا کر اٹھانوے ہزار تین سو مثقال سونا اور اس سے دو سو گنی چاندی حاصل ہوئی۔"

"راجہ چاند رائے کو شکست دینے کے بعد" عتبی لکھتا ہے "سلطان کو جو سونا، چاندی، قیمتی یاقوت، اور سچے سفید موتی دستیاب ہوئے اُن کی قیمت کا تخمینہ تیس لاکھ روپئے لگایا گیا۔"

ان روایات میں ہو سکتا ہے مبالغہ سے کام لیا گیا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ ہندوستان کی دولت، فارغ البالی اور خوشحالی پر ضرور دلالت کرتی ہیں۔ باہر کے لوگوں نے ہندوستان کا نام بجا طور پر "سونے کی چڑیا" رکھ دیا تھا

* * *

[۱] ترجمہ از شری رام سترما، ڈی، اے، وی کالج، لاہور جو علی گڑھ ہسٹاریکل انسٹی ٹیوٹ کے سہ ماہی جرنل جولائی اکتوبر کے شمارہ میں شائع ہوا۔

ذوالنورین

درد ہے دل میں اگر، درد کا درماں بھی تو ہے
زہر آلودۂ الفتِ جاناں بھی تو ہے

بارہا گردشِ افلاک سے لی ہے ٹکّر
اس میں لیکن نگہِ دوست کا احساں بھی تو ہے

خوب ہے دل کشیِ وادیِ اُلفت لیکن
اور آگے ابھی اک عالمِ عرفاں بھی تو ہے

کاکلِ دہر سنواریں، سحر تو لائیں
ہم سفرِ راہ میں لیکن دلِ ناداں بھی تو ہے

رہزنِ ہوش بھی ہے، دشمنِ ایماں بھی ہے عشق
راس آجائے اگر حاصلِ ایماں بھی تو ہے

کون کہتا ہے ہوئی ختم متاعِ اُلفت
خون ہے دل میں ابھی، دیدۂ گریاں بھی تو ہے

ہم یہ سمجھے تھے کہ اب ختم ہوئی مشقِ ستم
ہائے پھر سامنے وہ چشمِ پشیماں بھی تو ہے

تجھ کو اندازِ تبسّم یہ نہ آیا غمِ دل
پھول خنداں ہے مگر چاکِ گریباں بھی تو ہے

ہے کہاں محفلِ عشرت میں وہ آسایشِ غم
لمحۂ عیش و طرب تیز خراماں بھی تو ہے

سراج الدین علی خاں آرزو

کوثر چاندپوری

دہلی کی سرزمین کو تمدنی اور مرکزیت کے اعتبار سے ہمیشہ امتیاز حاصل رہا ہے۔ اس کی علمی اور ادبی عظمت بھی ہر دور میں برقرار رہی ہے۔ دہلی کی آغوش میں ایسے شاعر اور اہلِ فضل و کمال موجود رہے ہیں جن کے فن کا سکہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونِ ہند بھی چلتا رہا ہے۔ امیر خسرو اور حسن سجزی کے نام سے دہلی کی تاریخ ابد تک روشن رہے گی۔ سلاطین تیموریہ کے عہدِ حکومت میں بھی دہلی نے بڑے بڑے صاحبانِ کمال کو دنیا سے روشناس کرایا اور یہ سلسلہ میر و سودا اور غالب و مومن ہی تک جاری نہیں رہا بلکہ اب تک بھی منقطع نہیں ہوا۔ اکبر کے زمانہ سے محمد شاہ کے زمانہ تک اگر صرف ممتاز شعراء ہی کے نام شمار کئے جائیں تو ان کی فہرست کافی طویل ہوگی۔ شعراء کی قدردانی اور ان کی عزت افزائی کے تاریخی اسلسلے اور زیادہ حیرت انگیز ہیں۔ سلاطین چغتائیہ کے سلسلہ میں صرف ایک اورنگ زیب کی شخصیت ایسی ہے جس کو فنونِ لطیفہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور اس کا دورِ فرمانروائی ان فنون کے لئے ایک حد تک کس مپرسی کا دور تھا۔ سرکاری طور پر فنکاروں کی کوئی ہمت افزائی نہ ہوتی تھی بلکہ "ملک الشعراء" کا عہدہ بھی توڑ دیا گیا تھا لیکن ان اسباب سے علوم و فنون کا ارتقا رک نہیں سکتا تھا۔ ہر نظام اور ہر سماج میں فنکار پیدا ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ ان کے نقوشِ قدم سے وقت کے ذراتِ ریگ نہ اپنی پیشانی بچا سکے ہیں نہ آگے کو بچا سکیں گے۔ زمانہ انہیں جنم دیتا رہے گا اور وہ وقت کے ساز پر اپنا پیغام الاپتے رہیں گے۔ چنانچہ اورنگ زیب کی بے التفاتی کے باوجود دہلی میں شاعری کی شمع روشن رہی۔ ناصر علی اور مرزا عبدالقادر بیدل اسی زمانہ کی یادگار ہیں باوجودیکہ ان میں سے کسی کو "ملک الشعرائی" کا منصب حاصل نہیں ہوا مگر ان کے کلام کا سکہ آج بھی رواں ہے جب کہ شہنشاہ اورنگ زیب کی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سونے اور چاندی کے سکے کہیں نظر نہیں آتے۔ بیدل کا چراغ تو مرزا غالب تک روشن رہا۔ غالب کی ابتدائی شاعری پر بیدل کے گہرے نقوش موجود ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے شعور سے آخر تک بیدل کے اسلوب کو محو نہیں کر سکے۔ ان کے کلام میں کہیں نہ کہیں بیدل کی جھلک ضرور نظر آجاتی ہے۔ بیدل نے لمبی عمر پائی اور محمد شاہ کے آغازِ جلوس تک زندہ رہے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب طاہر نصیر آبادی اصفہان میں بیٹھے ایک تذکرۂ شعراء مرتب کر رہے تھے جس میں ایک باب شعرائے ہند کیلئے بھی مخصوص کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایران کے بعض تذکرہ نویس مثلاً محمد عوفی، دولت شاہ اور میر محمد تقی کاشی نے اپنے تذکروں میں ہندوستان کے شعراء کا ذکر کیا تھا۔

سراج الدین خاں آرزو بھی عہدِ محمد شاہی کے سخنور ہیں۔ میر محمد افضل ثابت الہ آبادی، مرزا عبدالغنی قبول کشمیری اور مرزا مظہر جانِ جاناں ان کے ہمعصروں میں شامل ہیں۔ ان کا فیضِ تربیت مرزا رفیع سودا، میر تقی اور خواجہ میر درد تک کارفرما رہا ہے بلکہ اردو کے زلف و گیسو میں آج جو دلکشی، خوبصورتی اور رعنائی نظر آرہی ہے اس کے پیچھے آرزو ہی کی فنکاری اور چابک دستی مصروفِ عمل ہے۔ وہ لوگ آرزو ہی کے تربیت کردہ تھے

جن کی بدولت اس مقبولِ عام زبان کو جگت اور ذو معنی الفاظ سے نجات ملی اور آہستہ آہستہ وہ فارسی کے اسلوب اور اندازِ بیان کا آئینہ بن گئی۔ اس کے باوجود اردو شاعری پر مقامیت کا رنگ غالب رہا اور اردو شاعروں نے ہمیشہ ہندوستانی ڈھنگ پر سوچا۔ آرزو کے والد کا نام حسام الدین حسام تھا نسب باپ کی طرف سے شیخ کمال الدین تک اور ماں کی طرف سے شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری تک پہونچتا ہے۔ شیخ کمال الدین شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کے بھانجے اور لکھنؤ کے باشندے تھے۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ اکبر آباد کب اور کیوں کر ہو گئے۔

آرزو سنہ ۱۱۰۱ھ میں پیدا ہوئے ان کی ولادت آگرہ میں ہوئی بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں اکبر آبادی کی جگہ گوالیاری لکھا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کی ننھیال گوالیار میں تھی۔ آرزو نے کم سنی ہی میں علوم متداولہ میں دستگاہ پیدا کر لی۔ شعر گوئی کا ذوق ابتدا ہی سے تھا آخر اس فن میں وہ نہایت کامل اور اپنے وقت کے اساتذہ میں شمار ہوئے۔ آرزو سنہ ۱۱۳۲ھ میں گوالیار سے دہلی آئے اور کچھ تذکرہ نگار اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ وہ گوالیاری ہیں چنانچہ تذکرۂ حسینی کے مصنف لکھتے ہیں: "شمعِ شبستانِ افسامِ گفتگو سراج الدین علی خاں آرزو سلمہ اللہ وطنش گوالیار است وسخنش لآلیِ آبدار"[1] تذکرۂ حسینی سنہ ۱۱۶۳ھ میں ختم ہوا ہے۔ "خجستہ انجام" تاریخ اتمام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تذکرۂ حسینی کے مصنف آرزو کے ہمعصر ہیں اور ان کا یہ تذکرہ آرزو کے مجمع النفائس سے ایک سال قبل مکمل ہوا ہے۔ ایسی صورت میں آرزو کی وطنیت کا غلط انتساب حیرت انگیز ہے۔

دہلی کے علم دوست حضرات نے آرزو کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سب سے پہلے وہ راجہ انند رام مخلص کے دامنِ التفات سے وابستہ ہوئے۔ مخلص خود شاعر تھے اور آرزو ہی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ممکن ہے یہ رشتہ دہلی آنے کے بعد ہی قائم ہوا ہو۔ بہر حال، مخلص کی کوشش سے آرزو کو بادشاہ کی سرکار سے منصب اور جاگیر کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ دہلی میں ایک اور صاحبِ اقبال ایسے تھے جن سے آرزو کے بیس سالہ مراسم تھے یعنی موتمن الدولہ اسحٰق خاں شوستری۔ یہ عربی اور فارسی نظم و نثر میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ ان کا التفات بھی آرزو کو حاصل رہا۔ شوستری کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نجم الدولہ نے بھی باپ کی روایت کو زندہ رکھا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھایا یعنی آرزو کو ڈیڑھ سو روپئے ماہانہ دینے لگا اس کے علاوہ کافی مراعات بھی کرتا تھا۔ نجم الدولہ کی وفات کے بعد اس کے چھوٹے بھائی "سالار جنگ" نے آرزو کی سرپرستی کی اور وہ انھیں اپنے ساتھ دیارِ شرق کی طرف لے گیا۔

آخر محرم ۱۱۶۰ھ میں صفدر جنگ ناظم صوبۂ اودھ و الہ آباد کی وفات کے چند روز بعد آرزو لکھنؤ پہونچے جو ان کے دادا کمال الدین کا وطن بھی تھا۔ یہاں سالار جنگ نے شجاع الدولہ سے ان کا تعارف کرا دیا۔

جب آرزو دہلی پہونچے ہیں اس وقت فرخ سیر دادِ فرمانروائی دے رہا تھا۔ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جانے کا زمانہ وہ ہے جب عنانِ حکومت شاہ عالم ثانی کے ہاتھ میں تھی۔ آرزو دارالحکومت میں قاضی القضاۃ بھی ہو گئے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عازمِ لکھنؤ ہونے سے قبل انکو اس عہدے سے ہٹا دیا گیا تھا یا وہ خود ہی دستکش ہو گئے تھے

بہرکیف لکھنؤ کا سفر بھی انھیں راس آیا اور شجاع الدولہ نے تین سو روپے ماہانہ مدِ خرچ کے طور پر مقرر کر دئے لیکن وہ زیادہ عرصہ تک اس سے مستفید نہیں ہوئے اور ربیع الاول ۱۱۶۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ علامہ آزاد بلگرامی نے تاریخ کہی ۔

شمعِ رونق بخشِ بزمِ گفتگو | خانِ والا شان سراج الدین علی
رحمتِ کامل بروحِ آرزو | زد رقم آزاد سالِ رحلتش

۱۱۶۹ھ

لکھنؤ ہی میں انھیں سپردِ خاک کیا گیا۔ بعد کو ہڈیاں دہلی لے جا کر دفن کی گئیں۔

آرزو نہایت متواضع، شگفتہ مزاج اور بردبار آدمی تھے انکا عہدہ بھی جو بہت زیادہ سنجیدگی اور متانت کا طالب تھا، ان کی ظرافت اور شگفتگی کے احساس کو دبا نہ سکا تھا۔ ان کے اندر خودبینی پیدا کر سکا تھا۔ دوسرے اردو شعرا کی طرح آرزو کی جمالیاتی حس بھی زندہ تھی اور وہ حسن پرستی کا ذوق رکھتے تھے۔ ایک مشاعرے میں چند شعر دوست حضرات بیٹھے شعر و سخن پر گفتگو کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے آرزو کی بیحد تعریف کی دیوان سودا کے دیباچہ نگار

---

[1] تذکرۂ حسینی صفحہ ۴۸

حکیم اصلح الدین خاں کی رگِ ظرافت پھڑکی اور پھبتی کر دیا۔

آرزو خوب است اما ایں قدر ناخوب نیست!

آرزو کو اس سے کوئی آزردگی نہیں ہوئی بلکہ وہ اور لوگوں کے ساتھ ہنس پڑے۔
آرزو فارسی کے شاعر تھے لیکن انھوں نے اردو میں شعر کہنے کے علاوہ بہت سے شاعروں کی سرپرستی بھی کی ہے۔ مرزا سودا نے انھیں کی رائے سے ریختہ کہنا شروع کیا ورنہ اس سے قبل وہ فارسی شعر کہا کرتے تھے۔ آرزو نے انھیں متوجہ کیا کہ فارسی تمھاری مادری زبان نہیں، اس میں کوئی امتیاز نہیں کر سکو گے البتہ اردو میں طبع آزمائی کرو گے تو شہرت اور انفرادیت حاصل ہو جائے گی۔ آرزو ایسے تجربہ کار استاد اور اسے سماج کے بہترین نقاد کی یہ رائے حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

آرزو اگرچہ ایک ذمہ دار عہدے پر فائز تھے مگر اسی کے ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی منہمک رہتے تھے اور ان کے وقت کا اکثر حصہ ادبی دلچسپیوں میں صرف ہوا کرتا تھا۔ وہ ایسے یہاں مشاعرے بھی منعقد کیا کرتے تھے ایک مرتبہ ان کے مکان پر مجلسِ سخن برپا تھی سودا اگرچہ نوجوان تھے لیکن وہ بھی شریکِ بزم تھے۔ انھوں نے مطلع پڑھا۔

آلودہ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکتے ہیں فلکِ برسوں میں کو

اصل میں سودا کا مطلع قدسی کے اسی مطلع کا ترجمہ تھا۔

آلودہ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را
اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

سُن کر اور لوگ تو خاموش رہے، آرزو جو ان تمام شعرا کے رہنما اور میر کارواں تھے ضبط نہ کر سکے انھوں نے فوراً کہا ؎

شعرِ سودا حدیثِ قدسی ہے
چاہیئے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

سودا کا ذہن غالباً اصل مقصد کی جانب منتقل نہ ہو سکا انھوں نے حدیث قدسی کے لفظ کو داد پر محمول کیا اور آرزو کے گلے سے لپٹ گئے اور اس داد پر بہت خوش ہوئے۔

تصانیف

آرزو کی بیشتر تصانیف اب تک اربابِ علم کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ وہ زبردست عالم اور نقاد تھے۔ زبان پر کامل عبور رکھتے تھے۔ شعرا کی سی اصطلاحات پر بھی انھوں نے محققانہ نظر ڈالی تھی اور ان کے کلام کا بہترین انتخاب بھی کیا تھا۔ ان تصانیف سے آرزو کے علم و فضل کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مجمع النفائس ۱۱۶۴ھ میں آرزو نے یہ تذکرۂ شعرا مرتب کیا تھا جس میں بقول آزاد بلگرامی مختلف شاعروں کے دواوین کا بڑے اہتمام اور نکتہ درسی سے انتخاب کیا تھا۔ اگرچہ شعرا کے حالات اور سنِ ولادت و وفات بیشتر واقعات میں تاریخی ترتیب پر توجہ نہیں کی گئی تاہم مجمع النفائس کی حیثیت "فتاوائی اشعار" سے کم نہیں ہے اور اس سے اکثر مفید باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ طرزِ تحریر نہایت صاف اور بے تکلف ہے۔ بہت سی نئی باتیں معرضِ تحریر میں لائی گئی ہیں۔ یہ آزاد بلگرامی کے الفاظ ہیں جو خود بہت بڑے شاعر عربی اور فارسی زبانوں کے ماہر، ساتھ ہی بڑے پائے کے تذکرہ نویس تھے۔
اس تذکرے کی تکمیل نجم الدولہ کی شہادت کے بعد ہوئی ہے ۱۱۶۳ھ میں نجم الدولہ بنگش افغانوں سے جنگ کے دوران میں قصبہ پٹیالی اور سہادر کے درمیان مارا گیا تھا۔ آرزو نے اپنے تذکرے میں اسحٰق خاں شوستری اور نجم الدولہ کا ذکر کیا ہے۔ نجم الدولہ کا تذکرہ غالباً اس کی زندگی ہی میں قلمبند کیا جا چکا تھا۔ آرزو نجم الدولہ کی قدرشناسیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں تیرہ سال سے ان کے ساتھ ہوں۔

۲۔ موہبتِ عظمیٰ۔ یہ رسالہ فنِ معانی میں ہے
۳۔ عطیۂ کبریٰ۔ علمِ بیان میں۔

یہ دونوں رسائل معانی و بیان میں مفتاح اور تلخیص کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

۴۔ فرہنگ سراج اللغت۔ برہانِ قاطع کے انداز پر لکھی گئی
۵۔ چراغِ ہدایت۔ اس میں وہ لغات اور اصطلاحات جمع کئے گئے ہیں جن کو جدید شعرا نے استعمال کیا ہے اور پہلی کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

۶۔ نوادر الالفاظ۔ ہندی کے وہ لغات جن کے عربی اور فارسی مترادفات ہندوستان میں مشہور نہیں ہیں۔

۷۔ خیابان۔ شرح گلستانِ سعدی

۸۔ کلیات۔ تقریباً تیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے تذکرہ میر حسن میں آرزو کے دو دادین کی تعداد سات بیان کی گئی ہے جن میں سے ہر ایک میر حسن کی رائے میں نظیری اور خاقانی کا مقابلہ کرتا ہے کلیات میں غالباً سا نون دیوان شامل ہیں۔ اسی وجہ سے اشعار کی تعداد زیادہ ہے۔

۹۔ تنبیہ الغافلین۔ قاموس المشاہیر میں صرف کتاب کا نام ہی لکھا ہے، اس کے موضوع کا کوئی حوالہ نہیں دیا خزانۂ عامرہ میں شیخ علی حزیں کے ذکر میں بتایا گیا ہے کہ یہ رسالہ آرزو نے حزیں کے بعض اشعار کے رد میں لکھا تھا۔ بات یہ تھی کہ دہلی کے شعرا حزیں سے ناراض ہو گئے تھے کیوں کہ انھوں نے اسے اس شعر میں ہندوستاں کی ہجو کی تھی۔

ناکس سبب الست بمانے مردمی

ارد تولاخ ہمند کہ مردم نداشتہ است

اس پر دہلی کے سخنوروں میں بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا اور حزیں کو دہلی چھوڑ کر اکبر آباد جانا پڑا تھا۔ پھر مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے وہ بنارس جا کر مقیم ہو گئے تھے۔ وہیں انتقال بھی ہوا تنبیہ الغافلین کو اسی ادبی ہنگامہ کی ایک لہر سمجھا چاہیئے۔

اردو اشعار

مرزا بیدل اور آرزو کے عہد تک اردو شاعری بالکل ابتدائی مراحل میں تھی بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ ابھی وہ تخلیق کے گہوارے ہی میں تھی اس لئے جو لوگ فارسی میں مشقِ سخن کر رہے تھے وہ اردو کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور محض دلچسپی کے طور پر کبھی کبھی طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے۔ آرزو نے بھی اپنے معاصرین کی طرح اردو میں کچھ اشعار کہے ہیں۔ ان کا کلام اردو کے ارتقا کی ایک ادبی اور تاریخی دستاویز ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی ابتدائی دور میں کیسے کیسے محاورے استعمال ہونے لگے تھے۔ قائم چاندپوری نے مخزنِ نکات میں ان کے چند اشعار لکھے ہیں بعض دوسرے تذکروں میں ان کے علاوہ جو اشعار مل گئے ہیں ہم نے وہ بھی لکھ دیے ہیں۔

وعدے تھے سب خلاف جو اس لب پہ ہم سنے

یہ لعل نیستی دیکھو جھوٹا نکل گیا

مرے شوخِ خراباتی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو

بہارِ حسن کو دی آب جب اس نے جرس کھینچی

میخانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے

زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے

چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے تہمد کے

دریا عرق میں ڈوبا تجھ سیم تن کے آگے

موتی نے کان پکڑا تیرے سخن کے آگے

ہرگز نظر نہ آیا ہم کو سجن ہمارا

گویا کہ تھا چھلاوہ من ہرلمن ہمارا

تیرے دہن کے آگے دم مارنا غلط ہے

غنچے نے گانٹھ باندھا سن کر سخن ہمارا

جان پر کچھ تجھ پر اعتماد نہیں

زندگانی کا کیا بھروسہ ہے

آتا ہے صبح اٹھ کر تیری برابری کو

کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

اس تند خو صنم سے ملنے لگا ہوں جب سے

ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو

تجھ زلف میں اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے

بے کار ہے اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے

دریائے اشک اپنا جب سر پہ اوج لائے

طوفانِ نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہو دیگا

مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رو دیگا

آرزو کے اردو کلام سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوتی ہے کہ زبان معزالدین موسوی خاں فطرت اور قزلباش خاں امید وغیرہ کے ایسے اشعار کو

از زلف سیاہِ تو بدل دوم پری ہے

در خانۂ آئینہ گتا گھوم پری ہے[1] (فطرت)

---

[1] بعض تذکروں میں اس شعر کو بھی تھوڑے تغیر سے امید ہی سے منسوب کیا گیا ہے۔ کوثر

دامن کی میٹی آج مری آنکھوں پر نیا ہو

حضرتِ دکانی دماود گر لرکی ہیٹ ''انیدا

کو بیٹے چھوڑ کر کا فی آگے بڑھ گئی تھی اور اس سے نسل کی روایات گردکار دائں جن کی تھیں آرزو نے پھوڑ پھوڑ تمہیدوں کے کٹول کال بلڑا کا بھوا دھا تکاں ہے کر ردیا۔ دن لگا قسم کے محاورے ہابہ بے تکلفی سے نظم کئے ہیں۔ تمام سماج کا نمائندہ اور رجحان ہوتا ہے اس لئے الفیں کرنا چاہیے کہ یہ محاورے ان کے اپنے نہیں بلکہ ان عوام کے ہیں جو اس زمانہ میں انھیں بولنے لگے تھے۔ قائم چاندپوری اس وقت کی اردو کو درجۂ اعتبار سے ساقط سمجھتے ہیں اور یہی خیال ان فنکاروں کا بھی تھا جو فارسی کو علمی اور تصنیفی زبان سمجھ کر اسی میں شعر کہہ رہے تھے اور ریختہ میں ان کا مسلسل کلام نہیں ملتا۔ یہی ریختہ آگے چل کر ہوش مند فنکاروں کی توجہ سے ''غزل'' میں تبدیل ہو گیا۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ

اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

شاگرد

آرزو کے تلامذہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو آگے چل کر نہ صرف آبروئے غزل ہی نہیں بلکہ زبان اور فن کے امام ثابت ہوئے مثلاً شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، شرف الدین پیام اکبرآبادی وغیرہ۔ مرزا مظہر جانِ جاناں، میر تقی، مرزا سودا اور میر درد بھی آرزو ہی کے تربیت یافتہ تھے۔ میر تقی ان کے شاگرد بھی تھے اور سوتیلے بھانجے بھی۔ میر کے والد عبداللہ نے آرزو کی بہن سے شادی کر لی تھی۔ آخر میں خانگی معاملات کی بنا پر آرزو سے کافی آزردہ ہو گئے تھے۔ فارسی زبان کے اکثر نامور شاعروں نے بھی آرزو کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے اور اپنے دواوین ان کے پاس اصلاح کی غرض سے بھیجے ہیں۔ اس سلسلہ میں میر محمد عظیم ثبات، حاکم لاہوری اور آنند رام مخلص کا نام لکھ دینا کافی ہے۔ حاکم لاہوری کے باپ عہد محمد شاہی میں پنج ہزاری امیر تھے۔ نوبت علم اور نقارہ بھی حاصل تھا۔ حاکم نے ایک تذکرۂ شعرا مردم دیدہ کے نام سے لکھا تھا۔ اس میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ میں نے اپنا دیوان سراج الدین علی خاں آرزو کی خدمت میں اصلاح کے لئے پیش کیا تھا اور آرزو نے غور سے دیکھ کر اپنی رائے حواشی پر لکھ دی تھی۔ حاکم نے اپنی غزل کے ایک مقطع میں بھی آرزو سے اظہارِ عقیدت کیا ہے ؎

گرچہ از فیضِ خانِ آرزو گیرد نمک

طرفہ شورے ایں غزل حاکم بہ لاہور افگند

آرزو نے حاکم کی اس غزل کو دیکھ کر برجستہ کہا ؎

مبت سحر آرزو را رتبہ

گر تو با ایں ہم بلندی حاکمی

حاکم نے یہ غزل آرزو کی ایک غزل پر کہی تھی۔

حاکم کے دیوان پر آرزو نے جو اعتراضات کئے تھے وارستہ سیالکوٹی نے ان کے جواب میں ایک رسالہ جوابِ شافی کے نام سے لکھ کر اعتراضات رفع کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود حاکم اور آرزو کے درمیان دوستانہ مراسم برقرار رہے۔ آرزو نے مجمع النفائس میں بہت اچھے الفاظ میں حاکم کا تذکرہ کیا ہے۔ اور حاکم بھی آرزو کی وفات کے بعد احترام و خلوص سے ان کا ذکر کرتا رہا۔

علامہ آزاد بلگرامی سے آرزو کی خط و کتابت تھی۔ دونوں کے درمیان اشعار کا تبادلہ بھی ہوا ہے۔ آرزو نے دو جگہ مجمع النفائس میں آزاد کا اور آزاد نے سرو آزاد اور خزانۂ عامرہ میں آرزو کا حال لکھا ہے۔ خط لکھنے میں پیش قدمی آزاد کی جانب سے ہوئی تھی۔ انھوں نے دو مرتبہ جوابی ہنڈی کے طور پر خط اور کچھ روپیہ آرزو کو بھیجا۔ آرزو کے چند فارسی اشعار خزانۂ عامرہ سے انتخاب کر کے یہاں لکھے جاتے ہیں ؎

اگرچہ نسبت زرِ سرخ در خزینۂ ما

حرم شرابِ شفق گوں بود دفینۂ ما

حیرتِ دیدار آرزو زمیں چمن در رم مرا

چشمِ حیراں بال پرواز است چوں شبنم مرا

سوال از منِ مخمور صبحِ حشر چہ سود

دماغِ اینکہ کسے را دہم جواب کجا

شیخ ایں جا دعویٔ تقوی نخواہد پیش رفت

عالم آب است ایں والله جائے نور نیست

شیخ زتا رتیج جہاں آگہیم

کعبۂ تو کہنہ صنم خانہ ایست

زتو چشمِ مہربانی دگر اے فلک ندارم ـــ شبِ ہجر بود ممکن کہ سحر کسی نہ کردی

صبا قصدِ جانِ من داری ـــ دشمنِ بندۂ خدا شدہ

جگر

وقار خلیل

وہ جگر، وہ جانِ محفل، وہ تغزل کا امام
وہ جگر، جس کی نوا تہذیب حاضر کا پیام
وہ جگر، سرمایۂ فکر و نظر جس کا کلام
وہ جگر، جو تھا جہانِ شعر کا ماہِ تمام
وہ جگر، جس کی غزل میں میرؔ و غالبؔ کا مزاج
وہ جگر، جو دو زمانوں کا تھا دلکش امتزاج
وہ جگر، جس سے فروزاں تھا چراغ فکر و فن
وہ جگر، رنگیں تھی جس سے شاعری کی انجمن
وہ جگر، جس نے دیا اردو کو اک تازہ نکھار
وہ جگر، جس کی غـزل رنگینیٔ باغ و بہار
وہ جگر، وہ مردِ حق آگاہ، وہ جانِ غزل
وہ جگر، وہ نکتہ داں، وہ ماہِ کنعانِ غزل
وہ جگر، جس کی نگاہوں میں تھے ذرّے آفتاب
وہ جگر، جس کے تصوّر نے اجالے ماہتاب
وہ جگر، جس نے دیا اردو کو اک حسنِ ثبات
وہ جگر، وہ راہبر، وہ محرمِ رازِ حیات
وہ جگر، وہ دیدہ ور، وہ مرد دانا چل بسا
شاعری کو زندگی دے کر مسیحا چل بسا

یہ رات

عمر برغمانی

یہ رات کارواں ہے
لمحات کے مسافر سمتِ شفق سے چل کر
جاتے ہیں سوئے منزل رستے بدل بدل کر
پل پل سنبھل سنبھل کر

یہ رات بے کراں ہے
پھیلی ہوئی سیاہی سمٹے ہوئے اُجالے
سمتیں بکھر گئی ہیں دامانِ شب سنبھالے
حدِّ نظر پہ ہالے

یہ رات جاوداں ہے
خاموشیِ ابد ہے گویائی ازل ہے
یہ شب نہیں ہے گویا غالبؔ کی اک غزل ہے
ہر بات بے بدل ہے
یہ رات بے بدل ہے

ادب کے جلّاد

غلام احمد فرقت کاکوروی

اور جب میں پہنچا تو اس مضمون کا صرف پانچواں حصہ پڑھا جا چکا تھا اور ابھی اُس کے چار حصے پڑھنا باقی تھے۔ مضمون زیادہ طویل بھی نہ تھا۔ فل اسکیپ کے صرف ۵۲ صفحات! پھر پڑھنے والے کے داؤں پیچ، مقالے کے اشعار کی زبانی تشریح، الفاظ کی وضاحت، ان کی ترکیبِ استعمال، اور بیچ بیچ مقالہ نگار کی مسکراہٹوں کو بھی اگر ان میں شامل کر لیا جائے تو دس پندرہ صفحات کا اضافہ اور کر لیجیے۔ سامعین میں دو سو افراد "انتقال" کی حالت میں بیٹھے تھے۔ کچھ درمیان میں دو ایک نیند سو لیے تھے، جو زیادہ حیالے اور ہاتھ پاؤں کے تگڑے تھے وہ مقالہ نگار کو دیکھ دیکھ کر کچھ نامہذب کلمات زبان پر لا لا کر رہ جاتے تھے۔ ایک صاحب جن کی آنکھیں بالکل پتھرا گئی تھیں اُن کا شانہ ہلا کر جب میں نے پوچھا کہ "کیوں قبلہ! مقالہ شروع ہوئے کتنی دیر ہوئی؟" تو اُنھوں نے جھلا کر اپنا شانہ کچھ اس انداز میں ہم سے چھڑایا جیسے وہ کہہ رہے ہیں "کیوں مُردوں سے چھیڑ خانی کرتا ہے" اور پھر اپنے دونوں گھٹنوں میں سر ڈال کر بیٹھ گئے۔ میری پشت پر ایک دُبلے پتلے کرسچین وضع کے بزرگ نظر آئے جو جاں کنی کے عالم میں اقبالِ جُرم کی منزل میں تھے۔ کچھ لوگ جن کی نیند پوری ہو چکی تھی سگرٹیں جلا جلا کر تازہ دم ہو رہے تھے اور کچھ نیند میں مست جھوم جھوم کر ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ ایک صاحب ایک دیوار سے پیٹھ لگا کر اپنے بغل میں ایک اونگھنے والے سے بولے۔ "حضرت! جب مقالہ ختم ہو جائے تو مجھے بھی جگا دیجیے گا" مگر مقالہ نگار منہ زور گھوڑے کی طرح اُچھل اُچھل کر اور وقفے وقفے سے پنجوں کے بل کھڑے ہو ہو کر اپنا مقالہ پڑھتا رہا۔ اگر کبھی درمیان میں اُس کی نظر دو چار سامعین کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے لڑ جاتی تو وہ اُنھیں طاقت کا انجکشن دینے کے طور پر کہہ دیتا "بس میں آپ لوگوں کا زیادہ وقت نہ لوں گا، بلکہ چند اہم نکات پر روشنی ڈالنے کے بعد مقالہ ختم کر دوں گا۔" اس پر بعض سامعین جُھرجُھری لے کر ہوش میں آنے کی دوبارہ کوشش کرنے لگتے اور اُن کے لب اس طرح حرکت کرتے دکھائی دیتے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر کہنے میں کچھ آداب مانع ہیں۔ بعض لوگ گُدّیاں کھجلانے میں مصروف تھے اور کچھ دانت سے ناخن کاٹ کاٹ کر صدر کو گھور رہے تھے۔ مقالہ نگار اپنے مقالے میں اپنے محبوب شاعر کے کلام کا تجزیہ کرتے کرتے سننے والوں میں زندگی پیدا کرنے کے لیے درمیان میں ایک آدھ ایسا لطیفہ بھی بیان کر دیتا جس کا اُس مقالے سے یا اُن اشعار سے دور کا تعلق نہ تھا۔ پھر لطیفہ بھی ایسا پٹا ہوا اور بے جان ہوتا کہ لوگ بجائے خوش ہونے کے اور اپنی بوٹیاں نوچنے لگتے۔ مثلاً اُس نے ایک شعر پڑھ کر کہا کہ مجھے اس شعر کو سُنانے سے پہلے ایک اونٹ اور گدھے کی کہانی یاد آ گئی جو میں نے کبھی اپنے بچپن میں پڑھی تھی۔ اس کہانی میں گدھے کو اونٹ نے پانی کے اندر بلوا لیا تھا اور گدھا ڈوب کر مر گیا تھا۔ یہ لطیفہ بیان کر کے مقالہ نگار سامعین کو داد طلب نگاہوں سے دیکھ کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اُس کے لطیفے سے وہ کس حد تک محظوظ ہوئے اور ان کی کتنی تکان دور ہوئی۔ مگر سامعین اُسی طرح قبرستان بنے ہوئے اپنی اُداسی شکلیں مقالہ نگار کو دکھاتے رہے۔ مقالہ نگار نے ان کی یتیمانہ شکلوں پر رحم

کھائے بغیر مقالے سے لطیفے کا ربط بتاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "بس اسی قسم کا طنز شاعر کے بیشتر اشعار میں جگہ جگہ ملتا ہے اور آخر میں اس کا انجام بھی وہی ہوتا ہے جو گدھے کا ہوا۔"

ایک آواز۔ "تو کیا شاعر بھی گدھے کی طرح پانی میں ڈوب کر مر گیا؟"

مقالہ نگار۔ "جی ہاں! وہ دریائے افلاس میں غرق ہو کر جاں بحق ہو گیا!"

کئی آوازیں "ہے ہے! حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔"

بہت سے سامعین نے یہ سُن کر مُنھ میں رومال ٹھونس لیے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مقالہ نگار پر نگاہیں گڑو دیں۔ مگر مقالہ نگار نے سامعین کی اس حرکت سے متأثر ہوئے بغیر مقالے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "یہ واضح ہے کہ جس دور میں شاعر نے یہ اشعار کہے تھے اُس دور کا ماحول ہی ایسا تھا۔"

ایک دور کی آواز "یعنی گدھے اور اونٹ جیسا؟"

مقالہ نگار نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے مقالے کو جاری رکھا اور پھر پڑھنا شروع کیا "اقتصادی بدحالی کا تو یہ عالم تھا کہ کدو جو آج کل چھ آنے سیر ملتا ہے اس دور میں پندرہ سولہ آنے سیر بکتا تھا!"

ایک آواز "کیا یہ حال آپ انگلستان کا سنا رہے ہیں؟"

مقالہ نگار نے بغیر اس کا جواب دیے اُس دور کے سیر کا قصّہ چھیڑ دیا اور بولا:

"اُس دور کا سیر موجودہ دَور کے سیر سے پاؤ بھر زیادہ وزن کا ہوتا تھا۔ مگر پاؤ بھر زیادہ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ اس سے زیادہ وزنی سیر تو شاہ جہاں پوری سیر ہوتا ہے جو آج کل بھی سیر سے پانچ چھ چھٹانک زیادہ ہوتا ہے۔"

اس کے بعد مقالہ نگار اپنی تکان دور کرنے کے لیے سامعین سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟" اس پر دو ایک قریب کے بیٹھنے والے جو دھیمی دھیمی سانسیں لے رہے تھے زور زور سے سانسیں لینے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مقالہ نگار کے قول کی تردید کرنا چاہتے ہیں مگر ناتوانی کا اس درجہ غلبہ ہو کہ اُن کی زبان جنبش سے قاصر ہے۔ مقالہ نگار نے شاعر کے کلام کی پھر تعریف شروع کر دی اور کہا کہ "اب یہ شعر جو میں آپ کے سامنے پڑھنے جا رہا ہوں اس میں الفاظ کی نشست و برخاست دیکھیے کس قدر چول سے چول بھڑا دی ہے۔ چول سے چول بھڑانا لکھنؤ کی طرف کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں دو پلنگوں کو ایک دوسرے سے اس طرح ملا کر بچھا دیا جائے کہ چول سے چول بھڑ جائے۔"

ایک آواز۔ "چول کسے کہتے ہیں؟"

مقالہ نگار۔ "ارے صاحب! چارپائی میں دو سیروے اور دو پٹیاں ہوتی ہیں۔ پٹیاں سیروے سے دوگنی لمبی ہوتی ہیں اور ان سیروں اور پٹیوں کو چارپائی کے چاروں کونوں پر ایک چول کے ذریعے جوڑ دیا جاتا ہے۔"

دوسری آواز۔ "پھر کیا ہوتا ہے؟"

مقالہ نگار۔ "اس کے بعد بڑھئی یا کھٹ بنا جو کھٹے کو باندھوں سے بننا شروع کر دیتا ہے۔"

تیسری آواز۔ "کیا بڑھئی اور کھٹ بنا ایک ہی چیز ہے؟"

مقالہ نگار۔ "نہیں، بڑھئی میں نے غلط کہا۔ میرا مقصد کھٹ بنے سے ہے۔"

چوتھی آواز۔ "بہت اچھا! اب مقالہ شروع کیجیے۔ مگر اُس دور میں باندھوں کا بھاؤ بھی بتاتے چلیے۔" (دو تین سامعین اُونگھ اُونگھ کر فرمائش کرنے والے پر دانت پیسنے لگتے ہیں)۔

مقالہ نگار۔ "ہاں! تو میں آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟"

ایک آواز۔ "چول سے چول بھڑانا۔"

دوسری آواز۔ "باندھوں کا بھاؤ۔"

مقالہ نگار۔ "باندھوں کا بھاؤ مقالہ ختم کرنے کے بعد میں زبانی عرض کروں گا۔ سردست اس شعر میں شاعر نے جس فن کارانہ انداز میں مصرعوں کی چول سے چول بھڑائی ہے وہ حقیقتاً اس کا حصّہ ہے۔ پھر اس میں بے روزگاری کا ذکر کرتے ہوئے غلّے کی گرانی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ہائے! کیا تیور ہیں پہلے مصرعے کے (شعر کا مصرعہ دُہراتے ہوئے) مگر آپ حضرات معاف فرمائیں اگر اس سلسلے ہی میں اپنے بچپن کی ایک کہانی آپ کے سامنے بیان کر دوں جو میری دادی اماں اپنے پاس لٹا کر اکثر مجھے سنایا کرتی تھیں۔"

ایک آواز۔ "کیا آپ کی دادی اماں زندہ ہیں؟"

مقالہ نگار۔ "نہیں صاحب! ابھی دو سال ہوئے جب اُن کا انتقال ہو گیا۔"

دوسری آواز۔ "اچھا پھر مقالہ شروع کیجیے" (صدر قہر آلود نگاہوں سے سوالات کرنے والوں کی طرف دیکھتا ہے)

مقالہ نگار۔ "تو صاحب وہ قصہ کچھ اس طرح کا ہے کہ چڑیا لائی چاول کا دانہ اور چڑا لایا ماش کا دانہ اور دونوں نے کھچڑی پکائی۔ بس اسی قسم کے واقعے سے متاثر ہو کر اس شعر میں ازدواجی زندگی پر طنز کیا گیا ہے۔ اس شعر کا اندازِ بیان کچھ ایسا دل کش ہے کہ بڑے بڑے شاعروں کے دیوان کے دیوان اس ایک شعر پر قربان کیے جاسکتے ہیں۔ اور یہ تو شاید میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ شاعر کی غذا آخر عمر میں بہت تھوڑی رہ گئی تھی اور وہ دو پھلکے شوربے میں بھگو کر کھاتا تھا اور ایک یخنی کا پیالہ پیتا تھا۔"

اس منزل پر آتے آتے تقریباً دو تہائی مجمع چھٹ جاتا ہے اور اب مقالہ نگار کے قریب جو دس بارہ حضرات رہ گئے تھے اُن میں بیشتر مُڑ مُڑ کر اپنے جوتوں کو دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں مقالہ نگار سے انتقام لینے کے بجائے جانے والے انھیں جوتے کی چوٹ نہ دے جائیں۔ اسی درمیان میں مقالہ نگار کی نیت پر جو ایک دو صاحبان جانے کے چکر میں کھڑے تھے ان میں سے ایک نے اپنے دوست کی طرف آنکھ مار کر مقالہ نگار سے یخنی کے بارے دریافت کرنے کو کہا کہ وہ پہلے پی جاتی تھی یا بعد میں۔ چنانچہ ایک نے چلّا کر اُن سے دریافت کیا۔

"کیوں صاحب! یہ یخنی کھانے سے قبل پی جاتی تھی یا بعد میں؟"

مقالہ نگار۔ "نہیں! مرحوم کھانا کھانے کے بعد یخنی پیتے تھے۔"

دوسری آواز۔ "یخنی تو بٹیر کی ہوتی ہوگی؟"

تیسری مگر دھیمی سی آواز۔ "اور بٹیر کے پکڑنے کا کون سا طریقہ اُس دور میں رائج تھا؟"

مقالہ نگار۔ "یخنی کے بارے میں تو یہ عرض ہے کہ وہ چوزے کی ہوتی تھی لہٰذا بٹیر کی پکڑ دھکڑ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

ایک دور کی آواز۔ (دور سے) "کیا فرمایا؟ اِدھر آواز ہی نہیں آرہی ہے۔"

مقالہ نگار "میں کہہ رہا تھا کہ یخنی چوزے کی ہوتی ہے چوزہ مرغی کے بچّے کو کہتے ہیں۔"

تیسری آواز۔ "اچھّا! چوزہ بھی مرغی کے بچّے کو کہتے ہیں۔"

(اس درمیان میں دو تین صاحبان جمائیاں لیتے جلسہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

مقالہ نگار۔ "میں دیکھتا ہوں کہ جو حضرات تشریف فرما ہیں وہ مقالے سے کچھ اس قدر دلچسپی لے رہے ہیں کہ مجھے اب افسوس ہو رہا ہے کہ میں اس کا بقیہ کیوں گھر پر چھوڑ آیا۔ مگر میں آپ حضرات کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔"

ایک آواز۔ "وہ بھی گھر سے جا کر لیتے آئیے۔"

صدر۔ (غنودگی کے عالم میں آہستہ آہستہ) "اچھا، اچھا! آپ اس وقت جو کچھ فرما رہے ہیں پہلے وہ فرما لیجیے۔ (سامعین سے مخاطب ہو کر) حضرات! یہ مقالہ جس شاعر سے متعلق ہے اُس کی برسی ہر سال منائی جاتی ہے لہٰذا فاضل مقالہ نگار آپ کو مایوس نہ ہونے دیں گے۔ وہ اس کی دوسری قسط بعد میں پڑھ دیں گے۔ یار زندہ صحبت باقی۔"

مقالہ نگار۔ "جی ہاں! صدر موصوف ٹھیک فرما رہے ہیں میں ابھی دو سال آپ کے شہر میں قیام کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

ایک دھیمی آواز۔ "دو سال تو بہت ہوئے۔"

مقالہ نگار۔ "اگر آپ حضرات کو اتنی ہی دلچسپی ہے تو آئندہ کسی مخصوص نشست میں میں اس مضمون کا بقیہ حصہ آپ کو سُنا دوں گا۔"

سامعین آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مقالہ نگار کو دیکھ رہے تھے اور مقالہ نگار "یوں سمجھیے" کہہ کر شاعر کا حلیہ بیان کرتے ہوئے اس کی آنکھوں کا اس طرح ذکر کرنے لگا: "خیال فرمائیے کہ اُس کی گول گول چھوٹی آنکھیں کمرے میں ہر چیز کو دیکھتی ہیں۔ اُس کے تخیل کی بھٹکتی ہوئی نگاہ اچانک ایک مکڑی کے جالے پر پڑ جاتی ہے جس میں مکڑا ایک مکھی کو پھانسنے کی فکر میں ہے۔ اس کی تخیل کا رُخ فوراً دُنیا کے بے بس مزدوروں کی طرف مڑ جاتا ہے اور وہ بے بسی کی منظر کشی پر ایک طنز کرتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ لطیفہ چونکہ شاعر کے اس شعر سے ایک خاص مناسبت رکھتا ہے اس لیے میں اُسے سُنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (درمیان میں متعدد پرچے صدر کی معرفت مقالہ نگار کے پاس پہنچ رہے تھے مگر وہ اُن سب کو مٹھی میں دباتا جاتا تھا) وہ قصہ ممکن ہے کہ آپ نے بھی سُنا ہو جس میں پہلے باپ گدھے پر بیٹھتا۔ پھر باپ بیٹے دونوں اُس پر بیٹھ جاتے اور آخر میں تینوں پیدل چلنے لگتے۔"

ایک آواز۔ "لطیفہ ذرا تفصیل سے بیان کیجیے۔ سیری نہیں ہوئی۔"

دوسری آواز۔ "کون تینوں پیدل چلنے لگتے ہیں؟"

مقالہ نگار۔ " مالک، اس کا لڑکا اور گدھا!"

ایک آواز۔ " کیا گدھا بھی پیدل چلنے لگا؟"

ایک جوان لڑکا۔ " اُف! حد ہوگئی!"

مقالہ نگار۔ " بہرحال میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا' اب مقالہ ختم پر ہے۔ صرف چند صفحات باقی ہیں جو اس مقالے کی جان ہیں اس میں میں نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ شاعر ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور ماحول کا اثر آب و ہوا پر پڑتا ہے۔ ماحول میں لباس، رفتار، گفتار اور آدابِ مجلس ساری چیزیں شامل ہوتی ہیں!"

ایک آواز۔ " اب مقالہ شروع کر دیجیے!"

مقالہ نگار (صدر سے مخاطب ہوکر) " ایک ذرا سا پانی منگوا دیجیے!"

ایک دور کی آواز۔ " ابھی پانی نہ پلوائیے گا نہیں تو ہم لوگ بے موت مرجائیں گے!"

مقالہ نگار۔ (سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے) " ہاں تو یہ خیال فرمائیے کہ اتنا بلند پایہ شاعر جو اتنے بڑے ماحول میں رہا ہو اور جس کی تخیّل کو دنیا کی کوئی قوت گرفت میں نہ لا سکتی ہو وہ اپنے ماحول میں کیا گھٹن محسوس کرتا ہوگا"

اسٹیج پر صدر کے گرد جو دو صاحبان باقی رہ گئے تھے وہ بھی مُنہ بناتے اپنا جوتا پہننے لگتے ہیں۔

مقالہ نگار۔ " میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا (مقالے کے صفحات گن کر) اب کل بیس صفحے باقی رہ گئے ہیں"

اچانک بجلی فیوز ہوجاتی ہے اور ہاتھ کو ہاتھ نہیں سُوجھتا۔ اِس اندھیرے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جو سامعین اونگھ رہے تھے وہ بھی بھاگ نکلتے ہیں۔ دس منٹ کے بعد دوبارہ روشنی ہونے پر صرف چھ آدمی اسٹیج پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

ایک صاحب۔ (مقالہ نگار کے قریب آکر) " حضور! اگر اجازت ہو تو اب میں پیکر دون لے جاؤں۔ ہم میں سے تین کمپنی کے آدمی ہیں!"

مقالہ نگار۔ " بہت بہتر ہے!"

دوسرے صاحب (ایک صاحب سے جو اسٹیج کے پیچھے کھڑے تھے)

" ارے بھئی مزدوروں کو بلا کر فرش اُٹھوا دو نا!"

مقالہ نگار۔ " صاحب! آپ لوگ مجھے بڑے ادب نواز اور صاحبِ ذوق معلوم ہوتے ہیں!"

وہی صاحب۔ " ہاں صاحب" (دو تین مزدوروں سے جو سامنے سے آرہے ہیں ڈپٹ کر) " دیکھو جی! جلدی فرش اُٹھاؤ!"

کمپنی والا آدمی۔ (مقالہ نگار سے) " حضور! صدر صاحب کو بھی جگا دیجیے۔ نہیں تو وہ یہیں رہ جائیں گے!"

مقالہ نگار۔ (صدر صاحب کا شانہ ہلا کر) " اُٹھیے جناب! جلسہ ختم ہوگیا۔"

صدر۔ (جو خرّاٹے لے رہے تھے) " دُور ہو! نہیں اس وقت کچھ نہیں کھائیں گے!"

مقالہ نگار۔ (زور زور سے شانہ ہلا کر) " حضور! میں ہوں!"

صدر (آنکھیں کھول کر اور گھبرا کر) " ارے! آپ ہیں۔ معاف کیجیے گا۔ کیا مقالہ ختم ہوگیا؟ اتنی جلدی؟"

مقالہ نگار۔ " اچھا! تو اب اجازت دیجیے۔ یار زندہ صحبت باقی!"

صدر صاحب لکڑی ٹیکتے جاگا نیندی کے عالم میں ایک طرف لڑکھڑاتے نکل جاتے ہیں۔

کہاں ہے

عمر انصاری

تھا بادۂ الفت سے جو سرشار، کہاں ہے — کہتے تھے جگرؔ جس کو وہ بیمار کہاں ہے

کچھ تو ہی بتا اے گلِ نورستۂ گلزار — وہ تیرے تبسم کا طلبگار کہاں ہے

ساقی کی نگاہوں میں تھا جو صورتِ مستی — میخانۂ الفت کا وہ میخوار کہاں ہے

جینے سے بھی بیزار رہا، مرنے سے بھی روکش — دونوں سے تھا جو برسرِ پیکار کہاں ہے

چلتا تھا جو کترا کے ہر اک راہِ طلب سے — غافل تھا جو دنیا سے وہ ہشیار کہاں ہے

آتی نہیں مقتل سے اب آواز کسی کی — شیدائے عروسِ رسن و دار کہاں ہے

تھا بزمِ رقیباں میں بھی جو شمع کی صورت — وہ صدر نشینِ دلِ اغیار کہاں ہے

لے جائے کہاں کوئی اب اس بارِ گراں کو — تھا جنسِ وفا کا جو خریدار کہاں ہے

تا عمر رہا برق سے جو برسرِ پیکار — تنظیمِ چمن کا وہ نگہدار کہاں ہے

روٹھے تو منانے اتر آئیں مہ و انجم — ایسا کوئی اب یارِ وفادار کہاں ہے

رکتا ہی نہ تھا جو حرم و دیر کے روکے — وہ سرکش و دیوانہ و دیندار کہاں ہے

ہر ذرے کو اک تاج محل جس نے بنایا — تعمیرِ محبت کا وہ معمار کہاں ہے

ہر موڑ پہ ہیں نقشِ قدم جس کے فروزاں — وہ رہروِ ہر جادۂ پُر خار کہاں ہے

مارا ہوا تیرِ نگہِ نازِ غزل کا — لیلائے تغزل کا پرستار کہاں ہے

تھا بادشہِ وقت جو اقلیمِ سخن کا
وہ بادہ کش و شاعرِ بیدار کہاں ہے

بچوں کی تربیت

نسیم بدرالزماں

آج کے بچے کل کے معمار ہیں۔ یہی بچے مستقبل کی خوبصورت عمارت، ہماری آرزوؤں کے محل اور تمناؤں کے قلعہ کی خشت اوّل ہیں۔ اگر ان میں ہماری کسی کوتاہی کی بناء پر کجی رہ گئی تو یہ کجی آخر تک باقی رہے گی اور یہ نقصان کسی ایک خاندان یا کسی ایک شہر کو پہنچنے کے بجائے پورے ملک کو پہنچے گا۔ اسی لئے بچوں کی معقول تربیت وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے اور اس طرف ہمیں پوری توجہ کرنی ہے۔

یہ بات مسلّم ہے کہ بچوں کی تربیت میں اُن کی ذہانت کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اس لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ ہم بچوں کو اچھی عادتوں کی طرف مائل کریں، انھیں وہ آداب سکھائیں جن کی ہمارے معاشرہ کو ضرورت ہے بالکل اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ہم بچوں کی ذہنی صلاحیت کو بھی ذہن میں رکھیں۔ اس سلسلے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ ذہین صرف وہی بچے ہوسکتے ہیں جو پڑھے لکھے بھی ہوں۔ لیکن تجربہ اور مشاہدہ اس بات کو غلط ثابت کرتا ہے۔ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ایسے اکثر بچے دیکھتے ہیں جو باوجود پڑھے لکھے ہونے کے بالکل کم عقل اور کم فہم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اَن پڑھ اور جاہل بچے اپنی ذہانت کے سبب ایسی عقلمندی کی باتیں کرتے ہیں یا ایسے کام کرتے ہیں کہ بے اختیار ان کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم بچوں کی ذہانت کا پتہ کیسے لگائیں؟ کون سا طریقہ استعمال کریں جو ہمیں ٹھیک ٹھیک یہ بتادے کہ فلاں بچہ بہت ذہین ہے اور اس کی ذہانت اس درجہ کی ہے کہ وہ آگے چل کر ایک عظیم شخصیت کا مالک بن سکتا ہے۔ ذہانت کا پتہ چلانے کا طریقہ یہ نہیں ہے، کہ ہم کسی بچہ کا نتیجہ امتحان دیکھ کر کوئی رائے قائم کرلیں۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ ایک معمولی ذہانت کا بچہ غیر معمولی محنت کرکے اپنے درجہ میں اوّل آجائے۔ کسی بچہ کی ذہانت کے بارے میں ہم صحیح فیصلہ اُسی وقت کرسکتے ہیں جب ہم یہ سمجھ لیں کہ بچہ کی پیدائشی ذہنی صلاحیت کیا ہے اور بچہ اسے کس حد تک استعمال کرنے پر قادر ہے۔

ذہانت جاننے کے سلسلے میں سب سے پہلی کوشش پندرھویں صدی کے ایک مشہور مفکر لوٹر (Lavater) نے کی اور بتایا کہ انسانی شکل اور خدوخال اس کی اندرونی مشینری کا آئینہ ہے لیکن یہ معیار قاعدہ کلیہ نہ بن سکا۔ ہاں اس نظریہ سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ دوسرے لوگ بھی اس طرف متوجہ ہوگئے۔ چنانچہ اٹھارویں صدی میں دو ماہرین نفسیات گال اور سپورزہیم (Gall & Spurzheim) نے سَر کے اُبھار اور دباؤ کو ذہن کے ارتقاء کی کسوٹی قرار دیا۔ اسی کسوٹی کی بنیاد پر ایک اور ماہر نفسیات لومبرسو (Lombroso) نے یہ انکشاف کیا کہ مجرموں کے سَر کی بناوٹ عام لوگوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ مگر یہ نظریہ بھی آگے چل کر بالکل بے جان ثابت ہوا۔

اس کے بعد انیسویں صدی میں دو بہت ہی طبّاع ماہرین

نفسیات 'بینے' (Binet) اور سائمن (Simon) نے ذہانت
کو پرکھنے کے لئے ایک بہت ہی کامیاب ذہنی سوال نامہ
(Intelligence Test) تیار کیا جسے ہم اب تک استعمال
کر رہے ہیں اور جس کی مدد سے ہم کو یہ معلوم کرنے میں بڑی حد تک
کامیابی ہوتی ہے کہ تین سے چودہ سال تک کے بچوں کی پیدائشی
ذہانت کا معیار کیا ہے۔ ان لوگوں نے اس سوال نامہ کو عمر کے
لحاظ سے تقسیم کر کے یہ کام اور بھی آسان کر دیا ہے۔ اب ہم
نفسیاتی مرکزوں (Psychological Centres) میں
جا کر اور کسی بھی عمر کے بچے سے یہ سوالات پوچھ کر اس کی ذہانت کا پتہ چلا سکتے
ہیں۔ اس سوالنامہ سے یہ پتہ چلایا جاتا ہے کہ بچہ کی عام معلومات کتنی
ہیں۔ مثلاً ایک تین سال کے بچے سے عام چیزوں کے نام پوچھنا، کوئی تصویر
دکھا کر اس کے بارے میں کچھ تفصیل معلوم کرنا یا ایک گڑیا کے جسم کے
مختلف حصوں کے نام پوچھنا وغیرہ۔ بچوں کی عمر کے لحاظ سے سوالات
کی نوعیت بدلتی جاتی ہے۔ بہرحال اس کسوٹی کی مدد سے یہ انکشاف
ہوا کہ ہر انسان کی دو عمریں ہوتی ہیں (۱) جسمانی عمر (Chronological age)
اور (۲) ذہنی عمر (Mental age)۔ بچوں
کی جسمانی عمر تو ہم جانتے ہیں مگر اس کسوٹی پر اُن کی ذہانت جانچنے
کے بعد ہمیں اُن کی ذہنی عمر بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

اب جہاں تک بچوں کو صحیح تربیت دینے کا تعلق ہے اس کے
لئے ان کی ذہنی عمر کا جاننا بہت ضروری ہے۔ بینے اور سائمن نے پوری
دنیا کے بچوں کو ذہنی عمر کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔
(۱) غیر معمولی ذہین یا طباع بچہ (Genius) (۲) اوسط ذہانت
کا بچہ (average) اور (۳) غبی بچہ (Dull)۔ اگر ایک
پانچ سال کا بچہ ان سوالات کا صحیح جواب دے دے جو پانچ ہی سال
کے بچوں کے لئے متعین کئے گئے ہیں تو ہم کہیں گے کہ اس بچہ کی ذہنی
عمر بھی پانچ سال ہے اور وہ ایک اوسط ذہانت کا مالک ہے۔ اگر
ایک پانچ سال کا بچہ وہ سوالات بھی حل کرے جو ایک آٹھ سال
کے بچہ کے لئے بنائے گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اس بچہ کا
ذہنی ارتقا بہت تیزی سے ہو رہا ہے اور وہ ایک غیر معمولی ذہین بچہ
کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک پانچ سال کا بچہ صرف
ان سوالات کا جواب دے سکے جو تین سال کے بچوں کے لئے بنائے
گئے ہیں اور اپنی عمر کے بچوں کے لئے منتخب کردہ سوالوں میں سے ایک
کا بھی صحیح جواب نہ دے پائے تو ایسے بچہ کو غبی کہنا چاہئے۔ دوسرے
الفاظ میں اس بچہ کا ذہن اس کے جسم سے پچھڑا ہوا ہے۔ دیکھنے میں وہ
بچہ پانچ سال کا ہے مگر باتیں صرف تین سال کے بچوں جیسی کر سکتا ہے۔

غیر معمولی ذہین بچوں کے سلسلے میں ایک مشہور ماہر نفسیات پروفیسر
ٹرمین (Terman) نے سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں کچھ انکشافات
کئے۔ انھوں نے کئی بچوں کی ذہانت کا امتحان لے کر یہ بتایا کہ جن بچوں کا
ذہنی ارتقاء بہت تیزی سے ہوتا ہے ان کی ذہانت کا رُخ صحیح راہ
پر رکھنا بہت ضروری ہے تاکہ وہ بڑے ہو کر سماج کو نقصان پہنچانے کے
بجائے ایک قابل فخر شہری بن جائیں۔ اس سے پہلے کچھ لوگوں کا خیال
تھا کہ غیر معمولی ذہین بچے بہت جذباتی ہوتے ہیں لیکن پروفیسر ٹرمین
اور ووڈ ورتھ (Woodworth) دونوں نے اس خیال کی بڑی شدت
سے تردید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ طباع بچے جذباتی بالکل نہیں ہوتے
بلکہ ان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہر قسم کے حالات میں
اپنے کو بہ آسانی کھپا لیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کبھی کسی سے مرعوب
نہیں ہوتے۔ تاریخ میں طباع یا غیر معمولی ذہین بچوں کی متعدد مثالیں ملتی
ہیں۔ مثلاً مشہور انگریز مصنف چارلس ڈکنس (Dickens)
نے سات سال کی ننھی سی عمر میں نہ صرف یہ کہ بڑی بڑی کتابیں پڑھ
لی تھیں بلکہ ایک کہانی بھی لکھ ڈالی تھی۔ اسی طرح جرمنی کے مشہور
شاعر و فلسفی گیٹے (Goethe) نے آٹھ برس کی چھوٹی سی عمر میں
ہی یونیورسٹی کے امتحان کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ دُور کیوں
جائیے، خود ہمارے ملک میں مولانا ابوالکلام آزاد نے صرف ۱۵ سال
کی عمر میں عربی و فارسی ادب اور دینیات میں عبور حاصل کر لیا تھا۔ مسز
سروجنی نائیڈو نے بھی صرف پندرہ سال کی عمر میں امتیازی حیثیت
سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی تھی

ان غیر معمولی ذہین بچوں کی مثالوں سے فوراً ذہن میں ایک سوال
یہ بھی اُبھرنے لگتا ہے کہ کیا ذہانت کا تعلق میراث سے ہے یا کیا وہ

پنڈت جواہر لال نہرو کی ۶۰ ویں سال گرہ کے موقع پر بچے نئی دہلی میں انھیں گلدستے پیش کر رہے ہیں

بچے اپنے چاچا کے ساتھ

پنڈت جواہر لال نہرو کلکتہ کے انسٹی ٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ (بچوں کے حفظان صحت کے ادارہ) میں جس کا انھوں نے عرصہ ہوا افتتاح کیا ہے، ایک مریض بچے کو پیار کر رہے ہیں

مستقبل

کے ناخدا

کسی خاص دائرے اور معاشرے ہی میں پرورش پا سکتی ہے؟ ماہرین نفسیات اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ذہانت کے لئے بچہ کی وراثت اور اس کا معاشرہ دونوں مساوی نمبر کے مستحق ہیں۔ البتہ وراثت کے لحاظ سے صرف دو جڑواں بچے ہی یکساں ذہن، انتہائی مشابہت رکھنے والے خد و خال اور ایک سی فطرت کے مالک کہے جا سکتے ہیں۔ جڑواں بچوں کے علاوہ ان کے دوسرے سگے بھائی بہن ذہن کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ والدین کی جسمانی قوت، ان کا جذباتی توازن اور ان کی دماغی کیفیت ہر بچہ کی پیدائش کے زمانہ میں کم و بیش بدلتی رہتی ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو بچہ اپنی پیدائش کے وقت اپنے والدین سے ان کے اس وقت کے حالات کا اثر قبول کر کے پیدا ہوتا ہے تو ان ہی حالات کا پرتو اس کی بقیہ زندگی پر پڑتا رہتا ہے۔ ایک ماہر نفسیات نیومین (Newman) نے جڑواں بچوں کے متعلق مزید تجربہ کیا۔ انھوں نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ متعدد جڑواں بچوں کو الگ الگ معاشرہ میں رکھ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ معاشرہ ذہنی تنزل و ارتقاء میں کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے اس سلسلہ میں تجربہ کے طور پر دو جڑواں بھائی، رچرڈ اور ریمنڈ کو منتخب کیا گیا۔ پیدائش کے بعد ہی رچرڈ کو ایک کسان نے گود لیا اور ریمنڈ کو ایک ڈاکٹر نے اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ دونوں بچوں کی ذہنی استعداد کو جب دس سال کی عمر میں بنے اور سائمن کی تیار کی ہوئی کسوٹی پر پرکھا گیا تو ان کی دماغی صلاحیتیں تقریباً برابر نکلیں۔ اس تجربہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ورثہ میں ملی ہوئی یکساں ذہنی صلاحیت کو معاشرتی اختلاف کم یا زیادہ نہیں کر سکتا۔ ہاں غلط معاشرہ سے ذہانت کو غلط مقصد کے لئے ضرور استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں جہاں ایک معمولی معاشرہ اور معمولی ذہنی صلاحیتوں کے حامل والدین کے بچوں نے تاریخ عالم میں نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں (مثلاً نپولین) لیکن اسی کے ساتھ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ انتہائی عقلمند، طباع اور ذہین والدین کا بچہ بالکل ہی غبی نکلا لیکن اس کی ذمہ داری والدین پر عائد نہیں ہوتی بلکہ بچے کے غبی ہونے کے کچھ اور ہی اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک عقلمند والدین کا بچہ اگر غبی ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس بچہ کی پیدائش کے وقت اس کے دماغ کو کوئی چوٹ پہونچ گئی ہو، یا بچہ کی پیدائش کے زمانے میں والدین نے شراب یا منشیات کا کثرت سے استعمال کیا ہو، یا اس کی ماں کوئلہ کی کان میں کام کرنے والی کوئی عورت ہو جس کے ہونے والے بچہ کے دماغ پر گیس کے مضر اثرات پڑ چکے ہوں۔ ایسے بچوں کا ذہن بدلنے میں اور اسے ابھار کرنے میں اچھے سے اچھا معاشرہ اور بہتر سے بہتر گرد و پیش کے حالات بھی عاجز نظر آتے ہیں۔

کچھ بچے پیدائشی غبی تو نہیں ہوتے لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کا ذہنی ارتقاء بہت سست ہو جاتا ہے یا بالکل رک جاتا ہے۔ اس کا ایک عام سبب کوئی مہلک مرض جیسے ٹائیفائڈ، چیچک یا کوئی بھی طویل المیعاد علالت ہو سکتی ہے۔ اگر بچہ اس بیماری کے بعد مکمل طور سے صحت یاب اور تندرست ہو جائے تو یہ خامی از خود دور ہو جاتی ہے۔ بچہ کا ذہن کند کر دینے والی بعض بیماریوں کا موثر علاج بھی ہوتا ہے مثلاً جن بچوں کا ذہن تھائیرائڈ غدود (Thyroid Glands) کی خرابی کے باعث بڑھنے سے رک جاتا ہے انھیں مخصوص انجکشن دئیے جاتے ہیں تاکہ ان کا جسمانی اور دماغی ارتقاء ساتھ ساتھ ہونے لگے اور غدود کی اس خرابی کے سبب بچے کا دماغ اس کے جسم سے پیچھے نہ رہ پائے۔ بعض بچے کسی اچانک حادثہ (Shock) کا شکار ہو جانے کے سبب سے بھی اپنی ذہنی صلاحیتیں کھو بیٹھتے ہیں۔ ایسے بچوں کو اگر کسی نفسیاتی مرکز میں بھیج کر اس حادثہ کو بھلانے کے لئے کسی ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کر لی جائیں تو ان بچوں کی ذہنی صلاحیتیں واپس لانے میں بہت حد تک کامیابی ہو جاتی ہے۔

پیدائشی غبی بچے البتہ تقریباً لا علاج قرار دے دئیے گئے ہیں۔ ان کی تربیت میں اس کا لحاظ رکھا جائے کہ وہ بہت زیادہ احساس کمتری کا شکار نہ ہونے پائیں اور ان کی دلچسپیاں برے راستوں سے ہٹا کر اچھے راستوں پر لگا دی جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ بے توجہی کا شکار ہو کر اپنے فطری تقاضوں کے باعث مجرم بن جائیں کیونکہ جرم کا رجحان پیدائشی غبی بچوں کا خاصہ ہے۔

غبی بچوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ ذہین بچوں کی صحیح تربیت بھی ایک اہم مسئلہ (Problem) ہے۔ یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ والدین کی بے پروائی اور بے نیازی کا نتیجہ ہو کر کتنے ہی ذہین بچے غلط راستوں پر گامزن ہو گئے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی بچہ اگر شریر ہو تو اُسے بُرا سمجھ لیا جائے۔ دراصل شرارت اور ذہانت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شرارت یوں تو ہر بچہ کر سکتا ہے لیکن ذہین بچہ شرارت نہ کرے ایسا شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس لئے بچوں کی شرارت سے عاجز آ کر اور جھنجھلا کر ان کی شرارت کو روکنے کے بجائے اگر ان شرارتوں کو اپنی نگرانی میں خوبصورتی کے ساتھ غیر مضر کھیلوں اور دلچسپ باتوں کی طرف موڑ دیا جائے تو بچوں کی ذہانت کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ لہذا شریر بچوں کی طرف سے نہ تو بے توجہی برتنی چاہیئے اور نہ ہر وقت انھیں ڈانٹتے رہنا چاہیئے۔ اگر والدین نے کسی ایسے بچہ کی طرف سے بے پروائی برتی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا اکثر وقت بُری باتوں کے سوچنے میں صرف کرنے لگے۔ اگر والدین اسے بچپن ہی سے کسی نہ کسی کام میں اُلجھائے رکھیں اور اسے شرارت کرنے کا کم از کم موقع دیں تو اس بچہ میں بُری عادتیں نہ پیدا ہونے پائیں گی۔

بعض والدین ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ذہین بچوں کی ذہانت کو بیجا اور بے جا سراہتے رہتے ہیں اور اپنے دوسرے بچوں کے مقابلہ میں اُس کی مسلسل تعریف کرتے رہتے ہیں۔ اس سے اس ذہین بچہ کے ذہن پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ وہ جھوٹے پندار اور احساس برتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لئے والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام بچوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں توازن رکھیں اور ذہنی اعتبار سے کمتر بچوں کی ذہین بچوں کے مقابلہ میں زیادہ حوصلہ افزائی کریں تاکہ ان کی صلاحیتوں کو بھی اُبھارا جا سکے۔ اگر کسی بچہ میں شروع ہی سے کوئی غیر معمولی صلاحیت اُجاگر ہو رہی ہے تو اس بچہ کی تعلیم میں اس کا شروع ہی سے لحاظ رکھا جائے۔ مثلاً بعض بچے اپنے کھلونوں کو کھیلنے کے بجائے انھیں توڑ کر بنانے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ایسے بچوں کی بنیادی تعلیم ختم ہونے کے بعد انھیں جلد از جلد مشینوں اور کل پرزوں سے دلچسپی لینے کے مواقع فراہم کرنا چاہیئے تاکہ بڑے ہو کر وہ ایک کامیاب انجینئر بن سکیں۔

اس سلسلے میں ایک مثال پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ میری ایک عزیز دوست کو بچپن ہی سے لڑکیوں کے محبوب ترین کھیل گڑیوں کے مقابلے میں لڑکوں کے کھیل زیادہ پسند تھے۔ خوش قسمتی سے اس کے والدین نے بھی اس کی اس دلچسپی کو نظر انداز کرنے کے بجائے تعلیم کے ساتھ ساتھ ایسے کھیلوں میں اس کی ہمت افزائی کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیڈمنٹن میں ہندوستان کی سب سے اچھی خاتون کھلاڑی مانی جاتی ہیں۔

گھر کے علاوہ اسکول بھی بچوں کی بڑی تربیت گاہ ہوتے ہیں۔ جس طرح والدین کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کے رجحانات اور عادات و اطوار کو مدِّ نظر رکھیں اُسی طرح اسکول میں اُستادوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی تربیت کا بھی خاص طور سے خیال رکھیں۔ اسکول میں مختلف عمر کے بچے پڑھتے ہیں اور عمر کے لحاظ سے ہر بچہ کا مذاق جداگانہ ہوتا ہے۔ اُستاد کا فرض ہے کہ وہ بچہ کی عمر اور اُس کا مذاقِ طبیعت دیکھتے ہوئے اُس کے لئے ایسے مواقع پیدا کرے کہ بچہ کے ذہنی نشوونما میں مدد ملے۔ مثلاً چھوٹے بچوں میں تجسس (Curiosity) کا مادہ کافی ہوتا ہے۔ اگر اُستاد بچوں کے رجحان کے مطابق ان کی دلچسپی کے کھلونے اُن کے سامنے رکھیں تو ان میں سائنسی تجسس اور معلومات حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ بچہ توڑ پھوڑ کا بھی عادی ہوتا ہے اور تعمیر کا بھی۔ اگر اُسے مواقع بہم پہنچائے جائیں تو وہ کسی چیز کو دیکھ کر یا اپنے تخیل سے کوئی نہ کوئی اور چیز بنایا کرے گا اور اگر اُس کی یہ عادت بنی رہے تو آگے بڑھ کر یہ اس کے لئے بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ بچہ کے ساتھ ہمدردی بھی بڑی ضروری چیز ہے۔ اس لئے اُستادوں کو بچہ کے ساتھ ہمیشہ ہمدردی سے پیش آنا چاہیئے۔ ہمدردی کرنے سے بچہ میں اجنبیت کا احساس نہیں رہتا اور اُس میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بھائی چارہ کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بچہ اگر کوئی اچھا کام کرے اور اُس کی تعریف کی جائے تو اُس کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ اُستاد اگر بچوں کے سامنے مسکراتا ہے اور اُن سے ہنس ہنس کر باتیں کرے تو اُس کے زیرِ تعلیم بچے زندہ دل اور باہمت بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی اُستاد بچوں کے سامنے ہر وقت غضبناک بنا رہے تو بچوں کی طبیعت مُردہ ہو جاتی ہے اور ان کی تیزی ختم ہو جاتی ہے۔ بچوں کے سامنے اس قسم کی معقول تحریکیں کرنا چاہیئے جس سے وہ متاثر ہوں۔ اُن سے یہ نہ کہا جائے

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۴۴ پر)

غزل

راج نواش رازؔ

ابنِ آدم کی ہے تاروں پہ نظر، جانیے کیا ہو!
شمع پر اب بھی ہے رقصندہ شرر، جانیے کیا ہو!

تیری پُرکار وفاؤں کا اثر، جانیے کیا ہو!
میں نے رکھے تو ہیں سینے میں شرر، جانیے کیا ہو!

جانے اُمید نے کیا نام دھرے، روپ بھرے ہیں؟
ایک دیوانہ ہے پھر خاک بسر، جانیے کیا ہو!

ذہن تاریک ہے، دل بیٹھا سا، آنکھوں میں نمی سی
حالِ تربت میں ہے یہ! وقتِ سفر؟ جانیے کیا ہو!

زندگی موت کے ساحل پہ کھڑی سوچ رہی ہے
کتنا نزدیک ہے کشتی سے بھنور، جانیے کیا ہو!

پگھلا جاتا ہے یہ پتھر سا جگر رازؔ ابھی سے
جب تلک آئے شبِ غم کی سحر، جانیے کیا ہو!

غزل

خورشید احمد جامیؔ

ہو کے انجان کچھ اتنے، ترے غم ملتے ہیں
جیسے مفلس سے کبھی اہلِ کرم ملتے ہیں

اب ہمیں رسمِ مداراتِ محبت نہ رہی
درد میں درد کے انداز بھی کم ملتے ہیں

داغِ دل، لالۂ و گُل، فکر کے ماہ و انجم
ہر جگہ آج ترے نقشِ قدم ملتے ہیں

شب کی آنکھوں میں ہے بجھتے ہوئے شعلوں کا دھواں
صبح کے دل میں دھڑکتے ہوئے غم ملتے ہیں

اتفاقاً کہیں بچھڑے ہوئے ارمانِ حیات
ہم سے ملتے ہیں تو با دیدۂ نم ملتے ہیں

اب تری یاد کے لمحاتِ حسیں بھی، جیسے
اپنے ہاتھوں میں لیے تیغِ ستم ملتے ہیں

کون سپنوں کے شبستاں میں جلاتا ہے دیے
کس سے گیتوں کے سمن زار میں ہم ملتے ہیں

زندگی ایک گلستانِ طرب ہے لیکن
گُل کے دھوکے میں یہاں خارِ الم ملتے ہیں

درِ مے خانہ پہ پہنچے تو خیال آیا ہے
راستے ہی میں کہیں دیر و حرم ملتے ہیں

فکرِ شاعر کے اُجالوں میں پہنچ کر، جامیؔ
اب نئی سوچ میں ڈوبے ہوئے غم ملتے ہیں

جگر مرادآبادی کے ساتھ ــــــ ڈائری کے چند ورق

قیسی الفاروقی

[illegible] الہدی [illegible] میں سلسلہ [illegible]
[illegible] وقت کا
[illegible] اسی زمانہ میں
[illegible] جگر صاحب [illegible]
[illegible] ڈائری کے چند ورق [illegible]
[illegible] جگر صاحب کی چند غیر مطبوعہ نظموں پر
بھی روشنی پڑتی ہے۔ ایڈیٹر

یکم جنوری ۱۹۵۹ء ۔ گذشتہ شب گونڈہ میں نعتیہ مشاعرہ تھا جس میں راقم الحروف، حمید صدیقی، عارف عباسی، وفا نظامی، شبنم سبحانی، اسعد ڈبائیوی، عمر انصاری وغیرہم شریک تھے۔ حمید صاحب اور رضا صاحب حضرت جگر کے یہاں مقیم تھے۔ ۳ بجے شب میں دورہ پڑا جس کا تھا مگر مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ ۲ بجے تک جاگتے رہے جب کہ مسلسل ان سے یہ اصرار ہو رہا تھا کہ آپ آرام فرمائیں۔ کئی مرتبہ چل کے ملے بار بار بستر کمبل وغیرہ دیکھے اور مطمئن ہونے کے بعد بھی بیٹھے رہے ۸ بجے شب کے وقت مشاعرہ کا افتتاح جگر صاحب کی نعت سے ہوا جسے حمید صدیقی صاحب نے پڑھا۔ جس وقت "اس اُمتِ عاصی سے نہ منہ پھیر خدایا" حمید صاحب نے پڑھا ہے حضرت جگر سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔

حضرت والا نے دوران گفتگو میں آج فرمایا کہ انسان میں دو استعدادیں ہوتی ہیں، ایک مادّی اور دوسری روحانی۔ خوشبو، مستی، لذت، کیف وغیرہ اور دیگر فنون لطیفہ کا تعلق روحانیت سے ہے۔ مادّہ اور روح انسان میں مل گئے ہیں۔ مادّہ کا تعلق خشک زندگی سے ہے۔ زوال آمادہ قومیں مادّہ کی فکر کرتی ہیں اور اسی کو ترقی سمجھتی ہیں۔ شعر سے انقلاب مادّی ناممکن ہے شعر کا مزاج کچھ اور ہے اور نظم کا کچھ اور۔ شعر میں انفرادیت ہے۔ اگر شخصیت صالح اور متوازن نہیں ہے تب بھی شعر اثر نہیں کرتے۔ لوئے گل سے اگر کوئی تلوار کا کام لینا چاہے تو موقوفی ہے۔ شراب، ساز اور کوئی لذت آسان رفتہ رفتہ قوائے عمل پر اثر انداز ہونے لگتی ہے۔ رقص، نغمہ اور اس طرح کے اور فنون قوائے عمل کو بیکار کر دیتے ہیں۔ آپ کو ان سے انقلاب کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔

۹ر جنوری ۱۹۵۹ء ۔ صبح ۹ بجے حاضر ہوا تو معلوم ہوا شب میں پھر دورہ پڑا۔ نڈھال ہو کر تکئے کے سہارے بیٹھے تھے، گھٹن ہو رہی تھی۔ کہنے لگے "بھئی رات تو اس قدر تکلیف تھی کہ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ آخری وقت آ گیا ہے مگر دوسرے دورے کے لئے پھر بچ گیا ہوں"۔ پھر کچھ تار کچھ خطوط دیئے اور فرمایا "عبدی صاحب کو لکھ دیجئے کہ میں ان کے ارشاد کی تعمیل ضرور کرتا مگر قطعیٔ معذور رہوں"۔

شام کے وقت بار بار فرماتے تھے آج طبیعت کا عجب عالم ہے۔ اندیشہ ہے کہ آج شب میں پھر دورہ پڑے گا۔ منھ لپیٹ کر پلنگ پر پڑے ہوئے تھے۔ بار بار فرماتے تھے۔ بغیر مقصد کی زندگی ہے، نہ دلکشی ہے نہ جاذبیت۔ پھر آدمی زندہ ہی کیوں رہے۔ ۸ بجے کے قریب عبدالمجید خاں صاحب

ڈسٹرکٹ جج سول سرجن صاحب پانڈے جی کو لے کر آگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے معائنہ فرمایا اور کہا کہ آپ بیکار پریشان ہیں۔ نبض، بلڈ پریشر اور قلب کی حالت اچھی ہے۔ آپ کچھ کھا لیں اور فکر نہ کریں۔ دہی دلیا اور یخنی آگئی اور حضرت صاحب نے تھوڑا تھوڑا کھایا۔ پھر رخصت ہونے لگیں سول سرجن صاحب نے کہا۔ "آپ دل سے اندیشہ نکال دیں۔ آپ سوچتے ہی کیوں ہیں کہ موت آجائے گی۔ آپ کے سوچنے سے فائدہ ہی کیا ہے"

حضرت نے فرمایا "مگر پہلے میرا ایک شعر سن لیجئے ؎

عشق ہی کی فطرتِ سرکش کا لیکن کیا علاج

ہر نفس رہبر سہی، جادہ سہی، منزل سہی"

پھر ڈاکٹر عبد الصمد صاحب کا ذکر کیا کہ وہ اپنی ماں کے پیر شب میں اس وقت تک دباتے رہتے تھے جب تک انھیں نیند نہ آجائے۔ ان کی والدہ ان کے لئے مجسّم دُعا تھیں۔ میرا ایک شعر ہے ؎

شیطاں نہیں، فرشتہ نہیں، یا خدا نہیں

اک مشتِ خاک ہے مگر انساں ہیں کیا نہیں

سول سرجن صاحب نے دیکھا کہ حضرت کی طبیعت کچھ بحال ہے تو ڈاکٹر ذکریا صاحب سے پیسلین کا انجکشن دینے کو کہا۔ انجکشن کے بعد سول سرجن صاحب نے فرمایا۔ "بہت دنوں سے تحصیلدار صاحب سے کچھ نہیں سنا گیا۔ آج ایک غزل سنیں گے حضرت نے کہا جی ہاں ضرور سنائیے۔ میں نے یہ ایک غزل سنائی جس کا مطلع ہے ؎

جسے دل سمجھتا ہے بے خبر نہیں کچھ بھی اس میں جو غم نہیں

یوں ہی بے حسی میں گذر گئی تو حیات موت سے کم نہیں

مری عمر بھر کی مسرتیں انھیں چار تنکوں پہ تھیں مگر

جو چمن بچا ہے تو باغباں مجھے آشیاں کا بھی غم نہیں

ہیں عبث یہ میری شکایتیں یہی بیش و کم کی حکایتیں

مجھے خود ہی پاسِ خودی نہیں مرے دل میں اپنا بھرم نہیں

میں بغیرِ منتِ راہبر یوں بلند و پست سے آشنا

مرا ذوق خود مرا رہنما میں اسیرِ نقشِ قدم نہیں

نہ مسرتوں کا خیال ہے نہ مصیبتوں کا ملال ہے

تری ہر خوشی ہے مری خوشی ہی اک خوشی مجھے کم نہیں

ہے قسم مذاقِ سجود کی کہ نگاہِ شوق و شعور میں

وہ جبیں ہے سنگِ جبیں ابھی کسی آستاں پہ جو خم نہیں

وہی تیرا قبلہِ مدعا تیرے در پہ تھا جو پڑا ہوا

نہ ہوا ہوسِ غریب پہ کوئی ایسا طرزِ ستم نہیں

حضرت اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور جب میں غزل پڑھ چکا تو ان کے چہرے پر شگفتگی کے آثار تھے۔ پھر کہنے لگے میں بھی ایک غزل سناتا ہوں۔ ہر چند کہ سب نے منع کیا اور میں نے عرض کیا کہ تحت اللفظ پڑھیں مگر لحن سے اور کافی بلند آواز سے۔ مخصوص والہانہ انداز میں یہ غزل سنائی ؎

نغمہ ترا نفس نفس جلوہ ترا نظر نظر

اے مرے سازِ حیات اور ابھی قریب تر

میں نے ایک شعر کے بعد منع کیا کہ حضرت اب بس کریں تو فرمایا کہ "ابھی سب ٹھیک ہے۔ کوئی چیز رائگاں نہیں جاتی"

جب غزل پڑھ چکے تو یہ پتہ چلتا تھا کہ جیسے نہ قلب کے مریض ہیں۔ نہ ڈاکٹر آپ کا طبی معائنہ کرنے آئے ہیں۔ نہ آدھ گھنٹہ قبل یہ مرض اور موت کے تصور سے نڈھال تھے۔

غزل پڑھنے کے بعد ہی فرمایا کہ اب میری طبیعت ٹھیک ہے اور مجھے یقین ہے کہ دورہ نہیں پڑے گا۔ سب لوگ رخصت ہونے کے لئے کھڑے ہوگئے اس لئے کہ ۹ بج چکے تھے۔ بھائی مہیسوری نے جو موجود تھے مجھ سے کہا کہ اس وقت تو ان کی حالت واقعی سنبھل گئی ہے۔ میں نے ان کو بتایا کہ سول سرجن صاحب اور ڈاکٹر ذکریا فیس نہیں لیتے اس لئے ان کی خاطر غزل سنائی ہے اور غزل سنانے میں خود ان کی طبیعت بشاش ہوگئی ہے مگر مجھے ڈر ہے کہ آج رات کہیں دورہ نہ پڑے اور ایسا ہی ہوا بھی۔

۱۹ جنوری ۵۹ء ۔ آج عبد الحمید خاں صاحب ڈسٹرکٹ جج پانڈے جی سول سرجن اور جبرت صاحب عمر حسرت کی خدمت میں ساہتیہ اکیڈمی کے "آتش گل" پر انعام کی مبارکباد دینے کے لئے آئے حضرت جگر نے ان اصحاب کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ "یہ انعام پاکستان کے لئے درسِ عبرت ہے۔ آپ حضرات میری عادات سے واقف ہیں۔ میری دنیا صرف محبت ہے۔ شاعر نفرت کا اہل نہیں ہے۔ مجھے پاکستان میں بہت کچھ

مانا جاتا تھا مگر میں نے دل نہیں چھوڑا۔ میں نے "آتش گل" میں موجودہ نظام پر تنقید بھی کی ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ تنقید کیوں کی۔ سوال یہ ہے کہ شاعر نے تنقید کو کس مقام پر دیکھنا چاہا ہے۔ اگر شاعر بیدار ہے تو اسے محسوسات کا اظہار ضرور کرنا ہوگا۔ دیکھنا چاہئے کہ جو شاعری زندگی کا خیال ہے۔ مجھے انعام ملا ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ اس سلسلے میں میری کوئی تحریک یا خواہش نہیں تھی۔ یاد رہے جس نے دیا یا کہ ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ "آتش گل" ہندی میں بھی چھپ جائے اور مشکل الفاظ کے لئے فٹ نوٹ دے دیے جائیں۔

۲۲ جنوری ۵۹ء ۔ جمانوں صاحب گوہاٹی کے ایک مہاجن ساہتیہ اکاڈمی کے انعام پر مبارکباد دینے حاضر ہوئے۔ اس دن طبیعت ٹھیک تھی۔ بہت دیر تک حاضرین سے گفتگو کرتے رہے۔ فرمایا کہ "قرآن کی عظمت کا صحیح احساس اب ہوا ہے۔ عارضی خوشی تو خریدی جا سکتی ہے مگر عارضی غم خریدنے سے بھی نہیں مل سکتا۔ غم ایک نعمت ہے اور لازوال چیز ہے۔ دنیا لذت آسانی کی طرف مائل ہے۔ بلند فطرت انسان بھی اس کے پیچھے پڑا ہے مگر گذرا ہوا لمحہ جاتا ہے۔ لذتِ دشواری اصل چیز ہے۔ اسے زندگی میں شامل کر لینا دشوار ہے۔

میں تو دولت کی ہوس کرنے والوں پر حسرت کرتا ہوں۔

کون کی ہوس میں ہے انسان ذلیل و خوار
کون ہے اپنے سینے کے اندر لئے ہوئے

میں کفر کا بھی قائل ہوں۔

اللہ مجھے رکھے محفوظ جو عادت سے
اے کفر ترے دم تک آرائشِ ایماں ہے

ایک شعر اور سن لیجئے۔

یہ وہ چمن ہے جس سے اک دنیا ہے نالاں
نفس سے گرمئ بازار بھی ہے

اور

اپنے حدود سے نہ بڑھے کوئی اے جگر
جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

میں کوڑی کی مثال دیا کرتا ہوں۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ میاں یہ کیا واہیات بات ہے ذرا سی بیٹھ لئے بکھرتے ہو۔ "ہماری میٹھ دیکھو" حسن بھی مناسب ہی سے ہے اور اس کے لئے تضاد بھی ضروری ہے۔

"مجھے سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ میں اس سے گھبراتا ہوں۔ سوری شاعر شعوری طور پر نفرت، سازش اور خوف سے سیاست بنتی ہے۔ خواہ فرد کا فرد سے مقابلہ ہو خواہ قوم کا قوم سے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

اگر سیاست کا برتنے والا شریف انسان ہو تو اس کی شرافت اثر انداز ہوتی ہے۔ میری عادت اتنے اشعار سنانے کی نہیں ہے مگر آپ (بھانومل صاحب) پہلی بار تشریف لائے ہیں اس لئے ضیافت کے طور پر اتنے اشعار پیش کر دیے ہیں۔"

۲۳ جنوری ۵۹ء ۔ حسب معمول احباب شام کو جمع تھے۔ حیرت صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ "آتشِ گل" کا ذکر آیا تو حیرت صاحب نے فرمایا کہ "جن لوگوں نے اس کتاب کو منتخب کیا وہ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں"۔ جگر صاحب نے فرمایا "جی ہاں۔ صرف سطحی باتوں کو جو دیکھا ہے وہ مجھے نہیں سمجھ سکتا۔ میں سیاست سے بہت دور رہوں۔ اس انعام سے یہ تو ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے قدم آگے بڑھ رہے ہیں اور آئندہ زمانہ بہتر ہوگا۔ میں نے جو کچھ اپنی نظموں میں کہا ہے وہ انتہائی خلوص سے کہا ہے۔ میں کسی قیمت پر ہندوستان چھوڑنے کو راضی نہیں ہوں۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ میں نے صالح اور پُرخلوص تنقید کی ہے یا نہیں۔ اس انعام سے حکومت کی فراخدلی ظاہر ہوتی ہے اور یہ راز بھی کہ ادب کا انعام ادب کی خاطر دیا گیا ہے۔ سیاسیات اور نظریات سے متاثر ہو کر نہیں"۔

۲۴ جنوری ۵۹ء ۔ آل انڈیا ربیع میموریل ہاکی ٹورنامنٹ کے میچ میں حضرت جگر کو ان کا دل بہلانے کے لئے لے گیا تھا۔ واپسی پر میں نے دریافت کیا تو فرمایا کہ "بچپن میں میں کرکٹ کھیلا ہوں۔ اور وہ کیا کھیل ہوتا ہے جو گیند اور بلّے سے کھیلا جاتا ہے"۔ میں نے کہا "ٹینس" تو فرمایا "جی ہاں"۔ پھر میچ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ "جی میں نے تو میچ دیکھا ہی نہیں ایک مصرعہ ضرور موزوں کیا 'جیت تو خیر جیت ہے ہار بھی کچھ بری نہیں'۔ میں نے پوچھا کہ آپ بتا سکتے ہیں کہ دونوں طرف کے کھلاڑی کس رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھے ہنس کے فرمایا "جی نہیں حضرت"۔

۳۰ جنوری ۵۹ء۔ آج صبح طبیعت کچھ اچھی تھی ۔ میں نے نظموں کے متعلق ذکر چھیڑا تو فرمایا کہ اعظم گڈھ کے دورانِ قیام میں میں نے "سوراج" "گاندھی جی" "ملک" "مولینا محمد علی مرحوم" اور "اسٹرائک" پر نظمیں کہی تھیں مگر اس دربدری کی زیادہ تر نظمیں ضائع ہوگئیں۔ دریافت کرنے پر فرمایا کہ "اب مجھے یاد نہیں رہیں ۔ بہت عرصہ ہوگیا"۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد یہ اشعار سنائے ۔

اے قوم کے نونہال بچو   اے قوم کے خوش خصال بچو

اے نقش و نگار گلشن ہند   اے تازہ بہارِ گلشن ہند

ماں باپ کی آنکھ کے نور ہو تم   ماشاءاللہ چشم بد دور ہو تم

[illegible]

بنگال تمہارا ہم سفر ہے   پنجاب تمہاری لب پر ہے

ڈائر کی وہ فوج آرہی ہے   وہ سر قدم بڑھا رہی ہے

[illegible]

پھر فرمایا کہ "ملک نے مکمل آزادی کا نعرہ لگایا تھا ۔ میں نے ڈرامائی انداز میں ایک نظم لکھی تھی جس میں ایک بہادر رہبر کی طرح ان کی روح مسلمانوں اور ہندوؤں سے مخاطب ہوتی ہے ؎

ملک کا اگر یاد ہو نام تم کو   جتانا انھیں کا ہے اکرام تم کو

سنانا انھیں کا ہے پیغام تم کو   دکھانا ہے اس صبح کی شام تم کو

تلک وہ کہ ہر مومنِ حق اس کا گاندھی   تلک وہ کہ سارا چمن اس کا گاندھی

"روح مسلمانوں کو ان کے اعمال صالح یاد دلاتی ہے اور ان کے زوال کے اسباب بتاتی ہے ۔

محبت تمہاری خدا کے لئے تھی   عداوت تمہاری خدا کے لئے تھی

عدالت تمہاری خدا کے لئے تھی   حکومت تمہاری خدا کے لئے تھی

نہ تھا فخر سے اور نہ مطلب جفا سے   جدا تم سے راضی تھا تم تھے جدا سے

روح پھر ہندوؤں سے مخاطب ہوتی ہے پھر حکومت برطانیہ کے مظالم گناتی ہے اور آخر میں پیغام آزادی دیتی ہے ۔

"سوراج" کے عنوان سے جو نظم کہی تھی اُس کے دو شعر یہ ہیں ؎

سوئے سوراج قدم اپنے بڑھاتے جاؤ
جس طرف جاؤ اُدھر آگ لگاتے جاؤ

خون ابھی اور بہانا ہے ریتوں پہ تمہیں
گولیاں اور بھی کچھ کھانی ہیں سینوں پہ تمہیں

"گاندھی جی" پر جو نظم کہی تھی اُس کا ایک مصرع ہے ع

اب ہوئے میکدۂ ہند کے گاندھی ساقی

شام کی نشست میں فرمایا کہ بھوپال میں میں نے ایک سہرا بھی کہا تھا ۔ آپ رشید الظفر صاحب کو لکھکر منگوا لیجئے گا ۔

خوشی سے نہ کیوں کر ہو معمور سہرا   کہ ہے زیب روئے منصور سہرا

یہ سہرا نہیں حسب دستور سہرا   یہ سہرا ہے نورٌ علیٰ نور سہرا

اِدھر ہے ماں باپ کے دل کی ٹھنڈک   اُدھر چشم احباب کا نور سہرا

جبیں ہے اسے کیا ہجوم نظر کی   جوانی کے نشے میں ہے چور سہرا

سرِ بزم لیتا ہے رُخ کی بلائیں   بہت شوخ و گستاخ مغرور سہرا

مرادوں کے پھولوں سے رنگیں مکمل   محبت کی خوشبو سے معمور سہرا

حیدرآباد میں ایک نظم "نکہت" پر لکھی تھی ۔ فرمائش ہوئی تھی ۔ یہ نظم مجھے ردی کاغذات میں الماری میں ملی تھی ۔

عکس روئے نگار ہے نکہت   واہ کیا پُر بہار ہے نکہت

جب اسے دیکھئے کسی کے لئے   ہمہ تن انتظار ہے نکہت

دردمندانِ شام فرقت کا   مونس و غمگسار ہے نکہت

موجِ راحت ہے نازبردار اس کا   اور کبھی جان خار ہے نکہت

درد کو اس کے کوئی کیا جانے   آپ اپنی بکار ہے نکہت

اس کی توصیف سب بجا لیکن   کاہلی کا شکار ہے نکہت

اور بہت سے اشعار تھے ۔

یکم فروری ۵۹ء ۔ شام کو مولانا شاہد فاخری صاحب ملنے آئے ۔ جگر صاحب نے دوران گفتگو میں فرمایا کہ بکٹنگ کا ایک واقعہ یاد آتا ہے ۔ اس زمانے میں بھی دو ایک بجے رات تک شراب آجاتی تھی ۔ میں پوری پی نہ تھا ۔ ایک دن بڑی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی ۔ مجھ سے لوگ بہت محبت کرتے تھے اور کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتے تھے ۔ بہت سے لوگ گئے اور واپس آگئے ۔ میں نے کہا میں خود چلتا ہوں ۔ میں نے جاکر والنٹیر کو باتوں سے مرعوب کرنا چاہا مگر ایک آدمی نے ایسا مسکت جواب دیا کہ بات نہ بنی ۔ اس نے کہا کہ صاحب ہم لوگ کانگریس کے حکم سے یہاں آئے ہیں ہم یہ باتیں

کیا جا رہا ہے۔ میں کانگریس کے سکریٹری کے پاس پہونچا اور اس سے خوب باتیں کیں۔ وہ متاثر ہوا اور اس نے اپنے کارکنوں سے کہا کہ بجلی انھیں نہ روکا کر دو ورنہ دوسرے لوگوں کو بھی ایسے ہی حسابات دینے لگے اور ہماری مشکلات بڑھ جائیں گی۔ پھر اس نے مجھے وہیں منگوا دی۔ مجالسی الٰہ آباد کا ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ عالباً مجالسی کا ہے۔ ایک صاحب زردل تھے، میری بدحالی سے ان کا دل بہت دکھا تھا۔ ایک دن میں نے کہا کہ میں ترک کر دوں گا اگر آپ کسی دن میرے ساتھ چل کر جلسہ دیکھیں۔ لوگ مجھ سے بہت مانوس تھے اور حسرت ہے کہ علما کا طبقہ بھی میری رعایت کرتا تھا۔ میں انھیں بھائے لئے گیا۔ مجھے اس کے بعد یاد نہیں کہ کیا کیا باتیں ہوئیں بہرحال یہ یاد ہے کہ میں گفتگو کر رہا تھا اور بندوں نے مجھے گھیر لیا تھا۔ کوئی میرے ہاتھ پاؤں دابنے لگا۔ اور کوئی دست بوسی کر رہا تھا۔ وہ بیٹھے دیکھتے رہے اور جب میں آیا تو وہ بھی واپس آ گئے۔ دوسرے دن اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ پیو مگر نہیں اب روکوں گا بھی نہیں۔"

۲ر فروری ۵۹ء۔ آج بھوپال کی ٹیم کے کھلاڑی حضرت والا سے ملنے آئے تو حضرت نے ان کی بہت خاطر کی۔ دوران گفتگو میں فرمایا کہ "زبان کا صحیح ہونا بہت مشکل ہے ہر استاد فن صرف اپنے زمانے تک کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ زبان ترقی کرتی رہتی ہے۔ ناسخ اُستاد تھے اور میں کار بھی۔ مگر ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ جب توجہ صرف فن کی طرف رہ جائے تو شعر بے اثر ہو جاتے ہیں۔ سیماب اکبرآبادی شاعر تھے۔ ان کے دل پر ایسی چوٹیں بھی پڑی تھیں جن سے ان کے دل میں گداز بھی تھا مگر ان کی مصلحتوں نے ان کے اشعار پامال کر دیئے۔ غزل کی صنف بہت نازک ہے۔ داخلی اثرات غزل میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور انسان کی عادتیں اور خصلتیں اور حرکتیں، نہ رفتہ رفتہ ایک کردار بنا دیتی ہیں اور پھر اس سے چھٹکارا پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ شاعر کو سمجھنے کے لئے اسی مقام سے اُسے دیکھنا چاہئے جہاں سے وہ کہہ رہا ہے ورنہ اس کی بات واضح نہ ہو گی۔ اگر کسی پر بیتی نہیں ہے تو اس کا کلام بے تاثیر ہو گا۔

یکم مارچ ۵۹ء۔ ۱۸ر فروری کو جناب جگر لکھنؤ کے لئے گونڈہ سے روانہ ہوئے اور ۲۰ر فروری کی صبح دہلی پہونچے۔ دہلی میں ایک دن آزاد ہند ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد منظور رحیدالرحمٰن صاحب کے یہاں منتقل ہو گئے۔ اکاڈمی کے انعام ۲۱ر فروری کو تقسیم ہوئے۔ اس کے بعد حکیم سیف الدین صاحب انھیں موٹر سے میرٹھ لے گئے۔ وہاں سے پھر علی گڈھ تشریف لے گئے اور گونڈہ کے مشاعرہ میں شرکت کے لئے ۲۷ر فروری کو تسکین صاحب کے ساتھ گونڈہ واپس آئے۔ اس قدر طویل سفر اتنی کم مدت میں اس لئے حضرت نے طے کیا کہ وہ مجھ سے وعدہ کر چکے تھے کہ گونڈہ کے مشاعرہ میں شرکت فرمائیں گے۔ لوگ برابر یہ کہتے رہے کہ جگر صاحب واپس نہیں آ سکتے مگر مجھے اُنکی تمام تکالیف کے باوجود یقین تھا کہ وہ وعدہ شکنی کی تکلیف سے بچنے کے لئے ہر دوسری تکلیف برداشت کر کے ضرور آئیں گے۔

۲۸ر فروری کے کالس کے مشاعرہ میں حضرت جگر نے اپنی غزل ترنم سے خود ہی سُنائی۔ غزل سُنانے کے بعد ان کی پیشانی اور چہرے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

۵ر مارچ ۵۹ء۔ جگر صاحب کی ایک نظم کا شعر ہے ؎

وطن ہی جب نہیں اپنا تو پھر کہاں کا وطن
چمن اُجاڑ رہا ہوں مگر برائے چمن

تسکین صاحب اور جگر صاحب کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ یہ نظم ۴۲ء میں کہی گئی تھی۔ اور "بھاگ مسافر میرے وطن سے" ۵۰ء کی نظم ہو گی۔ پہلی نظم کی تکمیل علی گڈھ میں ہوئی اور نظم "تجدید ملاقات" بھی وہیں مکمل ہوئی۔

۲۶ر مارچ ۵۹ء۔ میرے یہاں حافظ عبدالرشید صاحب ہمر پور سے تشریف لائے تھے اور تراویح میں اور نفلوں میں کلام پاک سُنا رہے تھے۔ حضرت جگر نے بھی فرمایا کہ وہ تراویح پڑھنا چاہتے ہیں۔ کل اور آج تشریف لائے اور بیٹھ کر تراویح پڑھی۔ بعد میں فرمانے لگے کہ تکان محسوس ہو رہی ہے مگر بغیر محنت کے صلہ بھی تو نہیں ملتا۔ آج میں نے ان کے چہرے پر شگفتگی دیکھی۔

۱۳ر اپریل ۵۹ء۔ آج شام کو حاضر ہوا تو حضرت جگر کے یہاں حباب ترمذی صاحب کو موجود پایا۔ وہ بنگلور سے رخصت پر اپنے وطن آئے ہوئے تھے اور حضرت جگر کی خدمت میں بغرض قدمبوسی حاضر ہوئے تھے۔ کچھ دیر

بعد خان بہادر مولوی مرتضیٰ علی علوی، اجتبیٰ علی علوی کے والد ماجد تشریف لائے۔ میں حضرت جگر کو حیاتِ جگر کے کچھ حصے سنا رہا تھا۔ جگر صاحب کے بعض اشعار پر مرتضیٰ علی صاحب پر رقت طاری ہو گئی۔ جگر صاحب نے ان کا حال دیکھ کر انھیں سراپا "دل بُرد از من دیروز شامے" سنایا۔ بعض اشعار پر مرتضیٰ علی صاحب بے قابو ہو کر روتے رہے۔ حضرت جگر نے اس کے بعد

نغمہ تر انفس نفس جلوہ برا نظر نظر

اے مرے شاہدِ حیات اور ابھی قریب تر

پوری غزل سنائی اور مرتضیٰ علی صاحب پر وہی کیفیت طاری رہی۔ پھر جگر صاحب نے ایک اور غزل

شیوۂ عشق عام سہی

عرفانِ محبت عام نہیں

سنائی اور مرتضیٰ علی صاحب کا وہی عالم رہا۔ پھر حضرت جگر نے ایک اور غزل

ترکِ طلب اور اطمینان

دیکھ تو میرا حسنِ طلب

سنائی۔ اب جگر صاحب کا نفس بھی تیز ہو گیا تھا۔ اسی غزل میں نے ان سے بیک وقت کبھی نہیں سنی تھیں مگر پاسِ خاطر کا نمونہ اور سامع کا یہ حال بھی اس کے قبل نہ دیکھا تھا۔ پھر فرمایا کہ بعض اشعار تو اس طرح ہو جاتے ہیں کہ شاعر خود بھی اس کیفیت یا اس عالم کو بیان نہیں کر سکتا کہ یہ کیونکر ہوا۔ وہ شعر شاعر کا نہیں ہوتا۔ وہ عطیہ ہوتا ہے۔ میرا یہ شعر

نغمہ تر انفس نفس جلوہ تر انظر نظر

اے مرے شاہدِ حیات اور ابھی قریب تر

اور اس قسم کے اشعار قدرت کا عطیات ہیں۔ بسا اوقات ایک لفظ کا بھی الہام ہوتا ہے۔ میرے اس شعر میں

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے

گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

میں "جہلِ خرد" الہام ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا۔

۲۹ جولائی ۵۹ء ۔ کل مجھے گونڈہ چھوڑ دینا ہے۔ میں اب حضرت جگر کی خدمت سے محروم ہو جاؤں گا۔ میرا تبادلہ بورن پور ضلع پیلی بھیت ہو گیا ہے حضرت والا کو ڈاکٹر نے ڈرتے ڈرتے سحر سنا دی ہے۔ اور رأسد کے مواقع میں نے انھیں کافی عالی ہمت پایا۔

۲۰ اگست ۵۹ء ۔ ایک شہادت کے سلسلے سے گونڈہ آیا تھا۔ حضرت والا کو خمیرہ آبریشم دیا جا رہا ہے۔ اس سے کچھ قوت آگئی ہے۔ یہ دوا بمبئی سے حکیم مرزا حیدر بیگ صاحب کے یہاں سے آئی ہے اور پندرہ دن کی خوراکیں ایک سو پچاس روپیہ کی ہوتی ہیں۔ حضرت جگر اس دوا کے استعمال کیلئے تیار نہیں ہوتے تھے مگر ہم لوگوں نے اصرار کر کے منگوا دیا تھا۔ فرماتے ہیں کہ بھئی اس مہنگی دوا سے کیا فائدہ مجھے کب تک آپ لوگ اس طرح زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ آخر متعلقین کے بھی تو حقوق ہیں۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ حضرت والا کو ماہ سو کی رقم پنڈت جواہر لال نہرو نے بغرضِ علاج بھیجی ہے۔ اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار دہلی سے اور سو روپیہ ماہوار لکھنؤ سے پھر وظیفہ جاری ہو گیا ہے۔

۱۹ ستمبر ۵۹ء ۔ آج پھر گواہی کے سلسلے میں گونڈہ آیا۔ حضرت شکیل قریشی بھی تشریف لائے تھے اور مشورہ دے گئے تھے کہ حضرت جگر کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ منتقل ہو جائیں۔ شب کے دو بجے کے قریب کسی آہٹ سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے سونے سے پہلے روشنی گل کر دی تھی اب جو دیکھا تو کمرے کا بلب روشن تھا اور حضرت جگر اتنا بڑا اٹیچی کیس کا سوٹ کیس بند کر رہے تھے۔ میں اُٹھ بیٹھا اور دریافت کیا کہ کیا بات ہے جو آپ اس وقت باہر کمرے میں تشریف لائے ہیں کہنے لگے "مجھے افسوس ہے کہ آپ کی نیند خراب ہو گئی۔ آپ سو رہیں کوئی بات نہیں ہے"۔ یہ کہکر اور روشنی گل کر کے اندر چلے گئے۔ اب میں نے دیکھا کہ حضرت والا نے اس وقت اُٹھ کر اپنے سوٹ کیس سے کشمیری شال نکال مجھے اُڑھا دیا تھا۔ اور اسی لئے زحمت کی تھی۔

(افسانہ)

انتہائے غم

فاض رفعت

ڈاکٹر داس کا شمار دنیا کے گنے چنے ذہنی امراض کے ماہرین میں ہوتا تھا وہ مریض کی حرکت و عمل اس کی شعوری اور غیر شعوری کوششوں کو جدید نفسیات کی روشنی میں پرکھنے کے بعد ہی علاج تجویز کرتے تھے۔

اس وقت بھی وہ کلینک کے داخلی دروازے سے لگ کر کھڑے ہوئے اس شخص کا نفسیاتی جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ جو ابھی کچھ دیر قبل ہی آیا تھا۔ وہ ایک ستائیس اٹھائیس سالہ یوروپین نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ خاصا جاذب نظر تھا مگر اس میں تازگی نہیں تھی۔ وہ اس کے کوٹ کے رنگ کی طرح پیلا تھا۔ اس نے ورسٹڈ کی مٹیالے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔۔۔ وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور اپنے گرد وپیش کے ماحول سے بالکل بے نیاز نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرہ پر سب سے زیادہ متاثر کن اس کی آنکھیں تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان میں جادو جگانے کی قوت سامری کی آنکھوں سے بھی زیادہ ہے۔

ڈاکٹر نے ایک بار اخبار کی اوٹ سے اس کی جانب دیکھا اور مسکرا دیا۔ وہ اس کے خیال کے سلسلہ کو منقطع نہیں کرنا چاہتا تھا حالانکہ اسے جلدی تھی۔ وہ آج اپنی بیوی شیلا کے ساتھ جرمنی کا مشہور سرکس دیکھنے جانا چاہتا تھا جو پچھلے ایک ہفتہ سے اس کے شہر میں دھوم مچائے ہوئے تھا اور جس کا بہترین آئٹم کسی مسخرہ کے کمالات کا مظاہرہ تھا یہ مسخرہ ہنساتے ہنساتے لوگوں کے پیٹ میں بل ڈال دیتا تھا۔

اس کی بیوی شیلا کو ہنسنے ہنسانے کے پروگراموں سے بڑی دلچسپی تھی شاید اس لئے اور بھی کہ وہ بذات خود ایک اچھی مزاح نگار تھی۔ اور اس کے مضامین بیچ جیسے معیاری رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر نے اس یوروپین نوجوان پر ایک بار پھر گہری نظر ڈالی۔ اور بڑی احتیاط سے کرسی پر پہلو بدلا۔۔۔ نوجوان بدستور خیال کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا۔

وہ لندن کے کسی ویران پارک میں روتا بلکتا پایا گیا تھا۔ اس کی پرورش یتیم خانوں میں ہوئی تھی۔ شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ اسے شدت سے احساس ہوتا گیا تھا کہ وہ اس دنیا میں بالکل تنہا ہے۔ اور اس تنہائی کے شدید احساس نے اس کی روح میں تلخی کا زہر گھول دیا تھا۔ یتیم خانہ کا سرپرست انتہائی بے رحم اور بدمزاج آدمی تھا۔ وہ اس سے بہت زیادہ کام لیتا تھا۔ اپنے بے ڈھب بڑے بڑے فوجی جوتوں پر اس سے پالش کراتا تھا۔ ڈرائنگ روم کی صفائی بھی اس کے ذمہ تھی۔ باورچی خانہ کا کچھ کام بھی اسے کرنا پڑتا تھا اور اگر کبھی کبھار اس سے کوئی پلیٹ ٹوٹ پھوٹ جاتی تھی تو اسے اپنے سرپرست کی غلیظ گالیاں سننی پڑتی تھیں۔ گھونسے تھپڑ اور کے کھانے پڑتے تھے اور وہ بڑے بڑے فوجی جوتے بھی جنہیں وہ اپنی میلی اور بوسیدہ قمیص سے چمکایا کرتا تھا اور جنھوں نے اس کے نرم جسم پر نشان ڈال دیئے تھے اور اس کی پشت سوجا دی تھی۔ وہ اپنے سرپرست کے مظالم اور جبر وتشدد سے تنگ آکر اکثر خودکشی کے متعلق سوچنے لگتا تھا۔ رہ رہ کے اس کے دل میں یہ جذبہ

پیدا ہوتا تھا کہ اسے موت آجائے۔ ایسی زندگی سے فائدہ بھی کیا جس میں
ذلت ہی ذلت ہے۔ کاش وہ پیدائش کے وقت ہی مرگیا ہوتا۔ کاش اسے
پارک ہی میں کوئی درندہ کھا لیتا۔ اس کا سرپرست جب غصہ میں دانت پیتا
ہوا اسے حرامزادہ کہتا تو وہ اپنی مجبوری پر بلک بلک کر رو دیتا تھا اور اسے
بے اختیار اپنی ماں یاد آجاتی تھی۔ ایک تخیلی پیکر اس کی آنکھوں کے سامنے
ابھرتا تھا اور وہ ماں ماں کہہ کر چیخ اٹھتا تھا۔ اس طرح وہ بچپن سے جوانی
کے دور تک ماں کی مقدس محبت اور اس کے لازوال پیار کے لئے تڑپتا رہا
تھا۔ مگر اسے ماں کی ممتا نصیب نہ ہوسکی تھی۔ وہ اس سے محروم ہی رہا تھا۔
ہوش سنبھالنے کے بعد ہی وہ ایک روز رات کو یتیم خانے سے بھاگ گیا
تھا اور پھر وہ شہر در شہر بھٹکتا رہا تھا ــــ وہ پاگلوں کی طرح عورتوں کو گھورتا
تھا مگر اس کے ذہن نے ماں کا جو تخیلی پیکر تراشا تھا وہ کسی سے بھی میل
کھاتا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ نورانی پیکر مریم کی طرح مقدس حوروں سے
زیادہ حسین اور نازک پھولوں سے بھی زیادہ خوش رنگ اور لطیف تھا۔

اچانک اس کی زندگی میں ایک لڑکی آئی مورس۔ وہ بڑی پیاری
لڑکی تھی۔ بہت خوش مزاج اور پُرمزاح لڑکی تھی پتہ نہیں اسے جمیس کی کون
سی ادا بھا گئی تھی کہ وہ اس پر مرمٹی تھی۔ جمیس بھی خلاف توقع اس سے پیار
کرنے لگا تھا اور بڑی حد تک پرسکون اور مطمئن نظر آنے لگا تھا ــــ اور
پھر ایک دن۔

وہ اور مورس جھیل کے کنارے مچھلیوں کا شکار کھیلنے گئے ہوئے
تھے۔ اس دن مورس نے فیروزی رنگ کے بروکیڈ کا اسکرٹ اور سفید ساٹن
کا چمکیلا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ وہ بہت حسین نظر آرہی تھی۔ موسم بھی خوبصورت
تھا۔ وہ لوگ بہت دیر تک مچھلیاں پھنساتے رہے تھے۔ ڈوبتی ابھرتی لہروں
کو دیکھتے رہے تھے۔ لہروں کے شفاف آئینہ میں ان کے عکس تھرتھرا رہے
تھے ــــ اور مورس اس کے قریب کھسک آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نشہ
تھا۔ جمیس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مورس کے کان
کی لویں سرخ ہوگئیں تھیں۔ وہ کچھ سننا چاہتی تھی۔

"کہدو جمیس جلدی کہدو میں تڑپ رہی ہوں" اس نے
اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا تھا ــــ

"تم ... تم کتنی حسین ہو" جمیس نے اٹک اٹک کر کہا تھا "مریم
کی طرح مقدس، حوروں سے زیادہ نازک، پھولوں سے زیادہ لطیف ... اور
اور" پھر وہ چیخ اٹھا تھا ــــ "مورس مجھے وہ چہرہ مل گیا جس کی
مجھے برسوں سے تلاش تھی ــــ وہ تم ہو ــــ تم ــــ ہاں۔ ہاں تم ... میری
ماں ہو ... تم میری ماں ہو مورس میری ماں! مجھے سینہ سے لگالو"
اس نے ہانپتے ہوئے کہا تھا ــــ "میری تشنگی دور کردو ــــ مجھے سینہ سے لگالو"

مورس بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس کے پہلو سے اٹھ گئی تھی۔
اس نے انتہائی نفرت سے اسے گھورا تھا اور اس کے منھ پر تھوک
دیا تھا ــــ "پاگل۔ جنونی۔ سٹری"۔ اور اسے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔
وہ اسے آوازیں دیتا رہ گیا تھا۔ مگر اس کی آواز کون سنتا تھا۔ اسکی
آوازیں گونج بن کے رہ گئی تھیں۔ اور وہ روتا رہا تھا۔ اس کا سارا
چہرہ آنسوؤں سے تر ہوگیا تھا۔ پھر وہ کبھی نہیں ہنس سکا تھا۔ اسے
کبھی ہنسی نہیں آئی تھی ــــ اور اس نے اسی روز اس شہر کو چھوڑ دیا تھا۔

اس نے اپنی نظریں اٹھائیں۔ ڈاکٹر بدستور اخبار کے مطالعہ میں
مصروف تھا۔ وہ خاموشی سے بغیر کچھ کہے سنے مقابل کی کرسی پر بیٹھ
گیا۔ ڈاکٹر نے اخبار رکھ دیا۔ ایک لمحہ تک وہ خاموش رہا اور پھر
سگرٹ کا ڈبہ اس کے آگے کھسکا دیا۔

"شکریہ۔ میں سگرٹ نہیں پیتا"

"اوہ کوئی بات نہیں۔ سگار؟" ڈاکٹر نے خوش اخلاقی
سے کہا۔

"جی نہیں"

"چائے۔ کافی یا پھر ٹھنڈا پانی؟"

"جی کچھ نہیں"

"ہوں" ڈاکٹر نے کچھ سوچا اور اسے مخاطب کیا۔

"آپ کچھ سوچ رہے تھے" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے بے تکلفی
سے کہا۔

"جی ہاں"

"کیا؟"

"میرے ذہن میں ایک گرہ لگ گئی ہے اور پچھلے دس سالوں سے
وہ گرہ نہیں کھل سکی ہے ــــ" وہ رکا اور تذبذب کے عالم میں بولا۔

"مجھے ... مجھے ہنسی نہیں آتی — میں ایک مسکراہٹ کے لئے ترس گیا ہوں۔ ایسی مسکراہٹ جس میں دل کی سچی خوشی شامل ہو — کیا تم مجھے ہنسی دے سکتے ہو؟ — کیا تمہارے پاس اس کا کوئی علاج ہے؟" اس نے تیزی سے کئی جملے کہے اور خاموش ہو گیا۔

"آپ بہت زیادہ پریشان ہیں۔ زندگی نے شاید آپ کو بہت غم دیئے ہیں۔"

"ہاں ڈاکٹر! تم ٹھیک سمجھے۔ مم مگر مجھے ہنسی کیوں نہیں آتی۔ میرے ہونٹوں پر پھولوں کی طرح شاداب ہنسی کیوں نہیں کھیلتی؟"

"بعض اوقات انسانی زندگی ایسے حادثات سے دوچار ہوتی ہے کہ انسان مایوسی کے عمیق ترین اندھیروں میں ڈوب جاتا ہے — کیا آپ کی زندگی میں ایسا کوئی حادثہ ...؟" ڈاکٹر دریافت کر رہا تھا۔

"ہاں ڈاکٹر ہاں ..." اور پھر جمیس نے اپنی زندگی کے اوراق ڈاکٹر کے سامنے پلٹ دیے۔

جمیس کی زندگی کی المناک داستان سن کر ڈاکٹر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا لیکن وہ مریض کو اس بات کا احساس دلا کر اُسے مزید احساس کمتری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا — شاید اسی لئے وہ بڑی خوبصورتی سے اپنے آنسو پی گیا تھا۔ مسئلہ بہت پیچیدہ اور مشکل تھا۔ پھر بھی تسلی و تشفی دینا ڈاکٹر کا پہلا فرض ہوتا ہے۔ خصوصاً ذہنی امراض کے ماہرین کو اس کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ وہ کسی بھی طرح مریض کو اُس کی ذہنی نزاکت کا احساس نہیں ہونے دیتے۔

مسٹر جمیس کوئی خاص بات نہیں۔ زندگی میں حادثات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ آپ یقیناً ہنس سکیں گے۔"

"ڈاکٹر میں دنیا کے بہترین ماہرین سے مشورہ لے چکا ہوں۔ دنیا کے متعدد مقامات کے چکر لگائے ہیں۔ مگر..."

"آپ بلاوجہ مایوس ہو رہے ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ..." اور ابھی ڈاکٹر اپنا جملہ پورا نہیں کر پایا تھا کہ شیلا کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ڈارلنگ کتنی دیر کر دی تم نے — کیا سرکس نہیں چل رہے ہو؟"

"ہلو شیلا تم نے خوب یاد دلایا۔ میں بالکل تیار ہوں۔ ذرا پہلے تم ان سے ملو — آپ ہیں میرے نئے دوست مسٹر جمیس — اور یہ ہیں شیلا میری بیوی۔" جمیس نے نظریں اُٹھا کر شیلا کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے ایک انچ کھسکے بغیر اپنا ہاتھ شیلا کی طرف بڑھا دیا۔

"مسٹر جمیس، شیلا بہت ہنسوڑ ہیں۔ ہر وقت ہنستی رہتی ہیں۔ یہ مزاح نگار بھی ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تم ان کے لطیفوں پر بے اختیار ہنس دو گے۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اجنبیت کے احساس کو بالکل ختم کر دینا چاہتا تھا۔

"آئیے فی الحال ہم لوگ جرمنی کا مشہور سرکس دیکھنے چل رہے ہیں۔ آپ نے بھی نام سنا ہوگا؟"

"جی ہاں مسٹر جمیس یہ بہت اچھا رہے گا — ہم لوگ اکٹھے سرکس دیکھ سکیں گے۔ خوب لطف رہے گا — اس مشہور سرکس میں کوئی مسخرہ ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا مسخرہ۔ سنجیدہ کامیڈی میں جس کا جواب نہیں۔ سنا ہے کہ دنیا بھر کے اعزازات انعامات حاصل کر چکا ہے۔ میں تو صرف اُسی کی خاطر سرکس دیکھنے جا رہی ہوں۔"

جمیس کے چہرہ پر اُلجھن کے آثار تھے۔ شاید ان لوگوں کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔

"آپ بلاوجہ تکلفات برت رہے ہیں۔ آئیے بھی۔"

"مگر ڈاکٹر ...."

"ہاں کہئیے۔ میں آپ کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں مگر آپ کو سرکس ضرور چلنا ہوگا۔"

"مگر ڈاکٹر۔ مم۔ میں.."

"آپ بلاوجہ رسمیات میں اُلجھ رہے ہیں۔ کیا آپ کو ہماری دوستی پر اعتماد نہیں؟"

"نہیں ڈاکٹر یہ بات نہیں بلکہ ..." جمیس نے اپنا سر تھام لیا۔

"آپ جو بھی کہنا چاہتے ہوں کہہ ڈالئے۔" ڈاکٹر نے خوشگوار لہجہ میں کہا۔ (بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

اردو غزل میں صنعتی سحر کاریاں

شعور بریلوی

اردو غزل شروع سے اپنی دلکشی و دلپسندی کے گہرے اور حسین نقوش صاحبان ذوق سلیم کے دل و دماغ پر کندہ کرتی رہی ہے اور اپنے مخصوص اسلوب مسحور کن و مترنم لب و لہجے، نرم و نازک الفاظ، شیرینیٔ زبان و بیان، موثر شیوہ بیانی، خوش ادائی اور اک خاص بانکپن کے باعث جملہ اصناف سخن میں ممتاز درجہ رکھتی ہے۔

زبان و بیان کی مرصع کاریوں، تشبیہات و استعارات کی بوقلمونیوں اشارات و کنایات کی رنگینیوں کے ساتھ ہی ساتھ اساتذۂ اردو غزل نے فنی اور صنعتی سحر کاریوں سے بھی اردو غزل کی جھولیاں بھر دیں۔ زیر نظر مضمون میں چند ایسی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جو صنعتی اعتبار سے بے عدیل و بے نظیر کہے اور سمجھے جانے کا پورا حق رکھتی ہیں۔

سب سے پہلے ایک غزل کرم رامپوری کی پیش کی جا رہی ہے جو صنعت اقسام الثلثہ میں کہی گئی ہے۔

خندۂ لب سے ہے اُس کے شمع خنداں بے فروغ
جلوۂ دنداں سے ہے سروِ چراغاں بے فروغ

نورِ بینائی ہے کم غلاف بت گلفام سے
ہے اندھیری رات میں شمع شبستاں بے فروغ

ٹمٹماتا ہے چراغ خانہ اپنا شام سے
ہے سوادِ خط میں یعنی روئے جاناں بے فروغ

جوں، امام سبحۂ گنتیٔ مجکو تشو کا پیشوا
ہوں تو میں دانا پہ ہوں پیش ندیماں بے فروغ

گرچہ میں گنتی سے باہر ہوں پہ ہوں آرام سے
جوں چراغ کشتۂ گور غریباں بے فروغ

ہے نہوروں سے ہمارے، اُس کی نکتوری زیاد
وصل کی شب میں بھی نجم بخت ہو یاں بے فروغ

کام ڈالا ہے خدا نے کس بت خود کام سے
ہے شرارت سے وہ کافر رو بداماں بے فروغ

لگ گئی ہیں اِس مریض غم کی آنکھیں چھت سے آج
ہے وہ نورِ دیدہ اک گوشے میں پنہاں بے فروغ

دیکھ کر بالا خرامی اُس کی سمتِ بام سے
مردمِ چشم اپنی ہیں یاں زیر ایواں بے فروغ

کیا ہی ہو نکلا ہے ابتر، چوچوپوچو میں وہ شوخ
خجلت و دشنام سے ہے روئے انساں بے فروغ

اے کرم اودھم اُٹھا رکھی ہے اس نے شام سے
اچپلاہٹ سے ہے اسکی برق رخشاں بے فروغ

صنعت اقسام الثلثہ کی تعریف یہ ہے کہ اشعار کو شروع سے آخر تک پڑھا جائے تو معلوم ہو کہ ہم نے ایک مکمل غزل پڑھی اور اگر مطلع کو چھوڑ کر باقی اشعار کے پہلے مصرعے بالترتیب پڑھے جائیں تو ایک

دوسری غزل مختلف قوافی اور ردیف کے ساتھ پیش ہوجائیگی۔ اسکے علاوہ مطلع چھوڑ کر محض دوسرے مصرعے بالترتیب پڑھے جائیں تو ایک غزل بقیہ مطلع تیار ہوجائے گی۔

اب زیر نظر غزل کا مطلع چھوڑ کر باقی اشعار کے پہلے مصرعوں کو پڑھیئے تو مندرجہ ذیل غزل پیش ہوتی ہے۔

نور بینائی ہے کم زلفِ بتِ گلفام سے
ٹمٹماتا ہے چراغ خانہ اپنا شام سے
ہوں امام سبحہ گننے مجکو سو کا پیشوا
گریہ میں گنتی سے باہر ہوں یہ ہوں آرام سے
ہے نہوروں سے ہمارے اس کی نکتوری زیاد
کام ڈالا ہے خدا نے کس بت خودکام سے
لگ گئی ہیں اس مریض غم کی آنکھیں چھت سے آج
دیکھ کر بالا خرامی اس کی سمت بام سے
کیا ہی ہو نکلا ہے ابتر چوچو دو چو میں وہ شوخ
اے کرم او دھم اٹھا رکھی ہے اس نے شام سے

اسی طرح اب اصل غزل کا مطلع چھوڑ کر باقی اشعار کے مصرعہائے ثانی بالترتیب پڑھیئے تو یہ غزل سامنے آتی ہے۔

ہے اندھیری رات میں شمع شبستاں بے فروغ
ہے سواد خط میں یعنی روئے جاناں بے فروغ
ہوں تو میں دانا پہ ہوں پیش ندیماں بے فروغ
جوں چراغ کشتۂ گور غریباں بے فروغ
وصل کی شب میں بھی نجم بخت ہے یاں بے فروغ
ہے شرارت سے وہ کافر رد اماں بے فروغ
ہے وہ نور دیدہ اک گوشے میں پنہاں بے فروغ
مردم چشم اپنی ہیں یاں زیر ایواں بے فروغ
تخجلت دو دشنام سے ہے روئے انساں بے فروغ
اچپلاہٹ سے ہے اس کی برق رخشاں بے فروغ

ایک غزل میں بالالتزام تین اقسام کی غزلیں پیش کردینا اور کسی فنی عیب یا گنجلک کا پیدا نہ ہونا کرم رامپوری کی عدیم المثال فن کاری کا روشن ثبوت ہے۔

ایک اور صنعت "صنعت مربع" یا "چہار در چہار" کہی جاتی ہے۔

"مربع" یا "چہار در چہار" صنعت میں عموماً دو اشعار کہے جاتے ہیں۔ ان چاروں مصرعوں کو بالترتیب لکھ لیا جائے پھر ہر مصرعے کو چار ہم وزن ٹکڑوں میں تقسیم کردیجئے اور اس کے بعد پہلے مصرعے کو معمولی طریقہ سے دائیں سے بائیں پڑھیئے اور پھر سارے مصرعوں کے پہلے ٹکڑوں کو اوپر سے نیچے پڑھیئے تو دونوں مصرعے ایک ہی جیسے ہوں گے۔ اسی طرح تمام ٹکڑوں کو پڑھ کر دیکھئے یہی صفت نظر آئے گی۔ مثال کے طور پر منشی علی امجد حسین امجد بدایونی کے دو اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

کروں کیا خفا ہے الٰہی وہ دلبر — خفا ہے وہ مجھ سے عبث کیوں ستمن بر
الٰہی عبث کیوں خفا ہے غضب ہے — وہ دل بر ستمن بر غضب ہے ستمگر

اب ان چاروں مصرعوں کو برابر وزن کے چار ٹکڑوں میں تقسیم کیجئے تو یہ شکل ہوگی۔

کروں کیا	خفا ہے	الٰہی	وہ دلبر
خفا ہے	وہ مجھ سے	عبث کیوں	ستمن بر
الٰہی	عبث کیوں	خفا ہے	غضب ہے
وہ دل بر	ستمن بر	غضب ہے	ستمگر

اب پہلے مصرعے کو دائیں جانب سے بائیں جانب پڑھیئے اور اوپر سے نیچے کی جانب پڑھیئے تو یہی مصرعہ پڑھا جائے گا۔ "کروں کیا خفا ہے الٰہی وہ دلبر"
اسی طرح دوسرے مصرعہ کو دائیں سے بائیں پڑھیئے اور پھر دوسرے خانے کے جملہ ٹکڑوں کو اوپر سے نیچے پڑھیئے تو ایک ہی مصرعہ، یعنی "خفا ہے وہ مجھ سے عبث کیوں ستمن بر" پڑھا جائیگا۔ اب تیسرے مصرعے کو دائیں سے بائیں پڑھیے اور تیسرے خانے کے جملہ ٹکڑوں کو اوپر سے نیچے پڑھیے تو بھی یہی مصرعہ بہر ترتیب پڑھا جائے گا۔ "الٰہی عبث کیوں خفا ہے غضب ہے"

پھر چوتھے مصرعے کو دائیں سے بائیں پڑھیئے اور چوتھے خانے کے جملہ ٹکڑوں کو اوپر سے نیچے پڑھیئے تو چوتھا مصرعہ یہ ہوگا۔ "وہ دلبر سمن بر غضب ہے ستمگر"

ایک تیسری صنعت ہے "صنعت مُدَوَّر"۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ شعر کا پہلا مصرعہ چار برابر ٹکڑوں میں تقسیم کیا جائے۔ پھر ہر مصرعہ کو چار چار خانوں میں لکھ لیا جائے۔ ان آٹھوں خانوں میں سے جس ٹکڑے سے شعر پڑھیئے گا ایک علٰحدہ شعر مختلف قوافی اور ردیف کا بنتا جائے گا۔ مثلاً ایک شعر ہے ؎

مرادل جفاجو غضب ہے جلانا   ترا دل پری رو عجب ہے ستانا

اب اس شعر کے ٹکڑے کیجیئے اس طرح :

جفاجو
غضب ہے
جلانا
ترادل
پری رد
عجب ہے
ستانا
مرادل
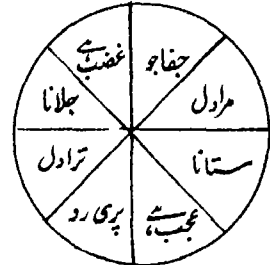
اب اس کے ہر ٹکڑے سے شعر شروع کیجیئے تو مختلف قافیوں اور ردیف کے ساتھ ایک ایک شعر بنتا جائے گا یعنی

جفاجو غضب ہے جلانا ترا دل   پری رو عجب ہے ستانا مرا دل
غضب ہے جلانا ترا دل پری رو   عجب ہے ستانا مرا دل جفاجو
جلانا ترا دل پری رو عجب ہے   ستانا مرا دل جفاجو غضب ہے
ترا دل پری رو عجب ہے ستانا   مرا دل جفاجو غضب ہے جلانا
پری رو عجب ہے ستانا مرا دل   جفاجو غضب ہے جلانا ترا دل
عجب ہے ستانا مرا دل جفاجو   غضب ہے جلانا ترا دل پری رو
ستانا مرا دل جفاجو غضب ہے   جلانا ترا دل پری رو عجب ہے

ایک اور صنعت "صنعت مثلث" ہوتی ہے۔ اس صنعت میں اس کا التزام رکھا جاتا ہے کہ رباعی یا دو اشعار کے قطعہ کے تین مصرعوں سے ہر مصرعے کا پہلا حصہ علیحدہ کر لیں تو ان علٰحدہ کئے ہوئے الفاظ سے چوتھا مصرعہ خود بخود بن جاتا ہے۔ مثلاً ایک رباعی ہے ؎

ہے مہر میں "تیرے حسن سے پرتو نور   "اور ماہ میں "تجھ سے روشنی ہے لے جو"
"تیرا ہی ظہور" سارے عالم میں ہے   ہر مہر میں اور ماہ میں تیرا ہی ظہور

اس رباعی کے مصرعۂ اول کے پہلے حصہ کو علٰحدہ لکھیئے "ہر مہر میں" اسی طرح دوسرے مصرعے کے پہلے حصہ کو لکھیئے "اور ماہ میں" تیسرے مصرعے کے پہلے حصہ کو بھی لکھ لیجیئے "تیرا ہی ظہور"۔ ان ٹکڑوں کو ملائیے تو چوتھا مصرعہ تیار ہو جاتا ہے یعنی۔ "ہر مہر میں اور ماہ میں تیرا ہی ظہور"

حکیم مومن خاں مومن نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی وفات پر اپنے قطعہ تاریخ میں ایک شعر کہا ہے جو فن تاریخ گوئی کی ایک نادر مثال ہے۔ شعر ہے ؎

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دین فضل و ہُنر لُطف و کرم علم و عمل

پہلے مصرعہ کی معنوی تشکیل پر نگاہ کیجیئے اور "بے سر و پا" کے تصرف کو ذہن میں رکھ کر مصرعۂ ثانی کے ہر لفظ کو بے سر و پا کر دیجیئے۔ تو درمیانی حروف سے تاریخ وفات پیدا ہوتی ہے یعنی 'فقر' کے سر اور پیر یعنی (ف) اور (ر) قطع کر دیجیئے اور صرف درمیانی حرف لے لیجیئے چنانچہ فقر سے "ق" اور اسی طرح "دین" سے "ی" فضل سے "ض" ہُنر سے "ن" لطف سے "ط" کرم سے "ر" علم سے "ل" اور عمل سے "م" علٰحدہ لکھ کر ان کے اعداد کو جوڑ لیجیئے تو مادۂ تاریخ بر آمد ہوگا یعنی

ق، ی، ض، ن، ط، ر، ل، م

۱۰۰ ۱۰ ۸۰۰ ۵۰ ۹ ۲۰۰ ۳۰ ۴۰ = ۱۲۳۹ سنہ ہجری

ایک صنعت اور ملاحظہ کیجیئے۔ "صنعت ترصیع مع التجنیس" اس کی تعریف یہ ہے کہ شعر کے پہلے مصرعہ میں جو حروف اور الفاظ واقع ہوں دوسرے مصرعے میں بھی بعینہ وہی حروف اور الفاظ آئیں مگر محل استعمال کے اعتبار سے معنی بدل جائیں۔ کرم رامپوری کی زیر نظر غزل اسی صنعت میں کہی گئی ہے۔ کرم رامپوری کو صنعتی شاعری میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

نہ وہ پہونچا، نہ کلائی، ہے ہات   نہ وہ پہونچا نہ کل آئی ہیہات
برسے، کیوں جائے ہے، رہ رہ برسات   برسے کیوں جائے ہے، رہ رہ برسات
بول میٹھا، تو سُنا جائے، نہ بات   بول میٹھا تو سُنا جائے، نبات

آپ بس جائیں مگر ہو تارات　　آپ بس جائیں، نہ گھر ہو تارات (تاراج و ویراں)
کہہ کرم سے وہ بس آئے دیہات　　کہہ کرم سے وہ بسائے دیہات

پہلے شعر کے پہلے مصرعہ کے الفاظ سے 'کالی' 'رات' اور پہنچے کے مناسبات ظاہر ہوتے ہیں دوسرے مصرعے میں انھیں الفاظ سے محبوب کے نہ آنے کا افسوس ظاہر ہوتا ہے۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ کے الفاظ سے' برسات سے ٹھہرنے اور برسنے کا تقاضہ ظاہر ہوتا ہے اور دوسرے مصرعے میں انھیں الفاظ سے' برسات کے رہ رہ کے برسنے کی شکایت ظاہر ہو رہی ہے۔

تیسرے شعر کے پہلے مصرعہ کے الفاظ سے' محبوب سے میٹھی بات اور میٹھا بول نہ سنانے کی شکایت کا پہلو ظاہر ہوتا ہے اور دوسرے مصرعے کے انھیں الفاظ سے' ایک مثل پیش کر کے یہ معنی پیدا کئے ہیں کہ: "سنتے ہیں کہ میٹھا بول تو مصری اور قند ہوتا ہے۔"

چوتھے شعر کے پہلے مصرعہ کے الفاظ سے' محبوب سے ایسی التجا کرنے کا پہلو ظاہر ہوتا ہے کہ' وہ اس وقت تک اپنے گھر واپس نہ جائے جب تک رات نہ ہو جائے۔ دوسرے مصرعے کے انھیں الفاظ سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ آپ اس گھر کو مستقل آباد کر دیں ایسا نہ ہو کہ یہ تاراج و ویراں ہو جائے۔

پانچویں شعر یعنی "مقطع" کے پہلے مصرعے کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب کی جانب سے کرم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ آجائے اور سہارا دے۔ دوسرے مصرعے کے انھیں الفاظ سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ وہ یہاں سے چلا جائے اور دیہات جا کر بسے۔

اساتذۂ متقدمین نے ایسی بے شمار صنعتی سحر کاریوں سے اردو غزل و دیگر اصنافِ سخن کے عریض دامن بھرے ہیں' مگر افسوس کہ وہ بعض ان کمیاب فنی کتب کو زینت بخش رہی ہیں' جن کا مطالعہ عام طور سے نہیں ہوتا۔ اسی لئے ان میں سے چند صنعتوں کو منظرِ عام لانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

ان صنعتوں کے علاوہ اُردو غزل میں باعتبار فن عروض بھی ایسے محیر العقول نوادرات ملتے ہیں جن کی مثل و نظیر موجدانِ فن کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ ان فنی نوادرات پر کسی دوسرے موقع پر روشنی ڈالی جائے گی۔

بچّوں کی تربیت

بسلسلۂ صفحہ ۳۰

کہ "تم یہ نہ کرو" اور "تم وہ نہ کرو"۔ اس طرح کی منفی ہدایتوں سے بچہ کے ذہن میں احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے جس کے نتائج آگے چل کر بُرے نکلتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ بالواسطہ طریقہ (suggestion) سے بچوں کے ذہن میں کوئی بات پیدا کی جائے۔ مثلاً اگر کسی بچہ نے کوئی چیز غلط لکھی ہو تو اُس سے یہ کہا جائے کہ "اس طرح غلط نہ لکھو" بلکہ اُس کے بجائے یہ کہنا چاہیئے کہ "اس طرح صحیح لکھو۔"

بچے اکثر غیر شعوری طور پر دوسروں کی نقل بھی کرتے ہیں۔ اگر ان کے اِس رُجحان کو ملحوظ رکھا جائے تو اسکول اُن کے لئے بڑی اچھی تربیت گاہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ استاد اپنے برتاؤ' اپنے کردار' اپنی گفتگو اور اپنے طرزِ معاشرت سے اُن کے سامنے بڑی اچھی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ لڑکے اپنے اِن اُستادوں سے سبق لے کر اُسی طرح بننے کی کوشش کریں گے۔ اسکول کے کھیل بھی بچوں کے لئے تربیت کا باعث بن سکتے ہیں۔ کھیل کے ذریعہ ان میں متحدہ کوشش کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے' نصیحت آمیز ڈرامے دیکھ کر اور اُن میں حصہ لے کر بچوں میں نیک بننے اور بڑے بننے کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔

غرض کہ اسکول چھوٹے بچوں کو تعلیم دینے کے علاوہ اُن کے کردار کی تعمیر میں بڑا نمایاں حصہ لے سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اُستاد اپنے فرائض کو محسوس کریں اور یہ سمجھ لیں کہ اُن کا فرض بچوں کو درسی کتابیں پڑھا دینا ہی نہیں بلکہ انھیں ایسی تربیت بھی دینا ہے جو آگے چل کر انھیں ایک ایسا مکمل شہری بنا دے جسے اپنے وطن اور اپنی قوم کے سلسلہ میں اپنے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس ہو۔ بچوں کے سلسلہ میں ہر قوم اور ہر ملک کے والدین اور استادوں پر یہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ہندوستان آزاد ہونے کے بعد اپنی تعمیرِ نو میں مصروف ہے۔ اس لئے ہندوستان میں بچوں کی جسمانی صحت اور تعلیم کی طرف توجہ دینے کے علاوہ ان کی مکمل تربیت کی طرف بھی توجہ دینے کی خاص ضرورت ہے۔

گمنام سپاہی

سوم ناتھ سوم

گمنام سپاہی مرے بھارت کے نگہباں — ہم سب کو بچانے کے لئے تو ہوا قرباں
ڈھونڈے سے بھی ملتے نہیں اس شان کے انساں — یہ موت نہیں زیست پہ انساں کے ہے احساں

ہر سر تری تعظیم کو جھکتا ہی رہے گا
تقلید زمانہ تری جرأت کی کرے گا

گاتی ہیں ہوائیں ترے ایثار کا نغمہ — آباد ترے دم سے ہے کہسار کی دنیا
قدموں کو ترے چومتا ہے عزم کا دریا — ہو چاند کہ سورج تجھے سب کرتے ہیں سجدہ

بے جان ہے تو پھر بھی تری شان وہی ہے
جو زیست میں سامان تھا سامان وہی ہے

بھوکا بھی رہا پیاس بھی کی تو نے گوارا — ہر حال میں خوش تھا کبھی ہمت نہیں ہارا
تو فرض پہ قرباں ہوا جنت کو سدھارا — تو دیش کا گورو ہے ہر اک آنکھ کا تارا

اک روز نظر سب کی تری سمت اٹھے گی
تنویر تری راہبر عزم بنے گی

محروم رہی لاش تری گور و کفن سے — لے آئی تجھے تیری قضا دور وطن سے
تو وادیٔ صحرا میں چلا آیا چمن سے — لیں درس وفا اہل عمل تیرے چلن سے

گلچیں کی جفاؤں سے ہر اک گل کو بچایا
گلشن کی حفاظت کے لئے خود کو مٹایا

بندوق تری اب بھی ترے پاس پڑی ہے — دشمن کی طرف اب بھی نظر اس کی جمی ہے
انداز جو اس کا تھا کبھی اب بھی وہی ہے — ہاں ایک فقط تیرے اشارے کی کمی ہے

دشمن جو نظر آئے تو یہ اب بھی مٹا دے
پائے جو اشارہ تو یہ اک حشر اٹھا دے

اے میرے سپاہی میں تری آن کے صدقے — جس شان سے تو مر گیا اس شان کے صدقے
ایمان کے صدقے ترے عرفان کے صدقے — ماں باپ کے صدقے تری سنتان کے صدقے

دنیا کی بہاریں ترے ایثار پہ قرباں
کونین کی عظمت ترے کردار پہ قرباں

نومبر ۱۹۶۲ء

اترپردیش شاہ راہِ ترقی پر

تیسرے منصوبے کے تحت ایک ہزار زرعتی انجمنوں کا قیام ——— مرزاپور کے قالینوں کی بڑے پیمانے پر برآمد ——— جامدانی کی صنعت کا احیاء ——— اترپردیش سے آموں کی برآمد ——— کھادی کے ذریعے روزگار کی فراہمی ——— ۵ ہزار چھوٹے صنعتی واحدے ——— غیر تربیت یافتہ صنعتی مزدوروں کے لیے سرٹیفکیٹ ——— توسیع تعلیم کے منصوبے ——— طبّی سہولتوں کے متعلق ۱۹۶۶-۶۵ء کا پروگرام ——— دیہی علاقوں کے لیے سستے فلش ——— اترپردیش میں نقل و حمل کی ترقی ——— متفرقات

اترپردیش میں تیسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت امداد باہمی کے چند اہم پروگراموں میں ۱۳۵ کروڑ روپے کے قرضوں کی سہولتوں کی فراہمی، ۴ ہزار خدمتی امداد باہمی انجمنوں، ایک ہزار زراعتی انجمنوں اور ۳۰۰ مارکیٹنگ واحدوں کا قیام اور تمام دیہی کنبوں کو تحریک امداد باہمی کے دائرے اثر میں لانا شامل ہیں۔

اُمید کی جاتی ہے کہ منصوبے کے پہلے دو برسوں میں دیہی کنبوں کو تحریک امداد باہمی کے دائرۂ اثر میں لانے کا پروگرام مکمل ہو جائے گا۔

ریاست میں خدمتی امداد باہمی انجمنوں کے سلسلے میں نمایاں کارگزاری پیش کی گئی ہے۔ گزشتہ سال وزیر اعظم پنڈت نہرو نے ریاست میں دس ہزار خدمتی امداد باہمی انجمنوں کا افتتاح کیا تھا۔ اس نمایاں کامیابی کے پیش نظر ریاستی حکومت نے سنہ ۱۹۶۶-۶۵ء کے مالی سال کے آخر تک ۴ ہزار نئی خدمتی امداد باہمی انجمنوں کی تجویز رکھی ہے۔ پس ماندگان علاقوں میں قرضے کی ۱۲۰ یونینوں کے قیام کے علاوہ ضلع بینکوں اور صدر بینک کو اور زیادہ مستحکم کیا جائے گا تاکہ ان کے ذریعے اُن سے ملحق واحدوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات پوری کی جا سکیں۔

منصوبے کے تحت کچھ نئے اقدامات شروع کرنے کی بھی تجویز ہے جن میں جوٹ، سن، کپاس، تلہن، تمباکو، پھل، ترکاری، کالی مرچ، لہسن، ادرک کی امداد باہمی اُصول پر خرید و فروخت شامل ہے۔ علاوہ ازیں پہاڑی علاقوں کے باشندوں کو روزگار کی فراہمی کے لیے جڑی بوٹیوں اور آلو کی خرید و فروخت کی اسکیم بھی شروع کرنے کی تجویز ہے

ریاستی امداد باہمی فیڈریشن جو مرکزی مارکیٹنگ سوسائٹی ہے، کو مزید تقویت پہنچانے کی تجویز ہے تاکہ یہ میں اضلاعی اور بین ریاستی تجارت کے علاوہ برآمد کے سلسلے میں اہم رول ادا کر سکے۔

پروگرام کے تحت ۲۰۰ مارکیٹنگ سوسائٹیوں، ۱۰۰ پروسیسنگ یونٹوں، مخصوص اشیا کے لیے پانچ انجمنوں، پھل اور ترکاریوں کی خرید و فروخت سے متعلق ۱۵ انجمنوں، ۱۰ ترقیاتی پروجیکٹوں اور پانچ کولڈ اسٹور کے قیام کی تجویز ہے۔

پہلے اور دوسرے منصوبوں کے تحت امداد باہمی زراعتی انجمنوں کے قیام کے مقررہ نشانے پار کر لیے گئے ہیں اور اس وقت ریاست میں ایسی ۲۱۳ انجمنیں قائم ہیں۔ تیسرے منصوبے کے تحت ایک ہزار زراعتی انجمنوں کے قیام کی تجویز ہے۔ علاوہ ازیں اجتماعی ترقیاتی بلاکوں میں ۴۵۰ اور دوسرے علاقوں میں ۵۵۰ رہبر منصوبے شروع کرنے کی تجویز ہے۔

دوسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت امداد باہمی کے اُصولوں کی تربیت سے متعلق جو اسکیم شروع کی گئی تھی وہ تیسرے منصوبے کے تحت بڑے پیمانے

پر جاری رہے گی۔ ماتحت عملے کے لیے تربیتی اداروں کی تعداد ۹ سے بڑھا کر ۱۱ کر دی جائے گی اور غیر سرکاری افراد کی تربیت کے لیے مزید ۱۰ ادارے قائم کیے جائیں گے۔ علاوہ ازیں امداد باہمی سے متعلق ایک مرکزی ادارہ کے قیام اور عملے کے لیے ریفریشر کورسوں کا بندوبست کرنے کی بھی تجویز ہے۔

حکومت اتر پردیش نے مرزا پور کی شہرہ آفاق قالینوں کی بڑے پیمانے پر برآمد کرنے کے لیے ایک پروگرام شروع کیا ہے جس کے تحت نہ صرف اعلیٰ درجے کا مال تیار کرنے بلکہ اس سلسلے میں درمیانی اشخاص کو ختم کرنے کے اقدامات کیے جائیں گے تاکہ بنکروں کو زیادہ سے زیادہ منافع حاصل ہو سکے۔

اس مقصد کے پیش نظر ان بنکروں کی ایک مرکزی انجمن ایک ترقیاتی شعبہ اور تین ابتدائی پیداواری انجمنوں کی تنظیم کی گئی ہے۔ جن کو ریاستی حکومت کی جانب سے انسٹرکٹروں کی تقرری اور مشینوں کی خریداری کے لیے مالی امداد اور کاروباری سرمایہ اور سرمایہ حصص کے لیے قرضے دیے گئے ہیں۔

ترقیاتی شعبے کے ذریعے فنی رہنمائی کے علاوہ رنگائی، بنائی اور تکمیلی عمل کے معیاری طریقے رائج کیے جا رہے ہیں۔

مرکزی انجمن جس کا صدر مقام بھدوہی میں ہے۔ بنکروں کو خام مال، کیمیاوی اشیاء، رنگ اور ضروری ساز و سامان فراہم کرنے کے علاوہ مال کے آرڈر حاصل کرتی ہے اور مال کی سپلائی کی نگرانی بھی کرتی ہے۔

ابتدائی پیداواری امداد باہمی انجمنیں بھدوہی، گیان پور (وارانسی) اور کچھوا (مرزا پور) میں قائم کی گئی ہیں۔ خاص خاص پیداواری مرکزوں میں جلد ہی پختہ رنگائی گھر بھی قائم کیے جائیں گے۔

اعلیٰ درجے کی قالینوں کی برآمد کی ہمت افزائی کے لیے مرزا پور اور بھدوہی میں واقع کوالٹی مارکنگ اسکیم کے جانچ کے مرکزوں کی نو تنظیم کی گئی ہے۔

اس صنعت میں تقریباً ۷۵ ہزار اشخاص لگے ہوئے ہیں۔ اس کے دست کاروں میں اکثریت در اصل کاشت کاروں کی ہے جو اپنے فاضل اوقات میں قالین بننے کا کام کرتے ہیں

قالین بافی کی صنعت کو جس کی دنیا کے بازاروں میں اٹھارویں صدی سے شہرت ہے۔ درمیانی اشخاص کے ہاتھوں نقصان ہوتا رہا ہے اور یہ درمیانی اشخاص غیر منظم بنکروں کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے رہے ہیں بہت سے بیوپاریوں نے غیر معیاری مال باہر بھیجا ہے جس سے ملک کی بدنامی ہوئی اور صنعت کی آئندہ ترقی پر بڑا اثر پڑا ہے۔

اس استحصال کے باوجود یہ صنعت اتر پردیش کی ایک اہم گھریلو صنعت ہے جس سے کافی غیر ملکی تبادلۂ زر حاصل ہوتا ہے۔ اس صنعت کی مجموعی پیداوار کا تقریباً ۹۵ فی صدی امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا اور دیگر ممالک کو برآمد کیا جاتا ہے جس سے ہر سال ۵ ۱/۴ کرور روپیہ حاصل ہوتا ہے۔

حکومت اتر پردیش نے ریاست میں جامدانی کپڑوں کی صنعت کے احیاء کے لیے ابتدائی اقدام کے طور پر ٹانڈہ (فیض آباد) کے جامدانی کے کاریگروں کی امداد باہمی انجمن کو ۲۷ ہزار روپیہ کی مالی امداد منظور کی ہے۔

ایک وہ بھی وقت تھا جب کہ اس دستکاری کے عمدہ کام کی تعریف کی جاتی تھی اور ملک بھر میں روساء اور امراء کی سرپرستی اس کو حاصل تھی لیکن ریاستوں اور زمین داری کے خاتمے سے اس صنعت کو سخت نقصان پہونچا۔ اس وقت اس صنعت کے کاریگروں کی تعداد تقریباً ۴۰ ہے جن میں سے بیشتر نے اس پیشہ کو ترک کر دیا ہے۔ اب اس صنعت کے ذریعہ سالانہ صرف ۴۰۰۰ روپیہ کی لاگت کا ہی مال تیار ہوتا ہے۔

ملک میں اس صنعت کے احیاء کی کوششیں کل ہند دستکاری بورڈ اور دوسرے اداروں کی ایماء پر شروع کی گئی ہیں جنھوں نے اس کی مصنوعات کی معقول کھپت کے بارے میں یقین دہانی بھی کی ہے۔ مزید برآں جامدانی سے متعلق امداد باہمی انجمن کو اس سلسلہ میں کافی آرڈر دیے جا چکے ہیں۔

ریاستی حکومت کی جانب سے جو رقم منظور کی گئی ہے اس میں سے ۲۰ ہزار روپیہ قرضہ اور ۷ ہزار روپیہ مالی امداد کے طور پر دیا جائے گا جس کو امداد باہمی انجمن ضروری ساز و سامان اور خام مال کی خریداری وغیرہ کیلئے صرف کریگی

اتر پردیش کے وزیر زراعت اور امداد باہمی شری موہن لال گوتم نے آج یہاں نظامت زراعت میں ریاست کے ایگریکلچر ریسرچ افسروں کے

جلسہ کے آخری دن تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اتر پردیش سے ہر سال کروڑوں روپیہ کی مالیت کا آم برآمد کرنے کے لئے کوشش کی جا رہی ہے۔

مسٹر گوتم نے کہا کہ دنیا کے مختلف ممالک میں آم بہت زیادہ مقبول ہے۔ سہارنپور کے باغبانی سے متعلق ادارہ میں اس ضمن میں کافی تحقیق کی گئی ہے اور اب بڑے پیمانہ پر آموں کی برآمد ممکن ہو گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس ضمن میں رعائتی کرایہ اور نقل و حمل کی سہولتوں کے لئے مرکزی وزارت ریلوے سے خط و کتابت کرنا چاہتے ہیں۔

سرد ممالک میں آم کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر گوتم نے کہا کہ وہ گذشتہ ماہ روس جاتے وقت اپنے ہمراہ ایک من تازہ آم لے گئے تھے۔ روسیوں نے آم کو بہت پسند کیا۔ ان میں سے بعض نے پہلی بار آم کو دیکھا۔

سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے مسٹر گوتم نے زراعت افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ منصوبہ میں زراعت کو اولیت دی گئی ہے اور یہ ان کا فرض ہے کہ وہ لوگ اس عظیم ذمہ داری سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونے کا اہل ثابت کریں۔ انھوں نے کہا کہ زراعت کے میدان میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اب مزید انتظار کے لئے وقت نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ افسروں کی دقتوں سے باخبر ہیں لیکن حکومت کے وسائل بھی محدود ہیں۔ تاہم انھوں نے یقین دلایا کہ ان کے جائز مطالبات پر غور کیا جائے گا۔

اس سے قبل مسٹر گوتم نے ریسرچ افسروں کو مختلف قسموں کے گیہوں کے بیج تجربہ کرنے کے لئے دئے۔ علاوہ ازیں زراعت افسروں کو انھوں نے زراعت سے متعلق لٹریچر بھی دیا جو انھیں روس میں ملا تھا۔

ڈائرکٹر محکمہ زراعت ڈاکٹر مکرجی نے وزیر موصوف کو یقین دلایا کہ ملک کی غذائی پیداوار بڑھانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے گی اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی پورا کریں گے۔

کھادی کی تحریک جو آزادی کی علامت ہے حصول آزادی کے بعد لاکھوں افراد کے لئے روزگار کی فراہمی کا موثر ترین وسیلہ ثابت ہو رہی ہے۔

ریاستی کھادی ترقیاتی اسکیم کے تحت اتر پردیش کے مشرقی اضلاع میں تقریباً ایک لاکھ ۰ ہزار افراد کو اپنے فاضل اوقات میں کتائی کے ذریعہ اوسطاً ۲ آنہ روزانہ آمدنی ہوتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت مزید ۳۵,۱ اشخاص کو کھادی کی بنائی یا دوسرے کام پر لگایا گیا ہے۔

کھادی تحریک کے گذشتہ بارہ برسوں میں کتائی کرنے والوں نے اتنک ۵۵۰۰۰ من سوت تیار کیا ہے۔ اور نقد اور جنس کی صورت میں مجموعی طور پر ۰۰,۰۰ لاکھ روپیہ کمایا ہے۔ علاوہ ازیں ان کو مزید ۲۲,۶۹ لاکھ روپیہ کی آمدنی ہوئی ہے۔ یہ رقم ان کو حکومت کی جانب سے مالی امداد کے طور پر دی گئی ہے۔ حکومت کے ذریعہ امداد پیشانی کے رماۃ میں دو آنہ فی لچھا کے حساب سے دی جاتی ہے۔

کھادی ترقیاتی اسکیم کے علاوہ بھی اداروں جیسے شری گاندھی آشرم وغیرہ کے ذریعہ بڑے پیمانہ پر اس تحریک کے مقصد کی تکمیل کی جا رہی ہے۔

ریاست کے سیلاب زدہ علاقوں میں متاثر اشخاص کو اب تقریباً ۴۵۲۹ چرخے مفت تقسیم کئے گئے ہیں یہ اقدام ان اشخاص کے لئے جو عملی طور پر تباہ ہو چکے تھے کسب معاش کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ عام طور پر کتائی کرنے والے کو ۵ روپیہ کی قیمت کے چرخے کے لئے ڈھائی روپیہ ادا کرنا ہوتا ہے اور بقیہ رقم ریاستی حکومت مالی امداد کے طور پر ادا کرتی ہے۔

کھادی کی ترقی کے ریاستی پروگرام پر اب دیہی اور گھریلو صنعتوں سے متعلق ریاستی سطح پر نوتشکیل قانونی بورڈ کی زیر نگرانی عمل درآمد کیا جائے گا۔

اس اسکیم کے تحت کتائی اور بنائی کی تربیت کے لئے بالترتیب ۵۲ اور ۸ مرکز چلائے جا رہے ہیں۔ یہ تمام مرکز مشرقی اضلاع میں واقع ہیں۔ ریاست میں ایک سال میں ۸ ہزار اشخاص کو کتائی اور ۸۰ اشخاص کو بنائی کی تربیت دینے کے مقررہ نشانہ کو ہمیشہ پورا کر لیا جاتا ہے۔

کھادی کے تیسرے منصوبہ کے تحت کھادی کے مزید ۳۵ مرکز اور ڈیزائن تیار کرنے کا ایک مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔

اتر پردیش میں گذشتہ دس سال کے اندر چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے حلقہ میں ۹۰۰ ۴ صنعتی واحدے قائم ہو گئے ہیں جن کے ذریعہ ڈیڑھ لاکھ افراد کو براہ راست روزگار کے مواقع فراہم ہوئے۔ ان

واحدوں کی بڑے پیمانہ پر توسیع ریاست کی جانب سے چلائے جانے والے قرضہ کی فراہمی کے اداروں کی کوششوں کی مرہون منت ہے۔

ان اداروں کی جانب سے اب تک مجموعی ۲۱٫۷۷ کروڑ روپیہ کے قرضے ۳ سے لے کر ۵ فی صدی تک کی رعایتی شرح سود پر دیے جا چکے ہیں۔ ایسے قرضوں کی مجموعی رقم مالی سال رواں کے شروع میں ۳٫۴۹ کروڑ روپیہ تھی۔

اس پروگرام کے تحت ۴۵ قسم کی صنعتیں قائم کی گئی ہیں جن میں انجینئرنگ۔ غذا۔ کپڑا۔ لکڑی۔ چمڑہ۔ کیمیاوی اشیاء کی صنعتیں شامل ہیں۔

قرضہ اور مالی امداد سے متعلق ریاستی محکمہ صنعت کے ادارہ کی جانب سے بڑی تعداد میں واحدوں کو سب سے زیادہ قرضے تقسیم کئے گئے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت گذشتہ ۳۱ مارچ تک ۴٬۶۱۳ صنعتی واحدوں کو ۱٫۷۹ کروڑ روپیہ کے قرضے دیئے گئے ہیں جن میں ۴۱۴ واحدوں کو ۲۱٫۰۲ لاکھ روپیہ کے قرضے پہلے پنجسالہ منصوبہ اور ۴۱۹۹ واحدوں کو ۱٫۰۸ کروڑ روپیہ کے قرضے دوسرے منصوبہ کے دوران میں دیئے گئے۔

مالیاتی کارپوریشن نے اپنے فنڈ سے ۴۷٫۰۰ لاکھ روپیہ کے قرضے ۶۰ چھوٹے واحدوں کو اور ۴۰ لاکھ روپیہ کے قرضے چار بڑے واحدوں کو دیئے۔

حکومت اتر پردیش نے صنعتی اداروں یا کارگاہوں میں کام کرنے والے غیر تربیت یافتہ مزدوروں کے لئے ایک سرٹیفکیٹ امتحان منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ "کل ہند ٹریڈ ٹسٹ" میں کامیابی حاصل کرنے والے امیدواروں کو نیشنل سرٹیفکیٹ دیئے جائیں گے۔

یہ اقدام پیشوں کی تربیت سے متعلق قومی کونسل کی سفارشات پر کیا گیا ہے اور اس کا مقصد مزدوروں کی ترقی کے سلسلہ میں ان کی تکنیکی نااہلیتوں کو دور کرنا ہے۔

ریاستی محکمہ محنت کے صنعتی تربیتی اداروں میں انجینئرنگ اور غیر انجینئرنگ پیشوں میں بالترتیب اپریل اور جولائی سنہ ۱۹۶۱ء میں امتحان ہوں گے۔

یہ تربیتی ادارے الموڑہ۔ لکھنؤ۔ الہ آباد۔ آگرہ۔ علی گڈھ۔ بلیا۔ بریلی۔ دہرہ دون۔ گونڈہ۔ کانپور۔ میرٹھ۔ مرزاپور۔ رام پور۔ وارانسی اور سری نگر (گڑھوال) میں واقع ہیں۔

امیدواروں کو ایسے پیشوں کے متعلق جن میں ان کا امتحان لیا جائے گا کسی منظور شدہ کارگاہ میں کم سے کم تین سال کا عملی تجربہ ہونا چاہیئے۔

امتحان میں شریک ہونے کے لئے درخواستیں قریب ترین صنعتی تربیتی ادارہ کے پرنسپل کو ستمبر سنہ ۶۰ء کے اخیر تک دیدینا چاہئیں۔ جہاں سے درخواست کے مقررہ فارم مفت دستیاب ہو سکتے ہیں۔ انجینئرنگ پیشوں کے لئے ایک روپیہ اور غیر انجینئرنگ پیشوں کے لئے ۵۰ نئے پیسے ادا کر کے نصاب تعلیم منیجر گورنمنٹ آف انڈیا پبلیکیشنز۔ سول لائنز دہلی سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

توسیع تعلیم سے متعلق ریاستی حکومت کی اسکیموں پر سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء کے دوران میں ۳۸۹٫۴۵۷ لاکھ روپیہ خرچ کرنے کی تجویز ہے جس میں جسمانی طور پر معذور بچوں کی تعلیم کے لئے ۱۱٫۲۰ لاکھ روپیہ کی رقم شامل ہے۔

سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء کے دوران رفتار ترقی سے متعلق ریاستی حکومت کی رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ توسیع تعلیم کے پروگرام میں مزید چار سینیر بیسک اسکولوں میں موسیقی کی تعلیم شروع کرنا اور ایسے ۱۵۰ اسکولوں میں لائبریریوں کا قیام شامل ہے۔ تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری ختم کرنے کی اسکیم کے تحت ۱۹۰۰ جونیر بیسک اسکولوں کا قیام اور ان اسکولوں کے ۷۶ سب ڈپٹی انسپکٹروں کی تقرری کی تجویز ہے۔

یونیورسٹی تعلیم کے بارے میں رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس ضمن میں ریاست کی یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کو اپنی لائبریریوں اور تجربہ گاہوں کی توسیع اور عملہ کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے مالی امداد دینے کی تجویز ہے۔

گورکھپور یونیورسٹی اور وارانسی سنسکرت ودیالیہ میں علمی کے مزید محکمے قائم کئے گئے ہیں۔ رڑکی یونیورسٹی کو ۵٫۲۵ لاکھ روپیہ کی رقم سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں اس کی سائنس فیکلٹی اور نئے پوسٹ گریجویٹ کورس

قائم کرنے کے لئے مہیا کی گئی ہے۔ اور امید کی جاتی ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اسے منظور کرلے گا۔ چندولی۔ ہنڈیا اور نینی تال میں فنی تربیت کے سلسلہ میں ۲،۸۸ لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی گئی۔

الہ آباد میں ایک انجینیرنگ کالج کے قیام سے متعلق رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ حکومت ہند نے ایسے ۸ علاقائی کالج کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک الہ آباد میں قائم کیا جائے گا جس میں ۲۵۰ طلبا سالانہ تعلیم حاصل کریںگے۔ مجوزہ کالج کے اخراجات حکومت ہند اور ریاستی حکومت مل کر برداشت کریں گی۔ حکومت ہند اس کالج کے قیام کے لئے بہت کوشاں ہے چنانچہ اس اسکیم کو سن ۶۱-۱۹۶۰ء میں بروئے کار لانے کے لئے ۵،۶۷ لاکھ روپیہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔

فنی تربیت کی توسیع کے سلسلہ میں رپورٹ میں اس امر کی سفارش کی گئی ہے کہ موجودہ اداروں کی اس طرح توسیع کی جائے کہ وہ فنی تربیت کی کل ہند کونسل کے معیار پر آ سکیں۔

ہارکورٹ بٹلر ٹیکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ کانپور میں تیل، موم، پینٹ اور وارنشوں کی تربیت میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم شروع کی جائے گی اور ایک صنعتی تحقیقاتی مرکز قائم کیا جائے گا۔ فنی تربیت کے سلسلہ میں ریاستی حکومت کے قرضے کی اسکیم کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے سن ۶۱-۱۹۶۰ء کیلئے پچھلے سال کی طرح ۴،۰۰ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں دوسرے منصوبہ کے پہلے چار سال میں تین سرکاری نارمل اسکولوں میں لڑکیوں کے لئے ابتدائی تعلیم سے قبل تعلیم دینے کے درجے کھولے گئے۔ ۲ نرسری اسکولوں کو امداد دی گئی۔ ۵،۱۴۰ نئے جونیر بنیادی اسکول اور ۱۳۵ سینیر بنیادی اسکول قائم کئے گئے۔ ۱۴۰ اسکولوں میں زرعی تعلیم ۲۳۰ میں دستکاری ۲۱۳ میں جنرل سائنس اور ۱۶ سینیر بیسک بنیادی اسکولوں میں موسیقی کی تعلیم شروع کی گئی۔ ایسے ہی ۸۹۰ اسکولوں کو ان کی لائبریری کے لئے اور شہری علاقوں میں ۸۰ جونیر بنیادی اسکولوں کی عمارت کی تعمیر کے واسطے امداد دی گئی۔ جونیر اور سینیر بنیادی اسکول کے ٹیچروں کی تربیت کے لئے سن ۵۸-۱۹۵۹ء میں ۱۱ بیسک ٹریننگ اسکول قائم کئے گئے جن میں ایک لڑکیوں کے لئے اور تین بیسک ٹریننگ کالج بھی شامل ہیں۔

ثانوی تعلیم کی توسیع کے سلسلہ میں رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ منصوبہ کے پہلے چار سال میں لڑکیوں کے لئے ۵ گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری اسکول قائم کئے گئے، ۸۰ ہائیر سیکنڈری اسکولوں کو ان کی عمارت کے لئے امداد دی گئی۔ ۱۲۵ اسکولوں میں کھیل کا میدان قائم کرنے کے لئے اور ۲۰۴ اسکولوں کو لائبریری کے سلسلہ میں نقد امداد دی گئی۔ ۲۵۷ نئے اسکولوں کو امداد دی گئی اور کچھ سرکاری اسکولوں میں ۵۶ مختلف المقاصد کورس شروع کئے گئے جن میں ۱۰ کورس جنرل انجینیرنگ کے بھی شامل ہیں۔

تین ہائیر سیکنڈری اسکولوں اور چار جونیر ہائیر سیکنڈری اسکولوں کو جو پچھڑے علاقوں میں قائم تھے ریاستی بنایا گیا۔ لڑکیوں کے ۶ سرکاری ہائی اسکول اور لڑکوں کے دو سرکاری ہائی اسکولوں کو انٹرمیڈیٹ کالج بنا دیا گیا۔ شاہ آباد (رامپور) کے سرکاری جونیر ہائی اسکول کو ہائی اسکول بنا دیا گیا۔ سن ۵۹-۱۹۵۸ء میں پچھڑے ہوئے علاقوں کے کچھ اداروں کو ایک لاکھ روپیہ کی نقد امداد دی گئی۔

ریاستی حکومت کی طبی سہولتوں کی فراہمی اور صحت عامہ سے متعلق اسکیموں پر ۶۱-۱۹۶۰ء کے دوران میں ۳۴۶،۱۳ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ یہ اطلاع محکمۂ منصوبہ بندی کی رفتار ترقی سے متعلق حالیہ رپورٹ میں دی گئی ہے۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت ابتدا میں صحت سے متعلق پروگرام کے لئے ۲۲،۴۴ کروڑ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی تھی۔ نظر ثانی شدہ منصوبہ میں یہ رقم گھٹا کر ۱۶،۵۵ کروڑ روپیہ کر دی گئی۔ منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں مذکورہ پروگراموں پر ۶۰۶،۷۶ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ ان اسکیموں کے علاوہ جن پر ریاست کے منصوبہ کے تحت عملدرآمد ہو رہا ہے متعدد دوسری ترقیاتی اسکیمیں بھی ہیں۔ ان اسکیموں پر ۶۱-۱۹۶۰ء کے دوران میں ۱۶۲،۸۴ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔

علاوہ ازیں زیر نظر سال میں شہری اور دیہی علاقوں میں پانی کی بہم رسانی کی اسکیموں کے لئے بالترتیب ۲۲ لاکھ اور ۱۶،۲۵ لاکھ روپیہ مقرر کیا گیا ہے۔

طبی تعلیم کی توسیع کے بارے میں رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس ضمن میں نمایاں کارنامہ کانپور میں ایک میڈیکل کالج کا قیام ہے۔ اس کالج

میں حال میں ایک چسٹ سرجری یونٹ اور انسدادی دواؤں کا شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ اس اسپتال کے جزو کے طور پر بچوں کا ایک اسپتال اور ایک ریڈیم انسٹی ٹیوٹ جس میں کینسر سے متعلق ریسرچ کی سہولتیں ہوں گی جلد ہی قائم کرنے کی تجویز ہے۔ آگرہ میڈیکل کالج میں اگست ۱۹۵۹ء سے طلباء کے داخلہ کی گنجائش ۵۰ سے بڑھا کر ۱۰۰ کر دی گئی ہے۔ اور ایک نیا سرجیکل بلاک قائم کیا گیا ہے اور مزید پلنگوں کا انتظام کیا گیا ہے جس سے اسپتال میں پلنگوں کی مجموعی تعداد ۶۰۰ ہو گئی ہے۔ لکھنؤ میڈیکل کالج میں تشخیص امراض اور دواسازی کے شعبوں کا درجہ بلند کر دیا گیا ہے۔ اور سماجی اور انسدادی دواؤں کا ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ لکھنؤ کے ڈینٹل کالج میں توسیع کی گئی ہے۔ اور اس سلسلہ میں داخلہ کی گنجائش اگست ۱۹۵۹ء سے ۲۰ سے بڑھا کر ۴۰ کر دی گئی ہے۔ لکھنؤ میڈیکل کالج میں بھی جلد ہی ایک چسٹ سرجری یونٹ کا قیام عمل میں آجائیگا۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ نیشنل ہومیوپیتھک میڈیکل کالج لکھنؤ میں ساڑھے پانچ سال کا ڈگری کورس شروع کیا گیا ہے اور عمارت کی تعمیل کے لئے حکومت کی جانب سے مالی امداد منظور کی گئی ہے۔

ملیریا کی بیخ کنی سے متعلق قومی پروگرام اتر پردیش میں ۵۹-۱۹۵۸ء میں شروع کیا گیا ہے۔ پروگرام کے تحت تقریباً ۴۰ لاکھ کی آبادی کو ملیریا سے محفوظ کرنے کے لئے ۴۴ اضلاع میں ملیریا کی بیخ کنی کے ۴۰ واحدے قائم کئے گئے۔ ۶۰-۱۹۵۹ء میں ۲۰ واحدوں کے قیام سے بقیہ علاقے بھی ان کے دائرہ اثر میں آگئے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ فائلیریا کی روک تھام کے لئے اس وقت آٹھ واحدے اور تین سروے ٹیمیں کام کر رہی ہیں۔

تپ دق کی روک تھام کے لئے ۱۶ کلینکوں میں تشخیص اور علاج کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں اور جلد ہی مزید ۱۵ کلینک تعمیر کئے جائینگے۔ ۶۱-۱۹۶۰ء میں ایسے مزید پانچ کلینک قائم کرنے کی تجویز ہے۔ علاوہ ازیں امید کی جاتی ہے کہ تپ دق کے مریضوں کے بعد کی دیکھ بھال اور بحالی کے لئے لکھنؤ میں جلد ہی ایک مرکز قائم ہو جائے گا۔ کوڑھ کی روک تھام کے پانچ مرکزوں کے قیام کے مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں تین مرکزوں کا قیام عمل میں آچکا ہے امراض خبیثہ کے لئے بھی دو کلینک قائم ہو چکے ہیں۔ کینسر کے مریضوں کے علاج کے لئے کملا نہرو اسپتال الہ آباد میں ۴۰ پلنگوں پر مشتمل ایک وارڈ قائم کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں ضروری سازوسامان فراہم کر دیا گیا ہے۔

یو پی لوکل سیلف گورنمنٹ انجینیرنگ ڈیپارٹمنٹ نے ادارہ منصوبہ بندی تحقیق اور عمل اور عالمی ادارۂ صحت کے اشتراک سے دیہی علاقوں کے لئے سستے ہینڈ فلش سسٹم کے پائخانہ کا نمونہ تیار کیا ہے۔ محکمہ کی جانب سے اس پائخانہ کو ایسے شہری علاقوں میں بھی رائج کرنے کی اسکیم ہے۔ جہاں گندے پانی کی نکاسی کا انتظام نہیں ہے اور کچھ عرصہ تک پانی کی نکاسی کی اسکیم شروع نہیں کی جا سکتی

سستے اور جدید قسم کے پائخانہ کا نمونہ تیار کرنے کا مسئلہ عرصہ سے زیر غور تھا۔ اس سلسلہ میں ملک کے مختلف حصوں میں بہت سے ڈیزائن تیار کئے گئے تھے لیکن وہ کسی نہ کسی وجہ سے عام استعمال کے لئے مناسب نہیں پائے گئے۔

ایک نئے قسم کے پائخانہ میں ایک تسلہ۔ ایک نعل نما پائپ اور آٹھ فیٹ گہرے گڑھے تک ایک ڈھکا ہوا پائپ ہوگا۔ اس پائخانہ سے غلاظت بہانے کے لئے ایک لوٹا پانی کافی ہوگا۔ اس پائخانہ پر مجموعی طور پر صرف ۲ روپیہ صرف ہوگا۔ اس کے سامان دیہات میں بھی تیار کئے جا سکتے ہیں۔

محکمہ مذکور کی جانب سے لکھنؤ اور میرٹھ اضلاع کے کچھ ترقیاتی بلاکوں میں اس قسم کے تقریباً ۱۰۰ پائخانہ بنائے جا چکے ہیں۔ یہ پائخانے سستے اور آسان ڈیزائن کے ہونے کی بنا پر بہت زیادہ مقبول ہو رہے ہیں۔

اتر پردیش میں نقل و حمل اور سڑکوں کے ذریعہ آمد و رفت کی ترقی سے متعلق ریاستی حکومت کے پروگرام کے لئے مجموعی طور پر ۱۴ء۲۹۲ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔ یہ اطلاع رفتار ترقی سے متعلق ایک رپورٹ میں دی گئی ہے۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ ۶۱-۱۹۶۰ء کے لئے مجوزہ صرفہ کی رقم خاص طور پر منظور شدہ کاموں کے لئے ہے۔ ۶۱-۱۹۶۰ء میں پختہ سڑکوں کی از سر نو تعمیر اور درستی اور خام پگڈنڈیوں کی نو تعمیر کے لئے ۴۵ء۵۱ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

اتر پردیش میں دوسرے منصوبہ کے پہلے چار برسوں میں رفتار ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دوسرے منصوبہ کی مدت میں ۲۰۰ء۱ میل لمبی پختہ اور ۲۲۸ میل لمبی دیہی سڑکوں کی تعمیر کی تجویز تھی۔ منصوبہ

کے پہلے تین برسوں میں ۹۵۰ میل لمبی پختہ اور ۲۵۰۲ میل لمبی دیہی سڑکیں تعمیر کی گئیں۔

۱۹۶۰-۶۱ء کے پروگرام کے تحت ۱۲۳۲،۷۱ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ۳۴،۶ میل لمبی پختہ اور ۱۰۸ میل لمبی دیہی سڑکوں کی تعمیر کی تجویز ہے۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں ۴۴ بڑے پل تعمیر کئے گئے اور آمد و رفت کے لئے کھول دیئے گئے۔ ۱۹۶۰-۶۱ء کے پروگرام کے تحت ۱۲،۹۳ لاکھ روپیہ کی لاگت سے مزید ۲۴ بڑے پل تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔

دیگر کاموں کی مد کے تحت ڈاک بنگلوں اور دیگر عمارتوں کی تعمیر، معاوماتی جائزہ، سرحدی سڑکوں کے لئے مخصوص ساز و سامان کی فراہمی اور درخت وغیرہ لگانے کے لئے ۱۲۳،۶۶ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی تھی منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں ان کاموں پر ۴۴،۳۰ لاکھ روپیہ صرف کیا گیا۔ ۱۹۶۰-۶۱ء کے دوران میں اس پروگرام کے تحت ۲۷،۰۶ لاکھ روپیہ صرف کرنے کی تجویز ہے۔

اتر پردیش میں ۱۹۶۰-۶۱ء کے دوران میں سیر و سیاحت کی ترقی کے لئے ۳،۵۰ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ کم آمدنی والوں کے لئے وارانسی میں ہوٹلوں کی تعمیر شروع ہو چکی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ ہوٹل ۱۹۶۰-۶۱ء کے آخر تک تعمیر ہو جائیں گے۔ ۱۹۶۰-۶۱ء کے دوران میں بدری ناتھ کیدارناتھ کے راستوں میں لکڑی کے ۱۵ کمرے تعمیر ہو جائیں گے۔ سری نگر (گڑھوال) میں یاتریوں کے لئے ایک سائبان تعمیر کرنے کے لئے زمین حاصل کر لی گئی ہے امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۶۰-۶۱ء کے دوران میں اس سائبان کی تعمیر مکمل ہو جائے گی جس پر تخمیناً ۱،۲۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ بدری ناتھ۔ کیدارناتھ کے یاتریوں کی سہولتوں کے لئے اہم مقامات پر مزید چار سائبان تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ موجودہ ٹورسٹ بیورو کے علاوہ سری نگر میں ایک نیا ذیلی بیورو قائم کرنے کی تجویز ہے۔

متفرقات

بیمہ شدہ صنعتی مزدوروں کو ریاستی بیمہ اسکیم کے تحت گذشتہ جولائی میں ۲ لاکھ روپیہ ادا کیا گیا جولائی میں ریاست میں بیمہ شدہ صنعتی مزدوروں کو مجموعی طور پر ۲،۵۲۷،۱۰۰ روپیہ ادا کیا گیا۔ اس اسکیم کے تحت ملازمین مفت علاج اور چار قسم کی نقد مراعات کے مستحق ہیں۔

زیر نظر مہینہ میں صنعتی مزدوروں کو جو نقد مراعات دی گئیں ان میں بیماری کے لئے ۱۵۴،۵۱۶ روپیہ عارضی معذوری کے لئے ۴۴،۱۴۱ روپیہ اور مستقل معذوری کے لئے ۴،۹۷۱ روپیہ کی رقومات شامل ہیں۔ متوفی مزدوروں کے پسماندگان کو ۳،۱۰۲ روپیہ ادا کیا گیا۔

مفت علاج کی سہولتوں سے ۱۵،۲۲۹ اشخاص نے فائدہ اٹھایا جبکہ مجموعی طور پر ۲۰،۱۲۶ اشخاص اس سہولت سے مستفید ہونے کے مستحق تھے۔ اب بیمہ شدہ مزدوروں کے کنبے بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

تپ دق کے مریضوں کو جن کی تعداد ۵۳ تھی مزید ۴،۱۳ روپیہ دیا گیا۔

زمین کی حصولی اور معاوضہ کی ادائیگی حکومت اتر پردیش نے اس امر پر زور دیا ہے کہ ایسے سرکاری دفتر جنھوں نے آراضی حاصل کی ہے وہ حصول آراضی اور آسامیوں کو معاوضہ دینے سے متعلق کارروائی کی جلد از جلد تکمیل کریں۔

اس سلسلہ میں ایک حکم نامہ کے ذریعہ بورڈ آف ریونیو کو ہدایت کی گئی ہے کہ ایسے آسامیوں سے جن کی زمین کسی سرکاری دفتر نے مفاد عامہ کے پیش نظر حاصل کی ہے اس زمین کا لگان اس تاریخ سے نہ لیا جائے جس تاریخ سے کہ زمین اس کے پاس سے نکل گئی ہو۔ اور متعلقہ محکمہ سے کہا جائے کہ وہ اس سلسلہ میں حصول آراضی سے متعلق پوری کارروائی جلد از جلد ختم کر دیں۔ آراضی کے لگان میں تخفیف یا چھوٹ کے مسئلہ پر ضلع افسران ریونیو مینول جلد اوّل کے پیرا ۱۴۴ کے مطابق کارروائی کریں گے۔

ایسی صورت میں جہاں کسی محکمہ نے حصول آراضی ایکٹ کے تحت کارروائی سے قبل آراضی پر قبضہ حاصل کر لیا ہے تو آراضی پر فی الواقع قبضہ پانے کی تاریخ سے ایکٹ کے تحت آراضی کے منتقل ہونے کی تاریخ تک کی مدت کے لگان کی وصولی کا سوال ہر معاملہ کی نوعیت پر الگ طے کیا جائے گا۔

کھیل کود کی صنعت کھیل کود کے سامان کی صنعت کی ترقی کے مرکز واقع بریلی کے ذریعہ جلد ہی میدان کے کھیلوں اور دوڑ وغیرہ کے سامان تیار کرنے کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

ریاستی حکومت نے مذکورہ مرکز میں ضروری مشینیں لگانے کے لئے کافی رقم الاٹ کی ہے۔

میرٹھ کے مرکز کی طرح یہ مرکز بھی کھیل کود کا سامان تیار کرنے والوں میں مقبول ہو رہا ہے۔

اتر پردیش میں تقریباً ۴ ہزار اشخاص اس صنعت میں لگے ہوئے ہیں اور اس کی مجموعی پیداوار کا دو تہائی بیرونی ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔

اس صنعت کی ترقی کے لئے ریاستی اسکیم کے ذریعہ دوسرے پنچسالہ منصوبہ کی مدت میں مزید ۶۰۰ اشخاص کو براہ راست روزگار فراہم ہوگا۔

چرخہ غریبوں کا ذریعہ معاش اگرچہ یہ بات بظاہر ناقابل یقین معلوم ہوتی مگر یہ حقیقت ہے کہ چرخوں کے ذریعہ ہی علاقوں کے لاکھوں افراد اپنی روزی کماتے ہیں

چرخہ کی اصل قیمت ۵ روپیہ ہے لیکن خریدنے والے کو ریاستی حکومت کی جانب سے ایک چرخہ پر ڈھائی روپیہ کی چھوٹ دی جاتی ہے۔ اس طور پر خریدنے والے کو صرف ڈھائی روپیہ ادا کرنا ہوتا ہے۔

چرخہ سے روزانہ پانچ یا اس سے زیادہ سوت کے لچھے تیار کرنے پر یقینی طور پر ۲۵ روپیہ ماہانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ یہ معمولی رقم غریب اور بے سہارا گاؤں والوں کے لئے نعمت ہے۔ جس سے وہ اپنی گزر بسر کر سکتے ہیں۔

صرف ریاستی کھادی ترقیاتی اسکیم کے تحت دیہی علاقوں کے تقریباً ایک لاکھ ۶ ہزار افراد کتائی کے ذریعہ اپنی روزی پیدا کر رہے ہیں۔

تیوہاروں کے موقعہ پر بجلی کے کنکشن حکومت اتر پردیش نے ریاستی بجلی بورڈ کو تیوہاروں کے موقع پر ان علاقوں میں بجلی کے عارضی کنکشن منظور کرنے کا اختیار دے دیا ہے جو گنگا اور شاردا ہائیڈرو الیکٹرک گرڈ کے تحت آتے ہیں۔

ان علاقوں میں صنعتوں اور آبپاشی وغیرہ کے لئے بجلی کی بہت زیادہ مانگ کے سبب اس کی قلت ہو گئی تھی۔ لہذا ریاستی حکومت نے یہاں بجلی کے عارضی کنکشن منظور کرنے پر یو۔ پی بجلی ایکٹ ۱۹۴۷ء کے تحت پابندی عائد کر دی تھی۔

حکومت کی جانب سے حال میں جاری کئے گئے حکم کے ذریعہ یو۔ پی بجلی بورڈ کو دسہرہ۔ دیوالی۔ اور دوسرے تیوہاروں کے موقعہ پر روشنی اور پنکھوں کے لئے عارضی کنکشن دینے کا اختیار دے دیا گیا ہے۔

اس حکم کے تحت ریاست کے چیف انجنیر (ہائیڈل) سپرنٹنڈنگ انجنیروں اور گنگا شاردا گرڈ میں ریاستی بجلی بورڈ کے ایگزیکٹیو انجنیروں کو ۲۵ کیلوواٹ تک زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے لئے۔ ا کیلوواٹ تک زیادہ سے زیادہ تین ہفتہ کے لئے اور دو کیلوواٹ تک زیادہ سے زیادہ ۱۵ دنوں کے لئے بجلی کے عارضی کنکشن دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔

انتہائے غم

(بسلسلہ صفحہ ۴۰)

"قسمت کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے۔ قدرت کا یہ کتنا بڑا ظلم ہے ......" جیمس پھر رک گیا۔ اس نے ڈاکٹر کے چہرہ پر نظریں جمادیں ــــ "ڈاکٹر وہ مسخرہ میں ہی ہوں۔ میں ہی ہوں وہ مسخرہ۔ ــــ میں ساری دنیا کو ہنسا سکتا ہوں۔ مگر خود نہیں ہنس سکتا"

اس بار کوشش کے باوجود ڈاکٹر اپنے آنسو نہیں روک پایا۔ شیلا حیرت سے اُس کا منھ تک رہی تھی۔

(صرف کلائیمکس، تونہار کے ایک مقولہ سے ماخوذ)

مراسلات و توضیحات

نگاہِ ساقی

"نیا دور" کے جون کے شمارے میں میری دس رباعیات شائع ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک رباعی کے ایک مصرع (صدیوں کے بجھے چراغ جل جاتے ہیں) کے سلسلہ میں جناب شہاب جعفری کا ایک مراسلہ اگست کے "نیا دور" میں نظر سے گزرا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ یہ مصرع ان کا ہے اور کئی رسالوں میں چھپ چکا ہے نیز ریڈیو سے براڈکاسٹ ہو چکا ہے۔ مراسلہ میں میرے متعلق یہ بھی کہا گیا تھا کہ "عمر صاحب نے مشاعروں میں مجھے رباعی پڑھتے سنا ہوگا۔ آخری مصرعہ یہ تھا" یہ سرقہ ہو یا توارد؟ میں ان پر کوئی الزام نہیں لگاتا"

اس کے جواب میں سب سے پہلے مجھے افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ نہ تو میں نے شہاب جعفری صاحب کو ہندوستان یا پاکستان کے کسی مشاعرے میں دیکھا ہے اور نہ کہیں ان کا کلام سنا ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ وہ اسی اس رباعی کو نیا دور اور دیگر بہت سے رسائل میں طبع کرا چکے ہیں، تو اس کی ذمہ داری میری نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے جس مصرع پر شہاب صاحب کو اعتراض ہے وہ دراصل میری ایک پرانی رباعی کا ایک مصرع ہے اور یہ رباعی سنہ ۱۹۳۶ء میں روزنامہ "الہند" میں شائع ہوئی تھی پھر ماہنامہ صاعقہ اور ہفت روزہ مشرقی میں چھپا۔ اس وقت شاہراہ نکلا بھی نہیں تھا اور شہاب جعفری صاحب نے شاعری بھی شروع نہ کی ہوگی۔

شہاب صاحب اس کو توارد کہیں یا اسے سرقہ سمجھتے رہیں۔ میں بہرحال یہ کہوں گا کہ خود شہاب صاحب نے میرا مصرع تحسین پاکر "سرقہ" کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ اردو شاعری میں ایک مصرع ملا دینا اور بات ہے پورے پورے شعر کا توارد ہو جاتا ہے اسکی مثالیں ایک نہیں سیکڑوں ہیں۔ مثلاً

میر — آنکھیں رنگ نقش قدم ہو گئیں سپید / ملنے کے انتظار میں قاصد کھلا پھرا

سودا — آنکھیں رنگ نقش قدم ہو گئیں سپید / اس سے زیادہ خاک کروں انتظار خط

تنہا — حسیں تیری آنکھیں حسیں تیرے آنسو / یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

جگر — حسیں تیری آنکھیں حسیں تیرے آنسو / یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

میر — کیا بھروسہ ہے زندگانی کا / آدمی بلبلہ ہے پانی کا

آتش — کیا بھروسہ ہے زندگانی کا / آدمی بلبلہ ہے پانی کا

قادر — بدلیں وہ نگاہیں تو یہ عالم ہے کہ قادر / کترا کے گزرتی ہے نسیم سحری بھی

حبیب احمد صدیقی — گلشن میں مرے رہنے کی تادیر سزا ہو / کترا کے گزرتی ہے نسیم سحری بھی

اب اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ میری یہ رباعی کہیں نہیں چھپی ہے تو میں ایسے مکتبۂ فکر کے حسب ذیل اشعار پیش کروں گا اور شہاب صاحب سے عرض کروں گا کہ وہ یا کوئی اور صاحب ان اشعار کو دیکھیں اور پھر یہ فیصلہ کریں کہ میری رباعی کا یہ مصرع "صدیوں کے بجھے چراغ جل جاتے ہیں" کس کا ہو سکتا ہے۔

ہجوم میں مرادوں کے ہوا ہے یہ تجربہ بھی اکثر / اٹھی ہے جس دم نگاہِ ساقی چراغ سو دل میں جل گئے ہیں

مل کر گلے کسی سے جہاں اور جدھر گئی / جلنے لگے چراغ جہاں تک نظر گئی

جس سمت بھی ہم نکل گئے ہیں / راہوں میں چراغ جل گئے ہیں

اللہ ری محبت کی یہ انجمن آرائی / جس سمت نظر اٹھی اک شمع جلا آئی

ایک رباعی بھی ملاحظہ کریں، اور اس کا دوسرا مصرع خاص طور پر۔

ٹوٹے ہوئے ساز اور سوئے ہوئے راگ / صدیوں کی جلی بجھا دے جنگل کی آگ

گلشن کا یہ حال ہے خزاں میں جیسے / اجڑا ہوا اک جوان بیوہ کا سہاگ

——— عمر انصاری

— اس سلسلہ میں آئندہ کوئی مراسلہ شائع نہ کیا جائیگا۔ ایڈیٹر "نیا دور"

"متروکاتِ نور اللغات پر ایک نظر"

ماہنامہ "نیا دور" اگست سنہ ۶۰ء میں حضرت اثر لکھنوی کا ایک مضمون بعنوانِ بالا شائع ہوا ہے جس میں بعض اُن الفاظ و محاورات کی صحت و عدم صحت سے بحث کی گئی ہے جن کو صاحب نور اللغات نے قابل ترک قرار دیا ہے۔ اسی مضمون میں ضمنی طور پر حضرت جلال لکھنوی اور ان کی کتاب سرمایۂ زبان اردو کا بھی تذکرہ ہے۔

میں حضرت اثر کی ادبی عظمت کا صرف قائل ہی نہیں ہوں بلکہ پورے خلوص کے ساتھ ان کی عزت کرتا ہوں۔ اس لئے زیر نظر مضمون "متروکاتِ نور اللغات پر ایک نظر" کے بعض مقامات سے کلی اختلاف کے بعد بھی خاموش رہنا مناسب خیال کرتا ہوں۔ مجھے اس مضمون کے صرف اس حصہ پر کچھ عرض کرنا ہے جس کا تعلق حضرت جلال لکھنوی اور ان کی کتاب سے ہے۔ وہ بھی بایں خیال کہ اس غلط فہمی کو نہ پھیلنے دیا جائے جس کے پھیلنے کا قرینہ حضرت اثر کی عبارت سے یقینی ہے۔ حضرت اثر فرماتے ہیں کہ حضرت جلال نے سرمایۂ زبان اردو میں ایک اور اُپج کی ہے۔ یعنی یہ کہ

"پو۔ بالفتح سحر اور باد سحر کو کہتے ہیں۔ بحر مرحوم

تنکے چنا باغ سے عقلا میں دیوانوں کی طرح
پَوَن تھی بادِ خزاں مجکو جھپٹا ہو گیا

لیکن تحقیق مقام یہ ہے کہ یہ لفظ بفتحین ہے۔ بروزن چمن۔ چنانچہ میر تقی مغفور کہتے ہیں۔

رکھا کر ہاتھ دل پر آہ کرتے
نہیں رہتا چراغ ایسی پَوَن میں"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اثر صاحب لکھتے ہیں

" جلال صاحب کو علم نہیں تھا کہ پون بروزن کون جادو کو کہتے ہیں۔ اور بحر نے بھی اسی معنی میں استعمال کیا ہے نہ کہ بمعنی ہوا۔ ۔ ۔ وہ سمجھے کہ بحر نے بخلاف جمہور پَوَن بفتحین کو پَوْن بروزن کَوْن استعمال کیا ہے اور اعتراض وارد کر دیا۔ اسی کے ساتھ بحر کے تبحر علمی پر روشنی پڑتی ہے۔"

حضرت آثر کا اعتراضی نوٹ لفظ بہ لفظ نقل کرنے کے بعد مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ موصوف نے اعتراض کرنے کے جذبے میں اپنی ادبی ذمہ داریوں کو بڑی حد تک نظر انداز کیا ہے۔ ان کا یہ فرمانا کہ جلال صاحب کو علم نہیں تھا کہ پون بروزن کون "جادو" کو کہتے ہیں اور بحر کا شعر بھی اسی معنی میں ہے درست نہیں کیونکہ جلال صاحب نے پون بالفتح یعنی بروزن کون کی شہرت کا پہلے ہی ذکر کیا ہے۔ چونکہ ان کے نزدیک یہ شہرت معتبر نہیں تھی اس وجہ سے اس لفظ کی چھان بین کر کے اپنے تحقیقی اور فیصلہ کن نوٹ میں پَوَن بروزن چمن کو محقق قرار دیا اور میر کی سند کے ساتھ۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ لفظ اصلاً سنسکرت کا ہے اور اس کا تلفظ چمن کے وزن پر ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہندی زبان کے اکثر شعرا نے ضرورت شعری کے پیش نظر پَوْن بروزن کَوْن بھی استعمال کیا ہے لیکن اس سے معنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا یعنی تغیر لفظ کے بعد بھی اسے "ہوا" ہی کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے نہ کہ "جادو" کے، جیسا کہ حضرت اثر فرماتے ہیں۔ اگر حضرت اثر کا یہ اصرار ہے کہ پَوْن بروزن کَوْن کے معنی "جادو" ہیں تو میں ان سے مودبانہ التجا کروں گا کہ موصوف بھی جلال صاحب کی طرح مع سند ثبوت پیش فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں جیسا کہ زیر نظر مضمون میں انھوں نے اسناد پیش کئے ہیں۔ بحر کے تبحر علمی کی آڑ ان کی بات نہیں منوا سکتی۔

میں اپنی بات کی وضاحت اور جلال صاحب کی تحقیق کی تائید مزید کے لئے ہندی زبان کے مشہور و مستند شاعر بھوشن کی نظم کا ایک بند جو بی۔اے کے نصاب میں داخل ہے نقل کر رہا ہوں! اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تغیر تلفظ یعنی پون بروزن کون کے بعد بھی اس کے معنی میں کوئی تبدیلی نہ پیدا ہو سکی۔

इन्द्र जिमि जम्भ पर, बाडव सुअम्भ पर,
रावन सदम्भ पर रघुकुल राज है।
पौन बारि बाह पर, शंभु रतिनाह पर,
ज्यो सहस्त्र बाहु पर राम द्विजराज है।

— نہال رضوی نبیرہ حضرت جلال لکھنوی

°—— ہندی (کھڑی بولی) کے شعرا پَوْن بروزن کَوْن استعمال نہیں کرتے۔ مقامی بولیوں مثلاً برج بھاشا اور اودھی میں البتہ یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بھوشن جن کا نہال صاحب نے حوالہ دیا ہے برج بھاشا کے شاعر ہیں اور ان کا "بند" نہال صاحب نے نقل کیا ہے، اس کی زبان بھی برج ہی کی زبان کہی جا سکتی ہے۔ جہاں تک لفظ پَوْن کے معنی کا تعلق ہے 'ہندی میں "ہوا" کے علاوہ اس کے دوسرے معنی بھی ہیں۔ یہاں ہندی کی دو مستند کتب لغات سے یہ معنی نقل کئے جاتے ہیں

" پَوْن = ہوا۔ ۔ بھوت پریت (مسلمانوں کے یہاں مستعمل) پَوْن چلانا یا مارنا = یعنی جادو ٹونا کرنا۔"

—— برہت ہندی کوش۔ گیان منڈل پرکاش — بنارس۔ ص ۸۴۸

" پَوْن = ہوا۔ ۔ پریت بھوت۔ محاورہ پَوْن چلانا یا مارنا = جادو کرنا۔ ٹونا چلانا۔ پَوْن ٹھانا یا (کسی پر) بھوت لگانا کسی کے پیچھے پریت لگانا۔

—— سنکشپت ہندی شبد ساگر۔ ناگری پرچارنی سبھا۔ کاشی۔ ص ۶۴۵

ہندی لغتوں میں پَوْن کے جو معنی دئے ہیں اس کی روشنی میں حضرت اثر لکھنوی کی تشریح دیکھی جائے۔ "نیا دور" (اکتوبر ۱۹۶۰ء) میں جناب اثر لکھنوی کے مضمون کے اسی ٹکڑے میں کتابت کی غلطی سے حضرت جلال کی عبارت ختم ہونے سے پہلے "اثر" چھپ گیا ہے جس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت اثر کی تشریح شروع ہو گئی ہے۔ اثر صاحب کی عبارت ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے "جلال صاحب کو علم نہیں تھا کہ ۔ " —— ایڈیٹر "نیا دور"

جلد ۱۵ نمبر ۹

اگرہائن ۱۸۸۲
دسمبر ۱۹۶۰ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
اپراجیتا پرساد سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

عنوانات

اکتوبر ۱۹۶۰ء سے میٹری نظام کے تحت ناپ تول کے نئے باٹ استعمال ہونے لگے ہیں۔ یہ نظام اکتوبر ۱۹۵۸ء سے شروع کیا گیا تھا اور ۱۹۶۶ء تک پرانے باٹ ختم ہو جائیں گے۔ میٹری نظام کا تخیل ہمارے ملک کے لیے نیا نہیں ہے۔ اس نظام کی بنیاد میٹر پر ہے اور میٹر میں اعشاریہ سے کام لیا جاتا ہے۔ اعشاریہ کی بنیاد دس کا عدد ہے۔ دس واحدے (یونٹ) ایک دہائی کے برابر، دس دہائیاں ایک سیکڑے کے برابر اور دس سیکڑے ایک ہزار کے برابر ہیں۔ ہمارے حساب میں ہر جگہ اس عدد ہی کی بنیادی حیثیت نظر آتی ہے۔

قدیم ہندوستان کے علم ریاضی میں اعشاریہ کو خصوصی اہمیت حاصل تھی اس لیے میٹری نظام ہندوستان کے لیے اجنبی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یوں بھی میٹر کے لفظ سے ہمارے عوام ناواقف نہیں ہیں کئی شعبوں میں میٹری نظام عرصے سے چل رہا ہے۔ مثلاً ڈاکٹروں کے نسخوں میں دواؤں کی مقدار میٹری ناپ تول کے حساب سے لکھی جاتی تھی۔ ملک میں ریلوے ٹرینوں کے سلسلے میں "میٹر گیج" کے الفاظ ہم سنتے چلے آئے ہیں۔ "میٹر گیج" پر چلنے والی ریلوں کی پٹریوں کے بیچ کا فاصلہ ایک میٹر کے برابر ہوتا ہے۔ ریڈیو کی لہریں بھی میٹر کی بنیاد پر متعین کی گئی ہیں۔ میٹر ہی کے حساب سے ہم اپنے ریڈیو کی سوئی گھماتے ہیں۔ کھیلوں میں دوڑیں بھی میٹر کے حساب سے ہوتی ہیں مثلاً ۱۰۰ میٹر والی دوڑ، ۲۰۰ میٹر والی دوڑ۔

میٹری نظام دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں رائج ہے۔ تمام ممالک کے درمیان اسی نظام کی بنیاد پر تجارت ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں جب کہ دنیا کے تمام ممالک کا ایک دوسرے سے تجارتی اور اقتصادی رابطہ قائم ہے، یہ ضروری ہے کہ ناپ تول وغیرہ کے سلسلے میں بھی ہر ملک ایک نظام کا پابند ہو۔ ایسا نہ ہونے سے ایک ملک کو دوسرے ملک سے لین دین میں دقتیں لاحق ہوں گی۔ اب کہ دنیا کے اکثر ملک میٹری نظام کو اپنا چکے ہیں اور تجارتی حیثیت سے ہندوستان کا سبھی ممالک سے تعلق رہتا ہے۔ اس کے لیے بھی مناسب تھا کہ وہ بھی اس نظام کو اختیار کرے۔ اس سے بین الاقوامی سطح پر تجارتی اور کاروباری معاملات میں اسے آسانی ہوگی۔ اس کے علاوہ میٹری نظام خود اندرونِ ملک کے لیے ضروری ہے۔ ہندوستان میں مختلف جگہوں پر ناپ تول کے مختلف باٹ رائج ہیں۔ مختلف جگہوں پر کیا ایک ہی شہر میں ناپ تول کے مختلف پیمانے ہیں۔ کہیں ایک من ۲۸۰ تولے کا ہوتا ہے اور کہیں ۸۲۰ تولے کا۔ کہیں ایک سیر ۸۰ تولے کا ہوتا ہے اور کہیں ۱۶۰ تولے کا۔ یہ فرق نہ صرف مضحکہ خیز ہے بلکہ اس سے ہمارے سادہ لوح کسانوں وغیرہ کو خرید و فروخت میں اکثر نقصان ہو جایا کرتا تھا۔ میٹری نظام کے ماتحت ناپ تول کے باٹ رائج ہو جانے سے سارے ملک میں یکساں حساب سے ناپ تول ہوا کرے گی اور ایک شخص دوسرے کو دھوکا نہ دے سکے گا۔

سادہ ورق کے صفحہ ۲ پر میٹری نظام کے تحت نئے ناپ تول کے باٹوں کی تشریح شائع کی جا رہی ہے۔ مختصراً یہ سمجھ لیجیے کہ وزن کے لیے کیلوگرام، طول کے لیے میٹر اور سمائی کے لیے لیٹر کے واحدے زیادہ تر استعمال ہوتے ہیں۔ ایک کیلوگرام ایک سیر ۶ تولے یا ۲ پونڈ ۳ اونس کے برابر ہوتا ہے۔ ایک میٹر ۳۹ ۳/۸ انچ کے برابر ہوتا ہے۔ ایک گیلن ۴.۵۵ لیٹر کے برابر ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ دس گنے کو ڈیکا، سو گنے کو ہیکٹا اور ہزار گنے کو کیلو کہتے ہیں یعنی ایک ڈیکا میٹر ۱۰ میٹر کے برابر ہے، ایک ہیکٹا میٹر ۱۰۰ میٹر کے برابر ہے اور ایک کیلومیٹر ایک ہزار میٹر کے برابر ہے۔ اسی طرح میٹری نظام میں دسویں، سویں اور ہزارویں حصے کے لیے ڈسی، سنٹی اور ملی کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ یعنی ۱۰ ڈسی میٹر برابر ہے ایک میٹر کے، ۱۰ سنٹی میٹر برابر ہے ایک ڈسی میٹر کے اور ۱۰ ملی میٹر برابر ہے ایک سنٹی میٹر کے۔

ایڈیٹر

دسمبر ۱۹۶۰

اکتوبر/ستمبر ۱۸۸۲

نسیمِ منزل

[illegible]

تبسم پھولوں کی نسیم سحری کی راہیں
میں ہوں اور منزلِ رنگیں نظری کی راہیں
شاید اب دور نہیں بے خبری کی راہیں
خواب آور ہیں یہ آشفتہ سری کی راہیں
چلتے چلتے بھی مری آنکھ جھپک جاتی ہے
ہر قدم پر مجھے منزل کی ہوا آتی ہے

بجھتی راتوں میں چمکتا ہوا تارا پاکر
بارو‌ئے اہل تمدن کا سہارا پاکر
بحرِ آفاق میں خوش ہوں میں کنارا پاکر
آج بھی "نرگسِ فردا" کا اشارا پاکر
دل میں امروز کے اک شمع سی جل جاتی ہے
ہر قدم پر مجھے منزل کی ہوا آتی ہے

کس نے میرے یہ بہاروں میں گریباں سیے
اہل دل پھرتے ہیں الزام خرد ساتھ لیے
نہ وہ اشکوں کے ستارے ہیں نہ زخموں کے دیے
زندگی آئی ہے فردوس کے در باز کیے
آج صحرا کی اداسی بھی غزل گاتی ہے
ہر قدم پر مجھے منزل کی ہوا آتی ہے

لے کے شعلے بھی جبیں پر نمِ شبنم گزرے
چارہ گر زخم پہ رکھتے ہوئے مرہم گزرے
نغمہ زن ملت و اقوام کے سنگم گزرے
میری نظروں سے بہت حسن کے عالم گزرے
وہ فسانہ ہوں جسے زندگی دہراتی ہے
ہر قدم پر مجھے منزل کی ہوا آتی ہے

سانس یوں چلتی ہے جس طرح کہ تلوار چلے
کس سلیقے سے یہاں زہر بھی ساغر میں ڈھلے
ٹوٹے مضراب، ساگ اٹھے سبو، گیت جلے
پھر بھی آرام سے ہوں شاخِ حوادث کے تلے
سختیِ راہ بھی تلوے مرے سہلاتی ہے
ہر قدم پر مجھے منزل کی ہوا آتی ہے

یہ مری شامِ وطن صبحِ بہاراں جیسے
ہو تخیل کسی شاعر کا پرافشاں جیسے
مد بھری آنکھوں میں پیمانے ہوں لرزاں جیسے
سایہ منزل کا ہو راہوں میں خراماں جیسے
زلف ماحول کی یوں شانوں پہ لہراتی ہے
ہر قدم پر مجھے منزل کی ہوا آتی ہے

ستمبر ۱۹۶۰ء

اگزہانیر ۱۸۸۲

کوئی بجلی نہ کہیں وادیٔ ایمن سے اٹھا
فتنۂ حسنِ نظر اس رخِ روشن سے اٹھا
پھر کوئی سروِ طرب جھوم کے گلشن سے اٹھا
ایک جھونکا سا ہوا کا مرے دامن سے اٹھا
راہ کی گرد بھی کرن بن کے اڑی جاتی ہے
ہر قدم پر مجھے منزل کی ہوا آتی ہے

پھر وہی "شہرِ غزل" ہے وہی تنہائی کی رت
پھر وہی میں ہوں وہی میرے خیالات کی رت
آ گئی راس مجھے تلخیٔ جذبات کی رت
میں نے ہنس ہنس کے گزاری غمِ آفات کی رت
کوئی موسم ہو، کلی دل کی چٹک جاتی ہے
ہر قدم پر مجھے منزل کی ہوا آتی ہے

سینۂ موج پہ روشن ہیں وہ ساحل کے چراغ
جستجو میں ہیں نئے موڑ کی، منزل کے چراغ
جھلملا اٹھے ہیں، اندیشۂ باطل کے چراغ
جیسے ہوں زخم مرے سینے کے محفل کے چراغ
سانس لیتا ہوں تو لَو شمع کی تھراتی ہے
ہر قدم پر مجھے منزل کی ہوا آتی ہے

کشتِ جمہور کو آواز دے اے ابرِ کرم
رقصِ دوراں! مری جانب بھی ذرا چار قدم
میں نے صحرا میں تراشے ہیں تمدن کے حرم
یوں چمک اٹھی ہے پیشانیٔ تقدیرِ امم
رات گزری نہیں اور صبح ہوئی جاتی ہے
ہر قدم پر مجھے منزل کی ہوا آتی ہے

چونکنا میں نے سکھایا ہے گراں خوابی کو
میں نے بخشا ہے سکوں وقت کی بیتابی کو
کیا کہوں کشتِ سوادِ تری شادابی کو
لے کے ماحول کے ہر شعلۂ عنابی کو
برق بھی پھول کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
ہر قدم پر مجھے منزل کی ہوا آتی ہے

کتنے ساحل ابھر آئے مرے طوفاں کے قریب
مجھ کو تریاق ملے زہرِ فراواں کے قریب
آ گئی خود ہی بہار اپنے گلستاں کے قریب
جب سے دیکھا ہے مجھے منزلِ جاناں کے قریب
گمرہی سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے
ہر قدم پر مجھے منزل کی ہوا آتی ہے

✡

فلسفیانہ شاعری

ہنس راج

فلسفے کو عموماً دماغ، اور شاعری کو دل کی شے سمجھا جاتا ہے۔ بعض ہندوستانی مفکرین کا قول ہے کہ فلسفے کو محض دماغ کی شے گردانا ایک وہم ہے جس کی ابتدا یورپ سے ہوئی ہے۔ اُن کی دانست میں فلسفہ دماغ، دل اور فعل یا دوسرے الفاظ میں علم، جذبہ، اور عمل کی مرکب جستجو کا موضوع ہے۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے اپنی تصنیفوں میں فلسفے کا یہی تصور پیش کیا ہے مگر سی، ای، ایم، جوڈ (C E.M Joad) نے اپنی ایک کتاب (A critique of Logical Positivism) میں اس خیال کی تردید کی ہے کہ یورپ فلسفے کو محض دماغ کا موضوع سمجھتا ہے۔ ان کی دانست میں یورپی روایات کے بموجب بھی فلسفہ علم، جذبہ اور عمل کی مرکب جستجو کا موضوع ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کا نظریہ ان دونوں سے جداگانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ فلسفے کو اپنا دائرہ عقلی تقاضوں تک ہی محدود کر لینا چاہیے کیونکہ فطرتِ انسانی کے اور بھی پہلو ہیں، جذبہ اور عمل۔ ٹھیک ہے۔ مگر فلسفہ عقلی، جذباتی اور عملی سارے تجربے کو منظم کرنے کی عقلی سعی ہے۔ فلسفے میں ہمیں استغراق نہیں ہوتا اور نہ ہم گاتے ہیں، بلکہ سوچتے ہیں۔ عقلیت ہی فلسفے کو فن اور دین سے جدا کرتی ہے۔ فلسفہ جذبہ و وجدان سے بحث کرتا ہے لیکن اُسے اُن پر انحصار نہ کر لینا چاہیے۔"[1]

---

1 It is urged that philosophy has no business to confine its attention to the intellectual demands as there are other aspects of human nature, feeling and will Certainly, but philosophy is an intellectual attempt to organize the whole of experience, intellectual, emotional and volitional ...In philosophy we do not sing or muse but think. It is its intellectuality that distinguishes philosophy from an art and religion.. While philosophy deals with feeling and immediate experience, it ought not to trust itself to them. Radhakrishnan, The Reign of Religion in Contemporary Philosophy, pp 15-16.

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ابھی اسی دہ سالہ میں لائبریری آف لیونگ فلاسفرس کی شائع کردہ کتاب "The philosophy of Radhakrishnan" میں شامل اپنے مضمون بعنوان Replies to critics میں فلسفے کی نسبت اپنے اسی پرانے خیال کی تلقین کی ہے۔

یوں تو فلسفے کا ہر بڑا مدرسہ فلسفے کی ایک نئی تعریف، ایک نیا تصور لے کر وارد ہوتا ہے، حتیٰ کہ اس کے انواع و اقسام کی تعریفوں میں کبھی کبھی ہمیں آسمان کا فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ مگر اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ فلسفیانہ فکر، فکر ہونے کے باعث خصوصاً ایک عقلی حقیقت ہے۔

آئیے اب اسی طرح، اجمالاً، شاعری کی فطرت کا بھی تعین کر لیں۔ ایک طرح سے نظم و نثر کے جاموں میں ملبوس سارا ادب اصلاً شاعری ہی ہے۔ ڈی کوینسے (De Quincey) ادب (لٹریچر) کے دو اصناف بیان کرتا ہے وہ ان میں سے ایک صنف کو لٹریچر آف پاور (Literature of Power) اور دوسری کو لٹریچر آف نالج (Literature of Knowledge) قرار دیتا ہے۔ ڈاکٹر سید اسد سہانے اقبال سے متعلق اپنی انگریزی کی کتاب میں ان کے لیے ایک نئی اور واضح تر اصطلاح، علی الترتیب لٹریچر آف انسپریشن (Literature of Inspiration) اور لٹریچر آف انفارمیشن Literature of Information وضع کی ہے۔ اوّل الذکر میں شعر و شاعری و نیز افسانہ، ناول، ڈراما، اسکیچ وغیرہ جنھیں ہم مجموعی طور پر افسانوی ادب (Fiction) کہہ سکتے ہیں، کا شمول ہے اور آخر الذکر میں تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، عمرانیات وغیرہ علمی مضامین کا۔ ادبیات سنسکرت میں بھی اس قسم کی تمیز پائی جاتی ہے۔ اس کی اصطلاح میں لٹریچر آف پاور کا مترادف کاویہ (काव्य) ہے اور لٹریچر آف نالج کا شاستر [۵۲] (शास्त्र)۔ اُردو میں، موٹے طور پر آخر الذکر کو علم اور اوّل الذکر کو ادب کہا جاتا ہے۔ "علم و ادب" اردو کا ایک عام فقرہ ہے۔ مگر دقت یہ ہے کہ "ادب" انگریزی کی اصطلاح "لٹریچر" کے مانند اتنے وسیع معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے کہ علم بھی اس کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہم اس مضمون میں علم اور ادب کے بجائے "علمی ادب" و "ادب لطیف" کے الفاظ استعمال کریں گے۔

ایک وقت تھا کہ سارا ادب لطیف عموماً نظم میں ہی ملتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ نظم کے علاوہ نثر میں بھی ادب لطیف سامنے آنے لگا۔ چنانچہ آج جو ناول ہے کل وہ نظم، رزمیہ (Epic) تھا۔[۵۳] کالرج نے کیا عمدہ بات کہی ہے:

"شعر کی ضد نثر نہیں بلکہ سائنس ہے، نثر کی ضد شعر نہیں بلکہ نظم ہے۔"[۵۴]

لہٰذا فلسفے کو علمی ادب اور شاعری کو ادب لطیف کے ذیل میں سمجھنا چاہیے۔

اس بحث کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ فلسفیانہ شاعری ہے کیا؟ دراصل فلسفیانہ حقائق و مسائل کے جذباتی پہلو کو سامنے لانے والی، یا ان کے جذباتی ادراک (emotional apprehension) کی ترجمانی کرنے والی شاعری ہی فلسفیانہ شاعری ہے۔ علامہ اقبال نے خوب کہا ہے کہ اگر حق میں سوز نہ ہو تو اس کو حکمت سمجھنا چاہیے اور جب یہی حق دل سے سوز حاصل کر لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے ؎

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است
شعر می گردد چوں سوز از دل گرفت

بعض حضرات فلسفے کے جذباتی پہلو کے قائل نہیں۔ وہ فلسفہ اور شاعری کے مابین کسی قسم کا رشتہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی نگاہ میں فلسفیانہ عقلیت اور شعری جذباتیت کا امتزاج فلسفہ اور شاعری دونوں کے لیے مہلک ہے۔ اس سے دونوں کا ایک ساتھ خون ہو جاتا ہے۔ اس خیال کی تصدیق کے لیے روم کے لیوکریشیس (Lucretius) اور یونان کے ایمپیڈکلیس (Empedocles) کی ناکامیاب فلسفیانہ شاعری کا حوالہ دیا جاتا ہے لیکن یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ اگر کہسار، سمندر، شفق، ہائیڈروجن بم جیسے مادی اور عشق، غم ہجراں، غم دوراں جیسے ذہنی حقائق کا پہلو ہو سکتا ہے تو فلسفیانہ حقائق و مسائل کو جذباتی پہلو سے عاری کیوں تصور کیا جائے۔ ہندی کے ایک ممتاز شاعر نے تو "سیاہی کی بوند" پر بھی شعر گوئی کی ہے۔

وجود و عدم کا مسئلہ فلسفہ کا ایک قدیم مسئلہ ہے۔ ہستی کا یہ سارا پھیلاؤ

---

۵۲ शास्त्र काव्य चेती वाङ मय विद्या

۵۳ غالباً اوّل اوّل یہ بات رالف فاکس نے اپنی کتاب (The novel and the people) میں کہی تھی۔

۵۴ The opposite of poetry is not prose, but science; the opposite of prose is not poetry, but verse.

کیوں، کیسے، کہاں سے ہو گیا؟ اس کے قبل تو نیستی کا بحرِ اعظم موج زن ہو گا؟
رگ وید کے ناسدیہ سوکت کا مصنف ایک اچھا فلسفی شاعر معلوم ہوتا ہے۔
وہ عدم کو وجود کا بھائی بند بتا کر اس مسئلے کا جذباتی حل پیش کرتا ہے۔ لیکن
آگے چل کر ہستی کو دیوتاؤں و نیز ذاتِ محیط و بصیر کے لیے مسئلہ لاینحل ہونے کا
شک ظاہر کرتے ہوئے خاموش ہو جاتا ہے[۵]۔ مسئلہ وجود و عدم کو لے کر اقبال
نے نہایت عمدہ اشعار کہے ہیں مثلاً

چہ لذت یا رب اندر ہست و بود است — دل ہر ذرہ در جوشِ نمود است
شگافد شاخ را چوں غنچۂ گل — تبسم ریز از ذوقِ وجود است

شنیدم در ازل پروانہ می گفت — دمِ از زندگی تاب و تبم بخش
پریشاں کن سحر خاکسترم را — ولیکن سوز و سازِ یک شبم بخش

(یا رب! عالمِ وجود میں نہ جانے کون سی لذت حاصل ہوتی ہے کہ
ذرّے ذرّے کا دل نمود کے لیے بے تاب ہے۔ جب گلاب کی کلی
شاخ چھوڑ کر نکلتی ہے تو وہ وجود کی خوشی میں مسکان بکھیرتی ہے۔ سُنا
ہے کہ روزِ ازل پروانے نے خالقِ باری سے کہا تھا "مجھے ایک لمحے
کے لیے زندگی کی چمک دمک عطا کر۔ چاہے صبح ہوتے ہی میری خاک
بکھیر دے، لیکن ایک رات کا سوز و ساز ضرور عطا کر۔")

بہر حال کامیاب فلسفیانہ شاعری کا ایک نہایت حسین نمونہ دیکھنا ہو تو اقبال
کی نظم "میلادِ آدم" دیکھیے [۵]

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد — حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور — خودگرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل — حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات — چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

(میلادِ آدم کی خبر پاتے ہی عشق چیخ اٹھا کہ ارے! یہ تو ایک خونیں
جگر پیدا ہو گیا ہے۔ حُسن کانپ گیا کہ اب تو ایک صاحبِ نظر پیدا ہو گیا
فطرت بھی پریشان ہو گئی کہ اب تو جہانِ مجبور کی خاک سے
خودگر، خود شکن اور خودنگر پیدا ہو گیا۔ آسماں سے شبستانِ ازل تک یہ
خبر عام ہو گئی کہ پردے (اسرار) والو! خبردار! ایک پردہ فاش
کرنے والا پیدا ہو گیا ہے۔ حیات کی آغوش میں خود سے بے خبر آرزو کے
آنکھ کھولتے ہی ایک دوسری دنیا نمودار ہو گئی۔ زندگی نے کہا
"میں ساری عمر خاک میں تڑپتی رہی، تب کہیں اس گنبدِ دیرینہ سے
دروازہ نمودار ہوا۔")

اس نظم کا مطالعہ کرنے کے بعد بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ فلسفے کا جذباتی ادراک
ناممکن ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ علمی ادب اور ادبِ لطیف کے فرق کو دور تک نہیں لے
جایا جا سکتا کیونکہ زمانہ افسانوی ادب زیادہ سے زیادہ علمی بنتا جا رہا ہے۔
صفِ اوّل کے کئی ناول تو علی الخصوص قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے
کی غرض سے ہی مرتب معلوم ہوتے ہیں، مثلاً پنڈت رتن ناتھ سرشار کا
فسانۂ آزاد، رومیاں رولاں (Romain Rolland) کے
ژیاں کرستاف (Jean Christophe) و نیز آندرے ژید
(Andre Gide) اور ڈی ایچ لارنس (D H. Lawrence)
کے ناولوں کی بابت بھی یہ فقرہ ایک حد تک صحیح ہے۔ دراصل جدید افسانوی ادب
کو ہم نہ تو خالص ادبِ لطیف کے ذیل میں رکھ سکتے ہیں اور نہ خالص علمی ادب کے۔
اس میں تعقل و اظہارِ جذبات دونوں ہی کے لیے خاصی جگہ ہے۔ اس کا دائرہ
اتنا وسیع ہو چلا ہے کہ اس میں عمرانیات، نفسیات، سیاسیات، تاریخ، فلسفہ
سب کچھ مل جائے گا۔ ہمارے علم میں ادبِ لطیف کی اس صنف یعنی افسانوی ادب
یا ناول میں ان موضوعات کی شمولیت پر کسی کو اعتراض نہیں ہوا ہے بلکہ ناول

---

[۵] सतो बन्धुमसति निरविन्दन् हृदि प्रतीष्या कवयो मनीषा ॥
को अद्धा वेद क इह प्रवोचत कुत आजाता कुत इयं विसृष्टि: ।
अर्वाग्देवा अस्य विसर्जनेन अथा को वेद यत आबभूव ॥
इयं विसृष्टिर्यत आबभूव यदि वा दधे यदि वा न ।
यो अस्याध्यक्ष: परमे व्योमन् सो अङ्ग वेद यदि वा न वेद ।

کا فلسفیانہ گہرائیوں میں اُتر جانا قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے لیکن یہ عجب بات ہے کہ ادبِ لطیف کی دوسری صنف یعنی شاعری کے ساتھ فلسفے کی رفاقت پر اکثر بھویں تن جاتی ہیں۔ آخر یہ امتیاز کیوں؟ اگر افسانوی ادب میں فلسفہ چل سکتا ہے تو شاعری میں کیوں نہیں چل سکتا؟ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے اب "علمی ادب" اور "ادبِ لطیف" کی حدِ فاصل کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ شاعری کے دیار میں اُسے اپنی پرانی جگہ۔ کہنے کی سعی، سعیٔ لاحاصل ہے۔ اب تو شاعری بھی افسانوی ادب کی ترقی پذیر علمیت کی تقلید کر رہی ہے۔ علمی ادب سے اچھی طرح واقف ہوئے بغیر ٹی ایس ایلیٹ (T S Eliot) کی مشہور و معروف نظم "ویسٹ لینڈ" کی کوئی تشریح و تعبیر کر سکتا ہے؟

اگر ہم کسی کے سراپا حُسن سے مخمور ہو کر عشقیہ شعر کہہ سکتے ہیں تو حیات و کائنات کے رموز سے متاثر ہو کر بھی ذہن میں جذبات کی جولانی پیدا ہو سکتی ہے، اور یہی جذبات فلسفیانہ شعر کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فلسفیانہ شاعری وہی ہے جس میں جذبات کا سوز پایا جاتا ہو۔ یہ خیال غلط ہے کہ فلسفے کے ہاتھوں شاعری بہرحال قطعاً خشک اور بے لطف ہو جاتی ہے۔ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ مشہور ولایتی نقاد جون بینٹ (Joan Bennett) کے قول کے مطابق "نظم بذاتِ خود شے کا نہیں بلکہ شاعر کے اس سے پیدا ہونے والے تاثرات کا اظہار کرتی ہے۔[۵۶]"

یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ تخیل کا جذباتی ادراک ہی فلسفیانہ شاعری کو جنم دے سکتا ہے۔ فلسفیانہ خیالات کو محض موزوں اشعار کا جامہ پہنا دینا کافی نہیں۔ وہی شاعر فلسفیانہ اشعار کا شاعر کہے جانے کا مستحق ہے جس میں فلسفیانہ حقائق و مسائل کے جذباتی ادراک کی صلاحیت ہو اور جو ان سے محض صورت آشنا ہی نہ ہو۔ نظامی کے دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جنبش نخستیں کہ جنبشے بود فرد ۔۔۔ جنبید چنداں کہ جنبش دو کرد

چوں آں ہر دو جنبش بہم یافتاد ۔۔۔ ز ہر جنبشے جنبشے نو بزاد

(ازل میں صرف ایک حرکت تھی۔ اس سے دو حرکتیں پیدا ہوئیں اور ان دونوں حرکتوں کے امتزاج سے حرکاتِ گوناگوں پیدا ہو گئیں۔)

یہ ایک فلسفیانہ نظم کی مثال ضرور ہے، مگر فلسفیانہ شاعری کی نہیں۔

ہاں! فلسفیانہ اشعار کے شاعر کے لیے فلسفیانہ بصیرت ہی کی شرط ہے، کسی نئے فلسفے کے اختراع کی نہیں۔ دانتے (Dante) جیسے شاعر کا فلسفہ اس کی اختراع نہیں تھا۔ البتہ اگر فلسفہ شاعر کا طبع زاد ہو تو کہنا ہی کیا۔ ہربرٹ ریڈ (Herbert Read) کا ایک معنی خیز جملہ ہے:

"تخیل و جذبے کے گداز کا امکان اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب تخیل میں ذاتی اختراع کی پوری تازگی رہتی ہے۔[۵۷]"

ایسی صورت میں شاعری کی لطافت بدستور قائم رہتی ہے اور فلسفے کی عقلیت اس کا پس منظر بن جاتی ہے۔ لہٰذا فلسفیانہ شاعری کے متعلق یہ سوچنا کہ وہ لازمی طور پر خشک علمی ادب بن کر رہ جائے گی، صحیح نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں ایک بات اور قابلِ غور ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ صرف روایتی فلسفیانہ مضامین پر ہی فلسفیانہ شعر کہے جا سکتے ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو فلسفہ چند مخصوص مسائل کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ وہ دراصل اشیاء کو ایک خاص عمیق نظر سے دیکھنے کے انداز کا نام ہے۔ شبلی نعمانی کا قول ہے:

"عالم میں جو کچھ موجود ہے، بلکہ کاروبارِ زندگی کی روزمرہ باتیں بھی اگر نگاہِ حقیقت سے دیکھی جائیں تو سب فلسفہ ہیں ؎

ہر کس بہ تماشائے رازیست دگر ۔۔۔ ایں ہا ہمہ رازیست کہ مفہومِ عوام است[۵۸]"

اسی خیال کے ماتحت ہم نے اس مضمون میں "فلسفیانہ شاعری" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، بجائے "مابعد الطبیعاتی شاعری" (Metaphysical

[۵۶] "A poem expresses not a thing in itself but the poet's feeling of it."
Joan Bennett, Four Metaphysical Poets.

[۵۷] "... the fusion of thought and emotion is surely more apt to be produced when thought has all the freshness of a personal discovery.
Herbert Read, Collected Essays in Literary Criticism.

[۵۸] شبلی نعمانی، شعر العجم، حصۂ پنجم، صفحہ ۱۶۱

Poetry) کے جو انگریزی شعرا ڈان (Donne)، بلیک (Blake) وغیرہ کے کلام کے لیے مستعمل ہے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو ذوق کے مندرجۂ ذیل اشعار بھی خالص فلسفیانہ شاعری کا نمونہ مانے جا سکتے ہیں:

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے
اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
اے شمع! تیری عمر طبیعی ہے ایک شب — رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

اس سلسلے میں مولانا شبلی نے ایک در غور طلب بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"فلسفے کے وہ مسائل جو خشک اور دقت طلب ہیں شاعری کی حد سے باہر ہیں۔ اگر ان کو کوئی شخص موزوں کرے تو وہ نظم ہوگی شعر نہ ہوگا۔"[۹]

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ فلسفہ کے بیشتر مسائل، زندگی سے نہ تو بلا واسطہ کوئی تعلق رکھتے ہیں اور نہ بالواسطہ۔ یہ اصطلاحی قسم کے مسائل ہیں جو نہایت ہی خشک اور بے کیف طریقے سے حل کیے جاتے ہیں۔ اُن میں ریاضی اور سائنس سے ماخوذ اتنی پیچیدگیاں رکھی جاتی ہیں کہ اُن میں جذبہ انگیزی کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ روایتی فلسفہ خواہ مشرق کا ہو خواہ مغرب کا "فلسفہ برائے زندگی" کے اصول پر مبنی ہے جب کہ فلسفۂ حاضرہ، جس میں فلسفۂ ثبوتیت منطقی (Logical Positivism) اور اس سے متاثر نظریوں کا بول بالا ہے، "فلسفہ برائے فلسفہ" کے اصول میں عقیدہ رکھتا ہے۔ حیات و کائنات کے قدیم مسائل اس کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتے۔ وہ انھیں فلسفے کے دائرے سے خارج کر چکا ہے۔ اس کے موجب الفاظ کے جنجال میں اُلجھے ہوئے خیالات و معانی کی تصریح و توضیح کے علاوہ فلسفہ اور کوئی منصب ادا نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ ایسا فلسفہ شاعری کا موضوع نہیں ہو سکتا۔ شاعری کے لیے تو وہی فلسفہ موزوں ہے جو زندگی سے براہ راست تعلق رکھتا ہو۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ شاعری کا موضوع ہمیشہ منفرد، مخصوص یا خاص (Individual or Particular) ہوا کرتا ہے اور فلسفے کا عام (General)۔ اوّل الذکر جزئیات (Particulars) سے سروکار رکھتا ہے جب کہ آخر الذکر کلیات (Universals) سے بحث کرتا ہے۔ ان کی نظر میں شاعری اور فلسفے کی اشتراکیت و آمیزش کا خیال زمین و آسمان کی اشتراکیت و آمیزش کے خیال کے مانند لغو ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ 'خاص' شاعری کا محض ایک وسیلہ ہے، نہ کہ مقصود۔ مقصود تو شاعری کا بھی 'عام' ہی ہوا کرتا ہے۔ شاعر ہیملٹ (Hamlet) میں نہیں بلکہ اُس حقیقت میں دلچسپی رکھتا ہے جس کا ہیملٹ ایک نمائندہ ہے۔ ہیملٹ تو عمومی انسانیت تک پہنچنے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ فلسفیانہ شاعری بھی 'خاص' کے واسطے سے ہی عمل پیرا ہوتی ہے۔ ابوسعید ابوالخیر کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

روزے زپئے گلابی گردیدم — پژمردہ عذار گل در آتش دیدم
گفتم کہ چہ کردہ کہ می سوزندت — گفتا کہ دریں باغ دمے خندیدم

(ایک روز میں نے گلاب کے رخسار آگ میں جھلستا ہوا دیکھا۔ میں نے پوچھا کہ تو نے کیا کیا ہے کہ لوگ تجھے جلا رہے ہیں۔ وہ بولا کہ میں اس باغ میں دم بھر کے لیے ہنس پڑا تھا)

یہاں گلاب ایک 'خاص' یا 'منفرد' ہے جس کے واسطے سے فلسفیانہ شاعر کو اس 'عام' کا جذباتی ادراک ہوا ہے کہ دنیاوی مسرّت کا انجام غم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فلسفیانہ شاعری عام فہم نہیں ہوتی۔ اس کی ابلاغ پذیری (Communicability) فلسفیانہ مذاق و تربیت والے ناظرین و سامعین تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ ٹالسٹائی نے اپنی What is Art نامی کتاب میں عمدہ آرٹ اور اس کی عام فہم ہونے کی قابلیت کو لازم و ملزوم قرار دے کر بڑی غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ کبھی کبھی خاص قسم کی شاعری کا حظ اٹھانے کے لیے خاص تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بات کوئی فلسفیانہ شاعری تک ہی محدود نہیں ہے۔ ہربرٹ ریڈ کا کہنا ہے:-

"بے شک عامی (The profane) فلسفیانہ شاعری سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے لیکن غیر فلسفیانہ شاعری کے بھی عامی (یا اناڑی) ہوتے ہیں۔ جو شخص کبھی پہاڑ کی چوٹی کے منظر سے مستفیض نہیں ہوا ہے وہ اس شاعری سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا جس کا موضوع

---

[۹] شبلی نعمانی، شعرالعجم، حصہ پنجم، صفحہ ۱۹۱

بالیسٹ ہو[۱۱۵]"

.. سب سے لفظوں میں، درحقیقت عمدہ شاعری کے لیے عام فہم ہونے کا معیار اب پرانا ہو چکا ہے۔

مشہور امریکی مفکر جان ڈیوی (John Dewey) نے اپنی کم شہرت یافتہ مگر نہایت ہی خیال انگیز کتاب Art as experience میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ چونکہ فلسفیانہ اشعار کہنے والے شاعر مختلف مدارس فلسفہ کے مقلد یا حامی رہے ہیں اس لیے اگر ہم ان میں سے کسی ایک مدرسۂ خیال سے ہمدردی رکھتے ہیں تو ہمیں دیگر مدارس فکر بے معنی معلوم ہوں گے اور اسی طرح ان کی بنیاد پر مرتب شاعری بھی ہمارے لیے بے لطف ہو جائے گی، کیونکہ ہر مدرسۂ فلسفہ دیگر مدارس فلسفہ کا مخالف ہی ہوتا ہے۔ مگر ڈیوی بھول جاتا ہے کہ فلسفیانہ شاعری کے اساسی فلسفے میں ناظرین کا اعتقاد بہرحال ضروری نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جیسا اوپر عرض کیا جا چکا ہے، شاعری شے کو نہیں بلکہ اس سے متعلق جذبات و تاثرات کو پیش کی جاتی ہے۔ شاعر کو صرف یہی ملحوظ رکھنا کافی ہے کہ اس کے ناظرین قوتِ متخیلہ کا استعمال کر کے اپنے میں وہ کیفیت پیدا کر لیں جس سے شاعری کی تخلیق کرنے والے جذبات کی تحریک ان میں بھی پیدا ہو جائے۔ شے کے متعلق تو نا اعتقادی کے تعطل بارضا (willing Suspension of disbelief) کی حاجت ہر نوع کی شاعری میں ہوتی ہے۔ سور ساگر کے کرشن کی حقیقت میں شک کی کافی گنجائش ہے لیکن قدر شناس و اہل ذوق و بصیرت کو سور داس کا کلام محظوظ و مسرور کر کے ہی چھوڑے گا۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی ایسا خفیف الاعتقاد واقع ہوگا جو ابر کی پیام بری جیسی چیز کو حقیقت مانتا ہو مگر اس سے کالی داس کی مشہور تصنیف میگھ دوت کی شعریت میں کوئی کمی نہیں ہوتی اسی طرح فلسفیانہ اشعار کے شاعر کے فلسفے میں ناظرین کی بے اعتقادی بھی اس کے کلام سے لطف اندوز ہونے میں مخل نہیں ہو سکتی۔ جرارڈ مینلے ہاپکنس (Gerard Manley Hopkins) نے عیسائیت کے اصولِ رستخیز (Resurrection) پر مبنی ایک دینی و فلسفیانہ نظم The Caged Skylark لکھی ہے جس میں جسم کو خانۂ استخواں (Bone house) قفسِ بے لطف (Dull Cage) خانۂ قبیح (Mean house) بتاتے ہوئے ہستی کو مشقتِ محض (Drudgery) کہا گیا ہے پھر جسم و روح کی یگانگت و یک جہتی بیاں کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "بعض اوقات دونوں مل کر سچے گیت نغمے سناتے ہیں[۱۱۶]" ایسا کون ہوگا جس پر جسم کے متعلق اس قسم کے جذبات کبھی کبھی نہ طاری ہوئے ہوں؟ شاعر کو بس اتنے ہی سے سروکار ہے شاعری کی ابلاغ پذیری جذبات کی اسی عمومیت پر منحصر و مبنی ہوتی ہے متذکرہ بالا نظم کے ناظرین کو اصولِ رستخیز کی تصدیق یا تکذیب سے کوئی واسطہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

شعور انسانی کے تین ابعاد، اطراف یا جوانب (Dimensions) بتائے جاتے ہیں جنھیں ہم اپنے الفاظ میں یوں ادا کر سکتے ہیں ۔

(۱) انفرادی (Individual) نفسی، داخلی یا موضوعی (Subjective) یا نفسیاتی (Psychological)

(۲) اجتماعی یا سماجی (Social) خارجی یا معروضی (objective) یا اجتماعیاتی یا عمرانیاتی (Sociological) اور

(۳) کلیاتی یا کائناتی (Cosmic) یا دینی و فلسفیانہ (Religio-philosophical) فلسفیانہ اشعار کا شاعر وہی ہوا جس کی شاعری اس تیسری جانب سے بالخصوص تعلق رکھتی ہے ظاہر ہے کہ اس نوع کی شاعری سے وہی لطف اندوز ہو سکتا ہے جس

---

۱۱۵ Of course metaphysical poetry cannot be enjoyed by the profane. But non-metaphysical poetry has its profanes also. One who has never been blessed with the sight of, say, a mountain peak cannot enjoy a poem which has the Himalayas as its theme. Herbert Read, Collected Essays in Literary Criticism.

۱۱۶ Both sing sometimes the sweetest spells.

کی شخصیت (Personality) کی تیسری جانب بیدار ہو۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلسفے کے بغیر معیاری شاعری ممکن ہی نہیں ہے۔ میگھ دوت جیسی بلند پایہ نظم میں فلسفے کا نام و نشان تک نہیں۔ مومن کی غزلیات ہی میں کون سا فلسفہ ہے؟ لیکن یہاں ایک بات کہہ دینا ضروری ہے میرے نزدیک معیاری شاعری دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک قسم ہے عمدہ شاعری (Good Poetry) اور دوسری قسم ہے، عظیم شاعری (Great Poetry) میرے خیال میں جس کسی شاعری میں ہمیں محو و مستغرق کر دینے کی صلاحیت پائی جائے، جس میں ہم جاذبیت و کشش محسوس کریں، معیاری شاعری ہے۔ جس معیاری شاعری میں ہم جزوی طور پر محو و مستغرق ہو پائیں، وہ عمدہ شاعری ہے اور جس میں ہم کلیتاً محو و مستغرق ہو جائیں وہ عظیم شاعری ہے ابھی میں نے شعورِ انسانی کے ابعادِ ثلاثہ (تین اطراف یا جوانب) کا ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے شعور کے تینوں جوانب کو، یا اُسے کلیتاً، متاثر کرنے والی شاعری عظیم اور باقی عمدہ شاعری ہے۔ عمومی طور پر، یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ تلسی داس کی شاعری سور داس کی شاعری سے اگر حُسن میں پیچھے ہے تو عظمت میں آگے بڑھ جاتی ہے۔ عظمت میں اقبال کے داغ اور بہت سارے دیگر شعرا پر فائق ہونے کا بھی یہی راز ہے۔ اس لحاظ سے اگرچہ فلسفے سے عاری شاعری بھی عمدہ حسین ہو سکتی ہے، تاہم اس میں عظمت پیدا کرنے کے لیے فلسفے کو کم از کم اس کا پس منظر بنانا لازم سا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ شاعر اپنے کلام میں معانی کی جتنی ہی زیادہ سطوح (Levels of Significance) کا اُبھار دکھا سکے گا وہ ناظرین کو اتنے ہی زیادہ جوانب سے متاثر کرنے میں کامیاب ہوگا۔ سطوح کا تنوع اُن میں حظ کے تنوع کی صورت میں منتج ہوگا، اور ظاہر ہے کہ اس تنوعِ حظ کے باعث اس میں ناظرین کا کلیتاً استغراق آسان ہو جائے گا اور یہ واقعہ ہے کہ فلسفے کے تعاون کے بغیر اس تنوع کی تکمیل ناممکن سی ہے۔

سنسکرت ادبیات میں بتایا گیا ہے کہ دل کش معانی سے پُر نظامِ الفاظ ہی شاعری ہے[12]۔ اور دل کشی کی تعریف کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ جس چیز میں ہمیشہ جدت کا احساس ہو اُسی کا نام دل کشی ہے[13]۔ معانی کی سطوح کا تنوع شاعری میں اس قسم کی دل کشی پیدا کرنے کے لیے اشد ضروری ہے۔ تنوع کے بغیر شاعر کا کلام دل برداشتگی پیدا کر دیتا ہے اور اس سے طبیعت اُچاٹ ہو جاتی ہے لیکن ہمارے شعور کے مختلف پہلوؤں کو متاثر کر سکنے کی صلاحیت رکھنے والا کلام ہمیں متعدد ہی کیفیتوں میں لطف اندوز کر سکتا ہے۔ فلسفہ اس تنوع کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ لیکن وہی فلسفہ شاعری کو دل چسپ بنا سکتا ہے جو زندگی سے ماخوذ ہو۔ پیٹے پٹائے، روایتی تخیل کو منظوم کر دینا کافی نہیں

---

[12] रमणीयार्थप्रतिपादक· शब्द काव्यम्।

[13] पुन. पुनर्यन्नवतामुपैति तदेव रूपं रमणीयताया· ।

فراست

نمکین کاظمی

علم الفراست کو عربوں نے علوم طبعیہ میں شمار کیا ہے جسکے وسیلے سے انسان کی ہیئت ظاہری، رنگ، شکل، اعضا، وغیرہ کو دیکھ کر اسکے اخلاق باطنی اور صفات روحانی، عادات و اطوار کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس علم کو فزیانومی PHYSIONOMY کہتے ہیں جس کے معنی قانون و قاعدہ طبعت کے ہیں اور اس سے مراد انسان کے ظاہری حدود حال کو دیکھ کر اس کی طبعیت اور اخلاقی کیفیت معلوم کرنا ہے۔

علم الفراست بہت قدیم علم ہے جس کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ہومر شاعر یونان نے (جس کا عہد حضرت مسیح سے بہت قبل کا عہد تھا) اس علم کے قواعد مدوّن کئے۔ خصوصًا فراست الید (پامسٹری) یعنی ہاتھ کی لکیروں کا علم عام کیا۔ بعض مورخوں کو اس سے اختلاف ہے مگر ہومر کی فراست دانی کے سب معترف ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ ہومر علم الفراست کا ماہر تھا۔ ہومر نے ترسیس کی تعریف میں جو شعر کہے ہیں اس کا ترجمہ بنانی نے (ایلیڈ کے عربی ترجمہ میں) دیا ہے۔ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہومر علم الفراست کا واقعی ایسا ماہر تھا کہ اس نے ترسیس کی شکل و صورت دیکھ کر اسکے باطنی اخلاق کا پتہ لگا لیا تھا۔

بقراط نے حضرت مسیح سے ساڑھے چار سو سال قبل اپنی تصنیفوں میں علم الفراست کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان کی اخلاقی حالت اور بیماریاں اسکے چہرے اور جسم سے بآسانی معلوم کی جا سکتی ہیں اسکے علاوہ جالینوس اور اقلیدس، مشہور یونانی حکیموں نے بھی علم الفراست کے متعلق بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ یونانیوں کے علاوہ مصریوں نے بھی اس فن میں بڑا کمال حاصل کیا تھا

مشہور یونانی حکیم ارسطو نے علم فراست پر ایک کتاب مرتب کی تھی جسے اس نے چھ فصلوں پر تقسیم کیا تھا اور ان تمام علامات کی تشریح کر دی تھی جس سے انسانی کمزوری، ہوشیاری، بے وقوفی، عقلمندی اور جہالت کا پتہ شکل، بال، اعضا، قامت اور چال ڈھال، نشست و برخاست وغیرہ سے چل سکتا ہو۔ اسکے علاوہ اس نے یہ بھی تحقیق کیا تھا کہ انسانوں میں حیوانات کی خصوصیات بھی ہوتی ہیں، چنانچہ کس وضع کے انسان میں کس جانور کی کسی خصوصیات پائی جاتی ہیں اسکا بھی اس نے ذکر کیا ہے۔ ارسطو کی کتاب فراست بہت مشہور ہوئی اور بیشتر زبانوں میں اسکے ترجمے بھی ہوئے۔ پھر دوسرے لوگوں نے بھی اس پر اضافہ کیا۔

عرب جاہلیت کے زمانے ہی سے اس فن سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور اسے انھوں نے تین حصوں میں منقسم کیا تھا۔ قیافہ، ریافہ، عیافہ۔ قیافہ معرفت نسانی کا علم تھا جسکو وہ قیافۃ البشر کہتے تھے۔ اسکے ذریعے انسان کا چہرہ، جلد، ہیئت، اعضا، ہاتھ پاؤں وغیرہ کو دیکھ کر انسان کے عادات و اطوار خاندان وغیرہ کی معلومات ہوتی تھیں۔ ریافہ وہ فن تھا جس کے ذریعہ زمین کے اندر کا پانی معلوم کیا جاتا تھا اور مٹی کو سونگھ کر اور گھاس کو دیکھ کر پانی کی موجودگی اور سطح زمین سے پانی کے فاصلے کو معلوم کیا جاتا تھا۔ عیافہ وہ علم تھا جس کے ذریعے گھوڑے کے سموں کے نشانات زمین پر دیکھ کر جانور کی وضع و ہیئت وغیرہ بتائی جاتی تھی اسی کے ساتھ علم اختلاج (پھڑکان اعضا یعنی انسانی جسم کے بعض حصوں کے پھڑکنے سے بعض خاص خاص باتیں معلوم کی جاتی تھیں۔

اشاعت اسلام کے بعد فلسفہ طب اور ہیئت کی طرح یونانی علم فراست

[1] حیدرآباد میں حسن بن عبداللہ مخاطب بہ عماد نواز جنگ علم عیافہ کے بڑے ماہر تھے جن کے قصے بہت مشہور ہیں۔

کو بھی مسلمانوں نے ترقی دی اور مستقل کتابیں اس فن پر لکھیں۔ چنانچہ طبیب رازی نے اس فن کو طب میں جگہ دی اور ارسطو کی کتاب فراست کا خلاصہ کر کے اس پر بہت سا اضافہ کیا۔ اسی طرح ابن سینا، ابن رشد، امام شافعی اور ابن عربی نے اپنی کتابوں میں اس فن کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہو۔

ہندوستان میں بھی اس فن یا علم کو خوب ترقی دی گئی چنانچہ ہندوؤں کے پاس ایک شاستر علم فراست اور علم قیافہ کے متعلق مستقل موجود ہے۔

مختصر یہ کہ قیافہ شناسی کا علم دنیا کی تقریباً ہر قوم اور ہر زبان میں عام ہے۔ شاید ہی دنیا کی کوئی زبان ہو جس میں قیافہ کے تجربات اور مسلّمات کا نچوڑ ضرب الامثال اور کہاوتوں کے ذریعہ عام نہ ہو۔ مثلاً کوتاہ قد، کوتاہ گردن، تنگ پیشانی، ازرق چشم، کانے، بھینگے، اندھے، لنگڑے آدمیوں کے متعلق ہزاروں اقوال مشہور ہیں۔

محمد الدین محمد الحسینی محمدی نے اپنی بے نظیر کتاب زینت المجالس میں لکھا ہے کہ فراست تین قسم کی ہوتی ہے طبعی، عربی، اور صنفی۔ طبعی وہ ہے جو تھوڑی ریاضت کے بعد انسان اپنی کدورت نفسانی کو زائل کرنے کے بعد خود حاصل کرتا ہے عربی اور طبعی وہ ہیں جو کسب و نظر مشق و ممارست کے بعد حاصل ہوتی ہیں۔

عربوں میں امام موسیٰ کاظم کو علم قیافہ کا بڑا استاد تھا۔ آپ نے نہ صرف ماہرین فن سے اس علم کو حاصل کیا تھا بلکہ دور دراز کا سفر کر کے ماہرین فن سے ملاقاتیں بھی کی تھیں اور تصنیفیں بھی کی تھیں۔ ایک دفعہ آپ کو اطلاع ملی کہ کسی شہر میں دو آدمی اس فن کے ماہر ہیں تو آپ ان سے ملنے کے لئے اس شہر کو گئے اور ان سے مل کر نہ صرف مزید معلومات حاصل کیں بلکہ ان سے اس فن کی کچھ کتابیں بھی حاصل کیں۔ واپسی میں ایک مقام پر پہنچے تو شہر کے دروازے پر ایک شخص نے آپ کا پرتپاک استقبال کیا اور آپ کو اپنا مہمان بنانا چاہا۔ پہلے آپ نے اس کی مہمانی سے انکار کیا لیکن اس نے اتنی منت خوشامد کی اور اتنا گڑگڑایا کہ آخر آپ اس کے مہمان بننے پر رضامند ہو گئے۔ اس شخص میں علم قیافہ کی رو سے ساری برائیاں موجود تھیں۔ پست قامت، کوتاہ گردن، تنگ پیشانی، ازرق چشم اور لنگڑا پن ان سب پر طرہ۔ مگر دو روز تک اس شخص نے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھ کر آپ کی اتنی خدمت کی کہ آپ حیران ہو گئے اور دل میں سوچا کہ فن قیافہ کی رو سے جتنی برائیاں اس شخص میں ہونی چاہئے اتنی ہی بھلائیاں نظر آ رہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ فن غلط ہے اور جن تجربات اور قیاسات پر ان اقوال اور مسلّمات کو شہرت دی گئی ہے وہ بھی غلط ہیں۔ چنانچہ آپ کو اس بات پر بہت افسوس ہوا کہ آپ نے اس غلط اور بیہودہ قیاسی علم پر اپنے اوقات عمر کا ایک بڑا حصہ ضائع کر دیا اور بیکار دور دراز محنت کر کے اس فن کی کتابیں نقل کیں۔ آپ نے یہ سفر بھی اسی فن کی تکمیل کے سلسلہ میں کیا تھا اور کئی ایک کتابیں خرید کر یا نقل کر کے حاصل کی تھیں۔ بہرحال اس شخص کی خاطر مدارات دیکھ کر آپ نے اس علم کے متعلق اپنی تمام کتابیں ضائع کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چوتھے دن جب آپ نے اس مقام سے روانگی کا قصد فرمایا تو آپ نے اپنے میزبان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور اسے دعوت بھی دی کہ کبھی تم آ کر میرے مہمان رہو اور مجھے اپنی میزبانی کا شرف بخشو۔ امام کی زبان سے یہ سن کر ان کے میزبان نے کہا امام! مجھے معلوم ہو کہ آپ سردار قبیلہ ہیں اور میں اگر آپ کے پاس آؤں تو آپ میری مہمانی کریں گے مگر میں نے اس امید پر آپ کی خدمت نہیں کی ہو۔ آپ کے قیام کے سلسلہ میں میرے جو اخراجات ہوئے ہیں ان کی یہ تفصیل ہو۔ یہ رقم مجھے ادا کر دیجئے اور آپ تشریف لے جائیے۔ اب امام کو حیرت ہوئی مگر انھوں نے اپنے غلام سے فرمایا کہ اس شخص سے فہرست لے لو اور جو رقم اس نے مانگی ہو ادا کر دو۔ غلام نے جو فہرست لی اور رقم دیکھی تو اسے بڑی حیرانی ہوئی کیونکہ صرف امام اور ان کے ساتھ کے ایک غلام کے تین روز کے اخراجات اتنے بتائے گئے تھے جتنے چالیس آدمیوں کے ہو سکتے تھے۔ غلام نے اس پر اعتراض کیا تو امام نے فرمایا کہ اس شخص نے جتنا مطالبہ کیا ہے اس کی دگنی رقم اسے دے دو۔ اس شخص نے آخر میں اپنی اصلیت ظاہر کر کے مجھے بڑی پریشانی سے نجات دی ہے اور فن قیافہ کے صحیح ہونے کا زندہ ثبوت دیا ہے اس لئے اس خوشی میں دگنی رقم بھی کم ہے۔ اور میں تجھے اس خیر خواہی کے عوض جو تو نے دکھائی ہے آزاد کرتا ہوں۔ چنانچہ اس روز سے امام موسیٰ کاظم نے اس فن کو بڑی اہمیت دینی شروع کی اور آخر تک اس پر یقین رکھا۔

امام شافعی کی قیافہ دانی کے قصے بھی بہت مشہور ہیں۔ آپ اس فن کے بھی امام تھے۔ محمود بن سمار بھی فن قیافہ کے ماہر تھے۔ مشہور ہے کہ ایک دفعہ امام شافعی اور محمود بن سمار ایک مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور نماز پڑھنے لگا۔ امام شافعی نے کہا یہ شخص لوہار ہے۔ محمود بن سمار نے کہا نہیں بڑھئی ہے۔ جب اس نے نماز ختم کر لی تو امام نے اس شخص سے دریافت

کیا کہ تمھارا پیشہ کیا ہے۔ اس نے جواب دیا پہلے لوہار تھا مگر اب بڑھئی کا کام کرتا ہوں۔

قاضی احمد غزنوی نے اپنی کتاب نگارستان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ احمد بن حسن میمندی بچپن میں سلطان محمود کے ساتھ پڑھتے تھے۔ ایک روز مدرسہ سے نکل کر ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے ایک باغ میں دونوں پہنچ گئے، وہاں فراست و قیافہ کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ اتنے میں ایک اجنبی سامنے نظر آیا۔ سلطان محمود نے اسے دیکھ کر احمد سے کہا تمھیں فراست کا بڑا دعویٰ ہے اب اس شخص کے متعلق جو آرہا ہے بتاؤ کہ کون ہے اور اس کا کیا نام ہے۔ احمد نے جواب دیا اس کا نام احمد ہے اور پیشہ کے لحاظ سے بڑھئی ہے۔ سلطان نے فوراً اس شخص کو پاس بلا کر نام اور پیشہ دریافت کیا تو احمد کی بات صحیح نکلی۔ اس پر سلطان کو بڑی حیرت ہوئی اور پوچھا تم نے اس کا پتہ کس طرح چلایا؟ احمد نے کہا یہ تو بڑی آسان بات تھی۔ آپ نے جب احمد کہہ کر مجھے مخاطب کیا تو یہ شخص بھی احمد نام سنتے ہی ہماری طرف متوجہ ہو گیا اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ اس کا نام احمد ہے اور چوں کہ یہ شخص درختوں کے تنوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اس لئے میں نے جان لیا کہ بڑھئی ہے۔

شیخ الرئیس بوعلی سینا کے ایک معالجہ کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ شیخ کو سلطان محمود غزنوی نے اپنے دربار میں طلب کیا مگر وہ مصلحتاً روپوش ہوگئے۔ اسی روپوشی کے زمانے میں گھومتے پھرتے گرگان پہونچ گئے اور وہاں علاج معالجہ بھی کرنے لگے۔ گرگان کے حکمران قابوس وشمگیر کا ایک عزیز ایک لاعلاج بیماری میں مبتلا تھا سارے اطبا اس کے علاج سے عاجز تھے۔ کسی نے قابوس سے کہا کہ ہمارے شہر میں ایک طبیب آیا ہوا ہے جو بڑا حاذق ہے، اس کی شہرت بہت ہو رہی ہے، اگر اس بیمار کو اسے بھی دکھا لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ اس پر قابوس نے حکم دیا کہ اس طبیب کو بلا کر بیمار کا معائنہ کرایا جائے۔ شیخ پہنچے اور بیمار کا معائنہ کیا ایک خوبصورت نوجوان بستر پر دراز تھا۔ نبض دیکھی تو کوئی مرض نہ ملا۔ حالات پوچھے تو کسی بات کا پتہ نہ چلا۔ سوا لاغری اور کمزوری کے کوئی بات نظر ہی نہ آئی۔ آخر تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد شیخ نے اپنی فراست سے مرض پہچان لیا اور کہا کہ کوئی ایسا شخص بلایا جائے جو شہر کے پورے محلوں سے واقف ہو اور ان کے نام گنا سکے۔ ایک ایسا شخص اسی جگہ موجود تھا جب وہ شیخ کے قریب آیا تو شیخ نے مریض کی نبض پر انگلی رکھ کر اس شخص سے کہا کہ تم شہر کے محلوں کے نام ایک ایک کرکے لیتے جاؤ۔ اس نے نام گنانا شروع کر دیئے۔ ایک محلہ کے نام پر شیخ نے اس شخص کو روک دیا اور کہا اس محلہ کا نام یاد رکھو اور اس محلے کی گلیاں گناؤ۔ اس شخص نے گلیاں گنانی شروع کیں۔ ایک خاص گلی کے نام پر شیخ نے اسے پھر روک دیا۔ اب شیخ نے پوچھا کوئی ایسا شخص یہاں ہے جو اس گلی کے مکانوں کا نام بتا سکے۔ ایک ایسا واقف کار بھی مل گیا اور اس نے مکانات کے نام بتانا شروع کر دیئے۔ ایک نام پر شیخ نے اسے روک دیا اور کہا کیا کوئی شخص اس مکان کے رہنے والوں کے نام گنا سکتا ہے۔ اس نوبت پر ایک خاص شخص طلب کیا گیا جس نے آکر اس گھر کے رہنے والوں کے نام گنانا شروع کر دیئے ایک نام پر شیخ نے اس شخص کو روک دیا اور کہا فلاں محلہ کی فلاں گلی کے فلاں مکان میں جو لڑکی فلاں نام کی رہتی ہے یہ لڑکا اس پر فریفتہ ہے، اس کا عقد اسی سے کر دیا جائے، اسے اور کوئی بیماری نہیں ہے۔ لڑکا جو لیٹا ہوا حسرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا شیخ کے الفاظ سن کر حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا اور پھر فرط حیرت سے اپنے منہ پر چادر تان لی۔ جب اس واقعہ کی اطلاع قابوس کو ملی تو اس نے شیخ کو طلب کیا۔ چوں کہ سلطان محمود نے شیخ کی تصویریں ہر شہر میں بھجوا دی تھیں کہ جہاں بھی ملیں انھیں دارالخلافہ بھجوا دیا جائے اسلئے قابوس کے پاس بھی شیخ کی تصویر پہنچ چکی تھی اور وہ اسے دیکھ چکا تھا اب جو شیخ نظر آئے تو اس نے پہچان لیا اور دیکھتے ہی پوچھا آپ شیخ بوعلی ہیں نا؟ شیخ نے کہا ہاں میں بوعلی ہوں۔ قابوس نے تخت سے اتر کر ان کا استقبال کیا اور شیخ کو گلے لگا کر اپنے تخت پر بٹھا لیا پھر پوچھا کہ آپ نے کیسے پہچان لیا کہ یہ لڑکا اس لڑکی پر عاشق ہے۔ شیخ نے کہا میں نے جب اس کا معائنہ کیا تو کوئی مرض نظر نہیں آیا سوا کمزوری کے۔ اس لئے میں نے جان لیا کہ یہ حضرت عشق کی کارستانی ہے۔ محبوبہ کا پتہ لگانے کے لئے پہلے میں نے شہر کے محلوں کے نام گنوائے اور بیمار کی نبض دیکھتا رہا۔ ایک محلے کے نام پر بیمار کی نبض بہت تیز ہو گئی تو میں نے جان لیا کہ یہی اس کی محبوبہ کا محلہ ہے پھر گلیوں کے نام سنائے گئے اور ایک گلی کے نام پر وہی کیفیت نبض میں پیدا ہوئی تو میں نے سمجھ لیا کہ یہی اس کی گلی ہے پھر مکانات کے نام سنائے گئے اور ایک نام پر وہی کیفیت ہوئی تو میں نے اس مکان کے رہنے والوں کے نام سنوائے اور جس نام پر آخر میں اسی حرکت کا اعادہ ہوا تو میں نے بتا دیا کہ وہی اس لڑکے کی محبوبہ ہے۔ یہ سن کر قابوس نے اسی وقت اس لڑکے سے حقیقت حال دریافت کی اور تصدیق

اگزامنیر ۱۸۰۲

ہوجا سنے پر شیخ سے کہا یہ لڑکا میرا عزیز ہے اور لڑکی بھی میرے ہی خاندان کی ہے اب آپ ہی دونوں کا عقد کر دیں چنانچہ شیخ نے ان دونوں کا عقد کر دیا اور شیخ کی فراست دانی کے طفیل میں دونوں نے چین کی زندگی بسر کی۔

اس قسم کی باتیں تو آثار اور اخبار کو پیش نظر رکھ کر بتائی جاتی تھیں مگر ایک شاخ فراست کی ایسی بھی ہے جسے آثار اور اخبار سے تعلق نہیں ہوتا اور "غیب" سے ساری باتیں خود بخود ذہن میں آجاتی ہیں۔ یہ قدرت کا عطیہ ہوتا ہے اور شاذ ہی اس سے سرفراز ہوتے ہیں مشق اور کوشش سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، محض قدرت کی مہربانی ہوتی ہے عرب میں ایسے لوگ بہت ہوتے تھے۔ چنانچہ بعض معمولی قبیلوں میں اس قسم کی عورتیں پائی جاتی تھیں جو "غیب" کی باتیں بتاتی تھیں۔ ایام جاہلیت میں انھیں کاہنہ کہتے تھے۔

مولفِ روضۃ الصفا کا بیان ہے کہ جب اولادِ عباس قریۂ حمیمہ سے بھاگ کر کوفے کی طرف چلی تو سفاح اور اس کا بھائی منصور اور ان کا چچا عبداللہ بن علی سب سے آگے تھے جب وہ ایک عراقی موضع میں پہنچے تو انھیں دیکھ کر ایک اعرابیہ نے دوسری عورت سے کہا خدا کی قسم میں نے ایسے تین چہرے کبھی نہیں دیکھے تھے ان میں ایک خارجی ہے اور دو خلیفہ ہیں۔ منصور نے یہ بات سنی تو اس عورت سے تفصیل پوچھی۔ اس نے کہا اوّل خلافت اس جوان کو ملے گی۔ یہ کہہ کر سفاح کی طرف اشارہ کیا اور پھر کہا اس کے بعد تیری طرف منتقل ہوگی۔ پھر عبداللہ بن علی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی یہ تجھ پر خروج کرے گا، چنانچہ یہ ہو کر رہا اور اعرابیہ کا لفظ لفظ صحیح ہوا۔

جعفر برمکی جو ہارون رشید کا وزیر اور یحییٰ برمکی کا بیٹا تھا بڑا فرس تھا۔ ایک زمانہ تک خاندانِ برامکہ کا طوطی بولتا رہا لیکن پھر خلیفہ کی نظریں اس خاندان والوں سے پھر گئیں اور وہ ان کے استیصال کے منصوبے باندھنے لگا۔ ایک دن خلیفہ کہیں جا رہا تھا۔ جعفر بن یحییٰ خلیفہ کی سواری کے آگے آگے چل رہا تھا۔ خلیفہ کی نظر اس کی گردن پر پڑی تو اس نے جعفر کے قتل کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ اتنے میں جعفر نے پلٹ کر خلیفہ کی طرف دیکھا اور کہا جس گردن پر آپ نے ہزاروں بوسے دیے ہوں اب اس پر تلوار لگنے کی سوچنا مروت سے دور ہے۔ خلیفہ کو جعفر کی اس فراست پر سخت حیرت ہوئی اور اس نے ادھر ادھر کی گفتگو میں اس بات کو ٹال دیا مگر آخر میں وہی ہوا اور جعفر کی گردن ہارون رشید ہی کے حکم سے کاٹی گئی۔

بعض شعراء کی فراست کے قصے بھی بڑے دلچسپ ہیں۔ انھیں سن کر حیرت ہوتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ بالکل صحیح واقعات ہیں۔ ہارون رشید کے حرم میں سیکڑوں ادیبہ اور شاعرہ کنیزیں تھیں۔ ایک رات ہارون رشید کسی ایسی ہی ادیبہ اور شاعرہ کنیز کے پاس پہنچا تو وہ ایک ادائے خاص سے محوِ خواب نظر آئی۔ رشید نے اس کی پنڈلی پر اپنا پاؤں رکھ دیا تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھی اور شرما کر کہنے لگی۔

"یا امین اللہ ماھذا الخبر"

(اے خدا کے امین یہ کیا واقعہ ہے؟)

رشید نے کہا

قلت ضیفٌ طارقٌ ارضکم   ھل تضیفوہ الی وقت السحر

(تمھارے گھر میں رات کے وقت ایک مہمان آگیا ہے! کیا صبح تک اس کی مہمانی کر سکتی ہو؟)

کنیز نے فی البدیہہ کہا

بسرور وھنا یا سیدی   اخدم الضیف بسمعی والبصر

(میرے آقا بسرو چشم انتہائی مسرت سے میں اپنے مہمان کی خدمت کروں گی)

صبح جب دربار شروع ہوا اور شعراء حاضر ہوئے تو خلیفہ نے ابونواس کو حکم دیا کہ اس مصرع "یا امین اللہ ماھذا الخبر" کو تضمین کرو۔ ابونواس نے فی البدیہہ کہا

طال لیلی حین وافانی السھر   فتفکرت فاحسنت الفکر

قمت امشی فی الطحان ساعۃً   ثم اجری فی مقاصر الحجر

فاذا وجہ جمیل مشرق   زانہ الرحمٰن من بین البشر

فلمست الرجل منھا ملمسًا   فدنت منی ومدت للبصر

واشارت لی بقول مفصح   یا امین اللہ ماھذا الخبر

قلت ضیفٌ طارقٌ فی ارضکم   ھل تضیفوہ الی وقت السحر

(رات مجھ کو نیند نہیں آئی اور میں جاگتا رہا میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ معاً دل میں یہ بات آئی اور میں اٹھ کر صحن میں ٹہلنے لگا اور پھر کنیزوں کے حجروں کی طرف جا نکلا (دیکھتا کیا ہوں کہ) ایک حسین چہرے والی سامنے ہے جس کو خدا نے انسانوں میں سے چن کر حسن و جمال سے آراستہ کیا ہے میں نے اس کے پاؤں کو ہاتھ لگایا تو اس نے غور سے مجھے دیکھا اور میری طرف متوجہ ہو کر بڑے ہی میٹھے الفاظ میں کہنے لگی: اے

اللہ کے امین کہا جاتا ہے)

خلیفہ نے اس تعیین کو سنکر ابو نواس کو خلعت و انعام سے سرفراز کیا

ہارون رشید کے زمانے میں بغداد میں ایک اندھا یعقوب نامی رہتا تھا جس کی فراست کے بڑے مشہور تھے۔ ایک روز یحییٰ برمکی وزیر اعظم محل کے اندر سے نکلے ہی تھے میں باہر نکلا اور حکم دیا کہ یعقوب کو حاضر کیا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد یعقوب حاضر ہوا تو حکم دیا سب خاموش رہیں کوئی شخص بات نہ کرے پھر یعقوب سے اس طرح گفتگو شروع کی۔

یحییٰ "یعقوب! تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

یعقوب نے تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کان لگا کر سننے کی کوشش کی اور دونوں ہاتھوں سے فرش کو ٹٹولا اور پھر کہا "ایک قیمتی جواہر جو ایک تھیلی میں رکھا ہوا تھا چوری گیا ہے"۔

یحییٰ۔ "سچ کہتے ہو۔ بتاؤ وہ کہاں ہے اور چور کون ہے؟"

یعقوب نے تھوڑی دیر تک سکوت اختیار کیا پھر کہا "وہ جواہر لوٹے کے اندر رکھ کر آبدار خانے کے قریب دفن کیا گیا ہے چور کا نام میں عزت ہمیں کر سکتا"۔

یحییٰ نے اسی وقت آبدار خانے کے قریب کھدوایا تو لوٹے میں جواہر موجود تھا۔ یحییٰ کو یعقوب کی فراست پر حیرت ہوئی اور اس نے حکم دیا کہ دس ہزار درہم یعقوب کو دئے جائیں۔ پھر پوچھا تمہارا مکان کہاں ہے۔ یعقوب نے عرض کی میرا کوئی مکان نہیں ہے یحییٰ نے حکم دیا ہمارے قریب سوق السردان (محلہ کا نام تھا) میں ایک مکان خرید کر یعقوب کو دیا جائے اور مکان کی خریداری کے بعد ضروری سامان کے لئے پانچ ہزار درہم اور دئے جائیں یعقوب نے یحییٰ کا شکریہ ادا کرکے کہا میری قسمت میں نہ مکان ہے اور نہ پانچ ہزار درہم ہی ہیں البتہ دس ہزار درہم مجھے ضرور ملیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد ہی برامکہ کا زوال شروع ہوگیا نہ مکان ہی یعقوب کو دلایا جاسکا اور نہ رقم دی جاسکی البتہ ابتداً جو دس ہزار درہم یعقوب کو ملے تھے وہی اسکے کام آئے۔

جریر اور فرزدق عرب کے دو بلند پایہ ہم عصر شاعر تھے دونوں میں نوک جھونک بھی ہوتی تھی۔ جریر، فرزدق کی ہجو کہتا تو ساتھ ہی ساتھ لوگوں سے یہ بھی کہہ دیتا کہ اس کے جواب میں فرزدق میری جو ہجو کہے گا وہ اس طرح ہوگی۔ چنانچہ بالکل ایسا ہی ہوتا تھا۔ اگر فرزدق جریر کی ہجو کرتا تو اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتا کہ اسکے جواب میں جریر میری جو ہجو کہے گا وہ یوں ہوگی۔ چنانچہ یہی صحیح ہوتا۔ چونکہ ایام جاہلیت میں عرب میں توہم پرستی عروج پر تھی اس لئے عام اعتقاد یہ تھا کہ شعراء کے تابع اجنہ ہوا کرتے ہیں اور جریر اور فرزدق کا جن ایک ہی ہے۔

اغانی میں ایک واقعہ لکھا ہوا ہے۔ ایک روز فرزدق کہیں بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے ایک سوار آیا۔ فرزدق نے پوچھا کہاں سے آتے ہو؟ اس نے جواب دیا یمامہ سے۔ پھر پوچھا ابن المراغہ یعنی جریر کو بھی دیکھا ہے؟ اس نے جواب دیا "ہاں"۔ پوچھا میرے بعد اس نے کچھ شعر بھی کہے ہیں۔ سوار نے کہا "ہاں یہ شعر کہے ہیں"۔

هاج الهوى لفؤادك المهتاج

(دل کی لگی محبت نے اور بھڑکا دی)

فرزدق نے کہا دوسرا مصرع اس نے یہ کہا ہوگا

فانظر بتوضح باكر الأحداج

(ذرا مقام توضح کو صبح سویرے دیکھو)

سوار نے کہا ہاں یہی مصرع اس نے کہا تھا پھر اس نے مصرع سنایا:

ان الغراب بما كرهت لمولع

(کوا احباب کو آوازیں دیا کرتا ہے)

فرزدق نے دوسرا مصرع یہ سنایا کہ پھر یہ کہا ہوگا:

بنوى الأحبة دائم التشحاج

(یہ وہی ہے جسے محبت کرنے والے بُرا کہتے ہیں)

سوار نے اقرار کیا کہ ہاں یہی کہا ہے۔ پھر سوار نے کہا خدا کی قسم یہ جریر ہی کے مصرعے ہیں، تم نے مجھ سے پہلے کسی سے سُنے ہوں گے۔ فرزدق نے کہا نہیں۔ میں نے یہ مصرعے اس سے پہلے نہیں سُنے مگر تو نے جو پہلے مصرعے سُنائے وہ یہی ثانی مصرعے چاہتے تھے۔ پھر کہا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا اور جریر کا شیطان ایک ہی ہے۔ پھر فرزدق نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ شعر حجاج کی مدح میں کہے گئے ہوں گے۔ یہ بات بھی صحیح تھی۔

ایسے سیکڑوں قصے تاریخ بغداد اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں جن کا نقل کرنا موجب طوالت اور بے لطفی ہوگا۔ افسوس ہے کہ فارسی شاعری میں ایسے واقعات اور قصے مطلق نظر نہیں آتے ایک آدھ واقعہ اسا نظر آتا بھی ہو تو خاص نہیں۔ البتہ ہندی شاعری ایسے جواہرات سے مالا مال ہو۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

کوئی تم جیسا تھا، ایسا ہی کوئی چہرا تھا
یاد آتا ہے کہ اک خواب کبھی دیکھا تھا

رات آنگن میں مرے چاند نہیں نکلا تھا
میری ہی طرح سے سایہ بھی مرا تنہا تھا

جانے کیا سوچ کے تم نے مرا دل پھیر دیا
میرے پیارے! اسی مٹی میں مرا سونا تھا

وہ بھی کم بخت زمانے کی ہوا لے کے گئی
میری آنکھوں میں مری مے کا جو اک قطرہ تھا

تو نہ جاگا مگر اے دل ترے ویرانے پر
ایسا لگتا ہے کوئی پچھلے پہر آیا تھا

تیری دیوار کا سایہ نہ خفا ہو مجھ سے
راہ چلتے یونہی کچھ دیر کو آ بیٹھا تھا

اے شبِ غم مجھے خوابوں میں سہی دکھلا دے
میرا سورج تری وادی میں کہیں ڈوبا تھا

اک مری آنکھ ہی شبنم سے شرابور رہی
صبح کو ورنہ ہر اک پھول کا منہ سوکھا تھا

تم ذرا تھام لو آ کر کبھی پیمانۂ جاں
دیکھو دیکھو مرے ہاتھوں سے ابھی چھوٹا تھا

ستمبر ۱۹۶۱ء

(نذرِ اقبال)

مادا کرشن گوپال مغموم

اسیرانِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
محبت میں کچھ ہم جاں اور بھی ہیں

محبت تو برحق ہے اے دوست! لیکن
کئی اُلجھنیں درمیاں اور بھی ہیں

نہیں ایک ہی در سزاوارِ سجدہ
جبیں کے لیے آستاں اور بھی ہیں

صعوباتِ دار و رسن سے بھی بڑھ کر
محبت کے کچھ امتحاں اور بھی ہیں

ہمیں پر نہیں ختم ذوقِ تجسس
تجسس میں گم کارواں اور بھی ہیں

اگر موج در موج ہے برقِ سوزاں
چمن در چمن آشیاں اور بھی ہیں

کوئی تجھ کو اے حسن! دیکھے تو کیونکر
کہ جلووں میں جلوے نہاں اور بھی ہیں

خبر کیا اسیرانِ دیر و حرم کو
اُسی جانِ جاں کے نشاں اور بھی ہیں

ادب کے گلستاں میں مغموم! مجھ سے
بفضلِ خدا خوش بیاں اور بھی ہیں

اگزامنیر ۱۸۸۲

مرأة الہند

آدم سیتاپوری

اردو زبان کی نشو و نما اور ارتقاء میں جتنا گہرا ہاتھ کشمیری برہمنوں کا رہا ہے "من حیث القوم" شاید ہی کسی اور کا رہا ہو۔ چندر بھان کشمیری اور للو لال جی کوی سے لے کر آنند نرائن مُلّا تک نظر ڈالی جائے تو ایسے ایسے باکمال ارباب علم و ادب آپ کو نظر آئیں گے کہ سر نیاز خود بخود جھک جائے گا پنڈت دیا شنکر نسیم۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ چک بست۔ علامہ کیفی دتاتریہ۔ جگموہن ناتھ شوق۔ سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت بشن نرائن دربا کا تو ذکر ہی کیا اُردو زبان و ادب کی تاریخ اپنے دامن میں نجانے کتنے انمول موتی سمیٹے ہوئے ہے جن سے بیشمار تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ پھر یہ علم افزائیاں نظم ہی تک محدود نہیں ہیں، نثر کے میدان بھی ان باکمالوں سے خالی نہیں ہیں۔

ہندوستانی صحافت کی داغ بیل تو چند انگریزی اردو فارسی اخبارات سے پڑی لیکن ہندوستان کے صحافتی ذہن و شعور کی تربیت دراصل اردو اخبارات کی رہین منت ہے اور یہ اردو اخبارات وہی ہیں جو انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد زیادہ تر ہندوؤں نے نکالے تھے اور ان ہندوؤں میں بھی یہی کشمیری برہمن پیش پیش تھے۔ لکھنؤ کے ہندو اخبار نویسوں میں منشی لال جی۔ منشی نول کشور۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ خیراتی لال طاہر۔ لالہ گوکل پرشاد۔ منشی چندن لال۔ منشی دوارکا بہاری لال۔ لالہ رام سہائے تمنا۔ بابو امبکا پرشاد۔ منشی مادھو لال۔ سری کرشن خیدر قیصر۔ پنڈت شیو ناتھ سنگھ۔ بابو گنگا پرشاد درما۔ لالہ دیبی پرشاد لالہ سری رام وکیل اور منشی دوارکا پرشاد اُفق ایسے جانے پہچانے لوگ ہیں جن میں سے بہتوں کے دیکھنے والے آج بھی زندہ ہیں لیکن یہ فہرست نامکمل رہ جائے گی اگر اس میں لکھنؤ کی معیاری صحافت کے ان علمبرداروں کے نام شامل نہ کئے جائیں جنھوں نے مرأة الہند جیسے معیاری اردو ماہنامے کو جاری کر کے برسوں اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دی ہیں۔

مرأة الہند اس کشمیری ادارے کا ماہنامہ تھا جسے مہتممان مراسلۂ کشمیر نے جاری کیا تھا۔ مراسلۂ کشمیر کشمیری برہمنوں کا ایک معیاری پرچہ تھا جس کے علمی اور ادبی مضامین ایک زمانے میں معیاری صحافت کی جان سمجھے جاتے تھے۔ اس کی مقبولیت کا حال یہ تھا کہ مراسلۂ کشمیر کے نام ہی سے ایک بہت بڑی علمی اور ادبی تنظیم جنم پا گئی۔ چنانچہ اپنے آخری دور میں اسی مراسلۂ کشمیر کی عنان ادارت اردو زبان و ادب کے سب سے بڑے محسن سر تیج بہادر سپرو کے ہاتھ میں آئی جو مدتوں اس تحریک کے میر کارواں بنے رہے۔ مرأة الہند اسی تحریک (مراسلۂ کشمیر) کا ایک ماہانہ آرگن تھا جسکے

اگزبانیشر ۱۸۸۲

سرورق پر "یہ رسالہ مجاریہ مہتمان مراسلۂ کشمیر مسمّی بہ مراۃ الہند" لکھا ہوتا تھا۔ ہندوستانی صحافت کی پہلی تاریخ اختر شاہنشاہی نے مراۃ الہند کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

مراۃ الہند ۔ غرض اس رسالے سے یہ ہوگی کہ ہندوستان کی رونق ترقی ہو۔ جملہ ساکنان ہندوستان کو دولت و عزت کامل حاصل ہو۔ علم و ہنر تہذیب اخلاق کی خوب ترقی ہو۔ فی مابین کل اقوام کے محبت اتفاق پیدا ہو۔ ہم لوگ اپنے حالات و خیالات کو بہ آسانی سرکار تک پہونچا ہر ایک طرح کی ایسی مدد سرکار سے حاصل کر سکیں جو منصف و نیک نیت حاکم کی طرف سے اپنی رعیت کی نسبت فرض ہے اور سرکار کے منشاء و خیالات صحیحہ سے صاف طور سے ہم سب کو آگاہی ہوتی رہے۔

لکھنؤ ــــ محلہ رانی کٹرہ۔ ماہواری ـــــ پندرہ ورق خورد۔

سالانہ تین روپیہ ـ رجسٹرڈ نمبر ۲۵۔

مجاریہ مہتمان مراسلۂ کشمیر مہتمم پنڈت کشن نرائن۔ از مطبع بہار کشمیر۔ اجرائے ۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۸۵ء"

اختر شاہنشاہی مطبوعہ اختر پریس لکھنؤ۔ جون ۱۸۸۸ء صفحہ ۲۲۸۔

یہ تھے مراۃ الہند کے اغراض و مقاصد ـــ اور ایک "نیم سیاسی" ماہنامے کے جاری کرنے کا مقصد اس دور میں اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا تھا۔ انقلاب اٹھارہ سو ستاون کے بعد ہندوستان کے سیاسی مسائل ایسے تھے بھی نہیں جن پر کھل کر آج کی طرح تنقید و تبصرہ کیا جا سکتا پھر بھی مراۃ الہند کے صفحات "حب الوطنی" کے بے پناہ جذبہ خلوص سے خالی نہیں تھے۔

اختر شاہنشاہی نے مراۃ الہند کا سن اجراء صحیح نہیں لکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کتابت کی غلطی ہو۔ مراۃ الہند کے شمارہ نمبر ۲۸ جلد نمبر ۳ (۱۵ جنوری ۱۸۷۸ء) کے ایک اعلان سے اس کی تردید ہوتی ہے :

" یہ رسالہ ۱۵۔ اکتوبر ۱۸۷۵ء سے جاری ہے ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ دو جزو سے کم نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی بوجہ زیادہ ہونے مضامین کے جیسے اس مرتبہ، بڑھ بھی جاتا ہے اس کے اجراء سے صرف ہند کا فائدہ مطلوب ہے، کچھ نجی وغیرہ سے اس کو کچھ واسطہ نہیں ہے۔"

مراۃ الہند تھا تو ایک مخصوص طبقے کا نمائندہ ـــ لیکن اس کے خریداروں کی جو فہرست ہر مہینے چھپا کرتی تھی اس میں کشمیری برہمنوں کے علاوہ بہت سے مسلمانوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ نواب کلب علی خاں والی ریاست رام پور۔ مولوی علی حسین وکیل۔ مرزا قمر الدین حسین خاں منصف۔ حافظ عبدالکریم خاں جج۔ مولوی کمال الدین منصف غرضیکہ بہت سے مسلمان بھی اس رسالے کے خریدار تھے۔ چونکہ اس ماہنامے کا تعلق کشمیری برہمنوں کے ایک عوامی ادارے سے تھا اس لئے ہر مہینے اس کا باقاعدہ حساب آمدنی و خرچ بھی شائع کیا جاتا تھا۔ ۱۵ دسمبر ۱۸۷۷ء کے شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کے شمارہ نمبر ۲۶ پر رسالے کی طباعت و اشاعت کی مد میں اکتالیس روپیہ ساڑھے پندرہ آنہ خرچ ہوئے تھے۔ اس کا سالانہ چندہ پیشگی مع محصولڈاک تین روپیہ چھ آنے تھا۔

میرے پاس مراۃ الہند کے جو چند شمارے محفوظ ہیں ان میں اس دور کی ادبی صحافت کے جو گرانقدر نمونے ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ مراۃ الہند اپنے دور کے رسائل میں ایک ممتاز نمایاں مقام رکھتا تھا۔ نیم سیاسی سماجی۔ علمی اور ادبی مضامین کے علاوہ اس رسالے میں ملکی و غیر ملکی خبروں پر مشتمل چند صفحات بھی ہوتے تھے لیکن نظم کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ ان کئی شماروں میں جو میرے سامنے ہیں نہ تو اردو یا فارسی کی کوئی غزل ہے نہ نظم۔

مراۃ الہند "مطبع بہار کشمیر" لکھنؤ میں چھپتا تھا۔ پنڈت کشن نرائن اس کے ایڈیٹر اور مہتمم تھے۔ سالانہ چندہ اسی تفریق کے ساتھ لیا جاتا تھا جیسا کہ اس دور میں عام دستور تھا۔ جو لوگ پیشگی چندہ دیتے تھے ان سے مع محصولڈاک تین روپیہ چھ آنے ـــ اور جو بعد میں دیتے تھے ان سے چار روپیہ چودہ آنے لئے جاتے تھے۔ طلباء سے دو روپیہ سالانہ ـــ اور ایسے لوگوں سے جو چندہ دینے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے ان سے صرف چھ آنے محصول ڈاک لے کر ان کے نام پرچہ جاری کر دیا جاتا تھا لیکن ان لوگوں کو کسی معزز اور موقر آدمی کا ایک تصدیق نامہ بھیجنا پڑتا تھا۔ عام طور پر ایک پرچے کی قیمت چھ آنے تھی۔

یہ پنڈت کشن نرائن کون بزرگ تھے؟ افسوس کہ ان کے حالات زندگی تک میری رسائی نہ ہو سکی۔ غالباً لکھنؤ ہی کے رہنے والے ہوں گے۔ ان کے "زر دربیان" سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت ہی روشن خیال۔ ترقی پسند اور انقلابی آدمی تھے اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اتنی اچھی تھی کہ شاید اس دور میں کم ہی صحافی ان کے ہم پلہ ہوں گے۔

مراۃ الہند کب تک جاری رہا۔ کس سن میں بند ہوا؟ اور اپنی زندگی کے مختلف زمانوں میں اچھے اور برے کن حالات سے دوچار رہا؟ یقینی طور پر اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میرے پاس جو متفرق پرچے محفوظ ہیں ان میں سب سے آخری شمارہ فروری ۱۸۷۸ء کا ہے۔

پنڈت کشن نرائن کی سیاسی "ژرف نگاہی" اور جذبۂ حب الوطنی مراۃ الہند کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ انقلاب ستاون کے بعد ہندوستان جن سیاسی اور سماجی مسائل کا شکار تھا پنڈت جی ان پر کڑی نظر رکھتے تھے اور اتنے باخبر رہتے تھے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان پر جو مباحثے ہوتے تھے ان کی روداد بھی ان کے سامنے رہا کرتی تھی چنانچہ ۱۵ دسمبر ۱۸۷۷ء کے پرچے میں انھوں نے مشہور ہندوستان دوست انگریز "پاٹر" کی اس تقریر کا خلاصہ شائع کیا ہے جو "پاٹر" نے پارلیمنٹ میں کی تھی۔ مراۃ الہند نے "پاٹر" کی زبانی نقل کیا ہے

"جنگ روم و روس سے بڑھ کر ہندوستان کے قحط سے انگلستان کی دولت اور عزت کا نقصان ہے جس صورت میں صرف قحط سے پندرہ لاکھ بندگان خدا کی جان جائے تو سلطنت ہائے شائستہ میں انگلستان کیا منہ دکھائے۔ باوجودیکہ ہند مفلس ہے تاہم جو پندرہ کروڑ روپیہ انگلستان اپنی ذاتی فوج میں صرف کرتا ہے اسی قدر ہند کی فوج میں بھی صرف پڑتا ہے۔ ہند کی حیثیت افلاس سے یہ رقم کہیں بڑھ کے ہے۔ ہند کے کل کاشتکار مفلس ہیں اور مدراس اور میسور میں ان کا نہایت حال تباہ ہے۔ مالک زمین سرکار ہے اور رعایا للعہ (چار روپیہ) سے لے کر للعہ (آٹھ روپیہ) تک فی ایکڑ کاشتکار ہے۔ اوسط درجے کا کاشتکار مع اپنے لڑکے بالوں کے صرف چار روپیہ مہینے میں پیٹ پالتا ہے . . . ایک روز صرف بیجا کے سبب سے ہند کا دوالہ نکلنے والا ہے۔ منجملہ پندرہ کروڑ روپیہ مصارف فوج کے کچھ

اگزامینر ۱۸۸۲ء

تخفیف ہونا چاہیے..... صیغہ سول میں بھی پانچ کروڑ روپیہ سالانہ صرف ہوتا ہے۔ اگر لائق ہندوستانی کسی قدر کم تنخواہ پر سرکاری عہدیدار مقرر ہوں تو اس مد میں بھی تخفیف ممکن ہے۔ جو انگریز سالہا سال کے واسطے اپنا گھر بار ترک کر کے ہندوستان جاتے ہیں وہ بے شک بیش قرار تنخواہ کی توقع رکھتے ہیں۔ دس ہزار "سال میں" جس آرام سے ہندوستانی بسر کر سکتا ہے انگریز تیس چالیس ہزار "سال میں" بسر نہیں کر سکتا۔ بس ایسی صورت میں ہندوستانیوں کو زیادہ تر سرکاری عہدوں پر مقرر کرنا نہایت انسب ہوگا اس کے علاوہ انگلستان نے بار بار وعدہ کیا ہے اور بعد غدر ۱۸۵۷ء کے اس وعدہ کی خوبی تصدیق کر دی ہے کہ سرکاری عہدوں میں کالے اور گورے میں فرق نہیں کیا جائے گا لیکن ایفائے وعدہ اب تک نہیں ہوا۔"

ہندوستان میں "نمک ٹیکس" کے خلاف سب سے بڑا عملی احتجاج ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی نے کیا تھا — لیکن "نمک ٹیکس" کے خلاف ہندوستان کی رائے عامہ میں انتشار اسی وقت پیدا ہو چکا تھا جب یہ ٹیکس باندھا گیا تھا۔ مراۃ الہند نے انھیں "پاٹر" کی تقریر کے حوالے سے "نمک ستیہ گرہ" سے پچاس برس پہلے ایک نوٹ لکھا تھا:

"پاٹر صاحب بہادر کی رائے میں نمک اور افیون کا ٹیکس بھی ناجائز ہے۔ گرم ملکوں میں بغیر نمک کے غربا کی زیست مشکل ہے۔ پس یہ ٹیکس بھی جلد موقوف ہونا چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس ٹیکس کی موقوفی کی سب سے زیادہ تر ضرورت ہے کیونکہ بار اس کا زیادہ تر غربا پر ہے اور یہ امر خلاف اصول سیاست مدن ہے۔"

ہندوستان میں اور ہندوستانیوں پر ۱۸۷۷ء کے مہیب قحط نے کیا کیا ظلم ڈھائے اور قحط کو بہانہ بنا کر ہندوستان کو کیسے کیسے تعلیمی اور ثقافتی نقصانات پہنچائے گئے مراۃ الہند کے ایک اداریہ میں جس کا عنوان میر انیس کے یہ اشعار ہیں۔

کسی کا کدہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے — کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر — کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

ان تفصیلات پر بڑے اچھے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے:

"کچھ اور سنیے گا —؟ دیکھیے تو کہ سررشتۂ تعلیم کا اس تخفیف کی

سخت وبانے کیسا ٹینٹوا لیا کہ سانس بھی نہ لینے دی اور دبا کیسی ــــ !
دبا تو محلّہ پیچھے دو چار گھوڑے جاتی ہے۔ یہ تو معلوم کون بلا تھی ایک دم سے سارا "بریلی کالج" نگل گئی ــــ دوسرے لقمے میں بنارس کا "انیگلو سنسکرت کالج" بھی مونہ (منھ) کے اندر ــ تعلیم نسواں کے اسکول اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے اسکولوں کو دو دو چار چار دانت مار ہی دیئے ــــ ارے بس بس! مگر جب دانتوں میں لہو لگ گیا تب چھوڑتا کون ہے۔ چلتے چلاتے ۳۱ مارچ ۱۸۷۷ء کو "دہلی کالج" پر ایک ایسی "جھپٹ" ماری کہ مر ہی تو گیا اور ہاتھ پیر توڑ لنڈ منڈ کرکے جھپ سے اس کی نعش بھی لاہور میں گاڑ تو پ دی۔ اس رویا پیٹا کرو جتنا چاہو واویلا کرو۔ چاہے رو رو کر اپنی آنکھیں پھوڑ دو سنتا کون ہے؟ جو کچھ ہونا تھا ہو لیا ـــــ . . تو صاحب دہلی والوں کا حوصلہ بھی نکل گیا۔ عرضی ہو گئی تھی وہ بھی نامنظور ہوئی۔ یہ کہئے "سرکار" نے بھی کچھ نہ سنا۔ ارے میاں! تم تو پھر اپنی ہی کہے جاتے ہو ادھر کی بھی تو کچھ سنا کرو ــــ بھائی۔ سرکار کیا کرے۔ یہ تو اسی سن ستہتر (۱۸۷۷ء) کے سب گن ہیں۔ سرکار کو تو اس نے ایسا زیر بار کیا کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ آمدنی سے زیادہ خرچ کرا دیا بلکہ اور قرض لینا پڑا۔ ارے بھئی ــــ سب حساب تک تو سنا دیا پھر کیا چاہتے ہو۔ ــــ ہاں دہلی والوں کو آفرین ہے کہ "دہلی کالج" کے چلانے کے لئے کوشش کر رہے ہیں اور دل سے تو یہ بھی نہ ہوا۔ ہو کہاں سے؟ بریلی والے تو چاہیں ایک نہیں دو کالج بنا لیں۔ جب فائدہ عام میں صرف کرنے کی عادت بھی ہو۔"

(شمارہ ۲۸/۲ ۱۵۔ جنوری ۱۸۷۸ء)

مرآۃ الہند کوئی مزاحیہ اخبار نہیں تھا مگر لکھنؤ کے "اسلوب نگارش" میں کچھ اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ اس کے انداز بیان میں قدم قدم پر لکھنؤ کا ہنستا بولتا اور مسکراتا چہرہ نظر آتا ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں جہاں ایک طرف پنڈت رتن ناتھ سرشار کا نام نظر آتا ہے وہاں حسن سیاح (غازی پوری) اور "ڈاسنہ" کے محمد اسمٰعیل وغیرہ بھی ملتے ہیں ــــ یہ محمد اسمٰعیل وہی بزرگ ہیں جن کی کئی غیر مطبوعہ کتابیں۔ (گل بکاؤلی اور تاریخ بھوپال وغیرہ) سنٹرل لائبریری بھوپال میں محفوظ ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار مرآۃ الہند کے ان لکھنے والوں میں تھے جن کی صحافت کا آغاز ہی ان دو چار پرچوں سے ہوا تھا۔ اس زمانے میں وہ مستقل طور پر "لکھیم پور کھیری" میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے اور اپنے نام کے ساتھ "سرشار" کے بجائے صرف "در" لکھا کرتے تھے۔ مرآۃ الہند مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۸۷۷ء میں ان کا ایک "نیم سیاسی" مضمون (خدیو مصر سے اچھی ہمدردی کی) بھی شامل ہے جس میں انھوں نے انگریزی اخبارات کی اس جھوٹی ہمدردی پر تبصرہ کیا ہے جو وہ "خدیو مصر" سے کر رہے تھے۔ سرشار نے اپنے مخصوص انداز میں اس مضمون کو اس طرح پر شروع کیا ہے۔

"پیر زنے موئے سیہ کردہ اند	گفتمش اے مالک دیرینہ روز
موئے تلبیس سیہ کردگیر	راست نخواہد شدن این پشت کوز"

بعض نامہ نگار اندھوں کی طرح اپنے ہی اپنوں کو "کھٹیاں" بانٹتے ہیں۔ چنانچہ اکثر انگریزی اخباروں کے کارسپانڈنٹوں نے آج کل خدیو مصر کی طرف بڑی شفقت کی نظر سے دیکھنا شروع کیا ہے۔ ان کے مضامین پڑھنے سے ناواقف آدمی بادی النظر میں یہی سمجھے کہ بھئی یہ خدیو مصر کے بڑے ہمدرد ہیں ــ لکن (لیکن) ذرا غور کیجئے تو کھل جائے کہ "دھویا ہی دھویا ہے"۔ مطلب سعدی دیگر است! ظاہرا ہمدردی کرتے ہیں مگر در پردہ ان کے حق میں کانٹے بوتے ہیں۔ چنانچہ ایک کارسپانڈنٹ نے غلبہ ذکاوت اور فرط عنایت سے فرمایا ہے کہ قولہ۔ "خدیو مصر نے زور زور سے سلطان روم کی اعانت ناحق ہی کی گو جنگ کا نتیجہ کیسا ہی ہو لکن (لیکن) سلطان روم ملک مصر سے محروم رکھے جائیں گے کیونکہ خراج کے وصول کرنے میں خدیو موصوف پر بڑی سختی ہوتی ہے حتیٰ کہ خزانہ مصر خالی ہو جاتا ہے۔ اگر روم فتحیاب ہو تو بھی سلاطین یورپ متفق ہو کر ملک مصر کو خود مختار کر دیں گے۔ انتہیٰ ــ

"اللہ اللہ ــ یہ رحم! یہ عنایت! یہ کرم گستری ــ یہ کرم! واہ ہمدردی ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسے ملکوتی صفات وقائع نگار خدیو مصر پر سلطنت عثمانیہ کا جور روا رکھیں ــــ کیا مجال اپنی آنکھوں دیکھیں اور کانوں سنیں کہ ترکوں نے مصریوں پر دست

تودری درار کیا ہے اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے چپ چاپ بیٹھے تماشا دیکھتے رہیں۔ توبہ توبہ محال! بالکل محال۔ بلکہ محض محال! زبردست کو زیر دست کے نیچے سے چھڑانا مظلوم کو ظالم کے ظلم سے بچانا تو ان پر فرض عین ہے سلطان روم سے کہہ دو کہ خبردار ہو جائیں۔ بہت برسوں سے بچارے خدیو مصر کی ناک میں دم کر رکھا ہے اب وہ دن لد گئے"۔ اب بڑے بڑے ارسطو فطرت نامہ نگاروں کے کان میں ان کے جور و سختی کی بھنک پڑ گئی ہے۔ یہ تھکنڈے نہ چھوڑے تو دو مضمونوں میں مصر کو خود مختار کر دیں گے۔ ان کی ہمدردی اس بات کی مقتضی نہیں کہ مصر کو غلامی کی حالت میں رہنے دیں اور "چوں" نہ کریں۔"

مرأۃ الہند میں نسبتاً ادبی، معاشرتی، تاریخی اور سائنسی مضامین کم ہوتے تھے، سیاست کی چاشنی زیادہ ——— پھر بھی ہر شمارے میں کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور تھا ——— محمد مصلح الدین کا ایک معاشرتی مضمون "ہندی لباس" کافی معلومات افزا ہے:

"دنیا میں جس قدر ملک ہیں مختلف طریقے کے لباس ہیں اور سب اپنے اپنے لباس میں اپنے آرام کے واسطے انواع و اقسام کی ایجادیں کر لیتے ہیں۔ رومی، فرنگی، پرتگیزی، فرانسیسی لباس میں "دو پاکٹ" رکھے جاتے ہیں۔ جس کے اندر رومال، کتاب، کاغذ، پنسل وغیرہ کے رکھنے کا پورا انتظام ہوتا ہے۔ عربی، مصری، چینی لباس میں اس قسم کی ایجاد نہیں کی گئی۔ ہندی لباس میں پرانی چال کا جامہ ہے۔ اس میں بڑی بھونڈی بدنما جیب رکھی جاتی تھی جو لٹکتی ہوئی معیوب معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بعد اسی کی تہذیب ہو کر "انگرکھے" میں دائیں جیب رکھنے کا رواج ہوا سو وہ باعث آرام و آسائش کے نہیں ہوتیں۔ بلکہ زیادہ تر اس میں دست بُردی کا اندیشہ ہے۔ بدمعاش آدمی اس کو کتر کر چوری کر لیتے ہیں۔ دراصل اسی کی بدولت ایک فرقہ جیب کترنے والوں کا ہو گیا۔ پنجاب، پورب اور مدراس میں اس کا رواج بھی کم ہے۔ میوات کے آدمی بجائے جیب اور پاکٹ کے اپنے "تہبند" میں آرام کے واسطے ایک "کیسی" گول بلدار ڈوری سے بنا کر باندھ لیتے ہیں۔ میوات ملک کا مشہور لباس "تہبند" ہے۔ یہ کپڑا کمر سے باندھا جاتا ہے اور آگے سمت میں۔ ایک مثلث واسطے پردے کے (جس میں تین شیشہ گول بقدر روپیہ کے جڑے ہوئے ہوتے ہیں) لٹکایا جاتا ہے اور اس کے نیچے سوائے "کوپین" کے کوئی کپڑا پردہ دار قسم پائجامہ اور دھوتی وغیرہ سے نہیں پہنا جاتا۔"

مضامین کے علاوہ ہر مہینے اہم خبروں کا خلاصہ دیا جاتا تھا۔ ان خبروں میں ملکی اور غیر ملکی دونوں قسم کی خبریں شامل کی جاتیں اور اس کی ترتیب میں ایک خاص قسم کا صحافتی سلیقہ برتا جاتا تھا جس سے اس زمانے کی صحافتی شعور کی بیداری کا اچھا خاصا ثبوت ملتا ہے۔ خبروں کے یہ خلاصے صرف دیسی اخبارات ہی سے نہیں لئے جاتے تھے بلکہ اس دور کے موقر انگریزی اخبارات کو بھی ماخذ بنایا جاتا تھا۔ بعض خبریں معلوماتی انداز ہی میں نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے "ادارتی نوٹ" کا درجہ بھی رکھتی ہیں۔ مثلاً

"ہند کی پچیس کروڑ کی آبادی میں سے صرف پچاس ہزار آدمیوں کی آمدنی ہزار روپیہ سال سے زیادہ ہے اور انگلستان کے جزائر متحدہ کی تین کروڑ آبادی میں دس لاکھ آدمیوں کی آمدنی ہزار روپیہ سال سے زیادہ ہے اور ۴۸۰ کی آمدنی پچاس ہزار روپیہ سے چالیس لاکھ تک ——— ایسی صورت میں سال آئندہ انکم ٹیکس کی تجویز ہندوستان میں خلاف مصلحت ہے کیونکہ اس میں یہاں بدنامی بہت اور روپیہ کم ملتا ہے۔ دیکھئے! ہمارے زرخیز ممالک مغربی اور شمالی کی آبادی بھی تین کروڑ ہے۔ یہاں سرکاری رعایا میں سے ایک نہیں ہے جس کی آمدنی چالیس لاکھ سال ہے۔"

مہاراجہ کوچ بہار کی شادی پر تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔ اب سے اسّی برس سال پہلے ایسے سماجی انقلاب کا تصور ہی ممکن نہ تھا کسی اخبار یا رسالے میں ایسی شادیوں کی تائید انتہائی جرأت مندانہ اقدام تھا۔

"ایک اخبار راوی ہے کہ مہاراجہ کوچ بہار کی شادی بابو کیشب چندر سین کی بڑی بیٹی سے ہونے والی ہے .... اس شادی سے تاریخ ہندوستان میں گویا ایک جدید کارروائی شروع ہوگی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ روز بروز ایسی ہی عمدہ کارروائیاں ہوں جس سے موجب فلاح کا ہے۔ اکثر موانعات مذہبی ایسے ہیں جن سے ملک کی ترقی نہیں ہو سکتی بنا برایں مناسب ہے کہ اشخاص معزز اور ذی مرتبہ ایسے موانعات کو دور کریں تاکہ ادنیٰ ادنیٰ لوگوں کو بھی ایسے امورات کا حوصلہ بڑھے۔ مہاراجہ کوچ بہا

گو نوجوان شخص ہیں مگر وہ مستحق ہر طرح کے اعزاز و اکرام کے ہیں کہ انھوں نے ایسا بہادرانہ کام کیا برخلاف ان لوگوں کے جو ان سے پہلے گذر گئے اور اپنے آباؤ اجداد ہی کی لکیر کو پیٹا کرتے تھے۔"

خبریں سیاسی بھی ہوتی تھیں اور سماجی بھی ــــ ان کے چند نمونے بھی ملاحظہ طلب ہیں۔

"دہلی کالج" ــــ دہلی کالج کے واسطے لارڈ نارتھ بروک صاحب سابق گورنر جنرل بہادر ہند نے دو ہزار روپیہ اس غرض سے عطا فرمائے تھے کہ ہر سال اس کے سود سے ایک تمغہ سوا کر کالج کے عمدہ ترین طالب علم کو دیا جائے چونکہ کالج شکست ہو گیا اس لئے گورنمنٹ ہند کی تجویز ہے کہ وہ روپیہ لارڈ نارتھ بروک صاحب کو واپس بھیجا جائے۔"

اس خبر پر مرآۃ الہند نے ایک نوٹ بھی لکھا ہے جس کے لفظ لفظ سے صحافتی بیدار مغزی ٹپکتی ہے:

"جس زمانے میں لارڈ نارتھ بروک صاحب مسند آرائے گورنر جنرل تھے ہم یہ سنتے تھے کہ یہ صاحب تنخواہ نہیں لیتے ہیں اور شاید جب نکل واپس جائیں گے اپنی تنخواہ کا کل روپیہ کسی کار خیر کے لئے ہندوستان کو وقف کر جائیں گے۔ وہ روایت تو بالکل غلط نکلی۔ ہاں ماہ بماہ تنخواہ نہیں لیتے تھے چلتے وقت کل یکمشت لے گئے اگر دہلی اسکول کے طلباء اوس تمغے کے مستحق نہ سمجھے جائیں تو کیا بعد استصواب لارڈ نارتھ بروک کے پنجاب کے "حی القائم" کالج میں انتقال اس روپیہ کا مناسب نہ ہوگا؟ اور جس صورت میں اکثر سکنائے دہلی یہ کوشش کر رہے ہیں کہ خیر اندیشان ہند کی اعانت سے دہلی کالج از سر نو قائم کیا جائے تو گورنمنٹ ہند کو اس روپیہ کے انتقال میں عجلت نہ چاہیئے۔" مرزا تریا جاہ بہادر وغیرہ کو چاہیئے کہ گورنمنٹ ہند میں عذر پیش کریں۔" (۱۵ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

"ــــ کل کا گھوڑا ــــ" دہلی گزٹ کا بیان ہے کہ نئی دنیا کے مقام "بوسٹن" میں ایک صاحب نے کل کا گھوڑا ایجاد کیا ہے خود سوار کے بوجھ سے اس کل میں حرکت ہوتی ہے اور جس طرح آدمی گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اوسی طرح یہ "کل" بھی باگ کے اشارے پر چلتی ہے۔ بوسٹن کی نمائش گاہ میں اس "کل" کا بخوبی امتحان ہو چکا ہے۔ موجد کہتا ہے کہ تیس روپیہ کی قیمت میں ایسے گھوڑے بنا سکتا ہوں کہ وہ ایک آدمی کو دس بارہ میل ایک گھنٹہ میں لے جا سکیں۔"

"ــــ ہندوستانی اخبارات کا سروے" ــــ گورنمنٹ ہند نے ہر ایک لوکل گورنمنٹ سے فرد طلب کی ہے جس میں ہندوستانی اخبارات کا نام اور طریقہ اور تعداد قیمت اور تعداد خریداران درج ہو گی۔

ــــ "غبارہ" ــــ حیدر آباد میں حضور نظام اور سالار جنگ اور کوئی ساٹھ ہزار تماشائی بمقام "حیدر گھاٹ" غبارہ کی سیر دیکھنے کو جمع تھے غبارہ نے زمین نہ چھوڑی سب لوگ واپس آئے۔"

ــــ "غلے کی گرانی" ــــ کشمیر سے ایک معتبر شخص لکھتا ہے کہ خاص کشمیر میں فی روپیہ دھان اور جوار ۶۵ سیر - جو - ۴۲ سیر ــــ اور گندم $\frac{1}{2}$ ۱۸ - سیر ہے۔ راولپنڈی اور رامپور کے درمیان "کوہی ضلاع" میں نرخ غلہ کا البتہ بہت گراں ہے مگر یہاں بھی چھ ہفتہ میں فصل جب تیار ہو گی غلہ ارزاں ہو جائے گا ــــ وزیر "پنو" گورنر کشمیر نے تھوڑا عرصہ ہوا خود بیان کیا تھا کہ میرے پاس اس قدر غلہ جمع ہے کہ تین سال کو کافی ہوگا بلکہ پہاڑی لوگ کشمیر سے اب تک غلہ خرید لے جاتے ہیں۔"

"برف" ــــ امریکہ میں برف کی تجارت ہر سال ترقی پر ہے اور اب بھی اوسکی مقدار بہت زیادہ ہے۔ یعنی جو سرمایہ اس تجارت میں لگا ہوا ہے وہ قریب چھ کروڑ روپیہ کے ہے اور پچاس لاکھ ٹن برف ہر سال صرف سلطنت متفقہ (ممالک متحدہ امریکہ) کے استعمال سے کاٹی جاتی ہے۔"

(۱۵ر فروری ۱۸۵۸ء)

• اس ماہنامہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کسی قسم کے اشتہارات یا سرکاری اعلانات کو جگہ نہیں دی جاتی تھی حالانکہ اس زمانے تک اخبارات و رسائل میں سرکاری اعلانات اور اشتہارات کی اشاعت کا کافی رواج ہو چکا تھا۔

ہاتھی کی لاڑی

وجاہت علی سندیلوی

آئے دن سننے میں آتا رہتا ہے کہ فلاں کروڑپتی کا دیوالہ نکل گیا۔ آج فلاں کمپنی بیٹھ گئی۔ آج فلاں کارپوریشن لیٹ گئی۔ آج فلاں ملک کے بجٹ میں خسارہ پڑ گیا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ کروڑپتی، یہ کمپنی اور کارپوریشن والے اور یہ ملکوں کے بجٹ بنانے والے حضرات ان دیوالوں اور اپنے بیٹھنے، لیٹنے اور خساروں کا اتنا ڈھونگ رچانے کے بجائے ہمارے راجہ صاحب بعل گڑھ کو اپنا اتالیق کیوں نہیں بنا لیتے جو یہ پریشانیاں اور سرگرانیاں ایک سرے سے لاحق ہی نہ ہوا کریں اور آمد و خرچ کی ریاں راجہ صاحب کی لابی اور گنجان مونچھوں کی طرح ہمیشہ برابر ہی تنی رہا کریں۔ خاتمۂ زمینداری کے بعد سے ہمارے راجہ صاحب کچھ بیکار سے ہیں اور اسمبلی کا پچھلا الکشن ہار جانے کے بعد سے انھیں دفعتاً یہ خیال بھی پیدا ہو گیا ہے کہ قوم کو ان کی خدمات کی اشد ضرورت ہے۔ ان کے پرانے راج وید کی تشخیص ہے کہ یہ خیال فاسد ان کی پرانی شکایت ضعفِ معدہ کی ایک نئی علامت ہے۔

وہ بھی کیا دن تھے کہ جب ہمارے راجہ صاحب واقعی راجہ صاحب ہی تھے اور ہزاروں انسانوں کے ان داتا کہلاتے۔ وہ اپنی ریاست میں کاشتکاروں سے زمین کا لگان وصول کرنے کے علاوہ سترہ دوسرے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ ان ٹیکسوں میں بعض ٹیکس تو اس قدر عجیب و غریب اور نادر الوجود تھے کہ ان کو محض سن کر راجہ صاحب کی رسائی فہم کی بے ساختہ داد دینا پڑتی مثلاً ہر کاشتکار کو اپنے دودھ دینے والے ہر مویشی پر سالانہ پانچ ٹکا دینا پڑتا۔ لڑکے کی شادی پر ایک بکرا اور لڑکی کی شادی پر چار سیر مٹھائی پیش کرنا پڑتی۔ بیٹے لڑکے کی پیدائش پر ایک بکرا اور بقیہ لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش پر پانچ پانچ سیر غلہ دینا پڑتا ورنہ اولاد کی پیدائش والدین کی موت ثابت ہونے لگتی۔ ان پیدائشی ٹیکسوں کی بدولت راجہ صاحب کے علاقے میں ضبطِ تولید کے فوائد سے ان کی رعایا خود بخود آگاہ ہو گئی تھی۔ کوئی مویشی مر جاتا تو اس کی کھال کے نصف دام راجہ صاحب کے خزانے میں جمع ہو جاتے ورنہ مردہ مویشی کے بدلے مالک کی کھال ادھیڑی جانے لگتی۔ راجہ صاحب کی عملداری میں کوئی دلہن اس وقت تک بیاہ کر آ ہی نہیں سکتی تھی جب تک دولہا کی طرف سے جہیز کے مالِ غنیمت میں سے راجہ صاحب کا خراج نہ ادا کر دیا جاتا۔ گاؤں کے ہر پیشہ ور اور دوکاندار کو حیثیت ٹیکس ادا کرنا لازمی تھا۔ اس حیثیت کی ناپ جوکھ کا ایک باقاعدہ چارٹ تھا جو راجہ صاحب کی کاوشِ فکر کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا۔ گاؤں میں کسی موقع پر کوئی جلسہ منعقد کرنے یا باجہ بجوانے پر کاشتکاروں کو پانچ روپیہ جرمانہ ادا کرنا پڑتا۔ مکان بنوانے کا ٹیکس علیحدہ تھا اور چھپر ڈالنے یا دیوار اٹھانے کا ٹیکس علیحدہ تھا۔ دروازے میں کواڑ لگوانے کا تاوان دس روپیہ تھا۔ کسی گھر میں چیچک نکل آتی اور بغیر جان لئے ختم ہو جاتی تو بطور شکرانہ ایک روپیہ راجہ صاحب کو بھینٹ کرنا پڑتا وغیرہ وغیرہ۔

ان مستقل ٹیکسوں میں وہ ہنگامی نذرانے، چندے اور جرمانے شامل نہیں تھے جو وقتاً فوقتاً وصول ہوتے رہتے تھے مثلاً جب راجہ صاحب کے یہاں کوئی تقریب ہوتی، خواہ وہ سب سے چھوٹی راجکماری کی نک چھدی ہی کیوں

نہ ہو، ہر کاشتکار کو حسب موقع اور حسب حیثیت نذر دینا پڑتی۔ اسی طرح بخشش۔ لاٹ صاحب کی دعوت یا نئی موٹر کی خریداری یا اسی قسم کے دوسرے فرائض ضروری کے موقعوں پر کاشتکاروں کو دریا دلی سے چندے دینا ان کی صحت کے حق میں مفید ثابت ہوتا اور پھر جرمانوں کا تو کوئی حساب ہی نہ تھا۔ ہر ممکن غلطی کے لئے نوشتۂ تقدیر کی طرح ایک جرمانہ مقرر تھا۔ کسی کی عورت بھاگ گئی تو جرمانہ۔ کوئی کسی عورت کو بھگا لایا تو جرمانہ۔ بیگار کے لئے کوئی بلایا گیا اور ٹھیک وقت پر نہیں پہنچا تو جرمانہ۔ ٹھیک وقت پر پہنچا لیکن کام ٹھیک نہیں کیا تو جرمانہ۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ کوئی زور سے بول دیا تو جرمانہ، ناک پر مکھی بیٹھ گئی تو جرمانہ، بے وقت چھینک آگئی تو جرمانہ۔ سنتے ہیں ایک دفعہ راجہ صاحب لاٹ صاحب سے ملنے جا رہے تھے اور ابھی پھاٹک سے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ ایک کم بخت کاشتکار کو چھینک آگئی۔ وہ تو کہئے تمام حاضرین راجہ صاحب کے قدموں پر گر پڑے اور بڑی مشکل سے سو روپیہ جرمانے پر بات طے ہو گئی ورنہ غالباً چھینکنے والے کو اپنی ناک سے ہی ہاتھ دھونا پڑتا۔ تاریخ میں شاید اس سے زیادہ قیمتی چھینک اب تک نہیں چھینکی گئی ہے۔

راجہ صاحب کے ان گنت مطالبات کے علاوہ ان کے سربراہ کاروں، ضلعداروں، کارندوں سپاہیوں اور سرداروں کی بھی کچھ تنخواہیں یا عرف عام میں حقوق تھے جو حصہ بقدر جثہ کے اصول کے مطابق فصل کٹنے کے وقت ہر کاشتکار سے کھیت ہی پر وصول کر لئے جاتے۔ راجہ صاحب اپنے خزانے سے اپنے کسی ملازم کی تنخواہ دینا بڑی بدشگونی سمجھتے۔ اور پھر یہ سب ملازمین ملازم بھی تھے تو اس کام کے لئے کہ کاشتکاروں سے روپیہ کھینچتے رہیں اور صرف یہ ان کی ہڈیوں پر گوشت نہ چڑھنے دیں بلکہ ان ہڈیوں سے گودا بھی نکال لیں لہذا ان کی تنخواہیں بھی ان کے حقوق کی صورت میں کاشتکاروں ہی سے وصول کی جاتیں۔ راجہ صاحب کے دشمنوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ ملازمین کا اتنا بڑا عول بیا بانی پالتے پھرتے۔ فائدہ تو سراسر کاشتکاروں ہی کا تھا کہ ان ملازمین کی فوج ظفر موج کی بدولت وہ اپنے لگان، مختلف ٹیکسوں اور جرمانوں کی ادائیگی بلکہ اکثر قید حیات اور بند غم سے جلد سے جلد آزاد ہو جاتے۔ البتہ کبھی کبھی راجہ صاحب اپنے ان ملازمین سے بھی خود دست خود دہان خود کے مصداق بچھڑا عالم کی طرح چھوڑ دیئے گئے تھے چھوٹے موٹے جرمانے وصول کر لیتے اور ان کو یاد دلا دیتے کہ ان کے حقوق کے ساتھ ہی ساتھ ان پر کچھ فرائض بھی واجب ہیں۔

لگان ٹیکس، نذرانوں، چندوں اور جرمانوں وغیرہ کی ادائیگی میں سہولت کے خیال سے راجہ صاحب نے از راہ غریب پروری ایک محکمہ الگ ہی کھول رکھا تھا جس کا کام غریب رعایا کو روپیہ قرض دینا تھا اور جس کی شرح سود صرف بیس روپیہ فی صدی سالانہ تھی جو سود در سود کے حساب سے اکثر پچاس یا ساٹھ روپیہ فی صدی سالانہ بھی ہو جاتی۔ غرض کہ کاشتکاروں کی پوری کمائی کو کسی نہ کسی بہانے سے ہضم کر جانا راجہ صاحب نے ایک فن لطیفہ بنا رکھا تھا اور اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو "ان داتا" کہلواتے اور خیال کرتے کہ انھوں نے اپنے وسیع علاقے میں جس فراخدلی سے اپنی رعایا کے ہڈی کے ڈھانچوں کو چند سانسیں لینے کی اجازت دے رکھی ہے اس کے احسان کے بوجھ سے وہ کم بخت اس جنم میں کیا سات جنم میں بھی سبک دوش نہیں ہو سکتے۔

راجہ صاحب نے ایک دفعہ ایک موت ٹیکس لگانا بھی تجویز کیا تھا لیکن جب اس کی دہشت سے اس قدر لوگ مرنے لگے کہ اس کا اثر زندگی کے دوسرے ٹیکسوں پر ناخوشگوار پڑا تو انھوں نے مجبوراً اس کو کسی مہالک کے موقع کے لئے ملتوی کر دیا تھا ۔۔۔ لیکن بدقسمتی سے اس مہالک کے موقع کی آمد سے پہلے ہی خاتمۂ مدارس کا قانون آ گیا اور راجہ صاحب کی بہت سی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ یہ تجویز بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکی اور وہ بیچارے "آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا" کی مجسم تصویر بن کر رہ گئے۔

راجہ صاحب کے پاس ایک بڑا گراں ڈیل ہاتھی چھبن نامی تھا جو ان کے ہاتھیوں کے غول کی ناک سمجھا جاتا اور جس کو ان کے پتا جی نے اپنی ساتویں شادی کے جہیز میں حاصل کیا تھا۔ جب یہ بڈھا ہو گیا اور کار ریاست کے قابل نہیں رہا تو خیر خواہان ریاست نے راجہ صاحب کو مشورہ دیا کہ اب اس کو فروخت کر ڈالا جائے تو بہتر ہے۔ دو تین ہزار روپے قیمت بھی وصول ہو جائیں گے اور اس کے اخراجات سے بھی چھٹی مل جائے گی۔ راجہ صاحب نے یہ تجویز سنی تو ان کے چہرہ پر چند لمحوں کے لئے غور و فکر کی گھٹائیں چھائیں لیکن پھر ایک دم سے فیصلہ کن تبسم کی پے در پے بجلیاں کوندنے لگیں اور انہوں نے بادلوں کی گڑگڑاہٹ والی آواز میں فرمایا "چھبن کے لئے لاٹری پڑے گی۔ ہر کھاتے دار کو ایک روپیہ فی ہل دینا پڑے گا"۔

صدور حکم کی دیر تھی ضلعداروں نے آنکھیں نکالیں۔ سپاہیوں نے آستینیں پڑھائیں اور سرداروں نے اپنے ڈنڈے سنبھالے اور بات

کی بات میں تین صرف تین ہفتوں میں چھبن کی لاٹری کے لئے سوا چھ ہزار روپے کا تعلقداروں کی جیبوں سے نکل کر راجہ صاحب کے خزانے کی فولادی تجوری میں جمع ہو گیا اور انہوں نے پنڈتوں سے مشورہ کرنے کے بعد لاٹری نکالنے کی مہورت، مناسب تاریخ اور دن گھڑی ساعت مقرر کر دی۔

لاٹری کا دن آیا تو ملازمین نے رات کی رات میں ... کھاتے داروں کو قلعے کے بڑے میدان کے ایک طرف شامیانے میں بند کر دیا گیا۔ بیچ میں بڑے طشت کو کھڑا کیا گیا اور دوسری طرف ایک زرق برق اور بہت وسیع شامیانے میں راجہ صاحب کا دربار آراستہ کیا گیا جس میں رئیسوں، راجکماروں، راجکماریوں اور راجہ صاحب کے دیگر رشتہ داروں، مصاحبوں، حاشیہ نشینوں اور حکام ریاست کی نشستوں کا حفظ مراتب کے لحاظ سے بہت مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ سارا شامیانہ ریشمی پردوں خوبصورت قالینوں اور زرنگار پلیٹ فارم پر مرصع چھتر کے نیچے راجہ صاحب کے گنگا جمنی تخت سے جگمگ جگمگ ہو رہا تھا اور ننگے اور بھوکے کاشتکار اس پرستانی منظر کو دیکھ دیکھ کر پاگلوں کی طرح خوش ہو رہے تھے۔ شہنائیوں کی مستانہ لے اور باجوں کی جھنکار کے درمیان راجہ صاحب ایک عالیشان ہاتھی پر اور ان کے پیچھے ان کے دوسرے متعلقین گھوڑوں اور موٹروں پر میدان میں پہنچے تو ساری فضا "ان داتا کی جے ہو" "ان داتا کی جے ہو" کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی۔ چھبن نے سونڈ اٹھا کر راجہ صاحب کو سلام کیا تو سارا مجمع مارے خوشی کے تالیاں پیٹنے لگا۔ لیکن پھر جب نقارے پر چوب پڑی تو سارے میدان میں خاموشی چھا گئی۔

کھاتے داروں یعنی لاٹری میں حصہ لینے والوں کے ناموں کو لکھ کر کاغذ کی گولیاں بنا دی گئی تھیں جو چاندی کے ایک بہت بڑے طشت بلکہ ٹب میں رکھی ہوئی تھیں۔ راجہ صاحب نے پنڈتوں کے منتروں کے جاپ کے درمیان شرماتے ہوئے اس طشت سے ایک گولی نکالی اور اس میں لکھا ہوا نام پڑھنے کے لئے اسے بڑے راجکمار کو دے دیا۔

دفعتاً ایک غلغلہ بلند ہوا "کلو دھوبی ساکن ٹکیٹ پور کو ہاتھی ملا" "کلو دھوبی ساکن ٹکیٹ پور کو ہاتھی ملا"۔ دربار کے شاعر پنڈت گرجا شنکر نے فوراً اس مصرع طرح پر اپنا قصیدہ پیش کیا "جن پاؤں پنھی نا ہیں تنھیں دیت گجراج" (یعنی جن پیروں کو جوتا بھی میسر نہیں ان کو تو نے ہاتھی بخش دیا)۔ لاٹری کا نتیجہ سن کر پورے مجمع میں ایک ہلچل اور کھلبلی مچ گئی تھی اور ہر کوئی خوش قسمت کلو دھوبی ساکن ٹکیٹ پور کو دیکھنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا کہ یک بیک ایک طرف سے روتا چیختا چیتھڑے لگائے کلو دھوبی نمودار ہوا اور سپاہیوں کی روک ٹوک کو ایک بلا کی بے خودی سے چیرتا پھاڑتا دوڑ راجہ صاحب کے تخت کے سامنے پہنچ کر اوندھے منہ گر پڑا اور بلک بلک کر گڑگڑانے لگا "ان داتا! ہمرا موڑ کاٹ ڈالیں گل ہم کا ہاتھی نہ دیں۔ ہم ہاتھی نا ہیں رکھ سکت ہیں" (ان داتا میرا سر کاٹ لیں لیکن مجھے ہاتھی نہ دیں۔ میں ہاتھی نہیں رکھ سکتا ہوں)۔

راجہ صاحب کا جذبۂ فیل پروری جوش میں آ گیا۔ انہوں نے چھبن کو واپس اصطبل بھجوا دیا جو اپنی سونڈ اٹھا کر ان کو سلام کرتا ہوا چلا گیا۔ غالباً خوش تھا کہ وہ اس بڑھاپے میں دھوبی کا گدھا بننے سے بچ گیا اور کلو دھوبی کو سو روپے انعام دلا دیئے۔ لاٹری کی تقریب ان داتا کی واہ واہ اور کلو دھوبی کی آہ آہ پر بحسن و خوبی ختم ہو گئی۔

بعد میں پتہ چلا کہ راجہ صاحب نے کسی راجکماری کے جہیز میں چھبن کو دیدیا اور وہ راجکماری کے ڈولے کے پیچھے سلام کرتا ہوا چلا گیا۔

....

خدا بخشے ہمارے چودھری صاحب بالکل صحیح فرماتے تھے کہ اگر زمینداریاں اور تعلقداریاں ختم ہو گئیں تو بڑے بڑے فنون لطیفہ ختم ہو جائیں گے۔

مندر

پریتم داس ہرنٹی

آسام میں برہم پترا ندی کے کنارے ضلع کامروپ میں ایک شہر ہاڈو آباد ہے۔ ہاڈو کی دلفریب پہاڑی پر 'کامکھیہ' نامی ایک خوبصورت مندر ہے۔ جہاں ہر سال ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ یہ نظم اسی مندر اور میلے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔

(۱)

اُجلا ماحول، مسکراتی فضا تازگی حسن رنگ روپ سنگار

نرم و شفاف سرمئی جھیلیں لہکے لہکے کنول، شگفتہ بہار

(۲)

نکھرا نکھرا پہاڑ کا منظر بکھری بکھری سحر کی رعنائی

مچلی مچلی صبا کی رقاصہ دھیمی دھیمی ہوا کی شہنائی

(۳)

پتیاں پھول اوس کے قطرے ننھی ننھی کٹوریوں میں عرق

آفتاب، اک طلسمی آئینہ دھوپ، سونے کا جگمگاتا ورق

(۴)

نور و نکہت کے نغمہ زاروں میں اُڑ رہا ہے صبا کا پیراہن

ہر کرن میں ہے رنگِ قوسِ قزح ہر کلی میں نہاں ہزار چمن

(۵)

زندگی ہے کہ رنگ و بو کی بہشت ہر نظارا دہائی دیتا ہے

دور پھولوں بھری پہاڑی پر ایک مندر دکھائی دیتا ہے

(۶)

یوں دمکتا ہے دھوپ میں مندر جیسے ترشا ہوا نگینہ ہو

یا کسی نور کے جزیرے میں ایک ہیروں بھرا سفینہ ہو

(۷)

دور مندر میں مسکراتی ہیں جنتیں، ضوفشاں نظاروں کی

رقص کرتی ہیں ہرنیوں کی طرح شوخ شہزادیاں بہاروں کی

(۸)

لہکے لہکے طلائی آویزے بکھری بکھری لٹیں پریشاں سی

نرم و نازک کلائیاں لرزاں کانچ کی چوڑیاں غزل خواں سی

(۹)

زندگی راگ، رنگ، روپ نکھار کیا کہوں کیا نہیں ہے میلے میں

دلِ تنہا اُداس ہے، لیکن روح گھبرا گئی اکیلے میں

(۱۰)

من کا مندر ہے سونا سونا سا کس کو سجدہ کروں، کدھر جاؤں

یہ اُداسی، یہ غم، یہ تنہائی آج زندہ رہوں کہ مر جاؤں

دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء

ہندو تلمیحات اور اردو ادب

محمود [illegible]

اردو ہندوستان کی زبان ہے جس نے رام اور کرشن کی مقدس سرزمین پر جنم لیا۔ گنگا اور جمنا کی گودوں میں پلی بڑھی اور عظیم ہمالیہ کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھ کر جوان ہوئی۔ برصغیر کی مشترکہ تہذیب، باہمی اتحاد و اخوت اور آپسی رواداری کی یہ ایک حقیقی جاگتی نشانی ہے جس میں عربی کی فصاحت و بلاغت، فارسی کی شیرینی و لطافت، سنسکرت کی عظمت و قدامت اور برج بھاشا کی سادگی اور لوچ غرض کہ سب ہی کچھ موجود ہے جو ایک مکمل زبان میں ہونا چاہیے۔ اردو ادب زلف و رخسار کی باتوں، گل و بلبل کی کہانیوں اور خال و خط کی حکایتوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس نے گرد و پیش کی حقیقی نمائندگی بھی کی ہے، ہماری زندگی، ہمارے اخلاق اور ہماری معاشرت کی ترجمانی بھی کی ہے۔ اردو ادب قدیم تاریخ و تمدن کے واقعات و حالات، قومی مشاغل اور رسم و رواج کی داستانوں اور ہندوستان کے موسموں، فصلوں، میلوں، تہواروں کے تذکروں سے بھی مالا مال ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو ادب پر زیادہ تر عربی اور ایرانی اثر محیط رہا ہے۔ اس میں نبیوں کے قصے، فرشتوں کے تذکرے، جنت و دوزخ کے نظارے، حشر و نشر اور قیامت کے حالات، مشاہیر عرب و ایران کی حکایتیں اور افسانے بکثرت ملتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہم عام بول چال میں سیکڑوں ہندی محاورے اور کہاوتیں بھی بلا تکلف استعمال کرتے ہیں مثلاً رپٹ پڑے کی ہر گنگا، اجگر کے داتا رام، پانچوں پنڈے چھٹے نرائن، اپنی رادھا یاد کرو، کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی، نو بدھ بارہ سترہ، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ہندو فلسفہ، ہندو تاریخ، ہندو شاعری اور ہندو مذہب سے متعلق سیکڑوں الفاظ اردو ادب میں شامل ہو کر اس کا ایک جز بن گئے ہیں۔ دیومالا، رامائن، مہابھارت، وید، پران اور اسی قسم کی دوسری کتابوں سے اخذ ہو کر بے شمار تلمیحیں بھی اردو ادب میں مستعمل ہیں اور عام طور پر بولی اور لکھی جاتی ہیں مثلاً متبرک مقامات میں گنگا، ماتا، بدری ناتھ، ایودھیا، بندرابن، کاشی، ہردوار، متھرا، گوکل، امراؤتی اور مندراچل۔ دیوتاؤں اور ان کے صفاتی ناموں میں اگنی، اندر، وایو، سوریہ، سوم، برہما، شیو، وشنو، رودر، برہسپتی، نیل کنٹھ، ترمورتی، گھیردل، اگھور ناتھ، چندر شیکھر، مہادیو، بھوتیشور۔ مشہور عورتوں اور دیویوں میں پاروتی، درگا، کالی، گوری، ستی، ساوتری، سیتا، دروپدی، اہلیا، لکشمی، جگت ماتا، لیلاوتی۔ مشہور بہادروں اور عالموں میں اشوتھاما، بھیشم، درودھن، دشرتھ، ارجن، بھیم، ہنومان۔ کتابوں میں رامائن، مہابھارت، گیتا، وید، شاستر اور پنچ تنتر۔ اوتاروں میں وامن، متسیہ، نرسنگھ، پرسرام اور کلکی۔ اس کے علاوہ ہزاروں ایسے الفاظ ہیں جو زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں اور استعمال ہوتے ہیں مثلاً شیش ناگ، کل یگ (کلجگ)، یم دوت، رشی، منی، سادھو، دیو، دانو، راکشس، راہو، کیتو، دان، الوپ، انجنی، سوم رس، کلپ برکش، ادم، کیلاش، بیکنٹھ، سورگ، نرک، پاتال، پرتھوی، آکاش، ترسول، نادیا بیل، سنکھ، ایراوت، سدرشن، گنگو مکھی، نندک، شارنگ، تلک، آرتی، چوکا، پھول، شرادھ، کرما کرم وغیرہ وغیرہ۔ اس مختصر

دسمبر ۱۹۶۰ء

دردِ دل اس بت سے رحم کو کہئے تو کہے
جا کے یہ رام کہانی تو سنا اور کہیں (جرأت)

تونے دل زندہ جب سے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تیری رام کہانی چھوڑی (حالی)

رام چندر جی چونکہ وشنو کے اوتار تھے اس لئے رام کا نام خدا کے لئے بھی مستعمل ہے اور اس نام سے کئی ضرب الامثال مشہور ہیں مثلاً اجگر کے داتا رام۔

اپنے تو کوئی ہرگز آیا نہ کام داتا
سچ ہے نظیر آخر اجگر کے رام داتا (نظیر اکبرآبادی)

کام دیو۔ کام دیو عشق و محبت کے دیوتا کا نام ہے قدیم روم میں اسے کیوپڈ (Cupid) اور یونان میں اروس (EROS) کہا جاتا تھا رگ وید میں لکھا ہے کہ خالق کائنات کے دل میں تخلیق عالم کی پہلی خواہش پیدا ہوئی تو اس سے کام خود بخود پیدا ہو گیا اس وقت تک دنیا کی کوئی شے پیدا نہ ہوئی تھی اس لئے کام دیو ہمیشہ کے لئے سب میں ممتاز اور بڑا ہے ایک روایت یہ ہے کہ کام دیو برہما کے دل سے پیدا ہوا تھا لیکن بعض دوسرے پرانوں کے مطابق یہ لکشمی کا بیٹا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ پانی سے پیدا ہوا تھا اس لئے "ارلج" (آب زائیدہ) کہلاتا ہے ایک قول یہ ہے کہ یہ "آتم بھو" (خود پیدا ہونے والا) ہے یا دوسرے دیوتاؤں کے مانند "اجا" (غیر زائیدہ) ہے پرانوں کی روایت کے مطابق اس کی بیوی کا نام رتی یا ربوا ہے جو خواہشات کی دیوی ہے۔ ایک بار کام دیو نے شیو جی کے مراقبہ میں خلل ڈالا تھا اور ان کے دل میں پاربتی جی کی محبت پیدا کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیو جی نے اپنی تیسری آنکھ سے اسے جلا کر بھسم کر دیا کام دیو کی بیوی کی منت و زاری پر شیو جی نے یہ بردان دیا تھا کہ کام دیو زندہ رہے گا مگر نظر نہ آئے گا

کام دیو کو جنت حوروں اور آسمان کی پریوں کا مالک سمجھا جاتا ہے اس کے ایک ہاتھ میں کمان اور پھولوں کا تیر رہتا ہے کام دیو عام طور پر نوعمری کی صورت میں رہتا ہے اس کی سواری طوطا ہے اس کے دوسرے ہاتھ میں سرخ رنگ کا ایک علم رہتا ہے جس پر مچھلی کا نشان بنا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں عشق محبت کی آگ لگانے والا اور خواہشات کا محرک یہی دیوتا ہے۔ کام دیو کے بہت سے صفاتی نام ہیں جیسے انگی روپ (حسن) اننگ (بغیر جسم والا) دیپک (شعلہ زن) کامنا (خواہشات) کاکیل (کیف و مستی) مدھو دیپ (شمع بہار) پُرو پاستر (حسن کا ہتھیار) سنسار گرو (دنیا کا استاد) سرنگار یونی (حسن کا مخرج) وغیرہ۔

رعد کی کٹوریوں میں وہ امرت گھلا ہوا
جس کا ہے کام دیو بھی پیاسا غضب غضب (اثر لکھنوی)

اَمرِت اور سمندر بلونا۔ امرت زہر کی ضد یعنی آب حیات کو کہتے ہیں۔ وہ پانی جس کے پینے سے انسان حیات جاوداں پا لیتا ہے اور کبھی نہیں مرتا۔ یہ سمندر منتھن سے حاصل ہوا تھا سمندر منتھن کی روایت مختلف کتابوں میں درج ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک بار دیوتاؤں اور راکھشسوں نے مل کر سمندر متھا اور اس میں سے امرت کا کلس (گھڑا) نکالا۔ سمندر منتھن کے لئے کوہ مندرا چل کو متھانی اور شیش ناگ کو اس کے گرد لپیٹ کر رسی بنایا گیا تھا۔ سمندر بلونے سے چودہ رتن برآمد ہوئے تھے ان میں یہ امرت بھی تھا باقی رتنوں میں دھنونتری طبیب، لکشمی، سوم، شراب (مہا لکشمی) شرد، کوستبھ منی، پارجات یا کلپ برکش، سُربھی، ایراوت، کمان، دھن اور شنکھ تھے۔ بعد میں دیوتاؤں اور راکھشسوں سے امرت کی تقسیم پر لڑائی ہونے لگی۔ آخر شیو جی کی مدد سے دیوتاؤں کو امرت پینے کو مل گیا۔ اردو ادب میں بھی لفظ امرت "آب حیات" یا لطیف و شیریں چیز کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا

دے کے بوسہ اس نے جب دشنام دی
میرے حق میں زہر امرت ہو گیا (تسلیم)

"سمندر منتھن" کی وجہ سے "سمندر بلونا" بھی محاورہ بن گیا ہے۔ اس محاورہ کے معنی چھان بین اور تلاش و جستجو کے ہیں

پایا نہ دل بہایا ہوا سیل اشک سے
میں بیچ مژہ سے سمندر بلو چلا (میر)

کرشن۔ کرشن کے لغوی معنی سیاہ کے ہیں۔ اس نام کا ذکر ویدوں میں بھی موجود ہے لیکن دیوکی کے بیٹے کرشن کا ذکر اور پہلا حوالہ ہمیں چھاندوگیہ اپنشد سے ملتا ہے جس میں ان کو ایک عالم دین اور طالب علم کی حیثیت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ کرشن جی ہندو دیو مالا کے سب سے مقبول اور مشہور ہیرو ہیں۔ چونکہ سانولے سلونے تھے اس لئے جسودھا انہیں پیار سے "کنھیا" کہتی

تھیں جس کے معنی ملیح، خوبصورت اور نوخیز کے ہیں۔ کرشن جی کے اور بھی بہت سے صفاتی نام اردو ادب میں مستعمل ہیں جیسے شیام، من موہن، مراری، نوکشور، بہاری، مرلی دھر، کنج بہاری، گوپی ناتھ، گوپال، منوہر، گھنشام، نند کے لال، بنواری وغیرہ وغیرہ۔

میں کیا کیا وصف کہوں یارو اس شام برن اوتاری کے
سری کشن، کنھیا، مرلی دھر، من موہن کنج بہاری کے
گوپال، منوہر، سانوریا، گھنشام، اٹل بنواری کے
نند لال، دلارے سندر چھب، برج چند مکٹ جھلکاری کے (نظیر اکبرآبادی)

کرشن جی کے حالات پرانوں میں تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بھگوت پران سب میں مستند سمجھا جاتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک دن نارد منی نے متھرا کے ظالم و جابر راجہ کنس سے پیشین گوئی کی تھی کہ تیرا قاتل تیری چچازاد بہن دیوکی کا ایک بیٹا ہوگا اور وہی تیری سلطنت کو ختم کرے گا۔ اس خطرہ کو محسوس کرکے کنس نے اپنے چھ بھانجوں کو لگاتار قتل کرا دیا تھا جو دیوکی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ساتویں بار جب کرشن جی نے جنم لیا تو ان کے ماں باپ نے ان کو چھپا لیا اور رات کے اندھیرے ہی میں نند جی کے یہاں پہنچا دیا جو متھرا کے قریب ایک گاؤں گوکل میں رہتے تھے۔ نند جی گوکل کے زمیندار تھے اور گوالوں کے سردار بھی۔ کرشن جی اسی طرح پرورش پاتے رہے۔ بچپن میں وہ اکثر نند جی کی گایوں کے ساتھ جنگل کو چلے جاتے تھے اور وہاں بیٹھ کر اپنی بانسری بجایا کرتے تھے۔ ان کی بانسری کی مدھر دھنوں پر گوکل کی نوخیز گوالنیں مست ہوکر ان کے گرد اگرد جمع رہتی تھیں۔

موہن کی بانسری کے میں کیا کیا کہوں جتن — لے اس کی موہنی ہے لو دھن اسکی چت ہرن
اس بانسری کا آن کے جس جا ہوا کہن — کیا جل پون، نظیر پکھیرو، وکیا ہرن
سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنھیا نے بانسری (نظیر اکبرآبادی)

کرشن جی کی آٹھ رانیاں بیان کی جاتی ہیں جو سب کی سب اعلیٰ خاندانوں کی شہزادیاں تھیں۔ ان کی پہلی شادی راجہ ودربھ کی بیٹی رکمنی سے ہوئی تھی۔ گوپیوں کی تعداد سولہ ہزار بتائی جاتی ہے مشہور ہے "سولہ سہس گوپی ایک کنھیا"۔ ان تمام گوپیوں میں تین سو ساٹھ بڑی مشہور تھیں۔ رادھا محبوب ترین گوپی تھیں۔

دیکھئے ہوگا سری کرشن کا درشن کیونکر
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل
پلکیں گھنیری گوپیوں کی نوہ کے لئے (محسن)

رادھا کے جھانکنے کا چھڑکو حصہ عضب (آنند مکھنوی)

کرشن جی کے بچپن سے آخر تک کا ہر ہر واقعہ اردو ادب میں تلمیح بن چکا ہے اور عام بول چال میں رائج ہے۔ ان کا ندر، زدا اسمبدی اور شجاعت کی داستانیں، کنس کے قتل کے دلچسپ واقعات اور جنگ مہابھارت میں ان کے پراسرار حالات، گیتا میں ان کے ملفوظات اور پر ماحرامیات کے قصے، خداشناسی اور معرفت الٰہی کے سلسلہ میں ان کے مراتب غرضیکہ ان سے متعلق ہر واقعہ کافی مشہور ہے اور اردو ادب کا ایک حصہ بن چکا ہے۔

سب مل کے یارو کرشن مراری کی بولو جے
گوبند چھیل کنج بہاری کی بولو جے
وہ جوز گوپی ناتھ، بہاری کی بولو جے
تم بھی نظیر کرشن بہاری کی بولو جے (نظیر)

بہت سے صوفی منش مسلمان مذہبی حیثیت سے کرشن جی کے بڑے معتقد ہیں۔ اردو شاعروں میں کرشن جی کے معتقدین میں مولانا حسرت موہانی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ مولانا نے متعدد اشعار کرشن جی کی ثنا و صفت میں لکھے ہیں

سومنات۔ سومنات کی اصل "سوم ناتھ" ہے جو سوم (چاند) اور ناتھ (مالک) سے مرکب ہے۔ سومنات کا مندر ہندوستان کے مشہور قدیم مندروں میں سے ہے اور ہندوستان کی پانچ مشہور چیزوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ جان مالکم نے کسی پران کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہندوستان کی پانچ چیزیں مشہور ہیں۔ دریائے گومتی، حسن ہلاحب، شکیل گھوڑے، دوارکا اور سومنات کے مندر۔

ترا در ہے قبلۂ سومنات
ترا کعبہ ہے مرجع سومنات (محسن)

گر جب ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
مری دعا ہے ریختہ کعبہ و سومنات کی (اقبال)

کالی۔ کالی کے معنی سیاہ فام کے ہیں۔ یہ نام ویدوں کے زمانہ میں اگنی کے لئے

زمین کو شق کر دے گا۔ اس لئے جب تک اس کا زور کم نہ ہو میرا زمین پر آنا مناسب نہیں۔ اس دھارے کے زور کو صرف شیو جی کم کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اسکے لئے تیار ہوں تو میں آؤں۔ بھگیرت نے شیو جی سے درخواست کی اور وہ اسکے لئے تیار ہو گئے۔ گنگا جی کو جب یہ اطلاع دی گئی تو وہ زمین پر آنے کیلئے تیار ہو گئیں اور شیو جی نے ان کے دھارے کو اپنی جٹاؤں پر روک کر اس کا زور کم کر دیا۔ اسی لئے شیو جی کو "گنگا دھر" بھی کہا جاتا ہے۔

ان لمبے لمبے بالوں میں گھونگر کی لہر سی
کروٹ سو جیسے بہتی ہو گنگا غضب غضب (اثر لکھنوی)

دریائے گنگا کی تقدیس و حرمت کی وجہ سے ہندو اس کی قسم بھی اٹھاتے ہیں اور مرتے وقت گنگا جل منہ میں ٹپکانا باعث تسہیل جانکنی سمجھا جاتا ہے۔

جب ملک برج میں جما ہو کھلنے کا ہمیں
ہے قسم کھائے اٹھائے ہوئے گنگا بادل (محسن)

ہندوستان کے لوگ چونکہ گنگا اشنان کو متبرک سمجھتے ہیں اس لئے ہر سال دور دراز کے یاتری گنگا میں نہانے آتے ہیں۔ گنگا اشنان چونکہ ایک مذہبی فریضہ ہے اس لئے محاورہ "گنگا نہانا" کسی کام سے سبکدوشی اور فراغت پانے کے لئے مستعمل ہے۔

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم
دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم (داغ)

"الٹی گنگا بہنا" بھی محاورہ ہے جس کے معنی غلط و بیجا کام کے ہیں

ہم تو پیاسے رہے نئے غیر کو دی پیر مغاں
الٹی اس شہر میں بہتی ہوئی گنگا دیکھی (امیر)

گنیش۔ گنیش عقل و دانائی کے دیوتا کا نام ہے جنھیں شیو اور پاربتی کا بیٹا مانا جاتا ہے۔ اسی لئے ہر کام کرنے سے پہلے اس دیوتا کا نام لیا جاتا ہے اور ہر کتاب کے آغاز پر اس کا نام لکھا جاتا ہے۔

پہلے پاؤں گنیش کا لیجے سیس نوائے
جا سے کارج سدھ ہوں سدا مہورت لائے (نظیر اکبر آبادی)

گنیش کا جسم چھوٹا اور موٹا ہے۔ رنگ زرد اور پیٹ بڑا ہے۔ سر ہاتھی کا سا ہے مگر دانت ایک ہی ہے۔ چار ہاتھ ہیں۔ پہلے میں سنکھ، دوسرے میں چکر، تیسرے میں ڈنڈا یا انکس اور چوتھے میں کنول کا پھول رہتا ہے۔ سواری کا جانور چوہا ہے۔

برہمن اس کو تو گنیش دیوتا بولے
کہیں ہیں شیخ ہوا کعبہ رواں تعمیر (سودا)

ہندوستان کے تہوار۔ ہندوستان کے تمام تہواروں، میلوں اور رتوں کے نام بھی اردو ادب میں تلمیح بن چکے ہیں اور عام طور پر مستعمل ہیں جیسے بسنت، ہولی، دیوالی، سلونو، بساکھی، بھیا دوج، جنم اشٹمی، بل دیو جی کا میلہ اور رام لیلا وغیرہ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بسنت موسم بہار کا تہوار ہے جس میں دیوی دیوتاؤں کے استھانوں پر سرسوں کے پھول چڑھائے جاتے ہیں اس تہوار کو ہندو اور مسلمان مل کر مناتے ہیں۔

واں تو ہو زرد پوش، یہاں ہیں ہوں زرد رنگ
واں تیرے گھر بسنت ہے، یاں میرے گھر بسنت (مومن)

بسنتی رنگ زرد رنگ سے ملتا جلتا ہے۔

غم اگر مجھ کو یونہی ہے اس بسنتی پوشش کا
جسم تو کیا زرد سب مبتلا ہو جائے گا (ناسخ)

"بسنت کی خبر نہ ہونا" محاورہ ناواقفیت اور بے خبری کے لئے مستعمل ہے۔

جو ہے بہار اس کو خزاں کا خطر بھی ہو
اے باغباں بسنت کی تجھ کو خبر نہیں (امیر)

سلونو اور راکھی ساون کے مہینہ کا ایک پیارا تہوار ہے جس میں بہن اپنے بھائی کے ہاتھ پر حفاظت اور رکشا کا ڈورا باندھتی ہے جسے راکھی کہتے ہیں جن لوگوں کی بہنیں نہیں ہوتیں ان کے ہاتھوں پر برہمن راکھی باندھتے ہیں۔

مچی ہے ہر طرف کیا کیا سلونو کی بہار اب تو — ہر اک گلرو دمکتے ہیں راکھی باندھے ہاتھ میں خوش ہو
ہوس جو دل میں گزرے ہے کہوں کیا آہ میں تم کو — یہی آتا ہے جی میں بن کے باہمن آج تو یارو
میں اپنے ہاتھ سے پیارے کے باندھوں پیار کی راکھی (نظیر اکبر آبادی)

راکھیاں لے کے سلونو کی برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل (محسن کاکوروی)

ہولی خوشی کا تہوار ہے۔ جب فصل کٹ جاتی ہے اور اناج کھلیانوں میں جمع ہو جاتا ہے تو ہولی کا جشن منایا جاتا ہے۔ موسم بھی اسی زمانہ سے بدل جاتا ہے۔ اظہار مسرت کیلئے رنگ کھیلا جاتا ہے جسے ہولی کھیلنا بھی کہتے ہیں اس موقع پر احباب ایک دوسرے سے ملنے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی ضیافت کرتے ہیں۔

یہ نکلا ہے رنگ بسمل سے
ہولی کھیلے گا آج قاتل سے (داغ)

عشق کے دل دو دیکھ کر کے مجھے
گھر میں ہولی منائے بیٹھے ہیں (راسخ)

کہتے ہیں کہ ہولی کے موقع پر جو آگ جلائی جاتی ہے اس سے نظر بد دور ہوتی ہے۔

سال بھر تک مگر مدتے دوست ہو محفوظ
لوگ ہولی سے نظر سب کی جلا لیتے ہیں (رشک)

دیوالی دراصل باطل پر حق کی فتح کی یادگار ہے۔ دیوالی میں جوا کھیلنے کا بھی رواج ہو گیا ہے۔ دیوالی کے دوسرے دن جگمگٹ ہوتا ہے۔

ہجوم رکھتے ہیں جا سار وں سے آگے
حواریوں کا دوالی کے جیسے جگمگٹ ہو

"دوالی بھرنا" ایک محاورہ ہے جس کا مفہوم دوالی کی پوجا کرنا اور مٹھائی چڑھانا ہے۔

دوالی اس نے بھری رات تو جو بیٹھے ہم
چراغ گور ہمارا دیا ہے جگمگٹ کا

ٹیسو کا تہوار دسہرہ کے زمانہ ہی میں منایا جاتا ہے۔ یہ دراصل بچوں کا تہوار ہے۔ کہتے ہیں کہ مہابھارت میں پانڈوں نے ٹیسو نامی سوار کا سر کاٹ لیا مگر سر کٹنے سے پہلے ٹیسو نے پانڈوں سے یہ قول لے لیا تھا کہ جب بھی کوئی جنگ ہو اس کا سر بانس پر لٹکا کر ضرور لے جایا جائے۔ پانڈوں نے اس قول کو نبھایا اور اب بھی دسہرہ کے موقع پر جنگ کی لیلا ہوتی ہے تو بچے ٹیسو کا سر بانس پر ٹانگ کر لئے پھرتے ہیں۔ یہ سر بانس کی کھپچیوں اور کاغذ کا ہوتا ہے دسویں دن اس کو توڑ پھوڑ ڈالا جاتا ہے۔

ہر اک صاحب حشم کا دور ہے دس روز عالم میں
دسہرہ تک ہمارے شہر میں ٹیسو نکلتے ہیں (سحر)

اب "ٹیسو بنانا" محاورہ بھی بن گیا ہے جس کے معنی ہنسی اڑانے اور سوانگ بنانے کے ہیں۔

اے جاں کبھی ہم نے جھنجھنیا نہیں مانگی
تم نے بھی کبھی ٹیسو بنا کر نہ نکالا (جان صاحب)

مختصر خبریں

زائرین عراق کو ضروری مشورہ۔ ریاستی حج کمیٹی، اترپردیش کے جاری کردہ ایک پریس نوٹ میں عراق کے زائرین کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ پورٹ حج کمیٹی سے یہ معلوم کیے بغیر بمبئی کے لیے روانہ نہ ہوں کہ ان کے لیے پاسپورٹوں اور ویزا کے اجرا کی سفارش کی گئی ہے یا نہیں۔

عراق کے قونصل خانے کے ذریعہ اس وقت زائرین کے پاسپورٹوں پر ویزا نہیں دیے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے پورٹ حج کمیٹی نے اس وقت تک کے لیے زائرین کے پاسپورٹوں کا اجرا یا رجسٹریشن بند کر دیا ہے جب تک کہ ویزا کے اجرا کی سفارش نہ کی جائے۔

روزگار سے متعلق صلاح دینے کے لیے مزید مرکز۔ حکومت اترپردیش ۱۵ر نومبر سے نوجوانوں کو روزگار سے متعلق صلاح دینے کے لیے مزید چار مرکز الموڑہ، بریلی، گورکھپور اور جھانسی میں کھولنے جا رہی ہے جس سے ریاست میں ایسے واحدوں کی تعداد روزگار دفتروں میں ۹ اور ریاستی نظامت تربیت و روزگار میں ایک ہو جائے گی۔

نوجوانوں کو پیشہ ورانہ رہنمائی کے سلسلے میں مزید سہولتیں بہم پہنچانے سے متعلق ریاستی حکومت کے فیصلے کے مطابق یہ اقدام کیا جا رہا ہے۔

ہندی کتابچہ ضبط۔ حکومت اترپردیش نے ہندی کتابچہ بعنوان حکمت گیتا عملی کو ضبط کر لیا ہے۔ اس کتابچے کے مصنف شری جگت نرائن آریہ ہیں اور یہ آزادی پریس، شیام گنج، بریلی میں طبع ہوا ہے۔ اس کتابچہ میں ایسا مواد موجود ہے جس کی اشاعت تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۲۹۵ (الف) کے تحت مستوجب سزا ہے۔

ریاستی حکومت نے ایسی تمام دستاویزات بھی ضبط کر لی ہیں جن میں اس کتابچہ کے اقتباسات اور ترجمے وغیرہ شامل ہوں۔

افسانہ

سرداری سداکور

رتن سنگھ

سرداری سداکور کو زمانے کی بدلی ہوئی رَو کا شدّت سے اس وقت احساس ہوا جب ان کے لڑکے کا پرانا مرض پاگل پن پھر سے عود کر آیا۔ وہ اڑوسی پڑوسی جن کے ساتھ پچھلے دو سال سے شرنارتھیوں کی اس نئی بستی میں وہ اکٹھے رہتے تھے، جن کے دکھ سکھ میں وہ برابر کے شریک ہوتے آئے تھے، آج انہی میں سے دو ایک سرداری سداکور کے پوتے بلجیت سنگھ کے ساتھ لڑنے آئے اور بولے "اپنے باپ سے کہو محلے والوں کو فحش گالیاں نہ دے۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا"۔ سرداری سداکور نے لاکھ سمجھایا کہ "میرا لڑکا جب اچھا تھا تب تو وہ کسی کو گالی نہیں دیتا تھا، لیکن اب وہ بےبس ہے، اسے ہوش ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اس لئے اس کی گالیوں کا برا نہ مانا جائے" مگر ان کی آواز کو وہاں کون سنتا۔ آخر بڑی مشکل سے وہ لوگ واپس گئے۔

مریض کو بریلی کے ہسپتال میں داخل کرنے کا سوال تھا۔ ظاہر ہے پاگل پن کے مریض کو سنبھالنا ایک آدمی کے بس کی بات تو ہے نہیں اس لئے بلجیت سنگھ نے اپنے پڑوسی کرم سنگھ سے کہا کہ دفتر سے دو ایک روز کی چھٹی لیکر میرے ساتھ بریلی تک چلے چلیئے۔ لیکن کرم سنگھ کوئی بہانہ کرکے ٹال گیا! اس بستی میں آنے کے بعد بلجیت سنگھ کے کرم سنگھ سے ہی زیادہ مراسم تھے اور جب اسی نے اس مصیبت کے وقت مدد کرنے سے انکار کر دیا تو بلجیت سنگھ کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس رات وہ بستر پر لیٹا ہوا کافی دیر تک روتا رہا۔ سرداری سداکور نے اپنے پوتے کی سسکیوں کی آواز سنی تو اسے دلاسا دینے کے لئے اٹھیں۔ وہ بہت ہی مستقل مزاج اور بڑی ہمت کی عورت تھیں۔ جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں۔ ایک ہی لڑکا تھا۔ شادی کے بعد اسے پاگل پن جیسا موذی مرض لگ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کی بیوی کا بھی انتقال ہوگیا۔ غرض کہ سرداری سداکور نے اپنی پوری زندگی مصیبتوں کا سامنا کرتے گزار دی لیکن کبھی ہمت نہیں ہاری۔ اُن کی زندگی کا سہارا اس کا یہی پوتا بلجیت سنگھ تھا مگر آج مصیبت میں پھنسے پوتے کو روتا دیکھ کر اُن کی بوڑھی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے۔ ان کا جھریوں بھرا چہرہ آنسوؤں سے تر ہوگیا۔ ایسے میں انہیں سیالکوٹ کے ضلع میں چھوڑے ہوئے اپنے گاؤں داؤدکی یاد آئی۔ وہاں بھی ان کا لڑکا پاگل پن کا دورہ پڑنے پر پورے گاؤں والوں کو نام لے لے کر گالیاں دیا کرتا تھا۔ رات کے گہرے سناٹے میں جب وہ چھت پر کھڑا ہوکر فحش گالیاں دیتا تو سرداری سداکور کا اپنا دل کانپ جاتا۔ پھر اگلی صبح ڈپٹی امام بخش، چودھری خان محمد اور لالہ ایشر داس وغیرہ ان کے بیٹے کی تیمارداری کے لئے آتے اور سداکور سے کہتے۔ "بیٹی یہ نہ سمجھنا کہ پرتاپ سنگھ بیمار ہے تو ہمیں کم دکھ ہے۔ اس کا باپ نرنجن سنگھ مر گیا تو کیا ہوا پورا گاؤں زندہ ہے۔ تمہارے لڑکے کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا"۔ پھر ڈپٹی امام بخش اپنے نوکر کو سرداری کے ہاں بھیج دیتے، کہ جاؤ پرتاپ سنگھ کی خدمت کرو۔ لیکن بھی جب کبھی پرتاپ سنگھ اپنے مرض کی شدت میں گھر سے بھاگ جاتا تو آدھا گاؤں اس کی تلاش میں نکل پڑتا۔ سرداری سداکور سوچتیں وہ دن شاید اب کبھی نہ آئیں گے۔

لیکن ہر مصیبت وقتی ہوتی ہے۔ سرداری سداکور کا لڑکا بریلی ہسپتال

یہ کسی نہ کسی طرح داخل ہو گیا، اور وہاں ایک سال بعد ٹھیک ہو کر گھر بھی آ گیا۔
سرداری کے گھر میں پھر پہلے کی سی خوشیاں لوٹ آئیں۔

کچھ دنوں سے وہ اپنے پوتے بلجیت سنگھ میں کچھ تبدیلی محسوس کر رہی تھیں۔ وہ ان پڑوسیوں سے ٹھیک سے بات چیت نہیں کرتا تھا جنھوں نے اس کے باپ کی بیماری کے وقت اس کی مدد نہیں کی تھی۔ سرداری نے دو ایک مرتبہ اسے ٹوکا بھی۔ لیکن بلجیت سنگھ بات کو ٹال گیا۔ آخر راز اس وقت کھل گیا جب بلجیت سنگھ نے کرم سنگھ کے بیٹے کے سندن کے موقع پر اس کے ہاں جانے سے انکار کر دیا۔ سرداری سداکور نے اسے سمجھانا چاہا تو بلجیت سنگھ نے صاف کہہ دیا "تائی، مجھے اس معاملے میں کچھ نہ کہو۔ جو لوگ میرے دکھ درد میں شریک نہیں ہو سکتے میں ان کے ہاں کیوں جاؤں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔" سرداری سداکور آج عورتوں میں سے تھیں جنھوں نے نہ صرف زمانے کے لاکھوں اتار چڑھاؤ دیکھے تھے بلکہ ان کا مقابلہ بھی کیا تھا۔ وہ زندگی کے ہر مسئلے کو سنجیدگی سے حل کرنا جانتی تھیں۔ اس لئے اس نے بلجیت سنگھ سے کہا "دیکھو بیٹے! اب تم اپنے گاؤں دادو میں نہیں رہ رہے ہو، جہاں لوگ تمھارے دادا، پر دادا سبھی کو جانتے تھے۔ وہاں اگر تم کسی کا نقصان بھی کر دیتے تو لوگ تمہارے بزرگوں کا لحاظ کر کے بھی خاموش ہو جاتے۔ اب تم شرنارتھیوں کی بستی میں رہ رہے ہو جہاں جنے بنے کی لکڑی جمع ہو گئی ہے۔ کوئی ملتان کا رہنے والا ہے تو کوئی راولپنڈی کا۔ کوئی پہلے سے ایک دوسرے کو نہیں جانتا۔ اور پھر تمھیں زندگی بھر انھی لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔ کسی سے بگاڑ کر بات نہیں بنتی۔ ان لوگوں کے دل بھی دشمنی کے بجائے پیار اور محبت سے جیتے جا سکتے ہیں۔ تم ان سے محبت کرو۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے رہو اور ایک دن یقیناً وہ آئے گا جب یہ سب تم سے محبت کریں گے۔ تمھاری مدد کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے۔ یہ لوگ بھی ڈپٹی امام بخش، چودھری خان محمد اور لالہ ایشر داس کی طرح تمہارے اپنے بن سکتے ہیں۔ پہلے تم ان کا بننے کی کوشش کرو۔"

"میں کسی کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوتا۔" بلجیت سنگھ نے اپنی دادی کو ٹوکا۔

"میرا مطلب یہ نہیں ہے بیٹے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ دوسروں کی غلطیوں کی طرف دھیان نہ دو۔ اپنا فرض نبھانا انسان کا فرض ہے۔ دوسرے خود اپنا فرض پورا کریں گے۔"

بلجیت سنگھ کرم سنگھ کے ہاں گیا۔ لیکن کچھے ہوئے دل سے بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد بلجیت سنگھ کی بیوی نے اس سے کہا۔ "پچاس روپے ہوں تو دے دیجئے۔ کرم سنگھ کی بیوی آئی ہے۔ اس کو ضرورت ہے۔"

"ضرورت ہے تو میں کیا کروں؟" بلجیت سنگھ کی ناراضگی ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔

"ان کے ہاں کچھ دنوں سے مہمان آئے ہیں۔ خرچہ بڑھ گیا ہے۔ اگر آپ روپے دے دیں تو ان کا کام نکل جائے۔ ایک مہینے میں واپس مل جائیں گے۔"

"روپے میرے پاس نہیں ہیں۔" بلجیت سنگھ نے روپے جیب میں ہوتے ہوئے بھی روکھا سا جواب دے دیا۔

سرداری سداکور کچھ دور کھڑی یہ باتیں سن رہی تھیں۔ جب کرم سنگھ کی بیوی دوسرے کمرے سے مایوس لوٹ رہی تھی سرداری نے اسے ٹوکا: "بیٹی تھوڑی دیر رک جاؤ۔" پھر وہ اندر گئیں۔ اپنے صندوق میں سے ایک پوٹلی کھولتی ہوئی باہر آئیں اور پچاس روپے کے نوٹ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولیں "تمہارا اپنا گھر ہے۔ اور روپوں کی ضرورت ہو تو بتانا۔"

انہی دنوں پڑوس میں لالہ امرچند کی بیوی بیمار ہوئیں تو چارپائی کے ساتھ لگ کر رہ گئیں۔ آئے دن حالت بگڑتی ہی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے دق کا شبہ ظاہر کیا اور جب لوگوں کو تشخیص معلوم ہوئی تو اڑوسیوں پڑوسیوں نے آنا جانا کم کر دیا۔ اگر مریض کا حال پوچھنے کے لئے آتے بھی تو چند منٹ رک کر چلے جاتے۔ لالہ امرچند بیچارے اکیلے تھے۔ کام وغیرہ بھی کوئی خاص نہیں تھا۔ اگر گھر پر بیوی کی تیمارداری کے لئے رکتے تو اس کے علاج کے لئے پیسہ کہاں سے آتا۔ اور اگر اپنا ٹھیلہ لے کر بازار جاتے تو بیوی کی دیکھ بھال کون کرتا۔ ایسے میں سرداری سداکور نے اسے سہارا دیا۔ "بیٹا! تو شانتی دیوی کی فکر نہ کر۔ تیری غیر حاضری میں ہم اسے ایک منٹ اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ اسے ذرا بھی تکلیف نہ ہوگی۔" رسمی نہیں نہیں کے بعد لالہ امرچند نے سرداری کی رائے مان لی۔ اب دن بھر سرداری سداکور اور بلجیت کی بیوی شانتی دیوی کی تیمارداری کرتیں۔ اسے دوا دارو وقت پر پلاتیں۔ یہاں تک کہ اکثر پاخانہ وغیرہ بھی صاف کرنا پڑتا۔ بہت سے پڑوسیوں نے دبے لفظوں میں سرداری کو سمجھایا کہ شانتی دیوی کو دق کا مرض ہے، اس کے نزدیک رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لیکن سرداری ایک کان سنتیں اور دوسرے کان یہ سب باتیں

نکال دیتی۔ تین مہینے کے لگاتار علاج اور تیمارداری کے بعد شانتی دیبی اچھی ہوگئی اور پھر سے چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی۔

اس واقعہ کو ایک سال گزر گیا۔ جب کبھی لالہ امر چند یا ان کی بیوی شانتی دیبی، سردارنی کی مہربانیوں کا ذکر کرتے تو وہ کہتی: بہن اس طرح شرمندہ نہ کرو۔ یہ تو پڑوسی کے ناتے ہمارا فرض تھا۔ ہم نے یہ فرض پورا کیا۔ ہم لوگوں نے آپ پر کوئی احسان تھوڑے ہی کیا ہے۔"

اتفاق ایسا ہوا کہ کچھ دنوں بعد بلجیت سنگھ کی مالی حالت خراب ہوگئی۔ کبھی سردارنی نے کرم سنگھ کی بیوی کی مدد کی تھی۔ بلجیت سنگھ نے سوچا کیوں نہ کرم سنگھ سے ہی مانگوں۔ یہ سوچ کر اسی دن شام کو اس نے کرم سنگھ سے باتوں ہی باتوں میں اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ اس پر کرم سنگھ نے کہا "میرے پاس تو روپے ہیں نہیں۔ اگر کہو تو کہیں سے سود پر ادھار لے لوں۔" بلجیت سنگھ جانتا تھا کہ کرم سنگھ آج کل خود سود پر روپے ادھار دینے کا کام بھی کرتا ہے۔ اور یہ سب روپیہ نہ دینے کے بہانے ہیں۔ اس لئے وہ خاموش ہوکر بیٹھ گیا۔ اس کے دل میں تو آیا کہ جاکر سردارنی سداکور کو یہ سب بتا دے۔ لیکن پھر وہ نہ جانے کیا سوچ کر خاموش ہوگیا۔

بلجیت سنگھ، لالہ امر چند کی مالی حالت سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے اس نے ان سے روپیہ مانگنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن پتہ نہیں اسے بلجیت سنگھ کی پریشانی کیسے معلوم ہوگئی۔ ایک دن شام کو بلجیت سنگھ دفتر سے لوٹا تو بیوی نے بتایا کہ شانتی دیبی سو روپے دے گئی ہے، کہہ رہی تھی لے لیجئے جب دل آئے واپس کر دیجئے گا۔ بلجیت سنگھ جانتا تھا کہ لالہ امر چند کے پاس سو روپے فالتو نہیں ہوسکتے۔ وہ سوچنے لگا کہ اتنی رقم اسنے کس طرح اکٹھا کی ہوگی۔ مگر یہ راز زیادہ عرصہ تک راز نہ رہ سکا۔ دوسرے دن جب وہ امر چند کے گھر گیا تو اسے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ شانتی دیبی کے ہاتھوں کی باقی بچی ہوئی چوڑیاں بھی غائب تھیں۔ اس سے بلجیت سنگھ کو دکھ تو بہت ہوا لیکن ایک دوسرے ڈھنگ سے سوچنے میں اسے خوشی بھی محسوس ہوئی۔ آخر وہ ایک نئے آدمی سے اس کی محبت اور اس کا اعتماد جیتنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس سے اسے دوبارہ اپنے گاؤں کی یاد آگئی۔ ایک دفعہ اس کے باپ پاگل پن کے زیر اثر برکت کے چارے کا کھیت خراب کر دیا تھا اور اس نے برکت سے کہا تھا "چاچا جی، یہ کھیت رہنے دیجئے۔ آپ اس کے بجائے ہمارا چھوٹے کنوئیں والا کھیت کاٹ لیجئے گا۔" بس اتنی سی بات پر برکت کو اتنا غصہ آیا تھا کہ اس نے بعد میں سردارنی سے شکایت کی تھی کہ آپ کے پوتے نے مجھے غیر سمجھا۔" کتنی محبّت اور کتنا خلوص تھا اس شکایت میں! بلجیت سنگھ کو جب بھی اس بات کا خیال آتا تو اس کا دل خوشی اور غم کے ملے جلے تاثرات سے بھر جاتا!

کچھ عرصہ بعد سردارنی سداکور سورگباش ہوگئیں۔ ان کی لاش کو گومتی کے کنارے جلا دیا گیا۔ اور بلجیت سنگھ ان کے پھولوں کو ہردوار جاکر گنگا میں پروا آیا۔ ممکن ہے ان کے پھول وہاں سے بہتے ہوئے سمندر کی گہرائیوں تک پہنچ گئے ہوں۔ لیکن ان کا دوسروں سے محبت اور پیار کرنے کا جذبہ اب بھی بلجیت سنگھ اور اس کے اڑوسیوں پڑوسیوں کے دل میں موجزن ہے۔

ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کرم سنگھ بیمار ہوگیا۔ اتفاق سے اس کی بیوی مائیکے گئی ہوئی تھی اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ایک بار تو بلجیت سنگھ کے دل میں بھی آیا کہ یہ وہی کرم سنگھ ہے جس نے میرے باپ کی بیماری کے موقع پر میری مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جو تھوڑے سے روپے ادھار نہیں دے سکا تھا۔ لیکن پھر اس نے سوچا، اس طرح کرنے سے سردارنی سداکور کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ اس لئے اس نے دوسرے دن ہی دفتر عرضی بھیج دی۔

"میرا ایک دوست بیمار ہے۔ اس کی تیمارداری کے لئے چار دن کی چھٹی دے دی جائے۔"

✡

غزل

شاہجہاں بانو یاد

کیا یہ خلوص کم ہے جہان خراب میں
سو غم ملے ہیں ایک خوشی کے جواب میں

دیکھی ہے زندگی سے بہت دور زندگی
کتنی حقیقتیں ہیں نہاں میرے خواب میں

میں غم زدہ سہی مگر اتنا ضرور ہے
دنیا کے غم ہیں میرے غمِ کامیاب میں

یہ بے خودیِ قلب و نظر کا ہے معجزہ
ہر چیز جیسے ڈوب چلی ہو شراب میں

ہم کیا ابھی ہمارے گناہ و ثواب کیا
تمیز کر رہے ہیں گناہ و ثواب میں

دیوانگی کی آخری منزل سمجھ گئے
اکثر یہی ہوا ہے شبِ ماہتاب میں

اپنی وفاؤں پر تھا بھروسہ دگر نہ یادؔ
کس کو خبر تھی کیا وہ لکھیں گے جواب میں

غزل

کرشن موہن وحشی

تری نظر کے اشاروں نے کروٹیں بدلیں
جنوں نواز سہاروں نے کروٹیں بدلیں

سفینہ آتے ہوئے دیکھ کر سوئے ساحل
یہ کیا ستم ہے کناروں نے کروٹیں بدلیں

گریباں چاک کئے پھر رہے ہیں اہلِ خرد
کچھ اس ادا سے بہاروں نے کروٹیں بدلیں

نظر پھری ہے چمن سے تو جانِ نکہت و رنگ
نظر کے ساتھ نظاروں نے کروٹیں بدلیں

چمن میں غنچہ و گل کا تو تذکرہ کیا ہے
ہوا بدلتے ہی خاروں نے کروٹیں بدلیں

انھیں خبر بھی نہ ہوگی کہ رات بھر کیوں کر
غمِ فراق کے ماروں نے کروٹیں بدلیں

یہ رازدارِ شبِ وعدہ تھے مگر وحشیؔ
فلک پہ چاند ستاروں نے کروٹیں بدلیں

مستقبل کی غذائیں

عبّاس حسین موسوی

علم الحیات (Biology) کے نقطۂ نگاہ سے اشرف المخلوقات انسان کا شمار بھی حیوانات میں ہوتا ہے چنانچہ قدرت کے وہ تمام اصول جو حیوانات پر صادق آتے ہیں انسان پر بھی صادق آتے ہیں۔ ان اصولوں میں سے ایک اہم اصول یہ ہے کہ کوئی بھی حیوان نباتات کی مدد کے بغیر اپنی غذا حاصل نہیں کرسکتا۔ نباتات میں (Inorganic)[1] مادہ کو کلوروفل (Chlorophyll) کے ذریعہ سورج کی کرنوں کی طاقت کی مدد سے جاندار (Organic) مادہ میں تبدیل کرسکنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ اس لئے ہر حیوان اپنی غذا یا تو نباتات سے براہ راست حاصل کرتا ہے یا نباتات سے غذا حاصل کرنے والے کسی دوسرے حیوان کو کھا کر اپنی غذائی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت انسان بھی اپنی غذا حاصل کرنے کے سلسلہ میں نباتات کا سہارا لینے پر مجبور ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے غذائی اجناس کی فراہمی کا۔ دنیا کی آبادی جب تک کم رہی غذا کا مسئلہ زیادہ نزاکت اختیار نہیں کرنے پایا مگر اب دنیا کی آبادی میں اتنا اضافہ ہوچکا ہے کہ غذا کی فراہمی کے سوال نے غیر معمولی اہمیت اختیار کرلی ہے۔ کھانے کے کام آنے والی ہر چیز کی قیمت، ذائقہ، غذائیت اور دستیابی کا سوال سامنے رکھا جائے تو غذائی مسئلہ کی نزاکت اور زیادہ ہوجاتی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ دنیا کے سائنس داں اس امر پر بھی متفق ہیں کہ جو اشیاء آج کل عام طور سے کھانے کے کام آتی ہیں (مثلاً اناج، پھل، ترکاری، گوشت، دودھ وغیرہ) ان کی پیداوار اتنی نہیں بڑھائی جاسکتی کہ مستقبل کی آبادی کا پیٹ بھرا جاسکے۔ ایسی صورت میں اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ان مناسب اور موزوں نباتات کا پتہ لگایا جائے جنھیں آج تک استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

غذاؤں کے نئے ذرائع معلوم کرنے کے لئے ہم کو ماضی پر نظر ڈالنی ہوگی۔ کرۂ ارض پر تہذیب پھیلنے سے پہلے خانہ بدوش انسان اپنے سے کمزور اور کمتر ذہانت والے حیوانات کا شکار کرکے اپنی غذا حاصل کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ ان میں سے بعض حیوانات کو پالنے اور ان کا گوشت اور دودھ استعمال کرنے لگا۔ اس کے بعد اسے سبزی اور اناج اُگانے کے طریقوں یعنی زراعت کا انکشاف ہوا۔ پہلے اس نے کچے غلے کو اپنی خوراک بنایا پھر اس کو پیسنے اور پکانے کے طریقے دریافت کئے۔ کھیتی باڑی شروع ہوجانے کے بعد انسان کے تہذیبی ارتقا کی رفتار بہت تیز ہوگئی جس کی وجہ سے نہ صرف انسان کے خیالات اور قدروں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں بلکہ اس کی غذاؤں میں بھی تنوع پیدا ہوتا گیا۔ اگر مختلف

---

[1] بے جان مادّہ (Inorganic) وہ چیز ہے جو کسی حیوانات یا نباتات کے جسم کا حصہ کبھی نہ رہا ہو۔ مثلاً پتھر۔ مٹی۔ لوہا۔ سونا۔ ہوا وغیرہ۔ اسکے برخلاف جاندار (Organic) مادّہ وہ کہلاتا ہے جو کبھی کسی جاندار کے جسم کا مستقل حصّہ رہ چکا ہو مثلاً لکڑی۔ ہڈی۔ معدنیاتی کوئلہ۔ بال۔ چمڑہ وغیرہ۔

اور اگر انسانوں کی غذا کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سماجی اور معاشی حالات انسان کی غذا پر کافی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جب بھی لوگوں کو کسی خاص غذا کے استعمال کی عادت پڑ گئی ہے تو اس کو بدلنا بہت مشکل ہو گیا ہے یا اگر عادت بدلی بھی ہے تو اس تبدیلی کی رفتار بہت سست رہی ہے۔

غذائیں موسم اور جگہ (جغرافیائی حالات) کے مطابق بھی بدلتی رہتی ہیں۔ مگر یہ امر مسلم ہے کہ خواہ آدمی کی معاشی حیثیت کچھ بھی ہو اس کی غذا میں ان گنی چنی چند بنیادی اشیاء کے علاوہ جو عام ہو چکی ہیں کوئی نئی چیز مشکل ہی سے شامل ہوتی ہے۔ آج کل جو غذائی اشیاء ہم استعمال کرتے ہیں وہ دو ذریعوں سے حاصل کی جاتی ہیں۔ نباتات اور حیوانات۔ نباتات سے حاصل ہونے والی غذائیں اناج۔ سبزیاں اور پھل وغیرہ ہیں اور حیوانات سے حاصل ہونے والی غذاؤں میں دودھ، انڈا، گوشت اور مچھلی وغیرہ شامل ہیں۔ آج ہر ملک ان غذاؤں کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں پیدا کرنے کے سائنسی طریقے اختیار کر رہا ہے۔ اس سعی مسلسل میں کسی حد تک کامیابی بھی ہو رہی ہے لیکن اس کے باوجود بڑھتی ہوئی آبادی کے سیلاب نے صورت حال کو نہایت نازک بنا رکھا ہے اور اسی وجہ سے ہمیں پیداوار کے نئے طریقے اور غذا کے نئے ذرائع تلاش کرنا پڑ رہے ہیں۔

"غذا کے یہ نئے ذرائع کیا ہو سکتے ہیں؟" اس سوال نے دنیا کے تمام سائنسدانوں کو تحقیقی مطالعہ (Research) پر مجبور کیا ہے۔ کئی محققین نے نئے راستے واقعی معلوم کر لئے ہیں اور عام غذائی اشیاء کے علاوہ متعدد ایسی اشیاء کا پتہ چلایا ہے جن میں غذائیت موجود ہے اور جن کے استعمال سے ہماری ضروریات بڑی حد تک پوری ہو سکتی ہیں۔ ان نئی دریافتوں میں الگی (Algae) اور فنگائی (Fungi) کے غیر معروف نباتاتی گروہوں کے علاوہ چند جڑیلے نباتات مثلاً ٹاپیوکا (Tapioca) شامل ہیں کئی سائنسدانوں نے اس بات کی امید ظاہر کی ہے کہ سطح زمین پر پائے جانے والے پودوں کے علاوہ سمندر سے بھی غذائی اشیاء مہیا ہو سکتی ہیں۔ مچھلی اور جھینگوں کے علاوہ (جو آج کل بھی عام طور سے اچھی غذا سمجھے اور استعمال کئے جاتے ہیں) دوسرے جانداروں[1] کے متعلق بھی مزید معلومات حاصل ہوئی ہیں اور ان جانداروں سے بھی غذا حاصل ہو سکتی ہے مثلاً پلینکٹان (Plankton) جانداروں کا ایک ایسا گروہ ہے جس کو بآسانی غذائی اشیاء کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ زمین کے مقابلے میں سمندر اپنے اندر ایسے نباتات اور حیوانات کے لئے زیادہ وسعتیں رکھتا ہے جو موجودہ غذاؤں میں کسی نہ کسی غذا کا بدل ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جاپان کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جہاں تقریباً ۰ فی صدی غذا سمندری ذرائع مثلاً مچھلی۔ جھینگے۔ سیپی۔ گھونگھے اور سمندری نباتات (Sea Weeds) سے حاصل کی جاتی ہے۔

کسی متوازن غذا میں اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے پروٹین (Proteins) کاربوہائیڈریٹ (Carbohydrate) وٹامن (Vitamins) معدنیاتی نمک (Mineral Salts) اور چکنائی (Fats) کا ہونا بہت ضروری ہے۔ نئی دریافتوں کو غذا کی حیثیت سے رواج دینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان میں مذکورۂ بالا تمام اجزا موجود ہیں یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض دریافتیں غذائیت کے اعتبار سے مکمل ہوں لیکن بعض کو باہری ذرائع سے متوازن بنانا پڑے گا۔ (ہندوستان کے مختلف تحقیقی مرکزوں اور تجربہ گاہوں میں اس قسم کا تحقیقی کام اعلیٰ پیمانہ پر ہو رہا ہے اور اس میں مرکزی غذائی تحقیقاتی ادارہ (Central Food and Technological Research Institute - India) کی تحقیقات قابل ذکر ہیں۔) بہرحال اس مضمون میں ہم ان تمام دریافتوں کا ذکر نہیں کریں گے جو غذا کے لئے استعمال ہو سکتی ہیں البتہ صرف ان کا تذکرہ کریں گے جن کے بارے میں تجربات ہو چکے ہیں اور تجارتی پیمانہ پر بھی جن کا کاروبار ہو سکتا ہے۔

ٹاپیوکا (Manihot utilissima - Tapioca) کے پودے جنھیں عام طور پر ٹاپیوکا کہا جاتا ہے برازیل (Brazil) کے جنگلوں کے علاوہ جنوبی و وسطی امریکہ۔ افریقہ اور ایشیا کے جنگلوں میں لاکھوں ایکڑ زمین پر قدرتی طور پر اُگتے ہیں۔ اور ان علاقوں کے غریب لوگ اس کی جڑوں

---

[1] جاندار کے لئے سائنس میں (organism) کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس میں نباتات اور حیوانات دونوں شامل ہیں۔

کو پکاکر کھاتے ہیں۔ ماہرینِ علم غذا کی تحقیقات نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ان کی جڑوں میں اسٹارچ (Starch) کی وافر مقدار کے علاوہ ۱ فی صدی پروٹین (Protein) ۰.۵ فیصدی فاسفورس (Phosphorus) ۲ فی صدی چربی (Fat) ۱ فیصدی معدنیاتی نمک (Mineral Salt) اور معمولی مقدار میں لوہا (Iron) کیلشیم (Calcium)، وٹامن بی اور سی (Vitamins B and C)، ریبوفلووین (Reboflovin) اور نیکوٹینک ایسڈ (Nicotinic Acid) ہوتا ہے۔ لیکن ان سب مفید اجزا کے ساتھ ساتھ ان جڑوں میں ایک زہریلا مادّہ ہائیڈروسیانک ایسڈ (Hydrocyanic Acid) بھی شامل ہوتا ہے۔ اس زہریلے مادہ کی مقدار اس پودے کی مختلف قسموں میں مختلف ہوتی ہے مثلاً کڑوی جڑوں والی قسم میں یہ مادہ ۰.۰۱ فی صدی اور میٹھی جڑوں والی قسم میں ۱۵ فیصدی ہوتا ہے لیکن پکنے سے یہ زہریلا مادہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ غذائیت کے اعتبار سے ٹاپیوکا کی جڑوں کا چاول سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ چاول ۴ ٹن فی ایکڑ کے حساب سے پیدا ہوتا ہے جس سے ہم کو ۳۲۲۴ کیلوری[1] (Calories) ملتی ہے جبکہ ٹاپیوکا ۱۱۰۸۶ ٹن فی ایکڑ کے حساب سے پیدا ہوتی ہے جس سے ہم کو ۲۲۵۲ کیلوری ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹاپیوکا بنجر زمین پر اگ سکتی ہے اور بغیر سینچائی کے زندہ رہتی اور بڑھتی ہے۔ اس کی فصل کو ملک کی تمام بنجر زمین پر بوکر اچھا خاصہ غذائی مادہ بغیر کسی خاص سرمایہ اور محنت کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ٹاپیوکا میں چاول کے مقابلے میں چارگنا اسٹارچ (Starch) ہوتا ہے لیکن اس میں پروٹین کا فقدان ہوتا ہے جو اس میں مونگ پھلی کے تیل نکلے ہوئے آٹے کو ملاکر پورا کیا جا سکتا ہے۔ مرکزی غذائی تحقیقاتی ادارہ ہند (C.F.T.R.I) کی ایجاد کی ہوئی ترکیب کے مطابق ٹاپیوکا کی جڑوں کو چھیل کر اور سکھا کر پیس لیا جاتا ہے۔ پھر اس میں ۱۵ فیصدی مونگ پھلی کا تیل نکلا ہوا آٹا اور ۲۵ فیصدی گیہوں (Samolcine) کا آٹا ملاکر ایک مفید مرکب تیار کیا جاتا ہے۔ اس مرکب آٹے کو پانی میں گوندھ کر سیوئیاں (Macaroni) بنائی جاتی ہیں جنھیں تجارتی پیمانہ پر تیار کرنے کے لئے ہندوستانی سرکار کی طرف سے چند کارخانے بھی قائم کئے گئے ہیں اور ان سیوئیوں کو (Tapioca macaroni) کے نام سے ملک کے مختلف حصوں میں فروخت کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ غذا جلد ہی عام ہو جائے گی۔

ایلگی (ALGAE) بہت ہی غیر پیچیدہ بناوٹ کے اور عام طور سے بہت چھوٹے پودوں کا یہ گروہ عام نباتات سے چند معنی میں مختلف ہے ان نباتات میں جڑیں۔ پتیاں۔ اور تنے نہیں ہوتے۔ اکثر اقسام (Species) صرف ایک سیل (Cell) کے ہوتے ہیں اور بعض ایک باریک دھاگے کی شکل کے ہوتے ہیں جو دراصل سیلوں (Cells) کی ایک قطار ہوتی ہے۔ عام طور سے تالابوں میں تیرتے ہوئے ہرے دھاگوں کے جال کی شکل کے یہ نباتات ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ ایلگی (ALGAE) کی دوسری قسمیں مختلف ماحول میں ملتی ہیں۔ ہرے۔ سنہرے۔ پیلے۔ آتشیں۔ بھورے اور سرخ رنگ کے یہ نباتات بغیر استیاز آب و ہوا نم اور نرم مقامات پر پیدا ہوتے اور پائے جاتے ہیں چاہے یہ نمی اور نرمی سربلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہو یا سمندر کی گہرائیوں میں، درختوں کی شاخوں اور تنوں پر ہو یا دیواروں اور چٹانوں پر۔ یہ عجیب پودے بڑی تیزی سے بڑھتے اور پھیلتے ہیں۔ مختلف ممالک کے سائنسدانوں نے ایلگی کی غذائیت کے بارے میں تحقیقات کرکے یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ غذا کی حیثیت سے ایلگی کا مستقبل بہت روشن ہے۔ جاپان کے پروفیسر ٹامیا، امریکہ کے ڈاکٹر مائیرز، وینیزویلا کے ڈاکٹر جارگیس اور ڈاکٹر جیو گھیگن کی امریکی تحقیقات سے بھی پتہ چلا ہے کہ ان ننھے پودوں میں کافی غذائیت ہوتی ہے۔ عام غذائی اشیا مثلاً اناج اور ترکاریوں کی کاشت کے مقابلے میں ایلگی کی کاشت بہت آسان، کم خرچ اور کافی فائدہ مند ثابت ہوگی۔ گھروں کی چھتوں پر یا صحن میں چھوٹے چھوٹے اتھلے حوض بناکر پانی میں رہنے والی ایلگی کی قسموں کی کاشت بڑی آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ سائنسی تجربات کی بنا پر یہ معلوم کیا جا چکا ہے کہ طریقۂ کاشت میں ناتجربہ کاری کی بنا پر پیدا ہونے والی اکثر غلطیوں کے باوجود دس سے پندرہ ٹن فی ایکڑ خشک غذائی مادہ ایلگی کی کاشت سے بہ آسانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] کیلوری = بین الاقوامی طاقتی پیمانہ ہے۔

فنگائی (FUNGI)- نباتات کی یہ قسم ہمارے لئے اتنی اجنبی نہیں جتنا اس کا نام ہے۔ رسات اور مرطوب آب و ہوا میں جوتوں، کتابوں، روٹی اور فرنیچر پر اُگنے والی پھپھوندی اور کوڑے کرکٹ پر اُگنے والے چھتری نما پودوں کا یہ گروہ تقریباً ہر ملک میں پایا جاتا ہے۔ اس نباتاتی گروہ میں اور بھی دوسرے قسم کے غیر معروف نباتات ہوتے ہیں۔ عام نباتات سے یہ پودے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ہرا مادہ کلوروفل (Chlorophyll) نہ ہونے کی وجہ سے یہ عجیب نباتات اپنی غذا عموماً جاندار (Organic) مادہ سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ سڑے گلے مرے ہوئے جاندار مادہ پر ہی اُگتے ہیں۔ طبی نقطۂ نظر سے بھی فنگائی بہت اہم ہیں۔ ہم کو اس کی ایک قسم پینسلیم (Penicillium) سے وہ مشہور دوا ملتی رہی ہے جس کو پنسلین (Penicillin) کہتے ہیں۔ اس گروہ کے اکثر اقسام سے ہم کو سخت نقصان بھی پہنچتا رہتا ہے مثلاً پھپھوندی۔ وھیٹ رسٹ (Wheat Rust) وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان پودوں کی غذائی اہمیت کی طرف توجہ حال ہی میں مبذول ہوئی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ مستقبل کی غذا میں فنگائی کی اہم جگہ ہوگی۔

فرانس اور اکثر دوسرے ممالک میں فنگائی کی کچھ قسمیں آج بھی نہایت پرتکلف اور مفید غذا شمار کی جاتی ہیں مثلاً ٹرفیلس (Truffles) اور اگاریکس (Agaricus) لیکن قابل غذا فنگائی کو پہچاننے میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہئیے کیونکہ اکثر فنگائی نہایت زہریلے بھی ہوتے ہیں۔ شاید انھیں چند زہریلے افراد نے انسانی توجہ کو فنگائی کی طرف سے ہٹا دیا ہے اور آج تک اس نباتاتی گروہ کو غذائی اعتبار سے نظر انداز کیا جارہا ہے۔ بہرحال موجودہ تحقیقات کے پیش نظر فنگائی کو زیادہ دن تک غذائی اعتبار سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بڑی آسانی تو ان نباتات کی کاشت میں ہے وہ یہ کہ یہ ایسی جگہوں پر اُگتے ہیں جو ہرے پودوں کی کاشت کے لئے بالکل بیکار اور نامناسب ہوتی ہیں مثلاً اندھیری اور سایہ دار جگہیں۔ اس کے علاوہ ان کی نشوونما دوسرے نباتات کے مقابلے میں بہت تیز ہوتی ہے اور جلد ہی ان کی فصل کافی پھیل جاتی ہے۔ اس لئے فنگائی کو گھروں کے بیکار کونوں اور گوشوں میں بویا جا سکتا ہے اور بے محنت کئے اور بغیر اخراجات کے اچھی خاصی مقدار میں غذا حاصل کی جا سکتی ہے۔

پلینکٹان (Plankton)۔ زمانۂ قدیم سے جہاں انسان زمین کی کوکھ سے جنم لینے والے غذائی ذرائع کو استعمال کرتا رہا ہے وہاں اس کی متجسس فطرت نے سمندر کے رازہائے سربستہ کو بھی افشا کیا ہے۔ چنانچہ سمندر سے حاصل کی جاسکنے والی غذاؤں میں پلینکٹان (Plankton) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

پلینکٹان (Plankton) ان تمام ننھے نباتات اور حیوانات کے لئے مجموعی طور پر استعمال ہوتا ہے جو پانی میں رہتے ہیں اور جو اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ پانی کی لہروں اور دھاروں کے خلاف تیر نہیں سکتے بلکہ امواج کے دوش پر جھولتے اور بہتے رہتے ہیں۔ اس گروہ میں الجی کی مختلف قسمیں، بہت سے خوردبینی (Microscopic) حیوانات مثلاً پروٹوزوا (Protozoa)، اکثر کیڑے مکوڑے (Arthropods)، چھوٹی قسم کے مچھلیوں کے انڈے اور نوزائیدہ بچے اور اسی قسم کے مختلف جاندار شامل کئے جاتے ہیں۔ اس طرح تقریباً ہر حیواناتی گروہ کے ممبران اور بہت سے نباتاتی گروہوں کے اقسام اپنی زندگی کے دوران میں ایک ایسی منزل سے گزرتے ہیں جب ان کا شمار پلینکٹان میں کیا جاتا ہے۔ ویسے تو پلینکٹان پانی کے ہر قدرتی ذخیرہ میں پائے جاتے ہیں لیکن سمندر میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ ممکن ہے کہ سطح سمندر سے لیکر چند فیٹ کی گہرائی تک کسی جگہ سے ایک چلو پانی لیا جائے اور اس میں سیکڑوں کی تعداد میں پلینکٹانی جاندار نہ ہوں۔ ان جانداروں Planktonic Organism کے بارے میں ایک دلچسپ چیز یہ ہے کہ سمندر، دریاؤں اور تالابوں میں رہنے والے زیادہ تر حیوانات کی یہ خاص اور واحد غذا ہیں۔ شارک اور وھیل مچھلیوں جیسے جسیم اور طاقتور حیوانات کی طاقت کا واحد ذریعہ پلینکٹانی جاندار ہیں جنھیں یہ قوی ہیکل حیوانات کھاتے ہیں۔ اس بات سے ان ننھے، نازک اور عجیب قسم کے جانداروں کی غذائی اہمیت (Nutritive value) کا ثبوت ملتا ہے۔ سائنس کی تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اکثر پلینکٹانی جاندار کافی مقدار میں کیروٹین (Carotenes) چربی (Fats) اور وٹامن (Vitamins) رکھتے ہیں جو ہمارے جسم کے لئے نہ صرف بہت مفید بلکہ نہایت ضروری ہیں۔

گزشتہ ۰۰ سال سے دنیا کے مختلف ممالک کے سائنسداں پلینکٹان

کی غذائی اہمیت کے سلسلہ میں تحقیقات میں مصروف ہیں اور اب تک بہت سی دلچسپ حقیقتوں کا انکشاف ہوچکا ہے۔ ڈبلو۔ اے۔ ہرڈ مین (W. A. Herdman) نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ نہ صرف لذیذ اور زود ہضم غذا ہے بلکہ کافی طاقت بخش بھی ہے۔ پلینکٹان کو تجارتی کاروبار کے لئے حاصل کرنے میں ایک بڑی دقت یہ ہے کہ یہ جاندار اتنے باریک ہوتے ہیں کہ معمولی کپڑے تک میں سے چھن کر نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کو پکڑنے کے لئے نہایت ہی باریک قسم کے بڑے بڑے جال بنائے جاتے ہیں جن میں اس بات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ان کی بناوٹ اس قسم کی ہو کہ جال کے اندر سے پانی کے بہاؤ میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو ورنہ پانی کے اندر تیزی سے ان جالوں کو کھینچنا سخت دشوار ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ تمام مسائل ایسے نہیں ہیں جو حل نہ ہوسکیں۔ ایسی بناوٹ کے جال تیار کر لئے گئے ہیں جن سے کافی حد تک کامیابی کے ساتھ کام لیا جاسکتا ہے۔ چین کے ساحلی علاقوں میں جھینگے کی قسم کے ایک نہایت چھوٹے پلینکٹانی جانور (Plankton Shrimp) سے ایک نہایت عمدہ اور خوش ذائقہ غذا تیار ہوچکی ہے۔ اس کے ماسوا سمندر کے مختلف حصوں اور گہرائیوں میں پلینکٹانی جانداروں کی موجودگی اور ان کی آبادی کی کمی یا زیادتی معلوم کرنے کے لئے ایک نہایت مفید آلہ ایجاد ہوچکا ہے جس کو ایکومیٹر (Echometer) کہتے ہیں۔

یہ ننھے جانور جو بہت چھوٹے ہونے کے علاوہ اس قدر نازک ہوتے ہیں کہ ماحول کی تبدیلی کو مشکل ہی سے برداشت کرسکتے ہیں اس لئے متعدد تجربہ گاہوں میں یہ تحقیق بھی ہو رہی ہے کہ انھیں سمندر سے نکال کر مصنوعی ماحول میں رکھا جاسکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ کئی محققین نے سمندری ساحل کو کاٹ کر سمندری پانی سے اس طرح مصنوعی ماحول بنائے ہیں جو تالابوں یا جھیلوں کی شکل کے ہوتے ہیں۔ ابھی تک انھیں ان پلینکٹانی جانداروں کو زندہ رکھنے اور فروغ دینے میں کافی کامیابی ہوئی ہے۔

"ٹی۔بی سیل کی فروخت کی مہم دراصل ایک گاندھیائی طریقہ ہے کسی نیک مقصد کے لیے عوام میں بھائی چارہ پیدا کرنے کا . . . میں ہر شخص سے اپیل کرتی ہوں کہ وہ اس تحریک کی دل وجان سے حمایت کرے اور ہماری ٹی۔بی۔ ایسوسی ایشنوں کو اس قابل بنائے کہ وہ دق کی روک تھام کے کام کو فروغ دے سکیں اور اس بیماری سے لڑنے کے لیے جو قومی منصوبے بروئے کار لائے جا رہے ہیں ان میں ایک ٹھوس غیر سرکاری سیکٹر کی حیثیت سے کام کرسکیں۔" ———— راجکماری امرت کور

جو لوگ ٹی۔بی سیل خریدیں گے اور اپنے خطوں، پارسلوں، تہنیتی کارڈوں اور تحفوں پر لگائیں گے وہ ٹی۔بی کے اُن مریضوں کی خاموش احسان مندی کے مستحق ہوں گے جن کے مفاد کے لیے سیل اس طرح استعمال کی جائیں گی ———— ٹی۔بی سیل حسبِ ذیل مقامات سے دستیاب ہوسکتی ہیں

(۱) آنریری سکریٹری، اُتر پردیش ٹیوبرکلوسس ایسوسی ایشن ۱۔اے، پی، سین روڈ، لکھنؤ

(۲) سیل فروخت کمیٹی، اُتر پردیش کے ہر ضلع میں۔

(۳) میونسپل اور/یا ڈسٹرکٹ میڈیکل آفیسر آف ہیلتھ۔ اتر پردیش کے ہر ضلع میں

گیارھویں ٹی۔بی سیل فروخت مہم

من جانب ٹیوبرکلوسس ایسوسی ایشن آف انڈیا۔ نئی دہلی

جگہ: عطیہ از ـــ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

اترپردیش شاہراہ ترقی پر

قومی معاشیات میں گائے کی اہمیت پر گورنر کا براڈکاسٹ ___ اترپردیش میں تحریک امداد باہمی کی رفتار ترقی ___ بھاری صنعتوں کی ترقی کے سلسلے میں سفارشات ___ تیسرے منصوبے کے تحت ۲۶ دیہی صنعتی ریاستوں کے قیام کی تجویز ___ سیلاب زدگان کی فوری بحالی ___ سیلاب سے غیرمتاثر علاقوں میں ربیع مہم ___ مال گزاری مطالبہ درستی اسکیم سے آمدنی میں اضافہ ___ تیسرے منصوبے میں بجلی کی پیداوار ___ بجلی ڈیوٹی جمع کرنے کی سہولت ___ مزید پنڈ شہروں میں واٹر ورکس ___ تیسرے منصوبے میں آب پاشی کی نئی اسکیمیں ___ راپتی پر پل کی تعمیر ___ ریہاند باندھ ___ متفرقات

اترپردیش کے گورنر ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ نے ۲۰ اکتوبر کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے گوپاشٹمی کے موقعہ پر ایک تقریر نشر کرتے ہوئے کہا کہ دیہی معاش کے استحکام اور ترقی میں گائے اور اس کے بچھڑوں کی نمایاں اہمیت ہے جن کے بغیر ملک میں زراعتی معاشیات کی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

گوپاشٹمی کی تقریب کا مقصد بتاتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ عوام میں گائے اور اس کے بچھڑوں کی سچی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ ان پر مویشیوں کی دولت کے تحفظ کی اہمیت بھی واضح کرنا ہے۔

سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ مویشیوں کے تحفظ کے مسئلہ کی جانب عوام کی توجہ مبذول کرنا بہت زیادہ ضروری ہے کیونکہ ہندوستان کا غریب کسان جس کے پاس بہت کم اراضی ہوتی ہے مشینی کھیتی کرنے سے قاصر ہے۔ وہ بیلوں کے سہارے ہی کھیتی کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں عوام کے لئے خوراک دودھ اور زراعتی اہمیت کی اشیاء جیسے گوبر اور ہڈیوں وغیرہ کی فراہمی کے لئے گائے کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔

مویشیوں کی نسل کے سدھار کے لئے ریاستی حکومت کی جانب سے کئے گئے اقدامات کا ذکر کرتے ہوئے گورنر نے کہا کہ پہلے پنجسالہ منصوبہ کے دوران میں اس ضمن میں کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ دوسرے منصوبہ کے تحت پہلے منصوبہ کی زیرعمل اسکیموں کے علاوہ ۴۶ نئی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔

اُنھوں نے کہا کہ مویشیوں کی نسل کو بہتر بنانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے لئے کافی مقدار میں بہتر چارہ پیدا کیا جائے۔ اس ضمن میں اُنھوں نے اس امر پر زور دیا کہ برسیم اور لوسرن وغیرہ کو چارہ کی فصلوں میں شامل کیا جائے جس سے چارہ کی پیداوار کے ساتھ ہی زمین کی زرخیزی میں بھی اضافہ ہوگا۔

گورنر نے اس امر پر بھی زور دیا کہ مویشیوں کی بیماریوں کی بیخ کنی کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے۔ آخر میں اُنھوں نے کہا کہ قومی بیداری کے اس دور میں گوپاشٹمی کی تقریب ہمارے لئے گائے اور اس کے بچھڑے اور مویشیوں کی دولت کے تحفظ کے لئے سرگرم عمل ہونے کا مظہر ہے۔ اُنھوں نے یہ اُمید ظاہر کی کہ اس موقعہ پر عوام اپنی مذہبی قدروں کے ساتھ ساتھ قومی ضرورت کا بھی احساس کریں گے اور گائے اور مویشیوں کی دولت کا تحفظ اور اس میں اضافہ کرنے کے لئے کمربستہ ہوں گے۔

ہندوستان اور اترپردیش میں ۵ نومبر سے ۱۲ نومبر تک کُل ہند امداد باہمی ہفتہ منایا گیا۔ اترپردیش میں اس ہفتہ کی تقریبات کا افتتاح کرتے ہوئے اترپردیش کے وزیر زراعت اور امداد باہمی شری موہن لال گوتم نے اترپردیش تحریک امداد باہمی کی رفتار بتائی اور کہا کہ موجودہ پنجسالہ منصوبہ کی مدت میں ریاست کی تحریک امداد باہمی نے بہت جلد ملک میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔

انھوں نے مزید کہا کہ ہر ایک گاؤں میں امداد باہمی انجمن کے قیام کے سلسلہ میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس سال کے آخر تک مشکل سے تین چار ہزار گاؤں ایسے بچ جائیں گے جن میں امداد باہمی انجمنوں کا قیام عمل میں نہ آسکے گا۔ گزشتہ تین چار برسوں کے اندر چالیس ہزار سے زائد گاؤں سبھاؤں میں امداد باہمی انجمنیں قائم ہو چکیں ہیں۔ اور ان کے ذریعہ دیئے جانے والے نقد قرضے کی رقم ۴ کروڑ روپیہ سے بڑھ کر ۱۵ کروڑ روپیہ تک پہنچ گئی ہے۔

شری گوتم نے بتایا کہ اتر پردیش ہی ایسی ریاست ہے جس نے ریزرو بینک سے حکومت کی ضمانت کے بغیر زراعتی اغراض کے لئے بھی قرضے حاصل کئے ہیں۔

امداد باہمی انجمنوں کی رفتار ترقی کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ اس ریاست کی امداد باہمی انجمنوں نے منصوبہ کی مدت میں اپنا سرمایہ حصص ۹۹ء۳ کروڑ روپیہ سے بڑھا کر ۹ کروڑ روپیہ کر لیا ہے۔ مرکزی بینکوں اور ریاستی امداد باہمی بینک کی نجی پونجی میں بھی اسی طرح اضافہ ہوا ہے۔ مرکزی بینکوں کی نجی پونجی ۶۴ء۱ کروڑ روپیہ سے بڑھ کر ۵۰ء۶ کروڑ روپیہ تک پہنچ گئی ہے۔ اور ریاستی امداد باہمی بینک کی نجی پونجی اس وقت ۵۵ء۲ کروڑ روپیہ ہے۔

انھوں نے کہا کہ منصوبہ کی مدت میں ۱۴۰ مارکیٹنگ سوسائٹیوں کی تشکیل ہو چکی ہے۔ ان سوسائٹیوں کی کل پونجی تقریباً ایک کروڑ روپیہ۔ ممبروں کی تعداد ۲۱۱۱۹۴ اور سالانہ لین دین ۱۴ کروڑ روپیہ تک پہنچ گیا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ریاست میں تحریک امداد باہمی کے استحکام کا اندازہ قرضہ کے بقایا کی وصولی سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہمارے ابتدائی ممبروں اور انجمنوں کے ذمہ بقایا رقم کا تناسب کل واجب الادا رقم کے مقابلہ میں بالترتیب ۱۱ اور ۸ فیصدی ہے جبکہ کل ہند تناسب بالترتیب ۲۰ فیصدی اور ۱۱ فیصدی ہے۔

انھوں نے کہا کہ اتر پردیش ہی ایک ایسی ریاست ہے جہاں اداروں کے ذریعہ بہتر بیجوں کی تقسیم ہو رہی ہے۔ اس وقت ریاست میں ۱۵۲۷ امداد باہمی بیج گودام ہیں۔ گزشتہ سال ان گوداموں نے کسانوں کو ۴ کروڑ روپیہ کے بیج قرضہ کے طور پر دیئے۔

انھوں نے کہا کہ امداد باہمی فرمہ کے ضمن میں یہ بندوبست کرنا ہے کہ ہر گاؤں سبھا میں مستحکم اور خود کفیل امداد باہمی انجمن قائم ہو جائے۔ تیسرے پنجسالہ منصوبہ میں تقریباً چار ہزار گاؤں سبھاؤں میں تین ہزار انجمنوں کے قیام کی ضرورت ہوگی۔ اس منصوبہ میں گاؤں کی سطح پر کم سے کم ۶۵ لاکھ خاندان امداد باہمی انجمنوں سے مستفید ہوں گے۔

انھوں نے مزید کہا کہ تیسرے پنجسالہ منصوبہ میں دیہی گوداموں کی تعمیر کے لئے ایک کروڑ ۳ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔ انجمنوں اور ان کے ممبروں سے سامان اور نقد چندہ لے کر اس رقم میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن گاؤں کی سطح پر فصل کو اکٹھا کرنے کا کام گوداموں کی تعمیر ہونے تک نہیں روکا جا سکتا۔ اور فصل اکٹھا کرنے کے لئے ممبروں سے مفت یا کم کرایہ پر کمرے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

امداد باہمی کاشت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس وقت رجسٹرڈ امداد باہمی کاشت انجمنوں کی کل تعداد ۴۱۱ ہو گئی ہے جن کے ممبروں کی تعداد ۹۶۷۶ اور زیر کاشت رقبہ ۸۶۱۶۰ ایکڑ ہو گیا ہے۔ تیسرے منصوبہ کے تحت یہ اسکیم ہے کہ ریاست کے ۵۴ اضلاع میں سے ہر ایک میں ایک رہبر منصوبہ شروع کیا جائے اور رہبر منصوبہ میں دس انجمنوں کو شامل کیا جائے۔ قرضہ اور سرمایہ حصص کے طور پر حکومت ان فارموں کی مالی ضروریات کا بندوبست کرے گی۔ رہبر منصوبوں اور اس کے باہر تشکیل شدہ امداد باہمی کاشت انجمنوں کی امداد کے لئے تیسرے منصوبہ میں ۹۲ء۶۵ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

شری گوتم نے مزید کہا کہ دودھ کی امداد باہمی انجمنوں کے قیام اور ترقی کے لئے تیسرے منصوبہ میں ۵ء۴ کروڑ روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے۔

آخر میں شری گوتم نے کہا کہ اشتراکیت اور امداد باہمی دونوں کا ایک ہی نصب العین ہے۔ دونوں کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ ایک ایسے نئے نظام کی تشکیل کرنا ہے جس میں تمام اقتصادی سرگرمیاں عوام کی فلاح اور بہبود کے لئے ہوں گی نہ کہ منافع کے لئے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا نقطہ نظر فرد کی آزادی کا تحفظ کرنا محنت کے وقار کو برقرار رکھنا اور سرمایہ کی اہمیت کو عوام کی عظمت کے تابع کرنا ہے۔ ہم کو ایک نئے اقتصادی نظام کی تشکیل کرنا ہے جس میں ایک سب کے لئے اور سب ایک کے لئے کام

کریں۔ انھوں نے کہا کہ یہ میری دلی خواہش ہے کہ اس عظیم کام میں آپ کو کامیابی ملے۔

اتر پردیش کی بھاری صنعتوں سے متعلق پلان کمیٹی رپورٹ۔ یہ ۲۵ر اکتوبر کو منظم صنعتوں کے فروغ سے متعلق مشاورتی بورڈ کے جلسہ میں غور پیش کیا گیا۔ یہ جلسہ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند کی زیر صدارت ہوا۔ رپورٹ میں ریاست کے معدنیاتی۔ جنگلاتی۔ اور زراعتی وسائل کو بروئے کار لانے کے لئے بڑی تعداد میں کارخانوں کے قیام۔ بجلی کے وسائل کو کام میں لانے۔ اور تیسرے منصوبے اور اس کے بعد کے منصوبوں کے دوران صنعتی اور تکنیکی تحقیق کی توسیع پر زور دیا گیا ہے۔

تیسرے منصوبہ کے دوران میں اس ضمن میں مختلف اسکیموں پر مجموعی طور پر ۴۵۱ کروڑ روپیہ صرف کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ اس رقم میں سے نجی حلقہ کے بڑے ڈیو سر اور درمیانی اسبار کی صنعتوں کے لئے بالترتیب ۲۱۶ کروڑ روپیہ اور ۵۰ کروڑ روپیہ ——— پبلک سیکٹر میں صنعتوں کے قیام کے لئے ۱۲۸ کروڑ روپیہ۔ ریاستی ملاں کے لئے ۳۵ کروڑ روپیہ امداد باہمی سیکٹر کے لئے ۱۲ کروڑ روپیہ کی سفارش کی گئی ہے۔

کمیٹی کی خاص خاص سفارشات حسب ذیل ہیں ———

ریاست کے سیکٹر میں مختلف صنعتی منصوبوں کی تکمیل کے لئے ریاست میں بھاری صنعتوں کا ایک کارپوریشن قائم کیا جائے۔ علاوہ ازیں معدنیات کی ترقی کے لئے بھی ایک کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا جائے۔

ریاست کے مختلف اضلاع میں بڑی اور درمیانی درجہ کی صنعتوں کے قیام کے لئے مناسب علاقے مخصوص کر دئے جائیں اور ان کے لئے نقل و حمل اور بجلی وغیرہ کی ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

صنعتی ترقی بورڈ کی طرح ایک اعلیٰ اختیاری بورڈ قائم کیا جائے جو صنعتی اسکیموں پر عملدرآمد سے متعلق بلا تاخیر فیصلے کرے۔

ریاست میں صنعتی ترقی کے تمام پروگراموں کی منصوبہ بندی اور ان پر عملدرآمد کے لئے بھاری صنعتوں کا ایک ادارہ قائم کیا جائے۔

جو تیسرے منصوبہ کے دوران میں مغربی اتر پردیش میں ایک ایٹمی بجلی گھر قائم کیا جائے جس سے اس ریاست اور دہلی کے علاقہ کی بجلی کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

یو۔ پی مالیاتی کارپوریشن کے سرمایہ میں اضافہ کیا جائے تاکہ اس کے ذریعہ صنعتوں کے لئے ۱۰ کروڑ روپیہ تک کے قرضے دئے جا سکیں۔

ریاستی حکومت کی جانب سے نجی سیکٹر کی صنعتوں کے لئے ۱۵ کروڑ روپیہ تک کے قرضے جاری کئے جائیں اور ۲۰ کروڑ روپیہ کی بینک کی ضمانتوں کا انتظام کیا جائے۔

تیسرے منصوبہ کے دوران میں ہرکی سے نوگڑھ۔ چیونا تھ پور سے بجو پور اور ڈھلکہ باندھ سے دہرہ دون تک ریلوے لائنیں تعمیر کی جائیں۔

ریاست کے صنعتی علاقوں کی ترقی کے لئے کم سے کم ۵۰۰ میل لمبی نئی سڑکیں تعمیر کی جائیں۔

اطلاقی اور صنعتی تحقیق کے لئے ایک صنعتی تحقیقی کمیٹی کی تشکیل کی جائے۔

ہرکورٹ بٹلر ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ کانپور کے موجودہ وسائل کو صنعتی اور ٹکنیکل ریسرچ کے لئے کام میں لایا جائے۔

انجینئرنگ صنعتوں کے لئے ایک ڈیزائن اور ریسرچ مرکز قائم کیا جائے۔

گورنمنٹ پری سیزن انسٹرومنٹس فیکٹری لکھنؤ کی توسیع کی جائے۔

ہرکورٹ بٹلر انسٹی ٹیوٹ کانپور۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کانپور۔ بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی۔ فارسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہرہ دون۔ گورنمنٹ سنٹرل ٹکسٹائل انسٹی ٹیوٹ کانپور۔ اور رڑکی یونیورسٹی میں صنعتی اہمیت کے پوسٹ گریجویٹ کورس شروع کئے جائیں۔

کمیٹی نے ریاست کے صنعتی وسائل کو بروئے کار لانے کے لئے بڑے اور درمیانی درجہ کی جن صنعتوں کے قیام کی سفارش کی ہے ان میں کاغذ، پلاسٹک۔ بھاری کیمیاوی اشیاء۔ کیمیاوی کھاد۔ دواسازی

اگزیلا نمبر ۲۰۰۸۱

تیل ۔ الیکٹریکل اور میکنیکل انجنیئرنگ ـــــ خام دھات کو صاف کرنے کی صنعتیں ۔ چمڑہ ۔ جنگلات کی پیداوار ۔ شکر ۔ سیمنٹ ۔ اور کپڑے کی صنعتیں شامل ہیں ۔

بھاری صنعتوں کی پلان کمیٹی کو مستقل کمیٹی کی شکل دے دی جائے ۔ تاکہ یہ کمیٹی مختلف ترقیاتی پروگراموں پر عملدرآمد کے سلسلہ میں ریاستی حکومت کی مدد کرسکے ۔

اترپردیش میں تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت ۲۶۳ دیہی صنعتی بستیوں کے قیام کی تجویز ہے ۔ ہر ایک بستی کے قیام پر تقریباً ۲ لاکھ روپیہ صرف ہوگا ۔ امید کی جاتی ہے کہ ان بستیوں کے قیام سے دیہی علاقوں میں روزگار کے مزید مواقع حاصل ہوں گے ۔ صنعتوں کی بتدریج لامرکزیت اور دیہی علاقوں میں ان کی مساویانہ تقسیم بھی ان بستیوں کے قیام کا اہم مقصد ہے ۔

صنعتوں سے متعلق ریاستی رابطہ کمیٹی نے جس کا جلسہ حال میں نائب وزیر صنعت اور محنت شری ایچ ۔ این ۔ بہوگنا کی زیرصدارت منعقد ہوا ان بستیوں کے قیام کے لئے مناسب محل وقوع اور اس اسکیم پر بلاتاخیر عملدرآمد کے لئے ضروری عملہ سے متعلق سفارشیں کی ۔ کمیٹی نے منصوبہ کی اسکیموں سے متعلق کمیٹی ۔ صنعتی رہبر منصوبوں کی رفتار ترقی سے متعلق مطالعاتی ٹیم اور گذشتہ جون میں سری نگر میں منعقدہ اجتماعی ترقیاتی کانفرنس کی سفارشات پر غور و خوض کیا ۔

ڈیولپمنٹ کمشنر شری سیس چندر نے بتایا کہ پہاڑی اضلاع کے ہر ایک بلاک میں چل چرخہ لگانے کے لئے مالی امداد دی جائے گی ۔ انھوں نے مزید بتایا کہ الموڑا میں یہ تجربہ کامیاب رہا ہے اور ریاستی حکومت نے مالی سال رواں کے دوران مزید ۔ اچل چرخے لگانے کا فیصلہ کیا ہے ۔

کمیٹی کی دوسری اہم سفارشات حسب ذیل ہیں ـــــ

تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت کا ہور جیسی مزید امداد باہمی صنعتی بستیاں قائم کی جائیں ۔

وظیفہ کی رقم میں اضافہ کرکے تربیت کی مدت میں مزدوری کمانے کی مزید سہولتیں بہم پہنچاکر دستکاروں کے خاندان کے اور زیادہ افراد کو تربیت حاصل کرنے پر آمادہ کیا جائے ۔

تربیتی اور پیداواری مرکزوں کو دستکاروں کی معاشی امداد باہمی انجمنوں کے سپرد کردیا جائے ۔

دیہی صنعتی مرکزوں کو ترقی دے کر چھوٹی بستیوں کی شکل دی جائے تاکہ دیہی علاقوں سے لوگوں کو روزگار کی تلاش میں شہروں میں جانا نہ پڑے ۔

کسانوں کے لئے بھارت درشن کے دوروں کی طرح دستکاروں کے لئے بھی معلوماتی دوروں کا انتظام کیا جائے ۔

کھادی اور دیہی صنعتوں سے متعلق کل ہند کمیشن سے ہر ایک بلاک میں پیداوار کے دو دو اداروں کے قیام کے لئے کہا جائے ۔

ہر ایک بلاک میں دستکاروں کو سرمایہ اور ضروری اخراجات کے لئے ۳۰ ہزار روپیہ کے قرضے دینے کی اسکیم جاری رکھی جائے ۔

حکومت اترپردیش نے سیلاب سے متاثر اضلاع کے ضلع افسروں کو یہ ہدایات جاری کی ہیں کہ وہ سیلاب زدگان کی بحالی کے لئے فوری کارروائی کریں ۔ حکومت نے اس سلسلہ میں سیلاب زدگان کو مکان اور کھیتی کیلئے زمین کی فراہمی ۔ مکانات کی تعمیر کے لئے امداد ۔ غیر کاشتکاروں کو قرضے اور مکانات کی تعمیر کے لئے امداد دینے سے متعلق بھی تفصیلی ہدایات جاری کی ہیں ۔

ضلع افسروں سے کہا گیا ہے کہ وہ ہر ایک سب ڈویژن کے لئے ایک اسکیم وضع کریں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہاں کیسے اشخاص کو مکانات اور کھیتی کے لئے زمین درکار ہے اور کن مواضعات میں گاؤں سماج یا محکمہ جنگلات کی ایسی زمین دستیاب ہے ۔

اگر کسی سب ڈویژن میں گاؤں سماج یا محکمہ جنگلات کی کافی زمین دستیاب نہیں ہے تو ایسی صورت میں ان لوگوں کی ایک فہرست مرتب کرنا چاہئے جنھیں وہاں جگہ نہیں دی جاسکتی ۔ ایسی فہرستوں کو ضلع کے دوسرے سب ڈویژنوں میں بھیجا جائے تاکہ ان لوگوں کو وہاں زمین دی جاسکے ۔ اگر پورے ضلع میں ضرورت کے مطابق کافی زمین دستیاب

نہیں ہے تو اس کی اطلاع سب ڈویژن کمشنر کو دینا چاہئے جو اپنے ڈویژن کے دوسرے ضلع افسروں کو ضروری کارروائی کرنے کی ہدایات دیں گے۔

سیلاب زدگان کو الاٹ کی جانے والی زمین کی مناسب حدبندی کرنا چاہئے اور سڑکوں اور گلیوں وغیرہ کا بھی معقول بندوبست کرنا چاہئے۔ اگر پورے گاؤں کو از سر نو بسانے کی ضرورت ہو تو نظم اور ترتیب کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا خاکہ تیار کرنا چاہئے۔ اور اس امر کا پورا خیال رکھا جانا چاہئے کہ تا حد امکان ہر جگہ ایک آدرش گاؤں کی طرح تیار کیا جائے۔

حصول جائداد اور امداد سیلاب سے متعلق ریاستی قانون کے تحت بھی مکانات کی تعمیر کے لئے زمین مناسب معاوضہ کی ادائیگی پر حاصل کی جا سکتی ہے۔ سیلاب زدگان کو یہ زمین حکومت کی جانب سے معاوضہ کے طور پر دی گئی رقم کے مساوی رقم کی ادائیگی پر الاٹ کی جا سکتی ہیں۔ اور ایسی زمین مناسب کرایہ پر پٹہ پر بھی دی جا سکتی ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ ضلع افسر یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص غربت کی وجہ سے زمین خرید سکے یا کرایہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو ایسے شخص کو زمین تحفہ کے طور پر دینے یا رعایتی شرح پر پٹہ پر دینے کے لئے ضلع افسر کو حکومت کے پاس رپورٹ بھیجنا چاہئے۔ ایسے تمام معاملوں میں سرکاری امداد ایکٹ کے تحت ایک باقاعدہ پٹہ تحریر کیا جانا چاہئے۔

اگر کوئی شخص جسے زمین دی گئی ہے مقررہ مدت کے اندر مکان تعمیر نہیں کرتا تو پٹہ ختم ہو جائے گا اور حکومت کو اس زمین پر دوبارہ قبضہ کرنے کا اختیار ہوگا۔ پٹہ کے تحت پٹہ دار کو ۳۰ برس کے لئے موروثی حقوق حاصل ہو جائیں گے لیکن یہ حقوق دوسروں کو منتقل نہیں کئے جائیں گے۔ پٹہ دار پٹہ کی تجدید بھی کرا سکے گا۔

سیلاب زدگان کو کھیتی کے لئے بھی زمین دی جائے گی۔ اس سلسلہ میں ایک خاندان کو ۱۲۵ء۳ ایکڑ سے کم اور ۲۵ء۶ سے زیادہ زمین نہیں دی جائے گی۔

اگر پٹہ دار پٹہ کی تاریخ سے دو سال کے اندر زمین میں کھیتی شروع نہیں کرتا تو پٹہ ختم ہو جائے گا اور حکومت کو زمین پر دوبارہ قبضہ کرنے کا اختیار ہوگا۔ ان شرائط پر جو اشخاص زمین لیں گے انہیں اسی سابقہ زمینوں کے جملہ حقوق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ کھیتی کے لئے صرف ایسے اشخاص کو زمینیں دی جائیں گی جو اپنے مواضعات میں سیرداً یا آدھی واسی تھے۔

مصیبت کے زمانہ میں کاشتکاروں کو تقاوی دینے کے احکام پہلے ہی سے موجود ہیں۔ حکومت نے ضلع افسروں کو دیہی اور شہری علاقوں میں غیر کاشتکاروں کو مصیبت کے زمانہ کے قرضے دینے کی ہدایات بھی جاری کی ہیں۔ کاوال شہروں میں یہ قرضے ایک خاندان کو ۵۰۰ روپیہ تک اور ریاست کے دوسرے علاقوں میں ایک خاندان کو ۲۵۰ روپیہ تک قرضے دئے جائیں گے۔ لیکن یہ قرضے ایسے خاندان کو نہیں دئے جائیں گے جس کو مکان کی تعمیر کے لئے قرضے دئے جا چکے ہیں۔

ریاستی حکومت نے غیر کاشتکاروں کو مکان کی تعمیر یا مرمت کے لئے دئے جانے والی قرضہ کی موجودہ حد جو ۲۵۰ روپیہ ہے کاوال شہروں میں بڑھا کر ۲ ہزار روپیہ اور دوسرے شہروں میں ایک ہزار روپیہ کر دی ہے۔ ریاست کے دوسرے علاقوں میں قرضہ کی انتہائی حد ۲۵۰ روپیہ ہے۔

ایسے قرضوں کی وصولی ۴ یا ۶ مساوی ششماہی قسطوں میں کی جائیگی ان قرضوں پر پانچ فی صدی سالانہ سود لیا جائے گا۔ باقاعدگی کے ساتھ قسطوں کی ادائیگی پر سود میں ایک فیصدی چھوٹ دی جائے گی۔ قرضہ کی پہلی قسط قرضہ دئے جانے کے چھ ماہ بعد واجب الادا ہوگی۔ ۴۰ روپیہ یا اس سے کم کے قرضے چار قسطوں میں وصول کئے جائیں گے۔

اگر قرضہ دئے جانے کی تاریخ سے تین ماہ یا ضلع افسر کے ذریعہ مقرر کی گئی مدت کے اندر مکان نہیں تعمیر کیا گیا تو قرضہ کی پوری رقم فوراً وصول کی جائے گی۔

ضلع افسروں سے کہا گیا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں درخواستیں طلب کریں۔ جن کی جانچ موقعہ پر شہروں اور شہری علاقوں میں فرسٹ کلاس مجسٹریٹ اور دیہی علاقوں میں نائب تحصیلدار کے ذریعہ کی جائیگی۔ یہ افسر قرضہ تقسیم بھی کریں گے۔

اتر پردیش کے ڈولپمنٹ کمشنر نے ایک گشتی چٹھی کے ذریعہ منصوبہ بندی

سے متعلق تمام محکموں کے افسروں کو یہ ہدایات جاری کی ہیں کہ وہ سیلاب سے غیر متاثر علاقوں میں ربیع مہم کی رفتار تیز تر کر دیں۔ چٹھی میں اس اندیشہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ سیلاب زدہ علاقوں میں ربیع کی بوائی میں بہت زیادہ تاخیر ہوگی۔ چٹھی میں سیلاب سے غیر متاثر علاقوں میں گیہوں اور جو کے تمام کھیتوں میں کیمیاوی کھاد کے مرکب کے استعمال کا مشورہ دیا گیا ہے۔ چونکہ اس سال زمین میں کافی نمی ہے اس لئے اتر پردیش کے طریقہ سے گیہوں اور جو کی کاشت کیلئے مقررہ کیمیاوی کھاد کے مرکب کی مقدار کا نصف ایسے علاقوں کو چھوڑ کر جہاں ستمبر یا اکتوبر کے دوران میں بارش نہیں ہوئی تمام غیر سیراب علاقوں میں استعمال کی جائے۔

چٹھی میں مزید کہا گیا ہے کہ چنا اور مٹر کے زیر کاشت علاقوں میں سوپر فاسفیٹ استعمال کی جائے۔ تجربات سے پتہ چلا ہے کہ سوپر فاسفیٹ کے استعمال سے چنا اور مٹر کی پیداوار میں ۲۰ سے لے کر ۲۵ فی صدی تک اضافہ ہوا ہے۔ افسروں سے کہا گیا ہے کہ وہ اس ضمن میں مخصوص مہم شروع کریں

ٹیوب ویل کے علاقوں میں پیداوار اضافہ کے لئے مخصوص پروگراموں کی ضروریات پر زور دیا گیا ہے تاکہ ایسے علاقوں میں پیداوار ۲۰ من فی ایکڑ سے کم نہ ہو۔

ڈویلپمنٹ کمشنر نے چٹھی میں یہ امید ظاہر کی ہے کہ سیلاب سے نقصانات کے باوجود اس سال ربیع کی فصل بہت اچھی ہوگی۔ زمین میں کافی نمی ہونے کی وجہ سے ان نقصانات کی بڑی حد تک تلافی ہو سکے گی بشرطیکہ پودوں کی نشو و نما کے لئے بڑے پیمانہ پر کیمیاوی کھاد استعمال کی جائے۔

اتر پردیش میں مالگذاری کی شرح میں کسی قسم کا اضافہ کئے بغیر اس کے سالانہ مطالبہ میں ۵۸۲۲۰۰۰ روپیہ سے زائد کا اضافہ ہوا ہے۔

یہ اضافہ مالگذاری کے مطالبہ کی درستی کی اسکیم کے سبب ہوا ہے جو ریاست میں گزشتہ اپریل میں شروع کی گئی تھی اور جس کا مقصد ایسی جوتوں پر مالگذاری عائد کرنا تھا جن کے قابض اشخاص ان کی ادائیگی سے کسی نہ کسی طرح بچ نکلتے تھے۔ اگرچہ وہ قانوناً اس کو ادا کرنے کے ذمہ دار تھے۔ ان میں خاص طور سے وہ جوتیں تھیں جو اگرچہ باغات کے طور پر درج تھیں لیکن حقیقت میں ان کی اصل نوعیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اور ان میں کاشت کی جاتی تھی علاوہ ازیں اس زمرہ میں ایسی جوتوں کے قابض اشخاص جن کو سیردار قرار دیا جا چکا تھا لیکن ان کا اندراج نہیں ہوا تھا اور ایسے قابض اشخاص بھی آتے ہیں جن کو کھتونی میں غلط اندراج کی بنا پر سیردار قرار نہیں دیا گیا تھا۔

اس اسکیم کے تحت کھاتہ داروں کے ذمہ سابق فصلوں کی جو بقایا مالگذاری واجب الادا پائی گئی اس کی مجموعی رقم گزشتہ ۱۵۔ اگست کو ۱۸۲۰۳۳۳ لاکھ روپیہ سے زائد تھی۔

کھاتہ داروں کو پریشانی سے بچانے کے لئے رواں مطالبہ کے ساتھ ان سے صرف ایک سال کی بقایا مالگذاری وصول کی جاتی ہے۔ ریاستی حکومت کی جانب سے یہ بھی ہدایات جاری کی گئیں کہ ان کھاتہ داروں سے بقایا وصول کرنے کے لئے کوئی اقدامات فی الحال نہ کئے جائیں جن کے اعتراضات قطعی فیصلہ کے لئے محکمہ مال کے مجاز حکام کے یہاں زیر سماعت ہیں۔

اس کے علاوہ اُن کھاتہ داروں کو محکمہ مال کے مجاز افسروں کے یہاں اپنے اعتراضات داخل کرنے کے لئے ایک ماہ کی مہلت دی گئی ہے جن کو متعلقہ مطالبہ کا نوٹس یا اطلاع نہیں ملی ہے اور ان کو اس کے متعلق پہلی بار اس وقت پتہ چلا ہے جبکہ امین ان کے پاس اس مطالبہ کو وصول کرنے گیا ہے بشرطیکہ اُنھوں نے امین سے تحریری طور پر اعتراض داخل کرنے کا ارادہ ظاہر کر دیا ہے۔

ریاست کے تیسرے پنجسالہ منصوبہ میں بجلی پیدا کرنے کی نو بڑی اسکیموں کی شمولیت کے لئے منظوری مل گئی ہے۔ ان اسکیموں کی تکمیل سے ریاست میں بجلی پیدا کرنے کی امکانی صلاحیت میں جو اس وقت تقریباً ۴۳۸ میگاواٹ ہے (ایک میگاواٹ ایک ہزار کیلوواٹ کے برابر ہوتا ہے) ۷۴۲ ایم۔ ڈبلیو کا اضافہ ہو جائے گا۔

بجلی کی مذکورہ اسکیمیں یہ ہیں — ریہاند — (۲۵۰ ایم۔ ڈبلیو) ماتا ٹیلہ (۳۰ ایم۔ ڈبلیو) — اوبڑا (۴۸ ایم۔ ڈبلیو) — یمنا مرحلہ اول (۵۶ ایم۔ ڈبلیو) — سنگرولی اسٹیم اسٹیشن (۲۵۰ ایم۔ ڈبلیو) — ہردوا گنج توسیعی مرحلہ اول (۶۰ ایم۔ ڈبلیو) — کانپور الیکٹرک سپلائی اکسٹینشن (۱۵ ایم۔ ڈبلیو) — ہردوا گنج مرحلہ دوم (۳۰ ایم۔ ڈبلیو)۔ اور پہاڑی علاقوں کے لیے چھوٹی اسکیمیں (تقریباً ۳ ایم۔ ڈبلیو)۔ علاوہ ازیں

اگر دونوں اسکیموں پر طریقے سے عمل کی بات تین کامیاب ہوگئیں تو اس کی جیلا ۴۰ ایکڑ زمین ... ڈبلیو ہو سکتی ہے۔

ریاست ... میں جلی کی مقامی ضروریات پوری کرنے کے لیے پانی کی ... یاس تھے ڈیزل سیٹ تھے وہ سب بیکار نہیں گئے ہیں اور ... اور میرٹھ وغیرہ میں چھوٹے ڈیزل اسٹیشن قائم کیے گئے ہیں علاوہ ازیں ان ڈیزل سیٹوں کے لیے چلو سلوا لیبی کی ایک فرم کو آرڈر دیئے گئے ہیں امید کی جاتی ہے کہ یہ سیٹ اس سال کے آخر تک پہنچ جائیں گے اور آئندہ ... دیے جائیں گے۔

علاوہ ازیں ... میں دو چھوٹی تھرمل یونٹیں لگائی جا رہی ہیں جن کے ذریعہ ... ہزار کیلوواٹ بجلی کے اضافہ ہونے کی امید ہے۔

... کی تعمیر کا کام جاری ہے جس کے آئندہ ... تک مکمل ہو جانے کی امید ہے۔ اس کے ذریعہ کھٹیما بجلی گھر کی بجلی پیدا کرنے کی امکانی صلاحیت میں چار ہزار کیلوواٹ کا اضافہ ہوگا۔ تیسرے منصوبے کے آخر تک بجلی ... ان منصوبوں کی تکمیل سے صنعت کاری کی رفتار ترقی تیز تر ہو جائے گی اور روزگار کے مزید مواقع حاصل ہوں گے۔

حکومت کے اکاؤنٹس میں رقم جمع کرنے کے موجودہ طریقۂ کار کے مطابق رقم براہِ راست اسٹیٹ بنک آف انڈیا میں جمع کر دی جاتی ہے اور روپیہ جمع کرنے والے کو ٹریژری آفیسر کے ذریعے چالان کو پاس کرانا نہیں پڑتا۔ تاہم روپیہ جمع کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بنک کو رقم ادا کرتے وقت چالان بھی پیش کرے جس میں کھاتے کی مد اور دیگر تفصیلات درج ہوں اور اس پر متعلقہ محکمے کے کسی افسر کے دستخط بھی ہوں۔

الیکٹریکل انسپکٹر کے دفتر کے سلسلے میں جو لکھنؤ میں واقع ہے اور جس کے ذیلی دفاتر اضلاع میں نہیں ہیں روپیہ جمع کرنے والوں کو کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان پریشانیوں کو ختم کرنے کے لیے ریاستی حکومت نے فیصلہ کیا ہے "مد ۱۳۔ دیگر ٹیکس اور ڈیوٹی" کے تحت روپیہ جمع کرنے کے لیے چالانوں پر الیکٹریکل انسپکٹر کے دفتر کے افسر کے دستخط ہونا ضروری نہیں ہیں بشرطیکہ اکاؤنٹ کی مد چالانوں پر چھپی ہوئی ہو لیے

چھپے ہوئے چالان الیکٹریکل انسپکٹر کے دفتر واقع لکھنؤ ۔۔۔ بجلی سپلائی کے تمام کارخانوں ۔ یو۔پی ریاستی بجلی بورڈ کے تمام سب ڈویژنل افسروں کے دفتروں اور ریاست کے تمام خزانوں سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

مذکورہ فارم بجلی ڈیوٹی کے علاوہ معائنہ فیس۔ لائسنسوں اور ٹرمینوں کے سرٹیفکٹوں کی فیس وغیرہ کو جمع کرنے کے لیے بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

اتر پردیش میں مالی سال رواں کے دوران میں مزید ۱۵ شہروں میں واٹر ورکس کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ یہ واٹر ورکس ریاستی محکمۂ لوکل سلف گورنمنٹ کے شعبۂ انجینیرنگ کے ذریعہ ۱۶ء۶ ۱ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کیے جائیں گے

ان پندرہ شہروں کے نام یہ ہیں ۔۔۔ مارہ سکی گونڈہ، رائے بریلی، سلطانپور، مہوبہ، ہیڑی، بیتار، شکوہ آباد، بروت، لکھیم پور کھیری، کالپی، امروہہ، نینی تال، بچھرایاں اور مظفر نگر۔

برطانوی دور حکومت میں اتر پردیش میں صرف ۲۷ واٹر ورکس تھے اور حصول آزادی کے بعد سات برس کے اندر ۲ واٹر ورکس تعمیر کیے گئے۔ ریاست میں پہلا واٹر ورکس ۱۸۹۰ء میں آگرے میں تعمیر ہوا اور اس کے بعد الہ آباد، نینی تال، کانپور، وارانسی، لکھنؤ اور مسوری میں واٹر ورکس تعمیر کیے گئے۔

پہلے منصوبے کے تحت محکمۂ لوکل سلف گورنمنٹ کے شعبۂ انجینیرنگ کے ذریعہ ۳۰ واٹر ورکس تعمیر کیے گئے جس سے ۱۹۵۵ء کے آخر میں ان کی مجموعی تعداد ۷۷ ہو گئی۔

دوسرے منصوبے کے تحت ۲۹ء۱۵۰ لاکھ روپے کی لاگت سے ۲۵ نئے واٹر ورکس تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔ ان میں سے ۱۵ واٹر ورکس کے آئندہ مارچ کے آخر تک مکمل ہو جانے کی امید ہے۔ بقیہ ۱۰ واٹر ورکس کی تعمیر جلد ہی شروع ہو جائے گی۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ واٹر ورکس بھی آئندہ مالی سال کے آخر تک تعمیر ہو جائیں گے۔

حکومت اتر پردیش نے تیسرے پنج سالہ منصوبے کی آب پاشی سے متعلق جن ۸۵ اسکیموں کو ان کی مفصل جانچ کرنے کے لیے منظور کیا تھا ان میں سے ۱۷ اسکیموں کے ابتدائی خاکے ضابطے کے طور پر منظوری کے لیے ریاستی حکومت

کو پیش کیے جا چکے ہیں۔

ان میں درج ذیل سکیمیں شامل ہیں

(۱) سہارن پور اور مظفر نگر میں رائس چینل سکیم۔ (۲) چندرا ول بند۔ (۳) جنوبی بیہ گھل ذخیرۂ آب۔ (۴) سوت ندی بند۔ (۵) بادر ذخیرہ آب۔ (۶) مالن ذخیرہ آب۔ (۷) کلو والا امد (۸) بجیسم پور تالاب (۹) ملہٹ بند۔ (۱۰) بھیکروالا بند (۱۱) دہرہ دون میں ۴۰ میل لمبی نالیوں کے کنارے اینٹوں کا لگانا (۱۲) گڑھوال میں ۲ میل لمبی نالیوں کے کنارے اینٹیں لگانا۔ (۱۳) دہرہ دون میں ۲۰ میل لمبی نالیوں کے کنارے اینٹیں لگانا (۱۴) ٹیوب ویل گلوں کے کنارے اینٹیں لگانا (۱۵) کسلاری تالاب اور (۱۶) کنڈا تالاب۔

اس کے علاوہ دوسری چار سکیموں کے ابتدائی سروے اور خاکے بھی تیار ہو چکے ہیں۔ ریاستی حکومت کی جانب سے اُن کی جانچ کی جا رہی ہے۔ یہ اسکیمیں ہیں — سروہر گومتی ذخیرہ آب۔ ہنونی تالاب اور سلارا کی نالی۔

مزید براں آٹھ دوسری اسکیموں پر بھی سروے کا کام جاری ہے۔

ضلع گونڈہ میں راپتی ندی پر ۲۱ء ۹ لاکھ روپے کی لاگت سے پختہ پل کی تعمیر کا نصف کام مکمل ہو چکا ہے۔

یہ پل ریاستی محکمۂ تعمیرات عامہ کے ذریعہ ریاست کے پس ماندہ علاقوں کی ترقی سے متعلق سکیم کے تحت تعمیر کیا جا رہا ہے۔ یہ پل ۵۹۵ فیٹ لمبا ہوگا۔ جس کے اوپر ۲۲ فیٹ چوڑی سڑک ہوگی۔ آئندہ سال کے آخر تک یہ پل بن کر تیار ہو جائے گا۔

اس پل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کل تخمینی لاگت میں سے چار لاکھ روپیہ مقامی عوام، گنا کے ابواب اور انفرادی عطایات کی شکل میں دے رہے ہیں۔ اس ضمن میں کافی رقم دی جا چکی ہے۔

اس پل کے ذریعہ ضلع گونڈہ کے جنوبی ترائی علاقے کے وسائل کو کام میں لایا جا سکے گا۔ اس علاقے میں وافر زراعتی پیداوار کے علاوہ اہم عمارتی سامان جیسے سال کی لکڑی اور پتھروں کی بہتات ہے۔ کسی پل کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ برسات کے زمانے میں ضلع کے دوسرے علاقوں سے کٹ جاتا تھا۔

اُمید کی جاتی ہے کہ اس پل کی وجہ سے اس علاقے کے باشندے اپنے علاقے کے وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں گے۔

اتر پردیش کے مشرقی اور مرکزی منطقوں کے گرڈ میں واقع تقریباً ۲ لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت کے رہاند باندھ بجلی گھر میں آئندہ فروری سے آزمائش کے طور پر ایک جنریٹر سے بجلی پیدا کرنے کا کام شروع ہو جائے گا اور پورا منصوبہ جون ۱۹۶۱ء تک پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔

رہاند کے گرڈ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ دوسرے منصوبہ کے آخر میں ریاست میں بجلی کی مجموعی پیداوار صرف ۲۹۶۰۰۰ کلوواٹ ہوگی جبکہ محض اس گرڈ کے ذریعہ ۵۷۵۱۳۶ کلوواٹ بجلی سپلائی ہوگی

علاوہ ازیں یہ گرڈ ریاست کے مشرقی اور مرکزی علاقوں کو مغربی اضلاع کے علاوہ اس مقام سے ملا دے گا جہاں جمنا ہائیڈل پروجیکٹ زیر عمل ہے۔

رہاند گرڈ میں اس وقت بھاپ یا تیل سے چلنے والے ۱۲ اسٹیشن ہیں جن کی امکانی پیداواری صلاحیت ۶۰۷۳۶ اور فی الواقع صلاحیت ۳۸۱۳۶ کلوواٹ ہے۔ آئندہ سال کے وسط سے رہاند کی وجہ سے اس میں مزید اضافہ ہوگا جس کی امکانی پیداواری صلاحیت ۲۵ اور فی الواقع صلاحیت ۵ کلوواٹ ہے

علاوہ ازیں مجوزہ اوبرا ہائیڈل بجلی گھر اور مدھیہ پردیش کے ضلع سگرولی میں کوٹا کی کوئلہ کی کانوں کے قریب تعمیر ہونے والے تھرمل بجلی گھر کے ذریعہ گرڈ کی فی الواقع پیداواری صلاحیت میں چوگنا سے زیادہ اضافہ ہوگا۔ ساڑھے گیارہ کروڑ روپیہ کی لاگت سے تعمیر ہونے والے اوبرا بجلی گھر کی امکانی پیداواری صلاحیت ۴۸ ہزار اور فی الواقع صلاحیت ۳۲ ہزار کلوواٹ اور ۴۶ کروڑ روپیہ کی لاگت سے تعمیر ہونے والے تھرمل بجلی گھر کی امکانی پیداواری صلاحیت ساڑھے چار لاکھ کلوواٹ اور فی الواقع صلاحیت ۴ لاکھ کلوواٹ ہوگی۔ یہ دونوں بجلی گھر ریاست کے تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے مسودہ میں شامل کر لئے گئے ہیں اور اُمید کی جاتی ہے کہ اس سلسلہ میں قطعی منظوری حاصل ہو جائے گی۔ روسی ماہرین عنقریب تھرمل اسٹیشن کے جائے وقوع کا معائنہ کریں گے کیونکہ بجلی گھر روسی امداد سے تعمیر کیا جائے گا۔

رہاند گرڈ کو مرکزی اور مغربی اتر پردیش سے ملانے کے لئے تقریباً

نیا دور

جلد ۱۵ نمبر ۱۰

پوش ۱۸۸۲

جنوری سنہ ۱۹۶۱ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
اپراجتا پرساد سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

عنوانات

اپنی بات

اُتر پردیش کے نئے وزیر اعلیٰ شری چندر بھان گپتا اور ان کی حکومت کے اراکین نے ۷ر دسمبر ۱۹۶۰ء کو گورنمنٹ ہاؤس لکھنؤ میں حلف وفاداری اٹھایا۔ شریمتی سُچیتا کرپلانی نے وزیر صحت کی حیثیت سے ۱۱ر دسمبر کو حلف وفاداری اُٹھایا۔ وزیر اعلیٰ اور اُن کی حکومت کے دوسرے اراکین کے مختصر سوانح حیات نیا دور کی اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ شائع کیے جا رہے ہیں۔ نئے وزیر اعلیٰ شری گپتا نے اپنی ایک تقریر میں، جو انھوں نے ۸ر دسمبر کو سکریٹریٹ کے عملے کے سامنے کی تھی، نئی حکومت کی پالیسی کے دو اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اور وہ یہ ہیں۔ کفایت شعاری اور سکریٹریٹ کے فائلوں میں غیر جانب داری اور دیانت داری سے اپنے خیالات کا اظہار۔ وزیر اعلیٰ نے کفایت شعاری کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ عوام کا ایک ایک پیسہ بھی پوری دیانت داری اور ایمان داری کے ساتھ خرچ کرنا چاہیے۔ سکریٹریٹ کے ہر افسر اور ماتحت کو انھوں نے مشورہ دیا کہ اُن کے سامنے جو بھی نئی اسکیم آئے اس پر اس نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے کہ یہ اسکیم کہاں تک فائدہ مند یا کارآمد ثابت ہوگی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میری رائے میں عمارتیں تعمیر کرنے کے مقابلے میں بجلی، زراعت اور صحت کے منصوبوں کے لیے روپیہ پس انداز کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ کفایت شعاری کے سلسلے میں اراکین حکومت کے فوری اقدامات کا ذکر کرتے ہوئے گپتا جی نے کہا کہ اُن کے ساتھیوں نے اپنی تنخواہوں میں تخفیف کرنے کے علاوہ دورے، موٹر اور ٹیلیفون کے اخراجات میں کمی کر کے کفایت شعاری کی جانب پہلا قدم اُٹھایا ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے گپتا جی نے بتایا کہ اب اُتر پردیش کے ہر وزیر اور وزیر ریاست کو ۱۲۰۰ سو روپے کی جگہ ایک ہزار روپیہ تنخواہ ملے گی اور اس تنخواہ پر انھیں انکم ٹیکس بھی دینا ہوگا۔ اس طرح انھیں تقریباً ۹۲۲ روپے ماہانہ ملیں گے۔ اور نائب وزرا کو ۹۰۰ روپے کی جگہ ۶۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ ملے گی۔ پارلیمنٹری سکریٹریوں کو تنخواہ نہیں دی جائے گی۔ وزیر اعلیٰ نے یہ بھی بتایا کہ وزیروں کا پٹرول الاؤنس ۵۰ گیلن سے گھٹا کر ۴۰ گیلن کر دیا گیا ہے۔ نیز وزرا اُن چھوٹے مکانات میں رہیں گے جو نائب وزیروں اور پارلیمنٹری سکریٹریوں کے لیے تعمیر کیے گئے ہیں۔ وزیروں کی رہائش کے لیے جو مکانات تعمیر کیے گئے تھے اُن میں اب سرکاری دفاتر قائم کیے جائیں گے۔ وزیر اعلیٰ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سکریٹریٹ کے کچھ روایات ہیں جنھیں زندہ رکھنا چاہیے۔ انھوں نے سکریٹریٹ کے عملے کو ہدایت کی کہ وہ بغیر کسی خوف کے اور پوری غیر جانب داری کے ساتھ فائلوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کریں کیونکہ کسی امر پر صحیح فیصلہ اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ (گورنر اُتر پردیش نے وزیروں، نائب وزیروں اور پارلیمنٹری سکریٹریوں کی تنخواہوں اور بھتّوں سے متعلق قوانین اور اُس سے متعلق امور میں ترمیم کرنے کے لیے حال میں ایک آرڈیننس جاری کر دیا ہے جو ۷ر دسمبر ۱۹۶۰ء سے نافذ سمجھا جائے گا۔)

ہندستان کے دوسرے حصوں کی طرح اُتر پردیش میں ۱۰ر دسمبر کو خاندانی منصوبہ بندی (فیملی پلاننگ) کا دن منایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ عوام کی توجہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کی طرف مبذول کرائی جائے۔ صورت حال یہ ہے کہ علاج و معالجہ کی سہولتوں کی وجہ سے اموات کی شرح میں کمی ہو گئی ہے۔ دوسری طرف آبادی میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے اضافے کی شرح ۱ء۵ فی صد تھی۔ اندازہ ہے کہ اب یہ اضافہ ۱ء۸ فی صد سے لے کر ۲ فی صد تک ہو رہا ہے۔ اس اندازے کے مطابق ۱۹۶۱ء میں اُتر پردیش کی آبادی ۷۳۶..... ہو جائے گی اور ۱۹۶۶ء میں ۸۲۳.....۔ ظاہر ہے کہ آبادی میں جب اس قدر اضافہ ہو رہا ہے تو انفرادی ترقی اور خوش حالی اور عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے جو منصوبے بنائے جا رہے ہیں اُن میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکے گی۔ اس لیے خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کمیشن رپورٹ کے مطابق اگر ایک خاندان میں بچوں کی تعداد تین سے زیادہ نہ ہونے پائے تو ملک میں آبادی کے اضافے کی مؤثر طور سے روک تھام ہو سکتی ہے۔ اس طرح پیدائش کی شرح فی ہزار ۴۰ سے کم ہو کر ۲۲ رہ جائے گی۔ ان حالات کے ماتحت عوام کا فرض ہے کہ وہ اُن تمام سہولتوں سے فائدہ اُٹھائیں جو حکومت نے فیملی پلاننگ کے مرکزوں کے ذریعہ مہیا کی ہیں۔ سماجی کارکن اس سلسلے میں شہر اور دیہات میں کام کر رہے ہیں لیکن ضرورت اس کی ہے کہ عوام خود بھی وقت کے تقاضوں کو سمجھیں اور آبادی کے اضافے کی روک تھام میں خود بھی حصہ لیں اور حکومت کے ساتھ بھی پوری طرح تعاون کریں۔

نیا دور (دسمبر ۱۹۶۰ء) میں سید تمکین کاظمی کا ایک مضمون بعنوان "فراست" شائع ہوا ہے۔ بعض حضرات نے مضمون کے اس حصے کی جانب جس میں امام موسیٰ کاظم کے حصول علم قیافہ اور تصانیف وغیرہ کا ذکر ہے، ایڈیٹر نیا دور کی توجہ مبذول کراتے ہوئے بتایا ہے کہ اس کا کوئی مستند تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ مضمون کے اس حصے کے شائع ہو جانے پر ہمیں افسوس ہے۔

ایڈیٹر

مشترکہ تہذیب اور اُردو زبان و ادب

فراقؔ گورکھپوری

اردو زبان ادب کے سلسلے میں ایک طبقہ اس خیال پر زور دیتا ہے کہ اُردو رسم الخط، اردو لغات کا عربی فارسی حصہ اور اُردو میں کام آنے والے کئی ہندی الفاظ کا تلفظ بالکل بدیسی چیزیں ہیں۔ پھر اُردو نثر و نظم کے تلمیحات و علائم بھی بالکل بدیسی چیزیں ہیں۔ اُردو ادب کا ذہنی، جذباتی اور وجدانی فضا و ردِّ عمل، اُردو ادب کا طرزِ احساس و طرزِ بیان، اُردو کی ترکیبیں، اُردو ادب کا مزاج اور نظریہ، یہ سب بھی سب کی سب سراسر غیر ملکی ہیں۔ اُردو نظم کی زیادہ سے زیادہ بحریں اور ان کے اوزان بھی غیر ملکی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہندی کے (سنسکرت کے نہیں) تمام الفاظ اور محاورے اردو زبان و ادب کے جزِ لاینفک بن چکے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اُردو بولنے والوں اور اُردو ادیبوں نے صدہا ایسے ہندی الفاظ تراشے ہیں جنھیں آج کا ہندی ادب سراسر اپنا چکا ہے۔ پھر بھی بھارتیت اُردو ادب میں قریب قریب معقود ہے۔ ہندوستان کی جتنی دوسری زبانیں ہیں اُن سب میں درجنوں یا سیکڑوں نہیں بلکہ ہزارہا سنسکرت الفاظ جزوِ زبان ہیں۔ صرف اُردو ایک ایسی زبان ہے جس میں شدہ سنسکرت الفاظ جنھیں تتسم کہتے ہیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

برعکس اس کے دوسرا طبقہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُردو زبان، اُردو لغات اور اردو ادب ایک مشترکہ تہذیب کی پیداوار ہے۔ ہندی کے علم برداروں کا یہ کہنا کہ ہندی میں کئی سو مسلمان شاعرات اور شاعر گزرے ہیں مثلاً کبیر، رحیم، ملک محمد جائسی، رس کھان، رسلین، عالم وغیرہ وغیرہ تو پھر کیوں نہ ہندی کو بھی حقیقی معنوں میں مشترکہ تہذیب کی پیداوار سمجھا جائے؟

اصل بات کیا ہے؟ جہاں تک ہندی ادب کا تعلق ہے ہندی کے مسلمان شعرا نے جو ادب ہمیں دیا ہے اس میں اگرچہ اسلامی تہذیب کے کچھ عناصر گھُلے ملے ہوئے ہیں لیکن بہ حیثیتِ مجموعی اُس پر فکری، صوتیاتی، جذباتی لحاظ سے ہندوئیت کی نمایاں چھاپ ہے، اور اُس کے خد و خال ہندو خد و خال ہیں۔ یہ ہندی ادب بالکل اُسی قسم کی چیز ہے اور انھیں اقدار کی حامل ہے جو ہمیں بنگالی زبان و ادب، مراٹھی و گجراتی زبان و ادب اور جنوبی ہند کی ہر زبان و ادب میں ملتے ہیں۔ غرض کہ کئی لحاظ سے ہندی ادب ایک مشترکہ تہذیب کی وراثت ہوتے ہوئے بھی غالب اور نمایاں طور سے ہندو ادب ہے۔ اس کی رہ نمائی ہندو سماجی زندگی نے کی ہے اور اس کے محرکات ہندو زندگی کے محرکات رہے ہیں۔

جہاں تک اُردو کا تعلق ہے یہ ہمیں پہلے ہی مان لینا چاہیے کہ بہ حیثیتِ مجموعی اُس پر ہندوستان کے مسلمانوں کا گہرا ثقافتی اثر رہا ہے۔ اسی کے ساتھ دو، چار، دس چیزیں نہیں، بلکہ صدہا باتیں اور چیزیں جو خالص ہندو تہذیب سے متعلق ہیں اُردو میں جگہ پا چکی ہیں۔ اس حد تک طرف دارانِ اُردو کا یہ دعویٰ قابلِ تسلیم ہے کہ اُردو ادب میں اسلامی روایات و موضوعات اور ہندو روایات و موضوعات دونوں قدرے مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں البتہ بہ حیثیتِ مجموعی اُردو پر مسلم ثقافت اور مسلم طرزِ احساس غالب ہے۔

آئیے! ذرا اور ڈوب کے اس مسئلے پر ہم آپ غور کریں کہ کیا اردو ادب اُن معنوں میں ایک مشترکہ تہذیب کی پیداوار ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اُردو سے یکساں اور برابر کی آسودگی محسوس کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی بڑی تعداد میں مسلمان ادیب شریک رہے ہیں۔ لیکن کیا ان

کی شرکت اور ان کے تعاون نے ان دوسری زبانوں کے ادب کو اُردو کا جیز بنا دی ہے؟ کیا قاضی نذرالاسلام اور جسیم الدین نے جو بنگالی ادب ہمیں دیا ہے وہ اُردو نما ادب ہے؟ یوں بھی سوچیے کہ غالب، آتش، مومن، میر حسن، نظیر اکبر آبادی، چکبست، داغ، امیر، حالی، اقبال، انیس، دبیر اور دیگر بچاسوں اُردو کے ہندو و مسلم شعرا نے جو ادب ہمیں دیا ہے وہ فارسی شعرا و اُدبا کی تخلیقوں سے زیادہ مماثلت اور مشابہت رکھتا ہے؟ کیا اُردو ادب کی فضا، اس کا مزاج، اس کی روح رواں وہی ہے جو ہندوستان کی دوسری زبانوں اور اُن کے ادب کی فضا، روح رواں اور مزاج ہے؟

اِس سے انکار نہیں کہ جب اُردو ادب پیدا ہوا اُس وقت کا ہندو اور آج کا ہندو بھی اپنے ہزار ہا سال پہلے کے ہندو سے بہت بدل چکا ہے لیکن قدیم ترین ادوار کی ہندو زندگی اور آج کی ہندو زندگی اور مستقبل بعید کی ہندو زندگی میں صوری اور معنوی لحاظ سے، خارجی اور داخلی لحاظ سے ایک ایسا تسلسل بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مشترکہ تہذیب کو یاد رکھتے ہوئے ایک مسلسل تہذیب اور اس کے تاریخی محرکات کو ہم کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ کیا اس مسلسل تہذیب کے زندہ نمونے راجہ رام موہن رائے، مادھو سُدھن دت، بنکم چندر چٹرجی، بال گنگا دھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے، مہادیو گوبند راناڈے، سوامی رام تیرتھ، ویویکانند، اروند گھوش اور دیگر صدہا سربرآوردہ ہندو، ان کی شخصیت اور اُن کے کارنامے ہیں یا نہیں ہیں؟ سیاسی اور عقائدی امور سے قطع نظر بلکہ زبان اور لغات سے بھی قطع نظر جو بھی قابلِ احترام ہندو گزشتہ سو سوا سو برس کے اندر اس ملک میں رونما ہوئے ہیں وہ ہرگز متعصب، تنگ نظر، کٹر اور مغائرت زدہ افراد نہیں تھے۔ لیکن اُن کی پوری ساخت اور شخصیت، اُن کی سرشت، اُن کے دل و دماغ، ان کا مزاج، اُن کا ردِ عمل، اُن کے تاثرات کیا وہی تھے جو اس سو سوا سو برس کے اندر اُن مسلمان حضرات کے تھے جنھیں سربرآوردہ کہا جا سکتا ہے؟ کیا ان کی شخصیتیں مثلاً سر سید احمد، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، مولانا محمد علی، وقار الملک، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، قائدِ اعظم محمد علی جناح، ڈاکٹر اقبال اور دیگر سربرآوردہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طبع ثانی تھی؟ کیا ان ہندوؤں کی داخلی اور خارجی زندگی، شخصیت اُن ہی معنوں میں ایک مشترکہ تہذیب کی پیداوار تھی، جن معنوں میں ہم اُردو ادب کو ایک مشترکہ تہذیب کی پیداوار بتاتے ہیں؟ یہ ہندو ہستیاں یورپ کی تہذیب کو جذب کر کے ہندو تہذیب کی نشاۃ ثانیہ کے واجب طور پر علم بردار بن گئے۔ یہ لوگ اردو ادب والی مشترکہ تہذیب کے پیداوار نہیں تھے۔ اور اگر اردو ادب کو پچھلے سو سوا سو برس کی ہندوستانی زندگی کا نمائندہ و ترجمان ہونا ہے تو ہمیں ایک فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنا پڑے گا! وہ یہ کہ آئندہ کا اُردو ادب، میر کے وقت سے آج تک کے اُردو ادیبوں اور مسلمانوں کے مزاج کی ترجمانی کرے جن کے نام ابھی ابھی گنوائے گئے ہیں اور اُسی مشترکہ تہذیب کا حامل ہو جس کی اب تک کا اُردو ادب، اردو ادیب اور بڑے بڑے مسلمان نمائندگی کرتے رہے ہیں۔

آج ہندوستان کی داخلی تعمیر میں نشاۃ ثانیہ کی جو قوتیں، ترغیبیں اور تحریکیں کارفرما ہیں اُن کی نمائندگی جائز طور پر وہ ہندو جن کے نام ابھی ابھی گنوائے گئے ہیں اُن کے مقلدین کریں گے یا کر رہے ہیں، یا وہ مسلمان یا اُن کے مقلدین جن کا ذکر ابھی ابھی آ چکا ہے؟ ان دو گروہوں میں اردو ادب کی قیادت کون گروہ کرے گا؟ جب ہم اپنی زبان میں بنگالی ادب، قدیم ہندی ادب، گجراتی ادب، مراٹھی ادب، پنجابی ادب، اُڑیہ ادب، آسامی ادب، تامل اور تلگو ادب، ملایالم ادب، کنٹر ادب اور دیس بھر کی مختلف زبانوں کا عوامی ادب اور ان کے گیتوں کا ترجمہ پڑھتے ہیں تو اُس اثر سے بالکل مختلف اثر اور مختلف فضا اور مختلف کائنات شعور کا احساس ہوتا ہے جسے اُردو شعر و ادب نے پیش کیا ہے اور جن کے مقابلے میں اُردو شعر و ادب ایک ایسی چیز معلوم ہوتی ہے جس کی جڑیں ہندوستان کی زمین میں اتھاہ گہرائیوں تک نہیں پھوٹ سکیں۔ کیا مشترکہ تہذیب کی پیداوار اردو ادب چند لحاظ سے محض ایک سطحی اشتراک اور میل جول کے علاوہ کچھ بھی ہے؟ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے شعر و ادب میں جو جمالیاتی اور وجدانی کیفیت ہے اگر اس کیفیت کا حامل اردو شعر و ادب نہیں ہے یا بہت کم ہے، اگر اُس کیفیت اور اُردو شعر و ادب کی مجموعی کیفیت میں باہمی مغائرت ہے تو کیا ہمیں بادلِ ناخواستہ دبی زبان سے یہ کہنا نہیں پڑے گا کہ مشترکہ تہذیب کی پیداوار اگر اردو ادب ہے تو یہ مشترکہ تہذیب مشترکہ زیادہ ہے اور تہذیب کم ہے یعنی کم از کم اور سطحی معنوں میں ہی اس مشترکہ تہذیب کو ہم مشترکہ تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ سر سید اور حالی نے اُردو شعر و ادب کے بیشتر حصے کو ایسی چیز بتایا ہے جس سے سڑاند کی بو آتی ہے اور اس ادب کے بیشتر تخلیق کنندوں کے بارے میں حالی نے یہاں تک لکھ دیا کہ "جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے"۔ خیر یہ

تو مبالغہ اور زیادتی تھی۔ ہم آپ چاہیں تو اسے جھوٹ کہہ لیں۔ سوچنا اور سمجھنا یہ ہے کہ اس جھوٹ میں کتنی سچائی تھی۔ جمال الدین افغانی نے بلبلِ ہند مرزا داغ کے منہ سے اُن کا کلام کلکتے میں سُنا تھا۔ داغ کے چلے جانے کے بعد جمال الدین افغانی نے کہا "خرسے را داغ کردند"۔ یہ جملہ اپنے اندر خود کتنی گہرائیاں رکھتا تھا؟

ابھی تک اس مضمون میں ہندی اور اُردو کے ساتھ ہندوستان کی دوسری عوامی زبانوں اور اُن کے ادب کا ذکر کیا گیا تھا۔ سنسکرت زبان و ادب، سنسکرت ثقافت، سنسکرت تہذیب کا ذکر اب تک نہیں آیا تھا۔ اُس چھوٹے دل و دماغ پر اس امر کا فیصلہ نہیں چھوڑا جا سکتا جو یہ زُعم خود یہ سوچ کر خوش ہو لیا کرتا ہے کہ سنسکرت ہندوستان میں مر چکی ہے۔ ایسے دل و دماغ والوں سے گزارش ہے کہ سنسکرت جی رہی ہو یا مر چکی ہو لیکن آج صدیوں کا دھندلکا مٹ چکنے کے بعد ہندوستان اُس منزل پر آ چکا ہے جہاں از سرِ نو اُسے یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہندوستان کی ثقافت اس کی داخلی اور وجدانی زندگی، اس کے تہذیب و ادب کا سرچشمہ رگ وید اور اُپنشد ہیں۔ ہماری تہذیب اور ہماری زندگی کے منبع اور مخرج وید، اُپنشد، پُران، مہابھارت رامائن اور سنسکرت ادب کے دوسرے کارنامے ہیں۔ اس منبع و مخرج سے ایک موجِ تہ نشیں کے طور پر ہماری زندگی و ادب اُن ادوار میں بھی جاری رہے ہیں جب یہاں مسلمانوں کا بول بالا تھا۔

جب یہاں چار کھونٹ انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی تو ہندو سماج کے بیدار مغز اور حساس مفکرین نے سر درگریباں ہو کر ایک نیا خوابِ زندگی دیکھنا شروع کیا۔ اس کا نہایت اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ تعمیرِ ہند میں سنسکرت کی اہمیت اور ایک نئی زندگی کے امکانات کا احساس پیدا ہوا۔ ہندوستان میں ایک نئی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ سنسکرت سے نئی زندگی حاصل کر کے انگریزی زبان میں اور ملک کی دوسری زبانوں میں نثر و نظم کی ایسی کتابوں کی تخلیق ہوئی جنھوں نے ہمیں از سرِ نو ہندوستان کا بھی شہری بنایا اور نئے زمانے کے محرکات و مطالبات سے ہمیں ہم آہنگ کیا۔ نئی قومی تحریک نے سنسکرت کے احیا میں جان ڈال دی۔ ہزارہا دل و دماغ ایک نئے شعورِ ہند سے منور ہونے لگے۔

اُردو زبان و ادب میں سیکڑوں محاسن تھے، سیکڑوں قدرِ اوّل کی چیزیں، بہت سے حیات آور عناصر تھے۔ اس زبان و ادب میں وہ موہنی تھی جو دلوں کو تسخیر کر لیتی تھی۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس زمانے میں اسی نشاۃ ثانیہ میں اُردو پر کچھ سنسکرت کا اثر پڑا یا نہیں۔ اُردو خواں اور اُردو داں عوام اور عام اُردو ادب پر تو ابھی سنسکرت اور اُس کے پیغام کا اثر پڑتا ہوا ہم نہیں دیکھتے لیکن اُردو کے کچھ انے گنے لکھنے پڑھنے والوں پر سنسکرت کا اثر پڑنا شروع ہو گیا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ سنسکرت کے جید عالم مہا پنڈت بلگرامی نے تمدنِ ہند کے نام سے ایک اہم اور ضخیم ایسی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ اُردو میں کیا جس میں قدیم ہندوستان اور اُس کے تہذیبی خزانوں سے دُنیا کو آگاہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تمدنِ ہند کے نام سے دوسری فرانسیسی کتاب کا بھی اُردو ترجمہ کیا۔ مرزا محمد عزیز نے براہ راست سنسکرت سے دکرم اُروشی کا اردو ترجمہ کیا کالی داس کی دوسری کتاب میگھ دوت کا منظوم اُردو ترجمہ ملک اثر کے نام سے اسی زمانے میں ہوا۔ بعد کو رت سنگھار کا بھی منظوم اردو ترجمہ ہوا ہے۔ بعد کو بلکہ ہمارے زمانے میں سنسکرت کے مسلمان عالم احتر رائے پوری نے کالی داس کے شہرۂ آفاق ناٹک شکنتلا کا اُردو ترجمہ کیا۔ ملک الشعرا دوارکا پرشاد افق نے ایک نصف صدی پہلے رامائن اور مہابھارت کا منظوم اردو ترجمہ کیا۔ اُردو نثر میں بھی پوری والمیک رامائن کا اُردو ترجمہ ہوا۔ بھرتری ہری ست کا بھی اردو نثر میں ایک خوبصورت ترجمہ شائع ہوا۔ گیتا کے بھی کئی ترجمے شائع ہو چکے ہیں لیکن وہ کسی قدر کم زور ہیں۔ حضرتِ افق کے فرزند منور لکھنوی نے کالی داس کی کمار سمبھو کا منظوم اُردو ترجمہ کیا لیکن اُنھیں زیادہ کامیابی نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنی فارسی اور اُردو نظم کے کئی حصّوں میں اس امر کا ثبوت دیا ہے کہ وہ سنسکرت ادب اور اس کی روایتوں سے خاصی حد تک متاثر ہیں۔ سنسکرت کی روایتیں اور اس کے محرکات صرف ادبی تخلیقوں تک محدود نہیں۔ فنِ تعمیر، فنِ مصوری، فنِ رقص و سرود یہاں تک کہ فنِ زندگی پر بھی سنسکرت کا نمایاں اثر ہے۔ سکندر علی وجد کی نظمیں اجنتا اور ایلورہ پر قدرِ اوّل کی تخلیق ہیں۔ اودے شنکر کے رقص پر بھی کچھ اچھی نظمیں کہی گئی ہیں۔ نرلا مندر پر بھی سیماب کی نظم اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے مناظر، یہاں کے دریا، پہاڑ، یہاں کے شہروں اور گاؤں، اور یہاں کے وحش و طیور، اور یہاں کے بلند تہذیبی کارناموں پر کثرت سے اُردو میں نظمیں کہی گئی ہیں۔

ان کا مزاج اپنی تخلیقوں میں نہیں انگ گیا ہے۔ البتہ کبھی کبھی یہ ملتی ہے، ایک نئی شعوری اور عملی آہنگ ملتی ہے، ایک نیا انداز احساس ملتا ہے، زندگی کی نئی داخلی قدریں ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں نظیر اکبر آبادی کی نظموں کا ذکر نہیں کیا گیا۔ نظیر اکبر آبادی نے صدہا ہندو اور مسلم اشعار اور پچاسوں نظمیں ہندو تہواروں، ہندو رسوم، ہندو عوامی عقائد اور ہندو عوامی زندگی پر لکھیں لیکن خارجی مشاہدے اور باجے گاجے، میلے ٹھیلے کی دھوم دھام سے نظیر آگے نہ جاسکے۔ حکمت نے بھی رامچندر جی کی جلاوطنی کے متعلق رامائن کا سین لکھا لیکن رامائن کی روح کو اس کا تخیل چھو نہ سکا، اور ان کی یہ نظم باوجود فصاحت، بلاغت و حسن بیان ایک بے جان، سطحی اور گمراہ کن "مشترکہ تہذیب" کی مظہر ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ سب باتیں سچ اور درست پھر بھی اردو غزل اور نظم کا عام آہنگ کسی قدر وطن دشمن رہا ہے بقول سام اردو شعر و ادب میں بڑی دلکشی رہی ہے، پھر بھی وہ کسی قدر غرابت کا احساس ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ ادب بہت حسین و جمیل چیز ہے، لیکن اس کے تہ یا دروں میں بھی ہندوستان کے مزاج کی گہرائیاں نہیں ملتیں خواہ کچھ آفاقی ادب کی آواز بازگشت اس میں کبھی کبھی اور کہیں کہیں سنائی دے جاتی ہو۔ اردو شاعری اپنی بہترین شکل میں بھی ہمیں سعدی، حافظ، نظیری اور دیگر فارسی شعرا کی کچھ یاد دلاتی ہے لیکن وید مقدس سے آج تک کی مسلسل سنسکرت ادب کی روایتوں کی یاد نہیں دلاتی۔ اردو شاعری میں کالی داس، والمیک، بھوبھوتی، جے دیو کی آوازیں گونجتی ہوئی کم ہی سنائی دیتی ہیں۔ اردو شاعری ایک بلبل بے آشیاں کی طرح اڑتی ہوئی اور گاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اردو اشعار عموماً اردو شعرا کے اس دل و دماغ کی آواز معلوم ہوتے ہیں جو ایک حسین خلا میں اڑنی تحلیق کر رہا ہے۔ اردو شاعری کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین کو انتہاہ گہرائیوں سے چھوتی ہوئی نہیں نکلتیں اسی سے یہ شاعری مکمل طور پر یہاں کی دھرتی سنگیت نہیں بن سکی میر، سودا، خواجہ میر درد، غالب، ذوق، مومن، آتش و ناسخ اور ان تمام شعرا کے ہم نوا، نظیر اکبر آبادی، انیس و دبیر، امیر، داغ، جلال، حالی اور بہت سے دوسرے اچھے سے اچھے اردو شاعر ویدوں کی معرفت اپنشدوں کے پیغام و مزاج، مہابھارت و رامائن کے مزاج، پیام، سنسکرت ادب کے نظریوں و کلیوں سے مانوس نہیں تھے۔ تاریخی حالات نے انھیں اس

مانوسیت کو حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اسی سے بہترین اردو شاعری میں بھی اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ یہ شاعری ہماری زندگی کے مرکزی محرکات سے کچھ کٹی کٹی یا کچھ کتراتی ہوئی چیز ہے۔ زبان و بیان میں اردو شاعری کا بہت بڑا اور مقتدر حصہ صحن رہ گزر سے اور سر دو خانہ ہمسایہ کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کی یہ نیم بے تعلقی اور نیم اجنبیت کسی قدر رہ رہ کے کھٹک جاتی ہے۔ انسانی اخوت کا نظریہ ملکی قومی اور نسلی امتیازات اور ان کی بوباس، رنگ روپ، خد و خال خصوصیات اور محاسن کو مٹا دینے کے لیے یا انھیں نظرانداز کر دینے کے لیے ہرگز استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستانیت یا عجمیت کو حجازیت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظری کوشش کا انجام یہی ہونا تھا کہ حجازیت کا بے باک بیڑا جیحوں، قلزم اور ساتوں سمندر پار کر کے بقول حالی گنگا کے دہانے میں آ کر ڈوب جائے۔ پریم چند کے بعد سے ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ سے متاثر ہو کر ہندوستان و پاکستان کے بیدار دماغ اردو نواز اور اردو پرست طبقے اس حقیقت سے آگاہ ہو چلے ہیں۔

اردو ادب میں جس کمی کے احساس کا میں نے ذکر کیا ہے اُسے پورا کرنے کی نئی اور بہترین کوشش پریم چند کا کارنامہ ہے۔ فارسی سے متاثر ہو کر بہت سی اردو غزلوں اور نظموں کو وہ لوگ بھی لکھ سکتے تھے جن کی زبان اردو ہو لیکن جن کا وطن ہندوستان نہ ہو جیسے کہ بہت سے فرانسیسی اور انگریز بھی اچھی خاصی اردو شاعری کر گئے ہیں۔ لیکن کسی کی زبان لاکھ اردو ہو پریم چند کے افسانے یا ناول اسی دل و دماغ کی پیداوار ہو سکتے ہیں جس میں ہندوستان کی زندگی رچ اٹھی ہو اور جس کی روح میں ہندوستان رس بس گیا ہو محض پلاٹ اور کرداروں میں نہیں بلکہ فضا آفرینی میں پریم چند نے اس دیس کی خوشبو سے ہمیں پہلے پہل روشناس کیا۔ شاعری میں کچھ اپنی ناچیز کوششوں کا ذکر بھی میں ماطریں کی اجازت سے کر دینا چاہتا ہوں۔ میں اپنی شاعرانہ زندگی میں مسلسل طویل مدتوں تک ایک بحرانی کیفیت سے دوچار ہوتا رہا ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ اردو غزل و نظم کو ایک نئے ایمان کی ضرورت ہے۔ مجھے فطرت کی اور مادے کی طہارت، پوری زندگی اور جذبات زندگی کی ترجمانی میں اس وجدانی کیفیت کے احساس کی کمی محسوس ہوتی رہی جو سنسکرت ادب و تہذیب کی جان ہیں اور جو اردو غزلوں میں ناپید نظر آتی تھی۔ میں نے ایک

داخلی کرب کے ساتھ محسوس کیا کہ اُردو شاعری ایک ایسی حسین شہناز ہے جس کے ماتھے پر سہاگ کی بندی نہیں جھلک رہی ہے ابھی یہ شاعری گھر کی لچھمی نہیں بن سکی ہے۔ حیات و کائنات پر ابھی اس شاعری کا ایمان گہرا نہیں ہو سکا ہے۔ اُردو شاعری میں ایک نئی جھنکار، نئی نرم گفتاری، نئے رس جس، خیر و برکت کے نئے عناصر، نئی سادگی و پرکاری، نئی ٹھنڈک اور رسیلی، نئے گھریلو پن، نئے سہانے پن، نئی شانتی، سکون و طمانیت کی ضرورت ہے۔ غزل میں، رباعیوں میں، نظموں میں میری کوشش یہی رہی ہے کہ سنسکرت ادب اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب میں ہندوستان کی روح کے ارتعاشات اور ہندوستان کے دل کی جو دھڑکنیں ملتی ہیں کسی طرح پیدا ہو جائیں۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ فصیح، شستہ اور رچی ہوئی اُردو زبان سے مجھے ایسا کام لینا تھا کہ سنسکرت، قدیم ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کی صوتیات و وجدانیات اُردو ادب میں محسوس ہونے لگیں۔ یہ کام ایک آدمی کا نہیں ہے۔ اس بات میں میری ناچیز کوششیں کہاں تک کامیاب ہوئی ہیں اس کا فیصلہ میرے ہم وطن کریں گے۔ یہاں ایک بہت لطیف اور نازک نکتہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یہ خیال کم و بیش عام رہا ہے کہ اُردو زبان، اُردو لغات، اُردو اسالیب بیان، صوتیاتی، معنوی اور وجدانی لحاظ سے وہ اثرات پیدا نہیں کر سکتے جو سنسکرت اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کا شعر و ادب پیدا کرتے ہیں۔ ہاں، ابھی حال سے پہلے تک اُردو کو اسی طرح استعمال کیا جاتا رہا ہے کہ اُردو سے یہ اثرات پیدا نہ ہو سکیں۔ لیکن خود میرے تجربوں اور کوششوں نے مجھ پر بارہا اس نکتے کا انکشاف کیا کہ اُردو اسلوب بیان میں وہ امکانات مضمر ہیں کہ اُردو اچھی سے اچھی اُردو لکھی جائے اور اس میں اس ہندوستانیت کی روح بھی اُتار لی جائے جو یہاں کی دوسری زبانوں کے شعر و ادب میں دھڑکتی اور جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس مسئلے پر اگر ہو سکا تو کسی دوسرے مضمون میں مثالوں و دلائل کے ساتھ روشنی ڈالوں گا۔ اسی ضمن و سلسلے میں اس سوال پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا کہ اُردو کی فصاحت کو ٹھیس پہنچائے بغیر وہ کون اور کتنے سنسکرت کے الفاظ ہیں جنھیں اُردو شعر و ادب میں کھپا کر ہم اُردو کو سنسکرت اور دوسرے ہندوستانی ادبیات کا ہم آہنگ بنا دیں۔ اُردو وہ زبان ہے جس میں بے شمار خلاقانہ امکانات و صلاحیتیں ہیں۔

اُردو ادب نے تنک ایک مشترکہ زندگی اور تہذیب کی پیداوار ہے لیکن اس زندگی اور اس تہذیب کی بے شمار تہیں اور بے شمار پہلو ایسے ہیں جنھیں اردو ادب میں اجاگر ہونا ہے۔ اپنے مسلمان ہم وطنوں بلکہ اہل پاکستان سے بھی میری گزارش ہے کہ سنسکرت ادب و تہذیب محض ہندوؤں کی پونجی نہیں ہے، اس پر مسلمانوں کا بھی اتنا ہی اور ویسا ہی حق ہے جتنا کسی بھی ہندو کا۔ سنسکرت ادب ہمیں کسی عقیدے یا مخصوص عقائد کو ماننے پر مجبور نہیں کرتا۔ وہ ہمیں صرف ایک طرز احساس دیتا ہے، شعور کی نئی دھڑکنیں اور نئی تھرکاریں دیتا ہے جنھیں حاصل کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی تہذیب مالا مال ہو جائے گی۔ سنسکرت ادب اور سنسکرت روایتوں سے محبت کر کے ہم اسلام کے تہذیبی خزانوں اور اس کی دین سے محروم ہو جائیں گے۔ قدیم یونانیوں کا مذہب اور ان کی تہذیب، عیسائی مذہب اور عیسائی زندگی و تہذیب سے کافی مختلف تھا، لیکن بر اعظم یورپ میں چودھویں صدی میں ہی کافر یونان کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور اس سے عیسائیوں کی تہذیب مالا مال ہو گئی۔ خود اسلامی ایران میں فردوسی کے ہاتھوں کافر ایران کی زبان، ایمان اور روایتوں کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور مسلمانوں کی تہذیب کو اس سے فائدہ پہنچا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ارسطو اور افلاطون کہاں کے مسلمان تھے لیکن اسلامی عرب کی نشاۃ ثانیہ میں کافر یونان کی ثقافت نے بڑا حصہ لیا۔ جدید مغربی علوم کو اپنا کر اگر مسلمانوں کی تہذیب فیض یاب ہو سکتی ہے اور قدیم یونانی، ایرانی، لاطینی ثقافت سے اگر مسلمانوں کو فائدہ پہنچا ہے تو سنسکرت ثقافت سے بھی مسلمانوں کی تہذیب کو چار چاند لگ جائیں گے۔ اسلام کفر کا دشمن ہی نہیں کفر کا دوست بھی ہے۔ کفر پر جان بھی چھڑکتا ہے۔ بقول اصغر گونڈوی کے

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید رسم نے جسے ایماں بنا دیا

جب ہم اُردو کو مشترکہ تہذیب کی پیداوار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں قدیم ہندوستان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ قدیم ہندوستان کی بنیادوں پر ہی اُردو ادب کی مستحکم تعمیر کی جا سکتی ہے ایسا ہونے پر ہی صرف سطحی اور خارجی لحاظ سے نہیں بلکہ گہرے اور داخلی لحاظ سے ہم اُردو ادب کو ایک مشترکہ تہذیب کا نمائندہ بنا سکیں گے۔

اب ان چند باتوں کا ذکر کر کے ہم آج رخصت چاہیں گے جو سنسکرت ادب

اور دیکھ سکتا ہے۔ پہلی چیز روح فطرت اور مناظر قدرت کا وہ شاندار احساس ہے، فطرت سے ہم آہنگی کی وہ دولت ہے جس سے سنسکرت ادب مالا مال ہے۔ گھریلو زندگی کی طہارت کی اہمیت کا احساس بھی ہمیں سنسکرت ادب کراتا ہے۔ ماں باپ، بہن، دوست، بھائی یہاں تک کہ دشمن سے بھی تعلقات کو نئی زندگی سنسکرت ادب سے ملتی ہے۔ حسن و عشق کی بھی وہ معرکہ آرا مصوری سنسکرت، قدیم ہندی اور ہندوستان کے دوسری زبانوں کے شعر و ادب میں ہوئی ہے جس کی مثالیں عالمی ادب میں ذرا سے نہیں ملیں گی۔ بچوں اور عورتوں کی انتہائی دلکش مصوری سنسکرت ادب میں کی گئی ہے رشیوں کے آشرم کی حیات بخش فضا، جنگلوں اور پہاڑوں کا سکون اور ان کی ٹھنڈی ہوائیں، صدہا حرو یات زندگی اور مرگی کے صدہا پہلو سنسکرت ادب نے جیتے جاگتے روپ میں پیش کیے ہیں سنسکرت ادب نے زندگی پر امرت کی برکھا کی ہے سنسکرت ادب ہمارے شعور کو عظمت دیتا ہے اور ہمیں ملا لحاظ مذہب و ملت انسان دوستی کا سبق دیتا ہے سنسکرت سے متاثر ہو کر ہم دشمنی اور عداوت بھول جاتے ہیں۔ دشمن کا لفظ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم پوری کائنات کو سنسکرت کی ترنیوں سے متاثر ہو کر اپنے کلیجے میں رکھ لینا چاہتے ہیں سنسکرت ادب کا یہی امرت ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کو امرت مائی بنا دیتا ہے۔ پھر ہم اردو والے اپنے

آپ کو اس دولت بیدار سے کیوں محروم رکھیں کاش "کفر" کی یہ نشاۃ ثانیہ (Pagan Renaissance) بھرپور طور سے اردو ادب میں رونما ہو۔

ہندوستان محض ایک جغرافیائی نام یا اصطلاح نہیں ہے یہاں کی دھرتی اور آکاش، یہاں کی طرز زندگی اور خواب زندگی، یہاں کے دریا پہاڑ اور ہوائیں، یہاں کے موسموں کا جلوس، یہاں کی فضا کا لمس اور اس سے ہم آہنگی، لمحہ سے لمحہ اور پاکیزہ سے پاکیزہ شہود و حضوری، حال و قال استغراق و مراقبے سے ہرگز کم نہیں۔ یہاں کا جغرافیہ روحانیت خیز ہے، یہاں کے مناظر آیات الہامی اور یہاں کے مظاہر عجب سماں یہاں کی تتلیاں اور بوٹے بوٹے میں عالم غیب رونما ہے، یہاں کی ہنسی اور آنسو حیات سرمدی کو آئینہ دکھاتے ہیں مشترکہ تہذیب کوئی بندھی ٹکی چیز نہیں ہے، نہ ایک محدود، سطحی، ساکن، جامد چیز ہے یہ ایک متحرک اور ارتقا پذیر حقیقت، تصور ہے۔ اس مشترکہ تہذیب کے عوامل لامتناہی اور بہت دور رس ہیں

میں ان سطور سے اس یقین اور عقیدے کے ساتھ رخصت ہو رہا ہوں کہ ہندوستان و پاکستان کے زیادہ سے زیادہ جرائد و رسائل اگر اس مضمون کو نیا دور لکھنؤ کا حوالہ دے کر اپنے یہاں شائع کریں تو اس سے سب کا بھلا ہو گا اور بہت بڑا بھلا ہو گا۔[1]

---

[1] اس مضمون کو اوّل سے آخر تک غور سے پڑھنے اور اس کے مفہوم کو ہضم کرنے کے بعد اور میری باتوں سے اتفاق کرنے کے بعد یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ سنسکرت زبان و ادب سے براہ راست واقفیت کے بغیر اردو میں ایسے شعر و ادب کی تخلیق ناممکن ہے جس کی طرف بار بار اس مضمون میں اشارہ کیا گیا ہے سنسکرت سے براہ راست واقف کاری کی ضرورت نہیں، ہو تو اچھا، نہ ہو تو بھی اچھا جتنا ہندو تو معمولی بول چال میں، مخصوص رسوم میں، یہاں کی زندہ روایتوں میں یہاں کی کتھاؤں میں اور پاکیزہ تہذیبی و تاریخی روایتوں میں سنسکرت کی روح کو پا جاتا ہے۔ ایسے ہندوؤں سے داخلی ذہنی قربت بغیر سنسکرت سیکھے ہی سنسکرت کا مزاج پیدا کر دے گی۔ بغیر اس داخلی قربت کے اور جذباتی ہم آہنگی کے وہ مخصوص وجدان پیدا نہیں ہو گا جو مشترکہ تہذیب اور مشترکہ اردو ادب کی روح رواں ہے کم سے کم مجھے یہ وجدان جتنا حاصل ہوا اسی طرح حاصل ہوا۔ پریم چند کو بھی دوسرے زاویوں سے یہ وجدان بے لطف بیان کے حاصل ہوا اور ہندوستان و پاکستان کے بھی کچھ اور نثر و نظم نگاروں کو بھی اسی طرح حاصل ہوا سنسکرت کا مذاق جہاں جہاں ذوق رکھنے والوں کو حاصل ہوا تو چراغ سے چراغ جلتے چلے جائیں گے، اور اردو ادب میں ایک بنیادی داخلی انقلاب رونما ہوتا چلا جائے گا۔ (فراق گورکھپوری)

غزل

ماہی حاشی

پہلے ایجادِ جہاں کے راز کی حامل بنی
پھر محبت جوش میں آئی تو میرا دل بنی

رفتہ رفتہ وہ نظر جب رازدانِ دل بنی
سرحدیں ناز و جفا کی توڑ کر قاتل بنی

میری جو تدبیر ہے وہ اصل میں تقدیر ہے
وہ بھی قسمت ہے جو میری سعیِ لاحاصل بنی

رازِ غم جذبِ جنوں سے بھی نہ عریاں ہو سکا
پردۂ دل میں تمنّا لیلیِ محمل بنی

نامِ اُلفت دل کُشا معلوم ہوتا تھا مگر
دل میں جب آئی محبت، عقدۂ مشکل بنی

لا رہی تھی جانبِ ساحل تمنّائے سکوں
اُٹھ کے اک موجِ بلا گرداب میں ساحل بنی

سر جُھکا جاتا ہے، دل ہے اور تقاضائے سجود
اب جبیں اُس آستانِ ناز کے قابل بنی

بزم برہم ہو چکی ہے، لیکن اک شمعِ خموش
صبح ہوتے اعتبارِ رونقِ محفل بنی

تھی طلب صادق تو اے ماہی دیارِ شوق میں
چلتے چلتے میں جہاں ٹھہرا، وہیں منزل بنی

غزل

سفق حوسوری

کس کی نگہہِ مست نے مستانہ بنایا
زاہد کو گدائے درِ مے خانہ بنایا

اللہ کی رحمت ہے مرے پیرِ مغاں پر
کیا صاحبِ الطافِ کریمانہ بنایا

کچھ اور ہے صنعت گریِ ساقیِ رعنا
کتنوں نے خُم و ساغر و پیمانہ بنایا

مومن ہوں نہ کافر ہوں نقیبِ حرم و دیر
کمبخت محبت نے کہیں کا نہ بنایا

ساقی تجھے بھولے گا نہ ایثار ہمارا
ہم نے ترے میخانے کو میخانہ بنایا

تھا شیخ کو غرّہ کہ ہمیں ہم ہیں حرم میں
رندوں نے بھی اک حلقۂ یارانہ بنایا

محروم ہے بلبل تپشِ سوز دروں سے
اس چیز نے پروانے کو پروانہ بنایا

باقی نہ رہی خانقہِ شیخ کی رونق
جس دن سے قدح نوشوں نے خمخانہ بنایا

گلشن میں بہلتا ہے نہ ویرانے میں یا رب
کیا تو نے مزاجِ دلِ دیوانہ بنایا

ہر درد گوارا ہے کہ تو نے مرے مالک
اپنی طلبِ غم سے نہ بیگانہ بنایا

کچھ مصلحتِ عقل مجھے راس نہ آئی
کچھ تم نے سمجھ بوجھ کے دیوانہ بنایا

کام آئی سفقِ جگر افگار کی مٹی
اللہ نے خاکِ درِ جانانہ بنایا

بارگاہِ جمال میں

جلالؔ ملیح آبادی

نیلگوں جھیل میں ہنستے ہیں کنول کے دو پھول
تھے کبھی ہم بھی شبِ ماہ میں یوں ہی خنداں
غنچہ و گل تھے غزل خواں تو ستارے رقصاں
آرزوئیں تھیں حسیں، اور تمنائیں جواں
تھا یہ دل، بارگہِ حسن میں تیری مقبول

ساغرِ گل میں جھلکتی ہوئی شبنم کی شراب
وہ چمکتے ہوئے جگنو کہ چراغاں کا سماں
جیسے پھولوں کی حسیں چھاؤں میں تارے رقصاں
چاندنی رات میں کھلتے ہوئے سبزے پہ گلاب

وہ ستاروں سے برستی ہوئی افشاں جیسے
آبشاروں کے وہ نغمے وہ پپیہے کی صدا
وہ جنوں خیز فضا، وہ طرب انگیز ہوا
وہ دلھن رات کی پہنے ہوئے تاروں کی قبا
وہ ہوائیں چمنستاں میں غزل خواں جیسے

چاندنی سبزۂ شاداب پہ لہرائی ہوئی
کہکشاں چرخ پہ کھولے ہوئے زرّیں پرچم
چمپئی نور میں ڈوبا ہوا سارا عالم
لالہ زاروں کے وہ ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی

صندلیں رات کے ماتھے پہ دمکتا ہوا چاند
تیری پیشانیٔ گل رنگ پہ بندی کی چمک
مخملی فرش پہ سبزے کے، وہ شبنم کی دمک
تیری آواز میں، بلور کے ساغر کی کھنک
انجمن میں وہ ستاروں کی چمکتا ہوا چاند

رخِ گلنار پہ بکھری ہوئی زلفِ مشکیں
مسکراتی ہوئی عارض پہ ترے صبحِ بہار
نیم خوابیدہ سی آنکھوں میں جوانی کا خمار
لبِ رنگیں پہ محبت کا وہ حرفِ شیریں

نغمہ و زمزمہ و ساغر و مینا و بہار
میرے ہاتھوں میں گلابی، تیری باہوں میں ستار
لحن کے دائرۂ کیف میں دنیا سرشار
تیری آواز میں محبت کی وہ پیہم جھنکار
گرم بوسی سے نکھرتی وہ جبینِ گلبار

تیری آواز، کہ پھولوں بھری ڈالی کی کماں
تیر شعروں کے چلاتی سمنستانوں میں
نت نئی شمع جلاتی ہوئی ارمانوں میں
شعر کی لو پہ وہ پروانۂ دل رقص کناں

وہ مرے دوش پہ بکھرے ہوئے گیسو تیرے
خوف یہ، عشق کا انجام نہ جانے کیا ہو
پیشگی شرم، کہ الفت نہ کہیں رسوا ہو
اور وعدہ یہ وفا کا نہ کبھی ایفا ہو
میرے رخسار پہ ڈھلکے ہوئے آنسو تیرے

تم محبت کے وہ وعدے، وہ وفا بھول گئیں
نگہ لطف کی آشفتہ گری یاد کرو
تم کو ہم سے بھی محبت تھی کبھی یاد کرو
غیر کی ہو کے، مجھے چھوڑ دیا، بھول گئیں
نیلگوں جھیل میں ہنستے ہیں کنول کے دو پھول

تنقید اور اصولِ تنقید

ابو محمد سحر

تنقید میں اصولوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر رائے کے پیچھے، اگر وہ نری جذباتیت پر مبنی نہ ہو تو، شعوری یا غیر شعوری طور پر کوئی نہ کوئی اصول کام کرتا رہتا ہے۔ ذوق اور پسند کا اختلاف اصولوں کے اتفاق کے باوجود ایسا رنگ دکھا سکتا ہے لیکن اختلافِ رائے کو ہر حال میں ذوق و پسند کا نتیجہ سمجھنا پوری طرح صحیح نہیں۔ اکثر اس کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ نقاد ادب کی تخلیق، اس کے مقاصد اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کے بارے میں کیا اصول رکھتا ہے۔ بعض صورتوں میں نقاد کے خیالات سے اس کے اصولِ تنقید کا پتہ چلایا جا سکتا ہے لیکن کبھی کبھی اصولِ تنقید کی وضاحت کے بغیر خود اس کے خیالات کی صحیح نوعیت واضح نہیں ہو پاتی۔ دوسرے الفاظ میں، اگر اصولِ تنقید سامنے نہ ہوں تو نہ صرف اختلافِ رائے کی خلیج کو پُر کرنا مشکل ہوتا ہے بلکہ تنقیدی خیالات کو اچھی طرح سمجھنا بھی آسان نہیں ہوتا۔

تنقید میں اصولوں کی جتنی ضرورت ہے اتنا ہی اصولوں کی تشکیل و تدوین کا کام مشکل ہے کیونکہ اصولِ تنقید خود ساختہ نہیں ہو سکتے۔ صرف ذاتی ذوق اور پسند سے اُن کی تشکیل و تدوین نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ادب کے گہرے اور منضبط مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ادب کی تاریخ کے مختلف ادوار، ہر دور کے ممتاز چھوٹے بڑے ادیبوں اور مختلف اصنافِ ادب کے مطالعے کے علاوہ ان سب کو ایک رشتے میں منسلک کر کے دیکھنے ہی سے ایسے ہمہ گیر اصولِ تنقید وضع کیے جا سکتے ہیں جو ماضی و حال بلکہ مستقبل کو بھی، جہاں تک ممکن ہے اپنی گرفت میں لے سکیں۔ کسی ادب کی تنقید کے اصول زیادہ تر اُسی ادب کی تاریخ و روایات اور حدود و امکانات سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے ادب سے ایسے ہی اصول لیے جا سکتے ہیں جو یا تو مشترک پہلوؤں پر مبنی ہوں یا پھر ایسے آفاقی عناصر پر جو جغرافیائی اور تہذیبی عوامل سے بالاتر ہوں۔

میں نے "اردو میں قصیدہ نگاری" کے نہایت مختصر دیباچے میں اصنافِ ادب کے مطالعے میں عصری میلانات اور سماجی پس منظر کو پیشِ نظر رکھنے کی اہمیت جتائی تھی اور قصیدے کی ترقی چونکہ مخصوص ادبی اور سماجی روایات کی تابع تھی اس لیے اس کے مطالعے میں اس پر خصوصیت سے زور دیا تھا۔ ہر زمانے کے ادب میں کچھ نمایاں پہلو ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا سلسلہ بلاواسطہ یا بالواسطہ، اُس زمانے کے ادبی اور سماجی ماحول سے ملتا ہے اور بحیثیت مجموعی اس کے مطالعے کا اس سے زیادہ موزوں طریقہ نہیں ہو سکتا کہ اس وقت کے ادبی اور سماجی ماحول کو سامنے رکھا جائے۔ لیکن تنقید کی دُنیا کسی زمانے کے ادب یا سارے ادب کے مجموعی مطالعے تک محدود نہیں ہے۔ ادیبوں کا فرداً فرداً مطالعہ بھی اس کی مملکت میں داخل ہے یہاں سماجی اور ادبی ماحول اپنی جگہ رکھتا ہے لیکن ادیب کی شخصیت، اس کی اُفتادِ طبع، خاندانی ماحول، تعلیم و تربیت اور واقعاتِ زندگی وغیرہ کے کچھ ایسے پہلو بھی سر اٹھاتے ہیں جن کی حیثیت ذاتی یا نجی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی تخلیقات کی بعض اہم خصوصیات کو بھی اس کی انفرادی صلاحیتوں کی روشنی ہی میں زیادہ اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ ادیب کی انفرادیت ادبی اور سماجی ماحول سے بے نیاز نہیں ہو سکتی لیکن اوّل تو اس کی تشکیل میں دوسرے عناصر بھی موقع موقع سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں؛

دوم ا، س کا مرکز بالعموم اس کی ذات میں ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ایک زمانے کے ادیب سب ایک سے ہوں اور ان میں کوئی امر مابہ الامتیاز نہ ہو جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دراصل ادیب بھی فرد اور ماحول کے عمل اور ردِ عمل کے ان نفسیاتی ضابطوں سے آزاد نہیں جن کی کارفرمائی ہر انسان کی زندگی میں ملتی ہے۔ جس طرح ادیب ماحول سے اثر قبول کرتا ہے اسی طرح وہ ماحول پر اپنی انفرادیت کی مہر بھی لگا سکتا ہے۔ کبھی اس کا یہ عمل ماحول سے ایک گہری ہم آہنگی رکھتا ہے، کبھی اس کو اپنا مقلد بنا لیتا ہے اور کبھی اس کے حصے میں ایک مستقل تصادم کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ مزید یہ کہ ہر ادیب میں یہ کیفیتیں ہمیشہ ایک طرح ظہور میں نہیں آتیں بلکہ نت نئے روپ اختیار کرتی ہیں۔ چنانچہ کسی ایک کیفیت کو کلیہ بنا لینے پھر اس کو بلا فرق و امتیاز ہر ادیب پر عائد کرنے سے صحیح نتائج نہیں نکل سکتے۔ نقاد کی بصیرت کا امتحان یہ ہے کہ وہ مختلف ادیبوں میں مختلف عناصر کی کارفرمائی کے صحیح تناسب کو گرفت میں لا سکے اور اس کی مدد سے اس کی انفرادیت کو واضح کر سکے۔

ادبی تنقید میں ادبی معیاروں کو پیشِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے علاوہ ادب اور غیر ادب کی تفریق کا کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا۔ ادب کے معیار، ادب کی ماہیت اور اس کی عشوہ طرازیوں کے تابع ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر ادب کے اغراض و مقاصد کا تعین کیا جائے تو اس میں کسی قیل و قال کی گنجائش نہیں کہ اظہار و بیان کے مختلف شعبوں کی طرح اس کے اغراض و مقاصد بھی جداگانہ ہیں۔ بعض مضمون پر نظر ڈالیے تو ادب کے مقاصد کی ایک وسیع دنیا سامنے آتی ہے۔ فلسفہ، مذہب، اخلاقیات، نفسیاتِ انسانی، سیاست، غرض کہ انسانی اوہام و عقائد، شعور و آگہی، فکر و نظر اور اعمال و تجربات کے کتنے ہی دروازے اس پر کھلے ہوئے ہیں۔ زندگی اپنے گوناگوں مظاہر کے ساتھ اس کے آئینہ خانے میں پرتو فگن ہے۔ وہ حقیقت کا نہ صرف مفسر اور ترجمان ہے بلکہ اُس کو بدلنے والا بھی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی اقدار کا سانچہ بھی رہا ہے اور انسانیت کا علم بردار بھی۔ عوامی بیداری کے موجودہ دور میں اسے عوام کا خادم ہونے کا منصب بھی حاصل ہے۔ زمانے کے انقلابات کے ساتھ ساتھ اس کے فنی تقاضوں میں بھی انقلاب آیا ہے لیکن فن کا کوئی نہ کوئی تصور اس کا رفیق رہا ہے۔ چنانچہ سب کچھ ہونے کے باوجود ادب کا ادب ہونا اس کی پہلی اور آخری شرط ہے۔ یہ عبارت ہے ایک خاص قسم کی اثر آفرینی سے جو اسلوب کی دل کشی اور جاذبیت اور دوسری فنی خصوصیات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس منزل پر ادب کبھی دل و دماغ کو تسکین بخشتا ہے، کبھی جذبات و احساسات کو حرکت میں لا کر ان کے اندر ایک نئی قوت اور ابھار پیدا کرتا ہے اور کبھی اُس کا اثر صرف ایک حیرت انگیز خلش کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

اس کا فیصلہ تو یقیناً ادبی معیاروں سے کیا جا سکتا ہے کہ کوئی تصنیف ادب ہے یا نہیں، لیکن تنقید کا کام صرف ادب اور غیر ادب کی درجہ بندی نہیں۔ ادب اور غیر ادب کی درجہ بندی کی ضرورت کچھ خاص صورتوں ہی میں ہو سکتی ہے خصوصاً اس صورت میں جب کسی تصنیف کی ادبی حیثیت کے بارے میں شبہ ہو۔ اگر ایسے تصانیف نظم و نثر کو جن کی ادبی حیثیت مسلّم ہے نقاد "ادب" ثابت کرنے ہی تک محدود رکھتا ہے تو یہ اُس کا ایک عجیب و غریب فریضہ ہوگا۔ ادب کو ادب کہہ دینے سے نہ تو اُس کی بڑائی واضح ہو سکتی ہے اور نہ اس کے دوسرے خصوصیات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جہاں تک فنی محاسن کے تجزیے کا تعلق ہے یہ تنقید کی ایک اہم جولاں گاہ ہے۔ اس کے معمولی نمونے اُردو کی ان پرانی اور نئی تنقیدوں میں دیکھے جا سکتے ہیں جن میں کسی ادیب یا شاعر کے اسلوب تحریر یا رنگ کے الگ الگ خصوصیات کا بیان کیا جاتا ہے اور ترقی پذیر نمونے انگریزی کی اس تنقید میں ملتے ہیں جس میں سارا زور ادبی شہ پاروں کے صوری خصوصیات کے تجزیے پر صرف کیا جاتا ہے اور جس کو "نئی تنقید" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی تنقید کچھ ہاتھ پاؤں پھیلا سکتی ہے لیکن کئی لحاظ سے اس کا دائرہ محدود ہے۔ ایک تو موضوع اور ہیئت میں جو ایک اٹوٹ تعلق ہے اس کی وجہ سے ہیئت کا مطالعہ بغیر موضوع کو ذہن میں رکھے ہوئے مکمل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے موضوع کی اپنی ایک الگ اہمیت بھی ہے۔ جس کو ادب کی قدر و قیمت کے تعین میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر تنقید صرف ہیئت یا اظہار و بیان کی خوبیوں کی سراغ رسانی اور نشان دہی تک اکتفا نہیں کر سکتی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کو خیالات کا جائزہ بھی لینا ہوتا ہے۔ ادب میں جن نظریات، خیالات اور تجربات کا اظہار کیا جاتا ہے اُن کی بنا پر ادب کی خوبی یا خرابی کے بارے میں رائے قائم کرنا ضروری ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ادب کی تنقید زندگی کی تنقید بن جاتی ہے اور اصولِ تنقید کا مسئلہ ایک پیچیدہ معنویت اختیار کر لیتا ہے۔ اکثر ادیب کسی نظریۂ زندگی کے ترجمان ہوتے ہیں یا اُس سے شعوری یا غیر شعوری وابستگی رکھتے ہیں۔ کبھی یہ ترجمانی اور وابستگی

کھلے طور پر ہوتی ہے اور کبھی درپردہ۔ کسی واضح نظریۂ زندگی کے نقوش اگر ادیب کے یہاں نہ بھی ہوں تو اُس کے خیالات میں زندگی کے بارے میں کوئی نہ کوئی زاویۂ نگاہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ زندگی کی ہر تصویر، تعبیر اور تفسیر میں بالعموم تنقیدِ حیات کا شائبہ ہوتا ہے۔ میتھو آرنلڈ نے تو ادب کو تنقیدِ حیات ہی کہا ہے۔ ادب کے اعلیٰ نمونے تاریخ کے مختلف ادوار میں پھیلے ہوتے ہیں۔ ہر دور کا ادب اساسی طور پر اُس دَور کی فکر و نظر اور شعور و آگہی کا رہینِ منّت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دور میں بھی ادیبوں کے نظریات اور نقاطِ نظر میں کبھی نمایاں اور کبھی خفیف اختلافات دکھائی دیتے ہیں جن کے سمجھنے کے لیے تاریخی طاقتوں کے علاوہ ادیبوں کے طبقی میلانات اور ذاتی حالات کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مختلف زمانوں کے ادیبوں یا ایک ہی زمانے کے مختلف ادیبوں سے یہ توقع رکھنا بے سود ہے کہ وہ کسی ایک نظریۂ زندگی یا نقطۂ نظر کے مالک ہوں۔ یہ بات کم و بیش پچھلے چالیس سال میں صرف اشتمالی ادب میں ظہور میں آئی ہے اور وہ بھی خاص طور سے اُن ملکوں میں جہاں اشتمالی حکومتیں قائم ہوئی ہیں۔ ادھر نقاد خود ایک سوچنے سمجھنے والے انسان کی طرح اپنے زمانے کے شعور و آگہی اور اپنے طبعی میلانات کے مطابق کوئی نظریۂ زندگی رکھتا ہے یا اسے کم از کم کسی نظریۂ زندگی سے ہمدردی ہوتی ہے۔ اگر وہ صرف اپنے خیالات و نظریات کا پاس کرے تو گزشتہ ادوار کے ادب اور ادیبوں کے تمام نظریات و خیالات پر خطِ تنسیخ کھینچ دینے پر مجبور ہو گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہے کہ زندگی کا کوئی نظریہ خواہ وہ اپنے زمانے کے لحاظ سے کتنا ہی جامع و مانع کیوں نہ ہو معمولی حالات میں ہر شخص کے لیے پوری طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ بالفرض ایک زمانے میں ایسا ہو بھی جائے تو اس کے جو کھٹے میں مختلف زمانوں کے مختلف ادیبوں کے خیالات و نظریات کو کامیابی سے بٹھانا ناممکن ہے۔ چنانچہ خیالات و نظریات کی تنقید میں نقاد کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ایک کھلا ہوا ذہن رکھے۔ اُسے اپنے زمانے کے خیالات و نظریات کو بیچ میں لانے سے پہلے ادب و ادیب کے تاریخی ماحول اور ذاتی حالات کی روشنی میں خیالات و نظریات کا تجزیہ کرنا چاہیے اور ان کی قدر و قیمت کے تعین میں اسی پس منظر سے کام لینا چاہیے۔ ایسے خیالات و نظریات کی جستجو یا اُن کو ثابت کرنے کی کوشش جن کا بروئے کار آنا ادب اور ادیب کے تاریخی ماحول کے پیشِ نظر ممکن نہ ہو، نہ تو صحیح ہو سکتا ہے اور نہ مستحسن۔

مختلف زمانوں کے ادب کے فنی تصورات کی تنقید میں بھی کم و بیش انھیں اصولوں کی پابندی ضروری ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مواد اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے ہر دَور کے ادب کے کچھ تقاضے اور روایتیں ہوتی ہیں۔ اس کا ایک بڑا حصّہ ان تقاضوں اور روایتوں کو پورا کرتا ہے اور ان کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اُس کو اُن سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود ہر دور کے ادب میں کچھ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو ہر زمانے میں اپنی تاب و توانائی کو برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے کسی کے ادب کا جہاں اس کے زمانے کے حدود میں جائزہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں اس کا پتہ لگانا بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں زندگی اور فن کی کچھ ایسی لہریں بھی ہیں یا نہیں جن کا بہاؤ حال و مستقبل میں بھی محسوس کیا جا سکے۔ جو ادب اپنے زمانے کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانوں میں بھی اپنی کشش اور جاذبیت کا سکہ جما سکتا ہے وہ اس ادب سے یقیناً بلند رتبہ سمجھا جائے جو صرف اپنے ماحول کا آئینہ دار ہو گا۔ ایک کی حیثیت جزوِ تاریخ کی ہو گی اور دوسرے کی حیثیت جزوِ زندگی کی۔ کسی ادب کا جزوِ تاریخ بن جانا معمولی بات نہیں لیکن اس کا جزوِ زندگی ہونا اس سے زیادہ غیر معمولی ہے۔ اور تنقید جس کا مقصد خوب سے خوب تر کی جستجو اور عظیم سے عظیم تر کی تلاش ہے اُس کی نشان دہی کے بغیر تکمیل کے درجے پر فائز نہیں ہو سکتی۔

ادب کی قدر و قیمت اور ادیب کے مرتبے کے تعیّن میں پوری کامیابی حاصل کرنے کے لیے نقاد کا ان اصولوں پر کاربند ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن ادب، ادیب اور نقاد کے نظریات زندگی اور نظریاتِ فن میں چند در چند اسباب کی بنا پر اختلافِ رائے کو دیکھتے ہوئے اصولوں کے اس سلسلے کی ایک اور کڑی قابلِ لحاظ ہے۔ کسی زمانے کے ادب یا ادیب کی عظمت اور بڑائی تسلیم کرنے کے لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ نقاد اس کے خیالات و نظریات یا فنی تصورات سے پوری طرح متفق ہو کیوں کہ ادب و ادیب کی عظمت اور بڑائی کا انحصار ادبی تخلیقات کی وسعت و ہمہ گیری، وزن اور گہرائی اور تاثیر و دل کشی پر ہوتا ہے اور یہ خوبیاں مختلف قسم کے خیالات و نظریات اور فنی تصورات میں اپنا جوہر دکھا سکتی ہیں۔ لیکن یہاں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ خیالات و نظریات اور فنی تصورات کی گوناگونی اور رنگا رنگی کے نام منفی اور مریضانہ تصورات میں عظمت اور بڑائی

نہیں ڈھونڈی جا سکتی۔ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ ادب اور ادیب کی عظمت اور بڑائی کی حیثیت اور صحت مند انسانی اقدار سے الگ کوئی جگہ نہیں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اثبات، صحت مندی اور انسانی اقدار کا کوئی جامد اور محدود تصور حاوی نہ ہو اور ہر زمانے کے ادب اور ادیبوں کے خیالات و نظریات اور فنی تصورات کا مطالعہ انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کو نظر میں رکھ کر کیا جائے۔ اس کے بغیر ادب یا ادیب اور نقاد کے درمیان نظریاتی اختلافات کا فاصلہ نہ تو کم ہو سکتا ہے اور نہ اختلاف کو گوارا سمجھا جا سکتا ہے اور یہ دونوں باتیں تنقید کے لیے اتنی ضروری ہیں کہ ان کے بغیر وہ پسند و ناپسند کے جھگڑوں سے کسی حد تک بھی آزاد نہیں ہو سکتی اور سائنٹفک تنقید کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

تنقید کو تخلیقی ادب کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادب کے محرکات تک رسائی حاصل کرنا، اس کے گوناگوں پہلوؤں کو گرفت میں لانا، ان کا انسان کے وسیع ذہنی و عملی تجربات کی روشنی میں جائزہ لینا اور پھر اس کو ایک نئی معنویت، ترتیب اور حسن کے ساتھ پیش کرنا تخلیقی عمل کی بہت سی خصوصیات کا حامل ہے لیکن تنقید کی تخلیقی صلاحیتیں ادب کے دائرے ہی میں اپنے کس بل دکھا سکتی ہیں۔ گویا طائر پرواز کرتے کرتے کتنی ہی بلندی پر کیوں نہ پہنچ جائے اس کی آنکھ نشیمن پر رہنا ضروری ہے۔ ادب اور زندگی کا تعلق بلاواسطہ ہے لیکن تنقید ادب ہی کے واسطے سے زندگی سے رشتہ جوڑ سکتی ہے۔ ادب کو بہانہ بنا کر اگر تنقید آزادانہ طور پر زندگی کی ترجمانی، تفسیر اور تعبیر وغیرہ کے میدانوں میں جولانیاں دکھانے لگتی ہے تو وہ تنقید نہیں رہتی۔ چنانچہ تنقید کی تخلیقی صلاحیتوں کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس کا بنیادی مقصد ادب کو سمجھنا سمجھانا ہے۔ دوسرے تمام مقاصد اور تقاضے اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔

تنقید تحقیق کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتی جب تک ادب یا ادیب کے متعلق صحیح اور مستند معلومات کی فراہمی میں کد و کاوش اور فکر و نظر سے کام نہ لیا گیا ہو تنقید یا تو اغلاط کا مجموعہ بن کر رہ جائے گی یا مفروضات کا طومار۔ اسی طرح وسعت مطالعہ کے بغیر بھی تنقید کا حق ادا نہیں ہو سکتا اس کے لیے ادب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ تنقیدی سرمائے سے بھی پوری واقفیت ضروری ہے۔ اس کے بغیر نہ تو تنقید میں وزن و وقار پیدا ہو سکتا ہے اور نہ وہ تکرار و اعادہ سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ نقاد کو اپنے موقف کا صحیح علم بھی اس کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ تنقید میں نئے زاویوں اور نئے خیالات کی بڑی اہمیت ہے مگر نئے زاویوں اور نئے خیالات کی تشکیل میں غلط تعبیر (Perversion) سے بچنا بھی اس سے کم اہم نہیں، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ مروجہ زاویوں اور خیالات یا دوسرے ناقدین کی رائے کا سنجیدگی اور غور و فکر سے مطالعہ نہ کیا گیا ہو۔

ادب سے لطف اندوز ہونے کے لیے مذاق سلیم اور حس لطیف کا ہونا اولین شرطیں ہیں لیکن اگر ادب کے مطالعہ کو صرف ایک مشغلہ سمجھنے کے بجائے ایک فن سمجھا جائے (جیسا کہ تنقید کی صورت میں وہ یقیناً ہے) تو اس کے لیے ذہن کی ایک خصوصی تربیت بھی درکار ہے۔ جب تک نقاد اس سے بہرہ یاب نہ ہو وہ صرف مذاق سلیم اور حس لطیف کے سہارے فن تنقید کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے ادب کے عام پڑھنے والوں اور نقاد میں نمایاں فرق ہے۔ یہ کہہ کر یہ تنقید کا علم بلند کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ اس میں دوسری قباحتیں ہیں مثلاً ادب کی خوبی یا خرابی میں اس کی مقبولیت یا عدم مقبولیت کا بڑا دخل ہے اور اس کا تعلق عام پڑھنے والوں سے بہت گہرا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ عام پڑھنے والوں اور نقاد کو اختلاف رائے کی صورت میں ایک دوسرے کی بصیرت پر شبہ کرنے کے بجائے حتی الامکان ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ یہ روش ادب اور تنقید دونوں کی ترقی کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔

اس مضمون میں ادب اور ادیب کا استعمال جس مفہوم میں کیا گیا ہے اس میں بالترتیب نثر و نظم اور نثر نگار اور شاعر دونوں شامل ہیں۔ تنقید اور نقاد کا ذکر بحث کی ضرورت کے لحاظ سے علیحدہ ہوا ہے ورنہ تنقید بھی ادب کی ایک شاخ ہے اور نقاد بھی ادیب ہے۔

نذرِ عقیدت

سعادت نظیر

(اردو ادب کے مایۂ ناز شاعر حکیم مومن خاں مومن کی خدمت میں)

وہ پھول تھے کہ مہکتا تھا گلستاں جن سے
وہ تارے تھے کہ چمکتا تھا آسماں جن سے
وہ خوش نظر تھے کہ رنگین تھا جہاں جن سے

برنگِ یاد جو عنوان ہے فسانے کا
وہ عکس ہے کسی گزرے ہوئے زمانے کا

غزل میں میرؔ کا سوز و گداز کیا کہنا
سراجؔ و دردؔ کا راز و نیاز کیا کہنا
خیالِ غالبؔ معنی طراز کیا کہنا

بلند پھر بھی ہے تیرا مقام اے مومنؔ
کچھ اور ہے ترا رنگِ کلام اے مومنؔ

بطرزِ نو ترے اسلوب میں لطافت ہے
بہ پاس وضع ترے طنز میں حلاوت ہے
بلا کی تیرے لب و لہجہ میں نزاکت ہے

لطیف اشاروں کی صورت گری نظر آئی
سخن میں شوق کی شائستگی نظر آئی

فروغِ فن سے تری شاعری عبارت ہے
ترا بیان فسانہ نہیں، حقیقت ہے
کہیں ہے شوخی، کہیں دل ربا متانت ہے

تری غزل میں ترا بانکپن نظر آیا
غضب کا نکھرا ہوا حسنِ فن نظر آیا

زمانے والے ترا مرتبہ گھٹا نہ سکے
کبھی ترے غمِ پردہ نشیں کو پا نہ سکے
ترے نشاطِ تغزل سے لطف اٹھا نہ سکے

سخن شناس تجھے خوش کلام کہتے ہیں
غزل نگاروں کا تجھ کو امام کہتے ہیں

نہ اور کوئی تمنّا، نہ کوئی ارماں ہے
اک آرزوئے بتاں ہو کہ تیرا ایماں ہے
تری نگاہ کا مقصود حُسنِ انساں ہے

خرد فروز صداقت ہے تیری محفل میں
وہی زباں پہ ہے جو بات ہو ترے دل میں

نہ تیرے لب پہ ہے روداد شمع و پروانہ
نہ ذکرِ ساقی و مطرب، نہ "ہوئے مستانہ"
نہ طوطی و گل و بلبل کا کوئی افسانہ

کہی ہیں تو نے انوکھی کہانیاں اپنی
سنائی ہے مزے لے لے کے داستاں اپنی

سرور و کیفِ بہاراں ہے تیرے نغموں میں
نشاطِ بزمِ نگاراں ہے تیرے نغموں میں
نوازشِ غمِ جاناں ہے تیرے نغموں میں

شعورِ عشق ہے رنگینیٔ خیال کے ساتھ
مذاقِ شعر ہے رعنائیٔ کمال کے ساتھ

بہ رنگِ شعلہ ترا جذبۂ رقابت ہے
بہ قدرِ سوزِ دروں تیرا حالِ وحشت ہے
بہ شکلِ سیل ترے دل میں جوشِ الفت ہے

تری غزل میں ہے تہذیبِ عاشقی تیری
تری حیات کا پرتو ہے شاعری تیری

بہارِ رنگِ طرب تیری زندگانی ہے
شبابِ جذبے کا احساس کی جوانی ہے
وفورِ شوق سے پُر تیری ہر کہانی ہے

صنم تراشے ہیں تو نے کس احتیاط کے ساتھ
سجائے بت کدے کس جوشِ انبساط کے ساتھ

جنوری ۱۹۶۱ء

فنونِ لطیفہ

اطہر پرویز

آرٹسٹ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے تجربات کو ایسی گرفت میں لے کر انہیں زندگی عطا کرے۔ جیسے فنی نمونوں میں وہ کسی نہ کسی حد تک زندگی کی ترجمانی ضرور کرتے ہیں۔ انگریزی کے مشہور شاعر اور نقاد میتھیو آرنلڈ نے شاعری کو "تنقیدِ حیات" کہا ہے۔ لیکن یہ تعریف شاعری کی ہی نہیں بلکہ تمام فنونِ لطیفہ کی قرار دی جا سکتی ہے۔ اسے تجربات کی ترجمانی بھی کہہ سکتے ہیں۔

فن کے جتنے کام ہوتے ہیں وہ زندگی کے تجربات میں شدت پیدا کرتا ہے انکی وضاحت کرتا ہے اور پھر بالآخر ان تمام تجربات کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔

آج ہماری تہذیبی زندگی میں بعض فنی تخلیقات ایسی ہیں جو ہماری روزمرّہ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی تخلیقات کا مقصد ہمیں خوشی یا مسرّت پہنچانا نہیں ہے بلکہ ہماری ضرورت کو پورا کرنا ہے ان کی تخلیق انسانوں سے زیادہ مشین کے ذریعہ سے ہوتی ہے، اور اگر انسانی عمل کی بھی براہ راست شرکت ہوتی ہے تو یہ عمل ایک طرح کا میکانکی عمل ہوتا ہے جس طرح فنی تخلیق کرتے وقت فن کار کو ایک ذہنی مسرت حاصل ہوتی ہے، ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے والے ان چیزوں کو بناتے وقت ذرا سی بھی خوشی نہیں محسوس کرتے اور نہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ فنی تخلیق کر رہے ہیں بلکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اس کا مقصد تجارت ہے اس لئے کہ وہ شے بازار میں بیچنے کے لئے ہے۔ یہ صنعتی فنون یقیناً ہمارے کام آتے ہیں جیسے کپڑا، موٹر، جہاز، ریل وغیرہ۔ ہم پہننے کے لئے کپڑا استعمال کرتے ہیں۔ مکان کا مقصد اس سے کوئی روحانی مسرت حاصل کرنا نہیں بلکہ آرام سے رہنا ہے۔ موٹر یا جہاز کا کام لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا ہے۔

وہی پل اچھا مانا جائے گا جو اتنا مضبوط ہو کہ گرنے کا سوال پیدا نہ ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ تمام چیزیں خوبصورت بھی ہوں لیکن ان کی اہمیت کا راز ان کی افادیت میں پنہاں ہے۔ ان میں نہ ان کے بنانے والے کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے اور نہ اس کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔ ایک کارخانے کی ایک ہزار موٹریں ایک ہی قسم کی ہوں گی۔ دراصل ایسی چیزوں میں خوبصورتی کی حیثیت اضافی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا زمانہ جلد ہی آجائے کہ یہ تمام چیزیں آرام دہ بھی ہوں اور ان کے حسن سے ہم متاثر بھی ہوں۔ یہ توقع بے جا نہیں کیوں کہ ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے جب کہ ان چیزوں میں حسن کا پہلو بھی تھا اور ان میں افادیت بھی تھی۔ گویا یہ افادیت اور حسن کا امتزاج تھا۔ کارآمد چیز کے لئے حسین ہونا ضروری تھا اور حسین چیز کارآمد ہوتی تھی۔ دنیا کے بہترین عجائب گھروں میں آپ کو چین، یونان اور دوسرے ملکوں کے قدیم فنی نمونے ملیں گے۔ جیسے برتن، چمچے، مرتبان اور پیالے وغیرہ۔ آج ہم انہیں عہدِ قدیم کے فنی نمونے کی شکل میں دیکھتے ہیں اور ان سے لطف لیتے ہیں۔ لیکن جس زمانے میں یہ چیزیں بنی تھیں اس زمانے میں یہ روزمرّہ کے استعمال میں آتی تھیں اور آج ہم انہیں فن پاروں کی حیثیت سے سجاتے ہیں۔

آپ نشاۃ ثانیہ کے یورپ کے آثارِ قدیمہ کو دیکھئے، وہاں آپ کو محل، گرجا گھر اور قلعے نظر آئیں گے۔ یہ عمارتیں اپنے زمانے میں استعمال میں آتی تھیں۔ دور کیوں جائیے آپ کو لال قلعہ اور موتی مسجد میں فنِ تعمیر کے نادر نمونے نظر آئیں گے۔ لیکن لال قلعہ میں دربار لگتا تھا اور یہ عمارت روزمرّہ

کے استعمال میں آتی تھی اور موتی مسجد میں نماز پڑھی جاتی تھی۔ آج جو عمارتیں سیاحوں کی تفریح گاہ ہیں کل یہ انسانوں کی ضروریات کو پورا کرتی تھیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ صحیح معنوں میں وہی ہے جو ہماری ضرورت کو بھی پورا کرے اور ہمیں روحانی مسرت بھی عطا کرے۔ خاص طور پر یہ مسئلہ فن تعمیر کے سلسلے میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ عمارتوں کو ہم محض دیکھنے اور اپنے ذوق جمال کو تسکین دینے کے لئے نہیں بناتے بلکہ اس کا افادی پہلو بھی ہوتا ہے اس لئے اس میں روپیہ بھی بہت خرچ ہوتا ہے اور یہ جگہ بھی زیادہ گھیرتی ہے گرجا گھر یا مسجد یونیورسٹی یا پارلیمنٹ کی عمارت کا اپنا مقصد ہوتا ہے۔ انہیں اگر ان کے مقاصد سے الگ کر دیا جائے تو ان کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ اس لئے فن کار کا تصور ان کے مقصد سے ہی ہم آہنگ ہے۔

جب ہم حسین اور کارآمد چیزوں کو غور سے دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فن اور صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ فن کی دو شکلیں ہوگئیں ایک کو میکانکی یا کارآمد فنون کہتے ہیں اور دوسرے کو فنون لطیفہ کہتے ہیں۔

کارآمد فنوں میں برتن بنانے والا، معمار، سنار، لوہار، بڑھئی، مکرد وغیرہ آتے ہیں۔ یہ لوگ جو چیزیں بناتے ہیں ان کا ایک فوری مقصد ہوتا ہے۔ ان کی اچھائی اور خرابی ان کی افادیت میں ہے۔ فرض کر لیجئے کہ بڑھئی ایک کرسی بناتا ہے جو دیکھنے میں بے حد خوبصورت ہے۔ اس نے بڑی محنت سے اس میں باریک کام کیا ہے۔ لیکن اگر وہ کرسی بیٹھنے کے لائق نہ ہو تو ہم اس کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہونے کے باوجود اس کو کارآمد نہیں کہیں گے کیوں کہ وہ کرسی اپنا مقصد پورا نہیں کرتی۔ اسی طرح اور دوسرے کارآمد فنون کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی اچھائی کا انحصار ان کی افادیت اور مقصد میں ہے۔ یہ فنون انسان کی روزمرہ زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرے۔ یہ ضرورتیں ہماری تہذیبی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہیں۔ ان کی پرکھ بھی اسی بات سے ہوتی ہے کہ وہ جس کام کے لئے بنائی گئی ہیں اس کے مقصد کو بھی پورا کرتی ہیں یا نہیں۔

کارآمد فنوں کے برخلاف فنون لطیفہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک قسم کی مسرت بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ مسرت خود اس فن کی تخلیق کرنے والا بھی حاصل کرتا ہے اور دیکھنے اور سننے والے بھی اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے مسرت اور فرحت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ پہلی قسم کی ترقی سے آپ کسی قوم کی مادی ترقی یا پچھڑے پن کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور دوسرے سے اس کے ذہنی معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً کوئی قوم ایسی روزمرہ زندگی میں کام آنے والی اشیاء کو بڑے پیمانے پر تیار کرتی ہے تو ہم اس کی مصنوعات کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ قوم صنعتی حیثیت سے بڑی ترقی یافتہ ہے۔ اسی کے ساتھ ہی اگر کوئی قوم فنون لطیفہ کے میدان میں آگے بڑھی ہوئی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا ذہنی اور عقلی معیار بلند ہے وہ ملک اپنے دانشوروں طبقے کی بنا پر عقلی برتری رکھتا ہے اور اس کی تہذیبی و تمدنی زندگی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تہذیبی ترقی میں مادی خوشحالی کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے

اس وقت ہم کارآمد فنوں کو نظر انداز کرتے ہیں کیوں کہ ہمارا تعلق فنون لطیفہ سے ہے۔ فنون لطیفہ کی پانچ شاخیں ہیں۔ فن تعمیر، فن سنگ تراشی، فن مصوری، فن موسیقی اور فن شاعری یا ادب۔ فنون لطیفہ کی تمام شاخوں کو ہم دو حصوں میں بانٹتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اور دوسرے وہ جن کا لطف کانوں سے سن کر اٹھایا جا سکتا ہے۔ گویا فن تعمیر، فن مجسمہ سازی اور فن مصوری کو ہم آنکھوں سے دیکھنے والے فنوں کی فہرست میں رکھتے ہیں اور کانوں سے سننے والے فنوں میں ہم موسیقی اور شاعری یا ادب کو رکھیں گے

یہاں پر اگر جرمن مفکر ہیگل کی رائے پیش کر دی جائے تو بے محل نہ ہوگی ہیگل کا خیال ہے کہ فنون لطیفہ کی پانچوں شاخوں میں درجات قائم کئے جا سکتے ہیں اس کا کہنا ہے کہ ایسی درجہ بندی کرتے وقت شاعری یا ادب کو سب سے بڑا درجہ دیا جا سکتا ہے اور فن تعمیر کو سب سے کم۔ اس نے درجہ بندی کرتے وقت جو اصول مقرر کیا ہے وہ یہ ہے کہ مادی وسائل کا استعمال جن فنوں میں مادی استعمال کم ہوگا وہاں ذہنی سطح بلند ہوگی۔ اس اصول کے تحت اس نے سب سے بلند درجہ شاعری کو دیا ہے اور سب سے کم فن تعمیر کو کیونکہ فن تعمیر میں مادی اشیاء کا استعمال بہت زیادہ ہے جیسے اینٹ، پتھر، چونا، گارا، لوہا اور لکڑی وغیرہ۔ اس کے علاوہ ان کی تعمیر میں جو اوزار استعمال ہوتے ہیں وہ بھی مادی حیثیت ہوتے ہیں فن تعمیر کا ہر مظہر مادی ہے جسے آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے لہٰذا دیکھنے والے کی نظر اس تعمیر کے ذہنی پس منظر سے پہلے اس کی مادی اور خارجی چیزوں میں کھو جاتی ہے مثال کے طور پر آپ تاج محل کو دیکھئے۔ سب سے پہلے آپ اس کی مادی اور خارجی چیزوں میں الجھ جائیں گے جنھوں نے تاج محل کی تشکیل میں

مدد کی۔ اس کے بعد پھر ہم تاج محل کے ذہنی پس منظر کی طرف متوجہ ہوں گے جو اس مقبرہ کی اصل خصوصیت ہے اور جس میں تاج کا تصور پنہاں ہے، جہاں اس کے جمال کی شخصیت جلوہ گر ہے۔

فن تعمیر کے بعد دوسرا درجہ مجسمہ سازی کا آتا ہے۔ فن مجسمہ سازی میں بھی مادی اشیاء کا استعمال ہوتا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا کہ فن تعمیر میں۔ اب اینٹ، پتھر، چونا، لکڑی، لوہا اور مٹی وغیرہ کی جگہ پتھر یا دھات سے کام چلایا جاتا ہے۔ جو دو مادی استعمال ہوتے ہیں یعنی چھینی وغیرہ وہ بھی فن تعمیر کے اوزار کے مقابلہ میں زیادہ نازک ہیں۔ یہاں ایک مجسمہ میں خون گردش کرتا ہے۔ مورت کے اندر انسان کی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔

فن مجسمہ سازی کے بعد فن مصوری کا نمبر آتا ہے۔ اب خارجی اور مادی چیزوں میں اور زیادہ کمی پیدا ہو گئی۔ فن کار کے پتھر یا دھات کی جگہ کاغذ یا کینوس لے لیا ہے اور چھینی کی جگہ برش۔ آپ مصور کی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھیے یہاں مادی اشیاء کا استعمال بہت کم ہو گیا ہے۔ آپ تصویر دیکھیے اور مادی اور خارجی اشیاء آپ کے ذہن کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنیں گی۔ آپ تصویر اور مصور دونوں کی ذہنی کیفیت کو اچھی طرح محسوس کریں گے گویا فن مجسمہ سازی میں پتھر یا دھات کا اہم حصہ تھا یہاں فن کار کے برش اور رنگ اور کینوس سے زیادہ کام فن کار کا دماغ کرتا ہے۔

اب ہم فن موسیقی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فن مصوری میں کاغذ یا کینوس اور رنگ اور برش کی ضرورت پڑتی ہے جو کہ مصور تصویر کے اندر ایک ذہنی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ موسیقی میں آوازوں کے ذریعہ موسیقار اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ ہاں ایسے آوازوں میں آہنگ پیدا کرنے کے لئے ساز کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ساز مصور کے خارجی و مادی اشیاء کے مقابلے میں زیادہ نازک ہے۔ اس فن کار کو اپنے جذبات کے اظہار کے لئے محض آواز کے آہنگ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اس کے بعد آخری نمبر شاعری کا ہے۔ ہیگل نے شاعری کو سب سے بلند درجہ دیا ہے کیونکہ اس کے نقطۂ نظر کے مطابق شاعری میں مادی اشیاء کا استعمال سب سے کم ہے۔ موسیقی میں تو پھر بھی ساز کے آہنگ کی ضرورت پڑتی ہے مگر شاعری کو آواز اور ساز کے سہارے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں مادی اشیاء کی جگہ الفاظ نے لے لی ہے۔ شاعری اپنے جذبات اور احساسات کو الفاظ کے ذریعہ پیش کرتی ہے۔ شاعر اور سننے والے کے درمیان کوئی ایسی مادی شے نہیں ہے جو رکاوٹ بن جائے۔ شاعری انسان کے ذہن کو براہ راست مخاطب کرتی ہے اور شاعر اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو الفاظ کے جامے میں بڑی نفاست کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔

یہ ہیگل کا تجزیہ ہے۔ اس نے جس طرح فنون لطیفہ کی تمام شاخوں کا موازنہ کیا ہے، اس میں کسی حد تک سچائی کا عنصر ضرور ملتا ہے لیکن اس میں ان تمام فنون کے ساتھ ایک طرح کی بے انصافی بھی نمایاں ہے۔ ہیگل نے یہ نہیں سوچا کہ ہر فن کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ کوئی فن کسی دوسرے فن کی جگہ ہرگز نہیں لے سکتا۔ تاج محل کی تعمیر کی جگہ کوئی خوبصورت سے خوبصورت نظم کبھی نہیں لے سکتی حالانکہ ادب نے کبھی کبھی اسے تخیل کے بل بوتے پر تصویر کی جگہ لینے کی کوشش کی ہے اور الفاظ میں تصویر کھینچنے کا فرض ادا کیا ہے لیکن یہ تصویر ادبی مرقع ہی کہلائی جا سکتی ہے۔

کوئی شاعر ہو ما۔ ڈ ونچی کی تصویر "مونالیزا" سے متاثر ہو سکتا ہے لیکن اس کی نظم "مونالیزا" کی جگہ کیسے لے سکتی ہے؟ اسی طرح کوئی مصور کسی ادبی تخلیق سے متاثر ہو کر تصویر بنا سکتا ہے جیسے شاعری موسیقی کے لئے نظمیں اور گیت فراہم کر سکتی ہے۔ خود ڈراموں اور شاعری نے موسیقی سے کافی مدد لی ہے۔ موسیقی اور شاعری میں ایک باہمی تعلق پیدا ہو سکتا ہے اور بعض صورتوں میں ہوتا بھی ہے لیکن اچھی شاعری کو موسیقی کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے ۔۔۔ بالکل اسی طرح جیسے اعلیٰ درجے کی موسیقی کو الفاظ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ الفاظ کے بغیر پوری کیفیت پیدا کر لیتی ہے۔

اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فنون لطیفہ میں سے ہر ایک کے لئے اپنے اپنے تقاضے ہیں اور کوئی فن کسی دوسرے کے مطالبوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام فنون کی ابتدا ایک وقت میں نہیں ہوئی بلکہ انسان کی ضرورت کے مطابق ہر فن اپنے مخصوص زمانے میں وجود میں آیا۔

آوازیں

ابوطاہرہ سعید

بہار کی آواز

مری آمد ہے اُلفت کا فسانہ !!
طرب انگیز ہے میرا ترانہ !!
مِری گودی میں پھولوں کا خزانہ !!
فریبِ حُسن ہے میرا زمانہ !!
کہاں ہے شاعرِ شوریدہ سَر تُو ؟

جنگل کی آواز

مری سرسبز و خرّم انجمن ہے !!
ہواؤں میں مری مشکِ ختن ہے !!
مرے دامن میں دریا موجزن ہے !!
زمیں پر میری فرشِ یاسمن ہے !!
کہاں ہے شاعرِ شوریدہ سَر تو ؟

کوہسار کی آواز

مری آغوش میں پھولوں کی جنّت
مری وادی میں عریاں حُسنِ فطرت
فضاؤں میں مری آرام و راحت
مری محفل میں خاموشی و خلوت
کہاں ہے شاعرِ شوریدہ سَر تو ؟

آبشار کی آواز

روانی میں مری شیریں تلاطم
صداؤں میں مری شورِ ترنّم
اداؤں میں مری شوخیٔ تبسم
زباں پر میری مستانہ تکلّم
کہاں ہے شاعرِ شوریدہ سَر تو ؟

چاند کی آواز

حسیں کوئی نہیں ہے مجھ سے بڑھ کر
چمک سے میری ہے دنیا منوّر
حکومت ہے مری بام فلک پر
ہیں صف بستہ مری خدمت میں اختر
کہاں ہے شاعرِ شوریدہ سَر تو ؟

آدھی رات کی آواز

مری زلفوں سے فرقت کی کہانی
کہی جاتی ہے عاشق کی زبانی
خموشی میں مری سوزِ نہانی
مری شبنم میں اشکوں کی روانی
کہاں ہے شاعرِ شوریدہ سَر تو ؟

طوفان کی آواز

مرے نالوں میں رعد و برق و باراں
مری آمد سے دنیا ہے لرزاں
تلاطم ہے مرے سینے میں غلطاں
مرا [illegible] میں تو انقلاب [illegible]
کہاں ہے شاعرِ شوریدہ سر تو؟

ستار کی آواز

مری جھنکار میں نغموں کا طوفاں
مرے پردوں میں سوزِ عشق پنہاں
نواؤں میں مری عشرت کا ساماں
اشاروں پر مرے حوریں غزل خواں
کہاں ہے شاعرِ شوریدہ سر تو؟

عورت کی آواز

نگاہوں میں ہیں میری تیر و نشتر!!
مرا اٹھتا ہے روزن پہ پردہ!!
تسلط میرا ہے شاہ و گدا پر!!
ہیں دلکش، دل نشیں، دلدار و دلبر!!
کہاں ہے شاعرِ شوریدہ سر تو؟

سُرخ بندی

محمد اشفاق حنفی

دسویں صدی کے راجپوتانہ کی ہری چنبل ندی کا کنارہ اور بہار کا موسم تھا۔ ہوا کے خوشگوار جھونکے دلوں میں ایک سرور پیدا کر رہے تھے لیکن لکشمی اُداس تھی۔ دن ڈھلنے لگا تھا مگر راجو (راجکمار رندھیر سنگھ) ابھی تک نہیں آیا تھا۔ مایوس ہو کر لکشمی اپنے گھوڑے کی باگ ڈور کھول ہی رہی تھی کہ جھاڑیوں کی اوٹ سے کسی ٹانگن کے ہنہنانے کی آواز نے اُسے چونکا دیا لیکن وہ فوراً سنبھلی۔ ہاتھ میں کمان اور چلّے میں تیر جوڑ کر اُس طرف بڑھی جدھر سے آواز آئی تھی۔ پتوں کی سرسراہٹ اور پھر سامنے ایک سولہ سترہ سال کا خوبصورت لڑکا کھڑا اُسے گھور رہا تھا۔ لکشمی کی کمان خود بخود جھک گئی۔ وہ حیرانی کے عالم میں اُسے تک رہی تھی۔ شکل و شباہت، ہاتھ، پیر، گھنگھریالے بال، بالکل راجو جیسا۔ پہچاننے کو تو وہ پہچان گئی۔ راجو اُسے بتا بھی چکا تھا مگر اُس نے انجان بن کر پوچھا ”کمار، ادھر کیسے آ نکلے؟“ لیکن کمار کے ماتھے کی تیوریوں کے بل ابھی اترے نہ تھے۔ چڑھ کر بولا۔ ”ہوں۔ تو یہ تم ہو، جس کے چکر میں بھیا روز دوپہر کو گھر سے چوری چوری ادھر آتے ہیں۔ آج ہی تو دادا سے جا کر کہتا ہوں۔ تم ذرا اپنا نام تو بتانا۔“

لکشمی بہت سٹپٹائی۔ اس بالک کو کیسے منایا جائے۔ راجو بھی نہیں تھا کہ اُسے پھسلا لیتا۔ بچہ ہے، کہیں سچ مچ جا کر مہاراج سے نہ کہہ دے۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ کمار نے طنزیہ کہا۔ ”کمان ہی لئے پھرتی ہو یا نشانہ بھی لگا سکتی ہو؟“ لکشمی جھینپ گئی۔ الھڑ کمار کو کیا پتہ کہ رتیا کا نشانہ کس قدر کاری ہے۔ بہرحال، لکشمی نے اپنی ذہانت سے کام لیا اور مسکرا کر بولی۔ ”کمار تم سے اچھی بان ودّیا میں جانتی ہوں۔“

”ڈینگ ہے — بالکل ڈینگ۔“ کمار بولا۔ ”میرے راج میں کوئی بالک ٹھاکر میرا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ دسہرے کے میلے پر دادا کے سامنے میں نے بہت سے لڑکوں کو ہرایا تھا۔ دیکھو دادا نے خوش ہو کر مجھے اپنے گلے کی یہ موتیوں کی مالا دی ہے۔“

”بس۔ بس۔ کمار بس۔ لڑکوں کو تم نے ہرایا ہوگا ہمیں ہراؤ تو جانیں۔“ لکشمی بولی۔

کمار نے جوش میں آکر فوراً کمان کندھے سے اُتاری اور لکشمی سے بولا۔ ”بتاؤ کس چیز پر نشانہ لگاؤں؟“

لکشمی نے موقعہ کو غنیمت جانا۔ اپنا رومال ایک تیر کی چٹکی میں باندھ کر انی ایک درخت کی ڈال میں پیوست کر دی۔ سُرخ ریشمی رومال ہوا میں بل کھاتا لہراتا لیکن کسی ایک جگہ پر ساکت رہتا۔ لکشمی مسکرا کر بولی ”راج کنور، اس رومال میں اپنے تیر سے چھید کر دو تو میں ہاری تم جیتے۔“

”ہارنے پر کیا دو گی؟“ کنور نے فخر سے سینہ تانتے ہوئے سوال کیا۔

”مٹھائی۔“ لکشمی نے مسکرا کر جواب دیا۔

کمار نے تیر چلّے سے چھوڑا۔ ہوا میں تیرتا ہوا تیر آگے ایک درخت کے تنے میں جا کر چبھ گیا۔ کمار کو حیرت ہوئی۔ نشانہ خالی۔ لیکن لکشمی نے اُس کی ہمت بڑھائی۔ پھر دوسرا۔ تیسرا۔ آخر کمار جھنجھلا اُٹھا۔ اب وہ

تیروں کی بارش کر رہا تھا جو اُس بار رومال کو لہرا لہرا کر تیروں کی نوک سے بچا لیتی اور اگر کوئی تیر رومال پر لگتا بھی تو ریشم کی چکنا ہٹ خود پھسل کر اپنے کو چھید نے سے محفوظ رکھتی اور یہی لکشمی کی ذہانت کا ثبوت تھا۔

کمار کا ترکش نصف سے زیادہ خالی ہو چکا تھا۔ لکشمی کمار کی بےبسی پر قہقہہ لگا کر ہنستی اور کہتی "کنور میری مٹھائی کھانا آسان نہیں" بھولے کنور پر ترس آنے لگا۔ اُس نے پیار سے کمار کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا "بس کرو کنور۔ اب تھک گئے ہو گے۔"

"نہیں میں تھک نہیں سکتا جب تک اس رومال کو چھید نہ ڈالوں گا گھر واپس نہیں جاؤں گا۔" کمار نے جواب دیا۔

"اچھا چلو یہی سہی لیکن ذرا دم لے لو۔ پھر میں تمہیں تیر چلانا سکھا دوں گی" لکشمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے تیر چلانا سکھاؤ گی؟ ہُنہہ" کمار نے کہا۔ اُسے سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔

"کنور تمہارے بھائی نے بان دو دیا مجھ سے ہی سیکھا ہے۔ دیکھو سارے راجپوتانے میں کوئی ان کے آگے بان نہیں اُٹھاتا۔" لکشمی بولی۔ اس کی مسکراہٹ میں شرارت جھلک رہی تھی لیکن کنور کو حیرت زدہ کرنے کے لئے اُس کا یہ حربہ کافی تھا۔

"سچ کہہ رہی ہو؟ تو مجھے بھی سکھا دو۔" کمار نے اشتیاق بھرے لہجہ میں کہا۔

لکشمی نے پیار سے اُس کا بازو پکڑ کر کہا "ہاں سکھا دوں گی۔ چلو پہلے تمہارا منہ میٹھا کرا دوں۔"

ندی کنارے نرم ریت پر کنور بیٹھا رتیا کی لائی ہوئی لذیذ مٹھائیاں کھا رہا تھا۔ یکایک اُس نے سر اُٹھا کر لکشمی کو بغور دیکھا اور بولا "اچھا یہ بتاؤ تم ہو کون؟"

"میں کچھ بھی نہیں" لکشمی شرما گئی۔

"جب تم کوئی بھی نہیں ہو تو پھر مجھے اتنی اچھی مٹھائی کیوں کھلا رہی ہو؟" کنور نے پھر پوچھا۔

اتنے میں جھاڑیوں کے پیچھے سے قدموں کی آہٹ نے دونوں کو چونکا دیا۔ سامنے راجو کھڑا مسکرا رہا تھا۔ لکشمی کے چہرے پر مشرقی حیا کی سُرخی جھلک اُٹھی۔ آنچل سنبھالتے ہوئے وہ راجو کے استقبال کو اُٹھی

"آپ کا بہت دیر سے انتظار ہو رہا تھا!" مسکراتے ہوئے اُس نے کہا۔

"میں نے تو اسی لئے کنور کو پہلے ہی تمہارے پاس بھیج دیا تھا۔" راجو نے شرارت آمیز تبسم سے جواب دیا۔

"واہ آپ نے کب مجھے ان کے پاس بھیجا تھا" کنور نے چونک کر کہا۔

"تو پھر کنور تم یہاں کیسے آئے تھے؟" لکشمی بول اُٹھی۔

"میں تو ایک خرگوش کے پیچھے گھوڑا بھگاتا یہاں تک چلا آیا تھا" کنور نے جواب دیا

راجو اور لکشمی کنور کی بوکھلاہٹ پر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ دن تیزی سے ڈھل رہا تھا لیکن کنور گھر جانے کو تیار نہیں تھا وہ لکشمی سے مُصر تھا "مجھے بھی بان دو دیا سکھا دو۔" دونوں ہنستے لکشمی کل کا وعدہ کرتی ضدی کنور مچل مچل کر کہتا "میں نے سوگند کھائی ہے۔ جب تک اُس رومال کو اپنے تیر سے نہ چھید ڈالوں گا تب تک گھر نہ جاؤں گا۔"

آخر لکشمی ہنستے ہوئے درخت کے پاس گئی اور ایک دوسرے تیر کی انی سے رومال کا دوسرا کونا درخت کی ڈال میں پیوست کر دیا۔ کنور نے اپنے تیر سے اُسے چھید کر اپنی قسم پوری کی اور ہنستے ہوئے کہا "تم ہار میں جیتا۔" لکشمی نے ہنستے ہوئے اپنی پیشانی سے سُرخ بندی چھڑا کر کنور کے ماتھے پر لگا دی اور بولی "لو یہ تمہاری جیت کا نشان ہے۔"

کنور جھینپ گیا۔

چند روز بعد دسہرے کا میلہ تھا لیکن جے نگر میں کہرام مچا تھا۔ ہر شخص گھبرایا ہوا اور پریشان تھا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے جگہ جگہ عورتیں اور مرد اکٹھا تھے۔ آپس میں چہ مہ گوئیاں ہو رہی تھیں۔

"لکشمی تو ایسی نہیں تھی۔" "مگر وہ آخر ندی کے کنارے تنہا گئی کیوں؟"

"کسی نے بلایا ہو گا۔" "وہ روز دوپہر کو جاتی تھی۔" "مگر اکیلے کیوں جاتی تھی؟" لکشمی کہاں اور کیسے غائب ہو گئی یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

لکشمی ٹھاکر رام سنگھ کی اکلوتی اولاد تھی۔ جب یہ ایک سال کی تھی تو ٹھاکر کسی لڑائی میں راجہ اندر کوٹ کی طرف سے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ راجہ نے بیوہ ٹھکرائن کو جے نگر کا گاؤں جاگیر میں دیا تھا۔ ٹھکرائن

نے لکشمی کو لڑکوں کی طرح سے پالا تھا مگر اُس کے یک بیک غائب ہونے
سے اُس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس قدر دُکھ ٹھاکر کے مرنے پر بھی اُسکو
نہ ہوا ہوگا۔ یہ خاندانی عزت کا معاملہ تھا۔ ٹھاکر کی بہادرانہ موت سے
خاندان کی عزت بڑھی تھی لیکن لکشمی کی وجہ سے آج پُرکھوں کی موتی ایسی
آب اُتری جا رہی تھی

اندرکوٹ کا راجکمار راجو اپنی ننھیال گیا ہوا تھا اُس کو وہیں
اس واقعہ کی اطلاع ملی۔ وہ بیتاب و بیقرار ہو کر اندرکوٹ چل پڑا۔
رہ رہ کر اس کے دل میں خیال آتا کہ یہ حرکت سوائے اچل سنگھ کے اور
کوئی نہیں کر سکتا۔ ٹھکرائن نے اچل سنگھ کے ساتھ لکشمی کو بیاہنا منظور
نہیں کیا تھا۔ ضدی ٹھاکر ہے، ضرور یہ ذلیل حرکت اُسی کی ہوگی۔

شام کا وقت تھا۔ راجکمار سڑک کے کنارے پڑاؤ باغ میں رات
بسر کرنے ٹھہر گیا۔ اندرکوٹ دو منزل کی دوری پر تھا۔ راجکمار عالم بیقراری
میں سڑک پر ٹہل رہا تھا کچھ دور پر اس نے آگ روشن دیکھی معلوم نہیں اُسکے
جی میں کیا آیا کہ وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ قریب
پہنچا تو دیکھا کہ ایک سادھو دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ راجو نے اُسے پرنام
کیا اور ادب سے اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ سادھو اس کی طرف متوجہ ہوا اور بولا
"کہو کمار اس قدر اُداس کیوں ہو؟" سادھو کے الفاظ میں ہمدردی بھری
تھی۔ راجو کے آنسو بہنے لگے۔ سادھو نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "کمار
مجھ سے اپنا دُکھ کہو۔ شاید میں تمہارے کچھ کام آسکوں"۔ راجکمار نے کل
واقعہ کہہ سنایا۔ سادھو نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا کہ یہاں سے کچھ
دور پر دو سادھو ہمارے ہی پنتھ کے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ آج ہی وہ اچل سنگھ
کی گڑھی سے آئے ہیں، انھیں اس کا کچھ حال معلوم ہوگا۔ راجو، سادھو کے
ساتھ دوسرے سادھوؤں کے پاس پہنچا۔ سادھو کے سوال کرنے پر اُنھوں
نے راجو کے خیالات کی تصدیق کردی۔ اُنھوں نے بتایا کہ اچل سنگھ نے
لکشمی کو اپنی گڑھی میں قید کر رکھا ہے۔

راجو کے لئے اتنی خبر کافی تھی۔ آن واحد میں اُس کے دو سو جان نثار
ساتھیوں کے گھوڑے اندھیری رات میں اچل سنگھ کی گڑھی کی طرف اُڑے
چلے جا رہے تھے۔ ابھی ایک گھڑی رات باقی تھی کہ راجو نے گڑھی کا گھیرا
ڈال دیا۔ گھیرا پڑتے ہی گڑھی سے تیر اور پتھر برسنے لگے۔ راجو اور اُس کے
ساتھی بار بار جان ہتھیلی پر رکھ کر پھاٹک پر حملہ کرتے مگر ناکام رہتے۔ پھاٹک
بہت مضبوط تھا اُس کے بھالوں کی انیاں ٹوٹ جاتیں مگر پھاٹک پر کوئی
اثر نہ ہوتا۔ گڑھی کی دیواریں بھی کافی بلند تھیں۔ کمندیں پھینک کر راجو کے
ساتھی اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے لیکن اوپر سے کمندیں کاٹ دی جاتیں۔

صورت حال دیکھ کر اُس نے اپنا ایک سوار مدد طلب کرنے کے
لئے اندرکوٹ بھیج دیا تھا۔ ابھی اندرکوٹ پانچ کوس باقی تھا کہ اُس سوار
کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور سوار نیچے آرہا۔ اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔
غریب اُٹھنے کے قابل بھی نہ رہا۔ وہ تکلیف سے بے چین تھا لیکن سب سے
زیادہ غم اُس کو مہاراج اندرکوٹ کے پاس راجکمار کا پیغام نہ پہنچا پانے
کا تھا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے ہرنوں کا ایک غول بھاگتا ہوا
نکلا ایک ہرن کے تیر چُبھا ہوا تھا جس سے تازہ خون بہہ رہا تھا۔ سوار حیرت
سے یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ چھوٹے راجکمار کا ہاتھی جھٹتا ہوا نظر آیا۔ ہرنوں کا
شکاری وہی تھا۔ زخمی سوار نے چھوٹے کمار کو چیخ چیخ کر پکارنا شروع کردیا۔

کنور نے بھائی کی پریشانی سُنی تو آنکھیں غصہ سے سُرخ ہوگئیں۔
راجپوتی خون جوش میں اُبلنے لگا اتنے میں اُس کے ساتھی بھی آگئے۔ اُس نے
پکار کر ان سے کہا: "ہم راجو بھیا کی مدد کو جا رہے ہیں جس کو ہمارا ساتھ
دینا ہو چلے"۔ اندرکوٹ کے سیناپتی کے لڑکے نے جو اُس کا دوست اور
اُس کے ساتھ تھا مشورہ دیا: "پہلے مہاراج کو خبر کردی جائے! ہاں سے
کچھ اور آدمی اور ہاتھی آجائیں تو ہمیں آگے بڑھنا چاہئے"۔ کنور جوش میں
ہودے میں اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا "تب تک پتہ نہیں کہ راجو بھیا پر کیا گذر جائے
میں ذرا دیر بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتا"۔ یہ کہہ کر اُس نے مہاوت کو اچل سنگھ
کی گڑھی کی طرف ہاتھی بڑھانے کا حکم دیا۔ کنور کے ساتھ سب ملا کر کوئی سو
آدمی تھے۔ چار ہاتھی تھے۔ یہ جماعت جنگ کرنے کے لئے نہیں شکار کھیلنے
کے لئے نکلی تھی اور اسی لئے باقاعدہ مسلح نہ تھی لیکن کمار اتنا صبر نہیں کرسکتا تھا
کہ اندرکوٹ سے باقاعدہ فوج آئے اور تب وہ گڑھی کی طرف روانہ ہو۔

اِدھر راجو، اچل سنگھ کی گڑھی پر چاروں طرف سے بڑھ بڑھ کر
یورش کرتا مگر ہر مرتبہ گڑھی سے تیروں اور پتھروں سے جواب ملتا۔ دوپہر
ہو رہی تھی۔ راجو بار بار سورج کو دیکھتا اور بیقرار ہوتا۔ اندرکوٹ سے
بھی مدد نہیں آئی۔ سیناپتی نے کیوں دیر کی۔ کیا مہاراج کو میری جان

بیاری نہیں ہے؟" راجو کے دل میں مختلف خیالات آرہے تھے۔ ہاتھیوں کی سخت ضرورت تھی۔ پھاٹک ہاتھی ہی توڑ سکتے تھے۔ راجو کو چھوٹے کنور کا گراں ڈیل رامو بہت یاد آرہا تھا۔ یہ دیو ہیکل ہاتھی بڑا طاقتور ہاتھی تھا اس کی مستک کی خوفناک ٹکر سے بڑے بڑے مضبوط آہنی پھاٹک ٹوٹ چکے تھے۔ اتنے میں پھاٹک کی طرف شور ہوا۔ راجو گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس طرف بڑھا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اس کے ہمراہیوں میں سے کسی کی کمند پھاٹک کی برجی میں پھنس گئی تھی۔ کمند کے ذریعہ اس کے کچھ ساتھی پھاٹک کی چھت پر پہنچ چکے تھے۔ اچل سنگھ کے سپاہیوں سے ان کی تلواریں چل رہی تھیں۔ راجو کو تاب نہ رہی اور وہ بھی اسی کمند کے ذریعہ اوپر پہنچ گیا۔ راجو کے اوپر پہنچنے سے اس کے ساتھیوں کی ہمت بڑھ گئی اور پھاٹک کی چھت پر ان کا قبضہ ہو گیا مگر اندر کی طرف گڑھی میں اترنا موت کے منہ میں جانا تھا۔ ایسے سیکڑوں سپاہیوں کے ساتھ اچل سنگھ سامنے میدان میں موجود تھا۔ اس کے سپاہی اتنی تیزی سے تیر چلا رہے تھے کہ دیوار کے اوپر سر اٹھانا ناممکن تھا۔

یکایک گڑھی کے باہر ایک شور ہوا۔ کنور اپنے ساتھیوں سمیت گڑھی پہنچ گیا تھا۔ سیناپتی کے لڑکے گنیش سنگھ کا ہاتھی آگے بڑھا مگر پھاٹک کے پاس پہنچ کر چنگھاڑ کر پیچھے لوٹ آیا۔ بہادر گنیش نے بھالے کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ تکلیف سے مست ہاتھی چنگھاڑتا مگر پھاٹک پر ٹکر لگانے کی ہمت نہ کرتا۔ پھاٹک میں بڑی بڑی نوکیلی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ یہی نوکیں ہاتھی کی ہمت پست کر دیتی تھیں۔ دوسرا ہاتھی، پھر تیسرا ہاتھی، لیکن وہ نوکیلی کیلیں سب کی ہمتیں پست کئے دیتی تھیں۔
آخر میں رامو کو خود چھوٹے کنور نے بڑھایا مگر بہادر رامو کی آنکھیں بھی لمبی نوکدار کیلوں کو دیکھ کر بند ہو جاتیں۔ بڑے بڑے خوفناک دانتوں والا رامو آج ہمت ہار رہا تھا۔ کنور بار بار اسے للکارتا، ہمت دلاتا، بھالے کی نوک گردن میں چبھوتا، لیکن رامو چنگھاڑ کر پلٹ پڑتا۔ آج ہاتھیوں کے مستک پر لوہے کے جنگی توے نہیں چڑھے تھے۔ اسی لئے یہ کیلوں کے مقابلے میں ہمت ہار رہے تھے۔

راجو نے سورج کی طرف دیکھا۔ دن ڈھلنے لگا تھا۔ "رات کی تاریکی سے اچل سنگھ فائدہ اٹھا سکتا ہے" یہ سوچ کر وہ گھبرا اٹھا اور چلا کر کہا: "کنور، میں نیچے اتر رہا ہوں۔ پھاٹک توڑ کر سارے سپاہی اندر لے آؤ۔" کنور راجو کا خطرناک فیصلہ سن کر گھبرا اٹھا۔ ہاتھی پھاٹک پر ٹکر مارنے سے ڈر رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بھائی دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ اگر وہ نہ رہا تو میں ماں باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ جوش اور غصہ میں اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ وہ ہودے سے کود پڑا۔ پھاٹک کے پاس پہنچ کر اپنی پگڑی کھولی۔ پیچھے گنیش سنگھ، اس کا جاں نثار دوست تھا۔ کنور نوکیلی کیلوں کو پکڑ کر پھاٹک پر چڑھنے جا رہا تھا کہ گنیش نے اسے پیچھے کھینچ لیا اور پوچھا "کیا ارادہ ہے کنور؟"

"گنیش، رامو ان نوکیلی کیلوں کو دیکھ دیکھ کر ڈر رہا ہے اسی لئے وہ پھاٹک میں اپنی مستک سے ٹکر نہیں مار رہا ہے۔ میں اس جگہ ان کیلوں کو پکڑ کر لٹک جاؤں گا جہاں رامو کی مستک کی ٹھوکر پڑے گی اور پگڑی سے اپنے کو ڈھک لوں گا تاکہ کیلیں بالکل چھپ جائیں۔ پھر رامو کی ایک ہی ٹکر میں یہ پھاٹک ٹوٹ جائے گا تم سپاہی لے کر بھیا کی مدد کو گڑھی کے اندر گھس پڑنا۔" کنور نے کہا۔

"کنور یہ کام مجھے کرنے دو۔ تم رامو کے ہودے میں جا بیٹھو۔ میں تمہاری جگہ لوں گا۔ تم رامو کو ہمت دلا کر آگے بڑھانا۔" گنیش جوش سے بے اختیار ہو کر بولا۔

"نہیں نہیں گنیش، بھیا کے لئے یہ کام میں کروں گا۔" کنور نے کہا۔

"کنور، میں تمہارے سیناپتی کا بیٹا ہوں۔ اندر کوٹ کی سینا کا ہونے والا سیناپتی۔ کنور، اگر آج میں تم سے پیچھے رہ گیا تو ہماری دوستی پر دھبہ لگ جائے گا۔ میرے پتا کی آنکھیں تمہارے پتا جی کے سامنے جھک جائیں گی۔ سارے راجپوت مجھے بزدل اور بے وفا کہیں گے۔" گنیش نے اسی جوش میں کہا۔

زمین دہل رہی تھی۔ مہاوت کانپ رہا تھا۔ سامنے خونخوار آہنی کیلیں بہادر گنیش سنگھ کے پیچھے چھپ چکی تھیں۔ کنور کی پگڑی سامنے سے اس کے جسم کو ڈھکے تھی۔ صرف اس کا منہ کھلا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بہادرانہ مسکراہٹ تھی۔ آنکھیں کنور کے چہرے پر جمی تھیں۔ ان سے وفاداری اور جاں نثاری ٹپک رہی تھی۔ کنور سسکنے کے عالم میں اپنے وفادار رفیق کا

اتر پردیش کی نئی حکومت

اتر پردیش کی نئی حکومت نے ۷؍ دسمبر ۱۹۶۰ء کو حلف وفاداری
اٹھایا ان صفحات پر اس حکومت کے اراکین کی تصویریں شائع
کی جا رہی ہیں

سری چندر بھان گپتا
وزیر اعلیٰ اتر پردیش

سری حکم سنگھ
وزیر مال و انصاف

سری چرن سنگھ
وزیر پولیس و زراعت

سری منگلا پرساد
وزیر ریاست برائے امداد باہمی

سری مظفر حسن
وزیر ریاست برائے نقل و حمل

سری رام مورتی
وزیر ریاست برائے آبپاشی

آچاریہ جگل کشور

وزیر تعلیم

سریمتی سچیتا کرپلانی

وزیر محنت

سری کیلاس پرکاش

وزیر ریاست برائے لوکل سیلف گورنمنٹ

ڈاکٹر سیتا رام

وزیر ریاست برائے آبکاری

ڈاکٹر جواہر لال روہتگی
نائب وزیر

سری رؤف جعفری
نائب وزیر

سری شانتی پرپن
نائب وزیر
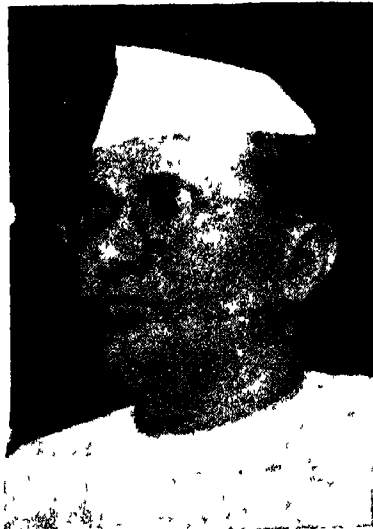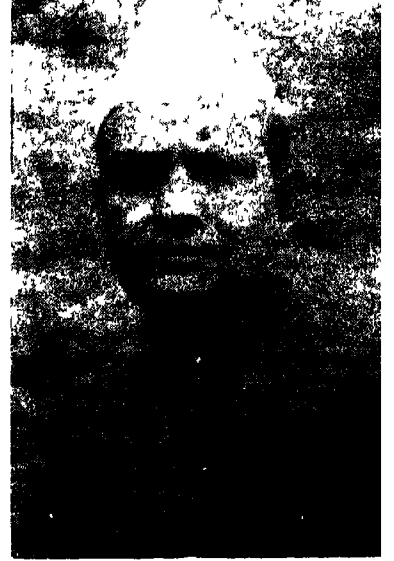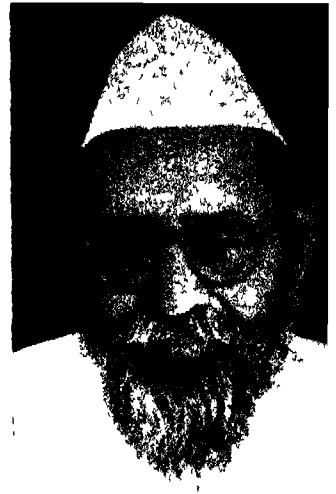
سرمتی پرکاش وتی سود
نائب وزیر

اترپردیش کی نئی حکومت ــــ وزرا کے مختصر سوانح حیات

اترپردیش کی نئی وزارت نے شری چندر بھان گپتا کی قیادت میں ۷ دسمبر ۱۹۶۰ء کو حلف وفاداری اٹھایا۔ وزرا کے مختصر سوانح حیات مع قلمدان وزارت درج ذیل ہیں۔

شری چندر بھان گپتا

اترپردیش کے نئے وزیر اعلیٰ شری چندر بھان گپتا موضع کولی ضلع علی گڑھ میں ۱۴ر جولائی ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ لکھیم پور کھیری میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کانگریس سے ان کی وابستگی ۱۹۱۶ء سے شروع ہوئی جبکہ وہ لکھنؤ کانگریس کے تاریخی اجلاس کو دیکھنے کے لئے لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے اسناد حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں وکالت شروع کی اور مشہور کاکوری مقدمہ میں وکیل صفائی کی حیثیت سے نمایاں رول ادا کیا۔ ریاستی کانگریس کمیٹی اور کل ہند کانگریس کمیٹی کے ۱۹۲۶ء سے ممبر رہے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک کی اور ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۲ء میں قومی تحریکوں کے سلسلہ میں جیل گئے۔ ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے کورٹ اور کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۷ء میں اس کے خزانچی منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ میونسپل بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۶ء میں ریاستی قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں پارلیمنٹری سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں وزیر غذا اور رسد مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں محکمہ صحت کا بھی چارج لے لیا۔ پنڈت پنت کے مرکز چلے جانے کے بعد تشکیل شدہ ڈاکٹر سمپورنانند کی وزارت میں ان کو منصوبہ بندی اور صحت کے محکمے سپرد کئے گئے۔ ۱۹۵۷ء تک وزیر غذا اور رسد، صحت، منصوبہ بندی اور صنعت رہے۔ ماہ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں یو پی کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔

شری گپتا کے پاس عام نظم و نسق۔ منصوبہ بندی۔ صنعت۔ بجلی۔ اطلاعات۔ مالیات۔ غذا اور رسد۔ صحت عامہ۔ تعمیرات عامہ اور جنگلات کے محکمہ جات ہیں۔

ٹھاکر حکم سنگھ

ٹھاکر حکم سنگھ ۱۸۹۲ء میں ضلع بہرائچ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ بہرائچ اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے اور ۱۹۲۰ء میں ایل ایل بی کے اسناد حاصل کئے۔ اگست ۱۹۲۰ء میں وکالت شروع کی۔ ۹ سال تک ڈسٹرکٹ بورڈ بہرائچ کے اور کچھ مدت کے لئے بہرائچ میونسپل بورڈ کے رکن رہے۔ ۱۹۳۲ء میں قومی تحریک میں حصہ لینے پر جیل گئے۔ ۱۹۳۷ء میں لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اگست ۱۹۳۷ء میں پارلیمنٹری سکریٹری (مال) مقرر ہوئے۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۹ء کو اس سے مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء میں انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ لے کر جیل گئے۔ ۱۹۴۲ء میں نظربند ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۹ر اگست ۱۹۴۶ء کو وزیر محکمہ مال و جنگلات مقرر ہوئے۔ اسمبلی اور کونسل میں خاتمہ زمینداری بل پیش کیا۔ پہلے عام انتخابات میں ضلع بہرائچ کے قیصر گنج جنوبی حلقۂ انتخاب سے ریاستی اسمبلی کے لئے منتخب ہوئے۔ مئی ۱۹۵۲ء میں وزیر صنعت مقرر ہوئے اور ۲۸ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو ڈاکٹر سمپورنانند کی کابینہ میں وزیر محکمہ زراعت و امداد باہمی و بحالیات مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں عام انتخابات کے بعد یو۔ پی کابینہ میں دوبارہ وزیر مقرر ہوئے۔

نئی کابینہ میں وزیر انصاف۔ لیجسلیٹو مال۔ امداد و بحالیات مقرر کئے گئے ہیں۔

شری چرن سنگھ

شری چرن سنگھ ۱۹۰۲ء میں نورپور ضلع میرٹھ میں ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں آگرہ کالج سے ایم اے پاس کیا۔ ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد غازی آباد میں ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۵ء تک وکالت کی پھر میرٹھ چلے آئے۔ ۱۹۲۹ء میں کانگریس میں شامل ہوئے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک میرٹھ ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیرمین رہے۔ ۱۹۳۷ء میں یوپی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ جنگ آزادی میں سرگرم حصہ لیا اور تین تحریک میں حصہ لینے پر ۱۹۳۰ء، ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۲ء میں جیل گئے۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک میرٹھ ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر یا جنرل سکریٹری رہے۔ ۱۹۴۶ء میں ضلع میرٹھ کے ایک حلقہ انتخاب سے یوپی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۹ء سے مارچ ۱۹۵۶ء تک یوپی لیجسلیچر کانگریس پارٹی کے جنرل سکریٹری رہے۔ ۲۴ اپریل ۱۹۴۶ء کو پال[illegible] اپریل ۱۹۴۶ء سے ستمبر ۱۹۴۷ء تک ٹاؤن و دیہی سلطنت، ستمبر ۱۹۴۷ء سے اپریل ۱۹۴۸ء تک انصاف، اپریل ۱۹۴۸ء سے جون ۱۹۵۰ء تک [illegible] لیجسلیٹو اور جون ۱۹۵۰ء سے محکمہ اطلاعات کے پارلیمنٹری سکریٹری رہے۔ ۴ جون ۱۹۵۱ء کو وزیر انصاف مقرر ہوئے۔ جون سے ۹ اگست ۱۹۵۱ء تک وزیر اطلاعات اور ۹ اگست ۱۹۵۱ء سے وزیر زراعت، نگہداشت مویشیان و اطلاعات رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ایک کتاب بعنوان "خاتمہ زمینداری" تصنیف کی۔ خاتمہ زمینداری و اصلاح آراضی ایکٹ کے مرتب کرنے میں سرگرم حصہ لیا۔ بھومی داری اسکیم کے خالق ہیں۔ پہلے عام انتخابات میں باغپت مغربی (میرٹھ) کے حلقہ انتخاب سے یوپی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ مئی ۱۹۵۲ء میں دوبارہ وزیر مال و زراعت مقرر ہوئے۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۵۴ء کو ڈاکٹر سمپورنانند کی کابینہ میں دوبارہ وزیر مال و نقل و حمل مقرر ہوئے۔ سمپورنانند کابینہ سے اپریل ۱۹۵۹ء میں مستعفی ہوگئے۔

نئی کابینہ میں وزیر پولیس، زراعت اور نگہداشت مویشیان مقرر ہوئے ہیں۔

آچاریہ جگل کشور

آچاریہ جگل کشور اپریل ۱۹۰۰ء میں موضع سیٹھر ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ کلکتہ، نینی تال اور ہندو کالجیٹ اسکول وارانسی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۱۷ء میں آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۱۷ء میں ہندوستان واپس آئے۔ گجرات ودیاپیٹھ، احمد آباد، سابرمتی آشرم اور بستی میں ادھیری کے مقام پر ایک ادارے میں ملازمت کی۔ ۱۹۲۲ء میں خالصہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب سے چلے آئے اور چند ماہ سابرمتی آشرم میں کام کیا۔ ۱۹۲۷ء میں گاندھی آشرم یوپی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں پریم مہاودیالیہ برندابن کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں جلیانوالہ باغ کے شہیدوں کی یاد میں قومی ہفتہ منانے کے سلسلہ میں نمک ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۲ء میں دوبارہ گرفتار ہوئے اور چند ہفتوں کے بعد رہا کردیے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلہ میں ۶ ماہ قید کی سزا ہوئی۔ رہائی کے بعد مغربی یوپی کی ہریجن سہایک سنگھ کے صدر کی حیثیت میں ہریجنوں کی فلاح و بہبود کے کام میں لگ گئے۔ ۱۹۴۰ء میں انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ لینے پر ایک سال قید کی سزا ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قائم مقام جنرل سکریٹری مقرر ہوئے اور ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" کی قرارداد کے بعد دوبارہ اس عہدہ پر فائز ہوئے۔ دہلی میں انڈر گراؤنڈ کام کرتے ہوئے گرفتار کرلیے گئے اور جولائی ۱۹۴۵ء تک نظربند رہے۔ ۱۹۲۲ء میں پنجاب کانگریس کمیٹی اور کل ہند کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری رہے۔ ۱۹۵۰ء میں یوپی کانگریس کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں یوپی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں پہلی کانگریس وزارت میں پارلیمنٹری سکریٹری مقرر ہوئے اور یوپی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ ۱۹۵۱ء میں یوپی کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کے صدر رہے۔ ۱۹۵۲ء کے پہلے عام انتخابات میں ریاستی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۴ء تک لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔

ڈاکٹر سمپورنانند کی کابینہ میں ۱۹۵۴ء میں وزیر محکمہ محنت و سماجی بہبود مقرر ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں اس کابینہ سے مستعفی ہوگئے۔

نئی کابینہ میں وزیر تعلیم اور سماجی فلاح مقرر ہوئے ہیں۔

شری منگلا پرشاد

شری منگلا پرشاد ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ضلع بنارس میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات میں حصہ لیا اور اسی سال آل انڈیا اسٹوڈینٹ فیڈریشن کی مجلس عاملہ کے ممبر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں ان طلبا میں سے ایک تھے جن کو برطانوی حکومت نے سزا دی۔ بعد ازاں گاندھی آشرم الہ آباد کے وائس پریسیڈنٹ ہوئے۔ رائے بریلی اور پرتاپ گڑھ اضلاع میں کسانوں کی

تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ ۳۱-۱۹۳۰ء میں دوسری تحریک سول نافرمانی اور ۱۹۴۱ء میں انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔

یوپی صوبائی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کانگریس والنٹیر کور کے انچارج اور کل ہند کانگریس کمیٹی کے ممبر رہے الہ آباد میونسپلٹی اور امپرومنٹ ٹرسٹ کے کچھ سال تک ممبر رہے۔ ۱۹۴۵ء میں یو۔ پی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے بعد ازاں کانگریس پارٹی کے چیف وہپ بنے۔ اس کے بعد پارلیمنٹری سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں دوبارہ ریاستی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور نائب وزیر امداد باہمی مقرر ہوئے ۱۹۵۷ء میں پھر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے آپ کل پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن مالکن جی باڑی اور یو پی اولمپکس کے صدر ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں وزیر ریاست امور داخلہ ساری اور ہریجن فلاح مقرر ہوئے۔ اور نومبر ۱۹۵۸ء میں مستعفی ہو گئے اس کے بعد یو پی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں یو۔ پی کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے نئی کابینہ میں وزیر ریاست برائے امداد باہمی مقرر ہوئے ہیں۔

شریمتی سچیتا کرپلانی

ماہ جون ۱۹۰۸ء میں انبالہ (پنجاب) میں پیدا ہوئیں۔ دہلی یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اچاریہ جے۔ بی کرپلانی سے شادی ہوئی۔ ڈیڑھ برس تک انڈین نیشنل کانگریس کے شعبہ خواتین اور شعبہ امور خارجہ کی سکریٹری رہیں ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۴ء میں کانگریس کی تحریکوں میں شرکت کرنے پر جیل یاترا کی ۴۷-۱۹۴۵ء میں کستوربا گاندھی نیشنل میموریل ٹرسٹ کی تنظیمی سکریٹری۔ انڈین نیشنل کانگریس کے شعبہ امداد کی سکریٹری ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی اور ۱۹۴۸ء میں یو۔ پی قانون ساز اسمبلی کی ممبر ۱۹۴۹ء میں ادارہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ہندوستانی وفد کی ممبر ۵۲-۱۹۵۰ء عارضی پارلیمنٹ اور ۵۶-۱۹۵۲ء میں پہلی لوک سبھا کی ممبر رہیں۔ چند برسوں کے لئے پرجا سوشلسٹ پارٹی سے وابستہ رہیں صنعتی مالیاتی کارپوریشن سے متعلق تحقیقاتی کمیٹی کی چیرمین اور نومبر ۱۹۵۴ء میں ترکی کو بھیجے گئے پارلیمانی وفد کی لیڈر تھیں۔

لوک سبھا کی ۱۹۵۷ء میں دوبارہ ممبر منتخب ہوئیں۔ آپ کے تفریحی مشاغل موسیقی اور مصوری ہیں۔ آپ نے ۱۲ دسمبر ۱۹۶۰ء کو حیثیت وزیر کے حلف وفاداری اٹھایا اور محنت، گھریلو صنعت اور اجتماعی ترقی کے محکمے اُن کے سپرد ہوئے ہیں۔

شری مظفر حسین

شری مظفر حسین ۲۲ جولائی ۱۹۰۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ طالب علمی کے زمانہ میں مسز اینی بسنت کی ہوم رول لیگ میں رضا کار بھرتی ہوئے دسمبر ۱۹۲۱ء میں نو ماہ کی قید بامشقت کی سزا ہوئی ۱۹۲۱ء اور ۱۹۴۲ء کی درمیانی مدت میں نو بار گرفتار ہوئے اور نظر بند ہوئے بنگال کے جیلوں میں بھی قید رہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے ماتحت بارہ برس تک سٹی کانگریس کمیٹی الہ آباد کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک صوبائی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری اور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک نائب صدر رہے۔ ۲۵ برس تک کل ہند کانگریس کمیٹی کے ممبر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ شہر سے یو پی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء میں الہ آباد جنوبی شمالی حلقہ انتخاب سے اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر سمپورنانند کی کابینہ میں وزیر تحفظ مقرر ہوئے ۱۹۵۸ء میں کابینہ سے مستعفی ہو گئے

نئی کابینہ میں وزیر ریاست برائے نقل و حمل اور مسلم اوقاف مقرر ہوئے ہیں۔

شری رام مورتی

شری رام مورتی ۱۹۱۰ء میں موضع دھورا ضلع بریلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کی سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا اس زمانہ میں دوبارہ جیل گئے حالانکہ وہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ ۱۹۳۳ء میں بنارس یونیورسٹی سے بی اے کی سند حاصل کی لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور ایل ایل بی کی اسناد لیں

۴۶-۱۹۳۹ء میں ضلع کانگریس کمیٹی بریلی کے جنرل سکریٹری رہے۔ ۱۹۳۹ء سے یو پی کانگریس کے ممبر ہیں۔ اس وقت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر ہیں۔ ۴۱-۱۹۴۰ء میں انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ لینے پر ڈیڑھ سال کی سزا ہوئی۔ ۸ اگست ۱۹۴۲ء سے دسمبر ۱۹۴۴ء کے آخر تک ۱۹۴۲ء کی تحریک کے سلسلہ میں نظر بند رہے۔ ۱۹۴۶ء میں بریلی کے شمالی دیہی حلقہ انتخاب سے یو۔ پی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ۱۹۵۲ء میں دوبارہ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ۵۲-۱۹۵۰ء میں یو۔ پی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ اور حکومت میں شامل ہونے کے قبل تک اس عہدے پر فائز تھے ۱۹۵۲ء

میں نائب وزیر آبپاشی ہے
وزیر عام انتخابات کے بعد وزیر ریاست برائے آبپاشی مقرر ہوئے ۱۹۵۹ء میں کانگریس منسٹری بنی
کی کابینہ میں وزیر ریاست برائے آبپاشی مقرر ہوئے ہیں۔

سری کیلاش پرکاش

سری کیلاش پرکاش ۱۹۰۹ء میں پرکیشت گڑھ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے
ہائی اسکول سے ام۔ ایس سی تک تمام درجوں میں پاس آئے۔ ۱۹۳۱ء کی
تحریک عدم تعاون میں شرکت سے سیاسی زندگی کا آغاز ہوا ۱۹۳۱ء سے
۱۹۳۲ء تک جیل گئے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک دس۔ ان کالج
میرٹھ کے وائس پرنسپل رہے۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۲ء تک یوپی کونسل کے ممبر رہے۔
۱۹۵۲ء میں یوپی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے جنوری ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر سمپورنانند
کی کابینہ میں نائب وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں نائب وزیر
تعلیم مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں مستعفی ہو گئے۔

سی کابینہ میں وزیر ریاست برائے لوکل سیلف گورنمنٹ اور تجارت مقرر ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر سیتا رام

ڈاکٹر سیتا رام ۱۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ضلع دیوریا
میں حاصل کی۔ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ ایگریکلچر کالج کانپور میں داخلہ لیا اور وہاں
سے ۱۹۴۳ء میں بی۔ ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں حکومت ہند
نے مابعد جنگ تعمیر اسکیم کے تحت غیر ممالک بھیجنے کے لئے منتخب کیا ۱۹۴۶ء
میں وسکونسن یونیورسٹی سے ام۔ ایس۔ سی کی ڈگری اور ۱۹۴۹ء میں اوہیو
اسٹیٹ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں
ہندوستان لوٹ آئے متعدد غیر ممالک کا جن میں سنگاپور۔ چین۔ جاپان۔ امریکہ
کینیڈا۔ انگلینڈ۔ فرانس۔ مغربی جرمنی۔ سوئزرلینڈ۔ آسٹریلیا۔ بلجیم۔ ہنگری
اور یونان شامل ہیں دورہ کیا۔

۱۹۵۰ء میں حکومت ہند کے محکمہ بارابی آراضی کے ڈپٹی ڈائرکٹر مقرر
ہوئے۔ پہلے عام انتخابات میں ضلع دیوریا سے ریاستی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب
ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں وزیر تعلیم کے پارلیمنٹری سکریٹری اور ۱۹۵۴ء میں نائب
وزیر تعلیم و ہریجن سہایک مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں وزیر ریاست برائے آبکاری
اور نقل و حمل مقرر ہوئے

سی کابینہ میں وزیر ریاست برائے آبکاری اور نقل و حمل مقرر
ہوئے ہیں۔

حیدرآباد کا ایک قدیم شاعر ــــ محمد صدیق قیس

(بسلسلۂ صفحہ ۱۲)

تو معرکہ دشت بلا کا ہے عنصر اور باپ ترا ہے گا مددگار پیمبر
سب ہیں عاشق ترے جوں عاشق مصطفیٰ خوش کیوں نہ ہو تیرے سے کھلا حاتم اکبر
یہ وقت مدد کا ہے مدد کیجئے عباس
دشمن کو مرے جلدی سے دیکھئے عباس

والشمس ترے چہرہ پہ سو جان سے قرباں واللیل ترے گیسو کا دیتا ہے نشاں
ہے جیسا نہ منیں مہر سوت سے نمایاں یوں خط ترے چہرہ پہ جوں جدول قرآں
یہ وقت مدد کا ہے مدد کیجئے عباس
دشمن کو مرے جلدی سے دیکھئے عباس

توقیر جو تری ہے وہ توقیر علی ہے باتوں میں نکلتی ترے تقریر علی ہے
جو تیری کمر میں ہے وہ شمشیر علی ہے ملتی تری تصویر سے تصویر علی ہے
یہ وقت مدد کا ہے مدد کیجئے عباس
دشمن کو مرے جلدی سے دیکھئے عباس

تو وہ ہے جگر گوشہ داماں رسالت تو منبع الطاف و کرم بحر سخاوت
تو رونق بستان جہاں باغ ولایت تو خانہ دیں شمع حرم ابر کرامت
یہ وقت مدد کا ہے مدد کیجئے عباس
دشمن کو مرے جلدی سے دیکھئے عباس

اس انتخاب سے قیس کے کلام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے غزلیات
ریختی۔ اور قصائد نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ شاعری میں قیس کو صف اول میں جگہ نہ
دی جائے تو کم از کم شعراء کے دوسری صف میں اس کو ممتاز مقام پہ
رکھا جا سکتا ہے۔

انعامی بانڈوں کے نتائج

ذیل میں انعامی بانڈوں کی دوسری سہ ماہی کی قرعہ اندازی کے نتائج درج کیے جاتے ہیں جو یکم دسمبر ۱۹۶۰ء کو منعقد ہوئی تھی

سیریز "اے" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵ روپے کا ایک انعام

۰۹۲۷۶۴

۱۰۰۰۰ روپے کے دو انعامات

۰۱۳۲۶۴ ۵۵۱۹۰

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۱۴۳۹۷ ۵۷۱۵۳ ۵۷۰۰۷۹ ۹۰۳۵۹ ۹۳۵۹۶

۱۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۰۲۲۲۲ ۷۱۵۷ ۰۷۲۲۳ ۸۳۳۰ ۲۳۱۲۰

۰۳۹۳۸ ۰۳۸۰۷۷ ۵۲۵۴ ۶۹۳۲۹ ۰۷۳۵۹۴

۰۷۶۲۳۵ ۰۰۹۶۹

۵۰۰ روپے کے ۳۰ انعامات

۶۷۱۱ ۱۸۵۲۹ ۲۴۵۵۹ ۲۶۲۶۷ ۲۷۵۴۱

۰۴۲۰۹۲ ۴۲۵۰۵ ۰۳۳۲۸۶ ۰۴۵۶۰ ۴۵۶۵۹

۰۵۲۹۲ ۵۲۸۸۴ ۵۵۸۹۴ ۵۷۲۲۱ ۶۴۱۶۳

۰۶۴۲۷۶ ۷۱۶۱۰ ۷۲۵۴۴ ۰۹۶۴۸۱ ۹۷۲۸۸

سیریز "بی" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵ روپے کا ایک انعام

۲۹۷۰۹

۱۰۰۰۰ روپے کے دو انعامات

۲۲۸۱۴ ۰۹۱۴۷۲

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۱۹۵۵۵ ۰۲۲۵۲۰ ۰۳۰۵۴۰ ۷۵۹۱۳ ۸۵۱۰۱

۱۰۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۰۰۷۲۲۲ ۰۱۱۵۱۱ ۱۷۲۳۵ ۲۱۷۱۷ ۳۶۲۵۸

۰۲۹۵۱۶ ۰۴۷۳۸۲ ۵۸۳۷۹ ۶۴۲ ۷۴۹۲۱

۰۸۲۶۷۰ ۰۸۷۹۰۲

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۱۲۳۰ ۰۱۸۸۰ ۰۰۷۰۷۶ ۰۱۷۱۴۴ ۱۹۲۴

۰۲۱۰۵۸ ۰۲۳۶۹۱ ۰۳۰۳۵۴ ۳۵۶۴۰ ۳۵۶۹۴

۰۴۹۵۶ ۰۵۵۲۰۵ ۰۶۰۶۴۰ ۶۳۴۵ ۰۶۷۹۵۵

۶۷۴۹۷ ۰۹۸۴۱۸ ۷۳۷۶۲ ۸۵۴۶۶ ۰۹۷۴۹۲

سیریز "سی" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۰۹۰۶۵۶

۱۰۰۰۰ روپے کے دو انعامات

۲۵۵۸۲ ۰۹۵۸۹۱

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۰۰۱۷۸۱ ۰۰۸۶۱۷ ۰۲۷۱۲۷ ۰۴۲۱۸۴ ۴۸۱۷۱

۱۰۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۰۰۰۵۳۴ ۰۰۴۳۳۰ ۱۱۹۲۷ ۱۴۰۹۸ ۰۳۰۸۳۷

۰۲۴۳۴۲ ۴۴۳۸۲ ۴۴۵۱۱ ۴۹۱۷۲ ۶۲۸۱۴

۸۷۰۸۰ ۹۶۰۳۱

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۵۷۶۷ ۱۱۰۸۳ ۲۳۱۵۸ ۲۵۳۸۸ ۲۷۴۷۰

۲۹۵۰۹ ۳۸۳۶۲ ۳۹۴۷۶ ۳۹۵۲۷ ۳۹۶۰۲

۰۴۸۶۵۶ ۰۵۴۲۹۷ ۵۵۰۰۵ ۶۳۹۴۲ ۰۶۴۷۱۲

۰۷۰۶۴۲ ۷۵۲۲۷ ۷۹۷۴۰ ۰۸۱۴۶۰ ۰۸۲۶۱۳

سیریز "ڈی" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۰۶۹۸۸۶

۱۰۰۰ روپے کے دو انعامات

۸۸۷۹ ۸۲۳۲۰

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۱۳۴۷۰ ۲۱۰۱ ۳۳۲۹۲ ۴۸۹۶۸ ۰۸۲۵۲۱

۱۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۰۰۲۱۵ ۰۵۶۸۹ ۰۰۹۰۱۷ ۱۵۸۲۰ ۰۱۶۵۱۵

۰۳۲۹۶۸ ۳۳۲۴۸ ۴۴۹۱۹ ۷۰۷۶۷ ۷۷۴۹

۸۶۲۱۳ ۹۷۲۲۱

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۰۰۷۵۸ ۰۲۱۲۲ ۰۳۹۶۰ ۴۲۰۷ ۵۸۱۱

۰۱۹۱۱۰ ۱۹۰۲۷ ۳۸۷۶۶ ۲۹۵۸۸ ۰۴۰۲۷۱

۴۹۹۰۸ ۵۶۸۴۹ ۶۲۳۵۱ ۶۶۲۳۷ ۷۵۲۸۵

۰۷۷۰۱۷ ۷۷۲۴۴ ۸۹۲۸۸ ۹۷۱۸۴ ۰۹۹۸۰۰

سیریز "ای" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۰۲۱۰۰۳

۱۰۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۰۲۰۲۵۲ ۰۳۰۲۲۰

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۰۳۰۷۱۷ ۰۳۳۲۷۰ ۵۵ ۱۰ ۰۷۰۵۶۶ ۰۹۸۷۸۵

۱۰۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۱۵۲۶۶ ۰۲۳۹ ۰ ۲۶۰۹۹ ۰۲۱۰۸۲ ۲۹۵۷۳

۳۰۲۸۹ ۰۳۲۳۸۰ ۲۸۹۵۷ ۰۶۹۱۲۲ ۰۷۲۵۲۵

۸۷۸۵ ۹۱۱ ۶

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۱۲۹۶۶ ۱۶۷۸۸ ۰۱۹۱۵۶ ۲۰۷۷۴ ۰۲۷۰۸۶

۰۲۰۶۰۱ ۴۹۶ ۵ ۳۹۹۵۶ ۵۰۸۸۹ ۵۳۲۲۹

۰۵۸۸۹۲ ۵۹۷۱۴ ۰۶۲۵۳۲ ۶۳۹۰۲ ۶۸۱۲۵

۷۶۷۸۴ ۰۷۸۰۰۷ ۰۸۳۹۴۰ ۹۱۲۵۶ ۹۱۶۶۴

سیریز "ایف" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۵۱۷۴۳

۱۰۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۰ ۲۵۳۸ ۶۱۴۹۰

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۶۸۲۶ ۰۰۷۸۴۰ ۵۶۱۵۹ ۰۷۹۷۸۹ ۰۸۱۳۱۵

۱۰۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۲۱۸۲ ۴۲۹۲ ۵۲۲۲ ۰۹۷۵۲ ۰۱۲۲۲۸

۲۷۱۴۶ ۶۶۲۸۲ ۶۶۵۴۸ ۶۸۲ ۵ ۰۷۲۳۳۵

۷۵۱۷۴ ۷۹۵۶۲

۵۰۰ روپے کے ۳۰ انعامات

۰۶۳۰۰ ۱۵۸۹۲ ۱۹۲۱۷ ۰۲۱۳۰۱ ۳۰۴۴۳

۰۳۲۵۱۴ ۰۳۸۵۰۲ ۰۲۹۴۱۶ ۰۴۴۴۶۴ ۴۵۳۷۳

۴۵۵۶۱ ۴۶۲۲۹ ۴۸۱۲۲ ۶۵۹۵۴ ۸۰۲۷۵

۸۰۵۲۲ ۸۱۴۵۳ ۸۴۵۴۹ ۰۹۲۸۶۹ ۹۸۴۹۷

سیریز "جی" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۰۱۲۲۲۸

۱۰۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۰۰۶۰۹۲ ۰۲۷۴۹۸

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۰۲۶۹۶۲ ۰۳۱ ۹۹ ۰۳۶۶۱۸ ۰۶۷۱۳۹ ۰۸۲۲۲۵

۱۰۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۶۱۲ ۰ ۱۶۴۰ ۰۰۴۹۱۵ ۷۷۱۷ ۰۰۸۰۳۷

۱۷۱۴۱ ۳۱۲۶۴ ۰۳۳۱۵۵ ۴۹۶۶۱ ۶۴۴۸۳

۰۷۷۳۱۵ ۸۸۱۵۶

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۱۲۴۰۸ ۰۱۹۱۴۰ ۰۲۷۶۹۱ ۰۲۹۰۸۶ ۰۳۰۸۱۹

۳۱۶۸۹ ۰۳۶۲۳۹ ۰۴۹۱۲۱ ۰۵۰۱۸۳ ۰۵۱۲۰۰

۵۲۹۷۷ ۰۵۴۲۶ ۰۵۵۹۴۹ ۰۶۱۳۵۲ ۰۷۳۶۸۵

۰۷۴۳۵۱ ۰۸۳۹۱۰ ۸۶۱۳۱ ۰۸۹۲۵۲ ۹۵۶۲۵

سیریز "ایچ" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۱۸۷۷۵

۱۰۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۳۰۶۵ ۶۵۱۹۰

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۱۱۵۰۳ ۲۱۲۰۵ ۴۷۵۶۲ ۴۸۷۰۶ ۹۴۱۱۳

۱۰۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۱۷۳۷ ۳۰۹۹۰ ۰۲۲۱۸۷ ۰۲۸۲۲۶ ۰۳۶۰۳۷

۳۶۸۸۰ ۰۴۱۴۱۷ ۰۵۴۷۷۷ ۵۶۷۷۸ ۰۶۴۹۹۶

۶۷۹۶۴ ۹۳۴۲۹

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۰۰۴۱۷ ۰۱۰۲۹۵ ۰۱۷۶۳ ۰۱۸۵۸۲ ۱۸۳۱۱

۱۸۵ ۷ ۰۱۸۹۸۹ ۲۲۵۰۲ ۰۴۴۸۹۱ ۴۵۶۴۱

۵۳۱۴۶ ۵۵۳۳۶ ۰۶۵۱۲ ۶۹۱۰۵ ۰۳۲۸۱

۷۸۲ ۹ ۸۷۲۰۲ ۰۹۲۱۴۵ ۹۵۶۹۵ ۹۸۱۷۰

سیریز "جے" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۰۷۵۵۲۹

۱۰۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۰۱۵۱۸۳ ۰۱۶۶۰۷

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۰ ۹۴۱۱ ۰۴۲۲۷۴ ۵۵۸۵۶ ۰۸۳۶۲۵ ۰۸۹۳۵۲

۱۰۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۹۸۵۴ ۱۴۵۹۴ ۰۲۴۲۱۸ ۰۲۸۲۵۴ ۲۹۲۹۶

۰۲۲۷۴۷ ۰۲۵۴ ۵ ۰۵۰۵۸۶ ۵۸۸۷۱ ۶۰۰۳۷

۶۹۵۰۹ ۹۷۵۲۱

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۷۶۶۶ ۰۱۱۴۷۱ ۱۶۹۹۶ ۰۲۹۵۰۹ ۰۳۲۰۷۶

۴۶۶۷۸ ۲۸۵۲۴ ۰۴۷۷۸۶ ۰۵۶۴۸۲ ۰۶۴۹۷۴

۶۷۴۲۲ ۶۷۵۴۵ ۶۹۹۷۹ ۰۷۱۲۲۹ ۰۷۴۱۳۶

۰۸۰۷۷۴ ۰۹۲۵۵۹ ۰۹۲۲۴۹ ۰۹۲۸۵۹ ۰۹۶۸۳۲

سیریز "کے" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۰۵۱۸۱۲

۱۰۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۰۷۴۲۵۲ ۰۹۴۱۷۴

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۰۰۷۶۲۶ ۰۲۳۵۷۲ ۰۸۰۹۶۷ ۰۸۲۸۸۹ ۰۸۴۷۲۱

۱۰۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۰۰۲۹۸۹ ۰۰۷۱۹۰ ۰۱۲۲۳۶ ۰۱۳۱۷۲ ۰۱۵۲۹۱

۱۹۱۸۵ ۲۹۲۷۱ ۰۲۲۲۷۲ ۷۶۷۰۶ ۸۹۰۸۱

۹۴۵۱۵ ۰۹۵۱۶۲

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۰۳۱۸۷ ۰۰۷۵۱۵ ۲۷۲۰۷ ۰۳۳۵ ۳ ۰۵۲۹۷۷

۰۵۲۲۳۸ ۵۳۵۹۸ ۰۵۷۸۴۳ ۹۰۸۸۵ ۶۵ ۱۷

۰۶۷۱۳۳ ۰۷۰۲۲۹ ۷۸۲۵۳ ۰۸۱۱۰۰ ۰۸۱۶۵۷

۰۸۷۳۶۵ ۸۸۶۸۳ ۰۹۰۰۸۶ ۰۹۱۵۵۱ ۰۹۶۲۷۷

سیریز "ایل" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۰۷۷۷۹۲

۱۰۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۰۵۲۲۵۵ ۰۶۲۵۷۰

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۰۱۵۲۲۹ ۰۲۸۳۰۰ ۷۰۶ ۹ ۸۲۵۱۶ ۹۵۷۵۲

۱۰۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۰۰۱۸۲۴ ۱۸۵۲ ۰۰۳۵۸۸ ۰۰۳۹۹۰ ۰۲۷۲۷۲

۲۸۲۹۷ ۰۵۵۳۶۷ ۰۶۷۱۱۳ ۷۲ ۵۸ ۷۸۶۶۸

۸۳۲۲۲ ۹۹۸۲۲

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۱۳۳۷۵ ۲ ۳۶ ۰۲۲۵۱۶ ۲۶۸۲۳ ۳۰۹۸۶

۰۳۲۱۶۵ ۳۳۱۶۱ ۵۱۷۵۲ ۵۳۱۱۹ ۶ ۱۸۱

۶۱۶۹۵ ۶۳۲۷۷ ۰۶۳۸۰۲ ۶۹۱۹۰ ۸۲۷۳۸

۰۸۶۹۳۱ ۸۷۸۳۹ ۹۱۱ ۸ ۹۶۶۲۸ ۹۸۲۹۶

سیریز "ایم" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام — ۰۲۲۷۸۹

۱۰۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۰۱۳۱۳۶ ۲۶۳۲۲

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۰۱۳۷۸۸ ۰۲۰۶۶۸ ۲۹۷۷۸ ۷۳۳۱۵ ۰۸۸۰۱۰

۱۰۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۰۰۱۵۹ ۰۱۵۷۳ ۰۲۵۳۲ ۰۷۹۳۰ ۰۰۹۵۷۲

۰۲۶۱۰۶ ۰۳۶۰۳۲ ۰۵۵۳۳۵ ۵۹۵۹۵ ۰۸۰۷۷۶

۸۱۲۳۵ ۹۷۶۶۶

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۰۰۱۲۷ ۱۳۵۲۷ ۱۳۷۹۳ ۰۱۵۹۱۲ ۰۱۷۹۵۰

۰۲۱۵۸۹ ۳۳۳۶۷ ۰۳۵۰۶۸ ۳۰۳۹۳ ۳۳۳۷۲

۳۷۵۶۳ ۵۳۱۸۹ ۵۹۰۵۳ ۰۵۹۰۸۲ ۶۱۸۶۷

۶۶۸۵۲ ۷۱۹۶۲ ۰۷۹۹۱۳ ۰۹۲۸۹۲ ۹۳۵۳۲

سیریز "کیو" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۲۸۰۶۰

۱۰۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۵۲۲۷۵ ۵۳۱۷۳

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۳۰۳۰ ۰۱۲۱۵۳ ۲۱۷ ۶ ۰۲۲ ۵۸ ۹۳۹۶۹

۱۰۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۱۱۲۵۳ ۰۱۳۸۶۹ ۰۲۳۷۶۱ ۰۳۳۲۹۲ ۰۳۶۶۱۳

۰۳۸۲۷۵ ۳۸۳۳۹ ۵۱۳۳۷ ۰۵۳۱۰۱ ۷۲۷۸۲

۷۹۲۲۲ ۸۲۹۳۹

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰ ۷۸۸ ۶۲۸۵ ۲۱۵۵۵ ۰۲۲۹ ۲۸۹۸۰

۲۳۲۹۲ ۲۸۱۲۳ ۰۳ ۸۱۳ ۳۶۲۸۷ ۵۲۶۲

۰۵۹۱۳۰ ۶۶ ۳۰ ۰۷۰ ۶۲ ۰۷۲۱۳۹ ۷۲۵۳۳

۸۲۷۲۹ ۸۵۲۲۲ ۹ ۰۲۶ ۹۵۷۲۲ ۹۶۷۵۶

سیریز "یو" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۰۲۸۳۲۲

۱۰۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۰ ۲۱۳۸ ۵۳۳۹۷

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعامات

۵۰۳۰ ۱۷۱۸۹ ۰۶۳۷۲۵ ۶۹۱۱۰ ۰۸۶۳۵۰

۱۰۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۱۱۲۸ ۰۶۲۷۲ ۰۸۰۷۹ ۰۹۵۹ ۰۱۱۶۷۶

۰۲۲۱۲۹ ۰۲۸۰۲۲ ۰۲۵۱۵۵ ۰۳۲۲۸۳ ۳۸۳۹۱

۰۶۵۷۲۵ ۹۸۳۸۶

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۲۸۰۲ ۰۳ ۰۲ ۰۱۶۸۳۰ ۰۱۸۰۳۲ ۰۱۸۵۶۳

۰۲۰۹۷۹ ۲۶۳۷۹ ۲۷۷۱۱ ۰۳۶۳۷۶ ۰۳۶۶۹۸

۰۳۱۶۲۰ ۵۳۳۹۵ ۵۹۱۷۹ ۰۶۲۳۹۳ ۰۶۳۰۰۳

۶۵۲۲۷ ۶۶۷۳۳ ۷۳۷۲۱ ۰۹۲۳۲۲ ۰۹۷۵۰۲

سیریز "ڈی" کے ۱۰۰ روپے کے بانڈ پر

۲۵۰۰۰ روپے کا ایک انعام — ۰۸۶۲۷۱

۱۰۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۰۳۳۷۸۵ ۰۶۰۷۲۷

۵۰۰۰ روپے کے ۵ انعات

۰۱۳۱۱۳ ۳۱۲۵۵ ۰۵۰۶۶۰ ۵۳۱۳۱ ۰۷۲۳۵۸

۱۰۰ روپے کے ۱۲ انعامات

۱۲۶۲۴ ۰۲۳۰۵۹ ۲۷۳۹۳ ۰۲۹۹۲۶ ۰۳۰۶۳۱

۰۵۱۸۶۵ ۰۵۲۱۳۷ ۵۴۴۱۳ ۶۲۳۸۲ ۸۳۶۸۴

۰۸۶۰۱۷ ۰۹۱۳۹۳

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۰۶۰۰ ۰۳۱۷۷ ۰۰۸۵۲۳ ۲۸۸۱۲ ۲۷ ۸۴

۲۰۲۲۰ ۰۳۰۹۲ ۳۹۷۰۲ ۳۱۸۱۵ ۳۲۳۶

۳۸۹۶۳ ۵۰۰۶۱ ۵۴۲۷۲ ۰۵۹۷۵۴ ۶۳۲۲۸

۰۷۵۲۹۹ ۸۴۰۳۰ ۸۹۵۰۰ ۰۹۲۳۱۰ ۹۵۵۲۱

سیریز "اے اے" کے ۵ روپے کے بانڈز پر

۵۰۰ روپے کا ایک انعام

۱۲۶۶۶۳

۲۵۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۲۲۶۸۱۹ ۲۹۲۵۲۱

۱۰۰۰ روپے کے ۱۰ انعامات

۲۶۵۰۸۳ ۱۱۶۰۶۳ ۲۲۶۹۹۰ ۲۸۲۸۲۰ ۶۸۲۳۷۳

۸۰۵۱۸۷ ۸۵۳۹۳۳ ۸۸۵۳۱۹ ۸۹۵۲۰۳ ۹۷۲۳۲۱

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۳۱۵۰۱ ۱۸۸۱۸۲ ۲۱۴۸۵۰ ۲۰۸۹۶۴ ۲۸۴۳۶۵

۳۱۷۲۱۸ ۲۳۸۱۲۹ ۳۷۰۱۱۲ ۲۸ ۹ ۴ ۳۰۸۵۰۱

۶۲۴۴ ۳ ۶۹۳۷۸۵ ۷۲۹۹۶۹ ۷۵۰۷۳۰ ۷۷۴۰۸۴

۸۲۱۲۹۱ ۸۸ ۶۸ ۹۱۳۵۲۰ ۹۳۶۲۱۸ ۹۵۳۸۵۲

۱۰۰ روپے کے ۲۵ انعامات

۲۸۱۶۲ ۱۵۵۷۷۱ ۱۵۴۴ ۳ ۱۷ ۹۸۵ ۲۲۹۸۵۲

۲۲۷۲۳۸ ۲۵۱۵۸۵ ۲۹۱۷۱۵ ۲۹۸۷۳۰ ۳۳۰۶۱۹

۲۵۳۲۵۱ ۳۷ ۹۸۳ ۳۱۱۴۱۲ ۳۱۶۵۲۳ ۳۳۹۷۰۴

۵۳۵۸۲۴ ۵۲۱۲۹۲ ۶ ۳۵۲۲ ۶۱۱۷۹۰ ۷۲۰۰۹۱

۸۲۰۹۸۳ ۹۲۵۸۲۳ ۹۵۸۲۱۸ ۹۸۲۲۳۷ ۹۸۸۴۱۶

۵۰ روپے کے ۲۳۰ انعامات

۰۰ ۹۲۳ ۰۰۱۳۲۱ ۰۲۳۹۷۹ ۰۲۳۵۲۳ ۲۳۶۰۲

۲۳۷۸ ۰۲۵۲۵۲ ۰۲۶۶۰۳ ۰۲۹۳۷۲ ۰۲۵۲۶۲

۲۸۰۳۲ ۰۲۹۲۷۷ ۳۱۲۹ ۳۱۸۹۹ ۵ ۷۲۳

۵۳۳۲۸ ۹۲۱۵۷ ۰۶۲۳۱۰ ۴۹۶۹۳ ۷۵۲۹۴

۷۷۲۷۹ ۸۰۳۳۷ ۸۴۹۲۸ ۰۹۱۶۵۳ ۹۲۳۷۷

۹۵۲۹۷ ۹۹۶۹۹ ۱۱۳۸۱۸ ۱۱۵۱۵۶ ۱۳۶۹۸۲

۱۳۰۷۷۱ ۱۳۲۶۲۳ ۱۵۲۹۷۲ ۱۵۳۲۷۲ ۱۵۶۲۲۳

۱۶۰۲۵۶ ۱۶۱۵۳۱ ۱۶۶۵۲۷ ۱۶۸۵۳۲ ۱۶۸۷۷۷

۱۶۹۲۲۳ ۱۷۲۸۰۱ ۱۷۳۲۵۶ ۱۷۷۱۲۳ ۱۸۱۳۲۳

۱۸۲۱۸۲ ۱۸۳۲۱۰ ۱۸۵۱۲۰ ۱۸۹۳۳۱ ۱۹۰ ۰۸

۱۹۱۲۹۷ ۱۹۳۲۰۹ ۱۹۳۳۶۱ ۱۹۶۸۲۳ ۲۰۰۳۰۷

۲۰۱۰۹۶ ۲۰۳۷۲۷ ۲ ۲۷۹۳ ۲۱۰۶۸۷ ۲۱۲۹۷۰

۲۱۳۵۳۰ ۲۱۳۱۳۱ ۲۱۵۳۷۳ ۲۲۲۹۱۴ ۲۳۵۸۳۰

۲۲۷۹۷۲ ۲۳۲۳۰۹ ۲۳۹۹۳۹ ۲۵۵۹۸۰ ۲۵۸۱۶۵

۲۶۵۲۳۲ ۲۷۷۳۷۲ ۲۸۲۳۳۷ ۲۸۳۷۲۸ ۲۸۷۲۷۱

۲۹۶۰۳۱ ۲۹۹۷ ۳ ۳۰۱۲۶۹ ۳۰۲۲۶۱ ۳۰۸۲۶۸

۳۱۷۲۵۷ ۳۲۶۷۲۷ ۳۲۳۳۰۳ ۳۳۲۵۳۱ ۳۳۹۲۸۵

۳۵۲۲۹۸ ۳۶۵۲ ۳۶۵۹۰۳ ۳۶۶۳۹۳ ۳۷۳۹۸۳

۳۸۸۳۵۶ ۳۸۹۹۱۳ ۳۰۳۹۲۷ ۳۰۹۲۰۹ ۳۲ ۹۵۷

۳۲۳۲۵۱ ۳۲۵۰۵۹ ۳۲۶۱۹۳ ۳۳۰۳۱۳ ۳۳۳۲۰۹

۳۳ ۰۸۵ ۳۳۰۰۸۸ ۳۳۲۱۱۹ ۳۳۳۷۶۸ ۳۳۶۲۷۶

۳۳۶۳۹۵ ۳۳۸۹۹۱ ۳۵ ۶۶۰ ۳۵۹۲۲۵ ۳۶۱۱۶۵

۳۶۶۳۸۱ ۳۶۹۲۵۲ ۳۷۳۰۳۸ ۳۷۶۵۶۱ ۳۸۱۸۶۳

۳۸۸۵ ۳ ۳۸۹۶۶۳ ۳۹ ۳۵۹ ۵۰۰۱۳۸ ۵۰۰۶۳۹

۵۰۲۳۲۰ ۵۱۵۵۱ ۵۲۰۲۶۶ ۵۲ ۳۵۲ ۵۲۶۹۸۶

۵۳۱۲۲۳ ۵۳۳ ۲۳ ۵۳۷۳۳۶ ۵۵۳۷۳۸ ۵۵۵۲۲۳

۵۶۲ ۳۶ ۵۶۲۳۱۸ ۵۹۵۷۳ ۵۹۷۹۶۰ ۶۰۱۸۲۹

۶ ۲۱۸۲ ۶۱۶۵۸۱ ۶۱۷۲۰۳ ۶۲۰۲۹۸ ۶۲۹۹۲۳

۶۳۲۸۸۵ ۶۳۶۶۹۳ ۶۳۸۳۱۱ ۶۵ ۰۱۹ ۶۶۰۹۱۶

۶۶۳۹۰۳ ۶۶۸۰۶۱ ۶۷ ۹۱۲ ۶۷۳۹۱۹ ۶۸ ۳۲۲

۶۸۲۵۷۰ ۶۸۳۷۲۲ ۶۸۳۸۶۷ ۶۸۸۳۶۰ ۶۹۸ ۶۸

۷۰ ۶۲۳ ۷۰۲۸۲۲ ۷۰۳۸۳۷ ۷۰۷۷۱۷ ۷۱۰۱۵۶

۷۱۱۱۲۳ ۷۲۱۸۲۶ ۷۲۵۷۸۲ ۷۲۶۲ ۱ ۷۲۳۳۳۳

۷۲۵۲۷۸ ۷۳۲۶۲۸ ۷۳۴۲۹۶ ۷۳۷۶۷۸ ۷۵۷۹۵۳

۷۸۲۱۳۸ ۷۸۲۹۵ ۷۹۲۲۵۶ ۸ ۵۸۹۲ ۸ ۶۳۵۳

۸۰۶۳۹۷ ۸۱۵۲۸۲ ۸۱۷۹۵۶ ۸۱۹۳۸۳ ۸۲۲۸۷۶

۸۲۸۲۲۶ ۸۲۸۶۸۹ ۸۳۱۲۷۰ ۸۳۳۹۵۲ ۸۵۱۷۹۰

۸۵۳۹۹۳ ۸۵۶۰۰۱ ۸۶۷۲۷۲ ۸۷۲۳۵۸ ۸۷۵۷۶۵

۸۸۱۳۵۷ ۸۸۳ ۰۷ ۸۸۳۲۶۵ ۸۹۱۲۱۲ ۹ ۲۳۸۵

۹۰۷۶۱۱ ۹۰۷۹۱۷ ۹۱۳۷۱۳ ۹۱۷۲۶۷ ۹۱۸۶۶۰

۹۲۰ ۹۸ ۹۲۲۰۶۸ ۹۲۹ ۶۵ ۹۳۰۲۶۷ ۹۳۵۱۹۹

۹۳۸۱۲۸ ۹۵۱۰۸۷ ۹۵۹۰۳۰ ۹۶۰۹ ۵ ۹۶۱۱۳۰

۹۶۲۶۸۵ ۹۶۳۳۵۰ ۹۷۰۵۸۳ ۹۷۰۹۰۳ ۹۷۷۱۳۹

۹۷۹۹۹۱ ۹۸۳۱۱۲ ۹۸۳۶۲۱ ۹۸۷۸۲۳ ۹۹۹۶۰۵

سیریز "اے بی" کے ۵ روپے کے بانڈز پر

۵۰۰ روپے کا ایک انعام

۰۳۶۲۳۵

۲۵۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۱۳۵۹۳۱ ۸۵۹۰۷۱

۱۰۰۰ روپے کے ۱۰ انعامات

۰۹۵۹۷۰ ۱۳۸۲۱۷ ۳۱۳۵۰۵ ۲۷۸۷۵۱ ۵۱۶۶۳۸

۸۵۲۵۷۵ ۸۷۵۷۳۶ ۹۱۶۵۹۵ ۹۲۰۰۳۳ ۹۶۷۱۷۸

۵۰۰ روپے کے ۳۰ انعامات

۰۲۰۹۱۸ ۰۹۷۷۶۸ ۹۹۳۵۶ ۱۲۰۸۴۹ ۲۷۰۹۵۳
۲۸۶۹۴۲ ۵۳۵۲۵۴ ۵۹۵۷۵۸ ۶۷۷۷۲۳ ۷۴۲۹۴۲
۷۴۷۳۰۰ ۸۱۶۳۹۶ ۸۶۲۵۴۴ ۸۶۶۷۲۹ ۹۰۵۸۱۰
۹۱۲۸۵۵ ۹۴۷۲۳۴ ۹۷۹۱۰۹ ۹۸ ۲۳۷ ۹۸۱۲۵۰

۱۰۰ روپے کے ۲۵ انعامات

۰۰۶ ۵۵ ۰۲۳۱۰۰ ۱ ۲۲۹۱ ۱ ۲۵ ۳ ۱۲۸۵
۱۳۸۲۵۴ ۱۴۸۸۲۳ ۱۸۰۴۵ ۱۸۴۷۸۱ ۲۸۴۷۵۶
۲۹۳۳۲۰ ۳۱۶۳۰۱ ۳۶۴۲۰۱ ۳۶۶۴۲۱ ۳۸۰۲۶۰
۴۹۸۹۶۷ ۵۸۴۵۵۴ ۶ ۸۳۸۸ ۶۹۲۵۵۵ ۷۰۷۶۹۵
۷۴۳۳۹۳ ۷۹۲۲۰۳ ۸۲۲۷۶۵ ۸۷۸۷۵۰ ۹ ۳۷۷۴

۵۰ روپے کے ۲۲۰ انعامات

۶۴۳۶ ۰۶۸۳۴ ۱۱۹۵۲ ۰۱۳۹۷۶ ۰۱۵۸۶۶
۰۱۸۵۶۰ ۱۹۴۳۲ ۲۵۹۸۲ ۰۲۶ ۴۱ ۳۷۲۳۲
۲۹۵ ۴ ۰۴۳۲۰۵ ۴۷۳۴۴ ۴۹۶۳۰ ۶۰۱۲۷
۶ ۶۶۲ ۰۶۸۴۱۱ ۷۵۴۲۳ ۷۸۲۲۲ ۸ ۲۹۹
۰۸۷۲۴۷ ۸۷۹۱۲ ۰۹۰۳۰۷ ۰۹۳۰۶۵ ۱۰۵۷۲۶
۱ ۷۵۶۳ ۱۱۲۴۹۶ ۱۱۳۵۷۰ ۱۱۳۵۸۶ ۱۱۷۶۸۵
۱۱۸۵۹۲ ۱۲۲۷۲۰ ۱۲۵۹۴۷ ۱۲۷۴۳۵ ۱۵۰۱۸۷
۱۵۷۹۴۵ ۱۶۰۷۴۶ ۱۶۱۲۶۰ ۱۶۱۹۸۳ ۱۶۲۲۰۷
۱۶۸۵۲ ۱۷۱۸۸۵ ۱۸۱۵۶۸ ۱۹۶۲۷۳ ۱۹۶۹۶۰
۲۰۲۸۹۱ ۲ ۳۰۶۳ ۲۰۸۹۳ ۲۱۶۷۲۰ ۲۱۸۱۸
۲۱۸۶۹۷ ۲۲۵۱۲۷ ۲۲۵۷۱۸ ۲۳۲۵۶۶ ۲۴۳۲۶۹
۲۴۴۷۰۹ ۲۴۷۵ ۵ ۲۴۸۶۲۷ ۲۵۰ ۱۵ ۲۶۳۵۵۰
۲۷۰۶۷۷ ۲۷۳۲۷۳ ۲۷۶۶۲۶ ۲۷۹۵۵۲ ۲۸۹ ۰۲
۲۹۲۳۰۹ ۲۹۲۷۴۷ ۳ ۳۱۲ ۳۱۳ ۹۶ ۳۲۹۲ ۶
۳۳۰۶۶۰ ۳۳۷۲ ۹ ۳۳۹۲۷۹ ۳۴۷۳۸۱ ۳۴۹۶۴۰
۳۸ ۱۰۷ ۳۸۹۲۳۳ ۳۹۳۰۶۶ ۳۹۹۲۳۲ ۴ ۷۰
۴۰۷۸۲۹ ۴۱۹۸۹۲ ۴۲۱۵۷۱ ۴۲۲ ۸۹ ۴۲۲۶۹۶
۴۲۵۶۴۸ ۴۴۷۲۰۸ ۴۴۹۱۵۸ ۴۴ ۴۵۷ ۴۴۷۴۷۸
۴۵۷۴۹۱ ۴۶۹۶۸۳ ۴۷۹۲۹۱ ۴۹۱۳۷۴ ۴۹۴۳۲۳
۴۹۵۱۴۷ ۴۹۶۴۳۶ ۵۰۲۱۸۹ ۵۱۳۴۲۰ ۵۱۷۹۱۶
۵۲۱۱۴۷ ۵۲۳۱۲۷ ۵۲۴۲۶۹ ۵۳۰۲۲۳ ۵۳۴۵ ۶
۵۳۶۹۸۸ ۵۴۰۸۰۳ ۵۴۶۵۰۱ ۵۴۷۲۳۳ ۵۴۹۸۲۹
۵۵۰۲۳۸ ۵۵۰۳۶۰ ۵۵۰۸۴۱ ۵۵۰۹۶۰ ۵۵۴۱۸۱
۵۵۵۵۹۴ ۵۶۵۳۲۱ ۵۶۶۶۵۳ ۵۶۹۵۰۰ ۵۷۷۳۶۴
۵۷۹۳۶۴ ۵۸۰۵۵۲ ۵۸۲۴ ۰ ۵۸۴۶۶۷ ۵۹۲۸۵۲
۵۹۹۸۸۴ ۶۰۱۳۴۰ ۶ ۵۴۱۳ ۶ ۵۵۵۲ ۶۰۶ ۷
۶۰۸۷۰۶ ۶۱۲۱۸۷ ۶۲۰۷۴۳ ۶۲۴۸۳۷ ۶۲۵۲۱۲
۶۳۵۰۰۴ ۶۳۹۷۴۲ ۶۴ ۵۳۷ ۶۴۱۵۶۸ ۶۴۱۶۰۱
۶۴۲۲۲۶ ۶۴۷۴۲۶ ۶۵۴۹۶۲ ۶۵۵۵۲۶ ۶۵۸۱۸۸
۶۶۱۳۲۳ ۶۶۶۸۲۹ ۶۷۸۹۹۷ ۶۷۹۷۸۲ ۶۸۱۶۱۶
۶۸۲۴۷۳ ۶۸۴۰۲۸ ۶۸۵۲۰۶ ۶۹۲۹۹۲ ۷۰۳۱۴۱
۷۰۳۷۲۴ ۷۱۰۹۹۱ ۷۲۹۹۵۳ ۷۴۳۹۴۰ ۷۴۷۳۴۷
۷۵۲۳۶۷ ۷۵۹۲۲۴ ۷۶۳۱۱۳ ۷۶۴۳۸۹ ۷۶۴۶۹۹
۷۶۷۰۴۵ ۷۷۰۱۱۸ ۷۸۲۷۷۰ ۷۹۲۳۲۱ ۸۰۶۵۷۷
۸۰۹۱۲۵ ۸۱۲۸۴۳ ۸۱۴۵۳۸ ۸۱۶۰۸۹ ۸۱۸۱۶۲
۸۱۸۹۵۲ ۸۲۳۶۷۹ ۸۲۹۰۹۷ ۸۳۱۰۵۸ ۸۴۰۷۰۱
۸۴۱۶۱۲ ۸۴۴۹۴۷ ۸۴۶۲۹۲ ۸۵۲۹۵۲ ۸۵۸۴۲۴
۸۵۹۲۹۳ ۸۶۵۳۱۲ ۸۶۷۲۲۴ ۸۷۱۰ ۶ ۸۷۲۷۹۰
۸۷۴۲۴۱ ۸۷۹۱۲۸ ۸۸۵۰۸۱ ۸۸۷۷۴۶ ۸۹۲۱۴۴
۸۹۳۸۹۱ ۸۹۴۰۱۴ ۹۰۴۰۱۲ ۹۱۲۷۲۱ ۹۱۸۴۸۴
۹۱۸۵۷۶ ۹۲۱۷۸ ۹۲۲۸۱۶ ۹۲۳۶۵۹ ۹۲۹۲۱۶
۹۲۹۸۸۱ ۹۳۰۹۸۷ ۹۳۳۶۱۱ ۹۵۳۱۱۱ ۹۶۸۲۱۰
۹۶۸۹۸۲ ۹۷۴۹۷۱ ۹۷۸۵۷ ۹۷۹۱۶۱ ۹۸۰۷۴۷
۹۸۹۷۷۰ ۹۹۳۵ ۰ ۹۹۴۱۱۱ ۹۹۵۱۰۵ ۹۹۹۲۲۴

سیریز ”اے سی“ کے ۵ روپیہ کے بانڈ پر

۷۵۰۰ روپے کا ایک انعام

۲۳۵۲۷۵

۲۵۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۱۲ ۶۸۱ ۳۰۶۷۵۶

۱۰۰۰ روپے کے ۱۰ انعامات

۰۵۶۲۷۵ ۲۵۲۸۰۳ ۳۲۲۴۱۲ ۶۱۵۱۷۲ ۷۲۲۹۶۸
۷۶۱۵۹۷ ۸۰۲۰۰۸ ۸۲۲۴۵۴ ۹۰۸۲۰۸ ۹۲۳۸۱۴

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۵۸۱۵۱ ۰۷۱۵۵۷ ۷۷۳۲۱ ۹۱۱۸۸ ۲۲۰۱۲۷
۲۲۸۵۴۷ ۲۹۱۳۹۱ ۳۳۵۵۹۶ ۳۵۱۷۶۴ ۴۰۵۷۶۷
۵۵۳۲۸۶ ۶۶۰۹۲۵ ۶۷۸۱۹۷ ۶۸۳۰۶۶ ۷۱۶۲۸۹
۷۶۱۳۰۱ ۸۰۷۳۰۷ ۸۶۰۸۴۶ ۸۹۵۴۵۳ ۹۰۵۱۴۷

۱۰۰ روپے کے ۲۵ انعامات

۰۱۳۷۷۹ ۰۲۳۴۸۰ ۰۴۰۳۱۳ ۴۱۹۹۹ ۰۹۱۰۶۵
۱۲۷۰۶۸ ۲ ۳۴۶۲ ۲۰۹۴۸۲ ۲۴۱۸۳۱ ۲۵۰۶۶۲
۳۵۴ ۹۷ ۳۹۲۸۲۷ ۳۹۶۴۱۳ ۵۷۳۲۷۰ ۵۸۴۲۸۴
۶۰۲۲۴۳ ۷۰۶۸۷۵ ۷۸۶ ۹۷ ۷۸۸۹۷۸ ۷۹۰۲۸۲
۸۷۰۳۳۵ ۹۰۵۲۲۹ ۹۰۹۴۵۷ ۹۱۷۵۴ ۹۸۹۳۵۸

۵۰ روپے کے ۲۲۰ انعامات

۰۹۲۳۷ ۰۲۲۱۳۱ ۲۲۴۷۲ ۰۲۲۸۲۴ ۰۲۹۲۰۴
۳۵۰۱۹ ۰۲۷۵۴۱ ۴۲۲۷۰ ۴۳۷۳۹ ۰۴۴ ۶۲
۰۴۷۲۸۵ ۰۵۰۶۲۰ ۰۶۱۵۲۴ ۶۴۵۱۶ ۰۶۸۲۴۵
۷۴۰۰۵ ۰۷۴۱۶۷ ۰۷۵۶۲۴ ۰۷۶۴۷۷ ۸۵۲۸۳
۰۸۹۵۱۰ ۰۹۸۸۱۸ ۱۰۳۰۲۳ ۱۱۱۹۱۶ ۱۱۷۲۲۶
۱۲۲۴۰۴ ۱۲۶۲۷۵ ۱۳۳۸۱۸ ۱۳۴۱۶۷ ۱۳۶۲۹۲

۱۶ ۷۳ ۱۶۳۱۳۹ ۱۶۳۲۱۰ ۱۶۵۳۸۰ ۱۶۶۳۱۳
۱۶۷۸۹۹ ۱۶۸۲۷۷ ۱۶۹۹۶۲ ۱۷۰۳۳۸ ۱۷۰۳۶۷
۱۷ ۵۰۹ ۱۷۳۷۲۲ ۱۷۹۲۱۹ ۱۸۱۷۳۸ ۱۸۵۷۳۶
۱۸۹۷۱۵ ۱۹۳۵۳ ۲۰۸۳۶۳ ۲۱۲۳۵۵ ۲۱۲۶۲۱
۲۱۹۸۵۲ ۲۲۲۱۳۵ ۲۲۲۱۵۰ ۲۲۳۳ ۷ ۲۲۶۳۸۲
۲۲۸۵۹۱ ۲۳۳۳۱۵ ۲۵۸۲۲۳ ۲۶۶۶۹۸ ۲۶۷۲۰۰
۲۷۰۵۷۷ ۲۷۱۸۸۶ ۲۷۳۱۹۱ ۲۸۵۰۷۱ ۲۸۵۰۸۷
۲۹۶۳۱۰ ۳ ۳۶۰ ۳۰۲۰۲۹ ۳ ۹۹۷۳ ۳۱۰۷۱۶
۳۱۵۲۱۰ ۳۲۰۲۰۲ ۳۲۶۶۱۳ ۳۳۱۲۲۶ ۳۳۷۶۶۷
۳۳۷۶۲۲ ۳۵۱ ۲۳ ۳۵۱ ۵ ۳۵۶۲۵۱ ۳۶۰۰۳۸
۳۶۶۸۳۷ ۳۶۷۲۲۳ ۳۶۹ ۵۲ ۳۸۲۰۲۳ ۳۹۳۳۷۳
۳۹۶۰۲۶ ۴۰۵۵۵۲ ۴۰۷۸۸۱ ۴۱۶۱۳۵ ۴۱۶۱۸۹
۴۱۶۳۵۳ ۴۱۸۳۱۵ ۴۲۲۷۵۶ ۴۲۳۹۲۸ ۴۲۷۸۳۵
۴۳۱۷۹۳ ۴۳۳۵۴۳ ۴۳۳۷ ۵ ۴۴۲۱۹۲ ۴۵۳۵۰۷
۴۶۹۰۱۹ ۴۷۵ ۲۸ ۴۷۵۲۷۳ ۴۸۳۵۰۲ ۴۸۵۲۳۵
۴۸۹۳۹۲ ۴۹۲۵۲۲ ۴۹۹۱۳۹ ۵۰۵۹۲۱ ۵۰۷۱۳۶
۵۱۲۰۷۱ ۵۱۵۹۳۲ ۵۱۷۵۹۳ ۵۲۰۸۸۰ ۵۲۲۶۷۲
۵۳۸۸۶۱ ۵۴۱۸۲۲ ۵۴۳۳۷۷ ۵۵۲۲۹۰ ۵۵۵۸۳۳
۵۶۱۰۲۹ ۵۶۱۳۳۰ ۵۶۱۵۸۵ ۵۶۳۷۶۱ ۵۶۹۲۰۸
۵۷ ۷۳۷ ۵۷۱۳۹۱ ۵۷۲۲۶۷ ۵۸۲۵۰۸ ۵۹۱۱۰۷
۵۹۱۲۲۳ ۵۹۶۷۱۰ ۶۱۶۲۲۹ ۶۲۶۸۲۱ ۶۳۱۳۶۹
۶۳۰۷۸۱ ۶۳۸۳۱۳ ۶۳۹۷۳۷ ۶۵۳۰۳۳ ۶۵۵۲۱۳
۶۶۱۹۸۱ ۶۶۳۱۹۳ ۶۶۳۵۳۲ ۶۶۸۸۳۹ ۶۶۹۸۷۳
۶۷۷۲۹۰ ۶۷۷۹۲۷ ۶۸۰۳۶۲ ۶۹۲۶۸۲ ۶۹۳۶۵۹
۶۹۷۲۸۹ ۷۱۰۳۶۲ ۷۱۳۵۱۷ ۷۱۳۳۹۳ ۷۲۲۱۱۳
۷۲۹۰۱۸ ۷۳۳۲۰۲ ۷۳۸۱۸۵ ۷۳۸۶۹۲ ۷۵۲۷۲۳
۷۵۲۷۵۶ ۷۵۳۶۲۳ ۷۵۳۳۳۰ ۷۶۰۱۶۷ ۷۶۰۶۸۰
۷۶۵۹۷۳ ۷۶۸۵۹۵ ۷۶۸۸۱۳ ۷۷۲۱۳۳ ۷۸۳۳۷۲
۷۸۸۱۳۵ ۷۸۹۰۱۰ ۷۸۹۳۵۲ ۷۹۰۹۵۱ ۷۹۳۶۸۲
۷۹۳۸۷۲ ۷۹۵۲۰۳ ۷۹۵۲۷۳ ۸۰۰۰۰۳ ۸۰۶۵۳۷
۸۰۷۸۰۶ ۸۰۸۶۰۵ ۸۱۹۳۷۷ ۸۲۳۳۵۱ ۸۲۵۳۰۳
۸۳۲۱۷۳ ۸۳۹۱۶۰ ۸۳۵۳۰۲ ۸۴۷۳۸۱ ۸۴۷۲۸۷
۸۵۲۲۵۶ ۸۶۱۶۹۳ ۸۶۶۹۲۳ ۸۷۲۹۸۶ ۸۷۵۵۱۳
۸۸۲۹۹۸ ۸۸۶۹۶۵ ۸۹۲۸۱۹ ۸۹۶۷۳۵ ۹۰۳۳۸۳
۹۰۳۸۳۷ ۹۰۵۳۳۱ ۹۰۵۷۰۷ ۹۰۸۷۰۹ ۹۱۱۸۳۹
۹۱۸۹۶۳ ۹۱۹۹۹۷ ۹۲۱ ۰۷ ۹۲۶۵۲۷ ۹۳۳۲۰۵
۹۳۶۹۲۷ ۹۵۷۷۳۷ ۹۶۵۰۹۱ ۹۷۰۹۸۱ ۹۷۳۲۸۱
۹۷۲۸۰۱ ۹۷۹۸۲۳ ۹۸۲۸۰۱ ۹۸۳۵۱۹ ۹۹۲۵۰۳

سیریز "اے ڈی" کے ۵ روپے کے بانڈ پر

۷۵۰۰ روپے کا ایک انعام

۷۲۳۲۶۹

۲۵۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۰۲۳۸۰۹ ۲۴۸۰۲۳

۱۰۰۰ روپے کے ۱۰ انعامات

۱۶۶۵۰۹ ۲۵۰۳۲۶ ۳۳۲۷۶۷ ۳۵۰۱۰۳ ۶۱۳۷۷۱
۶۵۳۹۸۶ ۶۹۵۲۸۲ ۸۵۲۹۱۵ ۸۵۴۳۸۲ ۸۸۳۲۰۵

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۵۷۹۶۳ ۰۷۰۱۵۸ ۰۷۹۹۹۷ ۰۸۲۲۰۷ ۱۶۹۸۳۶
۱۸۸۳۷۲ ۱۹۰۵۶۹ ۲۵۳۹۹۳ ۲۸۸۹۹۲ ۳۰۵۳۳۲
۳۳۶۳۸۱ ۳۶۰۰۱۳ ۳۷۵۱۳۳ ۵۱۹۷۰۳ ۵۶۳۳۵۵
۶۸۵۸۶۵ ۷۱۳۳۸۱ ۷۲۵۵۸۳ ۷۳۸۹۳۰ ۷۸۳۲۵۸

۱۰۰ روپے کے ۲۵ انعامات

۰۱۱۲۰۳ ۰۲۰۱۳۶ ۰۵۳۱۵۳ ۰۷۵۶۶۶ ۲۰۶۳۱۹
۲۵۱۲۵۲ ۲۶۵۱۳۲ ۳۰۷۶۳۱ ۳۱۰۰۸۷ ۳۳۶۰۳۳
۳۶۵۷۱۸ ۳۷۶۶۶۲ ۳۹۱۶۳۳ ۳۹۳۰۸۹ ۴۰۳۳۶۵
۵۲۸۰۰۳ ۵۷۲۷۳۳ ۷۳۵۶۵۳ ۸۲۰۲۹۲ ۹۰۹۱۹۳
۹۱۱۳۲۸ ۹۳۱۸۶۸ ۹۳۹۳۸۵ ۹۳۹۳۸۹ ۹۳۹۸۳۳

۵۰ روپے کے ۲۳۰ انعامات

۰۳۳۰۳ ۰۰۶۷۰۲ ۰۱۱۶۱۵ ۰۱۳۳۷۰ ۲۸۸۹۷
۰۳۱۷۳۲ ۳۲۲۹۰ ۰۳۲۳۲۲ ۰۳۵۵۳۵ ۰۴۱۲۶۳
۰۵۹۷۲۹ ۰۶۳۶۷۳ ۷۰۲۵۲ ۰۷۱۶۹۳ ۰۷۳۰۱۶
۷۶۹۰۶ ۰۷۷۱۱۳ ۷۹۵۰۵ ۰۸۵۰۷۳ ۹۰۱۳۱
۹۱۷۷۳ ۹۳۳۰۰ ۰۹۸۳۶۲ ۱۰۰ ۲۵ ۱۰۰۸۳۷
۱۰۱۶۸۹ ۱۰۵۰۶۹ ۱۰۵۵۲۳ ۱۱۰۱۶۳ ۱۱۳۰۶۱
۱۲۵۵۸۳ ۱۲۶۳ ۶ ۱۳۲۰۶۶ ۱۳۳۹۹۲ ۱۳۷۹۰۰
۱۳۹۱۵۰ ۱۵۲۲۶۳ ۱۵۳۱۷۹ ۱۵۷۰۶۳ ۱۶۳۳۲۹
۱۷۱۷۵۵ ۱۷۲۶۲۹ ۱۸۳۳۹۲ ۱۹۳۶۶۲ ۱۹۶۳۸۱
۲۰۳۳۵۶ ۲۰۵۱۵۰ ۲۰۵۲۰۷ ۲۰۹۳۳۳ ۲۱۰۹۳۶
۲۱۵۵۸۲ ۲۱۹۹۸۹ ۲۲۳۸۱۰ ۲۲۳۶۶۳ ۲۲۵۷۷۸
۲۳۳۳۹۳ ۲۶۲۱۰۷ ۲۷۱۹۳۸ ۲۸۲۰۳۹ ۲۸۲۹۰۳
۲۸۸۹۳۸ ۲۹۳۶۶۰ ۲۹۳۸۰۳ ۲۹۵۰۳۰ ۲۹۷۹۲۹
۲۹۸۲۸۱ ۳۱۳۹۳۶ ۳۱۵۱۹۶ ۳۱۶۸۹۶ ۳۱۷۰۰۱
۳۱۷۸۲۲ ۳۲۲۶۸۸ ۳۲۲۷۶۲ ۳۲۳۲۸۱ ۳۲۶۲۳۶
۳۳۹۳۹۸ ۳۳۰۷ ۸ ۳۵۳۰۲۵ ۳۵۳۸۳۸ ۳۵۵۹۸۱
۳۵۸۲۰۲ ۳۵۹۸۹۵ ۳۶۰۹۳۷ ۳۶۱۰۷۷ ۳۶۳۵۵۹
۳۶۹۱۵۶ ۳۷۱۵۵۷ ۳۷۲۸۲۳ ۳۷۵۸۹۹ ۳۷۹۹۷۳
۳۸۱۷۹۳ ۳۸۳۱۹۵ ۳۹۲۱۳۹ ۳۹۹۶۲۶ ۴۰۱۶۰۳
۴۰۶۱۶۲ ۴۰۷۰۵۹ ۴۰۹۹۶۸ ۴۱۳۰۱۰ ۴۱۹۵۲۵
۴۱۹۹۶۵ ۴۲۱۲۵۲ ۴۲۲۲۷۶ ۴۲۳۵۰۳ ۴۳۶۰۳۳
۴۴۰۱۹۶ ۴۴۱۰۷۸ ۴۴۱۵۳۶ ۴۴۴۶۸۹ ۴۴۵۸۳۳
۴۵۴۱۲۴ ۴۶۵۹۲۷ ۴۶۹۹۰۴ ۴۷۳۶۵۴ ۴۷۴۱۳۴
۴۷۹۷۰۹ ۴۸۴۸۷۵ ۴۹۰۱۶۵ ۴۹۹۲۴۰ ۵۱۳۷۴۸

۵۱۳۸۵۳ ۵۱۵۰۴۹ ۵۲۳۳۳۵ ۵۴۴۷۷۱ ۵۴۸۳۷۹
۵۴۸۹۴۱ ۵۵۶۲۱۱ ۵۵۷۲۱۳ ۵۶۵۷۷۶ ۵۶۷۹۰۵
۵۷۴۶۹۶ ۵۷۵۹۲۴ ۵۸۴۲۵۸ ۵۸۴۸۸۴ ۵۸۵۶۴۵
۵۸۶۶۲۸ ۵۸۷۳۱۹ ۵۹۲۰۱۸ ۵۹۶۷۷۷ ۶۰۲۴۴۴
۶۰۶۸۱۴ ۶۱۶۶۰۱ ۶۲۷۰۹۵ ۶۳۱۲۳۵ ۶۳۷۲۱۸
۶۶۰۱۰۵ ۶۶۰۵۳۷ ۶۶۱۵۳۶ ۶۶۹۹۷۰ ۶۷۱۶۶۳
۶۸۰۸۷۲ ۶۸۳۶۴۹ ۶۸۶۸۳۶ ۶۹۵۴۲۸ ۶۹۲۶۴۹
۷۰۱۴۰۳ ۷۰۳۰۹۷ ۷۰۶۹۷۰ ۷۱۲۲۸۲ ۷۱۴۶۳۸
۷۲۲۲۶۱ ۷۴۲۲۲۳ ۷۴۲۷۴۹ ۷۵۵۸۴۵ ۷۵۶۲۲۳
۷۵۸۵۳۹ ۷۵۹۹۰۷ ۷۶۱۸۵۱ ۷۶۶۹۵۷ ۷۸۷۰۲۳
۷۸۸۷۴۹ ۸۱۰۳۶۱ ۸۱۴۵۹۲ ۸۱۹۴۷۹ ۸۲۳۹۷۳
۸۳۲۷۵۹ ۸۳۴۰۳۲ ۸۴۵۴۹۱ ۸۴۷۷۸۷ ۸۵۰۶۸۷
۸۵۱۷۶۰ ۸۶۱۳۰۳ ۸۶۹۱۲۵ ۸۷۴۱۲۶ ۸۷۸۴۶۳
۸۷۹۳۳۸ ۸۸۰۴۴۳ ۸۸۰۸۶۶ ۸۸۰۸۷۴ ۸۸۳۶۰۲
۸۸۴۱۰۵ ۸۸۵۷۹۰ ۸۸۸۹۸۶ ۸۹۰۷۲۵ ۸۹۴۶۷۹
۹۰۱۳۵۲ ۹۰۳۳۸۱ ۹۰۴۹۷۰ ۹۰۸۸۸۲ ۹۰۹۴۷۲
۹۱۶۳۶۹ ۹۱۹۶۶۸ ۹۲۲۱۸۶ ۹۲۳۳۵۴ ۹۲۳۵۴۷
۹۲۵۵۰۷ ۹۳۰۳۳۳ ۹۳۰۶۵۸ ۹۳۲۰۸۵ ۹۴۵۷۸۸
۹۶۰۵۴۶ ۹۶۱۵۰۷ ۹۶۳۵۴۶ ۹۷۲۹۲۲ ۹۸۴۱۸۶
۹۸۶۹۷۱ ۹۸۷۰۸۳ ۹۸۸۸۱۲ ۹۹۰۹۵۲ ۹۹۲۵۱۱

سیریز "اے ای" کے ۵ روپے کے بانڈز پر

۷۵ روپے کا ایک انعام

۵۴۸۹۲۴

۲۵۰۰ روپے کے دو انعامات

۰۲۰۶۲۱ ۰۹۸۴۲۳

۱۰۰۰ روپے کے ۱۰ انعامات

۰۱۸۲۳۸ ۴۳۷۳۷ ۱۷۹۹۳۴ ۱۹۰ ۱۴ ۲۱۸۷۴۱
۲۵ ۳۰۴ ۲۵ ۶۴۸ ۶۱۸۲۱۷ ۶۲۹۵۵۶ ۷۱۲۳۵۹

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۴۱۴۸۹ ۰۵۱۵۴۶ ۸۷۱۲۶ ۱۶۰۷۴۸ ۲۱۹۵۸۴
۲۲۶۸۵۲ ۴۱۲[illegible]۲ ۴۴۰ ۳۸ ۴۶۳۵۹۷ ۴۸۱۱۵۶
۵۵۷۶۸۵ ۶۲۴۶۷۸ ۶۲۶۳۲۲ ۶۴۱۵۵۲ ۷۵۷۱۸
۹۱۱۶۸۵ ۹۲۸۱۲۸ ۹۵۶۰۱۴ ۹۸۶۲۳۱ ۹۸۸۸۳۰

۱۰۰ روپے کے ۲۵ انعامات

۰۰۲۳۳۴ ۰۰۳۶۸۸ ۹۶۰ ۵ ۱۲۲۰۹۹ ۱۵۹۸۱۴
۱۶۸۸۹۴ ۱۷۰۵۹۹ ۱۹۵۸۲۲ ۲۲۱۲۷۵ ۲۲۱۶۳۷
۳۷۰۱۷۳ ۴۷۲۵۷۷ ۵۲۵۴۹۸ ۵۶۰۸۰۶ ۶۰۲۸۰۱
۶۱۱۰۲۵ ۶۲۹۲۷۷ ۷۰۳۹۶۶ ۷۸۲۴۲۹ ۷۸۸۰۱۰
۸۰۴۰۴۴ ۸۴۱۲۴۲ ۸۵۹۱۱۹ ۹۳۹۷۲۶ ۹۶۲۲۵۵

۵۰ روپے کے ۲۲۰ انعامات

۹۲۷۶ ۰۰۹۷۵۱ ۰۱۱۴۲۰ ۱۲۰۸۳۳ ۰۱۵۲۹۲
۰۲۲۹۴۸ ۰۳ ۲۷۴ ۰۳۰۵۷۸ ۰۳۴۲۳۲ ۰۴۴۸۱۴
۰۴۶۲۴۴ ۰۵۵۱۹۰ ۰۵۹۱۴۳ ۰۶۳۵۲۹ ۰۷۴۱۱۲
۰۷۷۸۳۱ ۰۸۴۶۲۹ ۰۸۵۲۶۶ ۰۸۵۶۹۰ ۰۸۸۲۹۵
۰۹۲۲۴۴ ۰۹۳۰۵۵ ۰۹۹۵۸۴ ۱۰۳۶۵۵ ۱۰۳۷۱۴
۱۰۴۳۴۷ ۱۱۴۵۴۳ ۱۱۸۲۶۰ ۱۲۰۵۱۲ ۱۲۰۸۹۶
۱۲۱۶۵۰ ۱۲۴۶۴۵ ۱۲۹۳۲۲ ۱۳۳۷۹۷ ۱۳۸۶۳۹
۱۴۰۰۹۰ ۱۴۲۴۲۹ ۱۴۵۲۴۷ ۱۴۶۱۷۱ ۱۴۹۷۳۲
۱۵۸۵۸۸ ۱۶۰۷۱۵ ۱۶۶۳۳۹ ۱۶۹۰۰۸ ۱۷۴۶۷۰
۱۸۳۲۹۶ ۱۸۸۱۱۷ ۱۹۷۳۸۹ ۲۰۹۸۰۷ ۲۱۰۵۴۵
۲۱۱۷۸۵ ۲۱۶۴۵۶ ۲۱۹۰۱۰ ۲۲۲۷۹۶ ۲۲۴۰۳۰
۲۲۵۴۲۸ ۲۲۷۲۷۶ ۲۳۲۴۵۲ ۲۳۷۱۳۹ ۲۴۸۴۹۴
۲۵۲۱۵۸ ۲۵۳۳۶۶ ۲۵۴۹۳۲ ۲۶۰۴۳۲ ۲۶۱۱۵۳
۲۷۱۲۵۸ ۲۷۴۰۳۳ ۲۷۴۴۹۶ ۲۷۴۷۶۵ ۲۷۹۴۷۲
۲۸۷۱۱۸ ۲۹۱۳۰۸ ۲۹۱۸۱۳ ۳۰۳۲۰۷ ۳۰۴۷۰۱
۳۱۷۲۲۲ ۳۲۹۱۹۵ ۳۳۱۳ ۳ ۳۳۲۴۸۶ ۳۴۱۱۳۱
۳۴۷۸۹۷ ۳۵۲۲۱۱ ۳۶۰۲۱۲ ۳۶۱۵۹۸ ۳۶۶۹۹۹
۳۸۴۵۱۶ ۳۸۶۶ ۴ ۳۸۷۳۹۴ ۳۸۸۹۸۵ ۳۹۲۷۱۲
۳۹۶۰۱۸ ۳۹۷۳۸۱ ۴۰۶۰۶۰ ۴۰۶۱۹۲ ۴۰۶۲۵۵
۴۱۸۴۸۵ ۴۱۹۰۸۲ ۴۲۲۸۵۶ ۴۳۴۷۰۲ ۴۵۴۰۱۵
۴۵۵۱۷۴ ۴۵۷۶۹۷ ۴۶۲۲۹۹ ۴۷۶۰۸۴ ۴۷۶۳۳۴
۴۸۳۳۷۱ ۴۸۵۹۸۷ ۴۸۷۳۳۸ ۴۹ ۴۵۰ ۴۹۱۵۷۰
۴۹۳۵۴۵ ۵۰۰۹۹۱ ۵۰۳۳۱۰ ۵۰۳۳۳۷ ۵۰۶۷۱۸
۵۱۷۱۲۰ ۵۱۹۰۲۶ ۵۲۱۲۹۰ ۵۳۱۱۳۹ ۵۳۲۲۷۷
۵۳۲۶۴۹ ۵۳۳۹۴۴ ۵۳۴۵۴۲ ۵۳۵۸۲۲ ۵۵۴۰۹۶
۵۵۹۸۴۰ ۵۶۲۴۶۲ ۵۷۱۸۳۲ ۵۷۵۳۷۸ ۵۸۱۴۷۰
۵۸۵۲۷۰ ۵۸۸۶۳۴ ۵۸۹۸۲۴ ۵۹۰۶۹ ۶۰۷۵۶۱
۶۱۲۹۱۹ ۶۱۵۲۶۵ ۶۲۱۸۵۵ ۶۲۳۲۸۵ ۶۲۴۸۶۴
۶۳۶۷۰۰ ۶۳۹۳۱۷ ۶۴۲۸۱ ۶۴۸۵۸۲ ۶۴۹۶۰۹
۶۵۲۸۴۷ ۶۵۶۹۳۰ ۶۶۸۴۷۲ ۶۷۳۶۶۳ ۶۸۶۹۰۷
۶۸۸۳۷۴ ۶۹۳۸۹۱ ۶۹۵۷۱۶ ۶۹۵۹۵۰ ۷۰۸۰۶۰
۷۰۸۱۲۹ ۷۰۸۳۷۹ ۷۱۰۲۶۲ ۷۱۳۸۴۹ ۷۱۹۱۸۸
۷۲۸۴۲۱ ۷۳۸۲۶۹ ۷۳۹۰۳۸ ۷۳۹۲۵۶ ۷۴۷۷۲۷
۷۴۸۴۶۱ ۷۴۸۵۱۶ ۷۵۱۶۵ ۷۵۴۵۶۰ ۷۶۰۴۵۷
۷۶۳۵۶۴ ۷۶۸۱۶۷ ۷۷۵۷۶۲ ۷۷۷ ۶ ۷۷۹۶۱۴
۷۸۰۰۷۴ ۷۸۲۷۷۹ ۷۸۳۲۶۰ ۷۸۶۴۸۹ ۷۸۹۸۵۰
۷۹۸۷۹۸ ۷۹۹۲۴۸ ۷۹۹۴۲۳ ۸۱۰۵۶۶ ۸۱۳۴۹۶
۸۱۴۲۹۷ ۸۱۵۱۸۱ ۸۲۲۳۱۷ ۸۲۹ ۸۴ ۸۲۹۶۹۸
۸۳۵۲۷۱ ۸۳۵۲۵۰ ۸۳۸۶۰۰ ۸۵۲۷۸۷ ۸۵۷۱۶۴
۸۵۹ ۲۹ ۸۶۵۴۷۵ ۸۶۹۲۲۵ ۸۷۴۴۱۳ ۸۷۹۳۵۷
۸۸۴۱۰۶ ۸۹۶۳۳۷ ۸۹۶۵۸۲ ۹۱۰۸۴۴ ۹۱۹۵۹۵
۹۲۴۵۸۹ ۹۲۷۳۳۴ ۹۳۱۰۴۷ ۹۳۴۷۷۱ ۹۳۸۲۴۲

۹۷۰۹۰۷ ۹۶۳۸۱۳ ۹۵۵۹۱۱ ۹۵۵۴۴۴ ۹۳۹۷۹۳
۹۹۸۸۳۴ ۹۹۱۲۷۵ ۹۹۰۳۸۲ ۹۸۸۸۲۵ ۹۸۸۲۸

سیریز "اے ایف" کے ۵ روپے کے بانڈ پر

۷۵۰۰ روپے کا ایک انعام

۳۵ ۰۲۰

۲۵۰۰ روپے کے دو انعامات

۳۳۸۰۰ ۲۶۳۳۶۸

۱۰۰۰ روپے کے ۱۰ انعامات

۲۷۵۷۹۲ ۲۷۲۷۵۹ ۲۴۱۰۱۶ ۲۲ ۷۳۳ ۶۴۸۲۲
۶۴۴ ۱ ۵۱۴۶۰۳ ۴۸۳۵۲۶ ۴۷۸۵۳۵ ۲۹۸۹۸۲

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۱۸۸۵۳۰ ۱۵۶۷۶۴ ۱۱۷ ۵۵ ۹۵۱۹۹ ۵۹۸۸۵
۳۴۶۴۹۶ ۳۱۴۱۲۲ ۲۲۸۶۹۲ ۲ ۷۶۶۳ ۲۰۳۶۲۸
۶۲۳۷۲۳ ۵۱۸۹۶۲ ۴۷۸۳۳۶ ۴۲ ۸۴۶ ۳۷۵۷۲۶
۹۹۹۱۹۳ ۹۳۹۳۶۲ ۷۷ ۱۲۷ ۷۲۸۳۷۲ ۷۰۹۹۵۶

۱۰۰ روپے کے ۲۵ انعامات

۲۶۴۳۹۳ ۱۶۶۵۲۲ ۷۹۳۵۸ ۲۸۳۳۲ ۱۹۱۷۷
۴۸۸ ۵۲ ۴۴۳۵۲۶ ۳۶۸۴۸۶ ۳۴۹۹۷۲ ۳ ۲۸۹۲
۶۴۱۶۶۱ ۵۷۱۲۵۳ ۵۵۴۹۵۲ ۵۴۸۶۸۲ ۵۲۳۵۴۸
۸۸۱۱۳۱ ۸۶۲۱۲۲ ۸۶ ۳ ۶ ۸۰۶۳۶۹ ۷۳ ۱۱۴
۹۹۶ ۰۰ ۹۴۰۳ ۴ ۹۱۴۹۴۳ ۹ ۶۵۶۲ ۸۸۵۸۰۳

۵۰ روپے کے ۲۲۰ انعامات

۰۱۴۳۵۶ ۱۲۹۶ ۰۹۹۲۴ ۰۰۸۹۱۱ ۰۱۵۹۵
۰۴۳۶۸۰ ۳۷۸۶۱ ۳۷۵۹۷ ۳۷۱۰ ۱۷۸۰۵
۵۷۵۷۱ ۰۴۸۱۱ ۰۴۶۴۳۴ ۰۴۵ ۴۵ ۴۴۶۶۵
۰۷۷۵۲۰ ۰۷۵۵۴۲ ۷۰۵۳۳ ۰۶۶۴۳۳ ۵۸۷ ۳
۱ ۶۰۱۱ ۰۹۳۴ ۲ ۰۹۰۴۰۹ ۸۸۹۶۹ ۰۸۴۴۴۱
۱۲۲۱۱۴ ۱۲۰ ۰۶ ۱۱۴۴۵۷ ۱۱۱۷۷۹ ۱ ۹۴۸۴
۱۵۶۰۵۹ ۱۵۴۱۶۰ ۱۴۶۳۱۳ ۱۴۳۳۰۷ ۱۴۳ ۶۶
۱۸۴۵۰۳ ۱۷۹۲۹۳ ۱۶۶۱۵۲ ۱۶۳۱۰ ۱۵۸۴۶
۱۹۶۴۶۸ ۱۹۲۳۶۷ ۱۸۸۷۹۰ ۱۸۷۶۷۷ ۱۸۵۴۷۴
۲۰۳۰۱۳ ۲۰۲۱۴۱ ۲۰۰۶۳۹ ۱۹۹۴۲۵ ۱۹۷۹۶۷
۲۰۸۷۵۸ ۲ ۸۶۰۹ ۲ ۶۶۳۴ ۲۰۵۹۸۶ ۲ ۴۸۲۴
۲۲۳۱۰۳ ۲۲۰۱۵۶ ۲۱۵۲۹۳ ۲۱۰۰۳۲ ۲۰۹۰۴۸
۲۴۰۵۹۹ ۲۳۹۱۰۸ ۲۳۷۱۰۹ ۲۳۶۹۶۵ ۲۲۹۸۶۱
۲۶۷۲۶۰ ۲۶۲۳۴۱ ۲۵۸۹۶۴ ۲۵۸۲۵۳ ۲۴۵۹۰۳
۲۸۴۶۰۷ ۲۸۲۷۳۰ ۲۷۸۴۷۲ ۲۷۷۷۴۶ ۲۷۲۱۳۷
۳۰۱۰۶۱ ۲۹۶۳۱۰ ۲۹۴۸۶۵ ۲۹۴۱۹ ۲۸۹۹ ۳
۳۴۳۰۱۱ ۳۲۰۱۶۷ ۳۱۲۲۲۴ ۳ ۶۱۱۲ ۳۰۴۲۲۹
۳۵۸۲۶۹ ۳۵۵۲۴۰ ۳۵۲۹۳۲ ۳۵۲۵۰۵ ۳۴۳۹۶۳

۳۷۷۰۷۱ ۳۶۸۶۳۶ ۳۶۱۲۶۲ ۳۶۰۹۵۶ ۳۵۸۷۴۶
۳۹۰۸۴۹ ۳۹۰۷۱۲ ۳۸۷۶۱۵ ۳۸۲۵۳۲ ۳۷۷۳۸۵
۴۲۷۴۱۸ ۴۲۴۷۵۱ ۴۲۳۷۲۴ ۴۱۸۸۶ ۳۹۲ ۳۵
۴۶۶۵۳۴ ۴۵۴۸۹ ۴۵۴۲۲۷ ۴۵ ۳۸۲ ۴۴۲ ۱۴
۴۸۲۷۸۳ ۴۷۴۳۳۲ ۴۷۰ ۸۱ ۴۶۸۸۳۴ ۴۶۸۰۶۴
۴۹۳۴۷۹ ۴۸۸۰ ۱ ۴۸۷۳۴۳ ۴۸۵۳۳۷ ۴۸۳۶۷۱
۵۰ ۱۷۹ ۵۰۰۰۶۱ ۴۹۹۶۵۷ ۴۹۵۲۷ ۴۹۴۸۲۴
۵۲۱۰۷۷ ۵۱۳۸۷۷ ۵۱۱۹۴۸ ۵۱۰۳۴۲ ۵۰۲۷۶۹
۵۳۹۴۸۸ ۵۲۶۹۵۱ ۵۲۶۲۴۲ ۵۲۴۹۴۱ ۵۲۴۶ ۹
۵۶۰۵۲۳ ۵۶ ۴۴۳ ۵۵۵۹۲۹ ۵۵۳۷۵۸ ۵۴۹۴۱۵
۵۸۶۶۸۸ ۵۸۵۵۷۸ ۵۸ ۸۲۹ ۵۷۷۵۴ ۵۶۹۵۹۱
۶ ۶۵۱۵ ۶۰۳۱۰۶ ۵۹۶۸۶۸ ۵۹۲۸۸۲ ۵۹۱۶۱۵
۶۳۴۳۸۱ ۶۲۴۵۸۴ ۶۲۴۲۵۳ ۶۲۰۲۴۲ ۶۱۶۱ ۶
۶۵۹۹۸۲ ۶۵۸۱۰۸ ۶۴۵۸۱۳ ۶۴۵۴۵۸ ۶۳۵۷۴۲
۶۹۵۴۵۲ ۶۹۱۴۵۸ ۶۹۰۶۹۴ ۶۸۶۵۱ ۶۷۵۲۵۲
۷۲۴۴۴۶ ۷۱۷۵۸۵ ۷۱۱۰۰۷ ۷۰۸۱۱۷ ۷۰۷۶۴۳
۷۶۸۹۰۳ ۷۴۱۱۱۸ ۷۳۴۱۲۲ ۷۳ ۳۰۹ ۷۲۹۷۷۴
۷۸۵۸۸۶ ۷۸۱۲۶۲ ۷۷۷۳۲۵ ۷۷۴۲۷۱ ۷۶۹ ۱۸
۸۰۸۰۶۴ ۸۰۶۴۲۸ ۸۰۴۷۵۰ ۸۰۳۶۱۳ ۷۹۶۵۷۸
۸۲۵۵۴۹ ۸۲۰۴۳۰ ۸۱۶۶۶۵ ۸۱۵۷۲۲ ۸ ۸۰۹۶
۸۴۹۵۴۵ ۸۴۹۰۹۴ ۸۴۱۲۲۵ ۸۳۴۶۰۱ ۸۳۳۴۲۵
۸۶۹۷۴۶ ۸۶۷۹۴۹ ۸۶۲۹۶۸ ۸۵۱۴۲۲ ۸۴۹۸۱۷
۸۹۶۷۲۳ ۸۹۴۸۴۴ ۸۸۸۰۶۷ ۸۷۵۳۵۹ ۸۷۰۵۴۱
۹۲۱۰۸۷ ۹۱۵۰۱۶ ۹۱۲۵۴۳ ۹ ۲۷۵۶ ۸۹۷۱۸۸
۹۵۶۰۵۴ ۹۵۴۳۵۲ ۹۳۵۸۱۷ ۹۲۹۳۴۷ ۹۲۹ ۱۹
۹۷۷۳۸۳ ۹۷۵۵۳۷ ۹۷۰۵۸۸ ۹۷۰۴۵۹ ۹۶۶۵۲۹

سیریز "اے جی" کے ۵ روپے کے بانڈ پر

۷۵۰۰ روپے کا ایک انعام

۹۰۲۲۷۰

۲۵۰۰ روپے کے دو انعامات

۶۰۸۷۶۶ ۳۰۰۴۴۸

۱۰۰۰ روپے کے ۱۰ انعامات

۷۲۷۲۴۰ ۶۶۶۸۳۱ ۴۹۴۰۴۵ ۲۰۵۱۰۱ ۱۰۸۴۸۹
۹۹۷۵۱۶ ۹۷۶۲۴۹ ۹۶۱۱۳۸ ۹۲۶۸۴۶ ۹۲۱۱۸۴

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۴۴۴۸۴۱ ۳۴۱۸۹۲ ۳۴۱۰۰۵ ۲۶۳۳۹۸ ۱۷۸۹۳۷
۶۶۷۳۵۲ ۵۸۲۰۲۰ ۵۳۹۵۶۲ ۴۶۲۲۴۸ ۴۴۷۲۷۶
۸۴۸۹۰۰ ۸۰۵۳۹۷ ۷۵۸۰۹۱ ۷۵۳۶۸۰ ۷۲۴۶۸۶
۹۷۵۶۵۴ ۹۶۴۳۹۶ ۹۳۰۱۲۶ ۸۸۳۰۶۳ ۸۶۸۹۶۹

۱۰۰ روپے کے ۲۵ انعامات

۱۰۲۹۰۷ ۰۹۱۷۷۲ ۰۸۷۹۸۹ ۰۸۷۲۳۲ ۰۴۲۷۲۶

۱۳۷۵۹۵	۱۹۵۱۱۰	۲۶۲۹۸۲	۳۳۹۷۳۰	۳۸۸۸۶۸
۳۹۴۲۷۹	۴۰۱۷۶۹	۴۱۲۷۷۹	۴۱۶۹۷۴	۴۷۵۶۰۵
۵۰۲۲۳۶	۵۶۰۶۰۸	۵۸۵۲۲۹	۵۹۲۵۷۰	۷۰۳۱۱۷
۷۵۱۰۹۲	۷۸۴۲۰۱	۸۱۱۸۱۲	۸۸۵۵۹۰	۹۷۵۳۴۸

۵۰ روپے کے ۲۲۰ انعامات

۰ ۶۲۴	۰۰۳۰۸۰	۰۱۸۳۷۰	۰۱۸۶۲۴	۰۲۲۰۱۱
۰۲۳۲۲۸	۰۲۴۸۹۸	۳۰۰۰۰	۰۳۰۳۱۶	۰۳۴ ۶۴
۰۳۷۴۵۵	۳۹۶۴۴	۰۴۲۴۱۹	۰۴۹۵۵۷	۰۵۷۵۹۹
۰۶۰۶۰۸	۰۶۱۱۰۳	۰۶۷۱۸۱	۰۸۷۱۳۰	۰۹۰۶۸۸
۰۹۷۳۶۴	۱۰۰۴۰۷	۱ ۶۶۱۱	۱۱۰۶۲۲	۱۱۱۷۷۹
۱۱۹۴۹۷	۱۱۹۶۸۶	۱۱۹۷۷۸	۱۲۳۴۲۸	۱۳۳۶۳۶
۱۳۷۰۸۹	۱۳۹۶۵۸	۱۴۲۴۵۳	۱۴۲۵۵۰	۱۴۳۴۴۸
۱۵۱۰۸۴	۱۶۹۷۱۲	۱۷۴۳۴۴	۱۷۸۱۲۴	۱۸۰۷۱۶
۱۸۰۹۰۰	۱۸۲۵۰۴	۱۸۴۶۰۱	۱۸۸۲۰۴	۲۰۴۹۷۸
۲ ۹۸۴۸	۲۱۰۰۱۲	۲۱۱۱۱۹	۲۱۹۲۹۹	۲۲۴۳۱۹
۲۲۴۴۲۲	۲۲۵۴۶۲	۲۲۵۶۱۶	۲۲۷۸۸۲	۲۳۳۴۰۵
۲۳۹۸۱۶	۲۴۰۱۹۶	۲۴۴۰۴۳	۲۴۷ ۶۸	۲۴۸۶۹۶
۲۵۹۱۶۳	۲۶۶۶۹۷	۲۶۶۹۵۵	۲۶۷۵۵۷	۲۶۹۳۸۹
۲۷۰۴۷۹	۲۷۱۹۱۹	۲۸۱۰۴۳	۲۸۶۳۰۴	۳۱۲۱۲۵
۳۱۲۴۱۲	۳۱۸۳۴۶	۳۲۴۴۴۰	۳۲۷۵۳۶	۳۳۸۴۹۲
۳۴ ۹۱	۳۴۲۰۲۸	۳۴۳۲۱۳	۳۴۴۵۴۱	۳۵۲۳۱۹
۳۵۳۴۰۸	۳۵۶۴۴۸	۳۵۶۸۴۰	۳۶۳۲۵۵	۳۶۴۰۹۷
۳۷۵۷۲۷	۳۸۱۹۲۲	۳۸۲۱۱۱	۳۸۴۵۵۵	۳۸۶۳۵۱
۳۸۷۰۹۵	۳۸۷۰۹۸	۳۸۹۸۲۲	۳۸۹۹۶۲	۳۹۲۴۳۹
۳۹۴۸۵۷	۳۹۶۷۰۶	۴۱۸۳۹۲	۴۲۲۷۱۳	۴۲۳۳۵۴
۴۲۶۶۴۲	۴۳۱۱۴۳	۴۳۱۸۴۴	۴۳۳۸۸۱	۴۳۶۲۲۸
۴۴۱۵۵۹	۴۴۷۶۳۰	۴۵۱۸۰۳	۴۵۹۷۲۱	۴۶۰۳۹۱
۴۶۳۵۵۲	۴۶۴۵۷۸	۴۶۷۱۷۵	۴۶۹۲۸۸	۴۶۹۸۳۴
۴۶۹۸۸۸	۴۷۷۰۴۴	۴۸۱۸۶۷	۴۸۲ ۳۲	۴۸۵۵۹۷
۵۱۲۹۹۲	۵۱۳۷۷۶	۵۲۴۷۵۸	۵۲۷۱۷۹	۵۳۱۱۶۹
۵۳۶۷۱۸	۵۴۱۵۸۹	۵۴۲۷۲۷	۵۴۴۱۴۳	۵۴۸۲۲۹
۵۵۰۰۰۲	۵۶۳۲۴۳	۵۶۷۷۶۲	۵۷۵۱۴۱	۵۸۲۹۱۲
۵۸۹۸۲۷	۵۹۲ ۲۱	۵۹۲۶۷۹	۵۹۳۸۴۰	۶۰۰۱۰۸
۶۰۱۲۳۸	۶۱۰۷۲۶	۶۱۳۵۹۸	۶۱۸۳۹۰	۶۲ ۱۴۸
۶۲۷۹۸۲	۶۲۸۳۳۹	۶۲۸۵۷۰	۶۴۹۰۲۱	۶۵۵۳۵۷
۶۵۸۱۶۴	۶۵۹۴۷	۶۶۰۶۱۸	۶۶۲۷۴۷	۶۶۳۲۲۱
۶۶۴۲۰۵	۶۶۹۱۳۵	۶۷۰۵۲۶	۶۷۲۳۸۴	۶۷۵۱۱۹
۶۷۵۷۸۷	۶۷۶۹۳۴	۶۷۷۲۱۴	۶۸۰۶۲	۶۹۰۷۹۴
۶۹۵۴۰۷	۶۹۸۰۹۶	۷۰۹۱۳۷	۷۲۶۱۵۲	۷۲۸۹۳۸
۷۳۰۲۰۷	۷۳۰۸۹۲	۷۴۹۷۹۸	۷۵۲۱۰۴	۷۶۶۶۱۵
۷۷۴۳۶۱	۷۷۴۴۳۹	۷۸۶۰۴۸	۷۸۸۲۳۲	۸ ۶۱۴۸

۸۳۰۶۹۵	۸۳۹۳۶۷	۸۴۴۸۳۵	۸۴۵۳۱۸	۸۴۹۳۲۴
۸۵۰۳۰۱	۸۵۴ ۳۰	۸۵۲۰۴۱	۸۵۶۴۶۵	۸۶۲۹۳۳
۸۶۴۹۵۷	۸۷۰۲۳۴	۸۷۲۸۴۶	۸۷۹۸۱۶	۸۸۰۷۰۱
۸۸۵۷۳۷	۸۸۵۹۲۸	۸۹۰۷۹۹	۹ ۲۲۷۷	۹۰۸۷۳۶
۹۱۳۳۲۲	۹۱۳۹۴۹	۹۱۵۲۷۳	۹۱۷۶۶۸	۹۱۷۸۵۵
۹۱۹۴۰۶	۹۲ ۸۵۴	۹۲۴۹۴۹	۹۲۵۵۱۶	۹۴۳۳۴۸
۹۵۳۲۳۹	۹۵۷۵۴۸	۹۵۸۸۴۶	۹۶۴۰۹۶	۹۶۷۴۳۲
۹۷۰۳۴۸	۹۸۲ ۸۴	۹۸۶۱۲۶	۹۸۶۶۷۹	۹۹۸۲۵۶

سیریز "اے ایچ" کے ۵ روپے کے بانڈیز

۵،۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۹۷۹۰۹۴

۲۵ روپے کے ۲ انعامات

۰ ۲۲۳ ۷۱۵۴۴۲

۱۰۰۰ روپے کے ۱۰ انعامات

۱۱۲۰۵۲	۱۳۶۲۳۴	۲۸۹۶۴۹	۳۰۳۱ ۸	۴۹۳۱۲۴
۶۷۹۳۳۷	۷۵۹ ۳۵	۸۸۹۶۸۴	۹۰۶۷۷۷	۹۸۶۶۶۶

۵۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۰۵۸۳۶۶	۰۹۰۹۷۷	۱۳۳۴۴۸	۲۲۶۹۵۵	۲۷۷۷۷۶
۳۱ ۴۶۹	۳۲۷۲۷۷	۳۴۶۹۸۱	۳۶۲ ۸۶	۴۲۴۵۶
۴۴۴۵۱۶	۵۸۱۷۱۶	۶۱۴۸۳۵	۶۲۳۵ ۴	۶۲۵۰۶۴
۷۳۷۶۱۳	۷۶ ۱۷۲	۸۶۴۲۵۱	۸۹۸۲۷۲	۹۸۴۵۸۸

۱۰۰ روپے کے ۲۵ انعامات

۰۲ ۹۹۴	۰۳۴۷۳۷	۰۷۱ ۹۰	۸۲۱۵۸	۱۱۹ ۳۶
۱۳۹۴۹۲	۱۸ ۶۷۱	۲۳۷۷۲۲	۲۵۰۱۵۴	۳۶۲۶۲۰
۲۹۷۴۷۴	۳۱۶۵۳۳	۳۳ ۵۸۲	۳۳۳۴۳۳	۳۳۷۵۸۵
۵ ۴۱۲	۵۳۱۸۹۴	۵۴۳۹۷۳	۶۷۱۷۳۳	۷ ۴۹۱
۸۷۳۹۹۴	۸۹۶۹ ۸	۹۱۰۵۵۷	۹۳۱۸۳۸	۹۵۸۹۳۶

۵۰ روپے کے ۲۲۰ انعامات

۰۲۱۲۱	۰۹۸۶۳	۱۰۹۳۸	۱۵۰۸۱	۰۱۹۸ ۹
۰۲۸۰۷۴	۰۴۹۱۶۱	۰۵۲۸۰	۰۵۴۷۳۱	۰۶۷۹۲۵
۰۶۹۷۰۷	۰۷۳۶۲۵	۰۷۶۹۵۲	۸ ۳۱	۸۸۷۲۵
۹۰۷۶۳	۰۹۳۶۴	۰۹۵۳۳۶	۱ ۷۹۹۵	۱ ۸۸۹۳
۱۱۲۹۷۳	۱۱۳۲۶۶	۱۲۲۷۶۴	۱۲۵۳۳۰	۱۳۲۵۶۱
۱۳۸۶۸۵	۱۳۹۸۶۵	۱۳۹۹۵۰	۱۴۳۹۸۴	۱۴۵۶۶۰
۱۴۶۰۹۹	۱۵ ۰۶۱	۱۵۴۷۴۵	۱۵۶۷۴۴	۱۵۸۱۷۱
۱۶۸۳۴۵	۱۶۹۶۹۴	۱۷۱۶۳۶	۱۷۲۶۵۰	۱۷۸۴۳
۱۸۲۹۸۳	۱۸۳۹۹۰	۱۹۳۴۴۴	۱۹۹ ۵۵	۲۱۶۸۵
۲۲۱۰۶	۲۲۷۵۷۱	۲۳ ۸۶۶	۲۳۱۳۹۸	۲۳۱۸۷۷
۲۳۴۵۲۵	۲۴۱۴۳۳	۲۴۳۲۷۴	۲۵۰۱۸۴	۲۵۳۷۹۵
۲۶۱ ۱	۲۶۳۱۲۵	۲۶۶۸۱۱	۲۷۳۳۳۱	۲۸۲۴۵۹
۲۸۲۳۴۴	۲۸۶۶۵۳	۲۹۳۹۱۶	۲۹۳۹۷۳	۲۹۸۰۹۹

۳۰۷۱۶۰	۳ ۷۶۰۷	۳ ۸۹۶۰	۳۱ ۲۹۰	۳۱۲۸۵۱
۳۱۸۳۳۹	۳۲۲۲۴۷	۳۲۷۲۶۹	۳۲۹۳۱۱	۳۳۳۹۴۷
۳۴۵۳۵۵	۳۴۸۱۲۲	۳۴۹۶۶۶	۳۵۰۹ ۶	۳۵۴۱۲۲
۳۶۵ ۸۴	۳۷۰۸۲۴	۳۸۳۸۴۸	۳۸۷۲۰۶	۴۰۴۶۹۱
۴۰۷۰۶۸	۴ ۹۵۹۷	۴۱۴ ۵۰	۴۱۵۸۴۹	۴۲۱۴۲۴
۴۲۶۸۶۴	۴۳۳ ۱ ۳	۴۳۳۶۸۱	۴۳۴۷۷۳	۴۴۰ ۸۴
۴۴۰۳۵۷	۴۴۶ ۴۹	۴۴۹۸۸۱	۴۵۲۸۹۲	۴۵۶۲۲۵
۴۶ ۸۴	۴۶۲۴۳۱	۴۷۰۷۳۰	۴۷۵۷۶۸	۴۷۸۸۰۸
۴۸۰۸۲۴	۴۹ ۰۱	۴۹ ۷۴۹	۴۹ ۸۴۸	۴۹۶۵۰۱
۵ ۸۱۲۸	۵۱ ۵۸۸	۵۱۰۰۴۶	۵۱۹۲۱۲	۵۲۳۶۲۱
۵۲۶ ۱۳	۵۲۹۶۹۷	۵۳ ۶۶۲	۵۳۱۷۴۱	۵۳۶۹۳۵
۵۲۷۰۶۵	۵۴۲۱ ۲	۵۶۲۷۶۸	۵۶۲۲۴۵	۵۶۵۰ ۰
۵۶۶۳ ۳	۵۷۲۴۲۳	۵۷۲۶۱۹	۵۸۲۶۹۰	۵۸۴۶۸۳
۵۹۳۷۴۱	۵۹۵۵۴۴	۶ ۲۲۵	۶۱۴۲۶۶	۶۲۴۶۷۹
۶۲۷۴۲۲	۶۲۹۲۳۷	۶۳ ۲۴	۶۳۷۱۳۵	۶۳۷۱۹۷
۶۳۵۸۰۶	۶۴۰۸۶۸	۶۴۸ ۷	۶۴۸۷۳	۶۵۷۱ ۴
۶۶۱۰۶۴	۶۶۹۹۴۸	۶۷۶۷۶	۶۸۱۵۲۲	۷۰۱۲۶۷
۷ ۲۶۲۹	۷۱۰۴۱۴	۷۱۱۲۲۲	۷۱۳۳۵۸	۷۱۶۱۱۴
۷۱۷۶۴۱	۷۲۱۳۵۴	۷۲۳۵۸۷	۷۲۶۳۰۱	۷۲۷۱۲۱
۷۴ ۳ ۹	۷۴۸۲۱۲	۷۵۱۱۵۹	۷۵۶۲۹۵	۷۶۱۱۶۷
۷۶۲۹۵۵	۷۶۹۱۸۶	۷۷۴۱۱۸	۷۸۹۹۳	۷۹۲۴۷۱
۷۹۴۳۷۵	۸ ۳۶۲	۸۰۴۶۷۴	۸ ۶۶۱۱	۸ ۷ ۹۱
۸ ۹۷۵۳	۸۱۸۴۶۸	۸۱۹۱۷	۸۱۹۲۹۱	۸۱۹۳۲۳
۸۲۲ ۴۵	۸۳۹ ۳	۸۳۹۴ ۴	۸۳۷۱۶۰	۸۳۹۷۸۸
۸۴ ۴۴۹	۸۴۱۹۲۳	۸۴۸۱۶۱	۸۵۰۶۶۷	۸۵۵۰ ۳
۸۵۵۱۹۸	۸۵۶۴۵۵	۸۷۹۷۷۴	۸۸۳۷۳	۸۹۶۳۶۳
۸۹۸۵۱۷	۸۹۹۷۱	۹۱۳۵۳۶	۹۲۲۸۷۴	۹۲۵۶۹۱
۹۳۲۵۶۲	۹۳۶۳۹۵	۹۴۹۵۹۷	۹۵۹ ۵	۹۶۱۹۷۷
۹۶۳۸۲۰	۹۶۵۴۸۴	۹۶۷۶۵۵	۹۷۳۰۴۲	۹۷۴۱۱
۹۷۶۱ ۲	۹۷۶۱۷۴	۹۷۷۲ ۵	۹۸۱۷۱۳	۹۸۷۶۱۶
۹۸۹۲۵۷	۹۹۱۷۵۴	۹۹۲۸۴۷	۹۹۶۱ ۹	۹۹۸۱۴۷

سیریز "اے جے" کے ۵ روپے کے بانڈ پر

۵۰،۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۹۳۸۸۸۲

۲۵۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۲۵۲۶۲۲ ۹۰۸۴۴۰

۱۰۰۰۰ روپے کے ۱۰ انعامات

۱۲۲۶۶۵	۱۴۴۷۵۲	۲۷۶۱ ۶	۲۸۴۸۴۷	۵۶۳ ۸۸
۶۲۷۴۸۱	۶۹۵۴۲۲	۷۰۱۸۳۱	۷۸۵۶۸۲	۸۸۱۴۴۴

۵۰۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۲۴۸۹۴	۰۸۴۲۱۷	۱۰۲۵۶۸	۱۹۷۲۸۳	۳۴۳۷۶۰
۳۷۹۵۴۱	۴۲۷۶۱۹	۵۴۵۴۴۴	۵۹۴۴۳۶	۶۳۳۷۵۶
۶۷۱۰۳۲	۷۳۰۴۴۴	۷۳۷ ۱۸	۷۳۷۴۱۸	۸۷۳۲۲۷
۸۷۲۵۸۹	۸۸۲۶۵۹	۹۱۱۳۳۰	۹۸۴۹۰۱	۹۸۹۸۱۱

۱۰۰۰ روپے کے ۲۵ انعامات

۵۰۶۹۴	۰۵۱۵۴۳	۱۳۰۷۵۶	۱۳۹۳۷۵	۲۳۸۲۴۱
۲۴۷۴۷۷	۲۸۵۸۸۸	۳۴۷۷۴۸	۴۴۳۸۵۷	۴۴۸۹۵۳
۴۶۳۳۷۲	۴۹۸۹۴۱	۵۴۶۳۳۱	۵۷۵۵۴۶	۶۱۴۰۰۵
۶۲۹۵۶۱	۶۵۰۷۴۸	۶۵۸۳۵۷	۶۶۵۱۸۵	۶۹۱۱۳۶
۶۹۷۳۷۷	۷۹۸۹۴۵	۹۲۳۶۹۲	۹۷۲ ۲۹	۹۷۷۷۲۴

۵۰۰ روپے کے ۲۲۰ انعامات

۰۵۷۱۴	۷۸۲۸	۱۱۱۲۴	۱۲۴۳۳	۱۹۹۲۲
۲۰۵۵۸	۰۲۳۱۷۷	۲۴۲۶۳	۲۶۲ ۴	۰۳۳ ۹۳
۰۴۴۷	۵۵۹۳۷	۵۷۹۲۴	۵۸۶۸۳	۰۶۳۲۵۸
۶۷۳ ۱	۰۷۷۶۱۸	۰۸۴ ۷۳	۱ ۳۱۲۹	۱۰۵۶ ۳
۱۱۰۲۶۸	۱۱۹۲۱۹	۱۲۵۲۷	۱۳۲۸۸۹	۱۳۷۲۳۹
۱۳۷۶۸۳	۱۴ ۳ ۳	۱۴۶۱۹۹	۱۵۳ ۶	۱۵۵۰۹۲
۱۵۵۴۲۵	۱۵۶۳۵۵	۱۵۸۱۷۳	۱۶۲۶۱۹	۱۶۹۷۵۳
۱۷۱۷۸۷	۱۷۲۴۳۸	۱۷۶۸۸۹	۱۸۲ ۸۲	۱۸۳۷۴۱
۱۸۴۳۷۲	۱۸۶۵۱۹	۱۸۹۲۵۷	۱۹۲۸۶	۲ ۲۵۴۲
۲ ۲۹۵۹	۲۰۳۲ ۳	۲۰۴۷۰۸	۲ ۵۱۹۷	۲ ۵۸۰۷
۲۱۱ ۵۵	۲۲۶۶۰۵	۲۲۷۲۹۵	۲۲ ۶۳۶	۲۴۱۴۰۲
۲۵۵۷۴۹	۲۵۷۹۲۶	۲۶۴۸۵۵	۲۶۶۴۵۳	۲۷ ۱۴۵
۲۷۲ ۷۳	۲۷۳۹۶۴	۲۷۷۲۴۰	۲۸۷۷۶۸	۲۸۸۲۲۳
۲۹ ۸۸۶	۲۹۱۹۱۴	۲۹۳۹۰۴	۲۹۷۴۲۲	۳ ۱۳۲
۳ ۵۵۹۹	۳۰۷۰۹۷	۳۱۲۹۵۳	۳۱۴۱۴۸	۳۱۵۴ ۴
۳۱۶۱۲۲	۳۲۱۲۷۴	۳۲۹۵۹۶	۳۳۹۲۱۲	۳۳۹۶۳۴
۳۳۹۸۹۷	۳۷ ۱۴	۳۷۲۳ ۵	۳۷۵۱۷۷	۳۷۵۹۵۵
۳۸۱۹۹۹	۴۰۷۹۶۴	۴ ۹۱۴۴	۴۱۲۵۰۸	۴۱۶۵۳۹
۴۱۸۱۹۴	۴۲ ۳۲۴	۴۲۸۱۴۳	۴۳۲۳۸۱	۴۳۴۷۵۸
۴۳۵۷۳۳	۴۴۷۲۵۸	۴۵۳۹ ۳	۴۵۶۸۵۵	۴۶۱۶۱۴
۴۶۹۲۱۵	۴۷۱۶۳۷	۴۸۰۶۸۴	۴۸۳۷۹۳	۴۸۷۵۴۳
۴۸۸۹۷۹	۴۸۹۰۳۶	۴۹۱۲۸۴	۵۰۸۲۲۳	۵۱۶۵۴۲
۵۲۷۵۵۲	۵۳۲۸۲۵	۵۴۱۳۵۲	۵۴۲۶۴۳	۵۴۵۵۱۳
۵۴۷۴۴۸	۵۵ ۴۶۱	۵۵۴۹۱۸	۵۵۵۵۸۳	۵۵۶۱۹۶
۵۶۵۲۶۸	۵۷۵۶۶۶	۵۸۴۴۱۲	۵۸۵۲۱۵	۵۸۶۸۹۲
۵۹۲۱۸۶	۵۹۳۸۸۶	۶۰۴۶۷۷	۶۰۵۴۲۷	۶۱۲۷۳۰
۶۱۳۹ ۲	۶۱۴ ۲۰	۶۱۵۵۷۱	۶۲۲۶۴۹	۶۲۳۴۹۷
۶۲۴۶۸۹	۶۲۴۷۱۰	۶۲۸۷۹۱	۶۳۰۲۶۴	۶۳۵۱۸۶
۶۳۶۴۳۴	۶۵۰۲۴۹	۶۵۱۱۸۸	۶۶۷۳۶۹	۶۷۰۵۰۹
۶۷۱ ۵۳	۶۷۲۲۳۹	۶۷۷۳۸۹	۶۷۷۶۸۱	۶۷۹۹۷۰
۶۸۱۶	۶۸۵۹۸۸	۶۸۷۷۶۶	۶۸۷۹۸۳	۶۸۹۹۳۲

۶۹۲۲۰۰ ۶۹۵۵۲۶ ۶۹۷۴۳۴ ۶۹۸۴۳۳ ۷۰ ۸۴۸
۷ ۶۲۶۲ ۷۰۹۹۸۹ ۷۱۴۵۵۳ ۷۱۶۵۲۰ ۷۲۱۲۷۲
۷۳۰۹۶۴ ۷۳۳۱۱۷ ۷۳۶۸۲۴ ۷۴۱۷۶۴ ۷۴۸۲۵۰
۷۵۵۳۱۷ ۷۵۹۲۲۲ ۷۶۶۶۹۹ ۷۶۷۲۳۱ ۷۷۲۱۹۳
۷۷۹۶۸۳ ۷۸ ۲۵۹ ۷۹۰۷۷۹ ۷۹۳۵۳۲ ۸۰۷۱۸۱
۸۱۶۹۶۶ ۸۱۹۰۳۳ ۸۲ ۴ ۱ ۸۲۶۹۷۳ ۸۳ ۵۸۶
۸۳۰۹۵۴ ۸۳۳۱۹۰ ۸۳۹۹۳۶ ۸۴۱۹۴۳ ۸۴۷۳۱۹
۸۴۸۰۲۴ ۸۵۰۵۶۷ ۸۵۲۶۸۶ ۸۵۶۸۵۶ ۸۶۳۱۵۵
۸۶۳۱۷۳ ۸۶۸۸۹۸ ۸۷۳۵۹۷ ۸۷۶۵۴۵ ۸۸ ۱۳۲
۸۸۳۷۱۵ ۸۸۴۱۱۹ ۸۸۹۸۵۷ ۹ ۲۷۵ ۹ ۱۶۱۲
۹ ۷۷۴۸ ۹۱۷ ۱۲ ۹۳۲۹۶۴ ۹۳۸۹۵۲ ۹۵۲۵۶۵
۹۵۲۸۹ ۹۵۵۶۴۵ ۹۵۶۶۹۸ ۹۵۹۷۸۷ ۹۶۶۲۷۹
۹۷۳۷۲۲ ۹۸۳۶۷۳ ۹۸۳۹۲۵ ۹۹۲۳۰ ۹۹۶۷

سیریز "اے کے" ۵ روپے کے بانڈ پر

۵۰۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۹۹۵۵۶۶

۲۵۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۱۳۰۹۸۶ ۸۹۶۶۴۶

۱۰۰۰ روپے کے ۱۰ انعامات

۱۱ ۹۶۴ ۱۲۹۰۲۳ ۱۴۱۳۹۸ ۳۳۵۶۲۳ ۴۸۹۱۴۸
۶۴۸۵۲۴ ۷۶۱۴۷۳ ۷۸۷۲۵۹ ۸۶۲۵۷۲ ۸۸۴ ۱۵

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۰۶۹۲ ۰۳۴۴۶۸ ۰۶۸۴۸۱ ۰۹۸۹۴ ۱۴۸۵۹۳
۳۱ ۱۵۶ ۲۵۳۶۳۴ ۴۳۵۲۱ ۴۶۶۱۷۳ ۴۹۲۴۶۱
۵۹۶۲۳۷ ۶۲۶۶۱۸ ۶۵۰۰۳۲ ۶۶۱۸۹۴ ۷۱۴۹۲۲
۷۱۹۸۲۵ ۸۲۹۹ ۱ ۸۴۶۷۴۰ ۸۷۱۵۸۹ ۹۲۹۱۵۲

۱۰۰ روپے کے ۲۵ انعامات

۰ ۲۳۸۲ ۰۴۶۷۷۱ ۱۰۵۸۲۴ ۱۹۲۲۲۵ ۲۴۶۱۷۲
۲۷۴۴۰۷ ۳۱۵۲۲۴ ۳۳۹۱۳۵ ۴۱۴۹۲۰ ۴۹۶۳۶۵
۵۱۱۵۴۷ ۵۷۱۷۱۰ ۵۸۶۷۹۱ ۶۰۲۵۲۲ ۶۱۷۷۶۷
۷۲۷۳۶۱ ۷۳۶۰۸۷ ۷۵۰۲۴ ۷۵۸۲۱ ۸۵۸ ۴۳
۸۹۲۵۳۱ ۹۰ ۰۲۹ ۹۲۳۸۵۱ ۹۵۷۶۲۴ ۹۶۲ ۸۵

۵۰ روپے کے ۲۲۰ انعامات

۰۰۲۵۳۴ ۰۱۰۶۱۴ ۱۵۹۵۹ ۰۲۱۵۶ ۲۵۴۳۷
۰۳۵۴۸۰ ۰۴۵۲۲۷ ۰۵۰۳۷۳ ۵۳۱ ۲ ۰۵۵۵۶۲
۰۵۵۶۰۵ ۰۵۵۶۶۲ ۰۵۷۱۲۴ ۰۶۳۱۸۶ ۷۶۶۱
۸۴۵۹۸ ۰۸۵۵۵۷ ۰۹۲۳۴۶ ۹۴۰۶۲ ۱۱۴۷۵۵
۱۲۳۳۷۷ ۱۳۶۷۱۱ ۱۳۶۸۲۳ ۱۵ ۵۱۶ ۱۵۳۵۸۹
۱۵۶۹۵۸ ۱۶۱۱۰۵ ۱۷۴۸۱ ۱۹۱۸۰۵ ۱۹۱۸۶۵
۱۹۳۲۱۰ ۱۹۴۲۴۳ ۲۰ ۰۵۸ ۲ ۴۴۸ ۲۰۶۸۴۲
۲۰۹۴۶۷ ۲۰۹۹۳ ۲۱۱۹۵۷ ۲۱۵۴۹۰ ۲۱۷۳۴۴

۲۲۳۳۰۷ ۲۲۸۰۷۱ ۲۳۰۷۰۶ ۲۳۸۱۱۹ ۲۳۸۴۵۲
۲۳۸۵۶۲ ۲۴۱۳۴۳ ۲۵ ۲۳ ۲۵۱۱ ۷ ۲۵۵۲۹۹
۲۶۲۴۱۶ ۲۶۸۴۰۳ ۲۷۸۴۱۲ ۲۸۲۱۱۸ ۲۸۶۴۳۳
۳ ۰۴۷ ۳۱۳ ۶۱ ۳۱۹۳۷۹ ۳۲۴۴۹۹ ۳۲۹۴ ۴
۳۳ ۰۲۱ ۳۳۷۳۷۲ ۳۴۲۷۹۱ ۳۴۴۲۸۲ ۳۴۷۲۷۴
۳۵۲۸۹۵ ۳۵۲۵۵۴ ۳۶۰۴۳۱ ۳۶۳۱۷۲ ۳۷۰۳۴۷
۳۸۷۹۰۸ ۳۹۲۵۶۹ ۳۹۶۲۷۳ ۳۹۹۰۴۷ ۳۹۹ ۵
۳۹۹۷۹۷ ۴۱۲۳۸۱ ۴۲۰۱۲۸ ۴۲۵۶۵۷ ۴۲۸۷۱۸
۴۲۸۷۸۴ ۴۲۹۵۶۸ ۴۴۴۶۲۷ ۴۵۳۹۸۲ ۴۵۹۹۲۷
۴۶۲۹۱۸ ۴۶۵۷ ۲ ۴۷۱۱۵۲ ۴۷۱۷۶۳ ۴۷۳۷۱۳
۴۷۴۲۳ ۴۸۱۲۷۸ ۴۸۱۴۵۱ ۴۸۸۶۵۹ ۴۹۲۳۳۶
۴۹۴۳۲۲ ۴۹۶۶۸۲ ۴۹۶۷۲۰ ۴۹۶۷۲۸ ۴۹۸۰۶۰
۵ ۲۵۳۸ ۵۰۸۳۶۶ ۵۱ ۴۷۹ ۵۱۱۳۲۵ ۵۲۱۲ ۲
۵۲۹۱۲۷ ۵۲۱ ۹۴ ۵۲۴۱۰۸ ۵۳۷۵۳۲ ۵۳۹۰۲۸
۵۳۹۹۱۲ ۵۴۹۵۷۳ ۵۵۵۲۴۴ ۵۵۵۷۱۶ ۵۵۵۹۷
۵۵۶۷۸۲ ۵۵۷۴۶۲ ۵۷۷۸۹۸ ۵۹۴۴۲۵ ۵۹۵۷۸۳
۵۹۶۹۸۷ ۶۰ ۲۳۴ ۶۰۰۹۷۵ ۶۰۸۶۱۳ ۶۱۸۴۱۴
۶۲۶۳۱۹ ۶۲۹۴۲۲ ۶۳۱۵۲ ۶۳۴۵۱۵ ۶۳۹۲۴۵
۶۳۹۳۷ ۶۴۱۱۸۲ ۶۴۱۹۳۹ ۶۴۸۱۴۶ ۶۵ ۱۱۹
۶۵۱۱۷۱ ۶۵۳۴۲۷ ۶۵۳۴۵۹ ۶۵۴۱۰۴ ۶۶۵۳۵۱
۶۶۸۱۷۳ ۶۷۳۷۶۰ ۶۷۷۶۷۰ ۶۸۱۷۰۳ ۶۸۸۰۲۲
۶۸۹۹۳۱ ۶۹۰۴۹۷ ۷۰ ۱۹۹ ۷ ۰۳۰۷ ۷ ۰۴۷۶
۷۰ ۶۷۲ ۷ ۵۸۸۸ ۷ ۹۱۱ ۷۱۱ ۱۶ ۷۱۲۳ ۹
۷۱۵۷۷ ۷۲۶۱۲۶ ۷۳۲۷۸۳ ۷۴۴۵ ۵ ۷۴۴۶۷۶
۷۴۴۹۸۳ ۷۴۶۹۴۳ ۷۵۰۵۲۴ ۷۵۵۰۹۴ ۷۶۱۱
۷۶۷۳۸۹ ۷۶۹۲۸۰ ۷۷۱۹۸۱ ۷۷۲۷۵۳ ۷۸۱ ۰
۷۸۴۵۹۲ ۷۹۵۴۸ ۸۰۸۸۳ ۸۱۰ ۷۰ ۸۱ ۶۰۷
۸۱ ۶۸۰ ۸۱۳۶۰۳ ۸۱۶۴۴۶ ۸۲۲۸۲۲ ۸۲۳۷۹۸
۸۲۴۲۱۰ ۸۲۷۴۵۹ ۸۳۳۱۳۹ ۸۳۵۶۵۸ ۸۳۸۳۳۵
۸۴۳۸۳۶ ۸۵۰۸۹۸ ۸۵۱۲۸۵ ۸۵۹۲۱۱ ۸۶۰۳۱۹
۸۶۲۱۶۲ ۸۶۶۰۷۸ ۸۹۲۹۴۵ ۸۹۵۹۵۲ ۹۰۱۹۳۸
۹ ۷۳۷۸ ۹۱۰۶۸۷ ۹۱۱۲۷۵ ۹۱۱۸۸۶ ۹۱۵۲۰۲
۹۱۵۳۹۲ ۹۱۷۱۶۳ ۹۱۷۹۴۶ ۹۱۸ ۶۰ ۹۱۸۷۲۴
۹۱۹۸۶۸ ۹۳۵۵۷ ۹۴۲۹۲۲ ۹۵۱۵۸۹ ۹۵۴۱۹۶
۹۵۸۹۲۵ ۹۶۸۱۵۸ ۹۶۹۰۲۲ ۹۷۱۵۶۰ ۹۷۱۵۸۸
۹۷۳۴۱۷ ۹۸ ۸ ۹۸۶۶۸۴ ۹۹۸۸۳۵ ۹۹۹۲۸۰

سیریز "اے ایل" ۵ روپے کے بانڈ پر

۵۰۰۰۰ روپے کا ایک انعام

۳۵۲۲۷۳

۲۵۰۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۰۶۵۷۵۲ ۵۶۱۰۵۵

۱۰۰۰ روپے کے ۱۰ انعامات

۱۶۱۴۰ ۰۳۵۲۵۹ ۴۲۹۳۴ ۱ ۱۶۵۱ ۳۱۷۲۶۰
۳۸۶۴۵۰ ۴۲۷۳۵۰ ۴۸۴۷۳۳ ۷۹۷۱۲۶ ۸۷۳۷۱۰

۵۰۰ روپے کے ۲ انعامات

۱۴۸ ۴۱ ۱۶۱۵۷۰ ۲ ۱۲۹۱ ۲۲۵ ۳۷ ۳۲۳۷۷۸
۳۷۶۵۵۳ ۴۲ ۱۴۹ ۳۷۸۹۴۸ ۴۸۳۱۳۵ ۵۱۳ ۹۷
۵۱۸ ۷۴ ۵۷۱۷۵ ۶۱۲۵۷۲ ۶۲۶۲۳۹ ۶۷۰۷۹۴
۸۲ ۶۳۲ ۸ ۷۲۴۳ ۸۸۹۲۴۶ ۹۴۵۰۴۹ ۹۴۷۵۶۸

۱۰۰ روپے کے ۲۵ انعامات

۱ ۲۸ ۰ ۲۲۳۱۶ ۰۶۵۷۸۱ ۷۶۶۶۹ ۰۸۷۳۲۴
۱۴۳۲۵۳ ۱۹۳ ۲۴ ۲۱۲۸۵۳ ۲۷۹۵۹ ۳۵۰۶۰۹
۴۴۷۵۹۵ ۴۶۸۲۳ ۵۴۶۳ ۳ ۶۶۶۰۷۲ ۶۷۷۵۰۹
۶۸۵۸۴۱ ۶۸۷۷۵۱ ۷ ۵۴۹۱ ۷۲۷۳۹۸ ۷۴۵۳۲۷
۶ ۷۴۸ ۷۶۳ ۹۰ ۷۹۴۵۶۷ ۸۵۰۹۳۲ ۹۶۳۳۹۴

۵ روپے کے ۲۲۰ انعامات

۰ ۲۳۳۲ ۰۳۳۵۲ ۰ ۳۶۸۷ ۰۱۳ ۹۹ ۲۱۳۳۲
۰۲۸۲۵۴ ۲۹۱۳۴ ۲۹۹۹۹ ۰۳۴۹ ۱ ۴۳۶۳۶
۴۹۴۸۸ ۰۴۹۵۸ ۶۶۷۷۳ ۶۹۸۶۷ ۰۷۵۹۳۸
۷۷۵۸۹ ۰۸۳۱۶۱ ۹۴۱۳۲ ۰۹۷۰۲۷ ۰۹۸۸۱
۰۹۹ ۸۶ ۱۰۲۷۱۱ ۱ ۷۲۲۹ ۱۱۳۴۵۲ ۱۱۷۵۹۲
۱۲۲۱۲۱ ۱۳۱۴۰۷ ۱۳۵۹۴۳ ۱۴۶ ۲۷ ۱۴۶۰۹۵
۱۶۲۷۳۴ ۱۶۳۲ ۱ ۱۶۴۰ ۷ ۱۶۷۳۶۹ ۱۶۸۱۶۲
۱۶۸۳۴۱ ۱۷۴۹۱۲ ۱۷۶۴۳ ۱۷۷۲۸۶ ۱۸۱۹۳۷
۱۸۴۶۷۳ ۱۹۳۴۹۲ ۲ ۱۹۶۴ ۳ ۲۵۴۱ ۲۰۶۵۷۶
۲ ۸ ۶۵ ۲۱ ۴۷۷ ۲۱۹۸۸۲ ۲۲۲۴۵ ۲۲۹۲۹۷
۲۳۳ ۱۴ ۲۴۳۸۶۰ ۲۴۵۱۹۵ ۲۴۸۳۹۱ ۲۴۸۷۱۴
۲۵۶۳۳۷ ۲۶۱۰۰۱ ۲۶۱ ۳۳ ۳۶۱۴۱۱ ۲۶۲۴۳۲
۲۶۵۱۸۴ ۲۷۲۹۳۲ ۲۷۹۱۷۸ ۲۸۶۹۷۲ ۲۹۵۹۲۷
۳۰۴۶۷۰ ۳۱۱۴۱۱ ۳۲۱۵۵۷ ۳۳۲۷۸۸ ۳۳۷۴۴۰
۳۴۳۱۸۱ ۳۵۳۸۰۵ ۳۵۶۵۹۲ ۳۶۱۴۳۹ ۳۶۲۸۲۷
۳۶۵۸۱۰ ۳۶۶۲۳۹ ۳۷۵۵۴۹ ۳۷۶۰۹۱ ۳۷۶۶۳۴
۳۷۹۷۲۲ ۳۸۱۷۳۸ ۳۸۶۲۲۲ ۳۹۲۰۹۱ ۳۹۳۵۸۲
۳۹۶۴۶۲ ۳۹۸ ۹۳ ۴۰۳۶۷۷ ۴۰۸۰۱۱ ۴۱۴ ۴۸
۴۱۴۸۰۵ ۴۱۸۲۰۷ ۴۱۸۵۲۲ ۴۲۰۸۰۱ ۴۲۳۱۷۱
۴۲۵۵ ۴ ۴۳۸۹۵۷ ۴۴۰۰۱۰ ۴۵۰۵۶۴ ۴۵۲۶۱۷
۴۵۲۷۳۲ ۴۵۸۱۰۵ ۴۵۸۹۳۱ ۴۶۰۸۵۸ ۴۷۸۴۷۰
۴۸۸۱۲۷ ۴۹۹۵۹۹ ۵۰ ۳۱۵ ۵۰۶۴۱۹ ۵۰۷۷۳۷
۵۱۳۱۲۳ ۵۱۴۱۱۲ ۵۲۵۲۹۳ ۵۲۵۹۵۱ ۵۳۶۷۷۵
۵۳۸۰۹۶ ۵۴۱۷۴۷ ۵۴۲ ۱۵ ۵۴۲۲۳۲ ۵۴۶۰۵۵
۵۵۰۳۳۶ ۵۵۰۸۳۱ ۵۵۱۳۳۹ ۵۵۲۵۷۹ ۵۵۷۳۷۳
۵۵۷۹۶۳ ۵۸۵۶۰۶ ۵۸۷۹۹۶ ۵۸۸۶۷۵ ۵۹۰۱۴۴
۵۹۳۵۳۶ ۵۹۵۳۲۴ ۵۹۸۱۸۲ ۵۹۹۲۰۱ ۶۰۰۲۳۳
۶۰۴۹۳۲ ۶۰۸۷۵۵ ۶۱۴۰۵۶ ۶۳۱۷۹۸ ۶۴۳۲۷۰
۶۵۳۸۷۵ ۶۵۶۷۷۴ ۶۵۷۴۴۱ ۶۵۸۴۰۴ ۳۶۰۶۶۶
۶۶۶۹ ۲ ۶۷۳۵۶۱ ۶۸۱۰۳۳ ۶۸۱۷۲۳ ۶۸۶۱۲۹
۶۹۰۳۴۱ ۶۹۲۲۱۰ ۶۹۹۹۴۶ ۷۰۱۴۳۲ ۷۰۵۴۹۲
۷۱۲۸۲۷ ۷۱۳۶۳۹ ۷۱۴۲۵۶ ۷۱۷۰۱۵ ۷۲۳۶۹۷
۷۲۷۸۴۷ ۷۳۵۱۵۱ ۷۳۷۱۱۳ ۷۳۷۹۱۱ ۷۳۸۲۶۰
۷۳۹۵۱۲ ۷۵۸۶۶۱ ۷۶۷۵۰۵ ۷۶۸۲۷۶ ۷۶۹۰۱۰
۷۶۹۲۲۱ ۷۷۲۹۷۰ ۷۷۳۷۴۷ ۷۷۶۲۸۳ ۷۷۷۳۲۳
۷۸۶۱۵۶ ۷۸۷۴۹۰ ۷۸۸۰۲۹ ۷۹۴۳۱۳ ۷۹۹۸۸۱
۸۰۴۳۱۸ ۸۰۶۹۲۱ ۸۱۸۰۳۶ ۸۱۸۷۰۷ ۸۳۲۳۳۴
۸۳۶۴۹۹ ۸۳۳۴۹۸ ۸۳۸۹۷۱ ۸۴۹۹۶۰ ۸۴۹۹۷۳
۸۵۲۱۶۶ ۸۶۲۳۸۲ ۸۶۳۶۳۹ ۸۶۸۹۲۱ ۸۶۹۴۱۱
۸۷۰۶۳۶ ۸۷۲۰۰۱ ۸۷۳۹۸۷ ۸۷۵۴۱۵ ۸۷۹۵۷۸
۸۸۱۲۶۷ ۸۹۲۸۱۲ ۸۹۶۵۱۲ ۹۰۹۷۹۵ ۹۱۳۹۵۸
۹۱۳۳۱۸ ۹۱۷۹۳۲ ۹۱۹۲۲۴ ۹۳۴۶۲۶ ۹۳۵۰۸۸
۹۳۹۴۱۸ ۹۴۳۵۷۷ ۹۴۷۳۸۷ ۹۶۲۳۶۰ ۹۶۴۳۸۶
۹۷۲۱۶۰ ۹۷۲۶۱۸ ۹۷۳۱۲۵ ۹۷۴۹۰۴ ۹۸۲۶۸۳

سیریز "اے ایم" کے ۵ روپے کے بانڈ پر

۷۵۰۰ روپے کا ایک انعام

۳۱۷۸۳۱

۲۵۰۰ روپے کے دو انعامات

۰۷۱۵۱۵ ۶۹۵۱۴۵

۱۰۰۰ روپے کے ۱۰ انعامات

۴۱۰۹۷۷ ۴۳۹۳۱۹ ۴۴۵۸۲۴ ۴۷۰۳۶۷ ۴۹۲۶۶۰
۶۱۵۲۷۶ ۷۷۱۸۹۸ ۷۷۳۵۸۷ ۸۴۱۴۸۶ ۸۵۰۹۴۷

۵۰۰ روپے کے ۲۰ انعامات

۰۰۵۹۲۸ ۰۳۴۹۱۷ ۱۰۹۹۳۵ ۲۰۶۵۴۲ ۲۱۹۰۱۹
۳۱۲۰۳۰ ۳۵۳ ۰۴ ۳۷۷۸۱۱ ۴۳ ۳۷۲ ۵۱۸۲۸۶
۵۳۴۹۴۸ ۵۴۴۳۴۸ ۵۴۶۲۰۸ ۵۶۴۷۸۵ ۶۷۵۱۲۶
۷۱۳۹۵۰ ۷۵۳۱۹۶ ۸۱۲۵۳۹ ۸۴۷۳۷۷ ۸۹۴۲۵۷

۱۰۰ روپے کے ۲۵ انعامات

۰۰۳۳۵۲ ۱۲۸۱۶۳ ۱۳۳۲۱۶ ۱۵۳۴۶۵ ۱۸۶۹۵۱
۲۲۵۶۵۸ ۲۴۳۷۸۵ ۲۶۵۴۸۷ ۲۷۰۶۴۷ ۲۸۵۰۲۰
۲۹۸۲۹۶ ۴۵۹۷۴۳ ۴۶۷۰۶۷ ۴۹۴۴۴۳ ۵۳۲۴۲۶
۵۵۰۱۹۵ ۵۵۷۲۲۹ ۶۷۲۹۹۳ ۷۴۹۱۲۹ ۷۷۷۲۹۳
۸۴۲۶۲۶ ۸۷۵۵۱۸ ۸۸۵۵۰۸ ۹۱۸۹۹۹ ۹۳۶۲۸۹

۵۰ روپے کے ۲۲۰ انعامات

۸۶۷۲ ۰۰۹۳۵۰ ۰۲۳۳۲۴ ۰۲۳۶۹۴ ۰۴۰۱۱۷
۰۴۶۷۴۵ ۰۶۱۲۷۸ ۰۶۲۱۱۴ ۰۶۹۷۲۴ ۰۷۵۲۵۹
۱۰۰ ۶۹ ۱۰۴۳۰۰ ۱۲۰۳۰۷ ۱۲۷۱۹۶ ۱۴۱۳۱۸

۱۹۶۴۵۳	۲۰۲۴۱۵	۲۱۱۴ ۱	۲۲۰۴۸۴	۲۲۱۲۲۴
۲۲۸۹۸۹	۲۳۲۳۲۷	۲۴۵۱۵۸	۲۴۷۷۲۱	۲۵۳۵۶۲
۲۵۴۸۱۶	۲۶۶۱۲۸	۲۶۶۶۱۱	۲۷۰۴۷۲	۲۷۱ ۹۰
۲۷۶۴۷۱	۲۷۹۴۹۵	۲۹۶۴۷۳	۳۰۲۳۱۸	۳۰۲۵۳۹
۳ ۳۳۴۰	۳۰۶۷۶۸	۳۱۰۴۲۸	۳۱ ۸۶۳	۳۱۲۵۶۸
۳۱۷۹۹۴	۳۲۰۴۰۱	۳۲۱۹۸۲	۳۲۴۵۷۵	۳۲۷۵۸۳
۳۳۱۱۶۵	۳۳۳۸۷۵	۳۳۴۶ ۴	۳۳۵۰۸	۳۳۵۴۷۹
۳۵۱۱۹۰	۳۵۵۱۴۲	۳۵۷۴۸۳	۳۶۲۹ ۵	۳۶۴۵۱۶
۳۷ ۵۱۵	۳۷۳۲۷۷	۳۷۳۵۶۳	۳۷۴۷۰۵	۳۹۳۶۹۶
۴۰۱۰۹۸	۴۰۸۶۶۸	۴۱۱۹۷۱	۴۱۲۵۷۲	۴۱۸۰۹۵
۴۱۹۵۴۸	۴۲۰۸۴۸	۴۲۴۷۶۴	۴۲۵۴۷۱	۴۳۰ ۰۶
۴۳۹۲۳۳	۴۴۴۹۱۳	۴۴۶۱۸۶	۴۵۲۳۲۰	۴۵۳۰۱۹
۴۵۴۷۶۱	۴۶۴ ۵۸	۴۶۶۷۴۷	۴۷۰۹۵۴	۴۸۲۶۴۳
۴۹۶۹۹۹	۴۹۸۱۱۱	۵ ۲۸۴۳	۵ ۵۴۱	۵۰۵۵۳۲
۵۱۱۳۹۵	۵۱۸۹۷۱	۵۱۹۸۱۴	۵۲۵۷۱۴	۵۲۷۰۷۵
۵۳۱۵۲	۵۳۱۵۴۲	۵۳۱۸۶۲	۵۳۵۳۸۶	۵۴ ۴۸۰
۵۴۰۷۹۸	۵۴۶۴۲۴	۵۴۶۹۱۷	۵۴۷۱۷۴	۵۴۸۹۶۷
۵۵۲۳ ۰	۵۵۴ ۸۵	۵۷۴۴۶۶	۵۷۸۸۴۷	۵۸۳۴۲۷

۵۸۳۵۰۸	۵۸۷۷۹۸	۵۹ ۱۱۹	۵۹۶۹۵۲	۶۰۲۳۶۰
۶۰۲۷۵۷	۶۰۴۲۸۱	۶۱۵۲۵۸	۶۱۵۹۷۶	۶۲۲۳۸۹
۶۲۴۷۲۶	۶۲۵۷۴۲	۶۲۶۸۵۸	۶۳۲۳۰۹	۶۳۶۴۸۴
۶۴۱۲۰۲	۶۴۸۲۶۹	۶۴۸۴۸۴	۶۵ ۴۳	۶۵۱۵۵۳
۶۵۷۳۳۱	۶۵۸۵۹۸	۶۷۶ ۳۳	۶۷۹۸۶۶	۶۸۳۳۵۴
۶۸۶۰۷۷	۶۸۷۴۲۷	۶۸۷۷۱۲	۶۹۲۷۸	۶۹۳۷۶۶
۶۹۸۶۶۴	۷۱۳۸۹۴	۷۲۱۹۹۵	۷۲۸۵۷۲	۷۳۲۷۰۳
۷۳۶۰۳۰	۷۴۲۳۸۵	۷۴۳ ۲۸	۷۴۹۳۲۲	۷۵ ۱۱۷
۷۶۰ ۷۹	۷۶۷۷۵۲	۷۷۸۶۷۶	۷۸۳۹۶۴	۷۸۵۷ ۶
۷۸۶۷۲۶	۷۸۷۴۰۸	۷۸۷۹۶۸	۷۹ ۵۲۴	۸۱۸۷۸۱
۸۲ ۳۲۰	۸۲۱ ۱۱	۸۲۳۱۳۱	۸۲۶۱۷۹	۸۲۸۱۲۸
۸۳۷۸۳۹	۸۴۱۱۲۵	۸۴۱۳۴۷	۸۴۴۸۹۴	۸۵۲۴۷۶
۸۶۳۱۷۱	۸۶۹۱۸۵	۸۷۹۵۸۱	۸۸۳ ۵۷	۸۸۳۶۴
۸۸۵۷۵۱	۸۹۰۷۲۶	۸۹۵۳۳۵	۹ ۶۲۳۵	۹۱۵ ۴۴
۹۱۹۱۷۶	۹۴۴۲۰۸	۹۵ ۲۳۶	۹۵۴۹۱۱	۹۵۷۲۸۶
۹۵۹۶۵۹	۹۶۶۶ ۵	۹۷۱۴۵۵	۹۷۲۶۲۶	۹۷۶۳۴
۹۸۳۴۲۶	۹۹۳۶۱۹	۹۹۴۳۲۲	۹۹۴۹۵	۹۹۴۹۶۷

اترپردیش شاہراہ ترقی پر

ثانوی تعلیم کی اصلاح کے لیے کمیشن کا تقرر ـــــ امداد باہمی کاشت انجمنوں کے لیے رہبر منصوبے ـــــ سیلاب زدہ علاقوں کے افسران کو ہدایات ـــــ بچوں کی ہدایات و بہبود کونسل کی سرگرمیاں ـــــ شکر کی پیداوار کا نیا ریکارڈ ـــــ مواضعات میں سڑکوں کی تعمیر ـــــ گشت گرد شنکراچاریہ کی یادگار ـــــ دس شہروں میں میٹرک باٹ کا استعمال ضروری ـــــ متفرقات

حکومت اترپردیش نے ۱۲ ممبروں پر مشتمل ایک ثانوی تعلیم کمیشن مقرر کیا ہے جو علاوہ دیگر امور کے ریاست میں ثانوی تعلیم کے کمرشل نظم و نسق اور ڈھانچہ سے متعلق مسائل پر غور و خوض کرے گا۔

کمیشن کے ذریعہ جن دوسرے مسائل پر غور و خوض کیا جائے گا ان میں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کے بورڈ کی ازسرنو تشکیل۔ مالی امداد۔ طلبا کے اندر بدنظمی۔ قومی خدمت اسکیم۔ ڈگری اور ثانوی تعلیم کے مختلف مراحل میں تبدیلیوں سے متعلق مرکزی حکومت کے مشوروں معیار تعلیم میں انحطاط اور انگریزی اور ریاضی کے مضامین میں ناکامی کے تناسب میں اضافہ سے متعلق مسائل شامل ہیں۔

ریاستی پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین شری رادھا کرشن اگروال کی زیر صدارت تشکیل شدہ اس کمیشن کے ممبران حسب ذیل ہوں گے۔

کرنل کے۔ بی۔ بھٹناگر۔ وائس چانسلر آگرہ یونیورسٹی۔ وائس چانسلر رڑکی یونیورسٹی۔ شری ہری ہر پانڈے۔ شری راج ناتھ کنزرو۔ صدر۔ یو۔ پی ہیڈ ماسٹرس ایسوسی ایشن۔ شری بھگوتی پرشاد شکلا ایم۔ اے۔ شری دیوی پرشاد مصرا ایم۔ ایل۔ اے۔ شری رامائن رائے ایم۔ ایل۔ اے۔ شری دیرسین ایم۔ ایل۔ اے۔ شری عزیز امام ایم۔ ایل۔ اے۔ شری دیپ نرائن منی ترپاٹھی ایم۔ ایل۔ اے۔ شریمتی چندراوتی ایم۔ ایل۔ اے۔ شری کنھیا لال گپتا ایم۔ ایل۔ سی۔ شری کرشن دیو پرشاد گوڑ ایم۔ ایل۔ سی۔ شری شیام بہاری ویراگی ایم۔ ایل۔ سی۔ ڈاکٹر ایم۔ ایل۔ گجرال پرنسپل۔ کے۔ جی۔ میڈیکل کالج لکھنؤ۔ ڈاکٹر آر۔ کے۔ سنگھ پرنسپل بی۔ آر کالج آگرہ۔ ڈاکٹر اے۔ سی۔ ترویدی۔ پرنسپل ہرکورٹ بٹلر ٹیکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ کانپور۔ ڈاکٹر بی۔ کے کیلکر۔ ڈائرکٹر ای۔ آئی۔ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کانپور۔ ڈاکٹر ایس۔ کے انت راؤ ڈین کالج آف ایگریکلچر یونیورسٹی رودرپور۔ شریمتی مہادیوی ورما ایم۔ ایل۔ سی۔ ڈاکٹر کماری کچن لتا سبروال۔ پرنسپل مہیلا ودیالیہ لکھنؤ۔ پروفیسر حبیب الرحمن سابق پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڑھ یونیورسٹی۔ شری کے۔ ایس سریواستو پرنسپل ڈی۔ ایس۔ بی۔ ڈگری کالج نینی تال۔ شری ست گرد شرن اوستھی پرنسپل بی۔ ایس۔ این ڈی کالج کانپور۔ شری ایم۔ ڈاٹرے پرنسپل لامارٹینیر کالج لکھنؤ۔ ڈاکٹر اے۔ آر قدوائی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ڈاکٹر گوپال ترپاٹھی سابق پرنسپل۔ کالج آف ٹیکنالوجی بنارس ہندو یونیورسٹی شری ملولے سنگھ جوائنٹ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم اترپردیش شری کبیر ناتھ شکل سنسکرت یونیورسٹی وارانسی شری کیلاش نرائن مالویہ۔ ڈپٹی سکریٹری محکمہ تعلیم اترپردیش اور شری رگھوناتھ سرن سوری ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیم الہ آباد (سکریٹری)

اس کمیشن کو جس کا صدر مقام الہ آباد میں ہوگا تعلیمی اداروں کا معائنہ کرنے اور محکمہ تعلیم کے افسروں تعلیمی اداروں کے منیجروں اور افسران اعلیٰ اور ثانوی تعلیم میں دلچسپی رکھنے والے دیگر اشخاص سے انٹرویو کرنے کے اختیارات حاصل ہوں گے۔

مرکزی حکومت نے منصوبہ بندی کمیشن ریزرو بنک آف انڈیا اور اہم مرکزی اداروں کے مشورے سے امداد باہمی کاشت کے متعلق چند اہم فیصلے کئے ہیں۔ قومی ترقیاتی کونسل نے بھی ان فیصلوں کی توثیق کی ہے اور اترپردیش کے لئے ۱۰۱ امداد باہمی کاشت انجمنوں پر مشتمل ۴۵ رہبر منصوبے قطعی کئے گئے ہیں۔ یہ سفارش کی گئی ہے کہ رہبر منصوبے پر عملدرآمد کے ساتھ ساتھ رہبر منصوبہ کے علاقہ کے باہر نئی امداد باہمی کاشت انجمنیں رضاکارانہ طور پر قائم کی جا سکتی ہیں۔ رہبر منصوبہ کی انجمنوں کے علاوہ ان نئی انجمنوں اور موجودہ انجمنوں میں سے جن کی کارکردگی بہتر ہوگی وہ خصوصی مالی اور تکنیکی امداد پانے کی مستحق ہوں گی۔

مالی امداد کے ضمن میں ایک انجمن کو ۴ ہزار روپیہ کے درمیانی اور طویل مدت کا قرضہ۔ گودام اور مویشیوں کے باڑے کے لئے ایک انجمن کو ۵ ہزار روپیہ (۷۵ فی صدی قرضہ اور ۲۵ فی صدی امداد کے طور پر) اور انتظامی امور کے لئے ایک انجمن کو ۱۲ ہزار روپیہ کی مالی امداد مل سکتی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف رہبر منصوبہ کی انجمنوں کے سرمایہ حصص کے سلسلہ میں ریاستی حکومت ایک انجمن کو زیادہ سے زیادہ دو ہزار روپیہ دے سکتی ہے۔

یہ بھی سفارش کی گئی ہے کہ مختلف اسکیموں کے تحت دی جانیوالی مالی امداد کے سلسلہ میں انفرادی کسانوں کے مقابلہ میں امداد باہمی کاشت انجمنوں کو ترجیح دی جائے۔

اترپردیش میں گزشتہ مہینہ کے دوران میں چار مشترکہ کاشت انجمنوں کا رجسٹریشن ہوا جس سے مالی سال رواں کے دوران میں اب تک رجسٹر شدہ انجمنوں کی تعداد بڑھ کر ۲۲ ہو گئی جبکہ ۲۰ انجمنوں کے رجسٹریشن کا نشانہ مقرر تھا۔

ریاست میں اب امداد باہمی کاشت انجمنوں کی مجموعی تعداد بڑھ کر ۳۱۴ ہو گئی ہے۔ جن کی نوعیت کے اعتبار سے تقسیم یہ ہے: مشترکہ زراعت انجمنیں ۲۰۵ — اجتماعی کاشت انجمنیں ۲ — بہتر کاشت انجمنیں ۸۸ ۔ اور کاشت سے متعلق کسانوں کی انجمن ایک۔

ان انجمنوں کے ممبروں کی تعداد بڑھ کر ۹۷۷۹ ہو گئی ہے۔ اور زیر کاشت رقبہ ۸۵۶۱۳ ایکڑ ہے۔ ان کا سرمایہ حصص ۲۳۲۳۱۵۷ روپیہ اور ان کے پاس جمع کی گئی رقم ۲۲۴۳۸۲ روپیہ ہے۔

زیر نظر مدت میں ۱۰۶۲۲۲ روپیہ کے قرضے دیئے گئے اور اس ضمن میں ۱۴۱۵۵۵ روپیہ وصول کیا گیا۔

دہرہ دون کی ٹونس وادی کی کاشت انجمن نے قریب کی ہرت آبپاشی کی سہولت حاصل کرنے کے لئے ایک نالی تعمیر کی۔ آگرہ کے سابق فوجیوں کی امداد باہمی کاشت انجمن نے دو کچے کنوئیں بنائے اور آگرہ میں کنڈھو۔ امداد باہمی کاشت انجمن کے ممبروں نے نصف میل لمبی گول تعمیر کی۔

غذائی پیداوار بڑھانے کے لئے تقریباً ۷۲۵ ایکڑ کے رقبہ میں ہری۔ کیمیاوی اور کمپوسٹ کھاد استعمال کی گئی۔

کانپور کے ماڈرن کوآپریٹیو فارم نے زیر نظر مہینہ میں ۲۰ من دھونے کا صابن — ۲۷۵ گز چٹائی — اور ۵۰ گز رسی تیار کی۔ کھادی اور دیہی صنعتوں سے متعلق کل ہند بورڈ نے اس انجمن کو اسٹور کے بھٹہ کے لئے ۱۰ ہزار روپیہ مالی امداد اور ۱۸ ہزار روپیہ قرضہ کے طور پر دیئے جانے کی منظوری دی۔ الہ آباد کی یوپی امداد باہمی کاشت انجمن نے اپنے ہریجن ممبروں کے مفاد کے لئے کھال اُتارنے کی اسکیم شروع کی ہے۔

امداد باہمی کاشت سے متعلق تربیتی ادارہ واقع رامپور میں امداد باہمی کاشت انجمنوں کے نمائندوں اور دیگر غیر سرکاری افراد پر مشتمل ٹولی گروپ کو تربیت دی جا رہی ہے۔

ریاستی محکمہ مال کے افسروں سے کہا گیا ہے کہ وہ اس سال موسم سرما میں اپنے دورہ کے دوران میں سیلاب زدہ علاقوں پر خصوصی توجہ دیں۔ علاوہ ازیں ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ زیر کاشت اور آبپاشی کے رقبہ کے اعداد و شمار کی جانچ کرنے اور فصلوں کی کٹائی کے تجربہ کے لئے بلاک کے علاقوں میں ترقی اور منصوبوں کے کاموں کا معائنہ کریں۔ ان سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ اس امر کے متعلق اطمینان کر لیں کہ ترقی اور منصوبہ بندی کے قرضہ کی رقومات کا باقاعدہ حساب کتاب رکھا جاتا ہے اور ضروری کاغذات بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کے ذریعہ تحصیلداروں کو

بھیج دیے جاتے ہیں۔

ان افسروں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر معائنہ کے دوران میں موجود قواعد اور ضابطہ کی پابندی کے سلسلہ میں کوئی خامی کا پتہ چلے تو وہ اس کو فوری طور پر دور کرنے کے لئے اقدامات کریں اور وہ یہ بھی دیکھیں کہ مقامی دفتروں میں بدعنوانیوں کو ختم کرنے سے متعلق جو ہدایات جاری کی گئی ہیں ان پر سختی کے ساتھ عمل ہوتا ہے یا نہیں

دورہ کرنے والے افسروں کو یہ ہدایات جاری کی گئی ہیں کہ وہ سیلاب زدہ علاقوں کی ضروریات پر خصوصی توجہ دیں وہ یہ بھی دیکھیں کہ فصلوں کے نقصانات کا صحیح تخمینہ لگایا گیا ہے یا نہیں۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی اطمینان کرلیں کہ تمام مستحق معاملات میں مناسب امداد بہم پہنچائی گئی ہے اور مالگذاری کی چھوٹ یا اس کی وصولی کے التوا کی جو سہولتیں دی گئی ہیں اس کی نوٹس کسانوں کو بر وقت دی گئی ہے ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ یہ معلوم کریں کہ ایسا کوئی علاقہ ہے جہاں باوجود ضرورت کے امدادی اقدامات نہیں کئے گئے ہیں اور اگر ایسا کوئی علاقہ ہو تو وہ اس کے بارے میں اعلیٰ حکام کو فوراً مطلع کریں۔

ان افسروں کو یہ بھی ہدایات دی گئی ہیں کہ وہ پڑتال کے کام پر خاص طور پر توجہ دیں اور یہ دیکھیں کہ حصول زمین کے معاملات میں ٹھیک طور سے عملدرآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔

ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آراضی انتظامیہ کمیٹیوں کی کارکردگی کی پورے طور پر جانچ کریں۔

علاوہ ازیں وہ اس امر کی بھی جانچ کریں کہ پڑی جوتیں پڑتی تو نہیں پڑی ہیں اور اگر ساڑھے بارہ ایکڑ سے زائد رقبہ کی جوتیں مسلسل تین سال سے پڑتی پڑی ہوں تو وہ اس کا خیال رکھیں کہ یہ زمینیں باضابطہ طور پر اسامیوں کو کاشت کے لئے دے دی جائیں۔

مالگذاری کے بقایا کی فوری وصولی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے حکومت نے اس امر پر زور دیا ہے کہ ادھی واسی کے تمام زیر سماعت معاملات اس جاڑے کے دورہ کے دوران میں فیصل ہو جائیں۔

ضلع مجسٹریٹ اضلاع میں عام طور پر ۲۰ دن تک دورے پر رہیں گے اور جہاں کہیں اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تعینات ہوں گے وہاں ضلع مجسٹریٹ اور اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ۲۰۔۳۰ دن دورے پر رہیں گے۔

سب ڈویژنل افسران ۶ ہفتہ سے لے کر دو ماہ تک اور تحصیلداراً اور نائب تحصیلدار ۴۵ سے لے کر ۶۰ دن تک دورے پر رہیں گے۔

ایک سے زیادہ سب ڈویژنوں کے انچارج افسران زیادہ سے زیادہ دو ماہ تک دورے پر رہیں گے۔ جاڑے کے ان دوروں میں چک بندی والے اضلاع میں سب ڈویژنل افسر کے معائنہ کے معمول کے فرائض اڈیشنل سب ڈویژنل افسران انجام دیں گے تاکہ بندوبست افسران (چک بندی) چک بندی کے کام پر زیادہ سے زیادہ توجہ دے سکیں۔

بچوں کی فلاح وبہبود سے متعلق ریاستی کونسل ۱۹۵۰ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک اس کی سرگرمیوں میں گوناگوں توسیع کی جاچکی ہے۔

یہ کونسل جس کا صدر مقام موتی نگر لکھنؤ میں ہے سیلا دتی بالگرہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بے گھر بچوں کا گھر ہے ۱۹۵۴ء میں اس ادارہ میں صرف ۴ بچے تھے۔ اب ان بچوں کی تعداد بڑھ کر ۳۵ تک پہنچ گئی ہے جن کی وہاں پرورش کی جاتی ہے اور مفید صحت غذا اور طبی سہولت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ بڑے بچوں کو مناسب تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لئے تربیت یافتہ میٹرن اور دوسرا تجربہ کار عملہ مقرر ہے جو لاولد والدین اس قابل ہوں کہ وہ ان بچوں کی پرورش کرسکتے ہیں اور ان کو مناسب تعلیم دے سکتے ہیں وہ ان کو اپنا متبنیٰ بھی کرسکتے ہیں۔

بچوں کی ایک لائبریری سروجنی نائیڈو پارک حضرت گنج لکھنؤ میں واقع ہے جہاں ان کے لئے کھیل کود کا بھی انتظام ہے۔ اس وقت لائبریری میں ہندی اور انگریزی کی ۵۰۰ کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں اخبار اور رسائل بھی منگائے جاتے ہیں۔

ریاستی کونسل کی جانب سے بچوں کی فلاح وبہبود کے لئے ہر ضلع میں ضلع کونسل بھی قائم کی گئی ہیں جس کا صدر متعلقہ ضلع مجسٹریٹ ہوتا ہے۔

ریاستی کونسل نے مرکزی سماجی فلاح بورڈ کے اشتراک سے

اس سال گزشتہ مئی اور جون میں ۵۰-۵۰ لڑکیوں پر مشتمل دو جماعتیں بھی سیاحت کے لئے ضلع نینی تال بھیجیں۔ ان جماعتوں میں ۱۲ سے ۱۶ سال تک کی عمر کی ایسی لڑکیاں شامل تھیں جن کے سرپرستوں کی ماہانہ آمدنی ۲۰۰ روپیہ یا اس سے کم تھی۔ ان دونوں جماعتوں کی رہنمائی ایک ایک خاتون نگراں اور دو دو خواتین ٹیچر کر رہی تھیں۔

لکھنؤ کے مختلف محلوں میں بچوں کی دلچسپی سے متعلق فلم شو کا بھی انتظام کیا گیا۔ اس کے علاوہ ریاستی کونسل ریاست کے متعدد اضلاع میں ریاستی صحت بورڈ کی مدد سے بچوں کے کھیل کود کے مرکزوں میں کھیل کود کا سامان فراہم کرنے کے لئے بھی کوشش کر رہی ہے۔

اس وقت شہر لکھنؤ میں ریاستی کونسل سے ملحق بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق ۹ محلہ کمیٹیاں کام کر رہی ہیں۔ ان کمیٹیوں کو غریب و ضرورت مند بچوں میں تقسیم کرنے کے لئے کتابیں اور مکھن نکالا ہوا دودھ مہیا کیا جاتا ہے۔

قومی اہمیت کے دنوں مثلاً بچوں کا دن یوم جمہوریت اور یوم آزادی کے موقعوں پر ریاستی کونسل کی جانب سے ریاست کے تمام شہروں میں کھیل کود موسیقی رقص ڈرامہ وغیرہ کے مختلف پروگراموں کا انتظام کیا جاتا ہے جن میں ہزاروں بچے شریک ہوتے ہیں۔

اترپردیش میں اس سال شکر کی ریکارڈ پیداوار ہونے کی امید ہے۔ گزشتہ سیزن میں ریاست میں شکر کی واقعی پیداوار ۱۲،۷۰ لاکھ ٹن تھی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس سال شکر کی پیداوار ۱۳،۵۷ لاکھ ٹن ہوگی۔

گزشتہ سیزن میں ملک میں شکر کی مجموعی پیداوار ۲۴،۵۲ لاکھ ٹن تھی۔ گنے کی فی ایکڑ پیداوار جو سنہ ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۴۱۹ من تھی سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء میں بڑھ کر ۸،۴ من ہوگئی۔ موجودہ سیزن میں گنے کے زیر کاشت رقبہ ۲۲،۶۸ لاکھ ایکڑ ہے جبکہ گزشتہ سیزن میں یہ رقبہ ۱۹،۱۷ لاکھ ایکڑ تھا۔

گنے اور شکر کی پیداوار میں یہ اضافہ بڑی حد تک آبپاشی کی سہولتوں میں توسیع۔ نائٹروجن کھادوں کی تقسیم۔ بہتر بیجوں کی فراہمی اور سڑکوں پلوں اور پلیوں کی تعمیر کی بدولت ہوا ہے۔

دوسرے منصوبہ کے پہلے چار برسوں میں گنے کی کاشت کے علاقوں میں ۷،۸۲ پختہ کنویں تعمیر کئے گئے اور مشین سے ۵۶۸۴ کنووں کی کھدائی کی گئی۔ علاوہ ازیں ۴۸۹۴ رہٹیں لگائی گئیں اور ۱۸۶۲ چھوٹے ٹیوب ویل تعمیر کئے گئے۔ زیر نظر مدت میں گنے کے فارموں کو فیکٹریوں سے ملانے کے لئے سیمنٹ کنکریٹ کی ۱.۵ میل لمبی سڑکیں ۱،۸۷۰ میل لمبی کچی اور پکی سڑکیں اور ۲۵۳۶ پل اور پلیاں تعمیر کی گئیں۔

بہتر بیجوں کی تقسیم کے سلسلہ میں جس کی بدولت پیداوار میں دس فی صدی اضافہ ہوا ہے منصوبہ کے تحت ۲،۱۷ لاکھ من بیج تقسیم کرنے کے مقررہ نشانہ کو پار کیا جا چکا ہے اور یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ منصوبہ کے آخر تک ۲۸۲،۷۵ لاکھ من بیج تقسیم ہو جائیں گے۔ منصوبہ کے تحت ۶۱ لاکھ من کیمیاوی کھاد تقسیم کرنے کا مقررہ نشانہ بھی منصوبہ کے آخر تک پورا ہو جائے گا۔

حکومت اترپردیش نے سڑکوں کی تعمیر سے متعلق مرکزی ریزرو فنڈ سے ملنے والی امداد سے ریاست میں متعدد سڑکوں کی تعمیر کے لئے منظوری دے دی ہے۔ اس ضمن میں ضلع الٰہ آباد میں سڑکوں کی تعمیر کے پروگرام پر ۱۰۲۳۸۰ روپیہ صرف ہونے کا تخمینہ لگایا گیا ہے جس میں مرکزی حکومت ۴۳۵۸۵ روپیہ اور ریاستی حکومت ۲۹۳۹۷ روپیہ کی رقم ادا کرے گی۔

حکومت چاہتی ہے کہ ایسے تمام معاملات میں ہر اسکیم کی کل لاگت کا ایک تہائی حصہ عوام کے رضاکارانہ چندہ سے جمع کیا جائے چنانچہ ضلع الٰہ آباد میں سڑکوں کی تعمیر کے پروگرام کے سلسلہ میں عوام سے جو چندہ اکٹھا کیا جائے گا اس کی مجموعی رقم ۲۹۳۹۸ روپیہ ہوگی۔

ضلع متھرا میں سڑک کی تعمیر کے پروگرام پر تخمیناً ۱۷۴۵۰۰ روپیہ صرف ہوگا جس میں مرکزی حکومت ۸۷۲۵۰ روپیہ اور ریاستی حکومت ۴۳۶۲۵ روپیہ دے گی اور عوام کے چندہ سے تخمیناً ۴۳۶۲۵ روپیہ جمع کیا جائے گا۔

ضلع جونپور کے پروگرام کے تحت تخمیناً ۴۴۷۰۰ روپیہ کی لاگت سے سڑکیں تعمیر ہوں گی اس سلسلہ میں مرکزی حکومت ۲۲۳۵۰ روپیہ اور ریاستی حکومت ۱۱۱۷۵ روپیہ ادا کرے گی اور عوام کے چندہ

کے ذریعہ تخمیناً ۵،۱۱۱۱۰ روپیہ فراہم کیا جائے گا۔

ریاستی ادارہ منصوبہ بندی تحقیق و عمل کے ذریعہ تیار کی گئی جدید قسم کے پاخانہ کی ڈیزائن کے مطابق اپنے گھروں میں پاخانوں کی تعمیر کے لئے ریاست کے دس اضلاع کے دس مواضعات کے باشندوں کو انفرادی طور پر مالی امداد دی جائے گی۔ ہر ایک گاؤں کو زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپیہ تک کی مالی امداد دی جائے گی۔ اس طرح ہر ایک پاخانہ کی کل لاگت کی تین چوتھائی رقم مالی امداد کے طور پر دی جائے گی اور بقیہ ایک چوتھائی رقم گاؤں والے کو خود خرچ کرنا ہوگا۔ ہر ایک پاخانہ کی تعمیر پر ۲۵ - ۳۰ روپیہ خرچ آتا ہے۔

یہ فیصلہ گزشتہ اتوار کو دودھان کھون میں وزیر صحت شری حکم سنگھ کی زیر صدارت منعقدہ ریاستی صحت بورڈ کے جلسہ میں کیا گیا۔ اس فیصلہ کا مقصد دیہی علاقوں میں جدید قسم کے پاخانوں کو مقبول بنانا ہے۔

ادارہ منصوبہ بندی تحقیق کے ذریعہ تیار کی گئی جدید قسم کے پاخانہ کی ڈیزائن سے دیہی عوام کی ضروریات پوری ہوتی ہے اور اس پر بہت کم لاگت بھی آتی ہے۔ اور پانی سے صاف کئے جانے کے بعد اس میں سے بدبو بھی نہیں آتی۔ ضلع لکھنؤ کے چنہٹ جھایا بلاک کے تقریباً ۲۲ مواضعات میں اس کا تجربہ بھی کیا جا چکا ہے جہاں گاؤں والوں کے ذریعہ ۷ سے زیادہ پاخانے تعمیر کئے جا چکے ہیں۔

بورڈ کے جلسہ میں مختلف اضلاع کے بچوں کے کھیل کود کے مرکزوں کے لئے مالی امداد کی درخواستوں پر بھی غور و خوض کیا گیا۔

بورڈ نے ریاست کے مختلف میونسپل بورڈوں کو مختلف صحتی منصوبے جیسے ٹیوب ویل اور فلش پاخانوں کی تعمیر اور پانی کی نکاسی کے نظام کو بہتر بنانے وغیرہ پر عملدرآمد کے لئے منظوری دی۔

حکومت اتر پردیش کیدار ناتھ میں تقریباً ۱۴ ہزار فیٹ کی بلندی پر واقع بھگوان شیو کے مشہور مندر کے قریب جگت گرو سوامی شنکراچاریہ کی یادگار تعمیر کر رہی ہے۔

اس یادگار کی تعمیر پر تخمیناً ۲۰ ہزار روپیہ صرف ہوگا۔ یہ یادگار جو تقریباً ۹ ہزار مربع گز کے رقبہ میں تعمیر کی جا رہی ہے ایک چبوترہ کی شکل میں ہوگی جس کی ۱۲ فیٹ اونچی دیواروں پر سوامی شنکراچاریہ کے ارشادات کندہ کئے جائیں گے۔ چبوترہ کے دونوں طرف یاتریوں کے لئے سائبان ہوں گے۔ اور اس یادگار کے گرد و پیش خوبصورت باغ لگائے جائیں گے۔

جگت گرو شنکراچاریہ کی مناسب یادگار تعمیر کرنے کا خیال پہلے پہل وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند کے ذہن میں اس وقت آیا جب وہ تقریباً دو برس پہلے کیدار ناتھ کی یاترا پر گئے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی کی عظیم ترین شخصیت جگت گرو شنکراچاریہ نے اپنے جدید افکار سے ہندوستانی فلسفہ کو مالا مال کیا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے اسٹیٹ ٹاؤن اور ولیج پلانر کو جگت گرو کی شایان شان یادگار کا ڈیزائن تیار کرنے کے لئے کہا۔

یادگار کی تعمیر اس سال گرمی کے مہینہ میں شروع کی گئی تھی۔ جاڑے کی وجہ سے اس کی تعمیر کا کام بند کرنا پڑا۔ اس کی تعمیر آئندہ گرمی کے موسم میں دوبارہ شروع کی جائے گی اور امید ہے کہ گرمی کے موسم ہی میں اس کی تعمیر مکمل ہو جائے گی۔

ریاستی حکومت کے ذریعہ آج جاری کئے گئے ایک پریس نوٹ میں بیوپاریوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ریاست کے دس شہروں کے میونسپل علاقوں میں جہاں میٹری باٹوں کا استعمال قانوناً لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ لین دین میں اب پرانے باٹوں کو استعمال کرنا جرم ہے۔ بیوپاریوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ خود اپنے مفاد میں پرانے باٹوں کا استعمال فوراً بند کر دیں۔

پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ ریاست میں میرٹھ۔ آگرہ۔ جھانسی الٰہ آباد۔ وارانسی۔ گورکھپور۔ لکھنؤ۔ کانپور۔ بریلی اور مراد آباد کے میونسپل علاقوں میں یکم اکتوبر ۱۹۵۸ء سے کاروباری لین دین میں میٹری نظام کے باٹوں کا استعمال اختیاری بنیاد پر رائج کیا گیا تھا۔ دو سال کی عبوری مدت اس وجہ سے دی گئی تھی کہ عوام اور خاص طور پر بیوپاری نئے باٹوں کے استعمال سے مانوس ہو جائیں۔ اس عبوری مدت میں نئے باٹوں کے ساتھ پرانے باٹوں کے استعمال کی بھی اجازت دی گئی تھی۔ دو سال کی یہ مدت ۳۰ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ختم ہو گئی۔ اب اس کے بعد کوئی

بالا میونسپل علاقوں میں کاروباری لین دین میں میٹری باٹوں کے علاوہ کوئی دوسرا باٹ استعمال کرنا جرم ہے۔ حکومت کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کچھ بیوپاری خاص طور پر چاندی ہونے۔ پھل اور سبزی کے بیوپاری اب بھی پرانے باٹ استعمال کر رہے ہیں۔ اس لئے متعلقہ بیوپاریوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اگر وہ پرانے باٹوں کو استعمال کرنا بند نہیں کریں گے تو نہ صرف ان کے باٹ ضبط کر لئے جائیں گے بلکہ ان کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی جائے گی۔

متفرقات

خریف اور ربیع مہموں کے سلسلہ میں انعامات حکومت اترپردیش نے مالی سال رواں کے دوران میں خریف اور ربیع مہموں کے سلسلہ میں انعامات دینے کے لئے ۵۴ اضلاع کو ۶۹ روپیہ کی رقم الاٹ کی ہے۔ سرگرم اور اچھا یا بلاکوں کی بہترین گاؤں سبھاؤں کو جو انعامات ملیں گے وہ متعلقہ گاؤں سبھاؤں کے ذریعہ زراعت اور نگہداشت مویشیان کے پراگراموں کی تکمیل کے لئے کام میں لائے جائیں گے۔

مذکورہ رقم کے علاوہ لکھنؤ، فیض آباد، گورکھپور، وارانسی، الہ آباد، جھانسی، بریلی، نینی تال، آگرہ، اور میرٹھ کے اضلاع میں سے ہر ایک ضلع کے لئے ۸۰۰ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔ یہ رقم ہر ایک منطقہ کے بہترین سرگرم اور اچھا یا بلاکوں کو ایک مستقل شیلڈ بطور انعام کے دینے کے لئے صرف کی جائے گی۔

ضلع لکھنؤ کے لئے بھارت درشن دورہ اور گرام سبھا ٹیک سمیلن کے لئے مزید ۳۱۵۰۰ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

سرخ بندی

سلسلہ صفحہ ۲۸

آخری دیدار کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں رفاقت کے آنسو چھلک رہے تھے کہ اتنے میں چھت پر شور ہوا۔ "کنور، کنور، جلدی کرو۔ راجکمار خطرے میں ہیں۔ کنور چونک پڑا۔ بھالے کی نوک گراں ڈیل راجو کی پچھلی ران میں چبھی اور غصہ میں بپھرا ہوا راجو آگے بڑھنے لگا۔ بہادت کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ تیراندازوں کی کمانیں جھک گئیں، بہادر راجپوتوں نے جاں نثار گنیش سنگھ کی بے نظیر قربانی کے سامنے گردنیں جھکا دیں۔ ایک خوفناک ٹکراؤ اور ایک چیخ۔ بھاٹک ٹوٹ گیا تھا مگر گنیش کی بھینٹ لینے کے بعد!

راجکمار کے ساتھی بھوکے بھیڑیوں کی طرح اچل سنگھ کے سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ناگاہ راجو کی نظر اچل سنگھ پر جا پڑی۔ وہ داہنی طرف سب کی نظروں سے بچتا ہوا ایک طرف جا رہا تھا۔ راجو اس کی طرف لوٹا بپھرتا جھپٹا۔ کنور نے بھی راجو کو اچل سنگھ کی طرف جاتے دیکھ لیا۔ وہ بھی کسی طرح اس کے نزدیک جا پہنچا۔ اچل سنگھ اپنے اصطبل کے قریب جا کر رکا۔ وہاں کئی گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ اتنے میں دو آدمی لکشمی کو گھسیٹتے ہوئے لائے۔ وہ رسیوں میں جکڑی تھی۔ منہ پر بھی کپڑا بندھا تھا۔ راجو لکشمی کو اس حال میں دیکھ کر بیقرار ہو اٹھا۔ وہ تلوار سونت کر للکارتا ہوا ان آدمیوں پر حملہ آور ہوا اور کنور سے پکار کر کہا کہ میں ان لوگوں سے نپٹتا ہوں، تم لکشمی کی رسیاں کاٹ کر اس کی حفاظت کرو۔ کنور لڑتا ہوا لکشمی کے قریب پہنچ گیا۔ اتنے میں اچل سنگھ نے اپنا بھالا اٹھایا اور لکشمی کو نشانہ بنا کر اس کی طرف پھینکا۔ لکشمی کے بچنے کی کوئی اور صورت نظر نہیں آتی تھی سوائے ایک صورت کے۔ کنور پھرتی سے آگے بڑھا اور بھالا لکشمی کے بجائے کنور کے سینہ میں پیوست ہو گیا۔ لکشمی کے منہ سے چیخ نکلی۔ راجو کی تلوار نے ایک سپاہی کا سر کاٹا اور دوسرے ہی لمحہ اس کا بھالا ہوا میں سنسناتا ہوا اچل سنگھ کی پشت کے پار ہو چکا تھا۔ اچل سنگھ کے مرتے ہی اس کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

لکشمی کنور کا سر اپنے زانو پر لئے بیٹھی اس کی اکھڑی اکھڑی سانسیں گن رہی تھی۔ کنور نے ایک مرتبہ آنکھیں کھولیں۔ اپنے سینے سے بہتے ہوئے خون میں اپنی انگلی ڈبوئی پھر دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ لکشمی کی پیشانی کی طرف بڑھا۔ کانپتی ہوئی انگلی نے لکشمی کی پیشانی پر "سرخ بندی" بنا دی اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کنور بولا "یہ میری محبت کا نشان تھا۔ یہ انعام آپ ہی کا دیا ہوا تھا اور آج میں اسے آپ کو دے رہا ہوں۔" کنور پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

فہرست تعطیلات حکومت اُتر پردیش

(سنہ ۱۹۶۱ء ۔ سنہ ۸۳-۱۸۸۲ شک)

نام تعطیل	تعداد	تاریخ	دن	نام تعطیل	تعداد	تاریخ	دن
یوم جمہوریت	۱	۲۶ جنوری	جمعرات	× بارہ وفات	۱	۲۵ اگست	جمعہ
شیوراتری	۱	۱۲ فروری	[illegible]	جنم اشٹمی	۱	یکم ستمبر	جمعہ
ہولی		۲، ۳ مارچ	جمعرات، جمعہ	یوم پیدائش مہاتما گاندھی	۱	۲ اکتوبر	پیر
* عید الفطر		۱۹ مارچ	اتوار	دسہرہ	۲	۱۸، ۱۹ اکتوبر	بدھ۔ جمعرات
رام نومی	۱	۲۵ مارچ	سنیچر	دیوالی	۲	۷، ۸ نومبر	منگل۔ بدھ
* عید الضحیٰ	۱	۲۶ مئی	جمعہ	کارتک پورنیما (گنگا اشنان)			
* محرم	۱	۲۳ جون	سنیچر	یوم پیدائش گرو نانک	۱	۲۲ نومبر	بدھ
[illegible]	۱	۳ [illegible]	جمعہ	کرسمس	۱	۲۵ دسمبر	پیر
یوم آزادی	۱	۱۵ اگست	منگل	میک کی مالا ساب سدی	۱	۳۰ دسمبر	سنیچر

* ان تعطیلات کا تعین چاند ہونے پر منحصر ہے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ چاند کے مطابق ان تعطیلات کی تاریخوں میں رد و بدل کر سکتا ہے۔ اور اسٹیٹ بینک بھی اس کی پابندی کرے گا۔

مندرجۂ بالا تعطیلات کے علاوہ ہر سرکاری ملازم مندرجہ ذیل فہرست میں دی ہوئی محدود تعطیلوں میں سے کوئی دو چھٹیاں منا سکتا ہے۔

محدود چھٹیوں کی فہرست

نام تعطیل	تعداد	تاریخ	دن	نام تعطیل	تعداد	تاریخ	دن
یوم پیدائش گرو گوبند سنگھ	۱	(سنہ ۱۹۶۱ء میں گرو گوبند سنگھ کا یوم پیدائش نہیں پڑ رہا ہے سنہ ء میں یہ دو مرتبہ پڑ چکا ہے)					
یوم پیدائش سنت روی داس	۱	۳۱ جنوری	منگل	بدھ پورنیما	۱	۳۰ اپریل	اتوار
الوداع	۱	۱۷ مارچ	جمعہ	محرم	۱	۲۳ جون	جمعہ
یوم پیدائش سکھواں بہادر	۱	۲ مارچ	جمعرات	چہلم	۱	۳ اگست	جمعرات
گڈ فرائی ڈے	۱	۳۱ مارچ	جمعہ	رکشا بندھن	۱	۲۶ اگست	سنیچر
بیساکھی	۱	۱۳ اپریل	جمعرات	دسہرہ	۱	۱۷ اکتوبر	منگل

مذکورۂ بالا عام تعطیلوں اور محدود تعطیلوں کے علاوہ اس طرح کے تمام دفتروں اور اداروں میں (خزانوں اور ذیلی خزانوں کو چھوڑ کر) حسب ذیل تاریخوں میں بھی چھٹی رہے گی

نام تعطیل	تعداد	تاریخ	دن	نام تعطیل	تعداد	تاریخ	دن
ہولی	۱	۴ مارچ	سنیچر	دیوالی	۱	۹ نومبر	جمعرات

جمعۃ الوداع، محرم اور چہلم کی چھٹیاں چاند دیکھنے پر ضلع مجسٹریٹ متعین کریں گے۔

ضلع مجسٹریٹوں کو سرکاری احکام میں مقررہ شرائط کے ماتحت ان چھٹیوں کے علاوہ تین دن تک کی مقامی چھٹیاں دینے کا بھی اختیار ہے

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو۔

فروری ٦١

جلد ١٥ نمبر ١١

ماگھ ١٨٨٢

٢٦ جنوری سنہ ١٩٦١ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ ٠٠ ٢٥ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
اپراجتا پرساد سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

عنوانات

نیا دور کا یہ شمارہ، فروری کا شمارہ متصور کیا جائے

آئندہ پرچہ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء کا شمارہ ہوگا

نیا دور میں شائع شدہ مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ حکومت اُتر پردیش اُن سے ہر حال متفق ہو ۔

ایک روشن مستقبل کے لیے سرگرم عمل ہو جائیے

یوم جمہوریہ کے موقع پر گورنر کا پیغام

اتر پردیش کے گورنر شری بی رام کرشنا راؤ نے یوم جمہوریہ کے موقع پر حسب ذیل پیغام جاری کیا ہے

میرے لئے یہ امر باعث فخر ہے کہ یوم جمہوریہ کے اس مسرت بخش موقع پر میں اتر پردیش کے عوام کو دلی مبارکباد پیش کر رہا ہوں۔

آج سے گیارہ سال قبل ملک میں خود مختار جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا تھا جس میں ملک کے ہر فرد کو سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف۔ فکر و اظہار، عقائد اور عبادت کی آزادی۔ مساوات اور ترقی کے یکساں مواقع کی ضمانت دی گئی تھی ہم نے ملک کے تمام شہریوں میں باہمی اور اخوت کے جذبات کو پروان چڑھانے، ہر فرد کے وقار کو سربلند کرنے اور قومی اتحاد کو برقرار رکھنے کا بھی عہد کیا تھا۔ اس مبارک موقع پر ہم پر یہ لازم ہے کہ ان مقاصد کو ملحوظ رکھیں اور ایسا طرز عمل اختیار کریں جس سے ان کی تکمیل کے سلسلہ میں ہم اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لاسکیں۔ گزشتہ گیارہ برسوں کے دوران حکومت اور عوام نا ساعد حالات اور بے شمار دقتوں کے باوجود بڑی ثابت قدمی کے ساتھ منزل مقصود کی جانب گامزن رہے ہیں۔ ہمارے دو پنجسالہ منصوبوں کی تکمیل ہو چکی ہے اور تیسرا منصوبہ شروع ہونے والا ہے۔ اقتصادی اور دیگر دشواریوں کے باوجود ہم نے تعلیم، صحت، سماجی تحفظ، مزدوروں کی فلاح، تعمیر مکانات اور آبادکاری کے ضمن میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ زراعت اور صنعت کی ترقی کی بنیاد پڑ چکی ہے اور اسماجی ترقی کے پروگراموں، امداد باہمی منصوبوں اور پنچایتی راج کے قیام کی بدولت ہماری دیہی زندگی میں تیزی سے انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ تدبیریں نہیں بلکہ انسان اس دنیا کو بدل سکتے ہیں ۔ اور جب تک ہم اپنے ذاتی مفاد کو مفاد عامہ کے تابع نہ کرینگے اس وقت تک قومی خوشحالی کا حصول حد درجہ دشوار ہوگا۔

ملک کے بے شمار اور نامعلوم جاں نثاروں کی طویل جد و جہد اور قربانیوں کے بعد ہم نے آج سے تیرہ سال پہلے سیاسی آزادی حاصل کی۔ حصول آزادی کے ڈھائی سال بعد ہم نے جمہوری دستور منظور کیا جو ایک نئے اور ترقی پذیر اقتصادی اور سماجی نظام کے قیام کے لئے بے پناہ قومی جوش و خروش کے باعث باوجود وقت کی کسوٹی پر کھرا اترا ہے۔ ہمارا یہ اولین فرض ہے کہ ہم اپنی بیش قیمت آزادی کی حفاظت کریں اور قومی اتحاد کو مستحکم کرنے کے لئے پوری یکجہتی کے ساتھ کوشش کریں ۔ اور اگر ہم اپنے کو ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں کرینگے اور اپنے محبوب اور محترم لیڈروں کی قیادت میں متحد نہیں رہے تو اس کا امکان ہے کہ ہمارے قدم اکھڑ جائیں اور ایسی قوتیں ہم کو بہالے جائیں جن کے بارے میں نہ تو ہم کو پہلے سے علم ہو سکتا ہے اور نہ ہم ان پر قابو پا سکتے ہیں

آیئے، ایسے اہم موقع پر ہم سب ایک بار پھر یہ عہد کریں کہ ہم پورے خلوص اور وفاداری کے ساتھ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کوشش کریں گے اور ملک کو خوشحال بنانے نیز ایک روشن تر مستقبل کی تعمیر کے لئے پوری تندہی سے سرگرم عمل ہوں گے

چھبیس جنوری ۱۹۶۱ء کو جمہوریۂ ہند کی بارھویں سالگرہ ہے۔ یہ تاریخ ہندوستان کے لیے صرف ایک قومی تہوار کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ ہمیں اسے ۳۱ برس پہلے کی یاد دلاتی ہے جب کہ ہندوستانی عوام نے پہلے پہل آزادی کامل کا عہد دہرایا۔ کامل آزادی کا یہ عہد دسمبر ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا کانگریس کے اجلاس لاہور کے موقع پر جس کی صدارت جواہر لال نہرو کر رہے تھے کیا گیا تھا اور یہ طے ہوا تھا کہ ہر سال ۲۶ جنوری کو یہ عہد عام جلسوں میں دہرایا جائے۔ آزادی کی جدوجہد آخر کار کامیاب ہوئی اور ہندوستان ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہو گیا۔ اس ملک کے لیے ایک آئین تیار کرنے کا کام کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نے دلی میں ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء ہی سے شروع کر دیا تھا۔ یہ کام دو برس گیارہ مہینے سترہ دن میں ختم ہوا اور ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو ۳۹۵ دفعات پر مشتمل ایک آئین تیار کر لیا گیا۔ آئین تیار کرنے میں کافی غور و فکر اور تحقیق و توجہ برتی گئی تھی۔ آئین کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے متعدد کمیٹیاں بنائی گئیں۔ پہلے ان کمیٹیوں نے اپنی رپورٹیں مرتب کیں، پھر اگست ۱۹۴۷ء کے آخر میں آئین کا مکمل مسودہ تیار کرنے کے لیے ایک ڈرافٹنگ کمیٹی قائم کر دی گئی۔ اس کمیٹی کے صدر ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر تھے اور اس کے سیکرٹری بی۔ این۔ راؤ۔ انھوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں آئین کا مسودہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے سامنے پیش کر دیا۔ مسودہ تیار کرنے میں برطانیہ، آسٹریلیا، کناڈا، امریکہ، آئرلینڈ وغیرہ ممالک اور سوویت یونین کے آئین بھی پیش نظر رکھے گئے تھے۔ مسودے کی منظوری کے بعد ۲۶ جنوری کی اہمیت کے مطابق ۱۹۵۰ء کی ۲۶ جنوری سے ملک میں یہ دستور نافذ کر دیا گیا۔ دستور کی رو سے ہندوستان میں ایک جمہوری طرز حکومت رائج کیا گیا تھا اور ہندوستان کو ایک آزاد اور خود مختار قرار دیا گیا تھا۔ آئین وضع کرنے والوں نے ملک کے لیے جمہوری طرز حکومت اس لیے پسند کیا کہ یہ ہندوستانی سیاست کا تقاضا تھا۔ جمہوریت ہندوستان کی قدیم روایات کے عین مطابق ہے۔ قدیم ہندوستان میں ایسے متعدد "جن پد" یا "ریاستوں" کا ذکر پایا جاتا ہے جن میں جمہوریت کی روح جلوہ گر تھی۔ ہندوستان کی پنچایتیں آج بھی اس جمہوریت کی عکاسی کرتی ہیں۔

جمہوری طرز حکومت یوں بھی بہترین طرز حکومت ہے اور آج کی دنیا میں جمہوریت کے علاوہ کسی اور نظام کی گنجائش نہیں ہے۔ جمہوری حکومتوں میں افراد کی صلاحیتیں ابھرنے کے مواقع ملتے ہیں لیکن جمہوری نظام کی بنیادی اقدار ہیں۔ جمہوریت کو عوام سے طاقت ملتی ہے اور عوام کی نمائندہ ہوتی ہے۔ جمہوریت کا مقصد اعلیٰ ہوتا ہے کیونکہ عوام ہی جمہوری حکومت کی تشکیل کرتے ہیں اور عوام ہی حکومت کے مالک ہوتے ہیں۔ ایک مدت مقررہ پر تشکیل حکومت کے لیے عام انتخابات ہوتے ہیں اور اس وقت عوام جو چاہیں اپنے ووٹ سے جس جماعت کو چاہیں برسر اقتدار کر دیں۔ ایک سیاسی مفکر کے بقول جمہوریت اور ڈکٹیٹر شپ میں یہی فرق ہے کہ جمہوریت میں لوگ سروں کو گنتے ہیں اور ڈکٹیٹر شپ میں سروں کو توڑتے ہیں۔

ہندوستان کے دستور اساسی میں افراد کی اس بنیادی عظمت کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے اور دستور اساسی کی تمہید میں آئین مرتب کرنے والوں نے صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا ہے کہ ہم ہندوستان کے رہنے والے اپنے لیے ایک ایسا نظام حکومت منظور کرتے ہیں جس میں ہر شخص کو تحریر و تقریر اور جماعت سازی کی آزادی حاصل ہوگی، جس میں ہر فرد کے ساتھ سماجی اور معاشی انصاف کیا جائے گا اور جس میں ہر شخص کو ترقی کے یکساں مواقع ملیں گے۔ اس تمہید کے علاوہ دستور میں "افراد کے بنیادی حقوق" ایک علحدہ باب میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ ان بنیادی حقوق کے مطابق ہندوستان کے شہری کو آزادیٔ بیان، آزادیٔ عقائد، آزادیٔ مذہب، آزادیٔ تحریر و تقریر اور آزادیٔ جماعت سازی حاصل ہے۔ ہندوستان میں بڑے سے بڑے منصب تک پہنچنے میں اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ ہر تعلیمی ادارے میں اس کا داخلہ ہو سکتا ہے۔ ہر سیاسی جماعت میں وہ شریک ہو سکتا ہے۔ مروجہ قوانین کے ماتحت ہر شخص کی شکایات کی داد رسی ہو سکتی ہے۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر دیا گیا ہے اور اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ انتظامیہ عدالتی معاملات میں دخل اندازی نہ کرے۔ دستور میں لسانی اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق کا بھی خیال رکھا گیا ہے اور ان کے کلچر اور زبان کے سلسلے میں تحفظات عطا کیے گئے ہیں۔ انھیں اپنے مذہبی اسکول کھولنے کی بھی اجازت ہے۔ غرض ہندوستان کے دستور اساسی میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو جمہوریت کی روح ہیں۔

جمہوریۂ ہند میں ہندوستانی عوام کو یہ تمام مواقع اور حقوق ضرور حاصل ہیں لیکن اسی کے ساتھ اُن پر بعض ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ وہ ذمہ داریاں یہ ہیں کہ عوام اپنے ملک کو خوش حال بنانے میں پورا حصہ لیں اور ایسا کوئی قدم نہ اٹھائیں جس سے ملک کی آزادی یا سالمیت کو کوئی خطرہ درپیش ہو جائے یا دوسروں کے حقوق کی پامالی ہو۔ ہندوستان اس وقت ایک نازک اقتصادی دور سے گزر رہا ہے۔ ملک کی معاشی اور سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے پنج سالہ منصوبے بنائے گئے ہیں۔ ان منصوبوں کا مقصد عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہے۔ یہ منصوبے اُسی وقت کامیاب ہو سکیں گے جب انھیں عوام کا اشتراک و تعاون حاصل ہو۔ ہم نے حصول آزادی کے لیے بڑی قربانیاں کی ہیں لیکن جمہوریت کو کامیاب بنانے کے لیے ہمیں ابھی کچھ اور قربانیاں کرنا ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ جشن جمہوریت منانے کے ساتھ ساتھ ہم اس بات کا بھی عہد کریں کہ ہم اپنے ملک کی آزادی کے استحکام اور اس کی اقتصادی، صنعتی اور تعلیمی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور اپنے آپ کو ہر معنی میں ہندوستان کا سچا شہری ثابت کریں گے۔

ایڈیٹر

آزادی کی جھلکیاں کلامِ اکبر میں

[illegible]

حضرت اکبر الٰہ آبادی کے بارے میں پہلے یہ بنیادی نکتہ سمجھ لیا جائے کہ عمر بالآخر کے حالات زرا کچھ رہے ہیں۔ اُن کی شاعری بذلہ گوئی کو چھوڑ کر تمام تر ایک مقصدی شاعری تھی، شعر گوئی کی خاطر نہ تھی۔ گو وہ مقصد کبھی کبھی صرف ہنسی دل لگی تفریح، انبساطِ خاطر ہی رہ جائے۔ ہاں مقصدوں کی فہرست میں اُن کے ہاں سرِ فہرست مذہب اور اس کے ملحقات و متعلقات یعنی اخلاقیات تھے۔ اپنی ذات سے وہ مذہبی اور بڑے گہرے مذہبی تھے۔ توحید گوشت پوست میں رچی ہوئی ہے، فکرِ آخرت سارے سرمایۂ فکری و اعتقادی کا راس المال، کلام کے عاشق، تلاوتِ قرآن کے شیدائی، مذہب کی قدر اُن کی نگاہ میں ساری قدروں سے برتر۔ میدانِ سیاست کے شہسوار کچھ یوں بھی نہ تھے۔ اور پھر شروع سے سرکاری عہدوں کی قید میں گرفتار، اور آخر عمر میں پنشن کی زنجیروں سے گراں بار۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کھل کر کبھی سیاسی اکھاڑے میں قدم رکھ ہی نہ سکے، اور ایسا شمار احرار ذی وقار میں کرا سکے اور نہ شریعتِ آزادی کے احبار و ابرار میں۔

کہنا جو کچھ ہوتا، کھلے ہوئے لفظوں میں نہیں، اشارے کنایے میں کہتے، اور ظرافت کا نقاب ایک پردہ پوش ایسا ہر وقت موجود تھا کہ اُسے جس چہرے پر بھی چاہتا، لٹ کر دیتے۔ اور کبھی ایسی چابک دستی کے ساتھ کہ دیکھنے والے اُسی لگے ہوئے چہرے کو دیکھتے رہ جاتے، اور اصلی چہرے چہرے تک نقشے کی طرف کسی کا ذہن بھی نہ جاتا۔ انگریزی حکومت آخر زمانے میں تو خود ہی خاصی نرم ہو گئی تھی، اکبر کی شاعری کے شباب کے وقت اُس کی سختیوں اور سختی گیروں کا اندازہ ہی بعد والوں کو نہیں ہو سکتا۔ اکبر کا نقابِ ظرافت ایسے موقعوں پر خوب آڑے آتا اور پوری سپر کا کام دیتا۔ اکبر خود بھی اسی اصل حقیقت کے بارے میں باخبر تھے۔ ایک بار کر دوسروں کو بھی اس رمز سے آگاہ کر دیا ہے ؎

دوستوں سے التجا ہے کہ کریں اس کو معاف — لغزشیں جو ظرافت میں ہو کچھ آئیں نظر

تاہم مجھے بے اوڑھنا ہے ظرافت کا لحاف — سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برفبار

موسم کی سردی، اور ہواؤں کی برفباری خود ایک لمبی کہانی کا درجہ رکھتی ہیں۔

تحریکِ آزادی سے ہمدردی کسی مشرقی اور کسی ہندی کو نہ ہوتی۔ پنشن کے ایک عرصے کے بعد جب سن ۷۰ سے متجاوز ہو چکا تھا، اور گاندھی جی کی تحریکِ آزادی اپنے شباب پر تھی، تو بولے، اور گو انداز معذرت کا ہے، لیکن خوب بولے ؎

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا — اُس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

(مدخولہ کی شرح بھی شاعر نے ایک نجی صحبت میں اپنی زبان سے کر دی، کہ پنشنر ہوں، اس لیے اپنے کو مدخولہ کہا اگر اب تک برسرِ کار ہوتا تو "منکوحہ" کہتا!)

فرنگیت کا اصلی حملہ چونکہ اپنی بصیرت میں مذہب و اخلاق پر سمجھتے اسی لیے مسلمانوں کی بے راہ روی، مغلوبیت اور احساسِ کمتری سے اور زیادہ کڑھتے، دل کا بخار کبھی یوں نکالتے ؎

ہارون تو ہے موسیٰ کا، دستہ ہے پالیسی کا — لیکن اِدھر تصور جاتا نہیں کسی کا

ہر سو اُچھل رہے ہیں درجہ بہ درجہ ہے میں — ہر کوئی لیکن اس پہ سرور ہو رہے ہیں

اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو — اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو

لکھے گا کلکِ حسرت دُنیا کی ہسٹری میں — اندھیر ہو رہا تھا کل کی روشنی میں

کھلبلی

آوارہ

رات بھر کی جاگی رات گئی اور جھلملاتے تاروں کے جھرمٹ میں گھونگھٹ کر گئی سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ سہمے سہمے کلیاں کھلیں طائراں زمزمہ سنج چہچہانے لگے مرغ نے بانگ دی، شاہی نوبت بجنے میں تھوڑی ہی دیر تھی مگر صبح ہو گئی۔

اتنے میں ٹیس جی کی مسجد کے ملا جی جو سر شام سے لمبی تانے جنت کا فرحانی اور حوروں کے مرغن کا مزہ دار خواب دیکھ رہے تھے کلمۂ طیب پڑھتے اٹھ بیٹھے، جگی داڑھی پر ہاتھ پھیرا، اٹھے اور حجرے سے نکل، لمبے لمبے ڈگ بھرتے مسجد کے بڑے طاق کا جائزہ لینے پہنچ گئے۔

وہاں کیا دھرا تھا، ڈھاک کے وہی تین پات۔ گل کھلے نہ بتاشے، اللہ میاں کا رحم نہ حرامی کے پانچ ٹکے۔ ہاتھ جھول گئے، سہمے پھول گئے، چہرہ لٹک کے مکھی کا چھتا ہو گیا۔ دہن مبارک میں مکھی مار کے بیٹھ گئے۔ ناکامی کی تصویر، حسرت کی مورت، غرض کہ آتشبازی کے چھوٹے ہوئے دیو کی صورت ہو گئے۔ آخر کب تک؟ امید فردا پر دل کو ڈھارس دے، اپنی قسمت، مقدر کی شرارت، زمانے کو کوستے اٹھے اور محلے والوں کو بے نقط سناتے بے رنگ واپس ہوئے اور کھڑاؤں پہ کھٹ کھٹ کرتے سیڑھی اترے، چھوٹی سی مٹی کے ڈھیلوں اور بدھنی بھر پانی کے ما کلے گئے، جب طہارت سے فراغت پائی، مسجد کے بڑے حوض پر وضو کیا اور ریاض دار آواز سے گٹکری لگا کر اللہ اکبر کی متبرک صدا بلند کر دی۔

ادھر نواب شمس النساء بیگم کی عالی شان محل سرا کی ایک صحنچی میں بی ترنجا خانم، پوپلا منہ، سرکہ پیشانی، دادا پر ساٹھ برس کا سن، خاصی مردہ سوکھی کی شکل، میوں کا شلوکہ، ململ کا دوپٹہ، چھوٹے مشرع کا کلیدار پائجامہ پہنے ایسی پلنگڑی پہ بیٹھی آپ ہی آپ بڑبڑا رہی ہیں: "اے تجھ پر خدا کی مار، علی کی سوار، پر بد کے سایہ حشر ہو، اک دری کے دری بی جمالی کے ہاں رت جگے میں جانی تھی، بندہ بسر ہی تو عمدہ خانم کے ہاں گھڑی بھر کی دیر ہو گئی۔ وہاں سے آ کے کمر بھی سیدھی نہ کرنے پائی تھی جو اس نے اماں نے ککڑوں کوں ککڑوں کر کے سارا کھال ہے نے! نگھی ہی تو ہیں، پوچھی اس کو ناموں بھی تو ہیں ڈسا خالق حق کی قسم اسے نام کی ترنجا خانم نہیں جو اس کے اصل حسر سے صاحب عالم مرغ ملاؤ کی فرمائش کریں اور تیری حلیمہ تھری نہ پکوا دوں، ٹکے بوٹی نہ کرا دوں" تو ایسی بدسلا

غصہ کھا کر بڑی بی کے سینے کا ناسور کھٹ جانے جو ایک جماہی آئی، آنا اور اباں ابال منہ گیا، اور ساری اسٹیم کچھ ناک کچھ آنکھ کے رستے نکل گئی اور ترنجا خانم نے یہ کہہ کر کہ نئے سرے غصے کی جھاگ میں گوڑی اسم تک رہ گئی،'' ادار سدے سن کی ڈبیہ کھولی اور ورق چھڑی مسی گو سان نکال ایک چھوڑ تمس میں رہبر مار کر لیں۔ پھر پٹلے سے حسداں کھینچا دو مالوں بربرا کر کالکھا چونا لگا کر چکنی ڈلی کا چکی بھر چورا اور الائچی کے دو دانے ڈال کے یہ کیٹی میں کوٹ چمچی سے چاٹا، صافی سے پورے ماک گئے، اور کہتی ہیں، حرب نے ڈھکلی کرلی ہوئی صحنچی سے نکلیں اور بادرچی خانے کا رخ کیا۔

رُسوں کا باورچی خانہ، سٹروں کی کالک، ماما ئیں اصیلیں تو میں کچھا کچھ بھری ہوئی۔ ترنجا "میں کہتی ہوں یہ تم لوگوں کو آخر شکسی : ن سنہو رکھی آئے گا، صاحب عالم بیدار نہیں ہوئے، بیگم اللہ رکھے ابھی آرام خاص میں ہیں اور تم سب نے وہ کائیں کائیں مچائی ہے کہ ماذا اللہ"۔

حسنا۔ "اور سنیئے۔ صرف یہ دیکھ رہی ہیں نعمت کدے کی خانے سے پیچواں لا کے
سا رہی ہوں، وہ یہ کہہ جاتی ہیں کہ کائیں کائیں ہو رہی ہے کچھ پیس
کان بج رہے ہیں بی مغلانی کے"
قمرن۔ "اے ہے ہے کہو ہاں یہ ہے کہ ذرا سی سوجھا نے شک کر کے کم ہے":
تربجا۔ چپ گیسو بریدہ، کھلے راز "
حملہ پورا نہ ہونے پایا تھا جو نشست سے آواز آئی "حسنا حقہ لاؤ"۔
تربجا۔ صدقے جاؤں اس حکم کے" حسنا نے حسا شعل کے منھ سے اسے بھی
نہ نکلا کر لائی "حضور" یہ کہتی ہوئی آگے بڑھیں اور کمرے کا پردہ ہٹا کر داب
بجا لائیں بیگم نے گود کے اردو سے جواب دیا۔ حسنا نے بڑھ کے زیر انداز بچھا
اور پیچواں کی نے پیش کر دی۔
بیگم "تربجا۔ میں اسی دیر سے دیکھ رہی ہوں۔ وہ سامنے دیوار پر کاغذ سا
کیا چپکا ہوا ہے؟"
تربجا "وہ جو حق میں سے ہرا ہرا دکھائی دے رہا ہے؟ دار دی نیچے تو کوئی
نوٹس سا لگتا ہے حاضر کرے۔"
بیگم۔ (گھبرا کر) "کیا کہا نوٹس! کیسا نوٹس؟"
حسنا۔ "اجازت ہو تو لونڈی عرض کرے حضور کل ڈگی پٹ رہی تھی۔ یہ جو
سامنے جگنو لالہ رہتا ہے، سا اس کے گھر قرقی آنے والی ہے میں تو
جانوں اُسی کا نوٹس ہے۔ رات دن کی موئی ہوگی، جو اُٹھے گا تو آپ
ہی دیوالا ہوگا فلاس کھیلنے کے یہی نتیجے ہیں۔"
بیگم (ترش رو ہو کر) "کمبخت فلاس فلاس کئے جاتی ہو، یہ نہیں ہوتا کہ ڈیوڑھی پہ جا کے
دار وغہ سے دریافت تو کرائیں، آخر شے یہ ماجرا کیا ہے۔ ہے ہے نواب
بھی تو اب تک بیدار نہیں ہوئے۔ اور ہوں تو کیوں کر سے ان کو تو
کلب گھر کی چاٹ لگی ہے۔ سر شام سے جانا اور آدھی رات گئے آنا۔
چراغ میں بتی پڑی نہیں کہ وہ خدائی خوار انور آگیا اور لگا کے لے گیا
کلب گھر۔ یہاں کلیجہ ہے کہ ہاتوں اچھل رہا ہے، اندر رد الاکسی طرح بس ملا"
حسنا۔ "حضور میں دار وغہ صاحب سے بسدی کی جلدی کر کے ابھی عرض کرتی ہوں"
بیگم۔ "تربجا اے تربجا"
تربجا۔ (چونک کر) "جی حضور!"
بیگم۔ "ہے ہے۔ اتنی کیوں زہر مار کر لیتی ہو کہ دیدے کھلے کے کھلے اور منہ میں
بول مدارد؟"
تربجا "قربان جاؤں میں سوئی تھوڑا ہی ہوں۔"
بیگم۔ "اے میں کہتی ہوں، وہ درگور تمہارے پیر جی ضامن علی شاہ کس دن
کام آئیں گے ان سے کہہ کر کوئی اچھا سا فلیتہ نہیں لاتیں کہ یہ انور کسی
طرح دسل کر کے اس دربار سے نکالا جائے اُسی دن تو اس اچھے جا چھے
سا چھیڑ رہے ہیں بھاگ کی گت۔ وہ تو اڑا مادہ رہے ہیں میں بائیں
پر گنگ دے رہی ہوں، استے میں نہ جانے کدھر سے یہ انور آگیا اور
کچھ اس طرح جکسی چپڑی باتیں بنائیں کہ بہلا پھسلا کے لے ہی گیا
کلب گھر جب سے اس کے منحوس قدم میرے ہاں آئے ہیں، گھر کی برکت
اٹھ گئی۔ ڈیوڑھی میں جھاڑو سی پھر گئی۔"
تربجا۔ "اوج بیگم۔ جھاڑو پھرے دشمن سری کے گھر۔ دیکھئے میں آج ہی تو نقش
لاتی ہوں اور بس پڑ ملبے تو حاضرات بھی کراتی ہوں۔ مجھے کھرس سے
کی طرح نہ اڑ جائے تو تربجا خانم نام پلٹ دیجئے گا۔"
(پیروں کی چاپ نے تربجا خانم کا سلسلہ کلام قطع کر دیا)
حسنا۔ "حضور دار وغہ نے کورنش عرض کی ہے اور یہ کاغذ دیا ہے، اور ــــ اور
آگے جو کہا ہے وہ میں عرض نہیں کر سکتی"۔
"اے میں نعل کے کرے سنے" "استغفر اللہ" تم لوگوں کی داستان کل نے
تو واللہ میرا حرام کر دی" کہتے ہوئے نواب برآمد ہوئے کون؟ اس گھر کے
مالک شمس النسا بیگم کے شوہر بظاہر مازاں، باطن میں لکھ رکھنے والے احمق خیال
کی گرداں میں صیغہ ماضی مطلق۔ چھریرا بدن، میانہ قد، گیہواں رنگ، ناک نقشہ سجل
گلشن لیٹ کا سجاوٹ دار کرتہ۔ چوپڑے کے مشرع کا پیجامہ غرارہ دار، جالے
سلیم کا بکھائیں، تربجا خانم نے جٹ چٹ بلائیں لیں، علی کی امان، پنجتن کا سایہ
دعائیں دیں بیگم مسند کا کونا چھوڑ کر ہٹ گئیں۔
نواب۔ حقہ کا کش لے کر "حسنا یہ کیا ہے"؟
بیگم۔ "ہے کیا، میری تقدیر کا لکھا" آئے دن ایک نیا شگوفہ کھلتا رہتا ہے
اور آپ کو اصلاح نہیں ہوتی۔ نہ آپ کو کلب گھر سے فرصت ہوگی۔ نہ دو
گھڑی چین سے بیٹھا نصیب ہوگا۔ میں بھی آج سے صحیفے کے ورق اٹھا کے
چولہے میں رکھے دیتی ہوں۔ رہی شادی اور طبلے کی جوڑی، وہ بھائی
ابا لے کے لے جائیں گے۔"

نواب۔ "کیا کہا ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں واللہ کلک گھر یہ۔ دو چار بار جو کھٹ ملنگھے بھر کا گنہ گار بے شک کر کے ہوں۔ وہ بھی انور صاحب کے اصرار پر۔ سنا ہے گومتی پار کوئی مدرسہ کھلا ہے، تشریف رادے آپ چندے سے انگریزی پڑھنے بٹھلائے جائیں گے، اسی کی کنسان کلک گھر والے کر رہے ہیں"

بیگم۔ "اے حضرت میں کہتی ہوں آپ کو اس مدرسہ سے کیا واسطہ!"

نواب۔ "واسطہ تو بے شک کر کے نہیں۔ مگر انور صاحب کا کہنا اُدھر رہیں دیکھا گیا کہ نواب جانی سوا سو لکھ کے اُٹھیں، دِل کنکوے بار ایسی ہو کے کوٹے جھڑے لاکے دے دے اور میں ریئے کا منھ کروں۔ معاذ اللہ۔ ہزار روپئے کا وعدہ کر کے اٹھا"

حسنا۔ "ہے ہے۔ یہی تو داروغہ صاحب بھی کہہ رہے تھے"

نواب "اس! یعنی کیا کہہ رہے تھے میں بھی تو سنوں"

حسنا۔ "جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں۔ داروغہ صاحب خود اسے کانوں سن آئے ہیں۔ رحمو بالو دے والے نے کہا کہ یہ جو حضور ایسا الصدق ہزار کا نوٹ لکھ آئے ہیں، یہ سارا جھنجھلا اسی کا ہے۔ اور یہ سارا بس اُنہی انور صاحب کا تو بایا ہوا ہے۔ ملکی دنی زبان سے داروغہ صاحب یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ایک نرسے میاں جھل جھل دار لال ٹوپی دینے مجھلے نواب کے ساتھ گمنٹ یہ بیٹھے دکاں دکاں اڈوائی کھڑاتی کرتے گھوم رہے تھے"

بیگم۔ "کیوں حضرت ہم نہ کہتے تھے کہ یہ انور سہدا ایک نہ ایک دن آپ کو سولی پہ چڑھوائے گا؟"

نرگس "اے دور پار حضور کے دشمنوں سے۔ چھاتی پہ چڑھ کے مونڈی کاٹنے کا خون پی لوں گی"

حسنا۔ "حضور داروغہ صاحب کہتے تھے کہ تھوڑا اکھی دماس ہے بس انہی لوگوں نے جھلا کے نوٹس نکلوایا ہے۔ اور گھر بار کا تابیغہ کرایا ہے"

نواب۔ (گھبرا کر) "پھر اب کیا ہو گا واللہ رحم دے کر جان کس عذاب میں پڑ گئی مجھ سے تو انور صاحب نے کہا تھا کہ بینک گھر کے نام چک کاٹ کے دے دیجئے، کمپنی والے اسے آپ وصول کر لیں گے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ بے صبر مردے کفن پھاڑ کے نکل پڑیں گے، اور ایک دم گھر بار کا تابیغہ ہی کرالیں گے۔ کیوں بیگم اب کیا کیا جائے؟"

بیگم۔ "میں کیا بتاؤں انہیں اپنے لاڈلے انور صاحب سے پوچھئے۔ دس پانچ ہزار سے توڑئے اور لگا دیجئے"

نواب "دیکھئے انہیں بلواتا ہوں اور کمپنی والوں سے کہلواتا ہوں کہ اور روپئے جدا انوار الوار اور صبر کیجئے، کسی کی آبرو ریزی سے فائدہ؟ احاتم ہوا دار نکلواؤ۔ اور داروغہ سے کہو ذرا بھلے جاکے میر انور علی کو بلا لائیں اور خود بھی حاضر رہیں اس جنجال سے نجات پا گیا تو واللہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤں گا"

نواب صاحب نے ناشتہ نوش جان فرمایا پھر جامہ خانہ میں تشریف لے گئے، متاظرے ملبوس کی کشتی پیش کی۔ پر تکلف لباس بدل کر ہوا دار میں جلوس فرمایا سواری ڈیوڑھی محلدار نے آداب بجالا کر ڈیوڑھی کا پردہ کھینچا۔ کہاروں نے کندھا بدلوایا نواب فخر رکاب برآمد ہوئے۔ بست کا کمرہ دلہن کی طرح سجا ہوا۔ مصاحبوں نے آداب تسلیمات مجرا کورنش عرض کی۔

انور۔ نئی وضع کے خوش رو جوان "سلام علیکم"

نواب۔ "تسلیم"

انور۔ "مزاج اقدس آج یاد بافرمایا گیا۔ خیر تو ہے"

نواب۔ "کوئی حضرت آپ کی گندم نما جو فروش کمپنی نے کیا بہت کنڈے ہیں کہ انوار الوار بھی صبر نہ آیا اور اٹھا کے نوٹس دے دیا اور قرقی نکلوا دی"

انور "قبلۂ عالم، کیسے بہت کنڈے اور کس کی قرقی؟"

نواب۔ (کاغذ پھینک کر) "سمجھئے، یہ ہیں آپ کی کمپنی کے کرتوت"

انور۔ (کاغذ دیکھ کر) "قصور معاف۔ حضور کے دماغ کو عقل سے ابھی کچھ مس نہیں ہوا"

نواب۔ "ہائے واللہ جلد آشیاں بھی کیسے بادب سدھار گئے۔ یہاں سے لیکر تا بہ لندن لڑتے اور اپنے نور نظر کو سنبھالے"

انور۔ "پیر و مرشد۔ نوٹس نہ قرقی۔ یہ تو تماشے والوں کا اشتہار ہے ولایت کے بازی گر آئے ہیں۔ انہیں نے دیا ہے لاحول لاقوۃ۔ لگے سورے اور خلد آشیاں کا نام کرنے"

نواب۔ (اچھل کر) "کیا کہا تماشے والے؟ اماں ہمیں آپ کو میرے سر کی قسم"

انور "آپ جانتے ہیں میں شاعر نہیں ہوں جھوٹ بولنا حرام سمجھتا ہوں"

نواب۔ "ہائے پھر بھی یہ کہا کر ڈیوڑھی کا تابیغہ تو نہ ہو گا۔ کچہری دربار تو نہ جانا

علی جواد زیدی

ریگِ صحرا پہ نقشِ پا ہوں میں
آپ سے آپ مٹ رہا ہوں میں

خود کو، ماحول کو، زمانے کو
بارہا بھول بھی گیا ہوں میں

اپنی نیچی نگاہ سے پوچھو
غیر کیا کہہ سکے گا کیا ہوں میں

اے طلسمِ وفا! نہ چھیڑ مجھے
تجھ کو مدّت سے جانتا ہوں میں

حُسن ہے میرے شوق کا پرتَو
اپنے دھوکے میں مبتلا ہوں میں

دل نے چھیڑا ہے سازِ تنہائی
اُن کی آواز سُن رہا ہوں میں

دیکھ گم کردہ راہِ شوق مجھے
دُور کے گاؤں کا دِیا ہوں میں

کیا یہ طوفان روک سکتا ہے؟
چل پڑا ہوں تو چل پڑا ہوں میں

دُور کے کارواں بھی سُن لیں گے
غم کے صحراؤں کی صدا ہوں میں

تیرے آنچل کی اوٹ میں، اے دوست!
ٹمٹماتا ہوا دِیا ہوں میں

مجھ سے ڈر، اے زمانے، آگ ہوں آگ
کیا کوئی آہِ نارسا ہوں میں

جو دوا سے کچھ اور بڑھتا ہے
زیدی اُس درد کی دَوا ہوں میں

نظم و نسق اور عوام

برج لال جیٹ

جمہوریت کا تحفہ ہمیں یونان نے دیا ہے۔ لیکن وہ اس پارلیمانی ڈھنگ کی جمہوریت نہیں تھی جس سے ہمیں واسطہ ہے۔ یونان کے لوگ براہِ راست جمہوریت کے ماننے والے تھے جس میں حاکم و محکوم کی تقسیم دھندلی سی تھی، جس میں عوام کی آواز صرف الیکشن ہی کے موقع پر نہیں بلکہ آئے دن کے نظم و نسق کے معاملات میں بھی براہِ راست سُنی جاتی تھی۔ اہم فیصلے جلسۂ عام میں ہوتے تھے، عہدوں کا تعین چناؤ سے ہوتا تھا اور عام دستور یہ تھا کہ آپس میں عُہدے بدلے بھی جاسکتے تھے۔ یونان کا شہری ہونا بلاشبہ ایک عزت کی بات تھی۔

وہ کیا حالات تھے جن میں یہ صورت ممکن تھی۔ شہری ریاستوں کی آبادی محدود تھی اور تمام شہری ایک دوسرے سے واقف تھے۔ (قریب قریب ان ہی حالات میں ڈنمارک اور نشیبی ممالک میں مربوط قسم کی امداد باہمی انجمنیں بنیں اور انھوں نے کامیابی کے ساتھ کام بھی کیا) ریاست کو صرف محدود قسم کے اُمور انجام دینا ہوتے تھے۔ تعلیم و ذہانت کا معیار اونچا تھا۔ محنت و مشقت کے کاموں کے لئے جنگ کے قیدی تھے، غلاموں کا جفاکش دستہ تھا۔ یہ شہری حقوق سے محروم تھے اور پانی کھینچنا اور لکڑی چیرنا ان کے کام تھے۔ روشن خیال اور وسیع النظر یونانیوں کو ایک ایسے نظام میں کوئی اخلاقی خامی نہیں نظر آتی تھی جس میں ایک معتدبہ آبادی کو غلام بنا کر ڈال دیا گیا تھا اور اچھی زندگی کے دروازے ان پر بند کر دیے گئے تھے۔

شہریت اس زمانہ میں حیاتی تحقیقی اور عملی تھی۔ آج کے شہریت کے حقوق اس کے مقابلہ میں بے کیف، بے لطف اور بے رنگ سے نظر آتے ہیں۔ یہ صورت ہونا ہی تھی اس لئے کہ جب بنیادی حالات بدل گئے تو قدیم شکل کیسے قائم رہ سکتی تھی۔ ریاست کا رقبہ بڑا ہو گیا ہے، اس کی آبادی بڑھ گئی ہے اس کی سرگرمیاں رنگا رنگ ہو گئی ہیں، سائنس اور فنی علوم کی سرحدیں دور تک پھیل گئی ہیں۔ ہمیں ہر روز زیادہ ماہر اور زیادہ تربیت یافتہ عُمال کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں پُرانے وقت کا سادہ سا ڈھانچہ کیسے قائم رہ سکتا ہے؟ لیکن انسان کا ذہن، اس کی فطرت اور اس کے جذبات آسانی سے نہیں بدلا کرتے ہیں۔ اس لئے جدید حالات اور مسائل کی پیچیدگی سے واقفیت کے باوجود ہم اپنے دلوں سے یہ خواہش نہیں نکال سکتے کہ ہمیں اُمور ریاست کے انتظامات میں قریبی دخل حاصل ہونا چاہئیے اور ہم چاہتے ہیں کہ ایک ایسا رابطہ قائم ہو جو حقیقی اور شخصی ہو نہ کہ لاشخصی اور خیالی۔

اس طرح ذہن ماضی کی طرف پلٹتا ہے۔ وہ عہد رفتہ کو پھر سے زندہ کرنا چاہتا ہے اور اس ناٹک کو پھر سے کھیلنا چاہتا ہے حالانکہ عقل سلیم کہتی رہتی ہے کہ یہ ناممکن ہے اور اس کے ممکن العمل نہ ہونے کے اسباب بھی ظاہر ہیں لیکن خواہش اپنی جگہ قائم رہتی ہے اس لئے جو خلیج بن جاتی ہے اسے پاٹنا ہوتا ہے اور رائے عامہ سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کچھ مراعات بھی دینا ہوتی ہیں۔

یہ جدید جمہوری نظام میں، جو سائنس اور صنعت پر قائم ہے، کیسے کیا جاتا ہے ایک دلچسپ موضوع ہے۔ جب ایک کے بعد ایک قدم

تیزی سے اُٹھایا جاتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ پوری تصویر ذہن پر واضح نہ ہوتی ہو اور صرف یہ خیال ہوتا ہو کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ وقتی دشواریوں کو دور کرنے کے خیال سے کیا جا رہا ہے لیکن ان اقدامات کو پس منظر کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک خاکہ کے مطابق عوام سے زیادہ تعاون اور زیادہ اشتراک عمل حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

یہ کیسے کیا گیا ہے؟ سب سے پہلے یہ کوشش کی گئی کہ ہر سطح پر عوام کو مزید اختیارات سونپے جائیں۔ اس طرح منصوبہ کو عوام کا منصوبہ بنانے کے خیال سے دیہات کی سطح اور بلاک کی سطح پر عوام کو معتدبہ اختیارات سونپے گئے اور مزید اختیارات سونپے کا معاملہ زیر غور رہے۔ ان کے علاوہ سائنس کی دریافت اور ایجادات نے حکومت اور عوام کے رابطہ کو اور بھی حقیقی بنا دیا ہے۔ مائی کروفون کے ذریعہ ایک شخص کی آواز لاکھوں سننے والوں تک پہنچ سکتی ہے۔ سینما، ریڈیو اور اب تو ٹیلی وژن کے ذریعہ جو رابطے قائم کئے جاسکتے ہیں وہ پہلے خواب خیال میں بھی نہیں آسکتے تھے۔

پریس کا ذکر تو الگ کرنا چاہیئے اس لئے کہ اس کی ایک اپنی جگہ ہے۔ وہ آئے دن کے واقعات ہی نہیں چھاپتا ہے کچھ اور بھی کرتا ہے۔ اہم واقعات اور رجحانات کا تجزیہ چھان بین، تشریح اور بین السطور کے معانی بیان کرتے ہوئے اظہار خیال بھی کرتا ہے۔ اخبارات میں نہ صرف واقعات کا بیان ہوتا ہے بلکہ یہ اشارہ بھی ہوتا ہے کہ مستقبل کا کیا رُخ ہے۔ اسی طرح وہ رائے عامہ کو بنانے میں ایک زبردست آلۂ کار کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ جو نظریہ بھی پے در پے پیش کیا جائے گا وہ انسان کے ذہن اور خیال پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ ایک پرانی کہاوت ہے "بتاؤ کہ تم کیسے لوگوں میں رہتے ہو میں بتا دوں گا کہ تم کیا ہو" اسی طرح کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک انسان کے تاثرات کا اندازہ ان اخباروں سے کیا جاسکتا ہے جو وہ پڑھتا ہے؟ چوتھی ریاست بلاشبہ ایک زبردست طاقت ہے۔

مذکورۂ بالا کے نتیجہ میں ایک اور چیز کمیٹیوں کا اچانک ظہور ہے۔ نہ صرف قانون کمیٹیاں بلکہ مشاورتی کمیٹیاں واقف کاروں اور غیر ماہر لوگوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور وہ لوگ مسئلہ کو عام زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں جس میں فنی موشگافیوں اور تفصیلی پیچیدگیوں کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر رجحانات کا اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کی کمیٹیاں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں اور ان کے وقار اور اختیارات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

آخر میں تعلقات عامہ کا ذکر بھی کم اہم نہیں ہے جس سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ عوام کے ساتھ اخلاق دکھایا جائے یا جو معلومات ان کو درکار ہوں وہ خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو فراہم کی جائیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کا اصل مقصد انسان کے مزاج کو سمجھنا ہے، دوسرے کے نقطۂ نظر کو جاننا ہے اور اس سے ایسے انداز میں اظہار خیال کرنا ہے کہ انکار بھی کیا جائے تو اس کو ناگواری یا ناراضگی نہ ہونے پائے یعنی رویہ میں تبدیلی اور ظاہر سے زیادہ محسوسات کی اہمیت پر دھیان دینا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان صرف اس لئے تو نہیں بنایا گیا کہ وہ قانونوں کا نفاذ کیا کرے، حقیقت تو شاید اس کے برعکس ہے۔ اگر نظم و نسق کا نظام یا قوانین اس بات کو نہیں مانتے ہیں تو وہ فرسودہ ہو چکے ہیں اور ان کو خارج کر دینا چاہیئے۔

ابھی تک ہم نے تصویر کے ایک ہی رُخ پر نظر ڈالی ہے صرف اس جز پر غور کیا ہے جس کا تعلق حقوق سے ہے اور ان میں نظم و نسق سے براہ راست تعلق رکھنے کا جذبہ بھی شامل ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو انسانوں کے دلوں میں اسی وقت سے روشن ہے جو سے آزادی نے جنم لیا ہے اور اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود جمہوریت۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ نہ ہمیشہ ممکن ہے اور نہ ہمیشہ مناسب ہے، گو یہ واقعہ ہے کہ حاکم و محکوم کے بیچ کی خلیج بہت کچھ پٹ گئی ہے اور غالباً اور بھی پٹ جائے گی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ایتھنس کی براہ راست جمہوریت پر واپس جاسکیں گے۔ ہمیں اپنی توقعات پر کچھ روک لگانا ہوگی۔ حقوق کے ساتھ ساتھ فرائض بھی ہوتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ضبط سے کام لینا چاہیئے اور تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی غور کرنا چاہیئے۔

جب بھی بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو جائیں گے تو نظم و ضبط کے قاعدوں کا نفاذ ایک حد تک ضروری اور ناگزیر ہو جائے گا۔ اگر گاڑیوں کی آمد و رفت ہے تو ٹریفک پولیس کو متعین کرنا ہوگا اور ہر بڑے چھوٹے کو اس کی ہدایت ماننا ہی ہوگی۔ اس صورت حال کو ہر شخص سمجھتا ہے اور کوئی بھی اس سے انکار نہیں کرتا کہ پولیس مین کو حق ہے کہ وہ آمد و رفت کا ضبط و نظم درست رکھنے کے لئے بڑی سے بڑی شاندار کار اور اس کے سوار کو روک دے۔ اسی طرح اگر جلسہ ہے تو یہ ریت سی پڑ گئی ہے کہ ایک صدر ہوگا جو اس کی کارروائی کو چلائے گا اور ہر شخص اُس کا حکم مانے گا۔ یعنی ہر منظم اجتماع کے لئے لازم ہے

کہ کوئی اس کے ضبط و نظم کو قائم رکھے۔

یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ ضبط و نظم کس کے سپرد کیا جائے؟ اس کا انحصار اس بات پر ہے کیسے ضبط و نظم کی ضرورت ہے۔ آیا سیدھی سادی سی نوعیت ہے جس کے لئے فرد واحد کی خدمت کافی ہے یا پیچیدہ سی نوعیت ہے جس کے لئے کسی ادارہ کی ضرورت ہے۔ کس قسم کی خدمت سپرد کرنا ہے؟ کوئی پالیسی بنانا ہے یا اس پر عمل کرنا ہے؟ کسی چیز کو قائم رکھنا ہے یا کوئی نیا کام شروع کرنا ہے؟

اس سوال کا جواب ہی یہ بتائے گا کہ کس قسم کی مشینری کی ضرورت ہوگی، اور یہ ضرورت مختصر میعاد کی بنیاد پر ہوگی یا طویل میعاد کی بنا پر۔ اسی سے وہ درجہ وار ترتیب اور باقاعدہ نظام پیدا ہوتا ہے جس میں کثیر التعداد افراد شامل ہوتے ہیں۔ پہلے سے فرائض منصبی کا تعین کر دیا جاتا ہے اور نظم و ضبط، اور انتظام و انصرام نیز دوسرے امور کی انجام دہی کا خاکہ پورے غور و خوض کے ساتھ تیار کر لیا جاتا ہے۔ اب یہ سوچنا ہے کہ افراد کی شمولیت کس طرح ہونا چاہیئے؟ ان کی کیا ٹریننگ ہونا چاہیئے؟ اور ان کے لئے کس قسم کا تجربہ ضروری قرار دینا چاہیئے؟

کسی اسکیم کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے عملدر آمد کے لئے کیسی مشینری وضع کی گئی ہے اور مشینری سے مراد صرف سرکاری مشینری نہیں ہے جو مختلف درجوں کے سول سرونٹس پر مشتمل ہوتی ہے بلکہ غیر سرکاری کارکن بھی ہیں جن کو اپنا اہم کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ مشینری اور اس کے اجزا کتنے اچھے ہیں؟ کیا اسے اس کار عظیم کے لئے مناسب طور پر آراستہ کر لیا گیا ہے؟ کیا اس کے طریقۂ کار میں پیش قدمی اور تازگی ہے؟ کیا اس میں قیادت کے ضروری عناصر پائے جاتے ہیں؟ کیا اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ عوام کی خواہشات کو سمو سکے؟ نیز یہ کہ جماعت کا طریقہ کار ترقی پذیر اور متحرک ہے یا نہیں اس لئے کہ قیادت کی نوعیت کا انحصار اسی پر ہوگا۔ مزید براں یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ قیادت جماعت سے اُبھرتی ہے باہر سے مسلط نہیں کی جاتی ہے۔ وہ جماعت کا ایک جز ہوتی ہے۔ اس کا تصور جداگانہ حیثیت سے نہیں کیا جاتا اس میں اتنی ہی عظمت ہوتی ہے جتنی اسے جماعت سے عطا ہوئی نیز اس پر پابندیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ مشینری انسانی ہوتی ہے اس لئے کبھی کبھی غلطیاں بھی کر سکتی ہے۔

اس پہلو پر ہمیشہ نظر رکھنا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ سائنس نے پہلے کے مقابلہ میں پارلیمانی جمہوریت کو اب عوام سے کہیں قریب کر دیا ہے لیکن اس میں کچھ اپنی کمزوریاں بھی ہیں۔ وہ اس معنی میں کہ جو ہاتھ اس اسکیم کو چلاتا ہے وہ خطا بھی کر سکتا ہے۔ ان کمزوریوں کے اسباب مختلف چیزوں میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً مناسب تعلیم و تربیت کی کمی، کردار کی تعمیر پر معقول توجہ نہ کرنا اور اچھی روایات کا فقدان وغیرہ وغیرہ۔ ان کی اصلاح بلا شبہ ضروری ہے اور اس کی کوشش بھی کی جا رہی ہے لیکن یہ اچانک تو نہیں ہو سکتا خصوصاً ان معاملات میں جن میں دور رس منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ سچ کہا گیا ہے کہ کسی مشین کو نصب کرنے میں کم وقت لگتا ہے مگر اس کے چلانے والے انجینیر کی تربیت میں بڑا وقت لگتا ہے۔

اچھا نظم و نسق ایک قسم کی "سیلس مین شپ" ہے۔ جتنا لائق "سیلس مین" "کاؤنٹر" پر ہوگا اتنے ہی بہتر طریقہ پر وہ گاہک اور سودے کے مفاد کو قائم رکھ سکے گا۔ بیرونی ملکوں میں جو سفارتی نمائندے بھیجے جاتے ہیں ان کے لئے اسی لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ذہین ہوں اور خوش اخلاقی کا بہترین نمونہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسی ہی لیاقت کے لوگ دوسرے شعبوں میں بھی ہوں تو وہ کتنے مفید ہو سکتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسے لوگ خود رو نہیں ہوتے، وہ بنائے سنوارے جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ فیکٹری سے کل پرزے آ گئے اور ان کو جمع کر کے مشین تیار کر لی۔

ایک اور پہلو ہے جس پر غور کرنا ہے۔ عوام سے رابطہ ضروری چیز ہے۔ اس کے ذریعہ دوا کی کڑوی گولی پر شکر کی میٹھی تہ جمائی جاتی ہے لیکن مریض کو افاقہ شکر سے نہیں دوا کے اجزا ہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے گو "سیلس مین" کا کردار اہمیت رکھتا ہے مگر یہ بھی ضروری ہے کہ جن چیزوں کی وہ "سیلس مینی" کر رہا ہے وہ معیار پر پوری اترتی ہوں۔

کوئی چیز اچھی ہے یا بری ہے اس کا انحصار بہت سی باتوں پر ہے۔ اس کی تیاری کا پلان بنانا ہوتا ہے اور اس پر صحیح طریقہ پر عملدر آمد کرنا ہوتا ہے یعنی تیاری سے پہلے ہی یہ طے کر لینا پڑتا ہے کہ کون کام کون شخص کرے گا، ہر ایک کے کام میں ربط و ضبط رہے گا اور سب مل کر اپنی انتہائی کوشش کریں گے۔ اس کے لئے نگرانی اور جانچ کی تو ضرورت ہوتی ہی ہے مگر بعض اوقات سختی بھی کرنا ہوتی ہے۔ یہ کام مشکل بھی ہے اور سارے دن کا بھی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

شاد کا فن غزل گوئی اور اس کا تجزیہ

اسرار درسوی

گل و لالہ کا تجزیہ اور بو کا تجربہ برابر ہے۔ محض تجزیہ کے ساتھ رہ جانا بدذوقی اور کم نگاہی ہے۔ پھر بھی تجزیہ ایک ضروری عمل ہے۔ پھول کو پوری طرح سمجھنے کے لئے برگہائے گل اور ریزۂ گل کا نباتاتی تجزیہ کرنا ہی پڑتا ہے اور کبھی رنگ و نکہت کے حکمتی شعور کے لئے گلہائے تازہ کی عطریت اور رنگت کا کیمیاوی تجزیہ بھی ضروری ہوتا ہے لیکن فقط نباتاتی تشریح اور کیمیاوی تجزیہ کے نتائج و اعداد و شمار کی بنا پر جیسے جاگتے لہکتے مہکتے ہوئے پھولوں کی کلی تاثیر حسن کا کامل احساس و ادراک نہیں ہو سکتا۔ احساس و شعور حسن کی صحت مندانہ تکمیل، نتائج تجزیہ اور تاثیر ترکیب کی ہمہ جہتی مطالعہ سے ہی ممکن ہے۔ ایک فرد یا نوع بشر کو سمجھنے کے لئے بھی علم تشریح، علم افعال الاعضاء اور علم نفسیات کی ضرورت ہوتی ہے اجتماعیت انسانی کی تفہیم کے لئے علم معاشرہ، سیاست و اقتصاد وغیرہ کا مطالعہ لازمی ہے۔

پھول اور انسان کی خالص جمالیاتی تاثیر پذیری کبھی ترکیبی و کلی اور تشریحی و جزوی دونوں پہلوؤں سے ہوتی ہے۔ کبھی پھول کی پتیوں کی بناوٹ متاثر کرتی ہے، کبھی پتیوں کی قماش، کبھی صرف رنگت، کبھی صرف نکہت، کبھی برگہائے گل پر فطرت کی نازک قلم کاری۔ ان جزوی تاثرات کے ساتھ پورے پھول کا ترکیبی تاثر بھی ہوتا ہے۔ کلی تاثر نام ہے تجزیاتی اور ترکیبی تاثرات کا۔ محبوب کی آنکھیں نرگسی ہیں، ناک چمپا کلی، لب گل برگ، دانت دُرِّ مکنوں، رخسار مہ پارے، پیشانی مطلع خورشید، سینہ و شانہ جیسے راج ہنس کے جوڑے، کمر شاخ گل، ناف جام لالہ، پنڈلیاں ہاتھی دانت، پاؤں سیپی کی طرح، رفتار آہوئے مست خرام کی مانند ــ اور انگ انگ کے مشاہدہ کے بعد وصف مرکز محبوبیت۔ جانے کہاں ہے ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

سراپائے محبوب کی حسین ہم آہنگی خود ایک طرفہ تماشا ہے حسن محبوب کے بھرپور کلی تاثرات کے جذب و قبول کے لئے انگ انگ کی تندرستی کا الگ الگ درس کرنا بھی ضروری ہے۔

تبصرۂ جمال و تنقید حسن کی کامیابی دونوں پہلوؤں پر منحصر ہے۔ یعنی مشاہدۂ اجزاء اور مطالعہ ترکیب پر۔ آرٹ حسن کاری ہے لہٰذا تنقید فن کے بھی دو پہلو ہیں، تجزیاتی اور ترکیبی۔ عصر جدید میں تجزیاتی تنقید پر بہت زیادہ زور دینے لگے ہیں۔ مگر یک طرفہ پن ہمیشہ مخدوش ہوتا ہے۔ فقط تجزیاتی تنقید، ریزہ چینی پر ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے ناقدوں پر اہل بصیرت ادبی چیونٹیوں کی پھبتی کستے ہیں۔ اس سے نیچے بھی ایک مقام ادبی دیمکوں کا ہے۔ صحیح آگاہی کے لئے طائرانہ نظر کی بھی ضرورت ہے۔ نظارگی کی تکمیل تو جزرسی، جلوہ رو برو اور طائرانہ نگاہی سے ہوتی ہے۔ محض تجزیاتی تنقید پر زور دینے سے سطحیت، نارسائی، ادھورے پن، غیر منطقیت اور ادبی آمریت پیدا ہوتی ہے۔

شاد کے رنگ تغزل کا تجزیہ مقصود ہے مگر اس لئے کہ ہم ان کے

فن کی تشریح و وضاحت کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور اُس کا تفصیلی و کلی اثر قبول کر پائیں

میں اس سے پہلے ایک مضمون (مطبوعہ "نیا دور") میں عرض کر چکا ہوں کہ شاد کی غزلوں میں گہری ماورائی معنویت و صوفیت کی جلوہ گری ملتی ہے۔ میرے خیال میں شاد کے ہاں غیر فانی معنی آفرینی اتنی پر ورده جذبہ میں جتنی کہ وہ آفریدۂ تخیل ہے۔ شاد کی شاعری میں تخیل ایک نہایت ہی اہم عنصر ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

حسن سادہ دل کے تجدار کا یو تصور سست

یہ تھے ۔ تھے یہ کہاں یوں کبھی کڑک جاتی ہے

یہ شعر گہرے مشاہدے سے مملو ہے، فطرتِ حسن کا مشاہدہ۔ شاد حسنِ محبوب کی نفسیات سے آگاہ ہیں۔ وہ تخیل کی مدد سے ایک استعارہ بروئے کار لاتے ہیں اور موزوں، خوبصورت و پُر اثر الفاظ و ترکیب الفاظ کو قادر الکلامی کے ساتھ استعمال کر کے صنم طرازی اور فلم بندی کرتے ہیں۔ اس شعر میں جذبہ فائق عنصر نہیں۔ جذبہ کی رَو زیرِ سطح ہے۔ اس میں بڑا کلاسیکی ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔ تخیل کی کارفرمائی اور ملاحظہ ہو ؎

قیامت آئے وہ گیسو اگر رسا ہو جائے

ابھی یہی نہیں معلوم کیا سے کیا ہو جائے

شاعر کتنی سادگی سے بلند پروازی دکھاتا ہے۔ وہ تجربہ و تخیل کی مدد سے معراجِ دانِ حسن و عشق بنا ہے ؎

ہم ایک عمر سے سنتے ہیں دھوم محشر کی

نگاہِ یار کا یوں ہی سا اک اشارا ہے

پڑا ہوا اُس رُخِ روشن کا عکس پر تو

گُل کِھل دفعتاً شجرِ طور ہو گئے!

معرفت کی کتنی بلند جمالیاتی بات کہی ہے! عشق و محبت کی کارفرمائیاں تخیلی رنگ میں ملاحظہ ہوں ؎

رہ رہ کے اک دھواں سا نکلتا ہے چاک سے

جو کچھ نہ ہو وہ کم ہے دلِ شعلہ ناک سے

دیوانہ مر گیا مگر اب تک بھی اے جنوں

لپٹے ہیں دونوں ہاتھ گریباں کے چاک سے

تخیل نے جذبہ کے ساتھ مِل کر امکاناتِ جنوں کو کتنی بے کرانی بخش دی ہے، اللہ اللہ! ؎

گو شے اُسے بھی جلتی رہے، جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے

یہ فسانہ زلفِ دراز کا کہیں زندگی سے دراز ہے

شاد "زلف و گیسو" کو مخصوص ایمائی معنوں میں استعمال کر کے اس "دستِ" کو کائناتی و ماورائی وسعتیں عطا کرتے ہیں۔ یہ خاص رمزیت شاد کی شاعری میں انفرادیت پیدا کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ع ۔ کون سلجھائے گا اُلجھا ہوا گیسو تیرا

ع ۔ پیچ کھلتا نہیں اے زلف کمن تو تیرا

ع ۔ قیامت آئے وہ گیسو اگر رسا ہو جائے

ع ۔ یہ فسانہ زلف دراز کا کہیں زندگی سے دراز ہے

ع ۔ موجِ پیمانۂ تقدیر ہے گیسو تیرا

شاد نے موجِ پیمانۂ تقدیر کی تعبیر زلف و گیسو کی رمزیت سے کی ہے۔ کیسی حسین ترکیب ہے اور کیسی پیاری تعبیر! زلف پُر پیچ کبھی نقابِ رُخِ تاباں ہے اور کبھی اُس کا دلکش پس منظر۔ انسان کی والہانہ جدوجہد اسی گیسو کے سنوارنے کے لئے ہوتی رہتی ہے۔ اس راہِ شوق میں اُسے مرحلۂ شہادت سے گذرنا پڑتا ہے ؎

نہ آئے پھر کوئی آفت غریب خانہ پر

خدا کرے کہ وہ گیسو کہیں سنور جائے!

انسانیت کی سب سے بڑی تمنا، اُس کا سب سے بڑا سوال یہی ہے ؎

یقیں کی راہ تو مشکل ہے راہِ شوق آساں

تو ہی بتا کہ ترا راہ رو کدھر جائے

بنی آدم کی ازلی بے چینی اور ابدی بے یقینی! آدمی اسی دودھاری تلوار سے زخمی ہوتا رہتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انسان گرفتارِ شوق ہو ہی کیوں؟ شاعر اس کا جواب شاعرانہ طور پر یوں دیتا ہے ؎

اُس احتساب کا زاہد پتہ لگے اُس وقت

جو اُس نگاہ سے دم بھر تری نگاہ ملے

۲۶ جنوری ۵۶ء

ساری مصیبتوں کی ذمہ دار خود سرشتِ عشق ہے ؎

چھُری چلتی ہے یارب انتظارِ قتل میں دل پر
گھٹا جاتا ہے دم کب دیکھئے تیغِ جفا نکلے

ستم بالائے ستم فطرتِ حسن ہے ؎

عاشق کا اگر دل نہ دکھائے نہیں بنتی
افسوس کہ خود اس کے بنائے نہیں بنتی

حسن مجبورِ جفا ہے اور عشق مجبورِ وفا ؎

ہر چند سی رہتی تو ہے جان کے اوپر
تو بھی تو تجھے دل سے بھلائے نہیں بنتی

عشق کی وارفتگی و شوریدگی دیکھئے ؎

فقط شورِ دل بےقرار رہ گیا　　نہ دنیا تھی نہ میں تھا اور نہ تو تھا

نگہ کا تری ساتھ چھوڑا نہ دل نے　کہیں تیر جائے نشانہ یہی تھا
ترے گیسوؤں کو نہ چھوڑے کبھی ہم　سمتیں مختلف تھیں نشانہ یہی تھا

عرفانِ حسن کے مقامات کی سیر کیجئے ؎

بہار و تبسمِ گل تیرے اختیار میں ہے
کہیں کسی کو ہنسانا کہیں رُلا دینا

تری نگاہ کے ناوک جبھی سے ہیں دل دوز
کہ نام تک بھی نہ تھا جب کہیں نشانے کا

التجائے محبت سنیئے ؎

چشمِ سیہ میں سُرمہ دے زلفِ رسا میں شانہ کر
قتلِ جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

اور ؎ مجھ سے مایوس ہزاروں ہی تصدّق تجھ پر
تو سلامت رہے تجھ سے ہے تمنا باقی

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ شاد کی شاعری میں تخیّل کے ساتھ جذبات کی کارفرمائی بھی ملتی ہے لیکن فن کار تہذیبِ جذبات و شائستگیِ احساسات پر قادر ہے۔ توازن، متانت اور ٹھہراؤ سے جذبات نگاری اور قاتل بن جاتی ہے ؎

ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب بے اختیار
اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا
شاد کچھ پوچھو نہ مجھ سے میرے دل کے داغ کو
ٹمٹماتا سا چراغ اک اپنے ویرانے میں تھا

ترے نقشِ قدم کی گرد تک پہنچے نہ واماندہ
بہت پیچھا کیا اے کارواں کوسوں تلک تیرا

یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا
ہنسو گے خود اس چمن پہ سمجھو زمانہ آئے ذرا نمو کا

شاد جذبات نگاری کرتے ہوئے بھی بڑی فن کاری سے کام لیتے ہیں تشبیہ و استعارہ، مجاز و کنایہ، رمز و ایما، تصویریت و غنائیت، پیکر تراشی، محاکات، لب و لہجہ و تیور کے ہنرمندانہ استعمال سے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں ایک اور مثال ملاحظہ ہو ؎

کالی کالی وہ گھٹائیں وہ پپیہوں کی پکار
دھیمی دھیمی وہ پھوار
اب کے ساون بھی ہماری یوں ہی رونے میں کٹا
کیا کہیں حیف کے سوا

یہ پوری مستزاد خوبصورت و پُر اثر جذبات نگاری کی کامیاب مثال ہے ؎

رُت پھری، ساری ہری ڈالوں میں پھوٹی کونپل
ہو گئے پھول بھی پھل
اک یہ اُجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا
اور سوکھا ہی کیا

شاد کی جذبات نگاری میں یک رنگی ہے اُن کی شاعری میں مختلف جذبات کی آنچ ملتی ہے۔ جذبہ کی لو کبھی تیز، کبھی دھیمی ہوتی ہے، مگر کھٹکتی نہیں۔ تنوّع کے باوجود شاعر کے جذبات کی قوسِ قزح کا ایک وسطی چھایا ہوا رنگ بھی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

گلوں پہ رحم کر اب بھی خدا کو مان اے چرخ
خزاں کے ہاتھ سے خونِ بہار ہوتا ہے

وطرزِ اظہار کی طرف بھی خاص طور پر دھیان دیتے ہیں۔ جذبہ جاں ہنر مندی وصناعی کی کامیاب مثالیں ملتی ہیں شاد کی مشہور مستزاد تو سراپا آئینہ خانۂ فن ہے ؎

وہ تری کج روشی، کج کلہی، کینہ وری، دلبری، عشوہ گری

کون غش کھا کے گرا، کون موا، پھر کے دیکھا نہ ذرا

ایک شعر میں روئیداد نہایت ڈرامائی رنگ میں پیش کی گئی ہے۔ پہلے مصرع میں ترکیبوں کی تیز حرکت سے ایک سماں بندھ جاتا ہے اور ایکا یک ڈرامائی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ محبوب کی طراری وطراری اور برق وش قیامت خیزی ظاہر ہوتی ہے اس طرح کردار نگاری بھی ہوتی ہے۔ ان اداؤں کا دل دادوں سے تصادم ڈرامائی کشمکش کو تیز کرتا ہے۔ تصادم کی شدت بھی پہلے مصرع میں نمایاں ہے حرکت وعمل پورے ڈرامہ میں جاری ہے۔ کون غش کھا کے گرا، عروج کا مقام ہے۔ آہستہ آہستہ تفاعل عروج کی منزلیں طے کر رہی ہیں اور المیہ اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ کون موا، پھر کے دیکھا نہ ذرا۔ اکائی ہے۔ آخری ٹکڑے سے سیرت نگاری مکمل ہوتی ہے اور درد انگیز اضافہ ہوا ہے۔ یہ تو بہت ہی چھوٹا سا سوال ہے ایکا ایکی ڈرامہ سے ایک مکمل دلپذیر تاثیر المیہ۔

شاد رعایت لفظی کی صنعت گری کو بھی بڑے قاعدے اور ٹھاٹ سے نبھاتے ہیں۔ پھر اس میں تصویریت اور معنویت بھی پیدا کر دیتے ہیں مثلاً کی صناعی سطحی بھی ہو سکتی ہے اور گہری بھی مگر اس محدود رنگ کی صنعت گری کے امکانات وسیع بھی کئے جا سکتے ہیں یہ فن کار کی مہارت اور بصیرت پر منحصر ہے۔ شاد صاحب بصیرت بھی ہے اور صاحب لطف بھی دیکھئے ؎

یہاں نہ مستی و سما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا

ہنسو گے جو اس چمن پہ پہنچو زمانہ آئے ذرا مد کا

شاد تصویر لفظی سے بھی بڑے مؤثر کام لیتے ہیں ؎

لے کے جو دیر مغاں ہاتھ میں مینا آیا

میکشو شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

دل نے دیکھا مجھے اور میں نے فلک کو دیکھا

بحر کے ساحل پہ اگر کوئی سفینہ آیا

دوسرے شعر کی بلاغت کی سمت ہے۔

محاکات اور متحرک پیکر تراشی کی مدد سے کیسا پر معنی المیہ پیش کیا گیا ہے۔ مصور الفاظ نے ایک مرقع تصویر اور سائی ہے ؎

کنول ہیں چاند ستاروں کے جابجا روشن

شب وصال میں اللہ رے اہتمام ترا

کیسا تماشا کی منظر ہے کیسی پرکیف فضا!

محاکات، مصوری یا صنم طرازی کی چند اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں ؎

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا

زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

زند پھیلائے ہیں چلو کو تکلف کیسا

ساقیا ڈھال بھی دے جام جدا ساز آیا

ساقی کی عنایت سے تو لبریز ہے لیکن

دھڑکا ہے کہ لغزش سے مری جام نہ چھلکے

کیسی پر معنی وپر تاثیر تصویر کھینچی ہے۔ دھڑکا اور لغزش میں کیسی تجسس سے ربط ہے ؎

محرم در اصل بار بھری وہ نگاہ ہے

دیکھیں دو جو سے تو دیا گیا ماہ ہے

پہلی سی وہ رات دل میں تری تار کی نہاں

رگوں سے پیتی ل حشک ہیں اس جاں بات

کچھ تو پھولوں سے تسلی دل ناکام کی ہو　　ان میں خوشبو ہی سہی یار گل اندام کی ہو

غریب شمع اسے صبح یوں نہ بس کر کے سلا

اسی نے رات کو روشن کئے بچھے گھر کیا کیا

بلائیں میکدے کی دور، خم آباد سے کش خوش

ہمیشہ جام پر سایہ رہے ساقی کے دامن کا

شاد کچھ تو پوچھ مجھ سے میرے دل کے داغ کو
ٹمٹماتا سا چراغ اک اپنے ویرانے میں تھا

ماہ و شبنم تو اکثر براہ راست تشبیہات میں ان کا استعمال دیتے ہیں ۔

گلی میں یار کی اے شاد سب مشتاق بیٹھے ہیں
خدا جانے وہاں سے حکم کس کے نام آئے گا

منظر کشی اور ہنر کی مثال ملاحظہ ہو ۔

جوں ہی چھینٹیں ہوا نے دیں خلق دیدہ سے
اس نے دامن کو جھٹ بڑھ کے گردان لیا

حسن و ستم کے تجزیے میں جیسی کیفیت رکھ دی ہے شاد نے ۔

محو ہیں اپنی جگہ آسودگان گوشۂ دو مست
آرزو دل میں ہے دل آنکھوں میں آنکھیں ہونٹ دوست

محبت کی کتنی نازک اور لطیف مصوری کی ہے ۔ دل آنکھوں میں کا بوا ہیں ۔

تیرے تو دیدہ سراپا دشت سے لڑ رہے ہیں ضرور
دھجیاں جامہ میں اٹھتی ہیں دامانوں کی

کیسی خیرہ در تعبیری تصویر کشی ہے اچھا اور جمال آفریں اشعار سنیئے ۔

کسی کی لو ہے جو سینہ میں داغ روشن ہے
اندھیرے گھر میں یہی اک چراغ روشن ہے
اُدھر کی دین ہے اس آب و آتش میں یہ رنگ
سے خم کا نم ہے منور ایاغ روشن ہے
صبا نکلتی ہے یوں بیابان جیسے کھیت کرے
نقاب سبزہ ہے رخ پر کہ باغ روشن ہے
وہ میری قبر پہ جب بے نقاب آنے لگے
چراغ جتنے تھے روشن وہ جھلملانے لگے

تاثراتی مینا کاری ملاحظہ فرمائیے ۔

وہی رنگت، وہی خوشبو، وہی نازک بدنی
پھول نے نقش اتارا ہے سراپا تیرا

آواز و حرکت کے ذریعہ محاکات دلکش کا فن دیکھیئے ۔

عمر رواں کی تیز روی کا بیاں کیا
اک برق کوند کر ادھر آئی ادھر گئی

نظم و نسق اور عوام

(بقیہ صفحہ ۱۶)

اکثر و بیشتر یہ ایک ماہر کا کام ہے جس کے نتیجے کو سب ہی دیکھنے والے ہوتے ہیں اس لئے اس کے معیار میں خرابی نہیں آنا چاہیئے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جسے سب ہی مانتے ہیں لیکن کیا ہم ایسے حالات بھی پیدا کرتے رہتے ہیں جن میں مناسب معیار قائم کیا جاسکے؟

سب ہی جانتے ہیں کہ ہر گاڑی کی بوجھ ڈھونے کی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ اگر بوجھ حد سے تجاوز کر جائے تو انجن اور مشین کو سخت خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اسی لئے موٹر کے قواعد ہوتے ہیں۔ اسی مثال کے پیش نظر دوسرے شعبوں میں سلامتی کے قواعد وضع کئے گئے ہیں جن کا نفاذ ایک با اختیار ہستی کے سپرد ہوتا ہے۔ کیا یہ باتیں نظم و نسق کی مشینری پر بھی صادق نہیں آتی ہیں؟

ایک جدید ریاست کو جو امور انجام دینا ہوتے ہیں وہ وسیع بھی ہیں اور رنگا رنگ بھی۔ اسی کے جلو میں کسی حد تک مہارت خصوصی کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس کا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ بیشتر سرگرمیوں کو عوام کی نظر سے روپوش کرنا ہوتا ہے۔ سائنس کے تعاون نے اس صورت حال کا کسی حد تک ازالہ کر دیا ہے لیکن اس کی بھی اپنی حدیں ہیں۔ جب مال بنانے والا اور مال بیچنے والا یعنی "پروڈیوسر" اور "سیلس مین" ایک ہی ہو تو اسے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جس سے مال پر اچھا اثر نہ پڑے۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے کو دہراتی ہے لیکن جو نمونے بعد کو ابھرتے ہیں وہ بظاہر یکساں سہی لیکن ویسے ہی نہیں ہوتے۔ وقت کے ساتھ ان میں تبدیلیاں آ ہی جاتی ہیں۔ یونان کی براہ راست جمہوریت کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ کسی زمانہ میں اس پر عملدرآمد ہوتا ہوگا لیکن اب وہ ایک عملی تجویز نہیں رہ گئی ہے۔ انسان کا ذہن ایک نئے ڈھنگ اور نئے امتزاج کی تلاش میں لگا ہوا ہے۔ یہ ایک نیک اور پاک خواہش ہے لیکن نئی بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش میں یہ دھیان رکھنا ضروری ہے کہ کہیں ہم بیچ میں نہ گر پڑیں۔

ڈریسنگ گاؤن

خواجہ احمد عباس

ایک بڑے سرکاری افسر کے بنگلے میں ایک چور کل سوتا ہوا پکڑا گیا۔ اس کے پاس ہی چوری کی ہوئی چیزوں اور کپڑوں کے تین گٹھر پڑے تھے۔ اور چور خود مالک مکان کی اونی ڈریسنگ گاؤن پہنے ڈرائنگ روم میں دیوان پر لیٹا خراٹے بھر رہا تھا (نئی دہلی کی خبر)

دھیرے ۔۔ بہت دھیرے ۔ ۔ سے بھیکو نے باتھ روم کی کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں ہاتھ ڈال کر چٹخنی گرائی پھر کٹی رات کے سناٹے میں چٹخنی گرنے کی آواز ایسی گونجی کہ بھیکو سمجھا اب تو سارا گھر جاگ گیا ہوگا۔ وہ فوراً دیوار کے سایہ میں دبک کر بیٹھ گیا اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ چھوٹی موٹی چوریاں کرتے، تالے توڑتے اسے تیس مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن اب بھی اس کے دل سے پکڑے جانے کا خوف نہ گیا تھا اور پھر آج تو وہ اس بنگلے میں چوری کرنے آیا تھا جہاں وہ کتنے ہی برس گزار چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جس گھر کا بچہ بچہ اسے پہچانتا ہے وہیں چوری کرنے جانا خطرے سے خالی نہیں ہے لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں آج اس کے قدم آپ سے آپ اسے نمبر تین، گوتم روڈ تک لے آئے تھے۔

چٹخنی گرنے کی آواز باتھ روم ہی میں گونج کر رہ گئی اور سارا گھر اسی طرح لحاف میں لپٹا سوتا رہا۔ جب کئی منٹ تک نہ کوئی روشنی جلی اور نہ کوئی آواز آئی تو بھیکو کے دل کی دھڑکن کسی قدر کم ہوئی اور وہ اٹھا اور باتھ روم کی کھڑکی میں سے گھر میں داخل ہو گیا۔

اس بنگلے کا جغرافیہ بھیکو کو زبانی یاد تھا۔ اس باتھ روم سے ملا ہوا گوپال کا بیڈ روم ہے جہاں گوپال اور گیتا اور سب سے چھوٹا منا سوتے ہیں اور ان تینوں کے پلنگوں کے بیچ میں ان کی کھلائی موٹی گلابو۔ اس کمرے کے سامنے ہی مسٹر گھوش اور مسز گھوش کا بیڈ روم ہے۔ پھر ڈرائنگ روم کا بڑا ہال جس کے دوسرے کونے پر ڈائننگ ٹیبل رکھی ہوئی ہے اور اس کے پاس ہی مہاگنی کا بڑا احاتی سائز کا سائڈ بورڈ جس کی درازوں میں چاندی کے چمچے کانٹے رہتے ہیں۔ چاندی کی آئس کریم کھانے کی پیالیاں اور چاندی کا چائے کا سیٹ دھرا رہتا ہے اور ان چیزوں کی تلاش میں ہی بھیکو آج ادھر آیا تھا

اس ہال کے بعد دوسری طرف بھی ایک بیڈ روم ہے مگر بھیکو کو معلوم تھا کہ اس کمرے میں اب کوئی نہیں رہتا۔ خالی پڑا رہتا ہے۔ نہ وہاں کوئی قیمتی سامان ہے۔ دیواروں پر پرانی تصویریں ہیں جو وقت کے ساتھ پیلی پڑ چکی ہیں اور سنسکرت اور ہندی اور اردو فارسی کی پرانی پرانی کتابیں ہیں اور ایک حقہ ہے جو کئی مہینے سے بھرا نہیں گیا۔۔۔۔

شو کیس کے شیشوں میں سے آتی ہوئی چاند کی روشنی میں ہی چیزیں جمع کرنی شروع کر دیں۔ چمچے، کانٹے، چھریاں، چاندی کا چائے کا سیٹ، آئس کریم

کی بہ مدی کی پیالیاں چاندی کے ڈھکنے میں اس نے دیکھا کہ دیوار
کا طاق میں لٹکے ہوئے چند بڑے بڑے پیکٹ رکھے ہیں۔ ان کو ٹٹولنے
سے معلوم ہوا کہ الماری سے دُھلی نئی کلیں ہو کر سوٹ آئے ہیں اور جلدی
کوئی ان کو پہنتا ہے۔ کھول کر دیکھا ہے بھیکو نے سوچا ایک ایک سوٹ
کم سے کم چالیس پچاس میں تو بک ہی جائے گا اس لئے ان کو بھی مال غنیمت
میں شامل کر لیا۔ دلیپ سنگھ کے ... گزرتے گزرتے گویاں اور
دیا کی سونے کی گھڑیاں بھی ... اٹھا کر جیب میں ڈال لی تھیں لیکن اس
اتنے سامان کو اٹھا کر کیسے لے جائے؟ کوئی چادر مل جاتی تو کام بن جاتا۔
ایک کھڑکی میں سب بیچ باندھ لیتا اور اٹھا کر چلتا بنتا۔ چادر کہاں سے
آئے؟ اس نے سوچا شیرا اور مسز کھوسلہ کا بیڈ روم تو اندر سے بند رہتا ہے
جن کی چادریں، تولئے وغیرہ بھی ان کی الماری میں رہتے ہیں۔ پھر اسے
اس خالی کمرے کا خیال آیا جہاں ایک بستر اب بھی لگا ہوگا مگر سونے والا
نہیں ہوگا۔

اس کمرے کے پچھواڑے ایک گھنا نیم کا درخت تھا اس لئے اس میں
چاندنی کا گذر نہیں تھا گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بھیکو نے سوچا کھڑکیوں پر
تو پردے پڑے ہوئے ہیں ایک منٹ کو روشنی کر لوں، چادر لیتے ہی پھر
اندھیرا کر دوں گا۔ پرسوں اُس نے سر رات کو پورے دس بجے بٹن دبا کر روشنی
بجھائی تھی۔ اُس کا ہاتھ بلا کسی دقت کے بجلی کے بٹن پر پہنچ گیا۔ ایک پل
کے لئے تو دفعتاً تیز روشنی ہونے سے اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ پھر
اس نے دیکھا کہ سامنے والی دیوار سے کوئی اسے گھور رہا ہے۔ "یہ کوئی"
صرف ایک بڑی تصویر تھی۔ ایک بوڑھے آدمی کی تصویر۔ گنجے سر کے ارد
گرد سفید بالوں کی جھالر، چمکدار آنکھیں جو تصویر کے پردے میں بھی رحم اور
ہمدردی سے بھری نظر آتی تھیں چہرے پر جھریاں مگر مسکراتے ہوئے ہونٹ۔
آپ سے آپ بھیکو کے ہاتھ نمسکار کے لئے اٹھ گئے۔ من ہی من میں اس نے
کہا "نمستے پنڈت جی"۔ وہ یہ بھول گیا کہ اس کمرہ میں وہ چادر لینے آیا تھا جو ری
کے مال کا گٹھر سلے۔ وہ اس گھر میں اس رات کیوں آیا تھا کیا کرنے آیا تھا۔ وہ سب
بھول گیا۔ اب وہ بیس برس کا ہٹا کٹا جوان نہیں تھا۔ سات برس کا ایک
بچہ تھا اور اس کے بدن پر پھٹے پرانے چیتھڑے تھے اور وہ کناٹ پلیس
میں کھڑا جاڑے کی رات میں بھیک مانگ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک راہ گیر

کے سامنے ہاتھ پھیلایا اور اُس کے ہاتھ پر اکنی رکھتے ہوئے راہ گیر نے پوچھا "تمہارے
بچے! تیرا باپ تجھے اس سردی میں بھیک مانگنے بھیجتا ہے۔" تو مرہمیوں تی اُسنے
بچے نے کہا تھا "باپ نہیں ہے۔"
"اور ماں؟"
"ماں بھی نہیں۔"
"تیرا کا ماما، چاچا، پھوپھی کوئی رشتہ دار تو ہوگا"
"کوئی نہیں ہے۔"
"تو رات کہاں سوتا ہے؟"
"یہاں"
بچہ نے ایک بڑی سڑک کی طرف اشارہ کیا جس کے نیچے چند سائیکل رکشے والے
الاؤ جلائے آگ تاپ رہے تھے
"میرے ساتھ چلے گا؟"
"چلوں گا"
اور سو بچہ بوڑھے کی انگلی پکڑ کر اس کے ساتھ ہو لیا تھا اور اس طرح
پچپن نمبر ... روڈ میں پہلی بار داخل ہوا تھا اور کوٹھی کے اندر آتے ہی اُسے
اپنی چھوٹی سی عمر میں پہلی بار حبیب اور پیار دلداری کا احساس ہوا تھا بوڑھے
نے اپنے بیٹے اور بہو سے کہا تھا "میں اس تمہارے بچے کو لے آیا ہوں مگر یہ
نوکر کی طرح نہیں رہے گا۔ میری اولاد کی طرح رہے گا" اور پھر جب
پنڈت جی نے دیکھا تھا کہ بچہ سردی سے کانپ رہا ہے تو انھوں نے اپنا
اونی کشمیری ڈریسنگ گاؤن اڑھا دیا تھا اور ڈرائنگ روم ہی میں دیوان
پر سلا دیا تھا اور زندگی میں پہلی بار بچہ کو نرم اور گرم بستر نصیب ہوا تھا۔
باہر ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی اور رات کے سناٹے
کو اور بھی سنگین بنا رہی تھی۔ بھیکو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس تصویر
میں مسکراتے ہوئے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ اس سے کچھ کہہ رہے ہیں۔
"کیا ہے پنڈت جی؟" من ہی من میں اس نے سوال کیا۔
"پنڈت جی نہیں، بابا کہو بیٹا۔" تصویر خاموشی کی زبان سے بول رہی تھی۔
"کیا ہے بابا؟"
"بڑے افسوس کی بات ہے کہ جس گھر میں میں تمہیں بیٹا بنا کر لایا اُسی
گھر میں تم آج چوری کرنے آئے ہو۔"

"اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، بابا" بھیکو نے من ہی من میں ان تمام حالات کو یاد کیا جن کی وجہ سے وہ آج چور بن گیا تھا۔

جب پنڈت بالکرشن جی اسے اس گھر میں لائے تھے تو کئی برس تک انہوں نے اسے سچ مچ بیٹے کی طرح ہی پالا تھا۔ لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔ اسکول بھیجا تھا لیکن پھر پنڈت جی پر فالج کا پہلا دورہ پڑا تھا۔ دائیں ٹانگ اور دائیں بازو بیکار ہو گئے تھے۔ اب وہ گھر میں چل پھر نہیں سکتے تھے۔ مات بھی مشکل سے کر پاتے تھے۔ اب بیٹا اور بہو ان کی کوئی خاص پرواہ بھی نہیں کرتے تھے۔ صرف بھیکو ہی ان کے پاس بیٹھا رہتا۔ ان کی سیوا کرتا۔ اسکول جانا بھی اس نے چھوڑ دیا۔ پھر ایک دن اس نے سنا کہ اسکول سے اس کا نام کٹوا دیا گیا ہے کیونکہ بھوشن صاحب کا کہنا تھا کہ نوکروں کے لئے زیادہ پڑھنا لکھنا غیر ضروری ہے۔ اس کو کھانا بھی نوکروں کے ساتھ ملنے لگا۔ برتاؤ بھی نوکروں جیسا ہونے لگا۔ مگر اس نے ان باتوں کی خبر پنڈت جی کو نہ ہونے دی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ انہیں بہت دکھ ہوگا۔ وہ لڑکھڑاتی زبان سے کبھی پوچھتے بھی کہ "سب ٹھیک ہے نا، بھیکو؟"

"تجھے کوئی تکلیف تو نہیں؟" تو وہ انھیں یقین دلا دیتا کہ وہ بالکل آرام سے ہے۔

اور سو وقت گذرتا گیا۔ بوڑھے پنڈت جی کی حالت بگڑتی گئی یہاں تک کہ سارا جسم مفلوج ہو گیا صرف آنکھوں میں جان باقی رہ گئی۔ اب تو بھیکو کے ساتھ اور بھی برا سلوک ہونے لگا۔ رات دن کا کام کرنا پڑتا۔ اب بھوشن صاحب کے جوتوں پر پالش کرو۔ اب مسز بھوشن کی ساڑی پر استری کرو۔ اب بچوں کا کھانا اسکول لے جاؤ۔ اب رسوئی میں برتن مانجھو۔ اب ڈرائنگ روم کی صفائی کرو۔ تنخواہ کے نام کا اس کو ایک روپیہ بھی نہیں ملتا تھا کیونکہ مسز بھوشن کا کہنا تھا کہ آخر ہم نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے، پھر کھانا دیتے ہیں۔ رہنے کو جگہ دیتے ہیں، اور کیا چاہیئے۔

پھر ایک دن پنڈت جی کا آخری وقت آن پہنچا۔ ان کی ٹانگیں بالکل ٹھنڈی اور بے جان ہو گئیں۔ بھیکو نے گھبرا کر ان پر دو تین کمبل اور ایک لحاف ڈال دیا۔ پھر بھی ٹانگوں میں گرمی نہ آئی تو اس نے پنڈت جی کا وہ پرانا اونی ڈریسنگ گاؤن بھی ڈال دیا اور اس ڈریسنگ گاؤن کو دیکھ کر پنڈت جی کے چہرے پر مرتے ہوئے بھی ایک مسکراہٹ دوڑ گئی جیسے ان کو اس میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا بچہ یاد آ گیا ہو اور انھوں نے اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں سے ڈریسنگ گاؤن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خاموش ہونٹوں کی جنبش سے کہا "یہ تو لے لیجیو۔" اور پھر وہ چل بسے اور زندگی میں دوسری بار بھیکو یتیم ہو گیا۔

اور پھر ایک دن جب بھیکو اپنی نوکروں والی کوٹھری میں سردی سے کانپ رہا تھا۔ اسے پنڈت جی کا آخری تحفہ یاد آیا مگر وہ ان کے کمرہ میں سے ڈریسنگ گاؤن لے کر نکل ہی رہا تھا کہ مسز بھوشن نے اسے دیکھ لیا اور چوری کے الزام میں اسے گھر سے نکال دیا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا "کم سے کم سرٹیفکیٹ دے دیجئے تاکہ کہیں اور کام مل جائے" مگر مسٹر بھوشن نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "میں چوروں کو سرٹیفکیٹ نہیں دے سکتا۔"

وہ چور نہیں تھا پھر بھی انھوں نے اسے چور سمجھا اور سو وہ سچ مچ چور بن گیا تھا اور آج اسی گھر میں چوری کرنے آیا تھا۔

مگر پنڈت جی کی آنکھیں اس سے کچھ کہہ رہی تھیں۔

ادھر مڑ کر دیکھا تو دیوار پر وہی ڈریسنگ گاؤن ٹنگی ہوئی تھی۔ اب وہ سمجھ گیا کہ پنڈت جی اس سے کیا کہہ رہے ہیں "بیوقوف چرانا ہے تو کوئی کام کی چیز چرا۔ چاندی کے چمچوں سے سردی نہیں جائے گی اس کے لئے یہ ڈریسنگ گاؤن چاہیئے۔"

اور سو وہ ڈریسنگ گاؤن لے کر ڈرائنگ روم میں واپس آیا جہاں وہ چاندی کے چمچوں، کانٹوں وغیرہ کا ڈھیر لگا گیا تھا مگر اب اس چاندی کے سامان میں وہ چمک نہیں رہی تھی۔

اوپر کا روشن دان شاید کھلا ہوا تھا برفیلی ہوا کا ایک جھونکا اس کے قمیض کے کالر میں سے ہوتا ہوا اس کے سارے جسم کو کپکپا گیا۔ بے خیالی اور بے اختیار اس نے ڈریسنگ گاؤن پہن لی اور دفعتاً اس کا سارا جسم ایک عجیب نرمی اور گرمی کے احساس سے بھرپور ہو گیا۔ یہ گرمی اون کی نہیں تھی۔ محبت کی گرمی تھی۔ ایک عجیب تھکن کے احساس سے چور ہو کر وہ دیوان پر بیٹھ گیا اسے ایسا لگا جیسے دفعتاً پنڈت جی نے اسے اپنی باہوں میں لے لیا ہو مگر اب وہ چور نہیں تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ جو تھکا تھا اور تھکا ہوا تھا اور جسے بڑی سخت نیند آ رہی تھی۔ اور جسے ڈریسنگ گاؤن کی ملائم گرماہٹ اب تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔

مژدۂ بیداری

مسعود احمد جمال

جاگ اُٹھا ہندوستاں، روحِ صنم خانہ لیے

کیفِ مے خانہ لیے، گردش میں پیمانہ لیے
سوز و سازِ زندگی کا جذبِ رندانہ لیے
شمع کا نورِ یقیں، ایثارِ پروانہ لیے

سرفروشانِ وطن سے دل کا بیعانہ لیے
جاگ اُٹھا ہندوستاں، روحِ صنم خانہ لیے

آج کیفِ سرمدی سے رقص کرتی ہے صبا
کرشن کی بنسی کی لے سے گنگناتی ہے فضا
دشت و صحرا مست و بے خود، وجد میں ارض و سما

ذرّے ذرّے میں دھڑکتے دل کا افسانہ لیے
جاگ اُٹھا ہندوستاں، روحِ صنم خانہ لیے

امنِ عالم کے لیے قربان جان و تن کیے
آستینِ وقفِ الم، نذرِ جنوں دامن کیے
آندھیوں کی تیرگی میں شمعِ دل روشن کیے

گردشِ دوراں کی رَو میں، دورِ پیمانہ لیے
جاگ اُٹھا ہندوستاں، روحِ صنم خانہ لیے

اُٹھ گیا ہے دیدۂ و دل سے حجابِ درمیاں
آج ہے فکر و نظر میں وسعتِ کون و مکاں
سربلندی سے ہمالہ کی، پرِ پروازِ جاں

گنبدِ افلاک پر بنیادِ کاشانہ لیے
جاگ اُٹھا ہندوستاں، روحِ صنم خانہ لیے

آسماں در آسماں ہے اب جہانِ زندگی
کہکشاں در کہکشاں ہے داستانِ زندگی
بڑھ رہے ہیں سوئے منزل رہروانِ زندگی

وقت کا فرمان مستقبل کا پروانہ لیے
جاگ اُٹھا ہندوستاں، روحِ صنم خانہ لیے

غیرتِ صد ماہ و انجم، رشکِ صد خلدِ بریں
وادیٔ گنگ و جمن کی مسکراتی سرزمیں
لہلہاتے جھومتے کھیتوں کی آغوشِ حسیں

سیکڑوں فردوسِ رنگ و بو کا افسانہ لیے
جاگ اُٹھا ہندوستاں، روحِ صنم خانہ لیے

ہندوستانی پھل

(ہندوستان کے فارسی لٹریچر کی روشنی میں)

سید صباح الدین عبدالرحمن

ہندوستان کے ہر دور میں مختلف قسم کے پھلوں کی بڑی کثرت رہی
ان کا ذکر یہاں کی مختلف زبانوں میں موجود ہے۔ ایک عرصہ دراز تک
فارسی بھی یہاں کی سرکاری اور علمی زبان رہی اس لئے اس کے لٹریچر میں ہندوستانی
پھلوں کا ذکر بہت ہی لطف و لذت کے ساتھ کیا گیا ہے جس کو ہم اس مضمون
میں قلمبند کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ ان پھلوں میں بعض پھل تو خالص
ہندوستانی ہیں جو یہاں کے سوا کہیں اور نہیں ہوتے مگر بعض پھل باہر سے
لاکر یہاں لگائے گئے۔

آم۔ یہ ہندوستان کا قومی پھل ہے اس لئے خواص و عوام دونوں
میں مقبول رہا۔ دہلی کے غلام خاندان کے مشہور فرماں روا شمس الدین التتمش کو
یہ اس قدر پسند تھا کہ اس نے اس کا نام نغزک رکھنے کی کوشش کی، جس کے
لغوی معنے نادر، خوب اور لطیف ہیں۔ اسی پر امیر خسرو نے یہ شعر بھی کہا۔

نغزک ما نغزکن بوستاں

نغز ترین میوۂ ہندوستاں

لیکن یہ نام چل نہ سکا، آم یا انبہ ہی کہلاتا رہا۔ یہ ہندوستان کے علاوہ
کہیں اور نہیں ہوتا اس لئے بیرونی سیاح اس کا ذکر بہت ہی مزے
لے لے کر کرتے رہے، مثلاً ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں ایک
میوہ انبہ ہوتا ہے۔ اس کا درخت نارنگی کے درخت کے مشابہ ہوتا ہے گو
اس کے پتے نارنگی کے پتوں سے بڑے اور تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔
اس کا سایہ بھی زیادہ گھنا ہوتا ہے لیکن جو شخص اس کے سایہ میں سفر کرتا ہے
کسلمند ہو جاتا ہے اور اس کا پھل آلو بخارہ سے بڑا ہوتا ہے پکنے سے پہلے سبز
ہوتا ہے اور جب گر پڑتا ہے تو اس میں نمک ڈال کر اچار بناتے ہیں۔ اسی طرح
جیسے ہمارے ملک میں لیمو اور کھٹے کا اچار بناتے ہیں اور کھانے کے ساتھ کھاتے ہیں
اور ہر نوالہ کے پیچھے تھوڑا سا اچار کھا لیتے ہیں۔ جب خریف کے موسم میں انبہ پک کر
زرد رنگ کا ہو جاتا ہے اور اس کو سیب کی طرح کھاتے ہیں بعض لوگ
اس کو تراش کر کھاتے ہیں اور بعض چوستے ہیں۔ اس میں مٹھاس کے علاوہ
کچھ ترشی بھی ہوتی ہے۔ گٹھلی بڑی نکلتی ہے جس کو بوتے ہیں تو درخت
ہو جاتا ہے (سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۲۸۔۲۹)

بابر ہندوستان آیا تو آم کو دیکھ کر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ اس میں
خوشبو ہوتی ہے اور یہ خود رو بھی ہوتا ہے مگر خود رو عمدہ نہیں ہوتا عام طور سے
کچی کیریاں توڑ لیتے ہیں اور پال ڈال کر پکاتے ہیں گدری کیریاں ترشی لئے
ہوتی ہیں جن کا مربہ خوب ہوتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ آم ہندوستان کے عمدہ پھلوں
میں سے ہے۔ اس کا درخت بہت بڑھتا ہے۔ برسات کے موسم میں پکتا ہے۔
اس کو ایک تو اس طرح کھاتے ہیں کہ نیچے کی طرف کو پلپلاتے ہیں اور پھر اس کے
منہ میں سوراخ کرتے ہیں اور رس چوستے ہیں، دوسرے شفتالوئے کاردی
کی طرح پوست کو علیحدہ کر کے کھاتے ہیں۔ اس کا پتہ شفتالو کے پتے سے کچھ کچھ
مشابہ ہوتا ہے۔

بابر کو شاید آم زیادہ پسند نہ ہوا اس لئے وہ لکھتا ہے کہ بعض لوگ آم کو
اتنا پسند کرتے ہیں کہ خربزے کے سوا اور تمام پھلوں سے بہتر سمجھتے ہیں لیکن ایسا

تو نہیں ہے۔ ہاں شفتالو ٹے کا روی سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا تنہ بھی بے ڈھنگا اور بے ڈول ہوتا ہے۔ ابوالفضل نے بابر کی اس رائے کی تردید کی ہے اور وہ آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ آم اپنے رنگ، ذائقہ اور خوشبو میں بے مثل پھل ہے۔ بعض ایرانی اور تورانی بھی اس پھل کو خربوزے اور انگور سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کا درخت بے حد خوشنما ہوتا ہے خصوصاً جوان پودے بے انتہا خوبصورت ہوتے ہیں۔ ان کے پتے برگ بید سے مشابہت رکھتے ہیں۔ خزاں کے بعد ان میں سبز، زرد، نارنجی اور آتشی رنگ کے نئے پتے نمودار ہوتے ہیں اور جب بہار کے شروع میں ان میں کلیاں پھوٹتی ہیں اور پھل انگور کے خوشوں کی طرح لگتے ہیں تو ان کی خوشبو نہایت عمدہ ہوتی ہے اور درختوں کی نظارہ بخش بہار دکھاتی ہے

آموں کے متعلق ابوالفضل نے بعض مفید معلومات فراہم کیے ہیں مثلاً وہ لکھتا ہے کہ بعض آم وزن میں ایک سیر سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ آموں کے نہ صرف مربے اور اچار بنائے جاتے ہیں، بلکہ سالن میں ان کے تلے بھی ڈالے جاتے ہیں جو بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ لیکن قتلہ اسی وقت اچھا ہوتا ہے جب آموں میں گٹھلی ہو جاتی ہے۔ بعض آم جاڑوں کے شروع میں بھی ہوتے ہیں جن کو ھدیہ کہا جاتا ہے۔ آموں کے کچھ درخت ایسے بھی ہوتے ہیں جو سال بھر پھل دیتے رہتے ہیں لیکن ایسے درخت بہت کم کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ یہ پھل ہندوستان میں ہر جگہ ہوتا ہے۔ اس کی کثرت بنگال، گجرات، مالوہ، خاندیس اور دکن میں ہوتی ہے، پنجاب میں کم ہوتا ہے۔ آم کے پودوں کو دودھ اور شکر سے سینچا جاتا ہے تو ان کے پھلوں میں مٹھاس زیادہ ہو جاتی ہے۔ ابوالفضل نے شاید اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ بھی لکھا ہے کہ آم کی خستہ گٹھلیاں اگر رکھ دی جائیں تو یہ دو تین سال کے بعد تریاق کا کام دیتی ہیں۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اگر آم کو پکنے سے پہلے اس کی شاخ کے ساتھ توڑ لیا جائے اور شاخ کے اوپر گرم موم لگا کر اس کو گائے کے گھی یا شہد میں ڈال دیا جائے تو آم کے ذائقہ میں دو تین مہینے اور اس کے رنگ میں ایک سال تک کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ (آئین اکبری۔ جلد اول ص ۴۹)

ہندوستان میں درختوں میں پیوند لگا کر اچھے درخت پیدا کرنے کا رواج مسلمان بادشاہوں کے دور میں ہوا۔ عہد اکبری میں محمد قلی افشار کشمیر میں شاہی باغات کا داروغہ تھا۔ اس نے کابل سے شاہ آلو منگوا کر اس میں پیوند لگایا اور اسی کے بعد درختوں میں پیوند لگانے کا عام رواج ہو گیا۔ (تزک جہانگیری ص ۳۰۴) مسلمانوں نے آموں میں بھی پیوند لگانا شروع کیا اور اب قلمی آموں کی بے شمار قسمیں ہو گئی ہیں۔ ثمر بہشت، فضلی، خاص الخاص، گلاب خاص، دسہری، حسن آرا، محمود الظفر، دودھیا، حکیم الدین، سپیدہ وغیرہ مسلمانوں ہی کی کوششوں سے آج ملک میں پیدا ہو رہے ہیں۔ ہندوؤں نے بھی خاص خاص قلمی آم لگائے جن میں کشن بھوگ، موہن بھوگ، شوکل، سیپیا، طوطا پری وغیرہ مشہور ہیں۔

نارنج۔ نارنج، نارنگ کا معرب ہے جو اب نارنگی کے نام سے مشہور ہے۔ بابر کے زمانے میں یہ پھل سوات اور بجور میں بکثرت پیدا ہوتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ بجور کے نارنج بہت رسیلے اور بہی کے برابر ہوتے ہیں اور بعض درختوں میں سات سات ہزار لٹکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ گوادر جگہوں کے نارنجوں سے زیادہ کھٹے ہوتے ہیں۔ (تزک بابری۔ اردو ترجمہ ص ۲۸۵)

کنولا۔ یہ بھی نارنگی ہی کی ایک قسم ہے۔ ابوالفضل اس کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ رنگ میں زعفرانی اور بہی کا سا ہوتا ہے یہ پھل ہندوستان کے بہترین پھلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا درخت لیموں کے پودے سے مشابہ ہوتا ہے اور اس کے پھول میں ہلکی ہلکی خوشبو ہوتی ہے۔ (آئین اکبری۔ جلد اول۔ ص ۵۱)

ترنج۔ بابر لکھتا ہے کہ ترنج نارنج ہی کی طرح ہوتا ہے، بجور اور سوات والے اس کو بالنگ کہتے ہیں اسی لئے اس کے مربے کو مربائے بالنگ کہا جاتا ہے، ترنج دو طرح کا ہوتا ہے، ایک میٹھا لیکن بے مزہ۔ اس کے صرف مربے بنائے جاتے ہیں۔ دوسرا کھٹا ہوتا ہے جس سے بڑے مزہ کا شربت تیار کیا جاتا ہے۔ عام طور سے ترنج چھوٹے خربزے کے برابر ہوتے ہیں ان کے چھلکے پتلے، پوست کھردرے، رنگ نارنج کے رنگ سے زیادہ زرد اور پتے نارنگ کے پتوں سے بڑے ہوا کرتے ہیں۔ (تزک بابری۔ اردو ترجمہ۔ ص ۲۸۵)

سنگترہ۔ اس کے بارہ میں بابر لکھتا ہے کہ یہ رنگ اور وضع میں نارنج سے ملتا جلتا ہے ترنج سے چھوٹا اور اس کا درخت زرد آلو کے برابر ہوتا ہے اس میں بڑی ترشی ہوتی ہے لیکن جو میٹھا ہوتا ہے وہ پسند کیا جاتا ہے جہانگیر کو یہ بہت پسند تھا اور اس کے رنگ کی وجہ سے اس کا نام رنگترہ رکھنے کی کوشش کی لیکن یہ نام چل نہ سکا۔

لیمو۔ نارنج ہی کی طرح لیمو بھی ہوتا۔ بابر نے لکھا ہے کہ اس کے رشتہ کو جوش دے کر زہر کھانے والے کو پلایا جاتا ہے تو زہر کا اثر جاتا رہتا ہے۔ (تزک بابری ص ۲۸۵)

کلکل۔ بابر نے لکھا ہے کہ یہ نارنج جیسا بڑا لیمو ہے اور بڑا رسیلا پھل ہے قاز کے انڈے کے برابر ہوتا ہے۔ (تزک بابری۔ ص ۲۸۵)

کرنا۔ یہ بھی نارنج سے ملتا جلتا اور کلکل کے برابر لیکن ذائقہ میں کھٹا ہوتا ہے۔ ابوالفضل نے اس کے بارہ میں لکھا ہے کہ یہ سیب سے مشابہ ہوتا ہے۔ تین سال میں اس کے خوشے نکل آتے ہیں۔ ابتدا میں سبز، ترش اور کچھ تلخ ہوتا ہے لیکن بعد میں زرد ہو جاتا ہے جس کے بعد تلخی جاتی رہتی ہے اور پختہ ہو کر سرخ اور شیریں ہو جاتا ہے۔ دیر تک رکھے رہنے سے دوبارہ سبز ہو جاتا ہے۔ اسکا درخت لیمو کے مانند ہوتا ہے لیکن اس کی پتیاں برگ لیمو سے زیادہ چوڑی ہوتی ہیں اس کے پھول سفید ہوتے ہیں جن کے زردی ریشے یا دانے میں بے حد خوشبو ہوتی ہے اور ان سے عبیر تیار کیا جاتا ہے۔ (آئین اکبری۔ ص ۵۰)

امل بید۔ نارنج کے مشابہ ہوتا۔ بابر رقمطراز ہے کہ لوگوں کا بیان ہے کہ اس میں اتنی ترشی ہوتی ہے کہ اگر اس میں سوئی ڈال دی جاتی ہے تو پانی ہو کر بہہ جاتی ہے۔ اس کی عمدہ قسم کو کملہ کہتے ہیں جس کی مٹھاس لطیف اور خوشگوار ہوتی ہے۔ یہ حاجی پور میں زیادہ ہوتا ہے۔

جنبیری۔ نارنج کی شکل کا ہوتا ہے لیکن اس کے رنگ میں زردی ہوتی ہے، اور بڑا کھٹا ہوتا ہے۔

سدا پھل۔ یہ امرود کے برابر ہوتا ہے۔ رنگ بہی کے رنگ کے ایسا ہوتا ہے۔ اس میں مٹھاس ہوتی ہے۔ بابر لکھتا ہے کہ اس کی مٹھاس نارنج کی طرح ناگوار نہیں ہوتی۔ (تزک بابری۔ ص ۲۸۶)

امرد پھل۔ بابر نے لکھا ہے کہ یہ بھی نارنج ہی کی شکل کا ہوتا ہے۔ (تزک بابری۔ ص ۲۸۶)

کیلا۔ بابر ہندوستان آیا تو کیلے کے درخت کو دیکھ کر بہت متعجب ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اس کا درخت گھاس اور درخت کے بیچ بیچ ایک چیز ہے اس کا پتہ دو گز لمبا اور ایک گز چوڑا ہوتا ہے۔ یہ اور درخت کے بیچ میں ایک شاخ دل کی شکل کی طرح ہوتی ہے۔ اسی شاخ کے منہ پر غنچہ ہوتا ہے جس کی وضع بکرے کے دل جیسی ہوتی ہے۔ غنچہ کی جو پنکھڑی کھلتی ہے، اس کی جڑ میں سے چھ سات کلیوں کی ایک قطار پھوٹتی ہے۔ یہی کلیاں کیلا ہو جاتی ہیں۔ آگے چل کر لکھتا ہے کہ کیلے میں دو لطافتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا چھلکا آسانی سے اتر جاتا ہے، دوسرے یہ کہ اس کے اندر بیج یا اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بابر کو بنگال کے کیلے بہت پسند تھے اس لئے لکھتا ہے کہ یہاں کے کیلے بہت میٹھے ہوتے ہیں، اس کا درخت بھی خوشنما ہوتا ہے۔ اس کے چوڑے چوڑے اور ہرے ہرے پتے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ کیلے کا درخت نیزے کی طرح ہوتا ہے اور اس کی پتیاں بغیر سلی ہوئی آستینیں معلوم ہوتی ہیں۔ کلیاں پتیوں کے درمیان صنوبری شکل اور سوسنی رنگ کی ہوتی ہیں اور ہر خوشہ میں ستر یا اسی کیلے پھلتے ہیں۔ (تزک بابری ص ۲۸۲۔ آئین اکبری۔ ص ۵۱۰۵)

پنیالہ۔ بابر لکھتا ہے کہ یہ سُرخ سیب کے مشابہ اور مزہ میں چاشنی دار ہوتا ہے۔ اس کا درخت انار کے درخت سے اونچا اور پتے بادام کے ایسے مگر کچھ لمبے ہوتے ہیں۔ (تزک بابری۔ ص ۲۸۳)

مہوہ۔ بابر نے لکھا ہے کہ اس کا درخت خوشنما اور سایہ دار ہوتا ہے۔ اس کے پھولوں کا عرق کھینچا جاتا ہے اور ان کو سکھلا کر مویز کی طرح کھاتے ہیں جو مزہ میں کشمش کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی بو بھی اچھی ہوتی ہے۔

کھرنی۔ ہندوستان کا یہ معمولی پھل ہے لیکن بابر کی نظر اس پر بھی گئی اور وہ لکھتا ہے کہ اُس کا درخت اونچا تو نہیں لیکن چھوٹا بھی نہیں ہوتا۔ پھل کا رنگ تو زرد ہوتا ہے لیکن مزہ کچھ انگور سے ملتا ہے گو کھاتے وقت کچھ کسیلا پن بھی محسوس ہوتا ہے۔ (تزک بابری۔ ص ۲۸۳)

جامن۔ بابر کو جامن پسند نہیں آیا اس لئے لکھتا ہے کہ پھل تو سیاہ انگور کا ایسا ہوتا ہے لیکن مزہ میں زیادہ اچھا نہیں ہے، کچھ ترشی لئے ہوتا ہے۔

کمرک۔ بابر کو کمرک پسند آگیا تھا اس لئے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے پانچ پہلو ہوتے ہیں، عین آلو کے برابر ہوتا ہے۔ پکنے کے بعد زرد ہو جاتا ہے۔ اس میں گٹھلی نہیں ہوتی ہے۔ شروع میں تو بہت کڑوا ہوتا ہے لیکن پکنے کے بعد اس کی ترشی مزے کی ہو جاتی ہے۔ اچھا اور لطیف پھل ہے۔ (تزک بابری ص ۲۸۳)

کٹہل۔ بابر نے کٹہل کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اسکی صورت بکرے کی اوجھڑی کی ایسی ہوتی ہے۔ گپّی کی طرح سے پھولتا رہتا ہے بہت میٹھا لیکن بدمزہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر کے دانے خرما سے مشابہ ہوتے ہیں

ں لمبے ہونے کے بجائے گول ہوتے ہیں۔ ان دانوں میں کھجور سے زیادہ
نرم گودا ہوتا ہے جس کو کھایا جاتا ہے اس میں تری چپچپاہٹ ہوتی
، اسی لئے کھاتے وقت احتیاط ہاتھ اور منہ پر چکنائی رہ جاتی ہے۔
کے پھل درخت کی شاخ اور تنہ میں بھی لگتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے
دیا درخت میں کپیاں لٹکی ہوئی ہیں (تزک بابری۔ ص ۲۸۳)

بڑہل۔ بابر نے بڑہل بھی کھایا تھا اس لئے لکھتا ہے کہ سیب کے
ہوتا ہے۔ اس کی بو تو اچھی ہوتی ہے لیکن بے مزہ [illegible] ہے
ں بابری۔ ص ۲۸۳)

بیر۔ بابر نے اس پھل کے متعلق [illegible] کے معلومات
م کئے ہیں۔ کہتا ہے کہ تو [illegible] ایں اس کی ایک قلم ہوتی ہے اور
ان میں ہرا بھرا ہو جاتا ہے اور جب آفتاب دلو اور حوت میں آتا ہے
س کے پھل پکنے لگتے ہیں۔ [illegible] نے مانڈو کے بیر کی بڑی تعریف لکھی
۔ (تزک بابری۔ ص ۲۸۳)

کرونده۔ بابر نے اپنے وطن کے پھل حکہ سے اس کا موازنہ کیا ہے
کہتا ہے کہ اسی کی طرح لمبوترا اور گول ہوتا ہے لیکن حکہ عام طور سے
ں میں پیدا ہوتا ہے اور کرونده میدانوں میں ہوتا ہے۔ اس کا مزہ مرمی جوا
یا ہوتا ہے گو اس میں مٹھاس زیادہ مگر ترادٹ کم ہوتی ہے (تزک بابری۔ ص ۸۲)

آملہ۔ بابر اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی پانچ پھانکیں ہوتی
د رگو لے مزہ مگر مفید پھل ہے اس کا مربہ بُرا نہیں ہوتا ہے۔ اس کے
رت درخت کے پتے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں

گولر۔ بابر نے لکھا ہے کہ یہ انجیر سے مشابہت رکھتا ہے لیکن عجب
رہ پھل ہے جو درخت کے تنے میں لگتا ہے۔ (تزک بابری۔ ص ۲۸۲)

چرونجی۔ بابر کو اس کا مغز پسند آیا تھا اس لئے اس کے ذکر میں لکھتا ہے
کی گٹھلی میں سے چار مغز اور بادام کی سی گری نکلتی ہے جو مٹھائیوں وغیرہ
اجاتی ہے۔ (تزک بابری۔ ص ۲۸۴)

کھجور۔ ہندوستان میں عام طور سے اچھی کھجوریں نہیں ہوتی ہیں لیکن
ے اس پھل کے متعلق بھی دلچسپ معلومات فراہم کیے ہیں مثلاً وہ لکھتا ہے
ں کی شاخیں درخت کے سر پر ایک ہی جگہ ہوتی ہیں۔ پتے شاخوں کی جڑ
ے سر تک دو طرفہ ہوتے ہیں۔ تنہ تو کھردرا اور بدرنگ ہوتا ہے لیکن پھل

انگور کے خوشہ کی طرح لگتا ہے اس کے درخت میں دو باتیں حیوانوں کی ایسی
ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح حیوان کا سر کاٹ ڈالا جاتا ہے تو وہ مر جاتا ہے اسی طرح
اس کے درخت کا سر تراش دیا جاتا ہے تو وہ خشک ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ
جیسے حیوانات میں نر کے بغیر مادہ کے یہاں بچہ نہیں ہوتا اسی طرح جب تک مادہ
کھجور کے پھولوں میں نر کھجور کا پھول نہیں ملتا پھل نہیں لگتا۔ اس کے بعد بابر اس کی
تفصیل لکھتا ہے کہ کس طرح اس سے تاڑی نکالی جاتی ہے۔ (تزک بابری۔
ص ۲۸۴)

ناریل۔ بابر کے بیان کے مطابق اس کا درخت کھجور کے درخت جیسا ہوتا
ہے اور اس کی تمام شاخوں میں پتے ہوتے ہیں۔ اس کے پھل کے اوپر ریشہ دار
پوست ہوتا ہے جہازوں اور کشتیوں کے رسے اور رسیاں اسی پوست سے
بناتے ہیں۔ پوست کے نیچے سخت قسم کی گٹھلی ہوتی ہے جس کے اندر مغز بنتا ہے
ابوالفضل نے ناریل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں پھل برابر لگے رہتے
ہیں جو تین مہینے میں پک کر تیار ہوتے ہیں۔ کچے پھل کا رنگ سبز ہوتا ہے
اور کچھ دنوں رکھ دیا جاتا ہے تو اس سے ایک قسم کا شربت نکلتا ہے جو دودھ
کی طرح سفید ہوتا ہے۔ گرمی کے موسم میں اس کو شکر ملا کر پیا جاتا ہے تو
بہت لذیذ ہوتا ہے۔ پک جاتا ہے تو اس کو تیل میں ڈال کر سیاہ کر لیتے
ہیں جس کے بعد یہ میٹھا اور ترب دار ہو جاتا ہے اس کو پان کے ساتھ بھی
کھایا جاتا ہے جس سے زبان میں نرمی اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے
پوست کے پیالے، چمچے اور ستار وغیرہ بناتے ہیں۔ پھل چہار چشمی، سہ چشمی
دو چشمی اور یک چشمی ہوتا ہے۔ ہر ایک کی خاصیت علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے
لیکن آخری قسم سب سے اچھی سمجھی جاتی ہے۔ ناریل کی ایک قسم زہر کا تریاق
سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعض پھل بارہ سیر یا اس سے زیادہ وزنی ہوتے
ہیں۔ (آئین اکبری ص ۵۱)

تاڑ۔ بابر نے تاڑ کو بھی ہندوستانی پھلوں میں شمار کیا ہے اور اس کے
متعلق لکھتا ہے کہ اس کی شاخیں درختوں کے سر پر ہوتی ہیں۔ اس سے بھی
یہاں کے لوگ کھجور کی طرح رس نکالتے ہیں اور پیتے ہیں جس کو تاڑی کہتے ہیں
اس میں کھجور کے رس سے زیادہ نشہ ہوتا ہے۔ اس کی شاخوں میں گز ڈیڑھ
گز تک پتہ نہیں ہوتا ہے۔ اس کے بعد تیس چالیس پتے ایک دوسرے
سے ملے ہوئے نکلتے ہیں جن کی لمبائی تقریباً گز بھر کی ہوتی ہوگی ہندی تحریریں

اکثر ان ہی پتوں پر رکھی جاتی ہیں۔ بعض عورتیں ان کے پتوں کے بالے بھی پہنتی ہیں ان پتوں کے گدے بھی بنائے جاتے ہیں جو کھجور کے گدے سے زیادہ خوبصورت اور صاف ہوتے ہیں۔ (تزک بابری۔ ص ۲۸۵)

سنگھاڑا۔ بابر نے سنگھاڑا کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ابوالفضل نے اس کی تفصیل لکھی ہے کہ یہ پھل سہ گوشہ ہوتا ہے۔ اس کی بیلیں تالابوں میں پیدا ہو کر بڑھتی ہیں اور پھل پانی کی سطح پر نمودار ہوتے ہیں، یہ کچا اور پکا کر بھی کھایا جاتا ہے۔ (تزک بابری۔ ص ۲۸۵)

کسیرو۔ بابر نے اس کا بھی ذکر نہیں کیا ہے لیکن ابوالفضل اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ تالابوں میں پیدا ہوتا ہے اور جب اس میں رس آ جاتا ہے تو تالاب کی زمین میں سے اور یہ نکال لیا جاتا ہے۔ کچا بھی کھایا جاتا ہے اور ابال کر کے بھی (آئین اکبری ص ۵۲)

سالک۔ ابوالفضل نے اس کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ تالابوں میں زمین کے نیچے پیدا ہوتا ہے اور پانی کی تہہ سے باہر نکالا جاتا ہے۔ (آئین اکبری۔ ص ۵۱)

پنڈالو۔ اس کے بارے میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس کی بیل کو لکڑی پر چڑھاتے ہیں جو دو گز لمبی ہوتی ہے۔ اس کی پتیاں پان کے پتوں سے مشابہ ہیں اور اس کو جڑ سمیت اکھاڑ لیا جاتا ہے (آئین اکبری۔ ص ۵۱)

سیالی۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق اس کا پودا بھی ایک قسم کی بیل ہے جس کی جڑ میں پھل پیدا ہوتا ہے (آئین اکبری۔ ص ۵۲)

پان۔ ابوالفضل نے پان کو بھی ہندوستانی پھلوں میں شمار کیا ہے اور اس کی بڑی تعریف کرتے ہوئے اس کی مختلف قسمیں بتائی ہیں جن کو ہم سردست نظر انداز کرتے ہیں۔ (آئین اکبری۔ ص ۵۲)

پھولسری۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس کا درخت خوبصورت اور پھل عناب سے مشابہ اور رنگ نارنجی ہوتا ہے۔ (آئین اکبری۔ ص ۵۲)

انار۔ یہ قندھار، یزد اور کابل سے برابر آتے رہے لیکن سلاطین دہلی کے زمانے سے انار ہندوستان میں ہونے لگے تھے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں انار بکثرت ہوتے ہیں اور سال میں دو دفعہ پکتے ہیں۔ (اردو ترجمہ۔ ص ۳۰) سکندر لودی کو جودھپور کے کچھ انار پیش کئے گئے تو اس کو کہا کر اس نے کہا کہ فارس کے انار میں جودھپور کے اناروں کی ایسی لطافت اور شیرینی کم پائی جاتی ہے (تاریخ داؤدی۔ ص ۷۶)

انگور۔ انگور ہندوستان میں مسلمان لائے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے دہلی، سلورا، اور چتور میں تقریباً ساڑھے تیرہ سو باغات لگائے۔ ان میں انگور کی بھی کاشت ہوا کرتی تھی جس کی حسب ذیل قسمیں تھیں: سفید، سیاہ خرمئی، چتوری، ارغوانی، سیری وغیرہ۔ انگور اس زمانے میں ایک جیتل میں ایک سیر ملتا تھا۔ (تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف۔ ص ۲۹۶)
شاہان مغلیہ کے عہد میں سمرقند سے بھی انگور بکثرت آتے رہے اور اس کی قسموں میں صاحبی، حبشی اور کشمشی وغیرہ تھے۔ لیکن جہانگیر کے بیان کے مطابق ہندوستان میں بھی یہ قسمیں پیدا ہونے لگی تھیں اور لاہور کے بازاروں میں عام طور سے بکتی تھیں۔ (تزک جہانگیری۔ ص ۴) رفتہ رفتہ بلوچستان میں چمن انگور کی پیداوار کے لئے مخصوص ہو گیا

سیب۔ یہ زیادہ تر سمرقند، کابل اور جلال آباد سے آتے رہے (تزک جہانگیری۔ ص ۵۷) لیکن کشمیر کی آب و ہوا اس کے لئے موافق ثابت ہوئی تو یہاں بھی بکثرت ہونے لگے۔ جہانگیر اپنی ترک میں کشمیر کے سیب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں کا یہ پھل بہت مشہور ہے شاہجہانی عہد کے مورخ عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ میں کشمیر کے سیب کی رنگینی اور دلآویزی کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ یہاں کے بعض سیب وزن میں ۷۵ مثقال تک ہوتے ہیں۔

شاہ آلو۔ یہ عہد اکبری میں کابل سے لا کر ہندوستان میں لگایا گیا۔ پہلے پہل اس کا پیوند محمد قلی افشار نے کشمیر میں لگایا۔ (منتخب اللباب۔ جلد اول ص ۲۳۳) پھر وہیں بہ کثرت پیدا ہونے لگا جہانگیر تزک میں لکھتا ہے کہ کشمیر کے باغ نور افزا میں شاہ آلو ڈیڑھ ہزار اور دوسرے درختوں سے پانچ سو ٹوٹے گئے۔ یہ بیان کر کے وہ لکھتا ہے کہ میں نے یہ تاکید کی ہے کہ شاہ آلو کے درخت اکثر باغوں میں لگائے جائیں۔ (تزک جہانگیری۔ ص ۳۱۳) بادشاہ نامہ کا مولف عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے کہ کشمیر میں شاہ آلو کو گیلاس بھی کہتے ہیں اور یہ مٹھاس میں کابل کے شاہ آلو سے بہتر ہوتا ہے (بادشاہ نامہ جلد اول۔ حصہ دوم۔ ص ۳۰)

زرد آلو۔ محمد قلی افشار ہی کی وجہ سے ہندوستان میں اس پھل کا بھی

رواج ہوا۔ یہ پہاڑی علاقوں میں زیادہ ہوتا ہے کشمیر کے زرد آلو کے متعلق جہانگیر لکھتا ہے :۔ "زرد آلوئے کشمیر خوب می شود۔" (تزک جہانگیری ص ۳۰۴) بادشاہ نامہ کے مولف نے لکھا ہے کہ یہاں ایک بہت بڑا زرد آلو دیکھنے میں آیا جو وزن میں نوے مثقال تھا۔ (جلد اول حصہ دوم ص ۳۰)

شفتالو۔ یہ بھی باہر سے ہی آتا تھا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ استالیف سے جو شفتالو آئے ان میں ایک شفتالو ساٹھ تولے کا تھا۔ (تزک جہانگیری ص ۵۰) لیکن شفتالو بھی ہندوستان میں لگایا گیا اور بکثرت پیدا ہوتا رہا۔

آلوچہ۔ اس کا فارسی نام ظاہر کرتا ہے کہ یہ بھی باہر ہی سے آیا آلو بخارا سے مشابہ ایک ترش پھل ہوتا ہے۔

خربزے۔ خربزے ہندوستان میں عراق، خراسان اور کاریز (ہرات) سے آیا کرتے تھے۔ اکبری دور میں عبدالرحیم خانخاناں نے عراق اور خراسان سے اس کے تخم منگوائے اور گجرات کے ایک گاؤں بلکوارہ میں اس کی کاشت کرائی جہاں نہایت عمدہ خربزے پیدا ہوئے اور رفتہ رفتہ خراسان کے خربزے سے بڑھ گئے اور اس کی کاشت تمام ہندوستان میں ہونے لگی۔ کشمیر کے خربزے کے بارہ میں بادشاہ نامہ کا مولف لکھتا ہے کہ اگر اس کی کاشت آفتوں سے محفوظ رہے تو یہ کابل کے خربزے ہی کی طرح عمدہ ہوتے ہیں۔ (جلد اول حصہ دوم ص ۳۰) خربزے کی عمدہ قسم سردہ ہے یہ ہندوستان میں پیدا تو ہوتا ہے لیکن کابل کے سردے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔

تربوز۔ کابل کے تربوز بھی مشہور رہے لیکن ہندوستان میں بھی اچھے اور بڑے تربوز ہوتے رہے۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ فتحپور کے اطراف سے ایک تربوز میرے پاس لایا گیا۔ اتنا بڑا تربوز اب تک دیکھا نہیں گیا۔ میں نے حکم دیا کہ اس کا وزن کیا جائے۔ ۳۲ سیر وزن میں نکلا۔ (تزک جہانگیری ص ۵۷) کشمیر کے تربوز بھی بہت بڑے اور میٹھے ہوتے تھے۔ (بادشاہ نامہ جلد اول۔ حصہ دوم۔ ص ۳)

ناشپاتی۔ کشمیر کی ناشپاتی ہر زمانہ میں مشہور رہی۔ جہانگیر کا بیان ہے کہ یہاں کی ناشپاتی کابل اور بدخشاں کی ناشپاتی سے بہتر اور سمرقند کی ناشپاتی کے برابر ہوتی۔ (تزک جہانگیری۔ ص ۳۴)

انناس۔ یہ یورپ کے بندرگاہوں کا پھل تھا لیکن مغل بادشاہوں کے دور میں آگرہ کے شاہی باغ گل افشاں میں لگایا گیا تو وہاں بہ کثرت پیدا ہونے لگا۔ (تزک جہانگیری۔ ص ۴، ۱۷۳) ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ اس کو کٹھل سفری بھی کہتے ہیں کیونکہ بعض اشخاص اس کے درخت کو گملوں میں لگا کر سفر میں اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور اس حالت میں بھی ان میں پھل لگتے ہیں۔ یہ رنگ میں ترنج اور مزہ و خوشبو میں آم کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے تنہ کی لمبائی ایک گز ہوتی ہے اور اس کے پتے ہاتھ کی شکل کے ہوتے ہیں۔ پھل تنے کے آخر میں لگتا ہے اور پتوں کے سرے آری کی طرح دندانے دار ہوتے ہیں۔ (آئین اکبری۔ ص ۵۰) یہ پھل اب بنگال میں بہ کثرت ہوتا ہے۔

امرود اور شہتوت کا ذکر فارسی کتابوں میں بکثرت ہے۔ امرود تو ہر جگہ پایا جاتا لیکن بنگال کے شہتوت مشہور رہے۔

✡

سنہ ۱۹۶۰ء ـــــــ ایک جائزہ

عباس علی صدیقی

گزشتہ سال کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے جواہر لال جی نے اس کے جانے سے دو ہفتہ پہلے اپنی ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ بین اقوامی نقطہ نظر سے یہ ایک خراب سال رہا ہے۔ اور یو ٹو کے واقعہ چوٹی کانفرنس کی ناکامی متحدہ اقوام کے ہنگامہ خیز اجلاس، کیوبا اور امریکا کی کشاکش، کانگو کی بدامنی، الجیریا میں قتل عام اور لاؤس کی خانہ جنگی جیسی ان گنت دوسرے واقعات سے جو سنہ ۱۹۶۰ء کے دوران پیش آئے وزیر اعظم نہرو کے مذکورہ بالا بیان کے صحیح ہونے کا ثبوت ملتا ہے اگرچہ ہندستان صورت حال کے سدھار کی کوششوں میں برابر لگا رہا۔

شروع سال میں حالات بالکل دوسرے تھے سنہ ۱۹۵۹ء میں روسی وزیر اعظم کے روس کے سفر کے بعد چار بڑی طاقتوں ـــ امریکا، برطانیہ، فرانس اور روس ـــ کے سربراہوں کی چوٹی کانفرنس کے امکانات اجاگر ہو گئے تھے۔ امید تھی کہ مئی میں ہونے والی اس کانفرنس سے امن پسند رجحانات کو تقویت حاصل ہوگی اور سرد جنگ کی شدت رفتہ رفتہ کم ہوتی جائے گی۔ لیکن اس کانفرنس کی مقررہ تاریخ سے کوئی دو ہفتہ پہلے روس نے اپنی سرزمین پر امریکا کے ایک جاسوس طیارے کو گرالیا اور اس کے بعد حالات کا بہاؤ ایک دم سے الٹا ہو گیا۔ روس نے اس مسئلے کو چوٹی کانفرنس میں اٹھایا۔ اس نے امریکا سے مطالبہ کیا کہ وہ اس واقعہ پر معافی مانگے اور چوٹی کانفرنس میں اس کی طرف سے فضائی جاسوسی کی مذمت کا مطالبہ کیا گیا۔ اس اثنا میں امریکا نے اعلان کر دیا تھا کہ اب وہ اس قسم کی حرکتیں نہیں کرے گا لیکن اس اعلان سے روس کی تشفی نہیں ہوئی۔ مسٹر خروشچف نے صدر آئزن ہاور کو اپنے ملک آنے کی جو دعوت دی تھی وہ انھوں نے منسوخ کر دی اور ان کے ساتھ بات چیت کو لاحاصل قرار دیا۔

کچھ عرصہ بعد جب روس کا غصہ کچھ ٹھنڈا پڑا تو مسٹر خروشچف نے تخفیف اسلحہ کے مسئلے پر اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ایک چوٹی کانفرنس کی تجویز پیش کی اور کہا کہ اس اسمبلی کے اجلاس میں مختلف حکومتوں کے سربراہ شرکت کریں۔ مغربی طاقتوں کی رائے میں یہ ایک پروپیگنڈے والی چال تھی۔ اگرچہ صدر آئزن ہاور نے جنرل اسمبلی کو خطاب کیا اور برطانوی وزیر اعظم مسٹر میکملن نے بھی اس میں شرکت کی مگر اس سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ مسٹر خروشچف کو امریکا سے خریدنے میں بنٹن سے جہاں متحدہ اقوام کے دفاتر واقع ہیں باہر نکلنے کی ممانعت کر دی گئی یا مسدود اس نے کیوبا کے لیڈر ڈاکٹر کاسترو پر کیا دی جنھوں نے اپنے ملک کے معاشی نظام میں بعض ایسی اصلاحات کی تھیں جن سے وہاں لگے ہوئے امریکی سرمایہ کے مفاد پر اثر پڑتا تھا۔ ایسی پابندیوں اور ان کے رد عمل سے فضا بہت زیادہ مکدر ہو گئی۔ اور اگرچہ صدر آئزن ہاور اور وزیر اعظم مسٹر خروشچف دونوں نے جنرل اسمبلی میں تخفیف اسلحہ کے مسئلے کا ذکر کیا مگر اس کے متعلق ان کے منصوبوں میں ایک دوسرے کے حالات جانے بڑے شبہات جھلکتے تھے اور دونوں کی تجویزیں ان کے نزدیک چاہے کتنی پر خلوص ہوں لیکن ان کی باہمی کشیدگی کی وجہ سے دنیا کی نگاہوں میں ان تجویزوں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہو سکی اور تخفیف اسلحہ نیز ترک اسلحہ کی باتیں محض رسمی سی چیزیں بن گئیں۔

بحالی رابطہ کی تجویز ان ہی حالات کو دیکھ کر وزیر اعظم نہرو نے متحدہ اقوام کے اجلاس میں شرکت کا فیصلہ کیا اور کئی دوسرے افریقی ایشیائی ملکوں کے سربراہ بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے نہرو نے کہا کہ اس

وقت سب سے بڑا مسئلہ تخفیف اسلحہ کا ہے اور اگر اسے ابھی حل نہ کیا گیا تو آگے چل کر اس کا حل ناممکن ہو جائے گا۔ اس مسئلے سے دنیا کے سبھی ملکوں کی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے ہندستانی وزیر اعظم نے کہا کہ اس کی کنجی اس وقت امریکا اور روس کے پاس ہے اور اگر یہ دو بڑی طاقتیں کوئی ہلکا سا بھی اشارہ کر دیں تو حالات کا بہاؤ مل سکتا ہے۔

اس سلسلے میں وزیر اعظم نہرو نے ہندستان، انڈونیشیا، گھانا، متحدہ عرب جمہوریہ اور یوگوسلاویہ کی طرف سے پیش کی جانے والی اس تجویز کی پرزور وکالت کی جس میں کہا گیا تھا کہ روس اور امریکا کی حکومتوں کے سربراہ ایک دوسرے سے رابطہ قائم کریں۔ اس تجویز کا مقصد جیسا کہ جواہر لال جی نے کہا یہ تھا کہ دونوں بڑی طاقتوں کے سب سے بڑے لیڈر گفت و شنید کے اس سلسلے کو جو منقطع ہو گیا ہے بحال کر لیں۔ ان دونوں میں سابقہ واقعات کی بنا پر بول چال بند تھی اور ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ اسے کھولنے کے لئے پہل کرنے میں ہر ایک اپنی ہیٹی ہو جانے سے ڈرتا تھا۔ پانچ طاقتی رزولیوشن کے منظور ہو جانے سے ہیٹی کا سوال ختم ہو جاتا۔ جنرل اسمبلی کی اکثریت کا رجحان اس رزولیوشن کی موافقت میں تھا چنانچہ جب آسٹریلیا نے یہ تجویز پیش کی کہ دو طاقتوں کے سربراہوں کے درمیان رابطے کی بحالی پر زور دینے کے بجائے چار بڑی طاقتوں کی چوٹی کانفرنس بلائے جانے کی سفارش کی جائے، اور وزیر اعظم نہرو نے اس تجویز کو ایک "مہمل اور چھوٹی بات" قرار دیا تو رائے شماری میں صرف پانچ طاقتوں (برطانیہ، امریکا، فرانس، کناڈا اور آسٹریلیا) نے اس تجویز کی تائید کی اور ۴۵ ملکوں نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن اس کے بعد ارجنٹائن کے نمایندے نے کہا کہ تجویز کے رابطے کی بحالی والے فقرے پر الگ سے رائے لی جائے اور جب ۲۰ کے مقابلے میں ۴۱ ممبران نے اس فقرے کو رزولیوشن میں شامل رکھنے کی تائید کی تو صدر نے کہہ دیا کہ چونکہ اس فقرے کو دو تہائی ممبروں کی تائید نہیں حاصل ہو سکی ہے اس لئے اسے نامنظور سمجھا جائے گا۔ اس پر وزیر اعظم نے اس رزولیوشن کو یہ کہہ کر واپس لے لیا کہ اس کی براہ راست مخالفت تو سمجھ میں آ سکتی تھی لیکن ایک ترمیم کے ذریعے اسے "بے معنی بکواس اور بے اثر" بنا دیا گیا ہے۔

ایٹمی دھماکوں پر پابندی۔ سرد جنگ کا چکر توڑنے کی اس کوشش کی ناکامیابی کے بعد یہ چکر تیزی سے گھومنے لگا اور تخفیف اسلحہ کا مسئلہ ابھی فوری اہمیت کے باوجود پس پشت جا پڑا۔ اب فرانس نے ایٹمی فوج تیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ برطانیہ نے اپنے وہاں امریکا کی ایٹمی اسلحہ اور راکٹوں سے لیس آبدوزوں کو اڈے دے دیئے ہیں۔ یہ آبدوز کشتیاں لمبی مدت تک سمندر کی سطح سے نیچے رہ سکتی ہیں اور ساحل کے بالکل قریب جا کر راکٹ چھوڑ سکتی ہیں۔ روس نے برطانیہ اور امریکا کے اس سمجھوتہ پر احتجاج کیا ہے اور ساتھ ہی اپنے اسلحہ خانے میں ایسے ہی ہتھیاروں کی موجودگی کا انکشاف کیا ہے۔ دوسری طرف انجمن اٹلانٹک والے ملکوں (ناٹو) کے پارلیمنٹری نمایندوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس تنظیم کے تحت ایٹمی اسلحہ کا مشترکہ ذخیرہ قائم کیا جائے اور ناٹو افواج کو ایسے اسلحہ سے لیس کیا جائے۔ اس طرح وزیر اعظم نہرو کی اس آگاہی کی صداقت روز بروز روشن ہوتی جا رہی ہے کہ اگر ابھی تخفیف اسلحہ کا مسئلہ حل نہ ہوا تو اس کا حل دشوار سے دشوار تر ہوتا جائے گا۔ تاہم جنرل اسمبلی نے کرسمس سے قبل اپنا اجلاس مارچ تک کے لئے ملتوی کرنے سے پہلے ہندستان اور بعض دوسرے ملکوں کی وہ تجویز منظور کر لی جس میں کہا گیا ہے کہ ایٹمی طاقتیں ایٹمی دھماکوں پر اپنی رضاکارانہ پابندی قائم رکھیں۔

کانگو کی گتھی ایٹمی اسلحہ کے عام ہو جانے سے ان کے استعمال کا امکان بڑھ گیا ہے اور سرد جنگ کی تیزی کا اثر دوسرے مسئلوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ چنانچہ کیوبا اور امریکا کے جھگڑے کے سلسلے میں روس نے کہا ہے کہ اگر بات بڑھی تو وہ کیوبا کو ہر طرح کی مدد دے گا۔ سر دست یہ بات یہیں پر رک گئی ہے لیکن دوسری باتیں حاشی بڑھ گئی ہیں اور سرد جنگ کی وجہ سے بہت زیادہ الجھ گئی ہیں۔ ان میں کانگو اور لاؤس کے معاملات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کانگو ۱۹۶۰ء کے ساتویں مہینے کے پہلے دن آزاد ہوا اور بلجیم نے اسے ایسی حالت میں چھوڑا کہ اس کا خزانہ خالی تھا اور وہاں کے لوگ اعلیٰ تعلیم اور تجربے کی کمی کی وجہ سے نظم و نسق کی گاڑی اچھی طرح چلانے سے عاری تھے۔ ان کی ہمت بلند تھی مگر ان میں مشترکہ قومیت کے جذبے پر قبائلی جذبات حاوی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانگو آزاد ہونے کے فوراً ہی بعد بدنظمی اور علیحدگی پسند تحریکوں کا شکار ہو گیا۔ اس کی حکومت نے امداد کے لئے متحدہ اقوام سے اپیل کی مگر متحدہ اقوام کے اقدامات امن کی بحالی میں ابتدائی طور پر کامیاب ہو جانے کے بعد ناکامیاب ہوتے دکھائی دینے لگے اور بیرونی مداخلت کے واقعات سامنے آنے لگے۔

کٹنگا کے صوبے کے بعض لیڈروں نے بقیہ ملک سے اس کی علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ وزیر اعظم لومبا کی کانگولی حکومت کو کمیونسٹ ملکوں نے کچھ ہوائی جہاز اور موٹر لاریاں نقل و حمل کے لئے دیئے مگر صدر کاساوبو نے اس حکومت کی برطرفی کا اعلان کر دیا اور ایک نئی حکومت بنا دی۔ چند روز بعد ایک فوجی لیڈر

کرنل موبوٹو نے سب حکومتوں کو معطل اور پارلیمنٹ کو برخاست کر کے کچھ طالبعلموں کو کمشنروں کا لقب دے کر ایک اور حکومت قائم کر دی جس میں کانگوئی طلبا کے بلجیمی استاد مشیروں کی طرح کام کر رہے ہیں۔ کرنل موبوٹو کے فوجیوں نے مار دھاڑ کے ذریعے عوام کو مرعوب اور محکوم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مسٹر لومبا کو گرفتار کر لیا۔ اب ان دونوں لیڈروں کے حامیوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو چکی ہے اور کرنل موبوٹو کے آدمیوں نے اپنے مقامی مخالفوں کے علاوہ متحدہ اقوام کے عملے پر بھی جس میں ہندستانی دستے کے افراد شامل تھے تشدد کیا ہے۔

کانگو کے معاملات سے ہندستان کی دلچسپی کا سبب ایک تو یہ ہے کہ اس کے آدمی متحدہ اقوام کی فوج میں شامل ہیں جہاں انھیں سگنلنگ اور اسپتالوں کا کام چلانے کے فرائض تفویض کئے گئے ہیں اور ایک ہندستانی افسر شری راجیشور دیال کانگو میں متحدہ اقوام کے سکریٹری جنرل کے خصوصی نمائندے کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ایک دوسرا اور وسیع تر سبب ہندستان کا یہ احساس ہے کہ اگر کانگو میں خانہ جنگی کی آگ نہ بجھی تو یہ آگ نہ صرف افریقہ کے دوسرے حصوں میں پھیل جائے گی بلکہ اس میں بیرونی مداخلت سے بین اقوامی کشیدگی شدید تر ہو جائے گی۔

مداخلت پر نکتہ چینی بظاہر اس نوبت کو روکنے کے خیال سے ہندستان نے اپنے فوجی دستے کانگو سے واپس بلانے کا فیصلہ نہیں کیا ہے، اگرچہ بعض دوسرے افریقی ایشیائی ملکوں نے ایسا فیصلہ کر لیا ہے۔ تاہم ہندستان کی پارلیمنٹ میں اس کے وزیر اعظم نے اور متحدہ اقوام کی جنرل اسمبلی میں ہندستانی نمائندے نے کانگو کی صورت حال پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ شری نہرو نے متحدہ اقوام کی پالیسی پر نکتہ چینی کی ہے اور یہ شکایت کی ہے کہ شری دیال نے اپنی جس رپورٹ میں کانگوئی فوج کی بے راہ روی اور کانگو کے معاملات میں بلجیم کی مداخلت کا ذکر کیا تھا اس کا کوئی نوٹس تک نہیں لیا گیا اور صدر کاسا دوبو کو انجمن متحدہ اقوام میں کانگوئی نمایندوں کو نامزد کرنے کا اختیار دے کر وہاں کی اندرونی کشاکش کو ہوا دی گئی۔ ادھر جنرل اسمبلی میں شری کرشنا منن نے کہا ہے کہ اگر انجمن متحدہ اقوام کانگو میں غنڈہ گردی کو روک نہیں سکتی اور وہاں اپنے ضوابط کو نافذ نہیں کر سکتی تو اسے کانگو سے چلے آنا چاہیئے۔ یہ کانگو کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کا مشورہ نہیں بلکہ اس حال کو سدھارنے کا مطالبہ ہے۔ اس سدھار کے لئے ہندستان نے بعض دوسرے افریقی ایشیائی ملکوں کے ساتھ مل کر جنرل اسمبلی کے سامنے ایک رزولیوشن پیش کیا جس میں فوج کو سیاست سے الگ رکھنے، کانگو سے بلجیم کے تمام فوجی اور غیر فوجی آدمیوں کے ہٹائے جانے، سیاسی قیدیوں کے رہا کئے جانے اور پارلیمنٹ کے بحال کئے جانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کچھ دوسری تجویزیں بھی اسمبلی میں پیش ہوئیں مگر ان میں سے کوئی اتنی واضح اور ٹھوس نہیں تھی اور ان کے ابہام سے کانگو کے حالات کے اور زیادہ ابتر ہو جانے کا امکان ہے۔ بالآخر یہ سب تجویزیں رد ہو گئیں۔ افریقی ایشیائی رزولیوشن کے رد کر دیئے جانے سے جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اسے خطرناک قرار دیتے ہوئے ہندستان کے نمایندے نے کہا ہے کہ اب اسے اور دوسرے ملکوں کو کانگو میں متحدہ اقوام کی کارروائی کے متعلق اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔

الجیریا اور ابہام کچھ اسی قسم کا ابہام الجیریا کے مسئلے پر جنرل اسمبلی میں منظور ہونے والے رزولیوشن میں پیدا کر دیا گیا ہے۔ اس رزولیوشن کی ابتدائی شکل جو افریقی ایشیائی ملکوں نے بنائی تھی یہ تھی کہ آزادی اور خود ارادیت کے لئے الجیریا کے حق کو تسلیم کیا جائے اس حق کے موثر استعمال کی ضمانت دی جائے اور الجیریا کے مستقبل کے فیصلے کے لئے متحدہ اقوام کے زیر اہتمام وہاں رائے طلبی کرائی جائے۔ رائے طلبی والی دفعہ کو اسمبلی کی سیاسی کمیٹی میں اکثریت کی تائید تو حاصل ہو گئی مگر دو تہائی اکثریت نہیں حاصل ہو سکی اور جنرل اسمبلی میں جب یہ بات ایک ترمیم کی شکل میں پیش ہوئی تو وہاں بھی منظور نہیں ہو سکی اسی طرح فرانس اور الجیریائی مجاہدین کے نمایندوں کے درمیان گفت و شنید کی سفارش بھی رد کر دی گئی۔ ان ترمیموں کے رد کر دیئے جانے کے بعد جنرل اسمبلی کا رزولیوشن ایک نیک خواہش کا اظہار بن گیا ہے۔

اس خواہش کا اظہار خود فرانس بھی کر چکا ہے اور فرانسیسی حکومت نے اپنی الجیریائی پالیسی پر فرانس اور اس کی مقبوضات میں رائے طلبی کرانے کا اعلان کیا ہے۔ الجیریا میں بسے ہوئے فرانسیسی اور فرانس کے کچھ فوجی اور غیر فوجی افسر بھی اس پالیسی کی مخالفت کر رہے ہیں۔ وہ الجیریا کو ہمیشہ کے لئے فرانسیسی مملکت کا جز بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے صدر ڈی گال کے الجیریائی دورے کے دوران گزشتہ دسمبر میں اپنی مخالفت کا تشدد آمیز مظاہرہ کیا جس میں پولیس اور فوج سے [illegible] اس ٹکراؤ میں بھی مصیبت الجیریائیوں پر آئی اور وہ ایک بڑی تعداد میں [illegible] اور زخمی ہوئے۔ جس کی وجہ سے بقول وزیر اعظم نہرو ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس کا حل تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ان واقعات کی بنا پر فرانسیسی حکومت اپنے بعض افسروں کے خلاف کارروائی کر رہی ہے لیکن ابھی تک وہ الجیریا کی آزادی اور خود ارادیت کی بنیاد پر وہاں کے لیڈروں سے کسی بات چیت کے لئے نہیں تیار ہے۔

انس متحدہ اقوام میں افریقی ایشیائی رزولیوشن کے ذریعے اس تعطل کو توڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس رزولیوشن کی ہندستانی نمائندے نے تو پر زور وکالت کی اس رزولیوشن کی ایک سیاسی حیثیت حاصل ہو گئی اور افریقی ایشیائی نیز بعض یورپی ملکوں نے بھی سیاسی کمیٹی کے اجلاس کے بعد انھیں منظور کیا ۔ شری مینن نے ایک تقریر میں دراصل کو ٹمس اٹلانٹک سے ملنے والی امداد پر بھی نکتہ چینی کی ۔ اس طرح انھوں نے دنیا کو الجیریا میں جوابی واقعات کے خطرے سے آگاہ کر دیا ۔ الجیریا کی جلا وطن عارضی حکومت کی طرف سے بیرونی امداد حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے ۔ اور امداد کے لئے کئی ملکوں سے اس حکومت کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں وعدے حاصل ہو چکے ہیں ۔

لاؤس اور ہندستان لاؤس ہند چینی میں پہلے ہند چینی کی ایک ریاست تھا اور ہند چینی پر دوسری جنگ عظیم تک فرانس راج کرتا تھا جنگ کے بعد وہاں کی ریاستوں ۔ کمبوڈیا، لاؤس اور ویٹ نام میں فرانس کے خلاف آزادی کی لڑائی دور پکڑ گئی اس میں کمیونسٹ اور مغربی طاقتوں نے ایک دوسرے پر مداخلت کا الزام لگایا ۔ آخر ۱۹۵۴ء میں جینوا کی ایک کانفرنس نے ہند چینی ریاستوں کی آزادی کی بات طے کر دی اور یہ بھی قرار پایا کہ ان ملکوں میں الکشن کے ذریعے جمہوری حکومتیں قائم ہوں اور ان کو سرد جنگ سے الگ رکھا جائے ۔ لیکن ان دونوں میں سے کسی ایک بات پر بھی پوری طرح عمل درآمد نہیں ہو سکا ہے ۔ جیسا کہ ویٹ نام شمالی اور جنوبی علاقوں میں ۔۔ کوریا کی طرح ۔۔ بٹا ہوا ہے اور لاؤس میں اگرچہ الکشن ہو چکے ہیں لیکن الکشن کے ذریعے قائم ہونے والی حکومت کے خلاف کئی بغاوتیں ہو چکی ہیں۔ اس وقت بغاوت کے شعلے بہت تیزی سے بھڑک رہے ہیں ۔ صورت حال کی روک تھام کے لئے ہندستان کی زیر صدارت پولینڈ اور کناڈا کے نمائندوں پر مشتمل ایک بین اقوامی نگراں کمیشن جو جینوا کانفرنس کے تحت قائم ہوا تھا وہ معطل ہو چکا ہے۔ ہندستان نے جینوا کانفرنس کے چیرمینوں روس اور برطانیہ سے کہا ہے کہ کمیشن کی بحالی کے لئے ضروری کارروائی کی جائے ۔ جس کے جواب میں برطانیہ نے کہا ہے کہ پہلے لاؤس کی حکومت کو اس بات پر راضی ہو جانا چاہیئے ۔ لیکن لاؤس میں اس وقت دو حکومتیں قائم ہیں جو اس ملک کو جرمنی کوریا اور ویٹ نام کی طرح تقسیم کی سمت لے جا رہی ہیں ۔

امید کی شمع اس طرح ہندستان کی کوششوں کے باوجود سرد جنگ کے مورچے بدستور بنے ہیں لیکن ان کوششوں کو بے کار یا سو فی صدی ناکامیاب نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ اگر ہندستان بعض دوسرے ملکوں کے ساتھ مل کر ایسی کوششیں ۔ کرتا تو شاید سرد جنگ سال گزشتہ کے دوران گرم جنگ بن چکی ہوتی ۔ ان کوششوں سے اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ بین اقوامی کش مکش کی آندھیوں میں امن کی شمع روشن رہی ہے اور جنگ کی تیاریوں کے باوجود امن کی باتیں سنائی دیتی رہی ہیں ۔ ہندستان نے محکوم ملکوں کی آزادی کے لئے بھی آواز اٹھائی اور متحدہ اقوام کی جنرل اسمبلی نے نوآبادیاتی نظام کی تمام شکلوں کے جلد اور غیر مشروط طور پر ختم کر دیئے جانے کی سفارش کا جو رزولیوشن منظور کیا ہے اس کی وکالت میں ہندستان نے نمایاں حصہ لیا۔

متحدہ اقوام اور سرد جنگ سال کے دوران افریقہ کے بہت سے ملک آزاد ہو کر انجمن متحدہ اقوام کے ممبر بن گئے ۔ اس طرح اس انجمن میں افریقی ایشیائی ملک سب سے بڑا گروہ بن گئے ہیں اور ان کی طرف سے متحدہ اقوام کی سلامتی و معاشی کونسلوں میں مزید نمائندگی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جسے ہندستان کی تائید حاصل ہے ۔ لیکن اس نے یہ دیکھ کر کہ متحدہ اقوام کے چارٹر میں ترمیم کا مسئلہ سرد جنگ کا ایک نیا مورچہ بن جائے گا اس سلسلے میں اپنا ایک رزولیوشن واپس لے لیا ہے۔ چارٹر میں ترمیم کا سوال روس کی اس تجویز سے بھی پیدا ہو گیا کہ ایک سکریٹری جنرل کی جگہ تین آدمیوں کا ایک سکریٹریٹ قائم کیا جائے جس میں مغربی اور کمیونسٹ طاقتوں اور ناجانبدار ملکوں کا ایک ایک نمائندہ رکھا جائے ۔ ہندستان کی رائے میں یہ تجویز قابل عمل نہیں ہو گی لیکن وزیر اعظم نہرو نے کہا ہے کہ سکریٹری جنرل کی مدد کے لئے مشیروں کی ایک کمیٹی کا مقرر کیا جانا مفید ہو گا ۔ ایسی ایک کمیٹی کانگو کے لئے بن بھی گئی ہے مگر سرد جنگ نے اسے بے جان سا بنا رکھا ہے اور کانگو میں متحدہ اقوام کی (بہ وجوہ) بے اثری کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بعض افریقی ملک الگ سے اپنی ایک کمان بنانے کی سوچ رہے ہیں، اگرچہ بعض مغربی طاقتیں ان میں پھوٹ ڈالنے کے لئے کوشاں ہیں ۔

حکومتوں کا زوال سال گزشتہ یعنی ۱۹۶۰ء میں بعض ملکوں کی حکومتوں میں بنیادی تبدیلیاں بھی ہوئیں ۔۔ کہیں جمہوری الکشن کے ذریعے جیسے کہ امریکا میں صدر آئزن ہوور کی ری پبلکن پارٹی کی جگہ سابق صدر ٹرومین کی ڈیماکریٹک پارٹی برسر اقتدار آ گئی ۔ کہیں قتل کے ذریعے، جیسے اردن میں جہاں وزیر اعظم مجالی کو قتل کر دیا گیا ۔ کہیں فوجی اقدامات کے ذریعے جیسے ترکی میں، جہاں جنرل جمال گرسل صدر بایار اور وزیر اعظم مندریس کو گرفتار کر کے برسر اقتدار آ گئے کہیں شاہی فرمانوں کے ذریعے، جیسے نیپال اور سعودی عرب میں، بادشاہوں نے وزیر

کے برطرف کر دیئے جانے یا مستعفی ہو جانے پر خود حکومت کا کام سنبھال لیا ہے
ایک جگہ۔ حبش (ایتھوپیا) میں شاہی کو بھی گھن لگ گیا تھا مگر اس گھن کی مدت
بہت مختصر تھی اور شاہ ہیلی سیلاسی کے خلاف بغاوت ناکام ہو گئی ہے۔

سب سے دوستی ہندستان نے ان تمام تبدیلیوں کو ان کے صحیح پس منظر میں رکھ
کر دیکھنے کی کوشش کی اور کسی ملک کی اندرونی تبدیلیوں سے کوئی خاص دلچسپی
نہیں لی۔ سوائے اس کے کہ وہ جمہوریت پر اپنے عقیدے کا اظہار کرتا رہا۔ ہر
ملک کے ساتھ دوستی اور گروہ داری سیاست سے ناوابستگی کی پالیسی پر کاربند رہا

وزیر اعظم نہرو نے متحدہ اقوام کے اجلاس میں شریک ہونے کے علاوہ دولت
مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں بھی شرکت کی اور وہاں سے واپسی پر ترکی
اور متحدہ عرب جمہوریہ میں بھی ٹھہرے۔ صدر ناصر سے وہ سال میں دو بار ملے۔ ایک
بار نئی دہلی میں اور دوسری بار لندن سے واپس آتے ہوئے قاہرہ میں۔ برما کے
وزیر اعظم بھی ہندستان اس طرح آتے جاتے رہے جیسے کہ یہ ان کا اپنا وطن ہو۔
صدر جمہوریہ جب روس کے دورے پر گئے تو وہاں ان کا خیر مقدم اس طرح کیا
گیا جیسے کسی پرانے اور قریبی دوست کا کیا جاتا ہے اور روس کے صدر اور وزیر اعظم
کا یہاں بھی بہت ہی پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ امریکا اور ہندستان میں بھی چھوٹے
بڑے لیڈروں کی آمد و رفت جاری رہی اور دنیا کے دونوں بڑے طاقتی گروہوں
کے ساتھ ہندستان کے تجارتی اور تہذیبی تعلقات میں اضافہ ہوا اور دونوں گروہوں
کے ملکوں نے اس کی معاشی ترقی میں امداد اور تعاون کی پیش کش کی ہے۔

ہندستان اور پاکستان اس طرح ۱۹۶۰ء میں جو وسیع ترین اقوامی نقطۂ نظر
سے ایک خراب سال رہا ہے ہندستان کے بین اقوامی تعلقات میں کوئی ابتری
نہیں پیدا ہوئی بلکہ یہ تعلقات پہلے سے کچھ بہتر ہی ہو گئے۔ خاص کر جہاں تک
کہ ہندستان اور پاکستان کے تعلقات کا سوال ہے اگر کشمیر کے قضیے اور بیروباڑی
کی منتقلی کے مسئلے پر پاکستان کے رہنما فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے بعض بیانات
ایسے تھے جن سے ہندستان کو ناگواری ہوتی اور ہوئی لیکن اس ناگواری کے اظہار
میں حکومت ہند اور وزیر اعظم نہرو نے بڑی احتیاط برتی۔ کشمیر کے مسئلے پر کوئی تفصیلی
بیان دینے سے انھوں نے احتراز کیا اور ہندستان اور پاکستان کے درمیان قدیم
تہذیبی تاریخی اور جغرافیائی رشتوں پر ہمیشہ زور دیا۔ اسی طرح جب ۱۹۵۸ء کے
نہرو۔ نون سرحدی سمجھوتے پر عملدرآمد اور اس سمجھوتے کی رو سے مغربی بنگال کے
۴ مربع میل علاقے بھی بیروباڑی کی پاکستان کو منتقلی کی پارلیمنٹ اور مغربی بنگال
کی مجلس قانون ساز میں مخالفت کی گئی تو جواہر لال جی نے جہاں ایک طرف اس
بات پر زور دیا کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ دیا جائے کہ ہندستان جو معاہدے کرتا
ہے ان پر عملدرآمد نہیں کرتا وہاں دوسری طرف انھوں نے بیروباڑی کے مسئلے کے
وسیع تر اور انسانی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی اور ہندستان اور پاکستان کی
دوستی اور دونوں جگہ کے لوگوں کی پُرامن زندگی کو ہر دوسری بات سے زیادہ اہم قرار دیا۔

نہری پانی کا سمجھوتہ ہندستان اور پاکستان کے درمیان ۱۹ ستمبر کو نہری پانی
کے سمجھوتے سے دونوں ملکوں کے تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس سمجھوتے
سے ۱۳ سال پرانا ایک جھگڑا ختم ہو گیا۔ اس سے پہلے پاکستان کے لیڈر اپنے اس
اندیشے کا اظہار کرتے رہتے تھے کہ ہندستان ان ندیوں کو جو اس کے علاقے سے
ہو کر پاکستان جاتی ہیں روک کر پاکستان کی زراعت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچائے
گا۔ دوسری طرف ہندستان کے لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ پاکستان ۱۹۴۸ء کے اس
معاہدے پر جس میں اس نے مان لیا تھا کہ ہندستان اپنے یہاں سے نکل کر پاکستان
جانے والی نہروں کا پانی بتدریج کم کرتا رہے گا اور پاکستان اپنا دوسرا بندوبست
کرنے کا عملدرآمد کرکے پنجاب اور راجستھان کی ترقی میں رکاوٹ ڈال رہا
ہے۔ ۱۹۵۲ء میں عالمی بنک نے جو دونوں ملکوں کی درخواست پر بیچ میں پڑا تھا
یہ طے کر دیا تھا کہ تین مشرقی دریاؤں کا پانی ہندستان کو اور تین مغربی دریاؤں کا
پانی پاکستان کو مل جائے اور ہندستان پاکستان کو آبپاشی کے بعض ذرائع ترقی
کے لئے لگ بھگ ۶۰ کروڑ روپیہ دے دے۔ لیکن پاکستان اس سے کہیں بڑی رقم
مانگتا تھا۔ اب ۱۹۶۰ء کے سمجھوتے کے تحت ہندستان کو ۸۳ کروڑ روپیہ دینا ہوگا
اور ۸۰ کروڑ ڈالر پاکستان کو دوسرے ملکوں اور عالمی بنک سے ملے گا۔ بنک
ہندستان کو بھی بیاس ندی کی تعمیر کے لئے ۵۰ کروڑ روپیے سے لے کر ۶۰ کروڑ روپیہ
تک دے گا۔ تبادل بندوبست زیادہ سے زیادہ تیرہ برسوں میں ہو جائیں گے
اور ۱۹۷۳ء میں عبوری مدت ختم ہو کر دونوں ملکوں کے مغربی حصوں میں آبپاشی
کے ذرائع الگ الگ ہو جائیں گے۔

نہری پانی کا مسئلہ جتنے دور رس مضمرات رکھتا ہے اور اس پر جھگڑا جتنی
لمبی مدت سے چلا آرہا تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ دونوں ملکوں
کے آبپاشی کے وزرا یا سرکاری نمائندوں کے بجائے دونوں حکومتوں کے سربراہ
اس پر دستخط کرتے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اور پنڈت جواہر لال نہرو اس میں ذاتی
دلچسپی بھی لے رہے تھے۔ چنانچہ سمجھوتے کے سلسلے میں اپنی قوم کو خطاب کرتے

ہوئے صدر ایوب خاں نے بتایا کہ عبوری مدت کے متعلق گفت و شنید کے دوران بعض ایسی دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں جن کو شری سہروردی نے ذاتی طور پر مداخلت کر کے دور کر دیا۔ ہندستان کے وزیر اعظم نے بھی پاکستان والوں کو سمجھوتے کے وسیع تر پہلو اور اس کی نفسیاتی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ ان ہی دونوں باتوں کی وجہ سے انھوں نے خود کراچی آنے اور سمجھوتے پر دستخط کرنے کا فیصلہ کیا۔

سادگی اور سنجیدگی ہندستان کے وزیر اعظم نے پاکستان میں پانچ روز قیام کیا۔ اس دوران انھوں نے صدر ایوب خاں سے دونوں ملکوں کے دوسرے مسائل پر بھی تبادلہ خیال کیا۔ اور ان کے دورے کے اختتام پر جو اعلانیہ شائع ہوا اس میں ہندستان اور پاکستان کی دوستی کو بڑھانے اور ان کے تہذیبی تجارتی اور تعمیری تعاون پر زور دیا گیا۔ ایسے تعاون کا ذکر محض رسمی نہیں تھا دونوں سربراہوں کی ملاقات کے بعد ان کے نمائندوں میں متعدد دوسرے مسئلوں پر بات چیت ہو چکی ہے۔ ایسا ایک مسئلہ مشرقی ہندستان اور مشرقی پاکستان میں بہنے والی ندیوں کا ہے۔ یہ اس اعتبار سے پیچیدہ ہے کہ سندھ اور اس کی معاون ندیوں کے برخلاف گنگا اور برہمپتر کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس اعتبار سے آسان ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات اب پہلے سے اچھے ہیں۔ انھوں نے اپنے باہمی مسائل کے حل میں بات چیت کی افادیت کا تجربہ کر لیا ہے اور مغرب کے برخلاف مشرق کی ندیوں میں پانی بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ فی الحال دونوں ملک ایک دوسرے کو ندیوں کے بہاؤ اور ان کے پانی کے اتار چڑھاؤ کے متعلق اعداد و شمار فراہم کر رہے ہیں جن کی بنیاد پر سمجھوتے اور تعاون کے طریقے کی داغ بیل ڈالی جا سکے گی۔

دونوں ملکوں کے درمیان ایک تجارتی سمجھوتہ بھی ہو گیا ہے اور دونوں کو سردنی زرمبادلہ کی کمی کی وجہ سے جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں ان کے باوجود اس سمجھوتے میں چھ ماہی نظر ثانی کے دوران کوئی تخفیف نہیں کی گئی ہے بلکہ درآمد برآمد کی فہرستوں میں بعض نئی چیزیں شامل کر لی گئی ہیں۔ جہاں تک متروکہ جائداد کے مسئلے کا تعلق ہے غیر منقولہ جائداد کے متعلق کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا ہے لیکن اس مسئلے کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ بات بڑی غنیمت ہے کہ منقولہ جائداد کے متعلق دونوں میں دو سال پہلے جو سمجھوتہ ہوا تھا اس پر عملدرآمد کا جائزہ لینے کے لئے دونوں حکومتوں کے نمائندوں کی کانفرنس ہوئی جس کے فیصلوں سے دونوں طرف کے تارکان وطن کو بینکوں سے اپنا روپیہ اور زیورات وغیرہ نکالنے میں آسانی ہو جائے گی۔

براہ راست ٹرین سروس ایک اور اہم سمجھوتہ جس سے دونوں ملکوں کے عوام کو دونوں حکومتوں کے تعاون کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہو سکے گا ہندستان اور پاکستان کے درمیان براہ راست سفر کا ہے۔ اس کے متعلق راولپنڈی میں دونوں ملکوں کے ریلوے افسروں کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو گیا ہے جس کی رو سے مغربی پاکستان سے ٹرین کے ذریعے مسافر اور مال مشرقی پاکستان جا سکے گا اور اس طرح ہندستانی ٹرینوں کے ڈبے کلکتہ اور تری پوری، سیلچر، امین گاؤں اور سلیگوڑی کے درمیان آجا سکیں گے۔

دونوں ملکوں کے وزرائے مالیات کی بھی ایک کانفرنس پچھلے سال دسمبر ہوئی۔ اگرچہ اس کانفرنس میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا تاہم یہ پہلا موقع تھا کہ تقسیم کے وقت کے قرضوں کے ساتھ بعد کے حسابات پر بھی گفتگو کی گئی۔ پاکستان اس حساب کے فی الفور چکائے جانے کا مطالبہ کر رہا تھا جبکہ ہندستان تقسیم والے قرضوں کو بھی حساب میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اگرچہ پہلے پاکستان بعد والے حسابات میں ہندستان کے ذمہ ۵۰ کروڑ روپیہ نکالتا تھا مگر اب وہ ۱۰ کروڑ روپیہ کی فاضلات بتاتا ہے۔ اس کے ذمہ ہندستان کا تقسیم والا قرضہ ۳۰۰ کروڑ روپیہ کا ہے جو ۱۹۵۲ء کے بعد پچاس قسطوں میں ادا کیا جانے والا تھا لیکن جس کی کوئی قسط ابھی تک ادا نہیں کی گئی ہے۔

یہ مسئلہ مالیاتی حدود سے سیاسی حدود میں داخل ہو گیا ہے اور اگرچہ دونوں ملکوں کی پوزیشن ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے لیکن دونوں وزرائے مالیات نے نئی دہلی کی بات چیت کے اختتام پر کہا ہے کہ وہ پھر ملیں گے اور زیر نظر مسئلوں کا حل نکالنے کی کوشش کریں گے۔

چین سے سرحدی تنازعہ ہندستان اور چین کا تنازعہ جو ۱۹۶۰ء کو ۱۹۵۹ء سے ترکے میں ملا تھا ابھی طے نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن پچھلے سال اسے طے کرنے کے لئے ایک ایسے طریقے کا استعمال شروع ہو گیا جو ہندستان کی پالیسی سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس تنازعے پر دونوں ملکوں کی گفت و شنید کا آغاز گزشتہ اپریل میں اس وقت ہوا جب چین کے وزیر اعظم مسٹر چو این لائی نئی دہلی آئے۔ وزیر اعظم ہند نے دستاویزات وغیرہ کی روشنی میں انھیں بتایا کہ یہ علاقہ ہندستان کا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور بالآخر ان کے درمیان طے پایا کہ دونوں حکومتوں کے کچھ عہدیدار سرحدی مسئلے سے متعلق تاریخی

دستاویزات نقشوں اور دوسرے کاغذات کا جائزہ ہیں۔ یہ کاروائی تین کانفرنسوں میں جو بالترتیب پےکنگ نئی دہلی اور رنگون میں ہوئیں اور کئی کئی ہفتوں تک جاری رہیں مکمل ہوگئی ہے۔ جائزے کی رپورٹوں پر اب دونوں حکومتیں غور کر رہی ہیں۔

اس اثنا میں چین نے نیپال اور برما کے ساتھ اپنے سرحدی جھگڑوں پر سمجھوتہ کرلیا ہے لیکن جن دو ملکوں کے ساتھ چین کے سرحدی سمجھوتے ہوگئے ہیں ان میں کسی کے اتنے بڑے رقبہ پر چین نے قبضہ یا ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا تھا جتنا کہ وہ ہندستان سے طلب کر رہا تھا۔ ہندوستان کے شمالی اور مشرقی علاقوں میں چینی فوجوں کی موجودگی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نیپال اور برما کے ساتھ چین کا رویہ جیسا بھی ہو ہندستان کے ساتھ اس کی پالیسی جارحانہ ہے۔ یہ پالیسی ان واقعات میں بھی جھلکتی ہے جو حکومت ہند کے گزشتہ نومبر میں شایع ہونے والے چوتھے وہائٹ پیپر میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان واقعات میں سرحدی جھڑپیں شامل نہیں ہیں۔ لیکن ہندستان نے اپنی سرحد کے اندر شمال کی طرف سے آنے والے ہوائی جہازوں کی ناجائز پرواز کا ذکر کیا ہے۔ وہائٹ پیپر میں ہندوستان کی وہ احتجاجی تحریریں بھی شامل ہیں جن میں اس نے تبت میں ہندستانی تاجروں اور سفارتی عملے کے لوگوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کی طرف چینی حکومت کو توجہ دلائی ہے۔ ہندستان نے اس بات کی بھی شکایت کی ہے کہ چینی افسر بھوٹان اور سکم کو جن کے ساتھ ہندستان کے دفاعی معاہدے ہیں چینی مملکت میں شامل کرنے کے اشارے کرتے رہتے ہیں۔

ہندستان کے علاقے پر شمال کی طرف سے آنے والے ہوائی جہازوں کو نشانات اور قومیت کا صحیح پتہ نہیں چل سکا اس لئے کہ وہ بہت بلندی پر پرواز کر رہے تھے مگر ایک آدھ جگہ چین کے کچھ آدمی بھی دیکھے گئے جو مقابلے کے بغیر واپس بھی چلے گئے اور جن کے متعلق چین کا کہنا ہے کہ وہ بانس کاٹنے آئے تھے، حالانکہ جس جگہ وہ دیکھے گئے وہاں بانس کا اگنا ناممکن ہے۔ سال تمام سے پہلے کی اطلاعات میں نیفا کے مقام لانگ جو سے چینی فوج کے ہٹ جانے کا پتہ چلا، ہے مگر وزیر اعظم نہرو نے بتایا کہ یہ تخلیہ متعلقہ علاقے میں ایک وبا پھوٹ پڑنے کی وجہ سے ہوا ہے۔

بہر حال اپنی اس سابقہ پیش کش کے مطابق کہ لانگ جو پر کسی فوج کا قبضہ ہو ہندستان وہاں اپنے فوجی نہیں بھیج رہا ہے۔

"ہمارے آئین میں نامذہبیت (سیکولرزم) کا نصب العین کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ آئین مرتب کرنے والے ضابطۂ تحریر میں وہی چیز لائے ہیں جو ہمیں نسلاً بعد نسل ترکہ میں ملی ہیں"

—— (ڈاکٹر) راجیندر پرشاد

خمار بارہ بنکوی

رہا خوفِ غم، غم اٹھانے سے پہلے ہوئے غرق طوفان آنے سے پہلے

ہوئے ہوش گم تیرے آنے سے پہلے ہمیں کھو گئے تجھ کو پانے سے پہلے

اجازت جو ہو ایک بار اور ناصح انھیں یاد کر لوں بھلانے سے پہلے

گزارش ہے اتنی ہی اے برق تجھ سے مجھے پھونک دے آشیانے سے پہلے

ہوئی کیسے تجھ بِن بسر کون جانے کسے ہوش تھا تیرے آنے سے پہلے

گزرتے تھے روتے ہی دن اپنے لیکن یہ عالم نہ تھا مسکرانے سے پہلے

قیامت سے تھا غائبانہ تعارف کسی کی جوانی کے آنے سے پہلے

خمارؔ ان کو اپنا بنانا مبارک

مگر پوچھ لیجے زمانے سے پہلے
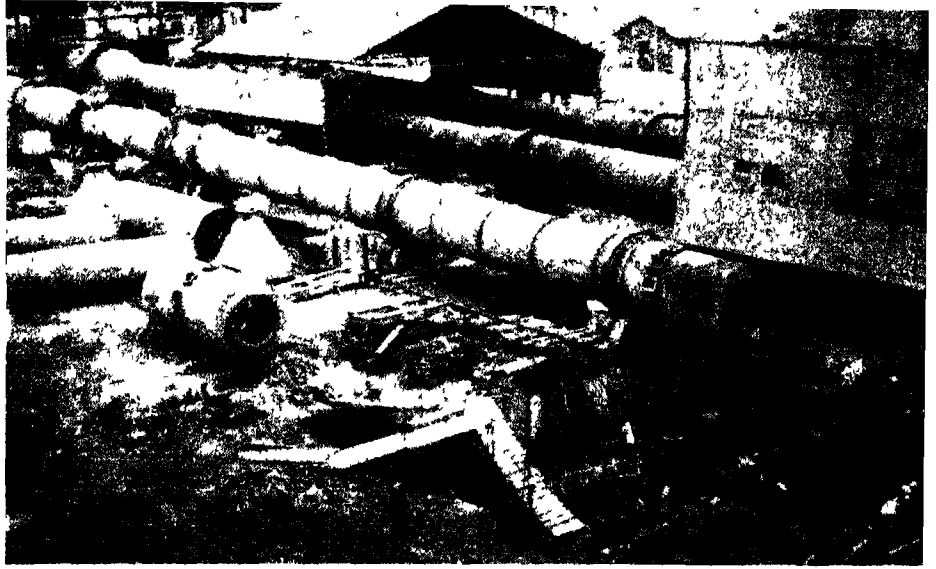
چرک ضلع مرزاپور کی سرکاری سیمنٹ فیکٹری کی توسیع

اترپردیش میں تعمیری سرگرمیاں

شنکرگڑھ ضلع الہ آباد کی بالو کی صفائی کی سرکاری تجربہ گاہ کا اندرونی منظر
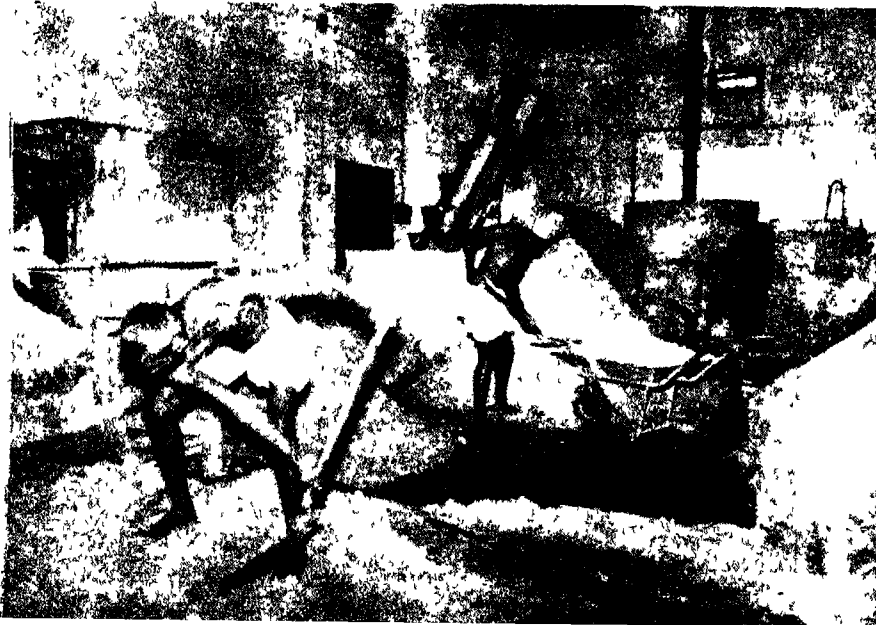
گوتا میں گنج لکھنؤ میں تسرم دال کے ذریعہ تعمیر کیا ہوا لونی کا پل

اتر پردیش میں تعمیری سرگرمیاں

میکو ضلع پتھورا گڑھ میں سرکاری کثیر مقصدی تربیتی مرکز

لکھنؤ میں مرکزی ڈرانس تحقیقاتی شعبہ

اترپردیش میں تعمیری سرگرمیاں

فیملی پلاننگ سنٹر، لونی ملاک میرٹھ
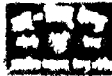
لکھنؤ کے قریب ایک گاؤں میں انسداد ملیریا اسکیم کے ماتحت ڈی ڈی ٹی کا چھڑکاؤ
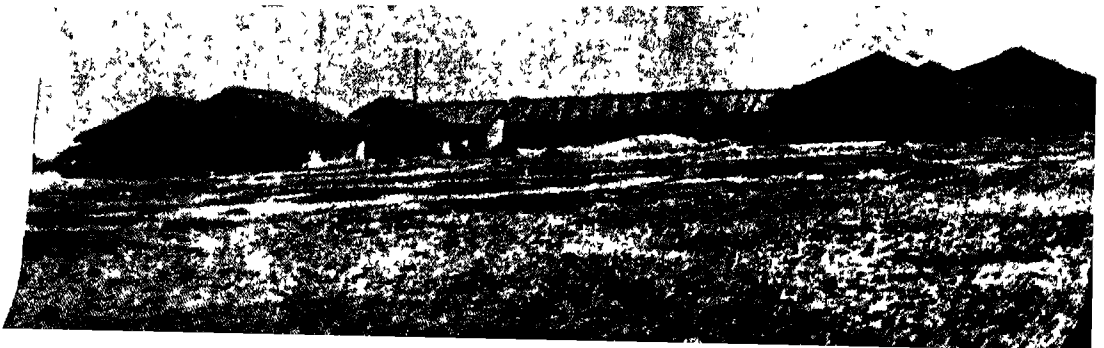
موضع کھٹی گھڑگ پور ضلع اعظم گڑھ کی ہریجن بستی

ستارے

محمد اسحٰق صدیقی

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

مرزا غالب نے اس شعر میں ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ستاروں نے انساں کو ہزاروں برس تک دھوکے میں رکھا ہے لیکن یہ قصور ان کا نہیں، خود ہماری نظر کا ہے۔ ہماری آنکھ اتنی ناقص ہے کہ ہم ستارے کی اصلی شکل بھی نہیں دیکھ سکتے۔ کسی ستارے کو غور سے دیکھئے تو اس میں ننھے ننھے کونے نظر آتے ہیں ☆ یا یوں کہئے کہ اس سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ خصوصیت ستارے کی نہیں روشنی کے ہر نقطے کی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ستارے کی اصلی شکل وہ نہیں جو ہم دیکھتے ہیں۔ وہ محض روشنی کا ایک نقطہ ہے۔ چنانچہ دوربین سے دیکھنے پر اس کی کرنیں غائب ہو جاتی ہیں لیکن اگر آپ چاہیں تو بغیر دوربین کے بھی ستارے کا اصلی روپ دیکھ سکتے ہیں۔ کسی موٹے کاغذ میں سوئی کی نوک سے ایک باریک سوراخ کیجئے۔ پھر اس سوراخ کو آنکھ کے قریب لا کر ستارے کو دیکھئے تو وہ محض روشنی کا ایک نقطہ معلوم ہوگا۔

ہماری آنکھ میں پتلی کے پیچھے ریشوں کا بنا ہوا ایک نیم شفاف شیشہ ہوتا ہے جسے عربی میں عدسہ اور انگریزی میں (Crystalline lens) کہتے ہیں۔ جب ہم کسی روشنی کے نقطے کو دیکھتے ہیں تو اس کی روشنی سے عدسے کے ریشے چمک اٹھتے ہیں اور ان کا عکس اندرونی پردے پر پڑتا ہے۔ اسی لئے ہمیں روشنی کے ہر نقطے سے کرنیں نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ جب ہم ستارے کو کسی باریک سوراخ سے دیکھتے ہیں تو اس کی روشنی ہماری آنکھ کے عدسے سے سیدھی گزر جاتی ہے اور آس پاس کے ریشوں کو چمکنے کا موقع نہیں ملتا[1]۔

یوں تو ستارے ہر رات کو جھلملاتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن جس رات کو کہرا گرتا ہے یا تیز ہوا چلتی ہے یا بارش کے بعد آسمان صاف ہو جاتا ہے تو وہ زیادہ جھلملاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آسمان پر چراغاں ہو رہا ہو اور چراغوں کی روشنی کبھی گھٹ جاتی ہو، کبھی بڑھ جاتی ہو اور کبھی کانپنے لگتی ہو۔ ان تبدیلیوں کا ستارے کی سطح سے کوئی تعلق نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ستارے کی روشنی زمین کی طرف آتی ہے تو ہوا کی حرکت کی وجہ سے ہمیں کانپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

زمین سے کئی سو میل اوپر تک ہوا کا ایک غلاف چڑھا ہوا ہے جسے "کرۂ ہوا" (Atmosphere) کہتے ہیں۔ ستارے کرۂ ہوا کے باہر اور ہم سے بہت دور ہیں۔ اگر ہم کسی طرح اس ہوائی غلاف کے باہر پہنچ جائیں تو ہمیں ستارے

---

[1] ستارے کی جن کرنوں کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ ان سے مختلف ہیں جو ہمیں آنکھ میچنے پر ستارے کے گرد نظر آتی ہیں اور جن کا سبب روشنی کا پلکوں پر پڑ کر منتشر ہو جانا ہے۔

بہت سیاہ اور بہت صاف نظر آئیں گے اور ان کا جھلملانا بھی بند ہو جائے گا ۔

زمین پر ہوا کی وجہ سے ہمیں ستارے کم اور دھندلے نظر آتے ہیں ۔ ستارے دن میں نظر نہیں آتے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج کی روشنی سے زمین کا ہوائی غلاف چمک اٹھتا ہے اور اس کی چمک میں ستاروں کی روشنی دب جاتی ہے مشہور ہے کہ اگر ہم کسی گہرے کنویں یا کان میں جا کر آسمان کو دیکھیں تو ہمیں دن میں ستارے نظر آئیں گے لیکن تجربے سے یہ بات غلط ثابت ہوئی ہے ۔ بڑی دوربینوں کی مدد سے البتہ انھیں دن میں دیکھا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ ایسی دوربینوں کے شیشے بڑے طاقتور ہوتے ہیں اور وہ ستاروں کی روشنی کو نمایاں کر دیتے ہیں ۔

جسے ہم آسمان کہتے ہیں وہ دراصل زمین کا ہوائی غلاف ہے ۔ سورج کی روشنی اس سے چھن کر ہم تک پہنچتی ہے ۔ یہ روشنی ہمیں سفید معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل سات رنگوں کی روشنی سے مل کر بنتی ہے ۔ چنانچہ تین پہلو والے شیشے سے دیکھیے پر اس کے ساتوں رنگ الگ الگ نظر آتے ہیں یعنی ۔

جب سورج کی روشنی کرۂ ہوا میں داخل ہوتی ہے تو ہوا، پانی کی بھاپ اور گرد و غبار کے ذرے اس روشنی کے نیلے جز کو منتشر کر دیتے ہیں اور باقی کو جذب کر لیتے ہیں ۔ اس لئے ہمیں آسمان نیلا نظر آتا ہے ۔ نیلا آسمان صرف ۵۰ میل کی بلندی تک پایا جاتا ہے ۔ اس کے بعد اس کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے ۔

جہاں زمین کی ہوا ختم ہوتی ہے وہاں سے خلا (Space) شروع ہوتا ہے ۔ خلا سے مراد وہ جگہ ہے جو چاند سورج ، سیاروں اور ستاروں کے درمیان پائی جاتی ہے ۔ اگر ہم خلا میں پہنچ جائیں تو ہمیں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے گا اور اس اندھیرے میں بے شمار ستارے ہر وقت چمکتے ہوئے دکھائی دیں گے ۔ اسی کے ساتھ سورج بھی دکھائی پڑے گا ۔ خلا کے اس اندھیرے کا رات سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ دن رات زمین سے متعلق ہیں ۔ زمین کا جو حصہ گردش کرتے ہوئے سورج کے سامنے آجاتا ہے ادھر دن ہوتا ہے اور جس حصے پر سورج کی روشنی نہیں پڑتی ادھر رات ہوتی ہے ۔ ستاروں کا نکلنا اور ڈوبنا بھی زمین کی گردش کی وجہ سے ہے ۔ بذات خود وہ نہ نکلتے ہیں نہ ڈوبتے ہیں ۔

کسی ایسے ستارے کی طرف غور سے دیکھئے جو کسی اونچے درخت یا مینار کے قریب نظر آ رہا ہو ۔ چند گھنٹوں کے بعد آپ اسے درخت یا مینار کے دوسری جانب پائیں گے ۔ اس طرح دوسرے ستارے بھی حرکت کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے کی سمت سے ان کے فاصلوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ آسمان کے گنبد میں جڑے ہوں اور آسمان آہستہ آہستہ گھوم رہا ہو ۔ یہ حرکت دراصل زمین کی حرکت کا عکس ہے ۔ جیسے ریل پر سفر کرتے وقت ریل ٹھہری ہوئی اور باہر کی چیزیں بھاگتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں بالکل اسی طرح ہمیں زمین ٹھہری ہوئی اور آسمان ستاروں سمیت گھومتا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ تک لوگ اس بات کے قائل رہے کہ زمین ساکت ہے اور آسمان گردش میں ہے ۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر بے شمار ستارے ہیں لیکن جن لوگوں نے ستاروں کو گننے کی زحمت گوارا کی ہے ان کا کہنا ہے کہ دوربین کی مدد کے بغیر ہمیں زیادہ سے زیادہ چھ ہزار ستارے نظر آتے ہیں ۔ لیکن ہم ایک وقت میں ان سب ستاروں کو نہیں دیکھ سکتے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین گول ہے اور اس کی گولائی پورے آسمان کو دیکھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہے ۔ شمالی نصف کرہ میں رہنے والوں کو جنوب کے اور جنوبی نصف کرے میں رہنے والوں کو شمال کے ستارے دکھائی نہیں دیتے ۔ اگر زمین چپٹی ہوتی تو بیشک ہمیں کل ستارے نظر آجاتے ۔

اوسط درجے کی نگاہ کا آدمی ایک وقت میں ۱۰۰۰ ستارے دیکھ سکتا ہے جس کی نگاہ بہت اچھی ہے وہ ۱۵۰۰ یا زیادہ سے زیادہ ۲۰۰۰ ستارے دیکھ سکتا ہے، اگر آپ رات بھر جاگیں اور آسمان کو دیکھتے رہیں تو شمالی نصف کرے میں نظر آنے والے کل ستارے باری باری آپ کی نظر کے سامنے سے گزر جائیں گے

پرانے زمانے کے لوگوں نے مشاہدے سے معلوم کیا کہ آسمان پر جو ستارے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ستاروں کے ان مجموعوں میں اپنے دیوی دیوتاؤں اور مقدس جانوروں کی تصویریں دیکھیں اور ان کے نام رکھے جو اب تک چلے آتے ہیں۔ یہ نام بڑے دلچسپ ہیں مثلاً چھوٹا بھالو (دُبِّ اصغر) بڑا بھالو (دُبِّ اکبر) چھوٹا کتا (کلب اصغر) بڑا کتا (کلب اکبر) قطب ستارا جسے غالباً آپ پہچانتے ہوں گے چھوٹے بھالو کی دم میں ہے

ستاروں کے نام بیشتر عربی ہیں اور انھیں یورپی زبانوں میں خفیف سی تبدیلی کے بعد اختیار کر لیا گیا ہے۔ یہ نام بھی بڑے دلچسپ ہیں مثلاً مچھلی کا منھ (فم الحوت) مرغی کی دُم (ذنب الدجاجہ) بچھو کا ڈنک (شولہ) دبے کی چکتی (الالیہ) ٹوٹا ہوا ہار (الفکہ) موتیوں کی لڑی (النظم) وغیرہ اس طرح کے نام بہت زیادہ نہیں ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگوں نے ہر مجموعے کے خاص خاص ستاروں کے نام رکھے تھے اور باقی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ جب اس کمی کا احساس ہوا تو بجائے اس کے کہ ہر ستارے کا الگ الگ نام رکھا جاتا، یہ مناسب معلوم ہوا کہ ہر مجموعے کے ستاروں کو یونانی حروف "الفا" "بیٹا" "گاما" وغیرہ سے ظاہر کیا جائے تاکہ نام لینے سے اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ کس مجموعے کا کون سا تارا مراد ہے جیسے (Alfa Centauru) یعنی مجموعہ قنطارس کا پہلا تارا (Beta Centauri) یعنی مجموعۂ قنطارس کا دوسرا تارا۔ ستاروں کی فہرستیں بھی بنائی گئی ہیں جن میں ہر ستارے کا ترتیب وار ایک نمبر ہے بعض ستارے انھیں فہرستوں کے مختصر نام اور نمبر سے مشہور ہیں

ستاروں میں بعض ایسے ہیں جو آسمان پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ زمین کی گردش سے نہیں بلکہ ذاتی حرکت سے۔ انھیں پرانے زمانے کے لوگ دوسرے ستاروں سے ممتاز کرنے کے لئے "سیّارے" (سیر کرنے والے) کہتے تھے۔ اس طرح کے کل نو سیّارے ہیں جو سورج کے چاروں طرف گھومتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہماری زمین ہے۔ سیّاروں اور ستاروں میں بڑا فرق ہے۔ سیّارے سورج کی روشنی پڑنے سے چمکتے ہیں اور ستاروں کی روشنی سورج کی طرح ذاتی ہے۔ دوربین سے دیکھنے پر سیّارے گیند کی طرح گول نظر آتے ہیں لیکن ستارے اتنی دور ہیں کہ بڑی سے بڑی دوربین سے دیکھنے پر بھی وہ محض روشنی کے نقطے معلوم ہوتے ہیں۔

ستاروں کو ان کی ظاہری چمک کے لحاظ سے مختلف درجوں یا قدروں میں بانٹا گیا ہے۔ سب سے چمکدار ستارے ہیں جنھیں "قدر اوّل کے تارے" کہتے ہیں جیسے سہیل وغیرہ۔ قطب ستارا دوسرے درجے کا تارا ہے۔ انسانی آنکھ ۶ درجے تک کے تارے دیکھ سکتی ہے اس کے آگے دوربین استعمال کرنا پڑتی ہے اور دوربین جتنی طاقتور ہوتی ہے، ستاروں کی تعداد اتنی ہی زیادہ نظر آتی ہے۔ دنیا کی بڑی دوربینوں سے اربوں ستارے نظر آتے ہیں۔

شام کو آسمان پر سب سے پہلے "قدر اوّل کے تارے" ظاہر ہوتے ہیں[1]۔

---

[1] ان سے پہلے بعض سیّارے، زہرہ اور مشتری وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں یہ کافی بڑے ہیں اور ستاروں کے مقابلے میں زمین سے بہت قریب ہیں۔

اس کے بعد دوسرے ستاروں کی باری آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ستارا جتنا مدھم ہو گا اس کے ظاہر ہونے کے لئے اتنے ہی اندھیرے کی ضرورت ہو گی۔ قدرِ اوّل کے تارے نمبر ۲ سے وسطاً ۲.۵ گنا روشن ہیں لیکن سب یکساں چمکدار نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض کی چمک اوسط سے کئی گنا زیادہ ہے اور بعض کی اوسط سے کم۔ ایک سے پہلے صفر ہوتا ہے اس لئے جو تارے اوسط سے زیادہ روشن ہیں انھیں صفر سے کے تارے کہتے ہیں اور جو تارے ان سے بھی روشن ہیں انھیں "صفر سے نیچے کے تارے" کہتے ہیں۔ ستاروں کی اس تقسیم کا تعلق ہماری نگاہ سے ہے، ستاروں کی ذاتی روشنی سے نہیں، جس کا انحصار ستارے کی جسامت اور درجۂ حرارت پر ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ستارا بہت چمکدار ہو لیکن زمین سے دور ہونے کی وجہ سے ہمیں دھندلا نظر آئے۔

پرانے زمانے کے لوگ ستاروں کو ثوابت (Fixed Star) کہتے تھے گویا وہ غیر متحرک ہوں۔ لیکن اب پتہ چلا ہے کہ وہ بھی اپنے محور پر گردش کرتے ہوئے مختلف سمتوں میں چلے جا رہے ہیں۔ ستاروں کی اس حرکت کا پتہ خاص آلات کی مدد سے چلتا ہے لیکن انسانی آنکھ اسے صدیوں بلکہ ہزاروں برسوں میں بھی محسوس نہیں کر سکتی۔ ستاروں کی اس حرکت کی بنا پر یہ امید کی جاتی ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب ستاروں کے کل مجموعوں کی شکلیں بدل جائیں گی اور اس لئے ان کے نام غلط ہو جائیں گے۔ اس وقت بھی ان مجموعوں کے ناموں اور ان کی صورتوں میں کوئی خاص مشابہت نہیں ہے۔ نیچے دُبِ اکبر کی موجودہ، گزشتہ اور آئندہ صورتیں دکھائی گئی ہیں۔ تیروں کے نشان اس کے سات تاروں کی حرکت کا رخ ظاہر کرتے ہیں۔

ستارے ہمیں چاند سورج سے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ چاند ہماری زمین سے چھوٹا ہے اور سورج ہماری زمین سے بہت بڑا لیکن بعض ستارے سورج سے بھی بڑے ہیں۔ ان کا چھوٹا نظر آنا صرف اس لئے ہے کہ وہ ہم سے بہت دور ہیں۔ ستاروں کا فاصلہ اعلیٰ ریاضی کی مدد سے معلوم کیا گیا ہے جس کے اصول و قواعد کی تفصیل غیر دلچسپ ہے اس لئے ایک ہی مثال پیش کی جاتی ہے۔ زمین سورج کے چاروں طرف جس راستے پر گھومتی ہے اسے مدار کہتے ہیں۔ زمین جہاں آج ہے ۶ مہینے بعد وہاں سے ۱۸ کروڑ میل دور ہو گی۔ یہ فاصلہ زمین کے مدار کی چوڑائی ہے۔ جب کسی ستارے کا فاصلہ ناپنا ہوتا ہے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ زمین سے کس سمت ہے۔ چھ مہینے کے بعد دوبارہ اس کی سمت پائی جاتی ہے۔ ان دونوں سمتوں اور زمین کے مدار کی چوڑائی سے ستارے کا فاصلہ علم ہندسہ کے اس اصول کے مطابق معلوم کرتے ہیں کہ اگر کسی مثلث کا قاعدہ[1] اور اس کے دو زاویے معلوم ہوں تو اس کے ضلعوں[1] کو ناپا جا سکتا ہے۔

یہ طریقہ صرف قریب کے ستاروں کا فاصلہ ناپنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

---

[1] مثلث کی کسی شکل کو قاعدہ اس کی بنیاد کو اور زاویہ دو لکیروں کے ملنے سے بننے والے کونے کو کہتے ہیں۔ یہ △ مثلث ہے اس کے نیچے کی لکیر قاعدہ ہے اور اس کے تین کونے تین زاویے ہیں۔ قاعدے کے دائیں اور بائیں جانب جو لکیریں ہیں انھیں ضلع کہتے ہیں۔

دور کے ستاروں کا فاصلہ ناپنے کے لئے دوسرے طریقے جو زیادہ مشکل ہیں کام میں لائے جاتے ہیں۔

اگرچہ آسمان پر سب ستارے برابر کے اور ایک ہی فاصلے پر معلوم ہوتے ہیں، گویا ایک ہی سطح پر ہوں لیکن دراصل کوئی ستارا بڑا ہے اور کوئی چھوٹا، کوئی نزدیک ہے اور کوئی دور۔ ستارے اتنی دور ہیں کہ ان کے فاصلے کو بتانے کے لئے ہماری گنتی قاصر ہے۔ ان کے فاصلے کو نوری سال سے ظاہر کرتے ہیں۔ نوری سال کے معنی ہیں وہ فاصلہ جو روشنی ایک سال میں طے کرے۔ روشنی کی رفتار ۱۸۶ میل فی سکنڈ[1] ہے۔ ایک سال میں جتنے سکنڈ ہوتے ہیں (۳۶۵ × ۲۴ × ۶۰ × ۶۰) ان کو اس گنتی سے ضرب کیجئے تو معلوم ہوگا کہ روشنی ایک سال میں تقریباً ساٹھ کھرب (۶ ..) میل کا فاصلہ طے کرے گی۔ سو لاکھ کا ایک کروڑ سو کروڑ کا ایک ارب اور سو ارب کا ایک کھرب ہوتا ہے۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک نوری سال کتنا زبردست فاصلہ ہوا۔

زمین تک چاند کی روشنی کو پہنچنے میں تقریباً سوا سکنڈ اور سورج کی روشنی کو قریب آٹھ منٹ لگتے ہیں۔ سورج کے بعد نزدیک ترین ستارا "پراکسما سینٹوری" (*Proxima Centauri*) ہے جس کی روشنی زمین تک تقریباً چار سال میں پہنچتی ہے اور بعض ستارے تو اتنی دور ہیں کہ ان کی روشنی زمین تک لاکھوں سال میں پہنچتی ہے۔

یہ حیرت انگیز بات ہے کہ جن ستاروں کو ہم آج دیکھتے ہیں ان کی صورتیں "آج" کی نہیں ہوتیں۔ ان میں سے بعض ستاروں کی روشنی تو اسی جگہ سے چلے ہوئے چند سال، بعض کو صدیاں، بعض کو ہزاروں اور بعض کو لاکھوں سال ہو چکے ہوتے ہیں۔ گویا ستاروں کی جو صورتیں ہم آج دیکھتے ہیں، وہ برسوں، صدیوں، ہزاروں یا لاکھوں سال پرانی ہوتی ہیں اور ان کی جو صورتیں "آج" ہیں ان میں سے چند ہمیں کئی سال بعد نظر آئیں گی اور باقی کو ہم نہ دیکھ سکیں گے بلکہ آنے والی نسلیں دیکھیں گی۔

اعلیٰ ریاضی اور سائنسی آلات کی مدد سے نہ صرف ستاروں کا فاصلہ ناپا گیا ہے بلکہ ان کی ضخامت اور ساوٹ کا بھی اندازہ کیا گیا ہے۔ ستاروں کا قطر[2] براہ راست دوربین کی مدد سے نہیں ناپا جا سکتا۔ اس کے لئے ایک خاص آلے سے مدد لی جاتی ہے جسے "انٹرفرا" (*Interferometer*) کہتے ہیں۔ یہ آلہ دوربین سے جڑا رہتا ہے۔ ستاروں کی حرارت تھرمائیل (*Thermocouple*) سے ناپی جاتی ہے جو اتنا حساس ہوتا ہے کہ چالیس میل کے فاصلے پر جلتی ہوئی موم بتی کی حرارت بتا سکتا ہے۔ ستاروں کی روشنی کا معائنہ آلۂ طیف نما (*Spectroscope*) سے کیا جاتا ہے جو دوربین اور تین پہلو والے شیشے (*Prism*) کے ملنے سے بنتا ہے۔ دوربین ستارے کی روشنی جمع کرتی ہے اور تین پہلو والا شیشہ اس روشنی کو اس کے اجزائے ترکیبی میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اس طرح سات رنگوں کی جو پٹی بنتی ہے اسے طیف (*Spectrum*) کہتے ہیں۔ ان رنگوں کے کیمیاوی تجزیے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ستارے میں کون کون سے عناصر کس مقدار میں پائے جاتے ہیں، اس کا درجہ حرارت کتنا ہے، اس کی حرکت کس طرف ہے اور اس کی رفتار کیا ہے۔

ہم سورج اور ستاروں کو دو مختلف چیزیں سمجھتے ہیں لیکن بناوٹ کے لحاظ سے دونوں ایک ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ سورج ایک ستارا ہے اور ہر ستارا جسے ہم رات کو دیکھتے ہیں ایک سورج ہے۔ سورج کا بڑا نظر آنا صرف اس لئے ہے کہ وہ ہم سے قریب ہے اور ستاروں کا چھوٹا نظر آنا صرف اس لئے ہے کہ وہ ہم سے دور ہیں۔ تجربے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز اگر قریب سے دیکھی جائے تو بڑی معلوم ہوتی ہے اور دور سے دیکھی جائے تو چھوٹی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ فاصلہ جتنا زیادہ ہوتا ہے اتنی ہی چیز چھوٹی نظر آتی ہے۔ ستاروں کا چھوٹا نظر آنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سورج کے مقابلے میں ہم سے بہت دور ہیں۔ اگر سورج اتنی ہی دور ہوتا جتنی دور کہ دوسرے ستارے ہیں تو وہ دھندلا روشنی کا ایک نقطہ معلوم ہوتا (سورج کا زمین سے فاصلہ تقریباً ۹ کروڑ ۳ لاکھ میل ہے)۔ سورج کتنا بڑا ہے اس کا اندازہ یوں کیجئے کہ اس کا قطر ۸۶۴ ۰۰۰ میل ہے، جبکہ زمین کا قطر صرف ۸۰۰۰ میل ہے۔ اگر زمین کے ایسے ۹ اکرے پہلو بہ پہلو رکھے جائیں تو کہیں جاکر وہ سورج کے قطر کا مقابلہ کر سکیں گے۔ سورج کا حجم اتنا زیادہ ہے کہ اگر وہ کھوکھلا ہوتا تو اس میں ۱۳ لاکھ زمینیں سما جائیں۔

بعض دوسرے ستارے سورج سے کتنے بڑے ہیں اسے یوں سمجھئے کہ الطابجوزا (*Betelgeuse*) کا قطر سورج کا ۳۹ گنا ہے۔ یہ

---

[1] روشنی کی رفتار کا معلوم کیا جانا سائنس کا ایک کارنامہ ہے جس کی تفصیل کسی دوسرے موقع پر بیان کی جائے گی۔

[2] سیدھی لکیر جو دائرے کے مرکز سے گزرے اور اس کے دو برابر حصے کر دے ⊖ اسے قطر کہتے ہیں۔

اتنا بڑا ہے کہ بندوق کی گولی اس کا ایک چکر ۵۶ سال میں کرے گی اگر کوئی ۱۴ سال کا لڑکا اس پر بندوق چلائے اور گولی چکر لگا کر پھر اسی جگہ آجائے تو اس عرصے میں وہ لڑکا ۷۰ سال کا بڈھا ہو چکا ہوگا۔ قلب العقرب (Antares) کا قطر سورج کا ۴۵۰ گنا ہے۔ بجلی جس کی رفتار روشنی کی طرح ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے ایک سکنڈ میں ہماری زمین کے سات پھیرے کرے گی لیکن قلب العقرب کا چکر لگانے میں اسے قریب پونے دو گھنٹے لگیں گے۔

اب تک جن ستاروں کی پیمائش کی گئی ہے ان میں سب سے بڑا (Epsilon Aurigae) ہے جس کا قطر سورج کا ۳۰۰۰ گنا ہے۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں پورا نظام شمسی سما جائے گا۔ چند مشہور ستاروں کے قطر کی ناپ میلوں میں یہ ہے۔

سماک الرامح	.	۲۱ میل
الدبران	. . . .	۳۵ میل
ابط الجوزا	. . . .	۲۷۳ میل
قلب العقرب	. .	۴۰ میل
اپسیلان اوریگا	. . . .	۲۶۰ میل

یہ جسامت ان ستاروں کی ہے جنھیں "دیو" (Giants) کہتے ہیں۔ بعض ستارے بہت چھوٹے ہیں جنھیں "بونے" (Dwarf) کہا جاتا ہے۔ یہ بونے ستارے لگ بھگ سیاروں کے برابر ہیں۔ سب سے چھوٹے ستارے کا قطر صرف ۳۰۰۰ میل ہے۔ یہ شعرائی یمانی (Sirius) اور شعرائی شامی (Procyon) کے بیچ میں واقع ہے اور (L 886-6) کے نمبر سے مشہور ہے[1]۔

روشنی کے لحاظ سے ہمارا سورج ایک معمولی ستارا ہے۔ بعض ستارے سورج سے کہیں زیادہ چمکدار ہیں۔ سماک الرامح (Arcturus) سورج سے سو گنا روشن ہے۔ ابط الجوزا ۱۲۰۰ گنا قلب العقرب ۴۰۰۰ گنا اور رجل الجبار (Rigel) تو اتنا چمکدار ہے کہ اگر ہمارے سورج کے جیسے ۲۰۰۰۰ سورج ملا دیئے جائیں تو کہیں اس کی چمک کو پہنچ سکیں گے۔ اسی طرح سہیل (Canopus) کی چمک ہمارے سورج کی ۸۰۰۰ گنا ہے اور بعض ستارے تو سورج سے کئی لاکھ گنا روشن ہیں۔ اگر سب ستارے ایک ہی فاصلے پر ہوتے تو سب سے چمکدار اور مدھم ستارا نظر آتا جسے سگما ڈوریڈس (Sigma Doradus) کہتے ہیں۔ یہ ہمارے سورج سے قریب چھ لاکھ گنا روشن ہے۔ برخلاف اس کے سب سے مدھم ستارے کی چمک ہمارے سورج کا پانچ لاکھواں حصہ ہے۔

ہمارا جسم اور ستارے ایک ہی مادے کے بنے ہیں۔ انسانی جسم، جانوروں اور پیڑ پودوں کا بیشتر حصہ ہائیڈروجن ہے جسے ہم پانی کہتے ہیں وہ دو گیسوں کا مجموعہ ہے۔ ہائیڈروجن دو حصہ اور آکسیجن ایک حصہ۔ ستاروں کا ۹۳ فی صدی حصہ ہائیڈروجن ہے۔ برخلاف اس کے ہماری زمین کا صرف ایک فی صدی حصہ ہائیڈروجن ہے۔ ستاروں میں ہائیڈروجن گیس ہیلیم میں مسلسل بدلتی رہتی ہے۔ اس تبدیلی سے جو طاقت پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ یوں کیجئے کہ اگر ایک پونڈ ہائیڈروجن کو ہیلیم میں بدلا جائے تو اس سے جو طاقت پیدا ہوگی وہ ۱۰۰۰۰ ٹن جلتے ہوئے کوئلے کی طاقت کے برابر ہوگی۔ اس کا مقابلہ ستاروں کی حالت سے کیجئے جن کا ہر سکنڈ لاکھوں ٹن مادہ طاقت پیدا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے سورج کا ہر سکنڈ ۵۶۴ ملین ٹن (ملین دس لاکھ کا اور ٹن ۲۸ من کا ہوتا ہے) ہائیڈروجن ۵۶۰ ملین ٹن ہیلیم میں بدل جاتا ہے جس سے ۴ ملین ٹن روشنی اور گرمی پیدا ہوتی ہے۔ اس

---

[1] a star No 4048 in the Bonn catalog of stars - 4° N. Declination.

روشنی اور گرمی کا ایک خفیف سا حصہ زمین تک پہونچتا ہے جس کی وجہ سے ہم آپ اور دوسرے تمام جاندار زندہ ہیں۔

ستاروں میں ہائیڈروجن کے ہیلیم میں تبدیل ہونے کا سبب ان کی انتہائی گرمی ہے۔ اگر ستارے کی سطح کی حرارت ہزاروں درجہ ہوتی ہے تو باطن کی لاکھوں بلکہ کروڑوں درجہ۔ چنانچہ سورج کی سطح کی حرارت ۱۱۰۰۰ درجہ فارن ہائٹ ہے لیکن اندر کی دو کروڑ درجہ۔ اس گرمی میں عناصر اپنی اصلی صورت پر برقرار نہیں رہ سکتے، دوسرے عناصر میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ اس تبدیلی سے جو طاقت پیدا ہوتی ہے وہ گرمی اور روشنی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی ستارے کی چمک کا راز ہے۔

ستارا ہائیڈروجن کے جلنے سے زندہ رہتا ہے جتنی اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی اس میں ہائیڈروجن کی کمی ہوتی جاتی ہے۔ چونکہ سیاروں میں ہائیڈروجن کے جلنے کا سلسلہ بند ہوچکا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نظام شمسی میں سورج تو "زندہ" ہے لیکن اس کے سیارے "مردہ" ہیں۔

ستاروں کے اجزائے ترکیبی کا خاص جز یعنی ہائیڈروجن تمام عناصر میں سب سے ہلکا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ستارے ہوا سے ہزاروں گنا لطیف ہیں۔ اتنے لطیف کہ اگر کسی برتن سے ہوا نکال لی جائے تو اس کے نکلنے کے بعد جو خلا (Vacuum)[1] رہ جائے گا، اس کا مقابلہ ہم ایسے ستاروں کے مادے سے کرسکتے ہیں۔ عموماً جو ستارا جتنا بڑا ہوتا ہے اس کا مادہ اتنا ہی لطیف ہوتا ہے۔ چنانچہ سب سے لطیف مادہ (Epsilon - Aurigae) "ایپسیلان اوریگا" کا ہے جو ستاروں میں سب سے بڑا ہے۔ اس کے مادے کی کثافت پانی کا دس کروڑواں حصہ ($\frac{1}{10}$) ہے جبکہ سورج کے مادے کی کثافت پانی کی ڈیڑھ گنا ہے۔

جیسے جیسے ستارے کی عمر بڑھتی جاتی ہے اس کا مادہ کثیف ہوتا جاتا ہے، اسی کے ساتھ اس کا جسم بھی سکڑتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ سیسے سے زیادہ ٹھوس ہوجاتا ہے چنانچہ شعرای یمانی کے قریب ایک ننھا سا ستارا ہے (Sirius - B) یہ ایک ایسے مادہ کا بنا ہے جو پانی سے ۶ گنا کثیف ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کا ایک گلاس مادہ تقریباً ۱۲ ٹن وزنی ہوگا۔ ایسے گلاس کو بھلا ہاتھ سے کون اٹھا سکتا ہے۔ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے تو ریل گاڑی چاہیئے۔ سب سے کثیف مادہ جس ستارے[2] کا ہے اس کی کثافت پانی کی ۳۶ .. .. گنا ہے ایک بڑے چمچے کے برابر اس کا مادہ تقریباً ۲۰ ، ٹن وزنی ہوگا۔ یہ بھاری ستارے وہ ہوتے ہیں جنھیں "سفید بونے" (White Dwarf) کہتے ہیں۔ ابتک ایسے قریب ۲ ستاروں کا پتہ چلا ہے۔

ستارے بھی ہماری طرح پیدا ہوتے ہیں، زندہ رہتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ ستاروں کی عمر اربوں سال ہوتی ہے۔ ان کی پیدائش مختلف زمانوں میں ہوئی ہے اور یہ عمل اب بھی جاری ہے۔ ستاروں کے ڈیل ڈول اور گرمی سے ان کی عمر کا پتہ چلتا ہے۔ جب ستارا جوان ہوتا ہے تو خوب روشنی دیتا ہے لیکن جیسے جیسے اس کی جوانی ڈھلتی جاتی ہے اس کی چمک دمک کم ہوتی جاتی ہے اور اس کا جسم سکڑتا جاتا ہے۔ جب وہ بڈھا ہوجاتا ہے تو روشنی دینا بند کردیتا ہے اور اس کا جسم بالکل ٹھوس ہوجاتا ہے۔ اسی لئے جوان ستاروں کو "دیو" اور بڈھوں کو "بونے" کہتے ہیں۔ جوان ستارے کا رنگ سرخ یا نیلا ہوتا ہے اور بڈھے کا سفید رنگ کا انحصار ستارے کے درجۂ حرارت پر ہے۔ رجل الجبار کا رنگ نیلا ہے، ابط الجوزا کا سرخ اور ہمارے سورج کا زرد ہے۔

اب تک جتنے ستارے دریافت ہوئے ہیں ان میں سے تہائی کے قریب جڑواں (Binary) ہیں۔ بظاہر وہ ایک معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل دو تارے ہیں جو ایک دوسرے کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس کا پتہ دوربین سے چلتا ہے اور ان میں سے بعض تو اتنی دور ہیں کہ دوربین سے بھی ایک ہی نظر آتے ہیں لیکن آلۂ طیف نما سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دو ہیں۔ ان میں سب سے دلچسپ الغول ہے۔ یہ ستارا تو جوان ہے لیکن اس کا ساتھی بڈھا ہوچکا ہے وہ روشنی نہیں دیتا اس لئے نظر نہیں آتا۔ جب وہ اس ستارے کے گرد گھومتے ہوئے ہمارے اور اس کے بیچ میں آجاتا ہے تو کچھ عرصے کے لئے اس کی روشنی رک جاتی ہے اور یہ ہمیں مدھم نظر آتا ہے۔ ہر تیسرے دن اس کی روشنی گھٹتی بڑھتی ہے لیکن روشنی کے اس فرق کو محسوس کرنے کے لئے بڑی تیز نگاہ چاہیئے۔ اہل عرب نے اسے سب سے پہلے محسوس کیا تھا اور اس کا

(بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

---

[1] مکمل خلا کسی حالت میں نہیں پیدا ہوتا کچھ نہ کچھ ہوا ہمیشہ رہ جاتی ہے۔

[2] Star No 8247 in the Astrographic catalog, 70° N Declination

طلسم ہوش رُبا کے دو غیر مطبوعہ نسخے

راز یزدانی

اردو کی داستانوں میں طلسم ہوش رُبا کی صحیح حیثیت کو کم لوگ جانتے ہیں۔ اہلِ علم میں بھی عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ طلسم ہوش رُبا فارسی سے ترجمہ کیے ہوئے داستانِ امیر حمزہ کے پانچویں دفتر کا نام ہے۔ یہ طلسم سات جلدوں میں ہے جن کی ابتدائی چار جلدیں محمد حسین جاہ لکھنوی نے ترجمہ کی ہیں اور باقی تین جلدیں قمر لکھنوی نے۔ جاہ لکھنوی کون تھے، قمر لکھنوی کب پیدا ہوئے کب ان کا انتقال ہوا، دونوں کے اندازِ بیاں میں کیا فرق تھا، دونوں میں ممتاز حیثیت کس کی تھی، دونوں کی نثر میں کیا خوبیاں ہیں اور کیا خامیاں اس پر آج تک غور کیا گیا ہے اور نہ یہ مسائل ہمارے سامنے ہیں۔ اسی کے ساتھ ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ اس داستان کے متعلق جو کچھ اہلِ علم میں بھی تسلیم لیا جاتا ہے اس کا درجہ بھی ایک ایسی روایت کا ہے جس کی تائید میں کوئی تاریخی یا واقعاتی شہادت نہیں بلکہ خود طلسم ہوش رُبا سے امداد لی جائے تو جو کچھ اس کے متعلق اہلِ علم میں تسلیم کیا جاتا ہے وہ قطعی بے بنیاد نظر آتا ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ اردو میں زبانِ اردو میں "طلسم ہوش رُبا" داستانِ امیر حمزہ صاحبقران کے پانچویں دفتر کا نام ہے لیکن فارسی داستانوں کے بڑے بڑے مخطوطوں میں جو دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں اور جن کی فہرستیں ہمارے سامنے ہیں اس طلسم کا کہیں ذکر نہیں مثلاً باڈلین لائبریری، لندن، رائل ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، رضا لائبریری، رام پور۔ صرف رضا لائبریری میں فارسی داستان کے قدیم مخطوطوں کے اندر ایک بڑے طلسم کا ذکر ملتا ہے لیکن اس کا نام طلسم حیرت گرداں ہے۔

یہ تو ہے طلسم ہوش رُبا کے فارسی الاصل ہونے کے متعلق دوسری کتابوں سے شہادت جسے ہم بڑی آسانی سے خارجی شہادت کہہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی تائید میں خود طلسم ہوش رُبا نے ایک داخلی شہادت بھی پیش کی ہے۔ قمر لکھنوی نے پانچویں جلد کے دوسرے حصے میں صفحات ۶۲۷ - ۶۲۸ پر لکھا ہے :

" جو صاحب اس کے مصنف مشہور ہیں جناب میر احمد علی صاحب مرحوم و مغفور انھوں نے چند اجزا تحریر فرمائے۔ وہ پردہ کتاں میں تھے جب حقیر نے ان اجزا کو پایا، داستانہائے لطیف و عیارہائے عجیب و غریب جابجا بڑھائیں "

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طلسم ہوش رُبا کے مصنف میر احمد علی داستان گو تھے۔ یہ اقتباس اس طلسم کی اشاعت چہارم سے لیا گیا ہے جس کی طباعت ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ میر احمد علی لکھنؤ کے باشندے تھے اور ان کی عمر کا بیشتر حصہ دربارِ رامپور میں گزرا۔ لیکن میں قمر لکھنوی کی بات کو بھی تسلیم نہ کرتا اگر مجھے رضا لائبریری میں اردو داستان کے ایک دوسرے مخطوطے سے اس کی تائید نہ مل جاتی کیوں کہ قمر لکھنوی کے اعتراف کے بعد بھی میر احمد علی کے لکھے ہوئے وہ "چند اجزا" جو قمر لکھنوی کو دستیاب ہوئے اب کہیں نہیں ملتے، اس لیے قمر لکھنوی کے لفظوں کو آسانی سے اردو داستان کے متعلق دوسرے مغالطوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مجھے رضا لائبریری رامپور میں اس کا براہ راست تو نہیں مگر بالواسطہ پتہ مل گیا۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ لکھنؤ میں میر احمد علی کے ایک شاگرد منشی انبا پرشاد رسا لکھنوی تھے جنھوں نے بعد میں اسلام قبول کر لیا اور ان کا اسلامی نام عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ رسا کے ایک بیٹے تھے جن کا نام منشی غلام رضا تھا۔ یہ دونوں باپ بیٹے دربار کے مانے ہوئے داستان گو

کسی طرح کی آفت نہ آنے اور ایک لوح تیار کی ۔ دستخط جمشید اس طرح پر تیار کی کہ جب تک وہ لوح محکم رہے تو عالم طلسم پر کسی طرح کی کوئی آفت نہ آسکے۔ اس لوح کو علاوہ لوح طلسمی کے تیار کر کے کسی مخصوص مقام پر روشن کر دیا۔ یہ اس لیے کہ طلسم کشا کو پتا ہو دوسرے لوح طلسمی کا ہوا کرتا ہے جب لوح طلسمی ملتی ہوگئی پھر طلسم تسخیر ہوا۔ مگر یہاں یہ بات نہیں ہے ہر چند کہ دونوں لوحیں طلسم کی خاص ہیں ایک تو ان میں کی حضور کو دیا کو کب سے قبل ہوئی اور دوسری جو مجھے معلوم ہے دریائے نیل میں ہے تخت افراسیاب اسی لوح پر محکم ہے۔ تا وقتیکہ کوئی حیلہ دست یاب نہ ہو اور نقش جمشیدی اس لوح سے نہ ملیں گے اگر ہزار لوحیں ملیں ہوں تب بھی بادشاہ کا دھگڑا میلا نہ ہوگا ۔

یہ تاریخ طلسم ہوش ربا کی دوسری جلد میں صفحہ ۱۶ سے صفحہ ۲۱ تک ہے جو کسی جادوگر کی زبان سے اس ساری تاریخ طلسم کے دوران بیان ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ بھی ہے کہ میر احمد علی کی نگاہ میں افراسیاب (بادشاہ طلسم ہوش ربا) اور کوکب جادو (بادشاہ طلسم نور افشاں) کون تھے ۔

" اب سنیے کہ ہوشنگ کے دو بیٹے تھے ایک کا نام ہوش ربائے ارمائیل اور دوسرے کا نام افلاک ارمائیل جب ہوشنگ جہنم کو بھیجا تو دونوں بھائیوں میں آپس میں تکرار ہوئی ۔ ہر ایک کو دعویٰ ہوا کہ ہم (میں) تمام طلسم پر قابض ہوں گے جیسا جب یہ نوبت پہنچی کہ حاسد دریائے قہر سے اس طرف کو متعلق ہوش ربائے ارمائیل اور دوسری جانب متعلق بہ افلاک ارمائیل ہوگئی (یعنی ملک تقسیم ہوگیا) ۔ چنانچہ بڑے بھائی نے اپنے طلسم کا نام تو طلسم ہوش ربا رکھا اور بہت سی باتیں اپنی صنعت اور دست کاری سے اس میں زیادہ کردیں، اور افلاک جادو نے بھی جو طلسم اُس کے حصّے میں تھا اُس کو اپنے طور پر آراستہ کیا۔ اب رہے باطن اس کے جس کو قرشاق نے پوشیدہ کر دیا تھا ۔ وہ بعض تو سرحد ہوش ربا جادو میں ہیں اور بعض سرحد افلاک بیادو میں ۔ مگر ان کا حال سوائے قرشاق جادو اور اولاد قرشاق کے کسی پر ثابت نہ ہوا حلاصہ مدعا یہ ہے کہ اولاد ہوش ربا جادو سے تو افراسیاب جادو ہے اور افلاک جادو کی کیفیت یہ ہوئی کہ حرم جمشید کہ نام اُس کا غدارۂ جہاں ہے اُس کی دایہ سے اور افلاک جادو سے ایک تعلق قدیمی تھا اور افلاک جادو کھلا دلدادہ تھا مگر بعد افلاک جادو کے وہ طلسم قبضۂ غدارۂ جہاں میں رہا غدارۂ جہاں نے اولادِ افلاک جادو میں سے کوکب روشن ضمیر کو اپنا فرزند کر کے پرورش کیا۔

جہاں جہاں وہ تمام سرحد کوکب روشن ضمیر کے قبضے میں ہے۔"

لاچین جادو کے متعلق بھی میر احمد علی کے لکھے ہوئے طلسم اور رجاہ اور قمر کے مطبوعہ طلسم میں اختلاف ہے۔ مخطوطے کی دوسری جلد میں زوجۂ افراسیاب ملکہ حیرت جادو کی زبان سے لوح طلسم کا حال بیان کیا گیا ہے اس سے ضمناً معلوم ہوتا ہے کہ میر احمد علی نے لاچین جادو کو کیا رتبہ دیا تھا ۔ اس مخطوطے میں صفحات کے نمبر نہیں اس لیے صفحات کے نمبر کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا

" جس دن سے قہقہہ نیل سر جادو لوح دار طلسم ہوش ربا کا مرگیا اور دوسرا نیل سر اور شہرہ نیل سر اُس کے بیٹوں میں باعث تقسیم ملک تلوار چلی اور دونوں مارے گئے لوح کا پتہ اور ٹھکانہ اور کسی کو تو کیا شہنشاہ ساحران عالم افراسیاب جادو کو بھی معلوم نہیں۔ گل دستہ لوح طلسم ہزار ہا اور لوح کو کون لے گیا، آسمان پر اُڑ گئی یا زمین میں سما گئی ۔"

گویا یہ ایک اور بنیادی اختلاف لوح طلسم کے متعلق ہے۔ مطبوعہ طلسم میں قہقہہ نیل سر کو لوح طلسم کا مالک بتایا گیا ہے مگر کہا گیا ہے کہ جب افراسیاب نے طلسم پر قبضہ کیا تو قہقہہ غرور لوح داری کے سبب سلام کو بھی نہ آیا، نہ خراج مقررہ بھیجا۔ قہقہہ کا مقام سکونت دریائے نیل تھا اور دریائے نیل کے ملحقہ مقامات میں ساحر کا سحر بے کار رہتا تھا لیکن افراسیاب دریائے نیل میں پہنچا۔ قہقہہ کو باہر لا کے بزور سحر چیر ڈالا اور لوح کو لینے انتظام میں لیا۔ لیکن یہ داستان مطبوعہ طلسم میں کہیں مفصل درج نہیں صرف اس کا حوالہ آیا ہے کہ افراسیاب نے لوح قبضۂ قہقہہ سے نکال کے اپنے انتظام میں کہیں رکھی ۔ بہرحال افراسیاب کو لوح کی جستجو تھی کہ بقول منشی علی رضا' بزبانِ حیرت جادو کے :

" قلم کوہ میں ایک مرتبہ سنا تھا اور کچھ پتا لوح کا سُنا کہ وہاں کے حاکم لاچین جادو نے لوح طلسم ہوش ربا کی پائی
برس دن تک افراسیاب اُس سے لڑا۔ آخر وہ شکست کھا کر بھاگا، پکڑا گیا
لاچین جادو اب قید ہے ۔"

یہ بنیادی اختلاف مطبوعہ طلسم اور میر احمد علی کے اصل طلسم میں ہیں۔ مطبوعہ طلسم میں قمر سے ایک چوک اور بھی ہوگئی ہے کہ افراسیاب جس آئینۂ طلسمی میں چلا جاتا تھا اُس کا حال کچھ بیان نہیں ہوا ۔ میر احمد علی کے طلسم میں وہ آئینہ ایک طلسم سے متعلق بیان کیا گیا ہے جس کا نام ہی طلسم آئینہ ہے۔ اسد اسے فتح کرتے ہیں۔ آئینۂ طلسمی ٹوٹتا ہے اور افراسیاب کا یہ شرف مٹتا ہے ۔

دوسرا غیر مطبوعہ نسخہ مرزا علیم الدین رامپوری کی تصنیفات میں سے ہے۔

مرزا علیم الدین بیٹے تھے دہلی کے مشہور شہر آشوب شاعر صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا کے۔ دو سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ دودھ پیتے بچے کی حیثیت میں رامپور آئے تھے۔ حیا کے رامپور آنے کا واقعہ ۱۸۵۶ء کا ہے اس لیے مرزا علیم الدین کی پیدائش ۱۸۵۴ء کی ٹھہرتی ہے ان کا انتقال ۱۹۲۶ء / ۱۳۴۵ھ میں ہوا۔ تقریباً ۷۴ برس کی عمر پائی۔ رامپور دربار میں بزمرۂ داستان گویاں ملازم رہے۔ ساٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ مرزا علیم الدین کی تعلیم گھریلو تھی اور یہی اس زمانہ میں شرفا کے بچوں کا مروجہ طریقہ تعلیم تھا۔ ان کا رنگ اپنے خاندانی وصف کے خلاف کھلتا ہوا تھا۔ میں نے اپنی نوجوانی میں یعنی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں جیسں دیکھا جب وہ اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہے تھے لیکن مجھے ان کی داستان سننے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اس کے دو سبب تھے۔ پہلا تو یہ کہ وہ داستان گو سے کہیں زیادہ داستان نویس تھے اور دوسرا اور زیادہ اہم بلکہ زیادہ صحیح سبب یہ تھا کہ وہ تھے درباری داستان گو اور میں زیادہ سے زیادہ ایک عام سامع۔ بہرحال جب میں نے انھیں دیکھا ہے تو دہلی کے صاحب عالم طبقہ سے کچھ مختلف پایا، رنگ میں بھی اور کچھ وضع قطع میں بھی۔ چہرے پر کھری داڑھی جسم پر سفید انگرکھا اور سفید پاجامہ۔ قد متوسط نہ دبلے نہ موٹے۔ ٹوپی زیادہ تر رامپوری مخملی۔ اور کبھی کبھی دوپلی بھی۔ صاف ستھرا لباس۔ پسندیدہ اخلاق اور عمدہ کھانا خاندانی ورثہ کے لوازم تھے۔ افیون کا شوق بھی خاندانی تھا اور داستان سے زیادہ شطرنج میں باپ کے سپوت تھے۔ شترخانہ کی مسجد سے ملحق شاہ رفیق کے تکیہ میں ان کی خاندانی ہڑواڑ تھی۔ وہیں اپنے اہل خاندان کے ساتھ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کو بچپن سے داستان سننے اور داستان کہنے کا شوق تھا اور کم سنی میں ہی لکھنؤ کے مشہور داستان گو میر نواب سے تا۔۔۔ دہ ہو گئے تھے جو دربار رامپور سے متعلق تھے۔

مرزا صاحب نے اردو داستان کو داستانوں کے نو سلسلے دیے جو ۱۸۹۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۵ء میں ختم ہوئے گویا انھوں نے چالیس سال اپنے قلم سے اردو داستان کی خدمت انجام دی۔ ۲۷ جلدیں اور ۱۰۵۶۱ صفحے اس عرصہ میں ان کے قلم سے نکلے جو سب کے سب رامپور لائبریری میں محفوظ ہیں بے جا نہ ہوگا اگر ان کے لکھے ہوئے طلسم ہوشربا کے مفصل ذکر سے قبل ان کے تمام کام کا پورا پورا ذکر کر دیا جائے کیونکہ خدا جانے ۔۔۔ ان کا نام لینے اور ان کا ذکر کرنے کا موقع اردو ادب میں پیدا ہو نہ ہو۔ اور شاید ان کا آخری تذکرہ ہو۔

(۱)	طلسم بہارستان مثال ۵ جلدوں میں	۱۳۰۴-۱۳۱۳ھ / ۱۸۸۵-۱۸۹۶ء	۲۴۴۳ صفحات
(۲)	تورج نامہ ایک جلد	تاریخ تحریر نہیں	۴۳۲ صفحات
(۳)	طلسم طاق سکندری دو جلدوں میں		۷۰۵ صفحات
(۴)	طلسم آذر کیوان عرف طلسم پری پیکر ۵ جلدوں میں	سنہ ۱۹۱۹-۲۱ء	۲۳۹۲ صفحات
(۵)	طلسم معدن غرائب عرف ہفت گلزار سلیمانی (ایک جلد)	سنہ ۱۹۲۲ء	۴۲۴ صفحات
(۶)	طلسم باطن ہوشربا ۸ جلدوں میں	سنہ ۱۹۱۳-۱۹۲۲ء	۲۳۷۹ صفحات
(۷)	طلسم زرال متعلق بہ طلسم ہوشربا ۴ جلدوں میں	سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء	۱۰۰۰ صفحات
(۸)	طلسم لالہ زار متعلق بہ طلسم ہوشربا ایک جلد	سنہ ۱۹۲۳ء	۵۱۱ صفحات
(۹)	طلسم چاہ زمرد متعلق بہ طلسم ہوشربا ایک جلد	سنہ ۱۹۲۵ء	۳۷۵ صفحات

سلسلہ نمبر پانچ تک مرزا صاحب نے جو کچھ لکھا اس سے اس مقالہ میں بحث نہیں البتہ آخر کے چار سلسلے طلسم ہوشربا سے تعلق رکھتے ہیں یہ چودہ جلدیں ہیں جو ۴۲۵۱ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب طلسم ہوشربا کو اس طرح بیان کرتے تھے کہ

حکیم دیو جالنس کلی کے شاگردوں میں ایک حکیم تھے جن کا نام حکیم ہوشنگ تھا جو خود اونچے درجہ کے حکیم تھے اور صاحب تلامذہ تھے۔ حکیم ہوشنگ سیلانی طبیعت رکھتے تھے۔ دنیا کی سیر اور ملکوں کی تفریح کرتے رہتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک بار کوہ عقیق گلزار سلیمانی پہنچے تو دیکھا کہ اس ملک میں جا بجا بڑے بڑے ساحر آباد ہیں جو ۔۔۔ مذہب و مسلک کے لوگوں کو آزار پہنچاتے ہیں۔ یہ بہار

نے "تفریق بری" کے ثبوت مہیا کرنے شروع کیے۔ فوربس نے کہا کہ اگر سمندر اور
خشکی ایسی جگہ ایسے ہی اٹل تھے تو پھر ایک ہی نسل کے نباتات اور حیوانات ایک
براعظم سے دوسرے براعظم پر کیونکر پہنچے۔ برطانیہ میں "کاربونیفرس" زمانے کی چٹانیں
اور ٹورنڈونین (Torrendonean) چٹانیں جن مادوں سے بنی ہیں اُن کی
چٹانیں اسکاٹ لینڈ میں پائی جاتی ہیں اور ایپلیچین جیوسنکلائین (Appala-
chian Geosyncline) جن مادوں سے بکھرے گئے تھے اُن کی چٹانیں جنوب
مشرق میں پائی جاتی ہیں۔ اگر دونوں براعظم کسی خشک جگہ کے ذریعے ایک دوسرے
سے جڑے ہوئے نہیں تھے تو پھر یہ مادے ایک جگہ سے دوسری جگہ کیسے پہنچے
جب کہ ان کے بیچ میں سوائے پانی کے اور کچھ نہیں۔ فوربس نے اس خشک
جگہ کی موجودگی عمودی تحریک (Vertical Movement) کے ذریعے
ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن اسے بڑے پیمانے پر اس بات کی عمودی
تحریک کے ذریعے ثابت کرنا لاحاصل ثابت ہوا۔ اس لئے کسی ایسی قوت
کی تلاش شروع ہوئی جو براعظموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکے۔

ایسی قوتوں کی موجودگی کا پتہ سب سے پہلے ایوٹوس (Eötüss) نے
لگایا تھا۔ بقول ایوٹوس یہ قوت جسے ہم سنٹری فیوگل فورس (Centrufugal
Force) کہتے ہیں کسی بھی گول چیز کے حرکت کرنے سے خود بخود وجود
میں آتی ہے۔ خط استوا کے پاس زمین کی وسعت زیادہ ہونے سے اس کی گردش
کی وجہ سے ایک خط استوائی کشش نمودار ہوتی ہے جو ہر شئے کو اسی طرف مائل
کرتی ہے تاکہ اس کی یہ خط استوائی وسعت قائم رہ سکے اور گھومتی ہوئی زمین
گردش کی وجہ سے ایک سیدھی لکیر پر گرنے سے محفوظ رہ سکے

شروع میں جب زمین وجود میں آئی اور ٹھنڈی ہونے لگی تو اس کی سطح
پر گرانائٹ (Granite) چٹانیں نمودار ہوئیں لیکن ان کے نیچے
نسبتاً بھاری بیسالٹ (Basalt) چٹانیں ابھی پگھلی ہوئی شکل میں تھیں اور
ہلکی گرانائٹ چٹانیں اس کے اوپر تیر رہی تھیں۔ اس وقت چاند کی پیدائش
وجود میں آئی۔ اس کی وجہ سے گرانائٹ کا ایک بہت بڑا حصہ چاند کے ساتھ
چلا گیا اور زمین پر جہاں سے یہ چٹانیں ہٹیں ایک بہت بڑا گڈھا
بن گیا جسے ہم **بحرالکاہل** کہتے ہیں۔ اس حادثے کی وجہ سے گرانائٹ کے
براعظم کے باقی حصے میں بھی شگاف پیدا ہو گئے۔ اس وقت اس خط استوائی
کشش کا کام غالباً یہ ہوگا کہ ان دراڑوں کو وسیع تر کر دے اور براعظم ایک دوسرے
سے دور ہو جائیں۔ اگر یہ کشش اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو
آج ہماری زمین کی شکل کچھ اور ہوتی۔ **بحرالکاہل** جو چاند کی پیدائش سے وجود
میں آیا اس کا کوئی نشان نہ ملتا۔ براعظم خط استوا کے دونوں طرف ایک متوازی خطے
میں پھیلے ہوئے نظر آتے اور ان کے شمال و جنوب میں قطب شمالی و جنوبی کے پاس
دو بڑے سمندر نظر آتے

(اگر خط استوائی کشش اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی
تو زمین کی شکل جیسے کہ نقشے میں ہے کسی موتی شکل کی طرح ہوتی)

لیکن خط استوائی کشش کا مقصد اس وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا کہ جب
براعظم ایک دوسرے سے کچھ دور ہٹے اور گرانائٹ چٹانوں کے ہٹنے سے بیسالٹ کی
پگھلی ہوئی سطح نمودار ہوئی تو ہوا لگنے سے وہ جلد ہی ٹھنڈی ہونے لگی۔
بیسالٹ جیسے جیسے ٹھنڈا ہو کر ٹھوس شکل میں تبدیل ہونے لگا براعظموں
کی حرکت میں ایسی ہی رکاوٹ بھی حائل ہوتی رہی۔ کیونکہ گرانائٹ چٹانیں جتنی
آسانی سے پگھلے ہوئے بیسالٹ پر سرکتی تھیں اتنی آسانی سے ٹھوس بیسالٹ پر کھسک
نہیں سکتی تھیں۔ اس طرح براعظموں کے خط استوا تک پہنچنے سے پہلے ہی پگھلی ہوئی بیسالٹ
ٹھنڈی ہو کر ٹھوس شکل میں آ گئی اور براعظموں کی حرکت ہمارے سیارے کے وجود میں
آنے کے تھوڑے عرصے کے بعد ہی ختم ہو گئی۔

"تفریق بری" کے سلسلے میں ۱۹۱۱ء میں ٹیلر (Tayloz) اور ۱۹۱۵ء
میں ویگنر (Waynex) نے اپنے نظریات پیش کیے لیکن ان سے پچاس
سال پیشتر ایک فرانسیسی ماہر طبقات الارض سائیڈر (Snuder) نے
"تفریق بری" کو جانبی تحریک (Lateral Movement) کے ذریعے
ثابت کرنے کی کوشش کی۔ سائیڈر نے زمین کی بدلتی ہوئی شکل کے دو نقشے
پیش کیے۔ ان میں کاربونیفرس زمانے کی جغرافیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے سائیڈر

نے افریقہ اور یورپ کے مغربی ساحل کو جنوبی امریکہ اور شمالی امریکہ کے ساحلوں سے ملا ہوا دکھا کر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن امریکہ کی کوسٹ کی چٹانوں میں پائے جانے والے ... اور یورپ کی کوسٹ کی چٹانوں میں پائے جانے والے باقی ... ایک ... کو ثابت کر دیا۔ اس کے خیال کے مطابق چٹانوں کی یکسانیت ... کے ... چٹانیں ... پاس پاس ہی ہوں گی ... جانی تحریک کے بجائے عمودی تحریک ... کی ... کھول گئے۔ آگے بڑھنے کی وجہ سے پیچھے کے حصوں میں چٹانوں کا ٹوٹنا پھوٹنا بھی یقینی ہے۔ اس کے بہت سے ثبوت بحر آرکٹک اور شمالی بحر اقیانوس کے ساحلوں پر پائے بھی جاتے ہیں۔

جنوبی کرۂ ارض میں گونڈوانا لینڈ (Gondwana land) قطب جنوبی کے پاس لاریشیا کی طرح ایک دوسرا براعظم تھا۔ اس کی چٹانیں بھی خط استوا کی طرف اسی طرح پھسلیں اور بحر ہند اور جنوبی بحر اقیانوس میں ان چٹانوں کے ٹوٹنے سے وجود میں آئے۔ اس طرح ٹیلر کے خیال کے مطابق پہاڑوں کے سے کی ساخت ... کی ... میں ... کوشش کی۔ (بائیں طرف کا نقشہ کا دوسیفرن ماننے میں پیش کی گل مینی کرتا ہے)

ٹیلر نے پہاڑوں کی موجودہ تقسیم کو تعریف ... ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس امریکی ماہر طبقات الارض کے خیال کے مطابق شروع میں لاریشیا (Lau-ratia) سی آل چٹانوں کا بنا ہوا ایک بہت بڑا براعظم تھا جو قطب شمالی کے پاس پھیلا ہوا تھا سی آل کے اس براعظم میں جس جگہ توت مدافعت کم تھی وہاں سے سی آل کے ٹکڑوں نے خط استوا کی طرف پھسلنا شروع کیا ان کے اس طرح جنوب کی جانب بڑھنے اور میان ٹ چٹانوں کے ساتھ رگڑ کھانے سے پہاڑ اور پہاڑی محرابیں (Mountain arcs) وجود میں آئے سی آل کے ان حصوں کے

وجہ سے جانبی تحریک عمل میں آئی جس سے براعظم ایک دوسرے سے اتنی دور ہٹ گئے لیکن ٹیلر کی بات پر اس وجہ سے زیادہ دھیان نہ دیا جا سکا کہ پہاڑوں کے وجود میں آنے سے جانبی تحریک چٹانوں کو زیادہ سے زیادہ چالیس میل تک دور ہٹا سکتی تھی جب کہ یورپ اور امریکہ کے درمیان چار ہزار میل کا فاصلہ موجود ہے۔

اس کے علاوہ ٹیلر نے یہ ثابت کرنے میں بھی کوتاہ اندیشی سے کام لیا کہ یہ قوت کس طرح وجود میں آئی۔ ٹیلر کے خیال کے مطابق چاند کی پیدائش کرنے سے سیتں

زمانہ میں ہوئی اس وقت چاند زمین سے بہت نزدیک تھا اور اس قرب کی وجہ سے زمین کی سطح پر جو مدوجزر پیدا ہوا وہ بذات خود زمین کی گردش میں رکاوٹ پیدا کرنے اور براعظموں کو خط استوا کی طرف کھینچ لانے کے لئے کافی تھا۔ لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے کہ چاند کریٹےسیس (Cretaceous) زمانے سے پہلے موجود نہ تھا۔ اگر بالفرض کوئی ایسی بات تھی تو پھر ٹرشری (Tertiary) اور کریٹےسیش (Cretaceous) زمانے سے پہلے کے پہاڑ کس طرح وجود میں آئے؟ اس کے علاوہ چاند کے ذریعے زمین کی سطح پر پیدا ہونے والے مدوجزر ہمیشہ زمین کی گردش میں حائل ہوتے ہیں اگر یہ مدوجزر اتنے قوی تھے کہ وہ براعظموں کو قطبین سے خط استوا کی طرف کھینچ لانے میں کامیاب ہوتے تو پھر ان کی قوت کی وجہ سے زمین کی گردش ایک سال کے اندر بالکل ختم ہو جاتی لیکن زمین آج بھی گردش کر رہی ہے۔ اس لئے کوئی بیرونی قوت تفریق بری کا موجب نہیں قرار دی جا سکتی ہے۔

دیگنر نامی ایک جرمن نے ۱۹۱۵ء میں "تفریق بری" کے سلسلے میں اپنی مشہور کتاب (Die Entstehung der Kontinente und Ozeane) شائع کی۔ اس کتاب میں دیگنر نے زمین کی بدلتی ہوئی شکل کے تین نقشے پیش کئے یہ نقشے زمانہ اپر کاربونیفرس (Upper Carboniferous) ایوسین (Eocene) اور قدیم کوارٹرنری (Older Quarternary) میں زمین کی جغرافیہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ زمین کی اس پہلی شکل کا جسے دیگنر "اپر کاربونیفرس" زمانے کی زمین کہتا ہے نام پینگیا (Pangaea) رکھا۔ دیگنر کا اپر کاربونیفرس زمانے کا (Pangaea) سائینڈرس کے کاربونیفرس زمانے کی زمین سے کسی حد تک مماثلت رکھتا ہے فرق یہ ہے کہ دیگنر کے نقشے میں ہندوستان اور انٹارکٹک براعظم آسٹریلیا اور افریقہ کے بیچ میں ملتے جاتے ہیں۔ دیگنر کے خیال کے مطابق کاربونیفرس زمانے میں قطب جنوبی افریقہ کے ساحلوں کے پاس تھا اس طرح دیگنر کی اسکیم کے مطابق جب براعظم ایک دوسرے سے دور ہٹے تو ان کے ساتھ قطبین بھی کھسکتے رہے۔

بقول دیگنر میسوزوئک زمانہ (Mesozoic) میں جنوبی کرۂ ارض کے براعظم قطب جنوبی سے الگ ہونا شروع ہوئے اس کے بعد براعظم امریکہ Pangaea سے الگ ہوا اور مغرب کی طرف کھسکنا شروع ہوا۔ سب سے آخر میں گرین لینڈ کی باری آئی۔ دیگنر نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ شمالی بحر اقیانوس پلیسٹوسین زمانہ (Pleistocene) میں وجود میں آیا۔ اس وقت تک قطب جنوبی اور شمالی دونوں اپنی جگہ بدل چکے تھے۔ براعظم انٹارکٹک قطب جنوبی کے پاس اور آسٹریلیا بالکل مشرق میں ساگر میں ہوا اور خط استوا کے دونوں طرف اور ہندوستان ایشیا کے جنوب میں اپنی جگہ پا چکا تھا۔

دیگنر نے خط استوائی کشش کو تفریق بری کا موجب بتایا۔ لیکن دیگنر کی تھیوری پر اس وجہ سے اعتراض کیا گیا کہ اتنے بڑے پیمانے پر تغیرات پیدا کرنا اس کشش کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے اس سے لاکھوں گنی زیادہ طاقت کی ضرورت ہے۔

اس کے علاوہ دیگنر نے براعظموں کی حرکت کا رخ مغرب کی طرف رکھا۔ امریکہ کے بارے میں تو دیگنر کا خیال کافی کارآمد ثابت ہوا لیکن ایشیا کے سلسلے میں

پیدا ہونا معمولی نہیں تھا۔ دونوں (شمالی جنوبی) امریکہ مغرب کی جانب کھسکے تو حسب الکاہل کی رکاوٹ کی وجہ سے ان کے مغربی ساحلوں پر پہاڑوں کی اونچی قطاریں ابھر آئی ہیں۔ ان دونوں براعظموں کے درمیان کچھ مادہ ان کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکا اور پیچھے رہ گیا۔ اسی طرح جزائر ویسٹ انڈیز وجود میں آئے۔ ایشیا کے مشرقی ساحلوں پر پائے جانے والی سمندری کھائیاں بھی وہ کیسر ہیں جو یوریشیا کے مغرب کی طرف کھسکنے سے بحر الکاہل میں پڑنے والی دراڑیں ہیں اور ایشیا کے مشرقی ساحلوں پر پائے جانے والے جزیرے بھی ویسٹ انڈیز کی طرح وجود میں آئے جو مغرب کی طرف کھسکتے ہوئے یوریشیا کا ساتھ نہ دے سکے اور پیچھے رہ گئے۔

براعظموں کا مغرب کی طرف کھسکنا بقول وگنر سورج اور چاند سے زمین کی سطح پر پیدا ہونے والے مدوجزر کا نتیجہ ہے۔ یہ کشش ہمیشہ زمین کی گردش میں حائل ہوتی ہے۔ اس کا اثر ابھری ہوئی سطح پر زیادہ ہوتا ہے بنسبت نیچی سطح کے۔ اگر اس قسم کی رکاوٹ حائل ہو تو براعظم جن کی سطح سمندروں سے اونچی ہے ان پر اس کا اثر زیادہ ہوگا اور ان کی رفتار میں رکاوٹ پیش آئے گی جس کی وجہ سے وہ پیچھے رہ جائیں گے یا بالفاظ دیگر پیچھے کی طرف کھسک جائیں گے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ گردش پر اس کشش کا اثر بہت تھوڑا ہی پڑ سکتا ہے کیونکہ یہ اتنی طاقتور نہیں۔

وگنر کے خیال کے مطابق براعظموں کی یہ حرکت پلیسٹوسین عہد Pleistocene تک جاری رہی لیکن موجودہ زمانے میں چاند اور سورج کی کشش سے جو حساب لگایا گیا اس سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے۔ یہ بات ضرور تھی کہ شروع زمانے میں جب زمین وجود میں آئی اور چاند سا اس وقت سمندر کی سطح آج کی طرح موٹی اور ثقیل نہ تھی اور اس کی قوت مدافعت بھی کم تھی اس وجہ سے چاند اور سورج کی کشش زیادہ زود اثر تھی۔ لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے کہ پلیسٹوسین زمانے میں جب زمین ٹھنڈی ہو چکی تھی اور چٹانیں وجود میں آ چکی تھیں اس قوت کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ براعظم دور ہٹ جائیں اور شمالی کہراؤ قیانوس وجود میں آ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریباً شروع زمانہ میں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی اور زمین کے ٹھنڈا ہونے کے بعد اب اس کے امکانات بالکل ختم ہو چکے ہیں۔

> جمہوریت کے یہ معنی ہیں کہ ہم نہ صرف ان لوگوں کے ساتھ رواداری برتیں جو ہم سے متفق ہیں بلکہ ان لوگوں کے ساتھ بھی رواداری سے پیش آئیں جو ہم سے متفق الرائے نہیں ہیں۔
>
> پنڈت جواہر لال نہرو

وفاقیت جمہوریت کے آئینے میں

سیّد مُحمّد سعد

جمہوریت کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یونان کو "جمہوریت کا گہوارہ" کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جمہوری ریاستوں کی ابتدا قدیم یونان سے ہوتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے لوگ جمہوریت سے ناآشنا تھے۔ قدیم ہندوستان میں جمہوری ریاستوں کے وجود کے واضح ثبوت اور ان کا تفصیلی ذکر ہمیں ویدک لٹریچر، رگ وید، یجر وید وغیرہ اور دوسری کتابوں سے ملتے ہیں۔ ویدک زمانے کی ابتدا میں اگرچہ کہنے کو "بادشاہت" قائم تھی لیکن اس وقت کی "سبھا" اور "سمیتی" ( ) میں جمہوریت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے جیسا کہ سنگھ تھیسر نے بھی لکھا ہے ویدک عہد کے آخر سے ہندوستان میں مختلف مقامات پر جمہوری نظام کی بنیاد پڑ رہی تھی اور ۵ قبل مسیح میں پنجاب اور سندھ وغیرہ میں جمہوری ریاستوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

جمہوریت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر سقراط، افلاطون اور ارسطو سے لے کر آج تک اکثر مفکرین نے اظہار خیال کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ جامع بہتر اور مختصر تعریف ابراہم لنکن نے پیش کی ہے۔ ان کے مطابق "جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جو عوام کے ذریعہ، عوام کے مفاد کے لئے اور عوام کا ہوتا ہے"۔ جمہوریت انگریزی لفظ "ڈیموکریسی" (Democracy) کا ترجمہ ہے۔ ڈیموکریسی لیٹن زبان کے دو الفاظ "ڈیموس" (Demos) اور "کریشیا" (Cracia) سے بنا ہے جس کے معنی بالترتیب "عوام" اور "طاقت یا حکومت" کے ہوتے ہیں۔ اس طرح لفظ "ڈیموکریسی" جو اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس میں ساری طاقت عوام کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ عوام سے علیحدہ ریاست کی خود کوئی طاقت نہیں ہوتی اور دوسری چیز یہ ہے کہ کسی ایک شخص یا ایک طبقے کی حکومت نہ ہو کر سارے عوام کی ہوتی ہے دوسرے الفاظ میں حقیقی طاقت (Sovereignty) عوام کے پاس ہوتی ہے اور نظام حکومت کا دار و مدار رائے عامہ (Public Opinion) پر ہوتا ہے۔

جمہوریت کی ابتدائی زندگی میں عوام اس طاقت کا استعمال خود ہی براہ راست (Directly) کرتے تھے یہی جمہوریت کی ابتدائی قسم وہ ہے جسے آج "براہ راست جمہوریت" (Direct Democracy) کہا جاتا ہے۔ ابتدا میں یونان میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں جن کی آبادی اور رقبہ بہت ہی کم ہوتا تھا۔ افلاطون نے بھی کہا تھا کہ "ریاست کی آبادی اتنی ہونی چاہیئے کہ اس میں ایک شخص دوسرے کو آسانی پہچان سکے"۔ ریاست کے اس تصور اور چھوٹی چھوٹی کم آبادی والی ریاستیں ہونے کی وجہ سے اس وقت ہر ریاست کے تمام افراد اپنی ریاست کا انتظام براہ راست کرتے تھے وہ سب ایک مقام پر جمع ہو کر قانون بناتے تھے ان کے نفاذ وغیرہ کے سلسلہ میں کارروائی کرتے تھے مختصر یہ کہ تمام سیاسی مسائل اور امور حکومت پر غور کرنے کے لئے وہ سب ایک مقام پر جمع ہو کر کوئی فیصلہ کرتے تھے جس میں ہر فرد کو اپنے خیالات کے اظہار کی پوری پوری آزادی ہوتی تھی اور تمام فیصلے اکثریت کی رائے سے ہوتے تھے۔ یہ براہ راست جمہوریت (Direct D

جمہوریت (Democracy) کی ابتدائی شکل تھی جس میں عوام اپنی حقیقی طاقت (Sovereignty) کا استعمال خود ہی براہ راست کرتے تھے۔

سماج کی ترقی اور آبادی کے تیزی سے ساتھ بڑھنے کے ساتھ ساتھ سیاسی مسائل اور سیاسی ڈھانچے میں بھی تبدیلی لازمی تھی۔ سٹی اسٹیٹ (City State) کی جگہ تیز آبادی اور طویل رقبے والے ممالک بنے جن میں اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ملک کے سارے لوگ کسی ایک مقام پر جمع ہو کر نظام حکومت چلا سکیں۔ لہذا زمانے کے ساتھ ہی اس طرز جمہوریت نے بھی کروٹ لی اور براہ راست جمہوریت "بالواسطہ جمہوریت" میں بدل گئی اور آج سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کی کچھ ریاستوں کے علاوہ دنیا کے دوسرے جمہوری ممالک میں بالواسطہ جمہوریت ہی قائم ہے۔ "بالواسطہ جمہوریت" (Indirect Democracy) میں عوام اپنے ہی میں سے چند افراد کو منتخب کر کے ایک معینہ مدت کے لئے اس کے ہاتھوں میں نظام حکومت سونپ دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں عوام حکومت کے کاموں میں براہ راست حصہ نہ لے کر بالواسطہ حصہ لیتے ہیں لیکن ان کی حقیقی طاقت (Sovereignty) ان کے پاس محفوظ رہتی ہے اور اگر وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے منتخب کئے ہوئے نمائندے ان کے مفاد میں کام نہیں کر رہے ہیں تو وہ انہیں ہٹا کر دوسرے نمائندوں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

جمہوریت کے دو بنیادی اصول ہوتے ہیں ایک "آزادی" اور دوسرا "مساوات"۔ اس نظام حکومت میں ہر فرد کو اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ترقی کے تمام مواقع سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری آزادی ہوتی ہے۔ جمہوریت میں "ہر فرد ایک ہوتا ہے، ایک سے زیادہ کوئی بھی نہیں" کے اصول کو مکمل طریقے پر اپنایا جاتا ہے، اور مذہب، نسل، امیر، غریب اور اس قسم کی کوئی تفریق نہ کر کے ریاست کی نظر میں ہر فرد برابر ہوتا ہے اور اس کے حقوق و فرائض مساوی ہوتے۔ ہمارے ملک کے دستور میں بھی ان دونوں اصولوں کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور ایک لامذہبی (Secular) نظام قائم کر کے جمہوریت کے تمام تقاضوں کو پورا کیا گیا ہے۔ "آزادی" اور "مساوات" کے حقوق کو ایک قانونی شکل دے کر "بنیادی حقوق" میں شامل کیا گیا ہے اور اس طرح عوام کو تحریر و تقریر کی آزادی کے ساتھ ساتھ مذہبی آزادی بھی دی گئی ہے۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ آبادی کی کثرت اور ملکوں کے رقبے کے بڑھنے کی وجہ سے "براہ راست جمہوریت" کے بجائے "بالواسطہ جمہوریت" کا قیام عمل میں آیا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک اہم مسئلہ یہ بھی پیدا ہوا کہ ایک ملک کے مختلف حصوں کے رہنے والوں کے مفاد اور ان کے مختلف معاشی، سماجی، سیاسی، لسانی اور دوسرے مسائل کو کیسے حل کیا جائے۔ بعض ممالک کے سامنے جہاں الگ الگ آزاد حکومتیں قائم تھیں غیر ملکوں سے اپنے اپنے تحفظ کا مسئلہ بھی پیش ہوا۔ ان دونوں مسائل کو حل کرنے کے لئے "وفاقیت" (Federation) کے اصولوں کو اپنایا گیا۔ لیکن سچ پوچھئے تو وفاقیت کا تصور پرانا نہیں ہے۔

انسانی شعور کی ترقی اور ذہنی و سیاسی بیداری کے ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی ارتقا ہوتا رہا ہے۔ البتہ ابتدا میں ہمیں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جہاں وفاقیت کے سارے اجزا موجود ہوں اور ہم اسے صحیح معنوں میں فیڈریشن کہہ سکیں۔ پھر بھی اصول وفاقیت کی تاریخ انسانی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ فطری طور سے ہر انسان سماج میں طاقت (Power) حاصل کرنا چاہتا ہے اسی لئے اس نے ہر دور میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ جدوجہد سماج کی تنظیم سے پہلے یعنی وجود انسانی کے ساتھ ہی ساتھ کسی نہ کسی شکل میں شروع ہوئی۔ شروع میں جب انسان منظم نہ ہوا تھا وہ ایک دوسرے سے بالکل آزادانہ طریقے پر زندگی بسر کرتا تھا اور اس کا طاقت حاصل کرنے کا یہ جذبہ محض انفرادی تھا۔ ایک انسان دوسرے کو زیر کرنے اور فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ انفرادیت کا یہ دور جلد ہی ختم ہوا اور خاندانوں کی تنظیم کے ساتھ ہی ساتھ یہ جذبہ اجتماعی شکل اختیار کر گیا۔ اب اپنے نسلی و خونی رشتے کے لحاظ سے منظم خاندان ایک دوسرے خاندان کو اپنے ماتحت کرنے کی جدوجہد میں مشغول ہو گیا اور ایک طاقتور خاندان اپنے سے کمزور خاندان کو اپنے تحت کر لیتا تھا۔ مختصر یہ کہ خاندانوں کی تنظیم سے پہلے اور بعد میں بھی انسان کے سامنے اپنے وجود کو برقرار رکھنے اور اپنی حفاظت کا مسئلہ (خواہ وہ انفرادی حیثیت سے رہا ہو یا اجتماعی) موجود تھا اور وہ یقیناً اس بات کے لئے کوشاں رہا ہوگا کہ ایک ایسا سازگار اور پُرامن ماحول پیدا کیا جائے جس سے ان کے باہمی اختلافات کا خاتمہ ہو سکے۔ اس لئے کہ یہ حالات صرف چند انسانوں یا خاندانوں کے لئے ہی نفع بخش ہو سکتے تھے سارے عوام کے لئے نہیں۔ دراصل یہیں سے وفاقی اصول کی ضرورت ابتداءً غیر ارادی و غیر شعوری طور پر ہوتی ہے۔ تمام خاندانوں یا انسانوں کے سامنے اپنے مشترکہ مقصد یعنی دفاع کے لئے کچھ ایسے اصولوں کی ضرورت پیش آئی جن پر عمل کر کے وہ سب آزادانہ طریقے پر ترقی کر سکیں۔ حقیقت میں وفاقیت (Federation) کا

مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ تمام ریاستوں کے مشترکہ مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وفاقی اصولوں کی ضرورت انسان نے بالکل ابتدا ہی میں محسوس کی تھی لیکن عملی شکل میں وفاقیت (Federation) کی ابتدا یونان میں سٹی اسٹیٹ کے قائم ہونے کے بعد ہی ہوئی۔ قدیم یونان کی سٹی اسٹیٹ (City State) ایک دوسرے سے اپنے سیاسی، سماجی اور معاشی معاملات میں بالکل آزاد تھیں اور وہاں براہ راست جمہوریت (Di:ect Democracy) تھی لیکن جلد ہی بیرونی حملوں سے اپنے دفاع کے لئے ان میں متحد ہونے کا جذبہ پیدا ہوا۔ جب بھی وہ کوئی غیر ملکی خطرہ محسوس کرتی تھیں یہ تمام سٹی اسٹیٹ آپس میں مل جاتی تھیں اور اپنے مشترکہ مقصد یعنی دفاع (Defence) کے لئے وہ ایک مشترکہ (مرکزی) حکومت یا یونین کی تشکیل کر لیتی تھیں جسے وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے کچھ اختیارات دے دیتی تھیں۔ اس باہمی تنظیم اور وفاقیت کے قیام میں مذہب نے زبردست مدد دی۔ مختلف سٹی اسٹیٹ عبادت (Consmon Warship) کے لئے کسی خاص عبادت گاہ کے گرد جمع ہو جاتی تھیں اور اس طرح ان کے الگ الگ ادارے (Associations) بن جاتے تھے جنھیں (Amphic-tyony) کہتے تھے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور مذہبی ہونے کے باوجود بھی انھوں نے یونان کی سیاسی زندگی کو بہت ہی زیادہ متاثر کیا تھا۔ ان کی تنظیم میں وفاقیت کے اجزا نمایاں تھے۔ ۲۸۱ ق م میں (Achean League) بنی جس میں وفاقی اصولوں کو بہت حد تک اپنایا گیا تھا۔ تمام مفکرین اسے بالاتفاق رائے وفاقی (Federal) تسلیم کرتے ہیں۔ اسی قسم کے اور بھی ایسوسی ایشن بنے جن میں لمبارڈ لیگ (Lombard League) اور ہنزیاٹک لیگ (Henseatic League) قابل ذکر ہیں۔ ان سب میں وفاقیت کے اجزا کم و بیش موجود تھے۔ اگرچہ ان ایسوسی ایشنوں کے قیام کا مقصد تمام سٹی اسٹیٹ کا مشترکہ دفاع تھا لیکن اس کے پس منظر میں ان کا مشترکہ مذہب، مشترکہ زبان، مشترکہ سیاسی اور معاشی مسائل کو بڑا دخل تھا۔

بہر حال اگر آج کل کچھ آزاد ریاستیں اپنے مشترکہ دفاعی، سیاسی، سماجی، معاشی، نسلی یا ثقافتی اور لسانی یا ادبی مسائل کو حل کرنے کے لئے باہمی طریقے پر متحد ہو کر ایک یونین کی تشکیل کرتی ہیں اور اسے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کچھ اختیارات دے دیتی ہیں یعنی ایک مشترکہ حکومت کی تشکیل کرتی ہیں تو اسے فیڈرل گورنمنٹ (Fedral Gov t) کہتے ہیں اور اس کی تشکیل کرنے والی ریاستیں اکائیاں کہلاتی ہیں جو اپنے حدود میں پوری طرح آزاد رہتی ہیں اور سوائے ان حقوق کے جو انھوں نے فیڈرل گورنمنٹ کو دے دئے ہوں ان کے سارے اختیارات و حقوق قائم رہتے ہیں۔ ان تمام ریاستوں کی مجموعی شکل کو فیڈریشن کہا جاتا ہے۔ زیادہ تر فیڈریشن کی تشکیل اسی طریقے سے ہوئی ہے کہ کچھ آزاد ریاستوں نے مل کر ایک فیڈرل حکومت قائم کی۔ دور حاضرہ کے اولیں فیڈریشن امریکہ کو بھی ۱۳ نو آبادیات نے اسی طرح قائم کیا تھا اس کے برخلاف ۱۸۶۷ء میں کناڈا میں فیڈریشن کی تشکیل کے لئے کناڈا کو دو ریاستوں کیوبک (Quebec) اور انٹیریو (Ontario) میں تقسیم کر کے وفاقیت کو اپنایا گیا تھا۔ دراصل فیڈریشن کے قیام میں دو میں سے کوئی ایک جذبہ کارفرما ہوتا ہے یا تو کچھ آزاد ریاستیں ایک فیڈرل حکومت بنانے کی طرف راغب ہوتی ہیں جسے مرکز جو قوت[1] (Centripetal Force) کہتے ہیں اور یا ایک ملک اپنے نظام کو کامیاب کرنے کے لئے اور ملک کے مختلف خطوں کے لوگوں کے اختلافی مسائل کو حل کرنے کے لئے خود اپنے کو کچھ ریاستوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس طرح ایک ایسے فیڈریشن کی تشکیل ہوتی ہے جس کی تشکیل میں مرکز گریز قوت[2] (Centrifugal Forces) کام کرتی ہے۔

پرانے زمانے کے مقابلہ میں آج حالات بالکل بدل چکے ہیں یونان کی سٹی اسٹیٹ کے بجائے طویل رقبے اور کثیر آبادی والے ملکوں کی حکومتیں قائم ہیں بعض ملکوں میں مختلف زبانوں کے بولنے والے، مختلف مذاہب کی پیروی کرنے والے اور مختلف نظریات کے لوگ پائے جاتے ہیں جن کے لسانی، ادبی اور ثقافتی مسائل بھی جداگانہ ہیں۔ ایسے حالات میں یہ ضروری نہیں کہ واحدی حکومت (Unitary Govt) ملک کے ہر خطے کے رہنے والے عوام کے سارے مطالبات کو پورا کر سکے اس لئے آج دنیا کے اکثر جمہوری ملکوں میں فیڈریشن کے طرز

[1] جب کسی ملک کی آزاد ریاستیں اپنے تحفظ یا اور کسی مقصد سے آپس میں مل کر ایک مرکزی حکومت یا وفاقیت کو قائم کرتی ہیں۔

[2] جب ایک ملک یا ایک مرکزی طاقت اپنے کو مختلف ریاستوں میں تقسیم کر کے وفاقی نظام قائم کرتی ہے۔

صبحِ جمہور

ساغر مہدی

تجھ کو کیا نذر کروں روحِ چمن جانِ وطن
تیرے قدموں پہ نچھاور مرے دل کی دھڑکن
صبحِ کاشی کی پھبن، شامِ اودھ کا جوبن
مسکراتے ہوئے ہنستے ہوئے یہ دشت و دمن

مادرِ ہند کی جاگی ہوئی تقدیر ہے تو
ظلم کے سر پہ چمکتی ہوئی شمشیر ہے تو
ذہنِ گاندھی کی درخشانی تعمیر ہے تو
آرزوؤں کے حسیں خواب کی تعبیر ہے تو

تیری آہٹ سے فرنگی کا بھرم ٹوٹ گیا
تیری خوشبو سے ہر اک حلقۂ غم ٹوٹ گیا
ظلم کی طاقتِ مکروہ کا دم ٹوٹ گیا
جبر و بیداد کا وہ دستِ ستم ٹوٹ گیا

آج آکاش سے یہ پاک زمیں اونچی ہے
ایشیا کی نگہِ عزم و یقیں اونچی ہے
شاہ راہوں سے رہِ خاک نشیں اونچی ہے
فخر سے آج ہمالہ کی جبیں اونچی ہے

آج عالم میں مساوات ترے نام سے ہے
عدل و انصاف کی مے عام ترے جام سے ہے
گلشنِ زیست میں خوشبو ترے پیغام سے ہے
جشنِ جمہور ترے کرمِ عام سے ہے

اسی سائے میں امیدوں کو جواں ہونا ہے
موجِ کم مایہ کو اک سیلِ رواں ہونا ہے
رفعتِ عشق کو سرمایۂ جاں ہونا ہے
تیرے ہاتھوں ہی سے یہ کارِ گراں ہونا ہے

اترپردیش شاہراہ ترقی پر

سنہ ۱۹۶۰ء کی تعمیری سرگرمیوں پر ایک نظر

اترپردیش میں وزارتی تبدیلی کے ساتھ سنہ ۱۹۶۰ء ختم ہوا۔ نئی وزارت نے کفایت شعاری اور نظم ونسق کی کارکردگی بہتر بنانے کو نمایاں اہمیت دینے کے عزم راسخ کے ساتھ اپنا کام شروع کیا۔ اسی زمانہ میں ریاست میں نئے گورنر کی تقرری ہوئی۔

سرحدی تحفظ اور ترقی پر اس سال خصوصی توجہ دی گئی۔ سرحدی علاقوں میں تین نئے اضلاع پتھورا گڑھ، اترکاشی اور چمولی بنائے گئے اور ان پر مشتمل ایک نیا ڈویژن یعنی اتراکھنڈ بنایا گیا۔ اس ڈویژن کو براہ راست چیف سکریٹری اور وزیر اعلیٰ کے چارج میں رکھا گیا۔ اس علاقہ کی ترقی خاص طور پر مقامی صنعت کے فروغ اور رسل و رسائل کے ذرائع کو بہتر بنانے کے لئے ریاست کے بجٹ میں مخصوص رقومات مقرر کی گئیں۔ سرحدی پہرہ داروں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور انھیں جدید ساز و سامان فراہم کیا گیا۔ ان دور افتادہ علاقوں میں زمانہ دراز سے وائرلیس یونٹیں برابر کام کر رہی ہیں۔

ریاست کے دوسرے حصوں میں بھی دفاعی اقدامات کئے گئے اور ہر سطح پر سرکاری ملازمین میں دفاع کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کے لئے بھی اقدامات کئے گئے۔

ترقیاتی سرگرمیوں میں صنعت اور بجلی کو بدستور نمایاں اہمیت حاصل رہی۔ زیر نظر سال میں ۱۴ بڑے اور درمیانی پیمانہ کی صنعتوں کے قیام کے لئے لائسنس جاری کئے گئے اور چرک ضلع مرزاپور میں بھٹیوں کی اینٹیں تیار کرنے کا ایک پلانٹ نے کام کرنا شروع کر دیا۔ ریہاند کے نزدیک ۱۸ کروڑ روپیہ کی لاگت کے ایک المونیم پلانٹ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور ریاست کی امداد باہمی شکر مل جو ریاست میں اپنی نوعیت کی دوسری مل ہے تجربہ کے طور پر چلائی گئی۔ ریاست کے تمام اضلاع کا صنعتی سروے مکمل کیا گیا اور ایک نیا ٹکنیکی اور اقتصادی سروے شروع کیا گیا۔ بریلی میں ۱۲ کروڑ روپیہ کی لاگت کی مصنوعی ربڑ فیکٹری اور مختلف چھوٹے پیمانہ کی صنعتی اسکیموں کی رفتار ترقی تسلی بخش رہی۔ ریاست میں ۸۲ کروڑ روپیہ کی لاگت سے بھاری صنعتوں کے قیام کے بارے میں مرکزی حکومت کے اعلان سے ریاست میں صنعت کاری کے امکانات روشن تر ہو گئے۔

ریاست میں صنعت کاری کی ترقی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ زیر نظر سال میں سلائی کی مشینوں، پکایا ہوا تیزہ، شکر، سیمنٹ، مٹی کے برتن اور سوتی کپڑا وغیرہ کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ ہوا۔

ہردوار گنج، جمنا ہائیڈل (دہرہ دون) اور شاردا ہائیڈل (کھٹیما) کی رفتار ترقی تسلی بخش رہی۔ ریہاند کو متھرا اور گورکھپور کے بجلی گھروں سے ملانے کے لئے کام شروع کیا گیا۔ اس کی تکمیل کے بعد مشرقی اضلاع کو مزید ۳۰ ہزار کیلوواٹ بجلی مہیا کی جا سکے گی۔ کانپور بجلی گھر میں ۱۵ ہزار کیلوواٹ کی ایک نئی یونٹ کا اضافہ کیا گیا۔ امید کی جاتی ہے کہ چند مہینوں کے اندر ۱۵ ہزار کیلوواٹ کی ایک اور یونٹ کا اضافہ ہو جائے گا۔ ریہاند کے بجلی پیدا کرنے کی پانچ یونٹوں میں سے دو یونٹیں آئندہ جون تک کام کرنے لگیں گی۔ ہر ایک یونٹ کی پیداواری صلاحیت ۵۰ ہزار کیلوواٹ ہے۔ اور ہردوار گنج بجلی گھر کی ۳۰-۳۰ ہزار کیلوواٹ کی دو یونٹوں کے آئندہ جولائی تک چالو ہو جانے کی امید ہے۔

صنعت کے ساتھ زراعتی ترقی کے بھی اقدامات کئے گئے۔ زیر نظر سال میں ۹۲ نئے ما قبل توسیعی بلاک قائم کئے گئے جن سے ۶۰ لاکھ سے زیادہ آبادی پر مشتمل مزید نو ہزار مواضعات ترقیاتی منصوبوں کے دائرہ اثر میں آ گئے۔ بہت سے بلاکوں کا درجہ بلند کیا گیا۔

دیہی نظم و نسق میں عوام کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینے کی پالیسی کے تحت غیر سرکاری افراد بلاک ڈیولپمنٹ کمیٹیوں کے چیرمین مقرر کئے گئے۔ اس سلسلہ میں بلاک کی سطح پر دو دیہی کمیٹیاں مقرر کی گئیں اور غیر سرکاری افراد ان کے چیرمین مقرر کئے گئے۔ پنچایت کی سطح پر بھی طاقت کی لامرکزیت کے لئے اس قسم کے اقدامات کئے گئے۔

لوکل سیلف گورنمنٹ کے ضمن میں زیر نظر سال کی اہم کارگزاری ریاست کے گاؤں اور شہروں میں کارپوریشنوں کا قیام ہے۔

اصلاحات اراضیات کے سلسلہ میں ایک نمایاں اقدام جوتوں کی حد کا تعین تھا۔ اس کے مطابق پانچ افراد کے ایک کنبہ کے لئے جوتوں کی حد ۴۰ ایکڑ آراضی مقرر کی گئی۔ زیر نظر سال میں لگانوں اور اراضی [illegible] اضافہ [illegible] اراضیات [illegible] کاغذات کی درستی [illegible] ریاست کی آمدنی میں تقریباً ۵ لاکھ روپیہ سالانہ کا اضافہ ہوا [illegible] روپیہ کی [illegible] کا پتہ چلا۔

زیر نظر سال میں تحریک امداد باہمی کی رفتار ترقی حوصلہ افزا رہی۔ [illegible] اغراض کے لئے ۵۰ ہزار [illegible] اور قرضہ امداد باہمی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا۔ [illegible] امداد باہمی انجمنیں بھی قائم کی گئیں علاوہ ازیں ایک مرکزی [illegible] بینک بھی قائم کیا گیا۔

آبپاشی کی ترقی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ زیر نظر سال میں ۱۹ لاکھ ایکڑ آراضی سیراب کی گئی جس سے ایک ریکارڈ قائم کیا گیا۔

اناج کی پیداوار پر زیر نظر سال میں خصوصی توجہ دی گئی۔ ۱۹۵۷ء ۱۹۵۸ء، ۱۹۵۹ء کے مقابلہ میں ۱۹۶۰ء میں اناج کی پیداوار میں ۲۷ لاکھ، ایک لاکھ اور ۴ لاکھ ٹن کا اضافہ ہوا گنے کی پیداوار میں بھی کافی اضافہ ہوا جس سے شکر ملوں میں ۲۸٫۴۴ کروڑ من گنے کی پرائی ہوئی اور ۲٫۱۲ لاکھ ٹن شکر پیدا ہوئی۔

زراعتی ترقی کے ضمن میں نمایاں کارنامہ زراعتی یونیورسٹی کا وزیر اعظم کے ہاتھوں افتتاح ہے۔ اس کا پہلا سیشن گزشتہ جولائی سے شروع ہوگیا ہے اور مختلف علاقوں کے لئے موزوں فصلوں کی دریافت اور تقسیم کے لئے ہر ایک ترقیاتی بلاک کے علاقہ میں ایک تحقیقی فارم کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ ایسے فارم سو مقامات پر قائم کئے جاچکے ہیں ضلع علی گڑھ میں رہبر منصوبہ کے تحت کام شروع ہوگیا۔ ریاست کی ۹ منڈیوں میں ماپ تول وغیرہ سے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لئے اقدامات کئے گئے۔

ریاستی حکومت نے جو مزدور کے مسائل کے متعلق اپنے ترقی پسند نقطہ نظر کے لئے مشہور ہے کپڑا ملوں کے مزدوروں کی اجرت میں اضافہ سے متعلق مرکزی اجرت بورڈ کی تجویز کو عملی جامہ پہنایا۔ نینی تال میں منعقدہ سہ باہمی کانفرنس میں کپڑا ملوں کے مزدوروں کی اجرت میں ۲ روپیہ سے لے کر ۸ روپیہ تک کا اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۹۵۹ء-۶۰ء کے پرائی کے سیزن کے لئے شکر ملوں کے مزدوروں کو مجموعی طور پر ۵۔۱۰ لاکھ روپیہ بطور بونس دینے کا اعلان کیا گیا۔ انجنیئرنگ صنعت پر کم از کم اجرت سے متعلق قانون کا اطلاق کیا گیا اور گنے کے کارخانوں کے مزدوروں کو پراویڈنٹ فنڈ کی سہولت بہم پہنچائی گئی۔ ریاست میں ۲ روزگار دفتروں کا قیام مزدوروں کی فلاح کے لئے ایک اہم اقدام تھا۔

پلوں اور سڑکوں کی تعمیرات کا کام زوروں پر جاری رہا۔ سرحدی علاقہ کے علاوہ زیر نظر سال کے آخر تک ۱۴ ہزار میل لمبی سڑکوں کی تعمیر مکمل کی گئی اور ۴۰ پلوں کی تعمیر کا کام پروگرام کے مطابق جاری رہا۔ زیر نظر سال میں چھوٹے پلوں کی تعمیر مکمل ہوئی۔

اتر پردیش زیر نظر سال میں قدرتی آفات کا بھی شکار رہا۔ سیلابات سے ریاست میں زبردست تباہ کاری ہوئی جس سے ۳ سے زیادہ افراد اور ۲۷۰ مویشی ہلاک ہوئے اور چار لاکھ سے زیادہ مکانات کو زبردست نقصان پہنچا۔ لکھنؤ میں جہاں سیلاب سے زبردست تباہ کاری ہوئی امدادی کاموں کے لئے فوج کو طلب کرنا پڑا اور بڑے پیمانہ پر امدادی اقدامات کئے گئے۔ سیلاب زدگان کو مفت امداد کے طور پر ایک کروڑ ۲۸ لاکھ روپیہ تقسیم کیا گیا۔

زیر نظر سال میں طلبا کی تحریکوں، مرکزی حکومت کے ملازمین کی ہڑتال اور سوشلسٹ ستیہ گرہ سے نظم ونسق کے ذمہ داروں کو نئی ذمہ داریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنی نئی ذمہ داریوں سے حسن وخوبی عہدہ برآ ہوئے۔

ریاستی حکومت نے زیر نظر سال میں تین اہم کمیشن یعنی پولیس کمیشن یونیورسٹیوں سے متعلق کمیشن اور ثانوی تعلیم کمیشن مقرر کئے۔ محکمہ پولیس نے جیل کی اصلاحات کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی۔ ماتحت عدالتوں میں بدعنوانیوں کے اسباب کا پتہ لگانے کے لئے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی اس نے حکومت کو اپنی عبوری رپورٹ پیش کردی۔

ہندی کے سلسلہ میں ہائی کورٹ سے کہا گیا کہ وہ ماتحت اور ضلع عدالتوں میں ہندی رائج کرے۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ کابینہ کے تمام کام ہندی میں کئے جائیں گے۔

بے گھر اشخاص کے ذکر کے بغیر کسی سال کی کھیتی باڑی ترقی کا جائزہ مکمل نہیں ہوگا۔ ریاست میں مشرقی پاکستان کے ۲۶۹ بے گھر کنبوں کو ترائی کے علاقہ میں زمینوں پر بسایا گیا اور مزید ۷ ایسے گھر کنبوں کی آبادکاری کے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

نئی حکومت نے عوام کے مطالبہ کے پیش نظر عارضی ضلع پریشدوں کے لئے غیر سرکاری چیرمین کی تقرری کے لئے ایک آرڈی نینس جاری کیا

آئندہ صفحات میں حکومت کی تمام تعمیری سرگرمیوں کی مزید تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔

اصلاح آراضیات

خاتمہ زمینداری اور اصلاح آراضیات سے متعلق قانون مجریہ ۱۹۵۰ء سے اصلاح آراضیات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس کی تکمیل زیر نظر سال میں جوتوں کی حد کے تعین سے متعلق ایکٹ ۱۹۶۰ء اور کماؤں اور اتراکھنڈ خاتمہ زمینداری قانون ۱۹۶۰ء کی منظوری کے ذریعہ ہوا

جوتوں کی حد کے تعین سے متعلق قانون کے تحت پانچ افراد تک کے ایک کنبہ کے لئے جوتوں کی حد ۴۰ ایکڑ اچھے قسم کی آراضی مقرر کی گئی ہے۔ پانچ سے زیادہ افراد پر مشتمل کنبہ کی صورت میں ہر ایک زائد ممبر کو آٹھ ایکڑ آراضی دی جائے گی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کنبہ کے پاس کل آراضی ۶۴ ایکڑ سے زیادہ نہ ہو

داخل خارج کے معاملات کے جلد تصفیہ کے لئے مجالس قانون ساز میں ایک بل پیش کیا گیا اس بل کو کونسل نے پاس کر دیا ہے اب اسے اسمبلی کی منظوری حاصل کرنا باقی ہے۔

زیر نظر سال میں مزید تحصیلوں اور تین اضلاع میں جوتوں کی چک بندی کی اسکیم شروع کی گئی۔ اس اسکیم کے دائرہ اثر میں اب تک ۳۵ اضلاع کی ۵۸ تحصیلوں میں ۲۲۸۸۲ مواضعات آ گئے ہیں۔ گزشتہ اکتوبر کے آخر تک ۱۱۴۴۵ مواضعات میں چک بنائے گئے اور ۱۱۱۱۰ مواضعات میں چکوں پر قبضہ دلایا گیا۔ چک بندی سے پہلے مزروعہ رقبہ ۱۱۳۹۱۸۲۱ پلاٹوں میں منقسم تھا۔ اسکیم کے تحت ان پلاٹوں کی تعداد کم کر کے ۲۰۵۲۷۹۵ کر دی گئی۔

جوتوں کی چک بندی کے ضمن میں ایک نیا اقدام یہ کیا گیا کہ مستطیل چک بنائے جائیں۔ یہ محسوس کیا گیا کہ مستطیل چک سے نہ صرف کھاتہ داروں کو بہت زیادہ سہولتیں فراہم ہو جائیں گی بلکہ اس سے ترقیاتی کاموں جیسے سڑکوں اور نالیوں کی تعمیر بھی بہت آسان ہو جائے گی ابتدا میں یہ نئی اسکیم ۱۵ منتخب اضلاع کی ایک ایک تحصیل میں شروع کی گئی گزشتہ ستمبر کے آخر تک ۴۹۶ مواضعات میں ۲۵ ۱۲۵ ایکڑ کے مستطیل چک بنائے گئے ۸۸۴ مواضعات میں حد بندی کے پتھر نصب کئے گئے

اس اسکیم سے جہاں ایک طرف عام طور پر کسانوں اور خاص طور پر کھاتہ داروں کو فائدہ پہنچا ہے وہاں دوسری طرف اب تک حکومت کی مالگزاری میں بھی تقریباً ۲۷ لاکھ روپیہ کا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ ایسی آراضیات پر مالگزاری عائد کی گئی ہے جن پر پہلے مالگزاری عائد نہیں کی گئی تھی لیکن کاغذات کی تنقیح کے بعد یہ پتہ چلا کہ ان پر مالگزاری عائد ہونا چاہیئے۔

پہاڑی علاقہ میں زیر نظر سال میں تین نئے اضلاع یعنی چمولی پتھوراگڑھ اور اترکاشی بنائے گئے۔ یہ اضلاع براہ راست چیف سکریٹری کے چارج میں رکھے گئے ہیں۔

زیر نظر سال میں پانچ اضلاع میں سروے اور کاغذات کی درستی کا کام مکمل ہو گیا اور دو اضلاع میں قریب تکمیل تھا۔ ضلع مرزاپور کے ۳۹۵ مواضعات میں سروے کا کام شروع کیا گیا اور اس سلسلہ میں کافی کام ہو چکا ہے۔ کماؤں اور اتراکھنڈ کے ڈویژنوں کی ۲۱ تحصیلوں میں سے ۱۶ میں یہ کام ہو رہا ہے۔

مالگزاری کے مطالبہ کی درستی سے متعلق اسکیم جو گزشتہ سال شروع کی گئی تھی زیر نظر سال میں جاری رہی۔ اس اسکیم کے تحت کئے گئے اقدامات کے نتیجہ میں مالگزاری میں کوئی اضافہ کئے بغیر مالگزاری کے سالانہ مطالبہ میں تقریباً ۵۸۶۰۰۰ روپیہ کا اضافہ ہوا۔

زیر نظر سال میں سابق زمینداروں کو خاتمہ زمینداری معاوضہ کے طور پر ۶۹۹۲۴۳۷ روپیہ نقد اور بانڈوں کی صورت میں ادا کیا گیا جس سے گزشتہ اگست کے اخیر تک اس ضمن میں ادا کی گئی مجموعی رقم ۶۴۴۴۰۷۹۰ روپیہ ہو گئی۔ مذکورہ مدت تک سابق زمینداروں کو بحالیاتی امداد کے طور پر ۱۲۷۹۲۲۰۴۰ روپیہ ادا کیا گیا۔ زیر نظر سال میں اوقاف ٹرسٹ اور خیراتی اوقاف کو عبوری سالیانہ کے طور پر ۹۱۵۹۶۲ روپیہ ادا کیا گیا۔

سابق ادھیواسیوں کے کھاتہ داروں کو معاوضہ کے طور پر ۱۱۷۸۸۹۸ روپیہ نقد اور بانڈوں کی صورت میں ادا کیا گیا۔ جس سے گزشتہ ستمبر کے آخر تک اس ضمن میں ادا کی گئی مجموعی رقم ۶۴۶۶۲ ۶۳ روپیہ ہو گئی۔

ڈسٹرکٹ گزیٹیروں پر نظر ثانی

ڈسٹرکٹ گزیٹیروں پر نظر ثانی کرنے کا کام جاری رہا ضلع لکھنؤ کا نیا گزیٹیر شائع ہو چکا ہے اور ضلع فیض آباد کا نیا گزیٹیر پریس میں بھیج دیا گیا ہے اور سیتا پور اور بارہ بنکی کے اضلاع کے گزیٹیروں کے مسودے مرکزی حکومت نے قطعی طور پر منظور کر لئے ہیں۔ آگرہ اور وارانسی کے نئے گزیٹیروں کے مسودے تیار کئے جا رہے ہیں۔

قدرتی آفات

قدرتی آفات سے ہر سال کافی تباہ کاری ہوتی ہے۔ زیر نظر سال میں کچھ اضلاع میں زبردست سیلاب آئے جو اپنی تباہ کاری اور غضب کے اعتبار سے بے مثال تھے۔ اکتوبر میں گومتی میں سیلاب سے خاص طور پر لکھنؤ، سیتاپور اور جونپور کے اضلاع میں زبردست تباہی ہوئی۔ اگرچہ سیلاب سے تمام ریاست متاثر ہوئی لیکن ۲۱ اضلاع کو زبردست نقصان پہنچا۔

اس سال کے سیلاب سے ۳۱۳ افراد اور ۲،۱۵ مویشی ہلاک ہوئے اور اس سے فصلوں اور ۴۳۴۵۶۰ مکانات کو زبردست نقصان پہنچا۔

متاثرہ اشخاص کو مفت امداد قرضہ اور تقاوی کی سہولتیں دینے کے لئے ریاستی حکومت نے ۱۲۸۰۹۰۰۰ روپیہ کی رقم منظور کی۔ علاوہ از یں سرکاری بقایا کی وصولی ملتوی کر دی گئی۔ حکومت نے سیلاب زدگاں کی بحالی کے کام کو اولیت دی۔

زیر نظر سال میں ۷۰ اضلاع سے آتش زدگی کے واقعات کی اطلاع ملی جس میں ۴۷۴ افراد اور ۲۸۰۴ مویشی ہلاک ہو گئے اور ۴۸۱۲۳ مکانات مکمل طور پر برباد ہو گئے۔ ریاستی حکومت نے مصیبت زدگان کو مفت امداد دینے کے لئے ۳۵۴۵ روپیہ کی رقم منظور کی۔

جنگلات

زیر نظر سال میں انڈین فارسٹ (یو۔پی ایکٹ) وضع کیا گیا جس کے تحت حکومت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایسے جنگلات کے علاقوں کو جن کی ترقی مفاد عامہ میں ضروری ہے ابتدا میں ۱۵ سال کے لئے اپنے قبضہ اور انتظام میں لے سکتی ہے۔

زیر نظر سال میں کمایوں میں ۱۱،۱۶ پھل کے درخت لگائے گئے

جس سے دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت لگائے گئے پھل کے درختوں کی تعداد بڑھ کر ۱۶۸۰۰۰ ہو گئی۔

زیر نظر سال میں ۲۹۸۰ سے زائد ایکڑ کے رقبہ میں صنعتی اہمیت کے درخت لگائے گئے۔ نجی جنگلات کے انتظام کی اسکیم کے تحت ۱۳۵۲ ایکڑ کے رقبہ میں درخت لگائے گئے۔

زیر نظر سال میں گزشتہ ستمبر کے آخر تک ۱۸۵ میل لمبی نئی موٹر سڑکیں تعمیر کی گئیں اور ۲۷۸ میل لمبی ٹیلیفون کی لائنیں دوڑائی گئیں جس سے موٹر سڑکوں اور ٹیلیفون لائنوں کی مجموعی لمبائی بڑھ کر بالترتیب ۵۵ اور ۹ ۲۷ میل ہو گئی۔

سہارنپور اور مظفر نگر کے اضلاع میں جنگل لگانے کی اسکیم کے تحت ۱۰۸۰ ایکڑ کے رقبہ میں درخت لگائے گئے جس سے ایسا رقبہ بڑھ کر چار ہزار ایکڑ ہو گیا جس میں دوسرے منصوبہ کے تحت درخت لگائے گئے۔

اجتماعی ترقی

زیر نظر سال میں ۹۲ نئے ماقبل توسیعی بلاک قائم کئے گئے اور ۱۷ بلاکوں کو پہلے مرحلہ کے بلاکوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ سال کے آخر میں ریاست میں کل ۵۹۸ بلاک دیہی عوام کو خوشحال بنانے کے لئے کام کر رہے تھے۔

ترقیاتی کاموں میں عوام کی موثر شرکت کے لئے بلاک مشاورتی کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی اور ان کو بلاک ترقیاتی کمیٹیوں میں تبدیل کر دیا گیا علاوہ ازیں ہر ایک بلاک میں دو ذیلی کمیٹیاں یعنی زراعتی پیداوار کمیٹی اور بلاک فلاح کمیٹی بنائی گئیں۔ عوام میں منصوبہ کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کے لئے پنچایت کی سطح پر بھی اس قسم کی دو کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی۔

امداد باہمی

زیر نظر سال میں تقریباً ۵ ہزار نئی خدمتی امداد باہمی انجمنوں کی تشکیل کے علاوہ ایک مرکزی آراضی رہن بنک بھی قائم کیا گیا جس کے ذریعہ زمین کی بازیابی اور ترقی۔ پرانے قرضوں کی ادائیگی اور بھاری اوزاروں کی خریداری وغیرہ کے لئے طویل مدت کے قرضے دیئے جاتے ہیں۔ اس بنک کی شاخیں ۲۵ اضلاع میں قائم ہیں۔ اس وقت ۶۵ ہزار گرام سبھاؤں میں قرضہ کی سہولتیں مہیا ہیں جن سے تقریباً ۲۰ لاکھ کنبے مستفید ہو رہے ہیں جبکہ دوسرے منصوبہ کے آغاز میں ایسے کنبوں کی تعداد تقریباً ۱۰ لاکھ تھی۔ امداد با

گئیں اور ان کو کامیاب اور موثر بنانے کے لئے گرام سہایکوں کی تربیت کا بندوبست بنایا گیا۔

مرکزی حکومت کی حمایت سے فورڈ فاؤنڈیشن کی امداد سے ایک رہبر منصوبہ شروع کرنے کے لئے ضلع علی گڑھ کا انتخاب کیا گیا۔ زیر نظر سال میں اس اسکیم کے تحت کام بھی شروع کیا گیا جس کا اصل مقصد گیہوں کی پیداوار بڑھانی ہے۔

زیر نظر سال میں اتر پردیش کے دلیقہ سے گیہوں کی کاشت کو مقبول بنانے اور اس کی ہمت افزائی کے اقدامات کئے گئے

ریاست میں ۱۱۴۲ ایکڑ میں مٹی کے تحفظ کے اقدامات کئے گئے اور ۱۱۴۳۴ ایکڑ کے رقبہ میں نئے باغات لگائے گئے۔ زیر نظر سال میں اکتوبر کے آخر تک ۴۸۵۰ ایکڑ کے رقبہ پر مشتمل پرانے باغات کی درستی کی گئی۔

زیر نظر سال میں پانچ مارکیٹنگ سرکل آفس لکھنؤ، کانپور، بریلی، ہاپڑ اور وارانسی میں قائم کئے گئے اور ۱۰۹ منڈیوں میں بازار بھاؤ وغیرہ سے متعلق معلومات بہم پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔

گورکھپور زراعتی یونیورسٹی کا پہلا سیشن اس سال جولائی سے شروع ہو گیا۔

نگہداشت مولشیان

زیر نظر سال میں مولشیوں کی نسل کو بہتر بنانے مولشیوں کی بیماریوں کی روک تھام اور عمدہ چارے کی فراہمی کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اس ضمن میں زیر نظر مدت میں بہت سی نئی اسکیمیں شروع کی گئیں جس سے مولشیوں اور مچھلیوں کی ترقی سے متعلق اسکیموں کی تعداد بڑھ کر ۶۲۳ ہو گئی۔

ریاست میں مصنوعی افزائش نسل کے ۸۳ مرکزوں اور ۱۰۰۰ ذیلی مرکزوں کے ذریعے ۱۰۸۸۱۵ مولشیوں کو گابھن کیا گیا۔ اور افزائش نسل کے لئے ۴۸۷ سانڈ اور ۳۲۷ بھینسے بہم پہنچائے گئے۔ ریاست کے گیارہ مرکزوں میں عمدہ نسل کے تقریباً ۵۲۷ مولشیوں کی پرورش کی گئی۔

مولشیوں کی بیماریوں کی روک تھام کے لئے ۶٫۸ لاکھ سے زیادہ مولشیوں کو رنڈرپیسٹ کے ٹیکے دیے گئے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ۱۹۶۱-۶۲ء کے آخر تک ریاست میں مولشیوں کے ۱۸ نئے اسپتال قائم کئے جائیں اور مزید ۱۸ اسپتالوں کو صوبائی بنایا جائے۔

جانوروں کی لاش کو کام میں لانے سے متعلق اسکیم کے تحت چار نئی امداد باہمی انجمنیں قائم کی گئیں جس سے ایسی انجمنوں کی تعداد بڑھ کر ۳۲ ہو گئی۔

مچھلیوں کی ترقی کے لئے ضلع لکھنؤ میں کریلا جھیل میں ایک نیا مچھلی فارم قائم کیا گیا۔ اور مچھلیوں کی پرورش گاہ کے لئے ۲۷ تالاب حاصل کئے گئے اور ۴۴ پرورش گاہوں کو بہتر بنایا گیا۔ پانچ تالابوں میں ۱۵۲۶۶۱۱ بیج مچھلیاں چھوڑی گئیں۔ ضلع جونپور میں گوجر تال کے مچھلی فارم میں ۱۲۴۰۰۰ بیج مچھلیاں چھوڑی گئیں۔ مختلف فارموں اور تالابوں میں مجموعی طور پر ۱۵۲٫۵ لاکھ سے زیادہ بیج مچھلیاں چھوڑی گئیں جس سے ۲۵۵۷۰۸ روپیہ کا خالص منافع ہوا۔

نجی افراد، گرام سماج اور قومی توسیعی سروس بلاکوں کو سستی شرح پر کل ۱۷٫۸۶ لاکھ روپیہ کی مالیت کی بیج مچھلیاں فراہم کی گئیں۔ ماہی گیروں کی ایک درجن امداد باہمی انجمنوں کو ۷ ہزار روپیہ کی غیر متوازی مالی امداد دی گئی۔

صنعت

زیر نظر سال میں ریاست میں صنعت کاری کے ضمن میں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں ان میں اہم یہ ہیں۔ ریاست کے تین مقامات پر ۸۲ کروڑ روپیہ کی مجموعی لاگت سے سرکاری حلقہ میں بڑے صنعتی کارخانوں کے قیام سے متعلق مرکزی حکومت کا اعلان ۴۰ نئے درمیانی اور بڑے پیمانے کے صنعتی واحدوں کے قیام کے لئے لائسنسوں کی منظوری۔ چرک میں بھٹوں میں استعمال کی جانے والی اینٹیں تیار کرنے کے پلانٹ کا چالو ہونا۔ باغپت کی دوسری امداد باہمی شکر مل میں تجربہ کے طور پر کام شروع ہونا۔ ہیری میں ۱۸ کروڑ روپیہ کی لاگت سے المونیم پلانٹ اور بریلی میں ۱۲ کروڑ روپیہ کی لاگت کی مصنوعی ربر فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھنا اور کانپور میں امریکہ کی امداد سے ۵ کروڑ روپیہ کی لاگت سے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کا قیام۔

علاوہ ازیں زیر نظر سال کے اہم کارناموں میں ریاست میں پہلی بار کھادی اور دیہی صنعتوں کے لئے قانونی بورڈ کی تشکیل۔ ریاست کے تمام اضلاع کے تفصیلی صنعتی سروے کی تکمیل اور صنعتوں سے متعلق ریاست کے تیسرے پنجسالہ منصوبے کے لئے عارضی طور پر ۴۰٫۲۶ کروڑ روپیہ مخصوص کرنا شامل ہیں۔

ریاست میں قائم کئے جانے والے تین صنعتی کارخانے یہ ہیں۔ روسی

امداد سے رستی کمیشن میں ۱۰ کروڑ روپیہ کی لاگت کی اینٹی بائیوٹکس فیکٹری ۔ ۲۷ کروڑ روپیہ کی لاگت کی کیمیاوی کھاد کی فیکٹری اور ۵ ۴ کروڑ روپیہ کی لاگت کی بجلی کی بھاری مشینوں کی فیکٹری

درمیانی اور بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی کے لئے مناسب محل وقوع کے انتخاب کے لئے ایک تکنکی اور اقتصادی سروے شروع کیا گیا ریاست میں گذشتہ سال کے دوران میں تقریباً ۲۶ ۳ نئے صنعتی واحدوں کا قیام عمل میں آیا

ریاست میں ۱۹۵۹ء کے مقابلہ میں ۱۹۶۰ء میں سلائی کی مشینوں کی پیداوار میں ۹ فیصدی ۔ کمائے ہوئے چمڑہ میں ۶۸ فیصدی شکر میں ۳٫۱۶ فیصدی سمنٹ میں ۶٫۶ ا فیصدی دیاسلائی میں ۹٫۴ ا فیصدی اور سوتی کپڑے میں ۴٫۴ فیصدی اضافہ ہوا ۔

ریاست میں سریع صنعت کاری کے پیش نظر بجلی کی کھپت میں بھی ۱٫۱۶ فیصدی اضافہ ہوا ۔

گورمنٹ پریسیزن انسٹرومنٹس فیکٹری لکھنؤ نے دسمبر ۱۹۶۰ء تک ۵ ۸ ۰ ۳ ۱ ۰ ا دائرمیٹر ۔ ۱۸ ۱۴ خوردبینیں اور ۵ ۴ ۲ ا سٹیتھسکوپ تیار کئے ۔

ریاست میں اکتوبر ۱۹۶۰ء تک گھریلو اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے حلقہ میں ۱٫۰۵ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ۵ ۸ اسکیمیں اور پس ماندہ علاقوں کے لئے ۹۱٫۰۰ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ۱ ا سکیموں پر عملدرآمد شروع کیا گیا ۔

ریاست کے پہاڑی اور دوسرے پس ماندہ علاقوں میں مزید پانچ صنعتی بستیوں کے قیام کے لئے کام شروع کیا گیا ۔

گذشتہ اکتوبر تک چھوٹے صنعت کاروں کو قسطوں پر مشینوں کی خریداری کے لئے ۲۹٫۲۴ لاکھ روپیہ کی مالیت کی مشینوں کی منظوری دی گئی اور ان کو مزید ۲۵٫۱۳ لاکھ روپیہ قرضہ اور مالی امداد کے طور پر دیا گیا ۔

ہتھ کرگھا صنعت نے نومبر ۱۹۶۰ء تک ۱۳٫۶ کروڑ روپیہ کی مالیت کا کپڑا تیار کیا ۔ اور ریشم سازی کی صنعت کی مزید پانچ اضلاع میں توسیع کی گئی ۔

بجلی کے منصوبے

بجلی کی پیداوار بڑھانے کے لئے ریاستی بجلی بورڈ کے ذریعہ زیر نظر سال میں اقدامات کئے گئے ۔ ہردوا گنج ۔ توسیعی منصوبہ ۔ ماتا ٹیلہ بجلی منصوبہ اور جمنا ہائیڈرو الیکٹرک سکیم (مرحلہ اول) پر دوبارہ کام شروع کیا گیا ۔

ہردوا گنج بجلی گھر کی تعمیر کے لئے جس میں ۳۰ ۔ ۳ ہزار کیلوواٹ کی دو پونٹیں لگائی جائیں گی تیزی سے کام ہو رہا ہے ۔ امید کی جاتی ہے کہ پہلی یونٹ اور دوسری یونٹ میں بالترتیب مئی ۱۹۶۲ء اور جون یا جولائی ۱۹۶۲ء میں کام شروع ہو جائے گا ۔

ماتا ٹیلہ منصوبہ کے تقریباً تین سال کے اندر مکمل ہو جانے کی امید ہے اس منصوبہ کی امکانی پیداواری صلاحیت ۳ ہزار کیلوواٹ بجلی ہے ۔ اس منصوبے سے پورے بندیلکھنڈ کو بجلی مہیا ہو سکے گی ۔

جمنا ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم (پہلا مرحلہ) پر کام شروع ہو گیا ہے ۔ اس اسکیم کے ذریعہ ۲۵ ہزار کیلوواٹ بجلی پیدا ہوگی ۔ علاوہ ازیں سیریز میں اس کے ذریعہ تقریباً ۵۵ ہزار کیلوواٹ بجلی پیدا ہوگی ۔ اس اسکیم کے تقریباً ۴ سال میں مکمل ہونے کی امید ہے ۔

کانپور میں حال میں ۱۵ ہزار کیلوواٹ کی ایک یونٹ چالو کی گئی ہے اور اتنی ہی پیداواری صلاحیت کی دوسری یونٹ کے لئے آرڈر دیئے گئے ہیں آئندہ تین مہینوں میں کانپور بجلی گھر کی بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت میں ہزار کیلوواٹ اور بعد میں مزید دو ہزار کیلوواٹ کا اضافہ کرنے کے لئے کوشش کی جا رہی ہے

شاردا ۔ دیوہا معاون نہر کا کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے ۔

ریاستی بجلی بورڈ نے مغربی اتر پردیش میں بہت سے مقامات پر لئے تمام ڈیزل سیٹوں کو چالو کر دیا ہے ۔

ریہاند منصوبہ جو ریاست کا بجلی کا سب سے بڑا منصوبہ ہے پر تیزی سے کام جاری ہے امید کی جاتی ہے کہ ۵۰ ۔ ۵ ہزار کیلوواٹ کی پیداواری صلاحیت کی پہلی دو مشینیں اس سال جون کے آخر تک اور بقیہ تین مشینیں اکتوبر تک کام کرنے لگیں گی ۔

ریہاند کو مئو اور گورکھپور کے تھرمل اسٹیشنوں سے ملانے کے لئے ایک منصوبہ شروع کیا جا چکا ہے ۔ اس منصوبہ کی تکمیل سے مزید ۳ ہزار کیلوواٹ بجلی دستیاب ہو سکے گی ۔

مزدور

زیر نظر سال میں کپڑا اور شکر کی صنعت سے متعلق سہ جماعتی کانفرنس نے اجرت میں اضافہ اور بونس کے پیچیدہ اور پریشان کن مسئلہ کو حل کیا ۔

ٹیکسٹائل کی سہ جماعتی کانفرنس نے بہ اتفاق رائے اجرت بورڈ سے متعلق مرکزی اجرت بورڈ کی سفارش کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا کانفرنس

نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اس کی تفصیلات ریاستی حکومت طے کرے۔ شکر کی صنعت سے متعلق سہ جماعتی کانفرنس نے ریاستی حکومت سے بونس کے متعلق بہ ملائی سفارش کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاستی حکومت نے کپڑا مل کے مزدوروں کی اجرت میں ۶ روپیہ سے لے کر ۸ روپیہ تک کے اضافہ اور ۱۹۵۹ء کے پرانی سیزن کے لئے شکر مل کے مزدوروں کو بونس کے طور پر تقریباً ۵.۱۰ لاکھ روپیہ ادائیگی کے لئے احکامات جاری کئے۔

اس سال میں اونی قالین کی صنعت کے مزدوروں نیز گھرے کام سے متعلق قانون کا اطلاق کیا گیا ملوں کے گنے کے فارموں پر کام کرنے والے مزدوروں پر پراویڈنٹ فنڈ کی اسکیم کا اطلاق کیا گیا۔ اور مزدوروں کی فلاح کے مزید تین مرکز، روزگار دفتر پیشہ دارانہ رہنمائی کے آٹھ واحدے اور ۱۰۰ صنعتی تربیتی ادارے قائم کئے گئے۔

ملازمین کی ریاستی بیمہ اسکیم اور پیرانہ سالی پنشن اسکیم سے بالترتیب ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ مزدور اور ۷ ہزار سے زیادہ بے سہارا اشخاص مستفید ہوئے۔

مزدوروں کے لئے تعمیر مکانات کی سکیموں کی رفتار ترقی تسلی بخش رہی تعمیر مکانات کی اسکیم کے تحت جس کے لئے حکومت نے مالی امداد دی مجموعی طور پر تقریباً ۲۲ ہزار اور شکر ملوں کے مزدوروں کے لئے تعمیر مکانات کی سکیم کے تحت ۱۰۴ کوارٹر تعمیر کئے گئے۔

نئے روزگار دفاتر کے قیام سے اتراکھنڈ کے تین نئے ضلعوں کو چھوڑ کر ریاست کے ہر ضلع میں ایک روزگار دفتر قائم ہوگیا۔ لکھنؤ۔ الہ آباد۔ آگرہ کانپور۔ میرٹھ الموڑہ جھانسی۔ گورکھپور اور بریلی میں پیشہ ورانہ رہنمائی کے واحدے کام کر رہے ہیں۔ دو نئے صنعتی تربیتی اداروں کے قیام سے ریاست میں ایسے اداروں کی تعداد بڑھ کر ۱۵ ہوگئی۔ ان اداروں کے ذریعہ تقریباً ۶ ہزار لڑکوں اور لڑکیوں کو ۲۰ انجینیرنگ اور ۱۲ غیر انجینیرنگ پیشوں کی تربیت دی جاتی ہے۔

نقل و حمل

ریاست میں گزشتہ ۳۰ ستمبر کو ۲۰۲۹ روڈویز بسیں ۶۰۰ راستوں پر چل رہی تھیں۔

پٹرول سے چلنے والی پرانی بسوں کی جگہ جدید طرز کی ڈیزل بسیں چلائی جا رہی ہیں۔ ۱۹۵۶-۵۷ء میں ان بسوں کے ذریعہ چھ کروڑ سے زیادہ اشخاص نے سفر کیا تھا۔ ۱۹۵۹-۶۰ء میں مسافروں کی تعداد بڑھ کر ۱۱ کروڑ سے زیادہ ہوگئی روڈویز بسیں سال میں اوسطاً ۸۰۰ لاکھ میل کی مسافت طے کرتی ہیں۔ میلوں تہواروں اور قومی اہمیت کے موقعوں پر اسپیشل بس سروس کا انتظام کیا جاتا ہے۔

لکھنؤ۔ الہ آباد۔ بریلی۔ آگرہ۔ اور وارانسی میں سٹی بس سروس کے ذریعہ عوام کو آمد و رفت کی سہولتیں بہم پہنچائی جا رہی ہیں

ریاست بھر میں روڈویز کے ۴۵ ورکشاپ ہیں اور کانپور میں ایک مرکزی ورکشاپ ہے۔

نجی حلقہ میں روڈویز ٹھیکوں کے اجرا میں فیاضی سے کام لیا گیا جس سے ریاست میں نقل و حمل کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے میں مدد ملی۔

آبکاری

ریاست کے ۱۱ اضلاع یعنی فرخ آباد۔ ایٹہ۔ مین پوری۔ بدایوں بلند شہر۔ سلطانپور۔ حمیر پور۔ اناؤ۔ کانپور۔ فتحپور۔ رائے بریلی اور اودے کی ریاست کے تین شہروں یعنی ہردوار۔ رشی کیش اور وارانسی میں نشہ بندی اسکیم نافذ رہی۔

سڑکیں اور پل

ریاست میں گزشتہ مارچ کے آخر تک ۴۴۴۳ میل سڑکوں کی تعمیر ہوئی جب کہ دوسرے منصوبے کے تحت ۴۳۱۴ میل سڑکوں کی تعمیر کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

ریاستی حکومت نے پہاڑی اضلاع میں سڑکوں کی ترقی پر خصوصی توجہ دی جہاں تقریباً ۱۰۰ میل پکی اور ۲۰۰ میل کچی سڑکوں کی تعمیر ہوئی۔

ریاست میں ۱۹۹.۴۵ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ۴۷ پلوں کی تعمیر مکمل کی گئی۔ زیر تعمیر پلوں میں سے چند اہم پل یہ ہیں۔ گڑھ مکتیشور میں دریائے گنگا کے اوپر پل۔ رڑکی میں رام گنگا کے اوپر پل اتر پردیش۔ پنجاب کی سرحد پر کیرانہ (ضلع مظفر نگر) کے قریب دریائے جمنا کے اوپر پل۔ کیکوٹ۔ نجن روڈ پر رام گنگا کے اوپر پل اور مظفر نگر۔ دھنا روڈ پر ہنڈن کے اوپر پل۔

معدنیات

نظامت ارضیات کے ذریعہ مرزاپور میں چونے کے پتھر اور کیلسائیٹ۔ ضلع گڑھوال میں ایسبسٹوس اور ضلع الموڑہ میں تانبہ اور میگنیسائیٹ کے ذخیرے کی کھوج کا کام جاری رہا۔ کوٹہ کے علاقہ میں تین مقامات پر چونے کے پتھر کی کھوج کے لئے ایک ہزار فیٹ گہری کھدائی سے چونے کے پتھر کے وافر ذخیرے کی موجودگی کا ثبوت ملا ہے جس سے سیمنٹ کی صنعت کی چونے کے پتھر سے متعلق ضروریات

کم سے کم ۰۰ سال تک پوری ہوسکیں گی۔

ضلع گڑھوال میں پہلی بار باقاعدہ طور پر ارضیاتی سروے شروع کیا گیا۔

سماجی خدمات

ریاستی حکومت کے ذریعہ ۱۹۶۱ء کے دوران میں سماجی خدمات کے ضمن میں جو اقدامات کئے گئے ہیں ان میں سے چند اہم یہ ہیں۔ ملیریا کی بیخ کنی کے لئے رہبر منصوبہ کا آغاز۔ ڈویژن کے ہیڈ کوارٹرس کے اسپتالوں میں ماہرین خصوصی کی خدمات کی بہم رسانی۔ ریاست کے پانچ بڑے شہروں میں کارپوریشنوں کا قیام اور نو محرموں۔ نابالغ مجرموں اور عصمت فروشی کے اڈوں سے چھڑائی گئی عورتوں کی دیکھ بھال اور ان کی بحالی کے لئے تربیت۔

تعلیم

ریاست میں گذشتہ سال کے آغاز میں پرائمری اسکولوں کی مجموعی تعداد ۳۲،۶۰۲ تھی جو سال کے آخر میں بڑھ کر ۳۲۶۰۹ ہوگئی۔ ان تعلیمی اداروں میں طلبا کی تعداد بھی ۲۵۲۱۰۵ سے بڑھ کر ۳۲ء۳۴ لاکھ ہوگئی۔ حکومت نے ان تعلیمی اداروں کو ان کے اس نقصان کی تلافی کے لئے جو ان کو ریاست میں ابتدائی تعلیم مفت کر دیئے جانے کی وجہ سے برداشت کرنا پڑا لوکل باڈیز کو ۵۲۶۳۰۰۰ روپیہ کی مالی امداد منظور کی۔

مدرسین کی تربیت کے ۴۸ اداروں کے قیام سے ریاست میں ایسے اداروں کی تعداد بڑھ کر ۱۱۰ ہوگئی جس میں خواتین مدرسین کے لئے ۲۲ ادارے شامل ہیں۔ زیر نظر سال میں ۱۳ ممبروں پر مشتمل ایک ثانوی تعلیم کمیشن مقرر کیا گیا جو علاوہ دیگر امور کے ریاست میں ثانوی تعلیم کے نظم و نسق اور ڈھانچہ سے متعلق مسائل پر غور و خوض کرے گا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کا معیار بلند کرنے کی تدابیر معلوم کرنے کے لئے مقررہ اعلیٰ اختیاری کمیشن کی رپورٹ کا انتظار ہے۔

ریاست میں سیکنڈری اسکولوں کی تعداد بھی ۱۵۰۸ سے بڑھ کر ۲،۰۴۱ ہوگئی۔ ان میں لڑکیوں کے ۳۴۶ اسکول بھی شامل ہیں۔ ان تعلیمی اداروں میں کھیتی باڑی کی تربیت کو مناسب اہمیت دی گئی اور ہر ایک اسکول کو ۱۰ ایکڑ آراضی بہم پہنچانے کے لئے اقدامات کئے گئے۔ جن اسکولوں کو آراضی بہم نہ پہنچائی جا سکی وہاں کتائی۔ بنائی کڑھائی کا کام سلائی۔ رنگائی اور مصوری کی تعلیم پر زور دیا گیا۔ ان اسکولوں کو مجموعی طور پر ۲۲۱۲۳ ایکڑ آراضی بہم پہنچائی گئی اور ۱۰۸۰ ایکڑ آراضی میں کھیتی باڑی شروع کی گئی۔

زیر نظر سال میں ۶۳ ہائیر سکنڈری اسکولوں کو تسلیم کیا گیا جس سے ایسے اداروں کی کل تعداد ۱،۱۹۱ ہوگئی۔ ریاستی حکومت نے غریب اور مستحق طلبا کو مالی امداد اور وظائف دینے کے لئے ۲۸۴۲۶۰ روپیہ کی رقم منظور کی۔ زیر نظر سال میں ۶۲ سرار کیڈٹوں کو دینی تعلیم دی گئی۔ علاوہ ازیں ریاست کے مختلف اضلاع میں فلم شو، سیمینار، کانفرنسیں اور نمائشیں منعقد کی گئیں۔

صحت عامہ

زیر نظر سال میں ڈویژن کے ہیڈ کوارٹروں کے چھ اسپتالوں اور منتخب اسپتالوں میں ماہرین خصوصی کی خدمات کی بہم رسانی سے طبی سہولتوں میں مزید توسیع کی گئی۔ اور ۱۹ مقامات پر جراحی اور طب کے ماہرین خصوصی بہم پہنچائے گئے۔ آٹھ ضلع اسپتالوں میں دانت کے کلینک اور پانچ ضلع اسپتالوں میں آنکھوں کے علاج کے کلینک قائم کئے گئے۔

دیہاتیوں کو علاج کی سہولتوں کی فراہمی کے لئے دیہی علاقوں میں آٹھ نئے شفاخانے قائم کئے گئے جس سے ریاست میں ایسے شفاخانوں کی تعداد بڑھ کر ۲۱ ہوگئی۔ تشخیص کی سہولتوں کی فراہمی کے لئے صحت عامہ سے متعلق تجربہ گاہوں کی تعداد بڑھ کر ۱۰ کر دی گئی۔

تپ دق کے مریضوں کو امداد بہم پہنچانے کے لئے آگرہ میں تپ دق تربیتی اور مظاہرہ مرکز قائم کیا جا رہا ہے۔ تپ دق کے مریضوں کے لئے ہردوائی میں ۵ پلنگوں پر مشتمل ایک اسپتال قائم کیا گیا ہے۔ ریاست میں ۲۰۱۴۸۱ افراد کو بی۔ سی۔ جی کے ٹیکے لگائے گئے۔

سروجنی نگر لکھنؤ میں میڈیکل افسروں کے لئے ایک جدید تربیتی کورس شروع کیا گیا جہاں ۸۲ میڈیکل افسروں کو تربیت دی گئی۔ ملیریا کی بیخ کنی کی اسکیم کی تفصیلات تیار کرنے کے لئے ضلع سلطان پور میں ایک رہبر منصوبہ شروع کیا گیا۔ ملیریا کی بیخ کنی کے پروگرام کی رفتار ترقی تسلی بخش رہی۔

کینسر کے مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر کانپور میڈیکل کالج میں ایک ریڈیم کینسر انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جا رہا ہے۔ جو ریاست میں اپنی نوعیت کا پہلا انسٹی ٹیوٹ ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی عمارت قریب تکمیل ہے۔ زیر نظر سال میں دیہی علاقوں میں ۶۰ اور شہری علاقوں میں ۱۰ خاندانی منصوبہ بندی کلینک کھولے گئے۔

لوکل سیلف گورنمنٹ

زیر نظر سال میں ریاست کے پانچ شہروں یعنی کانپور، الہ آباد، وارانسی، آگرہ اور لکھنؤ میں کارپوریشنوں کا قیام عمل میں آیا۔ ان کارپوریشنوں کا قیام مقامی خود اختیاری حکومت کی جانب ایک اہم اقدام تھا۔ ان کے قیام سے ریاست میں میونسپلٹیوں کی تعداد کم ہو کر ۱۳۲ ہو گئی۔

شہروں میں پینے کے پانی اور پانی کی نکاسی کے نظام کو بہتر بنانے کیلئے ۷۰ اسکیمیں شروع کی گئیں جن میں ۲۶ نئے واٹر ورکس کی تعمیر شامل ہے۔ دوسرے منصوبہ کے آخر تک ان اسکیموں کی تکمیل سے ۸۰ شہروں میں پائپ کے ذریعہ پینے کے پانی کی بہم رسانی اور ۲۰ شہروں میں پانی کی نکاسی کے بہتر نظام کی سہولتیں مہیا ہو جائیں گی

صنعتی مزدوروں کے لئے ۱۴۳۲۲ ایک اور دو کمرے کے مکانات تعمیر کرنے کی اسکیم کے تحت زیر نظر سال میں ۸۰۷۸ مکانات کی تعمیر مکمل کی گئی اور ۲۳۸۲ مکانات زیر تعمیر تھے۔ کم آمدنی والوں کے لئے تعمیر مکانات کی اسکیم کے تحت ۶۴۹۰ مکانات تعمیر کئے گئے اور ۱۰۲ مکانات زیر تعمیر تھے۔

گندی بستیوں کی صفائی کی اسکیم کے تحت جو دوسرے منصوبہ میں شامل کر لی گئی ہے ریاست کے پانچ بڑے شہروں میں ۴۳۲۳ مکانات کی تعمیر مکمل کی گئی اور ۸۸۹ مکانات زیر تعمیر تھے۔ اس ضمن میں لوکل باڈیز کو قرضہ اور مالی امداد کے طور پر ۱۶۵۰۳۰ لاکھ روپیہ منظور کیا گیا۔

پنچایتیں

ریاست کے ۴۶ اضلاع میں کل ۶۶۹۱۱ گاؤں سبھاؤں میں اتنے ہی تعداد میں پردھانوں اور پنچایتوں کے دس لاکھ سے زیادہ ممبروں کے چناؤ کے لئے جلد ہی ووٹ پڑیں گے پردھانوں کا چناؤ خفیہ بیلٹ کے ذریعہ ہوگا۔ ممبروں کے چناؤ میں بدستور سابق ہاتھ اٹھا کر ووٹ دینے کے طریقہ پر عمل کیا جائے گا۔ گاؤں پنچایتوں کی زراعتی و پیداواری اور فلاحی کمیٹیوں کی تشکیل سے گاؤں پنچایتیں دیہی ترقی کے لئے براہ راست ذمہ دار ہو گئیں پنچایتوں نے ۱۰۹۵۸ کنوؤں کی تعمیر اور ۴۷۵۲۳ کنوؤں کی مرمت کی اور ۱۲۷۶۰ دستی پمپ لگائے علاوہ ازیں ان کے ذریعہ ۲۸۲ میل لمبی پکی اور ۲۴۳۶ میل لمبی کچی سڑکیں۔ اسکولوں کی ۷۰۳ عمارتیں اور ۷۶۶ پنچایت گھر تعمیر ہوئے۔ شجر کاری کی اسکیم کے تحت پنچایتوں نے ۳۴۸۴۹۸۹ پھل کے درخت اور ۲۳۱۷۲۸۴ دوسرے درخت لگائے۔ گاؤں والوں نے جو تعاون کیا اس کی مالیت نقد اور محنت کی صورت میں بالترتیب ۶۲۹۵۵۵۹ روپیہ اور ۷۷۵۰۵۴۴ روپیہ تھی۔ نیائے پنچایتوں نے ۲۲۹۵ ۱ مقدمات فیصل کئے جن میں ۴۶۶۴۰ ایسے مقدمات بھی شامل ہیں جن میں نیائے پنچایتوں نے صلح کرانے میں مدد دی۔

سماجی فلاح

محکمہ سماجی فلاح نے زیر نظر سال میں نو مجرموں کے پروبیشن سے متعلق قانوں اور بچوں سے متعلق ریاستی قانون کے نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھالی۔ ان قوانین کا مقصد نوجوان اور کم سن مجرموں کی بحالی ہے۔ انسداد عصمت فروشی قانون کے تحت عصمت فروشی کے اڈوں سے چھڑائی گئی عورتوں کی دیکھ بھال اور ان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لئے مناسب تربیت دینے کے مقصد سے ریاست میں مزید پانچ تحفظ گاہیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ قانون ریاست کے ۱۵ اضلاع میں نافذ ہے۔ اس وقت صرف دہرہ دون میں ایک ایسی تحفظ گاہ قائم ہے۔ علاوہ ازیں ریاست میں ۱۲ ضلع پناہ گاہوں کو تحفظ گاہوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے جہاں عصمت فروشی کے اڈوں سے چھڑائی گئی عورتوں کو عارضی طور پر رکھا گیا ہے۔

سماجی فلاح کے لئے حکومت کی طرف سے چلائی جانے والی تمام اسکیموں کے لئے عوام کا تعاون حاصل کرنے کے لئے تقریباً ہر ایک اسکیم کے تحت غیر سرکاری مشاورتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ ان اسکیموں اور سماجی فلاح کے اداروں جیسے خواتین کی فلاح کا ادارہ دیہی نوجوانوں کی تنظیم۔ آگرہ اور بریلی کے اندھوں اور گونگوں کے لئے اسکولوں۔ لکھنؤ اور گورکھپور کے اندھوں کے لئے اسکولوں نگر کلیاں سمیتوں۔ اور ہردوار اور وارانسی میں واقع بھیکاریوں کے لئے محتاج خانوں کے ذریعہ سماجی فلاح کے اقدامات کئے جاتے رہے۔

ہریجن فلاح

فہرست مندرج اقوام۔ سابق جرائم پیشہ قبائل اور دوسرے پس ماندہ طبقوں کی خوش حالی اور طلبا کو پہلے درجہ سے لے کر اعلے درجوں تک وظائف۔ غیر متواتر مالی امداد اور فیس کی معافی کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ علاوہ ازیں فہرست مندرج اقوام کی اقتصادی حالت

بہتر بنانے کے لئے بھی اسکیمیں شروع کی گئیں۔

زیر نظر سال میں ان طبقوں کے افراد کی صحت بہتر بنانے کے لئے متعدد اسکیموں پر عملدرآمد کیا گیا۔ اس میں نئے مکانات اور کنوؤں کی تعمیر اور ان کے موجودہ مکانات کی مرمت شامل ہے۔ مزید برآں رضاکارانہ طور پر قائم شدہ اداروں کو مالی امداد دی گئی جو سماجی فلاح، خاص طور پر چھوت چھات دور کرنے کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کام کو آگے بڑھانے اور عوام کو فہرست مندرجہ اقوام کی فلاح کے لئے زیر عمل اسکیموں کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کے لئے ریاست کے کچھ ضلعوں میں سماجی کارکن مقرر کئے گئے۔

نظم و نسق

ریاستی حکومت کے ذریعہ گذشتہ سال کے دوران میں ضبط و نظم کے ضمن میں جو اقدامات کئے گئے ان میں ضبط و نظم کی مشینری کو بہتر بنانے کے پیش نظر پولیس کمیشن کا قیام، پسماندہ پہاڑی علاقہ کے عوام کی اقتصادی حالت بہتر بنانے اور سرحدوں کے تحفظ کے لئے تین پہاڑی اضلاع پتھورا گڑھ، چمولی اور اترکاشی کا قیام اور عدالتی کاموں میں ہندی کی ترویج شامل ہیں۔

ریاست کے سرحدی علاقوں کو مرکزی اور ریاستی حکومت کس قدر اہمیت دیتی ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ تین اضلاع پر مشتمل ایک مخصوص ڈویژن بنایا گیا جس کو براہ راست چیف سکریٹری اور وزیر اعلےٰ کے چارج میں رکھا گیا۔

زیر نظر مدت میں مذکورہ سرحدی اضلاع میں دفتروں، رہائشی مکانات اور اقتصادی اہمیت کی کچھ سڑکوں کی تعمیر شروع کی گئی جو زوروں پر جاری ہے۔ ضلع کے صدر مقامات پر ڈسپنسریوں کو صوبائی بنایا گیا ہے۔ مذکورہ تین اضلاع میں سے ہر ضلع میں ایک گشتی ڈسپنسری، دو آیورویدک ڈسپنسریاں اور ایک زچہ و بچہ فلاح مرکز قائم کیا گیا ہے۔ اور پینے کے پانی کی فراہمی اور صفائی کے معقول انتظامات کئے جا رہے ہیں۔

توسیع تعلیم کے لئے ۶۰ پرائمری اسکول، اور ۱۵ جونیر ہائی اسکول کھولے گئے ہیں اور دو گورنمنٹ ہائی اسکولوں کا درجہ بلند کیا گیا ہے۔ اعلیٰ تکنیکی تعلیم کے لئے طلبا کو مالی امداد دی جا رہی ہے۔

بھرپور صنعتی ترقی کے لئے بھی اقدامات کئے گئے ہیں جو اون کی ترقی، بڑھئی کی کارگاہوں کا قیام اور چرخوں کی فراہمی وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

مویشیوں کی نگہداشت کے ضمن میں بیلوں اور بھیڑوں کی تقسیم کی جا رہی ہے۔ بھیڑوں کے موجودہ مرکزوں کو بہتر بنایا جا رہا ہے اور ہر ایک ضلع میں مویشیوں کے علاج کے لئے ایک گشتی ڈسپنسری اور ایک تجربی یونٹ قائم کی گئی ہے۔

پولیس

ریاست میں سنہ ۱۹۶ء کے دوران میں اس امر کے باوجود کہ طلبا کی تحریک، سوشلسٹ پارٹی کی سول نافرمانی کی تحریک، مرکزی حکومت کے ملازموں کی ہڑتال اور اکتوبر کے زبردست اور تباہ کن سیلابات کی وجہ سے پولیس کو اپنے معمول کے فرائض کے علاوہ دوسری ذمہ داریوں کو پورا کرنا پڑا۔ ضبط و نظم کی صورت حال بحیثیت مجموعی تسلی بخش رہی۔

آگرہ اور اٹاوہ کے اضلاع اور جھانسی، مدھیہ پردیش اور اتر پردیش، راجستھان کی سرحدوں پر پولیس اور مسلح ڈاکوؤں کے درمیان کئی بار کامیاب مقابلے ہوئے جن کے نتیجہ میں بہت سے بدنام ڈاکوؤں کا قلع قمع ہو گیا۔ پی۔ اے۔ سی سے جن ڈاکوؤں کا مقابلہ ہوا ان میں سے مشہور ڈاکو ردیا کے گروہ کے رام ناتھ برہمن، رام ناتھ دوم اور چیالیا اور مان سنگھ کے گروہ کا سنے چمار تھے۔

زیر نظر سال میں پولیس نے بڑی تعداد میں آتشیں اسلحہ جات اور گولہ بارود برآمد کیا۔ پولیس نے گنڈوں، ناجائز طور پر شراب تیار کرنے والے اسمگلروں، جواریوں اور چوروں کے بہت سے گروہوں کو گرفتار کرنے میں نمایاں کارگزاری دکھائی۔ شعبہ تفتیش جرائم نے چند بہت ہی پیچیدہ اور مشکل معاملات کی کامیاب تفتیش کی اور مجرمین کو سزا دلائی۔ کانپور کے کنیٹی مار قاتل لکشمی داس کا سراغ لگانا اس شعبہ کی ایک اہم کارگزاری تھی۔

سماجی تحفظ (جیل)

ریاستی حکومت نے سنہ ۱۹۵۲ء میں قیدیوں کو کھلے کیمپوں میں آزاد مزدور کی طرح کام پر لگانے کا جو تجربہ شروع کیا تھا اس میں زیر نظر سال میں مزید توسیع کی گئی۔ اس ضمن میں ۱۹ فروری سنہ ۱۹۶ء کو ضلع نینی تال میں ستارگنج کے قریب ایک زراعتی اور صنعتی کیمپ کھولا گیا۔ اس کیمپ سے پہلے

قیدیوں کو ترقیاتی کاموں پر جیسے ندوں اور نہروں کی کھدائی وغیرہ پر لگایا جاتا تھا۔ بستا گنج کیمپ کے ذریعہ قیدیوں کو زراعتی اور صنعتی اسکیموں کی تکمیل کے لئے کام کرنے کے مواقع بہم پہنچائے گئے۔

جیل کے نظم و نسق کے سلسلہ میں ادھر چند برسوں میں جو اصلاحات کی گئیں ان کا جائزہ لینے کے لئے حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی

گاندھی جینتی کے موقعہ پر ۲ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو ۲۵ قیدیوں کی سزا میں چھوٹ دی گئی اور ان کو رہا کر دیا گیا۔

قومی بچت اسکیم

زیر نظر مدت میں قومی بچت اسکیم کی رفتار تیز تر کر دی گئی۔

اسکیم کے لئے عوام میں دلچسپی پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے ریاست کے بہترین ڈویژن اور ضلع اور ڈویژن کے بہترین بلاک کو رننگ ٹرافی بطور انعام دینے کی نئی اسکیم شروع کی گئی۔

زیر نظر سال میں قومی بچت اسکیم کے تحت ۳۰ نومبر ۱۹۶۰ء تک مجموعی طور پر ۶۴۲ء۱۰ ۶۴ کروڑ روپیہ جمع ہوا۔ علاوہ ازیں انعامی بانڈ اسکیم کے تحت ۱۹ء۱ کروڑ روپیہ جمع ہوا۔

سرکاری زبان ہندی

اکتوبر ۱۹۴۷ء کے اس اعلان کے بعد دیوناگری رسم خط میں لکھی جانے والی ہندی اتر پردیش کی سرکاری زبان ہے تمام سرکاری کاموں میں انگریزی کی جگہ ہندی کو بتدریج رائج کرنے کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ریاست کی کابینہ کا تمام کام ہندی میں کیا جائے گا۔ تمام محکموں کے افسران اعلیٰ کو احکام جاری کئے گئے جن کے ذریعہ ان پر سرکاری کاموں میں ہندی کے زیادہ سے زیادہ استعمال کی ضرورت کی اہمیت واضح کی گئی۔

حکومت نے جون ۱۹۶۰ء میں یہ فیصلہ کیا کہ ہائی کورٹ کو چھوڑ کر تمام ماتحت عدالتوں میں فیصلے ہندی میں لکھے جائیں۔ علاوہ ازیں محکمہ لسانیات نے انگریزی کی جگہ ہندی کی ترویج کے لئے آسانیاں پیدا کرنے کے لئے کئی کتابیں وغیرہ شائع کیں۔

ثقافتی امور

ثقافتی امور اور سائنسی تحقیق سے متعلق محکمہ نے یادگاروں اور تاریخی عمارتوں وغیرہ اور تاریخی اور ثقافتی اہمیت کی پرانی یادگاروں کی مرمت کے بارے میں سروے کیا۔ نجی افراد سے مسودے خریدے گئے اور پرانے کاغذات کی درستی کی گئی۔ ریاستی میوزیم لکھنؤ کی عمارت قریب تکمیل ہے اور میوزیم جلد ہی اس نئی عمارت میں منتقل ہو جائے گا۔

بے گھروں کی آبادکاری

ریاستی حکومت کے ذریعہ ۳۶۹۹ بے گھر کنبوں کی آبادکاری کے لئے جو اسکیمیں وضع کی گئیں تھیں ان کو مرکزی حکومت نے منظور کر لیا ہے۔ ان میں سے ۲۶۹۰ کنبے زیر نظر سال کے اخیر تک ریاست میں آگئے تھے اور ان کو نینی تال۔ بجنور۔ رامپور۔ پیلی بھیت اور بہرائچ کے اضلاع میں زمین پر بسایا گیا۔ بقیہ ۱۰۰۷ کنبوں کی آبادکاری کے لئے زمین کے حصول۔ کوارٹروں کی تعمیر۔ اور زمین کو قابل کاشت بنانے کا کام جاری تھا۔

انصاف

ماتحت دیوانی عدالتوں میں بدعنوانیوں۔ فیصلہ میں تاخیر اور عوام کو درپیش پریشانیوں کے اسباب کا پتہ لگانے کے لئے مارچ ۱۹۵۹ء میں ہائی کورٹ کے جج کی زیر صدارت جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی اس نے ایک سوالنامہ کے ذریعہ ضروری حقائق اور اعداد و شمار فراہم کئے ہیں۔ کمیٹی نے چند منتخب مقامات پر اس سلسلہ میں گواہوں کے بیانات بھی لئے۔ کمیٹی نے اپنی عبوری رپورٹ حکومت کو پیش کر دی ہے جو زیر غور ہے۔ کمیٹی اپنی قطعی رپورٹ تیار کر رہی ہے۔

نقد و تبصرہ

شعلۂ آواز

از سراج لکھنوی۔ قیمت مجلد تین روپے پچاس نئے پیسے
ملنے کا پتہ: سراج لکھنوی، کٹرہ ابو تراب خاں، لکھنؤ

حضرت سراج لکھنوی، لکھنؤ کے مشہور کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر ہیں اور اساتذۂ لکھنؤ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کی مدت ۴۲ برس کی ہو چکی ہے اور اب انجمن کے زیر اہتمام "شعلۂ آواز" کے عنوان سے ان کے کلام کا ایک انتخاب شائع ہوا ہے۔ سراج صاحب نے اس مجموعہ کے تین حصے کئے ہیں۔ ایک میں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک کی غزلیں، دوسرے میں ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۰ء تک کی غزلیں اور تیسرے میں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۹ء تک کی غزلیں شامل ہیں اور اس طرح سراج صاحب کا پرانا اور نیا دونوں رنگ کلام سامنے آگیا ہے۔ لکھنوی ہونے کی حیثیت سے سراج صاحب کے کلام میں زبان و محاورہ کی چاشنی تو ہونا ہی تھی لیکن محض اس کے لئے "داد طلب" نہیں ہونا چاہتے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنے متعلق خود لکھا ہے وہ "دلکش انداز بیان کے ساتھ تخئیل اور فکر کے" دل دادہ ہیں۔ یہاں پرانے اور نئے رنگ کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے — اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی
اب کہاں نقش وفا، جو مٹ گیا وہ مٹ گیا — آج تک میری جگہ خالی تری محفل میں ہے
قفس سے دور سہی موسم بہار تو ہے — اسیرو آؤ ذرا ذکر آشیاں ہو جائے

(۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء)

دامن تو یہ بھی دو چار چھینٹیں آ گئیں — جام جو چھلکا صدا آئی کہ چھلکا یا گیا
یہ وہ ارمان ہیں کہ ٹوٹے بھی نکل گئے — یہ انھیں تنکوں کا جو ہے گریاں آگ میں جل گئے
خدا جانے کس بت کا یہ آستاں ہے — کہ سر سے جھکائے چلے جا رہے ہیں

(۱۹۳۱ء - ۱۹۴۰ء)

یہ کیا کہ ہاتھ فقیروں کے اب بھی خالی ہیں — سروں کے تاج تو ہاں تاجدار کھو بیٹھے
سجدوں سے کسی نارسائی نے کہکشاں — نا آشنا نہیں ہیں تری رہ گزر سے ہم
آؤ جہان نو کی سمت کنگوں بڑھاں — گھبرا گئے ہیں گردش شام و سحر سے ہم
ذرا دیکھو یہ سرکشی ذرۂ خاک — فلک کا چاند بنتا جا رہا ہے

اردو ادب آزادی کے بعد

از ڈاکٹر اعجاز حسین۔ ناشر کاروان پبلشرز، الہ آباد
صفحات ۲۴۴ قیمت پانچ روپئے

تصنیف ہے ڈاکٹر اعجاز حسین صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کی۔ حصول آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان اور ایشیا کے دوسرے ملکوں میں بڑی معاشی اور سیاسی تبدیلیاں ہوئیں۔ تغیرات زمانہ کے ساتھ ساتھ ادب کی رفتار و گفتار میں بھی تبدیلیاں ہوئیں اور اردو ادب بھی اس سے کافی متاثر ہوا۔ شاعری ہو یا نثر، دونوں میں نئے رجحانات نے جگہ پائی۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اس کتاب میں انھیں نئے رجحانات کا ایک جائزہ لیا ہے اور ایشیائی ملکوں بالخصوص ہندوستان کی سیاسی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے اردو ادب میں آزادی کے بعد نظم، غزل، افسانے اور ناول پر دیگر اصناف ادب کی جو رفتار رہی ہے اس پر تبصرہ کیا ہے۔ اس تبصرہ کے دوران میں نثر و نظم کے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں ان سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

میری غزلیں

از علی جواد زیدی۔ ناشر ڈاکٹر علی سجاد زیدی۔ ڈاک خانہ کرہاں، ضلع اعظم گڑھ (یو۔ پی)
قیمت ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے

علی جواد زیدی اردو کے ان لکھنے والوں میں ہیں جنھیں نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ وہ ترقی پسند ہونے کے ساتھ ساتھ ادب میں پرانی قدروں کے بھی قائل ہیں۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "رگ سنگ" شائع ہو چکا ہے۔ مدت سے انھوں نے غزل گوئی ترک کر دی تھی لیکن چار پانچ سال سے پھر ادھر توجہ کی ہے۔ اس مجموعہ میں یہ تمام غزلیں شامل ہیں۔ جدید غزل کے بارے میں انھوں نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "جدید غزل نے اپنے دامن میں بہت کچھ سمیٹ لیا ہے۔ اب یہ پوری کائنات کو پا لینے کی کوشش کرتی ہے۔" غالباً اسی بات نے انھیں دوبارہ غزل گوئی پر آمادہ کیا ہے۔ بہر حال ان کی ان غزلوں میں غم جاناں بھی ملتا ہے اور غم دوراں بھی۔ ان کے اشعار دور حاضر کے احساسات و جذبات کی عکاسی کرتے ہیں اور ان میں انسانیت کی قدریں پوری طرح جلوہ دکھاتی ہیں۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم نے مانا کہ تیرہ دستی کم ہے — پھر بھی یہ صبح، شام غم تو نہیں
عشق میں صد شکست ہزار سہی — صد شکست دانہ و درم تو نہیں
مرے ہاتھ اٹھا ہی لیں گے کسی دن — ابھی زلف ہستی میں خم ہے تو کیا غم
وہ کیسے کم نگاہ تھے جو ظلمتوں سے ڈر گئے — ہمیں تو رہ بھی مل گئی جہاں گئے جدھر گئے
غم دوراں کی آنچ میں جو تپ گئے نکھر گئے — جو خود بھڑک اٹھے، نگاہ سے اتر گئے
یہ ناؤ بھی گزر ہی جائے گی مایوس ہو معصوم نہ ہو — ایسے ہی جھکڑ سے موجوں کے کشتی بھی بہا کرتی ہے
قصۂ گوئے فراق اب سوچا — صبح ہونے کو آئی بات گئی

حالی کا سیاسی شعور

از ڈاکٹر معین احسن جذبی۔ ناشر احباب پبلشرز، سول ایجنٹ انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ
صفحات ۲۰۸ (ڈیمائی سائز)۔ قیمت ۲٫۵۰ روپئے

جذبی اردو کے مشہور ترین اور مقبول ترین شعرا میں ہیں لیکن انھوں نے حالی کے سیاسی شعور پر پوری کتاب تیار کر کے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک اچھے نثر نگار، محقق اور سیاسی مبصر بھی ہیں۔ اپنی اس کتاب میں انھوں نے سرسید کے دور کا ہر پہلو سے جائزہ لینے کے بعد دکھایا ہے کہ حالی سیاست میں سرسید کے پکے مقلد تھے لیکن حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے سیاست میں اپنی راہ الگ نکالی تھی۔ حالی کی سیاست پر بحث کرنے کے سلسلے میں جذبی نے دراصل ہندوستان کی دو سو سال کی سیاسی اور معاشی حالت کا تجزیہ کیا ہے جس کا اندازہ کتاب کے حسب ذیل عنوانات سے لگایا جا سکتا ہے: برطانوی تسخیر کے اثرات، مسلمانوں کی طرف سے انگریزی تسلط کی مخالفت (وہابی تحریک)، انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی کوشش (سرسید کی تحریک)، حالی کے سیاسی شعور کی ابتدا، قدیم اور جدید نظام حکومت کا تصور، حالی اور سماجی اصلاحات۔ آخر میں کتابیات کی فہرست بھی دے دی گئی ہے۔

سکندر علی وجد

از سکندر علی وجد۔ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ
قیمت [illegible] پیسے

جلد ۱۵ نمبر ۱۲

پھاگن ۱۸۸۲
مارچ سنہ ۱۹۶۱ء
چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ ۰ ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
اپراجتا پرساد سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ۔ لکھنؤ

شایع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

فہرست

ستم ایجاد

رئیس صدیقی

عقلِ حاضر کی ہمہ نفسی قاتل ہے
زندگی کیا ہے سکوتِ نعرۂ بسمل ہے

علم کے بوجھ سے انسان دبا جاتا ہے
سر نبوت کا شرافت کا جھکا جاتا ہے
کارواں خضر کے ہاتھوں سے لٹا جاتا ہے
تھی جو مقصودِ بشر کیا یہ وہی منزل ہے

دستِ تہذیب سے ہے چاک گریبانِ حیات
یہ دبستانِ تمدن ہے کہ زندانِ حیات
رنگِ اخلاص نہیں وفن کی تصویروں میں
حسن مفقود ہے اس دور کی تعمیروں میں
زندگی قید ہے دستور کی زنجیروں میں
روحِ آدم ہوئی جاتی ہے پشیمانِ حیات

یہی دنیا کبھی آباد تھی برباد نہ تھی
وحشتِ اہلِ خرد اس قدر آزاد نہ تھی
امن سے جنگ کے شعلوں کو ہوا ملتی ہے
اس تمدن میں تشدد کی ادا ملتی ہے
ہر صداقت کو سیاست کی سزا ملتی ہے
عقلِ انساں کبھی اتنی ستم ایجاد نہ تھی

اور حرکات (Vowels)۔ حروف اُن آوازوں کو کہتے ہیں جن میں زبان یا ہونٹوں کے ذریعے تنفس میں پوری یا ادھوری رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ حرکات وہ آوازیں ہیں جن میں تنفس مسدود نہیں ہوتا لیکن زبان اور ہونٹوں کی مختلف صورتوں سے منھ اور حلق کے خلا (Space) کی شکل تبدیل ہوتی رہتی ہے اور اسی لیے ان میں سے مختلف قسم کی گونج (Resonance) لیے ہوئے آواز باہر نکلتی ہے۔ کچھ آوازیں ان دونوں کے درمیان ہوتی ہیں جنھیں نصف حرکات (Semi Vowels) کہتے ہیں۔

اصوات کی ایک دوسری بنیاد پر تقسیم کی جاتی ہے۔ کچھ میں صوتی تار جڑ جاتے ہیں اور آواز سیدھے مخرج ہی سے پیدا ہوتی ہے جیسے "گ" اور "ب" میں۔ کچھ میں صوتی تار نہیں بڑتے، صرف زبان اور ہونٹوں کی حرکت سے ایک دبی ہوئی گونج سی ہوتی ہے۔ جیسے "ک" یا "پ"۔ اوّل الذکر اصطلاح میں مجہور (Voiced) اور آخر الذکر کو مہموس (Unvoiced) کہتے ہیں۔ حرکات مجہور ہوتے ہیں اور حروف میں کچھ مجہور ہوتے ہیں اور کچھ مہموس۔

ہندوستانی حروف میں کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں جو معمولی حروف میں زیادہ سانس پھینک کر یا "ہ" کی آواز شامل کرکے بولے جاتے ہیں۔ ان کے لیے اصطلاح "منفوس" مقرر کی جا سکتی ہے۔ انگریزی میں انھیں (Breathed) یا (aspirated) کہتے ہیں۔ دوسرے حروف کو جنھیں انگریزی میں (Unbreathed) یا (Unaspirated) کہا جاتا ہے ہم "مقلول" کہہ سکتے ہیں۔

ان حرکات و حروف پر علاحدہ علاحدہ غور کیجیے۔ لیکن اس کے لیے زبان، منھ اور گلے کی بناوٹ پر بھی دھیان دینا ضروری ہے۔ گلے میں مخرج الصوت کے اوپر خلا ہوتا ہے لیکن آگے کی طرف زبان جڑی ہوتی ہے جس کا اگلا سرا دانتوں تک آ جاتا ہے۔ زبان کافی حد تک آگے پیچھے، نیچے اوپر کی طرف جا سکتی ہے اور اس کا کوئی بھی حصہ ارادی طور پر اُٹھایا، گرایا، پھیلایا یا سکوڑا جا سکتا ہے۔ صوتیاتی تجزیے کے لیے زبان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: (۱) بیخ (Root) (۲) عقب (Back) (۳) وسط (Mid) (۴) راس (Blade) اور (۵) نوک (Point)۔ بعض حروف میں زبان کے نوک سے نیچے کا حصہ کام میں آتا ہے اسے راسِ زیریں (Lower Blade) کہتے ہیں۔ اصوات کی تشکیل میں زبان منھ کے بالائی حصوں کو یا تو مس کرتی ہے یا ان کے قریب آجاتی ہے۔ ان بالائی اعضا میں سب سے آگے دانت ہوتے ہیں جن کے درمیان چند حروف میں نوکِ زبان آجاتی ہے پھر دانتوں کی جڑ ہوتی ہے جن میں نوکِ زبان لگ کر کچھ حروف پیدا کرتی ہے۔ پھر مسوڑھوں کا اوپری حصہ ہوتا ہے جسے لثہ (Alveolum) کہتے ہیں۔ سخت تالو کا اگلا حصہ ادنا الحنک (Front palate) کہتے ہیں۔ پھر سخت تالو کا اونچا حصہ ہوتا ہے جسے وسط الحنک (Cerebrum) کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک لٹکتا ہوا لچک دار گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے جسے "گلے کا کوّا" یا لہاۃ (Uvula) کہتے ہیں جو بولتے وقت عقب حلق سے چپک کر ناک میں ہوا جانے کے راستے کو سد کر دیتا ہے (لیکن ناک کے سہارے بولے جانے والے حروف میں ایسا نہیں ہوتا) اور کچھ حروف کو عقبِ زبان سے مل کر بناتا ہے (دیکھیے شکل ب)

شکل ب۔ آلاتِ صوت

ا۔ گلے کا کوّا۔
ب۔ قص الحنک (نرم تالو)
ج۔ وسط الحنک (سخت تالو کا پچھلا یا بالائی حصّہ)
د۔ ادنا الحنک (سخت تالو کا اگلا حصّہ)
ہ۔ لثہ یا مسوڑھوں کی جڑ
و۔ زبان
۱۔ بیخ زبان
۲۔ عقبِ زبان
۳۔ وسط زبان
۴۔ راس بالائے زبان
۵۔ نوک زبان ۶۔ راسِ زیرینِ زبان

ک. کھانے کی نالیاں
س. سانس کی نلی
ص. صوتی تار مخرج الصوت
ط. سانس نلی کا ڈھکنا (ایپی گلاٹس)
د. خلائے حلق
ج. خلائے بینی
ن. نچلا جبڑا

[ ] ہڈی دار یا سخت اعضا
[ ] گوشت یا نرم مغز
[ ] خلا

حرکات ہندوستانی زبانوں میں یورپی زبانوں کی نسبت کم ہوتے ہیں۔ ہندوستانی الفاظ میں صرف دس خالص حرکات ہوتے ہیں جب کہ انگریزی میں ان کی تعداد سترہ ہے اور جرمن، فرانسیسی میں اور بھی زیادہ ہے۔ حرکات کی تشکیل میں تین اعضا زبان، نچلا جبڑا اور ہونٹ بیک وقت کام کرتے ہیں۔ زبان آگے یا پیچھے ہوتی ہے۔ جبڑا زیادہ یا کم کھلتا ہے اور ہونٹ پھیلتے یا گول ہوتے ہیں۔ زیادہ تر زبانوں میں جن میں ہندوستان کی ساری زبانیں اور انگریزی شامل ہیں، زبان جبڑے اور ہونٹوں کی حرکتوں میں ایک خاص تناسب پایا جاتا ہے۔ جس وقت جبڑا پورا کھلا ہوتا ہے تو ہونٹ قدرتاً پورے کھلے ہوتے ہیں ساتھ ہی زبان بھی وسطی حالت میں رہتی ہے۔ جب نچلا جبڑا اوپر اٹھنے لگتا ہے تو زبان اسی تناسب سے یا تو آگے کھنچتی ہے (اور اسی تناسب سے ہونٹ پھیلتے جاتے ہیں) یا پیچھے سکڑتی ہے (اور اسی تناسب سے ہونٹ گول ہوتے جاتے ہیں) جبڑے کی حالت کے لحاظ سے حرکات کو کشادہ (Open) اور تنگ (Closed) کہا جاتا ہے۔ زبان کی حالت کے مطابق پیش (Front) اور پس (Back) اور ہونٹوں کی حالت کے مطابق مدّور (Rounded) اور کشیدہ (Stretched) کہا جاتا ہے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عرصۂ تلفظ کے لحاظ سے حرکات یا تو مختصر (Short) ہوتے ہیں یا ممدود (Long)۔

حروف کی تشکیل کے بھی دو اجزا ہوتے ہیں۔ ایک تو مقام تلفظ (Place of articulation) اور دوسرا تحلیل زبان (Modulation)۔ (Place of tongue) مقام تلفظ کے لحاظ سے ہندوستانی الفاظ کے حروف آٹھ حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔

(۱) قصی الحلقیہ (Glottal) ان میں زبان کا کوئی کام نہیں ہوتا، صرف مخرج الصوت کے بند ہوکر ایک دم کھلنے یا برابر کھلے رہنے سے حروف بنتے ہیں مثلاً "أ" اور "ہ"۔

(۲) قصی حنکیہ (Velar) اس میں نرم تالو زبان سے چھوتا ہے جیسے "ک، گ" وغیرہ۔

(۳) وسط الحنکیہ (Cerebral) ان میں زبان کی نوک زیریں سمت تالو کے عقب یا اونچے حصے کو چھوتی ہے جیسے "ٹ، ڈ" وغیرہ۔

(۴) ادنا الحنکیہ (Palatal) ان میں نوک زبان سخت تالو کے اگلے حصے کو چھوتی ہے جیسے "چ، ج، ی" وغیرہ۔

(۵) لثیہ (Alveolar) اس میں نوک زبان مسوڑھے کی جڑ کو چھوتی ہے جیسے "ر، ل، س" وغیرہ

(۶) دندانی (Dental) اس میں نوک زبان دانتوں کی جڑ کو چھوتی ہے جیسے "ت، د" وغیرہ

(۷) شفیہ دندانی (Labiodental) اس میں اوپری ہونٹ اور نیچے کے دانت ملتے ہیں جیسے "و" وغیرہ۔

(۸) شفیہ (Labial) اس میں صرف دونوں ہونٹ ملتے ہیں جیسے "پ، م" وغیرہ۔

ان کے علاوہ اگر خالص عربی اصوات کو بھی شامل کرلیا جائے تو چار قسمیں اور ہو جاتی ہیں ——

(۹) وسط الحلقیہ (Pharyngal) ان میں بیخ زبان پیچھے کھنچتی ہے جیسے "ع، ح"۔

(۱۰) ادنا الحلقیہ (Uvular) ان میں گلے کا کوّا عقب زبان سے چھوتا ہے جیسے "ق، غ، خ"۔

(۱۱) لثیۃ المطبقہ (Velarised alveolar) یہ لثیئہ ہی ہوتے ہیں لیکن باقی زبان اٹھی اور تنی رہتی ہے اور اوپری ہونٹ ڈھیلا رہتا ہے جیسے "ص، ض، ط، ظ"۔

(۱۲) وسط دندانی (Interdental) ان میں نوک زبان

دانتوں کے درمیان آجاتی ہے جیسے " ث اور ذ "

تحلیلِ زبان کے لحاظ سے حروف کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔

(۱) شدیدہ (Plosive) ان میں زبان مقام تلفظ سے جھٹکے کے ساتھ علاحدہ ہوتی ہے ۔ خالص ہندوستانی الفاظ میں سب سے زیادہ یہی حروف ہوتے ہیں ۔ ان کی چار قسمیں ہوتی ہیں (ا) مہموس مقلول جیسے "ک، چ" وغیرہ ' (ب) مہموس منفوس جیسے "کھ، چھ" وغیرہ ' (ج) مجہور مقلول جیسے "ج، گ" وغیرہ ' (د) مجہور منفوس جیسے " گھ، جھ " وغیرہ

(۲) غنہ (Nasal) ان میں زبان کی صورت شدیدہ جیسی ہی ہوتی ہے صرف لہاۃ (گلے کا کوا) پیچھے ہٹ کر ناک کا راستہ بند نہیں کرتا اور سانس ناک سے نکل کر بجتا ہوا سُر پیدا کر دیتی ہے جیسے "م، ن "

(۳) مکررہ (Trilled) ان میں زبان کی نوک تالو یا مسوڑھے سے مس ہو کر فوراً ہٹ جاتی ہے (کچھ حالتوں میں یہ مس جلد جلد دو تین بار ہوتا ہے ۔ ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں (ا) مقلول جیسے " ر ، ڑ " اور (ب) منفوس جیسے " ڑھ "

(۴) تجریہ (Lateral) اس میں زبان کی نوک تالو یا مسوڑھے سے لگی رہتی ہے لیکن اس کے پہلوؤں سے ہوا نکلتی رہتی ہے جیسے "ل "

(۵) تصفیریہ (Fricative) ان میں زبان کا مس سقفِ دہن سے پورا نہیں ہوتا ' بلکہ دونوں کے درمیان تنگ جگہ رہ جاتی ہے جس میں سے ہوا رگڑ کی آواز دیتی ہوئی نکلتی ہے ۔ ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں (ا) مہموس جیسے "س، ش" وغیرہ ' (ب) مجہور جیسے "ز، ژ " وغیرہ

ابتدائی اصوات

ہندوستان کی موجودہ زبانیں زیادہ تر سنسکرت سے نکلی ہیں ۔ جنوبی ہند کی زبانیں ضرور دراوڑی خاندان کی ہیں لیکن جہاں تک صوتیات کا تعلق ہے دونوں خاندانوں ' ہند یورپی اور دراوڑی ' میں اصوات کا لین دین لگ بھگ مکمل ہو چکا ہے ۔ سنسکرت کا پورا " ٹ ورگ " (وسط الحنکیہ) اسی دراوڑی خاندان کی دین ہے اس ضمن کے دو اصوات ابھی تک صرف جنوبی ہند کی دو زبانوں ' ملیالم اور تامل میں ہیں ۔ ان کا پتہ شمالی ہند کی کسی زبان میں نہیں ملتا ۔

ساتویں یا چھٹی صدی قبل مسیح میں پانینی (पाणिनि) نے سنسکرت قواعد کو قطعی طور پر مرتب کیا ۔ اس کی قابلِ قدر تصنیف اسٹھا دھیائی کو اس زمانے کے لحاظ سے تو مکمل کہا ہی جا سکتا ہے ۔ پانینی کی مدوّن سنسکرت کی صوتیاتی تقسیم دُنیا کی دوسری زبانوں سے کہیں زیادہ مکمل ہے ۔ سنسکرت میں ڈھائی ہزار برس پہلے ہی تحریری حروف کی صوتیاتی تقسیم ہو گئی تھی جب کہ دوسری زبانوں میں یہ کام پچھلی کچھ صدیوں ہی میں ہوا ہے اسی وجہ سے سنسکرت میں نئی تکنیکی صوتیاتی اصطلاحیں گڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ سارے ضروری اصطلاحات پہلے سے مرتب اور مروج ہیں ذیل میں انگریزی ' سنسکرت اور عربی فارسی صوتیاتی اصطلاحات کا نقشہ دیا جاتا ہے جس سے اس مطالعے میں آسانی ہوگی ۔

انگریزی	عربی فارسی	سنسکرت
Plosive	شدیدہ	स्पर्शी
Nasal	غنہ	अनुनासिक
Fricative	تصفیریہ	सघर्षी
Trilled	مکررہ	लुण्ठित
Lateral	تجریہ	पार्श्विक
Sibilant	گرم	ऊष्म
Half-vowel	انتہائی	अन्तस्थ
Velar	حلقی	कण्ठ्य
Cerebral	وسط الحنکیہ	मूर्धन्य
Palatal	ادنا الحنکیہ	तालव्य
Dental	دندانی	दन्त्य
Labial	شفیہ	ओष्ठ्य
Very long		प्लुत
Glottis	مخرج الصوت	काकल
Vowel	حرکت	स्वर
Consonant	حرف	व्यञ्जन
Voiced	مجہور	सघोष
Un-voiced	مہموس	अघोष
Breathed	منفوس	महाप्राण

سنسکرت	عربی فارسی	انگریزی
अल्प प्राण	مقلول	Unbreathed
विवृत	کشادہ	Open
संवृत	تنگ	Closed
पश्च	پس	Back
अग्र	پیش	Front
ह्रस्व	مقلقل	Short
दीर्घ	ممدود	Long

اب سنسکرت کا صوتیاتی نقشہ دیکھیے۔

۱۔ حرکات (स्वर) —

ا۔ مقلقل (ह्रस्व) अ (اَ)، इ (اِ)، उ (اُ)، ऋ (رِ)
ऌ (لِر)۔

ب۔ ممدود (दीर्घ) आ (آ)، ई (اِی)، ऊ (اُو)، ॠ (رِی)، ॡ (لری)

ج۔ مرکب (मिश्र विकृतदीर्घ) ए (اے)، ऐ (اَئے)
ओ (اُو)، औ (اَوْ)۔

۲۔ حروف (व्यञ्जन) :—

۱۔ स्पर्शी (شدیدہ)	कण्ठ्य (حلقیہ)	क ख ग घ ङ
	तालव्य (اقص الحنکیہ)	च छ ज झ ञ
	मूर्धन्य (وسط الحنکیہ)	ट ठ ड ढ ण
	दन्त्य (دندانی)	त थ द ध न
	ओष्ठ्य (شفیہ)	प फ ब भ म
ب۔ अन्तस्थ (انتہائی)		य र ल व
ج۔ ऊष्म (گرم)		श ष स ह

۳۔ دیگر۔ अनुस्वार (اَم : अं)، अनुनासिक (اں : अँ)
विसर्ग (اُ : अः)

پہلی ہی نظر میں یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ ترتیب حروف بالکل صوتیاتی بنیاد پر قائم ہے۔ لیکن ذرا غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ تلفظ سے یہ ترتیب میل نہیں کھاتی۔ اس میں مندرجۂ ذیل کمزوریاں معلوم ہوتی ہیں :—

(۱) क वर्ग کو اس میں कण्ठ्य (حلقیہ) کہا گیا ہے جب کہ دراصل وہ نرم تالو کے زبان سے مس ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔

(۲) च वर्ग اس وقت سخت تالو کے اگلے حصّے سے زبان کو مس کر کے بولا جاتا ہے اور اس لحاظ سے سنسکرت ترتیب میں اُسے ट वर्ग کے جو سخت تالو کے پچھلے یا بالائی حصے سے بولا جاتا ہے، بعد میں آنا چاہیے (کیونکہ ساری اسکیم میں زبان کو بتدریج پیچھے سے آگے کو بڑھایا گیا ہے) لیکن اُسے ट वर्ग اور क वर्ग کے درمیان رکھا گیا ہے۔

(۳) त वर्ग آج دانت کی جڑ پر زبان کی نوک لگنے سے بنتا ہے لیکن اس کا پانچواں حرف न (ن) دراصل لثّوی ہے یعنی مسوڑھے کے اوپری حصے سے بولا جاتا ہے۔

(۴) انتہائی (अन्तस्थ) حروف کا مطلب نصف حروف ہے۔ اس ضمن کے دو حروف य اور بعض حالتوں میں व کو ساری دنیا میں نصف حرف مانا جاتا ہے لیکن ल اور र کا جیسا تلفظ آج ہوتا ہے اس لحاظ سے انھیں کسی طرح اس شمار میں نہیں لایا جا سکتا۔

(۵) حرکات میں ऋ کا تلفظ "رِ" ہوتا ہے۔ "ر" مستقل حرف ہے اس لیے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ صوت حرکات کے ذیل میں کیوں رکھی گئی جب کہ دراصل یہ ایک متحرک حرف ہے یعنی خالص حرف بھی نہیں بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے ہے۔

لیکن پانینی جیسی بال کی کھال نکالنے والا ماہر لسان اتنی غلطیاں ایک ساتھ نہیں کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ترتیب حروف میں جہاں کہیں کمزوریاں معلوم ہوتی ہیں وہ بعد کی صوتیاتی تبدیلی کا نتیجہ ہی ہو سکتی ہیں۔ حقیقتاً اُس وقت کی ہندوستانی صوتیات موجودہ وقت سے کافی مختلف تھے خاص اختلافات مندرجۂ ذیل تھے —

(۱) پانینی کے وقت میں क वर्ग کے حروف غالباً اوناالحلقیہ تھے یعنی ان میں عقب زبان لشاہ (گلے کے کوّے) کو چھوتا تھا اور क کا تلفظ کچھ کچھ "ق" کی طرح ہوتا تھا۔

(۲) च वर्ग میں نرم تالو کے اگلے حصّے کو وسط زبان سے چھوا جاتا تھا اور च کی آواز کچھ کچھ آج کل क्य کی طرح ہوتی تھی۔ بعد میں دوسرے

صوتیات کے زیر اثر اس ذیل کے معمولی حروف کی آواز تبدیل ہو گئی لیکن ایسے حروف جن کا تلفظ پنڈت لوگ اپنے منتروں میں قدیم طریقے سے کرتے رہے اب بھی پرانے تلفظ سے بولے جاتے ہیں مثلاً ज्ञ درحقیقت ज اور ञ کا مرکب ہے۔ آج کے تلفظ کے لحاظ سے اسے "جنیہ" کی طرح بولا جاتا ہے لیکن یہ ہمیشہ سے شمالی ہند میں "گیہ" کی طرح بولا جاتا رہا ہے (گیہ ग्य)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پرانا ज آج کل کے "گ" کی طرح بولا جاتا تھا۔ اسی لیے اس ذیل کے حروف کو ترتیب میں त थ द ध न کے پہلے رکھا گیا ہے۔

(۳) त थ द ध न کا مقام تلفظ آج کی طرح دانت کی جڑ نہیں بلکہ مسوڑھے کی جڑ تھا اور त اور द کو بالترتیب انگریزی (فرانسیسی نہیں) T اور D کی طرح بولا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے مسوڑھے سے بولا جانے والا न بھی بغیر کسی دقت کے اسی ذیل میں لے لیا گیا۔ یہاں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو پانینی نے اسے दन्त्य (دندانی) نام کیوں دیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب زبان میں کوئی خالص دندانی صوت نہیں ہوتی تو مسوڑھے کے صوتیات کو آسانی سے دندانی سمجھ لیا جاتا ہے۔ انگریزی میں بھی ماہرین صوتیات نے T اور D کو Dental کہا ہے alveolar نہیں۔

(۴) ल اور र کا تلفظ سنسکرت میں غالباً آج کل کی طرح مجہور (Voiced) نہیں تھا بلکہ یہ بہت ہلکے سے یا پھسلا کر بولے جاتے تھے اور تقریباً مہموس (Unvoiced) تھے۔ موجودہ ویلش زبان کا LL کچھ سنسکرت ल کی طرح بولا جاتا ہے۔ اور انگریزی میں حروف صحیح (Consonants) کے بعد یا لفظ کے آخر میں آنے والا R بھی کچھ سنسکرت کے र کی طرح بولا جاتا ہے۔ مہموس تصفیریہ میں نہ زبان کا مس ہوتا ہے نہ گلے میں آواز۔ ساتھ ہی اگر "ش، س" وغیرہ کی طرح سانس کی رگڑ بھی نہ ہو تو انہیں نصف حرکت یا نصف حروف (Semi vowel or Semi Consonant) کہا جا سکتا ہے۔ اسی لیے سنسکرت میں ल اور र کا نام अन्तस्थ غیر موزوں نہیں ہے اور ان حروف کو य اور व کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔

(۵) ऋ، ॠ، ऌ، ॡ دراصل ल اور र کے قریب تھے۔ سنسکرت قواعد میں ऋ کا مقام تلفظ र کا اور ऌ کا مقام تلفظ ल کا دیا گیا ہے۔ ان چار حرکات میں سے ॡ، ऌ، ॠ کا بعد کی سنسکرت میں بھی رواج نہ رہا لیکن ऋ ابھی تک قائم ہے۔ اس کا تلفظ ہلکے र کی طرح ہوتے ہوئے بھی اسے حرکت اس معنی میں کہا جا سکتا ہے کہ سنسکرت میں र بھی اتنا ہلکا تھا کہ اسے نصف حروف کے ذیل میں کر دیا گیا۔ اگر اسے زبان کو ذرا اور آگے کر کے اور بھی ہلکا کر دیا جائے تو ऋ کی آواز پیدا ہوتی ہے جو اپنی اصلی صورت میں (موجودہ صورت میں نہیں) حرکت کہی جا سکتی ہے۔

ان تشریحات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پانینی یا دوسرے سنسکرت قواعد والوں نے سرے سے کوئی غلطی ہی نہیں کی۔ بہت باریک بینی کی جائے تو غلطیاں بھی دکھائی دیں گی۔ یہاں صرف یہ مقصد تھا کہ ظاہری کمزوریوں کی تشریح کی جائے اور سنسکرت کے ابتدائی اصوات کا خاکہ پیش کیا جائے۔

صوتیاتی تبدیلیاں

ان اصوات میں تبدیلی اس وقت شروع ہوئی جب پالی نے ادبی حیثیت سے سنسکرت کی جگہ لینا شروع کی۔ پالی دراصل اس زمانے کی عوامی بولی تھی جس میں سنسکرت کے مشکل اصوات کو آسان یا سخت اصوات کو نرم کر لیا جاتا تھا۔ اس میں ऋ کے مرکبات کو غائب کر دیا جاتا تھا جیسے سنسکرت کے सत्य کو सच्च کر لیا گیا اسی طرح ष، श وغیرہ کو غائب کر دیا جاتا تھا جیسے दुष्कृत کو दुक्कत بنا لیا گیا۔ اسی طرح جہاں ल اور र رہے وہ اپنی پوری آوازی صورت میں ہو گئے۔

اس کے علاوہ یونانی تلفظ نے بھی غالباً ہندوستانی تلفظ میں نمایاں تبدیلی کی ہے۔ یونانی میں دندانی حروف کی آوازیں خالصتاً "ت" اور "د" کی ہوتی ہیں حتیٰ کہ "ن" بھی خالص دندانی ہوتا ہے۔ ان میں "ن" کو چھوڑ کر باقی آوازیں ہندوستان میں لے لی گئیں۔ یونانی "ر" بہت تھرتھرائی ہوئی ہوتی ہے اس کی وجہ سے ہندوستانی र پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ یونانی میں "ک، کھ" اور "گ" کی آوازیں بھی موجودہ ہندوستانی تلفظ کی طرح زم تالو سے پیدا کی جاتی ہیں، حلق سے نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑی اور یونانی تلفظ اور مقامی استعمال کے زیر اثر سنسکرت کے بعض مخصوص تلفظ پہلے سے بہت بدل گئے تھے۔ منتروں وغیرہ میں پرانے تلفظ ضرور قائم رہے ہوں گے لیکن رامائن اور مہابھارت کی تصنیف کے بعد تحریری زبان کی اشاعت کی وجہ سے ان منتروں پر بھی اثر پڑنا لازمی تھا۔ ہاں وہ

آوازیں جو خالص سنسکرت الفاظ ہی میں ہوسکتی تھیں (مثلاً श اور क्ष) لیے مخصوص حروف باقی رہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بعد میں زیادہ تر لوگوں نے श کو "کیہ" اور क्ष کو "کھ" یا "چ" کی طرح بولنا شروع کر دیا۔ بنگالی میں ख کا تلفظ بھی "کھ" ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ان کی زبانیں فارسی اور عربی بھی ہندوستان میں آئیں اور یہاں کی مخصوص زبانیں ہو گئیں (اسی طرح جیسے برطانوی حکومت کے زیر اثر انگریزی کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور انگریزی تلفظ کا فیشن یہاں تک ہو گیا تھا کہ بعض حضرات جو سیدھے سادے "لال" تھے اپنے نام کو انگریزی میں Saal کی بجائے Saal لکھنے لگے تھے)۔ عربی فارسی نے ہندوستان کو نئے اصوات بھی دیے۔ اور اسی لیے عربی، فارسی صوتیات کا اجمالی ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ عربی میں ا، ب، ج، د، ہ، و، ز، ح، ط، ی، ک، ل، م، ن، س، ع، ف، ص، ق، ر، ش، ت، ث، خ، ذ، ض، ظ، غ، اٹھائیس حروف ہیں۔ جب یہ حروف ایران پہنچے تو ان میں پ، چ، ژ اور گ اور حرکات میں نون غنہ کا اضافہ ہوا۔ ہندوستان آنے پر مسلمانوں نے مقامی تلفظ کی مشکلوں کو حل کرنے کے لیے ٹ، ڈ، ڑ اور ھ کا اضافہ اپنے رسم الخط میں کر لیا لیکن سنسکرت کے क्ष ज्ञ ड़ ण اور ञ ان کی پکڑ میں نہ آئے اور وہ ان کے لیے رسم الخط میں علاحدہ حروف وضع نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ مقامی استعمال کے زیر اثر مؤخر الذکر چار اصوات ہندوستان میں بھی موثر طور پر اپنی جگہ کھو بیٹھے تھے۔

ایران میں عربی رسم الخط کی ترویج کے وقت فارسی میں عربی کی ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع اور ق کے اصوات نہ تھے۔ چنانچہ شروع میں عربی الفاظ کو بھی مفرس کر کے بولنے کا رجحان نظر آتا ہے مثلاً عربی "آقا" ایران میں آ کر "آغا" ہو گیا لیکن بعد میں فارسی الفاظ بھی خالص عربی طرز پر لکھے جانے لگے (جیسے مسٹر لال اپنا نام Saal لکھنے لگے تھے)۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ نقل نقل ہی رہی ہوگی اور یہ امر بہت مشکوک ہے کہ عربی ص، ض، ط اور ظ کی تفخیم (زبان کا پچھلا حصہ کھینچ کر بھاری آواز پیدا کرنا) اور ث اور ذ کے امالہ (دانتوں کے درمیان نوک زبان لا کر حروف کو ہلکا سا نا) کو ایرانی لوگ کبھی صحیح طور پر ادا کر سکے ہوں گے۔

مثلاً سیدھے سادے تپیدن کو عالمانہ زعم میں طپیدن لکھ دینا تو آسان ہے لیکن "ط" کی سخت آواز کے فوراً بعد "پ" کی ہلکی آواز نکالنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ "ض" کے ساتھ ہندوستان میں ایک دلچسپ بات دکھائی دیتی ہے۔ موجودہ عربی ماہر صوتیات اسے حروف شدیدہ کے ذیل رکھتے ہیں یعنی اسے مفخمہ (سخت قسم کے) "د" کی طرح بولا جاتا ہے لیکن ہندوستان میں اسے تصفیریہ صورت میں یعنی "ز" کی طرح بولا جاتا ہے۔ چوں کہ ایرانی فارسی میں حروف مطبقہ (جن میں زبان کا پچھلا حصہ اٹھ جائے) کا فقدان تھا اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی یا تو اس صوت کی شناخت میں دھوکا کھا گئے یا پھر اسے ٹھیک طرح ادا نہ کر سکے چنانچہ یہ تصرف یا تو خود انھوں نے کیا یا ان کی وجہ سے ظہور میں آیا۔

ہندوستان میں عربی "ل" اور "و" کے تلفظ میں بھی فرق دکھائی دیتا ہے۔ عربی "ل" اپنی اصلی صورت میں دندانی ہے یعنی نوک زبان کو دانتوں کی جڑ میں لگانے سے بنتا ہے۔ لثویہ صورت میں یہ لفظ "اللہ" میں یا پھر مطبقہ حروف (ط، ظ، ص، ض، وغیرہ) کے ساتھ آتا ہے۔ ہندوستان میں اس کا تلفظ بالکل لثویہ (مسوڑھے کا) ہے۔ "و" عربی میں نصف حرکت کی طرح زبان کے پچھلے حصے سے بولا جاتا ہے جیسے انگریزی کا "w"۔ لیکن ہندوستان میں سنسکرت "व" اوپری ہونٹ اور نیچے کے دانتوں کے ملنے سے انگریزی "v" کی طرح بولا جاتا ہے۔ چنانچہ عربی "و" بھی ہندوستان میں آ کر شفیہ دندانی ہو گیا۔

بہرحال ہندوستان کے لیے عربی فارسی "ث، ح، خ، ذ، ز، ژ، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق" کے اصوات نئے تھے۔ ان میں سے خ، ز، غ، ف اور ق کو آسانی سے زبان پر رواں کر لیا گیا ہے اور شمالی ہند کے اردو داں طبقے میں ان اصوات کا صحیح طور پر ادا کرنا تعلیم و تربیت کے لوازمات میں سے ہو گیا۔ بلکہ دیوناگری رسم الخط میں بھی بالترتیب ख، ज، ग، फ اور क के نیچے نقطے دے کر ان اصوات کے لیے حروف بنا لیے گئے۔ لیکن باقی کا یہ حال رہا کہ "ث اور ص" کو "س" کی طرح، "ح" کو "ہ" کی طرح، "ط" کو "ت" کی طرح، "ع" کو "ا" کی طرح، "ذ، ژ، ض اور ظ" کو "ز" کی طرح بولا جاتا رہا۔ ان میں بھی "ح، ژ، اور ع" کو علما صحیح طریقے پر بولتے رہے،

× حال ہی میں کچھ ہندی بیلسٹروں نے، جنھوں نے اردو شاعری کو ہندی میں دیا ہے "ع" کو अ کے نیچے نقطہ دے کر ظاہر کیا ہے لیکن وہ صرف اس کو حرکت فتحہ اور "ا" کے ساتھ ہی ظاہر کر سکتے ہیں مضموم یا مکسور "ع" کو دیوناگری میں ظاہر کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی

(۲) अ یہ "ام" جیسی آواز ہے جو موجودہ ہندی میں لفظ "اگ" کی طرح بولا جاتا ہے۔ (کچھ سنسکرت داں ان کے خیال سے یہی تلفظ صحیح ہے) کچھ لوگ ہندی میں غلطی سے اس نشان کو ہمزہ کے طور پر بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ اس کا استعمال سنسکرت الفاظ تک محدود ہے۔

(۳) आ یہ "آ" جیسی آواز والی ممدود حرکت ہے اس کا استعمال بھی صرف سنسکرت الفاظ میں ہوتا ہے۔

(۴) ऋ یہ ایک خالص سنسکرت علامتی حرکت ہے جو "رِ" کی طرح بولی جاتی ہے

(۵) ॠ یہ ऋ کی ممدود صورت ہے۔ یہ صوت ویدک سنسکرت کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔

(۶) ऌ یہ "لر" کی طرح بولی جانے والی مقامی حرکت ہے ویدک سنسکرت کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی

(۷) ॡ یہ ऌ کی ممدود صورت ہے ویدک سنسکرت کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔

اس کے علاوہ دو حرکات مصلہ (Dipthongs) بھی ہیں یعنی ऐ (अ + ए) اور औ (अ + ओ)۔

حروف ہندوستانی حروف کا نقشہ مندرجہ ذیل ہے۔۔۔

	شدیدہ مہموس بے نفس	شدیدہ مہموس منفوس	شدیدہ مجہور بے نفس	شدیدہ مجہور منفوس	انفی	مکررہ بے نفس	مکررہ منفوس	تصفیریہ سخت	تصفیریہ نرم	جانبی
اقصی الحلقیہ	ء							ہ		
وسط الحلقیہ								ح	ع	
ادنی الحلقیہ	ق							خ	ع	

	شدیدہ مہموس بے نفس	شدیدہ مہموس منفوس	شدیدہ مجہور بے نفس	شدیدہ مجہور منفوس	انفی	مکررہ بے نفس	مکررہ منفوس	تصفیریہ سخت	تصفیریہ نرم	جانبی
اقصی الحنکیہ	ک	کھ	گ	گھ	ङ					
وسط الحنکیہ	ٹ	ٹھ	ڈ	ڈھ	ण	ڑ	ڑھ	ष	[illegible]	ळ
ادنی الحنکیہ	چ	چھ	ج	جھ	ञ				ی	
لثۃ المطبقہ×	ط		ض					ص	ظ	
لثویہ					ن	ر		ش	[illegible]	ل
دندانی	ت	تھ	د	دھ				س	ز	
وسط دندانی								ث	ذ	
شفہ دندانی								ف	و	
شفویہ	پ	پھ	ب	بھ	م					

اس مضمون کو ختم کرنے کے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس میں صرف مستقل اصوات (Phonemes) کی بحث کی گئی ہے۔ درمیانی اصوات (Glides) لحنی (Pitch) وسعت (Quality) زور (Stress) وغیرہ اور ان کے اثر سے مسلسل تقریر میں پیدا ہونے والے تصوتات نیز مختلف زبانوں کی اعضائی بنیاد (Organic Basis) کی بحث اس میں نہیں ہے مندرجہ بالا امور کی بحث کے بغیر صوتیاتی مطالعہ مکمل بالکل نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ایک تو ان امور کا بیان بہت تشریح طلب ہے اور ایک مختصر مضمون میں اس کی گنجائش کہاں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کا صوتیاتی مطالعہ غالباً ابھی باقاعدہ طور پر شروع ہی نہیں کیا گیا ہے اور ان کی اعضائی بنیاد وغیرہ پر کوئی قطعی فیصلہ دینا قبل از وقت ہی کہا جائے گا۔

× لثۃ المطبقہ اور وسط دندانی حروف کی ہندوستانی زبانوں میں کوئی صوتیاتی جگہ نہیں ہے۔ اردو، کشمیری وغیرہ میں ان کی صرف تحریری اہمیت ہے

دوسرا منظر

آسمان کی شام ہو رہی ہے آدم کے گرد رنگین بادل
بے مہر ہیں، قوس قزح کا ہفت رنگ دائرہ
آدم کے سر پر آہستہ آہستہ گردش کر رہا ہے،
اس کی نیم نگاہیں باغ فردوس کی جانب
مرکوز ہیں۔ اچانک نغمگی کی سی موسیقی کے ساتھ
رضواں آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آدم کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی ہے

رضواں (قریب آکر)

اے حریمِ تخلیق دو عالم کے امیں
پا سکا تیرے تجھ سے ہی دردِ حزیں
روح وہ گردوں ہو کہ نورِ گیتی
آئی تیرے سوا کوئی نہیں کوئی نہیں
کیا بات ہے جو یاد کیا ہے مجھ کو

آدم: لگتا ہے کہ کچھ یہاں سرگوشیاں سنتا ہوں میں
ایک گہری فکر سے ہر وقت سرد آہوں میں
کیا بتا سکتا ہے اے رضواں! وہ اسرار حروف
یہ نصائے قدسیاں عرش اور مبہم حروف

رضواں (ادھر اُدھر دیکھ کر)

خلد کی سرگوشیاں بھی آج سمجھی جیرئیں

آدم: کچھ تو کہہ بڑھنے لگا ہے میرے دل کا اضطراب

رضواں (ذرا تامل کے بعد)

سن کہ کہتا ہوں سرا پردۂ فطرت کے رموز
تجھ سے اب تک ہیں نہاں قلبِ بشریت کے رموز
جب تری غایتِ تخلیق ہوئی عرش پہ فاش
پس ہویدا ہوئی دل میں فرشتوں کے خراش
یوں سرِ کنگرۂ عرش سے آئی آواز
خاطرِ آدم خاکی ہے مرا محرمِ راز

کل وہی خسروِ اقلیمِ دو عالم ہوگا
میرے پرتو کا وہی نورِ مجسم ہوگا
آسماں کیا ہے فرشتوں کا بھی مسجود ہے وہ
منزلِ عالمِ آفاق کا مقصود ہے وہ
قولِ یزداں پہ فرشتوں کے جگر کانپ گئے

آدم: آگے پھر کچھ نہ ہوا؟

رضواں: کیوں نہیں بارگہِ حق میں فرشتوں نے کہا
خالقِ ارض و سماوات، وہ سب کے داتا
سست ہے فطرت آدم کی ازل سے بنیاد
روئے گیتی پہ اُٹھائے گا یہ طوفانِ فساد
بات سن کے فرشتوں کی کہا داور نے
اس کے اسرار کو تم جان سکو گے کیسے
زیرِ لب جب سے فرشتوں میں یہی ہیں اذکار
جانے کیا تجھ سے ہیں وابستہ جہاں کے اسرار

(آدم کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کی شمعیں روشن ہو جاتی ہیں اور ایک گہرا سناٹا چھا جاتا ہے)

تیسرا منظر

حوضِ کوثر سے ذرا دور درختوں کے جھنڈ کے قریب "بہشتی حور" صنفِ نازک کی سحر طرازی کے جلو میں لطافتوں کا دامن تھامے، غمزوں اور رعنائیوں کے زیور سے مرصع لیکن اس وقت اداس بیٹھی ہے۔ صبیح پیشانی پر پسینے کے ننھے قطرے موتیوں کی طرح جھلملاتے ہیں۔ آدم اس کے گیسوئے مشک رنگ کو سلجھاتے ہوئے عرض کرتا ہے

آدم: تو کچھ ملول نہ ہو اے نگارِ شہرِ طرب
گرے جو گرتی ہے مجھ پر کسی کی برقِ غضب
خطا ہوئی ہے مگر عفو اس قفس میں کہاں
یہاں تلافیٔ مافات اپنے بس میں کہاں

یہاں اجازتِ گریہ نہ رسمِ داد رسی
یہاں حکایتِ مژگانِ خوں چکاں کیسی
یہاں ثباتِ تعمیر، نہ انقلابِ سکوں
فتنہ ہائے خرد ہیں نہ رنگِ جوشِ جنوں
سلام ایسے مقاماتِ پُر سکوں کو سلام

حوّا۔ نہ جانے کتنے حوادث کا سامنا ہوگا
نہ جانے کہاں کی ہے آوارگی مقدر میں

(رسون داخل ہوتا ہے)

ہے یہ فرمانِ صاد و مدہاں
تجھ کو جنّت سے نکلنا ہوگا
جانے کب تک میرِ بزمِ گیتی
شمع کی طرح پگھلنا ہوگا

آدم حوّا پر ایک حسرت آگیں نظر ڈالتے ہوئے اس فردوس کے مغربی رخ سے نخلستان کے ... ہوئے زمین کو جھکے ہوئے رستہ کی طرف اتر جاتا ہے۔

حوّا (آدم کو رخصت کرتے ہوئے)

رخصت اے طرۂ تاجِ ہستی
رخصت اے انجمنِ سرمستی
اس بلندی کو کبھی بھول نہ جا
دہر کیا ہوگا اندھیرے کے سوا
ہر قدم حلقۂ زنجیرِ ہوس
گردشِ رنگِ طرب کا وہ قفس
ہر نفس تلخیِ صہبائے حیات
کاٹتی صبح، وہ ڈستی ہوئی رات
پھر بھی کچھ غم نہیں اے رہروِ نو
تیرے سینے میں ہے احساس کی ضو
تجھ سے ہر سمت اُجالا ہوگا
دُور دنیا سے اندھیرا ہوگا

آخری منظر

کائنات کی انتہائی سرحدوں میں، لق و دق صحرا، فلک بوس کوہسار اور روح فرسا وادیوں کے بیچ ایک سناٹے کے درمیان آدم کی نگاہیں چاروں طرف اُٹھتی ہیں۔ دور دور تک تاریکی کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ طبیعت گھبرانے لگتی ہے۔ تنہائی کے شدید احساس سے گنگنانے لگتا ہے۔

نہ جانے لے کے کہاں آگئی مری تقدیر
قدم قدم پہ ہیں یہ اجنبی سے نظارے
کہاں وہ جلوۂ فردوس زندگی آموز
کہاں یہ ظلمتِ شب، دُھندلے دُھندلے سیارے
یہ کوہسار، یہ وادی، یہ گونگے دشت و دمن
یہ دل خراش خموشی، یہ تیرہ رو دھارے
نہ ذوقِ حسن، نہ کچھ خوش سلیقگی کا شعور
نہیں کسی میں ابھی کوئی زندگی کا شعور

کوہسار۔ تجھے خبر ہی نہیں اے چراغِ بزمِ حیات
چھپے ہیں تیری ہی مٹھی میں لاکھ بدرِ منیر
تری نگاہ میں مضمر ہے میرے دل کا گداز
کہ تیرے ہاتھ کی گرمی میں عظمتِ تعمیر
مرا وجود ہی کیا، میری یہ صلابت کیا
کہ تیرے دامِ عمل میں ہے کائنات اسیر

وادیِ صحرا۔ ترے جمال کو صدیوں سے ہم ترستے تھے
کہ ہم تمام ہیں تیرے خیال کے پابند
بسا دے ہم کو بھی آئینہ دارِ خلدِ بریں
تو چاہے ڈال ستاروں پہ کہکشاں پہ کمند
جدھر بھی تیرے عزائم کا قافلہ ہوگا
زمیں کی قسمت برگشتہ ہوگی اور بلند

(بقیہ صفحہ ۳۷ پر)

ہو کر راجہ جھاؤلال کی زیر کمان فوج میں سے نجیبوں کی چار پلٹنوں اور تلنگوں کی بھی چند پلٹنوں کو جو اپنی چڑھی ہوئی تنخواہ طلب کرتی تھیں اسی روز برطرف کردیا۔ راجہ جھاؤلال اب بھی مختارالدولہ کی مخالفت سے باز نہ آئے اس پر مختارالدولہ نے دربار سرکار عالی میں ان کی حاضری موقوف کردی مگر آصف الدولہ اُن سے بہت مانوس تھے اس لئے آپ ان کے مکان پر گئے اور ان کی تسلی اور دلداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

مختارالدولہ نے جب دیکھا کہ نواب میرے دام میں پھنس گئے ہیں تو عرض کیا کہ اگر فدوی کی عزت اور وقار کو برقرار رکھنا منظور ہے تو میرے مخالفوں اور معاندوں کو میرے تصور میں سامنے ہونے سے ممانعت فرما دیجئے۔ نواب نے ان کی عرض قبول کرلی اور اپنی خواصی میں بٹھا کر دولت خانے لے آئے۔ مختارالدولہ نے اپنے مخالفوں کو نہایت زجر و تہدید سے بُلا کر اُن کے تمام مناصب مراتب چھین کر معزول کردیا۔ راجہ جھاؤلال نے بجز اطاعت کوئی صورت اپنے مفر کی نہ دیکھی اس لئے مختارالدولہ کو بذریعہ قول و قسم اپنی طرف سے بالکل مطمئن کردیا اور پھر اپنے منصب مرتبہ پر بحال ہوگئے۔

بسنت علی خاں خواجہ سرا اور راجہ جھاؤلال میں قلبی اتحاد تھا۔ بسنت علی خاں کے پاس کثیر فوج بھی تھی۔ مختارالدولہ نے سوچا کہ اس فوج میں اور راجہ جھاؤلال کی فوج میں اگر کافی تخفیف ہوجائے تو یہ دونوں ہمیشہ میرے مطیع اور فرمانبردار بنے رہیں گے۔ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے اٹاوہ کے بندوبست کے لئے روانگی کا عزم ظاہر کیا اور آخر ماہ شعبان ۱۱۸۹ھ کو بڑے لاؤلشکر کے ساتھ نواب آصف الدولہ کے ہمرکاب کوچ کیا جب مہدی گھاٹ پر پہنچے تو کشتیوں کا پُل بنوا کر جھاؤلال اور بسنت علی خاں کی چند پلٹنیں دریا کے اس پار اُتروادیں۔ اس کے بعد حکم دے دیا کہ پُل توڑ کر کشتیاں ہٹالی جائیں پھر دریا کے کنارے توپیں لگوادیں اور انگریزی فوج کا ایک دستہ جو بلگرام میں مقیم تھا اُسے طلب کرکے حکم دے دیا کہ ان سپاہیوں کو یہاں سے بھگا دو اور ان کی برطرفی کا حکم بھی صادر کردیا۔ جب سپاہیوں پر یہ فریب ظاہر ہوا تو لڑنے مرنے پر کمربستہ ہوگئے اور بڑا ہنگامہ برپا کیا۔ قریب تھا کہ سارا شہر لُٹ جائے اتنے میں ریزیڈنٹ جان برسٹو صاحب (John Bristow) ہاتھی پر سوار ہو کر اور چند ملازم ساتھ لے کر دریا کے اُس پار پہنچے اور سپاہ کو مخاطب کرکے کہا کہ جب نواب نے تم کو جواب دے دیا تو تمھیں لڑنے بھڑنے اور کشت و خون کرنے کا کیا حق ہے۔ سپاہیوں نے بقایا تنخواہ کا عذر پیش کیا۔ ریزیڈنٹ نے اُسی وقت اپنے کارندوں کو حکم دے دیا کہ خزانہ سے روپیہ لاکر سولہ دن کی چڑھی ہوئی تنخواہ تقسیم کردیں اور بعد ازاں رقمیں لے کر سپاہیوں کو لشکر کے باہر کردیں۔

اس واقعہ کے بعد راجہ جھاؤلال اور بسنت علی خاں نے ایک دن آصف الدولہ سے عرض کیا کہ ہم لوگ جو حضور کے ساتھ بزم نشاط گرم کرتے ہیں تو یقین ہے کہ مختارالدولہ ہم کو آب شمشیر سے سرد کردیں گے۔ آصف الدولہ پر ان کے اس کہنے کا کچھ اثر نہ ہوا اور ایک دن خالی گیا تو پھر عرض کیا کہ کروڑ روپیہ کا حساب مختارالدولہ سے لینا چاہئیے اس پر بھی موصوف نے کچھ التفات نہ کیا۔ جب یہ تیر بھی نشانہ پر نہ پڑا تو دونوں نے یہ طے کیا کہ جناب عالی بستر خواب پر آنکھیں کھول کر سب سے پہلے مختارالدولہ کی صورت دیکھتے ہیں اور وہ بھی کورنش سلامی کے لئے دولت پر حاضر ہوتے ہیں بہتر یہ ہے کہ اُسی وقت مختارالدولہ کے گولی مار کر اُن کا کام تمام کردیا جائے۔ مرزا حسن رضا خاں سرفرازالدولہ اس مشورہ میں شریک تھے ان سے اور مختارالدولہ سے قریبی رشتہ داری تھی۔ انھوں نے مختارالدولہ کو یہ سب بتادیا۔ یہ خبر سُن کر اُن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور صبح کو آصف الدولہ کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے۔ دو مرتبہ سرکاری عصابردار بُلانے آیا مگر مختارالدولہ نے ہر مرتبہ طبیعت کی ناسازی کا حیلہ کرکے ٹال دیا۔ جب تیسری بار وہ یہ پیغام لایا کہ جو علاج تم وہاں کرسکتے ہو وہ یہاں بھی ممکن ہے مناسب ہے کہ جلد چلے آؤ۔ عصابردار نے یہ بھی بتایا کہ جناب عالی انتظار میں ابھی تک خواب گاہ سے برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ اس پر مختارالدولہ چھ سات سو سوار اور کچھ عزیز و اقارب اپنے ساتھ لے کر پہلے جان برسٹو صاحب ریزیڈنٹ کے پاس گئے تاکہ اُن کو بھی ان حالات سے باخبر کردیں۔ یہ واقعات شہر اٹاوہ میں رونما ہوئے۔ اتنے میں آصف الدولہ کو یہ خبر ہوئی کہ مختارالدولہ میرے پاس آنے کے بجائے ریزیڈنٹ کے یہاں گئے ہیں تو وہ بھی وہاں کے لئے فوراً روانہ ہوگئے۔ ریزیڈنٹ کے سامنے مختارالدولہ نے سلسلۂ کلام شروع ہی کیا تھا کہ جناب عالی کی آمد آمد کی خبر ہوئی۔ مختارالدولہ اور ریزیڈنٹ دونوں نے موصوف

[illegible] دو لعد حیدر بیگ خاں [illegible] تجارت [illegible] لطیف [illegible] مات سرفرازی [illegible] حشمت
[illegible] مامات صاحب [illegible] آصف الدولہ [illegible] ۔ مدد [illegible] دست و
[illegible] حاضر [illegible] لطیف [illegible] داخت ملک
[illegible] واقع [illegible] داشت کہ الاد
[illegible] یا دہ میں قید
[illegible] نے کات پائی
[illegible] فرورک لئے [illegible]
[illegible] مہربان [illegible] الدولہ
[illegible] کے ہاتھ [illegible] کر فرمایا کہ [illegible]
[illegible] مالا [illegible] لکھ [illegible] میں [illegible]
[illegible] تو [illegible] آسمان [illegible]
[illegible] کا پیالہ ہے ۔

[illegible] کی [illegible] کا سبب یہ تھا کہ [illegible]
[illegible] بہت ناخوش تھے اور اس کاٹے کو ہمیشہ کے لئے
[illegible] سبست علی خاں اور راجہ جھاؤ لال دلو
[illegible] آصف الدولہ مختار الدولہ کے معاندین کو اپنا
بہی خواہ تصور کرتے تھے مگر از راہ دنیا سازی مختار الدولہ کو اپنے
ظاہری برتاؤ سے بہلاوے میں ڈالے ہوئے تھے بہرحال نواب آصف الدولہ
[illegible] حیدر بیگ خاں نے [illegible] کو معزول کر کے راجہ
جھاؤ لال کو بریلی کی حکومت سپرد کر دی ۔ جھاؤ لال کے نائب اُن کے
ایک رشتہ دار بھگوان داس نے وہاں ایسی بے اعتدالیاں و بدعنوانیاں
کیں کہ ایک تحصیل نے ان کو لقمہ حیات کسی خازن حقیقی کے سپرد کر دیا ۔ چنانچہ
حیدر بیگ خاں نے صوبہ بریلی جھاؤ لال سے نکال کر ایک دوسرے
شخص مرزا مہدی کے حوالہ کر دیا اور حساب کی خانہ پُری کے لئے جھاؤ لال
کا مکان و اثاث البیت ضبط کرنے کے علاوہ خود راجہ کو بھی زیر حراست
کر دیا ۔ عرصہ ڈیڑھ سال کے بعد وہ حیدر بیگ خاں کو مطمئن کر کے
قید لیلائے آزادی سے ہم آغوش ہوگئے

نواب آصف الدولہ کے ایک وزیر راجہ ٹکیٹ رائے نے سنہ ۱۲۱ھ
میں مہاجنان شہر کی ایک فرد قرضہ تعدادی چھپتّر لاکھ روپیہ آصف الدولہ
کے حضور میں پیش کی اور عرض کیا کہ اس کا سود باعث نقصان سرکار ہے ۔
موصوف کو کاغذات کی جانب مطلق توجہ نہ تھی ۔ فرد دیکھ کر نہایت برافروختہ
ہوئے اور جھاؤ لال کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ جب تک حیدر بیگ خاں
زندہ رہے ہم کو حساب کتاب کی کبھی زحمت نہ دی اگر ہم بذات خود اس
کام کی طرف متوجہ ہوں تو یہ کارپرداز لوگ جو لاکھوں روپے اپنی خدمات
کا لیتے ہیں محض بیکار ہیں ۔ یہ سُن کر جھاؤ لال کے لبوں پر مہر خاموشی لگ گئی ۔
جب نواب نے دوبارہ ارشاد کیا تو جھاؤ لال نے عرض کیا کہ ٹکیٹ رائے
مہاجنان شہر سے سازش کئے ہیں ۔ جو اُن کا دارو غہ ٹکیٹ رائے کا بھائی
سمجھا جاتا ہے ۔ اُس کو آج اتنی مقدرت ہے کہ چاہے تو چاندی کی عمارت
تعمیر کرالے اور یہ سب حضور ہی کی جوتیوں کے تصدق میں ہے ۔ بالآخر
آصف الدولہ نے جھاؤ لال کو حکم دیا کہ مہاجنوں سے خود گفتگو کریں اور
رائے بالک رام (رشتہ دار جھاؤ لال) کو ان کا محاسبہ مقرر کیا جائے
تحقیق و تفتیش کے بعد حسب فیصلہ بالک رام مہاجناں کا صرف گیارہ لاکھ روپیہ
ریاست بر آمد ہوا باقی پورا حساب مصنوعی و جعلی ثابت ہوا جب نواب
نے سُن در ملاحظہ کی تو ٹکیٹ رائے کی حیات مرزا حسن رضا کی غفلت
اور راجہ جھاؤ لال کی امانت و دیانت اور دولت خواہی دل پر نقش
ہوگئی اور چاہا کہ انھیں کو سلطنت ریاست سے سرفراز کریں جب
ٹکیٹ رائے نے دیکھا کہ میری آبرو پر آنچ آنے کا اندیشہ ہے تو گھبرا کر عفو
تقصیر کے لئے سرفراز الدولہ کے پاس گئے اور عرض کی اب میری عزت آپکے
ہاتھ میں ہے ۔ انھوں نے رحمدلی سے کام فرما کر ضریح کے سامنے ہاتھ
اٹھایا کہ اگر میں نیب رہوں گا تو تم بدستور میرے نائب رہو گے خاطر
جمع رکھو ۔

ایک دن آصف الدولہ خود مرزا کو سمجھانے کی غرض سے اُن کے پاس
تشریف لائے اور کمال نوازش سے فرمایا بھائی مرزا ہماری ایک بات
مان لو ' جھاؤ لال کو اپنا نائب کر لو ' یہ تمھاری رفاقت سے کبھی باہر نہ ہوگا
دگرنہ تمھیں اختیار ہے ' اسی وقت موقوف کر دینا ' میں ضامن ہوتا ہوں مگر
مرزا نے عرض کی ' غلام ٹکیٹ رائے سے قسم کھا چکا ہے ٹکیٹ رائے
کا نام سنتے ہی پُرغضب ہو کر ارشاد کیا " پرائے گھر پرائی حکومت "
یہ فرما کر سوار ہوگئے اور نیب اور نائب دونوں معطل ہوگئے ۔

اس وقت آصف الدولہ کی راجہ جھاؤلال پر بہت لطف و کرم کی نظر تھی۔ موصوف انھیں کو اپنا نائب بنانا چاہتے تھے اسی نیت سے انھوں نے کارِ نیابت ظاہر بظاہر اپنے ہاتھ میں لے لیا مگر فی الحقیقت سیاہ و سفید کا اختیار راجہ جھاؤلال کو دے دیا۔ راجہ جھاؤلال نے ریذیڈنٹ کے میر منشی غلام قادر خاں کا تھوڑا سا سہارا پا کے انتظام کی چولیں درست کیں۔ افسرانِ فوج، نواب کے اعزا و نواب برہان الملک اور صفدر جنگ کے پس ماندگان کے مصارف میں کاٹ چھانٹ کرکے بچت کی ایسی صورت نکالی کہ انگریز ساہوکار کا ڈیڑھ کروڑ روپیہ جو راجہ ٹکیت رائے کے وقت سے واجب الادا چلا آتا تھا وہ بیباق ہو گیا اور خزانے سے چالیس لاکھ روپے لے کر بکریدوں کا سارا قرضہ ادا کر دیا اور جو کچھ باقی رہ گیا اس کی ادائی کے لئے چھ اقساط بلا سودی مقرر کرالیں۔ اس کے علاوہ خزانہ کو بھی زرِ نقد سے معمور کر دیا اور نواب کے امورِ خانگی میں بھی کفایت سے کام لیا۔ چنانچہ جنابِ عالی اکثر فرماتے تھے کہ "مرزا حسن رضا خاں اور ٹکیت رائے نے ہمارا گھر تباہ کر دیا مگر جھاؤلال نے پھر آراستہ کر دیا۔"

راجہ جھاؤلال نے ریاست کا اندرونی انتظام تو اپنی حسنِ تدبیر سے درست کر دیا مگر گورنر جنرل اور ان کی کونسل کو اپنا ہمنوا نہ بنا سکے بلکہ جو کارروائی وہ کرتے تھے وہ اُن لوگوں کے دل پر تیر دشتریں کر لگتی تھی۔

راجہ جھاؤلال نے کالپی کے مرہٹوں سے خفیہ طور پر پیام و سلام شروع کر دیا۔ ان کا ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تخبس طوائف سے تھیں۔ لڑکے کو انھوں نے ہمت بہادر کی بیٹی سے بیاہا اور اپنی ایک بیٹی کی شادی ہمت بہادر کے فرزند کے ساتھ کر دی تاکہ سلسلۂ اتحاد قومی ہو۔ دوسری بیٹی محمد بخش خاں تورانی ابن قدرت اللہ بیگ خاں ساکن شاہجہاں آباد (دہلی) کے ساتھ بیاہ کر دی اور رام پور سے عمر خاں بڑے مونچھے کو بلا کر نواب کی سرکار میں ملازم کرا دیا۔ راجہ جھاؤلال چاہتے تھے کہ سید نصیر اللہ خاں کو نواب احمد علی خاں والیٔ رامپور کے عہدۂ نیابت سے برطرف کرا کے عمر خاں کو وہاں کا نائب مقرر کرا دیں تاکہ رام پور کے افغانوں، شاہجہاں آباد کے تورانیوں، اور کالپی کے مرہٹوں کا اتحاد و یک جہتی برقرار

ضرورت کام آئے۔ پھر جب زماں شاہ والیٔ کابل نبیرۂ احمد شاہ ابدالی کی لاہور کی طرف آمد کی خبر مشہور ہوئی تو راجہ جھاؤلال اس کی خدمت میں بھی خفیہ پیغام بھیج کر امداد کے طالب ہوئے اور قلعہ الٰہ آباد کی مرمت کرا کے مشہور کر دیا کہ اگر ابدالی کی فوج اودھ پر چڑھائی کرے گی تو قلعہ الٰہ آباد میں پناہ لی جائے گی۔ یہ تمام خبریں کونسل کلکتہ تک پہنچیں تو گورنر جنرل اور اس کی کمیٹی کو گمان ہوا کہ جھاؤلال آصف الدولہ کو مخالفت پر ابھار رہے ہیں چنانچہ گورنر جنرل نے اس حیلہ سے کہ اگر ابدالی کا لشکر اودھ کا رخ کرے تو ہم سدِ راہ ہوں گے، قلعہ مذکور میں انگریزی فوج اتار دی۔ مگر زماں شاہ بعض وجوہ سے قندھار کی طرف واپس چلا گیا۔

مارچ ۱۷۹۶ء (۱۲۱۰ھ) میں سر جان شور گورنر جنرل تفضل حسین خاں علامہ کو ساتھ لے کر حیلہ تدارکِ زماں شاہ بنارس آئے اور وہاں سے کچھ انگریزی فوج ہمراہ لے کر بعض سیاسی امور پر گفتگو کرنے لکھنؤ آئے۔ جب زماں شاہ کی واپسی کابل کی خبر ملی تو ماہ شوال ۱۲۱۱ھ میں نواب سے رخصت ہو کر بنارس واپس چلے گئے مگر چلتے وقت انھوں نے نواب سے درخواست کی کہ راجہ جھاؤلال کو جن کی ذات سے مفسدہ پردازی اور فتنہ انگیزی کی اکثر خبریں سنائی دیتی ہیں ہمارے حوالہ کر دیجئے۔ چونکہ راجہ کی خفیہ مراسلت اور دیگر سیاسی کارروائیوں کا راز سربستہ حکام انگریزی پر کھل گیا تھا اس لئے جنابِ عالی سے انکار کرتے نہ بن پڑا اور راجہ بحکم سرکار بہ عزت مع مال و اسباب، نقد و جنس، عزیز و اقارب، متوسلین و ملازمین، لکھنؤ سے روانہ ہو کر پٹنہ (عظیم آباد) میں مقیم ہو گئے۔ ان کی روانگی شہر لکھنؤ میں ایسا عالم تھا سب محلوں میں خصوصاً ان سے ملازمین و متوسلین جانے والے تھے قیامتِ صغریٰ برپا تھی۔ تاہم جب تک راجہ بقیدِ حیات رہے حکام اعلیٰ موصوف سے بڑے اعزاز و احترام سے پیش آتے رہے۔ فریڈرک جان شور (Frederick John Shore) نبیرۂ سر جان شور متوفی گورنر جنرل ہندوستان نے بھی راجہ جھاؤلال کی جلاوطنی کا سبب

گورنر جنرل نے نواب شجاع الدولہ سے کئی بار کہا کہ سارس کمپنی کے

[1] Oudh & its Princes, and its Government vindicated by Frederick John Shore

حوالے کر دیں مگر وہ کسی طرح رضامند نہ ہوئے۔ شجاع الدولہ کی رحلت کے بعد جان برسٹو (John Bristow) ریزیڈنٹ اودھ نواب آصف الدولہ کے نائب مختار بن جانے کی کوشش میں اپنا مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ حکام انگریزی نے یہ خیال کر کے کہ واقعات ان ہی کے باعث راجہ جھاؤ لال تھے اور وہ ہی نے تمام عملداری میں ابتری پیدا کر دیا حالانکہ وہ بالکل بے قصور تھے۔"

اپنے پرانے محسن کی جدائی سے آصف الدولہ کے دل پر ایسا گہرا صدمہ ہوا کہ اس نے ان کی زندگی وبال کر دی۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے حکیم سعادت علی خان سے دریافت کیا کہ وہ کون مرض ہے جس میں طبیب بے بس ہو جاتا ہے اور کوئی دوا اثر نہیں کرتی۔ انہوں نے عرض کی کھانا کھانے کے بعد مستقل طور سے آرام کرنا۔ یہ علم ہونے پر انہوں نے بعد طعام روزانہ نہانا شروع کر دیا اور اکثر پانی میں نہاتے تھے۔ راس پانی ہاتھیوں کی لڑائی ہوا کرتی تھی۔ بالآخر مرض استسقا کے شکار ہو گئے۔ اس پر برف آپ بھی کثرت سے استعمال کرتے رہے۔ مرض نے طول کھینچا مگر علاج معالجہ کی طرف کبھی توجہ نہ کیا۔ عوام میں مشہور تھا کہ راجہ جھاؤ لال کی مفارقت میں نواب اپنی جان پر کھیلے جاتے ہیں بلکہ خود موصوف بھی اپنی صحبت خاص میں فرمایا کرتے تھے کہ اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتا' شکستہ دل کا کوئی علاج نہیں ہے۔ چنانچہ ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو جان عزیز جان آفریں کے سپرد کر دی

گورنر جنرل نے ۱۲۱۱ھ میں راجہ جھاؤ لال کو پٹنہ بھیج کر ایک ہزار روپے ماہوار بطور گزارہ مقرر کر دیئے تھے۔ راجہ نے وہاں عالی شان عمارتیں تعمیر کرائیں اور تعزیہ داری بڑی دھوم دھام سے کرتے رہے۔ اٹھارہ سال پٹنہ میں مقیم رہنے کے بعد بموجب بیان منشی رام سہائے تمنا ۱۲۲۹ھ میں اور حسب تحریر مولانا نجم الغنی ۱۲۳۰ھ میں بعہد دولت حضرت غازی الدین حیدر اس عالم فانی سے سدھار گئے

دوران قیام لکھنؤ راجہ صاحب کے عیش و نشاط کی لے بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اپنا اندوختہ زیادہ تر گل رخان بازاری پر صرف کرتے تھے۔ کھانے کے وقت سب اہل خاندان دستر خوان کے ایک جانب بیٹھ جاتے اور دوسری سمت میں زہرہ جبیں طوائفیں اپنے شریلے نغموں اور دلکش تانوں سے حاضرین کی سامعہ نوازی کرتی تھیں۔ انتقال کے وقت راجہ کی دو ہی اولاد تھم ہوتی ہے۔ زوجہ منکوحہ سے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں جس کی اولاد راجہ کے متروکہ پر قابض اور متصرف ہوئی۔ راجہ کی وفات کے بعد تھوڑے عرصہ تک راجہ بالک رام اور ان میں موافقت رہی اسی سبب سے اس کا دربار جاری رہا۔ زمان شاہ والی کابل کے نام مکتوبات تحریر کرنے کی علت میں راجہ بالک رام بھی شہر بدر کر کے الہ آباد بھیج دیئے گئے تھے۔ ان کا آباد کیا ہوا ایک محلہ بالک گنج دار ٹڈ دوات گنج میں اب تک اسی نام سے موسوم ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد بالک رام اور ان میں شکر رنجی ہو گئی اسی دوران میں محسن نے انتقال کیا اور راجہ بالک رام نے بھی لباس دنیوی ترک کر کے سنیاس لے لیا۔ راجہ جھاؤ لال کے پس ماندوں نے انگریز حکام اعلیٰ سے توسل پیدا کر کے اپنے اندوختہ سے اعزاز و احترام کے ساتھ زندگی بسر کی۔ بریلی کے کل مواضعات مملوکہ مالکانہ ان کے بیٹے رتن سنگھ کے نام سرکار انگریزی کی طرف سے بحال رہے۔

راجہ جھاؤ لال نے لکھنؤ میں امین آباد سے متصل ایک بازار اپنے نام پر آباد کیا تھا جو اب تک بازار راجہ جھاؤ لال کے نام سے مشہور ہے۔ امین آباد کے راستے میں قریب بھیروں جی رودوا جوں نے ایک پل بھی تعمیر کرایا تھا وہ بھی ان کے نام سے۔ راجہ جھاؤ لال کا پل معروف ہو کر اب تک ان کی یاد دلاتا ہے۔ لکھنؤ اور کاکوری کے درمیان محلہ ٹھاکر گنج میں انہوں نے سڑک کے ایک طرف ایک عالیشان مسجد بنوائی تھی جس کے محاذ میں سڑک کے دوسرے جانب ایک خوش نما امام بارہ تعمیر کرایا۔ یہ دونوں عمارتیں بوسیدہ حالت میں اب تک زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں۔

اڑیسی رقص

کرامت علی

اڑیسی رقص اڑیسہ کا ایک کلاسکی رقص ہے اور اپنی قدامت کے لحاظ سے اسے بھی وہی اہمیت حاصل ہے جو بھرت ناٹیم، کتھاکلی، کتھک اور منی پوری کو حاصل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اب تک ناٹیہ شاستر سے اس کے ارتقاء کی بابت پورے طور پر معلومات فراہم نہیں ہو سکی ہیں۔

تاریخی جائزہ

اڑیسہ میں رقص اور موسیقی کے قدیم ترین رجحان کا پتہ اُدے گری اور کھنڈ گری کے جین مندروں میں دو صدی قبل مسیح کے کھدے ہوئے نقوش سے چلتا ہے۔ اُدے گری کے رانی گمپھا کے نقوش میں بادشاہ کے ارد گرد لوگ بینا، مردنگ اور بانسری کی لے پر رقص کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کی بانسری چوتھی صدی میں سمدر گپت کے سکوں میں بھی نظر آتی ہے۔ پہلی صدی عیسوی سے چھٹی یا ساتویں صدی عیسوی تک اڑیسی رقص کے ارتقاء کے متعلق ہمیں معلوم نہیں۔ ساتویں صدی عیسوی کے بعد اڑیسہ میں مندروں کی تعمیر ہونے پر اڑیسہ کا رقص پتھروں کو تراش کر محفوظ کیا جانے لگا بھونیشور کے کپلیسر مندر، بھرتیسر مندر اور پرسو رامیسر مندر میں اس طرح کے پتھر کے نمونے نظر آتے ہیں۔ بارھویں صدی کے آغاز میں اڑیسہ میں گنگا راجاؤں کی حکومت قائم ہوئی۔ گنگا راجاؤں نے ناچ اور سنگیت کو مذہبی رنگ دے کر انھیں مندروں میں رائج کیا۔ کونارک کے مندر میں ناچ اور سنگیت کے کئی سنگی بت ملتے ہیں۔ حالانکہ کونارک کے رقص کرتے ہوئے ان بتوں سے یہ پتا نہیں چلتا کہ اس زمانے کا سنگیت کیا تھا۔ پھر بھی ان شکلوں میں موسیقی کے جو آلات دکھائے گئے ہیں اُن سے اڑیسی رقص کے متعلق ضرور بہت کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔

بھونیشور کے برہمیسر مندر سے پتہ چلتا ہے کہ آٹھویں صدی میں پہلی دفعہ دیو داسیاں (جنہیں اڑیسہ میں مہری کہا جاتا ہے) مندروں میں بھگوان کی خدمت کرنے لگیں۔ اس کے بعد ہی اڑیسہ کے تمام مندروں میں دیوداسیوں کے ناچ اور گیت رائج ہو گئے۔ شیومت کے زوال کے بعد جب وشنو مت کو عروج ہوا تو بارھویں صدی سے پُری کا جگناتھ مندر مذہب اور کلچر کا مرکز بن گیا۔ مشہور ہندی شاعر جے دیو کی گیت گووندا اسی زمانہ کی تصنیف ہے اس کے گانے دیو داسیوں کے ناچ اور گانے کی جان بن گئے۔ اس وقت دیو داسیوں کو سماج میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور امیر گھرانے کی لڑکیاں بھی دیو داسیاں بنتی تھیں۔ دیو داسیاں بہت ہی پاکیزہ زندگی گذارتی تھیں۔ مندر کے علاوہ انھیں اور کہیں رقص کرنا منع تھا۔ یہ سلسلہ پندرھویں صدی تک جاری رہا۔ اس کے بعد سے اڑیسہ کی سیاسی حالت بڑی خراب رہی۔ اس پر افغانوں، مغلوں، مرہٹوں اور انگریزوں کے حملے ہوتے رہے۔ پُری کے راجا رام چندر دیو نے ۱۸۵۵ء میں جگناتھ کے مندر میں پہلی دفعہ لڑکوں کو لڑکیوں کا لباس پہنا کر رقص کا رواج قائم کیا ان لوگوں کو ”گوٹی پوہ“ کہا جاتا ہے۔ دیو داسیوں کے بعد ”گوٹی پوہ“ نے اڑیسی رقص کے آرٹ کو برقرار رکھا۔ دورِ قدیم کے اساتذہ دیو داسیوں کو فنِ رقص سکھانے میں جھجک محسوس کرتے تھے لیکن ”گوٹی پوہ“ کو ماہرین سکھانے میں انھیں کوئی دقت

نیپالی جگنناتھ کے مندر میں دیوداسیاں اب بھی رقص کرتی ہیں لیکن پہلی سی بات نہیں۔

چند خصوصیات

اڑیسی رقص اپنے ساتھ کئی خصوصیات لئے ہوئے ہے۔ اس پر مقامی رنگ کے باوجود دوسرا ہندوستانی اثر، خاص طور پر بھرت ناٹیم کا بہت گہرا ہے۔ "گوٹی پوہ" کے رقص میں ایسے کئی مشکل حرکات ہوتے ہیں جو جنوبی ہند کے مندروں میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے مشکل حرکات کسی زمانے میں ہندوستان کے تمام کلاسیکی رقص میں مستعمل تھے لیکن شاید مشکلات کی وجہ سے دیگر کلاسیکی رقصوں سے ان اداؤں کا استعمال ختم ہو گیا لیکن اڑیسی رقص میں انھیں اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

بھرت ناٹیم کی طرح اڑیسی رقص میں بھی دونوں قدم فاصلے پر اور زاویہ قائمہ میں رکھے جاتے ہیں اور ہتھیلیوں کو نیچے کی طرف جھکایا جاتا ہے۔ لحاظ سے ۸، یعنی کُل ۳۴ ہیں۔ کسی اور کلاسیکی رقص میں ایک ہاتھ کے اتنے حرکات مستعمل نہیں۔ ناٹیہ شاستر میں ایک ہاتھ کے حرکات کی تعداد ۲۴ اور ابھینیہ درپن میں اس کی تعداد ۲۸ درج ہے۔ اڑیسی رقص میں دونوں ہاتھوں کے استعمال کے حرکات ۲۴ ہیں۔ اس طرح ہاتھوں کے حرکات کُل ۵۸ ہوتے ہیں لیکن ناٹیہ شاستر میں ان کی تعداد صرف ۳۷ اور ابھینیہ درپن میں صرف ۵۴ درج ہے۔

کرت گوبہ کے مطابق اڑیسی رقص میں دس اوتاروں کی مختلف ادائیں ہیں۔ یہ تمام ادائیں بھرت ناٹیم کے دس اوتار کی اداؤں سے ملتی جلتی ہیں۔ ایک زمانے میں اڑیسہ اور آندھرا ثقافتی حیثیت سے ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ دونوں کے رقص میں اسی لئے اس قدر مشابہت پائی جاتی ہے۔

اڑیسی رقص میں پاؤں کی پانچ حرکتیں ہوتی ہیں جن کے نام ہیں (۱) چٹوک (۲) مین دانڈی (۳) ورتل (۴) گھیر (۵) دوی کھ۔

دوی کھ (۵)　گھیر (۴)　ورتل (۳)　مین دانڈی (۲)　چٹوک (۱)

اس کی سب سے مشکل ادا یہ ہے کہ دونوں ایڑیوں پر پورے بدن کا وزن سنبھالا جاتا ہے اور بہت تیزی کے ساتھ ایڑیوں کو ٹیک کر پیچھے کی طرف لایا جاتا ہے۔ کتھک کی طرح اڑیسی رقص میں بھی بدن کا "چکر" ہے، لیکن اس میں ایک دفعہ میں ایک چکر لگایا جاتا ہے یعنی کتھک کی طرح اس میں ایک ساتھ کئی چکر نہیں ہیں۔

اڑیسی رقص کا "ابھینیہ" یا ڈرامائی حصہ بھی بھرت ناٹیم کی طرح ہے۔ لیکن اس میں ہاتھ کی کئی ادائیں ایسی ہیں جو کسی کلاسیکی رقص میں نہیں پائی جاتیں۔ دراصل منی پوری اور کتھک رقص میں ہاتھ کے حرکات (Gesture) اتنے اہم نہیں ہیں جس قدر بھرت ناٹیم، کتھاکلی اور اڑیسی رقص میں ہیں۔ اڑیسی رقص میں ایک ہاتھ کے حرکات کی تعداد قدیمی کتابوں سے ۲۶ اور روایتی

(۱) چٹوک۔ چٹوک مربع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں رقاصہ ایک مربع میں پاؤں کی حرکت کرتی ہے اور جس جگہ سے چلی تھی اُس جگہ پر واپس آ جاتی ہے۔

(۲) مین دانڈی۔ دانڈی میں رقاصہ کے قدم مچھلی کی ہڈی کی طرح حرکت کرتے ہیں۔

(۳) ورتل۔ اس میں رقاصہ پہلے اپنی جگہ سے کچھ آگے بڑھتی ہے اور پھر ایک دائرہ مکمل کر کے اپنی جگہ پر آ پہنچتی ہے۔

(۴) گھیر۔ گھیر سے مراد ایک جگہ چکر لگانا ہے۔

(۵) دوی کھ۔ دوی کھ سے مراد دونوں پاؤں دو طرف کھلے ہوئے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہو جیسے اُن کے دو رُخ ہوں۔ اسی عالم میں رقص

کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے

اُڑیسی رقص میں پانچ طرح کی چال مستعمل ہے۔ (۱) گونٹھی چالی۔ (۲) چاپوانی چالی (۳) کڑگھوسرا (۴) ٹھیاپوچی (۵) پُہانیا چالی

ایڑیوں پر چلنے کو گونٹھی چالی کہتے ہیں۔ دونوں ایڑیاں اٹھاکر رقص کے آغاز کرنے کو چاپوانی چالی کہتے ہیں۔ ایک پاؤں کو ایک طرف پھیلا کر چلنے کو کڑگھوسرا کہتے ہیں۔ دونوں پاؤں کے اگلے حصہ پر تمام بدن کا وزن دے کر بیٹھنے کے عالم میں آگے بڑھنے کو ٹھیاپوچی کہتے ہیں۔ کبھی ایک ٹانگ کو ایک طرف اٹھاکر اور کبھی دوسری ٹانگ کو دوسری طرف اُٹھاکر رقص کرنے کو پُہانیا چالی کہتے ہیں۔

رقص کا طریقہ

رقاصہ ایک نمسکار کے ساتھ رقص کا آغاز کرتی ہے۔ شروع میں شیوجی، گنیش جی یا کسی اور دیوتا کی مدح میں ایک گیت گایا جاتا ہے اور رقاصہ نمسکار کے ساتھ اپنی ہتھیلی کا پھول بھگوان کے چرنوں پر پھینک دیتی ہے۔ اس کے بعد سولہ "بول" ہوتے ہیں۔ ہر بول کے ساتھ رقاصہ ایک چکر کاٹ کر اپنی جگہ پر آپہنچتی ہے۔ اس طرح رقاصہ کُل سولہ چکر کاٹتی ہے۔ رقص کا دوسرا حصہ ہے "نرتن" یا خالص رقص۔ اس حصہ میں پتھروں کے مختلف انداز پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد سنسکرت یا اڑیہ گیت کے ساتھ رقص کا ڈرامائی حصہ یا ابھینیہ شروع ہوتا ہے۔ اڑیسی رقص میں عام طور پر اڑیہ کے کلاسیکی شعراء مثلاً اُپندر بھنج، بلدیو رتھ، بنمالی داس، گوپال کرشن وغیرہ کے گیت گائے جاتے ہیں اور رقاصہ نظم کے مفہوم کے مطابق رقص کے ساتھ ساتھ اداکاری کرتی ہے۔ ان تمام شعراء کے کلام میں اکثر اس طرح کی ترکیبیں مستعمل ہوتی ہیں جن میں کئی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے رقاصہ کو بھی اپنے فن کے مظاہرے میں بہت ہی محتاط رہنا پڑتا ہے۔ وہ اس طرح کے حرکات کرتی ہے جن سے گیت کے تمام مطالب ظاہر ہو جائیں۔ یہ بھی اڑیسی رقص کا ایک کمال ہے۔ عام طور پر ابھینیہ میں رادھا اور کرشن کے پریم کی عکاسی کی جاتی ہے۔ رقص کے آخری حصہ کا نام "ناٹنگی" ہے جس میں رقاصہ رقص سے نشاط کا اظہار کرتی ہے اور جھومتے ہوئے رقص کرتی ہے۔ آخر ایک نمسکار کے ساتھ رقص ختم ہو جاتا ہے۔

تال اور لَے

اڑیسی رقص کے چند تال اور لَے مندرجہ ذیل ہیں

(۱) تا تھئی تھئی

(۲) کت تک تھئی، کت تک تھئی

(۳) تاکری دھاک دھی

(۴) کت تک دھا تا تا

(۵) تا تھو تا کت تک تھو تا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ تال اور لَے اڑیسی رقص کی انفرادی خصوصیت ہیں جو کسی اور رقص سے نہیں ملتی۔

اڑیسی رقص ہی ہندوستان کا ایک ایسا رقص ہے جس کے مختلف انداز مندروں میں پتھروں کی شکلوں میں محفوظ ہیں۔ یہ شکلیں اڑیسی رقص کی مصدقہ صورتیں ہیں۔ اڑیسی رقص کے متعلق آج کل یہ سوال درپیش ہے کہ آیا اس رقص کو بھرت ناٹیم، کتھا کلی، کتھک اور منی پوری کے بعد پانچویں کلاسیکی رقص کی حیثیت دی جاسکتی ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں اندرانی رحمان نے یہ رائے دی ہے کہ "منی پوری جو نیم عوامی (Semi-folk) رقص ہے اور جو ناٹیہ شاستر کے قوانین کے مطابق نہیں ہے، اسے اگر ایک کلاسیکی رقص کہا جاتا ہے تو اڑیسی رقص کو بھی ہندوستان کے ایک کلاسیکی رقص کی حیثیت دینی چاہیئے۔" ہم سمجھتے ہیں کہ اندرانی رحمان کا یہ فیصلہ بہت ٹھیک ہے اور اڑیسی رقص کو بھی ہندوستان کے کلاسیکی ناچوں میں شمار کرنا چاہیئے۔

ہرکی پیڑی، ہردوار

ہمارے دریا

متھرا میں یما

اُڑیسی رقص

اُڑیسی رقص پر مضمون

بھونیشور کے "راج رانی" مندر میں اُڑیسی رقص کے سنگی مجسمے

بھونیشور کے "لنگراج" م

ا

مس پری یم مہاپاترا (?)

(اُڑیسی رقص کے "گیبی انداز میں)

"کونارک" کے مندر میں اڑیسی رقص کا مجسمہ
(تیرھویں صدی عیسوی)

ی رقص کا مجسمہ

مس سدیتا مہاتی
(اڑیسی رقص کے "مردلہ" انداز میں)

الہ آباد میں گنگا جمنا کا سنگم
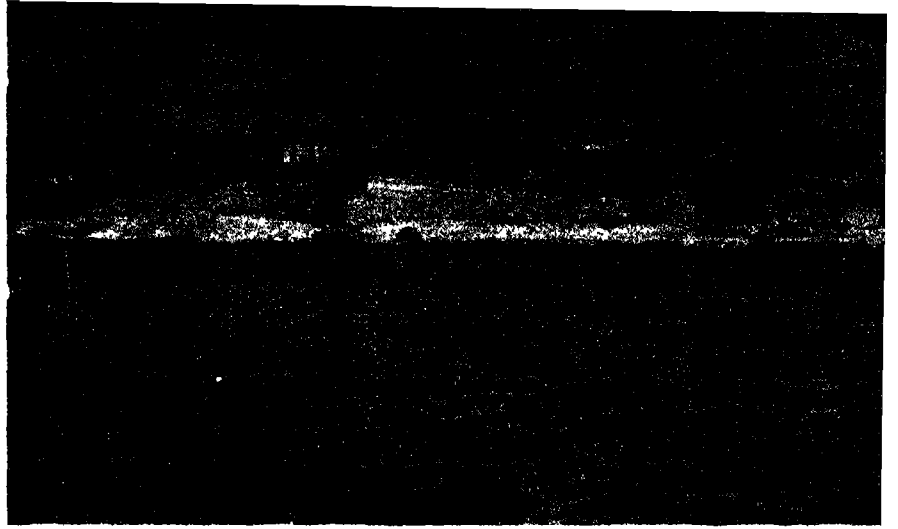
ہمارے دریا

وارانسی کے گھاٹ
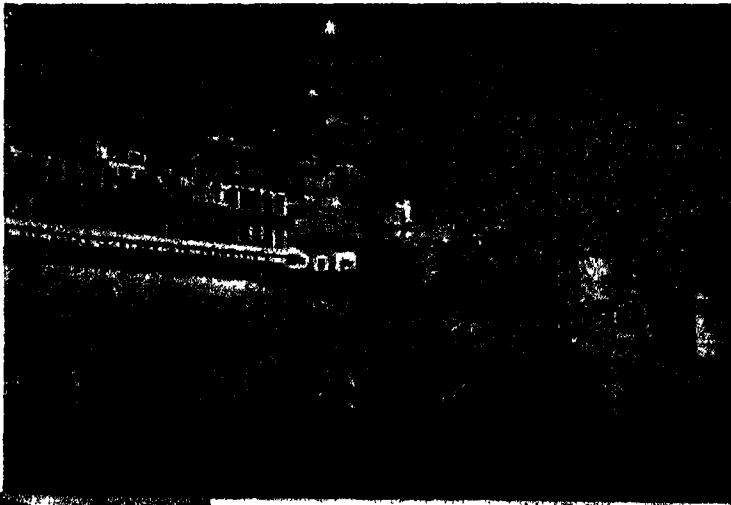
آج تک قریب قریب اسی انداز میں ادا ہوتی رہتی ہیں ۔

گنگا کے کنارے کے دوسرے میلے مقابلتاً چھوٹے پیمانہ پر ہوتے ہیں ۔ کارتک کے مہینہ میں گڑھ مکتیشر سے نیچے کی اور چلئے تو عورتوں بچوں اور مردوں سے لدی ہوئی بیل گاڑیوں کا ایک تانتا نظر آئے گا جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا ۔ سب میلہ دیکھنے کے لئے آ رہے ہیں یہ ہماری دیہاتی زندگی کا بہت ہی قدیم نظارہ ہے ۔

ہمارے بڑے دریاؤں پر قدرتی طور پر زیادہ توجہ کی جاتی ہے مگر چھوٹے دریا بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے ۔ کہیں بھی دیہات میں دور تک نکل جائیے امکان ہے کہ دو ایک چھوٹے دریا بیچ میں پڑیں ۔

ان دریاؤں کے بیچ و خم اس کی سطح آب پر کنول کی بیل کے پودے ان کے کناروں پر کھڑا ہوا گھنا جنگل آئے دن دلکش نظارہ دیتے رہتے ہیں ۔ ان دریاؤں پر طرح طرح کی قسم کے پل نظر آتے ہیں کچھ پرانے ڈھنگ کے بنے ہوئے کچھ سادی کاریگری کے اسے مستقل نوعیت کے پل ہوتے ہیں لیکن کچھ عارضی قسم کے بھی ہوتے ہیں بانس کے پل جو دریا کے بڑھتے ہی ہٹا دیئے جاتے ہیں ۔

دلچسپ مطالعہ

پانی کا بڑھنا اور گھٹنا ایک دلچسپ مطالعہ ہے ۔ یہاں دریا آن کی آن میں بڑھ جاتے ہیں ۔ مجھے برسوں کا یہ واقعہ خوب یاد ہے کہ دریا بڑھ گیا اور میں ایسا پھنسا کہ بمشکل تمام کار کو لیکر اس پار تک پہنچ سکا ۔

میدان کے علاقوں میں ایسی اچانک بہیا نہیں آتی لیکن ان کے بلو میں بڑے بڑے مسئلے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مشرقی ضلعوں میں تو یہ ایک معمول سا ہو گیا ہے اور مشرقی ضلعوں سے مراد وہ علاقہ ہے جو گھاگھرا کے مشرق سے شروع ہوتا ہے

ہر سال بڑے اور چھوٹے سیلابوں کا ایک چکر سا چلا کرتا ہے اور سالہائے گزشتہ کے تجربہ کی بنا پر ان مواضعات کو نقشہ میں بڑی آسانی سے نشان زد کیا جا سکتا ہے جو پانی بڑھنے پر متاثر ہوتے رہتے ہیں ۔

بعض جگہ تو ایسا پانی بڑھتا ہے کہ سوائے پانی کے کچھ نظر نہیں آتا ۔ دریا نالے ندیاں تالاب سب لبالب بھر جاتے ہیں اور آپس میں مل کر کھیت کھلیان مکان سب کو پانی میں غرق کر دیتے ہیں ۔ سارے راستے بند ہو جاتے ہیں اور رابطے ٹوٹ جاتے ہیں صرف کشتیاں رہ جاتی ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکتی ہیں ۔

جیسے جیسے سیلاب بڑھتا جاتا ہے لوگ نیچی سے اونچی جگہوں پر جمع ہوتے جاتے ہیں ۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ جب ایک کشتی کسی اونچے سے پیڑ کے نیچے سے گزرے تو ایک سانپ اس کی ڈال سے ٹپک پڑے ۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار سیلاب کے زمانے میں کچھ مکانوں کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ لوگ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے ہیں اور ان کی جھونپڑیاں بالکل خالی ہیں ہمارے پوچھنے سے پہلے ہی انہوں نے کہا کہ ایک بس کھوپڑا گھس آیا ہے اور ہم لوگ اسے مارنا چاہتے ہیں ہم نے اسے ڈھونڈھنا شروع کیا تو وہ پانی میں نکل گیا ۔ کوئی آدھ گھنٹے تک بس کھوپڑے سے آنکھ مچولی ہوتی رہی ۔ آخر وہ بندوق کی زد میں آگیا اور پہلی ہی گولی میں نشانہ بن گیا ۔ اس کا خون پانی پر پھیل گیا ۔

بہتے ہوئے پانی کی آواز ، خصوصاً رات کی فضا میں جب سناٹا ہو ، ذہنوں پر ایک خاص اثر مرتب کرتی ہے ۔ جب کوئی کنارہ پر بیٹھتا ہے اور پانی کو گرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اسے ایک غیر محسوس سی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور تنہائی کا خیال جاتا رہتا ہے ۔ گویا دریا ایک ذی روح کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔

مراقبہ کی جگہیں

ہمارے دریاؤں کے کنارے مراقبہ کی جگہیں رہے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ۔ سرجو اور گنگا کے کنارے اجودھیا اور وارانسی میں گوسوامی تلسی داس نے اپنی رامائن لکھی ، ایک کھنڈ کے بعد دوسرا کھنڈ ۔ اس عظیم الشان رزمیہ کی کہانی جیسے جیسے بیان ہوتی جاتی ہے آنے والی نسلوں کے لئے اس کی مستقل اہمیت نمایاں ہوتی جاتی ہے ۔ وہ بھی دریا کا کنارہ تھا کہ بودھ بھکشو نے اپنی چھوٹی سی کٹیا میں گیتا کو پروان چڑھایا اور کالی داس نے اپنی آفاقی نظموں کو اسی امر بنا دیا

دریا کو مختلف کیفیتوں اور مختلف صورتوں کی ایک زندہ چیز سمجھا جاسکتا ہے پانی کی کتنی شکلیں ہوتی ہیں ۔ شروع میں کچھ بیچ میں کچھ اور آخر میں کچھ ۔ برف پوش پہاڑوں سے نکلتے وقت ایک پتلی سی دھار آگے بڑھ کر ایک پرشور دھارا ، میدان میں ایک پر سکون دھارا ، پھر بھی ہے وہی پانی جو اس کی صورت کیفیت کچھ بھی ہو ۔ اسی طرح ہماری دیومالا بھی بہتی رہی ہے اور حقیقت و صداقت کے لئے اس میں ایک خاص قسم کی تڑپ پیدا ہوتی رہی ۔ ہم سے مغرب کا ذہن مشکل ہی سے سمجھ سکتا ہے ۔ ہمارے دریاؤں کی طرح ہمارے دماغوں میں بھی وسعت بے پایاں ہے ۔ اس میں جانے کیا کیا چیزیں پائی جاتی ہیں مگر سب پر ہماری قدامت و عظمت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے ۔ اگر ہندوستان کے مناظر کا صحیح اندازہ کرنا ہے اور ہندوستانی دماغ کا صحیح اندازہ لگانا ہے تو راستہ نکال کر دریا کے کنارہ پہونچنا ہوگا ۔

حسن احمد صدیقی

آنکھ سے خوں بہا کے دیکھ لیا (ق) خاک میں دل ملا کے دیکھ لیا

اب گلہ کیا کریں زمانے کا — تم کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

آنکھ بھی تو کسی کی نم نہ ہوئی — قصۂ غم سنا کے دیکھ لیا

سازِ ہستی کے تار ٹوٹ گئے — دامنِ دل چھڑا کے دیکھ لیا

ہجر کی رات روشنی نہ ہوئی — کتنی شمعیں جلا کے دیکھ لیا

اب خدا جانے کب تھمیں آنسو — تم نے ہم کو ہنسا کے دیکھ لیا

پھر انھیں سے ہے واسطہ جن کو — عمر بھر آزما کے دیکھ لیا

کہیں جاتی ہے برق کی چشمک — آشیاں بھی جلا کے دیکھ لیا

رسمِ فتنہ گری مٹی نہ مٹے — اپنی ہستی مٹا کے دیکھ لیا

اعتبارِ حیات کھو بیٹھے — ہم نے اُن کو بھلا کے دیکھ لیا

شکوے کیا کیا تھے، عزم کیا کیا تھے

تم نے کیوں مسکرا کے دیکھ لیا

(اے آئی آر لکھنؤ)

غزل

معین احسن جذبی

زندگی ہے تو بہر حال بسر بھی ہوگی

شام آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہوگی

پرسشِ غم کو وہ آئے تو اک عالم ہوگا

دیدنی کیفیتِ قلب و جگر بھی ہوگی

منزلِ عشق پہ یاد آئیں گے کچھ راہ کے غم

مجھ سے لپٹی ہوئی کچھ گردِ سفر بھی ہوگی

ہوگا افسردہ ستاروں میں کوئی نالۂ صبح

غنچہ و گل میں کہیں بادِ سحر بھی ہوگی

دل اگر دل ہے تو جس راہ پہ لے جائے گا

دردمندوں کی وہی راہ گزر بھی ہوگی

— ═ —

(اے آئی آر لکھنؤ)

ذوق اور علم نجوم و رمل

محمد انصار اللہ نظر

محمد اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کا عہد سلطنت مغلیہ کے انحطاط ملکہ جہاں کنی کا زمانہ تھا، لیکن اس عالم میں بھی مختلف علوم و فنون کو ترقی ہوئی۔ یہ خیال غلط محض اور بے بنیاد ہے کہ اس دور میں صرف شعر و سخن کا بازار گرم تھا اور راجا سے پرجا تک سب داد عیش دے رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم و فن کے جس شعبہ کی طرف نگاہ کیجئے بڑے بڑے ماہرین فن نظر آئیں گے۔ طب کے میدان میں حکیم احسن اللہ خاں، حکیم غلام نجف خاں اور حکیم آغا جان عیش جیسی ہستیاں دکھائی پڑیں گی، خوش نویسی میں سید محمد امیر پنجہ کش، محمد خاں اور میر امام الدین جیسے اساتذہ ملیں گے، مذہبیات کی طرف رخ کریں تو حضرت شاہ عبدالعزیز اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ جیسے اکابر ملیں گے۔ فن تعمیر اور نقاشی میں بھی یہ دور کچھ پیچھے نہیں قلعہ معلیٰ کی تعمیر کا کام عہد شاہجہانی میں شروع ہوا تھا لیکن ظفر محل اور محل حیات بخش وغیرہ کی تعمیر بہادر شاہ کے دور ہی میں ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس عہد میں دولت کی وہ فراوانی نہ تھی جو شاہجہاں اور اورنگ زیب کے دور تک رہی پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ اس دور انحطاط میں بھی متعدد ماہرین نے اپنے فن کے شاہکار پیش کئے۔ دوسرے علوم و فنون کے علاوہ اس عہد میں علم نجوم و ہیئت کا بھی رواج کافی معلوم ہوتا ہے۔ حکیم مومن خاں مومن وغیرہ اس فن کے ماہرین میں سے تھے، مرزا اسد اللہ خاں غالب اگرچہ اس فن سے کچھ زیادہ واقف نہ تھے لیکن پیشین گوئی کا شوق ان کو بھی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنی وفات کی تاریخیں کئی بار خود کہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ وہ صحیح ثابت نہ ہوئیں اور مرزا کی وفات ان تاریخوں میں نہ ہو سکی۔)

شیخ محمد ابراہیم ذوق استاد شاہ تھے۔ شعر و ادب کے علاوہ انھیں متعدد علوم سے دلچسپی تھی۔ ان ہی میں علم نجوم بھی تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد بیان کرتے ہیں کہ

"نجوم و رمل کا بھی شوق کیا اور اس میں دستگاہ پیدا کی۔ نجوم کا ایک صاحب کمال محل پورہ میں رہتا تھا اس سے نجوم کے مسائل حل کیا کرتے تھے۔ ایک دن اس نے کسی سوال کا جواب نہایت درست دیا اور گفتگو ہوتے ہوتے یہ بھی کہا کہ ایک ستارہ کا حال اور اس کے خواص معلوم کرنے کے لئے ۰۰ برس چاہئیں ہیں۔ سُن کر اس سے بھی دل برداشتہ ہو گئے۔[1]"

احکام نجوم کے ضمن میں مولانا نے ایک دلچسپ واقعہ بھی نقل کیا ہے

"نجوم کے چھوڑنے کا یہ سبب بھی ہوا کہ ولی عہدی کا زمانہ تھا ان دنوں جوانی کا عالم تھا مرزا مغل بیگ کا بھائی روشن بیگ تھا۔ اس کے ایک بندی لگی تھی۔ استاد کبھی کبھی کہتے کہو تمھاری وہ کیسی ہیں؟ وہ کہتا خوب! ان دنوں احکام نجوم کی مشق چڑھی ہوئی تھی کبھی گھر سے کبھی وہیں حساب لگا کر دیکھ لیتے اور کہتے کیوں جی آج رات کو تو خوب چلتی رہی۔ کبھی معلوم ہوتا تو کہتے کیوں رات تو مزے میں تھے، کیوں جی وہ عطر ہی پر بگڑی تھی یا د

---

[1] آب حیات مصنفہ مولانا محمد حسین آزاد مطبوعہ احسان بک ڈپو لکھنؤ ۵۰۸

دیوان ذوق مرتبہ آزاد مطبوعہ علیمی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۳۳ء ۱۳۵۱ھ ۲۲

بات پر۔ روش بیگ سوچتا۔۔ گھبراتا اور بتر ماتا۔

"اس نے کہنا شروع کیا کہ حضور! کھیں نجوم میں ترا دخل ہے۔ ایک دن استاد گئے۔ بادشاہ محل میں تھے خبر ہوئی، باہر آئے۔ مٹھی سامنے بند کر کے ان سے پوچھا کہئی ابراہیم اپنے نجوم سے حساب کر کے بتاؤ ہمارے ہاتھ میں کیا ہے۔ وہ دل میں شرمندہ ہوئے مگر حساب کر کے عرض کی کہ انگشتری کی کوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہنس پڑے اور مٹھی کھول کر دکھا دی۔ وہی تھی۔ ہاتھ میں ایک سونے کی انگوٹھی تھی وہ مرحمت فرمائی۔ انھوں نے اس دن سے توبہ کی۔ یہ کبھی موقع ہی آجائے تو حساب کر کے دیکھ لیتے تھے۔ وہ بات نہیں تھی۔"[۱]

اس سلسلہ کا ایک واقعہ اور سن لیجئے

"لکھن لعل کے گنج میں ایک جوتشی پنڈت تلسی رام نابینا تھے ایک مرد دیرینہ سال منشی درگا پرشاد کہ شیخ مرحوم کے قدیمی دوست تھے اور جوتشی صاحب کے پاس بھی جایا کرتے تھے انھوں نے جوتشی صاحب کی بہت تو لف کی اور ایک دن قرار پا کر یہ بھی ان کے پاس گئے کئی دلچسپ سلسلے گفتگوؤں کے ہوئے۔ بعد ازاں انھوں نے اظہار نام اپنے زائچہ کی صورت حال بیان کی۔"[۲]

یہ بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ ذوق کو علم نجوم سے کافی دلچسپی تھی۔ خود ذوق کا کلام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انھوں نے اس فن میں بھی دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ ان اشعار کا مطلب سمجھنے کے لئے اصطلاحات نجوم سے واقفیت ضروری ہے۔

ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

دل اپنا غم دہر سے تو کر نہ اچاٹ — جس طرح کٹیں بدر مصیبت کے تو کاٹ
اے ذوق فلک ہے آپ بارہ حصے — سودا ہو نہ کیوں زیر فلک بارہ باٹ[۳]

اہل نجوم نے آسمان کو بارہ حصوں پر تقسیم کیا ہے اور ہر حصہ کو اصطلاح میں ایک "برج" کہتے ہیں، ہر برج کی شکل مختلف بتاتے ہیں اور اس کی شکل کی مناسبت ہی سے اس کو نام دیتے ہیں۔ ان بارہ بروج کو عناصر اربعہ کی مناسبت سے چار قسموں میں ترتیب دیتے ہیں۔ یعنی اول، بروج آتشی۔ دوم، بروج خاکی سوم، بروج بادی۔ چہارم، بروج آبی۔

ذیل کے اشعار میں ذوق نے اس تقسیم کا ذکر کیا ہے ؎

دیکھنا آبی ددیدۂ مطہر یہ اس کے وقت خواب — برج آبی میں ہے مہر یا مہر روشن آب میں
روئے نیکو سے مائل تری ہوئے نیکو — کہوں کیونکر کہ الحسن الی الحسن یمیل
ہے جو انساں کے قالب میں ترا اور ظہور — برج خاکی میں ہے جو رتبۂ فلک کی تحلیل

جیسا کہ عرض کیا جا چکا بروج آسمانی کی مجموعی تعداد بارہ ہے ان کی ترتیب اس طرح ہے۔

بروج آتشی	بروج خاکی	بروج بادی	بروج آبی
۱ حمل	۲۔ ثور	۳۔ جوزا	۴۔ سرطان
۵ اسد	۶۔ سنبلہ	۷ میزان	۸۔ عقرب
۹۔ قوس	۱۰۔ جدی	۱۱۔ دلو	۱۲۔ حوت

ان کی ترتیب کا ذوق نے اس طرح ذکر کیا ہے ؎

حمل سے حوت تلک جا بجا ہیں تصویریں — بنا ہے عالم بالا بھی عالم تصویر

ان سب کی شکلیں بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ حمل۔ اس کی شکل بکری یا بھیڑ کے بچے سے مشابہ ہوتی ہے۔

۲۔ ثور۔ یہ بیل کی شکل سے مشابہ ہوتا ہے۔

۳۔ جوزا۔ یہ نصف بکری اور نصف عورت کے پیکر سے مشابہ ہوتا ہے۔

۴۔ سرطان۔ یہ کیکڑے کی شکل سے مشابہ ہوتا ہے۔

۵۔ اسد۔ اس کی شکل شیر کی سی ہوتی ہے اسے شیر گردوں بھی کہتے ہیں۔

۶۔ سنبلہ۔ یہ ایک لڑکی کی طرح ہے جو دامن پھیلائے لیٹی ہو۔ اس کا سر شمال و مغرب کی طرف، پیر مشرق و جنوب کی سمت، داہنا ہاتھ کندھے تک اوپر اٹھا ہوا اور اس میں خوشۂ گندم، اور بایاں ہاتھ پہلو میں دبا ہوا۔ سنبلہ خوشۂ گندم کو کہتے ہیں اور اسی سبب سے اس برج کو یہ نام دیا گیا ہے۔ اہل نجوم اس کو بانجھ قرار دیتے ہیں۔

---

[۱] دیوان ذوق مرتبۂ آزاد ۲۳ ـ مگر یہ واقعہ مولانا نے آب حیات میں تحریر نہیں کیا، ایک بات یہ ہے کہ اس واقعہ کی ابتدا میں "ولی عہد" کہا ہے اور بعد میں بادشاہ۔ اس فرق کا سبب بھی ظاہر نہیں۔ [۲] دیوان ذوق ۲۴، آب حیات ۵۰۸

[۳] دیوان ذوق مطبوعہ مطبع نول کشور کانپور ۱۸۶۱ء ـ ۱۸۸۲ء ـ مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ ۱۸۹۲ء وغیرہ، ـ البتہ آزاد نے اس رباعی کو اس طرح تحریر کیا ہے ؎

دل کو سر بازار جہاں کر نہ اچاٹ — جس طرح بنے سود و زیاں میں دن کاٹ
اے ذوق فلک کے جب ہیں بارہ حصے — سودا ہو نہ کیوں زیر فلک بارہ باٹ

(دیوان ذوق ـ مرتبۂ آزاد مطبوعہ ۱۹۳۳ء)

۷۔ دلو۔ ڈول کی شکل کا ہوتا ہے۔

۸۔ عقرب۔ اس کی شکل عقرب (بچھو) کی سی مونا ہوا اور اس کی تاثیر منحوس ہوتی ہے۔

۹۔ قوس۔ اس کی شکل کمان کی سی ہوتی ہے۔

۱۰۔ جدی۔

۱۱۔ میزان۔ اس کی صورت ترازو سے مشابہ ہوتی ہے۔

۱۲۔ حوت۔ مچھلی سے مشابہ ہے اور مشتری کا گھر ہے۔

ان بروج کی مزید تقسیم تیس حصوں میں کی جاتی ہے اور ہر حصہ کو درجہ کہتے ہیں۔ درجہ کے ساٹھ حصے کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو دقیقہ کہتے ہیں۔

ان اشعار میں خوبی یہ ہے کہ بروج کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کے خواص بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔

اب سیارگان فلک کے نام و خواص مجملاً تحریر کئے جاتے ہیں۔ سیارے کل سات ہیں، ان کے نام یہ ہیں

۱۔ زحل ۲۔ مشتری ۳۔ مریخ ۴۔ شمس ۵۔ زہرہ ۶۔ عطارد ۷۔ قمر۔ علم نجوم کی رو سے ان کی تفصیل اس طرح ہے

۱۔ قمر، ماہ یا چاند جسے ہندی میں سوم بھی کہتے ہیں اس کا مقام پہلا آسمان ہے۔ اسے ثور میں شرف اور جدی میں وبال ہوتا ہے

۲۔ عطارد، تیر، یا بدھ۔ اس کا مقام دوسرا آسمان ہے
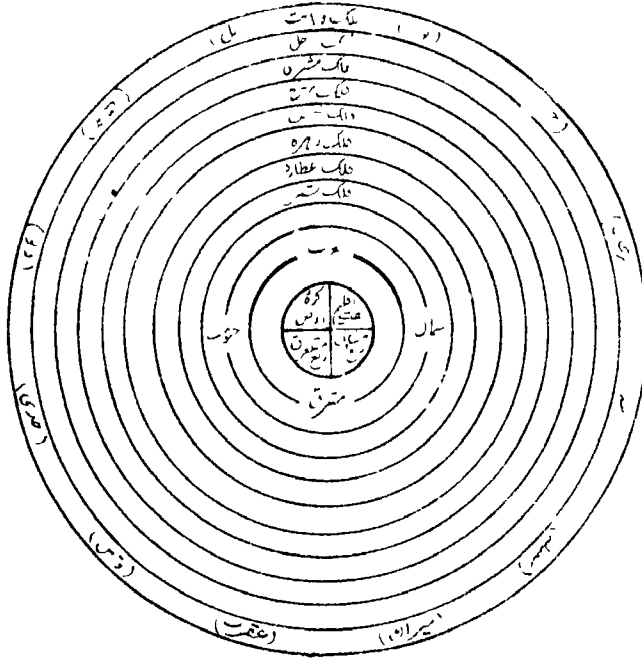
ان سب کی تفصیلات طوالت کا سبب ہوگی۔ بروج فلکی میں سے بعض کا ذکر ذوق کے ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیے ؎

سنبلہ کو تا سحر کو دے ہے سنبلہ عقیم | تاکہ ہو سرسبز و خوش حور فلک پر شاد کام
خورشید کھینچتا ہے جو برج اسد سے تیغ | پیاسے ہوں تیر جنگ وہ تجھ سے مگر حطاب
عدوئے نحیف ان کے گھر میں میزان حساب نکلے | الٰہی برج عقرب سے قمر جلدی کہیں نکلے

سنبلہ میں اسے شرف اور قوس و حوت میں اس کو وبال ہوتا ہے۔ عقل اس سے متعلق ہے چنانچہ اسے دبیر فلک بھی کہتے ہیں۔

۳۔ زہرہ، ناہید، یا سکر۔ اس کا مقام تیسرا آسمان ہے، اسکے دو گھر ہیں، ایک ثور دوسرا میزان۔ اس کا رنگ سفید ہوتا ہے اور اقلیم ماوراء النہر اس کے حوالہ ہے۔ اس کو حمل میں وبال اور حوت میں شرف

۳۔ رجعت۔ قمر اور شمس کے علاوہ پانچ سیاروں میں سے کسی کا اپنی جگہ پر واپس جانا رجعت کہلاتا ہے۔

ذوق کو ان سیاروں کی رفتار وغیرہ سے کیا حقہ واقفیت معلوم ہوتی ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عیش و طرب کو مژدہ کہ کرتا جہاں میں ہے — زہرہ سے اب قران مہ انور آسماں
ہنگام بزم عقد ثریا کے واسطے — کیا کیا سجے ہیں اوج و شرف کے گھر آسماں
طالع ہوئے۔ ایسے سعادت سے ہم قریں — گرچہ بہت قران مہ و مشتری ہوئے
مری منزل میں ہر ماہ سریع السیر وہ مہوش — جو آ سکا ہو گھر میں دشمنوں کے قطعہ تارے کا
کبھی کرتا تھا قران مہ و زہرہ پر نظر — کبھی تھا دیکھتا مریخ و زحل کی رجعت
رجعت سو کم بدر کی مری ماہی سپہر — جو چنگ س کے سٹھ رہے ایک جا گرہ

سیاروں کے علاوہ مختلف ثوابت کے اثرات بھی اکثر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ ثوابت تعداد میں بہت زیادہ ہیں تفصیل اس موقع پر طوالت بیجا کا سبب ہوگی اس لئے یہاں ہم صاحب غیاث اللغات کے بیان پر ہی اکتفا کرتے ہیں

"ثوابت' یک ہزار و بیست و دو ستارہ ثوابت اند کہ اہل ہیئت از قواعد رصد آنہا را معلوم کردہ چہل و هشت صورت بر فلک مرتسم اند' از آنہا مرکب ست۔ از الحمل دوازدہ صورت بر نفس منطقہ البروج واقع اند کہ دوازدہ بروج مشہورہ عبارت از آنست و بست و یک صورت جانب شمال منطقۃ البروج واقع شدہ و پانزدہ صورت جانب جنوب منطقۃ البروج۔"

ذوق نے ثوابت کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

سبعہ سیارہ ہوں ماثر تا سر ہفت آسماں — ہو ثوابت کا سپہر ہشتمیں پر ازدحام

ذوق نے ایک شعر میں چند ستاروں کا بھی نام لیا ہے ؎

وہ حسن دروش گہر جس کو حمل ہوں دیکھ کر — ماہ و ثریا و سہا نور عمر رنگ شفق

ان ستاروں کی تشریح ملاحظہ ہو۔ ثریا' یا پروین۔ یہ چھ ستارے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل منزل سوم پر واقع ہیں، اور یہ منازل قمر میں سے ہے سہا۔ بنات النعش میں سے ایک باریک ستارہ ہے اور بنات کے تین ستاروں میں دوسرے سے متصل ہے۔ بنات النعش بنات اور نعش سے مرکب ہے۔ نعش میں چار ستارے ہیں جو چارپائی کی صورت پر ہیں، اور بنات تین ستاروں کا مجموعہ ہے۔ یہ تینوں ستارے قطب شمالی کے قریب ہیں اور یہ سب مل کر قطب کے گرد گردش کرتے ہیں۔

ذوق نے متعدد اشعار میں نجوم کی اصطلاحات بھی نظم کی ہیں۔ ان اشعار کو سمجھنے کے لئے ان اصطلاحات کے متعلق بھی علم ہونا ضروری ہے بعض ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

تیرے منصوبے کے تابع ہیں سب احکام نجوم
صفحہ تقویم کا گویا ہے بساط شطرنج

تقویم بہ معنی جنتری وہ کتاب ہے جس میں ستاروں اور سیاروں کی رفتار اور کیفیت کی تفصیلات درج ہوتی ہیں۔ اسی کی مدد سے اہل نجوم حکم لگاتے ہیں۔

تا کرے معلوم اصطرلاب سے اختر شناس
ارتفاع ہر ستارہ روز و شب یا بیع و شام

اصطرلاب وہ آلہ ہے جس سے آفتاب کی بلندی و پستی، نیکی و نحوست وغیرہ سماوی حالات معلوم کرتے ہیں۔ یہ آلہ مسل کا بنا ہوا ہے اور صورت میں نرص سے مشابہ ہے اس کے اوپر تمام ادوار مسل کے ہوتے ہیں۔ ان ادوار کے اندر بہت زیادہ دائرے اور خطوط ہوتے ہیں۔ اس کی اوپری سطح پر پیچ سے ہوتے ہیں جس کو گھمایا جا سکتا ہے۔ اصطرلاب کا استعمال خود ایک علم ہے جو اصطلاح میں "علم اصطرلاب" کہلاتا ہے۔ اس علم کے اصول کے تحت اس آلہ کو آفتاب اور ستاروں کی بلندی اور ہر چیز کا ارتفاع دریافت کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس آلہ کے واضع کے ناموں میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک اس کا موجد ارسطو ہے اور بعضوں کا خیال ہے کہ بلیناس ہے کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق یہ ارخس حکیم یونانی کا ایجاد ہے۔

اب بعض متفرق اشعار دیکھئے جن میں علم نجوم سے متعلق حوالے ہیں ؎

کرتا ہے روز و شب کو برابر بہم شہا — میزان عدل سے تری میزان میں آفتاب
ماہ نو ایک ملک پر ترے نوبردوں میں — نو فلک نوکروں میں تیرے قدیم الخدمت
طالع سدا ساعد و عالم سدا مطیع — کوکب[1] ہمیشہ یار ترا یاور آسماں
وہ آسماں سے رتبہ ترا یوں بلند تر — جس طرح کو بار سے بالاتر آسماں

---

[1] کواکب کی تعداد مختلف ہے یعنی زحل کے ساتھ ۲ کوکب، مشتری کے تحت ۵ کوکب، مریخ کے تحت ۴، شمس کے ساتھ ۳، زہرہ کے ساتھ ۲، عطارد کے ساتھ قمر ہے۔

رمال قرعہ ڈالے جو اس عقدہ پہ تو ہو انگلی سے پورے پورے میں اسکی حدا گرہ

صفحۂ عنبر پہ کھائے نقطۂ رمال رشک
دیکھے نقشِ سم جو اس کا سلوہ گرد وقت خرام

حاشیہ سے حارج کبھی تشکل داخل تشکل حارث تھی کبھی داحل میت عرسٹ

صفحۂ عنبر لغت میں عبارہ آلود زمین کو کہتے ہیں اس کے علاوہ رمل کی اصطلاح بھی ہے۔ ذوق نے شعر ثانی الذکر میں دونوں مطالب سے فائدہ اٹھایا ہے۔

آخر میں بعض اور علوم کے نام سن لیجئے جو اسی قبیل سے ہیں اور جن کے متعلق ذوق کا کہنا ہے کہ وہ ان سے واقف تھے ؎

لائے گر دانیاں کا سا ہیں ہے پاس اپنے فسال نامہ
ہم اپنے نقطوں سے دانت ران ہی کی حال دولت دیکھ لیں گے
حال در عالم تجھ میں ہے پیر اادر ہے یہ نور کسف ہویدا
غیر قیافہ غیر سدرہ غیر تفاول یعمر دیا

پہلا سجدہ

(سلسلہ صفحہ ۱۵)

نباتات. ہنوز ہم کو خبر ہی نہیں کہ ہم کیوں ہیں
کہ تیری چھیڑ کے محتاج ہیں رموزِ حیات
فرشتے یوں تو اُترتے رہے مگر افسوس
سُلجھ سکے نہ کسی طرح کاکُلِ حالات
زہے خلوص، تڑپتے ہیں سینۂ نَے میں
ہنوز تیری محبت کے اَن گنت نغمات
چمن میں پھول بھی ہیں رنگ و بو چھپائے ہوئے
ترے بغیر کہاں ایسی دل نشیں سوغات
(مظاہرِ فطرت کی ساری قوتیں ایک دم سجدے سے اُٹھتی ہیں)

ہمارا حسن ہماری ادا ہے تیرے لیے
ہمارے دل کا ہر اک مدعا ہے تیرے لیے
اگر تو چاہے تو ہو جائے چاک امن تب
تجلیاتِ سحر کی ردا ہے تیرے لیے
قدم بڑھا کہ تری راہ کے غبار ہیں ہم
ترے رفیق ہیں تیرے ہی غمگسار ہیں ہم
(آدم کی جبیں بار سجدۂ شکر کے لیے اس دنیا میں پہلی بار جھک جاتی ہے۔ اس پہلے سجدے کے ساتھ آفتاب کی سنہری کرنیں اُفق سے پھوٹنے لگتی ہیں اور آہستہ آہستہ اندھیرے کا دامن چاک ہو جاتا ہے)

میری: نہیں تو سرکار!

پرسوا: تجھ کو معلوم ہے بھائی [illegible] گئے ہیں؟

میری: میری ماں کے پاس

پرسوا: تمھیں [illegible] ؟

میری: بات یہ ہے [illegible] ماں کا حال پوچھا [illegible] [illegible] ہیں۔

پرسوا: [illegible] کیا [illegible] تمھاری ماں بیمار ہیں۔ بس [illegible] تمھاری [illegible] بہت [illegible]

میری: [illegible] ہو گیا سرکار!

پرسوا: [illegible] کہیں [illegible] ۔ تک کیوں [illegible] (میری تو [illegible] ہے) [illegible] [illegible] نمکداں [illegible] چاندی کے رکھا

میری: چاندی کے سرکار!

پرسوا: ہاں کہہ تو دیا چاندی کے کیا تو بیوقوف ہونے کے ساتھ ساتھ بہری بھی ہے؟

میری: مگر حضور نمکداں ہیں کہاں؟ وہ تو کب کے بک گئے

پرسوا: بک گئے (گھبرا کر) بک گئے، تو پاگل تو نہیں ہو گئی ہے۔ آخر کس نے بیچے اور کیوں بیچے؟

میری: آج شام کو جب آپ باہر گئی ہوئی تھیں، پادری صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں نمکدانوں کو موسیو گرد کے پاس لے جاؤں جو اکثر ان کی بہت تعریف کیا کرتے ہیں اور مناسب قیمت پر بیچ دوں۔

پرسوا: لیکن تم کو میری بغیر اجازت ایسا کرنے کا کیا حق حاصل تھا۔

میری: (خوف زدہ ہو کر) لیکن پادری صاحب نے تو مجھ سے یہی کہا تھا۔

پرسوا: پادری صاحب لیکن ان کو آخر روپے کی کیا ضرورت تھی۔

میری: معاف کیجئے گا۔ میرا خیال ہے کہ پادری صاحب نے میری گیرنگ گوائر کو روپے بھیجے تھے۔

پرسوا: میری گیرنگ گوائر؟ بے شک میری گیرنگ گوائر۔ وہی جڑیل جو سارا دن بستر پر پڑی رہتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ وہ بیمار رہتی ہے! ارے وہ اول نمبر کی کاہل ہے۔ دن بھر پلنگ پر پڑی رہتی ہے تاکہ لوگ سمجھیں بیمار ہے۔ آخر اس کو روپے کی ضرورت ہی کیا آن پڑی تھی۔

میری: سرکار! اس کو کرایہ ادا کرنے کے لئے روپیئے کی ضرورت تھی۔ قرقی والے زیادہ انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے دھمکایا کہ اگر آج کرایہ ادا نہ ہوا تو سب کو مکان سے نکال باہر کریں گے۔ اس لئے اس نے جین (Jean) کو پادری صاحب کے پاس امداد حاصل کرنے کے لئے بھیجا اور

پرسوا: میرے خدا یہ پادری تو ہمارے لئے کچھ بھی نہ چھوڑے گا۔ اس نے اپنی جائداد بیچ ڈالی جو کچھ پس انداز تھا وہ ختم کر دیا۔ اب فرنیچر اور ایک آدھ کچی پکی چیز جو اب تک باقی بچی ہے اس کی بھی خیر نہیں ہے۔ اگر میرا سہارا نہ ہوتا تو اب تک فاقوں کی نوبت آ جاتی۔ سب سے بیش قیمت خوبصورت دو سکیاں رہتے ہوئے، نمکداں تھے وہ بھی چلے گئے۔ بس اب حد ہو چکی ہے۔

میری: سرکار! مجھے بے حد افسوس ہے۔ اگر میں یہ جانتی

پرسوا: (ٹوک کر) تمھیں کیوں رنج ہے۔ اگر پادری صاحب اپنے نمکدان بیچنا چاہیں تو ان کو کون روک سکتا ہے؟ تمھارے ہاتھ بہت میلے ہیں، جا کر دھو ڈالو۔

میری: بہت اچھا سرکار!

(پادری داخل ہوتا ہے)

پادری: آہا ہا! یہاں اندر کتنی اچھی معلوم ہوتی ہے! بار بار باہر جا کر کمرے کے اندر آنے کو دل چاہتا ہے۔

(پرسوا تیزی سے کوٹ اتارنے کے لئے بڑھتی ہے) شکریہ پیاری بہن!

(اس کی طرف دیکھ کر) کیوں آخر کیا بات ہے، تم رو کیوں رہی ہو؟ کیا میری نے تم کو کچھ پریشان کیا ہے؟

پرسوا: نہیں میری کی کوئی بات نہیں ہے مگر

پادری: خیریت تو ہے! آخر کیا بات ہے؟ کچھ کہو تو سہی (میری سے مخاطب ہو کر) میری بچی اب تم اپنے گھر جاؤ۔ تمھاری ماں اب پہلے سے بہتر ہیں۔ میں نے اور انھوں نے ساتھ ساتھ عبادت کی اور ڈاکٹر ان کو دیکھ چکا ہے جاؤ جلدی جاؤ (میری باہر جانے کے لئے گرم لباس پہنتی ہے) ہاں دیکھو کمرہ میں بہت آہستہ جانا شاید تمھاری ماں کی آنکھ لگ گئی ہو۔

میری: سرکار! آپ کا بہت بہت شکریہ! (میری دروازے تک جاتی ہے اور جیسے ہی دروازہ کھولتی ہے سرد ہوا اندر آ جاتی ہے)

پادری: میری یہاں آؤ لو یہ میرا گلوبند لے جاؤ۔ تم اس سے گرم رہو گی اس وقت بے انتہا سردی ہے۔

میری: (شرماتے ہوئے) نہیں سرکار اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(پادری میز کا خانہ کھولتا ہے اور اس میں سے چھری اور کانٹا نکالتا ہے ڈاکو چاقو کو غور سے دیکھتا ہے)

ڈاکو	میرا چاقو بہت تیز ہے (چاقو کی دھار پر انگلی پھیرتا ہے اور پھر تیز نظروں سے دونوں کو دیکھتا ہے) اور یہ کلسٹے (ہاتھ میں اٹھا کر) بالکل بیکار ہیں (پھینک دیتا ہے) میں جیل میں ان کو استعمال نہیں کرتا تھا۔

پرسوما	(متعجب ہو کر) جیل!

ڈاکو	(روٹی کا ٹکڑا کاٹتا ہے اور اس کو انگلیوں سے جانور کی طرح نوچتا ہے اور کھانا شروع کر دیتا ہے۔ دفعتاً وہ چونک پڑتا ہے) ایں یہ کیا؟ (دروازے کی طرف دیکھ کر) تم لوگ دروازہ اور کھڑکی کیوں کھلی چھوڑ دیتے ہو کہ جس کا دل چاہے اندر چلا آئے۔

پادری	ہاں ہمیشہ سے کھلی رکھتا ہوں۔

ڈاکو	اچھا تو اب ان کو بند کر دو۔ (اٹھ کر دروازہ اور کھڑکی بند کر دیتا ہے)

پادری	(آہ سرد کے ساتھ) میں برس میں بھی یہ بند ہوئے ہیں (ڈاکو جلدی جلدی کھانا کھاتا ہے اور ایک بڑی قرص رکھ کر ایک دیتا ہے)

پرسوما	ہائے میرا صاف ستھرا فرش خراب کر دیا۔ (پادری چھری اٹھا کر میز میں رکھ دیتا ہے)

ڈاکو	کیا تم چوروں سے نہیں ڈرتے؟

پادری	نہیں۔ مجھ کو ان پر رحم آتا ہے۔ (ڈاکو قہقہہ لگاتا ہے اور بوتل سے شراب پیتا ہے)

ڈاکو	کتنی اچھی شراب ہے۔ ہاں تم کو چوروں پر رحم آتا ہے تم بڑے شیطان ہو

پادری	نہیں میں پادری ہوں۔

ڈاکو	(قہقہہ لگا کر) پادری! قسم ہے کنواری مریم کی! پادری میں صدر دروازے میں ملوں گا۔

پادری	میرے بیٹے مجھ کو امید ہے کہ تم اس سے بچ سکتے ہو۔ پرسوما تم اب جا سکتی ہو۔ ان کو تمہارے جانے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا

پرسوما	ہاں میں چلی جاؤں اور آپ کو اس [illegible] کے ساتھ چھوڑ دوں۔

پادری	مہربانی کر کے تم چلی جاؤ تاکہ میں اور میرے یہ دوست آزادی کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔

ڈاکو	(جس پر شراب کافی اثر کر چکی ہے) ہاں تم جا رہی ہو۔ اچھا جاؤ۔ بڈھی میں پادری سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ہاں ہاں پادری سے (شراب پینے میں مست اور کھانا ہے)

پادری	شب بخیر پرسوما

ڈاکو	(دل ہی دل میں ہنستا ہے) تم پادری ہو اور میں [illegible] کیا تم جانتے ہو میں کون ہوں۔

پادری	تم ایک مصیبت زدہ انسان ہو۔

ڈاکو	مصیبت زدہ انسان! مصیبت زدہ انسان! میرے خدا! ہاں کبھی میں انسان تھا مگر اب تو میں محض ایک نمبر ہوں نمبر ۱۵۰۲۵ ہوں جو بیس برس دوزخ میں مقیم رہا۔

پادری	مجھ کو اپنی دوزخ کا کچھ حال سناؤ

ڈاکو	(مشکوک ہو کر) تاکہ تم پولیس کو میرے پیچھے لگا دو اور وہ مجھے گرفتار کر لے

پادری	نہیں میں پولیس کو ہرگز اطلاع نہیں دوں گا۔

ڈاکو	(پادری کی جانب غور سے دیکھ کر) نہ جانے کیوں مجھے تمہاری باتوں پر یقین سا آ رہا ہے۔

پادری	(ڈاکو کے شانے پر ہاتھ رکھ کر) اچھا کھانا کھاتے جاؤ اور [illegible] سے پہلے کا حال بیان کرو

ڈاکو	اس بات کو اتنی مدت گزری کہ میں سب کچھ بھول گیا [illegible] میرا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس پر [illegible] بیلیں چڑھی ہوئی تھیں جو [illegible] کی روشنی میں نہایت خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ ایک عورت تھی (کچھ سوچ کر) وہ میری بیوی ہو گی ہاں مجھ کو یاد آ گیا۔ ایک بار وہ بیمار ہوئی میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا زمانہ خراب تھا اس لئے کام بھی نہیں ملا میری بیوی سخت بیمار پڑی ہوئی تھی اس لئے میں نے اس کے علاج و معالجہ کے لئے چوری کی (ایک [illegible] کے بعد) پھر مجھ کو پکڑ لیا گیا میں نے جرم کا اقبال کیا اور چوری کا سبب بھی بتا دیا۔ بس پھر سب لوگ ہنسنے لگے۔ آخرکار مجھ کو دس برس کے لئے جیل [illegible] دوزخ میں بھیج [illegible] میں جیل گیا اس وقت کو جیلر نے کہا کہ میری بیوی مر گئی [illegible] سب [illegible] لعنت ہو (سسکیاں لیتے لیتے سر جھک جاتا ہے)

پادری	تمہارے جیل یعنی اس دوزخ کا حال بیان کرو۔

ڈاکو	جس کا حال بیان کروں۔ اچھا میری طرف دیکھو پہلے میں انسان تھا اور اب حیوان ہوں مگر مجھ کو حیوان بنانے کے ذمہ دار وہی لوگ ہیں۔ انہوں نے مجھے جنگلی جانور کی طرح زنجیروں میں جکڑ دیا تھا اور کتوں کی طرح مجھ پر [illegible] کھانے کو گندی اور خراب ملا کرتی تھی۔ جس سے جسم پر کیڑے پیدا ہوتے تھے [illegible] سوتا تھا جب کسی بات کی شکایت کرتا تھا تو ہنٹر پڑتے تھے۔ [illegible]

پر نظر پڑتی ہے، میں ایک بار پھر ان کو دیکھوں گا (ہاتھ میں اٹھا کر) یہ تو سینکڑوں کے ہیں اگر اگر میرے ہاتھ آ جائیں تو پھر مزہ ہی مزہ ہے۔ مدت کو یہ بہت پسند ہیں۔ کیونکہ اس نے کہا تھا کہ اس کی ماں نے اس کو دیئے تھے، ہاں اس کی ماں نے بگر جیل بھیجتے وقت کسی کم بخت کو میری ماں کا خیال نہ آیا۔ وہ مجھ پر مہربانیاں کر چکا ہے۔ مگر پادری کے پاس مہربانی کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ میرے دل خوش ہو! تو نرم کیوں ہوا جاتا ہے۔ اے خدا اگر میرے ساتھ والے قیدی یہ دیکھ لیں کہ ان کا ساتھی نمبر ۲۹۷۵ ارم دلی کی وجہ سے چوری کرنے میں پس و پیش اور تامل کرتا ہے تو وہ یقیناً ہنسیں گے۔ نہیں میں شمعدان ضرور لوں گا اور بھاگ جاؤں گا۔ اگر میں یہاں رہ گیا تو صبح کو پادری ضرور اپنا وعظ سنائے گا اور پھر میرا دل نرم پڑ جائے گا۔ لعنت ہے اس پر اور اس کے وعظ و پند پر۔ بس آج میں جاتا ہوں (یہ کہہ کر وہ شمعدانوں کو کوٹ کی جیبوں میں رکھ لیتا ہے اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر چلا جاتا ہے۔ پرسوما اس کے جانے کی آہٹ سن لیتی ہے

پرسوما (باہر سے) کون ہے؟ میں پوچھتی ہوں کون ہے؟ معلوم ہوتا ہے آج رات کو سونا نہیں ملے گا۔ ارے کون ہے؟ (اندر داخل ہوتی ہے) یقیناً میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی (چاروں طرف دیکھ کر) مگر یہاں تو کوئی نہیں ہے، پادری کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے، نظر اٹھا کر دیکھتی ہے تو شمعدان غائب، شمعدان! ایں کہاں چلے گئے، بھائی جان، بھائی جان، یہاں تو آئیے، قاتل، چور! (پادری داخل ہوتا ہے)

پادری ارے کیا ہوا۔ بتاؤ تو کیا معاملہ ہے؟

پرسوما وہ چلا گیا۔ وہی جس کی آنکھیں کھوکھ سے اندر دھنسی ہوئی تھیں وہ گیا اور ساتھ ہی شمعدان بھی لے گیا۔

پادری نہیں وہ میرے شمعدان نہیں ہوں گے (نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہے اور آہ بھرتا ہے) یہ بہت سنگین معاملہ ہے بہت ہی سنگین، کاش وہ کم بخت شمعدان نہ لیتا۔ یہی ایک دو ہی میرے پاس رہ گئے تھے۔

پرسوما اب جاؤ اور پولیس کو تو اطلاع کرو۔ وہ ابھی دور نہیں گیا ہوگا بلد پکڑا جائے گا اور شمعدان مل جائیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ شمعدانوں کے قابل ہیں ہی نہیں۔ بھلا کوئی بھی ایسے اچکے بدمعاش کو اپنے گھر پناہ دیتا ہے!

پادری تم بالکل سچ کہتی ہو میری ہی غلطی تھی کہ اس کو آزمائش میں ڈالا

پرسوما آپ نے بھی کیسی بے تکی بات کہی۔ آزمائش کیسی وہ پورا چور اور بدمعاش ہے، میں اس کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی۔ اب جا کر پولیس کو تو اطلاع کر دیجئے نہیں تو میں خود جاتی ہوں۔ (جانے لگتی ہے مگر پادری روک لیتا ہے)

پادری اطلاع کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بے چارہ پھر جیل میں چلا جائے گا۔ پرسوما ایسا نہ کرو، خدا کی طرف سے اس بات کی سزا ملی ہے کہ میں شمعدانوں کو بہت کچھ سمجھتا تھا۔ یہ میرے گناہ کی سزا ہے اور بہت سخت ہے۔ (اپنا سر ہاتھوں سے چھپا لیتا ہے)

پرسوما بس بھائی جان آپ غلط سمجھ رہے ہیں اگر آپ پولیس کو اطلاع نہیں کرتے تو میں خود جاتی ہوں۔ میں اپنی آنکھوں سے آپ کو اس طرح لٹتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ میرے بھائی اور ایک باعزت پادری ہیں۔ پر اس شہر میں آپ سے بہتر دوسرا آدمی نہیں ہے مگر معاف کیجئے آپ بیوقوف اور بچوں سے بھی زیادہ نا سمجھ ہیں۔ میں برداشت نہیں کر سکتی کہ لوگ آپ کی ہنسی اڑائیں۔ اس لئے میں ابھی جاتی ہوں اور پولیس کو اطلاع دیتی ہوں۔ (جاتی ہے)

پادری پرسوما، ٹھہرو، شمعدان میرے تھے اور میں نے اس کو دے دئے اور یہ میں نے ایسا کیا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہے، اگر میری ماں زندہ ہوتیں تو میرے اس فعل کو بنظر استحسان دیکھتیں۔

پرسوما لیکن ــ (دفعتہً باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے)

سارجنٹ جناب والا ہم آپ کی ایک چیز لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ کیا ہم لوگ اندر آ سکتے ہیں؟

پادری آؤ! میرے فرزند۔ سارجنٹ اور تین سپاہی اندر داخل ہوتے ہیں یورے ... ہوا ہے۔ سارجنٹ کے ہاتھوں میں شمعدان ہیں)

پرسوما دیکھو بدمعاش کو آخر ان لوگوں نے پکڑ ہی لیا۔

سارجنٹ جی ہاں میڈم! یہ بدمعاش سڑک کے کنارے چھپتا ہوا جا رہا تھا یوچھنے پر اس نے ایسا کچھ حال نہیں بتایا۔ اس لئے ہم نے شبہ میں پکڑ لیا۔ خدا کی پناہ! یہ بڑا طاقتور ہے۔ اور ہم کو گرفتار کرنے میں بے حد دشواری ہوئی۔ کشتم کشتا میں یہ شمعدان اس کی جیبوں سے گر پڑے (پرسوما جھک کر شمعدان لے لیتی ہے اور کپڑے سے پونچھ کر میز پر رکھ دیتی ہے)، ہم جانتے ہیں کہ یہ شمعدان پادری صاحب کے ہیں۔ مگر صرف شناخت کی غرض سے اس کو پکڑ کر یہاں لائے ہیں یہاں سے لے جانے کے بعد اس کو جیل میں بند کر دیں گے

(پادری اور ڈاکو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

پادری لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ یہ آدمی تو میرا دوست ہے۔

سارجنٹ کیا فرمایا آپ نے؟ یہ بدمعاش اور آپ کا دوست!

پادری ہاں میرا دوست، آج شب کو اس نے میرے یہاں کھانا کھا کر مجھ کو عزت

کھرتے (متھرا پرشاد)

قیامت نہ ہوگی سے ان کے بولے گی
اگر حشر ساماں دل ہی ہے

کھرتے ہم جہاں بیٹھ جاتے ہیں تھک کر
یہ محسوس ہوتا ہے منزل یہی ہے

منظر لکھنوی

شب غم ہم نے دیکھی، شام فرقت ہم نے دیکھی ہے
قیامت سے بہت پہلے قیامت ہم نے دیکھی ہے

نہ دکھلائے خدا تم کو جو گت ہم نے دیکھی ہے
یہاں پر سے تصور دشت ہم نے دیکھی ہے

وہاں سے آیا ہے منظر ہمیں شوق وفا لیا
جہاں ہر اک مصیبت کم حقیقت ہم نے دیکھی ہے

ندیم نانپاروی

وہ عکس ہر صورت تجھ سے ہی ملتا ہے
اکثر جو تصور کے پردے پہ ابھرتا ہے

احساس کی شدت نے دیوانہ بنایا تھا
احساس کا سایہ اب دیوانے سے ڈرتا ہے

نہال رضوی

اپنی منزل اپنا عالم
بھول چکا ہے ابن آدم
میری تمنا واضح واضح
ان کی آوازیں مبہم مبہم
سورج آنکھیں کھول رہا ہے
کیا ہوگا انجام شبنم

والی آسی

ہم نے بھی ترک کیا سلسلۂ عشق بتوں
ہو گئے جب سے فقیہان حرم آوارہ
کوئی والی کو جو پوچھے تو بتا دو اس کو
مال اچھے ہوئے با دیدۂ نم، آوارہ

ہزار لکھنوی

نہ حریص بندگی میں نہ حریف کج کلاہی
مگر اے تمام جلوہ مرے سامنے نہ آنا
مجھے دیر سے غرض کیا میں حرم میں کیا کروں گا
نہ یہاں مرا ٹھکانا نہ وہاں مرا ٹھکانا
مری مشکلوں کی تم کو مرے دوستو خبر کیا
میں تمہارے سامنے ہوں مرے سامنے زمانہ

عطا لکھنوی

فریب زندگی کو زندگی محسوس کرتا ہوں
میسر ڈالڈا ہوتا ہے، گھی محسوس کرتا ہوں
جو فرمائیں اسے کیجئے مگر پھر بھی شکایت ہے
محبت کو میں بالکل نوکری محسوس کرتا ہوں
خدا کا شکر ہے جس نے مجھے عقل و خرد بخشی
مگر اک بے وقوفی کی کمی محسوس کرتا ہوں

خالق فتحپوری

کچھ حال کے باشندے بے حال نظر آئے
جب بھیس میں شاعر کے نقال نظر آئے
کیا جانے کہ دنیا کی دولت کو ہوا کیا ہے
جو لوگ نظر آئے کنگال نظر آئے

✡

امداد باہمی اصول پر چلائے جا رہے ہیں۔ ہینڈ کرگھا امداد باہمی انجمنوں کی تعداد بڑھ کر ۱۲۲۰ ہو گئی ہے جن کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۱۱۷۶۰ ہے۔ ان میں سے تقریباً ۴۹۴ انجمنوں کو پیداواری خرید و فروخت انجمنوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

اس صنعت کے ذریعہ سالانہ ۳ کروڑ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تقریباً ۳۰ کروڑ گز کپڑا تیار ہوتا ہے۔

ہینڈ کرگھا کے محض ریشمی کپڑوں کے ذریعہ سالانہ تقریباً ۶۰ لاکھ روپیہ کی مالیت کا غیر ملکی تبادلہ زر حاصل ہوتا ہے۔

حکومت کے ذریعہ دی جانے والی مالی امداد اور انتظامی سہولتوں کی وجہ سے اس صنعت میں گزشتہ دس برسوں کے دوران غیر معمولی توسیع ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۵۱ء کے مقابلہ میں سنہ ۱۹۵۹ء تک ہینڈ کرگھا کپڑے کی پیداوار اور بکری میں بالترتیب ۲۵ اور ۴۰ گنا اضافہ ہوا ہے اور اسی مدت میں پیداواری انجمنوں کی تعداد بھی ۳۲ سے بڑھ کر ۴۸۶ ہو گئی۔

ہینڈ کرگھا بنکر کی فی کس ماہانہ آمدنی اب ۴۲ روپیہ تک ہو گئی ہے۔

ہینڈ کرگھا کپڑے کی بکری پر اب تک ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کی چھوٹ دی جا چکی ہے۔ ان کپڑوں کی مقبولیت بڑی حد تک ریاستی حکومت کے اس اقدام کی مرہون منت ہے۔ عمدہ ترین ڈیزائنیں اور دلکش رنگوں کا امتزاج ہینڈ کرگھا کے کپڑوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔

اس صنعت کے ذریعہ مختلف اقسام کے کپڑے تیار کیے جاتے ہیں اور ان کی قیمتیں ایسی ہوتی ہیں کہ سماج کے ہر طبقہ کے افراد ان کو بہ آسانی خرید سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ساڑھے تین روپیہ سے لے کر تین ہزار روپیہ تک قیمت کی ساڑیاں۔ بروکیڈ، چادریں، پردے اور رومال وغیرہ ہیں۔

کوالٹی مارکنگ اسکیم ہینڈ کرگھا کی مصنوعات کی معیاری بنانے کے سلسلہ میں بڑی حد تک ممد و معاون ہوئی ہے اور اس سے صارفین اور بیوپاریوں میں ہینڈ کرگھا کپڑوں کی کوالٹی سے متعلق اعتبار پیدا ہوا ہے۔ اس اسکیم کے تحت اب تک تقریباً ۱۱ لاکھ گز کپڑوں پر عمدگی کی مہر لگائی گئی ہے۔

لکھنؤ سنٹرل ڈیزائن مرکز اور امروہہ، رام پور، ٹانڈہ، مئو اور غازی پور کے پانچ مرکزوں میں نئی اور دلکش ڈیزائنیں تیار کی جاتی ہیں۔ اب تک تقریباً ۳۵۰ ڈیزائنیں تیار کی جا چکی ہیں۔

ریاستی حکومت کے امداد رسی کے پروگرام کے تحت بنکروں کی امداد باہمی انجمنوں کو کاروباری سرمایہ کے لیے ۳۰۰ روپیہ فی کرگھا کے حساب سے بغیر سود کے قرضے دیے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں بنکروں کو امداد باہمی انجمنوں کے حصے خریدنے اور بکری کے مرکز کھولنے کے لیے بھی امداد دی جاتی ہے۔

ہینڈ کرگھا کپڑے کی بکری کے ۱۰۱ امداد باہمی مرکزوں کے علاوہ ریاست میں پانچ سیلس امپوریم ہیں جس میں سے الٰہ آباد میں ایک اور لکھنؤ اور آگرہ میں دو دو امپوریم ہیں۔ اور ریاست کے باہر یعنی دہلی، کلکتہ، ناگپور، بھوپال اور حیدرآباد میں اتنی ہی تعداد میں امپوریم قائم ہیں۔

ریاست میں بنکروں کو پیداوار کے جدید طریقوں کو اپنانے کے لیے ۶۱۹ لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کے جدید قسم کے آلات تقسیم کیے گئے ہیں۔

ریاست بھر میں ۲۰ رنگائی گھر ہیں اور دھلائی اور تکمیلی عمل کے دو پلانٹ ہیں جن کے ذریعہ ہینڈ کرگھا کے کپڑوں کو عمدہ رنگ اور فنکس بنایا جاتا ہے۔

بنکروں کو مناسب شرح پر اچھے قسم کا سوت فراہم کرنے کے لیے اٹاوہ میں ایک امداد باہمی کتائی مل قائم کی جا رہی ہے۔

• • •

اتر پردیش کی وزیر محنت اور ترقیات مسز سچیتا کرپلانی نے ملازمین ریاستی بیمہ اسکیم کے مطابق متادرتی بورڈ کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے بتایا کہ ریاستی حکومت نے دو مہینوں کے اندر ملازمین ریاستی بیمہ اسکیم کو مزید تین علاقوں یعنی میرٹھ، مراد آباد اور فیروز آباد میں نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جلد ہی اس اسکیم کے عنقریب گورکھپور، بریلی، جھانسی، ہرگاؤں، جرک اور غازی پور میں بھی نافذ کیے جانے کی توقع ہے۔ متادرتی بورڈ کا یہ جلسہ حال ہی میں لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔

انھوں نے مزید کہا کہ حکومت نے کارپوریشن کے اس فیصلہ پر اپنی رضامندی دے دی ہے کہ اسپتالوں میں بھرتی ہونے کی سہولت کے علاوہ بیمہ شدہ مزدوروں کے کنبوں کو بھی علاج معالجہ کی وہ تمام سہولتیں دی جائیں جو ان مزدوروں کو دی جاتی ہیں۔

بورڈ نے ڈسپنسریوں کے نظم و نسق میں اصلاح کے لیے متعدد تجاویز کی سفارش کی تاکہ یہ ڈسپنسریاں ملازمین کو بلا تاخیر علاج و معالجہ کی بہتر سہولتیں فراہم کر سکیں۔ ریاست کے ۵ صنعتی شہروں میں جو اس اسکیم کے دائرہ اثر میں ہیں بیمہ شدہ ملازمین کی تعداد ۱۵۰۰۰۰ ہے۔

بورڈ نے بیمہ شدہ ڈسپنسریوں میں ڈاکٹروں اور لیڈی ڈاکٹروں کی کمی پر تشویش کا اظہار کیا اور یہ سفارش کی کہ ڈاکٹروں کو دیے جانے والے کرایہ مکان الاؤنس میں مناسب اضافہ کیا جائے اور پریکٹس نہ کرنے کا الاؤنس ۲ روپیے بڑھا کر

۱۰۰ روپیہ کرنے سے متعلق فیصلہ پر جلد از جلد عملدرآمد کیا جائے۔

جلسہ میں متفقہ طور پر یہ رائے ظاہر کی گئی کہ عملہ کی کمی کو دور کرنے کے لئے نرسوں اور دائیوں کے لئے تربیت کی مدت اور تعلیمی استعداد کی جو پابندیاں ہیں ان کو نرم کر دیا جائے۔ شریمتی کرپلانی نے اڈیشنل ڈائرکٹر میڈیکل و ہیلتھ سروسز سے کہا کہ وہ اس ضمن میں اپنی رپورٹ دیں کہ یہ تجویز کس حد تک قابل عمل ہے۔

بورڈ نے بیمہ شدہ ملازمین کے لئے کچھ پلنگ محفوظ کئے جانے سے متعلق اپنے سابق فیصلہ کی جگہ یہ تجویز پیش کی کہ بیمہ شدہ ملازمین کے بھرتی ہونے کی صورت میں ان کے لئے کارپوریشن اپنے صرفہ سے پلنگ مہیا کرے۔

بورڈ نے اپنے ممبروں کو بیمہ ڈسپنسریوں کا معائنہ کرنے کا اختیار دیا لیکن اس پابندی کے ساتھ کہ وہ وہاں کے عملہ کو کوئی حکم نہیں دے سکتے۔ انھیں اپنی تجاویز تحریری طور پر چیئرمین کے پاس بھیجنا چاہئے۔

بورڈ نے اپنی ایک دوسری قرارداد میں شریمتی کرپلانی کا مشورہ شامل کر لیا کہ ایلگنوں پر مشتمل اسپتال میں جس کے اس سال جون تک تیار ہو جانے کی امید ہے جولائی میں ضرور کام شروع ہو جانا چاہئے اور اس کے لئے ضروری انتظامات بہت پہلے مکمل کر لیا چاہئے۔

شریمتی کرپلانی نے چند ممبروں کی اس شکایت پر کہ بیمہ ڈسپنسریوں کے ڈاکٹر ڈیوٹی کے اوقات میں غیر حاضر رہتے ہیں اڈیشنل ڈائرکٹر سے کہا کہ وہ ان شکایتوں کی تحقیقات کریں اور جلد ہی اپنی رپورٹ دیں۔

• • •

اترپردیش کے تیسرے پنجسالہ منصوبہ میں آبپاشی کے لئے ۲۲۴۵ء۱۳۰ کروڑ روپیہ کی مقررہ رقم میں سے آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں کے لئے ۲ کروڑ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ جو دوسرے منصوبہ میں اس مقصد کے لئے مقررہ رقم سے تقریباً سات کروڑ روپیہ زیادہ ہے۔ ان اسکیموں کی تکمیل سے مزید ۹۵،۲۵ ایکڑ اراضی سیراب کی جا سکے گی۔

آئندہ یکم اپریل سے پانچ برسوں کی مدت میں کل چھ اسکیموں پر عملدرآمد کیا جائے گا۔ ان اسکیموں کے تحت وسط خزانہ آب، ۱۵ سرکاری ٹیوب ویل، ۴ چھوٹے خزانہ ہائے آب اور نالاؤں، پہاڑی علاقوں میں ۲۲ نالوں اور جنوبی اترپردیش میں بندھوں کی تعمیر کی جائے گی۔

۱۵۰ ٹیوب ویل کی ضلع وار تقسیم حسب ذیل ہے

دہرہ دون کا پہاڑی علاقہ۔ ۱۰۔ سہارنپور۔ ۳۵۔ مظفر نگر۔ ۵۰۔ میرٹھ۔ ۶۰۔ بلند شہر۔ ۵۰۔ علی گڑھ۔ ۵۰۔ متھرا۔ ۵۰۔ آگرہ۔ ۰۰۔ مین پوری ۵۴۔ ایٹہ۔ ۱۵۔ فرخ آباد۔ ۴۰۔ اٹاوہ۔ ۳۵۔ کانپور۔ ۲۰۔ بجنور۔ ۵۰۔ مرادآباد۔ ۵۵۔ بریلی ۲۰۔ پیلی بھیت۔ ۵۔ شاہجہاں پور۔ ۴۰۔ کھیری۔ ۴۰۔ سیتاپور۔ ۲۰۔ بدایوں۔ ۶۰۔ ہردوئی ۵۔ لکھنؤ۔ ۱۵ بارہ بنکی ۵۔ رام پور۔ ۲ وارانسی۔ ۰۰۔ مرزاپور ۵ جونپور۔ ۳۔ غازی پور۔ ۵۔ بلیا ۵ گورکھپور۔ ۵۰۔ بستی ۵۰۔ دیوریا۔ ۵۔ اعظم گڑھ ۷ گونڈہ ۴ بہرائچ۔ ۲۵۔ فیض آباد۔ ۲۰ سلطانپور ۱۰۔ اور الہ آباد ۶۔

• • •

ریاستی بجلی بورڈ کو چیکوسلواکیہ سے آٹھ ڈیزل سیٹوں میں سے ۸ کی۔ وی۔ اے کے چھ سیٹ موصول ہو گئے ہیں یہ سیٹ چند مہینوں کے اندر غازی آباد میں لگائے جائیں گے اور آئندہ اپریل یا مئی سے کام کرنے لگیں گے۔

یاد ہوگا کہ ریاستی بجلی بورڈ نے اس سے قبل اپنے تمام ڈیزل سیٹوں کو چالو کر دیا تھا اور مغربی اترپردیش میں بجلی کی سپلائی میں اضافہ کرنے کے لئے متعدد مقامات پر چھوٹے ڈیزل بجلی گھر قائم کئے گئے تھے۔

ہردوا گنج میں ۳۰۔۳۰ ہزار کیلوواٹ کی دو یونٹوں کے قیام کا کام تیزی سے جاری ہے۔ اس سلسلہ میں تعمیرات کا کافی کام مکمل ہو چکا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ پہلی یونٹ مئی ۱۹۶۲ء اور دوسری یونٹ جون یا جولائی ۱۹۶۲ء تک کام کرنے لگے گی۔ ہردوا گنج میں ۴۰ ہزار کیلوواٹ کی ایک تیسری یونٹ کے قیام کی اسکیم ریاست کے تیسرے پنجسالہ منصوبہ میں شامل کر لی گئی ہے۔

علاوہ ازیں مرکزی حکومت کی منظور شدہ جمنا ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم اور رام گنگا کثیر مقصدی منصوبہ پر جو دوسرے منصوبہ میں شامل ہے کام شروع کیا جائے گا ان اسکیموں اور بجلی پیدا کرنے سے متعلق چند دوسری اسکیموں کی تکمیل سے ریاستی بجلی بورڈ کے ذریعہ مغربی اترپردیش میں بجلی کی بھاری مانگ پوری کی جا سکے گی۔

• • •

حکومت اترپردیش نے لوکل باڈیز کو یہ احکام جاری کر دئے ہیں کہ وہ اپنے ملازمین کے مہنگائی بھتہ کی شرح میں یکم اپریل ۱۹۶۱ء سے اضافہ کر دیں۔

ان احکام کا اطلاق میونسپل بورڈوں اور عارضی ضلع پریشدوں کے زیر انتظام چلائے جانے والے پرائمری اسکولوں کے مدرسین پر نہیں ہوگا جن سے متعلق ریاستی

محکمۂ تعلیم کے ذریعہ علیحدہ سے احکام جاری کئے جائیں گے۔

مہنگائی بھتہ کی نظرثانی شدہ شرح کے مطابق ۵۰ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والے لوکل باڈیز کے ملازمین کے مہنگائی بھتہ میں مزید ۵ روپیہ ۵ نئے پیسے ماہانہ کا عارضی اضافہ کیا گیا ہے۔

لوکل باڈیز کے پہلے دوسرے اور تیسرے درجے کے ایسے ملازمین کو جن کی ماہانہ تنخواہ ۵۱ روپیہ سے لیکر ۱۰۰ روپیہ کے درمیان ہے اب ۳۵ روپیہ ماہانہ مہنگائی بھتہ ملے گا۔ چوتھے درجہ کے ملازمین کو ۳ روپیہ اور پانچویں اور چھٹے درجہ کے ملازمین کو ۲۵ روپیہ ماہانہ مہنگائی بھتہ ملے گا۔

لوکل باڈیز کے ایسے ملازمین کے مہنگائی بھتہ میں بھی جن کی ماہانہ تنخواہ ۱۰۱ روپیہ اور ۵۴ روپیہ کے درمیان ہے اور جن کے مہنگائی بھتہ میں ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۹ء میں اضافہ نہیں ہوا تھا ۵ روپیہ ماہانہ کا عارضی اضافہ کیا گیا ہے۔

پچاس روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والے لوکل باڈیز کے پہلے دوسرے اور تیسرے درجہ کے ملازمین کو اب ۳۳ روپیہ اور ۵۱ روپیہ سے لیکر ۱۰ روپیہ تک ماہانہ تنخواہ پانے والوں کو ۳۵ روپیہ ماہانہ مہنگائی بھتہ ملے گا اور ایسے ملازمین کو جن کی ماہانہ تنخواہ ۱۰۱ روپیہ اور ۱۰۴ روپیہ کے درمیان ہے اتنا مہنگائی بھتہ ملے گا جس کو ملاکر ان کی کل ماہانہ تنخواہ ۱۳۵ روپیہ ہو جائے۔ ۱۰۵ روپیہ سے لیکر ۴۵۰ روپیہ تک ماہانہ تنخواہ پانے والوں کو ۳ روپیہ اور ۴۵۱ روپیہ سے لیکر ۴۷۹ روپیہ تک ماہانہ تنخواہ پانے والوں کو اتنا مہنگائی بھتہ ملے گا جس کو ملاکر ان کی کل تنخواہ ۴۸۰ روپیہ ہو جائے۔

لوکل باڈیز کے چوتھے درجہ کے ایسے ملازمین کو جن کی ماہانہ تنخواہ ۵۰ روپیہ تک ہے ۲۰ روپیہ اور ۵۱ روپیہ سے لیکر ۱۰۰ روپیہ تک ماہانہ تنخواہ پانے والوں کو ۳ روپیہ ماہانہ مہنگائی بھتہ ملے گا۔ اور ۱۰۱ روپیہ سے لیکر ۱۰۴ روپیہ تک ماہانہ تنخواہ پانے والوں کو اتنا مہنگائی بھتہ ملے گا جس کو ملاکر ان کی کل تنخواہ ۱۳۰ روپیہ ہو جائے۔ ۱۰۵ روپیہ سے لیکر ۴۵۰ روپیہ تک ماہانہ تنخواہ پانے والوں کو ۲۵ روپیہ مہنگائی بھتہ ملے گا۔ اور ۴۵۱ روپیہ سے ۴۷۴ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والوں کو اتنا مہنگائی بھتہ ملے گا جس کو ملاکر ان کی کل تنخواہ ۴۷۵ روپیہ ہو جائے۔

پانچویں اور چھٹے درجہ کے ایسے ملازمین کو جن کی ماہانہ تنخواہ ۵۰ روپیہ تک ہے ۲۵ روپیہ ماہانہ مہنگائی بھتہ ملے گا۔ ۵۱ روپیہ سے ۱۰۰ روپیہ تک تنخواہ پانے والوں کو بھی ۲۵ روپیہ مہنگائی بھتہ ملے گا۔ ۱۰۱ روپیہ سے ۱۰۴ روپیہ تک ماہانہ تنخواہ پانے والوں کو اتنا مہنگائی بھتہ ملے گا جس کو ملاکر ان کی کل تنخواہ ۱۲۵ روپیہ ہو جائے۔ ۱۰۵ روپیہ سے ۴۵۰ روپیہ تک تنخواہ پانے والوں کو ۲ روپیہ مہنگائی بھتہ ملے گا اور ۴۵۱ روپیہ سے ۴۶۹ روپیہ تک تنخواہ پانے والوں کو اتنا مہنگائی بھتہ ملے گا جس کو ملاکر ان کی کل تنخواہ ۴۷۰ روپیہ ہو جائے۔

ان ملازمین کے مہنگائی بھتہ میں عارضی اضافہ سے جو مزید اخراجات ہونگے اس کی ادائیگی ریاستی حکومت متعلقہ لوکل باڈیز کو مالی امداد کی صورت میں کرے گی۔

• • •

حکومت اتر پردیش نے طلبا کے سائنسی تحقیق کے معاملہ میں ڈگری اور ہائیر سکنڈری درجوں کے دس طلبا کو انعامات دئے ہیں یونیورسٹی اور ڈگری کالج کے ہر ایک طالب علم کو ۲۰۰ روپیہ اور ہائیر سکنڈری درجوں کے ہر ایک طالب علم کو ۱۰۰ روپیہ بطور انعام ملا ہے۔

یہ معاملہ ضلع سائنس کمیٹیوں کے زیر انتظام ہوا ہے جو ابتدائی انتخاب کرتی ہیں۔ بعد ازاں داخلے منطقوں کے تعلیم کے ڈپٹی ڈائرکٹروں کے پاس بھیجے جاتے ہیں جو ایک کمیٹی کی مدد سے ان کی جانچ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں قطعی انتخاب ریاست کی سطح پر ایک کمیٹی کرتی ہے۔ اس کمیٹی کا قطعی فیصلہ جس کا جلسہ یہاں گزشتہ ماہ جنوری کو ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم سری سی این چک کی زیر صدارت ہوا حسب ذیل ہے۔

یونیورسٹی سری ریودمن سارن ہندو یونیورسٹی۔ وارانسی۔ سری ایس ایچ کھڈسے سارن ہندو یونیورسٹی۔ سری برائن سنگو سٹ جی ایف۔ کالج شاہجہاں پور۔ اور سری بھرت کول۔ لکھنؤ یونیورسٹی

ہائیر سیکنڈری اسکول کماری موہنی سوری ڈبلیو ایس۔ اسٹار کالج علی گڑھ کماری میرا سریواستو مہیلا ودیالیہ لکھنؤ۔ سری سرکش داس گورنمنٹ انٹر کالج بہرائچ۔ سری اشوک کمار جیسوال کوئنس کالج وارانسی۔ سری آنند سروپ رتوڑی۔ گورنمنٹ پرتاپ انٹر کالج ٹہری گڑھوال اور سری للورام ایس ایس ہائیر سیکنڈری اسکول بانسی پور۔ مرزا پور

• • •

دیہی علاقوں میں ڈاکخانوں کے سرٹیفکٹوں میں روپیہ لگانے والوں کو سہولتیں فراہم کرنے کے لئے محکمۂ ڈاک اور تار نے سرٹیفکٹ دینے کے لئے ایک ضابطہ نکالا ہے۔ جس کے مطابق اگر سرٹیفکٹ ایسے برانچ آفس سے جاری کئے

گئے ہوں گے جن میں ڈالے گئے ہیں تو روپیہ لگانے والوں کو یہ سرٹیفکیٹ ان ڈاکخانوں کے ذریعہ دئے جائیں گے

اس سے قبل اکاؤنٹ آفس سے جاری کئے گئے سرٹیفکیٹوں کو لینے کے لئے روپیہ لگانے والوں کو برانچ آفس جانا پڑتا تھا چونکہ پہلے سے قطعی طور پر یہ بات نہیں معلوم ہو سکتی تھی کہ یہ سرٹیفکیٹ اکاؤنٹ آفس سے کس تاریخ کو برانچ آفس میں وصول ہوں گے اس لئے روپیہ لگانے والوں کو سرٹیفکیٹ لینے کے لئے کئی بار برانچ آفس جانا پڑتا تھا۔ امید کی جاتی ہے کہ ڈاکخانوں کے ذریعہ سرٹیفکیٹ ملنے کی سہولت ہو جانے سے اسکیم کی ترقی میں مدد ملے گی۔

• • •

حکومت اترپردیش نے فہرست مندرج اقوام اور سابق جرائم پیشہ قبائل کے لئے اچھے مکانات، کنوؤں کی تعمیر و مرمت اور زراعتی زمین کی سہولتیں فراہم کرنے اور گھریلو صنعتیں قائم کرنے کے لئے ۱۲ر۱۲ لاکھ روپیہ دیا ہے۔

مالی سال رواں میں ایک ۶۵۱ کنوئیں اور ۱۲۲۳ مکانات تعمیر کئے جا چکے ہیں۔

فہرست مندرج اقوام اور سابق جرائم پیشہ قبائل کو معاش کے ذرائع کی فراہمی کے لئے مالی سال رواں میں منظور شدہ کل رقم ۲ر۲۵ لاکھ روپیہ دی جا چکی ہے جس سے اب تک ۶۳ اشخاص مستفید ہوئے ہیں۔

علاوہ ازیں کھادی باڑی کی ترقی کے لئے ۳۲۲ کنبوں کو مالی امداد دی گئی ہے اور اس ضمن میں اضلاع کو ۱۵ لاکھ روپیہ دیا گیا ہے جو اس مقصد کے لئے صرف کیا جا رہا ہے۔

• • •

حکومت اترپردیش نے حال ہی میں الموڑہ اور گڑھوال کے ضلعوں کے چائے کے باغات کے مزدوروں کی اجرت کی کم سے کم شرح مقرر کی ہے۔

ضلع الموڑہ کے بیری ناگ اور چوکوری علاقوں کے چائے کے باغات کے لئے اجرت کی شرح ایک روپیہ یومیہ یا ۲۶ روپیہ ماہانہ اور الموڑہ اور گڑھوال کے ضلعوں کے دوسرے علاقوں کے چائے کے باغات میں ۶۶ نئے پیسے یومیہ یا ۱۷ روپیہ ۱۶ نئے پیسے ماہانہ ہو گی۔ ایک مہینہ ۲۶ دنوں کا ہو گا۔ اس شرح میں بنیادی اجرت اور مہنگائی بھتہ وغیرہ شامل ہے۔

یہ شرح کم سے کم اجرت سے متعلق ریاستی مشاورتی بورڈ کی سفارشات کے مطابق مقرر کی گئی ہے۔ بورڈ نے کم سے کم اجرت کے سوال پر غور و خوض کرنے سے پہلے جو سروے کیا تھا اس سے پتہ چلا تھا کہ بیری ناگ اور چوکوری کے علاقوں کو چھوڑ کر ان اضلاع کے چائے کے باغات کے ۴۶ فیصدی مزدوروں کو ۱۰ روپیہ ماہانہ سے کم اجرت ملتی تھی اور کچھ معاملات میں اجرت کی شرح ڈیڑھ آنہ یومیہ تھی اور ان علاقوں کے غیر ہنرمند مزدوروں کی اجرت کی عام شرح ۱۲ آنہ یومیہ سے لیکر دو روپیہ تک تھی۔ سروے کے وقت الموڑہ اور گڑھوال کے ضلعوں کے چائے کے باغات میں تقریباً چار ہزار مزدور کام کر رہے تھے۔

کم سے کم اجرت سے متعلق قانون کا اطلاق ریاست میں زراعتی اور غیر زراعتی پیشوں پر کر دیا گیا ہے۔

ریاستی حکومت مختلف پیشوں کے لئے اس سے قبل مقرر کی گئی کم سے کم اجرت پر نظر ثانی کرنے سے متعلق ایک تصفیاتی کمیٹی کی سفارش پر بھی غور و خوض کر رہی ہے۔

• • •

حکومت ہند کے دیئے حالیہ ضوابط میں کی گئی ترمیم کے مطابق پہلے درجہ میں بحری یا ہوائی جہاز کے ذریعہ براہ راست یا عراق یا ایران ہوتے ہوئے حجاز جانے والے حج کے زائرین کے لئے اب انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہونے یا اس کی بے باقی کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ضروری نہیں ہے۔

ایسے افراد کو جو ہندوستانی شہری نہیں ہیں اور صرف وہ اشخاص جو یہاں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں اور ہمیشہ کیلئے بھارت چھوڑ رہے ہیں بدستور سابق انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہونے یا اس کی بے باقی کے سرٹیفکیٹ پیش کرنا ہوں گے۔

• • •

بمبئی سے جدہ کے لئے رمضان کے بعد روانہ ہونے والے حاجیوں کے جہازوں کے عارضی پروگرام پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ مختلف جہازوں کی روانگی کی نظر ثانی شدہ تاریخیں حسب ذیل ہیں —

"محمدی" ۲۲ مارچ — "مظفری" ۲۴ مارچ — "سعودی" ۲۶ مارچ
"اسلامی" ۲۸ مارچ — "محمدی" ۷ اپریل — "مظفری" ۹ اپریل —
"سعودی" ۱۳ اپریل — "اسلامی" ۱۶ اپریل — "محمدی" ۲۳ اپریل —
"مظفری" ۲۵ اپریل — "سعودی" یکم مئی — "اسلامی" ۵ مئی ——
"محمدی" ۹ مئی — اور "مظفری" ۱۱ مئی —

ان تمام جہازوں میں ڈیک کی تمام نشستوں کی بکنگ مکمل ہو جانے کی اطلاع ملی ہے اور ڈیک کلاس کی ویٹنگ لسٹ بھی بند کر دی گئی ہے۔

کیونکہ اس میں دو ہزار نام درج ہوچکے ہیں۔ تاہم کچھ جہازوں میں فرسٹ کلاس میں محدود تعداد میں نشستیں ابھی خالی ہیں۔

• • •

ریاستی حج کمیٹی کے سکریٹری کے جاری کردہ ایک پریس نوٹ میں بھی بتایا گیا ہے کہ حاجیوں کے تمام جہازوں میں بکنگ مکمل ہوچکی ہے اور ویٹنگ لسٹ بھی بند کردی گئی ہے

متفرقات

تیسرے منصوبہ کے لئے انسانی طاقت۔ تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے لئے تربیت یافتہ انسانی طاقت کی اہمیت کے پیش نظر ریاستی محکمہ منصوبہ بندی نے تیسرے منصوبہ کے دوران میں اس کی مانگ اور فراہمی سے متعلق جائزہ لینے کا کام شروع کیا ہے۔

یہ جائزہ چھ اہم زمروں کے عملہ یعنی انجینئرنگ۔ دستکاری، زراعت نگہداشت مولیشیاں صحت اور تعلیم تک محدود ہوگا۔ محکمہ منصوبہ بندی نے ایک افسر کے ذمہ یہ کام سپرد کیا ہے کہ وہ صحیح صحیح معلومات کے حصول میں متعلقہ محکموں کو ہر قسم کی امداد بہم پہنچائے۔

رقیق رنگوں کا لین دین۔ ریاستی محکمہ غذا اور رسد کے جاری کردہ ایک اعلانیہ میں کہا گیا ہے کہ گورنر نے یہ احکام جاری کردیئے ہیں کہ یکم اپریل ۱۹۶۱ء سے رقیق رنگوں کا لین دین یا ٹھیکہ ناپ ہی کے ذریعہ کیا جائے گا گورنر نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اس اعلانیہ کا اطلاق اتر پردیش پر بھی ہوگا۔

اتراکھنڈ ڈویژن میں تعلیمی سہولتیں حکومت اترپردیش نے ضلع چمولی میں گیتا سوامی۔ ہائر سکنڈری اسکول گوپیشور کو صوبائی بنادیا ہے اور ضلع اتر کاشی میں گورنمنٹ جونیر اسکول بڑولا کو ہائر سکنڈری اسکول میں تبدیل کردیا گیا ہے ان اسکولوں میں نئے مضامین اور نئی کلاسیں شروع کی گئی ہیں۔

سرحدی علاقوں میں عوام کو زیادہ سے زیادہ تعلیمی سہولتوں کی فراہمی سے متعلق حکومت کی پالیسی کے مطابق یہ اقدامات کئے گئے ہیں۔

کوڑھ ایک قابل علاج مرض۔ ڈاکٹر کے۔ ایم لال مہاتما گاندھی کی شہادت کے دن ملک بھر میں کوڑھ کے انسداد کا قومی دن منایا گیا ہماری زندگی کے بہت سے دیگر شعبوں کی طرح کوڑھ کے خلاف جدوجہد شروع کرنے کی بھی تحریک ہمیں سب سے پہلے مہاتما گاندھی سے ملی۔ انھوں نے ہمیں یہ بتایا کہ اگر ہم پوری سنجیدگی سے تہیہ کرلیں تو ہندوستان میں کوڑھ کا کوئی بھی ایسا مریض نہ رہے گا جو علاج کی سہولت سے محروم ہو۔ اس ضمن میں ان کے ہمدردانہ رویہ کا پتہ اس واقعہ سے چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے سیواگرام کے آشرم میں ہر چورے شاستری کی جو کوڑھ میں مبتلا تھے خود تیمارداری کی گاندھی سمارک نیدھی نے مہاتما گاندھی کے شایان شان یادگار کے طور پر ۱۹۵۰ء میں کوڑھ کے خلاف کام کرنے کا فیصلہ کیا۔

کوڑھ دنیا کے قدیم ترین امراض میں سے ایک ہے۔ ایک زمانہ میں دنیا کے تقریباً ہر ایک ملک میں یہ بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ عہد وسطیٰ میں یورپ میں اس کا بہت زیادہ زور تھا۔ تیرھویں صدی میں وہاں ۲ ہزار کوڑھ گھر تھے اور اس کے مریضوں کی تعداد ایک کرور ۸۰ لاکھ تھی جبکہ اس وقت یہ تعداد تقریباً ۲ ہزار ہے

ہندوستان میں کوڑھ کے مریضوں کی تعداد تقریباً ۱۵ لاکھ ہے جبکہ دنیا بھر میں ان کی مجموعی تعداد ۵۰ لاکھ ہے۔ ہندوستان میں مغربی بنگال اڑیسہ۔ مدراس کیرالا۔ آندھر پردیش۔ مدھیہ پردیش اور بہار میں اس مرض کا زیادہ زور ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اتر پردیش میں تقریباً ۸۰ ہزار افراد اس مرض میں مبتلا ہیں۔ اتر پردیش کے مشرقی اضلاع اور ہمالیہ کی ترائی کے علاقوں میں اس کا بہت زیادہ زور ہے۔ اگر دوسرے ممالک میں کوڑھ کی بیخ کنی کی جاچکی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم بھی ایسا نہ کرسکیں۔

کوڑھ کی روک تھام کے لئے انسدادی اقدامات کے علاوہ موجودہ مریضوں کا علاج اور ان کی بحالی ضروری ہے۔ کوڑھ کے کل مریضوں میں سے صرف ۳۰ فی صدی مریض ایسے ہیں جن کی بیماری متعدی ہے۔ ایسے مریضوں کو علاج کی جدید سہولتیں مہیا کرکے ان کی بیماری کو غیر متعدی بنایا جاسکتا ہے یا اس کے اثر کو کم کیا جاسکتا ہے۔ کوڑھ کے انسداد کے سلسلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہمیں بڑی تعداد میں ایسے ڈاکٹروں اور سماجی کارکنوں کی ضرورت ہے جو اپنے کو اس کام کے لئے وقف کردیں اور پرخلوص جذبہ سے کام کریں۔ حکومت کے لئے تنہا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کوڑھ کے مریضوں کی امداد کرے اور ان کی بحالی کے کام کو پورا کرے۔ کوڑھ ایک سماجی بیماری ہے جس سے بہت سے سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس بیماری کے لئے عوام میں تعصب۔

توہم پرستی اور اندیشہ کو ختم کرنا اشد ضروری ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کوڑھ کے مریضوں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا جائے۔ جسمانی عیوبات سے پیدا ہونے والی بیماری کا علاج شروع میں سلفونس سے کیا جا سکتا ہے جس پر کل ۱۲ روپیہ سے لے کر ۲۵ روپیہ تک (۱۲ روپیہ سالانہ) خرچ آئے گا۔ بچے اس بیماری کے بہت جلد شکار ہو جاتے ہیں۔ کوڑھ کے مریض کے ساتھ برابر رہنے سے بچوں کو یہ بیماری ہو جاتی ہے۔ اگر بچوں کو کوڑھ کے مریضوں سے علیحدہ رکھنا ممکن نہ ہو تو رات میں ان کو ایک علیحدہ کمرے میں رکھنا چاہئے۔

دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے دوران میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے ذریعہ کوڑھ کے انسدادی اقدامات تیز تر کرنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ اتر پردیش میں کوڑھ کے خلاف مختلف سرگرمیوں میں ربط قائم کرنے اور ان کی نگرانی کے لئے ایک افسر مقرر کیا گیا ہے۔ ریاست میں کوڑھ کے تین سرکاری اور ۱۵ نجی اسپتال قائم ہیں جن میں مجموعی طور پر ۱۴۸۴ پلنگ ہیں۔ علاوہ ازیں آٹھ دیہی مرکز گاہ بھی موجود ہیں جن کے ذریعہ کوڑھ کے مریضوں کا پتہ لگانے کے لئے آبادی کے مختلف گروپوں کا سروے کیا جاتا ہے تاکہ سلفونس کے ذریعہ ان کا علاج کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں ایک مطالعاتی اور علاج مرکز بھی ہے جو اس بیماری کے اقسام کا پتہ لگانے اور سلفون کے ذریعہ علاج کے نتائج کا اندازہ لگانے کے لئے سرگرم عمل ہے۔ تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے مسودہ میں کوڑھ کی روک تھام پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ تیسرے منصوبہ کے تحت ایک بحالی مرکز، ایک کنٹرول اور سروے یونٹ کے قیام اور ہند کشٹ نوارن سنگھ (کوڑھ کے انسداد سے متعلق کل ہند انجمن) کو مالی امداد دینے کی تجویز ہے۔

وارانسی کی ریشمی کپڑے کی صنعت۔ وارانسی کے ریشمی پارچہ جات کی صنعت اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ یہ شہر۔ ہر سال ہزاروں سیاح دریائے گنگا کے کنارے واقع دنیا کے اس قدیم ترین شہر کے حسین گھاٹوں کے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے ہیں اور اپنے ساتھ یادگار کے طور پر یہاں کے خوشنما ریشمی پارچہ جات لے جاتے ہیں جن میں ہندوستانی تہذیب کے اس مرکز کے انمٹ نقوش مرتسم ہوتے ہیں۔

یہاں کا کمخواب کپڑا اس قدر دلفریب اور نفیس ہوتا ہے کہ پہلی ہی نظر میں ہر شخص اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ سونے چاندی کے تاروں سے تیار کیا ہوا یہ کپڑا ملک میں زیادہ تر مذہبی تقریبات اور تہواروں کے موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی آب و تاب کبھی ماند نہیں پڑتی۔

ریشم اتر پردیش کی مشہور صنعت ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعہ بڑی تعداد میں لوگوں کو روزگار بھی ملتا ہے۔ وارانسی اور اس کے آس پاس کے ۴۰ ہزار گھروں پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ افراد کام پر لگے ہوئے ہیں۔

اس صنعت میں ڈیڑھ کروڑ روپیہ کا سرمایہ لگا ہوا ہے اور ہر سال اوسطاً تین کروڑ روپیہ کی مالیت کا کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔

ریشمی کپڑوں کے بنکر کو اس کی صلاحیت اور ہنرمندی کے مطابق یومیہ دو سے نو روپیہ تک کی آمدنی ہوتی ہے۔ اس صنعت سے ہونے والے منافع میں بنکروں کو مناسب حصہ دلانے کے مقصد کے پیش نظر امداد باہمی انجمنیں بنانے کے لئے ان کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔ ابھی تک ۲۶ امداد باہمی انجمنوں کی تشکیل ہو چکی ہے جن کے تین ہزار سے زیادہ ممبر بن گئے ہیں۔ ریاستی حکومت کاروباری سرمایہ مشغول اور جدید آلات کی خریداری کیلئے مالی امداد دیتی ہے۔

ریشمی کپڑوں کے لئے پکے رنگوں کی فراہمی کے لئے وارانسی میں چھ ریاستی رنگائی گھر کھولے گئے ہیں۔

وارانسی میں ریشمی کپڑوں کے بنکروں کو تربیت دینے کے لئے ایک سرکاری مرکز قائم ہے جس میں ان کو پیچیدہ ڈیزائنوں کے کپڑوں کی بنائی کی تربیت دی جاتی ہے۔ اور تربیت کی مدت میں ۲ تربیت پانے والوں کو ماہانہ ۳۰۔۴۰ روپیہ کے وظیفے دیئے جاتے ہیں۔

کل ہند ہتھ کرگھا بورڈ کے ذریعہ چلائے جانے والے مرکز کے ذریعہ نئے نئے ڈیزائنوں اور رنگائی اور جدید آلات کے استعمال کے بارے میں ضروری مشورے دیئے جاتے ہیں۔

وارانسی میں ریشمی کپڑے کے بنکروں کی ایک نئی بستی قائم کی گئی ہے جس میں بنکروں کے لئے ۱۰۰ مکان اور کارگاہوں کی تعمیر کی گئی ہے۔

بنکروں کے قرضوں کے بار کو کم کرنے کے لئے حکومت نے حال ہی میں ایک اسکیم شروع کی ہے جس کے تحت تقریباً ۱۵ ہزار روپیہ تقسیم کیا جا چکا ہے۔

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو۔

REGD. No. A-319

میٹری ناپ تول

۱۔ وزن

ٹنوں سے میٹری ٹنوں تک

ٹن	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
میٹری ٹن	۱٫۰۲	۲۰۳	۳٫۰۵	۴٫۰۶	۵٫۰۸	۶٫۱۰	۷٫۱۱	۸٫۱۳	۹٫۱۴	۱۰٫۱۶

پاؤنڈ (اے۔ وی) سے کلوگرام تک

پاؤنڈ	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
کلوگرام	۰٫۴۵	٫۹۱	۱٫۳۶	۱٫۸۱	۲٫۲۷	۲٫۷۲	۳٫۱۸	۳۶۳	۴٫۰۸	۴٫۵۴

تولہ سے گرام تک

تولہ	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
گرام	۱۱٫۶۶	۲۳٫۳۳	۳۴٫۹۹	۴۶٫۶۶	۵۸٫۳۲	۶۹٫۹۸	۸۱٫۶۵	۹۳٫۳۱	۱۰۴٫۹۷	۱۱۶٫۶۴

سیر سے کلوگرام تک

سیر	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
کلوگرام	۰٫۹۳	۱٫۸۷	۲٫۸۰	۳٫۷۳	۴٫۶۷	۵٫۶۰	۶٫۵۳	۷٫۴۶	۸٫۴۰	۹٫۳۳

من سے کوئنٹل تک

من	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
کوئنٹل	۰٫۳۷	۰٫۷۵	۱٫۱۲	۱٫۴۹	۱٫۸۷	۲٫۲۴	۲٫۶۱	۲٫۹۹	۳٫۳۶	۳٫۷۳

۲۔ لمبائی

میل سے کلومیٹر تک

میل	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
کلومیٹر	۱٫۶۱	۳٫۲۲	۴٫۸۳	۶٫۴۴	۸٫۰۵	۹٫۶۶	۱۱٫۲۶	۱۲٫۸۷	۱۴٫۴۸	۱۶٫۰۹

گزوں سے میٹر تک

گز	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
میٹر	۰٫۹۱	۱٫۸۳	۲٫۷۴	۳٫۶۶	۴٫۵۷	۵٫۴۹	۶٫۴۰	۷٫۳۲	۸٫۲۳	۹٫۱۴

انچوں سے ملی میٹر تک

انچ	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱۰	۱۲۰
ملی میٹر	۲۵٫۴۰	۵۰٫۸۰	۷۶٫۲	۱۰۱٫۶۰	۱۲۷٫۰۰	۱۵۲٫۴۰	۱۷۷٫۸	۲۰۳٫۲	۲۲۸٫۶۰	۲۵۴٫۰۰	۲۷۹٫۴۰	۳۰۴٫۸۰

۳۔ رقبہ

ایکڑ سے ہیکٹر تک

ایکڑ	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
ہیکٹر	۰٫۴۰	۰٫۸۱	۱٫۲۱	۱٫۶۲	۲٫ ۲	۲٫۴۳	۲٫۸۳	۳٫۲۴	۳٫۶۴	۴٫۰۵

مربع گزوں سے مربع میٹروں تک

مربع گز	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
مربع میٹر	۰٫۸۴	۱٫۶۷	۲٫۵۱	۳٫۳۴	۴٫۱۸	۵٫ ۲	۵٫۸۵	۶٫۶۹	۷٫۵۳	۸٫۳۶

۴۔ مقدار

گیلن (امپریل) سے لیٹر تک

گیلن	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
لیٹر	۴٫۵۵	۹٫۰۹	۱۳٫۶۴	۱۸٫۱۸	۲۲٫۷۳	۲۷٫۲۸	۳۱٫۸۲	۳۶٫۳۷	۴۰٫۹۱	۴۵٫۴۶